

مایہ ناز مصنفہ کے قلم سے محبتوں سے گندھے اور یقین کے  
بندھے رشتوں کے اچانک مسد ہونے کی دل گداز داستان

# منتہی

ناہید سلطانہ اختر

طویل قسط وار ناول

Published in pakeeza digest  
july 2002 to march 2005

Imagitor





**KSK Novels**



ناہید سلطانہ اختر

دکم کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکم تو دکم ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیسی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

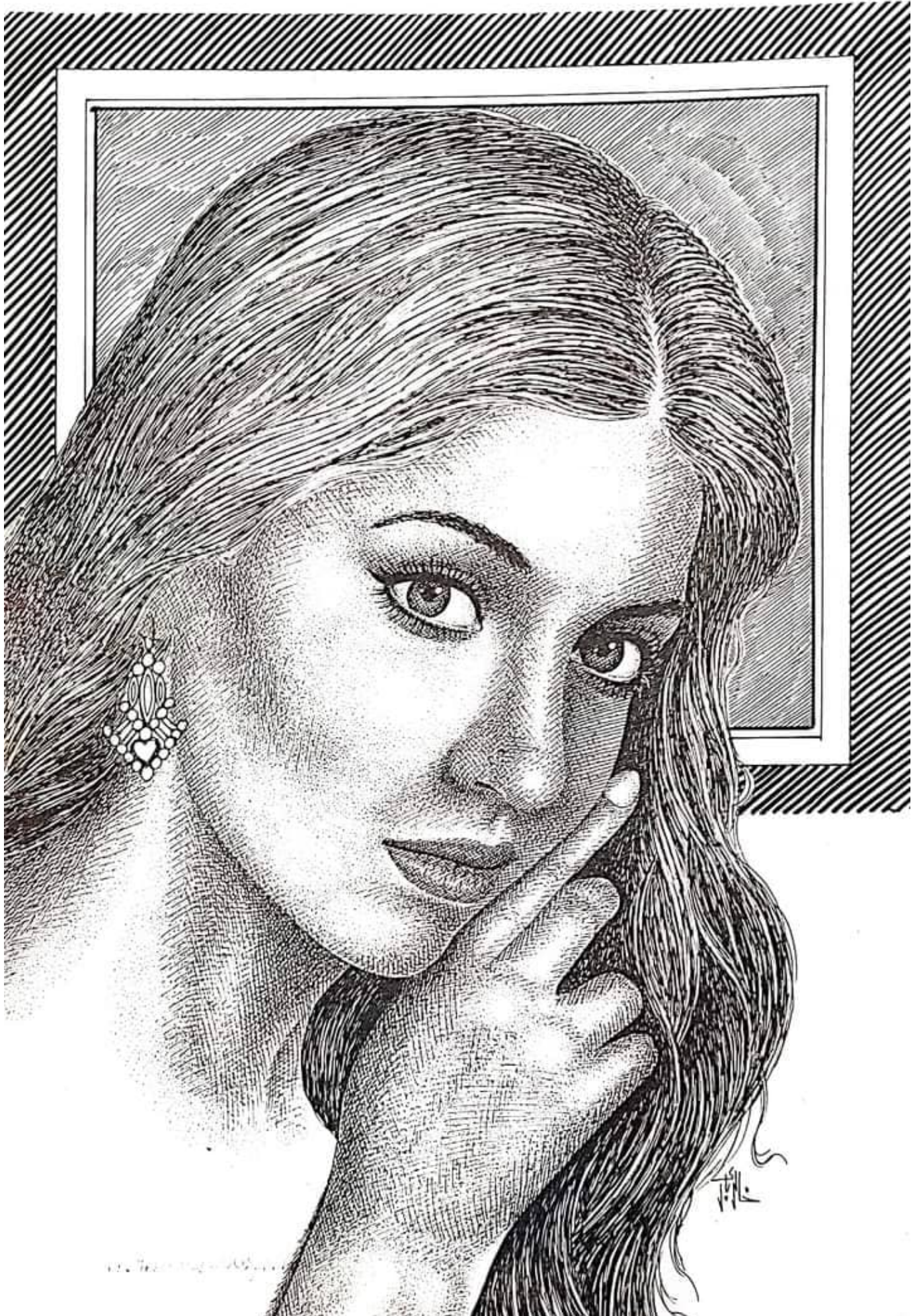
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھربڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبوں سے گندھارا یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک مسار ہونے کی دل گداز داستان

پہلی قسط

JULY.2002 ○PAKEEZA○64







گھنٹی بج چکی تھی۔  
 مٹی پبلک اسکول کے مرکزی نوٹس بورڈ پر سطرہ سطرہ تاریخ، مہینہ اور سال کے اندراج کے بعد جلی خط میں لکھا تھا۔

”شاگرد اور استاد میں بے آب و گیاہ زمین اور باغبان کا رشتہ ہوتا ہے۔ باغبان کی ریاضت بجز زمین میں گلہائے رنگارنگ کھلا سکتی ہے۔“

اس عبارت کے نیچے انتہائی بائیں جانب درج تھا۔  
 ”ڈے مسٹرئیس، مس منٹھا احمد!“

منٹھا.... جو اُس روز ڈے مسٹرئیس ہونے کے ناتے اور ادارے کے قواعد و ضوابط کے مطابق صبح اسکول کا وقت شروع ہونے سے نصف گھنٹے قبل اسکول پہنچی ہوئی تھی اور اسمبلی گراؤنڈ میں کھڑی بڑے محتاط سے انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ نوشاہہ رحیم نے اسمبلی گراؤنڈ سے گزرتے ہوئے اسے دور ہی دور سے دیکھ کر دیکھا، جو اب اس نے بھی ہاتھ ہلادیا۔

گھنٹی کیا بجی تھی گویا طبل جنگ بج گیا تھا۔

ادھر سے ادھر سے طلباء لپک لپک کر اسمبلی گراؤنڈ میں اکٹھے ہو رہے تھے جہاں ہر جماعت کے ہر فریق کے لیے ایک خط کھینچا ہوا تھا اور ہر طالب علم کو علم تھا کہ بلحاظ قامت اسے اپنے کس ہم جماعت کے آگے اور کس کے پیچھے کھڑا ہونا تھا۔

مطلوبہ تدریسی عملہ ادارے کے روزمرہ دستور کے مطابق گھنٹی بجتے ہی اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچ گیا تھا۔ مختلف فریقوں کے نگران اساتذہ نے اپنی اپنی جماعت کے رُوبرو پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اسمبلی کے آغاز تا اختتام نگران ہائے جماعت اپنی جماعتوں کے رُوبرو کھڑے ہو کر ان پر نظر رکھنے اور منضبط کرنے کے پابند تھے۔

نان کلاس ٹیچرز طلباء کی قطاروں کے عقب میں ان سے ذرا ہٹ کر پہلو بہ پہلو اس طور کھڑے ہوتے کہ مرد اساتذہ عموماً بائیں جانب ہوتے اور خواتین دائیں جانب۔ اسمبلی کے دوران میں غیر تدریسی عملے کو بھی حاضر رہنا لازم تھا۔

پلی ٹی آئی رستم خان اسمبلی گراؤنڈ میں بنے پختہ چبوترے پر استادہ ا۔ پمیلی فائر کے رُوبرو کھڑے کبھی بلند آہنگی سے وسل بجا کر کبھی منہ سے وسل نکال کر اپنے آلہ صوت کی انتہائی قوت پر طلباء کو ہدایات دے رہے تھے۔  
 سیونٹھ اے، لائن سیدھی رکھو۔

رن اپ بوائزز! رن اپ!

ہے! ایکپ کوائٹ۔

ہری اپ، ہری اپ!“

کلاس مانیٹرز اور ڈیٹی مانیٹرز اپنی اپنی جماعت کی قطار بنوا رہے تھے۔ طلباء کی قطاروں کا رخ اسمبلی کے چبوترے کی جانب تھا۔ چبوترے کا عقبی کنارہ ایڈمن بلاک سے اس طرح متصل تھا کہ پرنسپل ضمیر فاروقی صاحب کو طلباء سے خطاب کرنا ہوتا تو ایڈمن بلاک سے براہ راست اسمبلی کے چبوترے پر نکل آتے۔ حسب معمول وہ اور وائس پرنسپل مسز بشری زیدی ایڈمن بلاک کے برآمدے میں اپنی مخصوص جگہوں پر استادہ ہمہ تن اسمبلی گراؤنڈ کی طرف متوجہ تھے۔

اسٹوڈنٹس کونسل کے اراکین اور عمدے داران اپنے اپنے سینوں پر مخصوص رنگوں کی ”سٹیز“ آراستہ کیے اسمبلی گراؤنڈ میں اپنے اپنے مخصوص ”ڈیوٹی پوائنٹس“ پر متعین نظر آ رہے تھے۔

اسمبلی کے چبوترے پر رومٹرم کے دائیں جانب چار پانچ طلباء صاف ستھری یونیفارم میں ملبوس چاق چوند کھڑے



تھے۔ ان سب کا تعلق ایک ہی جماعت سے تھا بلکہ ایک ہی فریق سے۔ ادارے کے قواعد کے مطابق ہر روز کسی ایک فریق کو اسمبلی پر دو گرام پیش کرنا ہوتا تھا اس روز نہم جماعت کے فریق ب کی باری تھی۔ چوتھے کے عقبی کنارے پر اسکول بینڈ موجود تھا۔ سینوں پر سرخ پٹیاں اور سروں پر سبز کلفیوں والی سرخ ٹوپیاں آراستہ کیے۔

گاہے گاہے وسل بجاتے اور ہدایات جاری کرتے پی ٹی آئی نے دفعتاً پوری قوت سے وسل بجائی۔ طلباء کی قطاروں میں موجزن اضطراب نے ایک بیک دم سادھ لیا۔ رستم خان نے طلباء کی قطاروں پر ایک عقاب کی نگاہ دوڑائی اور منہ سے وسل نکال کر اپنی پاٹ دار آواز میں کاشن دی۔

”انٹرنیشن!“

اسکول بینڈ کے بڑے ڈرم پر زوردار ضرب پڑی۔ ڈرم پر اس ضرب اور کاشن کے جواب میں طلباء کے قدموں کی ہم آہنگی متاثر کُن تھی۔ ”اسٹینڈ ایٹ ایز“ پی ٹی آئی نے دوسری ہدایت جاری کی۔ طلباء اسی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے آرام دہ پوزیشن میں کھڑے ہو گئے۔ انٹرنیشن اور اسٹینڈ ایٹ ایز کی گردان تقریباً منٹ بھر جاری رہی اور طلباء کی حرکات و سکنات میں اسی ہم آہنگی اور مستعدی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ پھر روسٹرم کے دائیں جانب کھڑے نہم ب کے طلباء میں سے ایک طالب علم نے روسٹرم کے پیچھے اور مائیک کے روبرو آکر کہا۔

”السلام علیکم! میرا نام توقیر حسن ہے اور میرا تعلق جماعت نہم ب سے ہے۔ آج اسمبلی پر دو گرام ہماری جماعت کے ذمے ہے۔ ابتدا رب ذوالجلال کے پاک اور بابرکت نام سے .... تلاوت کے لیے آئیں گے میرے ہم جماعت ساتھی نجم شیراز!“

کمپیئر نے قاری طالب علم کے لیے جگہ چھوڑ دی اور اس دوران میں پی ٹی آئی کی آواز مائیک سے دور ہونے کے باوجود خوب گونجی۔

”پر پوزیشن!“ پی ٹی آئی نے صدا لگائی۔

طلباء نے اپنے دونوں ہاتھ سینوں پر باندھتے ہوئے سر جھکا لیے۔ منتہا نے اپنے سر پر دوپٹا لپیٹے ہوئے اپنی کلاس کی طرف دیکھا۔ آج وہ ڈے مسٹریس تھی اور اس کی اپنی کلاس اسمبلی کے دوران میں کلاس مانیٹر کی نگرانی میں تھی۔

قرأت کے بعد نعت خوانی ہوئی پھر ایک طالب علم نے ایک مختصر تقریر کی۔ بعد ازاں پرنسپل صاحب کا طلباء سے خطاب پھر پی ٹی آئی اور آخر میں اسکول بینڈ کے ساتھ قومی ترانہ اور پرچم کشائی۔

پھر بینڈ کی تیز دھن پر طلباء کا اپنی اپنی جماعت کے کمرے کی جانب تیز قدموں سے مارچ! منتہا کو اس روز ڈے مسٹریس ہونے کے باعث اسمبلی گراؤنڈ سے طلباء کی آخری قطار کی روانگی تک گراؤنڈ ہی میں ٹھہرنا تھا۔ پرنسپل صاحب ڈے ڈیوٹی ٹیچر کے ”ویجیلنٹ“ ہونے پر بہت زور دیتے تھے۔

پروکٹر انعام الدین صاحب اور ان کی معاون مسز عالیہ مجتبیٰ اپنے مخصوص گاؤن پنے اسٹوڈنٹس کو نسل کے چند اراکین کے ہمراہ طلباء کی یونیفارم چیک کرنے میں مصروف تھے۔ اسمبلی گراؤنڈ سے اپنی جماعت کے کمرے کی جانب رواں دواں ہر قطار کا ایک ایک بچہ ان کی عقاب کی نگاہوں کی زد میں تھا۔ نامکمل یا میلکی یونیفارم والے طلباء کو سرزنش کے



لیے روکا جا رہا تھا۔ طلباء کی یونیفارم کی چیکنگ اسکول کا روزمرہ معمول تھا۔ ہفتے میں ایک دن ہر طالب علم کے ناخن بھی دیکھے جاتے۔ بڑھے ہوئے اور آلودہ ناخن فوری ترشوائے جاتے۔ اس مقصد کے لیے اسٹوڈنٹس کونسل کے متعلقہ ذمے داران ”ناخن تراش“ اپنے پاس موجود رکھتے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ بالوں کی چیکنگ بھی کی جاتی۔ طلباء کے بال مقررہ تراش خراش سے زیادہ بڑھے ہوئے ہونے کی صورت میں اسکول کے چپراسی سلیم احمد سے بلا تکلف قہنچی چلوادی جاتی۔ اس لیے طلباء نے سلیم کی عرفیت ”قہنچی“ ڈال دی تھی۔ وہ آئے دن روٹی صورت بنائے انعام الدین صاحب یا مسزعالیہ مجتبیٰ کے سامنے آکھڑا ہوتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ ”آپ لوگ مجھ سے لڑکوں کے بال نہ کٹوایا کریں“ انعام صاحب مسکرا دیتے اور کہتے ”ارے یار، تم اپنا دل چھوٹا مت کیا کرو۔ کل جب ان میں سے کوئی کپتان، کوئی میجر، کوئی ڈاکٹر یا انجینئر بن کر تمہارے سامنے آئے گا تو یہ سوچ کر شرمائے گا تم سے کہ تم نے اس کی حجامت کی تھی۔“

”میں کوئی یہاں بیٹھا رہوں گا جب تک“ سلیم منمناتا۔

”یہاں نہیں تو پھر کیاں“ انعام صاحب کو مذاق سوچتا۔

”ری ٹیر ہو جاؤں گا سر!“

”یار، جن کی تم آج حجامت بنا رہے ہو، کل یہ جہاں بھی ملیں گے، سیلوٹ کریں گے تمہیں۔“

یوں انعام صاحب کے آگے سلیم کی اس کام سے عذر خوانی دھری رہ جاتی۔

آخری قطار کا آخری طالب علم اسمبلی گراؤنڈ سے جانے کے بعد منتہا دیر سے اسکول پہنچنے والے طلباء کی جانب بڑھ گئی جو اچھوتوں کی طرح الگ تھلگ کھڑے تھے۔ مسزعالیہ مجتبیٰ ”لیٹ کرز“ کو طنزاً ”بلند اقبال“ کہا کرتی تھیں۔ حسب قاعدہ منتہا کو ان ”بلند اقبالوں“ کے لیے تعمیری نوعیت کی کوئی ہلکی پھلکی سزا تجویز کرنی تھی۔ پرنسپل صاحب منفی نوعیت کی سزاؤں کے سخت مخالف تھے۔

پہنچے چوتھے پر بھی ”مارنگ اسمبلی“ کی محفل برخاست ہو چکی تھی۔ روسٹرم اور ایچ بی فائر کو وہاں سے ہٹایا جا رہا تھا۔

قومی ترانے کے ساتھ ساتھ لہرایا جانے والا سبز ہلالی پرچم چوتھے کے انتہائی شرقی کونے میں گڑے بلند وبالا آہنی کھجے کے انتہائی بالائی سرے پر بڑی آن بان سے لہرا رہا تھا۔

پرنسپل صاحب حسب معمول اسکول کے پہلے اور تفصیلی راولڈ پر نکل چکے تھے۔ مارنگ اسمبلی کے بعد وہ اسکول کے چپے چپے کا جائزہ لیتے۔ ایک ایک جماعت کے کمرے کا حسب ضرورت اندر باہر سے بغور معائنہ فرماتے۔ تدریسی اور غیر تدریسی عملے اور طلباء کو جب اور جہاں ضروری محسوس کرتے ہدایات اور مشورے دیتے۔ ان کا پہلا راولڈ کم دیش گھنٹا پون گھنٹا جاری رہتا۔ اس دوران میں وہ اساتذہ کی تدریس کا بھی جائزہ لیتے جاتے۔

وائس پرنسپل صاحب اپنے معمول کے فرائض کی انجام دہی کے لیے اپنے دفتر میں جا چکی تھیں۔ مارنگ اسمبلی کے بعد ان کا سب سے پہلا کام ٹیچرز کا حاضری رجسٹر دیکھ کر اس روز غیر حاضر اساتذہ کے پیریڈز دوسرے اساتذہ کے ذمے لگانا ہوتا۔ یہ کام ان کے لیے دماغ سوز ہوتا اور جن اساتذہ کے فری پیریڈز اس مد میں لگائے جاتے انہیں سخت ناگوار گزرتا۔

دیر سے اسکول پہنچنے والے بچوں سے نمٹنے کے بعد منتہا کو اسکول کا ایک چکر لگاتے ہی اپنی کلاس میں جانا تھا۔ ڈے مسٹریں ہونے کے باعث اس روز اسے پہلے اور پانچویں پیریڈز میں اپنی کلاس میں تاخیر سے پہنچنے کی رعایت تھی۔ ڈے ڈیوٹی ٹیچر کو مارنگ اسمبلی میں اپنی جماعت کے روبرو کھڑے ہونے سے بھی مستثنیٰ سمجھا جاتا لیکن ان دو چھوٹی چھوٹی رعایتوں سے قطع نظر ڈے ڈیوٹی ٹیچر کا پورا دن انتہائی مصروف گزرتا۔ اسے اپنے پیریڈز کے دوران میں بھی اس امر کا پورا خیال رکھنا پڑتا کہ اسکول کے کسی حصے میں کسی قسم کی بد نظمی نہ ہونے پائے۔ کسی کلاس سے شور کی آواز نہ



سنائی دے۔ طلباء کسی انتہائی ضرورت کے بغیر کلاس سے باہر دکھائی نہ دیں۔  
 ڈے ڈیوٹی ٹیچر کو وقفے کے دوران میں اسٹاف روم میں بیٹھنے کی ممانعت تھی۔ وقفے کے دوران میں اسے اسکول کے ہر حصے کا کم از کم دو مرتبہ راونڈ لینا ہوتا۔ کمرہائے جماعت میں جھانک جھانک کر یہ اطمینان کرنا ہوتا کہ کلاس گارڈ کے علاوہ کوئی اور طالب علم تو بلا سبب کسی دوسری کلاس میں تو موجود نہیں۔ وقفے کے دوران میں اسے کینٹین اور گراؤنڈ زمیں طلباء کی حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھنا ہوتی۔

وقفہ ختم ہونے کے بعد طلباء پھر اسمبلی گراؤنڈ میں قطاروں میں کھڑے ہوتے اور وہاں سے اپنے اپنے کمرے کی طرف پیش قدمی کرتے۔ ڈے ڈیوٹی ٹیچر کو سیکنڈ اسمبلی کے بعد اسکول گراؤنڈ، برآمدوں، راہداریوں اور بیت الخلاؤں کی صفائی ستھرائی کا جائزہ لینا ہوتا۔ بیت الخلاؤں کی دیواروں پر نامناسب تحریریں اور تصویروں کی موجودگی کی صورت میں انہیں فوری طور پر مٹوانے کے لیے اقدامات کرنا ہوتے۔

ڈیوٹی ٹیچر کو ڈے ڈیوٹی والے دن چائے اپنے فری پیریڈ میں پینا ہوتا تھا وقفے سے قبل یا بعد از وقفہ۔  
 چھٹی کے بعد ڈیوٹی ٹیچر کو آخری طالب علم کے اسکول سے گھر جانے تک اسکول میں رکتا پڑتا تھا خواہ چار ہی کیوں نہ بچ جاتے۔ چھٹی کے بعد بعض غیر ذمے دار قسم کے والدین تو بچوں کو اسکول سے واپس لے جانا جیسے بھول ہی جاتے۔ بچے کار پارکنگ میں بنے ٹیڈ کے نیچے سگی تختوں پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے اور گیٹ پر بیٹھے چوکیدار کو جماہیاں آنے لگتیں۔ آخری طالب علم کے جانے کے بعد ڈیوٹی ٹیچر کو ڈے ڈیوٹی رجسٹر میں دن بھر کی مفصل روئید اور رج کر کے پرنسپل صاحب کی میز پر رکھنا ہوتا۔ اگلی صبح پرنسپل صاحب حاضری رجسٹر میں اپنی حاضری لگانے کے بعد دوسرا کام ڈے ڈیوٹی رجسٹر کی چیکنگ ہی کرتے۔

گو تدریسی عملے کی تعداد پچاس سے زائد ہونے کے باعث ہر ٹیچر کی دو ماہ کے دوران میں ایک ہی مرتبہ ڈے ڈیوٹی لگتی مگر سوائے چند کے بیشتر اساتذہ کو یہ ڈیوٹی انتہائی گراں گزرتی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ صبح اسکول شروع ہونے کے وقت سے آدھا گھنٹا قبل اسکول پہنچو اور آخری طالب علم کے جانے تک چوکیدار بنے بیٹھے رہو۔ منتہا ان معدودے چند اساتذہ میں تھی جو اس ڈیوٹی کو منہ بنائے بغیر قبول کرتے۔

”بلند اقبالوں“ سے نشنہ کے بعد اس نے اسکول کا ایک چکر لگایا اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، اپنی کلاس کا رخ کیا۔ لڑکے خاموش بیٹھے وہ کام کر رہے تھے جو اس نے اپنی ڈے ڈیوٹی کے باعث ایک دن قبل ہی انہیں تفویض کر دیا تھا۔ کلاس میں ایسی خاموشی تھی کہ کیا کسی ٹیچر کی موجودگی میں ہوتی ہوگی۔ اس کمال کا سہرا خود اسی کو جاتا تھا۔ ڈے ڈیوٹی سے ایک دن قبل اپنی کلاس کو وہ بہت اچھی طرح سمجھا بچھا دیتی کہ انہیں کیا کرنا تھا اور کیا نہیں کرنا تھا۔

”دیکھو، بچو، کل میں ڈے مسٹریس ہوں گی۔ کسی کو بھی یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ڈے مسٹریس کی اپنی کلاس گڑبڑ کر رہی ہے، اوکے!“

”یس میڈم!“

وہ بچوں کو آنے والے دن کے لیے کام تفویض کر دیتی۔ مانیٹر اور ڈپٹی مانیٹر کو ضروری ہدایات دیتی۔ جماعت کے باقی بچوں کو مانیٹر اور ڈپٹی مانیٹر کی پوری طرح بات سننے اور ماننے کی تلقین کرتی اور آخر میں کہتی۔ ”مجھے امید ہے بچو، آپ لوگ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے مجھے آپ کی کلاس ٹیچر ہونے کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑے.... کیا میں یہ یقین رکھوں بچو!“

”یس میس!“

بچے اپنے عہد کا پورا پاس رکھتے جیسا کہ انہوں نے اس وقت رکھا ہوا تھا۔ ضمیر ناز دتی صاحب اسٹاف میٹنگز میں



اکثر کہا کرتے تھے کہ طلباء سے بہترین کارکردگی کے لیے استاد کو مختلف حربے آزمانے پڑتے ہیں۔  
جماعت کے کمرے میں اس کے داخل ہوتے ہی وہ سب کے سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔  
”السلام علیکم یحییٰ!“ اس کی عادت تھی کہ سلام میں وہ ہمیشہ پہل کرتی۔  
”وعلیکم السلام“ لڑکوں نے ایک آواز میں جواب دیا۔  
”سٹ ڈاؤن۔“

تمام لڑکے ایک ساتھ میکانیکی انداز میں بیٹھ گئے۔  
اس نے طلباء پر یہاں سے وہاں تک ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر کہا ”تھینک یو ویری مچ یچو۔ آپ سب بہت لظم و ضبط سے رہے۔ اسٹبل کے دوران میں بھی اور کلاس میں میری عدم موجودگی میں بھی۔“  
”تھینک یو، میم!“  
”آل رائٹ“ پہلے حاضری پھر آگے کام۔“

اس نے کلاس حاضری رجسٹر کھولا اور یکے بعد دیگرے طالب علموں کے نام پکارنے لگی۔ لڑکوں کی جانب سے  
لیس میم، پریڈنٹ ٹیچر، ایب سنٹ میڈم کی آوازیں آتی رہیں۔  
حاضری لینے کے بعد اس نے طلباء سے گزشتہ روز تفویض کیے گئے کام کی بابت پوچھا پھر ریاضی کی نئی مشق شروع  
کروانے سے قبل انہیں مثالی سوال سمجھانے لگی۔ طلباء ہمہ تن اس کی اور تختہ سیاہ کی جانب متوجہ تھے۔ کلاس میں  
طلباء کی صفوں کے درمیان مکمل خاموشی اور لظم و ضبط تھا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کے پیریڈ کے دوران میں خواہ  
وہ کسی کلاس میں بھی ہوتا، طلباء کی صفوں میں ایسی ہی خاموشی، لظم و ضبط اور ہمہ تن انہماک دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔ اسے  
اس ادارے میں پڑھاتے آٹھ سال ہونے کو آئے تھے اور اس دوران میں ان دنوں بھی جبکہ سالانہ اسپورٹس کی  
تیاریوں کے بہانے مل اور ہائی کلاسوں کے طلباء کی آدھی سے زیادہ تعداد اپنے کمرہ ہائے جماعت سے مفروز دیکھنے میں  
آتی تھی۔ ہر اس فریق کے لڑکے جہاں اس کا پیریڈ ہوتا خواہ وہ درحقیقت بھی سالانہ کھیلوں کے مقابلوں کی تیاری میں  
شریک کیوں نہ ہوتے کھیل کا میدان چھوڑ کر لپک لپک کر اس کی کلاس اینڈ کرنے کے لیے پہنچا کرتے تھے۔  
منتہا کنتی ”کلاس روم میں اگر ایک لڑکا بھی ہو گا تو میں پڑھاؤں گی۔“

اس کا اصول تھا، جس کلاس میں اس کا پیریڈ ہوتا، کتنی بچتے ہی وہاں پہنچتی اور پیریڈ ختم ہونے پر ہی وہاں سے  
نکلتی۔ ادارے میں اس کی ملازمت کے ابتدائی دنوں میں جبکہ سالانہ تقریب تقسیم انعامات کی تیاریاں تھیں، ایک دو  
مرتبہ یوں بھی ہوا کہ وہ کلاس میں پہنچی اور پوری کلاس غائب پائی۔ شاید اس لیے کہ سال بھر میں یہی وہ واحد موقع ہوتا  
تھا جب پرنسپل صاحب پروگرام کی تیاری کے لیے طلباء کو کلاس چھوڑنے کی اجازت دے دیا کرتے تھے۔ منتہا خالی  
کلاس ہی میں بیٹھ گئی اور پیریڈ ختم ہونے پر ہی وہاں سے نکلی۔ پھر آنے والے دنوں میں تو اس کے شاگرد نہ صرف اس  
کی اس عادت سے واقف ہو گئے کہ وہ اپنا پیریڈ چھوڑنے کی عادی نہیں بلکہ اس کے طریقہ تدریس نے انہیں اس قدر  
مرعوب و متاثر کیا کہ اب جبکہ اسے اس ادارے میں ملازمت کرتے آٹھ سال ہونے کو تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ اس کا  
کوئی شاگرد اسکول میں موجود ہو اور بغیر کسی انتہائی ناگزیر وجہ کے اس کی کلاس میں حاضر ہونے سے رہ جائے۔ ایک  
ایسے ادارے میں، جہاں پرنسپل کی اصول پسندی اور سختی کی وجہ سے لڑکے کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہوں  
جب انہیں کلاس چھوڑنے کا کوئی موقع، کوئی بہانہ مل سکے، منتہا کی کلاس ”مس“ نہ کرنے کی کوشش کا سرا صرف اور  
صرف منتہا ہی کو جاتا تھا۔

آٹھ سال کوئی بہت طویل عرصہ نہیں تھا مگر منتہا نے اس قلیل مدت میں اس ادارے میں بحیثیت ٹیچر ایک واضح  
شناخت اور اپنے شاگردوں کی جانب سے ایسا احترام حاصل کر لیا تھا جس نے پرنسپل صاحب کی نظروں میں اس کا ایک



اعتبار قائم کر دیا تھا۔ وہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ انتظامیہ کو اس کی تیسری سالانہ رپورٹ ارسال کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا ”میں اس لڑکی میں مستقبل کی ایک ایسی مغلہ کے آثار دیکھ رہا ہوں جو اپنی محنت، پابندی وقت، فرض شناسی اور درس و تدریس سے اپنی غیر معمولی لگن کی بنا پر اپنے پیشروؤں سے بہت آگے جائے گی۔“ یہ رائے ایک ایسی لڑکی کے بارے میں جس نے تجربے کا کبھی تصور تک نہ کیا تھا، ایک ایسے معتبر استاد کی تھی جو کیمبرج سے فارغ التحصیل تھا۔ جس کی ساری زندگی درس و تدریس سے وابستگی میں گزری تھی جو اپنی غیر معمولی پیشہ ورانہ استعداد کے باعث بیرون ملک دو پاکستانی تعلیمی اداروں کا سربراہ رہا تھا۔ تعلیمی حلقوں میں اسکول کی سطح پر جس کے نظریات و خیالات کو معتبر سمجھا جاتا تھا جس کی رائے کا احترام تھا جو صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا جا چکا تھا اور ان دنوں ٹی پبلک اسکول جیسے نامور اور معتبر تعلیمی ادارے کی سربراہی کر رہا تھا۔ جہاں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا شہر کے معززین آج بھی اپنی شان سمجھا کرتے تھے۔



ٹی پبلک اسکول کبھی ایک نجی تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا جس کی بانی مسز انیال ایک متمول صنعت کار گھرانے کی بہو اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ مذکورہ تعلیمی ادارہ انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنی پسند کے اسکول میں داخل نہ کروا سکنے کے بعد اس ادارے کی نگر پر قائم کیا تھا۔ ابتدا میں یہ ادارہ ایک وسیع و عریض شاندار کونٹری میں ٹی پریپ اسکول کے نام سے قائم کیا گیا لیکن اپنے قیام کے پانچویں سال ہی یہ ادارہ قلب شہر میں ایک وسیع رقبہ زمین پر بطور خاص اسکول ہی کے لیے تعمیر کی جانے والی ایک رُشکوہ عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ چھ علیحدہ علیحدہ بلاکوں پر مشتمل یہ عمارت مسز انیال کی خواہش پر ان کے شوہر نے تعمیر کروا کے دی تھی۔

اپنی وسعت اور طرز تعمیر کے لحاظ سے یہ عمارت شہر بھر کے تعلیمی اداروں میں بے نظیر تھی۔ نرسری سیکشن کی بیچ ستارہ نما عمارت کا رنگین شیشوں سے مزین بلند و بالا جھانسی گنبد دیکھنے والوں کی توجہ بہت دور ہی سے اپنی جانب مبذول کرا لیتا۔ اس عمارت کا ایک بلاک پرائمری جماعتوں کے لیے وقف تھا، ایک لوئر مڈل کلاسوں کے لیے۔ مڈل سیکشن بلاک میں لائبریری، اسپورٹس روم اور آرٹ روم بھی واقع تھے۔ ہائی سیکشن بلاک میں نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے کمرہ ہائے جماعت کے علاوہ دو سائنسی تجربہ گاہیں بھی تھیں۔ ایڈمنسٹریشن بلاک میں پرنسپل، وائس پرنسپل اور کلرکل اسٹاف کے دفاتر کے علاوہ مرد و خواتین اساتذہ کے لیے علیحدہ علیحدہ اسٹاف رومز تھے اور ایک وسیع و عریض سماعت گاہ بھی۔ ایڈمن بلاک کی مثالی جائے وقوع سے پرنسپل اور وائس پرنسپل کے لیے درگاہ کے بقیہ تمام بلاکوں کے علاوہ گراؤنڈ پر بھی نظر رکھنا ممکن تھا۔

انگریزی نظام تعلیم کی پروردہ ہونے کے باوجود مسز انیال نے نہ جانے کس پیش بینی اور پیش بندی کے تحت طلبہ تو مخلوط نہ رکھے البتہ تدریسی عملہ مخلوط رکھا۔ پریپ اسکول کے لیے انہوں نے مسز نیلو فر کو پرنسپل کے طور پر رکھا لیکن نئی عمارت تعمیر ہو جانے کے بعد جب پریپ اسکول نے ہائی اسکول کا قالب لے لیا تو مسز انیال نے بڑی حزم و احتیاط سے ادارے کے لیے ایک پرنسپل کا انتخاب کیا جن کا نام ضمیر فاروقی تھا اور جو کیمبرج سے فارغ التحصیل ہونے کے علاوہ اعلیٰ پیشہ ورانہ استعداد کے حامل تھے۔ اس انتخاب میں مسز انیال نے ایک باقاعدہ سلیکشن کمیٹی سے مدد لی جو دو ماہرین تعلیم اور ایک ماہر نفسیات پر مشتمل تھی۔

پرنسپل کی حیثیت سے ضمیر فاروقی کے انتخاب کے بعد وائس پرنسپل اور دیگر تدریسی اور غیر تدریسی عملے کا انتخاب مسز انیال نے ضمیر فاروقی صاحب کی معاونت سے اپنے حسابوں بہت دیکھ بھال کر کیا۔

مسز انیال کی غیر معمولی ذاتی دلچسپی، ضمیر فاروقی صاحب کی غیر معمولی پیشہ ورانہ دسترس اور اعلیٰ تعلیم اور تربیت یافتہ اساتذہ کی بدولت ٹی پبلک اسکول دیکھتے ہی دیکھتے شہر کا ایک ممتاز تعلیمی ادارہ بن گیا اور طلباء کی تعداد اتنی تیزی



سے بڑھی کہ ہم عصر ادارے نہ صرف حیران بلکہ پریشان ہو گئے۔ ان اداروں میں سے متعدد اداروں کے انتہائی اساتذہ پُرکشش مشاہیر کی خاطر سٹی پبلک اسکول کی ملازمت اختیار کر بیٹھے اور اس ادارے سے اپنی وابستگی پر نازاں ہوئے۔ اساتذہ ہی نہیں، یہاں ملازمت کرنے والے غیر تدریسی عملے کے ارکان بھی خود کو انتہائی معتبر اور موقر سمجھتے۔ شہر کے متمول اور بااثر گھرانوں کے بچوں کی تعلیمی کاشرف ان بچوں کے والدین سے اکثر و بیشتر اس ادارے کے تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین کے ایسے ایسے کام نکھارنا جو دوسرے لوگ اکثر سفارش، رشوت اور انتہائی بھاگ دوڑ کے باوجود بھی کروانے سے قاصر رہتے۔ ان کی اولادوں اور بھائی بندوں کو گھر بیٹھے اچھی ملازمتوں پر تقرری کے پروانے پہنچ جاتے۔ منگے پلاٹ سرکاری داموں پر الاٹ ہو جاتے۔ ملزم حوالا توں سے اور بیرون ملک سے آنے والے احباب و اقارب کسٹم ڈیوٹی ادا کیے بغیر کسٹم لاؤنج سے باہر نکل آتے۔ بڑی دکانوں سے رعایتی قیمتوں پر چیزیں خریدنا ممکن ہوتا۔ غرض اس ادارے کے اٹھانے فی صد ملازمین اس ادارے سے اپنی وابستگی کا حوالہ دے کر انواع و اقسام کے مادی اور غیر مادی فوائد اور مراعات حاصل کرنے کو اپنا حق باور کرتے۔

مزدانیال کی غیر معمولی دلچسپی، ضمیر فاروقی صاحب کی سربراہی، اعلیٰ تعلیمی اور پیشہ ورانہ استعداد کے حامل اساتذہ کے باعث یہ ادارہ چند ہی سال میں اعلیٰ تعلیمی معیار کی ضمانت بن گیا۔ بورڈ کے امتحانات میں اس کے طلباء کے نتائج انتہائی شاندار رہتے اور ہم نصابی سرگرمیوں میں ادارے کے طلباء اپنے ہم عصروں میں ممتاز دکھائی دیتے۔

جب سرکار نے نجی تعلیمی اداروں کو قومیاںے کا عمل شروع کیا تو سٹی پبلک اسکول کو بھی قومی تحویل میں لے کر پرائمری اور سینکڈری اسکول کو علیحدہ علیحدہ کر دیا گیا۔ پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس مسز نیلو فر اختیار مقرر کی گئیں۔ ہائی اسکول کے سربراہ ضمیر فاروقی صاحب مقرر پائے۔ تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی اکثریت ان دونوں اسکولوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی۔ جنہیں اضافی سمجھا گیا، انہیں قومی تحویل میں لیے جانے والے دوسرے اداروں میں کھپا دیا گیا۔ مزدانیال اینڈ فیملی ادارے کے انتظام و انصرام سے بارہ پتھر پرے قرار پائی۔

قومیاںے جانے والے بیشتر تعلیمی اداروں کی تنزیل کا تماشا سب نے دیکھا مگر بعض ادارے ایسے بھی تھے جنہوں نے نئے حالات میں بھی اپنا پرانا معیار اور روایات برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ سٹی پبلک اسکول میں بھی ضمیر فاروقی صاحب نے حالات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے اپنی لیاقت اور پیشہ ورانہ استعداد سے پورا کام لیا۔ چنانچہ قومیاںے جانے کے باوجود بھی ادارے کو ہم عصروں میں جداگانہ شناخت حاصل رہی۔

منتہا اس ادارے کو قومی تحویل میں لیے جانے کے بہت عرصے بعد اس ادارے کے تدریسی عملے میں شامل ہوئی اور اب اسے اس ادارے میں ملازمت کرتے تقریباً آٹھ سال ہو چکے تھے۔

وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے!

ان آٹھ برسوں میں اس نے ضمیر فاروقی صاحب کی ماتحتی میں کام کر کے بہت کچھ سیکھا تھا۔ حالانکہ خود ضمیر صاحب اسے ”بورن ٹیچر“ کہا کرتے تھے۔

بورن ٹیچر!

جبکہ ایک دانشور اور ماہر تعلیم کہتا ہے، پیدائشی طور پر ہر انسان محض ایک بچہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی سادہ تختی جس پر زمانے کا ہاتھ اپنی مرضی کی تحریر لکھتا چلا جاتا ہے۔ منتہا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ٹیچر کب بننا چاہتی تھی۔

اسے یاد تھا، اسکول کے آخری دنوں میں اردو کی ٹیچر نے ایک روز کلاس روم میں اس کی جماعت کی ہر لڑکی سے ایک سوال پوچھا تھا کہ وہ آئندہ زندگی میں کیا بننا چاہے گی، لڑکیوں نے جو جوابات دیے ان میں بعض کے جواب میں یکسانیت بھی تھی۔ بعض لڑکیوں نے بڑے دلچسپ جوابات دیے، جب اس کی باری آئی تو اس نے کہا ”ڈیڈی مجھے



ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں اور امی بھی یہی کہتی ہیں۔“  
 ٹیچر مسکرا دیں اور بولیں ”اور آپ خود کیا بننا چاہتی ہیں؟“  
 ٹیچر کی مسکراہٹ نے اسے خفیف کر دیا ”سوری مس، مجھے... مجھے نہیں پتا۔“  
 ”کیا نہیں پتا؟“

”کہ مجھے کیا بننا چاہیے۔“  
 ”کیوں بھی؟ کیوں نہیں پتا؟“ ٹیچر نے تعجب سے کہا اور جماعت کی بعض لڑکیاں ہنس پڑیں، وہ محبوب ہو گئی۔  
 جیسے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔

ٹیچر نے غالباً اس کی کیفیت تاڑ لی اور اس کی ہنسنے والی ہم جماعتوں کو تنہی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔ بعض سمجھ دار بچے اپنے مستقبل کا فیصلہ بہت سوچ بچار کے بعد کرتے ہیں“ پھر انہوں نے منتہا کی جانب روئے سخن کیا اور بڑی ملائمت سے بولیں ”آپ ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہیں منتہا، آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کے ابو آپ کو ڈاکٹر کیوں بنانا چاہتے ہیں اور امی بھی اسی حق میں کیوں ہیں؟“

”کیونکہ مس... میرے ڈیڈی... ڈاکٹر ہیں۔ وہ ایک اسپتال میں بھی جاب کرتے ہیں اور ان کا اپنا کلینک بھی ہے۔ وہ چاہتے ہیں میں ڈاکٹر بن کر ان کے ساتھ کام کروں، میرا مطلب ہے ان کی کلینک پر اور... امی کہتی ہیں کوئی تو ہونا چاہیے ڈیڈی کا ہاتھ بٹانے کو... اسی لیے وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ میں ڈاکٹر بنوں۔“  
 ٹیچر نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی۔

”اور اپنے مستقبل کے بارے میں آپ کی اپنی کوئی منصوبہ بندی نہیں... خیر، اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ آپ جیسی اچھی اسٹوڈنٹ کو پیچنگ میں آنا چاہیے۔“

”نو... نو مس!“ اس نے بے ساختہ گھبرا کر کہا ”ٹیچر تو میں کسی قیمت پر بھی نہیں بنوں گی۔“  
 ”کیوں؟“ ٹیچر نے اس کے صاف انکار پر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔  
 ”بس!“

”وجہ؟“

”بس مس! مجھے ٹیچر بننا اچھا نہیں لگتا“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

ٹیچر نے اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر پوری جماعت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور کہا ”ہاں بھی، آپ میں سے کوئی ٹیچر بننا چاہتی ہیں؟“

لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”یس مس!“ عقبی نشستوں کی جانب سے انتہائی مردہ سی آواز سنائی دی۔

اگلی نشستوں پر بیٹھی لڑکیاں ہلٹ کر پیچھے دیکھنے لگیں۔

وہ جماعت کی ایک کمزور اور ننھی سی لڑکی نرگس تھی۔

ٹیچر نے روئے سخن منتہا کی طرف کیا جو ان کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے اپنی سیٹ چھوڑے کھڑی ہوئی تھی ”سٹ ڈاؤن منتہا!“ انہوں نے کہا پھر پوری جماعت پر ایک طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے ان کے لبوں پر بڑی محزون سی مسکراہٹ پھیل گئی اور انہوں نے کہا ”عجیب بات ہے، کوئی لائق تو کیا ایورج اسٹوڈنٹ بھی ٹیچر بننے کا ارادہ نہیں رکھتی، حالانکہ اگر اچھے ٹیچرز نہیں ہوں گے تو اچھے اسٹوڈنٹس کیسے تیار ہوں گے۔ قوم کیسے ترقی کرے گی... ہمیں اپنے اس رویے کو تبدیل کرنا چاہیے۔ پیچنگ زیادہ بے انگ پروفیشن تو نہیں مگر بہت اہم اور بڑا مقدس کام ہے۔ یہ پیغمبرانہ کام ہے۔ میں آپ تمام بچیوں سے کہوں گی کہ اس کے بارے میں ضرور سوچیں۔ ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان



اور بینکار بننا جیسا کہ آپ میں سے بیشتر بچیاں خواہش رکھتی ہیں، یقیناً یہ بڑے کام ہیں مگر جب اچھے ٹیچرز نہیں ہوں گے تو اچھے ڈاکٹرز، انجینئرز، سائنس داں اور بینکار کہاں سے آئیں گے....؟" انہوں نے توقف کیا پھر منتہا کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "منتہا" میری بات پر ضرور غور کرنا۔ مجھے آپ کے یہ کہنے پر کہ آپ کو ٹیچر بننا اچھا نہیں لگتا قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ ٹیچنگ پروفیشن کے بارے میں ہمارا مجموعی رویہ یہی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ ہمارے اس رویے میں تبدیلی آئے اور لڑکیاں اتفاقاً ضرور آئیں اپنی خواہش کے برخلاف اس پروفیشن میں نہ آئیں بلکہ اپنی خواہش، ارادے اور محبت کے ساتھ یہ پروفیشن اختیار کریں۔"

ٹیچر کا لبا چوڑا لیکچرسن کر منتہا کچھ خفیف ہو گئی اور اپنا بدن سمیٹتے ہوئے خود کو اپنے آگے بیٹھی لڑکیوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگا جیسے ٹیچر نے یہ سب کچھ صرف اسی سے کہا تھا۔ جو نئی ٹیچر نے اپنی بات ختم کی "اس کے برابر بیٹھی ہم جماعت نے اپنے منہ کو ہاتھ کی اوٹ میں لیتے ہوئے زیر لب کہا "ٹیچر پھٹیچر" منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ مسکرا دی۔

جواباً منتہا کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

پیریڈ اور ہونے کے بعد کلاس روم سے ٹیچر کے جاتے ہی لڑکیاں اپنی اپنی بولیاں بولنے لگیں اور منتہا کو تسلی ہوئی کہ وہ سب کی سب اس کی ہمنوا تھیں۔ کوئی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، کوئی انجینئر۔ کسی کا ارادہ بزنس وومن بننے کا تھا اور کوئی ائر ہوسٹس بن کر دنیا کی سیر کرنا چاہتی تھی مگر ٹیچر۔۔۔ شاید ایک لڑکی بھی تو نہیں تھی ایسی، منتہا کی کلاس میں جو ٹیچر بننا چاہتی ہو۔

ان نو عمر لڑکیوں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے مستقبل کی لگامیں ان کی خواہشوں کے نہیں، وقت کے ہاتھوں میں تھیں۔

وقت! جس نے منتہا کے کالج کے زمانے میں اچانک ایسے لگامیں کھینچیں کہ اس کی ساری خواہشیں ہڑبڑا کر رہ گئیں۔



ڈیڈی شمر کے ایک معروف ڈاکٹر تھے۔ مئی ان کے دور پار کے رشتے داروں میں سے تھیں۔ رشتہ مناکحت قائم ہونے سے قبل دونوں نے بہت کم ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ وہ مئی سے عمر میں تقریباً پندرہ سال بڑے تھے۔ مئی پری پیکر تھیں، ڈیڈی انتہائی بد رو۔ مگر جب نصیب ملا تو شکل و صورت کا یہ تفاوت بے معنی ہو کر رہ گیا۔ شادی کے بعد ڈیڈی نے مئی کو وہ عزت اور راحت دی کہ وہ مئی کے لیے دنیا کے حسین ترین مرد بن گئے اور وہ لوگ جنہوں نے ان دونوں کے سب کوگ پر اس گاڑی کے چار دن بھی نہ چل سکنے کے دعوے کیے تھے، اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

شادی کے دو سال بعد منتہا پیدا ہوئی تو مئی اور ڈیڈی کا تعلق مزید مضبوط ہو گیا۔ منتہا کی تیسری سالگرہ سے صرف دو روز قبل نیسہ دنیا میں آئی اور نیسہ کے دو سال بعد علیب صاحب تشریف لائے۔

منتہا کو اپنے بچپن کے دن آج بھی ایک دل خوش کن خواب کی طرح یاد تھے۔ مئی اور ڈیڈی ہمیشہ خوش نظر آتے۔ کبھی گھر میں کوئی دعوت ہوتی، کبھی کسی دعوت پر جانا ہوتا۔ کبھی شاپنگ، کبھی لمبی سیریں۔ بارہا بیرون ملک بھی جانا ہوا۔ مئی ہمیشہ ڈیڈی کے پہلو پہ پہلو دکھائی دیتیں اور ہمیشہ انتہائی سادہ!

منتہا کو شمر کے سب سے بڑے اسکول کی نرسری میں داخل کروا کے اس کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ اس کے بعد نیسہ اور علیب کی باری آئی۔ وہ اور نیسہ ایک ہی اسکول میں تھیں جبکہ علیب کو دوسرے اسکول میں داخل کروایا گیا۔

منتہا کو اسکول کے زمانے میں کوئی ایسا دن یاد نہیں تھا جب چھٹی کے بعد اسکول کار پارکنگ میں ڈیڈی کی گاڑی نہ



کھڑی دکھائی دی ہو۔ چھٹی سے پہلے ہی ڈیڈی اسکول پہنچ جاتے اور اگر کسی روز اسپتال میں ان کی مصروفیت انہیں اسکول آنے کی اجازت نہ دیتی تو وہ ڈرائیور کو وقت مقررہ سے قبل ہی اسکول پہنچنے کے لیے اسے گاڑی لے کر روانہ کر دیتے۔

”آج ڈیڈی جان کیوں نہیں آئے؟“ منتہا کا ڈرائیور سے پہلا سوال یہی ہوتا۔  
 ”آپ گاڑی میں بیٹھو، میں بتاتا ہوں“ ڈرائیور جو گاڑی کا عقبی دروازہ دایکے کھڑا ہوتا، کہتا۔  
 ”نہیں، پہلے تم بتاؤ“ وہ اکر کر کھڑی ہو جاتی۔  
 ”اچھا بابا، اچھا!“ ڈرائیور ڈیڈی کے نہ آسکنے کا سبب بتانے لگتا۔  
 ”آج ڈیڈی سے لڑائی۔۔۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہتی۔  
 ”کیونکہ وہ لینے کے لیے نہیں آئے؟“ ڈرائیور اپنے سامنے آویزاں برر میں دیکھتا۔  
 ”اور کیا۔“

”ارے بی بی، وہ ڈاکٹر ہیں۔ یہ تو خوش قسمتی ہے آپ لوگوں کی کہ وہ آپ لوگوں کے لیے اتنا ٹائم نکال لیتے ہیں۔“ اسپتال میں سارے لوگ بولتے ہیں، ڈاکٹر نجیب احمد کے گھر والے بہت خوش قسمت ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان سب کا اتنا خیال کرتے ہیں۔“

”اچھا اچھا، ڈیڈی کی زیادہ سائنڈ مت لو، ان سے تو میں نمٹوں گی“ وہ ڈرائیور کو گھر کھڑکتی۔  
 ”کبھی ان کے گھر پہنچتے ہی، کبھی کچھ دیر بعد اسپتال سے ڈیڈی کا فون آ جاتا۔  
 ”آج آپ آئے کیوں نہیں؟“ وہ بڑے رعب سے پوچھتی۔

”سوری سوری، سوری بیٹا! میں بڑی تھما۔ یہ بتاؤ ڈرائیور تو وقت پر پہنچ گیا تھا، تم لوگوں کو انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“  
 ”آپ سے میری گئی!“ وہ اچھرے ہوئے لہجے میں کہتی۔

”مجھے اپنی بیٹی جان کو منانا آتا ہے“ ڈیڈی کے لہجے سے عیاں ہوتا کہ وہ مسکرا رہے ہیں۔

شام کو ڈیڈی ان سب کو گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جاتے۔ ممی گاڑی کی اگلی نشست پر ڈیڈی کے پہلو میں بیٹھی ہوتی اور وہ تینوں عقبی نشست پر۔ کبھی چھوٹی چھوٹی شرارتوں میں محو رہتے، کبھی ممی اور ڈیڈی کے درمیان اپنا سر نکال کر ان سے باتیں کرنے لگتے اور کبھی گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگتے۔ کھڑکی کے نزدیک بیٹھنے پر ان تینوں میں عموماً جھگڑا ہوتا اور علیحدہ چارے کو اکثر و بیشتر ان دونوں کے درمیان سینڈویچ بننا پڑتا۔ دونوں بہنوں کے مقابلے میں وہ خاصا گیلا سا تھا مگر ممی کی جان تھا وہ اور ڈیڈی کی جان منتہا تھی۔

جب ڈیڈی اپنی پرائیویٹ کلینک میں بیٹھنے لگے تو ان کی شامیں بھی مصروف ہو گئیں مگر اس مصروفیت کے باوجود وہ گھر والوں کے لیے وقت ضرور نکالتے۔ ہفتے میں دو دن ان کا کلینک بند رہتا اور یہ دو دن ممی اور بچوں کے لیے ہوتے۔ انہی شبانہ روز مصروفیات میں ڈیڈی نے نہ جانے کیونکر ممی کی خواہش پر نیا گھر بنوانے کے لیے بھی وقت نکال لیا۔ اگرچہ کام ایک ٹھیکے دار کے ذمے تھا مگر ڈیڈی اسپتال سے آنے کے بعد اور کلینک جانے سے قبل ممی کو سائٹ پر لے جاتے۔ ممی کام کا جائزہ لیتیں، ٹھیکے دار کو ہدایات دیتیں۔ وہ تینوں بھی اجزائے لازم کی طرح ہمراہ ہوتے۔ ڈیڈی ٹھیکے دار سے کہتے ”ٹھیکے دار صاحب! کام ہماری بیگم کی خواہش اور پسند کے مطابق ہونا چاہیے۔“ ٹھیکے دار اپنے سینے پر دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے سر خم کر دیتا۔

نیا گھر مکمل ہونے کے بعد وہ سب اس گھر میں منتقل ہو گئے۔ ممی نے عزیزوں اور دوستوں کو اپنے نئے گھر کی خوشی میں ایک شاندار ”ہاؤس وارمنگ پارٹی“ دی۔ ان دنوں منتہا شہر کے ایک معروف کالج میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ حالانکہ ڈیڈی کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے کیونکہ آخر کسی کو تو ان کا جانشین بننا تھا اور اس سلسلے میں ان کی نظر منتہا پر



تھی کیونکہ وہ اُن کی سب سے پیاری اولاد جو تھی مگر منتہا کا رجحان میڈیکل کی جانب نہ پا کر انہوں نے اسے اس سلسلے میں پوری آزادی دے دی تھی اور مئی سے بھی یہی کہا کہ وہ منتہا کو اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنے دیں۔ منتہا نے اپنی قریب ترین دوست تمکین کے ساتھ ایک ڈگری کالج میں داخلہ لینے کو ترجیح دی تھی۔

مئی نے کہا ”ٹھیک ہے، تم نہیں بنیں ڈاکٹر نہ سہی، نہ بنے گی۔“

”اور نہ اپنے مریضوں کو دوا کی گولیوں کے بجائے بون بون اور کینڈیز دیا کرے گی۔“ منتہا نے مذاقاً کہا تھا۔ نہہ کو بون بون اور کینڈیز کا بہت ہی شوق تھا۔

”جی نہیں“ نہہ بولی ”آپ دیکھئے گا“ میں کتنی اچھی ڈاکٹر بنوں گی۔“

”تو تم ڈاکٹر بنو گی؟“

”ضرور۔“

”گڈ لک!“

”میلب کتا“ میں تو کرکٹر بنوں گا۔“

میلب کو کرکٹ کھیلنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ مئی جب اس کے اس شوق پر معترض ہوئیں تو ڈیڈی مسکرا کر میلب سے کہتے ”کوئی بات نہیں بیٹا، کرکٹر بھی نقصان میں نہیں رہتے۔“

مئی شاکی نظروں سے ڈیڈی کو دیکھتیں اور کہتیں ”ڈاکٹر صاحب، بچوں کی یوں حوصلہ افزائی نہ کیا کریں، بگڑتے ہیں۔“

ڈیڈی بڑی محبت سے مئی کو دیکھنے لگتے۔

”فارحہ، ہماری اولاد انشاء اللہ العزیز کبھی نہیں بگڑے گی۔ یہ اصل ماں باپ کی اولاد ہیں۔“

کالج میں منتہا کے فاسٹل ایئر کی کلاسیں شروع ہونے تک زندگی بڑی دلکش تھی۔ کوئی فکر، کوئی غم نہ تھا مگر پھر ایک ایسی حالت بدلنے لگے۔ ڈیڈی نے گھر اور گھر والوں کو کم وقت دینا شروع کر دیا۔ مئی سے پہلے نظریں چرائیں پھر اکھڑے اکھڑے رہنے لگے اور یہ بات کھلنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی کہ انہوں نے اپنی کلینک پر کام کرنے والی ایک نرس سے شادی کر لی تھی۔ یہ خبر مئی، منتہا، نہہ اور میلب کے لیے تو جو صدمہ تھی سو تھی، ان سب کے لیے بھی ایک دھماکے سے کم نہ تھی جنہوں نے مئی اور ڈیڈی کے بے جوڑ میل پر اپنی ٹھوڑیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کہا تھا کہ فارحہ جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی ڈاکٹر نجیب جیسے بد صورت اور پختہ عمر مرد سے چند دن بھی نباہ جائے تو مشکل۔

مگر وقت تو الٹی ہی چال چل گیا تھا۔

اور وہ بھی ایک طویل مسافت کے بعد!

مئی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو گا۔ انہیں تو ڈیڈی پر ایسا بھروسہ تھا کہ جب گھر بنانے کے لیے پلاٹ خرید آگیا تو ڈیڈی نے اسے مئی کے نام پر خریدنا چاہا تھا مگر مئی نے اصرار کر کے پلاٹ ڈیڈی کے نام پر خریدوایا۔

”آپ اور میں دو تھوڑی ہیں۔ جو چیز آپ کی، وہ میری۔“ مئی نے کہا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے فارحہ، مگر ہمیں اس حقیقت کو بھی تو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پہلے آنے والا پہلے جاتا ہے۔“

میں تم سے پندرہ سال بڑا ہوں، میرے بعد وراثت کے چکروں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ گھر تمہارے ہی نام ہو۔“

”اب تو ہر گز بھی نہیں ہو گا“ مئی نے ڈیڈی کو شاکی نظروں سے دیکھا۔

”کیوں؟“

”کیا جتنا چاہتے ہیں آپ مجھے اپنی بڑی عمر کا احساس دلا کر کہ میں بے وقوف ہوں، نا سمجھ ہوں۔“

”ارے بھئی، ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گھر تمہارے نام پر ہونا چاہیے۔“



"میں نے کہہ دیا تھا۔"

ڈیڈی نے پھر پھر پھر بات کی مگر می اپنے موقف سے سرمونہ ملیں اور بالآخر پلاٹ ڈیڈی کے نام پر ہی خرید گیا۔  
می اور ڈیڈی کا بینک اکاؤنٹ مشترک تھا۔ بینک لا کر ڈیڈی کے نام پر لیا گیا۔ می کے زیورات 'فقدی' پر انزبانڈز  
سب اسی میں رہتے۔

مذکورہ نرس سے دوسری شادی کے موقع پر ڈیڈی نے نہ صرف لا کر خالی کر دیا بلکہ اسے ایک فلیٹ بھی خرید کر دیا۔  
یہ سب باتیں ڈیڈی کی دوسری شادی کے بعد کھلیں اور وہ بھی خود اُسی عورت کی زبانی! عجیب ڈھیٹ عورت تھی  
وہ۔ ایک عورت کا گھر اجاڑنے کے بعد ڈر کر بیٹھنے کے بجائے وہ ایک روز خود می کے سامنے آ پہنچی اور اس نے ڈیڈی  
سے اپنی شادی کا انکشاف خود ہی کیا۔  
می دم بخود رہ گئیں۔

"کوئی بات نہیں" وہ عورت بڑی مکاری سے می کے گلے میں بائیں ڈال کر بولی "اسلام میں تو چار کی اجازت  
ہے۔ میں آپ کی بہن بن کر رہوں گی۔"  
می نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"جھوٹ مت بولو.... یو چیٹ تم ہمارے ڈیڈی کو بدنام کر رہی ہو" منہا نے غصے سے کہا۔  
وہ طنز سے مسکرا دی۔

"ڈیڈی آئیں گے تو پوچھ لینا۔ یہ زیور جو میں نے پہن رکھا ہے یہ نہیں پہچان رہی ہو۔ تمہارے ڈیڈی کے لا کر کی  
چابی میرے پاس تو نہیں تھی" وہ اب عیاری سے مسکرائی۔  
"یہ گھراب ہماری بہن کا بھی ہے یہ نہیں رہے گی" اس کے ساتھ آنے والے لے تڑنگے دو نوجوانوں میں سے  
ایک نے کہا۔

"یہ دونوں میرے بھائی ہیں اور میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں" اس نے اتر کر کہا۔  
"کچھ بھی!" دوسرے نوجوان نے منہا اور نہ کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے  
کر کہا۔

می نے ان دونوں کو اپنے بازوؤں کی آڑ میں لے کر اپنے پیچھے کر لیا۔  
دھنسا پہلے نوجوان نے اپنا دایاں ہاتھ ملیب کے شانے پر رکھ دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے  
می کی طرف دیکھ کر بولا "آپ کو اپنا یہ بیٹا تو بہت عزیز ہو گا.... ہے نا؟"  
می سسکی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

"ہم جمعے کو اپنی بہن کو اُس کے سامان کے ساتھ یہاں چھوڑنے آرہے ہیں" دوسرے نے کہا۔ پھر وہ تینوں واپس  
چلے گئے۔

گھر میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

جب ڈیڈی اس روز گھر واپس لوٹے اور می نے ان سے اس خبر کی تصدیق یا تردید چاہی تو انہوں نے پلا تامل کہا  
"ہاں.... میں نے شادی کر لی ہے۔"  
می دم بخود رہ گئیں۔

"کیوں؟" انہوں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "کیوں کیا آپ نے ایسا؟"

"مجھ سے کوئی سوال نہ کیا جائے" ڈیڈی نے کہا۔

"کیونکہ آپ کے پاس می کے کسی سوال کا جواب جو نہیں ہے ڈیڈی جان!" منہا نے ڈیڈی کے روبرو کھڑے ہو کر



کہا۔

”شٹ آپ!“ ڈیڈی نے منتہا پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔  
 می نے ان کا ہاتھ روکتے ہوئے منتہا کو اپنی آڑ میں لے لیا۔  
 منتہا صدے کی کیفیت میں تھی۔ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ ڈیڈی، جنہوں نے ان تینوں بھائی، بہنوں میں سے کسی کو کبھی ٹیڑھی نظر سے بھی نہ دیکھا تھا، اس پر ہاتھ اٹھا بیٹھے تھے۔  
 ”وہ میری بیوی ہے، اب اسی گھر میں رہے گی“ ڈیڈی نے می کو خشونت سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ہرگز نہیں، وہ اس گھر میں نہیں آئے گی“ می کا لہجہ دو ٹوک تھا۔  
 ”تم کون ہو، ہوا سے روکنے والی! یہ میرا گھر ہے۔ میں جسے چاہوں رکھوں، جسے چاہوں نکال دوں۔“ ڈیڈی نے کیسے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

○☆☆○

پھر تو جیسے زندگی ہی نے نگاہیں بدل لیں۔  
 می ڈیڈی سے کوئی احتجاج، کسی قسم کا مطالبہ کیے بغیر اپنا اور ان تینوں کا ضروری اسباب سمیٹ کر ڈیڈی کا گھر چھوڑا۔ ان تینوں کے ہمراہ ماموں کے گھر آ گئیں۔ وہی ماموں اور ممانی جو می کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، سرد مہری برتنے لگے۔ ماموں تین چار دن تو اپنے بچوں کے ساتھ ان تینوں کو بھی کسی نہ کسی طرح اپنی گاڑی میں جگہ نکال کر بٹھاتے اور مایب کو اس کے اسکول اور منتہا اور نیہہ کو ان کے کالج پہنچاتے رہے لیکن پھر انہوں نے معذرت چاہی اور بولے ”نہیں، مجھے اپنے دفتر سے دیر ہو جاتی ہے۔ مایب کو تو میں دفتر جاتے ہوئے راستے میں ڈراپ کر سکتا ہوں، واپسی پر یا تو دین لگا دی جائے یا یہ پبلک بس پر خود آجایا کرے۔“  
 ”اول تو اب اتنے مہنگے اسکول میں پڑھانے کی ضرورت کیا ہے؟“ ممانی نے لقمہ دیا۔  
 ”منتہا اور نیہہ کے کالج کے لیے ڈائریکٹ بس ملتی ہے ہمارے بس اسٹاپ سے۔ یہ دونوں مل کر آجاسکتی ہیں“ ماموں نے منقطع ہو جانے والی بات کو پھر وہیں سے پکڑا۔  
 ”ہاں اور کیا، سبھی لڑکیاں کوئی گاڑیوں سے تھوڑی آتی جاتی ہیں اپنے اسکول کالج“ ممانی پھر بولیں۔  
 اپنے کمرے میں آنے پر می نے آہستگی سے ان دونوں کو سمجھایا ”کل صبح میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی، تمہیں بس سے کالج کا راستہ سمجھا دوں گا، واپسی پر تم لوگ خود آجانا۔“  
 اگلی صبح می دونوں کو ساتھ لے کر بس اسٹاپ پر پہنچیں۔ جو بس آتی، بھری ہوئی۔ زنانہ حصے میں لڑکیاں اور عورتیں باہر تک جھولتی ہوئی۔ ایک نہیں، کئی بسیں نکل گئیں۔ آخر کار می نے کہا ”بیٹا، اب بس آئے تو ہم لوگوں کو کسی طرح چڑھنے اور جگہ بنانے کی کوشش کرنی ہوگی ورنہ تمہیں کالج سے دیر ہو جائے گی، پہلے تم دونوں چڑھنا، پھر میں چڑھوں گی۔“

منتہا نے ہمت کر دکھائی مگر نیہہ ہمت نہ کر سکی۔ فٹ بورڈ پر کھڑی منتہا نے بس کی حرکت محسوس کرتے ہی چھلانگ لگا دی اور تھوڑا سا ڈگمگا کر سنبھل گئی۔ لوگ دیکھنے لگے۔ می اور نیہہ حواس باختہ سی اس کی طرف لپکیں۔  
 منتہا نے نیہہ پر آنکھیں نکالیں اور دانت کچکا کر بولی ”بے وقوف، تم چڑھیں کیوں نہیں؟“  
 ”مجھے ڈر لگتا ہے“ نیہہ روہانسی دکھائی دے رہی تھی۔  
 منتہا جو خوف زدہ تھی، می کی طرف دیکھتے ہوئے شاکی لہجے میں بولی ”اور آپ نے بھی چھوڑ دیا مجھے!“  
 ”بیٹا، میں تو پہلے نیہہ کو اوپر چڑھانے کی کوشش میں تھی۔“  
 ”پھسڈی! بے وقوف!“ منتہا نے پھر نیہہ کو گھڑکا۔



”دیے علفند تو خیر تم بھی نہیں ہو“ ان دونوں کے ہمراہ دوبارہ بس اسٹاپ کی طرف پلٹتے ہوئے می نے کہا۔  
 ”کیوں میں نے کیا کیا؟“ وہ چونکی۔  
 ”چلتی بس سے چھلانگ لگا دی۔“  
 ”تو پھر کیا کرتی؟“

”بس رکوانے کی کوشش کرتیں۔“  
 ”مجھے کیا پتا بس کیسے رکواتے ہیں؟“  
 ”چلا کر کہتیں ڈرائیور سے بس روکو۔“  
 ”وہ تو اندر تھا اپنی سیٹ پر اور باہر ٹریفک کا شور بہت تھا۔ میری آواز اس تک کیسے پہنچتی؟“  
 ”اندر لوگوں تک تمہاری آواز پہنچتی تو وہ اس سے گاڑی رکوا دیتے۔“

”اتنی دیر میں بس خدا جانے کہاں پہنچ جاتی۔“  
 ”وہ بہتر تھا، چلتی بس سے چھلانگ لگانے پر خدا نخواستہ کوئی حادثہ ہو جاتا تو؟“ می کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔  
 ”اچھا تھا تاہم... میں مر جاتی... ایک تو کم ہو جاتا ہم میں سے“ منتہا روہا نسی ہو گئی۔  
 ”میں چلتے چلتے تھم گئیں اور منتہا کو دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی آبی لہر تھی۔  
 ”یہ!... یہ تم نے کیا کہا؟“  
 می کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر منتہا خفیف ہو گئی۔  
 مگر زندگی نے اس کے نو عمر دل پر جو گھاؤ لگایا تھا اس کی ٹیسس بھی اپنی جگہ تھیں۔  
 ”اتنی ساری مشکلوں سے مر جانا ہی اچھا ہے۔“  
 می کچھ نہیں بولیں۔

خاموشی سے ان دونوں کو ہمراہ لیے دوبارہ بس اسٹاپ پر آکھڑی ہوئیں۔  
 پھر کئی بسیں گزر گئیں۔

بالآخر ایک بس میں جوں توں تینوں کے لیے جگہ بن ہی گئی۔  
 آدھا راستہ نیسہ سخت مشکل میں کبھی اُدھر کبھی اُدھر ڈالتی رہی پھر ایک سیٹ خالی ہوئی تو می نے اسے بٹھا دیا۔  
 منتہا اور می نے پورا سفر کھڑے کھڑے طے کیا۔  
 اس روز می انہیں واپسی پر بھی لینے کے لیے آئیں۔ بس اسٹاپ سے ماموں کے گھر کی طرف جاتے ہوئے می نے ان سے کہا ”اب تو ایسے ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔“  
 اس شب می نے اس سے پوچھا ”تم نے کیا کہا تھا منتہا! اتنی ساری مشکلوں سے مر جانا ہی اچھا ہے۔ یہی کہا تھا نا تم نے؟“

اس نے می کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔  
 ”ایک بات بتا دوں تمہیں“ آج پہلی اور آخری بار... اگر تم تینوں نہ ہوتے نا تو تمہارے ڈیڈی کی اس حرکت کے بعد میں خیند کی گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے سو جاتی۔“  
 منتہا نے ہڑبڑا کر می کو دیکھا۔

”ہاں“ می نے بڑے وثوق سے کہا پھر درد بھرے لہجے میں بولیں ”دنیا یہ تو جانتی ہے کہ ڈاکٹر نجیب نے اپنے بیوی بچوں کو بہت عیش و آرام دیا مگر کوئی یہ نہیں جانتا، خود تمہارے ڈیڈی بھی نہیں کہ ان کی بیوی نے ان کے لیے کیا کیا۔“



منتہا تکلی باندھے انہیں دیکھے مئی۔

”تمہارے ڈیڈی سے شادی سے قبل میں بڑی شوخ و شنگ لڑکی ہوا کرتی تھی۔ جسے خوش رنگ کپڑے پہننے عام لڑکیوں کی طرح بننے سنورنے، اپنے کزنز اور سیلیوں کے ساتھ ہلاکھا کرنے، بات بات پر اونچے اونچے قہقہے لگانے اور سیر و تفریح کے بھانے ڈھونڈنے کا شوق تھا۔ خاندان میں کوئی شادی ہوتی تو مائیں اور مہندی کی تقریبات میں مجھے بطور خاص بلایا جاتا۔ یہ طے تھا کہ گانے بجانے اور ہل بازی میں مجھ سے آگے کوئی دوسرا نہ نکل سکے گا۔ خاندان میں خوشی کی کوئی اور تقریب ہوتی یا فیملی پکنک، میری شرکت ضروری سمجھی جاتی۔ میں جہاں ہوتی، مسکراہٹیں، ہنسی اور قہقہے ہی ہوتے۔ میری جملے بازیوں، میری شوخی اور لطیفوں سے چھوٹے بڑے سبھی لطف اندوز ہوتے۔ اللہ جانے ان دنوں مجھے کیونکر شوخیاں، شرارتیں اور لطیفے سوجھا کرتے تھے۔ جب میرے لیے تمہارے ڈیڈی کا رشتہ آیا اور گھروالوں نے میری رائے پوچھی تو میں اچھل کر کھڑی ہو گئی اور میں نے کہا کہ ہرگز نہیں، میں اسے بھٹنے سے ہرگز شادی نہیں کروں گی مگر مقدر کا لکھا کسی کے روکے رکتا ہے۔ رشتہ طے پا گیا۔ خاندان والوں نے دعوے کرنا شروع کر دیے کہ یہ شادی چند دن بھی نہیں چلے گی۔ میری کزنز مجھے ڈراتیں کہ یوں ہوگا، دوں ہوگا۔ ایک روز ایک کزن نے کہا، ڈاکٹر نجیب تمہیں پیچھے میں بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لیں گے۔ یہ ساری باتیں مجھے خوف زدہ کر رہی تھیں اور میرے گھر والوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اپنے خوف کا اظہار میں اپنی امی اور بہنوں کے سامنے بھی کرتی اور ان سب کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ہمیں اتنا اچھا رشتہ مل جانے پر لوگ جل رہے ہیں، امی مجھے سمجھاتیں کہ شکل و صورت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور شوہر بڑی عمر کا ہو تو بیوی کا زیادہ خیال رکھتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ شادی سے دو دن پہلے امی نے مجھ سے کہا۔ خاندان والے جو دعوے کر رہے ہیں، انہیں جھوٹا کر دکھانے کے لیے تمہیں خود کو بدلنا ہوگا۔ میں نے حیرانی سے کہا، مجھے! بولیں، ہاں... نجیب سنجیدہ ہیں، کم گو ہیں، بردبار ہیں، تمہیں بھی خود کو ان کے رنگ میں رنگنا ہوگا ورنہ خاندان والوں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ تمہارے بعد دو بہنیں اور بھی بیٹھی ہیں۔“

”اونہ! بلکہ میلنگ“ منتہا کے لمبے میں تلخی تھی۔

”بے چارے والدین کی مجبوری کو“ مئی نے کہا۔

”کوئی مجبوری نہیں... اچھا خیر، پھر کیا ہوا؟“

”بس پھر میں اس شوخ و شنگ لڑکی کو اپنے ماں باپ کے گھر میں چھوڑ کر تمہارے ڈیڈی کے گھر آ گئی۔ شادی کے بعد شروع شروع کے دنوں میں تو جیز اور بری کے رنگ برنگے اور زرق برق کپڑے پہنے، میک اپ بھی کیا۔ زیورات بھی پہنے مگر کچھ دنوں بعد ہی میں نے یہ سب کچھ ترک کر دیا اس لیے نہیں کہ مجھے وہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ اس لیے کہ میرے اور تمہارے ڈیڈی کے درمیان فرق بہت نمایاں نہ ہو۔ میں اپنی پسند کے برخلاف ڈل کلرز کے کپڑے پہننے لگی۔ میک اپ کا مجھے اتنا شوق ہوا کرتا تھا کہ شادی سے قبل جب خاندان کی تقریبات میں جانے کے لیے تیار ہوتی اور امی میرے اس شوق پر پابندیاں عائد کرتیں تو میں سوچتی شادی کے بعد دل بھر کر اپنا یہ شوق پورا کیا کروں گی مگر تمہارے ڈیڈی سے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میں نے جیز اور بری میں ملنے والا اپنا سارا میک اپ کا سامان ادھر ادھر بانٹ دیا۔ صرف لپ اسٹک استعمال کرتی اور وہ بھی خاص مواقع پر۔ خاندان والوں سے ملتی تو بہت لمبے لمبے انداز میں۔ وہی کزنز اور رشتے کے بہنوئی، بھانجے اور بھتیجے جن سے میرا ہنسی مذاق رہتا تھا، میں ان سے کتراتے لگی تھیں اس لیے کہ لوگوں کو کوئی فسانہ گھڑنے کا موقع نہ ملے یا تمہارے ڈیڈی کے دل میں کوئی بدگمانی نہ جڑ پکڑ جائے۔ خاندان میں شادی بیاہ کی تقریبات ہوتیں اور مجھے پہلے کی طرح ہلاکھا کرنے کے لیے کھینچنے کی کوشش کی جاتی تو میں معذرت کر لیتی۔ ایک روز میری ایک کزن نے کہا، یہ تمہیں ہوا کیا ہے، کیا سنیاں لے لیا ہے؟ میں نے کہا اب مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ وہ بولی پھر کیا اچھا لگتا ہے؟ میں نے کہا صرف ڈاکٹر صاحب۔ پھر تو پورے خاندان میں میرا جیسے ریکارڈ



لگ گیا۔ بھی فارحہ نے تو اپنے میاں کے سوا دنیا میں باقی سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ خاندان سے باہر بھی جب میں تمہارے ڈیڈی کے ساتھ کسی گید رنگ میں جاتی تو بالخصوص مردوں سے بہت تکلف اور احتیاط کے ساتھ علیک سلک کرتی صرف اس لیے کہ کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔ غرض تمہارے ڈیڈی سے شادی کے بعد میں نے ان کی ذات کو اپنی زندگی کا محور بنانے اور باقی سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی اور اکیس سال اس غلط فہمی میں گزار دیے کہ میری زندگی کی اصل حقیقت اب صرف وہی تھی مگر انہوں نے کیا صلہ دیا! "مئی کی آواز رندھ گئی" تمہارے ڈیڈی نے مجھے اپنے پرائیوں کی نظر میں بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے بھابی جان ایک روز اپنی بہن سے فون پر بات کرتے ہوئے کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا؟" منتہا نے چونک کر پوچھا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کوئی مرد اپنا ہنسا ہنسا گھر نہیں اجاڑتا۔ کوئی نہ کوئی ایسی ایسی بات دیکھی ہوگی ڈاکٹر نجیب نے فارحہ میں جو اس کو چھوڑ کر اپنی نرس کو گھر میں آباد کر لینے کو ترجیح دی۔ مرد بیاہتا بیوی کو جو اس کے تین بچوں کی ماں بھی ہو" ایسے ہی نہیں چھوڑ دیتا۔"

"ممائی نے یہ کہا!" منتہا شک کی کیفیت میں تھی۔

"ہاں.... انہیں تو میں نے کہتے سن لیا، تمہیں کیا پتا لوگوں کی نگاہیں مجھ سے کیا کچھ کہتی ہیں" مئی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولیں "تم تینوں کا خیال نہ ہوتا مجھے تو میں اس ذلت سے گزرنے کے بجائے حرام موت کو گلے لگا لیتی۔ دیکھو منتہا، آج کے بعد کبھی ایسی کوئی بات نہ کرنا جیسی تم نے آج صبح کی" مئی کی آواز میں ارتعاش تھا اور غیر معمولی لجاجت۔ اچانک انہوں نے منتہا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "تم تینوں کے سوا میرے پاس اور وہ کیا گیا ہے۔ تم بھی اگر.... خدا نخواستہ مرنے کی باتیں کرنے لگو تو تمہاری اس بد نصیب ماں کے پاس جینے کا کیا بہانہ رہ جائے گا۔"

اچانک مئی گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔

"سوری مئی.... پلیز مت روئیں۔ پلیز فار گاڈ سیک مئی.... مجھے معاف کر دیں۔"

مگر مئی روتی رہیں۔

"آئی ایم سوری.... آئی ایم ریلی سوری مئی!" مئی کو روتے دیکھ کر منتہا خود کو ایک احساسِ ندامت سے دوچار پارہی تھی "میں وعدہ کرتی ہوں مئی.... آئی پرومیس.... کہ آئندہ کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی.... کبھی ایسی کوئی بات نہیں کروں گی جس سے آپ کو تکلیف پہنچے اور آج.... اس لمحے کے بعد سے مجھے ڈیڈی جان سے رہی سہی محبت بھی نہیں رہے گی۔"

"نہیں" مئی نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

"ہاں!" اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے مئی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ناخنوں سے گوشت جدا ہوا ہے کبھی وہ تمہارے باپ ہیں۔"

"آپ بھی تو میری ماں ہیں.... یو آر گرٹ مئی! میں حیران ہوں کہ آپ اب بھی ڈیڈی جان کی طرف داری کیوں کرتی ہیں؟ وہ بے ایمان ہیں، انہوں نے آپ کی قدر نہیں کی۔"

"میرے مقدر میں یہی تھا" مئی نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"میں نے ایک میگزین میں پڑھا تھا کہ جب ہم انسان اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی یا پیش آچکنے والے کسی حادثے کی کوئی جسیٹ نکلشن نہیں پاتے تو قصور وار اپنے مقدر کو ٹھہراتے ہیں حالانکہ ہماری تقدیر تو ہماری تدبیر کے ہاتھ میں ہوتی ہے" منتہا نے مئی کی بات کی نفی کرنی چاہی۔



"غلط!" می نے کہا "ہماری تقدیر کسی تدبیر کے نہیں لوح محفوظ کے تابع ہوتی ہے۔ ہمیں اس دنیا میں جو دکھ سکھ ملنے ہیں، وہ تو روزِ اول لوح محفوظ میں ہمارے نام کے ساتھ لکھے جا چکے۔ انہیں پیش آنا ہوتا ہے اور وہ پیش آکر رہتے ہیں۔"

منتہا دھیرے سے مسکرا دی پھر بولی "اگر یہ بات ہے تو آپ میری صبح والی بات پر اتنی ڈسٹرب کیوں ہو گئیں۔ ہو سکتا ہے میری قسمت میں کسی روڈ ایکیڈنٹ کے نتیجے میں موت لکھی ہو۔" می نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ دھر دیا اور اسے شاکی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔ "آج پبلک بس سے کالج آنے جانے کا راستہ تو دیکھ لیا ہے تم نے؟" می نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی!" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔  
 "اب کل سے تو تم دونوں بہنیں خود آ جا سکتی ہوتا۔ صبح کو بس اسٹاپ تک تو میں پہنچا دیا کروں گی۔" جی ٹھیک ہے۔  
 "نیسہ کا ذرا خیال رکھنا ہو گا تمہیں" می نے مہری نیند میں ڈوبی نیسہ پر نظر ڈالی پھر دھیمی آواز میں قدرے آزر دگی سے بولیں "بہت جلدی سو گئی۔ پبلک بسوں میں سفر کی عادت نہیں ہے نا، تھک گئی ہو گی آج" می کی آواز رندھ گئی۔  
 "عادت تو ہم میں سے کسی کو بھی نہیں می!"  
 "بس اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کی بات بھی ہوتی ہے۔ گھر چھوڑنے کے بعد سے وہ ویسے بھی کافی ڈسٹرب ہے، تمہارے اور ملیب کے مقابلے میں۔"

"ویسے ہمیں گھرا تخی آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا می!"  
 "نہیں بیٹا، میرا خیال ہے ہم نے اچھا ہی کیا۔ جس شخص سے تعلق تھا جب وہ تعلق ہی کمزور پڑ گیا تو اس کی چیزوں سے کیا تعلق رکھنا۔"  
 اگلے روز پھر می ان دونوں کو بس اسٹاپ تک چھوڑنے گئیں۔ گزشتہ دن کی طرح اس روز بھی بس ملنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ منتہا نے پہلے نیسہ کو جوں توں بس میں سوار کرایا پھر بس کے دروازے پر لگے آہنی دستے کا سہارا لے کر خود بھی فٹ بورڈ پر کھڑی ہو گئی۔ می بس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک بس اسٹاپ پر کھڑی "یا حفیظ" کا ورد کرتی رہیں اور بس پر پھونکتی رہیں۔



کالج میں منتہا اور نیسہ کی دوستوں میں بہت جلد اس بات کے چرچے ہو گئے کہ دونوں بہنیں اپنی گاڑی میں کالج آنے جانے کے بجائے پبلک بس سے آ جا رہی تھیں۔ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے لڑکیوں نے ان دونوں سے بھی استفسارات شروع کر دیے۔ چند دنوں نے مختلف جیلے بہانوں سے کام لینے کی کوشش کی۔ پہلے منتہا نے اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نیسہ نے بھی ڈرائیور کے چھٹی پر اور ڈیڈی کے مصروف ہونے کا بہانہ گھڑ کر اس سے کام چلایا پھر ڈیڈی کے کسی سیمینار میں شرکت کے لیے بیرون ملک روانگی اور ان کی واپسی تک ماموں کے گھر اپنے قیام کا بہانہ تراشا مگر اہو فون کا جس نے ان کا بھرم نہ رہنے دیا۔ فون پر نیسہ کی ایک دوست کا ڈیڈی کی نئی بیوی سے رابطہ ہوا تو اس عورت نے ٹائلڈ کے استفسار پر بڑی سختی سے کہا "یہاں کوئی نیسہ ویسا نہیں رہتی۔" ٹائلڈ نے نمبر کنفرم کیا۔ یہ پوچھا کہ کیا وہ ڈاکٹر نجیب کا گھر ہی ہے اور جواب اثبات میں ملنے پر کہا۔ اگر یہ ڈاکٹر نجیب ہی کا گھر ہے تو آپ یہ کیسے کہتی ہیں کہ نیسہ یہاں نہیں رہتی۔ وہ ڈاکٹر نجیب کی بیٹی ہے جواب ملا۔ وہ اب اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ ڈاکٹر نجیب نے



دوسری شادی کر لی ہے۔

اگلے دن منشا اور نیہہ کی دوستوں ہی نہیں دوسری لڑکیوں میں بھی یہ خبر عام ہو چکی تھی۔ نیہہ کی ایک کھلنڈری سی ہم جماعت نے اسے کالج لان پر دوستوں کی بھری محفل میں رسوا کر دیا۔

”نیہہ تم تو کتنی ہو ڈیڈی باہر گئے ہوئے ہیں اس لیے تم تمہارے بہن بھائی اور می ماموں کے گھر آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں تو پتا چلا ہے کہ تمہارے فادر نے دوسری شادی کر لی ہے۔ کتنی جھوٹی ہو تم!“

نیہہ کو تو جیسے سانپ سو نگہ گیا۔ اسے لگا وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ سر جھکا تو جھکتا ہی چلا گیا۔ نظریں نیچی ہوئیں تو پھر اٹھ نہ پائیں۔ دوستوں کے اِدھر اُدھر ہو جانے کے بعد وہ بہن کی تلاش میں اٹھی تو وہ اسے کالج گراؤنڈ میں ایک سنگی تختے پر تنہا بیٹھی دکھائی دی۔

”بچو! پلیز گھر چلو“ اس نے منشا کے نزدیک پہنچ کر کہا۔  
”کیوں؟“

”میری دوستوں کو پتا چل گیا ہے کہ ڈیڈی جان نے دوسری شادی کر لی ہے۔“ نیہہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میری دوستوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے“ منشا نے مردہ سی آواز میں کہا۔

”گھر چلو۔۔۔ میں۔۔۔ میں انہیں فیس نہیں کر پار ہی ہوں۔“

”ہاں، فیس تو میں بھی نہیں کر پار ہی۔“

”تو چلو نا گھر۔“

منشا کو یوں لگا جیسے نیہہ اس کے اپنے دل کی بات کہہ رہی تھی۔

واقعی سامنا تو وہ بھی نہیں کر پار ہی تھی اپنی دوستوں کا بھی تو ان سے الگ تھلگ گراؤنڈ میں آ بیٹھی تھی۔

اس نے نیہہ کی طرف دیکھا۔

ادھ خدا یا! وہ کتنی زرد ہو رہی تھی۔

دفعۃً نیہہ کو زور کی ابکائی آئی اور وہ فے کرتے ہوئے دوہری ہو گئی۔ منشا نے اس کے ہاتھ سے کتابیں لیتے ہوئے اسے سہارا دے کر سنگی تختے پر بٹھانے کی کوشش کی۔

آٹا ٹاٹا نیہہ نیم مردہ سی دکھائی دینے لگی تھی۔

آس پاس سے چند لڑکیاں ان کے گرد جمع ہو گئیں۔

”کیا ہوا؟“

”منشا تمہاری بہن کو کیا ہوا؟“

”تھوڑا سا پانی لا دو پلیز!“ منشا نے لجاجت سے کہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں تماشا بنی ہوئی تھیں۔

ایک لڑکی لپک کر پانی لے آئی۔

نیہہ کی حالت سنبھلنے پر منشا نے اسے سہارا دے کر ہاتھ روم تک پہنچنے میں مدد دی جہاں نیہہ نے اپنی آلودہ قمیص کا دامن دھویا اور منشا اس کے قدموں میں جھک کر اس کی قمیص کا دامن دائیں بائیں اپنی چٹکیوں میں پکڑ کر کچھ دیر اسے جھٹک کر سکھانے کی کوشش کرتی رہی۔

نیہہ کی حالت کے پیش نظر منشا نے وائس پر فیل سے گھر جانے کی اجازت لی اور دونوں گھر جانے کے لیے کالج سے نکل آئیں۔ راستہ بھر نیہہ مٹی کے بت کی طرح چپ رہی اور گھر پہنچتے ہی بستر پر گر پڑی۔ منشا نے می کو ساری صورت حال بتائی تو انہوں نے نیہہ کو دھیرے دھیرے سمجھایا ”دیکھو بیٹا“ آج نہیں تو کل تمہاری دوستوں کو معلوم تو ہوتا ہی تھا اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات۔“



”وہ سب آپس میں چپکے چپکے بھی پتا نہیں کیا، کیا باتیں کر رہی تھیں۔“  
 ”دو چار دن ایسا ہو گا پھر سب اسی طرح عادی ہو جائیں گی جیسے ہم سب اپنی اس نئی زندگی کے، اس ایک کمرے کے عادی ہو گئے ہیں“ مہی کی آواز بھرا گئی۔  
 ایک دو دن نہیں کافی دنوں تک نہ سہ کو مسلسل الٹیاں آتی رہیں۔ جو چیز بھی وہ کھاتی پیتی فوراً ہی الٹ ڈالتی حتیٰ کہ سادہ پانی بھی اس کے پیٹ میں نہ ٹھہرتا۔ ممانی ناک پر کپڑا دھرے پھرتیں اور ان کی آنکھوں سے ناگواری جھانکتی رہتی۔

”توبہ! توبہ! اس لڑکی نے تو ہمارے گھر کو سنڈا اس بنادیا ہے“ وہ ماموں سے کہتیں۔  
 ”ارے بھئی! اس کے ساتھ نفسیاتی پر اہلم ہے۔ فارحہ بے چاری ڈاکٹروں کو دکھاتی تو پھر رہی ہے اسے۔“  
 ”او نہ! بے چاری!“ ممانی بڑبڑاتی تھیں۔

مہی سے ان کی بات چیت برائے نام رہ گئی۔ اپنا گھر انہیں چھوٹا سا دکھائی دینے لگا۔ گھر کا وہ کرا جو ان لوگوں کو دیا گیا تھا، اس کے انہیں مختلف ضروری استعمال سوچنے لگے۔ مثلاً بچوں کو بڑھائی کے لیے علیحدہ کمرے کی اشد ضرورت تھی۔ اسٹور چھوٹا پڑنے لگا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ مہی اور ان تینوں بھائی بہنوں کی حیثیت اس گھر میں دوسرے درجے کے شہریوں کی سی ہو گئی۔ ممانی اٹھتے بیٹھتے منگائی کا روٹا روٹیں اور جتا تیں، کمانے والا ایک کھانے والے نو اور اس تعداد میں مہی اور وہ تینوں بھائی بہن بھی شامل ہوتے۔

گھر کا کام بڑھ جانے کے خیال سے ممانی کو اپنی اسی ملازمہ سے جس کے وہ دن رات لیتے لیے رہتی تھیں بلا کی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

## میرے نسوانی حسن کا راز

# بِلوسِم بریسٹ کریم (یونانی)

قدرتی جڑی بوٹیوں پر برہنہ ہائرس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد

**بِلوسِم بریسٹ کریم جو قیمت = 150/-**

- بریسٹ کے نشوز کو سخت کر کے آئینہ دار لاتی ہے۔
- بریسٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کر کے پُر وقار شخصیت کا مالک بناتی ہے
- کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے



کمزور و آفتاب دار غماز بازار فیصل آباد  
 محلی مقیم جہول مشہور ہسپتال روڈ جہول  
 عوامی دواخانہ مین بازار مظفر آباد  
 یو پی چنار مشہور سہری کشن روڈ کوٹہ  
 دکن چنار مشہور سہری کشن روڈ کوٹہ  
 انعام ٹیسٹ محلی روڈ دران  
 سعید نیسی مشہور اندرون ٹنگٹ کٹ کوٹہ  
 دارالشفاء عین بازار شنگورہ سوات  
 ملت دواخانہ کٹہ گھر شادور  
 ممتاز ایڈمنسٹریٹو کونسل مارکیٹ میرپور بکر

ابن سینا مشہور کٹہ گھر بازار ڈیرہ غازی خان  
 حبیب دواخانہ کٹہ گھر بازار ملتان  
 الراد ہوسپتال سہری کشن روڈ کوٹہ  
 شہزاد دواخانہ کارخانہ بازار فیصل آباد  
 خانی بی دواخانہ چھوٹ بازار فیصل آباد  
 عزیز انڈسٹریز کٹہ گھر بازار ملتان  
 نگر مشہور سہری کشن روڈ کوٹہ  
 جہول ہوسپتال سہری کشن روڈ کوٹہ  
 الی انڈسٹریز بازار مارکیٹ کلاں بازار  
 ڈیرہ غازی خان

۵۰ شاہینک مشہور بازار کلاں  
 ایشان ہوسپتال سہری کشن روڈ کوٹہ  
 راجہ برادر تر قیصل بازار سیالکوٹ  
 پاکستان بزرگ مشہور کٹہ گھر بازار گل جوک سرگودھا  
 نعیم ہوسپتال مشہور کٹہ گھر بازار فیصل آباد  
 ادک شاہینک مشہور بازار ڈیرہ غازی خان  
 ایس بی بیٹس مشہور سہری کشن روڈ کوٹہ  
 شاہی دواخانہ اندرون کٹہ گھر بازار ملتان  
 بادشاہ دواخانہ کٹہ گھر بازار ملتان  
 جہول ہوسپتال سہری کشن روڈ کوٹہ

ریاض محمود ۶۹- نیو مالیک مارکیٹ شاہ عالم لاہور فون: ۷۶۶۶۲۶۳ • شاہین بی بی دواخانہ بوہڑ بازار ڈیرہ غازی خان: ۵۵۰۵۵۱۹

محمد علی دواخانہ ۱۹- اہرن شاہینک مشہور آباد اسلام آباد۔ فون: ۵۵۰۲۹۰۳ • محمد صالحین اینڈ سنز موٹی و آئیے جوک بازار ملتان فون: ۵۳۲۱۴۳۰

حکیم ایسٹڈ سنسٹری پروسسٹ بکس نمبر 2159 - کراچی۔ 74600 - پاکستان



”بے چاری ہاجرہ کو آنا تسلا بھر کر گوندھنا پڑتا ہے۔ چپائیاں توے سے اتارتے اتارتے اس کی قمیص پیسے سے بیچ جاتی ہے۔ سالن اور سبزی ترکاری بھی دونوں وقت چلی بھر کر پکانا پڑتا ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ شام کو کبھی باسی کھانا چل گیا کبھی باہر سے کھالیا، بھی نو جانوں کا کھانا تو باہر سے نہیں منگوا یا جاسکتا۔“

اور یہ اعتراضات ممانی اس کے باوجود کرتی تھیں کہ مہی بھائی کے گھر کی روٹی اپنے اور بچوں پر حلال کرنے کی خاطر دن بھر کسی نہ کسی بیچارے میں لگی رہتی تھیں اور ممانی کو خوش رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں سے ان کی اور ان کے بچوں کی جو بھی خدمت ممکن ہوتی کرتیں مگر ممانی خوش تو کیا خاک ہوتیں ان کے تین روزہ روز بگڑتے ہی چلے گئے۔ مہی نہ بہ کی طرف سے بہت پریشان تھیں۔ مسلسل الٹیوں کی وجہ سے اس کی صحت روز بہ روز خراب ہوئی چلی جا رہی تھی اور وہ کالج بھی نہیں جا پا رہی تھی۔ بالآخر مہی اسے ڈاکٹر کے مشورے پر ایک ماہر نفسیات کے پاس لے گئیں جو نہ بہ کا مسئلہ سمجھنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے مہی سے کہا ”محترمہ! آپ کی بچی خوف زدہ ہے۔ اسے اس خوف سے نکلنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب! اس کی تعلیم کا ہرج ہو رہا ہے، امتحانات سر رہیں۔“  
 ”اب جو بھی سہی۔ بچی کی اس کیفیت میں جبکہ وہ مسلسل ڈی ہائیڈریشن چل رہی ہو، آپ اس کی صحت اور زندگی کے ریسک پر تو تعلیم جاری نہیں رکھوا سکتیں۔“  
 ”پھر؟“

”آپ کو کوئی ایک نقصان تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔“  
 نہ بہ کی تعلیم داؤ پر لگا دی گئی۔  
 سالانہ امتحانات آئے اور گزر گئے۔

نہ بہ نے امتحان نہیں دیا۔ مسلسل خرابی طبع نے اسے امتحان دینے کے لائق ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا وزن بہت گھٹ گیا تھا۔ چہرے کی رونق اور شادابی جاتی رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ عموماً چپ رہتی۔ زندگی کے عام معمولات سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تین تین چار چار دن لباس تبدیل نہ کرتی۔ کئی کئی دن بالوں میں کنگھانہ کرتی۔ کمرے سے بہت کم باہر نکلتی۔ تعلیم کے حصول سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بننے کے ذکر سے اسے بیزاری محسوس ہوتی۔

مہی کی پریشانیاں روز بہ روز بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اول تو ڈیڈی نے ان کے پاس چھوڑا ہی کیا تھا۔ جوائنٹ اکاؤنٹ کی چیک بک ڈیڈی کے پاس ہوا کرتی تھی، انہی کے پاس رہی۔ قلیل نقد رقم جو ان کے اپنے پاس تھی دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئی تھی۔ نہ بہ کے علاج معالجے کے لیے انہوں نے چپ چاپ اپنے وہ زیورات جو وہ ڈیڈی کا گھر چھوڑتے وقت اپنے ہونے چھوڑے تھے اور اب انہیں چھوٹی چھوٹی ضرورتوں میں محتاجی کا احساس ہونے لگا تھا، سو انہوں نے گھر سے نکل کر ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ منتہا نے مہی کی پریشانی بٹانے کو ممانی کے محلے کے بچوں کو یوشن پڑھانی چاہی تو ممانی نے قدغن لگا دی کہ وہ اپنے گھر کو کتب نہیں بنے دیں گی۔

مہی کو بمشکل تمام ایک پرائیویٹ کمپنی میں ریسپنڈنٹ کی ملازمت ملی۔ وہ صبح کی گئی شام کو واپس لوٹتیں۔ کمپنی نے پک اینڈ ڈراپ کی جو سہولت دی، اس کا مہی نے یہ فائدہ بھی اٹھایا کہ جاتے ہوئے منتہا کو بس اسٹاپ تک چھوڑ دیتیں۔ چند دن خیریت سے گزرے پھر ممانی شام کو مہی کی واپسی پر کچھ اس قسم کی شکایات ان کے گوش گزار کرنے لگیں۔

”دیکھو فارحہ، آج تمہاری بیٹی تین بجے کالج سے واپس لوٹی ہے۔ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔“

مہی منتہا کی جانب دیکھتیں۔

”مئی“ بس دیر سے ملی تھی۔ آپ نے تو دیکھا ہے نابس یہاں سے بھی اور وہاں کالج اسٹاپ سے بھی کتنی مشکل سے ملتی ہے۔“

”کل کیوں وقت پر مل گئی تھی؟“ مئی کے بجائے ممانی جرح کرتی۔

”ممانی جان بس اتفاق کی بات ہے کبھی جلدی بھی مل جاتی ہے۔“

”سیلیوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں وقت ضائع کر کے دیر سے کالج سے نکلو گی تو بس وقت پر کب ملے گی“ ممانی کہتی۔

منہا بے بسی سے مئی کی طرف دیکھنے لگتی۔

”کیا آپ نے ممانی جان کی بات کا اعتبار کر لیا“ اس کی آنکھیں مئی سے پوچھتی۔

”کیا کریں بیٹا، وقت نے کچھ کہنے سننے کے لائق ہی نہیں چھوڑا“ مئی کی آنکھیں کہتی۔

”اور ہاں، ملیب.... وہ تو اسکول سے آنے کے بعد بغل میں کتابیں دبائے آوارہ گرد ہی پھرتا ہے۔ نوکری کرنے والی ماؤں کے بچے یونہی آوارہ ہو جاتے ہیں۔“

مئی یہ جاننے کے باوجود کے ملیب کو اس گھر میں پڑھائی کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ ملنے کے باعث انہوں نے خود ہی اس کے ایک دوست کے گھر جانے کی اجازت دے رکھی تھی اور یہ بات وہ ممانی جان کو بھی دو تین مرتبہ بتا چکی تھیں کسی بحث میں پڑنے سے گریز کرتی۔ ویسے بھی اسکول میں ملیب کی تعلیم اب مکمل ہی ہونے والی تھی۔

دفعۃً ممانی کو نیہ کا خیال بھی آ جاتا ”ایک نیہ ہے، سارا دن بیمار بنی کمرے میں پڑی رہتی ہے۔“

مئی پھر خاموشی کا مظاہرہ کرتی۔

خدا یا! کیسے مشکل اور صبر آزما دن تھے۔

منہا نماز پڑھنے کھڑی ہوتی تو اس کے آنسو نہ تھتے۔

فائل کے استقامات سے فراغت پاتے ہی منہا نے خود بھی ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔

مئی جو گھر سے باہر نکل کر ملازمت کرنے والی نو عمر اور نا تجربہ کار نوجوان لڑکیوں کے مسائل سے کافی واقف ہو چکی تھیں منہا کو کسی غیر محفوظ اور غیر یقینی صورت حال میں کود پڑنے کی اجازت دینے کے حق میں نہ تھیں۔ انہوں نے منہا کو سمجھایا کہ وہ کسی چھوٹے موٹے نجی دفتر میں ملازمت کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے عزت اور اوقات کار کے اعتبار سے مغلّی سب سے اچھا پیشہ تھا۔

”مگر مئی، پینگ میں پیسے کم ملتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں میں جاب کروں اور آپ گھر میں رہیں۔ ہم علیحدہ رہیں گے مئی۔ ماموں جان کے گھر میں ہمارا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ممانی جان کی باتیں سنتی ہیں نا آپ اور اب تو ماموں جان بھی ہم لوگوں سے یوں دور دور رہتے ہیں جیسے....“ منہا کی آواز رندھ گئی۔

مئی نے اس کا شانہ تھک کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ اس نے مئی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دوچ لیا اور

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط، کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے نیٹک (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کریں تاکہ ضیاع نہ ہو۔ ای میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔

نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط، محکمے کی بدانتظامی کے سبب ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر ممالک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)





رقت آمیز لہجے میں بولی ”ہم اپنا علیحدہ گھر بنائیں گے می! اور میں آپ کو نوکری نہیں کرنے دوں گی۔ آپ کو نہیں پتا صبح سے شام تک جب آپ گھر سے باہر ہوتی ہیں تو ہم تینوں آپ کو کتنا مس کرتے ہیں۔ خاص طور پر ملیب۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے می اور پیسے کی بھی مگر بچنگ میں پیسہ نہیں ملتا۔“

”کوئی بات نہیں، کم پیسہ سہی مگر عزت تو بہت ہے۔ جہاں تک بات ہے میرے جاب چھوڑنے کی تو حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی یہ محسوس کرتی ہوں کہ تم لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ مجھے گھر پر ہی بیٹھنا چاہیے۔ سوچتی ہوں علیحدہ رہنے کا کچھ بندوبست ہو جائے تو میں گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دوں۔ بڑی کلاسوں کے بچوں کو تو شاید نہ پڑھا سکوں کیونکہ میں نے سنا ہے ریاضی میں تبدیلی آگئی ہے، سائنس کے مضامین بھی ایڈوانس ہو گئے ہیں البتہ چھوٹی کلاسوں کو پڑھا لوں گی۔“

”بلکہ یہ کام تو ہم دونوں مل کر کر سکتے می!“ منتہا نے پرجوش لہجے میں کہا۔  
 ”ہاں۔۔۔ میرا گھر میں رہنا نہہ کی وجہ سے بھی بہت ضروری ہے۔ حالات نے سب سے زیادہ اسی کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتی ہوں۔“  
 می کو دل گرفتہ دیکھ کر منتہا کے دل پر چوٹ سی لگی۔

کبھی یہ چہرہ کیسا شاداب ہوا کرتا تھا!  
 ”آپ فکر نہ کیجئے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے می کو تسلی دی۔  
 می اسے دیکھنے لگیں۔

ان کی آنکھوں میں دیرانی دیکھ کر منتہا کا دل کٹنے لگا مگر اس نے اپنی اصل کیفیت کو چھپاتے ہوئے بظاہر مسکراتے ہوئے کی کوشش کی اور می کو یقین دلانے کو بڑے عزم اور وثوق سے بولی ”ہاں۔۔۔ آپ دیکھئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈیڈی جان کے بغیر ہم زندہ بھی رہیں گے اور خوش بھی۔“  
 می غمگین باندھے اسے دیکھے گئیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“  
 ”کچھ نہیں“ می نے اپنی آنکھوں میں امنڈ آنے والی آبی روؤں کو اس سے پنہاں رکھنے کو اس کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا کر دوسری طرف پھیر لیں۔

وہ سوچ رہی تھیں، ان کے رفیق سفر، ان کے شریک زندگی ڈاکٹر نجیب احمد جن کا کہنا یہ تھا کہ صبح جب تک وہ اپنی بیٹی منتہا کا چہرہ نہ دیکھ لیں، انہیں صبح ہو جانے کا یقین ہی نہیں آتا۔ اب نہ جانے کیونکر صبح ہو جانے کا یقین کرتے ہوں گے!

میاں اور بیوی کے رشتے پر ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا تھا۔  
 کیا کمزور رشتہ تھا!

اور  
 کس قدر بودا تعلق!

کہ ایک دوسری عورت سے تعلق جوڑنے کی خاطر ڈاکٹر نجیب نے، جو محض ان کے شوہر ہی نہیں، ان کے خمن بچوں کے باپ بھی تھے، ان سے اور بچوں سے اپنا بیس ایکس سالہ تعلق یوں توڑ لیا تھا جیسے کبھی کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔  
 محبت سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کی پُر شکوہ عمارت ایسا کی ایسے منہدم ہوئی تھی کہ اب ہر سو غبار ہی غبار تھا۔

(باقی آئندہ)

○☆○





## ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے اسٹڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قطرے زندگی کو تہنہ نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہر بڑی نگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبوں سے گدھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے چابک مسارہ ہونے کی دل گداز داستان

دوسری قسط





جلد ہی منتہا کو ایک پرائیویٹ اسکول میں جو نیر اسکول منچر کی ملازمت مل گئی۔ چھوٹا سا اسکول تھا اور اسے ابتدائی جماعتوں کو پڑھانا تھا۔ تنخواہ کم تھی اور حالات کار خاصے ناقص اور بے یقینی مگر ڈوبتے کوٹھکے کا سہارا بھی بہت۔ ممانی کے روز بروز بگڑتے ہوئے تیور متقاضی تھے کہ جلد از جلد کوئی علیحدہ ٹھکانا بنایا جائے۔

”بس مئی، اب ہمیں گھر کرائے پر لے لینا چاہیے“ منتہا نے ملازمت ملتے ہی مئی سے کہا۔

”بٹا، دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن...“

”لیکن؟“

”یہاں سو پریشانیاں ہوتے ہوئے بھی ایک سہولت تو ہے کہ میں آفس میں ہوتی ہوں تو مجھے یہ فکر نہیں ہوتی کہ تم لوگ غیر محفوظ ہو گے۔ فرض کرو جیسے تیسے گھر لے بھی لیا کرائے پر تو صبح سے شام تک میری عدم موجودگی میں تم اور نیہہ... چلو تم بھی اسکول چلی گئیں اور صلیب کا بھی کالج میں داخلہ ہو گیا تو نیہہ اکیلی کیسے رہے گی گھر میں؟“

”نیہہ اکیلی کیوں رہے گی، آپ جاب چھوڑ دیں نا!“

”میں جاب چھوڑ دوں تو گزارہ کیسے ہو گا!“

”مجھے جو تنخواہ ملا کرے گی اس سے۔“

”اول تو تمہاری تنخواہ کتنی، دوسرے پرائیویٹ نوکری کا کیا اعتبار کہ کتنے دن چلے۔“

”انشاء اللہ چلے گی اور اگر یہ نہ بھی چلی تو دوسری سہی۔“

”نوکریاں آسانی سے نہیں ملتیں۔“

”اللہ مالک ہے مئی، بہر حال گھر ہم نے لینا ہے۔“

”تنخواہ مکان کے کرائے میں دے دی تو کھائیں گے کہاں سے؟“

”ہم لوگ بھوکے رہ لیں گے مئی، مگر سہاں نہیں۔ ممانی جان کو دیکھتی ہیں.... آپ، ہم سب کے ساتھ کتنا تو ہیں آمیز روئے رکھتی ہیں۔“

”دیکھتی ہوں“ مئی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی ”لیکن فی الحال کوئی اور راستہ نہیں دکھائی دیتا۔“

”میں یوٹو سنر بڑھا لیا کروں گی مئی.... کچھ بھی کر لیں گے مئی.... کچھ بھی لیکن بس آپ یہاں سے نکلیں ورنہ اس گھر میں تو ہماری زندگی بس اسی کمرے تک رہے گی۔“

”باجی ٹھیک کہتی ہیں“ نیہہ جو اپنی بیماری کے بعد سے بہت چپ چاپ رہنے لگی تھی، بولی۔

مئی نے چونک کر اسے دیکھا۔

منتہا اپنی جگہ سے اٹھ کر نیہہ کے نزدیک جا بیٹھی اور دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے بولی ”نئے گھر میں جا کر نیہہ بھی اپنی پڑھائی دوبارہ شروع کر دے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا نیہہ!“

نیہہ کچھ پریشان سی دکھائی دینے لگی۔ پڑھائی سے اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا تھا کہ وہ اس موضوع پر کوئی بات سننے کو تیار نہ ہوتی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہے نا مئی!“ نیہہ کو پریشان ہوتے دیکھ کر منتہا اصل موضوع پر آگئی۔

”کیا؟“

”کہ آپ جاب چھوڑ دیں گی اور ہم کرائے پر کوئی چھوٹا موٹا مکان یا فلیٹ لے کر رہیں گے۔“

”ابھی نہیں۔“ مئی نے کہا۔

”کیوں؟“ منتہا کا منہ لٹک گیا۔

”صلیب کا رزلٹ آنے والا ہے۔ اسے کالج میں داخل کروانا ہو گا۔ ابھی تو پیسوں کی ضرورت ہے، خرچ کرنے کی

کہاں سے سوچیں۔"

"اس کا مطلب ہے، ہمیں اسی گھر میں رہنا ہو گا۔"

"ہمیشہ نہیں۔ اللہ سے دعا مانگو وہ ضرور وسائل پیدا کرے گا۔"

منتہا کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"با جی! یہ نے پہلے منتہا پھر می کو دیکھا اور اس کی نگاہیں دوبارہ منتہا پر آٹھریں "آپ کے اسکول میں کم از کم کتنی کوا لیفیکیشن والوں کو جاب مل سکتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے" وہ ہنسی پکارتے ہوئے بولی "اگر مجھے بھی آپ کے اسکول میں جاب مل جائے تو" اس نے می کی

جانب دیکھا "پھر تو ہم علیحدہ گھر لے سکیں گے نامی!"

می اور منتہا کی نگاہیں باہم ملیں۔

کالج چھوڑنے کے بعد پہلی بار وہ کوئی امید افزا بات کر رہی تھی۔ اس کے نفسیاتی معالج نے اس کی دوائیں بتدریج ترک کروانے کے بعد می سے کہا تھا، زندگی کے معمولات میں اس کی از سر نو دلچسپی کے لیے اس پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے بلکہ اسے از خود ان معمولات میں لوٹنے کے لیے وقت دیا جائے۔

"بالکل مل جائے گی، تمہیں بھی جاب بلکہ مجھ سے بہتر ملے گی لیکن.... پہلے تم اپنی تعلیم تو مکمل کرو۔" منتہا نے

پیارے کہا۔

"میں ابھی کی بات کر رہی ہوں با جی... فوراً... تاکہ ہم گھر لے سکیں۔ یہاں رہنا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"اللہ سے دعا مانگو... اسے گھر دیتے کیا دیر لگتی ہے۔" می بولیں۔

"اللہ کرے ڈیڈی کی بیوی مرجائے۔"

می نے بے ساختہ چونک کر نہہ کی جانب دیکھا۔

"جب وہ مرجائے گی پھر تو ہم اپنے گھر میں واپس جا سکیں گے نا؟"

"نہیں بیٹا، ہم اب اس گھر میں کبھی واپس نہیں جائیں گے" می نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ وہ ہمارا گھر ہے۔"

"تھا!" می کے لہجے میں درد آمیز تلخی تھی۔

وہ اُس شام کو بھلا کیسے بھول سکتی تھیں جب ان کے شریک سفر اور ان کے تین بچوں کے باپ نے ایک بیک ان کے قدموں تلے سے زمین اور سر سے سائبان کھینچ لیا تھا۔ وہ تو اس شام بڑی رعونت سے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ یہ میرا گھر ہے اور میری دوسری بیوی کو اس میں رہنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کے بعد کی ساری اذیت تو انہوں نے ہی سہی تھی۔ اس رات وہ ایک لمحے کو نہیں سو پائی تھیں۔ انتہائی اضطراب اور ناقابل بیان کرب کے عالم میں وہ مسلسل ایک ہی بات سوچتی رہی تھیں کہ شوہر سے ان کا رشتہ کیسا طوطا چشم رشتہ تھا کہ جس شخص کی خاطر انہوں نے اپنی جوان عمر کے تمام ارمانوں اور خواہشوں کو تھپک تھپک کر سُلا دیا تھا، اس نے ایک ایسے مقام پر آکر انہیں دھوکا دیا تھا جب ان کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کو کچھ بھی نہ رہا تھا۔ پیش نظر اگر کچھ تھا تو تین بچے! اس پوری رات منتہا بھی کبھی سوتی کبھی جاگتی، ان کی بے کلی اور اضطراب کا یہ منظر دیکھتی رہی تھی اور صبح ہوتے ہی وہ تینوں بچوں کو ساتھ لے کر اس گھر سے نکل پڑی تھیں۔ وہ شخص جس کے ساتھ وہ زندگی کے رشتے میں بندھی تھیں اس وقت گھر میں موجود تھا مگر اس نے ایک مرتبہ بھی انہیں رُٹا "یا نکالنا" روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اور اب جب کبھی انہیں اس گھر کا خیال آتو وہ خود کو چپ چاپ پُرسہ دیتیں کہ وہ گھر کبھی ان کا تھا ہی نہیں۔ اگر



ہوتا تو اس کی زمین اتنی آسانی سے ان کے اور ان کے بچوں کے پیروں تلے سے کیسے نکل جاتی، اس کی چھت یک لخت ان کے سروں سے کیوں اڑ جاتی!

”ہم اب اپنا گھر خود بنائیں گے نہ!“ می کو دل گرفتہ دیکھ کر منتہا نے بظاہر نہہ کو لیکن درحقیقت می کو دلاسا دیا۔

ڈیڈی کے گھر میں اس آخری شب می کی بے بسی اور کرب کا منظر وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ اُس شب اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ می کو زندگی میں کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑے گی۔

○☆☆○

اول دن سے منتہا نے بڑے شوق اور لگن سے کام شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑے ہی دنوں میں وہ اسکول کے بچوں میں انتہائی مقبول ہو گئی۔ صبح جب وہ اسکول پہنچتی تو چھوٹے چھوٹے بچے اپنے ہاتھوں میں نودمیدہ پھول لیے اس کے منتظر ہوتے ”گڈ مارنگ مس“ ”گڈ مارنگ ٹیچر!“ کی آوازیں اسکول گیٹ سے اسٹاف روم تک اس کے ساتھ ساتھ چلتیں۔ ننھے ننھے بچے اس سے ہاتھ ملانے کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ کلاس میں ان کی معصومانہ باتیں اور نوع بنوع شرارتیں ہر روز ایک تازگی کا احساس دیتیں۔ کبھی کبھی بچے بڑی دلچسپ باتیں کرتے۔

زسری جماعت کے بچوں کو نظم ”پاسا کوا“ یاد کرواتے ہوئے ایک بچے نے اچانک بڑی عجیب و غریب نوعیت کا استفسار داغا۔

”مس! کوا مسلمان ہوتا ہے یا ہندو ہوتا ہے؟“

وہ چونک کر سوال کرنے والے بچے کو دیکھنے لگی۔

خدا یا! یہ کس قسم کا سوال سوچھا تھا اسے۔

بچے جو اس سے ایک مصرع سننے کے بعد اسے لہک لہک کر دہرا رہے تھے اس کے چپ ہو جانے پر بغور اسے دیکھنے لگے۔

اچانک جماعت کے ایک گوشے سے ایک مٹی سی آواز ابھری ”مسلمان!“

”نو ٹیچر نو... ہندو... ہندو... کوا ہندو ہوتا ہے“ دوسری جانب سے ایک گول مٹول سے بچے نے پہلی بچی کے جواب کو رد کرتے ہوئے کہا۔

منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

اچانک ایک بچے نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے بڑی بے چینی سے کہا ”مس“ ”ہم بتائیں“ ”ہم بتائیں۔“

”چلے“ آپ بھی بتادیتے“ منتہا کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

بچہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مودبانہ بتانے لگا ”مس“ جو نسے پاکستان کے کوئے ہوتے ہیں نا وہ مسلمان ہوتے ہیں اور انڈیا کے کوئے ہندو۔“

منتہا بے ساختہ ہنس پڑی۔

بچے اسے دیکھنے لگے۔

”بات یہ ہے بچو!“ منتہا نے پوری جماعت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر اپنی دانست میں بڑے تدریس سے بچوں کو سمجھانے لگی ”کوا ہویا کوئی اور پرندہ پرندے تو بس پرندے ہوتے ہیں نہ ہندو نہ مسلمان... ٹھیک ہے نا؟“

”بس مس!“ بچوں نے حسبِ عادت کورس میں جواب دیا مگر اس کورس میں ایک آواز ابھری ”غلط... غلط!“

منتہا نے چونک کر دیکھا۔

یہ تو وہی بچہ تھا جس نے کوئے کے مسلمان یا ہندو ہونے کے بارے میں سوال داغا تھا۔

”کیا بات ہے شاید؟“ منہا نے اس سے پوچھا۔

”ٹیچر آپ کا جواب غلط ہے۔“

”اچھا!“ منہا کو حیرت بھی ہوئی اور یوں علی الاعلان اپنی تکذیب پر قدرے خفت بھی محسوس کی اس نے ”تو پھر صحیح جواب آپ ہی بتا دیجئے“ اس نے شاید نامی اس بچے سے کہا۔

سرخ دسپید رنگت اور بھوری آنکھوں والے شاہد زمان نے اتر کر اپنے ہم جماعت بچوں پر ایک نظر ڈالی پھر بولا ”ٹیچر، کوّا مسلمان ہے۔“

”اچھا! یہ بتائیے کوّا اگر مسلمان ہے تو کیوں؟“ منہا نے زیر لب مسکراتے ہوئے شاہد کو گویا آڑے ہاتھوں لے کر اپنی تکذیب کا ازالہ کرنا چاہا۔

”وہ اس لیے ٹیچر کہ کوّا جو ہے نا، گوشت بھی کھاتا ہے۔ میری امی بولتی ہیں ہندو لوگ جو ہیں نا، گوشت نہیں کھاتے۔“

واہ! کیا نکتہ بیان کیا تھا اس بچے نے!

اس کے بدلے جواب پر منہا کو یک گونہ تحیر نے آیا۔

”بات تو ٹھیک ہے شاید لیکن جو بات میں نے کہی وہ بھی غلط نہیں۔“

”نو ٹیچر، نو ٹیچر! میرا جواب ٹھیک ہے“ شاہد نے پُر زور کہا۔

”اوکے اوکے“ منہا مسکرا دی ”کسی روز ہم کوڈوں کی دعوت کریں گے“ اس میں ان کے لیے رکھیں گے گائے کے

گوشت کے شامی کباب پھر ان سے یہ سوال پوچھیں گے کہ جناب، آپ لوگ مسلمان ہیں یا ہندو۔ کیوں بچو! ٹھیک

ہے؟“ منہا نے بچوں کی سطح پر آکر ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔

”لیس مس!“ بڑی معصومیت سے کورس میں جواب ملا۔

”ٹھیک ہے شاید؟“

”لیس مس!“ بالآخر اس زیرک بچے نے بھی اپنے بچہ ہونے کا ثبوت دے ہی دیا۔

”اچھا جناب، کوٹے کے مسلمان یا ہندو ہونے کے چکر میں ہماری لظم تو درمیان ہی میں رہ گئی۔“

وہ بچوں کو پھر سے لظم یاد کروانے لگی۔

ایک	کوّا	پیا	سا	تھا
جگ	میں	تھوڑا	پانی	تھا
کوّا		لایا		کنکر
پانی		آیا		اور
کوٹے	نے	پیا		پانی
ختم	ہوئی			کمانی

اسکول میں بچوں کو مطمئن کرنے کے لیے منہا کو کبھی کبھی اپنی تمام تر عقل و ذہانت بروئے کار لانا پڑ جاتی۔

گھر میں ممانی کے تیور روز بروز زیادہ بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ نہ وہ اس وقت مطمئن ہو پاتی تھیں جب می ہاتھ

پیروں سے ان کی خدمت گزاری کی کوشش کرتی تھیں نہ اب جبکہ می حسب استطاعت گھر کے روز مرہ بجٹ میں اپنا

اور خینوں بچوں کا بار بٹانا چاہتی تھیں۔

”نہیں بھئی نہیں“ مجھے پیسوں دیسوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ نہ کرے یہ کوئی ہو ٹل تھوڑی ہے کہ قیام و طعام کا

خرچہ لے لوں“ انہوں نے اس قدر رعونت سے کہا کہ می شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔



”بھالی جان! میرا خدا نخواستہ یہ مطلب تو نہیں“ مہی نے خفیف ہو کر کہا۔  
 ”دیکھو بھئی، لگی لپٹی کی مجھے عادت نہیں۔ آخر اس گھر میں بھی تو تم گزارہ کر رہی ہو حالانکہ تم بھی تکلیف میں  
 اور ہم بھی تکلیف میں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اپنے ہی گھر میں بیٹھی رہتیں۔ نجیب احمد نے دوسری کرنی تھی، کرنی، تم  
 نے اپنا گھر چھوڑ کر بڑی غلطی کی۔ ارے گزارہ کرنے والیاں تو ایک کیا، دو دو تین تین سو تین بھی برداشت کر لیتی ہیں۔  
 یہ سوچو دو جوان بیٹیوں کا ساتھ ہے۔ اکیلی ان کے فرض کیسے ادا کرو گی اور پھر بیٹا! اللہ معافی! جب تک باپ سر پر نہ ہو،  
 لڑکوں کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں، بڑی صحبت میں پڑتے کتنی دیر لگتی ہے۔ میری ماں تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، اپنے گھر جا کر  
 بیٹھو۔ یہ نوکری دو کر یہ نہ تمہاری نہ منہا کی کچھ دینے دلانے والی نہیں... میری کھری باتیں بڑی لگیں تو میرے منہ پر  
 کہہ دیتا... سچی بات ہے، دوسرے کے گھر میں بھلا کتنے دن گزارہ ہو سکتا ہے... تم سمجھ رہی ہو نا میری بات... دیکھو  
 بھئی، گھر تو بس اپنا ہی اپنا ہوتا ہے۔“

”کبھی کبھی وہ بھی اپنا نہیں ہوتا بھالی!“ مہی کی آواز ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔  
 ڈیڈی نے تو ایسی لا تعلقی اختیار کرنی تھی جیسے کبھی کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ بچوں سے تو ان کا رشتہ اٹوٹ تھا ہی  
 مہی سے بھی رشتہ تو اب تک قائم تھا۔ خدا جانے دوسری عورت نے کیا پڑھ کر پھونک دیا تھا ان پر کہ انہوں نے پلٹ کر  
 یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی کہ بیوی بچے کس حال میں ہیں حالانکہ مہی کا میٹرک کا نتیجہ آنے پر نہ جانے  
 کیوں مہی کو امید تھی کہ وہ ضرور رابطہ کریں گے۔ مہی نے سائنس گروپ میں اے گریڈ لیا تھا اور اب ایک مقامی  
 سائنس کالج میں ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں داخلے کی تیاری تھی۔

اور مہی، ڈیڈی کی اس لا تعلقی کے باوجود مہی کو اسی گھر میں واپس جانے کا مشورہ دے رہی تھیں۔  
 بہر حال یہ طے تھا کہ بدیر نہیں جلد مہی کا گھر چھوڑنا پڑے گا۔

ڈیڈی کی لا تعلقی، ماموں کی سرد مہری اور مہی کی دل شکن باتوں پر کسی شاعر کا یہ شعر صادق محسوس ہوتا تھا۔  
 گو ذرا سی بات پر برسوں کے یار اُٹھ گئے  
 لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

ویسے بات ذرا سی تو نہ تھی۔

مہی کی برسوں کی ریاضت، اپنی ذات کی نفی، اپنے ارمانوں کی قربانی کا کیا صلہ دیا تھا ڈیڈی نے!  
 زندگی میں ایک بڑی اور غیر متوقع ڈرامائی تبدیلی نے منہا کو ڈیڈی سے بد دل اور مہی کے اتنے نزدیک کر دیا تھا کہ  
 مہی اسے اپنی زندگی کا محور و مرکز محسوس ہوتیں۔ گھر میں اور گھر سے باہر وہ ڈیڈی کا ذکر زبان پر لانے سے یوں گریزاں  
 رہتی جیسے وہ شجر ممنوعہ تھے۔ اسکول میں وہ اپنی ہی زندگی کے بارے میں شاذ ہی بات کرتی۔ بات کرتی بھی تو مہی، نیند اور  
 مہی کے بارے میں۔ ڈیڈی کا ذکر قطعاً نہ کرتی۔ کو لیگز جب بھی اس سے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کوئی بات  
 کرتیں، وہ کمال احتیاط سے کئی کترانے، ان سنی کر دینے یا نالانے کی کوشش کرتی یا پھر موضوع بدل دیتی ورنہ چپکے سے  
 ادھر ادھر ہو جاتی۔ ڈیڈی کے بارے میں تو وہ اتنی محتاط تھی کہ اس نے اسکول میں کسی کو بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شر  
 کے معروف معالج ڈاکٹر نجیب احمد کی بیٹی ہے۔ اسے اس خیال ہی سے ڈر لگتا کہ جب وہ بتائے گی کہ وہ ممتاز معالج ڈاکٹر  
 نجیب احمد کی بیٹی ہے تو اسے لوگوں کو بہت ساری وضاحتیں دینا پڑیں گی۔ بہت سی باتیں کھلیں گی۔ ڈیڈی کی دوسری  
 شادی کا قصہ کھلے گا۔ لوگ متحس ہوں گے، طرح طرح کے استفسارات کریں گے۔ ڈیڈی کی دوسری شادی اسے  
 اپنے لیے ایک شرمناک گالی محسوس ہونے لگی تھی گویا۔ وہ ہر روز یہ دعا کر کے اسکول جاتی کہ کسی ایسے شناسا کا سامنا  
 نہ ہو جو اسے ڈیڈی کے حوالے سے جانتا ہو۔ اپنی ذاتی زندگی کے ارد گرد وہ ایک فسیل کھڑی کر چکی تھی جس کی بلندی  
 ہر روز گزشتہ دن سے زیادہ اونچی ہو جاتی۔ اس فسیل کے بیچ وہ خود تھی، مہی تھیں، نیند اور مہی کے مگر ڈیڈی اس

فصیل کے باہر کہیں تھے اور انہیں اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔  
 نجی زندگی کے بارے میں اس کے غیر معمولی محتاط رویے کے باعث اس کی اکثر ساتھیوں نے اسے "میس  
 پراسرار" کہنا شروع کر دیا تھا۔ بعض اس کے پیٹھ پیچھے کہتیں اور بعض سامنے کہنے سے بھی گریز نہ کرتیں۔ وہ ان کی  
 باتیں چپ چاپ لی جاتی۔ تاہم ذاتی زندگی کے بارے میں اس غیر معمولی محتاط رویے سے قطع نظر اپنے فرائض منصبی  
 کی تندہی، دیانت داری اور لگن سے انجام دہی کے باعث نہ صرف اس کی ساتھیوں بلکہ پرنسپل اور اسکول انتظامیہ کی  
 رائے اس کے بارے میں خاصی اچھی تھی۔ ساتھیوں میں یوں تو اس کی سب ہی سے اچھی علیک سلیک تھی مگر  
 مسز ظہیر نامی ایک سینئر ٹیچر غیر محسوس طریقے پر اس کے بہت قریب آگئی تھیں۔  
 ایک روز باتوں باتوں میں مسز ظہیر نے اس سے کہا "میس منتہا، ہم نے اور باقی کونیکز نے بھی ایک بات نوٹ کی ہے  
 کہ آپ سے جب بھی کوئی پرسل بات کی جائے، آپ ٹال جاتی ہیں آخر کیوں؟"  
 وہ سن رہی تھی۔

مسز ظہیر نے براہ راست سوال کر ڈالا تھا۔  
 "ایسی تو کوئی بات نہیں مسز ظہیر!" اس نے کہا۔  
 "آپ اب بھی ہمیں ٹالنے کی کوشش کر رہی ہیں" مسز ظہیر بولیں "ہماری عمر آپ کی عمر سے ڈھائی گنی اور عملی  
 زندگی کے بارے میں ہمارا تجربہ آپ کی عمر کے ڈیڑھ گنا ہے۔ اکٹھے کام کرنے والے لوگ ایک فیملی کی طرح ہوتے  
 ہیں اور جب فیملی کے افراد کو ایک دوسرے کے دکھ درد کا پتا چلتا ہے تو اسے بٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ ہم پر  
 اعتماد کر سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہم آپ کے کچھ کام آسکیں۔"  
 "تھنک یو ویری مچ، مسز ظہیر! ایسی کوئی بات نہیں۔"  
 "چلتے مان لیتے ہیں" مسز ظہیر دھیرے سے مسکرائیں "کسی روز آپ ہمیں اپنی والدہ سے تو ملوائیں۔"  
 "مئی... وہ... وہ تو جاب کرتی ہیں۔"  
 "کیا جاب کرنے والی خواتین کسی سے ملتیں نہیں؟" مسز ظہیر کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔  
 ان کی مسکراہٹ نے اسے ہڑبڑادیا۔  
 "یہ بات نہیں۔"

"تو پھر جو اصل بات ہے وہ کہہ ڈالیں۔"  
 مسز ظہیر کی گہری نگاہوں کی تاب نہ لا کر منتہا نے نظریں مچھالیں۔  
 "ہم نے کہا نا، جتنی آپ کی عمر ہے ہمارا تجربہ اس سے ڈیڑھ گنا ہے۔ مدتیں گزر گئیں، بچوں بچیوں کو پڑھاتے۔  
 ہم تو لڑکیوں کی آنکھوں سے ان کے دل میں جھانک لیتے ہیں۔"  
 منتہا کا جی چاہا، کسی ایسی جگہ جا چھپے جہاں مسز ظہیر کی درون بین خوفناک نگاہیں اس تک نہ پہنچ سکیں۔  
 "تو پھر کب ملواری ہیں آپ ہمیں اپنی والدہ سے؟"  
 "جی... میں... میں مئی سے کہوں گی۔"  
 "کیا کہیں گی؟"  
 "پوچھوں گی ان سے کہ... وہ کب مل سکتی ہیں۔"  
 "ہم ان کے جواب کا انتظار کریں گے میس منتہا!"  
 منتہا دن بھر خاصی پریشان رہی اور شام کو جب مئی دفتر سے واپس لوٹیں تو اس نے پہلی فرصت میں یہ قصہ انہیں  
 سنا دیا۔



"اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت" می سارا قصہ سن کر بولیں "کسی روز بلاوا نہیں۔"

"یہاں؟ منتہا نے چونک کر می کو دیکھا۔

"تو پھر کہاں؟"

"انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم اپنے گھر میں نہیں رہتے۔"

"تو کیا فرق پڑے گا؟"

"پڑے گا۔"

"کیا؟"

"اوہو! آپ سمجھتی کیوں نہیں می.... وہ یہاں آئیں اور.... ممانی جان نے کوئی ایسی بات کر دی جس سے انہیں پتا چل گیا کہ ڈیڈی...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ڈیڈی نے دوسری شادی کر لی ہے اور ہم لوگ ان سے الگ ہو گئے ہیں" می نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی۔ اس نے چونک کر می کو دیکھا۔

"اگر انہیں پتا چل گیا تو کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔ اس دنیا میں.... نہ جانے کتنے لوگوں کی یہی کہانی ہے۔"

منتہا چپ چاپ نمٹکی باندھے می کو دیکھے گئی۔

می نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور اسے بہت آہستگی سے پھتکتا ہوتے ہوئے بولیں "تم شرمندہ اور خوفزدہ کیوں ہوتی ہو۔ شرمندہ تو انہیں ہونا چاہیے جنہوں نے تمہاری خوشیاں چھین کر تمہیں اتنا خوف زدہ کر دیا کہ تم اپنے ہی جیسے انسانوں سے ڈرنے لگی ہو" می نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولیں "میں مسز ظہیر سے ضرور ملنا چاہوں گی۔"

"اور انہیں ڈیڈی کے بارے میں بھی بتا دیں گی؟"

"اگر انہوں نے پوچھا تو۔"

منتہا تشویش میں مبتلا دکھائی دینے لگی۔

"ایزی! ایزی بیٹا.... ہم.... بھلا کیوں ڈریں.... طوفان اٹھا.... بہت شدید تھا، ہم ڈوب بھی سکتے تھے مگر.... ہم نے ہاتھ پاؤں مارے۔ اور زندگی سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ہم زندہ رہنے کی کوشش کر رہے ہیں بیٹا، اور انشاء اللہ رہیں گے اور تم دیکھنا بہت سے اچھے لوگ ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

منتہا نے بے یقین نگاہوں سے می کو دیکھا۔

"ہاں بیٹا! می نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی پھر دھیمے سُر میں بولیں "تم نیکہ کی طرح کمزور مت پڑ جانا۔ تم سے تو مجھے طاقت ہے.... ہاں بیٹا!"

"تم سے تو مجھے طاقت ہے۔"

می کے ان الفاظ نے جادو کا کام کیا۔

اسے اپنے وجود اور روح میں ایک غیر مرئی سی قوت کے سراپت کر جانے کا احساس ہوا۔

○☆☆○

اس نے می کی مسز ظہیر سے ملاقات کروادی لیکن ماموں کے گھر پر نہیں بلکہ مسز ظہیر کے گھر پر۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ می نے انہیں ڈیڈی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

مسز ظہیر سے اسکول میں روزانہ ملاقات اور گھر پر ملنے میں منتہا کو کچھ ویسا ہی فرق محسوس ہوا جیسے کسی فرد کی تصویر کو اس کے پس منظر سے علیحدہ کر کے دیکھنے اور اس کی تمام ترجزئیات اور پس منظر سمیت دیکھنے میں۔

مسز ظہیر اعلیٰ خاندانی پس منظر کی حامل ایک باوقار اور انتہائی ملنسار خاتون تھیں۔ ان کے شوہر کسی دماغی عارضے کے باعث برسوں سے صاحب فراش اور بے روزگار تھے۔ ان کے چار بچے تھے، دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ چاروں زبردستی تعلیم، گھر کی معیشت تنہا مسز ظہیر کے شانوں پر تھی۔ اسکول میں ملازمت کے علاوہ انہوں نے گھر کے ایک حصے میں دستکاری اسکول کھول رکھا تھا جہاں سہ پہر سے رات تک کلاسیں ہوتیں۔ می سے مسز ظہیر کے بیان کے مطابق یہ دستکاری اسکول ان کے لیے ایسا کماؤ پوت تھا جس کے سہارے وہ اپنے شوہر کی علالت کا بڑے تحمل سے سامنا کرنے کے ساتھ مردانہ وار گھر کی گاڑی بھی کھینچ رہی تھیں۔ مسز ظہیر کے دستکاری اسکول میں خواتین کو مختلف قسم کی دستکاریاں بھی سکھائی جاتیں اور آرڈر پر سلائی کڑھائی اور بنائی کا کام بھی کیا جاتا۔ مسز ظہیر نے اپنا دستکاری اسکول می اور منہا کو دکھاتے ہوئے می کو بتایا ”یہ اسکول صرف ہمارے لیے ہی آمدنی کا ذریعہ نہیں بہت سی ضرورت مند بچیاں اور عورتیں یہاں کام سیکھ کر آرڈر پر کام کرتی اور روزی کماتی ہیں۔“

”مسز ظہیر، آپ صبح سے شام تک بڑی رہتی ہوں گی تھک نہیں جاتیں؟“ منہا نے پوچھا۔ وہ بڑے مدبر سے مسکرا دیں۔

”پیٹ خالی اور دماغ پریشان ہو تو آدمی ٹھکتا ہی نہیں، ادھ موا ہو جاتا ہے۔ کام کی تھکن اس ادھ موئے پن سے بہتر ہوتی ہے۔“

کھانے کا وقت تھا، مسز ظہیر نے می اور منہا کو کھانا کھائے بغیر رخصت ہونے کی اجازت نہ دی۔

کھانا نہایت سادہ تھا اور دسترخوان پر افراد خانہ کے علاوہ می اور منہا سمیت پانچ خواتین اور تھیں جن میں سے دو سلائی اسکول میں اجرت پر کام کرنے والی عورتیں تھیں اور ایک مسز ظہیر کی کوئی شناسا جو ان سے ملنے کے لیے آئی تھیں اور مسز ظہیر نے انہیں بھی زبردستی کھانے پر بٹھالیا تھا۔

”کھانے کا وقت ہو تو باجی آنے والے کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیتیں“ سلائی اسکول میں کام کرنے والی خواتین میں سے ایک نے کہا۔

”اور باجی کے ہاں رزق میں اللہ نے اتنی برکت دے رکھی ہے کہ کھانے کے وقت جو بھی آجائے یہ زبردستی کھانا کھلاتی ہیں اور کھانا کم نہیں پڑتا۔“ دوسری نے کہا۔

”ہم کھلانے والے کون سرور خاتون، اللہ کھلاتا ہے اور وہی برکت دیتا ہے“ مسز ظہیر نے بڑے نیاز مندانہ انداز میں کہا۔

کھانے کے بعد مسز ظہیر نے ایک مرتبہ پھر چائے پلائی۔ ڈھائی تین گھنٹے ان کے ساتھ گزار کر می اور منہا رخصت ہونے لگیں تو مسز ظہیر نے منہا سے کہا ”آپ کی والدہ ہمیں بہت اچھی لگی ہیں۔“

”شکریہ!“ می نے کہا ”اصل میں آپ خود بہت اچھی ہیں۔“

”ایک ریکونسٹ ہے آپ سے“ منہا نے قدرے ہلکے پھلکے ہوئے کہا۔

”ہاں، کئے؟“

”می نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے، اسکول میں دوسری لچر سے ذکر نہ کیجئے گا۔“

مسز ظہیر نے بڑی اپنائیت سے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولیں ”آج کے بعد تم یہ سمجھو کہ ایک ای تمہارے گھر ہیں اور ایک امی اسکول میں جو کہ ہم ہیں۔“

منہا کو ان کے لہجے میں اک عجیب سی ٹھنڈک اور حلاوت محسوس ہوئی۔

اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر کے انہوں نے گویا تکلف کی آخری دیوار بھی گرا دی تھی۔

”جو لوگ ہمیں جانتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہم بہت اچھے رازداں ہیں“ مسز ظہیر نے مزید کہا۔



منتہا کو اور اطمینان ہوا۔  
 مسز ظہیر اسے اور می کو رخصت کرنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے تک آئیں اور انہوں نے می سے کہا ”گو  
 ہم کسی لائق تو نہیں لیکن اگر کبھی کسی معاملے میں ہماری ضرورت ہو تو آپ تامل نہ کیجئے گا۔“  
 ”شکریہ!“ می نے کہا۔

”اور ایک مشورہ بھی ہے ہمارا آپ کے لیے۔“

می ٹھنک گئیں۔

”بچوں کے سلسلے میں آپ کی دہری ذمہ داری ہے۔ کچھ ایسا طریقہ کیجئے کہ آپ صبح سے شام تک گھر سے باہر نہ  
 رہیں۔“

”مجبوری ہے“ می نے کہا۔

”ہاں، وہ تو ہم جانتے ہیں لیکن گھر پر بیٹھ کر اگر کچھ تنگی ترشی سے گزارا ہو جائے تو وہ اس فراغت سے بہتر ہے جو  
 ماں کے گھر سے باہر رہنے پر میسر آجائے۔“

می نے قدرے خیر سے انہیں دیکھا اور ہچکچاتے ہوئے بولیں ”معاف کیجئے گا“ آپ خود بھی تو ملازمت کرتی  
 ہیں۔“

”ہماری عدم موجودگی میں بچوں کے والد گھر پر ہوتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ اپنی بیماری کے باوجود بچوں کو وہ  
 خوب تحفظ دیتے ہیں۔“

”سچی بات یہ ہے مسز ظہیر کہ میں بھی اپنے بچوں کو سمیٹ کر ہی بیٹھنا چاہتی ہوں۔ دعا کیجئے کہ خدا امیری مشکلیں  
 آسان کرے“ می نے کہا۔

”انشاء اللہ! ضرور آسان ہوں گی۔“ مسز ظہیر بولیں۔



مسز ظہیر اور می کی ملاقات نے مسز ظہیر اور منتہا میں اور زیادہ قربت پیدا کر دی بلکہ وہ تو جیسے اسکول میں منتہا کی  
 کیئر ٹیکر بن گئیں۔ ایک روز تو انہوں نے منتہا کو ”پراسرار“ کہنے والی ایک ساتھی لہجہ کو باقاعدہ ڈانٹ پلا دی۔ منتہا  
 اس وقت اسٹاف روم میں نہ تھی۔

”یہ آپ لوگ کیا ہر وقت پراسرار پراسرار کہتی رہتی ہیں منتہا کو۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی ہے۔ آپ  
 لوگوں کی طرح کپڑوں، زیور، میک اپ اور نئے فیشن کی باتوں میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ ہم اس کے گھر والوں سے ملے  
 ہیں۔ اچھے شریف لوگ ہیں۔“

”آپ ملی ہیں؟“

”ہاں۔“

”تو اتنی ریزرو کیوں رہتی ہے وہ؟“

”اس کی مرضی، بعض لڑکیاں ہا ہو پسند نہیں کرتیں۔“

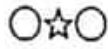
”خیریت تو ہے مسز ظہیر، بڑی طرف داری کر رہی ہیں آپ اس کی؟“ مسز واجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

مسز ظہیر بھی کب دبنے والی تھیں۔

”اطمینان رکھئے مسز واجد، ہمارے دلوں بیٹے ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ ہو سکیں تلاش کرنا نہیں شروع کی ہیں ابھی ہم  
 نے۔“

”ہوئیں نہ سہی، بھالی کی تلاش میں تو ہیں۔ ہم نے سنا ہے آپ اپنے سب سے چھوٹے اور آخری بھائی کے لیے

لڑکیاں دیکھ رہی ہیں آج کل؟“ مس مہر النساء چمکیں۔  
 ”کیا غضب کرتی ہیں، بھائی کے لیے تو ہم آپ پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ بتائیے کب آئیں آپ کے گھر؟“  
 اسٹاف روم میں زور کا تقہ پڑا۔  
 مس مہر النساء دم بخود رہ گئیں۔



سالانہ امتحانات نزدیک آئے تو منتہا سے کئی لوگوں نے اپنے بچوں کو یوشن دلوانے کے سلسلے میں رابطہ کیا۔  
 ماموں کے گھر بچوں کو بلانے کا سوال نہ تھا۔ ممانی پہلے ہی قدغن لگا چکی تھیں اور یہ می کو روانہ ہوا کہ وہ بچوں کو  
 پڑھانے کے لیے گھر گھر جائے۔ مس ظہیر سے اب وہ ہر مسئلے پر بلا جھجک بات کر لیتی تھی۔ اس مسئلے پر بات ہوئی تو  
 انہوں نے کوئی احسان دھرے بغیر کمال خوبی سے اس مسئلے کا حل اس کے سامنے رکھ دیا۔  
 ”دیکھو بھی، ضرورت تو ہمیں بھی ہے اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے کسی لیڈی ٹیوٹر کی، اگر تم چاہو تو ہمارے گھر پر تم ان  
 بچوں کو بھی پڑھانے کے لیے بلا سکتی ہو جو تم سے یوشن لینا چاہ رہے ہیں۔“  
 اس نے می سے بات کی اور اجازت لے لی۔

ایک بچی مس ظہیر کی اور پانچ بچے دوسرے جنہیں ان کے گھر والے مقررہ وقت پر پہنچا دیتے اور یوشن کا وقت ختم  
 ہونے پر لے جاتے۔ مس ظہیر نے ان کی نشست و برخاست کا خاطر خواہ انتظام کر دیا تھا۔ اپنی بیٹی کی یوشن فیس انہوں  
 نے پیشگی اسے ادا کر دی۔

مس ظہیر سے ان کی بیٹی کی فیس لیتے آئے بہت شرم آئی۔ انکار بھی کیا مگر انہوں نے پیسے زبردستی اس کی مٹھی میں  
 دبا دیے اور بولیں ”ارے بھئی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ استاد کا تو برا حق ہوتا ہے۔ ہم تمہارا پورا حق تو ادا نہیں کر سکتے  
 بلکہ سچ پوچھو تو عشر عشر بھی نہیں۔“  
 ”پلیز، مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”شرم کی کیا بات! آخر ہم بھی اسکول میں پڑھانے کا معاوضہ لیتے ہیں کہ نہیں۔“  
 ”آپ رہنے دیجئے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایک پرانی کمات ہے کہ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کہاں سے....“  
 مطلب سمجھیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

مس ظہیر مسکرا دیں۔

”مطلب یہ کہ گھوڑے کی خوراک گھاس ہے، اگر وہ گھاس سے دوستی کر لے اور مردوتا اسے نہ کھائے کہ اس سے تو  
 میری دوستی ہے تو بے چارہ بغیر کھائے زندہ کیونکر رہ پائے گا۔ دیکھو، ویسے تو درس و تدریس مشنری کام ہے۔ ایک طرح  
 کی عبادت ہے لیکن استاد بے چارے کے ساتھ بھی تو پیٹ لگا ہے۔ زندگی کی دوسری ضرورتیں اس کے ساتھ بھی  
 ہیں۔ لہذا اپنی محنت کا معاوضہ لینے میں کبھی شرم محسوس نہ کرنا ورنہ یہ سمجھ لو کہ اس معاشرے میں لوگ ایک  
 دوسرے کا استحصال کرنے میں ذرا مروت نہیں دکھاتے اور بے چارہ استاد اسے تو لوگ کسی شمار ہی میں نہیں رکھتے۔  
 ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ تم خود تو نہیں کہو گی باقی بچوں کے والدین سے بھی ہم ہی کہہ سن کر ایڈوانس فیس دلوائیں گے  
 تمہیں۔“

”ایڈوانس کی.... کیا ضرورت ہے مس ظہیر!“

”ابھی تمہارا تجربہ بہت کم ہے۔ ایڈوانس کی ضرورت اس لیے ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ مہینہ بھر



بچے کو پڑھا کر گھر بٹھالیتے ہیں اور فیس ہڑپ!“  
 نیوٹن کے لیے آنے والے دوسرے بچوں کے والدین سے بھی مسز ظہیر نے اسے پیشگی ادائیگی کروادی۔  
 بچوں کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

اسکول سے چھٹی کے بعد وہ بھاگ بھاگ گھر پہنچتی۔ نماز کے بعد جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہو کر مسز ظہیر کے گھر چلی جاتی۔ تین بجے سہ پہر سے بچے آنا شروع ہو جاتے۔ پڑھاتے پڑھاتے سات آٹھ بج جاتے۔ رات کو گھر واپسی ہوتی۔

ممائی نے اعتراضات شروع کر دیے۔ پہلے دبی زبان میں پھر واشگاف۔  
 ”جوان لڑکی رات کو گھر لوٹتی ہے۔ اس پاس لوگ دیکھتے ہوں گے تو کیا کہتے ہوں گے کہ کہاں سے آتی ہے لڑکی رات کو؟“

”ممی! پلیز بہت ہو چکا، بس اب یہ گھر چھوڑ دیں۔ مجھے اور نیوٹن شرمیل جائیں گی مگر خدا کے واسطے یہاں سے چلیں“  
 منتہا ممی سے کہتی۔

نیہہ اور ملیب نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بیٹا، نیوٹن ہوائی روزی ہے۔“

”ممی! ہم محنت مزدوری کر لیں گے، مسز ظہیر کے سلائی اسکول میں کوئی کام کرنے لگوں گی میں۔“  
 ”بٹن تک تو ٹانگنا نہیں آتا۔“

”یکھ لوں گی بس آپ یہاں سے نکلیں۔“

”ہاں، میں بھی سلائی سیکھ لوں گی“ نیہہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔

ممی مذہذب دکھائی دینے لگیں۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“ منتہا نے پوچھا۔

”ڈرتی ہوں بیٹا کہ یہاں سے نکل کر میں اکیلی تم تینوں کے ساتھ کیسے رہوں گی؟“

”ڈرنے کی کیا ضرورت، میں جو ہوں“ ملیب نے کہا۔

”جیتے رہو، خدا تمہیں لمبی عمر دے اور بہت ترقی پاؤ“ ممی نے اسے پیار سے دیکھا۔

”اگر آپ اکیلے رہنے سے ڈرتی ہیں تو یہ سوچئے کہ جن عورتوں کے شوہر مر جاتے ہیں آخر وہ بھی تو اکیلی رہتی ہی

ہیں۔“

منتہا کی اس بات پر ممی نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔

زندگی کے ایک تلخ تجربے نے ان بچوں کو جو فاسٹ فوڈز، آئس کریم اور اپنے پسندیدہ ڈراموں اور گلوکاروں کی باتیں کیا کرتے تھے، کتنی بڑی بڑی باتیں سکھادی تھیں۔

”ممی جان! اپنا علیحدہ گھر ہو گا تو ہم رات کو بارہ بجے تک بھی کام کریں گے تو کوئی اعتراض کرنے والا نہ ہوگا!“  
 نے پھر کہا۔

”سوال یہ ہے کہ گھر کہاں لیں؟“

”گھروں کی کوئی کمی ہے؟“

”کمی تو نہیں مگر ہمیں اپنی چادر دیکھنی ہوگی۔“

”مسز ظہیر بڑی ہیلپ فل خاتون ہیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔ وہ ضرور مدد کریں گی“ منتہا کی آنکھوں میں  
 اک امید افزا چمک تھی۔

مزنظیر سے منہا کے کہنے کی دیر تھی، انہوں نے تو گویا مکان کی تلاش کے لیے ہر کارے دوڑا دیے۔  
عجیب خاتون تھیں۔

اپنی زندگی کی تمام تردداتوں اور مسائل کے باوجود دوسروں کے دکھ دے، درے، سنے بٹانے کو ہمہ وقت تیار۔  
منہا کے لیے تو وہ جیسے ”گاؤدر“ بن گئی تھیں۔

انتہائی سوشل خاتون تھیں۔ اپنے علاقے میں ان کے وسیع سماجی مراسم تھے۔ ان کی ہمدردانہ فطرت اور مفساری  
کے باعث نہ صرف گھر میں ملنے جلنے والوں کی آمد و رفت جاری رہتی بلکہ جب وہ گھر سے باہر نکلتیں تو ہر دوسرا فرد ان کا  
شنا سنا نکلا۔

”السلام علیکم مزنظیر!“

”آداب مزنظیر!“

”کیسی ہیں مزنظیر؟“

”گھر میں سب خیریت مزنظیر؟“

”اسکول کیسا جا رہا ہے؟“

”چھٹیاں کب ہو رہی ہیں؟“

”آپ کے اسکول میں بچی کا داخلہ کواٹا ہے۔“

”آپ کے سلائی اسکول میں نئی کلاسیں کب شروع ہو رہی ہیں مزنظیر؟“

”مزنظیر صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ارے مزنظیر، ہماری چھوٹی کے لیے کوئی رشتہ تو بتائیے۔“

مزنظیر خواہ اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی ہو تیں یا اسکول کی چھٹی کے بعد تھکی ماندی گھر واپس لوٹ رہی  
ہو تیں، شاپنگ کے لیے بازار پہنچنے کی جلدی ہوتی یا کسی عزیز رشتے دار کے ہاں جا رہی ہو تیں، راہ میں ملنے والے اپنے ان  
شنا ساؤں سے بڑی خندہ پیشانی سے علیک سلیک کرتیں، ان کی خیریت پوچھتیں، ان کے سوالوں کے جواب دیتیں، ان  
کے مسائل سنتیں، انہیں مشورے دیتیں۔ ان کے دکھ سکھ سنی آگے بڑھتی جاتیں۔  
ہست و سبغ تھا ان کا حلقہ احباب!

مزنظیر کے بچے ان کے احباب کی کثرت پر کبھی کبھی بیزاری کا اظہار کرنے لگتے۔

”ادو، امی یہ کیا ہے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی آپ سے ملنے کے لیے آتا رہتا ہے“ بچے ناگواری سے کہتے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ مزنظیر بچوں کے ساتھ کہیں باہر جانے کو تیار ہو تیں اور کوئی ملنے والا اچانک کبھی محض  
ملاقات ہی کے لیے اور کبھی اپنے کسی مسئلے کے ساتھ آدھمکتا تو مزنظیر باہر جانا ملتوی کر دیتیں اور اس کی سننے بیٹھ  
جاتیں۔ بلکہ چائے کا وقت ہوتا تو چائے بھی پلا دیتیں۔ بچے جو ساتھ جانے کو تیار کھڑے ہوتے کبھی آنے والے کی  
کرسی کے نیچے یا صوفے کے پیچھے نمک لاکر ڈال دیتے اور اپنے اس ٹوکے کا اثر دیکھنے کو بے تاب دکھائی دینے لگتے،  
کبھی مزنظیر کے کان میں بار بار کہتے ”امی چلے نا۔“

مگر امی بڑے اطمینان کے ساتھ آنے والے کی باتیں سننے جاتیں اور ضرورت محسوس کرتیں تو مفت مشورے بھی  
دیے جاتیں۔ بسا اوقات آنے والا اتنی دیر میں اٹھتا کہ اگر کسی تقریب میں جانے کی تیاری ہوتی تو اس کا وقت نکل  
جاتا۔ بچے کپڑے تبدیل کر کے منہ لٹکا کر بیٹھ جاتے۔ مزنظیر سے باقاعدہ خفا ہو جاتے۔

”ارے بیٹا، ہم کیا کریں۔ لوگ کسی امید کے ساتھ ہی ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ان کی



بات سن لیں، اگر بات بھی نہ سنیں تو اللہ میاں کو کتنا برا لگے گا۔ آخر ہم بھی تو دن بھر میں کتنی مرتبہ وقت بے وقت اللہ میاں کو اپنی سناٹے ہیں۔“

”امی، آپ تو بس کوئی ادارہ کھول لیں“ بڑی بیٹی بھلا کہتی۔

”کھول تو رکھا ہے“ مسز ظہیر مسکرا دیتیں۔

بازار جانا ہوتا تو مسز ظہیر سودا سلف اٹھانے کے لیے لڑکوں کو ہمراہ لے جاتیں۔ دونوں ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ ”نہ بابا نہ“ امی کے ساتھ جانے کا مطلب ہے، دس منٹ کا کام تین گھنٹے میں۔ یہاں سے وہاں تک لوگ انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں کہ مسز ظہیر کب گھر سے نکلیں۔“

”بیٹا، یہ عزت اور محبت بھی کسی کسی کو قسمت سے ملتی ہے“ مسز ظہیر کہتیں۔

مسز ظہیر کے بعض عقیدت مندوں کا خیال یہ تھا کہ اگر انہوں نے سیاست میں دلچسپی لی ہوتی تو اب تک قومی اسمبلی میں ضرور پہنچ چکی ہوتیں۔

جبکہ اس کے برخلاف بعض نیاز مندوں کی نیاز مندانہ رائے یہ تھی کہ پانچ سالہ مدت مسز ظہیر کے شایان شان نہیں، وہ تو آجیات تنظیم کے لائق تھیں۔

مسز ظہیر کا حلقہ احباب وسیع تو تھا ہی متنوع بھی بہت تھا۔ امیر، غریب، جاہل، تعلیم یافتہ، خاندانی، غیر خاندانی، غنی، محتاج، بخی، سوس، دکھی، سکھی، عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے، شیعہ، سنی، غرض ہر قسم کے لوگ ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ ایسے بھی تھے جو ضرورت مندوں کی مدد کرنا چاہتے، ایسے بھی تھے جو مدد کے طلب گار ہوتے۔ مسز ظہیر ایک سے لیتیں، دوسرے کو دیتیں۔

جب سے منہانے ٹیوشن کے لیے ان کے گھر آنا جانا شروع کیا تھا، مسز ظہیر کے حلقہ احباب کا یہ تنوع روز بہ روز اس پر آشکار ہوتا چلا گیا تھا۔ ان کے شوہر کی وہ ہر روز مزاج پر سی کرتی اور ان کے بچوں سے اس کی بدترتیب بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ان کے خاندان والوں کے لیے وہ اجنبی نہ رہی تھی۔ ان کا حلقہ احباب اس سے آشنا ہو چکا تھا۔ مسز ظہیر کی سب سے بڑی خوبی ان کی زندہ دلی تھی۔ وہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھتیں۔ خراب سے خراب حالات میں بھی نہ جھنجھلاتیں، نہ اپنے اوپر یا سیت طاری ہونے دیتیں۔

ان کا فلسفہ زندگی یہ تھا کہ خود بھی خوش رہو اور جو اور دوسروں کو بھی خوش رہنا اور جینا سکھاؤ۔ ہر ایک اینڈ پر وہ بچوں کو بڑے اہتمام سے کسی تفریح گاہ یا کسی نئی فلم کے میٹنی شو میں لے جاتیں۔ ایسے مواقع پر ظہیر صاحب کی دیکھ بھال مسز ظہیر کے گھر میں عرصہ دراز سے رہنے والے لاوارث اور بے سروسامان ”گن میاں“ کرتے اور اس روز جی بھر کر خود بھی چائے پیتے اور ظہیر صاحب کو بھی پلاتے۔

مہمانے مناسب کرائے پر مکان کی تلاش میں مسز ظہیر کی مدد چاہی تو انہوں نے ایک دو نہیں دس آدمی اس کام پر لگا دیے۔ نتیجتاً ایک نہیں کئی مکان اور فلیٹ فہرست میں آ گئے۔

مسز ظہیر کی رائے یہ تھی کہ مکان، اسکول کے آس پاس لیا جائے تاکہ آنے جانے کی دقت نہ ہو۔ کرایہ آمدورفت بچے اور ٹیوشن کے لیے بچے آسانی سے اس کے پاس آجاسکیں۔

مسز ظہیر کی اس مخلصانہ رائے سے قطع نظر مئی اور مہتاب کے نقطہ نظر سے ضروری یہ تھا کہ مالک مکان زبردستی کم سے کم لے یا بالکل ہی طلب نہ کرے۔

بالآخر مسز ظہیر کے جاننے والوں میں ایک ایسا ہی مکان مل گیا۔ مالک مکان اپنے روزگار کے سلسلے میں اہل خانہ کے ساتھ بیرون ملک مقیم تھے۔ مکان اسکول سے پیدل کے راستے پر اور مارکیٹ سے بہت نزدیک تھا۔ مالک مکان ایک حصہ مکان میں کسی مختصر فیملی کو کرایہ دار رکھنا چاہتے تھے اور کرائے سے زیادہ دلچسپی انہیں اس امر سے تھی کہ گھر

میں رہنے والے لوگ گھر کو اپنا گھر سمجھ کر پورے گھر کی ستھرائی کا خیال رکھیں اور ٹوٹ پھوٹ نہ ہونے دیں۔ مالک مکان نے اس سلسلے میں جملہ اختیارات اپنے ایک عزیز کو سونپ رکھے تھے جو حسن اتفاق اس بینک کے فیجر تھے جہاں مسز ظہیر نے بقول ان کے لوگوں پر اپنا بھرم رکھنے کو اپنا کھانا کھلو اور کھا تھا۔

منٹھا اینڈ فیملی کے بارے میں پوری ضمانت اور ذمہ داری مسز ظہیر نے لی اور یوں ان سب کو تقریباً دو سال تک اذیت اور ذلت بھگتتے کے بعد ماموں کے گھر اور ممانی کی تکلیف دہ باتوں سے نجات مل گئی۔ مئی نے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔

مسز ظہیر ان کے لیے مسیحا بن گئی تھیں!



صدمہ، انتشار اور مشکلات کے بعد زندگی ایک مرتبہ پھر منظم و منضبط ہو گئی۔ دو کمروں، اٹیچڈ باٹھ رومز، کچن اور ٹیرس پر مشتمل پورشن بنا زر پشنگی انتہائی معقول کرائے پر مل گیا تھا۔ یہ مکان مسز ظہیر کے گھر کے نزدیک اور اسکول سے بمشکل دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ بسوں کے پیچھے بھاگ دوڑ کی علت بھی جاتی رہی۔ اسکول میں بچوں کی ننانوے فی صد تعداد قرب و جوار کے علاقوں میں رہائش پذیر تھی اور اپنے بچوں کو ٹیوشن دلوانے کے خواہش مند والدین کی کوشش ہوتی تھی کہ کہیں آس پاس ہی مقیم ترجیاً اسی اسکول کی کوئی اچھی ٹیچر مل جائے۔ منٹھا اپنی محنت، کام سے لگن، تدریسی مضامین پر خاطر خواہ عبور، موثر اور دلنشین تدریسی طریقوں اور بچوں سے غیر معمولی انسیت کے باعث قلیل عرصے میں اپنی شناخت بنا چکی تھی لہذا تھوڑے ہی دنوں میں اس کے پاس ٹیوشن کے لیے بچوں کا آنا بندہ گیا۔ نہ صرف اس کے اپنے اسکول کے بچے بلکہ دوسرے اسکولوں کے طلبہ بھی اس کے پاس ٹیوشن لینے کے لیے آنے لگے۔

اسکول سے واپس آنے کے بمشکل آدھ یون گھنٹے بعد ہی ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کی آمدورفت شروع ہو جاتی۔ دو جاتے تو چار آتے۔ رفتہ رفتہ بچوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ اسے رات آٹھ بجے تک فرصت ملنا محال ہونے لگی۔ کام میں آسانی پیدا کرنے اور طریقہ منضبط کرنے کے لیے اس نے مختلف جماعتوں کے بچوں کے لیے تدریسی اوقات مقرر کر دیے۔ مئی، نیہ اور ملیب بھی اس کی مدد کرنے لگے لیکن والدین کا اصرار یہی ہوتا کہ ان کے بچوں کو وہ خود ہی پڑھائے چنانچہ مئی، نیہ اور ملیب سے مدد لینے کے ساتھ اسے ہر بچے کو لازماً خود بھی وقت دینا پڑتا۔ نتیجتاً وہ اسکول سے آنے کے بعد دوپہر کا کھانا جلدی جلدی کھا کر اور نماز ادا کرنے کے بعد جو بیٹھتی تو عصر اور مغرب کے وقت نماز ہی کے لیے اٹھ پاتی۔ عشاء کی نماز وہ آخری بچے کے جانے کے بعد رات کا کھانا کھا کر ادا کرتی۔ جب تک وہ نماز ادا کرتی نیہ اگلے دن کے لیے اس کے کپڑے استری کر کے بیگر پر لٹکا دیتی، ضرورت ہوتی تو جوتوں اور سینڈلوں پر پالش بھی کر دیتی۔

منٹھا رات کو بستر پر پڑتی تو اگلی صبح مئی کے جگانے پر ہی آنکھ کھلتی۔

”منٹھا!“ مئی منٹھا بھرے لہجے میں اسے دھیرے سے پکارتیں ”اٹھ جاؤ بیٹا، نماز قضا ہو جائے گی۔“

ایک، دو، تین اور کبھی کبھی چار پانچ مرتبہ مئی کو پکار لگاتا پڑتی۔

منٹھا کی آنکھیں کھلتیں، ہمیں بند ہی رہنے دو۔

دن بھر کی محنت اور مشقت سے دکھتا جسم التجا کرنا کہ مجھے ابھی کچھ دیر اور بستر پر گزار رہے دو۔

مگر اسے آنکھیں کھولنی پڑتیں اور ٹکان سے چور جسم کو حرکت میں لا کر بستر سے اٹھنا ضروری ہوتا۔

جلدی جلدی وہ نماز کی تیاری کرتی۔

نماز۔



قرآن مجید کی ایک دور کو ع تلاوت۔

پہلے ناشتا۔

پھر اسکول کے لیے لپک جھپک تیاری اور اسکول روانگی۔

صبح تا رات ایک مصروف دن کا آغاز۔

مگر اس بھاگ دوڑ اس مشقت اور محنت میں عجیب مزہ بھی تھا۔

اپنے پیاروں کے لیے کچھ کرنے کی جاں فزا طمانیت!

مئی کو گھر بیٹھنے کے لیے ملازمت چھوڑنی پڑی تھی اور یہ کوئی گھائے کا سودا نہ تھا۔ وہ خود بھی مطمئن اور بے فکر رہتیں اور تینوں بچے بھی خوش رہتے۔ مئی اچھے بیٹھے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتیں کہ بھائی کے ہاں زیادہ عرصہ پڑے رہنے کی نوبت نہ آئی تھی ورنہ بھادج سے تو بعید نہ تھی کہ ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کرتیں۔

ماموں کا گھر چھوڑنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ نیمہ زندگی کے معمولات میں از سر نو دلچسپی لینے لگی تھی۔ اب وہ گھر کے کام کاج میں مئی کا ہاتھ بٹاتی۔ ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کو پڑھانے میں منتہا کی مدد کرتی۔ منتہا اسکول کے بچوں کی جو کاپیاں پڑتال کے لیے لے کر آتی، انہیں بڑے اشتیاق سے دیکھتی۔ بچوں کے ماہانہ ٹیسٹ یا میقاتی امتحانات ہوتے تو ان کی دوبارہ پڑتال اور نمبر شماری میں منتہا کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ نتائج مرتب کرتی تو بڑے انہماک اور اشتیاق سے ان نتائج کو دیکھتی۔

ملیب پوری سندھی سے اپنی تعلیم میں منہمک تھا۔ ایف ایس سی کے بعد وہ کمپیوٹر انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ ڈیڈی کی دوسری شادی کے نتیجے میں زندگی میں رونما ہونے والے اچانک انقلاب نے اس سے اس کی شوخی اور کھلنڈراپن چھین لیا تھا۔ دونوں بہنوں کو اپنی شرارتوں سے عاجز رکھنے کے بجائے وہ اب بڑی عمر کے مرد کی طرح بردباری سے رہنے لگا تھا۔ گھر کا سودا سلف لانے اور گھر سے باہر کے بہت سے کام نمٹانے میں وہ مئی کی بھرپور مدد کرتا۔ محلے کے مردوں سے علیک سلیک رکھتا۔ منتہا سے ٹیوشن لینے کے لیے آنے والے بچوں کو پڑھانے میں منتہا کی خاطر خواہ مدد کرتا۔ محلے کے دو تین بچوں کی ٹیوشن اس نے بھی پکڑ لی تھیں اور یوں وہ اپنے تعلیمی اخراجات کے سلسلے میں بڑی حد تک خود کفیل ہو گیا تھا لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو منتہا اس کے لیے اپنا آخری قطرہ خون تک بہانے کو تیار تھی۔ ملیب کے تعلیمی معاملات اور اس کے مستقبل کے بارے میں وہ ایسے متفکر رہتی جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے لیے رہتے ہیں۔

مئی، منتہا اور ملیب کی مشترکہ کوشش تھی کہ نیمہ کا منقطع تعلیمی سلسلہ بھی اب جلد از جلد بحال ہو جائے۔ اپنے اپنے طور پر تینوں ہی اسے دوبارہ اپنی تعلیم شروع کرنے کی ترغیب دینے کی کوشش میں لگے رہتے۔

"پڑھ کر کرنا کیا ہے؟" ایک روز منتہا کے ترغیب دلانے پر اس نے انتہائی پائیت سے کہا۔

منتہا، جو بچوں کے امتحانی پرچوں کی پڑتال کر رہی تھی، چونک کر اسے دیکھنے لگی "کیا مطلب؟"

"پہلے تو مجھے ڈیڈی کی کلینک سنبھالنی تھی، اب کیا کروں گی پڑھ کر؟"

"نیمہ!" منتہا نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دلسوز لہجے میں کہا "میری اچھی بہن، اب تو تمہیں پہلے سے بھی زیادہ شوق سے پڑھنا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"تاکہ تم اپنی کلینک بلکہ بڑا سا ہاسپٹل کھولو اور ڈیڈی کو پتا چل جائے کہ ہم ان کے بغیر بھی زندہ اور خوش رہ سکتے ہیں۔ دیکھو، علم کے بہت فائدے ہیں۔ مئی اپنی شادی جلد ہو جانے کی وجہ سے صرف انٹر تک ہی پڑھ پائیں لیکن دیکھ لو، وقت پڑا تو مئی نے جاب بھی کی۔ زیادہ پڑھی لکھی ہوئیں تو شاید زیادہ بہتر جاب ملتی۔ مجھے دیکھو، تھوڑا بہت پڑھا لکھا

ی کام آرہا ہے۔ میں تو اب بی ایڈ کرنے کی سوچ رہی ہوں۔"

"او خدا! کہاں سے نکالیں گی پڑھنے کے لیے وقت؟" نیہہ بولی۔

"کہیں سے بھی.... کسی بھی طرح وقت نکالوں گی مگر بی ایڈ ضرور کرنا ہے" منتہا نے بڑے عزم سے کہا۔

"کیا کریں گی بی ایڈ کر کے؟"

"ٹرنڈ ٹیچر کو زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ گورنمنٹ جاب ملنے کے چانسز بھی ہوتے ہیں۔"

"تو کیا اب آپ گورنمنٹ جاب کریں گی؟"

"ہیلے بی ایڈ!" منتہا نے مسکرا کر نیہہ کو دیکھا پھر کہا "مسز ظہیر بتا رہی تھیں گورنمنٹ سے منظور شدہ ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج میں شام کے وقت بھی بی ایڈ کی کلاسز ہوتی ہیں۔"

"یہ آپ کی مسز ظہیر ساری دنیا کی خبریں رکھتی ہیں؟"

"بہت اچھی خاتون ہیں اور بہت کام کی بھی۔ تمہیں ایک بات بتاؤں وہ جو ہمارے کالج میں تمہاری فزکس کی لیکچرار مسز راحیلہ آفتاب تھیں نا وہ مسز ظہیر کی فرسٹ کزن ہیں۔"

"ج! نیہہ! اچھل ہی تو پڑی۔ مسز راحیلہ آفتاب تو اس کی فیورٹ ٹیچر ہوا کرتی تھیں۔"

"ہاں ہاں.... مسز ظہیر کہہ رہی تھیں اگر نیہہ دوبارہ کالج جانا چاہے تو میں راحیلہ سے بات کر سکتی ہوں۔"

"میں ذرا مٹی کو دیکھ آؤں کیا کر رہی ہیں" نیہہ نے موقع سے فرار چاہی۔

"فکر مت کرو، مٹی گھر ہی میں ہیں" منتہا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے اٹھنے کی راہ مسدود کر دی۔ پھر لجاجت سے بولی "پلیز نیہہ! پڑھائی شروع کر دو۔ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔ میری، مٹی کی اور علیب کی۔ دیکھو، میں اگر پڑھی لکھی نہ ہوتی، جاب نہ ملتی مجھے تو اس وقت ہم اتنے اطمینان سے رہ رہے ہوتے بھلا کیا ہوتا پھر؟ وہی ماموں جان کے گھر کا ایک کمرہ، ممانی جان کی دل دکھانے والی باتیں اور گھورتی ہوئی آنکھیں۔ پھر ہمارے پاس دو ہی راستے ہوتے یا تو ہم دوبارہ ڈیڈی کے پاس جانے پر مجبور ہو جاتے یا پھر روتی بسورتی زندگی.... پلیز نیہہ! اپنے لیے اور ہم سب کی خوشی کے لیے پڑھائی شروع کر دو۔"

نیہہ نے اسے ابھی ابھی نگاہوں سے دیکھا۔

"تم تو اتنی ذہین اور لائق لڑکی ہو، کیوں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہی ہو۔"

"مجھے... مجھے پبلک بسوں میں سفر کرنے سے الٹی آنے لگتی ہے۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ تمہاری اٹیووں کا سبب تو کچھ اور تھا... تم اپنی کلاس میٹس پر ڈیڈی کی دوسری شادی کا قصہ کھل جانے اور ان کی باتوں سے ڈسٹرب ہو گئی تھیں لیکن اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ مٹی، علیب، میں ہم سب نے لوگوں کا سامنا کرنا سیکھ لیا ہے۔ مسز ظہیر کو سب کچھ معلوم ہے۔ اب اگر میری دوسری کو لیگز کو بھی معلوم ہو جائے تو مجھے پروا نہیں۔ یہاں محلے میں مٹی سے جو بھی پوچھتا ہے آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں، مٹی بتا دیتی ہیں کہ انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ہم سے علیحدہ رہتے ہیں البتہ مٹی یہ نہیں بتاتیں کہ وہ کون ہیں، کیا کرتے ہیں اور ان سے یہ باتیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔"

"لیکن اگر کبھی ہمارا کوئی جاننے والا کسی محلے والے کا بھی جاننے والا نکل آیا تو؟"

"تو کیا.... مجھے تو اب ان باتوں کی کوئی پروا نہیں رہی۔ میں تو اب بڑی کیسرفری ہو گئی ہوں" منتہا نے بڑی بے پروائی سے کہا پھر اصل موضوع پر آتے ہوئے بولی۔

"تم اگر پبلک بس سے کالج نہیں آنا چاہتا میں نہ سہی، ہم تمہیں کالج دین لگوا دیں گے۔"

نیہہ نے پھر پہاؤ بدلا۔



”بولو... کیا خیال ہے؟“

نیہہ چپ رہی۔

”پتا ہے کیا نیہہ، میرا تو جی چاہتا ہے کہ تم اچھی سی ڈاکٹر بنو اور ایک روز وائٹ کوٹ پہنے گلے میں اسٹیتھو کوپ ڈالے ڈیڈی جان کے سامنے جا کر کہو، ہیلو ڈاکٹر نجیب احمد! ہینر کمس ڈاکٹر نیہہ!“

”اوہ گاڈ! مجھے اتنی لالچ مت دلائیں باجی!“

”میں تمہیں اس سے بھی زیادہ دلا سکتی ہوں مائی ڈیر سسٹر!“

نیہہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ منتہا نے اس کے سر کو دھیرے سے دھپ لگائی۔

”اس کالج میں نہیں باجی!“ نیہہ دھیرے سے بولی۔

”تم جس کالج میں کوئی اسی میں بشرطیکہ کالج اچھا ہو اور تمہیں داخلہ بھی مل جائے“ منتہا نے خوش ہو کر کہا۔

نیہہ کا دوبارہ پڑھائی کے لیے آمادہ ہو جانا کسی نشاۃ ثانیہ سے کم نہ تھا۔

○☆☆○

منز ظہیر کی رہنمائی اور تعاون سے نیہہ کا ایک نئے کالج میں داخلہ ہو گیا۔ منز ظہیر کے تعلقات عامہ کی رسائی کا صحیح اندازہ منتہا کو نیہہ کے داخلے کے سلسلے میں مختلف اداروں میں ان کے ہمراہ آمد و رفت سے ہوا۔ منز ظہیر جہاں جاتیں، ان کے واقف کار مل جاتے۔ منز ظہیر کے روپ میں منتہا کو گویا خضر کا ساتھ مل گیا تھا۔ البتہ خضر کی طرح انہوں نے منتہا پر سوال نہ پوچھنے کی پابندی نہیں لگائی! ان کی جہاں دیدہ رفاقت منتہا کو بہت کچھ سکھار ہی تھی۔

منز ظہیر ہی ایک روز اسے اساتذہ کی تربیت کے لیے قائم گورنمنٹ سے منظور شدہ اس تربیتی ادارے میں بھی لے گئیں جہاں زیر ملازمت اساتذہ کے لیے سہ ہفتہ شام کلاسیں ہوتی تھیں۔ ادارے کے پرنسپل منز ظہیر کے بڑے بھائی کے ہم جماعتوں میں سے تھے۔ ان سے منتہا کا تعارف کراتے ہوئے منز ظہیر نے کہا ”یہ ہماری کولیگ ہیں۔ بڑی اچھی ٹیچر ہیں۔ ہم چاہتے ہیں یہ بی ایڈ کر لیں۔“

پرنسپل صاحب مسکرا دیے۔

”سلیٹی بہن، صرف آپ ہی چاہتی ہیں کہ یہ بی ایڈ کر لیں یا یہ بی بی خود بھی چاہتی ہیں۔“

”یہ چاہیں یا نہ چاہیں ہم انہیں بی ایڈ کروا کے ہی دم لیں گے۔“

”پھر تو کسی قسم کی بحث کی گنجائش ہی نہیں“ پرنسپل صاحب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی اور وہ دھیرے سے کھنکھار کر بولے ”پوچھ سکتا ہوں کہ انہیں بی ایڈ کروانے میں آپ کی اس قدر دلچسپی کا سبب کیا ہے؟“

”انتہائی ڈیزرونک کیس ہے۔“

”اچھا تو ایسا ہے سلیٹی بہن کہ اس سال تو داخلے ہو چکے ہیں۔ کلاسیں بھی شروع ہو چکی ہیں۔ آپ انہیں اگلے سیشن کے لیے داخلے کے وقت میرے پاس بھیجوا دیں۔“

”جی نہیں“ منز ظہیر بولیں ”آپ کو اسی سال داخلہ دینا ہو گا انہیں ورنہ شفقت بھیا کے حوالے سے ہمارا آپ کے پاس آنے کا فائدہ“ منز ظہیر نے بڑے بھائی کا نام لے کر انہیں اخلاقی دباؤ میں لینے کی کوشش کی۔

منتہا نے بے ساختہ ہڑبڑا کر منز ظہیر کو دیکھا کہ وہ تو اسے مذکورہ کالج دکھانے اور داخلے کا وقت اور طریق کار معلوم کرنے کے لیے ہمراہ لے کر اس کالج آئی تھیں۔ فی الحال داخلہ لینے کا تو کوئی پروگرام ہی نہ تھا اور وہ بھلا داخلہ لے بھی کیسے سکتی تھی۔ کالج کے اوقات کار کے دوران میں تو اس کے پاس نیچے ٹیوشن کے لیے آتے تھے۔

”ہم کچھ نہیں جانتے، ہمیں ان کا داخلہ فارم چاہیے بس ورنہ ہم شفقت بھیا کو بھیجیں گے آپ کے پاس۔“

”دیکھئے بہن“ کالج میں داخلوں کا وقت گزر چکا ہے۔“  
 ”معاف کیجئے گا“ یہ کوئی سرکاری کالج تو ہے نہیں۔ ہم جانتے ہیں منظور شدہ اداروں میں داخلے کے بہت سے راستے ہوتے ہیں، نکالے کوئی راستہ... اسی سیشن میں۔“  
 ”مسز ظہیر... اس سال رہنے دیں“ منتہا نے سرگوشی میں کہا۔  
 مسز ظہیر نے پرنسپل صاحب کو دیکھتے ہوئے ان کی میز کی آڑ میں منتہا کا زانو دبایا۔  
 ”یہ بی بی کیا کہہ رہی ہیں؟“  
 ”کچھ نہیں... کوئی اور بات تھی۔“  
 ”معاف کیجئے گا“ میں سمجھا کالج کے بارے میں کوئی بات کر رہی ہیں۔“  
 ”کالج کے بارے میں تو ہم آپ سے بات کر رہے ہیں کہ انہیں اسی سال داخلہ دلوانا ہے۔“  
 منتہا سرا سید دکھائی دینے لگی۔  
 یہ کیا غضب کر رہی تھیں وہ!  
 ٹیوشن والے بچوں کا کیا بنے گا!

”انتظامیہ نے داخلوں کا ایک وقت، ایک طریق کار وضع کر رکھا ہے“ پرنسپل صاحب نے پھر عذر تراشنے کی کوشش کی۔

”ہاں، مگر ہم جانتے ہیں کہ پرنسپل ہونے کے ناتے آپ کے اختیار میں بھی بہت کچھ ہے۔ ہم آپ کا زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ براؤ کرم ایک داخلہ فارم عنایت فرمائیں۔ انتظامیہ سے اگر اجازت لینے کی ضرورت ہے تو ہم اس کے پاس بھی جاسکتے ہیں۔“

”اچھا، مجھے آپ ایک دو دن کی مہلت تو دیں۔ میں انتظامیہ سے بات کرتا ہوں۔“  
 ”بڑی مہربانی، بہت نوازش۔“

پرنسپل صاحب کے دفتر سے نکلے ہی منتہا نے کہا ”یہ آپ کیا کر رہی ہیں مسز ظہیر، ہم لوگ تو کالج صرف دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ میں فی الحال داخلہ لے بھی نہیں سکتی۔“  
 ”کیوں؟“

”ٹیوشن والے بچوں کا کیا ہو گا؟“  
 ”ہو جائے گا سب ہو جائے گا۔ ان کا ٹائم بدل دینا یا پھر ایک دن کالج ایک دن بچے۔ جس دن کالج آنا اس دن بچوں کو دیر سے بلا لیا کرتا۔“

”ایسے تو والدین نہیں بھیجیں گے بچوں کو؟“  
 ”جن کو اتنے بچے کی ضرورت ہوگی وہ رات بارہ بجے بھی بھیجیں گے بچوں کو“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”مسز ظہیر پلیز!“ وہ گڑبڑائی ”دیکھئے، ابھی تو نیہ کا ایڈمیشن کروایا ہے۔ مہربانی کی تعلیم کے اخراجات ہیں۔ میں نے بھی پڑھائی شروع کر دی تو انکم کم اور اخراجات اور بڑھ جائیں گے۔“

مسز ظہیر چلتے چلتے تھم گئیں اور اسے دیکھنے لگیں۔  
 ”بی ایڈ کروں گی ضرور مگر ابھی نہیں“ منتہا نے کہا۔  
 ”تم سمجھتی ہو، ہمیں تمہاری پرابلمز کا احساس نہیں ہے۔ پتا ہے، ہم اسی سال داخلے پر کیوں اصرار کر رہے ہیں؟“ مسز ظہیر پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں۔  
 ”کیوں؟“ منتہا نے ان کے پہلو پہ پاؤں چلتے ہوئے پوچھا۔



”ہم نے اڑتی اڑتی سنی ہے کہ اگلے سال سے یہ لوگ بی ایڈ کی ایوننگ کلاسز ختم کر رہے ہیں۔ اسی سال تمہارا داخلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر جائے گا۔ درمیان میں اسکولوں کی تعطیلات آجائیں گی۔ تمہیں پڑھنے کے لیے وقت بھی مل جائے گا۔“

”ایوننگ کلاسز کے ختم ہونے کی بات آپ کو کس نے بتائی؟“

”سنا ہے ہم نے۔“

”اچھا دیکھئے، پہلے میں بچوں سے اور ان کے والدین سے بات کر لوں۔“

”پہلے داخلے کی فکر کرو۔ داخلہ ہو جائے پھر جو بچے دیر سے پڑھنے کے لیے آنے پر آمادہ ہوں، ٹھیک ہے جو آمادہ نہ ہوں انہیں یا تو اپنی والدہ اور بھائی بہن کے سپرد کرو ورنہ وہ گھر بیٹھیں۔ رہی آمدن کم ہو جانے کی بات تو روزی دینے والا اوپر بیٹھا ہے۔ ہماری ضرورتوں کی فکر اسے ہم سے زیادہ ہے۔ وہ خود بندوبست کرتا ہے۔ ہمیں دیکھو، نظمیر صاحب یوں تو ہماری شادی کے چند ماہ بعد سے ہی بیمار چل رہے ہیں۔ اکیس بائیس برس تو ان کی کمائی کا ایک پیسہ نہیں آیا ہمارے ہاتھ میں مگر زندگی کے سارے معاملات چل رہے ہیں۔ گھر کی دال روٹی بھی چل رہی ہے۔ بچے بھی پڑھ لکھ رہے ہیں۔ غمی، خوشی کے اخراجات بھی ساتھ لگے ہیں۔ اوپر والا ہی ساری ضرورتیں پوری کر رہا ہے۔“

”آسرا تو ہے نامز نظمیر۔ آپ کی جاب ہے، دستکاری اسکول ہے۔“

”یہ سب کچھ بعد میں ہوا منتہا.... دھیرے دھیرے.... ہم نے نیچرز ٹرننگ بھی بعد میں کی۔ دستکاری کا ڈپلوما بھی بعد میں حاصل کیا۔ دن جیسے بھی ہوں، گزر رہی جاتے ہیں۔ لیکن آج ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم پس و پیش میں رہتے، ٹرننگ لینے میں تاخیر کرتے، دستکاری کا ڈپلوما نہ لیتے تو کیا یہ سب کچھ کر سکتے تھے ہم۔“

”آپ کا حوصلہ، ہمت اور زندہ دل دیکھ کر رشک آتا ہے، مسز نظمیر!“

وہ بہت دھیرے سے ہنس دیں۔

ان کی ہنسی میں منتہا کو دھیماسا کر محسوس ہوا۔

”بس تم بی ایڈ کر رہی ہو۔ اور تم اطمینان رکھو، اسکول کے جو بچے تم سے ٹیوشن لینے کے لیے آتے ہیں، ان کے والدین سے ہم بات کریں گے۔ آخر ہم سینئر ٹیچر ہیں، مذاق تھوڑی ہے۔ انہیں اپنے بچوں کو تمہارے ہی پاس بھیجنا ہو گا خواہ شام کو یا رات کو۔“

”آپ کتنی ہلپ فل ہیں مسز نظمیر!“ منتہا نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

مسز نظمیر نے بس اسٹاپ کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے منتہا کا ہاتھ دھیرے سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولیں

”آخر ہمارا ہاتھ بھی تو کسی نے پکڑا ہی تھا منتہا!“

”کس نے؟“

”کس کس کا بتائیں اور کس کا بھول جائیں۔ بہت سے ملے جو راستہ دکھاتے گئے۔“ بے اختیار گھٹی گھٹی سی ایک سرد آہ مسز نظمیر کے لبوں سے نکلی اور ان کے بہت سے ان کے دکھوں کا فسانہ آشکار کر گئی۔

○☆☆○

مسز نظمیر نے غلط نہیں کہا تھا کہ دن جیسے بھی ہوں گزر رہی جاتے ہیں۔

دن گزر گئے تھے۔

منتہا نے اسی سال بی ایڈ کر لیا تھا۔

اور واقعی، اس سال کے بعد مذکورہ کالج میں بی ایڈ کی ایوننگ کلاسز ختم کر دی گئی تھیں۔

بی ایڈ کا نتیجہ آنے کے چند ماہ بعد ہی سرکاری اسکولوں میں نیچرز کی آسامیاں نکلیں تو مسز نظمیر نے اسے مذکورہ

آسامیوں سے متعلق اخباری تراشہ دیتے ہوئے کہا "فورا ایلوائی کرو۔"

"ایک بات تو بتائیے" آپ تو ٹرینڈ نیچر تھیں، آپ نے خود گورنمنٹ جاب کیوں نہیں کی؟"

وہ حسب عادت دھیرے سے ہنس دیں پھر بولیں "زندگی میں ترجیحات مقرر کرنی پڑتی ہیں۔ ظہیر صاحب ہماری زندگی کی اولین ترجیح ہیں۔ نوکری ہماری ضرورت ہے مگر اس ضرورت کی تسکین کے ساتھ ہی ہم ہمیشہ اپنے گھر کے بھی اتنے نزدیک رہنا چاہتے تھے کہ اگر خدا نخواستہ کسی ایمر جنسی میں ظہیر صاحب ہماری ضرورت محسوس کریں تو ہمیں جلد از جلد اپنے نزدیک پہنچا ہوا پائیں۔ سرکاری ملازمت میں تو ہماری پوسٹنگ گھر سے نہ جانے کتنی دور ہوتی۔ بس یہی ایک سبب ہے جو ہم نے سرکاری ملازمت کی نسبت کم تنخواہ پر ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرنے کو ترجیح دی۔ اٹھارہ سال ہو چکے ہیں ہمیں اس اسکول میں نوکری کرتے۔ سرکاری ملازمت ہوتی تو شاید آج ہم کسی اسکول کی ہیڈ مسٹریں ہوتے لیکن ہمیں کوئی بچھتاوا نہیں، ہم نے کہا نا انسان کو زندگی میں ترجیحات مقرر کرنا پڑتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے تمہاری ترجیح گورنمنٹ جاب ہونی چاہیے۔ پہلی فرصت میں ایلوائی کرو۔"

منتہا نے درخواست ارسال کر دی۔

انٹرویو کال آئی تو مسز ظہیر نے کہا "ہم بھی کسی بہانے سے اسکول سے چھٹی کر کے تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

"کہاں؟"

"انٹرویو کے لیے۔"

"انٹرویو کے لیے! تو کیا آپ نے بھی ایلوائی کیا ہے؟"

"ارے نہیں بھئی" وہ مسکرا دیں "تمہاری مورل سپورٹ کے لیے" انٹرویو کا نام ہی بُرا ہوتا ہے، اچھے اچھے گھبرا جاتے ہیں۔"

"سوٹائس آف بو مسز ظہیر! آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں" احساس تشکر سے منتہا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"تم ہمیں اچھی لگتی ہو۔ اور ہمارا اصول تو یہ ہے کہ جو اچھے نہ بھی لگیں ان کے لیے بھی راستہ ہموار کرتے چلے جاؤ۔"

"بو آرگریٹ مسز ظہیر!"

"دیکھو، ہمیں اتنی انگریزی نہیں آتی" مسز ظہیر مسکرا کر بولیں۔

انٹرویو والے دن مسز ظہیر واقعی اس کے ساتھ گئیں۔

اک جم غیر تھا جو انٹرویو کے لیے امنڈ آیا تھا اور بیشتر کا خیال یہ تھا کہ یہ سب محض دکھاوا تھا۔ جنہیں رکھنا تھا ان کے ناموں کی فہرست تو پہلے ہی مرتب کی جا چکی تھی۔ منتہا کے انٹرویو کی باری سہ پہر کو آئی۔

"اعتماد سے جواب دینا۔ گھبرانا بالکل مت" مسز ظہیر نے آہستہ سے کہا پھر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر تھپتھپاتے ہوئے بولیں "نصر من اللہ وفتح قریب۔"

"تھینک یو!"

انٹرویو کا نتیجہ ملنے میں اتنا لمبا وقفہ آیا کہ منتہا کو اس سنی سنائی پر اعتبار محسوس ہونے لگا کہ انٹرویو محض دکھاوا تھا، چنانچہ ایک روز اسکول سے گھر واپسی پر جب مئی نے اس سے کہا "منتہا مٹھائی کھاؤ" تو اس نے چونک کر پوچھا۔

"کس بات کی مئی؟"

"بو جھو" مئی نے مسکرا کر کہا۔

اس کا ذہن جانے کہاں کہاں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا۔

"ڈے... ڈی..."



"اونہوں۔"  
 "میلیب کو کوئی انعام ملا ہے؟"  
 "نہیں۔"  
 "نہہ کے بارے میں کوئی....؟"  
 "نہیں بیٹا!"  
 "تو پھر؟"

ممی نے ایک لفافہ اس کے سامنے کر دیا "بہت بے چینی سے انتظار تھا تا تمہیں اور پھر بھول بھی گئی تھیں۔ میں نے کھول کر دیکھ لیا ہے، تم بھی دیکھ لو۔"  
 اس کا پروانہ تقرری آگیا تھا۔  
 خوشی کے مارے وہ ممی سے لپٹ گئی۔  
 "مجھے سکسٹین گریڈ ملے گا ممی.... اوہ! آئی ایم سو ہسپی!" اس کی نگاہیں آپ ہی آپ آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔  
 "شکریہ! شکریہ اللہ جی، آپ کا بہت بہت شکریہ!" اس کے دل کی اتھاہ گھرائیوں سے نکلنے والی آواز نے آسمان کا رخ کیا۔

تشکر کے انہی لمحوں میں اچانک اسے مسز ظہیر کا خیال آیا۔  
 "ممی جان! ہمیں یہ خبر سب سے پہلے مسز ظہیر کو سنانی چاہیے" اس نے کہا۔  
 "ضرور بیٹا! وہ تو ہماری محسنہ ہیں۔"  
 مٹھائی کا ڈبائے کروہ ممی کے ہمراہ مسز ظہیر کے گھر پہنچی تو انہوں نے اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا دیکھتے ہی کہا  
 "اپا سٹمنٹ لیٹر آگیا نا؟"  
 "آپ کو کیسے پتا؟"  
 "تمہارے ہاتھ میں مٹھائی کا یہ ڈبا تار ہا ہے۔"  
 "مٹھائی کسی اور بات کی بھی تو ہو سکتی ہے؟"  
 "کسی اور بات کی بھی ضرور کھائیں گے" مسز ظہیر زو معنی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "لیکن یہ مٹھائی صرف اور صرف تمہاری اپا سٹمنٹ کی ہی ہو سکتی ہے۔"  
 "آپ درست سمجھی ہیں اور یہ سب آپ کی عنایت ہے۔"  
 "نہیں، یہ تمہاری لیاقت اور اہلیت کا ثمر ہے۔ تمہیں یاد ہے انٹرویو والے دن زیادہ تر لوگ کیا کہہ رہے تھے۔"  
 "کیا؟"

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تہمیدوں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط، کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے تنگ (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تعلقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کریں تاکہ ضیاع نہ ہو۔ ای میل پر تہمیدوں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔  
 نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط، محکمے کی بدانتظامی کے سبب ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر ممالک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)



"کہ انٹرویو محض ڈھکوسلا اور دکھاوا ہے۔"  
 "جی.... جی.... مجھے یاد ہے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا اگر ڈھکوسلا اور دکھاوا بھی ہے تو ہونے دو۔"  
 انٹرویو یہ سمجھ کر دتا کہ میں سب سے بڑھ کر لائق امیدوار ہوں۔"  
 "اب کیا خیال ہے لوگوں کی اس رائے کے بارے میں؟"  
 "انہوں نے زیادہ اڑاتے ہیں لوگ۔"  
 "بد قسمی سے یہ ہمارا مجموعی قومی مزاج بن چکا ہے" منظر ظہیر نے می کی طرف دیکھا اور بولیں "بہت مبارک ہو  
 آپ کو منشا کے اپنا ٹیمٹ کی۔"  
 "شکریہ!"

منظر ظہیر نے مٹھائی کا ڈبا کھولا اور پہلے می کا پھر منشا کا منہ میٹھا کرایا۔ منشا نے انہیں اپنے ہاتھ سے مٹھائی  
 کھلائی۔

"ویل ڈن! ایک اٹ اپ!" منظر ظہیر مسکراتے ہوئے بولیں۔  
 "میں تو یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے اتنی انگریزی نہیں آتی" منشا خوش دلی سے مسکرائی۔  
 "ہمیں بہت خوشی ہوئی منشا!" منظر ظہیر نے کہا۔  
 "مگر مجھے ایک بات کا افسوس ہے منظر ظہیر!"  
 "افسوس! کس بات کا؟"  
 "آپ کا اور میرا ساتھ چھوٹ جائے گا۔"  
 "ساتھ دل کا ہوتا ہے منشا، جب دل کسی سے ملا ہو تو سات سمندر پار رہ کر بھی اس کے نزدیک رہا جاسکتا۔ کیوں  
 ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟" اپنے آخری فقرے پر انہوں نے تائید طلب نگاہوں سے می کو دیکھا۔  
 "جی بالکل!"

منظر ظہیر نے منشا کی جانب دیکھا اور بولیں "گھبراؤ مت، انشاء اللہ العزیز ہم تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔"  
 مقررہ قواعد و ضوابط کے مطابق اپنے اسکول کو پندرہ دن کا نوٹس دے کر منشا نے پہلی ملازمت کو خیر باد کہا اور اپنی  
 نئی جائے ملازمت پر ڈیوٹی جوائن کر لی۔

گورنمنٹ سٹی پبلک اسکول ایک نیشنلائزڈ تعلیمی ادارہ اور اس کی نئی جائے کار تھی۔  
 وہ جس نے اپنے اسکول کے آخری دنوں میں اپنی ایک ٹیچر کے پوچھنے پر کہا تھا کہ وہ ٹیچر کسی بھی قیمت پر نہیں بننا  
 پسند کرے گی، تربیت یافتہ گریجویٹ ٹیچر بن گئی تھی اور اپنی نئی جائے ملازمت پر ڈیوٹی کے لیے رپورٹ کرنے پر یوں  
 خوش تھی جیسے ٹیچر بننا ہی تو اس کی اول و آخر آرزو تھی!  
 کسی دانشور نے ٹھیک ہی تو کہا تھا "ہر بچہ اس دنیا میں ایک سادہ تختی کے مانند آتا ہے۔ زمانے کا ہاتھ اس سادہ  
 تختی پر اپنے کچے کا مقوم لکھتا ہے۔"

منشا کے مقوم کی تختی پر زمانے کے ہاتھ نے لکھ دیا تھا۔  
 بس منشا احمد۔ ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر!

(باقی آئندہ)







## ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے اسٹنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

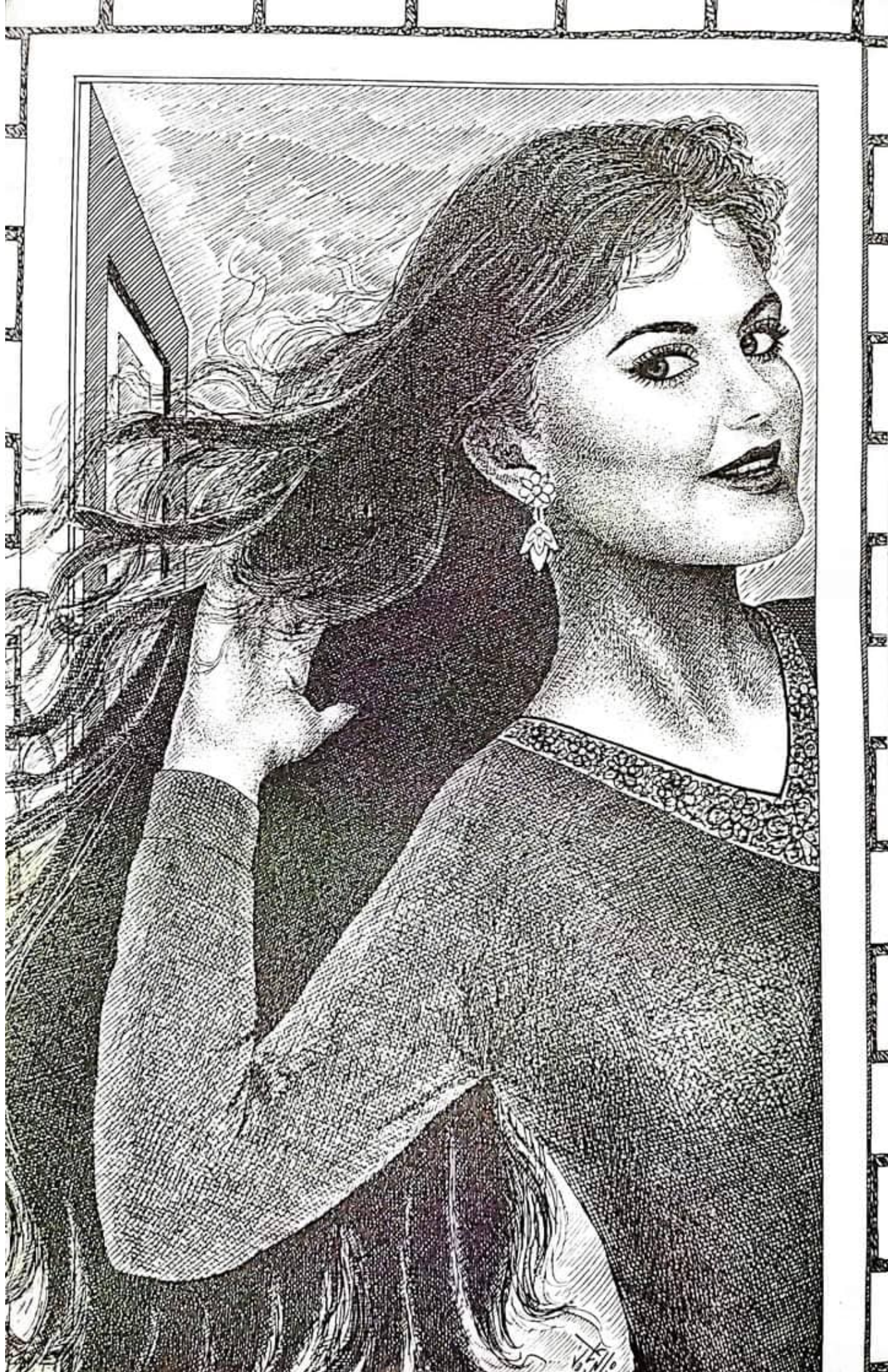
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبان سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سسار ہونے کی دل گداز داستان

تیسری قسط









مسز ظہیر کے چار بچوں میں بلحاظ عمر سب سے بڑا بیٹا تھا جس کا نام فرحان تھا، اس سے چھوٹی بہن تھی بیلا، تیسرے نمبر پر عدنان تھا اور سب سے آخر میں بیٹی جس کا نام لیلیٰ تھا۔ چاروں بہت باتیز اور والدین کے انتہائی فرمانبردار تھے۔ خوش اخلاقی اور مفساری انہیں ورثے میں ملی تھی۔

ظہیر صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ایک غیر ملکی ادارے میں ملازمت کیا کرتے تھے۔ زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ کوئی پریشانی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اپنے پرانے اس خوش و خرم جوڑے کو رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ اچانک ان کی خوشیوں کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ظہیر صاحب ایک رات نیند میں کسی بھیانک خواب سے اس بُری طرح ڈرے کہ ان کا ندوس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ علاج معالجے سے حالت بہتر تو ہو گئی مگر پہلے کی طرح نہ رہے۔ ملازمت ترک کردی اور گھر میں بیٹھ گئے۔ زندگی سے ان کی دلچسپی اور رغبت فقط کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے تک رہ گئی۔ احباب و اقارب سے ملنا جلنا برائے نام رہ گیا۔ کوئی ان سے ملنے کے لیے گھر پر آتا تو بمشکل کچھ دیر بیٹھتے پھر اچانک متوحش ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس وحشت میں کبھی کبھی باتیں بھی بے ربط سی کرنے لگتے لیکن کبھی اتنے اچھے بھی نظر آتے اور ایسی باتیں کرتے کہ لگتا کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مسز ظہیر نے بڑی پامردی سے زندگی کا مقابلہ کیا تھا۔ حالانکہ ان کے اپنے قریبی اعزہ و اقارب نے ظہیر صاحب کی اس ذہنی بیماری کے ابتدائی دنوں میں انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ایسے شخص سے کنارہ کر لینا ہی بہتر ہو گا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ یکے بعد دیگرے وہ ان کے چار بچوں کی ماں بھی بنی تھیں۔ ظہیر صاحب کو بیمار اور پھر بے روزگار ہوئے برسوں گزر چکے تھے مگر مسز ظہیر کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی تھی۔ خانہ دارانہ اور معاشی ذلت داریوں کے ساتھ وہ اب بھی اسی تندہی سے ظہیر صاحب کا خیال رکھتیں اور جب کبھی احباب و اقارب میں سے کوئی ان کے مقدر پر تاسف کا اظہار کرتا تو وہ مسکرا کر کہتیں ”ظہیر صاحب، ہمارے بچوں کے باپ ہیں۔ وہ تو ہمیں اس دنیا کے سب سے اہم اور سب سے پیارے انسان لگتے ہیں۔“

انہوں نے اپنے چاروں بچوں کو بھی باپ کا خیال رکھنے، ان کا ادب کرنے اور بہر صورت ان کا احترام ملحوظ رکھنے کی عادت ڈالی تھی۔ ان کی اسی تربیت اور خاندانی نجات کا اثر تھا کہ چاروں بچے ظہیر صاحب کے آگے بچھے بچھے رہتے تھے۔ جی ابو، اچھا ابو، ٹھیک ہے ابو۔ ظہیر صاحب کے سامنے ان چاروں کے گویا تکیہ کلام تھے۔ خاندان بھر میں ان کی سعادت مندی کی مثالیں دی جاتیں۔

فرحان پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ کا طالب علم تھا، بیلا کالج میں تھی، عدنان اور لیلیٰ آگے پیچھے اسکول کے آخری درجات میں تھے۔

”یہ بچے ہماری زندگی کی کمائی ہیں“ مسز ظہیر اپنے بچوں کے بارے میں بڑے امید افزا لہجے میں کہا کرتیں۔ چاروں بچوں کے اپنے اپنے خواب، خواہشیں، آرزوئیں اور تمناں تھیں۔ چاروں نے ماں کو ہمیشہ زندگی سے جو کبھی لڑتے دیکھا تھا۔ انہوں نے ان کے لیے ماں ہی نہیں، باپ کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ ان کی ضرورتوں کا خیال رکھا تھا۔ انہیں گھر کے اندر ہی نہیں باہر بھی خاطر خواہ تحفظ فراہم کیا تھا۔ انہیں تعلیم دلوا رہی تھیں اور ان کے مستقبل کی مناسب منصوبہ بندی رکھتی تھیں۔

بچوں کی اپنی منصوبہ بندی تھی۔

”میری جاب کے بعد آپ جاب نہیں کریں گی“ فرحان ان سے کہتا۔  
 ”اچھا بھئی اچھا، پہلے تم اپنی تعلیم تو مکمل کر لو“ مسز ظہیر اسے پیار سے دیکھتیں۔  
 ”بس ہوئی امی!“ فرحان چٹکی بجاتا۔

”میں آپ کے لیے بڑا سا گھر بناؤں گا۔“ یہ عدنان کی خواہش تھی۔

”کتنا بڑا؟“

”بہت بڑا، جس میں ہم سب کے علیحدہ علیحدہ کمرے ہوں گے۔ ایک بڑا سا ڈرائنگ، ڈائننگ اور ٹی وی لاونج بھی۔ اور ہاں، لان بھی ہوگا اس گھر میں جہاں بیٹھ کر ہم سب آبی اور ان کے گھر والوں کی طرح اکٹھے چائے پیا کریں گے۔“

مسز ظہیر کے بچے اپنی چھوٹی خالہ کو ”آنی“ کہا کرتے تھے۔ جو آنٹی کی وہ تحریف شدہ صورت تھی جو فرحان نے اسے بچپن میں لفظ آنٹی صحیح طور پر ادا نہ کر سکنے پر اپنی تھی اور اس کی پیروی میں بعد میں دوسرے بھائی بہنوں نے بھی آنٹی کی بجائے ”آنی“ کو اس قدر استقامت سے پکڑا تھا کہ اب مسز ظہیر کی چھوٹی بہن کی عرفیت ہی آنی پڑ چکی تھی۔ بچوں کا خواب یہ بھی تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد اپنی امی کے لیے کار بھی خریدیں گے تاکہ انہیں باہر آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔

”ارے بیٹا، ہمیں تو پیدل چلنا اچھا لگتا ہے“ مسز ظہیر بڑی انکساری سے کہتیں۔  
 ”واہ، جب گھر میں گاڑی ہوگی تو ہم دیکھیں گے کہ آپ پیدل کیسے چلتی ہیں۔ آنی کو دیکھا ہے نا گھر کے دروازے سے نکلتی ہیں تو کار پورچ میں گاڑی کھڑی ہوتی ہے۔“  
 ”ہم کوئی تمہاری آنی کی طرح سونے کا چچہ منہ میں لے کر تھوڑی پیدا ہوئے تھے۔“  
 ”سونے کا چچہ بنوایا تو جاسکتا ہے۔“  
 ”اچھا، ابھی اچھا تم لوگ جیتے ہم ہمارے“ مسز ظہیر ہتھیار ڈال دیتیں۔  
 ”تھینک یو۔“

آنی واقعی سونے کا چچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھیں مگر ان کی سادگی اور انکساری سبحان اللہ! مسز ظہیر اور ان کے بچوں کی وہ مختلف حیلے بہانوں سے یوں اعانت کر جاتیں کہ لینے والوں کو سبکی یا احسان محسوس نہ ہو، کبھی پاس ہونے پر بچوں کی مٹھی میں پیسے دبا جاتیں، کبھی کسی تقریب یا تہوار کے بہانے ڈھیر شاپنگ کروا جاتیں۔ بہن کے گھر جب بھی آتیں خالی ہاتھ نہ آتیں۔

مسز ظہیر اپنے حلقہ احباب میں بہن کی اس داد و دہش کا اعتراف کرتے نہ تھکتیں۔  
 ”خدا ہماری بہن کو بہت دے۔ بہت خیال رکھتی ہے وہ ہمارے بچوں کا۔“  
 بیلا کو اس کی سالگرہ پر اپنی خالہ کی طرف سے طلائی ٹاپس تحفے میں ملے تو مسز ظہیر نے منتہا کو دکھاتے ہوئے کہا  
 ”ہم بچوں کی سالگرہ ہیں منائیں یا نہ منائیں ان کو آنی کی طرف سے تحفے ضرور ملتے ہیں۔ یہ دیکھئے، بیلا کو اس بار اپنی سالگرہ پر یہ ٹاپس ملے ہیں، آنی کی طرف سے۔“  
 ”بہت خوبصورت ہیں۔“

”آنی نہ ہوں تو شاید ہمارے بچوں کی تو بہت سی خوشیاں دبے پاؤں گزر جایا کریں۔“  
 منتہا کو پہلی بار مسز ظہیر اتنی دل برداشتہ دکھائی دیں۔  
 ”ہم تو کبھی کبھی یہ سوچتے ہیں کہ اپنی بہن کے اتنے احسانات کا بدلہ کیونکر اتار پائیں گے۔“  
 ”مسز ظہیر جب اللہ میاں آپ کو دیں گے تو آپ بھی ان کی اور ان کے بچوں کی خوشیوں میں یونہی شریک ہو جایا کیجئے گا۔“

مسز ظہیر کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ منتہا کو ان کی مسکراہٹ میں حزینہ رنگ دکھائی دیا۔  
 ”پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا اور آئے گا بھی کہ نہیں۔“  
 ”یہ آپ کہہ رہی ہیں مسز ظہیر!“ منتہا نے انہیں بے یقینی سے دیکھا۔



”کیا مطلب؟“

”آپ سے تو اور لوگ صبر و شکر اور امید کا سبق لیتے ہیں۔“  
”مز ظہیر پھر مسکرا دیں۔ اب کی بار ان کی مسکراہٹ میں حزن کا رنگ پہلے سے بھی گہرا تھا۔“  
”ہم بھی تو انسان ہی ہیں منتہا اور انسان بھی وہ جسے صنفِ نازک کہا گیا ہے۔“  
”آپ اس زمرے میں نہیں آتیں۔“

”ہم سمجھے نہیں۔“

”آپ تو ان خواتین میں سے ہیں جو مردانہ وار زندگی کا مقابلہ کرتی ہیں۔“

”تھینک یو فار دی کمپلیمنٹس!“ مز ظہیر پھر مسکرائیں۔

”منتہا کو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی آبی رو دکھائی دی۔“

ایسے ہی کبھی کبھی ممی کی آنکھوں کے قرینے بھی غم آلودہ سے دکھائی دینے لگتے تھے۔ بالخصوص اس وقت جب کوئی ان کے سامنے ڈیڈی کا ذکر چھیڑتا!

○☆☆○

ٹی اسکول جو کبھی شہر کا معروف ترین نجی تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا قومی تحویل میں لیے جانے کے بعد برسوں سے ”پیلے اسکولوں“ کی برادری کا رکن تھا مگر اس کی خوش قسمتی کہ قومیاے جانے کے بعد بھی اسے ضمیر فاروقی صاحب کی سربراہی حاصل رہی چنانچہ اپنے ہم عصر اداروں میں اب بھی اس کی ایک امتیازی شناخت تھی۔ ہر نئے تعلیمی سال کے آغاز پر ایک منظم طریقہ کار کے تحت جماعت اول میں سختی سے اہلیت کی بنیاد پر داخلے کیے جاتے۔ باقی جماعتوں میں نشستوں کی دستیابی کی شرط پر داخلہ ٹیسٹ کے بعد داخلہ ملتا جو چنداں آسان نہ ہوتا۔

ضمیر فاروقی صاحب ”مقدار“ کے مقابلے میں ”معیار“ کے قائل تھے چنانچہ ادارے کا تعلیمی معیار قومیاے گئے اکثر اداروں کی طرح بگڑنے نہیں پایا تھا۔ بورڈ کے امتحانات میں اس ادارے کے طلباء اب بھی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے اس کی سربلندی اور اساتذہ کی سرخروئی کا باعث بنتے اور یہی وجہ تھی کہ والدین اس ادارے میں اپنے بچوں کے داخلے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔

منتہا کو آغاز کار میں لورڈ مل کلاسوں کی تدریس سونپی گئی لیکن ضمیر فاروقی صاحب کی جو ہر شناس نگاہوں نے جلد ہی اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور دوسرے ہی سال اسے ثانوی جماعتوں کے پیریڈز دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے اس فیصلے پر بعض سینئر اساتذہ انتہائی چہیں بہ جہیں ہوئے۔

اسکول کا نظام الاوقات مرتب کرنے والے سینئر استاد نور عالم صاحب نے ناگواری سے کہا ”فاروقی صاحب کو خدا جانے کیا ہوا ہے ہاؤ کلاسز ایک ایسی لڑکی کو دینے جارہے ہیں جسے اس اسکول میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ نویں دسویں کے لونڈے تو ایسے بد معاش ہیں کہ ہم مردوں کے قبضے میں نہیں آتے ان محترمہ کو کب گھاس ڈالیں گے۔“

”پر لپل صاحب مدظلہ کونٹ نئے تجربات کا از حد شوق ہے“ خالد اشتیاق صاحب طنزاً بولے۔

”آپ درست فرماتے ہیں“ نور عالم صاحب نے خالد اشتیاق کو دیکھا اور تلخ لہجے میں بولے ”میں نے کہا سر، ٹی لڑکی ہے سوچ لیں۔ فرمایا سوچنا کیا ہے نور عالم صاحب، نئے لوگوں کو آزمائے بغیر جانے والے پرانے لوگوں کی جگہیں کیونکر پُر ہوں گی۔ مں منتہا کو نفیس صاحب کے پیریڈز دینے کے لیے کہا گیا ہے۔“

”مزعارف کی کلاس ٹینتھ سی تو ایسی ناخلف ہے کہ محترمہ دوسرے ہی دن کان پکڑتی وہاں سے بھاگیں گی“ شبیہ الحسن نے خیال آرائی کی۔

”جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے“ ثانوی جماعتوں کو اردو کی تدریس پر مامور کالجی صاحب نے بہ آواز بلند کہا۔  
 خواتین اساتذہ بھی پرنسپل صاحب کے اس فیصلے کو بر ملا تنقید کا نشانہ بناتی پائی گئیں۔  
 ”مجھے تو اپنی کلاس کی ابھی سے فکر لگ گئی ہے۔“ مسز عارف نے تشویش ظاہر کی ”خدا جانے کیوں فاروقی صاحب اتنا بڑا رسک لینے کے درپے ہیں۔ بورڈ کلاسز تجربہ کار اور سینئر ٹیچرز کے پاس ہی رہنی چاہئیں۔“  
 ”میں کب سے کہہ رہی ہوں پرنسپل صاحب سے کہ مجھے ہائر کلاسز دی جائیں، مجھے تو دیں نہیں جو نیر موسٹ کو دے رہے ہیں۔ یہ تو ہم سینئرز کو ڈی گریڈ کرنے والی بات ہوئی“ مسز یحییٰ نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔  
 ”آپ نے سنا نہیں مسز یحییٰ جسے پتا چاہے وہی ساگن.... مس منشا آج کل پرنسپل صاحب کی گڈ بکس میں ہیں“  
 مس قیوم بانو کا لہجہ اور مسکراہٹ دونوں معنی خیز تھے۔

”تو بہ کچھ مس قیوم! کیسی باتیں کرتی ہیں، منشا فاروقی صاحب کی چھوٹی بیٹی کی عمر کی ہے“ مسز عالیہ مجتبیٰ بولیں۔  
 مس قیوم خفیف ہو گئیں لیکن اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے تیوری چڑھا کر مسز مجتبیٰ کو دیکھتے ہوئے بولیں ”یہاں تو محاوراتی اردو بھی نہیں بول سکتا آدمی۔ ہمارا مطلب یہ تھا کہ سرکار وقت کو جو بھا جائے اسی کو خلعت شاہانہ عطا کر دیتی ہے۔“

”مس قیوم، براہ کرم آپ محاوراتی اردو ہی بولیں تو بہتر ہے“ چائے کی چسکیاں لیتی مس حنا اشرف مسکرائیں۔  
 مس قیوم بانو نے اب تیوری چڑھا کر مس حنا کو دیکھا پھر پلو بدلتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے بولیں ”ہم شین قاف بگاڑ کر بولنے والوں میں نہیں، اہل زبان ہیں۔“  
 ”دیکھتے ہیں بڑی کلاسوں میں مس منشا صاحبہ کیا تیر مارتی ہیں“ مسز یحییٰ نے اصل موضوع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

حقیقت یہ تھی کہ ضمیر فاروقی صاحب کے اس فیصلے پر خود منشا بھی گھبرائی ہوئی تھی جب انہوں نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر کہا ”مس منشا، آپ کے علم میں ہوگا، ہمارے سینئر ٹیچر نفیس احمد صاحب جلد ہی ایل پی آر پر جارہے ہیں۔“

”جی.... جی سر!“

”ہمارا ارادہ ہے کہ ان کی کلاسیں آپ کو دے دی جائیں۔“  
 منشا نے چونک کر انہیں دیکھا اور گھبرا کر بولی ”نو.... نو سر!“  
 ”کیوں؟“

”سر، میرے لیے مشکل ہوگا۔“

”آپ نے تو سیمس اسٹینٹس کے ساتھ گریجویشن کر رکھی ہے۔“

”جی.... وہ تو ٹھیک ہے سر مگر میرا خیال ہے میں.... میں ہائر کلاسز نہیں لے سکتی۔“

فاروقی صاحب مسکرا دیے ”یہ آپ کا خیال ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ ہائر کلاسز کو بہت اچھی طرح پڑھا سکتی ہیں۔ میں نے آپ کو پڑھاتے دیکھا ہے۔ آپ کے لیسنز آبزرو کیے ہیں۔ مختلف ذرائع سے آپ کے بارے میں فیڈ بیک بھی ملتی رہتی ہے۔ آپ ایک باصلاحیت ٹیچر ہیں۔“

”تھینک یو سر! لیکن....“

”لیکن؟“

”مجھے بڑی کلاسز کو پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔“

فاروقی صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔



”پڑھائیں گی تو تجربہ ہو جائے گا۔“

”سر! پلیز، مجھے چھوٹی کلاسز ہی میں رہنے دیں۔ ہائر کلاسز کو پڑھانا میرے لیے مشکل ہو گا۔“

”میں آپ کو اپنے تجربے کی بات بتاتا ہوں جس منتہا۔ چھوٹی کلاسوں کو پڑھانا بڑی کلاسوں کو پڑھانے کی نسبت کئی اعتبار سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے ساتھ نظم و ضبط بھی سکھانا پڑتا ہے۔ ان کی نئی باتیں سیکھنے کی اہلیت بڑے بچوں کے مقابلے میں کم اور قدرے ست ہوتی ہے۔ اگر ٹیچر کو اپنے تدریسی مضمون پر دسترس ہو تو ثانوی جماعتوں کو پڑھانا اور سمجھانا زیادہ آسان اور زیادہ بار آور بھی ہوتا ہے۔ آپ کے اپنے تعلیمی نتائج اس امر کے غماز ہیں کہ آپ ایک اچھی طالبہ رہی ہیں اور ایک اچھا طالب علم عموماً اچھا استاد بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں نے اس یقین کے ساتھ آپ کو ہائر کلاسز دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ آپ چھوٹی کلاسوں کی طرح بڑی کلاسوں کے لیے بھی ایک اچھی ٹیچر ثابت ہوں گی۔“

”سر!۔۔۔“

”ایسا کریں“ فاروقی صاحب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”کچھ دنوں کو ٹرائل سہی، اگر آپ کو کچھ مشکل ہوئی یا بڑی کلاسوں کے طلباء خدا نخواستہ مطمئن نہ پائے گئے تو ہم آپ کو آپ کی موجودہ کلاسوں میں واپس لے آئیں گے۔“

منتہا پہلے سے بھی زیادہ پریشان دکھائی دینے لگی۔

”کیا بات ہے، آپ اتنی نروس کیوں ہو رہی ہیں؟“

”سر! وہ سر! میں نے اسٹاف روم میں۔۔۔“

”ہاں ہاں بولے، آپ چپ کیوں ہو گئیں۔“

”سر! میں نے ٹیچرز کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ بڑی کلاسز کے لڑکے بہت بد تمیز اور بے ادب ہیں۔“

فاروقی صاحب پھر مسکرا دیے۔

”ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو؟“ انہوں نے منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

منتہا کی نگاہوں سے تجسس جھلک لگا۔

راز کی ایسی کون سی بات بتانے جارہے تھے وہ اسے، جس نے ان کے لبوں پر مسکان بکھیر دی تھی۔

فاروقی صاحب دھیرے سے کہنے لگے ”پھر گویا ہوئے“ ایک ایسا ٹیچر جسے اپنے مضمون پر عبور ہو، جو محنت سے جی نہ چرائے، خلوص نیت اور لگن سے اپنے فرائض منصبی سرانجام دے، طلباء کی خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے کمزوری بن جاتا ہے۔ ایسے استاد سے چھوٹے بچے اگر پیار محبت کرتے اور اس کی ہر بات کو آمنہ صدقہ جانتے ہیں تو بڑی جماعتوں کے طلباء اس کی پرستش کرتے ہیں۔ خود بخود اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اس سے اکتساب کرنا چاہتے ہیں اور اسے اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں۔“

منتہا چپ چاپ ان کی بات سنتی رہی۔

”آزمائیے“ فاروقی صاحب نے کہا۔

”لیکن سر! نفیس صاحب جن کی کلاسز آپ مجھے دینا چاہتے ہیں وہ تو اس اسکول کے بہت سینئر ٹیچر ہیں۔“

”کبھی وہ بھی جو نیئر ہی رہے ہوں گے۔“

ہر راہ مسدود پا کر منتہا نے سر جھکا دیا۔

”دیکھ لیں سر!۔۔۔ آپ کی مرضی۔“

”میری مرضی بلکہ خواہش تو یہی ہے کہ آپ بڑی کلاسز لیں۔“

اسکول کے نظام الاوقات میں مذکورہ تبدیلی کے لیے فاروقی صاحب نے نور عالم صاحب سے بات کی تو وہ اچھلی ہی تو پڑے ”کیا غضب کرتے ہیں سر“ ایک نئی اور نا تجربہ کار ٹیچر کو بڑی کلاسیں دے کر اسکول کا رزلٹ خراب کرانا ہے کیا؟“

”کوئی بات نہیں نور عالم صاحب، کبھی رزلٹ خراب بھی سہی“ فاروقی صاحب نور عالم کی ہڑبڑاہٹ پر مسکرا کر بولے۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں سر!“ نور عالم صاحب نے فاروقی صاحب کو بے یقینی سے دیکھا۔ ان کے لیے پرنسپل صاحب کی یہ بات حیران کن اس لیے تھی کہ پرنسپل صاحب تو بورڈ کے امتحانات میں ہمیشہ اپنے اسکول کے سو فیصد کامیاب نتائج کے خواہاں رہا کرتے تھے۔

”مجبوری ہے نور عالم صاحب!“

”یہ بہت بڑا رسک لینے کی بات کر رہے ہیں سر آپ؟“

”رسک لینا پڑے گا نور عالم صاحب کیونکہ کوئی اور متبادل صورت نظر نہیں آرہی۔ نویں دسویں جماعتوں کے دس سیکشنز ہیں اور انہیں ریاضی پڑھانے والے ہمارے ہاں صرف تین ہی ٹیچرز ہیں بشمول نفیس صاحب۔ جن کے اہل پی آر پر جانے کے دن قریب ہیں۔ باقی دو ٹیچرز دس سیکشنز کو ریاضی پڑھانے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے ساتھ کسی تیسرے ٹیچر کو ضرور لگانا پڑے گا۔ مجھے بتائیے ہمارے باقی اسٹاف ممبرز میں کون ہے جس کا مضمون ریاضی رہا ہو اور وہ بڑی جماعتوں کو پڑھا سکے۔“

”سرنفیس صاحب کی جگہ ڈائریکٹریٹ ہمیں کوئی ٹیچر تو دے گا۔“

”میں نے بات کی تھی ڈائریکٹریٹ سے۔ نفیس صاحب کی جگہ وہ ہمیں ٹیچر ضرور دے گے مگر ریاضی کا ٹیچر ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اردو، اسلامیات اور معاشرتی علوم پڑھانے والوں ہی کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ لہذا اس منتہای کو آزمانا پڑے گا۔“

”اور اس منتہا کی اپنی کلاسیں؟“

”نفیس صاحب کی جگہ کسی ٹیچر کے تبادلے تک ان کلاسوں کے لیے کوئی عارضی بندوبست کرنا پڑے گا مگر بڑی کلاسوں کے لیے ٹیچر کا فوری بندوبست ضروری ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ ان کے پیریڈز خالی جائیں۔ ادھر نفیس صاحب کلاسیں چھوڑیں ادھر دوسری ٹیچر انہیں پڑھانا شروع کر دے۔“

”ٹھیک ہے سر!“ نور عالم صاحب نے بادل ناخواستہ کہا اور پرنسپل صاحب کے دفتر سے اٹھ کر اسٹاف روم میں پہنچنے کے بعد وہ ان کے اس فیصلے کے خلاف دھواں دھار بولے تاہم انہیں اسکول کے نظام الاوقات میں پرنسپل صاحب کی مرضی کے مطابق تبدیلی کرنا ہی پڑی۔

منتہا کو اس کا نیا ٹائم ٹیبل دیتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا ”ایک بات یاد رکھئے گا اس منتہا جب لوگ آپ سے کوئی امید کوئی توقع وابستہ کر لیں تو آپ کی کوشش ہونی چاہیے کہ انہیں مایوس نہ کریں۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟“

”یس سر!“

”گڈ! یہ رہا آپ کا نیا ٹائم ٹیبل!“

”تھینک یو سر!“

”بجائے یہ کہنے کے کہ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں اور آپ کی سرخروئی کا متمنی ہوں“ میں یہ کہوں گا کہ میں آپ کو آپ کا یہ نیا ٹائم ٹیبل دیتے ہوئے خود اپنی سرخروئی کا متمنی ہوں۔“



منتہا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔

منتہا باطن انتہائی متوحش تھی کہ فاروقی صاحب کے اعتماد پر پوری بھی اُتر سکے گی یا نہیں۔  
اپنا نیا ٹائم ٹیبل لے کر وہ اسٹاف روم میں پہنچی تو مرس حنا اشرف نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا "نیا ٹائم ٹیبل مبارک ہو مرس منتہا!"

اس نے چونک کر مرس حنا کو دیکھا۔ نیا ٹائم ٹیبل تو اس کے بیک میں تھا، انہیں کیسے الہام ہو گیا تھا۔  
"ابھی ابھی سلیم آیا تھا اسٹاف روم میں مسز نقوی سے کسی آفیشل لیٹر پراسائن کروانے، اس سے پتا چلا کہ پرنسپل صاحب نے آپ کو آپ کا نیا ٹائم ٹیبل اپنے دست مبارک سے دینے کے لیے اپنے آفس میں طلب فرما رکھا ہے۔"  
مرس حنا اشرف حسبِ عادت اٹھلا اٹھلا کر بولیں۔  
"مبارک ہو!" مسز یحییٰ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

منتہا نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا پھر اسٹاف روم میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ اسٹاف روم میں فضہ مختار کی موجودگی اسے طمانیت بخش گئی۔  
"گر بہ کشتن روز اول مرس منتہا... نا منہ ٹینتھ کے طلبا انتہائی بے لگام اور گستاخ ہیں۔ اول دن سے ہی ہاتھ ذرا سخت رکھے گا" مرس قیوم بانو نے بظاہر بڑے دلسوز لہجے میں صلاح دی۔  
منتہا کی نگاہیں فضہ کی نگاہوں سے ملیں۔  
"مرس قیوم بانو گھر کی مرغی دال برابر" ہمارے نیچے دوسرے اسکولوں کے بچوں سے پھر بھی بہت بہتر ہیں" مسز سائرہ ملک بولیں۔

منتہا چپ چاپ اپنی مخصوص کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ فضہ اس کی کرسی کے دائیں جانب اپنی کرسی پر بیٹھی چپ چاپ اسے دیکھتی رہی اور اس کے بیٹھ جانے کے بعد اسے شوکا دیتے ہوئے سرگوشی میں بولی "اے! تم نے منہ اتنا لٹکا کیوں رکھا ہے۔"

منتہا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فضہ کو باہر چلنے کا اشارہ دیا۔

دونوں اپنے اپنے بیک اٹھا کر اسٹاف روم سے باہر آ گئیں۔ اسٹاف روم سے چند قدم دور نکل آنے کے بعد منتہا نے ایک گہری سانس کھینچی اور کہا "توبہ توبہ" مجھے تو اسٹاف روم میں کبھی کبھی وحشت ہونے لگتی ہے۔"  
فضہ چلتے چلتے ٹھنک گئی۔

"کبھی!" اس نے فقط ایک ہی لفظ کہا۔

منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

"اسٹاف روم میں اگر تم نہ ہو اکرو تو میں تو شاید اپنی کرسی گراؤنڈ میں کسی درخت کے نیچے ڈلوالوں۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ کسی درخت کے نیچے دھونی رما کر بیٹھ جاؤں" فضہ بولی۔

"وقت پڑا تو یہ بھی کر لیں گے۔"

فضہ ہنس دی۔

"نیا ٹائم ٹیبل مل گیا؟"

"ہاں" منتہا نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

"خیریت!"

"نئے ٹائم ٹیبل نے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے۔"

”کیوں بھی؟“  
 ”پرنسپل صاحب کہہ رہے تھے جب دوسرے لوگ آپ سے کوئی امید کوئی توقع وابستہ کر لیں تو آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انہیں مایوس نہ کریں۔“

”فاروقی صاحب کی یہی باتیں تو بندے کو آگے بڑھنے اور دوسروں کی توقعات پر پورا اُترنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔“  
 ”تمہیں ملتا یہ ٹائم ٹیبل تو پوچھتی میں تم سے“ منتہا نے شاکی نگاہوں سے فضہ کو دیکھا۔  
 ”کیا پوچھتیں؟“

”سنتی نہیں ہو کیا روزانہ اسٹاف روم میں بڑی کلاسوں کے لڑکوں کے قصے، کل ہی کی تو بات ہے“ نامنتہا بی میں  
 مس روجی بلیک بورڈ کی طرف منہ کیے بچوں کو کوئی نیا میریکل سمجھا رہی تھیں کہ کسی نے چاک کا ٹکڑا ان کی پشت پر  
 دے مارا۔“

”ہاں تو تم نے کل مس روجی کا لباس دیکھا تھا!“

”اس بد تمیزی کا اُن کے لباس سے کیا تعلق!“

”سی تھرو لان کا آف وائٹ سوٹ اور گلے میں ڈوری نما دوپٹا ڈال کر کلاس میں جائیں گی تو بڑے تو بڑے چھوٹے  
 لڑکے بھی ان کی اس بے حیائی پر متنبہ کرنے کو چاک کا ٹکڑا کیا پتھر مارنے سے بھی گریز نہیں کریں گے“ فضہ نے کہا۔  
 ”بھئی سنا ہے بڑے لڑکے ٹیچرز کو ویسے بھی بہت عاجز رکھتے ہیں اپنی حرکتوں سے۔“

”صرف ان ٹیچرز کو مائی ڈیر جو پڑھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ پڑھاتے ہیں تو بے دلی اور بے رغبتی سے۔ سید  
 علی اور مس کرٹینا جیسے ٹیچرز بھی تو ہیں جنہیں بڑی کلاسوں سے کوئی شکایت نہیں۔“  
 ”ہاں واقعی، ان دونوں کا بہت احترام کرتے دیکھا ہے میں نے لڑکوں کو“ منتہا نے کہا۔

فضہ نے اپنا ہاتھ منتہا کے شانے پر دھر دیا۔

”آئی ایم شیور ڈیر، تمہیں ان سے بھی زیادہ احترام دیں گے لڑکے کیونکہ...“ فضہ نے اپنی بات ادھوری  
 چھوڑ دی۔

”ہاں بولو۔۔۔ چپ کیوں ہو گئیں؟“

”تم کو ایفائیڈ ہو، محنتی ہو اور بچوں کو ڈوب کر پڑھاتی ہو۔“

”ڈوب کر کہاں ڈوب کر بھی!“

”خلوص نیت سے جذبے کی صداقت کے ساتھ، لگن، ترمک اور امنگ کے ساتھ۔“

منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

”فارگاڈسک مس قیوم بانو کی زبان میں بات کر کے میری زبان دانی کا امتحان مت لو۔ تمہیں پتا ہے میرا ذخیرہ  
 الفاظ کتنا محدود ہے؟“

”میں تمہارے ذخیرہ الفاظ کی حدود سے اچھی طرح آگاہ ہوں ڈیر!“ فضہ نے اسے ذومعنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے  
 ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اچھا پلیز اب یہ تو بتاؤ اس نے ٹائم ٹیبل کا میں کیا کروں؟“

”اوں!“ فضہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور چہرے کے زیر دم سے گہری سوچ میں پڑنے کا  
 تاثر دینے کی کوشش کی پھر چار پانچ سیکنڈ بعد آنکھیں کھول کر مسکراتے ہوئے بولی ”ایک تو یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس کا  
 اچار ڈال لو۔ سنا ہے نے ٹائم ٹیبل کا اچار بڑا مزے دار ہوتا ہے۔“

منتہا نے اسے پیار سے کھورا۔



فضہ اس کے گھورنے کو بڑی بے نیازی سے نظر انداز کر کے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی "دوسری ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ تم بسم اللہ کر کے نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق کلاسیں لینا شروع کرو، اللہ شفا دے گا۔" منہانے ایک گہری سانس کھینچی۔

"یہی کرنا پڑے گا۔"

"تو پھر پریشان کیوں ہو" فضہ نے اسے ٹھوکا دیا اور حوصلہ افزا لہجے میں بولی "گواہیڈ ڈیر!"

○☆☆○

اسکول سے گھر واپسی پر کھانے کے دوران منہانے کو جب تک دن بھر کی روئیداد نہ سنا لیتی اسے اطمینان نہ ہوتا۔ اس دوران می بھی اسے گھر کے معمولی اور غیر معمولی حالات سے آگاہ کرنا نہ بھولتیں۔ تصویر زندگی سے ڈیڈی کے نکلتے ہی وہ اور می ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئی تھیں کہ منہانے کو دوئی کا تصور بھی گراں لگتا۔

معمول کے مطابق اس روز بھی اسکول سے گھر واپس لوٹنے پر کھانے کے دوران میں اس نے می کو اپنے نئے ٹائم ٹیبل کی خبر سنانی ضروری سمجھی۔

"چلو اچھا ہے بڑی کلاسوں کو پڑھانے سے تمہاری اپنی قابلیت میں بھی اضافہ ہوگا اور تجربہ بھی بڑھے گا" می بولیں۔

"اوہ والدہ مجھے تو سخت ڈر لگ رہا ہے۔ فاروقی صاحب کی توقع پر پورا نہ اُتر پائی میں تو..."

"تو کیا ہوگا... قیامت تو نہیں آجائے گی۔ اول تو توقع پر پورا کیوں نہ اُترے گی بھلا" ارے بھی تمہارا اپنا سبجیکٹ ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے والدہ لیکن..."

"لیکن وہ کچھ نہیں بیٹا... آخر زندگی کی اتنی کڑی آزمائش سے بھی تو گزری گئے ہم... کبھی سوچا تھا ہم نے کہ زندگی آسانشوں کے بغیر بھی گزارا جاسکتی ہے۔ کار کے بغیر گھر سے قدم نکالنے کا تصور محال تھا ہمارے لیے... کبھی کبھی جب مجھے وہ دن یاد آتا ہے جب میں تمہیں اور نیہ کو پبلک بس سے کالج لے جانے کے لیے تم دونوں کو لے کر بھائی جان کے گھر سے نکلی تھی اور بس اسٹاپ پر جا کر بھری بھری بسوں کو دیکھتے ہوئے نیہ وحشت زدہ ہوئی جاتی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور ٹھنڈا ہوا جارہا تھا۔ اس دن کو یاد کر کے مجھے تکلیف ہوتی ہے مگر... دیکھ لو اب وہی نیہ کتنے اطمینان سے پبلک بسوں میں آتی جاتی ہے۔ وقت سب کچھ سکھارتا ہے میرے بچے!"

منہانے کو می کی آنکھوں میں ہلکی سی آبی رو دکھائی دی "اس نے دیر سے می کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔"

"آپ پرانے دنوں کو یاد نہ کیا کریں۔"

"کاش! ایسا ہو سکتا... مگر ایسا نہیں ہو سکتا" می نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"آج نیہ اور ملیب دونوں ہی کیوں غائب ہیں والدہ!" منہانے می کو رنجور دیکھ کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"ملیب کی یونیورسٹی میں تو آج کوئی پروگرام ہے، دیر سے آنے کا کہہ گیا ہے۔ نیہ کا پریکٹیکل ہے اس لیے دیر سے آئے گی۔"

"پتا نہیں ڈیڈی کو بھی یہ خبر ہے کہ نہیں کہ نیہ میڈیکل میں ہے۔"

"اگر خبر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے بیٹا... جو لوگ اپنے لیے جیتے ہیں انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے زندہ ہیں یا... می کی آواز رندھ گئی اور انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔"

”آپ انہیں بھول نہیں پائیں.... ہے نا؟“  
 می نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر نظریں چراتے ہوئے بولیں ”یہ بات نہیں۔“  
 ”یہی بات ہے۔“

”میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے“ می نے نظریں بدستور چرائے رکھیں۔  
 ”بالکل غلط... اگر آپ نے سب کچھ نہ سہی صرف ڈیڈی جان ہی کو بھلا دیا ہوتا تو ان کے ذکر پر آپ کی آنکھوں میں یوں آنسو نہ آجایا کرتے۔“  
 می نے پھر بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کسی بیدرد شکاری کے تیرے گھائل ہرن کی آنکھوں جیسی لرزاں وحشت تھی۔  
 ”جب ان کے ذکر پر آپ کی آنکھوں میں چپکے سے نمی آجاتی ہے نا تو میرا دل اداس ہو جاتا ہے والدہ.... انہیں بھلا دیں۔“

می کے لبوں پر بڑی کرب انگیزی مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے ایک گھٹی گھٹی سی سرد آہ کھینچی پھر بولیں  
 ”بہت سے اچھے دن بھی تو گزار رکھے ہیں میں نے تمہارے ڈیڈی کے ساتھ۔“  
 منتہا کو تعجب ہوا۔

”کسی نے سچ ہی کہا ہے“ وہ گویا خود کلامی کی کیفیت میں بولی۔  
 ”کیا؟“ می نے چونک کر پوچھا۔

”عورت ایک پہیلی۔“

”مگر مرد سے کم مشکل.... وہ تو آخر تک اپنا کوئی سراغ کوئی پتا نہیں دیتا۔ تمہارے ڈیڈی بظاہر کتنے شریف اور سیدھے سادے سے آدمی تھے مگر دوسری شادی انہوں نے اتنی خاموشی سے کی کہ مجھے کانوں کان ہوا نہ لگنے دی اور جب یہ بھید اوروں کی زبانی کھلا تو انہوں نے مجھ سے یکایک یوں نگاہیں پھیر لیں جیسے کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا اور نہ صرف مجھ سے بلکہ اپنی اولاد سے بھی بیگانہ ہو گئے۔“

”آپ کو یاد ہو گا ہم نے ایک روز تہیہ کیا تھا کہ ڈیڈی کا ذکر اپنے گھر میں کبھی نہیں ہونے دیں گے۔“  
 می نے پھر ایک سرد آہ کھینچی۔

”بعض باتوں کے معاملے میں انسان اتنا بے اختیار ہوتا ہے جیسا کہ ہر عہد اس کا منہ چڑا جاتا ہے۔“

”مجھے آپ کی آسیر یاد چاہیے والدہ!“

”کس لیے؟“ می نے چونک کر پوچھا۔

”بڑی کلاسوں کو پڑھانے کے لیے۔“

”اللہ تمہاری مدد کرے اور ہاں، ایک بات یاد رکھنا، اللہ انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ماں کی دعائیں تمہارے ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہیں میرے بچے۔“  
 ”بس تو پھر مجھے نہ پریشان ہونے کی ضرورت نہ! ادھر ادھر دیکھنے کی۔“

○☆☆○

منتہا کی اپنی گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ، ساتھیوں کے خدشات، اعتراضات اور قیاس آرائیاں سب دھڑے رہ گئے۔  
 فاروقی صاحب کی توقعات پر پورا اُترنے کے لیے اس نے اپنی تمام تر صلاحیت اور توانائی کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لانے کی کوشش کی۔

کلاس میں جانے سے پہلے وہ سبق کی اچھی طرح تیاری کرتی۔ بچوں کو کوئی نئی مشق شروع کروانے سے قبل وہ



ایک طالب علم کی طرح اس مشق کا ایک ایک سوال خود حل کرنے کی کوشش کرتی تاکہ دورانِ تدریس اپنے شاگردوں کے سامنے کہیں اٹکنے نہ پائے۔ وہ طلباء کے ممکنہ سوالات پر نظر رکھ کر ان کے جوابات بھی ذہن میں رکھتی تاکہ طلباء کی جانب سے کسی سوال کی صورت میں انہیں مطمئن کر سکے۔

اپنا پیریڈ شروع ہوتے ہی وہ کلاس میں اتنی مستعدی سے پہنچتی جیسے کوئی چاق چوبند سپاہی اپنے محاذ پر پہنچے۔ طلباء اس کے منتظر ہوتے اور کلاس میں اس کے داخل ہوتے ہی احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ وہ سلام میں ہمیشہ پہل کرتی اور سلام کا جواب پانے اور بچوں کے بیٹھ جانے کے بعد کلاس .... کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک بھرپور نظر ڈالتی۔ کسی طالب علم کو ذرا سا بھی بے قاعدہ یا عدم متوجہ پاکر وہ اس کا نام لے کر اسے ٹوکتی۔ طلباء کے نام یاد رکھنے میں اسے بلا کا کمال حاصل تھا۔ نویں جماعت کے ایک فریق میں اظہر نام کے چار لڑکے تھے اور اسے ہمیشہ یاد رہتا کہ ان میں سے محمد اظہر کون تھا، اظہر محمد کون، کس کے نام کے ساتھ احمد لگتا تھا اور کون سے اظہر کا سر نیم فاروق تھا۔ ڈیٹی مانیٹر کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کا پیریڈ شروع ہوتے ہی جماعت کے کمرے میں اس کے پہنچنے سے قبل یہ دیکھ لے کہ استاد کی میز پر چاک، جھاڑن، درسی کتاب اور جیومیٹری کے پیریڈ میں استاد کا جیومیٹری بکس موجود ہے۔ کلاس مانیٹر کو اس نے یہ ذمہ داری تفویض کر رکھی تھی کہ جماعت کے کمرے میں اس کے پہنچنے سے قبل تختہ سیاہ صاف کر کے تاریخ، مضمون، مشق نمبر اور ٹیچر کا نام تختہ سیاہ کے بائیں جانب بالائی حصے میں درج کر دے۔ سبق شروع کرنے سے قبل وہ ہر جماعت میں طلباء کی اخلاقی تربیت کے لیے خواہ ایک آدھ منٹ ہی کو سہی کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتی۔

پھر تدریس کا باضابطہ آغاز ہو جاتا۔ لمحے تیزی سے سرکتے چلے جاتے۔ طلباء انتہائی انہماک سے متوجہ رہتے۔ اگر کبھی اسے اس انہماک میں ذرا سی بھی کمی کا احساس ہوتا وہ رسمی تدریس کا سلسلہ ایک دو منٹ کو روک کر طلباء سے عمومی دلچسپی کی کوئی ایسی بات کر لیتی جو انہیں تعلیم کے لیے از سر نو تازہ دم کر دیتی اور جماعت کے کمرے میں زندگی، استاد اور شاگردوں کے مابین قربت اور حصولِ علم کی مسرت کا احساس موجزن ہو جاتا۔

پیریڈ ختم ہونے پر جب وہ جماعت کے کمرے سے جانے کو پر تو لیتی تو طلباء کے چہروں پر تکان، عدم توجہی اور بیزاری نہیں، تراوٹ اور کچھ پانے اور سیکھ لینے کی خوشی کا احساس ہوتا۔

”تھینک یو میڈم!“ وہ سب ایک آواز میں کہتے۔

منتہا کے رگ و پے میں ایک ناقابلِ بیان سرخوشی سراپت کر جاتی۔

فری پیریڈ کے دوران میں جب اس کی ساتھیاں گپ شپ کرنے میں مصروف ہوتیں، وہ اسٹاف روم کے ایک گوشے میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کاپیاں چیک کر رہی ہوتی۔ وقفے کے دوران جب کھانے پینے کا ذور گرم ہوتا تو وہ ایک ہاتھ میں چائے کا مک لیے درسی کتاب کھولے آئندہ اسباق پر نظر ڈال رہی ہوتی۔ چھٹی کے بعد جب وہ پڑتال کے لیے باقی رہ جانے والی کاپیوں کا پلندہ اپنے ساتھ گھر لے جانے کے لیے لے کر اٹھتی تو دن بھر مصروفیت اور کلاسوں میں مسلسل بولتے رہنے کی وجہ سے اسے اپنے حلق میں دھکن محسوس ہو رہی ہوتی اور فری پیریڈ میں مسلسل کاپیوں کی پڑتال کے باعث سر اور آنکھوں میں تکلیف کا احساس ہوتا مگر دل کے کہیں اندر بہت ہی اطمینان سا محسوس ہوتا۔ اپنا غم دوسروں کو منتقل کر دینے کی طمانیت اور سرخوشی!

سخت گیر مرد اساتذہ کے پیریڈز سے بھاگ کر اسکول میں ادھر ادھر جا چھپنے والے لڑکے بھی اس کے پیریڈ میں ذوق و شوق سے حاضر رہتے۔

”بس منتہا کا پیریڈ ہے یا ر!“ ایک دوسرے کو مطلع کیا جاتا۔

”بس منتہا کی کیا بات ہے!“

”بہت زبردست نیچر ہیں۔“  
 ”اُن کا پیریڈ کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا ہے یار۔“  
 ”فٹا سٹک!“

”کیا اسٹاکل ہے اُن کے پڑھانے کا!“  
 ”جو پڑھاتی ہیں دماغ پر جیسے نقش ہوتا چلا جاتا ہے۔“  
 ”مس منتہا کا پیریڈ تو پتا ہی نہیں چلتا کب شروع ہوا، کب ختم۔“  
 ”مس منتہا کا پیریڈ کبھی ضائع نہیں ہونے دیتیں، کلاس میں ایک بھی لڑکا ہو تو پڑھانا شروع کر دیتی ہیں۔“  
 ”آج ٹیسٹ ہے یار، مس منتہا کے سبیکٹ میں فیل ہونے کو جی نہیں چاہتا۔“  
 ”مس منتہا کے سبیکٹ میں تو بندے کو یوشن لینے کی ضرورت ہی نہیں۔“  
 دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی میں لڑکوں نے بر ملا نعرے لگائے۔  
 ”ایسٹ اینڈ ویسٹ۔ مس منتہا دی بیسٹ۔“

اسی تقریب میں منتہا کو ”بیسٹ نیچر آف دی ایئر“ کا خطاب دیا گیا اور جب وہ اپنا ٹائٹل لینے کے لیے اپنی نشست سے اٹھ کر اسٹیج تک گئی تو اس کی واپسی کے بعد بھی اتنی دیر تک ہال میں تالیاں گونجتی رہیں کہ اپنی اس پذیرائی پر اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔



گو منتہا اتنی لگن اور جذبے سے طلباء کو پڑھاتی کہ ان میں سے اکثر کو دیگر مضامین کی طرح اس کے مضمون میں یوشن لینے کی ضرورت نہ پڑتی لیکن پھر بھی کمزور بچے امتحانی نقطہ نظر سے اپنی کمزوریاں دور کرنے کو اور اچھے بچے زیادہ بہتر نمبر لینے کی خاطر یوشن کے سلسلے میں اس سے رجوع کرتے۔ اس کے اپنے اسکول ہی نہیں دوسرے اسکولوں کے طلباء بھی اس سے یوشن لینے کے لیے اس کے پاس آتے۔ چھوٹے بچوں کو یوشن پڑھانے میں سرکھپائی زیادہ تھی، بڑوں کو پڑھانے میں لطف آتا۔  
 یوشن سزاس کی ضرورت بھی تھی۔

اور پھر اس کی ایک سینئر ساتھی نے ایک مرتبہ کہا تھا جیسے پرائیویٹ پریکٹس ڈاکٹر کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ مریضوں سے اس کے قریبی روابط کا ذریعہ بنتی ہے، ویسے ہی پرائیویٹ یوشن سز بھی استاد اور شاگردوں کے قریبی رابطے کا باعث بنتی ہے۔ آپ کو دوسرے اداروں سے آنے والے طلباء سے ان اداروں کی کارکردگی کا پتا چلتا ہے اور آپ بہت سی نئی باتیں سیکھتے ہیں اور آپ کو اپنی کارکردگی بہتر بنانے کے مواقع ملتے ہیں۔“

منتہا کے پاس اتنے بچے یوشن لینے کے لیے آتے کہ اسے رات تک فرصت میسر نہ آتی۔ یوشن سز سے ہونے والی آمدن نے زندگی کے کتنے بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد دی تھی!

اسے بڑی کلاسیں دیتے وقت پرنسپل صاحب نے اس پر جس بھروسے اور اعتماد کا اظہار کیا تھا، اس نے ان کے اس اعتماد کو نہیں نہیں پہنچنے دی تھی۔

صرف دو تین سالوں میں وہ ادارے کی ایک مقتدر نیچر قرار پا چکی تھی۔  
 پرنسپل صاحب نے بڑی تحمل مزاجی سے سارا منظر دیکھا تھا۔

منتہا کے چھوٹی جماعتوں سے بڑی جماعتوں میں جانے اور اپنی کارکردگی سے طلباء کی من چاہی استاد بننے کا منظر! تین سال بعد انہوں نے اسکول کا نظام الاوقات مرتب کرنے والے نور عالم صاحب سے کہا ”کہئے نور عالم صاحب، مس منتہا کو بڑی کلاسوں میں لے جانے کا فیصلہ کیسا رہا؟“



”زبردست سرا! آپ کے انتخاب کی داد دی جاتی ہے۔ لڑکے بھی بہت خوش ہیں مس منٹھا ہے۔“  
 ”لڑکوں کی خوشی کی تو آپ بات نہ کیجئے“ فاروقی صاحب دھیرے سے مسکرا کر بولے۔ ”لڑکے خوش تو اس ٹیچر سے  
 بھی بہت ہوتے ہیں جو انہیں پڑھنے اور اپنے آپ کو پڑھانے کی صعوبت میں ڈالنے کے بجائے خود بھی عیش کرتا ہے،  
 انہیں بھی بے عمل رکھتا ہے، آپ کے تجربے میں ضرور آئے ہوں گے ایسے ٹیچر۔“  
 ”جی..... جی سرا!“ نور عالم صاحب سمجھ گئے کہ ان کا اشارہ کس کس کی طرف تھا۔

ایسے متعدد اساتذہ موجود تھے اسکول میں جو فاروقی صاحب کے بے حد دروں میں اور انتہائی با اصول منتظم ہونے  
 کے باوجود اکثر طرح دے جایا کرتے تھے۔ ایسوں پر فاروقی صاحب کی یہ بات بھی اثر نہ کرتی جو وہ اسٹاف میٹنگز میں اکثر  
 دہرایا کرتے تھے کہ ایک تعلیمی ادارے کا سربراہ اپنے ماتحت اساتذہ کو کلاس رومز میں جانے پر تو مجبور کر سکتا ہے لیکن  
 انہیں پڑھانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جماعت کے کمرے میں جانے کے بعد وہی استاد پڑھائے گا جسے اپنے فرائض  
 منصبی کا احساس ہوگا۔

”طلباء میں مس منٹھا کی مقبولیت کا سبب یہ ہے نور عالم صاحب کہ انہیں اپنے فرائض منصبی کا خاطر خواہ احساس  
 ہے اور وہ بچوں کو انتہائی ذوق و شوق سے پڑھاتی ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، سرجن ادریس بھی کانون آیا تھا میرے  
 پاس کہہ رہے تھے میرا بیٹا اپنی میٹھ میٹھس ٹیچر سے بہت خوش اور مطمئن ہے۔“

”بھئی وائس پرنسپل مسز زیدی پرنسپل صاحب کے کمرے کے دروازے پر وارد ہوئیں اور انہوں نے مداخلت کی  
 معافی چاہتے ہوئے نور عالم صاحب سے کہا ”نور صاحب، ٹینتھ ای آج آپ کے پیریڈ میں مس منٹھا سے پڑھنا چاہ رہی  
 ہے۔ آپ کا تو شاید کورس ختم ہو چکا ہے۔ اگر اجازت دیں تو میں منٹھا کا پیریڈ لگا دوں۔“  
 ”ننگی اور پوچھ پوچھ“ نور عالم صاحب مسکرا کر بولے۔

”تھینک یو۔“ مسز زیدی واپس جانے کو مڑیں اور جاتے جاتے بولیں ”ویسے منٹھا بے چاری کو آج بھی ایک پیریڈ  
 فری ملنا تھا۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میڈم، ٹائم ٹیبل میں ہر ٹیچر کو روزانہ کم سے کم دو پیریڈز ضرور فری دیے ہیں میں نے“  
 نور عالم صاحب نے مدافعت لہجے میں کہا۔

”جی، جی!“ مسز زیدی جاتے جاتے گردن موڑ کر بولیں ”مجھے معلوم ہے مگر آج فرسٹ ہاف میں منٹھا کا فری پیریڈ  
 ٹانٹھ سی نے اپنے گیسز پیریڈ میں لگوا لیا تھا۔ لڑکوں کا بس چلے تو بے چاری منٹھا کو ایک پیریڈ بھی فری نہ ملنے دیں۔“  
 فاروقی صاحب اور نور عالم صاحب کی نظریں باہم ملیں اور ان کے لبوں پر بڑی اطمینان آمیزی مسکراہٹ پھیل  
 گئی۔



پہلے اسکول میں منٹھا کی ملازمت کا حاصل مسز ظہیر سے اس کی دوستی تھی تو ٹی اسکول میں فضا کی بہترین  
 دوست ٹھہری۔

فضا کا پورا نام فضا مختار تھا۔ مختار فضا کی زوجیت تھی۔ خوش رو، خوش لباس اور خوش سیرت فضا کی اسمارٹنس  
 دیکھ کر یہ یقین کرنا ہی محال تھا کہ وہ شادی شدہ تھی، کچا تین بچوں کی ماں ہوتا!

منٹھا تو اس اسکول میں اپنی ملازمت کے ابتدائی چند دنوں میں فضا کی خوش لباسی اور اسمارٹنس دیکھ کر یہی باور  
 کیے رہی کہ وہ ”مس“ تھی لیکن ایک روز اساتذہ کے حاضری رجسٹر میں فضا کے نام کے ساتھ ”مسز“ دیکھ کر وہ چونک  
 گئی۔

”مس فضا، آپ کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ آپ مسز ہوں گی“ اس نے فضا پر اپنے استعجاب کا براہ راست

اظہار کر ڈالا۔

”اچھا! فضلہ مسکرا دی ”تو پھر کیا یقین آتا ہے؟“  
”یقین ہی آتا ہے کہ آپ ان میریڈ ہوں گی۔ دو چار سال پہلے تعلیم مکمل کر کے جاب شروع کی ہوگی۔“  
”ارے نہیں“ فضلہ بڑے ہی دلنشین انداز میں مسکرائی ”آٹھ سال کا تو میرا چھوٹا بیٹا ہے۔“  
”ریلی!“ منتہا کے لیے یہ انکشاف اور بھی استعجاب انگیز تھا ”کیا آپ کے بچے بھی ہیں؟“

”ہاں... تین!“  
”گڈ گاڈ! یقین نہیں آتا۔“  
فضلہ کا چہرہ تھمتانے لگا۔

”میرا بڑا بیٹا راول ساتویں جماعت میں ہے، چھوٹا سانول تیسری میں پڑھتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بیٹی ہے،  
رائیل جو پانچویں جماعت میں ہے۔ تینوں کو میں نے گھر کے نزدیک ہی ایک اسکول میں داخل کر رکھا ہے۔“  
”یہاں کیوں نہیں؟“

”یہ دور پڑتا ہے اور میں اس بات کی قائل ہوں کہ بچے کا اسکول گھر سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔“  
”مگر معیار کا بھی تو مسئلہ ہوتا ہے؟“

”آپ بچے کو کتنے ہی اعلیٰ درجہ ادارے میں پڑھوائیں جب تک اسے گھر پر والدین کی توجہ اور مدد حاصل نہ ہوگی،  
وہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر پائے گا۔ میں نے تو اپنے بچوں کو ایک چھوٹے اور معمولی سے اسکول میں داخل  
کر دیا رکھا ہے البتہ خود گھر پر انہیں پوری توجہ دیتی ہوں اور شام کو دو تین گھنٹے انہیں پڑھاتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے وہ کسی  
بھی بڑے تعلیمی ادارے کے طلبہ سے کمتر نہیں۔ کبھی میرے ساتھ آئے تو دیکھنا، ماشاء اللہ کیسے پُر اعتماد ہیں تینوں۔“  
الفاظ ”اظہار“ معلومات ہر معاملے میں پرفیکٹ!“

”یقیناً ہوں گے“ آپ کے بچے جو ہیں۔“  
”اوہ نوا! یہ بات نہیں“ فضلہ نے جھینپ کر کہا۔

”آپ کس نفسی سے کام نہ لیجئے۔ اس اسکول میں آپ واحد خاتون ہیں جو مجھے ہر لحاظ سے اچھی لگی ہیں۔“  
”تھینک یو... تھینک یو... عزت افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!“

فضلہ سے یہ منتہا کی پہلی قدرے تفصیلی بات چیت تھی ورنہ اس سے پہلے صرف ہیلو ہائے ہی چل رہی تھی۔ تاہم  
یہ سچ تھا کہ اسکول کی خواتین اساتذہ میں فضلہ اسے ہر اعتبار سے اچھی لگی تھی۔ وہ خوش رو اور خوش لباس تو تھی ہی  
اس کے انداز و اطوار میں ایک خاص سلیقہ اور گفتگو میں بلا کی چاشنی تھی۔

ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پروفیسر عثمان فاروقی نے ایک روز اپنے ایک لیکچر کے دوران میں کہا تھا ”جدید تحقیق بتاتی ہے  
کہ ہر انسان کے وجود سے ایک مخصوص خوشبو پھوٹتی ہے۔ یکساں خوشبو کے حامل وجود آپ ہی آپ ایک دوسرے کی  
جانب کشش محسوس کرتے ہیں اور محبت و دوستی کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔“

منتہا کو ان کی اس بات میں خاصی رومانویت محسوس ہوئی تھی!

فضلہ کے وجود سے یقیناً وہی ہی خوشبو پھوٹتی تھی جیسی منتہا کے اپنے وجود سے تبھی تو دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گہری  
دوستی کے بندھن میں بندھ گئی تھیں۔ اسٹاف روم میں ہوتیں تو دونوں ایک مخصوص گوشے میں ساتھ ساتھ بیٹھتیں۔  
وقفے میں اکٹھے چائے پیتیں۔ بیک وقت فری پریڈ ملتا تو ساتھ ساتھ بیٹھ کر کاپیوں کی پڑتال یا آئندہ اسباق پر نظر  
ڈالتیں۔ کبھی کبھی اسٹاف روم کے اس مخصوص گوشے میں چپکے چپکے ہی یا گراؤنڈ میں یا لان پر ٹہلتے ہوئے دھیمے لہجے  
میں نجی باتیں بھی کر لیتیں۔ وقفے وقفے سے فضلہ نے اپنی نجی زندگی کے بارے میں منتہا کو جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے لیے



انتہائی حیران کن تھا۔ ہنستے مسکراتے اور بظاہر بڑے مطمئن اور آسودہ چہروں کے پیچھے بسا اوقات کیسی درد انگیز کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔

○☆☆○

فضہ کا تعلق ایک خوش حال گھرانے سے تھا۔ چھ بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھی۔ میٹرک میں تھی کہ والدین نے ایک غیر خاندان میں اس کا رشتہ طے کر دیا۔ میٹرک کا امتحان دیتے ہی شادی بھی ہو گئی۔ سرال انتہائی متمول تھی۔ اپنے بیگانوں بھی نے فضہ کی شادی اس قدر امیر گھرانے میں ہونے پر اسے مقدر کی دھنی قرار دیا مگر فضہ چاندی کی منقش اور زرد جوہرات سے مرصع چھپر کھٹ پر آراستہ جلد عروسی سے باہر نکلی تو اسے سرال کا ماحول بہت ہی عجیب اور نامانوس سا لگا۔ حویلی کی بلند وبالا دیواروں کے بیچ انتہائی امارت مگر جمالت اور بربریت تھی۔ ان دیواروں کے بیچ حویلی کی عورتیں مردوں کی محکوم بن کر رہتیں۔ ان کے زرق برق ملبوسات اور بیش قیمت زیورات انہیں حویلی کے مردوں کے سامنے زبان کھولنے کی اجازت نہ دیتے۔ مردوں کا جو جی چاہتا کرتے، عورتوں کو لب کشائی کی اجازت بھی نہ تھی۔ حویلی میں عورتوں کے استحصال کی بدترین صورت فضہ کو اپنے شوہر کی پھوپھی ماہتاب کی صورت نظر آئی۔ پھوپھی ماہتاب کی شادی اپنے چچا زاد سے ہوئی تھی مگر بد قسمتی سے شادی کے دو ماہ بعد ہی شوہر کے انتقال نے انہیں صرف سترہ برس کی عمر میں بیوگی کی چادر اوڑھادی۔ تقریباً چار پانچ سال وہ خوشیوں سے کٹی سرال کے ایک کمرے میں محصور ورنجور پڑی رہیں، میکے والے بھی گویا انہیں بھولے رہے۔ پھر چند ہی خواہوں کے سمجھانے بچھانے پر پھوپھی ماہتاب نے چپ چاپ اپنے ہی گاؤں کے ایک آدمی سے نکاح کر لیا اور دونوں راتوں رات ایک دوسرے گاؤں چلے گئے۔ پھوپھی ماہتاب کے اپنی سرال سے فرار کی خبر ان کے میکے پہنچی تو باپ اور بھائیوں نے ان کی تلاش میں ہر کارے دوڑا دیے۔ پھوپھی ماہتاب کا شوہر انہیں دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے گاؤں لیے پھرتا رہا مگر ان کی تلاش میں نکلے ہوئے ہر کاروں نے بالآخر انہیں جا ہی لیا، اس وقت پھوپھی ماہتاب اپنے بطن میں ایک ننھی جان کی امین بن چکی تھیں۔ ان کی بازیابی کی خبراتے ہی باپ اور بھائی انہیں گھرانے کے لیے ان کے مقام بازیابی پر پہنچے۔ ان کے شوہر کو حوالات میں بند کروایا اور پھوپھی ماہتاب کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں کا رخ کیا۔ راستے بھر باپ اور بھائی انہیں مارتے رہے۔ لہو لہان کر دیا اور جب وہ پانی مانگتیں تو انہیں پانی کے بجائے باپ اور بھائیوں نے اپنا قارورہ پینے کے لیے دیا۔

پھوپھی ماہتاب کو حویلی واپس لانے کے بعد ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر ایک کمرے میں مقید کر دیا گیا تھا۔ بعد میں اسی کمرے میں انہوں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ فضہ کی شادی کے وقت یہ بچی سات سال کی تھی اور پھوپھی ماہتاب تیس سال کی عمر میں پچاس پچپن سال کی عمر رسیدہ عورت دکھائی دیتی تھیں۔ گو جب فضہ نے انہیں پہلی بار دیکھا تو وہ پابند سلاسل نہ تھیں مگر ان کی چال دیکھ کر فضہ کو یوں لگا جیسے وہ بمشکل قدم اٹھا پاتی تھیں۔ گھر کی ایک ملازمہ نے فضہ کو پھوپھی ماہتاب کی پہلی شادی، بیوگی، نکاح ثانی، بازیابی اور ان کے تین چار سال پابند سلاسل رہنے کا قصہ سنایا تو وہ تھرا کر رہ گئی اور ان تمام باتوں سے زیادہ ہولناک بات یہ تھی کہ پھوپھی ماہتاب کے دوسرے شوہر کو ان کے بھائیوں نے کرائے کے قاتلوں سے قتل کروا دیا تھا۔

فضہ کے بقول وہ پھوپھی ماہتاب کا قصہ سن کر اور ان کی معصوم بچی کے ساتھ ٹانا اور ماموؤں کا ہٹک آمیز اور پُر نفرت رویہ دیکھ کر اتنی خوف زدہ ہوئی کہ شادی کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی اس نے اپنے گھر والوں سے کہہ دیا کہ وہ اتنے جاہل اور ظالم لوگوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ فضہ کے گھر والے بھونچکا رہ گئے۔ ماں نے کہا ”تم اگر اس طرح گھر بیٹھ گئیں تو تمہاری باقی تین بہنوں کا کیا بنے گا؟ ان کے رشتے کون لائے گا؟“ اس موقع پر فضہ کا بھائی، جو اس سے برس بھر چھوٹا اور ان دنوں دسویں جماعت کا طالب علم تھا، اس کی ہمنوائی کو اس کے ساتھ آکھڑا ہوا اور اس نے کہا ”آپا اب وہاں نہیں جائے گی“ فضہ کے بقول بھائی کے اس ایک جملے نے اسے گویا اور مضبوط کر دیا۔



پانچ چھ سال وہ میکے بیٹھی رہی اور سسرال والے اسے واپس لے جانے کے لیے بھرپور کوشش کرتے رہے۔ اس دوران میں اس کے بھائی نے گریجویشن کر کے مقابلے کے امتحان میں شرکت کی تیاری شروع کرنے کے ساتھ ہی فاضل کی جانب سے اس کے شوہر کے نام خلع کا دعویٰ دائر کر دیا۔ وہ لوگ بڑے جزیب ہوئے۔ مختلف ذرائع سے فاضل کے گھر والوں پر دباؤ ڈال کر اسے ساتھ لے جانے کے لیے مختلف حربے آزمائے مگر بقول فاضل، پھوپھی ماہتاب اور ان کی بچی کے تصور کے ساتھ ہی اسے یہ وحشت ہونے لگتی تھی کہ خدا نخواستہ اس گھر میں جا کر وہ بھی ایک بیٹی پیدا کر بیٹھی تو پھوپھی ماہتاب کی طرح وقت سے پہلے بوڑھی اور زندہ درگور ہو جائے گی۔ مقدمے کے دوران میں ہی بھائی نے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ایک اہم سرکاری عہدے پر اس کا تقرر ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے فاضل کو بھی پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے مزید تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔ مقدمہ تقریباً تین سال چلتا رہا۔ فاضل کے سر نے ایزی چوٹی کا زور لگا ڈالا مگر بالآخر عدالت کا فیصلہ فاضل کے حق میں رہا۔ خلع ہو گئی۔ فاضل نے یکسوئی کے ساتھ حصولِ تعلیم پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔

اس نے بی اے کر لیا۔ اس دوران میں والدہ اس کی چھوٹی دو بہنوں کے رشتوں کے لیے کوشاں رہیں مگر کہیں بات نہ بن پائی۔ فاضل کا خلع لے کر گھر بیٹھ جانا گویا چھوٹی بہنوں کے راستے کی دیوار بن گیا۔ موقع اور حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے محلے کی ایک عورت نے اپنے بھائی کے لیے جو دوسرے شہر میں مقیم تھا اور اپنی بیوی کو طلاق دے چکا تھا اور اس بیوی کے بطن سے اس کی ایک بیٹی بھی تھی، فاضل کے رشتے کی بات چلائی اور اپنے بھائی کی شرافت و وسیع کاروبار اور خاندانی نجابت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ فاضل کے گھر والوں نے کچھ اس عورت کی محلے داری کا اعتبار کرتے ہوئے اور کچھ اپنی مجبوری کے پیش نظر مختار نامی اس شخص اور اس کے والدین سے فقط ایک ہی ملاقات اور بات چیت کے بعد ہاں کر دی اور اس شخص کے بارے میں اس کی جائے رہائش سے کوئی چھان بین کرانی ضروری نہیں سمجھی۔ فاضل کو اس موقع پر اپنے بھائی کی عدم موجودگی کا شدت سے احساس ہوا جو ان دنوں اپنی ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں مقیم تھا۔ فاضل کے اپنے پاس چون و چرا کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بہت سادگی سے اس کا نکاح مختار کے ساتھ کر دیا گیا۔ دعوتِ ولیمہ مختار کی بہن کے گھر پر ہوئی۔

ولیمے کے بعد وہ دوسرے شہر میں واقع اپنے سسرالی گھر پہنچی تو کچھ اور ہی نقشہ پایا۔ تقریباً دو مرلہ قطعہ زمین پر ایک دکان میں مختار، اس کے بھائی اور والد کا مشترکہ نام نہاد ”وسیع کاروبار“ تھا۔ اس دکان سے ملحق ایک ہاتھ روم سے زینہ دکان کے اوپر بنے ایک کمرے کو جاتا تھا۔ اس ایک کمرے میں مختار کے والدین، بھائی، پانچ جوان اور بن بیابی بہنیں مقیم تھیں۔ اسی کمرے کے ایک گوشے میں چولہا اور برتن دھرے تھے۔ اس کمرے کے اوپر ایک دو چھتی تھی جو مختار اور فاضل کا بید روم قرار پائی۔

یہ دوسرا گھر فاضل کے پہلے سسرالی گھر سے قطعاً مختلف تھا۔ وہاں اگر چہ جہازوں جہالت اور بربریت تھی تو یہاں کھنڈیوں کس مہر سی۔ جہالت بھی کچھ کم نہ تھی مگر فاضل کے لیے اب ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ دوبارہ ماں باپ کے گھر واپسی ممکن نہیں تھی۔ دنیا کیا کہتی، پہلے ایک شوہر کو چھوڑا، اب.... اپنے مقدر پر دل ہی دل میں رو کر بیٹھ رہی۔ دن اسی ایک کمرے میں ساس نندوں کی مسلسل کچ کچ میں گزارتی اور رات کو کمرے کے اوپر واقع دو چھتی میں چلی جاتی۔ ہاتھ روم جانے کی ضرورت پیش آتی تو دو چھتی سے پہلے کمرے میں آنا پڑتا پھر زینے سے اتر کر نیچے دکان کے ساتھ ملحق ہاتھ روم میں جاتی، زندگی کا یہ روپ انتہائی درد انگیز تھا۔

تقریباً مہینے بھر بعد فاضل کے دونوں بھائی، والدہ اور ایک بہن اس سے ملنے کے لیے اس کی سسرال آئے تو اس کا پہلا تاخیر تجربے کے بعد رہا سہا رنگ روپ بھی ماند پڑ چکا تھا۔ بھائی، جو چھٹی پر گھر آیا تھا اور گھر والوں کے ساتھ اس سے ملنے کے لیے اس کی سسرال آیا تھا، گھر والوں کی اس عاقبت نااندیشی پر کہ انہوں نے فاضل کو کنوئیں سے نکال کر کھائی میں جھونک دیا تھا، سخت خفا ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ فاضل اس بار اپنے مقدر پر شاکر ہو چکی تھی۔



اسی محبوب دو چھٹی میں وہ شادی کے گیارہ ماہ بعد بیٹے کی ماں بنی، جس کا نام راول رکھا گیا۔ سوامینہ نہانے کے بعد وہ میکے آئی تو ماں نے، جو اس سے ملنے کے بعد روتی ہوئی اپنے گھر واپس لوٹی تھی، اس سے کہا ”جو ہوتا تھا سو ہو چکا۔ اب تمہیں دوبارہ اس قید خانے میں واپس جانے کی ضرورت نہیں۔ بیس ہمارے پاس رہو، تمہارے اور اس بچے کے لیے روٹی کپڑا بہت“ فضا رک گئی، اپنے لیے نہیں، اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے۔ ماں کے ہاں اس کے رکنے پر نہ مختار کو کوئی اعتراض ہوا نہ اس کے گھر والوں کو بلکہ مختار کے گھر والوں نے تو فضا کے اس فیصلے پر ایسے اطمینان کا اظہار کیا جیسے وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔

فضا نے ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کر لی۔ بچے کی دیکھ بھال اس کی ماں اور بہنیں کرتیں۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ اس نے بی ایڈ کے لیے بھی کمر کس لی۔ مختار کا جب جی چاہتا، اس سے اور بچے سے ملنے کے لیے آجاتا۔ بی ایڈ کے دوران میں رانیل ہوئی۔

بی ایڈ کے بعد فضا نے سرکاری ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے۔ غیبی امداد بہم پہنچی اور اسے ایک سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی۔ فضا کے بقول یہ اس کی زندگی کا اہم ترین موڑ تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی اصل زندگی اب شروع ہوئی تھی!

”اس ملازمت نے میری زندگی کو نئے معنی دیے“ یہ کہتے ہوئے فضا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ”مجھے یوں لگا منہا، جیسے میرے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی گئی ہے۔“

سرکاری ملازمت کے دوسرے برس وہ ایک اور بیٹے سانول کی ماں بنی۔ اس سے اگلے برس اس کا تبادلہ ٹی اسکول میں کر دیا گیا۔ گزشتہ سات سال سے وہ اسی اسکول میں تھی۔ اس دوران میں اس کے والدین اور بہن بھائیوں نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ماں اور بہنوں نے اس کے بچوں کی نگہداشت و پرداخت میں اس کا بھرپور ہاتھ بٹایا تھا۔ اسکول سے گھر آنے کے بعد وہ شام تک بچوں کو مسلسل ٹیوشن بھی پڑھاتی۔ تنخواہ اور ٹیوشنز سے ملنے والی آمدنی سے اس نے اپنے والدین کی جانب سے ملنے والے ایک قطعہ زمین پر اپنا گھر بھی تعمیر کر لیا تھا۔ مذکورہ قطعہ زمین اس کے والدین کے گھر سے ملحق تھا۔ لہذا وہ اپنے میکے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی بھرپور تحفظ میں تھی اور اسے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے ہر معاملے میں اپنے گھر والوں کا مکمل تعاون حاصل تھا۔

فضا کے تمام بہن بھائی اب شادی شدہ تھے۔ اس کے بچے اب اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ انہیں اپنی روزمرہ ضروریات زندگی کے سلسلے میں خود انحصاری آگئی تھی۔ مختار وہیں کا وہیں تھا۔ اسی محبوب سے گھر کا مکین اور اسی چھوٹی سی دکان میں باپ اور بھائی کا شریک کاروبار۔ اس کے بھائی بہنوں کی شادیاں ہو گئی تھیں مگر ان کی جابلانہ ذہنیت جوں کی توں تھی۔ مختار کا جب جی چاہتا، فضا اور بچوں سے ملنے آجاتا۔ فضا نے اپنے زور بازو سے تعمیر کیے گئے گھر میں اپنے بچوں کو ان کی ضرورت کی ہر چیز فراہم کر رکھی تھی۔ ملازمت کے ساتھ ٹیوشنز کا سلسلہ بھی مسلسل جاری تھا۔ اس کے بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ فضا کے بقول وہ اگر اپنی قسمت سے خوش نہ تھی تو غیر مطمئن بھی نہ تھی۔ دوسری ٹھوکر کھانے کے بعد وہ لڑکھڑا کر مری نہیں تھی، اس نے خود کو سنبھالا تھا اور بے یقینی سے یقین اور یاسیت سے امید کے راستے پر نکل آئی تھی۔ اس کی منزل اس کے بچوں کا مستقبل تھا جس کے لیے وہ دے دے، رخنے دن رات ایک کیے ہوئے تھی۔ اسے اپنے بچوں کا مستقبل درخشاں ہونے کا یقین تھا۔ بے یقینی سے یقین کے اس سفر میں فضا نے خود کو کہیں بھی کم نہیں ہونے دیا تھا۔ یہی اس کی انفرادیت اور شناخت تھی اور یہی منہا سے اس کی دوستی کا سبب بھی!

منہا کا سفر بھی تو بے یقینی سے یقین کی جانب اور یاسیت سے امید کی سمت ہی تھا۔

اپنی اور اپنے پیاروں کی سلامتی اور سربلندی کے ساتھ بقا کی تنگ و دو وہ خوشبو تھی جس نے اُن دونوں کو دوستی اور رازدانی کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ)



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

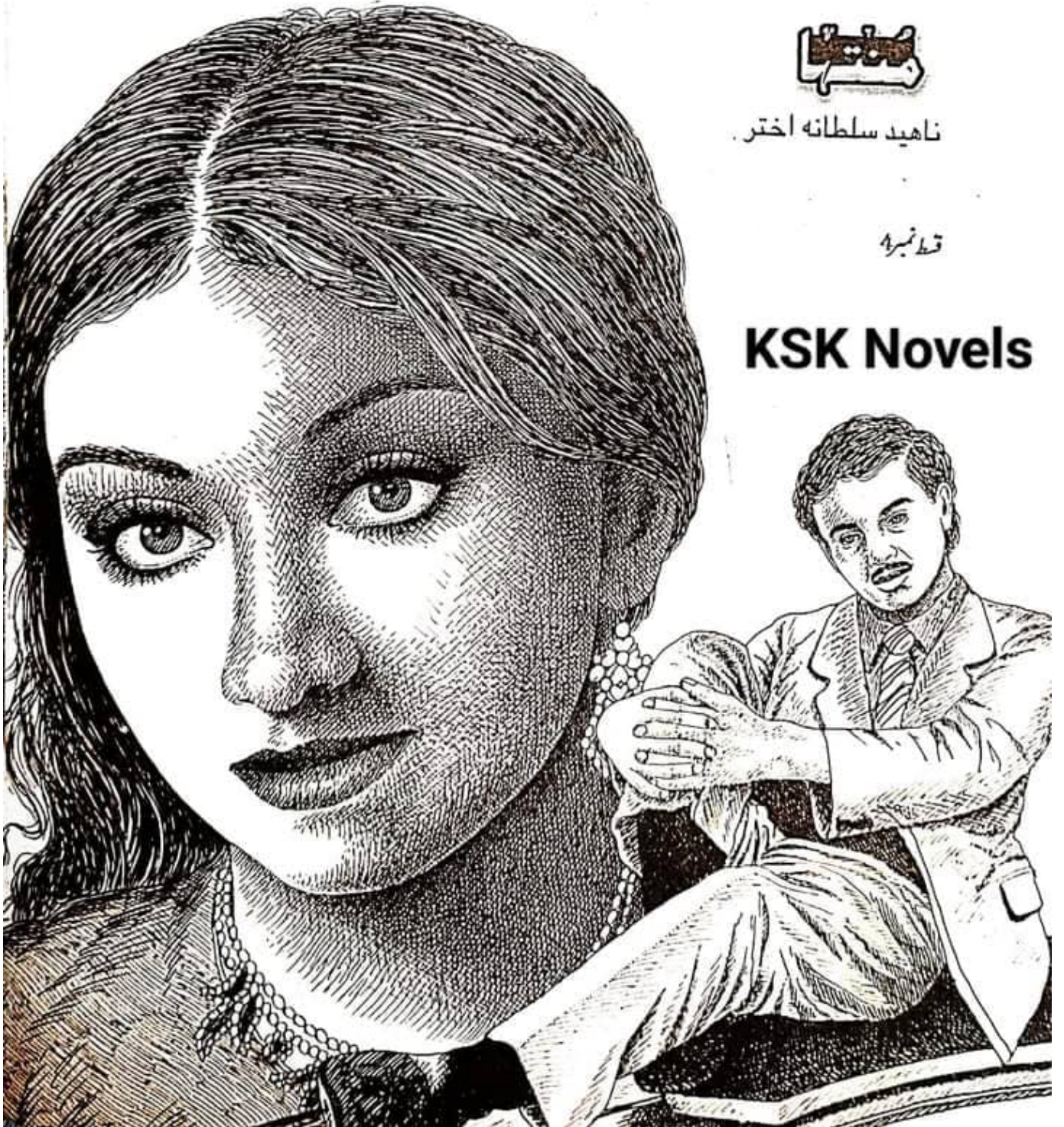
محبتوں سے گزرے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سار ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانہ اختر

قسط نمبر 4

KSK Novels









کل ہی کی بات لگتی تھی۔  
 منتہا کو سرکاری ملازمت اختیار کیے آٹھ سال ہو چکے تھے۔ اول دن سے اب تک وہ ٹی اسکول ہی میں خدمات  
 بجالا رہی تھی مگر اس دوران نظامت تعلیم نے دو مرتبہ دوسرے اداروں میں اس کے تبادلے کے احکامات جاری کیے مگر  
 پرنسپل ضمیر فاروقی صاحب اس کی کارکردگی سے اتنے خوش اور مطمئن تھے کہ انہوں نے دووں مرتبہ نظامت میں  
 اپنا اثر و رسوخ استعمال میں لا کر اس کے تبادلے کے احکامات منسوخ کروا لیے۔ سچ تو یہ تھا کہ خود منتہا بھی اب اس  
 اسکول کے ماحول کی اتنی عادی ہو گئی تھی کہ کہیں اور جانا نہیں چاہتی تھی۔

فاروقی صاحب غیر معمولی قابلیت اور صلاحیتوں کے حامل ایک محنتی اور فرض شناس آدمی تھے۔ اپنے ماتحتوں  
 سے لگن اور دیانت کے ساتھ فرائض منصبی کی بجا آوری کی توقع رکھتے اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں بھی غیر  
 معمولی لگن اور دیانت کا مظاہرہ کرتے۔ لائق، محنتی اور فرض شناس رفقاء کار کی قدر کرتے اور انہیں پورا احترام  
 دیتے۔ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے منتہا ان کی ”گڈ بکس“ میں آگئی تھی۔

ماتحت اساتذہ کی کارکردگی کی جانچ پڑتال کے لیے فاروقی صاحب مختلف طریقے آزماتے۔ کسی استاد کی تدریس کا  
 معیار جانچنے کے لیے وہ اکثر جماعت کے کمرے کے باہر رانداری میں کسی کھڑکی یا دروازے کی آڑ میں چھپ کر کھڑے  
 ہو جاتے اور استاد کی حرکات و سکنات کا چوری چھپے جائزہ لینے کے ساتھ اس کی آواز پر بغور کان لگا دیتے۔ استاد کا رخ  
 تختہ سیاہ کی جانب پا کر کبھی کبھی دسے پاؤں جماعت کے کمرے کے پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوتے اور عقبی  
 نشستوں پر طلباء کے درمیان یوں دھک کر بیٹھ رہتے کہ کبھی کبھی تو استاد کو ان کی موجودگی کا دیر تک احساس ہی نہ ہونے  
 پاتا۔ طلبہ کو کرائے جانے والے تحریری کام کا جائزہ لینے کے لیے موصوف اکثر بغیر پیشگی اطلاع کے کسی بھی جماعت  
 کے کمرے میں چلے جاتے اور طلباء کے بستے کھلو کر کا پیاں دیکھنے لگتے۔

اساتذہ کی کارکردگی کے اس بنفس نفیس جائزے کے بعد پرنسپل صاحب نہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی میں  
 کوئی رورعایت دکھاتے نہ خوبیوں کا اعتراف کرنے اور اچھی کارکردگی کو سراہنے میں بخل کا مظاہرہ کرتے بلکہ اپنے  
 رفقاء کار اور طالب علموں کی اچھی کارکردگی کو سراہنے کے معاملے میں تو وہ خاصے فیاض واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ  
 منتہا کے غائبانہ اور حاضرانہ اکثر اپنے دوسرے ساتھیوں سے اس کی تعریف کرتے رہتے۔

جب پہلی مرتبہ اس کے دوسرے اسکول میں تبادلے کے احکامات رکوانے کے لیے انہوں نے نظامت میں متعلقہ  
 افسران سے بات کی تو اوروں کے استاد کاظمی صاحب نے انہیں فون پر کسی افسر سے بر ملا کہتے سنا ”سرا! میں منتہا میرے  
 ادارے کی بہترین ٹیچر ہیں۔ میں انہیں ری لیو نہیں کروں گا۔“

اسکول کا شعبہ خبر رسائی اتنا سریع الحکمت تھا کہ بات ایک نے سنی گویا سب نے سنی۔  
 کاظمی صاحب نے ایک سے کہا ”ایک نے دوسرے سے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات پورے اسکول میں مشہور ہو گئی  
 اور اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہر ایک اس پر تبصرے اور حاشیہ آرائیاں کرنے لگا۔  
 ”شی از اے بورن ٹیچر!“ منتہا کے بارے میں یہ بات تو پرنسپل صاحب ایک نہیں، کئی بار مختلف اوقات میں  
 مختلف لوگوں سے کہہ چکے تھے۔

اس کے بارے میں یہ رائے ان کے گھرے اور بغور عملی مشاہدے کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے بارہا کسی کھڑکی یا  
 دروازے کی آڑ میں کھڑے ہو کر اور عقبی نشستوں پر طلباء کے درمیان دھک کر اسے پڑھاتے دیکھا اور سنا تھا۔ اس کے  
 مضمون میں طلباء کی کاپیوں کا بنفس نفیس جائزہ لیا تھا۔ اس کے شاگردوں کو اعتماد میں لے کر اس کی تدریس کے بارے  
 میں ان کی رائے لی تھی۔ فاروقی صاحب کو یقین تھا کہ ایک استاد کی پیشہ ورانہ اہلیت کے سب سے بڑے نقاد اس کے  
 شاگرد ہوتے ہیں۔ اپنے کسی ماتحت استاد کے بارے میں اس کے شاگردوں کی رائے لیتے ہوئے فاروقی صاحب اچھے



اوسط، کمزور ہر طرح کے طلباء کی رائے کو اہمیت دیتے۔

فاروقی صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنے ادارے کے ہر استاد کی پیشہ ورانہ اہلیت، لگن، دیانت اور فرض شناسی کا کماحقہ جائزہ لے کر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے اور پھر یہ رائے ان کی حتمی رائے ہوتی۔ منہا کے بارے میں رائے انہوں نے جماعت میں اس کی عملی کارکردگی، طلباء کی نوٹ بکس کی پڑتال کے معیار اور اس کے شاگردوں کی آراء کی روشنی میں قائم کی تھی اور یہ ان کی حتمی رائے تھی۔

وہ اب برملا کہتے کہ منہا ان کے اسکول کی بہترین استاد ہے اور اپنی اس رائے کے احترام میں وہ منہا کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ وہ کبھی کسی کام سے ان کے دفتر میں جاتی تو اسے دیکھتے ہی بڑی گرم جوشی سے کہتے ”آئیے، آئیے!“ منہا! ”بیٹھے کا اشارہ دیتے۔ اپنا کام روک کر اس سے اس کی آمد کا سبب پوچھتے۔ اس کی بات کو پوری توجہ سے سنتے اور اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو اسے فوری حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اسٹاف میٹنگز کے دوران فاروقی صاحب کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھتیں، پالیسی معاملات پر بات ہوتی تو وہ اس کی رائے ضرور طلب کرتے اور اسے وزن بھی دیتے۔ آتے جاتے رابڈاری یا گراؤنڈ میں سامنا ہوتا تو وہ بے اختیار رک جاتے اور انتہائی گرم جوشی سے اس کی خیر و عافیت پوچھنا نہ بھولتے۔ ان کے لہجے میں انتہائی شفقت اور حدت ہوتی جو منہا کو ڈیڈی کی یاد دلاتی!

منہا کے ساتھ پرنسپل صاحب کے اس رویے نے اس کے اپنے ہی ساتھیوں میں اس کے بدخواہ اور حاسد پیدا کر دیے تھے۔ جن میں سے بعض کھلم کھلا بدخواہی کا اظہار کرتے تو بعض اسے نیچا دکھانے اور فاروقی صاحب کو اس سے بدظن کرنے کی کوششوں میں اونچھے حربے آزماتے۔ اسکول میں اپنی ملازمت کے چوتھے برس ششما ہی امتحان میں پیش آنے والے ایک واقعے کو تو وہ شاید کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

اسکول کے شعبہ امتحانات کے کرنا دھرتا ظفر بیگ صاحب سائنس ٹیچر تھے۔ ثانوی جماعتوں کے متعدد طلباء ان سے یوشن لیتے تھے منہا نے ثانوی جماعتوں کو ریاضی پڑھانا شروع کیا تو بہت سے ایسے طلباء جو بیگ صاحب سے صرف ریاضی ہی پڑھا کرتے تھے، ان کی طرف سے نوٹ کر منہا کی طرف آگئے اور اس سے یوشن لینے لگے۔ بیگ صاحب کو مادی نقصان جو ہوا سو ہوا، شاگردوں کا اپنی طرف سے ہٹ کر دوسری طرف اور وہ بھی ایک نئی خاتون ٹیچر سے یوشن کے لیے چلا جانا انتہائی توہین آمیز محسوس ہوا۔ اپنی مجروح انا کی تسکین کے لیے وہ موقع بے موقع منہا کو نیچا دکھانے اور فاروقی صاحب کو اس سے بدظن کرنے کی کوششوں میں رہنے لگے۔

شعبہ امتحانات جس کی تنظیم بیگ صاحب کے ذہن رسائے کی تھی، بڑے منظم انداز میں تمام کام کرتا۔ جس دن جس مضمون کا پرچہ ہوتا، پرچہ ختم ہو جانے کے بعد شعبہ امتحانات کے ذمے داران امتحانی کمروں سے موصول ہونے والی جوابی کارپوں کو مضمون اور جماعت وار علیحدہ علیحدہ اکٹھا کر کے بعد احتیاط انہیں گنتے پھر ایک بڑے خاکی لفافے پر جماعت، فریق، مضمون، جوابی پرچوں کی کل تعداد، کلاس کے نمبران اور قمتحن کے نام اور پڑتال کے بعد پرچوں کی واپسی کی تاریخ لکھ کر متعلقہ قمتحن کے حوالے کرتے۔

مذکورہ ششما ہی امتحانات کے دوران جماعت نہم کا ریاضی کا پرچہ ہونے کے بعد منہا کو نہم ”ب“ کے جوابی پرچوں کا لفافہ ملا تو اس پر جوابی کارپوں کی کل تعداد بیالیس درج تھی۔ منہا نے جوابی پرچوں کو جانچنے کے بعد طلباء اور ان کے حاصل کردہ انفرادی نمبروں کی فہرست بنائی اور حسب قاعدہ شعبہ امتحانات کے سپرد کر دی۔ پھر دوسری جماعتوں کے پرچوں کی پڑتال میں لگ گئی۔

امتحانات ختم ہونے کے دو تین دن بعد حسب قاعدہ ہر نمبران جماعت کو اس کی جماعت کے طلباء کی ہر مضمون کی مارکس شیٹ ایک دوسرے سے نتھی کر کے دی گئیں تاکہ وہ اپنی جماعت کا نتیجہ مرتب کر سکیں۔ اس سے اگلے دن فاروقی صاحب نے منہا کو اپنے دفتر میں بلا بھیجا۔ وہ وہاں پہنچی تو دیکھا، فاروقی صاحب، مسز زیدی، بیگ صاحب، ان

کے معاونین اور ہم "ب" کی نگران جماعت مسز نسیم آفاق کچھ فکر مند سے بیٹھے تھے۔

"بیٹھے بس منتہا!" فاروقی صاحب گبیر لہجے میں بولے۔

وہ کمرے میں موجود تمام افراد کے چروں پر ایک اچھتی ہوئی نظر ڈالتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بس منتہا! مسز نسیم آفاق نے ایگزیم سیل کو رپورٹ دی ہے کہ ریاضی میں ان کی کلاس کے ٹاپ اسٹوڈنٹ

عمران احمد کو آپ نے غیر حاضری مارک کیا ہے" فاروقی صاحب بولے۔

"غیر حاضری ہو گا سر!" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"ہو گا کا کیا مطلب بس! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ امتحان میں کون حاضر تھا، کون غیر حاضر" بیگ صاحب نے

چبھتے ہوئے لہجے میں مداخلت کی۔

"سوری بیگ صاحب!" منتہا نے کہا "یہ معلومات کلاس ٹیچر کو ہوتی ہیں کیونکہ حاضری کا ریکارڈ انہی کے پاس

ہوتا ہے میں تو بیکٹ ٹیچر ہوں۔"

"بیکٹ ٹیچر کو بھی یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کس اسٹوڈنٹ نے پرچہ دیا ہے کس نے نہیں؟" بیگ صاحب

نے کسی ماہر وکیل کی طرح جرح کرنے والے انداز میں کہا۔ ان کی نگاہوں اور مسکراہٹ میں استہزا تھی۔

"بیگ صاحب" بچے جوابی کاپیوں پر رول نمبر لکھتے ہیں، نام نہیں۔ بیکٹ ٹیچر کے لیے ہر بچے کا رول نمبر یاد رکھنا

ممکن نہیں ہوتا" اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"جی ہاں!" وائس پرنسپل نے تائید کی۔

"بلکہ یہ تو کلاس ٹیچر کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے" مسز نسیم آفاق بولیں۔

"ٹاپ اسٹوڈنٹس کے رول نمبرز تقریباً ہر ٹیچر کو یاد ہوتے ہیں" بیگ صاحب پھر بولے۔

"آئی ایم سوری بیگ صاحب! میں کبھی کسی اسٹوڈنٹ کا رول نمبر یاد رکھنے کی نہ کوشش کرتی ہوں، نہ ضرورت

محسوس کرتی ہوں۔ میرے مد نظر تو بچوں کی پرفارمنس ہوتی ہے اور بس۔ جو جتنے نمبروں کا مستحق ہوتا ہے، وہ دیتی چلی

جاتی ہوں۔"

"میرا خیال ہے اس بحث میں پڑنے کے بجائے اصل مسئلے پر بات کی جائے" پرنسپل صاحب بولے۔ پھر انہوں

نے منتہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بس منتہا! عمران احمد جو مسز نسیم آفاق کی کلاس میں فرسٹ آنے والا بچہ ہے،

آپ نے اسے اپنے بیکٹ میں امتحان والے دن غیر حاضر دکھایا ہے جبکہ حاضری رجسٹر اور ایگزیم سیل کے ریکارڈ کے

مطابق وہ اس دن حاضر تھا اور اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اس دن امتحان بھی دیا تھا۔"

"سر..."

"اس کا باپ ڈی ایس پی ہے" بیگ صاحب نے منتہا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس سے غرض نہیں" منتہا نے قدرے ناگواری سے بیگ صاحب کو دیکھا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولی

"میں بچوں کے والدین کی حیثیت اور منصب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔"

بیگ صاحب پہاؤ بدل کر رہ گئے۔

مسز نسیم آفاق اور مسز زیدی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور زیر لب مسکرا دیں۔

بیگ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ایک ڈائری میں اپنے ان شاگردوں کے والدین کے تفصیلی کوائف

درج رکھتے ہیں جن سے کوئی کام نکلوا یا جاسکتا ہو۔

"سوال یہ ہے بس منتہا کہ اس لڑکے کا پیپر کیا کہاں؟" پرنسپل صاحب بولے۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں سر! مجھے اس سیٹ میں جتنے جوابی پرچے ملے، میں نے انہیں چیک کر کے ایوارڈ لسٹ پر



ترتیب وار رول نمبرز اور مارکس لکھ کر ایگزیم سیل میں جمع کرا دیے تھے۔“  
 ”بیگ صاحب، اس لڑکے کی جوابی کاپی کہیں کسی اور کلاس کے سیٹ میں تو نہیں چلی گئی؟“ وائس پر نپیل صاحبہ نے قیاس ظاہر کیا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا میڈم!“ بیگ صاحب بولے۔  
 ”ہم بہت احتیاط سے جوابی پرچے گنتے اور لفافوں میں ڈالتے ہیں“ بیگ صاحب کے معاون کا بولے۔  
 ”سر، عمران کلاس میں فرسٹ آنے والا لڑکا ہے اور پولیس افسر کا بیٹا ہے، اس کا پیپر نہ ملا تو قیامت آجائے گی“  
 بیگ صاحب نے گویا مسئلے کو ہمیر کیا۔  
 ”بات یہ نہیں بیگ صاحب کہ لڑکا کون ہے یا اس کا باپ کیا کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ اگر اس بچے کی حاضری لگی ہوئی ہے اور اس نے میٹھس کا پرچہ بھی دیا ہے تو اس کا جوابی پرچہ کیا کہاں؟“  
 ”یہ تو سبجیکٹ ٹیچر ہی بتا سکتی ہیں سر!“

منتہا نے بے ساختہ چونک کر بیگ صاحب کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں اور لبوں پر وہی استہزائیہ کیفیت تھی۔  
 ”سر! یہ عمران احمد کے خلاف کوئی سازش بھی ہو سکتی ہے“ بیگ صاحب نے یہ بات چبا چبا کر کہی۔  
 ”نپیل صاحب کے کمرے میں موجود افراد نے چونک کر بیگ صاحب کو دیکھا۔  
 ”کیسی سازش بیگ صاحب؟“ فاروقی صاحب بولے۔  
 ”سر! نا منتھہ بی میں عمران احمد کا پڑھائی میں مقابلہ اس کے جس ہم جماعت کے ساتھ چلتا ہے، وہ مس منتھہ سے ٹیوشن پڑھنے کے لیے ان کے گھر جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے سر، اس مرتبہ عمران کے حریف کو کلاس میں فرسٹ پوزیشن پر لانے کے لیے عمران کا پرچہ غائب کر دیا گیا ہو؟“

منتھہ نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا، اس کھلے عام الزام تراشی پر اسے سخت خفت محسوس ہوئی تھی۔  
 ”یہ.... یہ سراسر الزام ہے!“ اس نے احتجاجا کہا۔  
 ”اوہو! مس منتھہ، میں آپ کو تھوڑی کہہ رہا ہوں، ہو سکتا ہے آپ سے ٹیوشن پڑھنے کے لیے آپ کے گھر جانے والے عمران کے ہم جماعت نے آپ کے گھر میں اپنی کلاس کا سیٹ رکھے دیکھ کر اپنا پرچہ دیکھنے کے بہانے عمران کے پرچے پر ہاتھ صاف کر ڈالا ہو؟“  
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امتحانی پرچے میں بہت حفاظت سے رکھتی ہوں۔“  
 ”ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کو تو ان کے پیپر ضرور دکھاتی ہوں گی؟“ بیگ صاحب پھر اسی مکاری سے مسکرائے۔

”جی نہیں۔“  
 ”حیرت ہے!“ بیگ صاحب کی مسکراہٹ گہری ہو گئی پھر وہ فاروقی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے بڑی عیاری سے بولے ”سر! یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہو گا!“  
 ”نپیل صاحب نے اپنا روئے خن مسز زیدی کی جانب کیا اور بولے ”مسز زیدی! آپ اس معاملے کی چھان بین کے لیے ایک انکوائری کمیٹی تشکیل دیجئے اور مجھے کل تک اس کی رپورٹ چاہیے۔“

”رائٹ سر!“  
 منتھہ کو سخت تضحیک محسوس ہوئی۔  
 مسز زیدی نے اسی روز ایک انکوائری کمیٹی جو تین سینئر اساتذہ پر مشتمل تھی، اس معاملے کی چھان بین کے لیے بٹھادی۔

انکوائری کمیٹی نے سب سے پہلے متعلقہ جماعت کے حاضری رجسٹر میں ریاضی کے پرچے والی تاریخ کو عمران احمد کی حاضری پھر اس جماعت کے ریاضی کے پرچے کی جوابی کاپیوں کا سیٹ اور اس کی مارکس شیٹ دیکھی۔  
حاضری رجسٹر کے اندراجات کے مطابق اس جماعت میں طلباء کی کل تعداد پینتالیس تھی۔ ریاضی کے پرچے والے دن تین طلباء کی غیر حاضری لگی ہوئی تھی۔ گویا بیالیس طلباء حاضر تھے۔ شعبہ امتحانات کے ریکارڈ کے مطابق جماعت نہم ”ب“ کے بیالیس طالب علموں نے ریاضی کا پرچہ دیا تھا اور متعلقہ ممتحن کو بیالیس جوابی پرچے پڑتال کے لیے دیے گئے تھے۔ مقررہ طریق کار کے مطابق بیالیس جوابی پرچے ایک بڑے خاکی لفافے میں ڈال کر اس لفافے پر جماعت مع فریق، جماعت میں طلباء کی کل تعداد، امتحان میں حاضر اور غیر حاضر طلباء کی تعداد، ممتحن کا نام اور جوابی پرچوں کی پڑتال کے بعد واپسی کی تاریخ درج تھی۔ یہی اندراجات شعبہ امتحانات کے ایک رجسٹر میں بھی موجود تھے۔ ان اندراجات کے مطابق متعلقہ ممتحن منتہا کو بیالیس جوابی پرچے پڑتال کے لیے دیے گئے تھے۔

منتہا نے پڑتال کے بعد جوابی پرچوں کا جو سیٹ مع مارکس شیٹ شعبہ امتحان کو واپس لوٹایا تھا، انکوائری کمیٹی نے اسے نکلا کر دیکھا تو لفافے میں بیالیس پڑتال شدہ جوابی پرچے موجود تھے۔ مارکس شیٹ پر بھی بیالیس طلباء کے حاصل کردہ نمبر ان کے رول نمبروں کے سامنے لکھے ہوئے تھے۔ تین طالب علموں کے رول نمبر ایسے تھے جن کے سامنے سرخ روشنائی سے پہلا انگریزی حرف ”اے“ لکھا ہوا تھا جو امتحان سے ان کی غیر حاضری کا غماز تھا۔ ان تین میں سے ایک رول نمبر عمران احمد کا تھا تاہم منتہا کے دفاع اور بریت کے لیے یہی بنیاد کافی تھی کہ اسے بیالیس جوابی پرچے پڑتال کے لیے دیے گئے تھے اور اس نے بیالیس کے بیالیس شعبہ امتحانات کو جمع کر دیے تھے۔ جن میں سے ایک جوابی پرچہ پر اس جماعت کے تین غیر حاضر طلباء میں سے اس طالب علم کا رول نمبر لکھا ہوا تھا جو حاضری رجسٹر اور دفتر کے ریکارڈ کے مطابق اسکول چھوڑ کر جا چکا تھا۔

انکوائری کمیٹی کو اب یہ گتھی سلجھانی تھی کہ اس جماعت کے کس طالب علم نے اپنے جوابی پرچے پر دانستہ یا نادانستہ اس طالب علم کا رول نمبر لکھ دیا تھا جو اسکول ہی چھوڑ چکا تھا نیز عمران احمد بھی اگر غلطی سے اپنا رول نمبر جوابی پرچے پر غلط لکھ گیا تھا تو ان بیالیس جوابی پرچوں میں اس کا پرچہ کون سا تھا؟

پہلے عمران احمد کو سیٹ میں موجود ایک ایک جوابی پرچہ دکھا کر اپنا پرچہ شناخت کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے ایک ایک پرچہ دیکھا اور ان میں سے کسی بھی پرچے کو اپنے جوابی پرچے کے طور پر شناخت کرنے سے انکار کیا۔

بعد ازاں عمران کے سوا ان تمام طالب علموں کو جنہوں نے ریاضی کا پرچہ دیا تھا، اپنا اپنا پرچہ دیا گیا۔ ماسوا اس پرچے کے جس پر اسکول چھوڑ کر جانے والے طالب علم کا رول نمبر لکھا ہوا تھا، ہر طالب علم نے اپنا جوابی پرچہ شناخت کر لیا۔

اس ایک جوابی پرچے کو جس پر اسکول چھوڑ چکنے والے طالب علم کا رول نمبر درج تھا، ریاضی کے پرچے والے دن غیر حاضر تینوں طالب علموں اور عمران کو باری باری دکھایا گیا۔ اس پر کسی کا دعویٰ نہ آیا۔ بعد ازاں مذکورہ پرچہ جماعت کے باقی تمام طالب علموں کو بھی باری باری دکھایا گیا۔ ہر ایک نے اس کو دیکھا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ ہماری ہینڈ رائٹنگ نہیں۔

اب سوال یہ تھا کہ اگر مذکورہ جوابی پرچہ اس جماعت کے کسی طالب علم کا نہیں تھا تو وہ اس جماعت کے جوابی پرچوں میں کہاں سے آچکا تھا نیز عمران کا پرچہ کہاں گیا تھا۔

انکوائری کمیٹی نے اسکول کی تمام جماعتوں کے ہر ہر مضمون کے جوابی پرچوں میں عمران کا جوابی پرچہ تلاش کروا دیکھا مگر بے سود۔ آخر کار انکوائری کمیٹی نے پرنسپل صاحب کو اپنی تحریری رپورٹ میں لکھا ”میں منتہا کو جماعت نہم ”ب“ کے ریاضی کے بیالیس جوابی پرچے پڑتال کے لیے دیے گئے جو انہوں نے پڑتال کے بعد شعبہ امتحانات کو



واپس لوٹا دیے۔ ان کی جانب سے کوئی سہو نہیں ہوئی۔ عمران احمد متعلم نہم ”ب“ کا ریاضی کا پرچہ تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکا تاہم ریاضی کے جوابی پرچوں میں اسکول چھوڑ چکنے والے ایک طالب علم کا جوابی پرچہ شامل ہونا اور اس پر امتحانی نمبر کے نگران کے دستخط کا موجود ہونا ایک ایسا معما تھا جسے انکواری کمیٹی انتہائی کوشش کے باوجود حل نہ کر سکی کیونکہ اس پرچے کا کوئی دعوے دار سامنے نہیں آیا۔“

انکواری کمیٹی کی اس رپورٹ کی روشنی میں منتہا کسی سہو یا الزام سے بری قرار پائی تاہم فضلہ نے اسے آہستگی سے سمجھایا ”اے معمولی واقعہ مت سمجھنا۔“

”کیا مطلب؟“

”بیک صاحب سینئر اسٹوڈنٹس میں تمہاری روز افزوں مقبولیت اور اپنی کئی یوشنر تمہارے پاس چلے جانے سے کافی خائف ہیں تم سے۔ اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ فطرتاً سازشی آدمی ہیں اور اپنے پیچھے قدموں کے نشان باقی نہیں رہنے دیتے۔ تم بہت پرانی نہیں ہو اس اسکول میں مگر ان کی فطرت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو چکا ہو گا تمہیں۔“

”ہاں.... لیکن.... فاروقی صاحب نے ایسے آدمی کو انگریزیم سیل کا انچارج کیوں بنا رکھا ہے؟“

”کیونکہ انہیں لوگوں سے کام تو بہر حال لینا ہی ہے نا۔ بیک صاحب کی سازشی فطرت اپنی جگہ مگر ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ فرسودہ اور روایتی طریقہ امتحان کو جدت دینے میں مہارت رکھتے ہیں اور کام بہت برق رفتاری سے کرتے ہیں۔ اسکول کا شعبہ امتحانات سنبھالنے کے بعد انہوں نے روایتی طریق کار کو تبدیل کر کے بہت سی ایسی نئی باتیں متعارف کرائیں جنہیں ادارے سے باہر بھی لوگوں نے بہت سراہا۔“

”ویسے عمران کا پرچہ گم ہونے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور تمہارے خلاف کوئی ایسی سازش بھی جس کا مقصد اسٹوڈنٹس میں تمہاری مقبولیت کے گراف کو نیچے گرانا اور تمہارا نام پرنسپل صاحب کی گڈ بکس سے نکلوانا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو کوئی غیبی مدد بہم پہنچی جو تمہارے سیٹ میں بیالیس پرچے نکل آئے ورنہ تین بچے غیر حاضر اور ایک عمران کی کاپی گویا پینتالیس بچوں کی کلاس میں سے اگر چار پرچے کم ہوتے تو اصولاً آکتالیس پرچے ہونے چاہیے تھے۔“

”میں حیران ہوں کہ اسکول چھوڑ چکنے والے بچے کے رول نمبر والی کاپی کہاں سے آگئی؟“ منتہا بولی۔

”میں نے کہا نا، یہ کوئی غیبی مدد پہنچی ورنہ ذرا سوچو کہ اگر لفافے پر جوابی پرچوں کی تعداد بیالیس لکھی ہوتی اور اندر سے نکلتے آکتالیس تو تم کیا کرتیں؟ عمران کا پرچہ گم ہونے کی ساری ذمہ داری تم ہی پر آتی اور اس غیر ذمہ داری پر تمہارے بارے میں پرنسپل صاحب کی رائے کا متاثر ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ!“

”آئندہ انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ انگریزیم سیل سے جب بھی اپنا کوئی سیٹ لو، جوابی پرچے رول نمبر وار اور گن کروصول کرنا۔ خدا جانے کیا چکر تھا جس سے اللہ میاں نے تمہیں بچالیا۔ عمران کے والد کو میں جانتی ہوں، سیونٹھ کلاس میں عمران کی کلاس نیچر میں ہی تھی، بچہ جتنا اچھا ہے، باپ اسی قدر پریشان کن ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دینے والا۔ تم دیکھنا، بیٹے کا پرچہ گم ہونے پر وہ کتنا شور مچائے گا۔“

”لیکن میرا تو کوئی قصور نہیں۔“

”خوش قسمتی سے پرچوں کی تعداد پوری نکل آنے پر تم یہ بات برملا کہہ سکتی ہو۔“

”تھینکس گاڈ!“ منتہا نے ایک اطمینان بھری سانس کھینچی۔

پھر وہی ہوا جو فضلہ نے کہا تھا!



عمران احمد کے والد نے بیٹے کا امتحانی پرچہ گم ہو جانے پر وہ لے دے کی کہ معاملہ نظامت تک جا پہنچا اور پرنسپل صاحب کی پیشی اعلیٰ افسران کے روبرو ہوئی۔ فاروقی صاحب معاملہ فہم اور ونگ آدمی نہ ہوتے تو بات جانے کہاں تک جاتی، بمشکل گلو خلاصی ہوئی اور پرنسپل صاحب کو اساتذہ کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کر کے یہ ہدایات جاری کرنا پڑیں کہ آئندہ اساتذہ امتحانی کاموں میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کریں گے۔ نگران ہائے جماعت اپنی اپنی جماعت کی حاضری پوری توجہ سے لیں گے۔ کمرہائے امتحان میں طلباء کی نگرانی پر مامور اساتذہ جوابی کاپیوں پر اپنے دستخط ثبت کرتے ہوئے اور جوابی پرچے ان سے وصول کرتے وقت پوری ذمہ داری سے یہ اطمینان کریں گے کہ رول نمبر اور جماعت وغیرہ درست لکھی گئی ہے نیز کوئی غیر متعلق رول نمبر والی کاپی تو وصول نہیں کی گئی۔ ممتحن اپنے اپنے مضمون کے جوابی پرچے شعبہ امتحان سے گن کر وصول کریں گے اور پڑتال کے بعد جب وہ پرچے شعبہ امتحان کو واپس کریں گے تو یہ شعبہ امتحان کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ پڑتال شدہ جوابی پرچے گن کر ممتحن سے وصول کرے۔

عمران کے گشودہ جوابی پرچے کا کچھ پتا نہ چل سکا کہ زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا۔ اساتذہ نے پرنسپل صاحب کی ہدایات کا بھی آئندہ ایک دو امتحانات میں خاطر خواہ خیال رکھا پھر حسب روایت اپنی سابقہ روش پر پلٹ گئے مگر منتہا کو اس واقعے نے اتنا محتاط کر دیا کہ وہ نہ صرف تب بلکہ بحیثیت استاد ہمیشہ ان ہدایات پر کاربند رہی۔

مئی اکثر کہا کرتی تھیں، منتہا کو جب میں نے کوئی بات کہہ دی، اس نے اسے دوبارہ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ نیسہ اور ملیب ان کی بات ٹال جانے یا ان سنی کر جانے والے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اگر کوئی بات مئی کو دوبارہ سمجھانے کی ضرورت پڑتی تو منتہا کو ایک ہی بار کہہ دینا کافی ہوتا اور یہی وہ حد فاصل تھی جس نے اسے بچپن سے اب تک مئی کی نظروں میں نیسہ اور ملیب کے مقابلے میں ممتاز رکھا تھا اور اسکول میں بھی اس کا قریب ہی تھا!



گزشتہ آٹھ برسوں میں نوکری اور یوشنر منتہا کی ایسی مستقل مصروفیت رہی تھی کہ چھٹی والے دن کے علاوہ اسے شاذ ہی فرصت ملتی اور چھٹی والے دن بھی فرصت کا بس نام ہی تھا۔ دن گھر کے کاموں میں، مئی کا ہاتھ بٹانے، ہفتے بھر کے لیے سودا سلف کی خریداری، آئندہ ہفتے کے لیے کپڑوں کی دھلائی، انہیں کلف دینے اور استری کر کے الماری میں لٹکانے میں گزر جاتا۔ وہ ہفتے بھر کے لیے کپڑے ایک ہی دن استری کر کے رکھ لیتی۔ روزانہ یہ سوچنے کی فرصت کے تھی کہ اگلی صبح اسکول جانے کے لیے کون سے کپڑے پہنے جائیں۔ اگرچہ موسم گرما کی طویل تعطیلات میں کئی ہفتے تک کپڑوں کو کلف لگانے اور دبا دبا کر استری کرنے کی ہفتہ وار مصروفیت سے فراغت مل جاتی۔ اسکول آمدورفت بھی ماسوا تنخواہ والے دن یا پھر کسی ریفریشر کورس کے دنوں کے ترک رہتی مگر دیگر مصروفیات بدستور رہتیں بلکہ تعطیلات کے دوران یوشن کے لیے آنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا۔ یوشن کی مخالفت میں بولنے والے والدین بھی کبھی اپنے بچوں کی کمزوریاں دور کرانے کو اور کبھی انہیں محض مصروف رکھنے اور پڑھائی سے لا تعلق نہ ہو جانے کی خاطر یوشن لگوا دیتے اور یوں تعطیلات میں بھی منتہا مصروف ہی رہتی۔

ملازمت اور یوشنر نے اسے زندگی کے محاذ پر کتنے معرکے سر کرنے میں مدد دی تھی۔

ملیب نے انجینئرنگ یونیورسٹی سے ڈگری لے لی تھی۔ گوانجینئرنگ یونیورسٹی میں اسے اس کی خواہش کے مطابق کمپیوٹر انجینئرنگ کے شعبے میں تو داخلہ نہ مل سکا تھا تاہم اس نے میکینکل انجینئرنگ میں ڈگری لے لی تھی اور اب ایک مقامی ادارے میں ملازمت کر رہا تھا جہاں کے حالات کار سے اگر وہ بہت خوش نہیں تھا تو ایسا کچھ غیر مطمئن بھی نہ تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ ڈیڈی کی دوسری شادی کے بعد ماں اور بہن نے اس کی منزل کھوئی نہیں ہونے دی تھی۔ پیٹ کاٹ کر اپنی جان پر مشقت جھیل کر اسے بالآخر اس لائق تو کر دیا تھا کہ وہ عزت کی روٹی کما سکتا تھا۔ سرائی کر چل



سکتا تھا اور راہ گزار حیات پر کبھی ڈیڈی کے روبرو آجانے پر ان سے کہہ سکتا تھا کہ زندہ ہوں اور مطمئن بھی! نیمہ کا ایم بی بی ایس کر لینا بھی کوئی کم بڑا معرکہ نہ تھا۔ وہ لڑکی جو ڈیڈی کی دوسری شادی کے بعد قرینہ زندگی کے یکایک الٹ پلٹ جانے سے اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اس نے حصول تعلیم سے یکسر منہ موڑ لیا تھا، ماں اور بہن کے ہمت بندھانے پر ہی تو دوبارہ اٹھی تھی اور بالآخر اس نے ایک دیرینہ خواب کی تعبیر پالی تھی اور اب کبھی ڈیڈی کا سامنا ہو جانے پر ان سے کہہ سکتی تھی فادر ڈیئر! ہر کامیاب مرد ہی کے پیچھے نہیں ہر کامیاب خاتون کے پیچھے بھی کسی خاتون ہی کا ہاتھ ہوتا ہے جیسے میرے پیچھے میری ماں اور بہن کا ہاتھ!

حقیقت یہ تھی کہ ممی اور منتہا نے یک لخت بکھر جانے والے آشیانے کو باہم مل جل کر تنکا تنکا سمیٹا تھا، جوڑا تھا۔ ممی کو منتہا سے اور منتہا کو ممی سے بہت ڈھارس تھی۔ منتہا کا دل اکثر چپکے چپکے ممی کے لیے دکھنے بھی لگتا۔ وقت سے پہلے ہی ان کے بالوں میں کثرت سے چاندی کے تار لہلہا اٹھے تھے۔ چاندی کے ان تاروں کو رنگنے کے لیے منتہا نے نہ جانے کتنی مرتبہ مہندی بھگوئی مگر ممی قابو ہی نہ آتیں۔

”ارے بیٹا، مجھے کیا ضرورت ہے بھلا مہندی لگانے کی؟“

”بس ہے نا ضرورت!“

”ضرورت کی وضاحت کرو“ ممی ایک روز بولیں۔

”آپ سے کہیں بڑی عمر کی عورتیں اپنا ایک بال سفید نظر نہیں آنے دیتیں۔“

”مجھے کس کو دکھانا ہے؟“ ممی کے لہجے میں حسرت تھی۔

منتہا نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نظریں چرائیں مگر ان کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی آبی لہر منتہا کی نظروں سے پنہاں نہ رہ سکی۔

”ہمیں اور کسے!“ اس نے کہا۔

اپنی آنکھوں کے زیریں کناروں پر جھنجھکیا پھیر کر بڑی رازداری سے اپنی آنکھوں کی سیلن کو چھٹکی کی اگلی پور میں جذب کرتے ہوئے ممی دھیرے سے مسکرا دیں۔

منتہا نے ممی کے روبرو ہو کر اپنی بانہیں ان کے گلے میں حائل کر دیں۔ ممی اسے دیکھنے لگیں۔

”میں، نیمہ، علیب، ہم تینوں آپ کو پہلے کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں۔ جوان، اسارٹ اور خوش۔“

ممی کے لبوں پر پھر حزنِ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”جب اولاد جوان ہو جائے تو مائیں جوان نظر آنے کی کوشش کرتی اچھی نہیں لگتیں۔“ انہوں نے دھیمی آواز

میں کہا۔

منتہا کو ان کی آنکھوں کی سیلن آواز میں اتنی محسوس ہوئی۔

”ایک بات بتائیے۔“ ممی نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ ”سچ بتائیے گا۔“

ممی نے کچھ اس طور اس کی جانب دیکھا جیسے کہتی ہوں، ایسی کیا بات پوچھنے جا رہی تھی وہ جس کے بارے میں اسے خدشہ تھا کہ وہ اس سے سچ بولنے سے گریز بھی کر سکتی تھیں۔

”اگر.... اگر ہم ڈیڈی کے ساتھ ہوتے تو کیا تب بھی آپ خود سے اتنی بے پروا رہ سکتی تھیں۔“

ممی نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ لمحہ بھر میں اُن کی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی تھی۔

”کیا تب بھی آپ اپنے بالوں کو یوں ہی سفید چھوڑ دیتیں؟“

ممی چپ رہیں مگر ان کا چہرہ ان کے باطنی کرب کا غماز بن گیا تھا!

”بولیے۔“

مئی بدستور چپ رہیں۔  
”بتائیے نا“ اب اس کے اصرار میں بے قراری تھی۔

”ایسے سوال کیوں کرتی ہو؟“  
”آپ وقت سے پہلے اپنے اوپر بڑھاپا طاری کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں لوگوں پر...“ اس نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر بولی ”یہ کہ آپ نے ڈیڈی کے بعد جوگ لے لیا ہے۔“  
”خدا نہ کرے... میں... میں بھلا کیوں لینے لگی جوگ، ایک ایسے آدمی کے لیے جس نے...“ مئی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”آپ سے اور ہم سب سے بے وفائی کی۔“  
مئی نے پھر چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں گھائل پن تھا۔  
”خوش رہا کیجئے، اپنا خیال رکھا کیجئے... اچھے کپڑے، بالوں کو مندی یا ڈائی لگا ہوا... میرے، نیمہ اور علیب کے لیے... دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ آپ ڈیڈی کے بغیر بھی خوش رہ سکتی ہیں اور ڈیڈی تک یہ خبریں پہنچانے کے لیے کہ ہم ان کے بغیر بھی نہ صرف زندہ بلکہ خوش بھی ہیں۔“  
مئی نے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچی اور اس ایک آہ نے ان کے دل کا راز طشت از بام کر دیا۔  
”اب مجھے نہ ان تک اپنی کوئی خبر پہنچانے میں کوئی دلچسپی ہے نہ ان کی کوئی خبر ملنے میں دلچسپی۔“  
”یہ تو نہ کہئے“ منتہا نے انہیں گہری نگاہوں سے دیکھا ”اگر آپ کو ان کی خبر ملنے سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تو بھلا ہم یہ کیسے جان پاتے کہ فادر ڈیڈی کے دو بچے اور بھی ہیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ان کی چھوٹی سی کلینک اب ایک پرائیویٹ اسپتال میں تبدیل ہو چکی ہے، جس کی ایڈمنسٹریٹران کی دوسری بیگم صاحبہ ہیں۔“  
”لوگ آپ ہی خبریں سنا جائیں تو میں کیا کروں؟“

ڈیڈی اور ان کی دوسری بیوی اور بچوں کے بارے میں خبریں مئی کو ادھر ادھر سے ملتی رہتیں۔ کبھی کسی رشتے دار کبھی کسی مشترکہ ملنے جلنے والے سے۔ ڈیڈی کے بارے میں کوئی نئی تازہ سننے ہوئے مئی بظاہر انجان سی بن جاتیں، عدم دلچسپی کا اظہار کرتیں اور کہتیں ”جس راہ جانا نہیں اس کا ذکر کیا“ مگر مئی کی آنکھیں کچھ اسی طرح ان کے دل کی چغلی کھا جاتیں جیسے اس وقت ان کی سرد آہ نے ان کے دل کا راز افشا کر کے رکھ دیا تھا۔  
مئی کی تمام تردیلچسپی اب ایک ہی بات پر مرکوز تھی اور وہ یہ کہ دونوں بیٹیاں جلد از جلد اپنے گھریلو کی ہو جائیں پھر علیب کے لیے کچھ سوچا جائے۔

کسی رشتے دار، محلے دار یا شناسا سے بات ہوتی یا مسز ظہیر سے ملاقات، مئی بڑی عاجزی سے ایک ہی بات کہتیں ”منتہا کے لیے کوئی مناسب رشتہ بتائیں۔“

”میرے لیے کیوں، نیمہ کے لیے کیوں نہیں؟“ منتہا کہتی۔

”اس کے لیے بھی مگر بڑی تو تم ہو، اس لیے تمہارے لیے پہلے۔“

”نہیں والدہ، میں شادی نہیں کروں گی“ ایک روز اس نے دونوک کہہ دیا۔

”پاگل ہوئی ہو... کنوار کو ٹھہرا چنواؤ گی کیا“ مئی نے اسے معترض نگاہوں سے دیکھا۔

”چنواؤ گی کا کیا مطلب! چنوا لیا ہے والدہ... ہم دونوں کے لیے تین کمروں کا فلیٹ بہت۔ علیب اور اس کی ہونے والی فیملی جب تک گزارہ کر سکے ہمارے سر آنکھوں پر، جب چاہیں علیحدہ۔ والدہ آپ بس نیمہ اور علیب کی فکر کیجئے، میری فکر چھوڑیں۔“

”بکومت!“ مئی نے ناگواری کا اظہار کیا ”آئندہ ایسی بد فال منہ سے نکالی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“



”پلیز!“ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنے پکڑ کر انہیں از حد محبت اور احترام سے دیکھتے ہوئے گڑ گڑائی ”ناراض نہ ہوں۔“

”تو کیا شادیا نے بچواؤں کے میری بیٹی شادی سے انکاری ہے۔“  
”میں.... میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ آپ بس نیسہ کی فکر کریں۔“  
”پھر وہی بکواس کی تم نے۔“

”آپ نے اپنے سے دور کیا تا تو میں مرجاؤں گی“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔  
”میں نے اسے ممتا آمیز خفگی سے دیکھا۔“ کوئی کسی سے دور ہو کر نہیں مرتا۔ ہم مرے تمہارے باپ...“ می نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ان کے لیے تو مرنا فضول تھا۔ ایسے شخص کے لیے کون بے وقوف مرے گا بھلا جس نے کبھی پلٹ کر یہ تک نہیں دیکھا کہ وہ عورت جو اس کی بیوی تھی بلکہ اب بھی ہے اس پر اور اس کے تین عدد بچوں پر کیا گزری۔ زندہ بھی رہے کہ نہیں“ اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔  
”کتنی دفعہ کہا ہے میں نے کہ ان کا ذکر نہ کیا کرو۔“

”لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں کہ آپ کسی بہانے سے ان کا ذکر سننا پسند کرتی ہیں؟“  
”اچھا خیر چھوڑو، ذکر کیا تھا اور تم کیا قصہ نکال بیٹھیں۔“

”سچ والدہ“ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی میں۔ اور نہ ہی کبھی یہ گوارا کروں گی کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی اور آئے۔“

”ہمیں بھی اپنی امی سے بہت محبت تھی“ می نے اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”مگر ماں نے تمہارے باپ کے پلے باندھ دیا، ہم چپ چاپ انہی کے ساتھ ہو لیے۔ امی اب اس کو چھوڑنا پڑا، بھول گئے ہم کہ ہمیں ان سے کتنا پیار تھا۔ امی ہماری اگر دن میں کبھی خلافِ عادت سوچا تیں تو ہم بے چین پھرتے کہ آج ہماری ماں خلافِ عادت دن میں کیوں سو گئیں، کہیں طبیعت تو خراب نہیں۔ دن کو طرح طرح کے وہم ستانے لگتے تھے۔“ می نے دبی دبی سی ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولیں ”کہاں پرانے قصے لے بیٹھی میں.... تمہاری مسز ظہیر سے بھی کہا ہے میں نے تمہارے لیے کوئی لڑکا دیکھنے کو۔“

”ہاں، وہ بتا رہی تھیں مجھے.... پلیز، آپ ہر ایک سے یہ بات نہ کہا کریں، مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔“  
”لوگوں سے کہنے سننے ہی سے نئے رشتے ناتے بنتے ہیں۔“

”مجھے ایک بات بتائیے، آپ کو شادی کر کے کیا ملا آخر جو آپ مجھے اس نقصان سے محفوظ رکھنا چاہتی ہیں؟“  
”میں کو شاید اس سے اس قسم کی بات کی توقع نہ تھی، وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔“  
”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“

”بتاؤں.... بتاؤں کیا ملا؟“

”منتہا انہیں ٹانگی باندھ کر دیکھنے لگی۔“

”تم.... تم تینوں.... علیب، نیسہ اور تم.... اور کیا چاہیے مجھے؟“ می کی آواز بھرا رہی تھی اور آنکھوں میں ہلکی ہلکی آبی روویں ہلکورے لے رہی تھیں۔

”اس نے می کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کے بیچ لے کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔  
اسے وہ دلدوز شام پھر یاد آئی جب ڈیڈی ایک دوسری اور اس کی ماں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے کمتر عورت سے اپنے رشتے کا واشگاف اعتراف کر کے می کو تنہا چھوڑ گئے تھے۔ شام ڈھلنے کے بعد رات آئی اور اس پوری رات می

ننگے پاؤں اپنے کمرے میں بے قرار مشقت رہی تھیں۔ کبھی وہ دروازے تک جاتیں، کبھی کھڑکی کے نزدیک ٹھٹھک کر رہ جاتیں۔ دھیرے سے ہٹا کر باہریوں جھانکنے لگتیں جیسے کسی کا انتظار ہو۔ کبھی اپنی مٹھیاں بھیجنے لگتیں، کبھی اپنے زیریں لب کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان بے تابی سے مسلنے لگتیں۔ ان کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتے بڑھتے کرب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس رات می کا اضطراب و کرب دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ می کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑے گی۔

شاید..... بلکہ یقیناً یہی وہ عہد تھا جس نے اس کے دل میں خود انحصاری کا وہ بیج بویا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اک شجر سایہ دار بنتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی شبانہ روز انتھک محنت، فرائض منصبی کی غیر معمولی لگن سے انجام دی، غیر معمولی خود اعتمادی اور زندگی کے ہر معاملے میں خلوص نیت اسی شجر کے تو ثمر تھے۔

ثمر تو اس شجر کے اس کے وہ شاگرد بھی تھے جنہیں اس نے پیشہ تدریس اپنانے کے بعد راہ گزار زندگی سے گزرنا سکھایا تھا۔ نہ جانے کتنوں کو وہ مسز ظہیر والے اسکول میں اپنے علم سے فیض یاب کر آئی تھی اور کتنے سٹی اسکول میں اس کی آٹھ سالہ ملازمت کے دوران اس کے سامنے زانوئے تلمذہ کر گئے تھے۔ اپنی غیر معمولی یادداشت کے باعث وہ ان میں سے بیشتر کے چہرے مع ان کے سیاق و سباق جب چاہتی، اپنی چشم تصور میں لا سکتی تھی۔ استادوں کی طرح ان شاگردوں کی بھی اپنی اپنی کمائیاں اور اپنے اپنے مخصوص حوالے تھے۔

کرنجی آنکھوں والا ارشد سمیع جس کا باپ اس کی پیدائش کے بعد اسے دیکھنے سے قبل ہی چل بسا تھا۔ ارشد کی ماں جس نے اسے ماں ہی نہیں، باپ بھی بن کر پالا تھا، اس کی تعلیمی کارکردگی کا احوال جاننے کے لیے اکثر اسکول آتی اور اس کے ہر نیچر سے فرداً فرداً رابطہ کرتی۔ منہانے اپنے سینئر ساتھیوں کی زبانی سنا تھا کہ ارشد کا نوجوان باپ اپنے پہلے بچے کی ولادت کے لیے بیوی کے اسپتال میں داخل ہونے کی خبر ملنے کے بعد اپنے دفتر سے چھٹی لے کر اسپتال آ رہا تھا کہ راستے میں انجانے دہشت گردوں کی دہشت گردی کا شکار ہو کر اپنے پہلے بچے کا منہ دیکھنے سے قبل ہی چل بسا تھا۔

چمڑے کے مشہور صنعت کار امین چودھری کا گاؤدی سا بیٹا حنیف چودھری جو اپنی نومبندی اور سادہ لوحی کے باعث اکثر اپنے ہم جماعتوں کے ہی نہیں، دوسرے ہم مکتبوں کے ہنسی مذاق کا نشانہ بنارہتا تھا اور اس کے گھر سے اکثر ایسے لڑکوں کے خلاف شکایات آتی رہتی تھیں۔

میکلیم کی غیر معمولی کمی کی شکار انتہائی زرد دانتوں والی طلحہ اشفاق جو اپنی زردی دندان کے باعث بری طرح احساس کمتری کا شکار تھی اور اپنے ہونٹوں کو ہمہ وقت سختی سے بھیچے رہتی تھی۔

مسلسل اور ایک سینکڑوں بلا مبالغہ دو مرتبہ پلکیں جھپکتے رہنے والا انور حفیظ جسے اس کے ہم کتب چھیڑ خانی میں ٹوٹنکل ٹوٹنکل کہا کرتے تھے۔

جاپانی ماں اور پاکستانی باپ کی بیٹی نادیہ اکبر جس کی جاپانی ماں اس کے پاکستانی باپ کے عشق میں اپنا ملک، معاشرت، والدین، بہن بھائی، رشتہ دار اور دوست سب کچھ چھوڑ چھاڑ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اس کے باپ سے شادی کر کے پاکستان چلی آئی تھی۔

بلا کے شریر ہم شکل جڑواں بھائیوں شہود اور زفود کی جوڑی جو اکثر و بیشتر کرے کوئی بھرے کوئی کی عملی تفسیر بنی رہتی تھی۔ شرارت شہود کی ہوتی پکڑا جاتا زفود اور زفود کے شبے میں گرفتار بلا ہو جانے والے شہود کو اکثر دوسروں کو یہ باور کرانا مشکل ہو جاتا کہ وہ زفود نہیں شہود تھا۔ ان کا ہم شکل ہونا کبھی انہیں فائدہ دیتا تو کبھی دلچسپ صورت حال پیدا کردیتا۔

آرتھوپیڈک سرجن اور لیس احمد بھٹی کا معذور بیٹا ایازا احمد بھٹی جو پانچ سال کی عمر میں ہڈیوں کی ایسی کمزوری کا شکار



ہوا کہ اب اپنے چہرے پر بیٹھی مکھی تک اڑانے سے قاصر ہو کر خالق کے سامنے بندے کی بے بسی اور لاچارگی کا منظر بنا ہوا تھا کہ وہ جس کا باپ معذوروں کے لیے نوید مسیحا سمجھا جاتا تھا، اس کا اپنا اکلوتا بیٹا عضو معطل بنا ہوا تھا۔ ایک برسہ وقتی ملازم اسے گاڑی سے گود میں اٹھا کر جماعت کے کمرے تک پہنچاتا اور پرنسپل صاحب کے خصوصی اجازت نامے کے تحت چھٹی ہونے تک ایاز کے جماعت کے کمرے کے باہر راہداری میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا اور اس کی مختلف حوائج کا خیال رکھتا۔

راحت علی شاہ جسے اپنے مصور باپ سے شوق مصوری ورثے میں ملا تھا۔ راحت کی مجسمہ ساز خوبصورت اور نوجوان ماں کو تین چار سال قبل انتہائی پراسرار حالات میں قتل کر دیا گیا تھا۔ آئے دن گھر سے فرار ہو لینے کا عادی اسد نذیر۔

سو تلی ماں کے مظالم کا شکار یا سر نیاز۔ پڑھائی میں صفر گریڈ منسٹن کا گویا پیدائشی کھلاڑی فہیم آفاق جسے پڑھائی میں اس کی تمام تر کمزوری اور عدم دلچسپی کے باوجود پینڈ منسٹن کے مقابلوں میں اس کی غیر معمولی کارکردگی کے باعث ایک مخصوص شناخت حاصل تھی۔ انڈر نائنٹین ٹیم میں شامل کرکٹ کا کھلاڑی اشوک گوپال جسے کرکٹ میں اس کے تابناک مستقبل کی بنا پر ایک مقامی بینک نے اپنے ہاں اعزازی ملازمت دے دی تھی۔ عمارتی کام کے ان پڑھ مگر متمول ٹھیکے دار کا پڑھا کو بیٹا محمد نعیم۔

اور بہت سے ان گنت جن میں سے بعض کی کہانیوں میں تو وہ بہت زیادہ انوالو ہو چکی تھی۔ انور سلطان ایک سیلف میڈ سفید پوش گھرانے کا لڑکا دو بھائیوں اور چھ بہنوں میں سب سے چھوٹا۔ ماسوا اس کے سبھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ بڑا بھائی ایک نیم سرکاری ادارے میں قانونی مشیر تھا۔ بہنوں میں سب سے بڑی اسکول ٹیچر تھی۔ ایک بہن ڈاکٹر تھی، ایک بینکار، ایک انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی، اس سے چھوٹی آنرزا اور سب سے چھوٹی ایف ایس سی کر رہی تھی۔ بڑے بھائی اور دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ زیر تعلیم بہنوں میں سے ایک اپنے ایک عم زاد سے منسوب کی جا چکی تھی۔ سب سے بڑی بہن جو اسکول ٹیچر تھی، اپنے کنبے کی معاشی کفالت میں باپ کی مدد و معاون رہی تھی اور اس مقصد کی خاطر اس نے شادی نہیں کی تھی۔ تعلیم سے انور کی عدم دلچسپی اور بے پروائی کے باعث وہ اس کی طرف سے انتہائی فکر مند رہتی اور اس کی تعلیمی کارکردگی کا احوال لینے کے لیے وہ گاہے گاہے اسکول آتی اور انور کے ایک ایک ٹیچر سے ملتی۔ انور رعایتی نمبروں سے پاس ہو کر آٹھویں سے نویں میں آیا تو اس کی بہن کی منتہا سے بھی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

”مس جی! آپ کی وہ بہت تعریف کرتا ہے، آپ اسے سمجھائیں کہ پڑھائی پر توجہ دے۔ سارے بھائی بہنوں نے اپنے اپنے مقام پر پہنچنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ہم سب اس کی طرف سے بہت فکر مند ہیں۔ صرف پاس ہو جانا ہی تو کافی نہیں۔ آگے بڑھنے کے لیے لیاقت کا ہونا ضروری ہے۔ بڑے بھائی اتنے قابل اور یہ۔“

منتہا اسے گاہے گاہے سمجھانے بھجانے لگی۔ وہ سر جھکائے اس کی نصیحتیں اور ہدایتیں سنے جاتا مگر ایک روز اس نے جارحانہ لہجے میں کہا ”میڈم! آپا اور باقی گھروالے سب مجھ سے بار بار یہ کیوں کہتے ہیں کہ تمہیں بھائی صاحب کی طرح بننا چاہیے۔“

منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تو پھر کیا کہنا چاہیے، چھوٹے بہن بھائیوں کو بڑوں ہی کی مثالیں دی جاتی ہیں“ اس نے دلسوز لہجے میں کہا۔

”سوری مس، میں بڑے بھائی کی طرح نہیں بننا چاہتا۔“

”کیوں بھی؟“ منتہا نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

وہ متذبذب دکھائی دینے لگا۔

”بتاؤ۔“

”مس.... مس“ آخر یہ سب لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں بھائی صاحب کی طرح بنوں؟“

”اور آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ آپ بھائی صاحب کی طرح بنوں؟“ منتہا نے اس کے سوال کے جواب میں سوال

داغا۔

”مس!“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا ”ابا اور آپا نے بھائی صاحب کو بڑھایا لکھایا۔ آپا نے فیملی کے لیے قربانی دی۔ جب بھائی صاحب کو ابا کی مدد کرنی چاہیے تھی، آپا نے جاب کی اور بھائی صاحب کو تعلیم دلوانے میں ابا کی مدد کی۔ آپ کو بتایا ہو گا نا میری سسٹر نے کہ میرے بھائی نے انگلینڈ سے بار ایٹ لا کر رکھا ہے۔“

”ہاں، بتایا تھا انہوں نے۔“

”مس“ میری سسٹر نے... یہی بڑی والی سسٹر جو آپ کے پاس آتی ہیں، انہوں نے صرف فیملی کو سپورٹ کرنے کے لیے خود شادی نہیں کی مگر بھائی صاحب کی شادی ایک امیر گھرانے میں کروائی۔ وہ اب ہم لوگوں سے الگ رہتے ہیں۔ ہمارا گھر نار تھ میں ہے، وہ ڈیفنس میں رہتے ہیں، نہ امی ابا کا خیال کرتے ہیں، نہ آپا کا وہ احترام کرتے ہیں جو انہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں نا مس، آپا نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ کوئی نرس ایک رات مریض کے ساتھ جاگ لے تو مریض اس رات کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ آپا نے تو ہم لوگوں کو اپنی پوری زندگی دی ہے مگر نہ بھائی صاحب انہیں پوچھتے ہیں نہ بھابی اور بچے۔ سوری مس، میں بھائی صاحب کی طرح نہیں بننا چاہتا۔ میں تو امی، ابا اور آپا کا بہت خیال رکھنا چاہتا ہوں۔ ابا ریٹائر ہوئے تو انہیں جو پیسے ملے اس سے انہوں نے بھائی صاحب اور بہنوں کی شادیاں کر دیں اور کچھ رقم خاص ڈپازٹ میں رکھوا دی۔“

”گھر بھی تو بنایا شاید؟“

”نہیں وہ تو ہمارے پاس پہلے کا ہے۔ پہلے ایک منزل تھا پھر پاورس بلڈنگ سے لون لے کر ایک منزل اور بنائی۔ اس کی قسطیں آپا نے یوٹیلٹی کے اتاریں۔ امی کوچ کی خواہش تھی مگر ابا انہیں حج کے لیے نہیں لے جاسکے۔ بھائی صاحب لے جاسکتے تھے مگر انہیں پرواہی نہیں میں امی اور ابا کو حج کروانا چاہتا ہوں۔ باقی بہنوں کی شادیاں کروانا چاہتا ہوں۔ میں تو آپا کی نوکری چھڑوا کر ان کی بھی شادی کرانا چاہتا ہوں۔ یہ سارے کام میں بھائی صاحب کی طرح بن کر تو نہیں کر سکتا۔“

منتہا انتہائی محویت سے سنتی رہی۔

نویں جماعت کا وہ نو عمر لڑکا جسے اس کی کمزور تعلیمی کارکردگی کے باعث وہ اور دوسرے اساتذہ کند ذہن سمجھا کرتے تھے کیسی متانت سے کسی باشعور فرد کی طرح بات کر رہا تھا۔ کیسی گہری بات کی تھی اس نے کہ کوئی نرس ایک رات کسی مریض کے ساتھ جاگ لے تو مریض اس رات کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے، آپا نے تو ہم لوگوں کو اپنی پوری زندگی دی ہے! اسے اپنے اس شاگرد، اس کے والدین اور پوری زندگی اپنی فیملی کے لیے قربان کر دینے والی بہن سے غیر معمولی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

”اس کے لیے تمہارا تعلیم میں دلچسپی لینا بہت ضروری ہے انور، بڑھے بغیر تم یہ سب کچھ کیسے کر سکو گے؟“

”مس، بھائی صاحب نے فارن سے بار ایٹ لا کیا، وہ یہ سب کچھ کب کر سکے؟“

منتہا نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔

اس کی باتیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک کند ذہن اور غبی طالب علم تھا۔ اس کی باتوں میں زندگی کے گہرے



تجربے کی کاٹ تھی اور الفاظ میں وزن تھا۔  
 ”اچھا دیکھو، بحث کی ضرورت نہیں، اگر تم واقعی وہ سب کچھ کرنا چاہتے ہو جو تمہارے بڑے بھائی نہیں کر سکے تو تمہیں اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ تمہارا پڑھائی کے سلسلے میں سیریس ہونا اس لیے ضروری ہے کہ تمہارے والدین اور تمہاری بہن جن کا تم اتنا احترام کرتے ہو، تمہیں پڑھا لکھا دیکھنا چاہتے ہیں اور میں بھی تمہاری نیچر ہونے کے ناتے تمہیں ایک اچھا اسٹوڈنٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔ سمجھ رہے ہونا آپ میری بات؟“  
 ”یس مس!“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”دیکھو انور، پڑھے بغیر یہ تو ممکن ہے کہ آپ خوب پیسا کما لو اور وہ سب کچھ کر دکھاؤ جو بقول تمہارے، تمہارے بڑے بھائی صاحب نہیں کر سکے لیکن تعلیم حاصل کیے بغیر آپ شاید اتنے اچھے انسان نہ بن سکو جتنا کہ آپ کے والدین، بہن اور گھر کے دوسرے لوگ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“

وہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا۔

”میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”یس مس!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”گڈ! ایک اچھا بچہ، ایک اچھا طالب علم بننے کی کوشش کرو۔“

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔

”ٹھیک ہے“ منتہا نے اثبات طلب لہجے میں کہا۔

اس نے نگاہ اٹھا کر منتہا کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلادیا۔

”گڈ! اب تم جاسکتے ہو۔“

منتہا کو جب اور جہاں موقع ملتا، دلسوزی سے اسے سمجھانے، بھانے کی کوشش کرتی۔ گلیشئر پگھلنے لگا۔

انور سلطان پڑھائی میں دلچسپی لینے لگا۔ اسے پڑھانے والے اساتذہ حیرانی ظاہر کرنے لگے۔

”ارے بھئی، نا، منتہا بی کا انور سلطان تو بہت امپروو کر رہا ہے۔“

”اس بار ٹیسٹ میں بڑے اچھے نمبر لیے ہیں اس نے۔“

”کلاس میں اس کا رویہ بھی بہت تبدیل ہو گیا ہے۔“

”لگتا ہے گھروالوں نے اچھی پھینٹی دی ہے اسے جو سدھر گیا ہے۔“

”ایسے نالائقوں کے ساتھ یہی کیا جانا بھی چاہیے۔“

منتہا چپ چاپ تبصرے سنتی رہتی۔ اسے انور کے رویے میں تبدیلی اور پڑھائی میں دلچسپی لینے پر حیرانی نہیں خوشی تھی۔

خوش اس کی بہن بھی بہت تھی۔

”مس جی! آپ سے بہت امپریسڈ ہے وہ۔ بہت احترام کرتا ہے آپ کا... اپنے تمام نیچروں میں گھر پر بس وہ ایک

آپ ہی کی تعریف کرتا ہے۔“

اس کے بارے میں نیچرز کے یہ دعوے کہ وہ بورڈ کے امتحان میں بری طرح فیل ہو گا یکسر غلط ثابت ہوئے۔ نویں

جماعت کے امتحان میں اس نے بڑے اچھے نمبر حاصل کیے اور اس کی اس کامیابی پر مختلف آراء سننے کو ملیں۔

”بعض طالب علم وقت کے ساتھ ساتھ یونہی سیریس ہو جایا کرتے ہیں، پڑھائی ہیں“ منتہا نے اس کی کامیابی پر

اپنے ایک ساتھی کا تبصرہ سنا۔

”جیل صاحب، بچوں کو سمجھانا بھی پڑتا ہے“ اس نے اپنی رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھا ”اور ہم استادوں کا

کردار اس سلسلے میں بہت اہم ہے۔“

”ارے نہیں بس منتہا یہ بد معاش لڑکے اپنے باپوں کو خاطر میں نہیں لاتے تو استادوں کو کیا لائیں گے۔ انہیں تو کوئی خدائی معجزہ ہی سنوارتا ہے۔“

شاید یہ بھی صحیح تھا!

منتہا کا سمجھنا بجھانا انور سلطان کے دل کو لگ جانا کوئی خدائی معجزہ ہی تھا ورنہ تو اس کے اپنے گھر والے بھی اس کی طرف سے مایوس ہوئے بیٹھے تھے۔

بڑی مستقل مزاجی سے ماہانہ ٹیسٹوں اور میقاتی امتحانات میں فیل ہونے اور اسکول کے سالانہ امتحانات میں رعایتی نمبروں سے پاس ہو کر اگلی جماعت میں ترقی پانے والا انور سلطان دسویں کے امتحان میں اے گریڈ حاصل کر کے کسی اچھے کالج میں داخلے کا استحقاق حاصل کر گیا۔

اگلے دو برس کے دوران اس نے ایک مقامی کالج سے انٹر کیا اور اب یونیورسٹی کا طالب علم ہونے کے ساتھ شام کے وقت ایک جزوقتی ملازمت بھی کر رہا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملتا بطور خاص منتہا سے ملنے کے لیے اسکول ضرور آتا اور بے لاگ کہتا ”بس“ میں صرف آپ سے ملنے کے لیے اسکول آتا ہوں۔“

منتہا کو اس سے مل کر ہمیشہ کچھ ویسی ہی خوشی اور تسکین ملتی جیسی اپنے ایک اور شاگرد یا سر نیاز سے مل کر ہوا کرتی تھی۔



یا سر نیاز ان دنوں جبکہ وہ چھوٹی جماعتوں کو پڑھایا کرتی تھی، چھٹی جماعت میں اس کا شاگرد ہوا کرتا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی اسکول کے پرائمری سیکشن میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ دونوں اس کے سوتیلے بھائی تھے۔ دونوں غضب کے شریر اور چلبے جبکہ یا سران کے برعکس بہت سنجیدہ اور قدرے ڈرا سہما سار کا تھا مگر بلا کا ذہین!

یا سرکی سگی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور سوتیلی ماں روایتی سوتیلی ماؤں کی طرح اس کے حق میں اچھی نہ تھی۔ دونوں سوتیلے بھائیوں کے مقابلے میں یا سرکی یونیفارم، جوتے، بستے، کاپیاں، کتابیں اور تھرماس بوتل کے بیرونی پلاسٹک خول پر بڑی ان گنت لکیریں رویتے کے اس فرق کی چغلی کھاتے جو یا سرکی سوتیلی ماں اپنے گئے بچوں اور یا سر کے درمیان روا رکھتی تھی۔

”پیرٹس ڈے“ پر یا سر کے والدین جب بھی اپنے بچوں کی تعلیمی ترقی کا حال جاننے کے لیے ٹیچرز سے ملاقات کے لیے آتے یا سرکی سوتیلی ماں اس کے خلاف شکایتوں کا ایک دفتر بھی ہمراہ لاتی جسے وہ اس کی ہر ٹیچر کے سامنے کھولنا نہ بھولتی۔ منتہا مسلسل دو سال یا سر کی ٹیچر رہی۔ پہلے سال ریاضی کی ٹیچر اور نگران جماعت بھی اور دوسرے سال صرف ریاضی کی ٹیچر کی حیثیت سے اس کا یا سر کے والدین سے گاہے گاہے رابطہ رہا۔ اس مسلسل رابطے نے اسے یا سر کے گھریلو حالات اور اس کے سوتیلے بھائیوں کے مقابلے میں اس کے ساتھ اس کے والدین کے متضاد رویے کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد دی۔ افسوس ناک امر یہ تھا کہ ماں تو تھی ہی سوتیلی، سگا باپ بھی وہی کہتا جو اس کی سوتیلی ماں بولتی۔ دونوں کے خیال میں یا سر بد تمیز، جھگڑالو اور نالائق بچہ تھا۔ ابتدا میں منتہا نے ان کے ان خیالات کی مخالفت اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یا سر ایک باتمیز اور ذہین لڑکا ہے، اس وقت تک اسے یہ علم نہ تھا کہ خاتون یا سرکی سوتیلی ماں تھی لیکن ماں اور باپ دونوں ہی نے کبھی منتہا کی بات سے اتفاق نہ کیا۔

”آپ نہیں جانتیں بس کہ وہ کتنا بد تمیز لڑکا ہے“ خاتون ہمیشہ انتہائی نخوت سے کہتی ”آپ کے پاس تو یہ چند گھنٹے گزارتا ہے۔ اسکول اگر شریف بن جاتا ہے، میرا ہی دل گرہ ہے جو اس کی حرکتیں برداشت کرتی ہوں۔“

یا سرکی سوتیلی ماں اس کے بارے میں عموماً ایسی ہی رائے کا اظہار کرتی اور باپ اس کی تائید میں سر ہلاتا رہتا۔



یاسر کا سر جھک جاتا۔ کبھی اس کی ماں اس کے ہم جماعتوں اور ان کے والدین کی موجودگی ہی میں اس کے کان کھینچنے لگتی، کبھی اس کا باپ اس کے سر پر بے دردی سے ہاتھ مار کر اس کے جھکے ہوئے سر کو اور جھکا دیتا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔

والدین کے اسی رویے کے باعث اور یہ معلوم ہونے پر کہ خاتون یاسر کی سگی نہیں سوتیلی ماں تھی، منہا کو یاسر سے ہمدردی اور انس ہو گیا اور وہ اس سے خصوصی شفقت کا اظہار کرنے لگی۔ نتیجتاً یاسر اسکول کے اوقات کے دوران موقع پاتے ہی بہانے بہانے اس کے پاس آنے اور ہم کلام ہونے کی کوشش کرنے لگا اور دھیرے دھیرے ان کے مابین ایک اپنائیت سی نمونہ بننے لگی۔ منہا کو اس کی بہت سی محرومیوں اور مسائل کا علم ہوتا چلا گیا۔

وہ محبت کو ترسا ہوا بچہ تھا جسے کھانا بھی پیٹ بھر کر نہ ملتا۔ اس کے سوتیلے بھائیوں کے مقابلے میں اسے سستے کپڑے اور ناقص جوتے دلوائے جاتے۔ نئی جماعت میں ترقی پانے پر پرانی کتابیں ملتیں اور کاپیاں یا تو ناقص کاغذ کی ہوتیں یا پھر اس کے چھوٹے بھائیوں کی پرانی کاپیوں میں باقی ماندہ سادہ اور ارق کو باہم بند ہوا کرنا پڑ جاتیں۔ اسے گھر سے اسکول آنے اور اسکول سے گھر واپس جانے کے لیے آرام دہ پرائیویٹ کو سڑکی سہولت بھی میسر نہ تھی کہ یہ تو اس کے سوتیلے بھائیوں کا حق تھا۔ وہ چھوٹے جوتے اور ان کی ماں بھی زندہ تھی۔ یاسر بڑا تھا اور پبلک بس میں آ جاسکتا تھا۔ اس کا باپ سوتیلی ماں اور اس کے چھوٹے بھائیوں کی ذرا سی شکایت پر اسے دھنک کر رکھ دیتا جس کے نشانات آئے دن عموماً اس کے چہرے پر پائے جاتے۔

ایک روز یاسر اسکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس نہیں پہنچا اور اگلے دن صبح اسکول کھلنے پر معلوم ہوا کہ آٹھویں جماعت کا اسد نذر بھی گزشتہ روز اسکول سے گھر نہیں پہنچا تھا۔ یہ اطلاع اسکول میں اسد کے ایک ہم جماعت اور محلے دار لڑکے کی زبانی پہنچی۔ اسد کے گھر والوں نے اسکول والوں کو مطلع کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھا کہ ان کے لیے یہ پہلی بار نہیں تھا، اسد آئے دن گھر سے فرار ہونے کا عادی تھا۔

اسد نذر نامی اس امیر زادے کی شان بھی نرالی تھی اور اس سے کہیں زیادہ محیر العقول اس کے گھر والوں کا رویہ تھا جنہیں نہ اس کی نالائقی کی پروا تھی نہ تعلیمی میدان میں اس کے پھسڈی پن کی۔ وہ آئے دن گھر سے فرار ہوتا پھر خود ہی پلٹ بھی آتا۔ ادارے کے اساتذہ کی مشترکہ رائے یہ تھی کہ اسے اسکول سے نکال دیا جانا چاہیے کیونکہ اس سے دوسرے طالب علم بھی بگڑ سکتے تھے مگر بھلا ہو پرنسپل صاحب کا جو اس کا نام خارج کرنے کے بجائے اس کی اصلاح کی کوششوں کے حق میں تھے۔

یاسر کی گمشدگی کے ساتھ اسد نذر کے فرار کی خبر بھی اسکول پہنچی تو یاسر کی گمشدگی کے ڈانڈے اسد نذر کے فرار سے مل گئے اور اساتذہ کو گرم مکالمہ آرائی کا موقع ہاتھ آگیا۔

”کچھ عرصے سے یاسر اور اسد اسکول میں اکٹھے دیکھے جا رہے تھے، ہونہ ہو یا سر کو وہی بد معاش اپنے ساتھ لے بھاگا ہے۔“

”ہم نے تو پرنسپل صاحب سے کتنا کہا کہ اس بد معاش اسد کو اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ تھما کر اسکول سے نکال باہر کریں ورنہ وہ ادروں کو بھی بگاڑے گا مگر پرنسپل صاحب کو تو اس کی اصلاح کا شوق تھا۔“

”ارے، ایسے چھپے ہوئے لفنگے کہیں سدھرتے ہیں بھلا!“

”اب کی بار اسکول آئے تو اس کا نام خارج کر دیا جانا چاہیے۔“

”بلکہ اس کے ساتھ یاسر کا بھی۔“

”یک نہ شد دوشد!“

یاسر کے باپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں درج کروائی تو پولیس اہلکار تفتیش کے سلسلے میں اسکول

بھی آئے۔ یا سر کے ہم جماعتوں، قریبی دوستوں، اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں، پرنسپل، وائس پرنسپل، اساتذہ اور اسکول کے غیر تدریسی عملے بالخصوص چوکیدار سے بھی تفصیلی پوچھ گچھ کی۔

دو دن بعد یا سر مل گیا۔ اسد نذیر کے ساتھ!

دونوں حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر گرد آلود چہروں اور میلے کپڑوں میں ایک ریڑھی کی آڑ میں بیٹھے دہی بھلے کھارہے تھے۔

یا سر بے چارے کو یہ دہی بھلے بہت مہنگے پڑے۔ پولیس کے ہاتھوں اس کی وصولی کے بعد اس کے باپ نے اسے گھر لے جا کر وہ پھینٹی لگائی کہ اس کی ایک ٹانگ توڑ ڈالی۔ دو ڈھائی ماہ تک وہ اسکول سے غیر حاضر اور گھر میں بستر پر پڑا رہا۔ اس کے ایک چھوٹے بھائی کے ذریعے جو درخواست اس کی کلاس ٹیچر کو گھر والوں کی جانب سے بھجوائی گئی، اس کے اندراجات اور منسلک میڈیکل سرٹیفکیٹ کے مطابق اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، کیسے؟ اس کے بارے میں نہ اس کے سوتیلے بھائی کوئی جواب دے سکے نہ اس کے محلے دار، ہم جماعت۔ کوئی کچھ کہتا، کوئی کچھ۔

دو ڈھائی ماہ بعد جب یا سر نے لنگڑا لنگڑا کر اسکول آنا شروع کیا تو اساتذہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ گھر میں میڑھیوں سے گر پڑا تھا مگر منتہا کو اس کی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ دیتی نہ دکھائی دیں۔

”میڑھیوں سے گرے تھے یا کوئی اور شرارت کی تھی آپ نے؟“ منتہا نے پوچھا۔  
وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں منتہا کو ان کما کرب ہلکورے لیتا دکھائی دیا۔  
”کیا بات ہے؟“

جواب میں اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”کیا ہوا یا سرا“ منتہا نے تشویش سے پوچھا۔

اس نے سر جھکا لیا۔

”رو کیوں رہے ہو؟“ منتہا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس نے بے ساختہ چونک کر منتہا کی جانب دیکھا اور اچانک سک سک کر رونے لگا۔

”کم آن یا سر... بچے، بتاؤ تو سہی کیا ہوا؟“

”پاپا نے بیٹ سے مارا تھا، فریکچر ہو گیا“ وہ بھیگی ہوئی آواز میں دھیرے سے بولا۔

”پاپا نے مارا تھا!“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب؟“

”پولیس اسٹیشن سے گھرانے کے بعد۔“

”جب آپ گھر سے بھاگے تھے؟“

”جی ہاں!“

”مائی گاڈ! اتنی بری طرح مارا انہوں نے؟“

”ہاں ہاں!“

”مگر آپ کے بھائیوں نے تو یہ نہیں بتایا کسی کو؟“

”پاپا نے منع کر دیا تھا۔“

”اسپتال لے گئے تھے آپ کو یا کسی پرائیویٹ کلینک؟“

”اسپتال۔“



”وہاں کیا بتایا؟“  
 ”میٹرھیوں سے گرنے کا بتایا تھا۔“  
 ”او مائی گاڈ!“  
 ”مس پلینز.... پلینز مس، آپ کسی کو مت بتائیے گا“ وہ گڑگڑا کر بولا۔  
 ”کیوں؟“  
 ”یابا مجھے ماریں گے۔ انہوں نے کہا تھا کسی کو نہیں بتانا۔“  
 ”مگر آپ نے مجھے تو بتادیا۔“  
 ”سوری مس!“  
 ”مجھے کیوں بتادیا؟“

”پتا نہیں مس!“ وہ بڑی معصومیت سے بولا۔  
 منتہا نے اس کا ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دلسوز لہجے میں بولی ”دیکھو، آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ اچھے بچے کوئی گھر سے بھاگتے ہیں؟“  
 ”سوری مس!“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔  
 اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر منتہا کا دل بھر آیا۔  
 ”یاسرا! بچے، ایک بات سنو.... پڑھ لکھ جاؤ گے نا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ محنت سے پڑھو، ساری توجہ اپنی تعلیم پر رکھو۔ مجھے یقین ہے تم ایک دن بڑے آدمی بنو گے۔“  
 وہ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔  
 ”ہاں.... مجھے یقین ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ تم اسد نذیر جیسے کسی لڑکے سے دوستی نہ رکھو۔“  
 منتہا نے اس کی ناک کی پھنگ کو اپنی چنگی میں دبا کر اس کا موڈ بدلنے کو اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔  
 منتہا کی مسکراہٹ نے کام کر دکھایا۔  
 وہ بھی مسکرا دیا مگر اس کی مسکراہٹ کرب آمیز تھی۔  
 اسے دن گریڈ میں اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ ان دنوں ایک مقامی کالج میں ایف ایس سی پری انجینئرنگ کا طالب علم تھا اور منتہا سے ملنے کے لیے اکثر اسکول آتا۔  
 ”ہاؤ آر یو یاسر؟“ اس کے آنے پر منتہا جب اس کا حال پوچھتی تو وہ مسکرا کر کہتا ”ٹانگ اب ٹھیک ہے میڈم!“  
 منتہا کو اس کی مسکراہٹ میں اب بھی کرب آمیزی کا احساس ہوتا۔



گزشتہ آٹھ برسوں میں بعض نئے تعلقات کی استواری کے ساتھ منتہا نے مسز ظہیر سے اپنی دوستی کی بھی خاطر خواہ پاسداری کی تھی۔ خود مسز ظہیر تو تھیں ہی بڑی بامروت اور مخلص۔ کبھی منتہا ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر چلی جاتی، کبھی وہ خود اس سے ملنے کے لیے آ جاتیں۔ منتہا انہیں اپنی محسنہ قرار دیتی تھی۔ مشکل وقت میں انہوں نے بہت ساتھ دیا تھا۔ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں امید کی راہ بچھانے کو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ساتھ ساتھ چلی تھیں۔

گزشتہ چار پانچ برسوں کے دوران خود مسز ظہیر کے اپنے گھر چلو اور معاشی حالات میں بھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ ظہیر صاحب طویل عرصہ بیرون ملک گزار کر آنے والے ایک ماہر نفسیات سے علاج کروا کے شفا یاب ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک نئی ادارے میں ملازمت بھی کر لی تھی۔ مسز ظہیر کا بڑا بیٹا فرحان، جس نے بی ٹیک کیا تھا، بیرون ملک

مقیم اپنے ایک کزن کی مدد سے بیرون ملک ملازمت کا موقع ملنے پر دیہی چلا گیا تھا۔ بیلا کی شادی مسز ظہیر نے اپنے ایک شناسا گھرانے میں کر دی تھی۔ وہ اب ایک بیٹی کی ماں تھی۔ چھوٹا بیٹا عدنان ایم بی اے کے بعد ایک مقامی ادارے میں ملازمت کر رہا تھا۔ بیٹی فائز آرٹ میں ڈگری لینے کے بعد ان دنوں ایک آرٹ اسکول سے وابستہ تھی۔ اس کی نسبت اپنے اسی کزن سے طے تھی جس نے فرحان کو بیرون ملک ملازمت حاصل کرنے میں خاطر خواہ مدد دی تھی۔ مسز ظہیر کو اب نہ تو ملازمت کی ضرورت تھی نہ دستکاری اسکول چلانے کی مگر انہوں نے دونوں کام بدستور جاری رکھے ہوئے تھے۔

گھر کی آمدن میں اضافہ ہونے سے مسز ظہیر کے رہن سہن میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ مگر مسز ظہیر کی سادگی طبع میں سرمو فرق نہ آیا تھا۔ وہ اب بھی لوگوں سے اسی خلوص اور محبت سے ملتیں۔ ان کے بچے ان سے ملازمت چھوڑ دینے کے مقاضی ہوتے تو وہ بڑے تحمل سے کہتیں۔ ”ارے بیٹا، یہ نوکری تو ہمارے برے دنوں کی ساتھی ہے، اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا ہمارا۔“

”اچھا، چلے دستکاری سینٹر تو بند کر دیں؟“ بچے کہتے۔

”کیا مانگتا ہے یہ سینٹر ہم سے۔ اس کے ذریعے چند ضرورت مند عورتوں کے گھروں کے چولھے گرم ہو جاتے ہیں۔“

”اوہو ای! آپ کو تو سارے زمانے کی فکر رہتی ہے۔“

”ارے نہیں بیٹا، ہماری اتنی بساط کہاں کہ زمانے کی فکر کر سکیں۔ چند عورتیں اس سینٹر سے روزی کما لیتی ہیں بس۔“

حالات بدل جانے کے باوجود مسز ظہیر اوروں کی طرح منتہا سے بھی اسی گرم جوشی اور اپنائیت سے ملتیں۔ کبھی وہ

## زندگی بدلنے والی ورزش کی شیلیں

### JOGGING TREADMILL



ڈاکٹر کی پسندیدہ اور تجویز کردہ۔ دنیا بھر میں موٹاپے اور کولیسٹرول کے خاتمے اور زندگی بھر اسمارٹ اور فٹ رہنے کے لئے آزمودہ جوائین و حضرات کے لئے یکساں مفید بجلی سے چلنے والے خود کار نیز مینیوئل ماڈلز کی وسیع رینج آپ کی ضرورت اور بجٹ کے عین مطابق۔

### EXERCISE BIKE



اپنے کمرے میں میلوں چلے اور سائیکلنگ کا لطف اٹھائیے۔ کسی بھی عمر میں اسمارٹ اور توانائی سے بھرپور رہنے کے لئے صرف ۵ منٹ روزانہ، کسی بھی وقت استعمال کیجئے۔ بے شمار ماڈلز آپ کے انتخاب کے لئے۔ آپ کے بجٹ کے عین مطابق۔

یاد رکھیے! دائمی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی گھریلو ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں ورزش کے کوئی مضر اثرات نہیں



**BILAL BROTHERS**

Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62

All Brands of Exercisers Repaired  
All Credit Cards Accepted

LAHORE

NABI BUX SPORTS LIFE  
Tel: 7354004 Tel: 6303519

PESHAWAR

MOLACO RASHID SONS  
Tel: 273585 Tel: 272823

RAISALABAD

ELECTROLUXE  
Tel: 541004

QUETTA

SPORTS HOUSE  
Tel: 825564

MULTAN

DAWN SPORTS  
Tel: 541658

BB-2002/002

marksman

OCTOBER.2002 OPAKEEZA 091



ان کے ہاں چلی جاتی، کبھی وہ خود ملنے آ جاتیں۔ کبھی کبھی جب دونوں طرف مصروفیت کے باعث انہیں ایک دوسرے سے ملے معمول سے کچھ زیادہ دن ہونے لگتے تو مسز ظہیر فون کر کے بڑے پیار سے کہتیں ”ہم نے سوچا بتادیں آپ کو کہ ہم زندہ ہیں۔“

”سوری مسز ظہیر!“ وہ خفیف ہو کر کہتی۔  
 ”سوری تو ہمیں بھی کہنا چاہیے، قصور وار تو ہم بھی ہیں۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آدمی ان لوگوں سے ملنے کے لیے بھی وقت نہ نکال پائے جنہیں وہ عزیز رکھتا ہو۔ سچ کہتے ہیں ہم، تمہیں دیکھے جب زیادہ دن ہونے لگتے ہیں تو تم ہمیں بے طرح یاد آنے لگتی ہو۔“

”آپ کی محبت میرے لیے ایک اثاثہ ہے مسز ظہیر!“  
 ”بھئی، ہم تو آپ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے ہیں“ مسز ظہیر اب بھی اسے کبھی آپ کبھی تم کہہ کر مخاطب کرتیں۔

”تھنک یو دیری مچ!“  
 مسز ظہیر کا خود آنے کا ارادہ نہ ہوتا تو وہ اس سے کہتیں ”ملاقات کب ہو رہی ہے؟“  
 ”انشاء اللہ بہت جلد۔“

اور وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر ان سے ملنے پہنچ بھی جاتی۔  
 اس روز بھی مسز ظہیر نے اسے بلانے ہی کو فون کیا تھا مگر ان دنوں اسکول میں امتحانات چل رہے تھے۔  
 ”مسز ظہیر، آج کل بچوں کے پیپر ز ہو رہے ہیں، انشاء اللہ ان سے فارغ ہوتے ہی آؤں گی میں آپ کے پاس۔“  
 ”بھئی، ہم انتظار نہیں کر سکتے، فوراً ملنا چاہتے ہیں آپ سے“ مسز ظہیر کے لہجے سے بے قراری جھلک رہی تھی۔  
 ”کوئی خاص بات ہے مسز ظہیر!“

”ہاں، بہت ضروری کام ہے ہمیں تم سے۔“

”ممنون پر بتادیں۔“  
 ”فون پر بتانے کا نہیں۔ آپ کسی بھی طرح وقت نکال کر جلد از جلد آئیں ہمارے پاس۔“  
 ”اوکے!“

مسز ظہیر کے خلوص اور مہربانیوں کا تقاضا تھا کہ وہ جلد از جلد ان سے ملتی چنانچہ اگلے ہی دن وہ اسکول سے چھٹی کے بعد ان کے گھر پہنچ گئی۔

”جی مسز ظہیر، اب بتائیے کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے اتنی ایمر جنسی میں؟“  
 مسز ظہیر مسکرا دیں۔ ”پہلی بات یہ کہ تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا ہمارا۔“  
 ”اور دوسری بات؟“

”دوسری بات.... دوسری بات یہ کہ اگلے ماہ فرحان میاں آرہے ہیں۔ ہم اب ان کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور ہم نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے۔“

منہتانے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا۔  
 فرحان کی شادی سے اس کا بھلا کیا تعلق تھا!  
 مسز ظہیر کے لبوں پر بڑی میٹھی سی مسکان تھی۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ  
 ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا  
 ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے  
 پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے  
 بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔  
 اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی  
 نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔  
 گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی  
 کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے  
 بہنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھارہیں سے بندھے رشتوں کے چاکت سار ہونے کی دل گداز داستان

**KSK Novels**

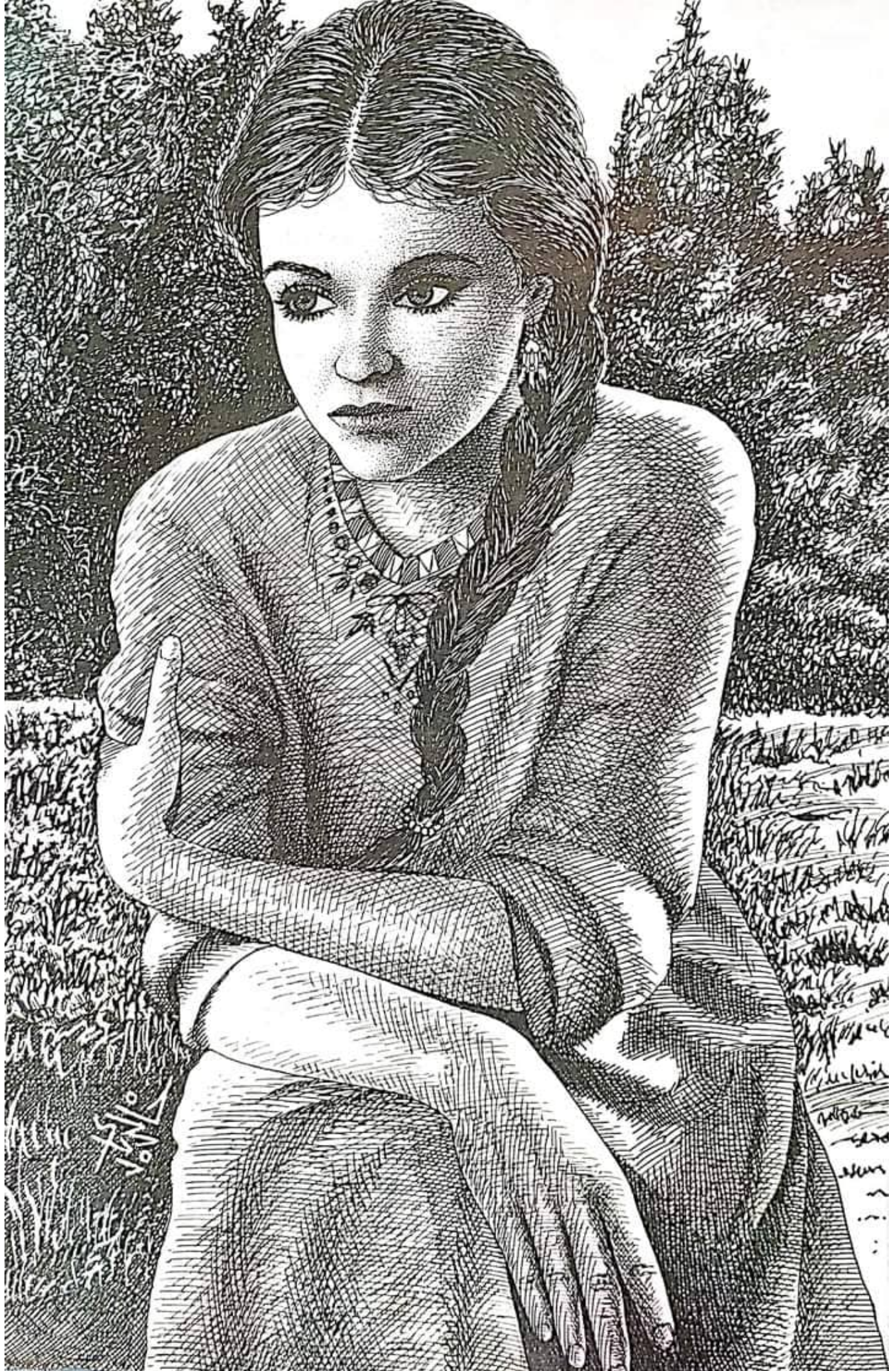
منتہا

ناہید سلطانہ اختر

قسط 4









”اچھی بھالی سے تو ملی ہیں نا آپ؟“  
 اچھی بھالی مسز ظہیر کے مرحوم و مغفور تایا زاد بھائی کی بیوہ کی عرفیت تھی۔  
 ”جی..... جی ہاں۔“

”ان کے دو بیٹے ہیں، دونوں دہائی میں ہیں۔ ایک تو وہی جس سے ہماری لیلیٰ کی نسبت ملے ہے۔ فرحان میاں کو باہر بلانے میں اُسی نے مدد کی تھی۔ اچھی بھالی اب اپنے بڑے بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہیں۔ ہم اسی سلسلے میں انہیں آپ کے گھر لے کر آنا چاہتے ہیں۔ سو چاہے آپ سے بات کر لیں۔“  
 منتہا چوکنی ہو گئی۔

”تمہاری والدہ نے کئی مرتبہ ہم سے کہا منتہا کے لیے کوئی لڑکا دیکھیں۔ لڑکے تو خیر کئی نظر میں تھے مگر ہم چاہتے تھے تمہارے لیے کوئی ایسا رشتہ ہو جس کے لیے ہم آنکھ بند کر کے ضمانت دے سکیں۔ نعیم کے لیے ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے بچوں میں کوئی برائی ہو سکتی ہے مگر نعیم میں نہیں۔ اچھی بھالی نے شوہر کے انتقال کے بعد اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم و تربیت مثالی انداز میں کی، الحمد للہ دونوں لڑکے ایک سے بڑھ کر ایک نیک ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کا علم دیا ہے بھالی نے انہیں۔ ایم ایس سی کے بعد نعیم نے کچھ عرصہ یہیں پاکستان میں ملازمت کی پھر دہلی چلا گیا۔ وہاں بینک میں ملازمت ہے، ماشاء اللہ بہت اچھا کما رہا ہے۔ صوم و صلوة کا پابند اور فطرتاً انتہائی نیک۔ اچھی بھالی سے ہم نے تمہارا ذکر کیا۔ جس طرح نعیم کے لیے ہم گارنٹی دے سکتے ہیں کہ اچھا لڑکا ہے اسی طرح ہم نے اچھی بھالی سے آپ کی تعریف کی۔ وہ اسی سلسلے میں ہمارے ساتھ تمہارے گھر آنا چاہ رہی ہیں۔“

”مسز ظہیر، آپ تو ابھی ذرا دیر پہلے فرحان کی شادی کی بات کر رہی تھیں، یہ میرا ذکر کہاں سے آگیا؟“ منتہا بولی۔  
 ”بات یہ ہے کہ تمہاری چھوٹی بہن کے لیے ہم فرحان میاں کا رشتہ دینا چاہ رہے ہیں مگر ظاہر ہے کہ ہر ماں کی طرح تمہاری والدہ کی خواہش یہی ہوگی کہ پہلے بڑی کا رشتہ ہو پھر چھوٹی کا سو ہم بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ اچھی بھالی اور ہم ایک ساتھ تم دونوں بہنوں کے لیے تمہاری والدہ سے بات کریں۔“  
 منتہا کچھ جزبزد کھائی دینے لگی۔

”ٹھیک ہے نا؟ کیا خیال ہے نیہ کے لیے تمہاری والدہ راضی ہو جائیں گی نا؟“ مسز ظہیر نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

”میرے لیے آپ ان سے کوئی بات نہ کیجئے گا۔“  
 ”کیوں؟“ مسز ظہیر چونکیں۔  
 ”بس، مسز ظہیر.....“

”بس کا کیا مطلب! آخر کیوں نہ کریں بات؟“  
 ”میں..... میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“  
 ”تو پھر کب کرو گی؟“

”جتنا نہیں لیکن ابھی نہیں۔“

”اگر ہمیں بات بات پر انگریزی بگھارنے کی عادت ہوتی تو آپ کی اس بات پر ہم کہتے یو آر سلی.... عجیب بے وقوف لڑکی ہو۔ ابھی نہیں تو پھر کب؟“

”میں چاہتی ہوں پہلے ممی نیہ اور ملیب کی ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں۔“

”ارے بھئی، نیہ کے لیے تو ہم بات کرنا چاہ ہی رہے ہیں تمہاری والدہ سے۔ اگر وہ راضی ہو جاتی ہیں تو سمجھو نیہ کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ رہے ملیب تو ماشاء اللہ انہیں آپ ان کے پیروں پر کھڑا کر ہی چکی ہیں۔“



”شادی تو اس کی بھی کرنی ہے نا مسز ظہیر۔“

”ارے لڑکوں کی شادی بھلا کیا مسئلہ.... جب چاہیں برتیار۔“

”یہ تو آپ نے ممی والی بات کر ڈالی۔ وہ بھی یہی کہا کرتی ہیں۔“

”ٹھیک کہتی ہیں۔“ مسز ظہیر نے توقف کیا پھر بولیں ”تمہاری والدہ کو بیٹے سے زیادہ فکر تم دونوں بہنوں کی ہوگی۔ ویسے ایک بات بتائیں ہم آپ کو۔“ مسز ظہیر کے لبوں پر معنی خیز مگر بڑی میٹھی سی مسکان پھیل گئی۔ ”ہمارے خاندان کے مردوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنی بیویوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں۔ نعیم اور ہمارے فرحان میاں دونوں انشاء اللہ تعالیٰ اس خاندانی روایت کا پاس رکھیں گے۔“

”آپ ممی سے نیسہ کے لیے ضرور بات کریں مگر....“

”مگر....؟“

”میرے لیے نہیں۔“

”بھئی کیوں آخر؟“

”میں.... میں اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”چکر! چکر سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”میں... شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

مسز ظہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے نظریں چرائیں۔ ”کیا کہیں اور انٹرنیٹڈ ہو تم؟“

اب وہ چونکی۔ ”نہیں.... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر اتنے صاف انکار کی آخر کوئی توجہ ضرور ہوگی۔“

”میں.... میں ممی کو نہیں چھوڑ سکتی۔“

مسز ظہیر قدرے مطمئن ہو کر دھیرے سے مسکرا دیں اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولیں۔

”سب لڑکیوں کو بالآخر چھوڑنا پڑتا ہے اپنی ماؤں کو۔“

”بہت سی نہیں بھی چھوڑتیں مسز ظہیر.... میں بھی نہیں چھوڑنا چاہتی۔“

”احق ہیں آپ۔“ مسز ظہیر نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی دھپ لگائی پھر دل سوز لہجے میں کہا ”جانتی ہو کتنی

فکر مند ہیں تمہاری والدہ تمہاری شادی کے لیے۔ کتنی مرتبہ تو انہوں نے ہم سے کہا۔ بس اتفاق ہے کہ اچھی بھالی نے

نعیم کے لیے ہم سے کہا ورنہ ان کے اپنے میکے میں بہت اچھی اچھی لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ جس لڑکی پر بھی نعیم کے لیے

ہاتھ رکھ دیتیں، انکار نہ ہوتا۔ ایسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ یقین کرو بہت خوش رہو گی تم۔

اچھی بھالی کا ارادہ ہے کہ شادی کے بعد بہو کو بیٹے کے ساتھ ہی رہی بھیج دیں گی۔ ہم بھی یہی چاہیں گے کہ فرحان میاں

بھی اپنی دکن کو اپنے ساتھ ہی رکھیں۔ تم دونوں بہنیں ہو گی تو ہمیں بھی اطمینان رہے گا۔“

”پلیز! آپ میرا ذکر تو نکال ہی دیں۔“

”اپنی والدہ کے سامنے یہ کہہ کر دکھانا تو ہم جانیں گے۔“

”میں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں ان کے سامنے۔“

”اچھا!“ مسز ظہیر نے حیرانگی ظاہر کی ”تو پھر کیا کہا انہوں نے؟“

”خفا ہوئیں۔“

”ظاہر ہے.... انہیں خفا ہونا بھی چاہیے۔“

”ضروری تو نہیں مسز ظہیر کہ ہر لڑکی ہی شادی کرے۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ ہم سے پوچھو کتنی فکر ہوتی ہے ماؤں کو بیٹیوں کی شادی کی۔ بیلا کے بعد اب لیلیٰ کی ہمیں اتنی فکر لگی ہوئی ہے کہ بتا نہیں سکتے ہم۔“

”میں نے می سے کہہ دیا ہے کہ وہ میرے بارے میں فکر کرنا چھوڑ دیں اور مجھے اس سلسلے میں کبھی مجبور کرنے کی کوشش بھی نہ کریں۔“

”ایسا ممکن ہی نہیں۔“

”کیوں ممکن نہیں؟“

”کیونکہ بیٹی کو اپنے گھریلو کاموں کی خواہش ہوتی ہے۔“

”لیکن بیٹی کی اپنی خواہش ماں کی اس خواہش کے برخلاف بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”بڑی عجیب و غریب خواہش کہلائے گی۔“

”جو بھی سہی، بہر حال مجھے اس معاملے میں می بھی مجبور نہیں کر سکیں گی۔“

”مسز ظہیر چونکہ اس کا منہ دیکھنے لگیں۔“ بڑی انہونی بات کر رہی ہیں آپ۔“

”انہونی تو نہیں، مسز ظہیر، بے شمار خواتین شادی کیے بنا رہی ہیں۔“

”ایسی خواتین کی مشکلات کا کچھ اندازہ ہے آپ کو۔“

”میں نے تو اکثر بڑے مزے میں دیکھا ہے.... آزاد اور خود مختار۔“

”دور کے ڈھول سہانے ہی لگتے ہیں۔ کبھی ان خواتین کے دلوں میں جھانکیے، ان کے مسائل سنئے.... بے برگ و شراشجار بھلا کس کام کے.... اس نام نہاد خود مختاری اور بے معنی آزادی کے دھوکے میں بھی نہ آنا۔“

”میرے نزدیک اہمیت اس آزادی اور خود مختاری کی ہے بھی نہیں۔“

”تو پھر کا ہے کی اہمیت ہے؟“

”ہمیشہ می کے ساتھ رہنے کی.... میں می کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی.... یہ میری کمٹ منٹ ہے اپنے آپ سے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ارے بھئی، وہ تو تم شادی کے بعد بھی انہیں اپنے پاس رکھ سکتی ہو۔“

”میرے اُن کے ساتھ رہنے اور اُن کے میرے ساتھ رہنے میں بڑا فرق ہے مسز ظہیر۔ می بہت خود دار ہیں۔ وہ کبھی بھی یہ پسند نہیں کریں گی۔“

”وہ یہ بھی تو پسند نہیں کریں گی جو تم چاہتی ہو۔“

”میں انہیں مجبور کر دوں گی۔“

”کیا یہ زیادتی نہیں ہوگی اُن کے ساتھ؟“

”زیادتی یہ ہوگی کہ میں انہیں اکیلا چھوڑ دوں۔“

”ارے ہنو، خواہ مخواہ کی بحث میں مت الجھاؤ ہمیں۔“ مسز ظہیر زچ ہو گئیں پھر دو ٹوک لہجے میں بولیں ”بس ہم اچھی بھالی کو لے کر آرہے ہیں تمہارے گھر۔“

”دیکھ.... مگر اچھی بھالی کو نہ لائے گا.... کم از کم اس ارادے سے ہرگز نہیں۔“

”دیوانی ہو تم تو.... ہم انہیں ضرور لے کر آئیں گے۔“

”پلیز!“ اس کے لہجے میں بے پناہ لجاجت تھی۔

”مسز ظہیر اسے ٹھنکی باندھ کر دیکھنے لگیں۔“

”اس نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولی ”ایسا مت کیجئے گا ورنہ...“



جملہ ادھورا چھوڑ دینے پر مسز ظہیر نے استفہامیہ لہجے میں کہا ”ورنہ؟“  
 وہ مضطرب سی دکھائی دینے لگی۔  
 ”بولیے۔“ مسز ظہیر نے تقاضا کیا۔  
 وہ چپ رہی۔

”بناؤ نا، ہم اگر اچھی بھالی کو تمہاری ہاں لے آئے تو؟“  
 اضطراب کی کیفیت میں وہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے چٹانے لگی پھر اُن سے نظریں چراتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ دھیمی آواز میں بولی ”میری اور آپ کی دوستی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“  
 مسز ظہیر بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر ٹنکنکی باندھے اسے دیکھتی رہیں پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولیں ”یہ اچھا نہیں کر رہی ہو تم... نہ اپنے ساتھ نہ دوسروں کے ساتھ۔“  
 اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے کھینچ لیا اور اٹھنے کا قصد کرتے ہوئے بولی ”میں اب چلوں گی“  
 یوشن والے بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔

”سوچ لو منتہا۔“  
 ”یہ فیصلہ ہے مسز ظہیر۔“  
 ”مگر اس معاملے میں فیصلے کا اختیار تو تمہاری والدہ کے ہاتھ میں ہے۔“  
 ”میں یہ بات اُن سے بھی کہہ چکی ہوں۔“  
 ”اور انہوں نے مان لی تمہاری یہ بات!“ مسز ظہیر کے لہجے کی کاٹ نے منتہا کو چونک کر ان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”انہیں ماننا پڑے گی۔“  
 ”یہ بے رحمی ہے آپ کی اپنی والدہ کے ساتھ۔“  
 ”بے رحمی کی کیا بات مجھے اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا اختیار ہونا چاہیے۔“  
 ”تم سے ہمیں ایسی خود غرضی کی امید تو نہیں تھی۔ تمہاری والدہ تمہارے لیے فکر مند ہیں اور تم کہتی ہو...“  
 ”میں بھی تو اُن کے لیے فکر مند ہو سکتی ہوں“ اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری تھی۔  
 ”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، ہم آپ کو مجبور تو نہیں کر سکتے“ مسز ظہیر نے کہا مگر ان کے لہجے سے خفگی جھلک رہی تھی۔

وہ ان سے نظریں چراتے ہوئے جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔



موسم بہار اپنے شباب پر تھا۔  
 اسکول میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر سال نئے تعلیمی سال کا آغاز اپریل میں ہوتا جو آئندہ سال مارچ کے مہینے میں مل کلا سز تک سالانہ امتحانات کے انعقاد اور نتائج کے اعلان پر اختتام پذیر ہوتا۔ اپریل میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہونے پر موسم بہار کی چند روزہ تعطیلات ہوتیں پھر کلاسیں شروع ہو جاتیں۔  
 ضمیر فاروقی صاحب ہر سال مارچ کے آخری دنوں میں اپنے ایک دفتری حکم نامے کے تحت تمام اساتذہ سے یہ ضرور دریافت کر لیتے کہ آئندہ تعلیمی سال کے دوران... وہ کن کن جماعتوں کے کون کون سے مضامین پڑھانے کو ترجیح دیں گے۔ فاروقی صاحب کی جانب سے اساتذہ کو یہ یقین دہانی بھی ہوتی کہ نئے ٹائم ٹیبل کی تیاری میں ان کی ترجیحات کا خاطر خواہ خیال رکھا جائے گا تاہم یہ بھی واضح کر دیا جاتا کہ طلباء اور ادارے کے مفادات کو ان کی ترجیحات

پر بہر حال فوقیت دی جائے گی۔

موسم بہار کی تعطیلات کے دوران نور عالم صاحب اپنے ایک دو معاونین کی مدد سے ٹائم ٹیبل ترتیب دیتے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس ٹیم کی پرنسپل صاحب کے ساتھ ایک میٹنگ ہوتی جس میں فردا فردا ہر ٹیچر کی پیشہ ورانہ لیاقت، استعداد اور نئے ٹائم ٹیبل کے لیے دی ہوئی ترجیحات پر غور کیا جاتا۔ باہم صلاح مشورہ ہوتا اور یہ دیکھا جاتا کہ کون ٹیچر کس جماعت کے کس مضمون کی تدریس کے لیے موزوں ترین ثابت ہوگا۔ اسی میٹنگ میں آئندہ سال کے لیے ہر جماعت کے مختلف فریقوں کے نگران ہائے جماعت کا فیصلہ بھی کر لیا جاتا۔ اساتذہ کے تدریسی اور فارغ گھنٹوں کا تعین بھی کیا جاتا۔ فاروقی صاحب اس سلسلے میں بہت سے امور کو مد نظر رکھتے۔ تقسیم کار کے سلسلے میں وہ بڑے مدبرانہ اور غیر جانبدارانہ فیصلوں کے ماہر تھے۔ اساتذہ میں تدریسی اوقات کی تقسیم جب انہیں یکساں تقسیم سے انحراف پر مجبور کرتی اور ماتحت اساتذہ میں سے کوئی ان کے اس انحراف پر معترض ہوتا تو وہ کہتے ”دیکھئے جناب! ٹائم ٹیبل کوئی ترازو بات کا کھیل تو ہے نہیں کہ ایک پلڑے میں باٹ رکھے جائیں اور ٹائم ٹیبل بنانے والا ہر ٹیچر کو تول تول کر مساوی پیرٹرز دیتا جائے۔ ایک پیرٹ کم نہ ایک پیرٹ زیادہ۔ ٹائم ٹیبل سیٹ کرتے وقت بہت سارے امور کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔“

پرنسپل صاحب کی یہ توجہ شاہزی کسی کو مطمئن کر پاتی۔ اسکول کا نظام الاوقات مرتب کرنے والوں کو عموماً آغاز سیشن سے ہی بیشتر ساتھیوں کی تنقید کا سامنا رہتا۔ تمام اساتذہ اپنی مرضی کا ٹائم ٹیبل چاہتے اور اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر نور عالم صاحب اور ان کے معاونین سے کبھی گلہ کبھی خفگی کا اظہار کرتے۔

”نور عالم صاحب! آپ سے سیونٹھ اے کی انگلش مانگی تھی میں نے۔“

”سوری میاں، ممکن نہ ہو سکا“ نور عالم صاحب معذرت چاہتے۔

”اوہو نور عالم صاحب، آپ نے مجھے سکس کلاس کیوں دے دی؟“

”شاہد صاحب چھوٹے بچوں کو پڑھانا زیادہ ثواب کا باعث بنتا ہے“ نور عالم صاحب مذاقاً کہتے۔

”دیکھئے، میں سیریس ہوں۔“

”ارے، تو میں کون سا مذاق کر رہا ہوں۔“

”آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اٹھارہ برسوں میں چھوٹی کلاس کبھی نہیں لی ہے میں نے۔“

”ارے، صاحب، اپنی علمیت اور تجربے سے چھوٹے بچوں کو بھی تو مستفید فرمائیے نا۔“

”نور عالم صاحب!“

”شاہد صاحب، اس سال تو کام چلائیے، انشاء اللہ اگلی بار خیال رکھوں گا۔“

”کیا پرنسپل صاحب سے بات کرنا پڑے گی؟“

”کر لیجئے۔“

مگر ٹائم ٹیبل بغیر کسی غیر معمولی سبب کے عموماً کسی تبدیلی سے متبرار رہتا۔ فاروقی صاحب کہا کرتے تھے ٹائم ٹیبل بہت سوچ سمجھ کر بنایا جائے اور سال بھر کے لیے اسے حتمی ہی ہونا چاہیے کیونکہ ٹائم ٹیبل میں بار بار تبدیلی طلبہ پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہیں کرتی۔

خواتین اساتذہ اپنی فرمائشیں اور ترجیحات پوری نہ ہونے پر عموماً کچھ اس قسم کے گلے کرتیں۔

”نور عالم صاحب، میں نے آخری پیرٹ فری رکھنے کی ریکونسلٹ کی تھی۔“

”بی بی، دو تین دن کر تو دیا ہے۔“

”میں نے روزانہ کی ریکونسلٹ کی تھی۔ بچوں کو پک کرنے کے لیے ان کے اسکول جانا ہوتا ہے اس لیے۔“



"بی بی! پرنسپل صاحب کی ہدایت تھی کہ پہلا اور آخری پیریڈ مسلسل ہفتے بھر کسی کافر نہ ہو ورنہ پہلا پیریڈ فری رکھنے والا روزانہ دیر سے اسکول پہنچے گا اور جس کا آخری پیریڈ روزانہ فری ہو گا وہ روزانہ جلدی جانے کی کوشش کرے گا۔"

"اوہ نہ! فاروقی صاحب کے اپنے بچے تو بڑے ہو گئے ہیں نا اس لیے۔"

"بی بی! وہ اپنے بچوں کے بچپن میں بھی ایسے ہی ہوا کرتے تھے۔"

"نور عالم صاحب! میں اسلامیات نہیں پڑھا سکتی۔"

"الحمد للہ مسلمان تو ہیں نا آپ؟"

عذر ظاہر کرنے والی خاتون چونک کر نور عالم صاحب کو دیکھتیں۔

"بی بی! ہر مسلمان کو اسلامیات پڑھانے کے لائق ہونا چاہیے.... کوشش تو ضرور کرنی چاہیے۔"

نور عالم صاحب بے سبب بے جواز اور بے وزن عذر کرنے والوں کو اکثر بوخی لا جواب کر دیتے۔

ٹائم ٹیبل کے بارے میں نگلے شکوے، اعتراضات اور عذر خواہیاں یوں تو سارا سال ہی چلتیں مگر نئے تعلیمی سال کے آغاز پر ابتدائی دن اس سلسلے میں خاصے، بحرانی کیفیت میں گزرتے۔ اسی لیے نور عالم صاحب پہلے دن فرداً فرداً تمام اساتذہ کو ان کا ٹائم ٹیبل حوالے کر کے ایک دو دن کی اتفاقی رخصت پر چلے جایا کرتے تھے۔ پرنسپل صاحب کے پاس جو بھی ٹائم ٹیبل کے سلسلے میں کوئی شکایت حکایت لے کر پہنچتا وہ اسے قائل کر کے واپس لوٹاتے۔ ان سے بحث مباحثے میں الجھنے کی ہمت کسی کو نہ ہوتی۔

لیکن اس بار منہا کو اپنا نیا ٹائم ٹیبل ملا تو وہ فاروقی صاحب سے الجھ بیٹھی۔

نویں جماعت کے جو دو فریق اسے اور دو راشد عثمان صاحب کو ریاضی پڑھانے کے لیے دیے گئے تھے۔ ان میں سے ہر فریق کے لیے ریاضی کے ہفتہ وار آٹھ پیریڈز مختص کیے گئے تھے لیکن ایک فریق جو بیگ صاحب کو دیا گیا تھا اس میں ریاضی کے ہفتہ وار صرف چھ پیریڈز تھے۔ اس تفاوت پر راشد عثمان صاحب بہت چیں یہ جییں ہوئے۔ نور عالم صاحب سے بات کی تو انہوں نے کہا "یہ پرنسپل صاحب کا فیصلہ ہے، ان سے بات کیجئے مجھ سے کچھ مت کہیں۔"

راشد صاحب خود تو پرنسپل صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہ کر پائے منہا کو اکسایا کہ وہ بات کرے۔

منہا کچھ غلط کو غلط کہنے کی جرأت رندانہ رکھنے کے باعث اور کچھ پرنسپل صاحب کی گڈ بگس میں ہونے کا اعتماد حاصل ہونے کی بنا پر اور کچھ بیگ صاحب کے خلاف دل میں رنجش کی وجہ سے بھی پرنسپل صاحب کے روبرو جا پہنچی۔ "سر! مجھے دو سیکشنز میں اپنے چار اضافی پیریڈز پر اعتراض نہیں کیونکہ میں تو اکثر اپنی مرضی اور بچوں کی خواہش پر ہفتے میں کئی کئی اضافی پیریڈز لے لیتی ہوں لیکن اعتراض یہ ہے سر کہ بیگ صاحب کو تو پہلے ہی دو سرے ٹیچرز کے مقابلے میں کم پیریڈز دیے جاتے ہیں۔ اب مزید دو پیریڈز کی رعایت کیوں؟"

پرنسپل صاحب کے دفتر میں اس وقت نور عالم صاحب کے علاوہ دو سینئر ٹیچرز اور بھی موجود تھے۔

"بیگ صاحب! ایگزیم سیل کے انچارج ہیں" پرنسپل صاحب نے متحمل لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا سر؟"

پرنسپل صاحب نے چونک کر اور باقیوں نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس لہجے میں تو سینئر ٹیچرز بھی فاروقی صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

"سر! انہیں تو آپ نے ایگزیمز کنڈکٹ کرنے کے لیے دو اسٹنٹ بھی دے رکھے ہیں اور روزانہ سات میں سے

صرف تین پیریڈز۔ امتحانات میں ان کی مصروفیت تو سال میں صرف تین مرتبہ ہوتی ہے اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ

دو تین ہفتے کے لیے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ باقی تمام سال عیش کریں۔ سر! ہم باقی لوگوں میں سے بعض کے پاس

تو پانچ پانچ، چھ چھ سیٹ پر جوں کے آتے ہیں جو چیک کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی کہ محض ایک ٹیچر کو فیور دینے کے لیے آپ نائنٹھ کے چار سیکشنز کے مقابلے میں ایک سیکشن کے بچوں کو دو پیریڈز کا نقصان کیوں دینا چاہتے ہیں۔“

پرنسپل صاحب کی نگاہیں اپنے روبرو کرسیوں پر بیٹھے سینئر اساتذہ کی نگاہوں سے ملیں اور نور عالم صاحب کی نگاہوں نے کہا ”جناب! یہ ہوتا ہے جو نینروں کو سر پر بٹھانے کا انجام!“

پرنسپل صاحب کو شرمندگی نے آیا۔ اپنے دیرینہ ساتھیوں سے نظرس چراتے ہوئے انہوں نے قدرے ناگواری سے منتہا سے کہا ”یہ فیور نہیں ہے، مس منتہا، ڈائریکٹریٹ اپنے زیر انتظام پرائمری اسکولوں کے اسکا لرشپ ایگزیم کے سلسلے میں بیک صاحب سے کچھ کام لینا چاہتا ہے اس لیے انہیں اسکول کی جانب سے کچھ ریلیف دینا ضروری ہے۔“

”چاہے انہیں ریلیف دینے میں بچوں کا نقصان ہو جائے؟“ منتہا نے ترکی بہ ترکی کہا۔

”نہیں ہوگا“ پرنسپل صاحب اب قدرے درشتی سے بولے ”بیک صاحب کا کہنا ہے وہ اپنے سیکشن کو چھ پیریڈز میں آٹھ پیریڈز کے برابر کام کروادیا کریں گے۔“

”مداخلت کی معافی چاہتا ہوں سر!“ پرنسپل صاحب کے روبرو بیٹھے ساتھیوں میں سے ایک نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے آپ کو مس منتہا کو یہ ساری وضاحت دینے کی ضرورت تو نہیں۔ پیریڈز کی تقسیم ایک پالیسی میٹر ہے جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔“

پرنسپل صاحب نے چونک کر متکلم کی جانب دیکھا پھر کچھ خفیف ہو کر بولے ”یقیناً.... آپ درست کہہ رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سر! تو نائنٹھ کے تمام سیکشنز میں ریاضی کے آٹھ پیریڈز رکھے جائیں ورنہ ہم بھی اپنے سیکشنز میں آٹھ نہیں چھ ہی پیریڈز لیں گے“ منتہا نے کہا۔

”مس منتہا! آپ کو اتنے ہی پیریڈز لینا ہوں گے جتنے آپ کو دیے گئے ہیں۔“ پرنسپل صاحب نے تیوری بگاڑ کر کہا۔

”آئی ایم سوری سر! میں نہیں لوں گی۔“

”آپ کو لینا ہوں گے“ فاروقی صاحب اب غصے میں آگئے۔

”بشرطیکہ بیک صاحب کو آٹھ ہی پیریڈز دیے جائیں۔“

”بحث مت کیجئے، مس!“ نور عالم صاحب نے مداخلت کی۔

”پلیز! آپ انٹرفیئر نہ کریں“ منتہا نے ناگواری سے کہا۔

نور عالم صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔

”مس منتہا! دل یو پلیز لیو مائی آفس!“ اپنی اور اپنے سینئر رفقاء کے کار کی توہین پر فاروقی صاحب کا چہرہ غصے سے تھمتانے لگا تھا۔

منتہا نے چونک کر پرنسپل صاحب کو دیکھا۔ اسے غالباً ان سے اس قدر درشتی کی توقع نہ تھی۔ چند لمحے وہ دم بخود کھڑی رہی پھر پلٹی اور ان کے دفتر سے نکل گئی۔

”انتہائی گستاخ لڑکی ہے“ فاروقی صاحب کے روبرو بیٹھے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔

”سر! ہماری آج تک یہ جرات نہیں ہوئی کہ آپ کے کسی فیصلے کے خلاف کچھ بولیں اور ایک جو نیر ٹیچر! معاذ اللہ اتنی بدتمیزی!“

”ایسی ٹیچر کا توڑا سفر ہو جانا چاہیے سر!“ نور عالم صاحب بولے۔



فاروقی صاحب کو خود جو سکی محسوس ہوئی سو تھی، رفقائے کار کے جملے جلتی پر گویا تیل کا کام کر رہے تھے۔

○☆○

پرنسپل صاحب کے دفتر سے نکل کر منتہا سیدھی فضا کے پاس پہنچی جو اس وقت اسکول لائبریری میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔

”خیریت!“

”فاروقی صاحب سے بھر کر آئی ہوں۔“

فضہ چونکی۔ ”کیا... کیا کہا؟“

”وہی جو تم نے سنا“ فضا سے اس کی بدترجہ ایسی بے تکلفی ہو گئی تھی کہ آپ جناب کا تکلف جاتا رہا تھا۔  
”جو میں نے سنا“ اسے سن کر یقین نہیں آیا۔ فاروقی صاحب کے سامنے ہم میں سے کسی کی مجال کہ زبان کھول دے۔“

”احترام اپنی جگہ فضا مگر بے اصولی بے اصولی ہی ہے“ اس کے تیور جارحانہ تھے۔

”ذیور“ کچھ پتا تو چلے ہوا کیا؟“ تبھی گھنٹی بج گئی۔

”میرا پیریڈ ہے بعد میں بتاؤں گی“ منتہا نے اٹھنے کا قصد کرتے ہوئے کہا۔

”بتا کر جاؤ“ میرا یہ پیریڈ بھی فری ہے، سخت بے چین رہوں گی۔“

”اس وقت تو میں کلاس میں جا رہی ہوں۔“

”دو چار منٹ دیر سے چلی جاؤ گی تو قیامت نہیں آجائے گی۔“

”سوری.... تمہیں پتا ہے کلاس میں دیر سے پہنچنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”اوکے!“ فضا نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

فضہ کو لائبریری میں بیٹھا چھوڑ کر وہ جو نئی لائبریری کے دروازے سے باہر نکلی، نور عالم صاحب سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے نظر بچا کر گزرنے کی کوشش کی مگر نور عالم صاحب نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔

”بس! آپ کو پرنسپل صاحب کے ساتھ اتنا روڈ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہم سب ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔“

”میں بھی بہت عزت کرتی ہوں نور عالم صاحب!“

”لیکن اس وقت تو آپ نے ان کی بہت انسلٹ کی.... سینئرز اور وہ بھی سربراہ ادارہ سے اس طرح تو بات نہیں کی جاتی...“ نور عالم صاحب کے لہجے میں اچانک ہی استہزائیہ کیفیت ہویدا ہوئی ”آج انہیں بھی ہم جیسے نااہل سینئرز اور ان کی گڈ بکس میں رہنے والے جو نیئرز کا فرق پتا چل گیا ہوگا۔“

منتہا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ مسکرا دیے اور ان کی مسکراہٹ نے منتہا کو خفیف کر دیا۔ اپنے شانے پر لٹکا بیک سنبھالتی وہ آگے بڑھ گئی۔

”اونہ!“ نور عالم صاحب نے سر کو جھٹکا دیا اور لائبریری میں داخل ہو گئے۔

منتہا بڑی پر آگندہ سی کیفیت میں اپنی کلاس میں پہنچی۔ لڑکے حسب معمول اس کے منتظر تھے۔ روز مرہ علیک سلیک کے بعد اس نے حسب عادت میز پر رکھی درسی کتاب اٹھائی اور ایک ہاتھ میں چاک کا ٹکڑا لے کر گردن موڑتے ہوئے تختہ سیاہ پر ایک نظر ڈالی اور طلباء سے پوچھا ”آج ہم کون سی ایکسر سائز شروع کریں گے؟“

”تھری پوائنٹ فائو میڈم!“

”اوکے!“

مشقی سوالات شروع کرانے سے قبل وہ حسب قاعدہ طلباء کو مثالی سوالات سمجھانے لگی۔ طلباء ہمہ تن متوجہ تھے۔

تختہ سیاہ کی جانب رخ کیے وہ دوسرا مثالی سوال لڑکوں کو سمجھا رہی تھی کہ دفعتاً جماعت کے کمرے میں کسی کے کھلکھلانے کی آواز ابھری۔ وہ چونکی، پلٹی اور اس نے گہری نگاہوں سے جماعت کا طائرانہ جائزہ لیا۔ اس کے تیسرے دیکھ کر لڑکے سسے ہوئے نظر آنے لگے۔

”یہ کون تھا؟“ منتہا نے چاک کے ٹکڑے کو اپنی ہتھیلی پر ہلکورے دیتے ہوئے کھوجی نگاہوں سے جماعت پر پھر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

لڑکے دُزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ لوگوں سے؟“ منتہا نے غصے سے کہا۔

جماعت کے بیشتر لڑکے اپنے ایک ہم جماعت اصغر علی کو دیکھنے لگے۔ اصغر شانے اونچے کر کے اپنی گردن دبکانے اور منتہا کو چوری چوری دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”جو بھی تھا خود کھڑا ہو جائے۔“

اصغر کے برابر میں بیٹھے لڑکے نے اسے شوکا دیا۔

جماعت کے کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

”کم آن!“ منتہا نے اب غضبناک لہجے میں کہا۔

اصغر کے ساتھ بیٹھے لڑکے نے ڈیسک کے نیچے اس کے بائیں پاؤں والے جوتے کو اپنے دائیں جوتے سے زور سے دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا ”اٹھ جا یا ر!“

اصغر سر جھکائے نظریں چرائے چپ چاپ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

منتہا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے نزدیک پہنچی۔

”کیوں؟“ اس نے خلافِ عادت غیر معمولی کڑخی سے کہا۔

”سوری میڈم!“ وہ منمنایا۔

منتہا نے اس کی ڈیسک پر کھلی رکھی ریاضی کی مجلد کتاب اٹھائی، اسے بند کیا اور پوری قوت سے اسے اصغر کے سر پر دے مارا۔

زور کی آواز آئی۔

اصغر کا جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔

باقی لڑکے سسم کر کبھی اصغر کو کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

تراخ!

تراخ!

تراخ!

منتہا اصغر کے سر پر مسلسل کتاب برساتی چلی گئی۔

اصغر کا سر نیچے سے نیچے جھکتا چلا گیا۔

لڑکے دم بخود تھے۔

اس سے پہلے اس نے کسی طالب علم پر اس قدر برہمی کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔

اصغر کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

”نالائق! بد تمیز!“ منتہا نے ایک مرتبہ پھر زور سے کتاب اس کے سر پر ماری۔

اصغر کی ناک بھی ٹپک پڑی۔



منتہا نے کتاب زور سے اس کی ڈیک پر پٹی۔

وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس کے ساتھیوں کی نگاہوں سے اس کے لیے احساسِ ترحم جھلکنے لگا۔

منتہا اس کے رونے سے اثر پذیر ہونے کے بجائے تختہٴ سیاہ کی جانب ہلٹی اور ادھورا رہ جانے والا مثالی سوال دوبارہ سمجھانے لگی۔ اس کی آواز اور لہجے سے برہمی اور خفگی جھلک رہی تھی۔

پیریڈ کے اختتام تک لڑکے دم سادھے، سسے سسے سے بیٹھے رہے اور اصغر سر جھکائے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ منتہا اسے یوں نظر انداز کیے رہی جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں تاہم دل ہی دل میں وہ خود کو ایک احساسِ جرم سے دوچار پارہی تھی۔ شاید کچھ زیادہ ہی چوٹ لگی تھی اسے ورنہ لڑکے اور وہ بھی اصغر علی جیسے لڑکے آسانی سے کب روتے ہیں۔ وہ تو مشکل سے مشکل حالات میں بھی بے پروائی کا مظاہرہ کرنے والا لڑکا تھا۔

اس کا اگلا پیریڈ فری تھا۔ اسٹاف روم میں طلباء کی کاپیاں چیک کرتے ہوئے اس کا دھیان بار بار اصغر علی کی طرف جاتا رہا۔ اس کے سر پر پڑنے والی ضخیم جلد کتاب کی شدید ضربوں کے احساس نے اسے بتدریج ایک تشویش سے دوچار کر دیا۔

”کل اگر اس کے گھر سے شکایت آگئی تو...؟“

منتہا کو گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ جی میں آیا اسے چراسی کے ذریعے کلاس سے بلوائے اور اسٹاف روم کے باہر راہداری میں کھڑا کر کے سمجھائے کہ کلاس میں بدتمیزی کسی نیچر کو بھی گوارا نہیں ہوگی۔ شاید غلطی کا احساس اسے گھروالوں کو مار کی بابت بتانے سے روک دے مگر نہیں، اس طرح بلانے اور سمجھانے بجھانے سے وہ الٹا شیر بھی تو ہو سکتا تھا۔

”اللہ مالک ہے، جو ہو گا سو دیکھا جائے گا“ بالآخر منتہا نے اپنے دل کو ٹھہرایا۔ غلطی تو بہر حال تھی نا اس کی۔ آخر کیوں ہنسا تھا وہ کلاس میں۔ مگر ایک غلطی تو وہ بھی کر بیٹھی تھی۔

اسکول میں طلباء کو کسی بھی قسم کی جسمانی سزا دینے کی سختی سے ممانعت تھی۔ یہ ڈائریکٹریٹ کا حکم نامہ تھا جس کا لحاظ نہ رکھنے پر دو تین اساتذہ کی جواب دہی ہو چکی تھی بلکہ ایک لڑکے کے والدین تو معاملہ سرکار تک لے گئے تھے۔ متعلقہ نیچر کی بمشکل گلو خلاصی ہوئی تھی۔



اس روز اسکول سے چھٹی کے بعد وہ گھر پہنچی تو طبیعت خاصی مکدر تھی۔ دن بہت خراب گزرا تھا، پہلے پر نسل صاحب سے ٹکرا رہی تھی پھر اصغر والا واقعہ!

مئی کو نہ جانے کیونکر الہام ہو گیا۔

”خیریت؟“ انہوں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی پوچھا ”آج چہرہ بہت اترا ہوا ہے تمہارا؟“

”نہیں تو“ اس نے نظریں چرانے کی کوشش کی۔

”کوئی بات ہو گئی کیا؟“

اس نے چونک کر مئی کو دیکھا۔ ”کیسی بات؟“

”کیسی بھی۔“

”نہیں.... کوئی بات نہیں۔“

”مان لیس بائی“ انہوں نے جس کی ان دنوں نائٹ ڈیوٹی چل رہی تھی، کہا۔

منتہا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف بڑھ آئی اور بڑے پیار سے اس کے گلے میں بائیں

حاصل کر کے بولی ”باجی، میں، ملیب اور آپ اپنی تکلیف، اپنی خوشی، اپنا کوئی مسئلہ یا پریشانی لاکھ چھپائیں مگر ڈیڑھ گونہ جانے کیسے پتا چل جاتا ہے... بائی دی دے بات کیا ہے جو آج آپ کا چہرہ اتنا اترا ہوا لگ رہا ہے۔“

”کچھ نہیں بابا!“ اس نے نیہ کا گال محبت سے چھوتے ہوئے مسکراتے ہوئے کی کوشش کی ”بس ذرا سر میں درد ہے۔“

”صبح سے رات تک مغز کھپائی کرو گی تو یہی ہو گا۔ آئینے میں جا کر دیکھو منہ ذرا سا نکلا ہوا ہے اور رنگت لٹھلی ہوئی ہے۔“

”ویسے باجی، آپ کو یوشنر اب ختم کر دینی چاہئیں۔“

”کیوں بھی؟“ منتہا نے چونک کر نیہ کو دیکھا۔

”بس نا بہت کر لیا.... دس گیارہ سال ہو گئے آپ کو ہم لوگوں کے لیے دن رات ایک کیے۔“

”ہم لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے بگی، مئی میرا دل ہیں، ملیب اور تم میری آنکھیں۔ میں جو کچھ کرتی ہوں اپنے دل کی خوشی اور آنکھوں کی تسکین کے لیے۔“

”ملیب بھی یہی کہتا ہے۔“

”کیا؟“ اس نے مئی کی جانب دیکھا۔

”باجی کو اب یوشنر چھوڑ دینی چاہئیں۔“

”میرے لیے یہ ایک خبر ہے کہ ملیب بھی کچھ کہہ سکتا ہے“ منتہا نے شگفتگی سے کہا۔ مئی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس کی خاموشی میرے دل کو چیرے ڈالتی ہے“ انہوں نے گھائل لہجے میں کہا۔

گھر ٹوٹنے کے بعد ملیب جو مئی اور ڈیڈی کے درمیان خلیج حائل ہونے سے قبل انتہائی شوخ و شرارتی لڑکا ہوا کرتا تھا، اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں سنجیدہ اور بردبار ہو گیا تھا۔ اس کا تیز تیز بولنا، بلند آہنگ قہقہے اور دونوں بہنوں کو اپنی نوع بنوع شرارتوں سے عاجز رکھنا گویا قصہ ماضی بن گیا تھا۔ بات کرتا تو ضرور تبا، مسکراتا تو خست سے۔ ماں بہنوں سے مخاطب ہوتا تو انتہائی حزم و حلم سے۔ مئی کا دل اس کی کم گوئی اور وقت سے پہلے آجانے والی متانت پر اکثر چپکے چپکے دکھے جاتا۔

کچھ ہی حال منتہا کا بھی تھا۔ ڈیڈی سے مئی کی علیحدگی کے بعد اتنا کچھ سہنا اور اتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑا تھا کہ اس کی ہم عمر ساتھیاں اس کی باتیں سن کر اور اس کی دلچسپیاں اور مشاغل دیکھ کر کہتیں ”منتہا کے اندر تو کوئی بوڑھی روح بستی ہے۔“

خود اسے بھی کبھی کبھی یونہی لگتا جیسے وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھی۔ جن باتوں پر اس کی ہم سن ساتھیاں بلند بانگ قہقہے لگاتیں، ان پر وہ فقط مسکراتے پر اکتفا کرتی۔ جب اس کی ہم عمر ساتھیاں فیشن، ٹی وی ڈراموں اور کسی شاپنگ سینٹر میں لگنے والی جوتوں یا کپڑوں کی رعایتی سیل کو موضوعِ سخن بنائے ہوتیں تو وہ یا تو اسٹاف روم میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کاپیوں کی پڑتال، نئے سبق کی تیاری یا بچوں کے حاضری اور فیس رجسٹر میں اندراجات کرنے میں منہمک ہوتی یا پھر فٹنہ سے مئی، نیہ اور ملیب کے بارے میں سرگوشیوں میں بات کر رہی ہوتی۔

پہلے اسکول کی طرح یہاں بھی اپنے ساتھیوں سے وہ اپنی نجی زندگی کے بارے میں کوئی بات کرنے سے عموماً گریز ہی کرتی تھی لیکن پھر بھی ساتھیوں کے استفسار پر کبھی کبھی اس احتیاط کے دائرے میں کوئی شگاف پڑی جاتا، ایسے مواقع پر اسے کبھی کبھی جھوٹ کا سہارا بھی لینا پڑ جاتا۔

ذاتیات سے قطع نظر پیشہ ورانہ معاملات اور موضوعات پر وہ ہمیشہ غیر معمولی اعتماد، جوش و خروش اور دلائل کے ساتھ گفتگو کرتی۔ اپنے فرائض منصبی سے لگن اور انہماک نے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی پیشہ ورانہ اہلیت اور



صلاحیت کو وہ نکھار دیا تھا جس کے یوں تو اس کے اکثر ساتھی معترف ہو چکے تھے مگر پرنسپل ضمیر فاروقی صاحب تو جیسے اس کے مداح ہو گئے تھے۔ وہ اسے اپنے ادارے کی بہترین ٹیچر قرار دینے میں کوئی پس و پیش نہ دکھاتے۔

اس کے بارے میں فاروقی صاحب کی یہ رائے ان کے کئی سالہ مسلسل مشاہدے کا نتیجہ تھی۔ اس مشاہدے میں فاروقی صاحب نے اس کی پیشہ ورانہ اہلیت کے ساتھ اس کے ذاتی اوصاف کو بھی محل نظر رکھ کر اس کے بارے میں غیر معمولی رائے قائم کی تھی۔

وہ محنتی تھی، دیانت دار تھی، خوشامدی نہ تھی۔ راست گو اور بے باک تھی۔ سچ بات کہنے میں ذرا رُورعایت نہ دکھاتی اس کی اس خوبی کو فاروقی صاحب اکثر اپنے رفقاء کے کار کے سامنے بر ملا سراہتے۔

مگر آج...

آج اس کی اسی خوبی نے فاروقی صاحب کو اپنے چند دیرینہ رفقاء کے کار کی موجودگی میں جو شرمندہ کیا تھا سو کیا تھا، بات ان کے دفتر سے نکل کر پورے اسکول میں پھیل گئی تھی اور اس پر ہر ایک نے اپنے اپنے حسابوں اظہار خیال کیا تھا۔ منہا کے فاروقی صاحب کی گڈ بکس میں ہونے پر اس سے بغض و حسد رکھنے والوں کو کھل کر یہ کہنے کا موقع مل گیا تھا کہ فاروقی صاحب کو اپنا ہی بویا کاٹنا پڑا تھا۔ نہ وہ سینئر ٹیچرز کے مقابلے میں ایک جو نیئر ٹیچر کو اتنا سرچڑھاتے نہ وہ یوں ترکی بہ ترکی ان کا سامنا کرتی جیسا کہ نور عالم صاحب اور چند دوسروں کی زبانی سننے میں آیا تھا۔

شرمندگی خود منہا کو بھی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ ایک چھوٹی سی بات پر اتنی برا فروختہ ہو گئی تھی پرنسپل صاحب کے سامنے!

اس کشیدگی کا منطقی نتیجہ اسی روز بھری جماعت میں اصغر علی کی تابڑ توڑ پٹائی کی صورت نکلا تھا۔

سچ ہے ایک غلطی دو سری کو جنم دیتی ہے۔

خدا انخواستہ کل اصغر علی کے گھر سے شکایت آگئی تو! بعض ساتھیوں کو تو ہنسنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔

وہ سخت پریشان تھی۔ مئی کے استفسار کے باوجود اس نے اپنی اس پریشانی کو اپنی ذات تک ہی رکھنا مناسب جانا۔ مئی کو اگر تبا بھی دیتی تو وہ بے چاری کیا کر لیتیں۔



شام کو فضا کا فون آگیا۔

"میں نے سوچا بیمار کا حال پوچھ لوں" فضا نے اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں بولی۔

"اچھا نہیں ہے۔" اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا، زیادہ پریشان مت ہو" فضا نے سمجھایا۔

"ایک پرابلم اور بھی ہو گئی نا!"

"کیا؟" فضا نے چونک کر پوچھا۔

"لاسٹ پیریڈ میں تم سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے بتانہ سکی۔ آج نا، انتھ کے ایک لڑکے کی کچھ زیادہ ہی مرمت کر دی میں نے۔"

"کیوں بھئی؟"

انتھانے پورا قصہ اسے سنایا۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا تمہارے ٹینشن میں ہونے کی وجہ سے ہوا ورنہ ایسی چھوٹی موٹی حرکتیں تو لڑکے کلاس میں اکثر کرتے ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر اس کے گھر سے شکایت آگئی تو؟"

”تو کیا؟“ فضہ کی آواز سے مسکراہٹ جھلک رہی تھی ”شکایت پر نپل صاحب کے پاس ہی آئے گی اور جو تعلقات بگڑ چکے ہوں ان کے مزید بگڑ جانے کے اندیشے سے پریشان ہونے سے فائدہ!“

”شکایت نہ بھی آئی تو میں بہر حال اپنے ٹرانسفر کے لیے درخواست دینے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“

”ڈونٹ لی سلی!“ فضہ نے اسے پیار سے ڈانٹا ”اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر ٹرانسفر کروانے لگیں تو پھر کسی ایک اسکول میں بھی نہیں ٹھہراؤ گی۔ فاروقی صاحب تو بہت شائستہ مزاج آدمی ہیں۔ ہیڈز تو ایسے ایسے ملتے ہیں کہ اللہ کی پناہ..... میں پہلے جس اسکول میں تھی وہاں کی ہیڈز تو کھڑے کھڑے آدمی کو ذلیل کر کے رکھ دیتی تھیں۔ ہر امت ماننا، فاروقی صاحب تو اعلیٰ ظرف آدمی ہیں جو تم نے اتنی بحث کی اور وہ برداشت کر گئے، ورنہ وہ شٹ اپ اور گیٹ آؤٹ بھی کہہ سکتے تھے۔ سزینگی کا فون آیا تھا۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پاس، وہ بتا رہی تھیں کہ نور عالم صاحب نے انہیں اسکول میں بتایا کہ مہس منہا نے فاروقی صاحب سے اتنی روڈی بات کی جس کا ہم سینئرز تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”یہ کیا بات ہوئی، غلط کو غلط کو تو بے ادبی اور گستاخی کا الزام لگ جاتا ہے۔“

”میں تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے سمجھا رہی ہوں منہا.... زندگی میں انسان کو کبھی کبھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ابھی صرف ملازمت کی ذمہ داری ہے اور ملازمت بھی وہ جس میں آپ اختیارات کے معاملے میں خاصے خوش قسمت ہوتے ہیں۔ دن بھر آپ کو اپنے طالب علموں سے، خواہ آپ ایک معمولی اہلیت کے ٹیچر ہی کیوں نہ ہوں ایس میڈم، ایس ٹیچر ہی سننے کو ملتا ہے۔ جو آپ نے کہہ دیا، آپ کے طلباء اسے آمنا صدقاً جانتے ہیں۔ جب شادی کے بعد گھر داری کے جھمیلوں میں پڑو گی نا ڈیئر تو پتا چلے گا کہ صرف ایک آدمی کی محکومی قبول کر کے آپ کو کتنے بہت سے لوگوں کی اطاعت گزار کرنا پڑتی ہے۔ نہیں کہنے کا آپ اختیار ہی نہیں رکھتے۔“

”مجھے ایسی محکومی سے نفرت ہے۔“

”مگر کب تک؟ ایک نہ ایک دن تمہیں یہ محکومی قبول کرنا پڑے گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ ٹرانسفر کی درخواست دینے کے بجائے سمجھوتے کرنا سیکھو۔ ابھی بیک صاحب کو چھ پیریڈز دیے گئے تھے۔ تمہاری بلا سے، تم اپنے کام سے مطلب رکھتیں۔ خواہ مخواہ بحث کی پر نپل صاحب سے.... حاصل؟ وہی ڈھاک کے تین پات نا۔ کیا کروا دیے تم نے بیک صاحب کے آٹھ پیریڈز؟“

”مجھے افسوس اس بات کا بھی ہے کہ میں تو فاروقی صاحب کو اصولی انسان سمجھتی تھی۔“

”ویسے وہ اتنے آدمی ہیں، پتا نہیں ان کی کیا پرالیم ہوگی؟ اچھا خیر ایک خوش خبری سنو، راول کو انٹر کالجیٹ انگلش ڈیپٹ میں فرسٹ پرائز ملا ہے“ فضہ نے موضوع بدل دیا۔

”گڈ! بہت مبارک ہو تمہیں اور.... راول کو میری طرف سے فی الحال تو صرف پیار دینا.... انعام ادھار۔“

”ارے نہیں، بس پیار ہی کافی ہے۔ انعام کے تکلف میں مت پڑنا۔“

”یہ میرا اور راول کا معاملہ ہے، تمہیں مشورہ دینے کی ضرورت نہیں“ فضہ اگرچہ عمر میں اس سے بڑی تھی مگر دوستی اور ذہنی ہم آہنگی نے ان کے درمیان قربت اور بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

”اوکے!“ فضہ اس کی بات پر دھیرے سے ہنس دی۔

منہا کو اس کی ہنسی میں کرب آمیزی کا احساس ہوا۔

”راول تو بہت خوش ہو گا۔“

”بہت بھئی، کالج سے آتے ہی دوسرے شہر اپنے ابا جان کو فون کیا مگر...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”مگر کیا؟“

”انہوں نے یہ کہہ کر اس کی ساری خوشی خاک میں ملا دی کہ انجینئر بننا ہے یا سیاست کرنی ہے جو تقریر میں انعام



حاصل کر کے اتنے خوش ہو رہے ہو... راول بہت ڈپر بسڈ ہوا۔ بچے کو باپ کی طرف سے حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی ملے تو وہ بے چارہ تو ڈپر بسڈ ہی ہو گا نا۔  
”تم نے سمجھایا ہوتا مختار بھائی کو۔“

”اتنے برسوں سے اور کتنی کیا رہی ہوں.... وہ اور میں دو مختلف دنیاؤں کے باسی، دو مختلف راستوں کے مسافر ہیں منتہا یا یوں سمجھ لو کہ ریل کی پٹریاں جو ریل کے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کے لیے میل ہا میل ایک دوسرے کے متوازی تو چل سکتی ہیں مگر کبھی ملتتی نہیں“ فضا کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔  
”لگتا ہے میری طرح آج تم بھی ڈسٹرب ہو؟“

”خدا نہ کرے جو تم کبھی میری طرح...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پل بھر کو توقف کیا پھر اگلے ہی لمحے بولی ”اللہ کرے تمہیں اچھا سالائف پارٹنر ملے.... تم سے ذہنی ہم آہنگی رکھنے والا.... دولت اور اسٹیٹس کی چاہ رکھنے والے احق ہوتے ہیں۔ منتہا، اصل بات یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کے ساتھ آپ کو زندگی گزارنی ہے وہ آپ کو اور آپ اسے سمجھتے ہوں۔ آپ کا اور اس کا مزاج ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو۔ آپ اپنے دکھ سکھ، مال، اولاد، مشاغل اور دلچسپیوں کو مشترک سمجھیں۔ یہاں عالم یہ ہے کہ میں اپنے روزمرہ کاموں سے نمٹنے کے بعد رات کو سونے سے قبل جب تک کچھ دیر کو کچھ پڑھ نہ لوں نیند نہیں آتی اور ان کا یہ حال ہے کہ جو کبھی پڑھنا تھا، پڑھ لیا اب تو کبھی اخبار بھی نہیں دیکھتے، یہاں آئے ہوئے ہوں اور مجھ سے، بچوں سے یا کسی اور سے نئی تازی سنیں تو گنتے ہیں اچھا یہ ہوا۔ ان کی لاعلمی اور بے خبری پر اوروں کے سامنے کبھی کبھی بڑی شرمندگی اٹھانی پڑ جاتی ہے۔ کبھی اگر کہہ دوں کہ مختار صاحب، کبھی کبھی اخبار دیکھ ہی لیا کریں تو اکڑ کر کہتے ہیں۔ مجھ پر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا رعب نہ جمایا کرو۔“  
”خود بزنس مین جو ہیں“ منتہا نے لقمہ دیا۔

”خاک بزنس مین ہیں۔ کبھی دیکھو نا اگر تم ان کی دکان تو کو، یہ ہوتا ہے بزنس.... اوہ، منتہا میں تم سے کتنی اور کیسی کیسی پرستل باتیں کر جاتی ہوں۔ جو میں نے آج تک اپنے گھروالوں سے بھی نہیں کیں۔“  
”میں بھی تو.... میں بھی تو وہ سب کچھ تم سے کہہ دیتی ہوں فضا جو میں کسی اور سے نہیں کہہ پاتی۔“  
”اچھا ہاں یہ تو بتاؤ، وہ جو تمہاری دوست ہیں مسز ظہیر، انہوں نے پھر بات کی؟“  
”میں نے منع کر دیا تھا نا۔“

”احق ہو تم!“  
”بندل آف ٹھینکس فار یور کمپلیمنٹ۔“  
فون پر کچھ ملی جلی سی آوازیں آنے لگی تھیں۔  
”اچھا ڈیئر، باقی باتیں کل.... سانول اور رائیل کے درمیان جنگِ عظیم چھڑنے کا طبل بج رہا ہے... خدا حافظ!“  
”خدا حافظ۔“

○☆☆○

اگلی صبح جب وہ پڑتال کی غرض سے گھر لائی جانے والی نوٹ بکس اپنے سینے سے لگائے اسکول کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو اصغر علی گیٹ کے نزدیک یوں کھڑا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ منتہا نے اس سے نظریں چرائیں اور آگے بڑھ جانا چاہا۔

”گڈ مارننگ میڈم!“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
منتہا کو اپنی سماعت بے بھرم سی محسوس ہوئی مگر یہ وہی تھا۔  
”گڈ مارننگ!“ اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ چند قدم ہی چل تھی کہ عقب سے آواز سنائی

دی "ایکسیکوزی میڈم!"

وہ ٹھنک گئی۔

پلٹ کر دیکھا تو اصغر پیچھے موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتی، وہ آگے بڑھ آیا اور اس نے بغیر کچھ کہے سے اس کے ہاتھوں سے نوٹ بکس لینے کو ہاتھ بڑھائے۔ کسی معمول کی طرح منتہا نے نوٹ بکس کا پلندہ اسے تھما دیا۔

"تھینک یو!" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے استفہامیہ لہجے میں کہا "میڈم! اسٹاف روم میں؟" وہ نوٹ بکس کی بابت پوچھ رہا تھا کہ اسٹاف روم میں رکھی جائیں گی یا کہیں اور۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "اس کے غیر معمولی مودبانہ انداز نے اسے شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔

نوٹ بکس لیے وہ اسٹاف روم کی طرف چلا گیا اور منتہا اسی شش و پنج میں وائس پر نپیل کے کمرے کی جانب چلی گئی جہاں اسے اساتذہ کے حاضری رجسٹر میں اپنی حاضری لگانا تھی۔ اصغر کے رویے پر اسے بڑی حیرانی ہو رہی تھی۔ اسے تو خدشہ تھا کہ اس کے گھر سے شکایت نہ آجائے۔ شکایت نہ بھی آئی تو اسے اتنا تو یقین تھا کہ بھری کلاس میں پٹائی ہو جانے پر وہ دو چار دن تک اس کی صورت بھی دیکھنے کا روادار نہ ہو گا یا پھر اپنا منہ چھپانے کی کوشش ضرور کرے گا مگر...!

حاضری رجسٹر میں دستخط کر کے وہ جونہی وائس پر نپیل کے کمرے سے نکلی، اصغر کو باہر راہداری میں کھڑے پایا۔ "میڈم" میں نے کاہیز آپ کی ٹیبل پر رکھ دی ہیں" اس نے کہا۔

"تھینک یو!" منتہا کا جی چاہا اس سے کہے "میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی تھی مگر مجبور تھی" اسے دلسوزی سے سمجھائے کہ کلاس میں دورانِ تدریس بدتمیزی اچھی بات نہیں لیکن چاہنے کے باوجود اس نے اس موقع کو دلسوزی کے لیے مناسب نہ جانا۔ کیا عجب کہ وہ اس کے سمجھانے بجھانے کو اس کی کمزوری گردانے اور شیر ہو جائے.... پھر کبھی سہی۔

اسٹاف روم کی طرف جانے کو اس نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ پھر اس کی آواز سنائی دی۔

"ایکسیکوزی میڈم!"

وہ تھم گئی، پلٹ کر دیکھا، وہ سر جھکائے نادم نادم سا کھڑا تھا۔

"آئی ایم سوری میڈم!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"سوری مس" میں نے کل آپ کی کلاس میں بدتمیزی کی۔"

منتہا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

"آئی ایم ریلی سوری میڈم... ارشد نے ہمایوں کا بیگ پیچھے سے اس کے سونے کے ساتھ باندھ دیا تھا مجھے اس پر

نہی آگئی.... آئی ایم سوری.... مس.... میں آپ سے مار کھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آپ تو اتنی اچھی

ہیں میڈم" میں.... ہم سب، میری پوری کلاس، باقی کلاسوں کے لڑکے بھی آپ کی بہت عزت کرتے ہیں میڈم.... پلیز

مجھے معاف کر دیں" وہ رقت آمیز آوازیں کہتا چلا گیا۔

منتہا دم بخود کھڑی تھی اور اس پر خود بھی رقت طاری ہوئی جا رہی تھی۔

"پلیز مس!" وہ گڑ گڑا کر بولا۔

"اوکے!" منتہا گھٹی گھٹی آوازیں میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

"تھینک یو.... تھینک یو دیری جی میڈم.... آئندہ کبھی آپ کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔"



”مجھے بھی.... اچھا نہیں لگا اصغر.... میں کسی بھی بچے کو مارنا نہیں چاہتی۔“  
 ”میں جانتا ہوں میڈم.... ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کتنی پولائٹ ہیں“ اس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔  
 تبھی اسمبلی کی گھنٹی بج گئی۔

”ٹھینک یو میڈم!“ اس نے ایک مرتبہ پھر کہا اور اسمبلی گراؤنڈ کی طرف جانے کو پر تو لے۔  
 منہا اپنے خدشات اور اندازوں کے برخلاف رد عمل سامنے آنے پر متعجب تھی۔  
 اس روز فضا سے ملاقات ہونے پر اس نے یہ سارا واقعہ اسے سنایا تو وہ بولی ”خوش قسمت ہو ڈیر کہ بچے تمہارا  
 اتنا ریگارد کرتے ہیں ورنہ تمہارے اس اسکول میں آنے سے پہلے ایک واقعہ میں ایسا بھی دیکھ چکی ہوں کہ ایک بچے کو  
 مارنے پر ایک اچھی بھلی ٹیچر کو دس ماہ تک معطل رکھا گیا۔“  
 ”مزید؟“ منہا نے تائید طلب نگاہوں سے فضا کو دیکھا۔

فضا چونکی۔ ”تمہیں کیسے معلوم؟“  
 ”ایک روز اسٹاف روم میں ذکر ہو رہا تھا۔“  
 ”ہاں وہی.... بات صرف اتنی تھی کہ لڑکا گول مٹول اور گورا چٹا تھا، مسز بار نے اس کی کسی غلطی پر لکڑی کا اسکیل  
 اس کی ہتھیلی پر مارنا چاہا تو اس نے ہاتھ پیچھے ہٹالیا۔ اسکیل اچٹا ہوا اس کے پیٹ پر لگ گیا اور وہاں پر گیا نشان۔ بچے کا  
 باپ تھا کوئی بااثر آدمی، اس نے بات قومی اسمبلی میں پہنچادی اور وہاں اس مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ وزارت تعلیم نے  
 ڈائریکٹریٹ سے جواب طلب کیا۔ ڈائریکٹریٹ نے مسز بار کو فوری طور پر معطل کر کے انکوائری بٹھادی۔ دس ماہ تک  
 رپورٹیں ادھر سے ادھر آتی جاتی رہیں، آخر میں مسز بار کو بچے کے والدین سے دست بستہ معافی مانگنی پڑی تب کہیں  
 جا کر ان کی گلو خلاصی ہوئی اور وہ اپنی سروس پر بحال ہوئیں۔“  
 منہا کو جھرجھری سی آگئی۔

”ویسے کبھی کبھی بچے کو سدھانے کے لیے اسے مارنا بھی ضروری ہوتا ہے۔“  
 ”کبھی کبھی کیا، اکثر“ فضا نے اس کی بات کی تائید کی ”آخر گھر میں بھی تو ماں باپ اپنے بچوں کی بد تمیزیوں پر  
 تنبیہ کرنے کو انہیں مار ہی دیتے ہیں لیکن استادوں پر پابندی شاید اس لیے بھی ہے کہ جب چھوٹ تھی تو بعض  
 اوقات استاد بہت بے رحم ہو جایا کرتے تھے۔ امی جان بتایا کرتی ہیں کہ ان کے زمانے میں ماں باپ بچے کو یہ کہہ کر  
 استاد کے پاس بٹھا جایا کرتے تھے کہ چڑی آپ کی، ہڈی ہماری۔ ابا جان بتاتے ہیں ان کے بچپن میں مدرسے کے ایک  
 استاد نے ایک لڑکے کی گدی پر اتنی زور سے ہاتھ مارا تھا کہ بے چارہ اسی وقت منہ سے جھاگ ڈالتے لگا اور وہیں تڑپ  
 تڑپ کر مر گیا۔“

”او خدا! یہ تو خیر بے رحمی اور سفاکی ہے۔“  
 ”اور آج بھی جہاں پوچھ گچھ کا نظام، رحم کا جذبہ اور خوف کا احساس نہیں، وہاں اس قسم کے واقعات اب بھی  
 ہوتے ہیں۔“

فضا نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی بات منہا کے دل کو لگی تھی۔ واقعی اسے بھی اگر پوچھ گچھ اور احتساب کا  
 خوف نہ ہوتا تو گزشتہ روز اصغر کو مارنے کے بعد وہ آج صبح تک شاید اتنی متفکر نہ رہی ہوتی۔  
 خدا کا شکر کہ خطرہ ٹل گیا تھا اور آئندہ کے لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے، بچوں کو جسمانی سزا  
 نہیں دے گی۔ درس و تدریس کو لوگ کس قدر آسان تصور کرتے ہیں مگر استاد کو کس قدر دلسوزی اور احتیاط سے کام  
 لینا پڑتا ہے۔ پڑھاؤ تو جان مار کر اور خون جگر جلا کر شاگردوں کی تربیت کرو تو اپنا پتا مار کر اور حلم و حکمت سے۔ سربراہ  
 ادارہ کمزور اور کم لیاقت ہو تو خوشامدیوں کے زرخے میں، لائق فائق ہو تو اس کی گڈ بکس میں آنے کے لیے سخت

جائفتاشانی درکار مگر اس کے باوجود یہ ضمانت نہیں کہ کب اسے کوئی بات ناگوار گزر جائے۔ ضمیر فاروقی صاحب کتنے حلیم الطبع اور ذکی سہی مگر کل کی بات پر ان کا موڈ جو بگڑا تھا تو آج تک بگڑا ہوا تھا۔ صبح اسمبلی کے بعد اپنے راؤنڈ کے دوران وہ اس کی کلاس کے سامنے سے گزرے تو معمول کے مطابق استادوں سے علیک سلیک کیے بغیر گزر گئے۔ دوسرے پیریڈ میں جب وہ ایک کتاب لینے کے لیے لائبریری میں گئی تو وہ وہاں موجود تھے مگر انہوں نے اسے یوں نظر انداز کیا جیسے دیکھا ہی نہیں حالانکہ اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ غیر معمولی گرم جوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

کل دن بھر اسکول میں اور پھر گھر جانے کے بعد بھی کچھ پر نسل صاحب سے ہونے والی رنجش اور کچھ اصغر کی پٹائی کے ممکنہ رد عمل کی فکر سے طبیعت مضطرب رہی تھی تو آج اصغر والے قصے کی فکر رفع ہو جانے کے باوجود پر نسل صاحب کے بگڑے ہوئے موڈ کی فکر اس کی طبیعت مکرر کیے دے رہی تھی۔

چوتھے پیریڈ کے بعد وقفہ ہونے پر جب فضلہ چائے کے لیے اس کے ساتھ آکر بیٹھی تو اس نے آہستہ سے کہا ”آج پر نسل صاحب نے بات نہیں کی مجھ سے۔“

”کل کی بات پر؟“

”نہا ہے۔۔۔ اس سے پہلے تو کوئی بات ہوئی نہیں۔“

”ڈنٹ وری۔۔۔ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ فضلہ نے سرگوشی میں کہا۔

مگر اس کے تسلی دینے سے منتہا کی طبیعت کو قرار نہ آیا بلکہ دل کو ٹٹولا تو پر نسل صاحب کی خفگی اسے اصغر کی مار کے قصے سے بھی زیادہ گہیر معاملہ محسوس ہوا۔

## سیرے نسوانی حسن کا راز



### بِلوسِم بَرلِیٹ کریم (یونانی)

قدرتی جڑی بوٹیوں پر برسہا برس کے تجربے اور تحقیق کے بعد ایک نئی ایجاد  
**بِلوسِم بَرلِیٹ کریم جو** قیمت = 150/-  
 • برلیٹ کے نشوز کو سخت کر کے ابھار لاتی ہے۔  
 • برلیٹ کے چھوٹے پن میں اضافہ کر کے پُر وقار شخصیت کا مالک بناتی ہے  
 • کھوئی ہوئی نسوانی خوبصورتی کو دوبالا کرتی ہے

مرکزہ و خانہ کارخانہ بازار فیصل آباد  
 محلی مقیم جنرل مشورہ سپتال روڈ بھکوال  
 عراقی و خانہ من بازار منصف آباد  
 بریلی چاند مشورہ سہری کشن روڈ کوٹہ  
 رکن چاند مشورہ سہری کشن روڈ کوٹہ  
 انعام پریسٹ قسرس روڈ مردان  
 سید نیسی مشورہ اندرون کفایت کراچی  
 دارالشفا و منشا بازار منگورہ سوات  
 ملت و خانہ کھنڈ گھڑ شاہ اور  
 ممتاز منڈ سنز نائی کشن مارکیٹ میرپور ناہر

ابن سینا مشورہ کھنڈ گھڑ بازار دورہ غازی خان  
 منیب و خانہ کھنڈ گھڑ بازار ملتان  
 الامیر میو مشورہ بانی سٹریٹ ساہیوال  
 شہزاد و خانہ کارخانہ بازار فیصل آباد  
 فانی جلی و خانہ چھپرٹ بازار فیصل آباد  
 عزیز انڈیو ریس منڈی ملی مشورہ سہری کشن بازار کوٹہ  
 شامیہ علی مشورہ ریس روڈ ساہیوال  
 جبین ہوس مشورہ رو بازار کوٹہ ناہر  
 الفاظہ و خانہ بازار مارکیٹ کلاں بازار  
 لوریہ غازی خان

ہار شینگ مشورہ بازار ناہر ناہر  
 نشان اوس مشورہ چھپرٹ بازار فیصل آباد  
 رامبراد و خانہ فیصل بازار ساہیوال  
 پاکستان بزیل مشورہ سہری کشن بازار کوٹہ  
 منعم ہولی مشورہ مارکیٹ متانہ و فیصل آباد  
 ارنک خان ملک مشورہ بازار دورہ غازی خان  
 ایس ایم جی مشورہ فیصل بازار کوٹہ  
 شانی و خانہ اندرون مارکیٹ شاہی بازار ناہر  
 بادشاہ دکانی و مشورہ کھنڈ گھڑ بازار ناہر  
 جبین ہوس مشورہ بازار ناہر ناہر

اسٹاکسٹ  
 خواجہ مشورہ ایس مارکیٹ صدر کراچی  
 صدیق علی مشورہ ایس مارکیٹ صدر کراچی  
 مسلم تیزا مشورہ لیاقت مارکیٹ طبرک کراچی  
 ابراہیم سن لیاقت مارکیٹ طبرک کراچی  
 تھری اشارہ جنرل مشورہ مارکیٹ  
 رشیم بازار صدر آباد  
 نیو دلی و خانہ و کٹورہ روڈ سکھر  
 پیرزاد و مشورہ علی مشورہ سہری کشن روڈ سکھر  
 مانظریہ انیل مشورہ کین پر روڈ کوٹہ

رایس محمود ۶۹- نیو مالیک مارکیٹ شاہ عالم لاہور فون ۷۶۶۶۲۶۳ • شاہین طہق و خانہ بوسہ بازار روڈ فیصل آباد فون ۵۵۰۵۵۱۹  
 محمد علی و خانہ ۱۱۰ ہریل شاہنگ مشورہ آپارہ اسلام آباد فون ۵۵۰۲۹۰۳  
 محمد سلیم انڈسٹریز موتی واسے چوک بازار ملتان فون ۵۳۲۱۴۳۰  
 حکیم انشد سنس پروسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان





چار پانچ دن یہی حالات رہے، فاروقی صاحب اس سے باقاعدہ خفا رہے۔ وہ بھی سلام سے آگے کچھ نہ بولی۔  
 فاروقی صاحب اس کے سلام کا جواب سر کی خفیف سی جنبش سے دیتے رہے، بات چیت بالکل بند رکھی۔ منتہا سے ان کی ناراضی کا قصہ تمام ساتھیوں میں عام ہو گیا۔ اسکول میں منتہا کی غیر معمولی اور روز افزوں مقبولیت سے خائف حاسدین کو تو بغلیں بجانے کا موقع مل گیا۔ وہی بیگ صاحب جو اسے دیکھتے ہی تیوری چڑھالیا کرتے تھے، موقع تاک تاک کر اسے دن بھر میں کئی کئی مرتبہ سلام داغتے اور بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں مزاج پوچھتے۔  
 ”جی مس منتہا، کئے کیسے مزاج ہیں؟“

جتنی مرتبہ وہ اس کے مزاج پوچھتے، اتنی ہی مرتبہ وہ سر سے پاؤں تک کھول کر رہ جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ کہہ رہے ہوں ”کئے، کیسی نکلیں آپ پر نپیل صاحب کی گڈ بکس ہے!“  
 بعض بد خواہ بھی خواہی کالبادہ اوڑھ کر اسے ٹولنے کی کوشش کرتے۔  
 ”پر نپیل صاحب سے کیا بات ہو گئی مس منتہا؟“ تجاہل عارفانہ سے کہا جاتا۔  
 ”سنا ہے، فاروقی صاحب سے آپ کی کچھ ان بن ہو گئی؟“  
 ”قصہ کیا تھا؟“

”اونہ! فاروقی صاحب بھی بس نام ہی کے اصول پسند ہیں، کمزور کو دباتے ہیں۔ اچھا کیا جو آپ نے احتجاج کیا۔“  
 ”ارے وہ بیگ صاحب، حرفوں کے بنے آدمی ہیں۔ آپ کی اور پر نپیل صاحب کی گلہ بڑ پر آج کل بہت خوش خوش پھر رہے ہیں۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک کیا مس منتہا...! بندے کو اصول پر اسٹینڈ لینا چاہیے۔“  
 غرض ایک قصہ تھا بیس زبانیں جو آتا اپنی اپنی بول کر چلا جاتا۔ منتہا ہر اگلے دن پچھلے دن سے زیادہ تناؤ میں مبتلا ہوتی چلی گئی۔ پر نپیل صاحب کی مستقل خفا اس کی خفت میں روز بروز اضافہ کرتی رہی۔ ساتھیوں کی باتیں، صلاح مشورے اور حاسدین کی مسکراہٹیں مرے پر سودرے کے مصداق ثابت ہو رہی تھیں۔  
 چھٹے دن وہ خود ہی پر نپیل صاحب کے دفتر میں جا پہنچی اور اس نے اپنا تحریری استعفیٰ چپ چاپ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے پڑھا اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کا جی بھر آیا۔  
 ”بیٹھے!“ وہ گنہگار لہجے میں بولے۔

وہ اپنے لبوں پر طاری لرزش ان سے چھپانے کو دونوں ہونٹوں کو باہم بھینچتی ان کے مڑبڑو بیٹھ گئی۔  
 ”یہ کیا حماقت ہے؟“ فاروقی صاحب نے اس کا استعفیٰ تہ کر کے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اور انگوٹھے کے درمیان دباتے ہوئے اس کے سامنے کیا۔  
 اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”سوری سرا! میں.... میں.... ٹینشن میں کام نہیں کر سکتی“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور یک بیک سک سک کر رونے لگی۔

فاروقی صاحب نے اس کے رونے پر کسی فوری ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔  
 اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

فاروقی صاحب نے گھٹی بجاکر چراسی کو طلب کیا اور بولے ”ایک گلاس پانی لائیے۔“  
 چراسی کے پانی لے کر آنے تک وہ کچھ نہیں بولے۔ وہ پانی لے آیا تو انہوں نے اسے پانی کا گلاس منتہا کے سامنے رکھنے کا اشارہ کیا۔ چراسی نے کن انکھیوں سے منتہا کو دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا اور واپس پاٹ گیا۔

”پانی پیئیں۔“

منتہا نے گلاس اٹھا کر پانی کا ایک گھونٹ لیا پھر گلاس آہستگی سے واپس رکھ دیا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں مرس منتہا؟ دوسرے لوگ ٹینشن میں کام کرنا پسند کرتے ہیں؟“ فاروقی صاحب نے غیر معمولی گنہگار لہجے میں کہا۔

اس نے بے ساختہ چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ میز پر اپنے سامنے دھرے سنگ مرمر کے پیپر ڈسک کو اضطرابی کیفیت میں گھما رہے تھے۔

”مرس منتہا!“ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا ”مختلف جگہوں پر بیٹھے دو افراد کا زاویہ نظر ایک نہیں ہوتا۔ سربراہ ادارہ کو کبھی کبھی بلکہ اکثر ایسے فیصلے کرنا پڑتے ہیں جو ادوروں کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے لیکن اس کے اپنے حساب سے بالکل درست ہوتے ہیں۔ سینئر افراد کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں کہیں نہ کہیں کچھ ریلیف دینا پڑتا ہے حالانکہ ان کی ذمہ داری اس ریلیف کے مقابلے میں اکثر زیادہ ہوتی ہے۔ آپ تو ابھی چند ہی قدم چلی ہیں، اپنے سینئرز کے مقابلے میں آپ زیادہ توانائی رکھتی ہیں، ان کے مقابلے میں زیادہ اور دیر تک بوجھ اٹھانے کی سکت ہے آپ میں۔ آپ آج جتنا کام کریں گی، اپنا آنے والا کل اتنا ہی روشن پائیں گی۔ مجھے افسوس اس بات کا نہیں کہ آپ نے میرے کسی فیصلے پر نکتہ چینی کیوں کی۔ ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی ہونی چاہیے مگر بات کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ ہم کہاں اور کن لوگوں کے سامنے اور کس لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے مجھ سے ان لوگوں کے سامنے تلخی سے بات کی جو شاید اس موقع کے منتظر ہی تھے۔“

منتہا شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ”سوری سر!“ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں، صاف گوئی اور اپنے موقف کا بے باکانہ اظہار یقیناً قابل تعریف اوصاف ہیں لیکن اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے خواہ موقف سو نہیں ہزار فیصد ہی درست کیوں نہ ہو، شکم کو اپنے مخاطب، حاضرین اور موقع کا لحاظ مد نظر رکھتے ہوئے بات کرنی چاہیے۔ کم از کم آپ سے مجھے اس قسم کے لہجے کی امید نہیں تھی۔“

”سوری سر! آئی ایم ریلی سوری!“

فاروقی صاحب نے اس کا استغفی پھاڑا اور اسے پُرزہ پُرزہ کر کے اپنی میز کے نیچے رکھے خاک دان میں ڈالتے ہوئے بولے ”اور یہ کمزوروں اور نا اہلوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ ذرا سی بات ہوئی اور نوکری سے استغفی دینے کھڑے ہو گئے۔ یہ سراسر فرار ہے، آئندہ اس قسم کی حماقت سے گریز کیجئے۔“

منتہا نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولی ”وری سر!“

”کوشش کریں کہ سوری کہنے کے مواقع زندگی میں کم سے کم آئیں۔“

اس نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اے! اپنی زندگی کا اصول بنالیں۔“

”میں کوشش کروں گی سر کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں۔“

”صرف مجھی کو کیوں... کوشش کریں کہ کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”آل رائٹ سر!“

”مکد!“

”میں جاسکتی ہوں سر؟“

”آپ کی مرضی ہے“ فاروقی صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”تھینک یو سر!“ وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔



فاروقی صاحب نے عینک لگاتے ہوئے اپنے سامنے دھری فائل کھول لی۔

اس نے دروازے کا رخ کیا مگر جاتے جاتے پھر پلٹ آئی۔ ”سرا“

فاروقی صاحب نے فائل پر سے نظر ہٹا کر عینک کو ذرا سائیچے کرتے ہوئے اسے عینک کے بالائی کناروں کے اوپر سے دیکھا۔

”سرا! آپ نے مجھے.... مجھے ایک سیوز تو کر دیا نا؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

فاروقی صاحب دھیرے سے پھر مسکرا دیے۔ ”ہم انسان صبح سے شام تک نہ جانے کتنی غلطیاں، کتنی خطائیں کرتے ہیں اور وہ غفور الرحیم ہم سب کو معاف کرتا رہتا ہے۔ آپ میرے لیے بیٹی کی طرح ہیں اور بچوں کی غلطیوں کو درگزر کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”تھینک یو سر... تھینک یو دیری میچ!“

فاروقی صاحب سے معذرت کر کے وہ اپنے ذہن کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ ان سے تعلقات کی از سر نو بحالی ایسے ہی تھی جیسے تینتی دوپہر میں ایک بیک ابر چھایا جائے۔



اسے مسز ظہیر سے ملے کتنے دن ہو گئے تھے! اس روز کے بعد انہوں نے بھی تو پلٹ کر خبر نہیں لی۔ حالانکہ جب اسے ان سے ملے کچھ زیادہ دن ہونے لگتے تو وہ خود ہی فون کھڑکا دیا کرتی تھیں۔ شاید اس کے انکار پر ناراض ہو گئی تھیں وہ۔ ویسے ناراض ہونے والی بات تو نہیں تھی۔ ٹھیک ہے، نہیں بڑنا چاہتی تھی وہ فی الحال شادی وادی کے چکر میں۔ اس بات پر ناراضی بھلا کیوں؟ اور پھر اس نے اپنے لیے ہی تو انکار کیا تھا نا، ان کے بیٹے کے لیے تو نہیں۔ وہ اگر چاہتیں تو اپنے بیٹے کے لیے نہہ کے رشتے کے بارے میں رابطہ قائم کر لیتیں۔ یہ کوئی شرط تھوڑی تھی کہ وہ اگر ان کی اچھی بھالی کے بیٹے کے لیے ہاں کرے گی تبھی وہ فرحان کے لیے نہہ کا رشتہ بھی مانگیں گی۔ اچھا ہوا جو اس نے مسز ظہیر سے ہونے والی بات کا می سے تذکرہ نہیں کیا تھا ورنہ وہ تو آس لگا کر بیٹھ جاتیں اور کیا عجب کہ مسز ظہیر کے رابطہ نہ کرنے پر اب تک خود ہی ان سے رابطہ قائم کر چکی ہوتیں۔ اور پھر اگر مسز ظہیر انہیں بتا دیتیں کہ وہ تو ایک نہیں دونوں ہی بہنوں کے رشتے مانگنا چاہ رہی تھیں تو کیا عجب کہ می اسے بھی قسما دھری کر کے گھیر لیتیں۔

نہیں۔ وہ کسی بھی ایسی صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی جو اس سے می کو چھوڑنے کی متقاضی ہوتی۔

وہ شخص جو بسلسلہ معاش بیرون ملک مقیم تھا، اس سے شادی ہونے کی صورت میں دو ہی تقاضے متوقع تھے یا تو اس کے ساتھ باہر جانا پڑتا جیسا کہ مسز ظہیر نے کہا تھا یا اس کے گھر والوں کے ساتھ ان کے گھر میں رہنا پڑتا۔

خیر، مسز ظہیر اگر واقعی اپنے بیٹے کے لیے نہہ کے رشتے میں دلچسپی رکھتی تھیں تو انہیں رابطہ کرنا چاہیے تھا۔

وہ خود ان کے ہاں جانے سے گریز اس لیے کرتی رہی کہ ایک عجیب ہی خفت دامن گیر تھی۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ کہ کیسی طوطا چشم ہے۔ اتنا ساتھ دیا، مشکلات میں راستے دکھائے۔ مورل سپورٹ دی اور اس سے ایک سوال کیا تو اس نے کورا جواب دے دیا۔

می بھی کئی مرتبہ ٹوک چکی تھیں ”بیٹا، کافی دن ہو گئے۔ تم نے مسز ظہیر کی کوئی خبر نہیں لی، کیا سوچتی ہوں گی وہ کہ کیسے بے مروت لوگ ہیں، فون ہی کر لو۔“

”کسی روز جاؤں گی.... فرصت ہی نہیں مل رہی۔“

”آخر پہلے بھی تو فرصت نکالتی تھیں، اپنے محسنوں کو ہر مصروفیت کے مقابلے میں ترجیح دینی چاہیے۔“

”اچھا می، جاؤں گی۔“

قربت میں فاصلہ پیدا ہونے کے بعد دوبارہ قربت کی کوشش انسان کو کبھی کبھی خود اپنے آپ سے بھی کتنا شرمندہ کر دیتی ہے، اس کا اندازہ منتہا کو اگلے چند دنوں کے دوران ہوا۔ وہ ہر روز مسز ظہیر کے ہاں جانے کا ارادہ کرتی اور ہر

روز اپنے اس ارادے سے پاپائی اختیار کر لیتی۔ اسی کشمکش میں ایک روز خود مسز ظہیر کا فون آگیا۔  
 ”کہاں ہیں بھئی، آپ تو عید کا چاند ہو گئیں؟“ ان کے لہجے میں وہی حدت، وہی حلاوت، اپنائیت اور شفقت تھی۔

”نہیں مسز ظہیر، ایسی تو کوئی بات نہیں!“ ان کے شکوے کا اس سے کوئی اور جواب بن ہی نہ پایا۔  
 ”تو پھر کیا بات ہے؟“ ان کی آواز اور لہجے سے عیاں تھا کہ وہ مسکرا رہی تھیں۔  
 ”کو... کوئی بات نہیں“ وہ شرمندگی سے بولی۔  
 ”ایک بات کہیں ہم تم سے؟“  
 ”جی!“

”محبت کے تعلقات کو حالات اور مسائل سے ماورا ہونا چاہیے... آپ سمجھ رہی ہیں نا ہمارا مطلب؟“  
 ”جی... جی نہیں“ اس نے اپنی نافرمانی کا اعتراف کیا۔  
 ”ہم نے آپ سے ایک بات کہی، آپ نے اسے نہ مانا اور انکار کر دیا۔ ہم مایوس ضرور ہوئے لیکن ہم نے آپ کے انکار کا قطعاً برا نہیں منایا۔ سوال کرنے کا حق ہمیں تھا، اقرار یا انکار کا آپ کو... آپ کے انکار سے ہمارے دل میں آپ کی محبت میں سرمو فرق نہیں آیا لیکن آپ شاید ہماری بات کا برا مانا گئیں؟“  
 ”نہیں مسز ظہیر، ایسی کوئی بات نہیں“ وہ اور شرمندہ ہو گئی۔  
 ”تو پھر اتنے دن سے آئیں کیوں نہیں ہماری طرف اور نہ ہی فون کیا؟“  
 ”آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔“

”ہم سمجھے نہیں!“  
 ”مجھے اس بات پر شرمندگی تھی کہ آپ کیا سوچتی ہوں گی، کیسی بد تمیز ہے، صاف انکار کر دیا... آپ کے تو اتنے احسانات ہیں مجھ پر کہ میں آپ کے سامنے نظر بھی نہیں اٹھا سکتی“ اس کی آواز بھرا گئی۔  
 ”ہش! اتنی ثقیل گفتگو ہمیں ہضم نہیں ہوتی“ ان کی آواز سے پھر مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔  
 مشکل دنوں کی یاد نے منہا کی آنکھوں کے کنارے نم کر دیے تھے۔  
 ”پتا ہے، ہم آپ کی والدہ سے آپ دونوں بہنوں کے رشتے کی بات اس لیے کرنا چاہتے تھے کہ انہیں نیہہ کے لیے فرحان کا رشتہ قبول کرنے میں اس لیے تردد نہ ہو کہ پہلے بڑی کا رشتہ ہو جائے اور ہمارا ایک انٹرسٹ اور بھی تھا اچھی بھالی کے ہاں آپ کا رشتہ ہو جانے پر... اور وہ یہ کہ جب ہماری لیلیٰ اس گھر میں جاتی تو آپ کو وہاں موجود پاتی ہمیں بھی تسلی رہتی۔“

”آپ چاہیں تو می سے نیہہ کے لیے بات کر لیں“ منہا نے اب بھی انہیں ہٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا۔  
 ”ایک ماں ہونے کے ناتے ہم جانتے ہیں کہ ان کی خواہش یہی ہوگی کہ پہلے آپ کا رشتہ طے ہو۔“  
 ”میں می کو منانے کی کوشش کروں گی۔“

”عجیب لڑکی ہو! لڑکیاں تو اپنی شادی کے لیے دعائیں اور وظیفے کیا کرتی ہیں۔“  
 ”وہ لڑکیاں ہوتی ہیں نا مسز ظہیر!“

”اور تم کیا ہو؟“ مسز ظہیر کی آواز میں چونکنے کا تاثر تھا۔  
 ”میں... میں پتا نہیں کیا ہوں“ یک بیک وہ کھکھلا کر ہنس دی اور اسی ہنسی میں اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔  
 صد شکر کہ مسز ظہیر سامنے نہیں تھیں!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



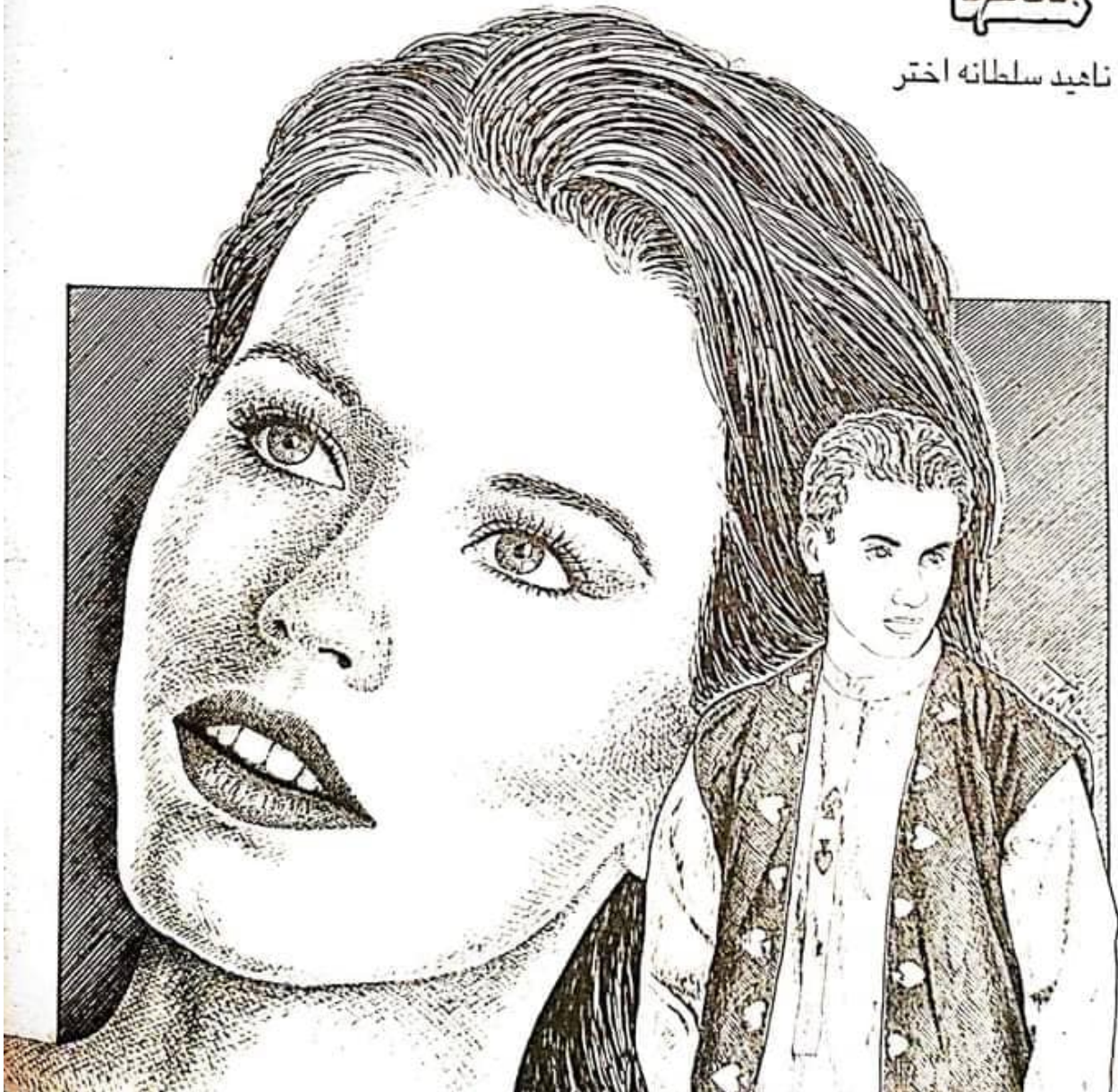
دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تہمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہری تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بینور میں پھنس گیا تھا۔

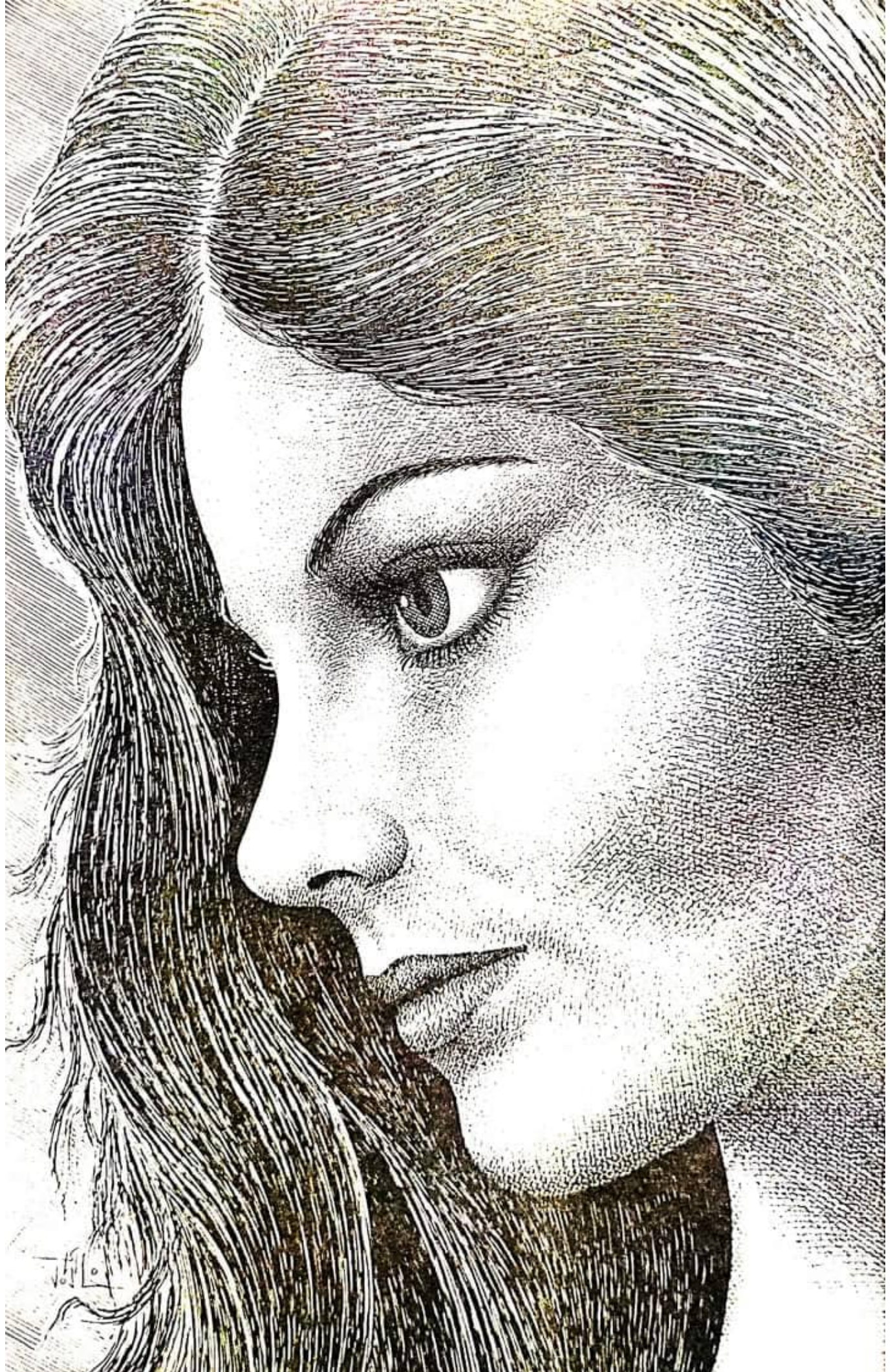
محبتوں سے گزرے اور یقین سے بندھے شتوں کے چاکل سمان ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانہ اختر









منتہا نے مسز ظہیر سے کہہ تو دیا کہ وہ می کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ نیسہ کے لیے ان کے بیٹے کا رشتہ منظور کرنے میں محض اس لیے تامل نہ کریں کہ وہ بڑی تھی لہذا پہلے اس کی شادی ہونی چاہیے تھی۔ مگر می کو آمادہ کرنے کے لیے اسے اپنی تمام تر عقل و فراست بروئے کار لانا پڑی۔

”ہرگز نہیں“ پہلے تو می نے صاف ہی انکار کر دیا۔

”کیوں می؟“ وہ ان کے انکار کا سبب جانتے ہوئے بھی انجان بن گئی۔

”یہ کہاں لکھا ہے کہ چھوٹی کی شادی کر دو اور بڑی بیٹھی رہ جائے۔“

”یہ بھی تو کہیں نہیں لکھا کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

”مجھ سے بحث مت کرو“ می نے اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

”میں آپ سے بحث کر سکتی ہوں بھلا“ اپنا بازو می کے ایک شانے سے دوسرے تک دراز کرتے ہوئے اس نے

اپنا گال بہت پیار سے می کے شانے پر دھریا۔

می نے گردن موڑ کر نظر جھکاتے ہوئے اسے دیکھا۔

وہ نگاہ اوپر کیے بڑی محبت سے انہی کو دیکھ رہی تھی۔

انہیں اپنی جانب دیکھتے پا کر اس نے اپنا سر ان کے شانے پر سے اٹھایا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

”مسز ظہیر کہہ رہی تھیں ان کے خاندان کے مردوں کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنی بیویوں کے حق میں بڑے

اچھے شوہر ثابت ہوتے ہیں۔“

”ہوتے ہوں گے۔“ می نے ناگواری سے کہا۔

”می پلیز یوں ریمیکٹ نہ کریں۔ لڑکا بھی اچھا ہے اور خاندان بھی ہمارا دیکھا بھالا ہے۔“

”زیادہ بڑی بننے کی ضرورت نہیں“ سمجھیں! می نے اب اسے باقاعدہ گھر کا۔

”پلیز!“

”میں نے کہہ دیا“ می نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”مسز ظہیر اپنے بیٹے کا رشتہ کہیں اور کر لیں گی۔“

”کر لیں وہی کوئی پہلا اور آخری لڑکا تو نہیں ہے۔“

”یا تو آپ اتنی پریشان تھیں۔ ایک ایک سے کہہ رہی تھیں رشتہ بتاؤ۔ مسز ظہیر سے بھی کہا تھا آپ نے اور

اب جبکہ رشتہ آگیا ہے تو آپ انکار کر رہی ہیں؟“

”یہ میں نے کب کہا تھا کسی سے کہ نیسہ کا پہلے کر دوں گی“ می نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

”کر دیں نا!“

”مسز ظہیر سے کہو، تم دونوں کے لیے لے آئیں میں کر دوں گی۔“

”اور اگر دونوں کے لیے نہ ہو تو؟“

”تو پہلے نیسہ کے لیے نہ آئیں۔“

”ایسا نہ کریں می...! آپ خود ہی تو کہتی ہیں اچھے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔ دیکھ لیں وہی ممائی جان جو ہم

لوگوں سے کترانے لگی تھیں اب کیسے چکر لگانے لگی ہیں ہمارے گھر کے۔“

می نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ کس زخم کو چھیڑ دیا تھا اس نے!

ایک ہی تو بھائی تھے نا ان کے... فقط ایک! نہ دوسرا کوئی بھائی نہ بہن.... گھر بگڑنے کے بعد جب قسمت نے ان

کے در پر لے جا ڈالا تو کیسے نگاہیں پھیر لی تھیں نہ صرف بھانج بلکہ بھائی نے بھی۔ ایسی بھی کیا زن مریدی! بڑے وقت میں اس گھر میں وقت گزارنا مشکل کر دیا تھا ان کی سرد مہری نے۔ پھر جب الگ ہو گئے تو برسوں تک انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں تھا۔ آٹھ نو برس لا تعلق سے رہے۔ خاندان میں کسی غمی خوشی کے موقع پر سامنا ہو جاتا تو بھائی اجنبیوں کی طرح خیریت پوچھتے اور بھانج کترائی کترائی رہتیں۔ اب وہی بھائی بھانج خود بڑھ بڑھ کر ملنے لگے تھے۔ ان کی اس گرم جوشی کا سبب خود می ہی نہیں منتہا، نیہہ اور ملیب بلکہ اپنے پرائے بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ مدیحہ ان کی بڑی بیٹی اور پہلوئی کی اولاد شادی کی عمر کو جو جا پہنچی تھی!

بھائی اب بہانے بہانے گھر آتیں۔  
 ”بادام کا حلوا بنایا تھا تمہارے بھائی کے لیے۔ مقوی دماغ ہوتا ہے، میں نے سوچا ملیب کو بھی دے آؤں۔“  
 ”تمہارے بھائی سے میں نے کہا تھا کوئی باہر آتا جاتا ملے تو اپنے اور بچوں کے لیے شریٹیں منگوا لیں۔ بھی زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے کوالٹی میں۔ مجھے ملیب کی پسند کا اندازہ ہے، صوفیا نے رنگوں کی دو شریٹیں میں نے اس کے لیے نکال لیں۔“

ممائی اپنی کرم فرمایوں کا اظہار کچھ اس طرح کرتیں۔  
 ”تمہاری نیہہ میرے بیٹے سے چھوٹی ہوتی تو میں تو اسی کو اپنی بہو بنا لیتی۔ بھی، اپنا پھر اپنا ہوتا ہے۔ مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے۔ مدیحہ کو تو میں اپنوں ہی میں دینے کا تہیہ کیے بیٹھی ہوں۔“  
 ”بھئی بیٹے کی رات تم لوگ ہمارے ساتھ کھانا کھانا۔ مدیحہ نے جب سے کلنگ کلاسز لی ہیں، ہمیں تو باہر کا کھانا اچھا ہی نہیں لگتا۔ تم لوگوں کو مدیحہ کے ہاتھ کا کھانا ہی کھلو آؤں گی۔“  
 ”مدیحہ نے چھوٹی خالہ سے کڑھے ہوئے سوٹ منگوائے تھے ملتان سے، اسے فون پر خاص طور سے تاکید کی، میری پچھو کے لیے بھی ایک دو اچھے سے سوٹ بھجوانا۔ آج ہی آئے ہیں۔ مدیحہ کہنے لگی، چلیں پچھو سے اس بہانے مل بھی آتے ہیں۔“

مدیحہ! مدیحہ! مدیحہ!  
 بھائی نے اسی کے لیے گھاٹ لگا رکھی تھی ملیب پر۔  
 کتنے خود غرض ہوتے ہیں لوگ!  
 اپنی اغراض کے غلام!  
 ”تم ٹھیک کہتی ہو“ می نے اس کی بات سن کر ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے کہا ”زمانے کا دستور یہی ہے بیٹا۔ خدا بخشے ہماری امی کہا کرتی تھیں۔“

بنی کے چہرے پہ لاکھوں غار  
 بن کے جو بگڑے تو دشمن ہزار  
 ”ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے والدہ“ آپ ممائی جان کو ملیب کے سلسلے میں ذرا لفٹ نہ کرائیے گا۔“  
 ”یہ فیصلے اوپر ہوتے ہیں بیٹا! اگر ملیب کی قسمت میں اسی گھر کی لڑکی ہوئی تو میں کیا کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔“  
 ”ہماری ایک ساتھی کہا کرتی ہیں جس گھر کی لڑکی لینی ہو، سب سے پہلے اس گھر کی ماں سے ملنا چاہیے، اگر ماں سمجھ دار ہوئی تو اس کا مطلب ہے اس نے بیٹی کی تربیت بھی اچھی کی ہوگی۔ انشاء اللہ ملیب کے لیے ہم ایسا ہی کریں گے۔ مسز ظہیر نے اگر اپنی چھوٹی بیٹی کی منگنی نہ کر دی ہوتی تو میں تو آپ سے یہی کہتی ملیب کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیں۔ بڑی پیاری لڑکی ہے بلکہ وہی کیا ان کے سارے بچے اچھے ہیں۔ ہاں تو پھر بتائیے ناکب بلا لیا جائے مسز ظہیر کو!“  
 اس نے اصل موضوع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔



میں نے محبت آمیز شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولیں "اپنی بات بھولیں نہیں تم۔"

"یہ بھولنے والی بات ہے بھلا۔ نیمہ کی مجھے آپ جتنی فکر تو نہیں ہو سکتی مگر میری خواہش ہے اور دعا بھی کہ اسے اتنی خوشیاں اور سکون ملے کہ وہ ڈیڈی کے بعد ملنے والا ہر دکھ اور بے سکونی بھول جائے۔"

میں نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں نے کہا، کیوں یہ درد انگیز ذکر چھیڑ دیا تم نے۔

منتہا نے ان کی کیفیت متاثر ہوتے ہوئے ان کا ہاتھ دھیرے سے اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی "والدہ مسز ظہیر کو ہمیں ڈیڈی کے بارے میں کچھ نہیں بتانا پڑے گا۔ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ڈیڈی کے بعد ہم نے جو کچھ کیا ہے، خود ہی کیا ہے۔ ان کی طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوگی اور وہ نیمہ کا خیال بھی رکھیں گی۔ ایک بات تو ہے نا والدہ... ہم سب بظاہر کتنے ہی نارمل دکھائی دیں، ڈیڈی کے بعد تھوڑی تھوڑی اینارملٹی تو ہم سبھی میں ہو گئی ہے۔"

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ اُن کی نگاہوں میں بڑی کرب انگیزی کیفیت تھی۔

منتہا نے ان سے نظریں چڑھائیں اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی "میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں۔ ہم ٹوٹے ہوئے گھر کے لوگ ہیں والدہ.... بروکن فیملیز کے افراد نارمل نہیں رہتے۔ کوئی نہ کوئی اینارملٹی پیدا ہو جاتی ہے ان میں.... نیمہ کو دیکھیں ڈاکٹر بن گئی ہے، باہر نارمل رہتی ہے مگر گھر میں آئے مہمانوں کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتی ہے۔

میلیب کو چپ لگ گئی ہے، آپ آئے دن بیمار رہنے لگی ہیں اور میں.... وہ یک لخت چپ ہو گئی۔

"ہاں.... تم...؟"

اس نے نظراٹھا کر مئی کی جانب دیکھا۔

"بولو" مئی نے تقاضا کیا۔

"میں...." اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا "میں اکثر رات کو خواب میں نہ جانے کہاں کہاں نکل جاتی ہوں.... اپنے پھاڑ گہری کھائیاں، تیز بارش، گھپ اندھیرا.... ڈراؤنے خوابوں سے میں اکثر ڈر جاتی ہوں والدہ!"

"نہ میرا بچہ!" مئی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھریا اور اسے کسی چھوٹی سی بچی کی طرح چمکارتے ہوئے بولیں۔

"جب تک میں زندہ ہوں، تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

مئی کی آواز دھیمی اور لمبے میں دکھ تھا۔

"مسز ظہیر سے کہہ دوں آجائیں۔"

مئی کی اور اس کی نگاہیں باہم ملیں۔

"بیٹا میری تو خواہش تھی کہ پہلے تمہاری ہوتی" مئی نے ہتھیار ڈال دیے۔

منتہا نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"پلیز!" وہ گڑ گڑائی۔

مئی نے فوری کچھ نہیں کہا مگر چند لمحے بعد بادل نا خواستہ بولیں "اچھا ٹھیک ہے.... جیسے تمہاری مرضی۔"

منتہا کو یک گونہ خوشی کا احساس ہوا۔

"مگر یہ دیکھ لو، نیمہ بھی یہ کہتی ہے کہ جب تک باجی کی شادی نہ ہو میرے بارے میں سوچنا بھی مت۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔"



"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" نیمہ نے اکر کر کہا۔

"کیوں؟"

”بس!“

”بس کرئی تو وجہ ہوگی۔“

”پہلے آپ کیوں نہیں کرتیں۔“

”میرے لیے کوئی رشتہ آئے گا تو میں بھی کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے تو پہلے اپنے لیے رشتہ آنے دیں۔“

”ڈونٹ بی سلی! اب یہ تو نہیں ہو سکتا تا کہ میرے لیے رشتے کے انتظار میں تمہارے لیے اچھا رشتہ بھی مگنوا دیا

جائے۔ مسز ظہیر می کی طرح تمہارا خیال رکھیں گی۔“

”اتنی مبالغہ آرائی بھی مت کریں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”مانتی ہوں کہ آپ کی مسز ظہیر اچھی ہوں گی مگر ہماری اپنی ماں کی طرح ہمارا خیال اور کون رکھ سکتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو“ منتہا نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے کہا ”اپنی ماں کی طرح تو شاید کوئی بھی خیال نہیں رکھ

سکتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسز ظہیر بڑی نفیس اور ہمدرد خاتون ہیں۔ وہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دیں

گی۔“

”کیا اب بھی کوئی تکلیف پہنچنی باقی ہے۔“

منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے لبوں پر بڑی کرب انگیزی مسکان پھیل گئی۔

منتہا نے اس کا ہاتھ اپنے دو توں ہاتھوں کے درمیان لے لیا اور بوجھل آواز میں بولی۔ ”خدا کرے تمہیں اتنی

خوشیاں ملیں میری جان کہ تمہیں کوئی دکھ یاد نہ رہے۔“

نیہہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ منتہا کو اس کی نگاہوں میں کسی گھائل ہرنی کی سی کیفیت دکھائی دی۔

”کم از کم میں نہیں بھول سکتی۔ اسپتال میں جب کسی ایمرجنسی کال کے لیے مائیکروفون پر ڈاکٹر نیہہ احمد کی پکار

سنائی دیتی ہے تو جتنی مرتبہ میرا نام پکارا جاتا ہے اتنی ہی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میرا آدھا نام میرا ہے اور آدھا

... ”وہ کہتے کہتے رک گئی۔“

منتہا نے اس کے آخری فقرے پر چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مگر اس کے

کتھار سس کے لیے منتہا نے اسی کی زبان سے سننے کو تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

”آدھا!“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے نیہہ کو دیکھا۔

اس نے نظریں جھکا لیں اور دھیرے سے بولی ”ڈیڈی کا!“

”جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم سب کچھ بھول جاؤ گی میری جان! سب کچھ.... مسز ظہیر کا پورا گھرانہ ہی بہت

اچھا ہے بلکہ پورا خاندان بے مثال ہے۔ ایسے پیار سے ملتے ہیں ان کے خاندان کے لوگ دوسروں سے کہ ان سے

ملنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ خود بھی اسی خاندان کا حصہ ہے۔ ذرا اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیتے وہ لوگ

دوسرے کو۔ پڑھے لکھے، معزز اور خاندانی لوگ ہیں۔ مسز ظہیر کا بیٹا فرحان بہت ملنسار لڑکا ہے۔ شادی کے بعد مسز ظہیر

اپنی ہونے والی بہو کو روایتی ساسوں کی طرح اپنے شگجے میں جکڑ کر نہیں رکھنا چاہتیں بلکہ ان کی خواہش ہے کہ بہو ان

کے بیٹے کے ساتھ دینی میں ہی رہے۔“

”ہاں تو پھر میری جاب کا کیا ہو گا؟“ نیہہ بے ساختہ بولی۔

منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا یہ بے ساختہ استفسار اس کی آمادگی کا غماز تھا۔



منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

”میری جان، وہیں جا ب کر لینا۔“

”آپ زیادہ خوش نہ ہوں، پہلے آپ کی شادی ہوگی پھر میرے بارے میں سوچے گا۔“  
”اوہ نیسہ.... فار گاؤز سیک... فار گاؤز سیک میری جان! اب تم اٹکنے کی کوشش مت کرو۔ کتنی مشکل سے تو میں نے می کی یہ ضد توڑی ہے، ان کا بھی یہی کہنا تھا۔“  
”ٹھیک ہی تو تھا۔“

”دیکھو نیسہ پلیز! اب تم ضد مت باندھنا۔ ٹرائی ٹوبی رٹیلٹ ڈارلنگ! ہماری فیملی ایک بروکن فیملی ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے نظر نہیں جڑانی چاہیے کہ ہمارے معاشرے میں شادی محض لڑکا اور لڑکی کی نہیں دو خاندانوں کا ملاپ ہوتی ہے۔ ڈیڈی مرگئے ہوتے تو اور بات تھی، زندہ ہیں۔ تمہاری یا میری شادی کے لیے بلکہ علیل کے لیے بھی جہاں بات چلے گی، ڈیڈی کے بارے میں ضرور سوال کیا جائے گا۔ باپ زندہ ہو اور ساتھ نہ ہو تو لوگ بیسیوں سوال کرتے ہیں۔ ہم لاکھ مظلوم ہوں، دوسرے لوگ ہمارے ہی بارے میں غلط انداز میں سوچنے لگتے ہیں۔ مسز ظہیر جانی بوجھی ہیں، ہمیں انہیں کوئی وضاحت نہیں دینی پڑے گی۔“  
”لیکن بابی، ایک بات اور بھی تو ہے“ نیسہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔  
”وہ کیا؟“

”میں... میں ایم بی بی ایس ہوں اور مسز ظہیر کا بیٹا صرف ڈیپلوما انجینئر!“  
”تو کیا ہوا؟“

”آپ کے خیال میں تعلیم کا فرق کچھ فرق ہی نہیں ہوتا۔ انجینئر ہے تو کم از کم ڈگری ہولڈر تو ہوتا۔“  
منتہا نے اس کی بات پورے غور سے سنی اور اس کے جواب میں کہا ”ہاں، اگر وہ ڈگری ہولڈر انجینئر ہوتا تو یقیناً زیادہ بہتر ہوتا۔ مجھے اعلیٰ تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں مگر میرے نزدیک کسی فرد کا ایک اچھا انسان ہونا اس کے ڈگری یافتہ ہونے سے بہتر ہے۔ میری کولیکز میں ایک صاحبہ ایسی بھی ہیں جن کے شوہر کے بارے میں میں نے اپنی چند سینئر ساتھیوں سے سنا ہے کہ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم انکلیڈ سے حاصل کر رکھی ہے مگر بد بخت انسان بیوی کی پیشانی نیگے فرش پر رکھ کر سر کے اوپر اپنے جوتے برساتا ہے اور گالم گلوچ کرتا ہے۔ کیا تم خدا نخواستہ کسی ایسے ڈگری ہولڈر انجینئر سے شادی کرنا پسند کرو گی؟“

”ہرگز نہیں.... میں تو ایسے آدمی کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی۔“  
”تو میری جان! پھر تم ایسے لڑکے سے شادی کرنے کے لیے ہاں کرنے میں اس کے ڈگری یافتہ نہ ہونے کو مسئلہ نہ بناؤ جس کے بارے میں تمہاری اپنی بہن جسے تم بے حد عزیز اور پیاری ہو، یہ ضمانت دینے کو تیار ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ تمہارے حق میں ایک اچھا لائف پارٹنر ثابت ہوگا۔“  
نیسہ خاموش رہی۔

منتہا چند ثانیے تک باندھے اسے دیکھتی رہی پھر اپنے لہجے میں شگفتگی پیدا کرتے ہوئے بولی۔  
”کہئے جناب، تو پھر کیا ٹھہری؟“  
”پہلے آپ!“

”اے!“ منتہا نے اسے محبت سے آنکھیں دکھائیں اور مسکراتے ہوئے کہا ”اب یہ بات پھر مت کہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے آپ پہلے آپ کے چکر میں لڑکا ہاتھ سے نکل جائے۔“  
”نکل جائے، ہمیں پروا نہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب، آپ کو پروا ہو یا نہ ہو، اس بندی عاجز و خاکسار کو ہے۔“

”کیوں ہے؟“

”ناکہ والدہ کے چہرے سے فکر کی لکیریں کم ہو سکیں۔ سچ نیبہ، مئی بہت فکر مند ہیں ہم دونوں ہی کے لیے۔ میں سمجھتی ہوں، ہم میں سے جس کے لیے بھی کوئی وسیلہ پہلے بن جائے، ہمیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ والدہ نے ہم لوگوں کے لیے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں، ہمارا فرض ہے کہ انہیں جو سہولت، آسانی اور خوشی دے سکتے ہیں، دیں۔ اور پتا ہے کیا؟ جب ہمارے بارے میں ان کی فکر کم ہوگی تو وہ علیل کے لیے بھی کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گی۔ تمہیں تو پتا ہے نا، ممانی صاحبہ نے کیا جال پھیلا رکھا ہے علیل کو پھانسنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے تمہاری شادی کے بعد تمہاری سسرال میں علیل کے لیے کوئی ایسی لڑکی مل جائے کہ تمہارے بعد ہم علیل کی بھی شادی کر دیں۔“

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ارے بھئی، کوئی اچھا بندہ مل گیا تو ہم بھی کر لیں گے۔“

”بے ایمان!“

”کے کہہ رہی ہو؟“ منتہا نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اے جو چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے نکلے تو میری بہن جیسی بہیرالذکی نہیں ڈھونڈ پائے گا۔“

”ارے ارے ارے، علاج معالجے، دواؤں، اپنی ڈی اور اوٹی سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر صاحبہ چراغوں اور ہیروں کی باتیں کہاں کرنے لگیں۔“

”جناب عالی! ہم بھی گوشت پوست کے انسان ہیں اور اپنے سینے میں اک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔“

”اچھا! تو دل رکھتی ہیں آپ بھی؟“

”جی اتفاق سے۔“

”کیا خوب اتفاق ہے بلکہ حسن اتفاق!“

”کیسی بے معنی اور بے سروپا باتیں کر رہے ہیں ہم۔“

”سوری، سوری، سوری.... چلے جاتے ہیں... اچھا تو یہ بتاؤ میری جان کہ وہ کون سا مبارک دن ہو کہ تمہیں بھی گھر پر ٹھہرے رہنے کی فرصت ہو اور ہم مسز ظہیر کو باضابطہ طور پر تمہارے لیے اُن کے بیٹے کا پیغام شادی دینے کے لیے بلا لیں۔“

”ضروری ہے؟“

”اتنا ہی جتنا سانس لینا۔“

”پھر تو مجبوری ہے؟“

”آپ یہ فرمائیں کہ آپ کی فرصت میں کتنی دوری ہے؟“

”واہ، کیا قافیہ بندی ہے۔“

”دیکھو، شرافت سے بتاؤ، کس دن بلائیں انہیں۔“

”کسی بھی دن بلا لیں۔ اگلے ہفتے سے میری نائٹ ڈیوٹی شروع ہو رہی ہے۔“

”دینی جا کر دیکھنا، یہاں کی طرح اگر وہاں بھی اپنا مطلب کھولنے کی سہولت ہو تو کہیں ملازمت کرنے کے بجائے اپنی کلینک کھولنے کو ترجیح دینا۔“

نیبہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”نہیں کیوں؟ کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟“



”میں یہ سوچ کر ہنسی کہ آپ کتنی دور کی سوچنے لگیں۔“

”آدی کو مستقبل ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہیے۔“

”زور کس پر ہے؟ آدی پر یا مستقبل پر؟“

منتہا نے مسکراتے ہوئے بہت پیار سے اس کا کان اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پکڑا اور بولی ”زور تمہارا گھر جلد از جلد بسا دینے پر ہے میری جان!“

○☆☆○

ڈائریکٹریٹ نے اپنے زیر انتظام اداروں میں اساتذہ کے مابین پیشہ ورانہ مسابقت کو تحریک دینے کے لیے ہر ادارے سے نامزدگیاں طلب کیں تو فاروقی صاحب نے اپنے ادارے سے منتہا کو بہترین ٹیچر کے اعزاز کے لیے نامزد کیا۔ ان کے اس اقدام پر رفقاءے کار میں کھلبلی مچ گئی۔

”خدا جانے ایسے کیا سُرخاب کے پر لگے ہیں مِس منتہا میں؟“

”فاروقی صاحب کو تو جیسے اسکول میں مِس منتہا کے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔“

”ہاں جناب، ہم کیا بچتے ہیں مِس مِس کے آگے۔“

”لگتا ہے، مِس منتہا نے تو جیسے پرنسپل صاحب پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا ہے۔“

”مِس منتہا کا جادو تو فاروقی صاحب کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔“

”ارے! فاروقی صاحب کو کیا یاد نہیں رہا کہ ٹائم ٹیبل کے سلسلے میں مِس منتہا نے ان سے کتنا مِس بی ہو کیا تھا۔“

”اتنے بہت سے سینئر ٹیچرز کے مقابلے میں مِس منتہا کی نامزدگی دو سروں کی حق تلفی ہے۔“

”جسے پیا چاہے وہی ساکن!“

منتہا کی نامزدگی پر دیگر اساتذہ کے اس عدم اطمینان کی ہوا نظامت تک بھی جا پہنچی اور فاروقی صاحب کے اس فیصلے کے خلاف ادارے کے اساتذہ کی جانب سے ایک مشترکہ مگر گناہم تحریری احتجاج وصول ہونے پر ڈپٹی ڈائریکٹر نظامت تعلیمات نے فاروقی صاحب کو اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور مذکورہ اعتراض و احتجاج ان کے علم میں لانے کے بعد بولے ”فاروقی صاحب، آپ ماشاء اللہ ایک کہنہ مشق استاد ہیں۔ اسکول ایڈمنسٹریشن میں آپ کی ایک ساکھ اور جداگانہ شناخت ہے۔ آپ کے اساتذہ کا یہ اعتراض حق بجانب لگتا ہے کہ ادارے کے پچاس سے زائد اساتذہ میں آپ کو تیس تیس، پینتیس سالہ تدریسی تجربہ رکھنے والے سینئر اساتذہ کے مقابلے پر ایک نئی اور کم تجربہ کار ٹیچر ہی بہترین ٹیچر کے اعزاز کے لیے مناسب کیوں دکھائی دی!“

”سر! اتنی نئی اور اتنی کم تجربہ کار بھی نہیں ہے وہ۔ کافی سال ہو چکے ہیں اسے میرے پاس کام کرتے۔“

”تیس پینتیس سالہ تدریسی تجربہ رکھنے والوں کے مقابلے میں اس خاتون کا تجربہ کیا اہمیت رکھتا ہے فاروقی صاحب! کم از کم آپ سے ڈائریکٹریٹ کو اس قسم کی جانبداری کی توقع نہیں تھی۔“

”سر! یہ جانب داری نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“

”میرے ادارے میں یہی ٹیچر اس نامزدگی کی اہلیت پر پوری اترتی تھی۔“

”تجربہ کی بات ہے!“ ڈپٹی ڈائریکٹر نے فاروقی صاحب کو استعجابیہ نگاہوں سے دیکھا پھر بولے ”آپ کا مطلب ہے، پچاس سے زائد کے اسٹاف میں کوئی اور ٹیچر اس اعزاز کے لیے نامزدگی کا مستحق ہی نہیں تھا۔“

”سر! اگر مِس منتہا نہ ہوتیں میرے اسکول میں تو یقیناً کسی دوسرے ٹیچر کا نام پہنچتا آپ تک۔“

”فاروقی صاحب!“ ڈپٹی صاحب نے انہیں معنی خیز نظروں سے دیکھا ”میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ بس منتہا میں آخر ایسی کیا خاص بات ہے جو آپ نے اپنے ازارے کے کہنہ مشق اساتذہ کو نظر انداز کر ڈالا۔ لگتا ہے بس منتہا سے آپ کچھ زیادہ ہی متاثر ہیں“ ڈپٹی ڈائریکٹر کے آخری جملے میں انتہائی معنی خیزی تھی۔

فاروقی صاحب ان کی نگاہوں اور نیچے کی معنی خیزی کو چنداں خاطر میں لائے بغیر اسی متانت اور تحمل سے بولے۔

”سر! میری یہ ٹیچر وقت کی انتہائی پابند ہے۔ اپنی ہر کلاس میں بروقت پہنچتی ہے۔ اسے اپنے تدریسی مضمون پر خاطر خواہ دسترس حاصل ہے۔ وہ انتہائی محنت اور لگن سے پڑھاتی ہے۔ طلباء اور ان کے والدین اس سے حد درجہ مطمئن اور متاثر ہیں۔ طالب علموں کے نزدیک وہ ایک آئیڈیل ٹیچر ہے۔ وہ بچوں کی نوٹ بکس کی چیکنگ باقاعدگی اور رزٹے داری سے کرتی ہے۔ اس کی کلاس میں کبھی بد نظمی نہیں دکھائی دیتی۔ سالانہ کھیلوں کے زمانے میں بھی جب لڑکے کلاسوں سے بھاگے رہتے ہیں، اس کے پیرڈ میں لڑکے بھاگ بھاگ کر کلاس میں پہنچتے ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ ایک ایسی ٹیچر ہے جس پر ادارہ فخر کر سکتا ہے.... شی ازارے بورن ٹیچر سر!“

”ریٹلی؟“ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب نے فاروقی صاحب کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”سر!“

”بہر حال بہترین ٹیچر کا انتخاب کرنے والی کمیٹی صرف یہی نہیں اور بھی بہت کچھ دیکھے گی۔ اس کا اپنا تعلیمی کیریئر، دورانِ تعلیم، ہم نصابی سرگرمیوں میں کارکردگی، کوئی غیر معمولی امتیاز، تعلیمی لیاقت، پیشہ ورانہ اہلیت، دورانِ ملازمت کارکردگی، تعلیمی لیاقت اور پیشہ ورانہ استعداد میں مزید اضافے کی رغبت، اسکول اور بورڈ امتحانات میں اس کے شاگردوں کے نتائج، شاگردوں کی ہم نصابی سرگرمیوں میں اس کی دلچسپی، کوئی ریسرچ ورک، کوئی تھینف، رفاہ عامہ کے کاموں میں اس کی شرکت و شمولیت، ملک و قوم کی ترقی میں کوئی حصہ، اس کی ظاہری شخصیت، اخلاقی کیفیت، خاندانی پس منظر، افسران، رفقاء، کار، طلبہ، ان کے والدین اور عوام الناس سے تعلقات غرض بہت کچھ۔“

فاروقی صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔

”بہت سخت معیار ہے سر!“

”ہونا چاہیے“ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب اٹل لہجے میں بولے ”آپ ایک ٹیچر کو اس کی کارکردگی پر ایوارڈ دینے جارہے ہیں جو قوم کا معیار ہوتا ہے۔ معیار سخت ہی ہونا چاہیے۔“

”سر، ہو سکتا ہے، میری نامزد کردہ ٹیچر آپ کے اس معیار پر پوری نہ اتر پائے لیکن ایک بات طے ہے کہ پھر بھی وہ انتہائی کمیٹی کو اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں بہتر محسوس ہوگی اور چونکہ اس کا مقابلہ صرف اپنے ہی ساتھیوں سے نہیں، ڈائریکٹر کے زیرِ انتظام تمام اداروں کے اساتذہ سے ہے اس لیے میں نے اس ایوارڈ کے لیے اپنے ادارے سے اسی کو نامزد کیا ہے۔“

”گویا آپ نام تبدیل نہیں کریں گے۔“

”سر! میں اپنے دستخط کے استعمال میں انتہائی احتیاط برتا ہوں۔ ایک سربراہ ادارہ کو کم از کم اتنا محتاط تو ہونا ہی چاہیے کہ جب وہ اپنے کسی فیصلے پر دستخط کر کے اعلیٰ افسران کی خدمت میں ارسال کرے تو اس فیصلے کو حتیٰ بھی سمجھے۔ ایوارڈ کے لیے نامزدگی ہی نہیں، میں تو چھوٹے سے چھوٹے معمولی سے معمولی معاملے کو بھی نظامت کی خدمت میں سمجھوانے سے قبل پوری احتیاط برتا ہوں۔ جو فیصلے تبدیل کیے جائیں وہ پھر فیصلے تو نہیں ہوتے ناسر!“

”اس کا مطلب ہے...“

”جی سر!“ فاروقی صاحب نے ڈپٹی ڈائریکٹر کی بات ختم ہونے سے قبل ہی کہا ”میرا مطلب وہی ہے جو آپ سمجھے ہیں۔“



”فائن!“ ڈپٹی ڈائریکٹر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا ”اپنے اسٹاف کو ان کی شکایت کے خلاف اعتماد میں لینا آپ کا کام ہے۔“

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب ان کا منہ دیکھنے لگے۔

فاروقی صاحب کے لبوں پر دھیمی سی مسکان پھیل گئی۔

”سرا! ڈائریکٹر نے نامزدگیاں طلب کرنے کے سلسلے میں سربراہان ادارہ کو جو مراسلہ ارسال کیا تھا، اس میں کہیں یہ نہیں لکھا تھا کہ سربراہ ادارہ نامزدگی ارسال کرنے سے قبل یا اس کے بعد اپنے اسٹاف کو اعتماد میں لینے کا پابند ہوگا۔“

ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب خفیف ہو گئے۔

”میں نے یہ بات اس لیے کہی فاروقی صاحب کہ آپ کا اسٹاف آپ کی ارسال کردہ نامزدگی سے نامطمئن ہے۔“

”آئی ایم سوری سر، مذکورہ مراسلے میں ایسی بھی کوئی شق نہیں تھی کہ نامزدگی دیگر اسٹاف کے اطمینان کی پابند

ہونی چاہیے۔“

”آل رائٹ، آل رائٹ، فاروقی صاحب!“

”سرا! اگر میں اس نامزدگی میں جانبداری کا مرتکب ہوا ہوں تو اپنے اس فعل کے سلسلے میں خدا کے سامنے

جوابدہی کا پابند ہوں۔“

”ٹھیک ہے فاروقی صاحب! اب ہم اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کریں گے.... دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ آپ

نے اگر جانبداری برتی بھی ہے تو کم از کم میں آئندہ فیصلے کے سلسلے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے اپنے

طور پر ایک انتہائی غیر جانب دار اور دیانت دار کمیٹی تشکیل دی ہے جو یقیناً غیر جانبداری سے کام کرے گی۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے سرا!“



مسر ظہیر نہہ کے لیے اپنے بیٹے کا پیغام لے کر آ رہی تھیں۔ می چاہتی تھیں کہ منتہا اسکول سے چھٹی کر لے تاکہ

گھر آنے والے مہمانوں کی پذیرائی کے انتظامات کیے جاسکیں مگر منتہا نے کہا ”وہ لوگ تو شام کو آئیں گے والدہ، صبح

سے چھٹی کر کے گھر بیٹھ جانے سے فائدہ؟“

”بیٹا انتظامات بھی کرنے ہیں کہ نہیں؟“

”کیسے انتظامات؟“

”ان کے لیے چائے وائے کا بندوبست!“

منتہا مسکرا دی۔ ”والدہ، چائے صرف پانچ منٹ میں بنتی ہے۔“

”بھئی خالی چائے تھوڑی ددگی۔ چائے کے ساتھ کچھ اور بھی تو دینا ہوگا۔“

”بسکٹ اور نمکو گھر میں موجود ہیں۔ فریزر میں کباب بنے رکھے ہیں۔ اسکول سے واپسی پر میں کیک یا مٹھائی لیتی

آؤں گی، بس بہت ہے۔“

”گھر بیٹھا ہے، بینک کی صفائی کرنی ہے۔“

”والدہ، سب ٹھیک ہے۔“

”میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں اور تم کہتی ہو، سب ٹھیک ہے۔“

منتہا می کے نزدیک بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر بولی ”ہاتھ پاؤں کیوں

پھولے جا رہے ہیں۔“

”اکیلی ہوں اس لیے۔“

منتہا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”ایسے موقعوں پر ایک دوا اپنے ہوتے ہیں ساتھ دوسروں کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے“ می نے سلسلہ

کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”کس نے کہہ دیا آپ اکیلی ہیں“ منتہا نے اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پر سے ہٹا کر اپنا بازو ان کے شانوں پر دراز کر دیا۔

”ہم ہیں نا آپ کے ساتھ والدہ.... میں‘ نیہہ اور ملیب!“

”تم سے کہا چھٹی کر لو اسکول سے تو تم چھٹی پر تیار نہیں۔“

”بلاوجہ چھٹی کرنے سے فائدہ.... چار کلاسوں کا ہرج ہوگا اور ہر کلاس میں کم از کم ساٹھ ستر بچے یعنی ڈھائی تین

سو بچوں کی پڑھائی کا نقصان۔“

”تمہیں تو بس اسکول سے عشق ہو گیا ہے‘ ہائے اسکول ہائے بچے!“

اسکول اور بچوں سے اس کے عشق کا می اکثر گلہ کر بیٹھتی تھیں۔

اس نے می کو بڑے پیار سے اپنی بانہوں کے حلقے میں لے لیا اور از حد محبت و عقیدت سے ان کا گال دھیرے

سے چوم کر بولی ”عشق تو مجھے آپ سے بھی ہے بلکہ میرا پہلا عشق تو آپ ہی ہیں۔“

”اور دوسرا؟“ می نے گردن موڑ کر نگاہیں ترچھی کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”دوسرا!“ وہ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی ”دوسرا نیہہ‘ ملیب‘ اسکول اور بچے!“

”ماں سے عشق کا دعویٰ اور اسکول سے ایک دن کی چھٹی نہ کرنے کو اتنی باتیں!“

”والدہ‘ آپ کی خاطر تو میں زندگی بھر کو چھٹی کر سکتی ہوں“ اس نے اپنا سر می کے شانے پر ٹکا دیا۔

”زیادہ باتیں نہ بناؤ.... صبح سویرے گھر سے نکلتی ہو تو دوپہر ڈھلے گھر واپسی ڈھیر کا پیوں کے ساتھ۔ کھانا کھایا نہیں

کہ یوشن والے بچے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ شام ڈھلنے تک ان کے ساتھ مغز کھپائی‘ رات ہوئی تو موٹی موٹی کا پیوں

پر سرخ قلم گھمانا شروع کر دیا۔ ادھر درست ادھر کاٹا، کبھی ٹیسٹ کی کا پیاں چیک ہو رہی ہیں، کبھی امتحانی پرچے، کبھی

رزٹ بنانے بیٹھ گئیں، کبھی رجسٹر میں حاضری اور فیوں کا حساب کتاب کرنے لگیں۔ صبح ہوئی پھر وہی اسکول۔ مجھے

صبح کا دوپہر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتے دیکھتے اور تمہاری واپسی کی راہ نکلتے نکلتے میری آنکھیں تھک

جاتی ہیں۔“

”کیوں کرتی ہیں انتظار۔ میں تو واپسی کا وقت ہونے پر ہی لوٹوں گی نا والدہ!“

”ہاں‘ یہ تو مجھے معلوم ہے۔“

”معلوم ہے تو پھر کیوں تھکاتی ہیں آپ اپنی آنکھوں کو؟“

”بس‘ میری بھی مجبوری ہے۔“

”کیسی مجبوری؟“ وہ می کے شانے پر سے اپنا سر اٹھاتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

”تم کیا سمجھو گی... میری طرح ماں بنو اور گھر سے باہر جانے والے بچوں کا انتظار کرنا پڑے تمہیں‘ تب سمجھ آئے

تمہیں میری مجبوری۔“

”اللہ اس وقت سے محفوظ رکھے مجھے“ وہ شگفتگی سے بولی۔

”کیوں بد فال نکالتی ہو منہ سے۔ میری تو نگاہیں لگی ہیں اس وقت پر کہ کب تم تینوں بھائی بہنوں کے بچے

کھلاؤں۔ جیسے خدا نے نیہہ کے لیے سبیل بنائی“ اللہ کرے تمہارے لیے بھی جلد کوئی آئے اور تم اپنے گھر جاؤ۔“



”واہ والدہ واہ! آپ بھی جناب عالی خوب ہیں۔ ایک طرف تو اس شدت سے انتظار کرتی ہیں میرا اور دوسری طرف گھر سے نکالنے کی باتیں۔“

”ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اولاد اس کی زندگی ہی میں ٹھکانے لگ جائے“ مئی کے لہجے میں دلسوزی تھی۔

”اوہو! اصل بات تو درمیان ہی میں رہ گئی۔“

”مہمانوں کے آنے کی؟“

”جی ہاں۔“

”ٹھیک ہے تم اسکول جاؤ۔ مجھے جو کرنا ہو گا کر لوں گی خود ہی۔“

”ناراض نہ ہوں... دیکھیں نا مئی! میں چھٹی کراؤں گی تو بہت سے بچوں کی پڑھائی متاثر ہوگی۔ گھر صاف ستھرا ہے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے کچھ چیزیں گھر میں موجود ہیں، ایک آدھ میں آتے ہوئے لے آؤں گی۔ یوشن والے بچوں کو آج میں نے مغرب کے بعد بلایا ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں، آپ بالکل اطمینان سے رہیں۔ مسز ظہیر ہمیں اور ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ کسی تکلف میں مت پڑنا، ہم لوگ صرف ایک کپ چائے پیئیں گے۔“

منتہا کے آخری فقرے کے دوران نیسہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا دوپٹا اور ہنسنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ نماز ادا کر کے آئی تھی۔

”کیوں جناب! آج ناشتے کا پروگرام نہیں ہے کیا جو صرف ایک ایک کپ چائے پینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”ہم اپنی بات نہیں کر رہے“ منتہا نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا ”شام کو آنے والے مہمانوں کی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ ان کے لیے چائے کے ساتھ کوئی اہتمام نہ کیا جائے، صرف ایک ایک کپ چائے پیئیں گے وہ لوگ۔“

”گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”دیکھا والدہ! اس نے تو ابھی سے ان کی تعریفیں شروع کر دیں۔“

”جو بات اچھی ہو! اس کی تعریف ضرور کی جانی چاہیے۔ اپنی ساتھی ڈاکٹرز سے تو میں نے خیر زیادہ نہیں سنا مگر اپنے پیرامیڈیکل اسٹاف میں ہم اکثر اس قسم کے قصے سنتے رہتے ہیں کہ اس قسم کے مہمان کتنا ایکسپلائٹ کرتے ہیں لڑکی کے گھروالوں کو۔ ایک اسٹاف نرس کے بارے میں مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ اس کی ہونے والی سسرال نے پانچ چھ سال سے منگنی کی ایک انگوٹھی پہنا کر لڑکی اور اس کے گھروالوں کو کھانے پینے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔“

”ہوتے ہیں ایسے لوگ بھی!“ مئی نے کہا۔

”بلکہ اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے قصے تو میرے اسٹاف سے سنئے، فری پیریڈز میں جب اسٹاف روم میں ہماری ٹیچرز بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں تو اکثر ایسے لالچی اور خود غرض لوگوں کے قصے سننے کو ملتے ہیں۔“

”باجی! آپ کو آج اسکول نہیں جانا ہے کیا؟“

”ہاں ہاں جانا ہے۔“

”اسکول جائے بغیر ان کا گزارہ ہو گا بھلا؟“ مئی کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”تو پھر یہ آج صبح سویرے روزانہ کی طرح بھاگ دوڑ کر اسکول جانے کی تیاری کے بجائے اس قدر اطمینان سے بیٹھی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپ سے۔“

”اٹھ رہی ہوں بھئی اٹھ رہی ہوں۔ تم والدہ کے جذبات کو مت چھیڑو“ منتہا جانے کو اٹھی۔

”کیا مطلب؟“

"مطلب یہ کہ والدہ چاہتی تھیں کہ شام کو مہمان آرہے ہیں لہذا مجھے آج اسکول سے چھٹی کر لینی چاہیے" منتہا نے کمرے کے دروازے کے رخ پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔

"کیا ضرورت ہے۔ ہماری قوم کو تو ویسے ہی چھٹی کا برا شوق ہے۔" می نے ٹیڑھی نگاہ سے نیہہ کو دیکھا اور بولیں "تم بھلا اس کی بہن ہونے کا ثبوت کیوں نہ دو گی؟" نیہہ نے چونک کر می کو دیکھا۔

"وہ تو پہلے ہی اسکول کے عشق اور شاگردوں کی محبت میں چھٹی نہیں کرنا چاہتی، اب تم اور ہوا دوا سے جو وہ عین تمہاری شادی والے دن بھی اسکول جانے کے لیے تیار ہو۔" "ارے والدہ، میں تو خود اپنی شادی کے دن بھی اسکول جاؤں گی" منتہا نے جو کمرے سے باہر جانے کے لیے دروازے تک پہنچ چکی تھی، رک کر گردن موڑتے ہوئے مسکرا کر می کو دیکھا۔ می نے اسے مستاً آمیز نگاہ سے گھورا۔

"زندہ باد!" نیہہ نے بے ساختہ کہا "یہ ہونا ایک چھٹی پرست قوم کی ترقی پسند اسکول ٹیچر کا انقلابی نظریہ کہ آدمی خود اپنی شادی والے دن بھی ڈیوٹی پر جائے۔"

دفعۃً نیہہ کی نگاہیں می کی جانب اٹھیں۔ وہ اسی کو گھور رہی تھیں۔ اس نے نگاہیں چڑالیں اور یوں انجان بن گئی جیسے اس نے انہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ پھر منتہا کی جانب دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے بولی "اب تو اپنی شادی والے دن میں بھی ڈیوٹی پر جاؤں گی۔"

"شرم کرو" می نے دونوں کو آنکھیں دکھائیں۔

منتہا جاتے جاتے پلٹ آئی۔

نیہہ می کی طرف بڑھی۔

دونوں نے می کو دائیں بائیں سے اپنی بانہوں کے حلقوں میں لے لیا اور انہیں چٹا چٹ پیار کرنے لگیں۔

"بس کرو، بس کرو" می کا خود کو ان سے چھڑانا محال ہو گیا۔

○●○

شام کو مسز ظہیر اور ان کے اہل خانہ کا استقبال کرتے ہوئے منتہا کو یوں لگا جیسے برسوں بعد کسی خوشی نے گھر کے دروازے پر دستک دی تھی۔ مسز ظہیر کے ساتھ ظہیر صاحب اور ان کی چھوٹی بیٹی لیلیٰ بھی آئی تھیں۔ ان تینوں کے استقبال کو می کے ساتھ منتہا ہی نہیں، ملیب بھی موجود تھا۔ مسز ظہیر کے ساتھ ظہیر صاحب کے بھی آنے کی اطلاع کے باعث می نے ملیب کو بھی جلدی چھٹی کر کے گھر آنے کا پابند کر دیا تھا سو وہ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی گھر پر موجود تھا۔ مہمانوں نے وقت کی ایسی پابندی رکھائی کہ پانچ بجے کما تھا تو ٹھیک پانچ بجے ہی وہ گھر کی دہلیز پر موجود تھے۔ "معاف کیجئے گا فارحہ بہن، ہمیں وقت کی پابندی کی بڑی عادت پڑی ہوئی ہے" مسز ظہیر نے می سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"ارے، یہ تو بہت اچھی عادت ہے، آپ اسے بڑا کیوں کہہ رہی ہیں؟"

"اصل میں ہمارے ہاں تو پابندی وقت کرنے والوں کو اتنا بے وقوف سمجھا جاتا ہے کہ لوگ اپنی ڈیوٹی پر بھی بروقت نہیں پہنچتے اور ہم بد قسمتی سے ایسے ہی بے وقوفوں میں شامل ہیں۔ اسکول کی نوکری نے اس عادت کو اور بھی بگاڑ دیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم کسی باعث اسکول سے چھٹی پڑن ہوں اور اسمبلی نیل کے وقت اسکول میں موجود نہ پائے گئے ہوں۔"

"منتہا کا بھی یہی حال ہے بلکہ میرے تینوں ہی بچوں کا" می نے کہا۔



”اسی لیے.... اسی لیے تو ہم بہت خوش ہو کر اس گھر میں داخل ہوئے ہیں کہ کم از کم یہاں ہمیں بے وقوف نہیں گردانا جائے گا۔“

”آئی امی کا یہ حال ہے کہ ہم بہن بھائیوں نے ایک لطیفہ گھر رکھا ہے کہ ایک روز ہماری امی خاندان کی ایک شادی میں شرکت کے لیے شہر کے ایک میرج ہال پہنچیں تو ہال کے چوکیدار نے کھٹکھٹا ہٹ پر مین گیٹ کھولا اور پوچھا۔ ”کئے آپ کون؟“ ہماری امی نے کہا ”آج اس ہال میں جو شادی ہو رہی ہے، ہم اس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔“ چوکیدار نے لمبی جمالی لی اور بولا ”ابھی سے کہاں بیگم صاحبہ، ابھی تو ہم کچھلی رات والے مہمانوں سے فارغ ہو کر سنا رہے ہیں، آپ کل آئیے گا۔“ لیلیٰ نے مسکرا مسکرا کر بتایا۔

”بھئی تم لوگ ایک نہیں دس لطیفے گھر لو، ہمیں جو عادت پڑی ہے، سو ہے“ مسز ظہیر نے لیلیٰ کو متنبہ کرتے ہوئے دیکھا پھر ممی کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں ”ہماری اس عادت کی وجہ سے ہمارے بچوں کو اکثر تقریبات میں طویل انتظار کی کوفت بھگتنا پڑتی ہے لیکن ہم ان سے کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں، آج نہیں تو کل ہماری قوم کے لوگوں کو پابندی وقت کی اہمیت کا احساس ہو ہی ہو جائے گا۔ الحمد للہ یہ قوم مسلمان ہے اور پابندی وقت ہمارے دین کی بنیادی تربیت ہے۔ انشاء اللہ العزیز ایک دن ہم پاکستانی مسلمان اپنی نمازوں کے اوقات کی طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی پابندی وقت کی عادت اپنائیں گے۔“

”استاد ہونے کا بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی موقع پاتے ہی معلیٰ شروع کر دیتا۔“ ظہیر صاحب بڑی حلیمی سے بولے۔

مسز ظہیر نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

”بیگم صاحبہ پابندی اوقات کے ساتھ وقت کی بچت بھی ایک مفید اور شاندار عادت ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنے میزبانوں کا وقت ضائع کرنے کے بجائے جلد از جلد اپنے مدعا پر آنے کی کوشش کریں۔“ ظہیر صاحب کے انداز گفتگو اور الفاظ کے چناؤ پر ممی کو ایک غیر متوقع حیرت ہوئی۔ قبل ازیں انہوں نے ظہیر صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا البتہ منہا کی زبانی وہ کئی برسوں سے ان کا ذکر سنتی چلی آئی تھیں۔ مسز ظہیر سے منہا کی دوستی کے بعد کئی سال تک ممی، ظہیر صاحب کے بارے میں اس کی زبانی یہی سنتی رہی تھیں کہ وہ کچھ ذہنی مریض تھے، بے روزگار بھی تھے پھر اسی کی زبانی انہوں نے سنا تھا کہ ظہیر صاحب علاج معالجے اور مسز ظہیر کی مسلسل توجہ سے صحت یاب ہو گئے تھے اور انہوں نے برس ہا برس بعد دوبارہ کوئی نوکری کر لی تھی مگر ان تذکروں کے نتیجے میں ان کے تصور نے ظہیر صاحب کی جو تصویر کھینچی تھی، وہ اس تصویر سے بہت مختلف تھی جو وہ آج دیکھ رہی تھیں۔ ان کے تصور میں کھینچی تصویر تو ایک مجبوط الحواس اور پریشان حال شخص کی تھی، اصل ظہیر صاحب تو مہذب، خوش پوش اور خوش بیان تھے۔

”آپ اطمینان رکھیے، ہم ان کا زیادہ وقت نہیں لیں گے“ مسز ظہیر نے ظہیر صاحب کی بات کے جواب میں کہا اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے ممی کی جانب توجہ کی۔

”شرمندہ نہ کیجئے، آپ کے آنے سے تو بہت خوشی ہوئی ہے، ہم لوگوں کو“ ممی بولیں۔

مسز ظہیر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا ”ہم کوئی تمہید نہیں باندھیں گے فارح بہن، ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے جتنا ہم آپ لوگوں کو جانتے ہیں۔ آپ ہمارے خاندان، ہمارے کنبے، ہمارے بیٹے کے سلسلے میں جہاں، جس کسی سے اور جس طرح کی بھی معلومات کروانا چاہتی ہوں بلا تکلف کروائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں بلکہ ہمیں یہ اطمینان ہوگا کہ آپ نے آنکھ بند کر کے بٹی کسی کے حوالے کرنے کی غلطی نہیں کی۔ ہم خود بھی بیٹیوں والے ہیں۔ بیٹیاں بہت نازک، بڑی پیاری تخلیق ہیں اللہ کی انہیں محفوظ ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔“

ممی کا جی بھر آیا۔  
 قسمت کا کچھ پتا ہوتا ہے۔ اُن کے اپنے والدین نے بھی تو انہیں محفوظ ہاتھوں ہی میں دیا تھا بلکہ اپنے  
 حسابوں انتہائی غیر معمولی محفوظ ہاتھوں میں۔ ڈاکٹر نجیب احمد بلحاظ عمر اُن سے چند سال بڑے تھے۔ وہ پری پیکر تھیں،  
 نجیب احمد انتہائی بد مروت۔ پہلے حور میں لنگور والی مثل صادق آتی تھی ان کے جوڑ پر۔ گوان کے بے جوڑ سنجوگ پر  
 لوگوں نے چار دن بھی اس گاڑی کے نہ چلنے کے دعوے خم ٹھونک ٹھونک کر کیے تھے۔ کون لڑکی اور وہ بھی ایسی جس  
 کے طلب گاروں کی اپنوں پر ایوں میں کمی نہ رہی ہو ایسے بد مروت اور اپنے سے کہیں بڑی عمر کے مرد کے ساتھ زندگی  
 گزار سکتی تھی مگر کوئی گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ وہ پری پیکر نہیں بلکہ وہ بد مروت مرد بے وفائی کر جائے گا لیکن ایسا ہو گیا تھا۔  
 انہونی ہو چکی تھی!

”آپ ٹھیک کہتی ہیں“ ممی نے ایک گھٹی گھٹی سرد آہ کھینچی ”میری بچیوں کے سر پر تو آپ جانتی ہیں کہ میرے بوا  
 بڑا کوئی بھی نہیں۔ اللہ رکھے بھائی ہے مگر ابھی اتنا بڑبار تو نہیں کہ اتنے بڑے فیصلے اکیلا کر سکے۔ مجھے تو اللہ پر توکل  
 کر کے ہی بچیوں کے لیے فیصلے کرنے پڑیں گے۔“

مسز ظہیر نے ممی کا ہاتھ دھیرے سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولیں ”جس نے اللہ پر توکل کر لیا اسے اللہ میاں  
 کبھی مایوس نہیں کرتے۔ انسانوں کی حقیقت اور اصلیت تو ان سے واسطہ پڑنے پر ہی کھلتی ہے۔ ہم اس وقت آپ  
 سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہم کسی کی بیٹی کو اپنے گھر میں چین سے نہیں رکھیں گے تو ہماری بیٹیاں  
 دوسرے گھروں میں کیونکر سکون سے رہ پائیں گی؟“

ظہیر صاحب بڑے انہماک سے طلب سے باتیں کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔  
 ”ایکسی کیوزی! مسز ظہیر! میں لیلیٰ کو نیہہ کے پاس لے جاؤں؟“ منتہا نے پوچھا۔  
 ”ارے بھئی! آپ نیہہ کو ہی یہاں کیوں نہیں لے آئیں۔ ہم سب انہی کے لیے تو آئے ہیں“ مسز ظہیر بولیں۔  
 منتہا نے اجازت طلب نگاہوں سے ممی کو دیکھا۔  
 ممی کچھ متردد سی دکھائی دیں۔

”ہمیں آپ روایتوں سے ماورا کر دیجئے فارحہ بہن!“ مسز ظہیر ممی کو متردد دیکھ کر بولیں ”ماشاء اللہ آپ کا گھرانہ  
 بھی پڑھا لکھا ہے اور ہم بھی قدامت پرست نہیں۔ یہ حق صرف لڑکے اور اس کے گھر والوں ہی کو کیوں کہ وہ لڑکی کو  
 دیکھیں۔ لڑکی کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو جانچے جو اسے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔“  
 ممی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منتہا کو اجازت دی۔  
 ”منتہا بی بی! چائے بھی پلوائیے“ ظہیر صاحب بے تکلفی سے بولے۔

”جی ضرور!“  
 ”مگر چائے کی ٹرے نیہہ نہیں لے کر آئیں گی“ مسز ظہیر نے کہا پھر وہ ممی کی جانب دیکھ کر بولیں ”ہمیں لڑکی کا  
 لڑکے والوں کے سامنے چائے کی ٹرے لے کر آنا سخت ناپسند ہے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی گھبرا شرمنا رہی ہوتی ہے۔ ہاتھ  
 پاؤں اس کے پھولے جاتے ہیں اس پر طرہ چائے کے برتنوں سے لدی پھندی ٹرے اور ہاں! ایک بات اور سنو  
 منتہا۔“

منتہا جو دروازے تک پہنچ چکی تھی رک گئی۔

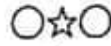
”صرف چائے۔“

”کیوں مسز ظہیر!“

”ہم نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا، ہماری خوشی اسی میں ہے کہ بس ایک ایک کپ چائے مل جائے، ظلوں



اور محبت کی مٹھاس کے ساتھ۔“  
 ”یہ نہیں ہو سکتا“ منتہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”کیونکہ اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہوئے میں صرف آپ کی خاطر آپ کی پسند کا کیک لینے کے لیے بطور خاص یونیک بیکرز گئی تھی۔ آپ نے اگر کیک نہ کھایا تو میں تو دیوالیہ ہو جاؤں گی۔“  
 ظہیر صاحب بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس دیے۔  
 مسز ظہیر مسکرا دیں۔  
 ”اچھا بھی، لے آئے کیک بھی۔“  
 ”تھینک یو!“  
 ”آپ کی منتہا جیسی بیٹی خدا سب کو دے“ منتہا کے جانے کے بعد مسز ظہیر می سے بولیں۔  
 ”آمین!“



تیسرا پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی ابھی کچھ ہی دیر پہلے بجی تھی۔ منتہا کا چوتھا پیریڈ فری تھا۔ پچھلا پیریڈ دہم ج میں لینے کے بعد اسٹاف روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے اسکول کے معمر نائب قاصد اور اپنے اخلاقی اوصاف کے باعث پرنسپل صاحب کے خاص الخاص غیر تدریسی ملازم گل زرین کو ایک سوئڈ بوٹڈ شخص سے باتیں کرتے دیکھا۔ مذکورہ شخص ایسے رخ پر کھڑا تھا کہ وہ اس کا چہرہ دیکھنے سے قاصر رہی۔ ملاقاتیوں کو پرنسپل صاحب کے دفتر کے آس پاس یا راہداریوں میں کھڑے دیکھ کر خواتین اساتذہ عموماً محتاط روی سے گزر جانے کی عادی تھیں سو اس نے بھی گل زرین اور اس سے مجھ گفتگو شخص کے نزدیک سے قدرے محتاط روی سے گزرنے کی کوشش کی لیکن بابا گل زرین کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

”مس جی!“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”جی بابا، آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ اس نے گل زرین سے بات کرنے والے شخص کو ایک نظر دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

مگر وہ اس حد تک نظر انداز کیے جانے کے باوجود اس کے روبرو آکھڑا ہوا اور منتہا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب دیکھنا پڑا۔

سنہری گمانی میں جکڑے شفاف آبی شیشوں کے پیچھے دو مانوس سی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں میڈم!“ وہ اپنے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں اڑسے کھڑا تھا۔

”آصف اُدھی!“

وہ اچھل ہی تو پڑا اور بے ساختہ ہنسا۔

”آئی کانٹ لی لیواٹ میم!“ اس نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا ”آپ نے تو مجھے میرے پورے نام کے ساتھ یاد رکھا ہوا ہے حالانکہ میرے اکثر پرانے ساتھی بھی جب کبھی ملتے ہیں تو آصف تو انہیں یاد آجاتا ہے مگر اُدھی کو وہ

مشکل ہی سے یاد کراتے ہیں مگر آپ نے میرے نام کے اس مشکل حصے کو بھی یاد رکھا!“

”اُدھی کو میں کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟“

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

”گاؤ گریش! یہ آپ نے کیا یاد دلایا میم.... اوہ یس! مجھے اب بھی یاد ہے کہ مجھے میری کلاس کے اکثر لڑکے مذاقاً اُدھی کے بجائے اُدھی کہا کرتے تھے۔“

”کیونکہ تم تھے جو اُدھی“ منہا مسکرائی۔

”یس یس آئی ایڈ مٹ میم! مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں واقعی بہت شرارتی اور موقع پاتے ہی کلاس میں اُدھم مچا دینے والا لڑکا ہوا کرتا تھا اور اسی لیے میرے ساتھی مجھے اُدھی کہا کرتے تھے۔“

اس ادارے میں منہا کو اس کی ملازمت کے دوسرے برس جب پرنسپل صاحب نے اسے لوئرڈل کلاسوں سے ہائی کلاسوں کی مدرس پر مامور کرنے کا غیر معمولی فیصلہ کیا تو ان دنوں آصف اُدھی نویں جماعت کا طالب علم ہوا کرتا تھا۔ جینٹل مگر بلا کا شرارتی اور اُدھم باز۔ تمام لُچر زاس کی شرارتوں سے اس قدر عاجز رہا کرتے تھے کہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے جو اکثر بد تمیزی اور گستاخی کی حدوں کو بھی جا پہنچتی تھیں، اس کی غیر معمولی ذہانت کی بھی کوئی قدر نہ رہی تھی۔ منہا کو یاد تھا کہ پہلے دن جب وہ اس کی کلاس میں گئی تو اس نے ہر دو منٹ بعد اپنی سیٹ سے اٹھ کر مضمون اور موضوع سے متعلق پے درپے سوالات کر کر کے اسے زچ کر دینے کی بھرپور کوشش کی تھی اور بہت دنوں بعد ایک بار اس سے کہا تھا ”میڈم! جب ہماری کلاس نے سنا کہ نفیس صاحب کی ریٹائرمنٹ ڈیو ہو جانے کی وجہ سے اب آپ ہمیں پڑھایا کریں گی تو سارے لڑکوں نے یہ میم مجھے سوچی کہ سرنفیس کی جگہ پر آنے والی نئی لُچر کو اتنا تنگ کیا جائے کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر ہماری کلاس چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ میں نے پوری کوشش کی میڈم مگر آپ نے ہمیں اتنی محبت اور محنت سے پڑھایا اور میری بد تمیزیوں کے مقابلے میں اس قدر حیرت انگیز صبر و تحمل سے کام لیا کہ ہم سرنفیس جیسے اچھے لُچر کو بھی بھول گئے۔ یوور مار ویس میم!“

اس کے اس اعترافِ جرم و شکست کے بعد منہا اور اس کے درمیان محبت اور ادب و احترام کا ایسا رشتہ استوار ہوا تھا کہ ایک روز اس کی والدہ منہا سے ملنے آپہنچیں۔ درمیانی عمر کی ایک خوبو، خوش اطوار اور انتہائی جامہ زیب خاتون۔

”بس! مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آصف اکثر آپ کا ذکر کرتا ہے۔ آپ سے بہت متاثر ہے وہ۔ آپ کی شخصیت سے بھی اور آپ کے پڑھانے کے انداز سے بھی۔“

”آپ کا بیٹا خود بہت اچھا ہے.... بہت انٹیلی جنٹ!“

”جی، مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت ذہین ہے۔ ذہین تو وہ ہمیشہ سے ہے بس مگر اس کی ذہانت بے لگام تھی، آپ نے اسے لگام دی۔ اسے یہ احساس دلایا کہ ایک ذہین طالب علم ہونا اور ایک باتمیز اور مہذب طالب علم ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ اچھا طالب علم وہی ہے جو ذہین ہونے کے ساتھ تمیز دار بھی ہو۔ آپ یقین کیجئے، اس کی شرارتوں اور بد تمیزیوں کی شکایت کے خوف سے میں اس وقت بھی اسکول آنے سے ہچکچایا کرتی تھی جب میرا یہاں آنا ضروری ہوتا تھا کیونکہ میں اس کے جس لُچر سے بھی ملتی تھی، مجھے ڈھکے چھپے یا واشگاف الفاظ میں یہی سننے کو ملتا کہ ہم والدین اس کی تربیت صحیح نہیں کر پائے ہیں۔ مگر جب سے آپ اس کی کلاس میں آئی ہیں اس میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ گھر میں اکثر آپ کا ذکر کرتا ہے اور آپ کو ایک آئیڈل لُچر کہتا ہے۔“

میزنک پاس کرنے کے بعد وہ گئی جنی مرتبہ ہی اسکول آیا اور جب بھی آیا کسی کام ہی سے آیا۔ کبھی اپنی مارکس شیٹ لینے کے لیے کبھی پراویژنل سرٹیفکیٹ لینے اور بہت بعد میں ایک بار تعلیمی بورڈ سے موصولہ اپنی سند لینے کے لیے پھر جیسے وہ اسکول کا راستہ بھول ہی گیا۔ اب کئی سال بعد اچانک اسے دیکھ کر منہا نے پوچھا۔

”کہاں ہوتے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟“

”ہمیں ہوتا ہوں میم! کمپیوٹر انجینئرنگ کی ہے، ایک ملٹی نیشنل میں کام کر رہا ہوں۔“



”گڈ!“

”میم“ یہ سب آپ کی مہربانی ہے ”وہ بڑی انکساری سے بولا۔  
”نہیں نہیں“ یہ تمہاری اپنی محنت کا صلہ ہے۔“

”میڈم“ محنتی طالب علم تو میں اسکول کے زمانے میں بھی تھا۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ ادھر ادھر سے بھی بہت کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ مطالعے کی اس عادت کی وجہ سے میری عام معلومات اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ تھیں اور جب ٹیچرز پڑھاتے تو میرے ذہن میں سوالات اور ہم مچانے لگتے تھے لیکن جب میں ٹیچرز سے کلاس میں کوئی بات پوچھنے کی کوشش کرتا تو اکثر ٹیچرز میری بات سننے سے پہلے ہی مجھے عموماً گھڑک کر بٹھا دیا کرتے تھے جس پر میں جھنجھلا کر الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا اور ٹیچرز مجھے بدتمیز، بے ادب اور گستاخ گردانتے۔ اسکول میں میری شہرت ہی ایک اچھے طالب علم کے بجائے ایک بدتمیز اور بے ادب طالب علم کے طور پر تھی۔ آپ پہلی ٹیچر تھیں اس اسکول میں جنہوں نے ہمیشہ میری بات کو توجہ سے سننے اور اس کا جواب دے کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شاید اسی لیے میں نے جتنا فائدہ آپ سے اٹھایا، جتنا کچھ آپ سے سیکھا، اسکول کے کسی اور ٹیچر سے نہیں سیکھا اور اسی لیے ... اسی لیے میم، میں آپ کو کبھی نہیں بھول سکا اور نہ بھول سکتا ہوں۔ حالانکہ میری سوال پر سوال داغنے کی عادت سے اکثر میرے والدین تک زچ ہو جایا کرتے تھے لیکن آپ ... ”اس نے انتہائی نیازمندانہ انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منہا کے سامنے سر جھکا دیا پھر اچانک سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا ”پتا ہے کیا میم“ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ میرے دماغ میں کسی شیطان کا بسیرا ہے جو مجھے اٹلے سیدھے سوالوں پر اکساتا رہتا ہے۔“

”تم جیسے سینٹس بچوں کی یہی پرابلم ہوتی ہے۔“  
”جینٹل! وہ نو میم ....! میں تو ایک عام سا اسٹوڈنٹ تھا بس آپ جیسے ٹیچرز نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔“  
”اتنی بھی کسر نفسی مت دکھاؤ آصف!“

”نو نو میم! کسر نفسی نہیں“ اسکول سے جانے کے بعد کالج اور پھر انجینئرنگ یونیورسٹی میں آپ کی پڑھائی ہوئی میتھمیٹکس نے مجھے کمال کی مضبوط بنیاد فراہم کی۔ وہ میم، آپ نے ہمارا کورس جیسے ہماری فنگر ٹپس پر ریکارڈ کر دیا تھا۔ اسی ڈسک نے مجھے کمپیوٹر انجینئر بننے میں مدد دی۔“

”اتنی مبالغہ آرائی مت کرو“ منہا نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اسے مشفقانہ نگاہوں سے گھورا۔  
”آپ یقین کریں یا نہ کریں یہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔“

”آل رائٹ .... اپنے باقی ہم جماعتوں کے بارے میں تمہیں کس کس کی خبر ہے؟“  
”ہوں“ وہ دھیرے سے مسکرایا اور اپنے ان ساتھیوں کی خبر خیر سے دینے لگا جن سے وہ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی رابطے میں رہا تھا۔ ان میں سے بعض کے بارے میں منہا کو پہلے ہی خبر تھی۔ اپنے جن ساتھیوں کے بارے میں وہ لا علم تھا، منہا نے اسے ان کے بارے میں بتایا تو وہ حیران ہو کر بولا ”میم“ آپ کو یہ سب کچھ کیسے پتا چلتا ہے؟“  
”اکثر بچے خود ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اور بعض اوروں کی خبر خیر دے جاتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے میں ہی نالائق ہوں جو اتنے عرصے بعد آیا؟“  
”بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“

”اور میں حیران ہوں کہ آپ نے مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگائی حالانکہ لوگوں کا خیال ہے اور میرا اپنا بھی کہ میں بہت بدل گیا ہوں۔ میرا مطلب ہے جیسے بعض بچے بڑے ہو کر بھی شکل و صورت کے اعتبار سے زیادہ نہیں تبدیل ہوتے، میں اپنے اسکول کے زمانے کے مقابلے میں بہت تبدیل ہو گیا ہوں۔“  
”زمین آسمان کا بھی فرق آجائے تو ماں باپ اپنی اولاد کو اور استاد اپنے شاگرد کو اس کی صورت سے نہیں“ اس کی

خوشبو سے پہچان لیتے ہیں۔"

"بست اچھی بات کی ہے آپ نے!" وہ پھرک کر بولا پھر اس نے مزید کہا "میم" آپ اپنی ایسی ہی باتوں کی وجہ سے بھی نہیں بھٹلائی جاسکیں۔ مجھے یاد ہے، کلاس میں آنے کے بعد پڑھائی شروع کرنے سے قبل اور کبھی کبھی پڑھائی میں مختصر سا وقفہ کر کے آپ ہم لوگوں سے کوئی ایسی بات کہہ دیتی تھیں جو یاد رکھنے کے قابل ہوتی اور ہماری اخلاقی تربیت بھی کرتی۔ مجھے یاد ہے، اسکول کی تمام جماعتیں عید ملن کی تیاری کر رہی تھیں مگر آپ نے اس تقریب سے ایک روز پہلے بھی معمول کے مطابق انتہائی پابندی سے ہمارا پیڑ لیا۔ ہمیں نیا کام کروایا اور پڑھائی کے دوران منٹ بھر کا وقفہ کر کے ہم سے کہا، کل آپ کی عید ملن پارٹی ہے۔ خلیل جبران ایک بہت بڑا دانشور گزرا ہے، اس کا ایک مقولہ ہے کہ میں انسانوں کو کھاتے پیٹے دیکھتا ہوں اور سمجھ جاتا ہوں کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ آپ نے ہم سب سے کہا عید ملن کے دوران خلیل جبران کی اس بات کو یاد رکھتے ہوئے کھانے پینے کے دوران تمیز کا مظاہرہ کیجئے گا۔ میم، اس دن کے بعد سے آج تک یہ حال ہے کہ گھر بویا باہر میں کھاتے پیٹے وقت ممکنہ حد تک محتاط رہنے اور بدتمیزی سے کھانے پینے سے گریز کرنے کی کوشش کرتا ہوں حالانکہ... "اس نے مل بھر کو توقف کیا اور کچھ خفت سے بولا "اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ کسی تقریب میں چکن بروسٹ دیکھ کر تو جیسے مجھے گڑا بادشاہ سے اپنی پرانی دشمنی یاد آجایا کرتی تھی۔"

منشا ہنس دی۔

"ویسے میم، ایک بات بتائیں، آپ اتنی اچھی باتیں کرتی تھیں کبھی شاعری بھی کی آپ نے؟"

منشا مسکرا دی۔ "کبھی فرصت ملی تو ضرور کروں گی۔"

"آئی ایم سوری میڈم! آپ میری وجہ سے اتنی دیر سے کھڑی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"اور میں کتنا نالائق ہوں کہ میں نے آپ کا اتنا وقت لے لیا اور یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ کا پیڑ تو نہیں؟"

"اگر ہوتا تو میں علیک سلیک کر کے چلی جاتی۔"

"مگر میں آپ کے فری پیڑ کے انتظار میں کھڑا رہتا کیونکہ میں بالخصوص آپ ہی سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔"

"تھینک یو، مگر باقی پچرز سے بھی ضرور ملنا۔"

"میم، بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اتنا وقت دیا۔"

"پرانے بچے آتے ہیں تو مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔"

"ایک بات پوچھ سکتا ہوں میڈم؟"

"ہوں۔"

"آپ کی شادی ہوئی؟"

منشا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ اس کے نہ جانے کتنے شاگرد ڈاکٹرز اور انجینئرز بن چکے تھے۔ کتنے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں میں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں پوری کر رہے تھے۔ ایک دو نہیں، بیسیوں انواج پاکستان میں شمولیت اختیار کر چکے تھے، ان میں سے بہت سے اسکول چھوڑے کئی برس گزر جانے کے باوجود بڑی محبت اور عقیدت سے اپنا تعلق برقرار رکھے ہوئے تھے۔ وہ اکثر اس سے ملنے کے لیے اسکول آتے بلکہ کبھی کبھار تو ایک دوسرے سے پوچھتے پوچھتے اس کے گھر بھی پہنچ جاتے۔ ایک سے کئی کا احوال معلوم ہو جاتا۔ اسکول بھر کے اساتذہ میں وہ واحد تھی جس سے اس کے شاگرد اتنی زیادہ وابستگی رکھتے تھے اور اکثر اپنی نہایت ذاتی باتیں بھی اس سے کر جاتے مگر اس قربت کے باوجود آج تک اس کے کسی پرانے سے پرانے طالب علم نے بھی اس سے اس قدر ذاتی نوعیت کا استفسار پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔



آصف اُدھی کے براہ راست ذاتی سوال نے اسے چند لمحوں کو انتہائی محبوب کر دیا مگر وہ اپنی اس کیفیت کو اس پر نہ ظاہر ہونے دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ تمہیں اچانک میری شادی کا خیال کیوں آگیا؟“

”بس ایسے ہی میم!“ وہ کچھ محبوب سا ہو گیا۔

”شادی فل ٹائم جاب ہے اور.... میں آل ریڈی ایک جاب کر رہی ہوں.... آئی او ٹیچنگ۔ شادی کر کے میں اپنی اس جاب کو نہیں کھونا چاہتی جو مجھے تسکین بخش بھی لگتی ہے اور مسرت بخش بھی۔“

”میڈم! آخر اور بہت سی خواتین بھی تو ہیں جو شادی کے بعد ٹیچنگ بھی کر رہی ہیں۔“

”اچھا چھوڑو، آؤ باقی ٹیچرز سے بھی ملو تاکہ میری طرح انہیں بھی خوش ہونے کا موقع ملے۔ تم پرانے بچے ہم سے ملنے کے لیے آتے ہو تو ہمیں تازہ دم کر دیتے ہو.... کم آن!“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔



بُرے دنوں کی ساتھی ہونے کی وجہ سے منتہا اور ممی کے دل میں مسز ظہیر کی قدر پہلے ہی موجود تھی۔ اب جو نیہہ کے لیے ان کے بیٹے کے رشتے کا سلسلہ چلا تو انہوں نے ایسی رواداری اور اپنائیت دکھائی کہ ممی نے اپنی عنان فیصلہ بھی انہی کو سونپ دی۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوتے چلے گئے۔ مسز ظہیر نے کسی بھی مرحلے پر اور کسی بھی معاملے میں اپنا پلڑا بھاری رکھنے اور ان کا استحصال کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دو دن قبل جمعہ کی شام تاریخ شادی بھی طے ہو گئی تھی۔ ہفتے کو یوم اقبال کی چھٹی تھی۔ پیر کی صبح منتہا اسکول گئی تو دو کلو مٹھائی کا ڈبا بھی جو اس نے گزشتہ شام علیب سے منگو کر رکھ لیا تھا، اسکول لے گئی۔ وقفے کے دوران آیا جی نے چائے کے ساتھ مٹھائی بھی زنانہ اور مردانہ دونوں اسٹاف رومز میں فردا فردا سب کو اس پیغام کے ساتھ پہنچائی کہ یہ مس منتہا کی بہن کی شادی طے پا جانے کی خوشی میں کھلائی جانے والی مٹھائی ہے۔ غیر مدرسی ملازمین بھی اس خوشی میں شریک کیے گئے۔

مٹھائی کھانے والوں نے فردا فردا منتہا کو مبارک باد دی۔ بعض نے مبارک باد کے ساتھ اس قسم کے جملے بھی کہے۔

”مس منتہا، آپ کی باری کب آرہی ہے؟“

”اللہ کرے، آپ کی مٹھائی بھی جلد کھانے کو ملے۔“

”بھئی ہم تو آپ کے لیے بھی دعا گو ہیں۔“

فضہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا ”آئی ایم سو ہسپی منتہا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کے گھر بیٹے دیکھنا بھی عجیب طرح کی مسرت ہوتی ہے۔ یقین کرو، میری طلاق کے بعد جب میری بہنوں کے لیے رشتوں میں کچھ دیر سی ہونے لگی تھی تو میں ان دنوں اتنی پریشان رہا کرتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ تمہاری پہلے ہو جاتی تو اچھا تھا یا کم از کم دونوں بہنوں کی ایک ساتھ ہی مگر تم بے ایمانی کر گئیں، ممی کو بتایا تک نہیں کہ مسز ظہیر کے خاندان سے تمہارے اپنے لیے بھی تھا ایک پروپوزل!“

”ممی کو پتا چل جاتا تو وہ تو میری جان کو آجاتیں۔“

”میں بتا دوں اب؟“ فضہ سرگوشی میں بولی۔

”فار گاڈ سیک فضہ!“ منتہا نے چونک کر اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

”ارے بھئی، مذاق کر رہی ہوں“ فضہ مسکرائی پھر بولی ”ہم دوستوں کے اعتماد کو دھوکا دینے والوں میں سے نہیں۔“

”تھینک یو!“  
 ”اچھا سنو، شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں میری جہاں بھی ضرورت ہو تمہیں، تکلف نہ کرنا۔ شاپنگ کے لیے جب بھی جانا ہو، میری صابن دانی حاضر ہے۔“  
 فضا نے اپنے اور بچوں کے استعمال کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ چھوٹی گاڑی خرید لی تھی جسے وہ ازراہِ تفتن صابن دانی کہا کرتی تھی۔

”تھینک یو دیری مچ فضا!“  
 وقفے کے بعد پانچواں پیریڈ ختم ہونے پر مسز صفیہ وقار اسٹاف روم میں آئیں تو منتہا اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی کاپیوں کی پڑتال میں مصروف تھی۔ پیر کے دن وقفے کے بعد اس کے دو لگا تار پیریڈ زفری ہوتے تھے۔ میز پر رکھے مٹھائی کے ڈبے میں ایک چم چم باقی بچی ہوئی تھی۔ مسز صفیہ وقار نے چم چم اٹھائی اور اسے کتر کتر کر کھاتی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی منتہا تک آپہنچیں۔ چم چم کا آخری ٹکڑا منہ میں رکھ کر انگلیاں چاٹتے ہوئے وہ فضا کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور انہوں نے کہا ”مس منتہا، آپ کی بہن کی بات سنی ہوئی ہے، بہت خوش ہوئی۔“  
 ”تھینک یو مسز وقار!“ منتہا نے اپنا کام روک دیا۔  
 ”بٹ آئی ٹیل سوری فار یو!“ وہ دھیرے سے بولیں۔  
 ”فار وہاٹ؟“ منتہا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔  
 ”آپ کو افسوس تو ہوا ہو گا؟“ انہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔  
 ”افسوس! کس بات کا؟“

صفیہ وقار نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”جب میری چھوٹی بہن کی منگنی ہوئی تو میں چھ ماہ تک اس صدمے میں بستر پر پڑی رہی کہ میں اس سے بڑی ہو کر کیوں بیٹھی رہ گئی ہوں۔ میری حالت دیکھ کر امی بے چاری کڑھتی رہتی تھیں۔ بہن کا دکھ بٹانے کو وقار کی امی نے، جو میری خالہ بھی ہوتی ہیں، میرے لیے اپنے بیٹے کا پیغام دیا تب کہیں جا کر میں بستر سے اٹھ پائی۔“  
 منتہا منگنی باندھے صفیہ وقار کا چہرہ دکھ گئی۔  
 انسانی سوچ اور رویوں میں اکثر کتنا حیرت انگیز فرق ہوتا ہے!  
 ایک فضا تھی جس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا ”آئی ایم سو، پسپی منتہا، چھوٹے بہن بھائیوں کے گھر بٹے دیکھنا بھی عجیب طرح کی مسرت ہوتی ہے۔“  
 اور ایک صفیہ وقار تھیں!

”تھینکس گاڈ، مسز وقار! میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی خوشی تو ہماری اپنی ذات سے بڑھ کر ہوتی ہے۔“  
 صفیہ وقار چونک کر اس کا منہ یوں تکتے لگیں جیسے وہ کوئی عجوبہ تھی!  
 صفیہ وقار سے کہے گئے اپنے تین جملوں کی صداقت اور مسرت وہ اپنے جسم میں دوڑتے لہو کی ایک ایک بوند میں محسوس کر سکتی تھی!



بقیہ اگلے ماہ پڑھیں





ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھار یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سمار ہونے کی دل گداز داستان

قسط نمبر 7









نظامت تعلیمات نے اپنے زیر انتظام اداروں میں بہترین استاد کے انتخاب کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی تھی منتہا اس کے معیار انتخاب پر تو پوری نہ اتر سکی۔ تاہم اس ایوارڈ کے لیے اسکول کی جانب سے اس کی نامزدگی کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ افسران بالا کی نگاہوں میں آگئی۔ کمیٹی سے اس کے بالمشافہ انٹرویو کے موقع پر ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر نظامت تعلیمات بھی موجود تھے۔ موخر الذکر نے اس کی نامزدگی پر اسکول کے اساتذہ کی جانب سے ضمیر فاروقی صاحب کے بارے میں جانبداری کی مشترکہ شکایت ملنے پر ان سے طویل بحث و تحقیص کی تھی۔ منتہا کو دیکھ کر اور اس سے بات کر کے انہیں فاروقی صاحب جانب داری کے الزام سے بری محسوس ہوئے۔ وہ اس ایوارڈ کے لیے مختلف اداروں کی جانب سے نامزد کیے جانے والے بیشتر اساتذہ کے مقابلے میں بدرجہا بہتر تھے۔ تاہم کمیٹی نے ایوارڈ کی سفارش ایک ایسے سینئر ٹیچر کے حق میں کی جن کے کریڈٹ پر یہ کارنامہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے ادارے کے پکنک پر جانے والے طلباء کی ایک بس کو حادثہ پیش آنے پر اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر متعدد طلباء کو ایک گھرے کھڈے سے باہر نکالا تھا۔

منتہا کو ایوارڈ نہ ملنا اس کے اپنے ادارے کے اکثر اساتذہ کے لیے انتہائی مسرت و تسکین کا باعث اور پرنسپل صاحب کے فیصلے کے خلاف بڑھ چڑھ کر بولنے کا سبب بنا۔

”اوہ نہ! فاروقی صاحب سمجھ رہے تھے ڈائریکٹر بھی ان کی طرح بے وقوف ہے۔“  
 ”نور عالم صاحب کا نام جاتا تو ان کے مقابلے میں کوئی ٹھہری نہیں سکتا تھا۔ پرنسپل صاحب کی جانبداری نے ہمارے اسکول کو ایک اعزاز سے محروم کر دیا۔“

”فاروقی صاحب بے چارے کو تو منتہا کے سامنے کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا مگر اللہ سب کو دیکھتا ہے۔“

”فاروقی صاحب کا اگر بس چلے تو منتہا کا نام نوبل ایوارڈ تک کے لیے بھجوا دیں۔“

”چچ چچ! بے چارے فاروقی صاحب۔“

”ہائے بے چاری منتہا!“

”حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔“

بعضوں نے بڑے پھو کے منہ سے فاروقی صاحب کو چوسہ دیا اور بعضوں نے منتہا کے منہ پر اس کی بھد اڑائی۔

”کیا ہوا مس منتہا، پرنسپل صاحب تو بڑے پُر امید تھے آپ کو ایوارڈ ملنے کے سلسلے ہیں۔“

”بس جی آپ سلیکشن کمیٹی سے انٹرویو والے دن کس رنگ کے کپڑے پہن کر گئی تھیں؟ سنا ہے کمیٹی کے ایک ممبر ریڈ کلر سے الرجک تھے۔“

”دل چھوٹا نہ کیجئے مس منتہا، فاروقی صاحب کی ریٹائرمنٹ میں ابھی دو سال باقی ہیں۔ خدا نے چاہا تو اگلے برس

اور پھر اس سے اگلے برس بھی وہ اس ایوارڈ کے لیے آپ ہی کو نامزد کریں گے۔“

بس فضا تھی جس نے اسے دلجمعی سے کام لینے کی ہدایت کی۔

”تم ان لوگوں کی باتوں سے اپنا دل بُرا مت کرنا ڈیر، جل نکلے ہیں یہ سب۔ ایوارڈ کے لیے تمہاری نانی نیشن ہی اپنی جگہ ایک بہت بڑا اعزاز تھی۔“

”مگر یہ لوگ تو فاروقی صاحب پر جانبداری کا الزام لگاتے ہیں۔“

”سوہاٹ، ان کے الزام سے میری تمہاری یا فاروقی صاحب کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی

حال میں بھی مطمئن نہیں ہوتے، ان کا کام باتیں بنانا ہوتا ہے اور بس!“

”کہتے ہیں فاروقی صاحب کی ریٹائرمنٹ میں ابھی دو سال باقی ہیں۔ اگلے سال اور پھر اس سے اگلے سال بھی

تمہارا ہی نام بھیجیں گے۔“

”تم کہو! اگر میں اس کی حقدار ہوں تو میرا ہی نام جانا بھی چاہیے۔“  
 ”اوہ فضہ، لوگ اتنے تنگ دل کیوں ہوتے ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ فاروقی صاحب میرا نام ہی نہ بھجواتے، جسے دیکھو باتیں بنا رہا ہے۔“

”پریشان مت ہو۔ اور جو گزر چکا اس کے بارے میں مت سوچو۔“  
 ”ان لوگوں کی باتیں مجبور کر دیتی ہیں سوچنے پر۔“  
 ”بھئی اور بہت سی اچھی اچھی باتیں ہیں سوچنے کے لیے۔ ان بیکار، فضول اور لغو باتوں سے دل کیوں جلایا جائے۔ یہ بتاؤ، نیہہ کے دل میں تم کیا پس رہی ہو؟“  
 ”وہ تم تو بعد کی بات ہے میں نے تو ابھی شادی کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ مجھے کیا پہننا چاہیے۔“  
 ”یو سلی گرل، دلہن کی ایک ہی بہن اور.....“  
 ”ایسی نکمی۔“

”نہیں نکمی تو خیر نہیں البتہ اپنے خیال سے بے پروا... بھئی اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، جلدی جلدی اپنے کپڑے بناؤ۔ کام ہواؤ گی یا بنے بنائے لو گی؟“  
 ”کام والے نہیں میں تو سادے سادے سے سوٹ بناؤں گی، ہو سکا تو سوتی۔“  
 ”ماکہ لوگ یہ کہیں ہائے بے چاری افسردہ ہے کہ مجھ سے پہلے چھوٹی بہن کی کیوں ہو رہی ہے۔“  
 ”منتہا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ ”کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو!“  
 ”میں سمجھوں یا نہ سمجھوں لیکن بہن کی شادی میں تمہیں سادہ سوتی کپڑے پہنے دیکھ کر اور لوگ یہی سمجھیں گے۔“

منتہا اسے نمٹکی باندھے دیکھتی رہی۔  
 فضہ نے لوہا گرم دیکھ کر مزید ضرب لگائی۔  
 ”اور نیہہ بھی یہی سمجھے گی۔“  
 ”نوا! منتہا نے پورے شد و مد سے کہا۔

”تو پھر اچھے اچھے کپڑے بناؤ، نہ صرف شادی اور دلہن کے لیے بلکہ مایوں اور مہندی کے لیے بھی۔ تم دلہن کی ایک ہی بہن ہو سارے لوگوں کی نظروں میں رہو گی۔ اگر تم لوگوں کو یہ دکھانا چاہتی ہو کہ تم چھوٹی بہن کی شادی اپنے سے پہلے ہو جانے پر واقعی خوش ہو تو.....“

”واقعی خوش ہونے کا کیا مطلب، میں سچ مچ خوش ہوں۔“  
 ”لباس ہماری اندرونی کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سچ مچ خوش ہو تو اس کا واضح اظہار بھی کرو۔ اچھے اچھے کپڑے بناؤ، خوب فینسی سے، میں تمہیں ایک بات بتاؤں، مختار کی وجہ سے میں جس دن زیادہ ڈسٹرب ہوتی ہوں اس دن اچھے سے اچھے کپڑے پہن کر اور زیادہ میک اپ کر کے اسکول آتی ہوں ماکہ لوگوں پر میری پریشانی ظاہر نہ ہو۔“  
 ”مگر..... میں..... میں تو خدا نخواستہ ڈسٹرب نہیں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن یہاں اسکول میں کئی مرتبہ لوگوں کو تاسف کا اظہار کرتے دیکھ چکی ہوں کہ بے چاری منتہا کی چھوٹی بہن کی شادی ہو رہی ہے اور منتہا..... انہیں یقین ہے کہ تم اپنی اصل کیفیت چھپائے ہوئے ہو درحقیقت ناخوش ہو۔“

”رہش! جو لوگ ایسا سمجھ رہے ہیں وہ بے وقوف ہیں۔“  
 ”یہ عوام الناس کی رائے ہے جسے غلط ثابت کرنے کے لیے تمہیں عملی ثبوت دینا ہو گا۔ خوب برائٹ کلرڈ



کپڑے بناؤ۔ بیوٹی پارلر جا کر کوئی اچھا سا بیئر اسٹائل او، کچھ جیولری شیولری، کچھ کاسمیٹکس کا بندوبست رکھو۔“

”تمہیں پتا ہے یہ سب میرے مزاج کے خلاف ہے۔“

”دوسروں کی تسلی کے لیے کبھی کبھی اپنے مزاج کے خلاف کام کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔ شادی ہو لینے دو اپنی بھی پھر دیکھنا ہر تین میں سے دو کام اپنی مرضی کے خلاف کرنے پڑیں گے۔“

”میں ایسی غلطی کروں گی ہی کیوں جس کی سزا میں مجھے تین میں سے دو کام اپنی مرضی کے خلاف کرنے پڑیں۔“

”ڈسیر یہ غلطی تو تمہیں ایک نہ ایک دن کرنی ہی پڑے گی۔“

”زبردستی ہے کیا۔“

”زبردستی نہیں بُور کے لڈو ہیں۔“

”جو کھائے پچھتائے۔“ منتہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جو نہ کھائے وہ بھی پچھتائے۔“

”پچھتانا ہی ٹھہرا تو کھائے ہی کیوں جائیں۔“

”پچھتانا ہی ہے تو کھا کر کیوں نہ پچھتایا جائے۔“ فضلہ نے ترکی بہ ترکی کہا اور دونوں بیک کھلکھلا پڑیں۔

○☆☆○

مسز ظہیر بری کی ایک ایک چیز بڑے چاؤ سے تیار کر رہی تھیں۔ پہلے بیٹے کی شادی تھی اور برسوں زندگی کے تپتے سلگتے ریگزار میں کہیں چھاؤں ملی تھی۔

”ہماری سمورانی ڈاکٹر ہیں بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر۔“ وہ ایک ایک کو بڑے فخر سے بتاتیں۔

یہ بات نہیں کہ نیسہ سے پہلے ان کے خاندان میں کوئی خاتون ڈاکٹر نہ تھی۔ ان کا خاندان تو تھا ہی بڑھے لکھے اور لائق فائق افراد کا خاندان۔ بس انہی کے بچے تھے خاندان کے دیگر افراد کے مقابلے میں واجبی تعلیم کے حامل تاہم دوسرے بست سے لوگوں کے مقابلے میں بہت بہتر اور بہت اچھے۔

مگر خاندان کا ہر فرد مسز ظہیر کی خوشی میں بڑھ چڑھ کر ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی اس خاندان کا امتیازی وصف تھا۔ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی تپاک سے گلے لگانے اور دکھ سکھ بٹانے کو تیار رہتا۔

مسز ظہیر کے بہن بھائی بالخصوص ان کی چھوٹی بہن دایہ، درے، سخنے ان کی خوشی میں شریک تھے۔ کبھی ایک بہن چکر لگاتیں، کبھی دوسری بری کی تیاری میں مشورے دی جاتیں تو کبھی بھائی بھانج گڈی لے کر انہیں شاپنگ کرانے کو آتے۔ چھوٹی بہن جو خاندان بھر میں آنی کی عرفیت سے مشہور تھیں نیسہ کو منہ دکھائی میں دینے کے لیے ڈائمنڈ سیٹ بنوا رہی تھیں۔ خدانے انہیں دیا بھی خوب تھا اور دل بھی بڑا بنایا تھا۔

اپنے ہی نہیں غیر بھی مسز ظہیر کی خوشیوں میں بھرپور طریقے سے شریک تھے۔ ان کے انڈسٹرل ہوم میں کام کرنے والیاں دوپٹوں اور غاروں پر ایسی نفیس نکائی کر رہی تھیں کہ جو دیکھتا تعریف کیے بنا نہ رہتا۔ چٹائی کے ایک غارے میں انہوں نے رنگوں کا ایسا دلکش امتزاج رکھا تھا کہ جس نے دیکھا اپنی کسی لڑکی کے جینز لڑکے کی بری کے لیے دیا ہی غارہ بنوانے کی خواہش ظاہر کی۔ شیفون کے ایک کرتے اور دوپٹے پر انڈسٹرل ہوم میں اجرت پر کام کرنے والی ایک عورت نے ایسی نازک مقفیش بنائی تھی کہ مسز ظہیر نے خوش ہو کر اسے ڈیڑھ گنا اجرت دی۔ انڈسٹرل ہوم میں مستقل بنیادوں پر اجرت کا کام کرنے والی ہر لڑکی اور عورت کو مسز ظہیر نے بہت قیمتی نہ سہی مگر ایک ایک ریشمی جوڑا لاکر دیا تھا اور دیکھے میں پہننے کے لیے سی کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ سب کی سب تو برات کے ساتھ بھی جانے کی خواہشمند تھیں مگر مسز ظہیر نے بڑے پیار سے سمجھا دیا کہ وہ لڑکی والوں پر زیادہ بار نہ ڈالنے کو برات مختصر لے جائیں گی۔

”بھئی تم لوگوں کو جتنا ہلاک کرنا ہو تم فرحان میاں کے مانجھے اور مندی والے دن کر لینا۔“

”ٹھیک ہے آپ جیسے آپ کی مرضی۔“

منز نظیر نے تو می اور منتہا سے یہ بھی کہا تھا کہ انہیں جینز میں کچھ نہیں چاہیے، لڑکی کو وہ اپنے ہی لائے ہوئے عروسی جوڑے میں لے جانا پسند کریں گی۔ مگر می کو یہ بات گوارا نہ ہوئی۔

”وہ لاکھ کہیں کہ انہیں جینز نہیں چاہیے مگر ہم سے تو جو کچھ بن پڑا دیں گے۔“ انہوں نے منتہا سے کہا۔

”ٹھیک ہے والدہ جیسے آپ کی مرضی۔“

سوتیا ریاں دونوں طرف ہی جاری تھیں۔

ملبوسات اور زیورات نیسہ کی پسند کے باقی چیزیں می اور منتہا کی باہمی پسند اور مشاورت سے۔

منتہا کا کام ان دنوں بہت بڑھ گیا تھا۔ چھٹی والا دن پہلے سے زیادہ مصروفیت میں گزرتا۔ ممانی کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ کبھی ماموں ان کے ساتھ ہوتے کبھی بیٹا انہیں لے آتا۔ مدیحہ تو اکثر ہی ان کے ہمراہ ہوتی۔ نیسہ کے جینز اور دیگر معاملات میں وہ بڑھ چڑھ کر می کو اپنے مشوروں سے نوازتیں۔ مدیحہ ہمراہ ہوتی تو اسے بہانے بہانے کاموں میں لگانے کی کوشش کرتیں۔

”مدیحہ! بیٹے پھپھو تمہاری تھکی ہوئی لگ رہی ہیں ذرا پاؤں تو دبا دو ان کے۔“

”نہیں نہیں۔“ می کہماتیں۔

”اے بے فارحہ، تکلف کیسا تمہاری اپنی اولاد ہے۔ جاؤ بیٹا جاؤ زبردستی پھپھو کے پاؤں پکڑ لو۔“

اور مدیحہ دو زانو ہو کر می کے پاؤں دبائے لگتی۔

”ممانی جان آپ چائے پیئیں گی۔“ منتہا پوچھتی۔

”ہاں ہاں بھئی کیوں نہیں مگر تم کیوں بناؤ گی مدیحہ سے بناؤ۔ مدیحہ بیٹے جاؤ کچن میں جا کر سب کے لیے چائے تو

بناؤ۔“

”اچھا ماما۔“

”اچھی سی بنانا۔“

”میں چائے اچھی ہی بناتی ہوں ماما۔“ مدیحہ اتر کر کہتی۔

”واقعی میری مدیحہ چائے بہت لاجواب بناتی ہے۔“ ممانی اس کے جانے کے بعد کہتیں۔

کبھی وہ اپنی آواز میں زبردستی رقت پیدا کرتے ہوئے اپنے بچوں سے کہتیں۔ ”ارے بھئی آئے ہو تو کچھ دیر کو جا کر نیسہ کے پاس بیٹھو، بے چاری بچی اب تو گھنے پنے دنوں کی مہمان ہے اس گھر میں۔“

ممانی کی اس بات پر می کا دل پیچنے لگتا۔

”ارے بچو آئے ہو تو ایک آدھ گیت ہی گا جاؤ تم لوگ۔ شادی والا گھر تو لگے۔“

مدیحہ لپک کر کوئی تھال ڈبا اور چچہ اٹھالاتی اور وہ سب مل کر اونچی اونچی آوازوں میں گانے لگتے۔

بتو تیرے باوا کی اونچی حویلی

بنی میں ڈھونڈتا چلا آیا

مدیحہ کی آواز سب سے اونچی ہوتی۔

ممانی تال دیتے دیتے اچانک ہی رقت آمیز لہجے میں دوسرا گیت چھیڑ دیتیں۔

موہے رکھ لے تو آج کے دن

میاں میں تو پاہنی رے



مئی کا دل کٹنے لگتا۔ آنکھیں بھیگتی چلی جاتیں۔  
 ”ماما جی باہنی کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ ایک روز مدیحہ سے چھوٹے باہرنے پوچھا۔  
 ممانی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر بولیں ”بیٹا باہنی ہندی زبان کا لفظ ہے اس کا مطلب ہوتا ہے مہمان۔ بیٹی  
 اپنے باپل کے گھر میں مہمان تو ہوتی ہے جیسے تمہاری نینہ باجی اب اس گھر میں مہمان ہیں۔“  
 مئی کا دل ایسا بھر آیا کہ وہ یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ممانی کی درد انگیز لے نے مئی کی رقت کو اور ہوا دی۔  
 موہے رکھ لے تو آج کے دن  
 میا میں تو پاہنی رے

منتہا کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔  
 کیسا درد انگیز تھا یہ خیال کہ نینہ اس کی عزیز از جان بہن اس گھر اور اس کے مکینوں سے جدا ہو کر ایک نئے گھر کی  
 مکین اور ایک نے خاندان کی فرد بننے جا رہی تھی۔  
 صد شکر کہ وہ لوگ جانے بوجھے تھے۔ دوسروں کے درد کا احساس اور اس کا درماں بھی رکھتے تھے۔

○☆○

مسز ظہیر اور ان کے خاندان والوں کی طرح فضا بھی انہی لوگوں میں سے تھی جو دوسروں کے درد کا احساس بھی  
 رکھتے تھے اور اس کے درماں کی کوشش بھی کرتے۔  
 مگر مختار جانے کیسا آدمی تھا۔

بے جس اور بے درد!

اسے نہ کسی کے درد کا احساس تھا نہ اس کے درماں کی کوشش کرتا۔ اسے بس اپنی ذات عزیز تھی۔ اس کا جب  
 جی چاہتا بیوی بچوں سے ملنے آ جاتا جب چاہتا ”اچھا میں جا رہا ہوں“ کہہ کر چل دیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ وہ اسے گھر  
 میں سوتا چھوڑ کر اسکول جاتی اور واپسی پر اسے پتا چلتا کہ وہ چلا گیا۔ وہ شاک میں رہ جاتی۔ دل دکھنے لگتا۔ وہ اپنے آپ  
 سے پوچھتی ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے نہ میری پروا ہے نہ بچوں کی پھر میں اس کے آنے سے خوش اور جانے پر  
 اداس کیوں ہو جاتی ہوں؟“

وہ جانتی تھی کہ وہ ایک اذیت پسند شخص تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ وہ دیر تک کولہو کے نیل کی طرح مشقت میں  
 رہتی تھی رات کو وہ دیر تک کمرے کی بتی جلائے رکھتا۔ کبھی کمرے کی کھڑکیاں دروازے بلا مقصد کھولتا، کبھی اتنی زور  
 سے بند کرتا کہ وہ متوحش ہو کر اٹھ بیٹھتی۔ موسم سرما کی سخت راتوں میں وہ کھڑکیوں اور دروازوں کے پٹ کھول کر  
 ان پر پڑے پردے بھی سرکا دیتا۔ کمرے میں در آنے والے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں جلتے بیڑی کی لو پر  
 تھر تھراہٹ سی طاری کر دیتے۔ گرمیوں میں وہ رات کو کسی بھی وقت پنکھا اور روم کولر آف کر دیتا۔ بچوں کے ساتھ  
 بیٹھا وہ خود بھی ٹی وی دیکھ رہا ہوتا اور اچانک ہی اٹھ کر اسے بند کر دیتا۔

شروع شروع میں فضا کو اس کی اس قسم کی حرکتیں بڑی پریشان کیا کرتی تھیں مگر اب وہ اس کی ان حرکتوں کی اس  
 حد تک عادی ہو چکی تھی کہ اگر کسی روز وہ ایسی حرکت نہ کرتا تو وہ تشویش میں پڑ جاتی اور اس سے پوچھتی ”آپ کی  
 طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے میری طبیعت کو۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہتا۔

”نہیں.... بس ایسے ہی مجھے لگا کہ آج آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“

وہ واپس چلا جاتا تو وہ ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کے ٹوٹوں کو اس کے دوبارہ آنے تک جوں کا توں رکھتی۔

انہیں بار بار سو گھمتی۔ اس کا جی چاہتا وہ آئے خواہ رات کو کتنی ہی زور سے دراوڑے اور کھڑکیاں کیوں نہ دھڑھڑائے۔ موسم سرما کی بے راتوں میں کبھی کھڑکیاں کھول کر اور ان پر بڑے پردے سمیٹ کر اور کبھی موسم گرما میں پنکھا اور روم کو لبر بند کر کے وہ اس کی موجودگی کا تصور کرنے کی کوشش کرتی۔

اپنے اس پاگل پن پر کبھی اسے ہنسی آنے لگتی کبھی غصہ۔

”یہ میں کیا کرتی ہوں۔“ وہ اپنے آپ سے کہتی۔

کبھی وہ کسی کھڑکی کے نزدیک جا کر باہر نیم تاریکی میں یوں اپنی نگاہیں دوڑانے لگتی جیسے مختار کی راہ دیکھ رہی ہو۔ کتنی عجیب بات تھی!

مختار کی تمام تر بے پروائی کے باوجود اسے مختار کی موجودگی میں ایک ان کے تحفظ کا احساس ہوتا اور اس کے جاتے ہی وہ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتی۔ مگر اوروں پر وہ اپنی اس کمزوری کا اظہار نہ ہونے دیتی ماسوا اکبر علی کے جو اس کا ماں جایا ہی نہیں دوست، ہراز، نمکسار سبھی کچھ تھا اور اس کے استقلال اور پامردی کا سبب بھی۔ وہی تو تھا جو ہر کڑے ہر آڑے وقت میں اس کی ہمت بن جاتا تھا۔ اپنے دل کی ہریات وہ اسی سے کہتی اور اس سے کہنے کے بعد اپنے دل کو بہت ہلکا محسوس کرتی۔ داسے، درے، خنے وہ جب اور جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتی اسے پکارنے سے پہلے ہی موجود پاتی۔

”مجھے تمہارے ہر دکھ کا الہام ہو جاتا ہے آپا۔“ وہ اس سے کہتا۔

”کاش اس وقت بھی ہو جاتا جب مختار میرے نصیب میں لکھا جا رہا تھا۔“ ایک روز فضا نے حنینہ مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔

”تم جیسی مختار العقل اور نادر مثال کہاں دیکھ پاتا میں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”یار آپا عجیب عورت ہو، اپنے قاتل کو پہچانتے ہوئے بھی اسے میا سمجھتی ہو اور اسی سے چارہ گری کی طلبگار رہتی ہو۔“

”میں تو سمجھی تھی کہ تم نہ جانے کس مختار العقل اور نادر مثال کی بات کر رہے ہو۔“

”کیا نہیں ہو تم؟“

اس نے بہت دھیرج بہت پیار سے اس کے گال سے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں مس کیں اور بوجھل آواز میں بولی ”ڈھونڈنے کی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں تمہیں۔ نظر دوڑاؤ گے تو ایسی بے شمار مثالیں مل جائیں گی تمہیں۔“

جب سے بچے بڑے اور سمجھدار ہوئے تھے فضا کے دل کا درد وہ بھی بٹانے لگے تھے۔

”اماں ایک بات بتائیں، آپ نے بابا سے شادی کیوں کی؟“ ایک روز راول بولا۔

”کیا مطلب!“ اس نے بے ساختہ چونک کر اپنے نزدیک آٹھننے والے بیٹے کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ آپ دونوں رتو اوڈ کپل کا لیلل صادق آتا ہے، آپ مشرق وہ مغرب۔ یہ شادی ہوئی کیوں؟“

وہ ہنس دی پھر اس کے گھونگرے بالوں پر بہت پیار سے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ”کیونکہ اس وقت تم جو نہیں تھے یہ کہنے والے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”ایمان سے اماں میں اگر ہوتا اس وقت تو ہرگز ہرگز آپ دونوں کی شادی نہ ہونے دیتا، چاہے اس شادی کو روکنے کے لیے مجھے آپ کو اغوا ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔“

”بھائی اب کچھ ہو سکتا ہے؟“ رانبل نے مسکراتے ہوئے کہا۔



فضہ نے اُسے گھورا۔

اس نے یوں نگاہیں چرائیں جیسے دیکھا ہی نہ تھا۔

”ہو تو سکتا ہے۔“ وہ اپنی ٹھوڑی کو سہلاتے ہوئے بولا۔

”کیا ہو سکتا ہے بھائی؟“

فضہ کی نظریں راول پر جمی تھیں۔

راول نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے کی کوشش کی پھر رائیل کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ دبا کر بولا ”اماں کو ان

کے میاں سے ڈاکی ورس دلوا کر ان کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔“

فضہ کا منہ کھلا اور کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔

”کس سے بھائی“ رائیل اور راول کا مکالمہ جاری تھا۔

”کسی بگ شاٹ سے یا جس کے پاس بڑا سا گھر ہو۔ بیجیرو ہو، لینڈ کروزر ہو، مرسدیز ہو، نوکر چاکر ہوں، ڈھیر سا

پیسہ ہو اور جو اماں کو ان کی ویڈنگ اپنی دوسری پر ڈائمنڈ سیٹ گفٹ کرے۔“

”اماں کی دوسری شادی کراتا ہے۔“ فضہ نے اس کا کان دبوچ لیا۔

رائیل کھلکھلا دی۔

”لیتی ہوں تمہاری بھی خبر۔“ فضہ نے رائیل کو گھورا۔

”سوری سوری، سوری اماں۔“

”موم کا ہے اماں الگ ہو گیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“ راول نے بوئے پھو کے منہ سے کہا۔

”کیا؟“ فضہ نے چونک کر کہا اور بے خیالی میں اچانک اس کا کان چھوڑ دیا۔

”وہی جو آپ نے چھوڑ دیا ہے یعنی میرا کان۔“

”بد معاش!“

راول ہنستا ہوا اس سے دور بھاگا اور رائیل پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

بچوں سے فضہ کا دوستانہ رویہ مختار کی اذیت پسندی کے باوجود انہیں کسی تناؤ یا پیچیدگی کا شکار نہ ہونے دیتا تھا بلکہ

فضہ کے رویے نے انہیں ایسا اعتماد بخشا تھا کہ وہ مختار سے بھی ہنسی مذاق کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ اب یہ اور بات

ہے کہ ان کے ہنسی مذاق پر مختار اکثر انہیں آنکھیں دکھا کر کہا کرتا تھا ”تمہاری ماں نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے تم لوگوں کو۔“

فضہ انہیں الگ آنکھیں دکھاتی۔

”باپ کے سامنے ادب سے رہا کرو..... سر جھکا کر۔“

”اماں کوئی اللہ میاں تو نہیں ہیں وہ۔“ سانول ایک روز بولا۔

”نعوذ باللہ! کیا کفر بکتے ہو۔“

”آپ ہی تو کہتی ہیں نا اماں کہ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیے۔“

”خواہ مخواہ کی بحث مت کرو۔“

”وہ ٹھیک تو کہہ رہا ہے نا اماں۔ بابا کوئی اللہ میاں تو نہیں ہیں نا کہ ان کے سامنے ہم لوگ سر جھکا کر رکھیں۔“

رائیل بولی۔

فضہ نے اُسے گھورا۔

”سوری اماں“ اس نے اپنے کان کی لوائٹوٹھے اور پہلی انگلی کے درمیان دباتے ہوئے کہا پھر فضہ کے نزدیک آکر

اس کے گلے میں اپنی بائیں حائل کرتے ہوئے بولی ”ایک بات بتائیے اماں۔“

فضہ اسے دیکھنے لگی۔

”آپ بابا کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہیں!“

فضہ تھکنگي باندھے اسے دیکھتی رہی۔

”بنائے نا اماں۔“

”کیونکہ وہ تمہارے باپ جو ہیں۔“

”اگر ہمارے باپ نہ ہوتے تو کیا تب بھی آپ ان کا اتنا ہی خیال رکھا کرتیں۔ میرا مطلب ہے اگر ہم.... آئی مین آپ کے تینوں بچے پیدا نہ ہوئے ہوتے تو کیا تب بھی؟“

”پتا نہیں۔“

”جھوٹ مت بولے اماں آپ کو اچھی طرح پتا ہے۔“

”کیا! فضہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔“

”یہی کہ بابا اگر ہمارے باپ نہ ہوتے، آئی مین ہم تینوں نہ بھی پیدا ہوئے ہوتے تب بھی آپ بابا کا اتنا ہی خیال کرتیں.... لی کا زیو لوہم۔ آپ کو ان سے محبت ہے.... ہے نا اماں؟“

”بے شرم!“

”کیوں اس میں بے شرمی کی کیا بات، لوگ اللہ میاں سے محبت کرتے ہیں، اپنے ماں باپ سے کرتے ہیں، بہن بھائیوں سے کرتے ہیں تو کیا آپ بابا سے محبت نہیں کر سکتیں.... یو لوہم.... یو لوہم۔“

”اُف خدا یا! کیسے بے شرم بچے ہیں آج کل کے۔ ایک ہم تھے کہ آج تک اپنی ماں سے ایسی کوئی بات کہنے کرنے کا تصور نہیں۔“

”ہم سائنسی دوز کے بچے ہیں اماں۔“

”براہ کرم سائنس کو بدنام کرنے کی کوشش مت فرمائیں، یہ سب میڈیا کا اثر ہے۔ ہم محبت کا نام بھی زبان پر لاتے شرماتے تھے اور تم لوگ!“

”آئی لویو مدر“ رائیل نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے اس کے گال کو بوسہ دیا۔

”ہٹو“ فضہ نے اسے پرے کرنے کی کوشش کی۔

”اومدر آئی ریٹی لویو.... آئی لویو۔ آئی لویو۔ آئی لویو۔“

”او کے.... او کے۔“

یہی وہ محبت تھی جو فضہ کو صرف جینے کا نہیں بلکہ کھل کر جینے کا حوصلہ دیتی تھی۔



منتہا کلاس میں تھی کہ چڑا سی پرنسپل صاحب کا پیغام لے کر پہنچا کہ وہ فارغ ہو تو ان سے مل لے۔ پریڈ ختم ہونے کے بعد وہ ان کے دفتر میں پہنچی تو وہ کسی ملاقاتی سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان کے فارغ ہونے کے انتظار میں ایک طرف بیٹھ کر جماعت نہم اور دہم میں پڑھائی جانے والی ریاضی کی نئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وزارت تعلیم نے ریاضی کے نصاب پر نظر ثانی کے بعد ترامیم و اضافوں کے ساتھ نئی کتاب شائع کروائی تھی جو ان دنوں اسکول میں ہمہ وقت منتہا کے بیگ میں رہتی اور وہ موقع ملتے ہی اس کی ورق گردانی کرنے بیٹھ جاتی۔ جیسا کہ اس وقت ہوا تھا۔ کتاب کی ورق گردانی کے ساتھ پرنسپل صاحب اور ان کے ملاقاتی کی باہمی گفتگو بھی اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ ان کی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ مذکورہ شخص اسکول میں کتابوں کی نمائش لگانے کا خواہاں تھا۔

اپنے ملاقاتی کے جانے کے بعد فاروقی صاحب منتہا کی جانب متوجہ ہوئے اور اسے صوفے پر سے اٹھ کر اپنے



مردرو آہٹنے کا اشارہ دیا۔ وہ ان کی میز کی دوسری طرف عین ان کے مقابل جا بیٹھی۔ فاروقی صاحب نے اپنی میز پر رکھا اخبار اٹھایا۔ اس کی تہ کھولی۔ ورق پلٹا۔ نظر دوڑائی اور ایک مخصوص صفحہ دوہرا کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ انہیں مذبذب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے منتہا نے اخبار ان سے لے لیا۔ پھر اخبار پر نظر ڈالتے ہوئے بولی ”کوئی خاص خبر ہے سر؟“

”جی ہاں بہت خاص۔“ وہ دھیرے سے مسکرا دیے۔  
 منتہا اخبار کی سطروں پر نظر دوڑانے لگی اور فاروقی صاحب چپ چاپ اس کی نگاہوں کا جاؤ لینے لگے۔  
 ”آئی ایم سوری سر، آپ بتا نہیں کون سی خبر کی بات کر رہے ہیں۔“  
 ”پبلک سروس کمیشن کا اشتہار دیکھیے۔“ انہوں نے کہا۔  
 منتہا کی نگاہیں اشتہار پر مرکوز ہوئیں پھر سطر بہ سطر دوڑنے لگیں۔  
 ”ہمارے اداروں میں وائس پر پبل کی آسامیاں نکلی ہیں آپ ضرور اپلائی کریں۔“  
 ”میں سر!“ وہ چونکی۔

”جی..... میں آپ ہی کے لیے کہہ رہا ہوں۔“  
 ”نوسر..... میں..... اس لائق کہاں۔“ وہ کچھ خفیف سی ہو کر بولی۔  
 ”کمیشن کا کام یہی ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ کون کس لائق ہے اور کون لائق نہیں ہے۔ آپ کو ضرور اپلائی کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے آپ خود کو بہت سوں کے مقابلے میں اہل ثابت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“  
 ”سرایہ تو آپ کی عنایت ہے کہ آپ میرے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں۔“  
 ”آپ اس رائے کی حقدار ہیں مس منتہا۔“  
 ”بہت شکریہ سر!“

”ڈو اپلائی۔ کمیشن کے دفتر سے درخواست فارم منگوائیے اور اپلائی کر دیجئے۔ شاہد صاحب آپ کو اس سلسلے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔“

”سر! شاہد صاحب وائس پر پبل کے لیے کو ایفائی نہ کر سکے تو میں..... میں تو ان کے مقابلے میں کافی جوئیر ہوں“  
 ”میں..... میں بھلا کہاں کو ایفائی کر سکتی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔ پہلی دفعہ میں کو ایفائی نہ کر سکیں تو پھر سہی پھر سہی۔ تجربہ تو ہو گا۔ لوگ کئی کئی بار کوشش کرتے ہیں اور بالآخر کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی تین مرتبہ کمیشن کے سامنے پیش ہوئے انٹرویو کے لیے تیسری کوشش کے بعد ان کا انتخاب ہوا۔ وائس پر پبل شپ کے لیے۔“

”سر میں..... میں نیچر ہی ٹھیک ہوں۔“

”نیچر تو خیر آپ ٹھیک نہیں بلکہ بہت اچھی ہیں۔“

”نوسر..... میرا مطلب ہے میں نیچر ہی رہنا پسند کروں گی۔ ایڈمنسٹریشن میرے بس کا روگ نہیں۔“

”مس منتہا ایک کلاس میں پچاس ساٹھ بچوں کو کوئی مضمون پڑھانا اور بات ہے اور ایک ادارے کے انتظام و انصرام میں معاونت قطعاً مختلف تجربہ۔“

”سر! اس قسم کی ذمہ داریوں کے لیے تو طویل تجربہ چاہیے ہوتا ہے۔“

”تجربہ تو حاصل کرنے سے آتا ہے مس منتہا۔ آپ کی مراد اگر یہ ہے کہ ایڈمنسٹریشن میں آنے کے لیے میری طرح بال سفید ہونے چاہئیں تو یہ غلط ہے۔ اداروں کے منتظمین کو تازہ دم اور فعال ہونا چاہیے اور یہ خوبیاں جواں عمر افراد میں عموماً بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ سفید بالوں والے لوگ تو میری طرح عموماً تھک ہی چکے ہوتے ہیں۔“

”اودہ نو سر“ آپ تو بہت ایکٹو بہت انرجیٹک ہیں۔ ہم لوگ تو رشک کرتے ہیں آپ کے اس قدر انرجیٹک ہونے پر۔“

”اچھا“ وہ دھیرے سے مسکرائے اور قدرے توقف سے بولے ”تو پھر آپ اپلائی کر رہی ہیں۔“  
وہ مذہذب دکھائی دینے لگی۔

”یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے آپ کو۔“  
”سر! وہ ہچکچاتے ہوئے بولی ”کو ایفائی نہ کیا تو یہاں لوگ اسی طرح مذاق اڑائیں گے میرا جیسے.....“ اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”جیسے؟“ فاروقی صاحب نے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔  
”جیسے ایوارڈ کے لیے میری نامزدگی اور پھر ایوارڈ نہ ملنے پر۔“  
”میرے نزدیک تو آپ کی نامی نیشن بجائے خود ایک ایوارڈ تھا۔“  
”میں جانتی ہوں سر اور اس فیور کے لیے میں آپ کی شکر گزار بھی ہوں۔“  
”وہ فیور ہرگز بھی نہیں تھا۔ آپ ڈیزرو کرتی تھیں کہ آپ ہی کا نام بھیجا جائے۔“  
”تھینک یو سر۔“

”اور اگر آپ اس پوسٹ کے لیے اپلائی کریں گی تو آپ کی درخواست میں پُر زور سفارش کے ساتھ آگے بڑھاؤں گا۔“

”مگر سر آپ تو سفارش کے خلاف ہیں۔“  
”میں نااہل افراد کو دھکا دے کر اہل افراد کی حق تلفی کرتے ہوئے آگے بڑھانے کی سفارش کا مخالف ہوں۔  
اہلیت اور لیاقت کے حامل شخص کے لیے راستہ ہموار کرنے کا مخالف نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے بحث طویل ہو رہی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میری خواہش ہے آپ وائس پر نسل کی پوسٹ کے لیے اپلائی کریں اور اپنی لیاقت اور اہلیت کو آزمائیں۔“

وہ چپ ہو رہی تاہم مذہذب نظر آتی تھی۔  
”آج سے دو دن بعد میں آپ کا درخواست فارم مطلوبہ دستاویز کے ساتھ اپنی میز پر موجود دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
منتہانے چونک کر انہیں دیکھا۔  
”ازدیت کلیر؟“ انہوں نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا۔  
”سر..... میری..... میری تو بہن کی شادی ہے۔“

”سو دہاٹ؟“  
”وہ سر فارم..... مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ہے سر کہ میں فارم لینے کے لیے پبلک سروس کمیشن کے دفتر جا سکوں۔ دوسری بات یہ سر کہ مجھے تو کمیشن کے دفتر کا راستہ بھی معلوم نہیں۔“  
”آپ فکر نہ کیجئے فارم آپ کو میں منگوا دوں گا مگر جیسا کہ میں نے کہا دو دن بعد اسے میری میز پر ہونا چاہیے..... اوکے؟“

”اوکے سر!“ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بادل ناخواستہ کہا۔  
”مگڈ!“

”میں اب جا سکتی ہوں سر؟“  
فاروقی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔



”تھینک یو ویری مچ۔“

اسی دن چھٹی کے وقت جب وہ اسکول کار پارکنگ میں کھڑی اسکول بس کی طرف جا رہی تھی چڑاسی سلیم اپنی بائیکل سمیت اس کے نزدیک آرکا اور نیلے رنگ کا ایک کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”بھٹو! فاروقی صاحب نے بھجوایا ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“ اس نے لپٹا ہوا کاغذ اس سے لیتے ہوئے کہا۔

”آپ خود ہی دیکھ لو۔ فاروقی صاحب نے آدھی چھٹی میں میرے کو بھیجا تھا ایک پرچہ دے کر بلیک سروس کمیشن کے دفتر اور کہا تھا فارم لا کر منتہا بی بی کو دے دیجیو۔“

”اچھا اچھا..... شکریہ۔“ اس نے فارم اس سے لیا اور بیگ سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”رہن دور رہن دو بھٹو۔“ اس نے محض تکلف کے طور پر کہا۔

”نہیں نہیں رکھو چائے پی لینا۔“

سلیم نے نوٹ اس سے لے کر مٹھی میں دبایا۔

مئی کہا کرتی تھیں ”غریب لوگوں کو دیتے دلاتے رہنے سے انسان کا دل مردہ نہیں ہونے پاتا۔“

فارم اپنے بیگ میں رکھ کر اس نے اسکول بس کی جانب قدم بڑھا دیے جو روانگی کے لیے تیار تھی۔  
فاروقی صاحب نے فارم منگوانے میں کیسی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اب کوئی راہ فرار نہ تھی۔

○☆○

شادی کے کارڈز چھپ کر آگئے تھے۔

مئی اور منتہا مہمانوں کی فہرست بنا رہی تھیں۔ ممانی اور ان کے بچے بھی گھر آئے ہوئے تھے۔ ماموں ان لوگوں کو چھوڑ کر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ مہمانوں کی فہرست بنوانے میں ممانی بھی خاطر خواہ مدد کر رہی تھیں۔ مئی مہمانوں کی فہرست زیادہ طویل نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ کچھ اخراجات حد میں رکھنے کے خیال سے اور کچھ اس لیے بھی کہ گزشتہ برسوں کے دوران خاندان کے بہت سے لوگوں سے ان کا تعلق بہت واجبی سارہا تھا۔ جو لوگ بہانے بہانے ان کے دل کا زخم چھیڑنے کی کوشش کرتے ان سے وہ بدرجہا کنارہ کش ہوتی چلی گئی تھیں۔ ایسے لوگوں کو وہ نیہ کی شادی میں بھی مدعو نہ کرنا چاہتی تھیں۔ ایسے دو غلے دو منے بات ہوتی کچھ ہے اسے رنگ کچھ اور دیتے ہیں۔ مسز ظہیر اور ان کے گھر والوں کو تو سب کچھ معلوم تھا مگر ان کے خاندان کے اور لوگوں کے سامنے اس طرح کے دو منے لوگ کوئی ایسی دسی بات کر دیتے تو مسئلہ ہو جاتا۔ کہنے والوں نے تو پہلے بھی کہہ ہی دیا تھا اور اب بھی ان کی باتیں مئی کے کانوں تک کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچ ہی جایا کرتی تھیں جن کا لب لباب یہ ہوتا کہ کوئی بھی آدمی اپنا گھر بلا وجہ نہیں بگاڑتا، مالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ قصور صرف مرد ہی کا نہیں عورت کا بھی ہو گا بلکہ مئی کے کانوں تک تو بعض دفعہ بہت دل دکھانے والی باتیں بھی پہنچی تھیں۔ عجیب و غریب انواہیں گرم کر رکھی تھیں بعض لوگوں نے بٹلا یہ کہ شوہر کی زیادہ عمر اور بد روئی کی وجہ سے ان کا کسی اور کے ساتھ ایسا دیا تعلق ہو گیا تھا اس لیے میاں نے ان کی بے وفائی کی وجہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔ بہت تکلیف دہ تھیں اس قسم کی باتیں۔ خدا نخواستہ شادی میں کوئی بد خواہ ایسی دسی بات زبان سے نکال بیٹھتا تو کیسی رسوائی ہوتی۔ چنانچہ مئی اپنی طرف کے مہمانوں کی فہرست بہت حزم و احتیاط کے ساتھ مرتب کروا رہی تھیں۔ دو غلے دو منے بد فطرت اور بد خواہ لوگوں سے حتی الامکان حد تک پاک فہرست۔

منتہا مئی کا بتایا ہوا کوئی نام اس فہرست میں لکھ رہی تھی کہ ممانی نے بلا تمہید مئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فارحہ! ایک بات بتاؤ، نجیب بھائی کو کارڈ نہیں بھجواؤ گی کیا؟“  
 می اور منتہا بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر ممائی نے نظریں چڑھائیں اور  
 کچھ شرمندہ سی ہو کر بولیں ”خدا نہ کرے میں نے کسی اور مقصد سے نہیں پوچھا۔ نجیب بھائی نے تمہارے ساتھ لاکھ  
 زیادتی کی لاکھ بڑے سہی وہ مگر.... بچوں کے تو باپ ہی ہیں نا۔ لڑکی کے نکاح کے وقت باپ زندہ ہو تو وہی اس کا ولی ہوتا  
 ہے۔“

”بھائی! ملیب کو خدا لمبی عمر دے، وہ ہے بہنوں کو رخصت کرنے کے لیے۔“ می کی آواز بھرا رہی تھی۔  
 منتہا نے می کی طرف دیکھا۔ جذبات کی شدت نے ان کی آنکھوں میں سرخی سی بکھیر دی تھی۔  
 ”خدا ملیب کو سلامت رکھے۔“

”ڈیڈی جان ہماری زندگی سے عرصہ ہوا نکل چکے ہیں ممائی جان۔“ می کی ڈھارس بندھانے کو منتہا نے اپنا بازو  
 ان کے شانوں پر دراز کر دیا۔

اس کی بات پر می نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور ان کی نگاہوں نے اس سے کہا ”ایسا نہ کہو۔“  
 ”ہمارے لیے سب کچھ ہماری ماں ہی ہیں۔“ منتہا نے اپنا سر می کے شانے پر ٹکاتے ہوئے اپنا دوسرا بازو بھی  
 دراز کر کے می کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”بے شک!“ ممائی بولیں ”تمہاری ماں کی بڑی ہمت تھی جو اپنی ڈوہتی ناؤ کو کھلے لے گئیں۔ مگر مینا یہ موقعے ایسے  
 ہوتے ہیں کہ آدمی دشمنوں کو بھی پوچھ لیتا ہے، وہ تو تمہارے باپ ہیں۔“

”بد قسمتی سے۔“ منتہا تلخ لہجے میں بولی۔ می کو دل گرفتہ دیکھ کر اسے ممائی پر غصہ آ رہا تھا کہ کیوں انہوں نے یہ  
 ذکر چھیڑ دیا تھا۔ جب سے نیمہ کی شادی کا قصہ چھڑا تھا اس ذکر سے تو وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چڑائے ہوئے  
 تھے۔ چاہتے ہوئے بھی بات نہ کر پائے تھے اب تک۔

”بھائی جان، نیمہ کو اس کے ماموں اور بھائی رخصت کر س گے۔“ می نے فیصلہ کن مگر دل گرفتہ لہجے میں کہا۔  
 ”ٹھیک ہے جیسے تمہاری خوشی۔“ ممائی کا انداز سپردگی دیکھنے کے لائق تھا۔ یہ وہی خاتون تھیں جو ان لوگوں پر بڑا  
 وقت پڑنے پر نیچے نکال کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

واہ ری نیرنگی گردوں!  
 ”بات خوشی کی نہیں بھائی..... ذرا سوچئے کون بد نصیب عورت یہ چاہے گی کہ اس کے بچوں کا باپ زندہ ہو اور  
 بیٹی باپ کے سائے میں رخصت نہ ہو۔ بات اصول کی ہے بھائی..... اتنے برس گزر گئے جس شخص نے کبھی پلٹ کر یہ  
 نہ دیکھا کہ جو عورت اس کے نکاح میں تھی اور ہے اس کا اور اس کے بچوں کا کیا حال ہے اسے کیونکر یاد کیا جائے۔ سچ  
 تو یہ ہے بھائی کہ نجیب احمد نے تو مجھ سے اپنے رشتے پر میرا اعتماد دھجی دھجی کر کے رکھ دیا۔ کیا اتنا کمزور ہوتا ہے یہ  
 رشتہ!“

”والدہ سارے رشتوں میں یہی خود غرضی ہوتی ہے سوائے ماں اور اولاد کے۔“ منتہا تلخ لہجے میں بولی۔  
 ”واہ بھئی واہ!“ ممائی تنک کر بولیں اور ابرو چڑھا کر منتہا کو دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں ”تم نے سب کو ایک ہی ٹکڑی  
 سے ہانک ڈالا۔“

”سوری ممائی جان، غلط تو نہیں کہا میں نے۔ ڈیڈی کا گھر چھوڑنے کے بعد ہم نے کیا کچھ سہا وہ ہم جانتے ہیں۔“

آسمان پر اللہ تھا اور زمین پر ہماری ماں۔  
 ”اوہ، جیسی یہ کس بحث میں پڑ گئیں۔ فہرست بناؤ۔ کارڈ لکھنے اور پھر تقسیم بھی کرنے ہیں۔“ می نے قصہ لپٹنے کی  
 کوشش کی۔



”دیے ڈیڈی جان کو خاندان میں کسی نہ کسی سے خبر تو مل گئی ہوگی نیمہ کی شادی کی“ یہ کہتے ہوئے منتہا نے دزدیدہ نظروں سے ممانی کو دیکھا۔<sup>۱</sup> ”ہاں ہاں خبر تو انہیں خیر سے پہنچ چکی ہے۔“ ممانی بولیں۔

ممی نے چونک کر انہیں دیکھا اور کہا ”آپ کو کیسے پتا؟“  
 ”پھوپھی اسٹل کے پوتے کی رسم بسم اللہ میں تو خیر نہ جاسکی مگر نسرین باجی سے فون پر بات ہوئی تو وہ بتا رہی تھیں کہ وہاں ڈاکٹر صاحب کی دونوں بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں اور ایک ایک سے پوچھ رہی تھیں، سنا ہے نیمہ کی شادی ہو رہی ہے۔ دونوں بہنوں نے یہ خبر بھائی تک ضرور پہنچائی ہوگی۔“

پھوپھی اسٹل ممی کی رشتے کی پھوپھی تھیں اور نسرین پھوپھی اسٹل کی بیٹی تھیں۔  
 ”میں نے تو انہی لوگوں کی وجہ سے خاندان کی تقریبات میں آنا جانا چھوڑ دیا۔“ ممی دل گرفتہ لہجے میں بولیں۔  
 ”غلطی کی۔“ ممانی بولیں۔

ممی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔ کیا ممانی کو معلوم نہیں تھا کہ اپنوں کی کیسی کیسی باتیں سننی پڑی تھیں انہیں۔  
 ”اچھا والدہ اور بتائیے۔“ منتہا نے ممانوں کی نامکمل فہرست کو مکمل کرنے کے لیے دوبارہ قلم اور کاغذ کا دستہ سنبھال لیا۔



فاروقی صاحب نے اس کا درخواست فارم پبلک سروس کمیشن کو ارسال کروا کے ہی دم لیا۔  
 نیمہ کی شادی میں پانچ دن رہ گئے تھے۔ یوشن کے لیے آنے والے بچوں کی تو اس نے ہفتہ بھر کے لیے چھٹی کر دی تھی تاہم اسکول سے ابھی چھٹی نہیں لی تھی۔ اسکول سے واپس آتے ہی کبھی بازار دوڑتی کبھی کسی کو دعوت نامہ پہنچانا ہوتا۔ باہر کے کام نمٹا کر آتی تو نیمہ کے جیز اور شادی کی درون خانہ تیاریوں میں رات گئے تک ممی کے ساتھ مصروف کار رہتی۔ ایک تھوڑی بے شمار کام تھے جو اسے، ممی اور ملیب کو مل جل کر کرنا تھے۔  
 ممی کئی دن سے ہر روز اس سے ایک ہی سوال کر رہی تھیں ”ارے بھی چھٹی کب لوگی؟“  
 ”لے لوں گی والدہ۔“  
 ”کب آخر؟“

”بس ایک آدھ دن میں۔“ وہ ممی سے نظریں چڑا کر کہتی۔  
 اس روز بھی جب اس نے انہیں یہی جواب دیا تو وہ قدرے خفا ہو کر بولیں ”ملیب کی تو خیر مجبوری ہے کہ اسے دفتر جانا ہوتا ہے۔ تمہیں کیا مجبوری ہے ایسی جو چار دن گھر نہیں بیٹھ پارہیں۔“  
 وہ دھیرے سے مسکرائی۔

ممی کی یہ بات ایک عمومی معاشرتی رویے کی غماز تھی۔  
 ملیب بھی اسی کنبے کا رکن تھا جس کی وہ تھی بلکہ وہ تو اس کنبے کا واحد مرد رکن تھا مگر ممی نے اب تک اس سے ایک مرتبہ بھی یہ تقاضا نہیں کیا تھا کہ اسے بہن کی شادی کے لیے اپنی ملازمت سے رخصت لے لینی چاہیے جبکہ اس سے وہ کئی دنوں سے یہ مطالبہ کر رہی تھیں حالانکہ وہ اپنی ملازمت سے رخصت لیے بنا بھی شادی سے متعلق مختلف النوع امور بڑی سرگرمی سے نمٹا رہی تھی اور گھر والوں کو پتا بھی نہ چلنے دیتی کہ رات گئے جب وہ تھکی ماندی بستر پر لیٹی ہے تو اس کا انگ انگ تھکن سے کس قدر چور چور ہوتا ہے۔

ممی کا اس سے چھٹی لینے کے لیے بار بار تقاضا اور اس کے چھٹی نہ لینے پر اس روز ہلکی سی سسی مگر باضابطہ خفگی گویا اس امر کی غماز تھی کہ ان کے نزدیک ملیب کے مقابلے میں اس کے ملازمتی فرائض اور ذمے داریوں کی ایسی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ یہ منفی تفاوت پورے سماجی ڈھانچے میں موجزن تھا اور ممی کا رویہ اسی تضاد کا آئینہ دار تھا۔

مرد کی مصروفیات اہم عورت کی غیر اہم۔

مرد سر آنکھوں پر عورت پاؤں کی جوتی۔

مطلب اگر اسے اپنی جان سے بڑھ کر پیارا نہ ہوتا تو شاید می کے اس رویے سے وہ یقینی طور پر دل گرفتہ اور آزرده ہوئی ہوتی اور یوں نہ مسکرائی ہوتی۔

”لے لوں گی والدہ چھٹی بھی لے لوں گی۔“

”کب! شادی کے بعد لوگی کیا؟“ می کے لہجے سے خفگی چمک رہی تھی۔

”ضرورت ہوئی تو شادی کے بعد بھی۔“ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے می کے سوال کے اصل مطلب سے

تجابل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے پیار سے می کے گلے میں اپنی بائیں جھانک کر دیں۔

”ارے ہو، تمہارا تو اگر بس چلے نا تو اسکول ہی میں ڈیرا جمالو۔“

”ہاے سچ می آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میرا جی چاہتا ہے یونیورسٹی کیمپس کی طرح ہر تعلیمی ادارے کی اپنی چھوٹی سی کالونی ہو جہاں اس ادارے کا اسٹاف اپنی ٹیملیز کے ساتھ رہا کرے نہ کوئی دیر سے پہنچے نہ کسی کو جلدی جانے کی وحشت ہو۔ بچوں کی کاپیاں چیک کرنی ہوں، رجسٹرورک کرنا ہو یا رزلٹ بنانا ہو جب جی چاہا گھر سے نکلے اور اسٹاف روم میں جا کر یہ کام نمٹا آئے، نہ ڈھیروں کاپیاں لا کر گھر لانے کی ضرورت نہ مارا مار کام ختم کرنے کی وحشت۔ سارا کام اطمینان سے ہوا کرے۔“

”ماشا اللہ! بڑے نیک خیالات ہیں۔“ می نے اسے تکیھی نظروں سے دیکھا۔

”تھینک یو“ وہ پھر اسی تجابل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیاز مندی سے مسکرائی۔

”بس اب چھٹی لو، شادی کا گھر ہے ڈھیروں کام ہیں کوئی مذاق نہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں کوئی کام ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔“

”چھٹی کب لوگی؟“

”جب ضرورت ہوگی۔“

”ارے شادی سر پر ہے اور تم کہتی ہو جب ضرورت ہوگی..... آخر اور کب ہوگی ضرورت۔“

”میں نے دو دن کی چھٹی کی درخواست دے رکھی ہے۔“

”صرف دو دن کی! می چو نکلیں۔“

”زیادہ کی ضرورت کیا ہے والدہ۔ شادی والے دن اور اس سے اگلے روز۔“

”دو دنوں کا تکلف بھی کیوں کرتی ہو، رہنے دو..... اللہ نے چاہا تو تمہارے دو دن چھٹی لیے بغیر بھی ہو جائیں گے

سارے کام۔“ می نے خشونت سے اسے دیکھا۔

”پلیز ناراض نہ ہوں، بچوں کے امتحانات سر پر ہیں اور ہمارے اسکول میں ٹیچرز کا یہ حال ہے کہ اکثریت سال کے

خاتمے کی وجہ سے اپنی اتفاقی چھٹیاں پوری کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ نومبر دسمبر کے مہینوں میں ہر سال یہی ہوتا ہے۔

پر نسل صاحب بے چارے عاجز آ جاتے ہیں اس صورت حال سے۔ آپ یہی چاہتی ہیں نا کہ کوئی کام رکے بغیر نیسہ کی

شادی بحسن و خوبی ہو جائے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں سب کام ہو جائے گا نیسہ کی شادی ہونے تک۔ مجھے اگر پوری

پوری رات بھی جاگنا پڑا تو انشا اللہ تعالیٰ میں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونے دوں گی۔“

”مگر دو دن سے زیادہ چھٹی نہیں لوگی۔“

”کام تو دو دن چھٹی لیے بغیر بھی چل سکتا ہے والدہ۔“

می نے اسے ناگوار سے دیکھا۔



”میں آپ کو ایک بات بتاؤں، آئے دن بہانے بہانے چھٹی کرنے والوں سے بالکل مختلف سی ہمارے اسکول میں ایک ٹیچر ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں میں نے سنا ہے، فجر کے وقت ان کے والد کی تدفین ہوئی اور اسی روز وہ معمول کے مطابق اسکول میں حاضر تھیں۔“

”ہاں بعض لوگ ایسے سنگ دل بھی ہوتے ہیں۔“

”یہ سنگدلی نہیں والدہ فرض شناسی ہے۔“

”ہمارے مرنے کے بعد تم بھی یہی فرض شناسی دکھانا۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں۔“

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔“

”پلیز ایسی بات نہ کریں مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”موت سے کیا ڈرنا! برحق ہے۔ کل نفس زانقہ الموت۔“

”آپ نیسہ کی شادی کی باتیں نہیں کر سکتیں۔ آف تو بہ شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں اور ہمارے گھر میں

سناٹا پڑا ہے۔“ منتہا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔ مسز ظہیر بتا رہی تھیں جس دن سے لڑکا آیا ہے اُن کے گھر ہر رات گانے بجانے

کی محفل جم رہی ہے۔“

”کل سے ہم بھی جمائیں گے۔ ممانی جان اور ان کے بچے آخر کب کام آئیں گے۔“

ممی کے لبوں سے بے اختیار ایک سرد آہ نکلی۔

منتہا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

دونوں کی نظریں باہم ملیں اور ایک لمحے میں ایک دوسرے کو کرب و ملال کی ایک داستان سنا کر جھک گئیں۔

ٹوٹے ہوئے گھروں اور بکھرے ہوئے کنبوں کے افراد کو کیسے کیسے دکھ سہنے پڑتے ہیں!



مسز ظہیر جیسے لوگ دو سروں کے لیے زندگی کے دشوار گزار سفر کو کتنا سہل کر دیتے ہیں۔

”مایوں اور مہندی ہم لوگ اپنے اپنے گھر کر لیں گے۔“ انہوں نے ممی اور منتہا سے کہا تھا۔

ممی کو یوں لگا تھا جیسے سر سے کوئی بڑا بوجھ اور ذہن سے کوئی بڑی فکر ہٹ گئی ہو۔

اخراجات کی فکر جو تھی سو تھی اس سے زیادہ فکر انہیں اس بات کی تھی کہ ان دو تقریبات میں مسز ظہیر کا تو

خاندان کا خاندان ہو گا اور ان کی طرف سے؟

صد شکر کہ مسز ظہیر کے اس فیصلے نے کہ فریقین یہ دونوں تقریبات روایتاً ایک دوسرے کے ہاں آئے جائے بنا

یکطرفہ طور پر اپنے اپنے گھروں میں ہی منعقد کر لیں گے ان کی فکر دور کر دی تھی۔ کیسا دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا مسز ظہیر

نے نہ پیسے کا زیاں نہ وقت ضیاع۔ خدایا! ان تقریبات بالخصوص مہندی کے موقع پر لوگ کتنا اسراف کر بیٹھتے ہیں۔ مسز

ظہیر نے ممی کو یک گونہ طمانیت بخشی۔

نکاح کے لیے باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پا چکا تھا کہ ظہر کے بعد گھر ہی میں ہو گا۔ رخصتی رات کو ایک

میرج ہال سے ہونا تھی۔ سو پرگرام کے مطابق شادی والے دن بعد نماز ظہر گھر پر نکاح پڑھایا گیا اور تقریباً آٹھ بجے

شب برات ہال میں پہنچی۔ مسز ظہیر نے وقت کی پابندی کا نکاح اور برات دونوں موقعوں پر خاطر خواہ خیال رکھا۔

دعوت نامے میں آمد برات آٹھ بجے شب لکھی تھی۔ برات آٹھ بجے کے لگ بھگ میرج ہال کے صدر دروازے پر

موجود تھی۔ بچے، بڑے، مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان سب کے سب اپنے چہروں مہروں، ملبوسات، انداز و اطوار،

نشست و برخاست اور گفتگو سے خاندانی، معزز اور رکھ رکھاؤ والے لگتے تھے۔ دولہا ایسا وجہ کہ لڑکی والے دیکھتے رہ گئے۔ اس کے گلے میں پڑا نو دمیدہ گلابوں کا ہار اس کی مردانہ وجاہت پر ایسی بھین دکھا رہا تھا کہ ممانی، مئی سے یہ کہے بنانہ رہ سکیں ”فارحہ! داماد تو تمہیں اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیا ہے۔“

”آپ کی دعائیں ہیں بھالی۔“ مئی نے بڑے عجز سے کہا۔  
اور ڈرنک روم میں نیسہ کی ایک ہم پیشہ ساتھی اس سے کہہ رہی تھی ”ہی از سو ہیڈ سم نیسہ کہ.....“

”تم دیکھو گی تو عاشق ہو جاؤ گی۔“  
”فارہ پور کا سنڈ انفارمیشن میں دیکھ چکی ہوں۔“  
”ریٹلی! کتنی بے ایمان ہو تم۔ ہم سے تو تم نے یہ کہا تھا کہ تم نے انہیں دیکھا نہیں ہے۔“ کمرے میں موجود نیسہ کی دوسری ہم پیشہ ساتھی نے کہا۔  
”یہ میں نے کب کہا تھا کہ میں نے تصویر نہیں دیکھی ہے۔“ نیسہ بولی۔  
”او یو جیسٹ۔“ نیسہ کی اول الذکر دوست نے پیار سے اس پر مٹکا تانتے ہوئے اس پر آنکھیں نکالیں۔  
نیسہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

مئی، منتہا اور ملیب آراستہ دیراستہ ہال میں براتیوں کے مخلوط اجتماع میں مہمانداری میں مصروف تھے۔ مئی کا دل جیسے کوئی مٹھی میں دوپچے لے رہا تھا۔ ایک عجیب سی کک محسوس کر رہی تھیں وہ، رہ رہ کر انہیں ایک کھٹک ایک ککی کا احساس ہو رہا تھا!

منتہا کا ایک پاؤں یہاں تھا تو دوسرا وہاں۔ فضلہ سمیت اس کی بہت سی کونگیز اور ان کے اہل خانہ کی آمد نے تقریب کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا۔ فضلہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں ایسے لگی ہوئی تھی کہ برات میں شامل ایک خاتون منتہا سے یہ پوچھنے پر مجبور ہو گئیں کہ آسمانی جوڑے میں ملبوس اس خاتون سے دلہن کا کیا رشتہ تھا۔ سلک کے آسمانی رنگ کے جوڑے میں ملبوس فضلہ کسی طرح بھی جوان بچوں کی ماں نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہ بھی خدا کی دین تھی اسے ورنہ زندگی نے تو اسے محرومیاں جھولی بھر اور طمانیت چٹکی بھر ہی دی تھی۔

آر سی مصحف، دودھ پلائی، سلائی اور دوسری بہت سی چھوٹی موٹی رسوم کی انجام دہی کے دوران مسز ظہیر کی دونوں بیٹیاں، چھوٹا بیٹا، داماد اور چھوٹی بیٹی کا منگیتر جو اس شادی میں شرکت کے لیے بطور خاص چھٹی لے کر بیرون ملک سے پاکستان آیا تھا انتہائی پیش پیش رہے۔

رسوں سے فراغت کے بعد تقریباً ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ کھانا شروع ہوا۔ مئی، منتہا، ملیب، ممانی اور ان کے ساتھ مدحہ بھی آگے بڑھ کر خاطر مدارات میں مصروف رہیں۔ فضلہ بھی اس سلسلے میں اپنوں کی طرح پیش پیش رہی۔

منتہا ایک مہمان خاتون کو خالی پلیٹ لیے کھڑے دیکھ کر ان کی جانب بڑھی اور بولی ”آپ کچھ لیجئے نا پلیز۔“  
”جی..... لیتی ہوں دراصل میں..... میں اپنے میاں کی تلاش میں ہوں۔“ انہوں نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ..... وہ کہاں ہیں؟“  
”یہی تو میں دیکھ رہی ہوں۔“  
”آپ کھانا شروع کیجئے میں انہیں دیکھتی ہوں۔“  
”کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟“



”جی نہیں۔“

”تو پھر آپ انہیں کیونکر دیکھیں گی؟“

”ان کی خالی پلیٹ سے۔ جس طرح آپ ان کی تلاش میں ہیں اسی طرح وہ بھی آپ کی تلاش میں ہوں گے۔“

”جی نہیں، ان کے ہاتھ میں پلیٹ نہیں گود میں بچہ ہو گا۔ وہ رو رہا تھا اسی کو بہلانے لے گئے تھے۔“

”وہ دیکھیے..... اُدھر“ منتہا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ”گود میں تو ان صاحب کے بھی بچہ ہے۔“

مسمان خاتون نے گردن موڑ کر دیکھا پھر منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں ”تھینک یو ویری مچ۔“

”یو ویکم۔“

”باقی دی دے آپ نے ایک منٹ میں انہیں تلاش کیسے کر لیا؟“

”ان کی گود میں بچہ دیکھ کر۔“ منتہا مسکرا کر بولی۔

”تھینک یو!“ خاتون خالی پلیٹ کے ساتھ اپنے شوہر کی جانب بڑھ گئیں۔

منتہا دھیرے سے مسکراتے ہوئے پٹی تو اس نے خود کو مسز ظہیر کے روبرو پایا۔ ہاتھوں میں پلیٹ سنبھالے وہ ایک

دراز قامت اور ہینڈ سم نوجوان کے ساتھ اس کے مقابل کھڑی تھیں۔

”ہم نے سنا ہے دلہن کی ایک بہن بھی ہیں۔“ مسز ظہیر بہت خوش نظر آتی تھیں۔

”جی ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔“ منتہا مسکراتے ہوئے بولی۔

”کہاں ہو بھی ہم اتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

”یہیں ہوں مسز ظہیر۔“

”خبردار جو تم نے آج کے بعد ہمیں مسز ظہیر کہا۔ ارے بھی اب ہماری اور آپ کی باقاعدہ باضابطہ رشتہ داری

ہو چکی ہے۔ اب آئی کہا کرو ہمیں۔“

”جی بہتر۔“

مسز ظہیر نے اپنے ساتھ کھڑے نوجوان کی جانب دیکھا اور اس سے بولیں ”یہ ہماری دلہن کی بہن ہیں۔“

اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے سر کی خفیف سی جنبش سے اسے دس کیا پھر شستہ لہجے میں بولا ”آپ سے

مل کر مسرت ہوئی۔“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی مسز ظہیر شگفتہ لہجے میں نوجوان سے بولیں ”اب انہیں بھی مسرور ہونے کا موقع

دو۔“ پھر انہوں نے روئے سخن منتہا کی جانب کیا اور نوجوان کو اس سے متعارف کرایا ”یہ نعیم ہیں..... اچھی بھالی کے

بڑے صاحبزادے۔“

منتہا نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

میرج ہال کی چکا چونڈ روشنیوں میں وہ انتہائی وقار سے کھڑا بڑے قرینے سے مسکرا رہا تھا۔

(باقی آئندہ)

پس منظر میں دھیمے دھیمے بجتے سازینے نے سارے پیش منظر کو بے حد سحرناک بنا رکھا تھا!

ہر ماہ اپنا پسندیدہ ماہنامہ پاکیزہ بذریعہ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک گھر بیٹھے حاصل کیجئے

بیرون ملک کے قارئین کے ڈرافٹ یا انٹرنیشنل منی آرڈر کراچی میں واقع کسی بینک میں قابل ادائی ہونا ضروری ہیں۔ بصورت دیگر بینک

کمیشن کی رقم بھی ارسال فرمائیں جو ڈرافٹ ہو سکتی ہے۔

FOR BANK TRANSFER : JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS, A/C No. 400094-78 HABIB BANK LTD., MANSFIELD STREET BRANCH, KARACHI, PAKISTAN.

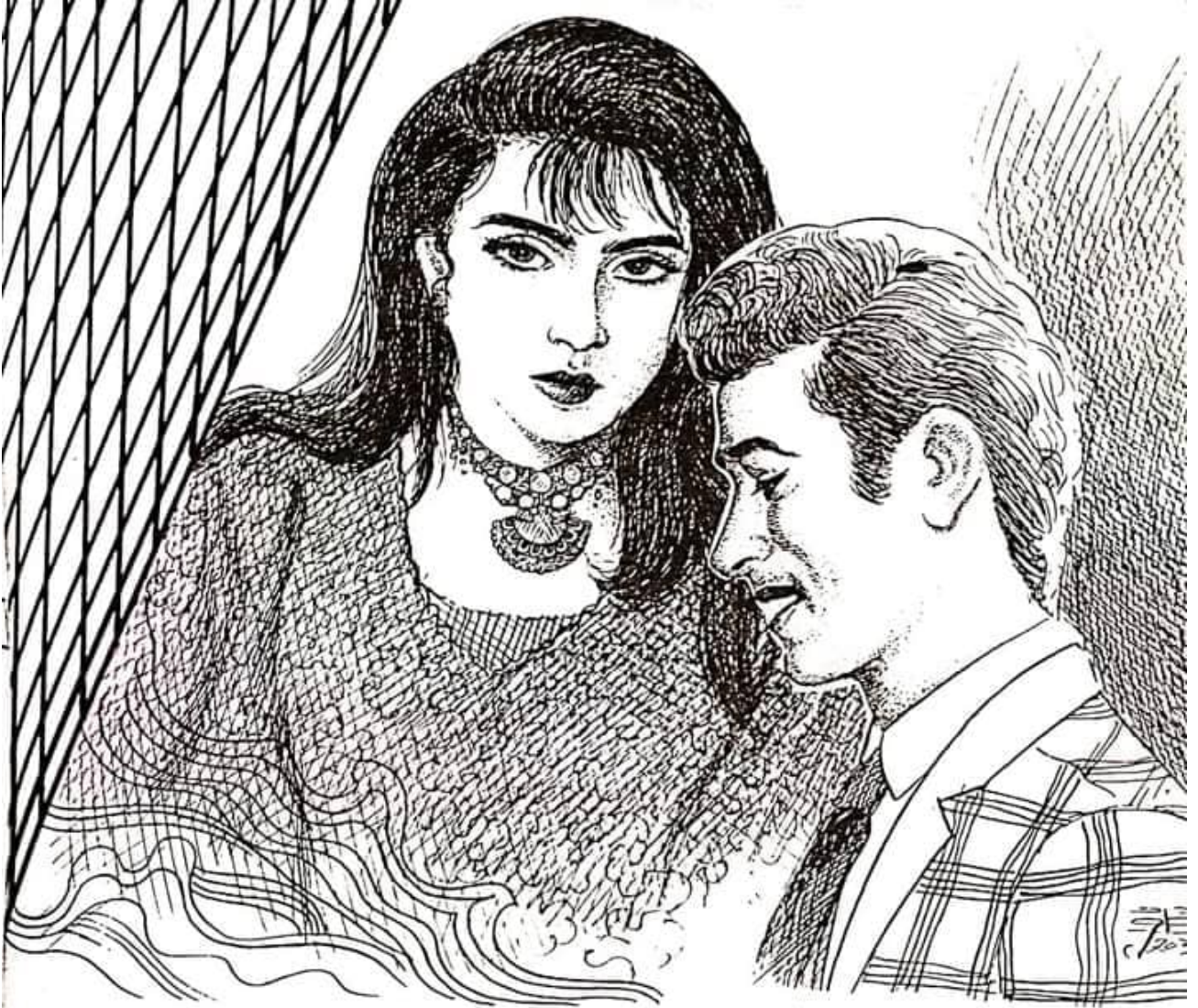
رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے زر سالانہ مع ڈاک خرچ

اندرون ملک کے لئے 550 روپے

ایشیا پرپ اور آفریقا کے لئے 1800 روپے

آسٹریلیا اور آسٹریلیا کے لئے 2400 روپے





**KSK Novels**



ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیسی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک مسامحہ کی دل گداز داستان

FEBRUARY.2003 ○ PAKEEZA ○ 74





قطة 8



"ارے بھی کئے نا آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔" مسز ظہیر نے منتہا سے کہا۔  
 "جی۔ جی ہاں۔ آ۔ آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔" اس نے اکتے ہوئے کہا۔  
 "توازش!" وہ بڑی متانت سے مسکرا دیا۔

"یہ ہمارے خاص الخاص مہمان ہیں۔" مسز ظہیر نے مسکراتے ہوئے نعیم کی جانب دیکھا اور منتہا سے بولیں "فرمان  
 میاں کی شادی میں شریک ہونے کے لیے یہ آج صبح ہی دہلی سے یہاں پہنچے ہیں۔ نعیم ہمارے ہونے والے دامادان کے برادر  
 خورد ہوتے ہیں۔"

"جی۔ آپ نے بتایا تھا۔" منتہا بولی۔  
 "ہم نے تو ان کے بارے میں بھی بتایا تھا آپ کو۔" مسز ظہیر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔  
 وہ انجان سی بن گئی۔

"آپ ذرا ان کی خاطر داری کا خیال کیجئے ہم اوروں کی خبر لے لیں۔" مسز ظہیر نے نعیم کی خاطر داری اسے سوچی اور اپنی  
 پلیٹ لیے آگے بڑھ گئیں۔  
 دونوں کی نگاہیں باہم ملیں۔

"آ۔ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟"  
 "پھوپھی جان مجھے آپ کے حوالے کر گئی ہیں۔ آپ کہیں گی تو کھالوں گا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔  
 "پلیز!" منتہا نے نوع بنوع کھانوں سے مزین میزوں کی سمت اس کی رہنمائی کی۔  
 "تھینک یو۔"

"یو ویلکم۔ مجھے اجازت دیجئے ذرا دوسرے مہمانوں کو بھی دیکھ لوں۔"  
 "جی ضرور۔"

وہ آگے بڑھ گئی۔

"میڈم ذرا سنئے گا۔"

وائس جانب سے سنائی دینے والی آواز شناسا تھی۔ وہ تھم گئی اور فنفہ اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔  
 "کون ہے وہ؟" فنفہ نے پوچھا۔

"کون!" وہ انجان بن گئی۔

"وہی جسے تم کھانے کی میز تک پہنچا کر آئی ہو۔"

"دولہا کا کزن۔" اس نے فنفہ سے نظریں چڑا رکھی تھیں۔

"ویسے ہے براڈ۔ لیشنگ!" فنفہ نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی نظریں اسی میز کی سمت تھیں جہاں وہ کھڑا تھا۔  
 "بچلہ ہے یا۔؟" فنفہ کی نگاہوں میں معنی خیزی ناچ رہی تھی۔

"پتا نہیں۔"

"پتا: دنا چاہیے۔"

"کیوں پتا: دنا چاہیے۔"

"کیونکہ وہ تمہاری طرف ہی دیکھ رہا ہے۔" فنفہ نے کن انکھیوں سے اسی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

منتہا نے چونک کر اُدھر نگاہ کی۔

وہ واقعی اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

منتہا نے ہر برا کر نظریں چڑا لیں۔



”دولہا کا کس رشتے سے کزن ہے؟“ فضہ نے سرگوشی میں کہا۔  
”تمہیں اتنا تجسس کیوں؟“  
”ایسی ڈیشننگ پر سٹالٹیز کبھی کبھی دکھائی دیتی ہیں ڈیر۔ بالی دی دے نام کیا ہے اس کا؟“  
”پتا نہیں۔“ منتہا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔  
”جھوٹ مت بولو۔ میں نے خود دیکھا وہ تم سے باتیں کر رہا تھا۔“  
”ضروری تو نہیں کہ اس نے اپنا نام ہی بتایا ہو۔“  
”تم کہو تو میں معلوم کروں اس کا نام اور اتا پتا۔“ فضہ کے لبوں پر بڑی معنی خیزی مسکراہٹ تھی۔  
”شکریہ۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔“  
”آریو شیور؟“  
”لیس آئی ایم۔“  
”اے پتھر دل حینہ تو آخر کب موم ہوگی۔“ فضہ مسکرائی۔  
”شاعری بعد میں کر لینا، یہ مہمانوں کی خاطر دیر رات کا وقت ہے۔ تم اس طرف جاؤ میں ادھر کا راستہ پکڑتی ہوں۔“  
”آل رائٹ۔ آل رائٹ۔“ فضہ مسکرائی۔  
منتہا جانے کو مڑی۔  
”مگر۔“ فضہ کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔  
”مگر کیا؟“ اس نے پلٹ کر فضہ کی طرف دیکھا۔  
”اس کا نام تو پوچھ لیا ہوتا۔“  
”مجھے معلوم ہے۔“  
”اچھا!“ فضہ چونکی ”ہمیں بھی بتا دو نا۔“  
”نعیم۔“  
فضہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔  
منتہا مسکرا دی۔  
فضہ نے کن انکھیوں سے نعیم کی جانب دیکھا پھر منتہا کی طرف دیکھتے ہوئے دانت کچکا کر بولی ”بے ایمان!“  
منتہا کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔  
”میں تمہیں قتل کر دوں گی۔ سمجھیں۔“ فضہ نے اسے گھورا۔  
”تمہارے ہاتھوں قتل ہو کر مجھے خوشی ہوگی۔“ منتہا نے خوش دلی سے کہا اور مسکراتی ہوئی مہمان خواتین کی جانب بڑھ گئی۔  
نعیم کی متجسس نگاہیں اس کے تعاقب میں تھیں۔ فرحان کی شادی میں وہ بغیر کسی پیٹنگی پروگرام کے اچانک ہی آ گیا تھا۔  
گزشتہ شب تک اس کا اس شادی میں شرکت کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ رات گئے وہ پاکستانی کیونٹی کے ایک ثقافتی پروگرام میں شرکت کے بعد اپنے اپارٹمنٹ واپس لوٹا تو خیال آیا کہ کل فرحان کی شادی ہے، آج تو مندی کی رات ہے سارا خاندان اکٹھا ہو گا اور لڑکے لڑکیوں نے ہنگامہ مچا رکھا ہو گا۔ کیوں نہ فون کر کے پھوپھی جان اور فرحان کو شادی کی مبارکباد کل کے بجائے آج ہی دے دی جائے اور باقی لوگوں سے بھی ہیلو ہائے کر لی جائے۔ فون کیا تو وہ ہنگامہ سماعت تک پہنچا کہ الاماں! اسے یوں لگا جیسے وہ بنفس نفیس اس تقریب میں جا پہنچا تھا۔ فون پر جس جس سے بات ہوئی ہر ایک نے خواہ رہنمایا و اعتنائی کہا کہ اس کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ امی بھی آئی ہوئی تھیں ان سے بھی بات ہوئی اور انہوں نے یہ کہہ کر کہ سب آئے ہوئے ہیں بس ایک

تم ہی نہیں دکھائی دے رہے ہو اس کے دل کو ایسا برمایا کہ پاکستان سے رابطہ منقطع ہوتے ہی اس نے اپنے پاس سے اس کے ہنگامی نمبر پر رابطہ کر کے چھٹی لی اور پہلی دستیاب پرواز سے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی صبح وہ پاکستان میں تھا۔ امی اور نعیم اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔

”خیریت تو ہے بیٹا اتنے اچانک؟“ امی نے اسے پیار کرنے کے بعد پوچھا۔

”جی سب خیریت ہے اور اچانک اس لیے کہ آپ نے رات کو فون پر بات ہی ایسی کہہ دی تھی۔“

”کیا کہہ دی تھی؟“ امی چونکیں۔

”یہی کہ سب آئے ہوئے ہیں بس ایک تم ہی نہیں دکھائی دے رہے ہو۔“

امی کی آنکھیں بے اختیار ڈبڈبائیں۔

”ہاں بیٹا میرے لیے تو تم دونوں بھائی ہی میری آنکھیں ہو۔ میں تو انہی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتی ہوں۔ تمہی دونوں کے سارے تو میں نے اپنی زندگی گزار دی۔ جب تمہارے ابو کا انتقال ہوا تو میں تیس سال کی تھی۔ خاندان والے کہا کرتے تھے ‘اچھی بی! پھاڑی زندگی کیسے گزارو گی۔ میں اپنے دونوں ہاتھ تم دونوں بھائیوں کے کندھوں پر رکھ کر جواب دیتی‘ ان کے سارے۔“ امی کی آواز بھرا گئی۔

”آپ بہت عظیم ہیں امی جان۔“

نعیم اور نعیم نے انہیں دائیں بائیں سے یوں اپنے درمیان لے لیا جیسے انہیں اب ہر آزمائش ہر افتاد سے بچالینا چاہتے ہوں۔

امی نے نظر اٹھا کر پہلے نعیم کو پھر نعیم کو بہت پیار سے دیکھا۔

”حضرت! آنا تھا تو میرے ساتھ ہی آگئے ہوتے۔“ نعیم نے بھائی سے کہا۔

”یار کوئی پروگرام نہیں تھا۔ کل رات امی سے بات ہونے تک کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس اچانک دل نے کہا کھانا کھانا تو ساری زندگی کا ہے ایسے موقعے کم کم آتے ہیں جب سارا خاندان اکٹھا ہو اور خوش بھی۔ لہذا میں نے باس سے تین دن کی چھٹی کی درخواست کی۔ وہ بھی کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے پانچ دن کی چھٹی عنایت کر دی۔ ویک اینڈ کو ملا کر ایک ہفتے کی رخصت! “دیری گڈ!“ نعیم نے بھائی کو رشک سے دیکھا۔

امی نے متا بھری نگاہوں سے نعیم کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولیں ”بہت اچھا کیا جو چلے آئے۔ پھوپھی جان تمہاری خوش ہو جائیں گی۔ سلمیٰ بے چاری نے بھی بڑی سختیوں میں مگر بہت ہمت اور حوصلے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ اب اللہ نے کچھ فراغت دی ہے انہیں۔ فرحان میاں کی شادی نے انہیں باغ باغ کر رکھا ہے۔“

”سنا ہے فرحان کی ہونے والی دلسن ڈاکٹر اور ان کی کسی کو لگ کی بہن ہے۔“

”ہاں۔ ماشاء اللہ ڈاکٹر ہے اور دیکھنے میں بھی بڑی پیاری لڑکی ہے۔“

”آپ نے دیکھی؟“

”ہاں جن دنوں فرحان کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی تمہاری پھوپھی جان ایک روز مجھے بھی لے گئیں تھیں لڑکی والوں کے ہاں۔ اچھے شریف سے لوگ ہیں۔ تمہاری پھوپھی جان کی نظر تو لڑکی کی بڑی بہن پر بھی تھی تمہارے لیے مگر لڑکی راضی نہیں ہوئی ورنہ شاید تمہاری پھوپھی جان کے ساتھ ساتھ میں بھی نہٹ جاتی تم سے۔“

”دیکھ لیجئے یہ زمانہ آگیا ہے۔“ نعیم نے شرارت بھری نظروں سے نعیم کو دیکھا اور بولا ”کبھی لڑکے راضی نہیں ہوا کرتے تھے اب لڑکیاں راضی نہیں ہوتیں۔“

”یار اب ایسی بھی ناشکری مت کرو۔ ایک تو راضی ہو گئی ہے۔“ نعیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کون؟“ امی نے چونک کر نعیم کی طرف دیکھا۔



"لیلیٰ امی جان۔"

"اوہو! میں تو کچھ اور ہی سمجھی تھی۔"

"کچھ اور کیا؟"

"میں سمجھی تھی تم نے وہاں دہائی میں کوئی دیکھ لی ہے شاید۔"

"یہ گستاخی کر سکتا ہوں بھلا۔"

"جیتے رہو۔ اچھا بھئی میں ذرا تمہاری پھوپھی جان کو فون کر کے خبر دے دوں تمہارے آنے کی۔"

"اوہو! نہیں۔" نعیم نے انہیں روکا۔

"کیوں؟"

"میں اچانک وہاں جا کر سر پرانہ دوں گا ان سب کو۔"

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ ہاں یہ بتاؤ شام کو برات میں پہنوں گے کیا۔ نعیم کے لیے تو تمہاری پھوپھی جان نے برات اور ولیمہ دونوں کے لیے خود ہی کپڑے تیار کروا کے بھجوائے ہیں۔"

"اے! نعیم نے پیار سے نعیم کے بازو پر آہستگی سے مٹکا مارتے ہوئے مسکرا کر کہا "ابھی سے خراج دامادی وصول کر رہے ہو۔"

"بڑی بہن راضی ہو گئی ہو تیں تو لڑکی والوں کے ہاں سے آپ کے بھی جوڑے سج کر آتے تھال میں۔" نعیم نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"لڑکی اچھی تھی۔ تمہاری پھوپھی جان اس کی سمجھداری کی تعریف کرتی ہیں۔ راضی ہو جاتی تو میں تو فوراً رشتہ دے دیتی تمہارا۔"

"ارے امی لڑکیوں کی کوئی کمی تھوری ہے آپ کے اس خوش شکل، خوش لباس اور برسرِ روزگار بیٹے کے لیے۔"

"سب سے مضبوط پوائنٹ تو آپ بھول ہی گئے۔" نعیم بولا۔

"وہ کیا؟"

"دہائی۔"

نعیم کے لبوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اپنا ہاتھ نعیم کے شانے پر دھرتے ہوئے اپنا منہ اُس کے کان کے نزدیک کر کے بولا "آپس کی بات ہے یا یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ وطن اور اپنوں سے دوری کی قیمت میں ملنے والا اسٹینس ہمیں کبھی کبھی کتنا ترپاتا ہے۔"

امی نے چونک کر نعیم کو دیکھا۔

نعیم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے ماں کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"اسی لیے میں تم دونوں کی شادیاں جلد کر دینا چاہتی ہوں۔ اپنے بیوی بچے ساتھ ہوں تو دیرانہ بھی چمن لگنے لگتا ہے۔"

"امی جان دہائی تو بیوی بچوں کے بغیر بھی چمن لگتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ نعیم بھائی آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔"

"تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو میں بھی وہیں آ جاؤں گی۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" نعیم چکا۔

"امی جان زندہ باد!" نعیم نے امی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

شام کو جب وہ امی اور نعیم کے ہمراہ فرحان کی شادی میں شریک ہونے کے لیے پھوپھی جان کے ہاں پہنچا تو سب متعجب رہ گئے۔

"ارے! تم کب آئے؟" ہر ایک کا یہی سوال تھا۔

”آج صبح۔“

”میاں کسی کو ہوا تک نہیں دی اپنے آنے کی۔“ ظہیر صاحب بولے۔

”بس پھوپھا جان ایسے آنے میں زیادہ لطف محسوس ہوا۔“

”تمہارے آنے کی ہمیں اتنی خوشی ہوئی ہے نعیم کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ تم نے آکر بڑے بھیا کی کمی پوری کر دی۔“ مرحوم بھائی کے ذکر پر مسز ظہیر آبدیدہ ہو گئیں۔

”نعیم نے آگے بڑھ کر انہیں دلا سادینے کی کوشش کی مگر آنسوؤں پر بندھے بند گویا یکبارگی ٹوٹ گئے۔ مسز ظہیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور آن کی آن بھی کی آنکھیں بھر آئیں۔ جانے والے خوشی کے موقع پر بھی کیسے ٹوٹ کر یاد آتے ہیں! فرحان کے دولہا بننے کے دوران کزنز اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ تمام کزنز میں نعیم سے فرحان کی خاصی بے تکلفی رہی تھی۔ اور جب سے دونوں بسلسلہ معاش بیرون ملک یکجا ہوئے تھے یہ دوستی اور بڑھ گئی تھی، سو اس کے دولہا بننے وقت کزنز کی چھیڑ چھاڑ اور جملہ بازیوں میں نعیم سرفروست تھا۔ فرحان کے سرسرا باندا جانے لگا تو نعیم نے اپنا دایاں ہاتھ سرے کے سامنے کر کے انگلیاں نچاتے ہوئے دوسرے کزنز کی جانب دیکھ کر آنکھ دبا لی اور بولا ”فرحان بیٹے اس وقت تو تمہیں سرے کی ہر لڑی کے پیچھے سے میرے ہاتھ کی پانچ انگلیاں نظر آرہی ہوں گی ذرا ٹوٹل تو بتاؤ۔“

”نعیم میاں ذرا تم اپنے سر سرابندھنے دو“ اپنے اس سوال کا جواب تمہیں خود ہی مل جائے گا۔“ آنی نے کہا۔

”کیوں بد دعا دیتی ہیں آنی!“ نعیم نے مسکراتے ہوئے آنی کو دیکھا۔

”میاں! جلد یا بدیر یہ وقت تو سب پر آتا ہے۔“ چھوٹے پھوپھا بولے۔

”اچھی بھابھی، نعیم میاں پر یہ وقت کب آ رہا ہے؟“ منجھلی چچی نے پوچھا۔

”میرا بس چلے تو گھڑی کی چو تھائی میں لے آؤں وہ وقت۔“

”سن رہے ہو نعیم۔“

”جی سن رہا ہوں۔“

”کوئی لڑکی دیکھی مائی اماں؟“ چھوٹے چچا کی بیٹی رابعہ نے جو ابھی دو ڈھائی ماہ قبل اپنی شادی سے پہلے نعیم سے شادی کی امیدواروں میں تھی نعیم کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تلاش میں ہوں بیٹا، کوئی اچھی لڑکی ہو نظر میں تمہارے تو بتانا۔“

مسز ظہیر نے نعیم کا بازو دلوچ کر آہستہ سے اس کے کان میں سرگوشی کی ”میاں لڑکی تو تمہارے لیے ایسی ہے ہماری نظریں کہ راضی ہو جائے تو تم زندگی بھر ہمیں دعائیں دیتے رہو۔“

”نعیم نے چونک کر انہیں دیکھا۔“

”کیا۔ کیا کہا ہے پھوپھی جان نے تمہارے کان میں؟ ہمیں بھی بتاؤ۔“ بڑے تایا ابا کی بیٹی اور کزنز میں سب سے بڑی حمیرہ آپا چلائیں۔

”راز کی بات ہے۔“ نعیم مسکرایا۔

”بے ایمان۔“

”وہ تو یہ پیدا کنٹی ہیں۔“ فرحان نے چہرے سے سر اٹھا کر کہا۔

”اچھا، پتھر زرا اسرال کی چوکھٹ پر پہنچو پھر پوچھوں گا۔“

فرحان نے سر اچھوڑ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے سرے کے پیچھے سے بولا ”وہاں عزت رکھ لینا یا ر۔“

اچانک کمرے کی فلاش چمکی۔

”بہت شکریہ فوٹو گرافر صاحب۔“ نعیم نے بہ آواز بلند کہا۔



"اس کے چھتیس پر نٹ نکالے گا تاکہ سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔" نعیم چکا۔  
 "بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔" حمیرہ آپا نے نعیم اور نعیم کو باری باری گھورا۔  
 "آداب! آداب!" نعیم نیم خم ہوتے ہوئے فرشی سلام بجالایا۔

برات انتہائی ہنسی خوشی روانہ ہوئی۔  
 میرج ہال میں طعام شروع ہوا تو مسز ظہیر نے نعیم سے سرگوشی میں کہا "آؤ تمہیں اس لڑکی سے ملوائیں۔"  
 "کس لڑکی سے بھوپھی جان۔"

"ارے بھئی وہی جو ہم نے تمہارے لیے پسند کی تھی۔"  
 "وہی جو بقول آپ کے اگر راضی ہو جائے تو میں زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہوں۔"  
 "ہاں ہاں وہی۔"

"ارے جلدی سے دکھائیں بھوپھی جان میں تو اسے دیکھنے کو مرا جا رہا ہوں۔"  
 "ہائیں!" مسز ظہیر نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا "کیسے بے شرم ہو گئے ہیں آج کل کے لڑکے۔"  
 "بھوپھی جان آج کل کے نہیں لڑکے تو کل پر سوں کے بھی بے شرم ہی ہوا کرتے تھے۔"  
 "خدا کی پناہ!" مسز ظہیر نے مسکراتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔  
 "لڑکی جلدی دکھائیے نا۔"

"افوہ! کیا بے تابی ہے۔ کسوں اچھی بجا بھی ہے۔"  
 "پلیز! ضرور کہئے تاکہ مجھے کہنے کی ضرورت نہ رہے۔"

مسز ظہیر نے بڑے پیار سے اسے آنکھیں دکھائیں۔ وہ مسکرا دیا۔ مسز ظہیر نے وہیں کھڑے کھڑے چہار اطراف طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ منتہا مسمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھی۔  
 "آؤ ہم تمہیں اس سے ملوائیں۔"

اسے منتہا سے ملوا کر مسز ظہیر خود لڑھکھڑھو گئی تھیں۔ منتہا بھی اس سے مل کر جا چکی تھی مگر اس کی نگاہیں اسی کے تعاقب میں تھیں۔ شادی کی اس تقریب میں اس کے خاندان کی متعدد لڑکیاں ایسی تھیں جو شکل و صورت لباس اور ظاہری چمک دمک کے اعتبار سے اس لڑکی سے بہتر تھیں، مگر اس لڑکی میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور تھی جو اسے اس محفل میں موجود دوسری لڑکیوں سے منفرد اور ممتاز کرتی تھی۔

شاید اس کا انداز گفتگو!

شاید اس کی پُر اعتماد شخصیت!

شاید اس کا احساس ذمے داری!

اتنی بڑی محفل میں وہ فرداً فرداً ہر مسمان کی انتہائی خندہ پیشانی سے خاطر مدارات کر کے حق میزبانی ادا کرتی اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمے دار لگ رہی تھی اور شاید یہی احساس ذمے داری اس کی ذات کو ایک انفرادیت بخش رہا تھا اور وہ شاید اسی لیے خود کو اس کی جانب ملتفت ہوتے محسوس کر رہا تھا کہ ہوش سنبھالنے پر باپ کے سائے سے محرومی کے احساس نے خود اس کی اپنی ذات میں بھی ایسا ہی احساس ذمے داری جاگزیں کر دیا تھا جس نے اسے اس کی اصل عمر سے کہیں آگے لے جا کر کھڑا کیا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ اپنی فطرت سے انحراف کر کے وہ کبھی کبھی اسی طرح "لائٹ موڈ" اختیار کر لیا کرتا تھا جیسا کہ اس شام فرحان کی سرابند حالی کے موقع پر کیا تھا۔

وہ اس کی نگاہوں کی زد سے نکل کر مسمانوں کے ہجوم میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ اس نے بھولے سے بھی پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا حالانکہ خاندان ہی نہیں باہر کے لوگ بھی اس کی متاثر کن شخصیت کے مداح تھے۔ کتنے لوگ تھے خاندان

میں جو اپنی بیٹیاں اس سے بیاہنے کے آرزو مند تھے اور اس سلسلے میں اس سے اور امی سے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ بھی بات کی تھی اور پھر مایوس ہو کر بیٹیوں کے رشتے کہیں اور کرتے جا رہے تھے۔ وہاں دینی میں کئی پاکستانی اور انڈین گھرانے تھے جنہوں نے اس پر گھات لگا رکھی تھی۔

مگر اس کے اپنے کچھ خواب کچھ خواہشیں تھیں۔

ابو کے بعد اگرچہ خاندان والوں نے مل جل کر امی اور ان دونوں بھائیوں کا ہر طرح سے خیال رکھنے کی کوشش کی تھی کہ مگر تے کو سارا دینا اور سنبھال لینا اس خاندان کا دستور تھا مگر انسان فقط معاشی حاجتوں کا تو تابع نہیں بے شمار اور ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق محسوسات سے ہوتا ہے۔ معاشی اور معاشرتی ضرورتیں پوری ہو جانے کے بعد ان گنت ایسی ضرورتیں جن کا تعلق دل اور محسوسات سے تھا بے پاؤں دو بیٹوں اور ان کی ماں پر مشتمل اس مختصر سے کنبے کے ساتھ چلی تھیں اور محرومیوں کا روپ دھار گئی تھیں اور یہ نعیم کا عہد تھا اپنے دل سے اپنی ذات سے کہ زندگی سے اپنے حصے کی کوئی خوشی وصول کرنے سے قبل امی اور نعیم کی ان تمام محرومیوں کی تشریف کرے گا جو انہوں نے چپ چاپ سہی تھیں۔ ابو کے جھوڑے ہوئے مکان کو امی کے لیے ایک پُر آسائش اور آرام دہ گھر میں بدل دینا، انہیں حج کروانا، ان کے لیے ایسی ہوسیں گھرانہ جو انہیں وہی عزت و حکم دیں جتنی کہ وہ دونوں بھائی دیا کرتے تھے۔

اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے اسے بادل ناخواستہ امی سے دور جانا پڑا تھا۔ تقریباً دس سال ہو گئے تھے اسے دینی میں ملازمت کرتے۔ ان دس سالوں میں اس نے ابو کی جانب سے ترکے میں ملنے والے مکان کو دو منزلہ خوبصورت گھر میں بدل ڈالا تھا جہاں افراد کنبہ کی ضرورت اور آسائش کا ہر سامان میسر تھا۔ گھر کیلوا استعمال کی ڈھیروں جدید ترین اشیا تو وہ خود دینی سے لے کر آیا تھا۔ گھر میں گاڑی بھی تھی اور گھر کی دیکھ بھال میں امی کی مدد کے لیے اس نے انہیں ایک ہمہ وقتی ملازمہ رکھ دی تھی۔ بیوہ عورت تھی۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ چھٹی والے دن یا عید تہوار پر اپنے بھائی بھتیجیوں سے ملنے جاتی اور مل کر آجاتی۔ امی کو اس نے عمر و اور حج بھی کروا دیا تھا۔ کوئی تین ساڑھے تین سال قبل موقع ملنے پر اس نے نعیم کو بھی ملازمت کے دیزے پر اپنے پاس بلا لیا تھا اور پھر بڑی پھوپھی کی بیٹی لیلیٰ سے اس کی نسبت بھی طے کرادی تھی، حالانکہ امی بہت جربز ہوئی تھیں، ان کا خیال تھا کہ وہ بڑا ہے لہذا پہلے اس کی بات کہیں طے ہونا ضروری تھی مگر اس نے امی کو مختلف دلیلیں اور تاویلیں دے کر مجبور کرنے کی کوشش کی۔

”امی جان لیلیٰ بہت اچھی لڑکی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے خاندان کی ہے۔“ اس کی سب سے بڑی تاویل یہ تھی۔

”مجھے انکار نہیں مگر بڑے تو تم ہونا بیٹے۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پڑتا ہے۔ سب لوگ کیا کہیں گے۔“

”آپ لوگوں کی پروا نہ کریں۔ پھوپھی جان نے لیلیٰ کی بات کہیں اور طے کر دی تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“

”کیا مسئلہ ہو جائے گا۔ کر دیں جہاں جی چاہے اُن کا۔ ہمیں کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔“

”لڑکیوں کی تو کمی نہیں امی جان مگر۔“

”مگر؟“

”نعیم، لیلیٰ کو پسند کرتا ہے۔“

”تم سے کس نے کہا؟“

”مجھے اندازہ ہے۔“

”گذا دیہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر تو یہ رشتہ ضرور طے ہو جانا چاہیے بلکہ پہلی فرصت میں۔“



”نہیم!“

”جی امی جان۔“

”بڑے تم ہو پہلے تمہاری شادی ہوگی بیٹے پھر نہیم کی۔“ امی رسان لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے مگر ممکن تو پہلے نہیم کی ہو سکتی ہے نا۔“

”ہرگز نہیں، ممکن بھی پہلے تمہاری ہی ہوگی۔“

”امی جان پلیز ایسی شرط نہ لگائیں۔ دیکھئے مجھے ممکن بھی پہلے کرنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن کوئی لڑکی تو ہو۔“

”لڑکیاں بہت۔“

”میں بہت نہیں صرف ایک لڑکی سے شادی کروں گا جو میری پسند کی ہوگی۔“

”ہاں ہاں تم اپنی پسند بتاؤ تو سہی رشتے لے کر جانا اور منظور کرانا میرا کام۔“

”مسئلہ تو یہی ہے کہ ان بہت ساری لڑکیوں میں سے مجھے کوئی پسند نہیں۔ جب کوئی پسند آجائے گی تو آپ کو بتا دوں گا مگر

اس وجہ سے آپ ایک اچھی لڑکی کو تو ہاتھ سے نہ جانے دیں نا۔ لیلیٰ اس گھر کے لیے اچھی لڑکی ثابت ہوگی۔ میں نے دیکھا ہے

وہ آپ کا بہت احترام کرتی ہے۔“

”مجھے اس سے کب انکار ہے۔ سلمیٰ نے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے، انہیں بڑوں کا احترام سکھایا ہے۔ ماشا اللہ

دونوں ہی بچیاں بہت سلجھی ہوئی ہیں اور ماں کی طرح ملنسار اور ہمدرد ہیں۔ اسی تربیت کا اثر ہے کہ بیلا اپنی سسرال میں چھاگنی

ہے۔ ساس کو امی جان کہتے منہ سوکھتا ہے اس کا۔ نتیجتاً ساس بھی اسے گلے سے لگائے رکھتی ہیں۔ سلمیٰ کے بچوں میں ایک

خوبی اور بھی ہے۔ ہماری طرح اچھے بڑے سب دن دیکھ رکھے ہیں انہوں نے۔ تنگی، فراغت ہر حال گزارہ کر سکتے ہیں۔“

”پھر دیر کس بات کی امی جان۔ ہمیں اس گھر میں ایسی ہی لڑکیاں تو چاہئیں جو تنگی، فراغت ہر حال میں گزارہ کرنا جانتی

ہوں۔ لیلیٰ کا رشتہ گنوا دینا ایک ایسی غلطی ہوگی جس پر ہم ہی نہیں شاید ہماری اگلی نسلیں بھی پچھتائیں گی۔“

امی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں امی جان۔“ اس نے بہت پیار سے اپنا بازو امی کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی لڑکی اپنے لیے بھی بتا دو، میں تم دونوں بھائیوں کی اکٹھے نسبت طے کئے دیتی ہوں۔“ امی نے پیار سے اس کا گال

چھوا۔

”میں نے کہا نا جب کوئی پسند آجائے گی بتا دوں گا۔“

”کیوں الٹی گنگا بہانے کی کوشش کر رہے ہو، پہلے بڑوں کو نمٹنا چاہیے کہ۔“

”اوہو امی جان پھر وہی نکتہ پکڑنے کی کوشش نہ کریں، بس نہیم کی لیلیٰ سے بات طے کر دیجئے۔“

امی اسے شاکی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

”حکم دے رہے ہو؟“

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

”درخواست کر رہا ہوں امی جان۔ آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ ابو اور پھوپھی جان میں بہت محبت تھی۔ نہیم کا رشتہ

وہاں ہونے پر شاید ابو کی روح بھی خوش ہو جائے۔“

امی نے گھٹی گھٹی ایک سرد آہ کھینچی۔

”پلیز امی جان۔“ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”نسبت طے کروں گی مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ وہ اچھل کر ان کے قدموں سے اٹھا اور ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"شادی پہلے تمہاری ہوگی یا پھر دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ۔"  
"منکور۔"

اور یوں نعیم کی لیلیٰ سے منگنی ہو گئی۔ اس منگنی نے نعیم سے نعیم کی محبت کو دو آتشہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیلیٰ اسے اچھی لگتی تھی۔ دل کے کسی گوشے میں اسے ہمیشہ کے لیے پالنے کی خواہش بھی رکھتا تھا مگر اسے اس حقیقت کا ادراک بھی تھا کہ نعیم اس کا بڑا بھائی ہے، پہلے اس کی شادی کی بات چلے گی، اس کا رشتہ کیسے طے ہوگا پھر شادی ہوگی اس کے بعد اس کا اپنا نمبر آئے گا۔ اس دوران لیلیٰ کے مقدر کا فیصلہ نہ جانے کیا ہو چکا ہو۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھائی اس کی زندگی کی دشوار ترین منزل کو یوں آسان کر دے گا۔ منگنی کے بعد جب نعیم نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے پوچھا "ہاں یا خوش ہو؟" تو وہ اس سے لپٹ کر رونے لگا تھا۔

"ارے! ارے! روتے کیوں ہو یا ر، اطمینان رکھو انشاء اللہ تمہاری شادی بھی جلدی کر دیں گے۔"  
وہ روتے روتے مسکرا رہا اور جھینپ کر بولا "میں اس لیے تو نہیں رورہا؟"  
"تو پھر کاہے کے لیے رورہے ہو!"

"یو آر گرٹ بھائی۔ یو آر نیلی گرٹ۔" وہ دوبارہ اس سے لپٹ کر رونے لگا۔

منگنی کے بعد نعیم نے بھائی سے سالار جنگ فرحان کی سفارش کروائی تو پہلے اسے وزٹ ویزا پر دینی بلوایا پھر بنگرانہ تعلقات کے بل بوتے پر نعیم کی نوکری بھی لگوا دی۔ نعیم کی ان کرم فرمائیاں پر فرحان ہی نہیں پھوپھی جان یعنی مسز ظہیر اور ان کا پورا گھرانہ نعیم کا مشکور تھا اور نعیم کا احسان مند کہ وہی تو تھا جس نے نعیم سے فرحان کی سفارش کی تھی۔ مگر نعیم ایسا منکسر المزاج نوجوان تھا کہ جب کبھی فرحان یا اس کے اہل خانہ میں سے کوئی اس کی اس مہربانی پر شکر گزاری ظاہر کرتا تو وہ بڑی انکساری سے کہتا "میرا کیا اختیار کہ میں کسی کے لیے کچھ کر سکوں، اللہ میاں نے فرحان کا دانہ پانی باہر کا لکھا تھا سو راستے آپ ہی آپ بن گئے۔"

مسز ظہیر کا ارادہ تو یہ تھا کہ دونوں بیٹیوں کو رخصت کر کے ہو گھر لائیں گی لیکن نعیم سے لیلیٰ کی منگنی کے بعد نعیم کی شادی ہونے سے قبل نعیم کی شادی نہ ہونے کے آثار پا کر انہوں نے فرحان کی شادی کر دینے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے لڑکی بھی نظر میں تھی بل منڈھے چرحتی چلی گئی۔ چاہتی تو وہ یہ تھیں کہ نعیم کا رشتہ مننتا سے طے ہو جائے تاکہ اچھی بھابھی دونوں بیٹیوں کے فرض سے اور وہ لیلیٰ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں مگر مننتا کے انکار نے گڑبڑ کر دی تاہم انہوں نے اس سلسلے میں اپنی کوششیں ترک نہیں کی تھیں۔ فرحان کی شادی میں نعیم اور مننتا کو ایک دوسرے سے متعارف کرانا انہی کوششوں کی کڑی تھی۔

○☆☆○

پہلے بیٹے کی شادی تھی۔ مسز ظہیر نے ولیمہ بہت دھوم دھام سے کیا۔ خاندان اور محلے میں شاید ہی کوئی گھرایا رہا ہو جسے انہوں نے اس موقع پر پوچھا نہ ہو۔ انتہائی پُر رونق تقریب تھی۔ مسز ظہیر کے افراد خاندان کیا مرد کیا عورتیں، کیا بوڑھے اور کیا بچے ہر ایک کے چہرے 'لباس' انداز گفتگو، ہنسی مذاق، نشست و برخاست سے نجات جھلک رہی تھی۔ دولہا دلہن کی جوڑی چندے آفتاب چندے ماہتاب دکھائی دیتی تھی۔ نیمہ کی آرائشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مسز ظہیر نے اسے شہر کے سب سے مٹکے بیٹی پارلر سے دلہن بنوایا تھا۔ اس کا نظر افروز عروسی لباس اور جگمگاتے زیورات اس کی دلکشی کو جلا بخش رہے تھے۔ حیا بار پلکیں کبھی ذرا سا اوپر اٹھتیں پھر جھک جاتیں۔ اس کی آنکھوں میں خمار تھا اور لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ اس کے خوش ہونے کی نماز تھی۔ فرحان اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتا پایا جا رہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر پایا بی کی سرخوشی اور طمانیت تھی۔



مودی بن رہی تھی۔ رشتے دار اور احباب واقارب باری باری دھواؤ لسن کے ساتھ بیٹھ کر مودی بنوا رہے تھے۔  
 جیسے جیسے طریقہ سازیے اور اوپن ایئر میرج لان پر جا بجا چھوٹی چھوٹی مصنوعی آبشاروں نے ماحول کو رومان انگیز بنا رکھا تھا۔

میں خوش تھیں مگر!

منتہا نے خاموشی سے ان کا منظر نظیر سے موازنہ کیا۔  
 منظر نظیر عمر میں میں سے بڑی تھیں۔ زندگی کی سختیاں بھی سہی تھیں انہوں نے مگر ان کے چہرے پر بڑی طمانیت اور ٹھنڈاؤ تھا جبکہ میں کی آنکھوں سے ادا سی مترشح تھی۔ منظر نظیر بات بات پر کھلی پڑ رہی تھیں اور میں مسکرائیں بھی تو ایک کرب کے ساتھ۔

اس تفاوت کا سبب منتہا اچھی طرح جانتی تھی۔

منظر نظیر کو وہ تحفظ حاصل تھا جو ایک عورت کو اس کا رفیق حیات، شریک سفر دیتا ہے جبکہ میں اس تحفظ سے محروم تھیں اور اس محرومی کا احساس ان کے چہرے، ان کے لباس، ان کی آنکھوں، ان کی مسکراہٹ، ان کی حرکات و سکنات غرض ہر طرح سے جھلک رہا تھا۔

دھواؤ لسن کے ساتھ دھواؤ لسن کے میکے والوں کی مودی اگرچہ پہلے ہی بنائی جا چکی تھی مگر کھانا شروع ہونے سے قبل منظر نظیر میں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دوبارہ ڈانس پر لے گئیں اور بولیں "اب ہم دونوں سمجھیں دھواؤ لسن کے ساتھ گروپ بنوائیں گے۔"

"امی آپ دونوں سمجھیں ہی کیوں دونوں فیملیہ کیوں نہیں۔" لیلیٰ نے جو ڈانس کے روبرو کھڑی تھی ہانک لگائی۔

"آجاؤ سب لوگ آجاؤ۔" منظر نظیر خوش دلی سے مسکرائیں "اپنے ابو کو بلاؤ وہ کہاں ہیں؟"

"بھابی جان ان کی کچھ مت پوچھئے وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو خود کچھ اپنی خبر نہیں آتی۔ دھواؤ کے ابا بن کر اس قدر اتراتے پھر رہے ہیں آج کہ کیا بتائیے۔" نظیر صاحب کی چھوٹی بہن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دھواؤ کے ابا تو وہ اذلی ہیں بچو۔" فرحان بر جستہ بولا اور پل بھر کے توقف سے اس نے مزید کہا "اترا کسی اور بات پر رہے ہوں گے۔"

"شاید دھواؤ کے سر بن کر۔" ڈانس پر دھواؤ لسن کے عقب میں کھڑی بیلا نے اپنے بالوں میں لگے گجرے کو بہت نزاکت سے چھوتے ہوئے کہا پھر وہ نیلہ کے زرمار دوپٹے کا کنارہ چومتے ہوئے بولی "اتنی پیاری دھواؤ کے سر بن کر ابوجی اترائیں گے بھی نہیں کیا۔ کیوں بھائی؟" بیلا نے شرارتاً فرحان سے تائید چاہی۔

نیلہ شرمانی۔

فرحان مسکراتے لگا۔

"آؤ بھئی آؤ سب لوگ جلدی سے آجاؤ۔ وہ دیکھو وہ رہے تمہارے ابو۔ نظیر صاحب! ادھر آجائے ذرا۔" منظر نظیر نے ڈانس پر سے نظیر صاحب کو جو اچانک ہی انہیں نظر آگئے تھے بہ آواز بلند پکارا۔

"بس منتہا آپ ادھر آئی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔" لیلیٰ نے جو منظر نظیر کی نشست کے پیچھے کھڑی ہو چکی تھی منتہا کو مخاطب کیا۔

"یہ بس منتہا کیا ہوتا ہے!" منظر نظیر نے گردن موڑ کر لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"سوری امی۔" لیلیٰ خفیف ہو گئی "زبان پر بس منتہا ہی چڑھا ہوا ہے۔"

"منتہا باجی کمو۔"

"منتہا باجی آپ اس سیٹ پر بیٹھ جائیں۔" لیلیٰ کے لہجے میں ہنوز خفت تھی۔

"میلیب تم بیٹھو میں کے ساتھ۔" منتہا نے خود کو پیش کی جانے والی نشست ملیب کو پیش کی اور خود بیلا اور لیلیٰ کے

ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

”آپ۔ آپ بیٹھے۔“ ملیب منتہا کے کھڑے ہونے اور خود بیٹھنے پر راضی نہ ہوا۔

”نہیں نہیں۔ تم بیٹھو۔“

”مئی کے ساتھ آپ کو بیٹھنا چاہیے۔“ ملیب بولا۔

”پلیز تم بیٹھو۔“ اس نے ملیب کے شانے پکڑ کر اسے زبردستی بیٹھانے کی کوشش کی۔ ملیب اسے دیکھنے لگا۔

”پلیز!“ منتہا نے اسے چکارا۔

”ملیب میاں آپ بیٹھے۔ منتہا نہیں آئیں گی۔ والدہ کے برابر میں یہ سیٹ انہوں نے آپ ہی کے لیے چھوڑی ہے۔“

منظر ظہیر نے پھر گردن موڑ کر منتہا کی طرف دیکھا اور بولیں ”بہت پیار کرتی ہیں یہ آپ سے۔“

منتہا نے محبت بھری نگاہوں سے ملیب کو دیکھا۔ وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے مئی کے برابر خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ منتہا

نے ذرا سا ہٹ کر مئی اور ملیب کی نشستوں کے عقب میں عین ان کے درمیان جگہ سنبھال لی۔

”میری جگہ کہاں ہے بھئی؟“ بیلا کامیاں لپک کر آیا۔

”آپا کے دل میں۔“ لیلیٰ شوخی سے بولی۔

”لیلیٰ!“ بیلا نے جھینپ کر لیلیٰ کو آنکھیں دکھائیں پھر میاں سے بولی ”آپ ادھر ہمارے برابر کھڑے ہو جائیں ابوی سیٹ

کے پیچھے۔“

”اور میری جگہ؟“ نسیم کو بھی شوخی سو جھی۔

”اب بولو!“ بیلا نے لیلیٰ کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”امی کے پیچھے۔“ لیلیٰ نے بے دھڑک کہا۔

ظہیر صاحب دُلسن کے برابر بیٹھی منظر ظہیر کے بائیں جانب آبیٹھے۔ مئی دولہا کے بائیں جانب اور ان کے برابر ملیب جبکہ

بیلا اس کامیاں، لیلیٰ، نسیم، عدنان اور منتہا پیچھے کھڑے تھے۔

اسٹل فوٹو گرافر نے کیرا آنکھوں سے لگا لیا۔ مودی میکر مودی بنانے لگا۔ ڈائس پر بیٹھے اور کھڑے افراد پوز دینے لگے۔

منتہا کی نگاہیں مئی اور ملیب کے شانوں پر مرکوز ہو گئیں۔

”آپ جو پیچھے کھڑی ہیں اوپر دیکھیے پلیز۔“ اسٹل فوٹو گرافر بے آواز بلند بولا۔

کھڑے ہوئے افراد نے ایک دوسرے کو دیکھا ماسوا منتہا کے جو ہنوز مئی اور ملیب کے شانوں پر نظریں مرکوز کیے کھڑی

تھیں۔

”منتہا باجی آپ سے کہہ رہے ہیں۔“ منتہا کے برابر میں کھڑی لیلیٰ نے آہستہ سے کہا۔

منتہا نے چونک کر لیلیٰ کی طرف دیکھا۔

”ادھر سامنے دیکھیے۔“

منتہا نے سامنے نگاہ کی۔

اسٹل فوٹو گرافر کے پیچھے چند گز کے فاصلے پر ڈائس کے رُوبرو کھڑے نعیم کی نگاہیں اپنے اوپر مرکوز پا کر وہ ہڑبڑا گئی۔

اور وہ دھیرے سے مسکرا دیا!

”اُف خدا یا! یہ فضا مع عیال کہاں غائب ہو گئی تھی۔“

اپنی ہڑبڑاہٹ اور نعیم کی مسکراہٹ پر اسے یک بیک فضا اور اس کے بچوں کا خیال آجانا بظاہر بڑی غیر متعلق سی بات

لگتی تھی۔

مگر شاید اتنی غیر متعلق بھی نہیں!



وسیع و عریض اور چکا چوند سبزہ زار پر طعام شروع ہوا تو مسمان پلا تفریق مرد و زن کھانے کی میزوں کے گرد بیٹھے۔ بڑی عمر کے لوگوں نے اپنے اپنے افرادِ کنبہ کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دی تاہم نوجوان لڑکوں نے اپنے دوستوں اور لڑکیوں نے اپنی سیلیوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کیا۔

مئی کو مسز ظہیر دلسن کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے ڈاکس پر لے جانا چاہتی تھیں مگر مئی نے آہستگی سے ان سے کہا ”آپ کچھ خیال نہ کیجئے گا“ میں اگر بھائی، بھابی کے ساتھ بیٹھوں تو اچھا رہے گا۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ مسز ظہیر بولیں۔

”آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔“ مئی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”ارے نہیں آپ کیسی بات کرتی ہیں۔ ہم آپ کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ آخر ہم بھی تو اسی مصلحت کو ش دنیا کے پاس ہیں۔ آپ اطمینان کے ساتھ اپنے بھائی، بھابی کے ساتھ بیٹھیں ہم نیہہ کو سمجھا دیں گے۔ اصل میں انہی کی وجہ سے ہم نے آپ سے کہا کیونکہ آپ کے ساتھ وہ ذرا بے تکلف ہو کر کھانا کھا لیتیں۔“

”میں منتہا کو بھیجے دیتی ہوں نہ جانے کس طرف ہے وہ۔“ مئی نے چار اطراف نظر دوڑائی۔

”ہم دیکھ لیتے ہیں۔ آپ ذرا دیکھیے بھائی، بھابی کس طرف بیٹھے ہیں، ہم آپ کو ان تک پہنچا دیں۔“

”شکریہ! میں۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔“ مئی نے سبزہ زار پر طائرانہ نظر دوڑائی ”وہ۔ اس طرف بیٹھے ہیں وہ لوگ۔ نہ جانے منتہا کہاں ہے۔“

”میں یہاں ہوں والدہ۔“

مئی اور مسز ظہیر نے پلٹ کر دیکھا۔

”بیٹا، آنٹی نیہہ کے ساتھ کھانا کھانے کو کہہ رہی ہیں، میں تو بھائی اور بھابی کے ساتھ بیٹھوں گی، تم چلی جاؤ۔“

”آئی ایم سوری مسز ظہیر۔“

”پھر مسز ظہیر!“

”اوه سوری“ میں کیا کروں آپ کو آنٹی کہنے میں مجھے نہ جانے کیوں بدیہی پن لگتا ہے۔ آپا کموں گی۔ بات یہ ہے کہ میں نے اپنے اسکول سے صرف فضا اور اس کی فیملی کو انوائٹ کر رکھا ہے، کھانے کے وقت انہیں اکیلے چھوڑ دینا.... مجھے اچھا نہیں لگے گا حالانکہ فضا اتنی اچھی ہے کہ وہ مائنڈ بالکل نہیں کرے گی مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا۔“

”انہیں بھی لے چلو۔“

”وہ شاید ایزی لیل نہ کریں۔ نیہہ کے ساتھ آپ بیلا اور لیلی کو بٹھا دیں نا۔ بھی وہ اب آپ ہی کی تو ہے۔“

”دلہنوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے میکے والوں کے ساتھ ہی۔“

”جن دلہنوں کو آپ جیسے خیال رکھنے والے سرال والے مل جائیں انہیں میکے والوں کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔“

”تم اس تجربے سے گزر دو گی تو ہم پوچھیں گے۔ شادی کے بعد تو میکے کا خیال لڑکی کے دل کی ہر ہر دھڑکن میں بس جاتا ہے۔“

”آمین!“ مئی بڑے خشوع و خضوع سے بولیں۔

منتہا نے چونک کر مئی کو دیکھا۔

”آپ نے آمین کس بات پر کہا؟“

”خدا کرے تمہیں بھی نیہہ کی طرح اچھے لوگ ملیں۔“

”آمین!“ مسز ظہیر بولیں۔

اب منتہا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

وہ مسکرا دیں۔ چند ثانیے اسے دیکھتی رہیں پھر بولیں "اب ہم سے بھی تو پوچھو کہ ہم نے آئین کس بات پر کہا ہے۔" منتہا نے ان سے نظریں چرائیں۔  
 منظر ظہیر نے اس کا بازو پکڑا اور می کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں "انہیں تو اتنے اچھے لوگ ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار بیٹھے ہیں جنہیں دنیا ہاتھوں ہاتھ لینے کو تیار رہتی ہے۔"  
 "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

منظر ظہیر نے کچھ کھانا چاہا مگر منتہا نے ان کے بولنے سے پہلے ہی لجاجت سے کہا "پلیز، اور کچھ مت کئے گا۔"  
 منظر ظہیر دھیرے سے ہنس دیں۔  
 "اچھا جائے معاف کیا۔ کیا یاد کریں گی آپ کہ کسی سخی سے پالا پڑا تھا "انہوں نے خوش دلی سے یہ کہتے ہوئے اس کا بازو چھوڑ دیا اور بڑی اپنائیت سے می کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولیں "چلئے آپ کھانا کھا لیے۔"  
 "بھائی کہاں ہے؟" می نے جاتے جاتے منتہا سے پوچھا۔  
 "ان کی آپ فکر نہ کریں، بہت محفوظ ہاتھوں میں ہیں، کھانا شروع ہونے کی بو پاتے ہی فرحان میاں کو سب سے پہلے سالار جنگ ہی کا خیال آیا۔"  
 می کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

"ہم اپنی سمجھن کو لیے جا رہے ہیں، آپ اپنی دوست کی خبر لیجئے کہ وہ کہاں بیٹھی ہیں۔" منظر ظہیر اتنی خوش تھیں کہ مسکراہٹ ان کے لبوں سے ہٹ نہ رہی تھی۔  
 منتہا نے فضا کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔ وہ سائل اور رائیل کے ساتھ بیٹھی اپنے گرد پیش پر نظر دوڑا رہی تھی۔  
 اچانک رائیل کی نظر منتہا پر پڑی اور اس نے ماں کو بھی اس کی طرف متوجہ کر دیا۔  
 منتہا نے تلے قدم اٹھائی ان کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

"اوہ آئی ہم لوگ آپ ہی کو دیکھ رہے تھے کہ آپ کہاں ہیں۔" رائیل بولی۔  
 "میں یہاں ہوں ڈارلنگ! منتہا نے پیار سے اس کا سر چھوا "بائی دی وے بڑے صاحب زادے کہاں ہیں؟"  
 "تمہارا مطلب ہے راول؟" فضا نے اس کی جانب دیکھا۔  
 "کیوں؟ راول سے بڑا کوئی اور بھی ہے کیا؟"  
 "ہاں ایک ہے تو۔"

"رائیل!"  
 "جی ہاں، ان کے والد بزرگوار مختار صاحب۔"  
 "ہائے اللہ آئی ہم لوگ ماما سے اتنا کہتے ہیں کوئی دوسرے اچھے سے بابا دیکھ لیں۔ ہینڈ سم، دولت مند پر یہ سنتیں ہی نہیں۔ کتنا مزہ آئے نا اگر ماما کا بھی ایسا ہی شان دار سا ولیہ ہو۔"  
 "رائیل! فضا کے لہجے میں سرزنش تھی۔

رائیل اپنے بائیں کان کی لو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی انگلی کے درمیان دبا کر دزدیدہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔  
 "ویسے آئیڈیا تو برا نہیں۔" منتہا نے مسکراتے ہوئے فضا کو دیکھا۔  
 "اب تم بھی ان شیطانوں کا ساتھ دینے لگو اچھا۔" فضا نے اسے بھی آنکھیں دکھائیں۔  
 "تھینکس گاڈ! کسی نے تو ہمارے آئیڈیا کو اپریشیٹ کیا۔" رائیل دنگ ہو کر بولی۔  
 "شرافت سے کھانا کھاؤ۔"

"ماما جی کیا کھانا رذالت سے بھی کھایا جاتا ہے۔" سائل نے بڑے پھو کے منہ سے پوچھا۔



”بت زبانیں چلتی ہیں تم لوگوں کی۔“ فنفہ نے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے دھیرے سے اسے گھڑکا۔

”راول کہاں ہے بھئی؟“ منتہا نے پھر پوچھا۔

”تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ حسب عادت اس نے بنا لیے ہیں یہاں بھی دوست۔ انہی کے ساتھ بیٹھا ہوگا کسی میز پر۔“

”دیکھتی ہوں کہاں۔ کہاں۔ کہاں۔“ منتہا گرد و پیش پر طائرانہ نظر دوڑانے لگی۔

”تم کھانا کھاؤ وہ جہاں بھی ہوگا میرے بغیر اپنے باپ کی طرح بت خوش ہوگا۔“

”کیا بات ہے آج مختار بھائی بت یاد آرہے ہیں!“

”ہاں بے وقوف ہوں نا اس لیے۔“

”ویسے ماما آپ نے بابا سے شادی کی کیوں تھی؟“ رائیل کی نگاہیں اپنی پلیٹ پر ہی رہیں۔

فنفہ نے بظاہر توجہ کھانے پر ہی رکھتے ہوئے چپکے سے راول کی گردن کے پیچھے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر رائیل کا کان

دبوچنے کی کوشش کی۔

”اف ماما یہ تو میرا کان ہے!“ سانول ٹھٹھی آواز میں بولا۔

فنفہ نے سٹپا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

رائیل اور منتہا ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

”وہ دیکھو اس طرف۔“ فنفہ نے ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے منتہا سے سرگوشی میں کہا۔

منتہا نے ادھر دیکھا جدھر اس نے ابرو سے اشارہ کیا تھا۔

فرحان، عدنان، نعیم، نعیم، علیب، بیلا کا شوہر اور ان کے ساتھ دو اور نوجوان ایک میز کے گرد بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے

بڑی بے تکلفی سے ہنس بول رہے تھے۔ ماسوا علیب کے جو حسب عادت اس وقت بھی بوڑھوں کی سی سنجیدگی اختیار کیے بیٹھا

تھا۔ اچانک کسی بات پر وہ سب کے سب قہقہہ مار کر ہنسے اور نعیم کی نگاہیں اس میز کی جانب اٹھیں جہاں وہ فنفہ اور اس کے

بچوں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ نعیم سے شناسائی کے باوجود منتہا نے نظریں چرائیں اور اس کی طرف سے انجان سی بن

کر فنفہ کی طرف دیکھنے لگی۔

مگر فنفہ! وہ تو ہنوز اسی طرف دیکھ رہی تھی جہاں نعیم بیٹھا تھا۔

فنفہ کی نگاہیں پلٹیں۔

منتہا چونکی ہو گئی۔

فنفہ کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے ملیں۔

فنفہ زیر لب مسکرائی اور معنی خیز انداز میں دھیرے سے کمنکھاری۔

منتہا نے اس سے بھی ویسے ہی نظریں چرائیں جیسے کچھ دیر پہلے نعیم سے چرائی تھیں۔ دل میں کوئی چور نہ ہونے کے باوجود

نعیم اور پھر فنفہ سے اس کا نظریں چرائینا کوئی معنی رکھتا تھا!

○☆☆○

اسکول سے تین دن کی رخصت کے بعد واپس سے اگلی صبح اس نے اسکول کے لیے کمر کس لی۔

”بیٹا ایک دو روز تو گھر میں رہیں۔“ ماما نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”پھر بھی جانا تو ہوگا نا والدہ۔“

”ہاں یہ تو میں جانتی ہوں مگر تمہاری کے شروع شروع کے دن مشکل ہوتے ہیں۔“ ماما کی آواز میں بھراہٹ تھی اور آنکھوں

میں نمی۔

اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔

وہ می کے نزدیک بیٹھ گئی۔  
کچھ دیر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی پھر اس نے دھیرے سے کہا ”آپ پہلے بھی تو صبح سے دوپہر تک اکثر اکیلی ہی ہوا کرتی تھیں گھر میں۔“

می نے اثبات میں سر ہلایا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولیں ”لیکن تب یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ نیمہ اب اس گھر میں نہیں رہی۔“

اچانک می پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔  
علیب جو واش روم میں تھا گھبرا کر باہر نکلا۔  
”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ منہا نے اپنی آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے پونچھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی پھر بولی ”والدہ کو نیمہ کی یاد آ رہی ہے۔“

می کے نزدیک بیٹھ کر علیب نے اپنا بازو ان کے بائیں شانے سے دائیں شانے تک دراز کر دیا اور اپنا ہاتھ ان کے دائیں شانے پر دھیرے دھیرے تھپکتے ہوئے انہیں دلا سادینے کی کوشش کرنے لگا۔

”آپ فکر نہ کریں والدہ ہم جلد ہی اس گھر میں نیمہ کی ریلیسنٹ لے آئیں گے۔ کوئی اچھی سی پیاری سے لڑکی جو آپ کا دل بسلا کرے گی۔ کیوں شاہزادے ٹھیک ہے نا؟“ اس نے علیب کا سر بہت پیار سے تھپتپایا۔  
علیب بڑی سنجیدگی مگر معصومیت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”والدہ کو اس گھر میں ایک عدد پیاری سی بسو کی ضرورت ہے جو ہم دونوں کی عدم موجودگی میں انہیں تنہائی کا احساس نہ ہونے دے۔“

”آپ اگر یہ سمجھتی ہیں کہ میں نیمہ کی طرح آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گا تو یہ آپ کی بھول ہے۔“  
”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”اب آپ کی باری ہے۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
”زیادہ دادا ابا بننے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے پہلے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ غلٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے می کی طرف بڑھی اور ان کے سر کو بوسہ دیتے ہوئے بولی ”اچھا والدہ مجھے دیر ہو رہی ہے چلتی ہوں۔“

می نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔  
کچھ کہنے سننے کی فرصت نہ تھی۔

”خدا حافظ۔“ اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

گھر کی دہلیز اس نے بوجھل دل کے ساتھ پار کی۔

کچھ دیر بعد علیب کو بھی دفتر کے لیے گھر سے نکل لینا تھا۔ پھر می کو گھر میں اکیلے رہ جانا تھا۔

کتنی لجاجت اور بے بسی سے انہوں نے اس سے کہا تھا ”ایک دو روز گھر میں رہیں۔ تنہائی کے شروع شروع کے دن مشکل ہوتے ہیں۔“

مگر وہ بھی کیا کرتی۔

اسکول کے بغیر تو وہ خود کو ماہی بے آب سمجھنے لگتی تھی۔ جس دن چٹھٹی کر لیتی دن بھر دھیان بار بار اسکول کی طرف جاتا رہتا۔

آج خدا جانے کیا کیا ہو گا بچوں نے!



ڈائریکٹر سے کسی افسر نے سربراہانِ وزٹ نہ کر لیا ہو۔  
اٹھتے بیٹھتے خیال آتا۔

اوہو! آج تو ٹیسٹ ای کوئی ایکسٹریکٹ شروع کروانی تھی۔

ٹیسٹ ای کا پرسوں ٹیسٹ ہے، ان کی ٹرگنومتری کی کاپیاں تو میرے لاکر میں پڑی ہیں۔ جو نیچے آج ٹرگنومتری کی تیاری کرنا چاہ رہے ہوں گے ان کی تیاری تو ماری مٹی۔ کاپیاں میرے پاس ہیں۔ تیاری کیسے کریں گے۔ یاد نہیں رہا ورنہ ٹیسٹ کے لیے آنے والے کسی بچے کے ہاتھ لاکر کی چابی فضا کو سمجھا دیتی۔ وہ لاکر سے کاپیاں نکال کر بچوں کو دے دیتی۔ اب کیا ہو سکتا ہے! ٹیسٹ ایک دن آگے بڑھانا پڑے گا۔ کیوں بھی ہماری چھٹی کی سزا بچے کیوں بھگتیں۔

شام کو جب بچے ٹیسٹ کے لیے آتے تو وہ بڑھانا شروع کرنے سے پہلے ان سے اسکول کا احوال یوں لیتی جیسے درد مند ماں سسرال سے میکے آنے والی بیٹی کا دکھ سکھ ٹٹولنے کی کوشش کرتی ہے۔

میرے پیریڈ میں آپ کی کلاس میں کس کا پیریڈ لگا تھا؟

کچھ کام کروایا؟

چیکنگ کی تھی؟

پر ٹیبل صاحب نے آج صبح اسمبلی میں کوئی خاص بات کی بچوں سے؟

آج اور کون سے ٹیچر غیر حاضر تھے؟

رات کو وہ فضا سے فون پر بات کر کے اسکول کا رہا سہا احوال بھی معلوم کر لیتی۔ مگر نیند کی شادی پھر لیٹے میں ایسی مصروفیت رہی کہ وہ تین دن تک کسی سے اسکول کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکی۔ گھر کی دہلیز پار کرتے ہی مٹی کی تنہائی کا خیال جیسے یک لخت دل سے جاتا رہا تھا اور اس کی جگہ تین دن تک بچوں کی پڑھائی کے نقصان کی تلافی کی فکر نے لے لی۔ بس میں سوار ہوتے ہی دل جیسے شانت ہو گیا۔

صد شکر کہ وہ معمول کے مطابق پھر اسکول جا رہی تھی۔

نہ جانے لوگ اپنے فرائض منصبی کو پس پشت ڈال کر اپنی چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم ذاتی ضروریات کے لیے چھٹی نہیں چٹیاں کرنے کا حوصلہ کیوں کر کر لیتے ہیں۔

اسکول پہنچی تو تقریباً تمام ہی ساتھیوں نے روزمرہ علیک سلیک کے ساتھ اسے بہن کی شادی کی مبارکباد دینا بھی ضروری سمجھی اور بعض نے ترم کے ساتھ اس کا بھی جلد گھر بسنے کے لیے اپنی دعاؤں اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ لگا تار تین پیریڈ پڑھانے کے بعد چوتھا پیریڈ فری ملا تو اس نے مٹی کا حال لینے کے لیے گھر فون کیا۔

”ہیلو!“

اسے اپنی سماعت بے بھرم سی لگی۔

یہ تو نیند کی آواز تھی۔

”کون؟“

”اچھا جی اتنی جلدی ہم کون ہو گئے۔“ نیند کے لہجے سے چپکتی غیر معمولی شگفتگی اس کے خوش ہونے کی غماز تھی۔

”نیند؟ تم!“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں، جی۔ میں۔۔۔ ہنس نہیں۔“

”تم کیسے؟“

”کیوں؟ کیا میرا داخلہ منع ہے اس گھر میں؟“

”اوہ نو! میرا مطلب ہے۔۔۔ تمہارا اس وقت یہاں ہونا میرے لیے قطعاً غیر متوقع ہے۔“

"میں نے می کو فون کیا تو پتا چلا آپ اسکول جا چکی ہیں اور ملیب صاحب اپنے آفس۔ امی نے مجھ سے کہا تم اور فرحان دو تین گھنٹے کو می کے پاس ہو آؤ۔"

"امی نے کہا! کیا مطلب؟ امی کون! میں سمجھی نہیں۔"

"فرحان کی امی۔۔۔ بھی میں اور کیا کہوں انہیں۔ میری بھی تو وہ امی ہی ہوئیں نا۔"

"اوہ نیس یو آر سو سویٹ نیس۔"

"آپ کی مسز ظہیر بھی کچھ کم سویٹ نہیں، سچ مجھے تو اتنی اچھی لگیں کہ جب انہوں نے مجھ سے کہا بیلا کو رخصت کر کے ہم شروع شروع بہت اداس رہے تھے، تمہاری می بھی اداس ہوں گی۔ تم اور فرحان دو تین گھنٹے کو ان کے پاس ہو آؤ۔ باقی لوگ اتنا خیال کہاں کرتے ہیں دو سروں کا اور ہاں سٹوے کو ہم لوگ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد مری وغیرہ جا رہے ہیں۔"

"مسز ظہیر ان لوگوں میں سے ہیں جو دو سروں کا خیال رکھنا جانتے ہیں۔"

"بہت کم ہوتے ہیں ایسے لوگ۔"

"خدا کا شکر کہ کم ہی سہی مگر ہوتے ہیں۔"

"فرحان سے بات کریں گی۔"

"کراؤ۔۔۔ می تو بہت خوش ہوں گی تم دونوں کے آنے سے۔"

"بہت۔۔۔ جب سے ہم دونوں آئے ہیں ان کا ایک پاؤں کچن میں ہے اور دوسرا ہم لوگوں کے پاس۔ لیجئے فرحان سے بات کیجئے۔"

## قرآنی آیات سے مسائل کا حل

اگر کسی سے حاجت درپیش ہو☆ اداسی کے لئے☆ افسر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے☆ اولاد کے حصول کے لئے☆ اگر زوجہ لا محذور کے لیے چلی گئی ہو☆ امتحان میں کامیابی کے لئے☆ برکت کے لئے☆ بچوں کے کم ہونے کے لئے☆ بدگوئی، غصہ اور چڑچڑے پن کو ختم کرنے کے لئے☆ برے مسائے سے پناہ کے لئے☆ بستہ شخص کو کھولنے کے لئے☆ تباہ کرنے کے لئے☆ تکلیف دہ مکان کے لئے☆ (جس میں کسی سخت روح یا جن کا گزر ہوتا ہو)☆ جادو، سحر، نوہ، آسیب، نظر، ہر قسم کی بندش اور بد عملیات کا توڑ☆ جائداد کے تنازع کو ختم کرانے کے لئے☆ حرام کمائی سے محفوظ رہنے کے لئے☆ حفاظت کے لئے☆ حاکم کی ناراضگی دور کرنے کے لئے☆ ہر جائز مراد کے لئے☆ ہر مشکل اور ہر پریشانی کا حل معلوم کرنے کے لئے☆ ہر مشکل، پریشانی اور تکلیف سے نجات کے لئے☆ ہر مقصد میں کامیابی کے لئے☆ خود اعتمادی میں اضافہ کے لئے☆ خواب میں حالات معلوم کرنے کے لئے☆ دفع لکڑ وفاقہ کے لئے☆ پیغام نکاح و خیران کثرت سے آنے کے لئے☆ دلخواہ شادی کے لئے☆ دشمنوں سے نجات کے لئے☆ دینی ہوئی رقم کی واپسی کے لئے☆ رزق میں فراخی کے لئے☆ زوجہ کی عمدہ عادت کے لئے☆ سسرال کی ناچاقی کو ختم کرانے کے لئے☆ شراب یا کسی بھی قسم کے نشہ کی عادت چھڑانے کے لئے☆ شوہر کی مار پیٹ روکنے کے لئے☆ طلاق رکوانے کے لئے☆ ظالم سے خلاصی کے لئے☆ عداوت کو محبت میں بدلنے کے لئے☆ عمر میں برکت کے لئے☆ عہدے کی واپسی کے لئے☆ علم میں اضافہ کے لئے☆ عزت کو قائم رکھنے کے لئے☆ قرض کی وصولی کے لئے☆ قرض اتارنے کے لئے☆ کاروبار کی ترقی کے لئے☆ کابلی کے لئے☆ کم شدہ مال کی واپسی کے لئے☆ گھریلو جھگڑوں کو ختم کرانے کے لئے☆ مکان، فلیٹ یا کاروبار یا جگہ کو کرایہ دار یا کسی قابض سے خالی کرانے کے لئے☆ مظلوم کے لئے☆ مقدمات میں کامیابی کے لئے☆ ملازمت یا کاروبار کے حصول کے لئے☆ موذی جانوروں سے نجات کے لئے☆ مالی پریشانی دور کرنے کے لئے☆ میاں بیوی میں ناراضگی ختم کرانے کے لئے☆ میاں بیوی میں محبت کے لئے☆ محبت میں ناکامی کے لئے☆ ناجائز تعلقات ختم کرانے کے لئے☆ نفرت کے لئے☆ نافرمان یا آوارہ اولاد کو راہ راست پر لانے کے لئے☆ نقصان سے محفوظ رہنے کے لئے☆ نیا کاروبار شروع کرنے کے لئے☆ نیک عمل کے لئے☆ دہم، دوسے اور دیگر مسائل کا فوری حل۔

ایسی بات کے لئے موبائل فون نمبر 0333-2168184 پر شیڈر صاحب سے رابطہ کریں



"السلام علیکم باجی۔" فرمان کی آواز میں مگر مجبوشی تھی۔  
منتہا کو یوں لگا جیسے اب وہ ایک نہیں دو بھائیوں کی بہن تھی۔  
عجب تقویت بخش تھا یہ احساس!

مسز ظہیر کیسی نفیس خاتون تھیں۔ می کی تنہائی بنانے کو انہوں نے اپنے گھر کی رونق کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرمان صرف ایک ماہ کی چھٹی پر وطن آیا تھا جس میں سے تقریباً دس دن تو گزر ہی چکے تھے۔ ہفتہ بھر کے لیے وہ نیسہ کو بنی مون پر لے جا رہا تھا پھر گئے پنے دن تھے جو اسے گھر والوں کے ساتھ گزارنا تھے!

گھر پر ٹیلیفون کرنے کے بعد اس نے آفس سپرنٹنڈنٹ عبدالحمید سولنگی کی میز پر رکھے پرائیوٹ ٹیلیفون کالز رجسٹر میں اس کال کا اندراج کیا۔ اسکول کے سرکاری فون سے پرائیوٹ ٹیلیفون کالز کے لیے سولنگی صاحب کے کمرے میں پرنسپل صاحب نے ایک رجسٹر رکھوایا ہوا تھا۔ اساتذہ غیر تدریسی ملازمین یا طلبہ میں سے کسی کو اپنی کسی ذاتی ضرورت کے تحت یا کسی ہنگامی صورت حال میں کہیں فون کرنا ہوتا تو اس رجسٹر میں اندراج کرنا پڑتا۔ باہر سے آنے والی بیشتر کالز پہلے سولنگی صاحب ریسیو کرتے۔ دفتری معاملات سے متعلق کال ہوتی تو وہ خود ہی نمٹا دیتے۔ پرنسپل صاحب کا فون ہوتا تو کال ان کے کمرے میں ٹرانسفر کر دیتے۔ ادارے کے کسی ملازم یا کسی طالب علم کا فون ہوتا تو اسے چہرہ اسی کے ذریعے پیغام بھجوا دیتے۔ طلبہ کو کسی انتہائی صورت ہی میں کوئی فون کال ریسیو کرائی جاتی۔

گھر کی جانے والی کال کا متعلقہ رجسٹر میں اندراج کرنے کے بعد منتہا نے سولنگی صاحب کا شکریہ ادا کیا تو وہ اپنے مخصوص لہجے میں انتہائی مگر مجبوشی سے بولے۔ "شکریہ کی کیا بات ہے منتہا، سرکاری فون ہے۔"

"مگر میں نے اس سے کی تو پرائیوٹ کال۔"

"کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ ارے ہاں میں منتہا، بہت مبارک ہو بہن کی شادی۔"

"تھینک یو سولنگی صاحب۔"

"بہن میں نے سنا ہے آپ سے چھوٹی تھی۔"

"جی ہاں۔"

"آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔"

اس نے سٹپا کر حمید سولنگی کو دیکھا۔ ان کی جانب سے اس قدر بے دھڑک اور وہ بھی اتنے ذاتی سوال کا قطعاً امکان نہ تھا۔ سولنگی کی آنکھوں میں ڈولتی معنی خیزی اور لبوں پر بکھری مسکراہٹ نے اسے جھپکنے پر مجبور کر دیا مگر اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا "میں سمجھی نہیں سولنگی صاحب۔"

سولنگی کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

"سمجھا دوں گا میں منتہا ذرا فرصت سے بات کرنے والی بات ہے۔"

منتہا نے سولنگی کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

"ایسی کیا بات ہے سولنگی صاحب۔"

"جلدی نہیں جلدی نہیں بابا اطمینان سے۔"

"آئی ایم سوری سولنگی صاحب، میری عادت ہے کہ کاموں کو التوا میں نہیں رکھتی۔" منتہا دیکھنا چاہتی تھی کہ سولنگی صاحب ایسی کیا بات کہنا چاہ رہے تھے اس سے جس کی تمہید باندھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں معنی خیزی اور لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی اور جسے اس سے کہنے کے لیے وہ فرصت کی طلبگاری ظاہر کرتے تھے۔

"اس وقت میرا فری ہیریڈ ہے پھر بریک ہو جائے گی، مجھے فرصت ہے۔"

"بریک میں چائے پینی ہوگی آپ نے۔"

FEBRUARY.2003 © PAKEEZA © 96

© 2003 PAKEEZA © 96

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث طبع ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”چائے کی آپ فکر نہ کریں بریک میں ابھی دیر ہے۔“  
 ”اچھا تو پھر بیٹھیں۔“ سونلکی صاحب نے اُدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔  
 وہ سونلکی صاحب کے رُوبرُو بیٹھ گئی۔

سولنگی صاحب نے دھیرے سے کھنکھارتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا پھر کچھ تامل کے ساتھ بولے ”کافی عرصے سے آپ سے ایک بات کرنا چاہتا تھا میں۔“ اپنی کہنیاں میسر بٹکتے ہوئے وہ ذرا سا آگے کو بٹکتے اور قدرے رازداری سے بولے ”میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

منتہا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”مگر آپ تو۔۔۔ میں نے سنا ہے آپ کے تو پانچ بچے بھی ہیں۔“

سولنگی صاحب نے یوں برا سامنہ بنایا جیسے عرق کر لیا کر بیٹھے ہوں اور بولے ”ہاں مگر ان سے اور ان کی ماں سے کوئی انڈر شینڈنگ نہیں ہے۔ ایسی عورت ہے ہر وقت کائیں کائیں کرتی رہتی ہے۔ میں سکون کی زندگی گزارنے کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں سونلکی صاحب۔ یہ۔ یہ آپ کا۔ ذاتی معاملہ ہے۔“

”ہاں“ سونلکی صاحب نے اپنے چہرے پر بڑی کرناک سی کیفیت پیدا کرتے ہوئے دل گیر لہجے میں کہا پھر منتہا کو دوزیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے ”آپ کی نظر میں کوئی اچھی خاتون ہو تو میرے کو بتائیں کوئی لیچر مل جائے تو اچھا ہے۔ ایک فیلڈ کے لوگ ہوں تو گزارہ اچھا ہو جاتا ہے۔“

سوئگی صاحب نے سر جھکایا اور منہ لٹکالیا۔  
 ”یہی بات تھی سوئگی صاحب یا۔۔۔؟“ منتہا نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کا لہجہ سرد تھا جیسے سوئگی کی بات سے اسے نہ کوئی دلچسپی ہو نہ ہمدردی۔  
 ”جی۔“ سوئگی نے بدستور سر جھکائے رکھا۔

وہ اٹھ... کھڑی ہوئی۔

سولنگی نے نظراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”بس مفتہا! اس کا ذکر کسی سے مت کرنا پلیز۔“

مفتہا کچھ نہیں بولی۔

سو لنگی نے پھر سر جھکا لیا اور اپنے لہجے میں قدرے رقت پیدا کرتے ہوئے بولے ”میری اور آپ کی عزت اسی میں ہے۔ لوگ کہانیاں بنا لیتے ہیں بابا۔“  
وہ مڑی اور سو لنگی کے کمرے سے نکل گئی۔

(باقی آئندہ)

FEBRUARY.2003 OPAKEEZA O97





## ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھربڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سارہونے کی دل گداز داستان

قسط 9









دن ایسی سرعت سے گزرے کہ پتا ہی نہ چلا۔ شادی، ولیمہ اور ہنی مون سے واپسی پر رشتے داروں کے ہاں صبح شام دعوتوں کا سلسلہ اس تواتر سے چلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے فرحان کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ نیمہ کو یوں لگا جیسے کوئی سنا خواب ٹوٹنے لگا ہو۔

”چھٹی بڑھوا نہیں سکتے آپ؟“ اس نے فرحان سے کہا۔

وہ مسکرایا۔

”وہ پاکستان نہیں ہے جہاں لوگ تین مہینے کی چھٹی لے کر باہر جاتے ہیں اور اس چھٹی کو بڑھواتے بڑھواتے برٹش پاسپورٹ یا گرین کارڈ لے کر چھٹی مزید بڑھوانے کے لئے واپس لوٹتے ہیں، جانا ہو گا ورنہ سچ سچ چھٹی ہو جائے گی میری!“

”ہو جائے“ نیمہ نے بڑی بے نیازی سے کہا ”یہاں ملازمت نہیں مل سکتی کیا آپ کو...؟“

”ہمیں کر رہا تھا مگر...“

”مگر...؟“

”یہاں اتنے پیسے کب ملتے ہیں مجھ جیسے ڈپلوما ہولڈر کو کہ ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جائے۔“

”ہم دونوں کی جاب ہوگی گزارہ ہو جائے گا“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”مجبوری ہے کہ میرے پاس آنے تک تم اپنی ملازمت جاری رکھو گی ورنہ اگر سچ پوچھو تو میں نہیں چاہتا کہ تم ایک دن بھی جاب کرو۔“

”کیوں بھی؟“ نیمہ نے چونک کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

”بس۔“

”وجہ بتائیں نا“ آپ کی تو اپنی امی جاب کرتی رہی ہیں۔“

”ہاں... یہی تو وجہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”امی کی ملازمت اور انڈسٹریل ہوم نے ہم بہن بھائیوں کے بچپن کو ایک شدید قسم کی محرومی سے دوچار کر رکھا۔ ہمیں ان کی وہ محبت اور بھرپور توجہ نہیں مل پائی جو ہم ان کی طرف سے چاہتے تھے۔“

”آپ کا مطلب ہے انہوں نے آپ کو محبت اور توجہ نہیں دی؟“ نیمہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”نہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ امی کو ہم لوگوں سے بہت پیار ہے۔ انہوں نے تو ہمارے لئے ماں ہی نہیں باپ کے فرائض بھی ادا کیے۔ برسوں گھر کی گاڑی تنہا کھیچتی رہیں مگر اس معاشی تک دو میں وہ بے چاری اکثر ہماری جذباتی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہیں۔ مثلاً اپنے بچپن میں میری بڑی خواہش ہوتی تھی کہ جب میں اسکول سے گھر واپس لوٹوں تو امی گھر میں ہوں لیکن امی یا تو اپنے اسکول سے واپس نہ لوٹی ہوتیں یا اسکول سے گھر واپس لوٹنے ہی حسب معمول انڈسٹریل ہوم میں چلی گئی ہوتیں۔ ان کا معمول تھا کہ اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہی دس پندرہ منٹ کے لیے ہی سہی پہلے انڈسٹریل ہوم کا چکر لگاتیں پھر گھر میں آکر کھانا کھاتیں اور ہم بہن بھائی اسکول سے واپسی پر اتنے بھوکے ہوتے کہ امی کا انتظار کیے بغیر ہی ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ چکے ہوتے۔ جس روز امی اسکول سے چھٹی کر لیتیں اور اسکول سے ہماری واپسی پر گھر میں ملتیں وہ دن کم از کم مجھے تو عید کا دن محسوس ہوتا۔ امی بے چاری اتنی مصروف رہتیں اور صبح سے شام تک کام کر کے اتنی تھک جاتیں کہ رات کو اکثر ہم سے پہلے ہی سو جاتیں۔ ہمیں حسرت ہی رہی کہ کبھی کسی رات تو امی ہمیں اپنے پاس لٹا کر کوئی کہانی سنائیں۔“

”پلیز، ایسی کوئی بات امی کے سامنے بھی مت کر ڈالیے گا فرحان، وہ کیا سوچیں گی کہ میں نے تو ان لوگوں کے

لیے اتنی جدوجہد کی اور انہیں اتنے گلے شکوے ہیں۔“  
 ”گلے شکوے نہیں نیمہ، یہ تو ہمارا اور امی کا مشترکہ دکھ ہے۔ انہیں خود بھی احساس ہے ان ساری باتوں کا بلکہ شاید ہم سے بڑھ کر احساس ہے۔ انہوں نے جو کچھ خود سہا ہے اسے اپنی اولاد کو نہ سننے دینے کی خاطر انہوں نے بیلا کو اس کی بے پناہ خواہش کے باوجود ملازمت نہیں کرنے دی اور لیلیٰ کو بھی صرف شادی سے پہلے تک جاب کرنے کی اجازت دی ہے۔“

”اچھا!“ نیمہ نے تعجب سے کہا۔

”ہاں بلکہ وہ تو اب یہ کہتی ہیں کہ خواتین کو بلا ضرورت اور محض شوقیہ ہرگز ملازمت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اکثر کہتی ہیں کہ مرد کے ہاتھوں عورت اور اس کے بچوں کو ملنے والی آدمی روٹی اس عورت کے گھر سے نکلنے پر ملنے والی پوری روٹی سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ روٹی کی تلاش میں امی کے گھر سے باہر نکلنے کے نتیجے میں ہم بہن بھائیوں نے کیا کچھ سہا ہے میں نہیں بتا سکتا نیمہ۔ کاش تم اندازہ کر سکتیں۔“

”مجھے تھوڑا بہت اندازہ ہے فرحان۔“

فرحان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا کہ نیمہ کو اس کا اندازہ کیونکر تھا۔  
 ”کچھ عرصہ مئی نے بھی جاب کی ہے۔ واقعی وہ بہت مشکل دن تھے ہمارے لیے۔ مایب تو اسکول سے آنے کے بعد مئی کی واپسی کے انتظار میں کھانا ہی نہیں کھاتا تھا بھوکا پھرنا رہتا تھا۔“

فرحان نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر بڑے ہی دل گرفتہ لہجے میں بولا ”کبھی فرصت سے بیٹھے تو تمہیں سناؤں گا کہ مئی کی معاشی تنگ و دو کی قیمت ہم چاروں بہن بھائیوں نے اپنے اپنے طور پر کیونکر چکائی۔ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ ایسی لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کروں گا جو ملازمت کرتی ہو۔“

”اب کیا خیال ہے؟“ نیمہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔  
 وہ اسے دیکھنے لگا۔

”ایسی لڑکی سے شادی کیوں کر بیٹھے جو ملازمت کرتی ہے؟“

”ہوں!“ وہ اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے جھوٹ موٹ تشویش میں پڑ جانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا ”ہو تو گئی ہے گڑبڑ... مگر اب کیا ہو سکتا ہے اب تو غلطی ہو گئی۔“  
 ”اس غلطی کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔“

”کیسے؟“

”میں واپس چلی جاتی ہوں۔“

”کہاں؟“ وہ بے ساختہ چونکا۔

”جہاں سے آئی ہوں۔“ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور بولی ”مئی کے گھر۔“

”اور یہ سوچا کہ میرا کیا بنے گا....؟“

”دوبارہ دولہا بن جائیے گا کسی جاب نہ کرنے والی لڑکی کو اپنے گھرانے کے لیے۔“

”گوارا کر لو گی؟“

”مجبوراً.... آپ کی خواہش جو پوری کرنا ٹھہری دیے بھی میں تو اپنے گھر چلی جاؤں گی یعنی مئی کے گھر۔“

”مر جاؤں گا میں تمہارے بغیر۔“

نیمہ نے ہڑبڑا کر اس کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

فرحان نے اس کی ہتھیلی چوم لی۔



محبوب ہو کر اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا اور اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی ”آئندہ کبھی ایسی بری بات زبان سے نکالی ناتو۔۔۔“  
 ”تو؟“ وہ اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”تو آپ کی شکایت ہو جائے گی۔“  
 ”کس سے؟“

”امی ابو سے۔“  
 ”معافی!“ وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے مسکرایا پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا ”ڈاکٹر ہو کر مرنے کی بات سے اتنا ڈرتی ہو!“  
 ”موت سے ہر انسان ڈرتا ہے اور ڈاکٹر بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے فرحان کو شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا!“ وہ بڑے پھو کے منہ سے بولا ”مگر ہمارے گھر میں جو خاتون ڈاکٹر آئی ہیں وہ تو انسان نہیں لگتیں۔“  
 ”تو پھر کیا لگتی ہوں؟“ وہ بے ساختہ چونک کر قدرے حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔  
 وہ دھیرے سے مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں ایک بیک گہری وارفتگی اٹھ آئی۔  
 ”آسانی حور۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔  
 نیمہ دھیرے سے ہنس دی۔

”زمینی حور بھی ہوتی ہے کیا؟“  
 ”ہاں۔“ وہ بولا ”دبی آؤ گی تو دکھاؤں گا۔“  
 ”ہوں!“ نیمہ کی نگاہوں میں وہ مخصوص اور تشلیک آمیز معصومیت تھی جو شوہر کو شک کی نگاہ سے دیکھتی بیوی کی نگاہوں میں ہوا کرتی ہے۔

”اوہ نو!“ فرحان سٹپٹا کر بولا پھر اس نے بہت دھیر ج بہت پیار سے اس کی ستواں ٹاک کی پھنگ کو چھوا اور اپنا سر اس کی پیشانی سے مس کرتے ہوئے بولا ”کبھی شک نہ کرنا مجھ پر پہلی عورت کو آخری بھی سمجھ کر اس سے ہمیشہ وفادار رہنا ہمارے خاندان کے مردوں کی روایت رہی ہے۔“  
 نیمہ کا دھیان اچانک ڈیڈی کی طرف جا پہنچا۔  
 کاش وہ بھی ایسی ہی کسی روایت کے پابند رہے ہوتے مگر وہ ایسے کب تھے۔  
 وہ تو ایسے بے مروت ثابت ہوئے تھے کہ اسے رخصت کرنے کے لیے اس کے سر پر ہاتھ دھرنے بھی نہ آ سکے تھے۔

فرحان اپنا سر اس کی پیشانی سے مس کیے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اپنی آنکھوں کی نمی اس سے پنہاں رکھنے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں!



پبلک سروس کمیشن سے انٹرویو کال آچکی تھی۔ انٹرویو سے ایک روز قبل فاروقی صاحب نے اسے انٹرویو کے سلسلے میں ضروری نکات و رموز سمجھائے۔ شاہد صاحب جو اس قسم کے انٹرویو کے سلسلے میں تجربے کا رتھے اسے اپنے تجربے سے آگاہ کرنے کے لیے بطور خاص اس سے ملے۔ فضلہ نے اسے لباس اور آرائش کے سلسلے میں اپنے مخلصانہ مشوروں سے نوازا۔

”وہ جو تمہارا آف وائٹ سوٹ ہے جس کے دوپٹے پر باریک نیل لگی ہوئی ہے وہ پہننا اور اس کے ساتھ بلیک

کورٹ شوز۔ ہلکا سا میک اپ بھی ضرور کرنا۔ ہاں، بیک ضرور بدل لینا۔ وہ جو ہم نے بوہری بازار سے خریدا تھا وہ ٹھیک رہے گا۔

”اور کچھ؟“ منتہا مسکرائی۔

”اور... اور کوئی اچھا سا پرفیوم۔“

”بس!“ منتہا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”بس کا کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بس بیوٹی پارلر جانے کی کسر رہ گئی۔“

”نہیں خیر، کسر تو ابھی بہت باقی ہے۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً۔“ فضا کے چہرے پر شرارت ڈولنے لگی اور دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنی انگلی پوروں کے بل پر سانے دھری میز پر رکھی کاپیوں کے ڈھیر پر سب سے اوپر دھری کاپی پر تاپنے لگیں۔ نگاہوں میں جھوٹ موٹ گہری سوچ کا تاثر ابھرا اور وہ چند ثانیے مراقبے میں چلی گئی پھر اسے شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ”ایک عدد ہینڈ سم سا دولہا اور براتی۔“

”شکر ہے تم نے حوالاتی نہیں کہا۔“

”بھئی نکاح کے بعد دولہا خود بخود حوالاتی بن جاتا ہے، زندگی بھر کے لیے۔“ فضا مسکرائی۔

”ضروری نہیں۔ حوالاتی آپ خود بھی تو بن سکتے ہیں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے جیسے میں بن گئی۔“ فضا کے لبوں پر مسکراہٹ کے باوجود اسے اس کے لہجے میں مظلومیت اور کرب کا احساس ہوا۔

منتہا اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”ایسے نہ دیکھو پلیز، مجھے رحم کھانے والی نگاہوں سے اپنی انسلٹ محسوس ہوتی ہے۔“

”سمجھنے کی غلطی ہے میں تو محبت سے دیکھ رہی ہوں۔“

”تھینک یو، تھینک یو۔“ وہ اپنی کرسی کے ہتے پر اپنی کہنی ٹیکتے ہوئے اپنے بائیں پہلو پر اس کے نزدیک ہو گئی اور سرگوشی میں بولی ”ادھر سے کوئی خبر؟“

”کدھر سے؟“

”دہلی سے۔“

”ہاں ہاں۔ فرحان کا ہر دوسرے تیسرے دن فون آتا رہتا ہے۔“

”میری جان میں فرحان کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“

”تو پھر؟“

”میں اس کی بات کر رہی ہوں جو تمہاری بہن کے دلہے میں تمہیں کھٹی میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔“

”شش!“ منتہا نے بے ساختہ ہڑبڑا کر اسے تنبیہی نگاہوں سے دیکھنے کے بعد اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

”اطمینان رکھو۔“ فضا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ”کسی کو ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں، سب کو اپنی اپنی

پڑی ہے۔“

”بظاہر! مگر کان سب کے ایک دوسرے کی طرف لگے ہوں گے۔“ منتہا نے دھیرے سے کہا۔

”اچھا خیر چھوڑو، تم یہ بتاؤ ان حضرات کی کچھ خبر ہے؟“



”بھئی مجھے کیوں ہوگی بھلا خیر خبر۔“

”تو پھر کے ہوگی؟“

”جسے اس سے کوئی دلچسپی ہوگی۔“

”تم کیوں نہیں پیدا کر لیتیں دلچسپی؟“

”مجھے اس وقت صرف اس بات سے دلچسپی ہے کہ کل انٹرویو کے لیے مجھے کیا تیاری کرنی چاہیے۔“

”بہت چالاک ہو تم۔“

”اچھا! وہ کیسے؟“

”کتنی خوبی سے ٹال گئیں بات۔“

”ٹالنے کی بات نہیں بھئی جس بات سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں اس میں دلچسپی کیونکر ظاہر کروں میں۔“

”اب تو نیسہ کی شادی بھی ہو گئی اب کیا مسئلہ ہے؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ کل میرا انٹرویو ہے اور فاروقی صاحب نے یہ کہہ کر کہ آپ ضرور سلیکٹ کر لی جائیں گی مجھے پھر

ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔“

فضہ مسکرا دی۔

”دیئے یہ اپنے فاروقی صاحب بھی ہیں کمال کے آدمی۔ ایمان سے ان کے انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کسادیکھ کر ہاتھ ڈالا ہے انہوں نے بھی۔ آئے دن تمہیں کسی نہ کسی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں کبھی سینئر کلاسوں کو میٹھنے بڑھانے کی آزمائش، کبھی بچوں کو ہم نصابی مقابلوں میں شرکت کے لیے تیار کرنے اور انعام حاصل کرنے کی آزمائش، کبھی کسی سر پھرے لڑکے کو انسان بنانے کی آزمائش، کبھی نیا ٹائم ٹیبل بنانے میں سینئرز کی معاونت کی آزمائش، کبھی ان مضامین اور ان جماعتوں کے لیے امتحانی پرچے مرتب کرنے کی آزمائش جن سے تمہارا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں اور اب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے وائس پرنسپل منتخب ہونے کی آزمائش۔ لگتا ہے فاروقی صاحب تو تمہیں کندن بنا کر ہی دم لیں گے۔ آل رائنٹ... ویش یو آل دی مسٹ ڈیئر۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”مس فضہ، کچھ دعائیں اور نیک تمنائیں ہمارے لیے بھی۔“ قریب ہی ابھرنے والی ایک مانوس آواز نے فضہ

اور منتہا کو چونکنے اور گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

مسز عارف ان دونوں کے عقب میں چند گز پرے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بظاہر اخبار کا مطالعہ کر رہی تھیں مگر نہ

جانے کب سے ان کے کان ان دونوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

منتہا نے فضہ کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو لو سن لو تم تو کہہ رہی تھیں کسی کو ہماری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں!

”ڈونٹ وری۔“ فضہ نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا پھر مسز عارف کی طرف دیکھے بنا بہ آواز بلند کہا ”مسز

عارف، آپ کو اب دعاؤں اور نیک تمنائوں کی کیا ضرورت۔ اب تو آپ اپنے بچوں کے لیے دعائیں کرائیں۔“

مسز عارف نے اخبار اپنے منہ کے سامنے سے ہٹایا اور قدرے ترش کھجے میں بولیں ”ماں باپ سے بڑھ کر اولاد کا

خیر خواہ اور دعا گو کون ہو سکتا ہے مس فضہ اپنے بچوں کے لیے تو میں اور ان کے پاپا اٹھتے بیٹھتے دعائیں مانگتے رہتے

ہیں۔“

فضہ اور منتہا کی نگاہیں باہم ملیں اور دونوں دھیرے سے مسکرا دیں۔

فضہ کی پُر خلوص دعاؤں اور نیک تمنائوں، شاہد صاحب کے بھی خواہانہ مشوروں اور فاروقی صاحب کی جانب سے

خاطر خواہ رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے باوجود آنے والے کل کے انٹرویو کا خوف ہنوز اس کے تحت الشعور میں دبکا ہوا تھا۔

اُف خدا! انٹرویو بھی کس بلا کا نام تھا۔

○☆☆○

دروازے پر کھڑے دربان نے پیتل کا دستہ گھما کر دروازہ کھولا اور وہ اپنے بے تحاشا دھڑکتے دل کو لگام دینے کی کوشش کرتی بظاہر بڑے اعتماد سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“

اس نے چونک کر دیکھا کہ یہ کون تھا جس نے اس کے اعتماد کو لٹکانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے خود کو چند خوش پوش افسران نما افراد کے روبرو پایا جن میں سے ایک ڈائریکٹر نظامت تعلیمات تھے۔ سلام ترچھی ابروؤں والے ایک سوئڈ بوئڈ صاحب کی جانب سے داغا گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”بی بی السلام علیکم کا جواب۔ وعلیکم السلام ہوتا ہے۔“

”سوری سر۔“

”بیٹھے۔“

وہ کسی مشینی انسان کی طرح جس کا کنٹرول کسی اور کے ہاتھ میں ہو، انٹرویو ٹیم کے اراکین کے روبرو بیٹھ گئی۔ ڈائریکٹر نظامت تعلیمات کی موجودگی کا احساس اسے غیر معمولی محتاط کیے دے رہا تھا۔ بورڈ کے ایک رکن دھیرے سے کھٹکھارے اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”کس اسکول سے پڑھا؟“

”میٹرک سائنس گروپ میں کرنے کے بعد انٹر میں گروپ تبدیل کیوں کر لیا؟“

”بی اے میں پولیٹیکل سائنس لینے کا کوئی خاص سبب؟ کوئی خاص مقصد؟“

”درس و تدریس اختیار کرنے کی وجہ؟“

”بہ حیثیت نیچر خود کو کس درجے میں رکھتی ہیں بہترین“ اچھی اوسط یا اوسط سے کمتر صلاحیت کی نیچر؟“

اس سوال کا جواب دینا اسے مشکل تو نہ محسوس ہوا البتہ متاثر ضرور ہوئی پھر کہا ”یہ تو آپ میرے شاگردوں سے پوچھئے۔“

”آپ کے پرنسپل یا افسران بالا سے نہیں؟“ سوال داغا گیا۔

”جی... ان سے بھی۔“ اس نے دزدیدہ نظروں سے ڈائریکٹر صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا پھر بڑے اعتماد سے بولی۔

”لیکن میرے خیال میں ایک استاد کے بارے میں سب سے بہتر رائے اس کے شاگرد ہی دے سکتے ہیں۔“

”لیکن جس سطح پر آپ پڑھا رہی ہیں وہاں شاگردوں کی رائے کا اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“ لہجہ سوالیہ تھا۔

”بالکل سر۔“ اس نے بلا تامل کہا ”میں تو سیکنڈری کلاسز کے بچوں کو پڑھا رہی ہوں۔ ایک نیچر کے بارے میں تو

پہلی جماعت کا بچہ بھی صاحب الرائے ہوتا ہے۔ وہ بھی بتا سکتا ہے کہ کون نیچر اچھا ہے کون برا، کون سخت کون نرم۔“

”خود آپ سخت نیچر ہیں یا نرم؟“

”جب سختی کی ضرورت ہوتی ہے سخت جہاں نرمی درکار ہوتی ہے وہاں نرم۔“

”گویا آپ بدلتی رہتی ہیں؟“

”استاد کے رویے میں لچک نہ ہو تو وہ نیچر نہیں رہتا ماسٹر بن جاتا ہے۔“

”نیچر ماسٹر ہی تو ہوتا ہے۔“

”جسے اپنی رعیت کو مطیع بنانے کے لیے ڈنڈا نہیں اپنا علم اور حکمت استعمال کرنی چاہیے۔“



”اچھا یہ بتائیے آپ استاد کے ہاتھ میں ڈنڈے کی قائل ہیں؟“  
 ”جی نہیں، ڈنڈا تو کسی کے ہاتھ میں بھی اچھا نہیں لگتا۔“ مسلسل سوالات نے اب اسے قدرے ایزی کر دیا تھا۔  
 ”مگر بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ طالب علم یا تو شوق سے پڑھتے ہیں ورنہ ڈنڈے کے زور پر۔ جو شوق سے نہ  
 پڑھیں ان کو ڈنڈے کے زور پر پڑھانا چاہیے۔“

”میں اس نظریے کی قائل نہیں۔“  
 ”آپ کس نظریے کی قائل ہیں؟“  
 ”میرا نظریہ یہ ہے کہ بعض بچے محبت سے پڑھتے ہیں بعض رعب سے۔ جو محبت سے رام نہ ہوں ان پر رعب  
 آزمانا پڑتا ہے۔“

”رعب ڈنڈے کے بغیر ممکن ہے؟“  
 ”بالکل ہے۔ اگر آپ اچھے ٹیچر ہیں اور بچے کو یہ احساس ہے کہ آپ اس کے مقابلے میں زیادہ جانتی ہیں اس  
 کے ہمدرد اور بھی خواہ ہیں تو وہ آپ کی نظر سے ڈرے گا۔ آپ کی خشکی کے ڈر سے پڑھنے کی کوشش کرے گا۔ آخر اللہ  
 میاں بھی تو کوئی ڈنڈا لے کر ہم انسانوں کے سامنے نہیں آجاتے لیکن ہم ان کا ڈنڈا تو بہت دور کی بات ہے خود انہیں  
 بھی دیکھتے بغیر محض ان کی بڑائی اور عظمت کے خوف اور رعب ہی سے بہت سی برائیوں سے حتی الامکان دور رہنے کی  
 کوشش کرتے ہیں۔ بچے کو عملاً جزایا سزا ملنی ضروری نہیں، اس کا تصور اس کا احساس ہونا ضروری ہے۔“

”مقرر رہی ہیں؟“

”کبھی نہیں۔“

”نڈہبی ہیں؟“

”صوم و صلوٰۃ کی پابندی کی حد تک۔“

”قرآن مجید پڑھتی ہیں؟“

”جی.... باقاعدگی سے۔“

”صرف عربی یا....؟“

”روزانہ کم از کم ایک رکوع کا ترجمہ اور تفسیر بھی پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”صرف پڑھتی ہیں یا سمجھتی بھی ہیں۔“

”کوشش کرتی ہوں سمجھنے کی۔“

”قرآنی تعلیمات کے حوالے سے انسان پر کتنے قسم کے حقوق عائد ہوتے ہیں؟“

”حقوق اللہ، حقوق العباد اور حقوق النفس۔“

”آپ کے زیادہ اہمیت دیتی ہیں؟“

”حقوق العباد کو!“

”کیوں؟“

”جب آپ بندوں کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو حقوق اللہ کی پابندی آپ ہی آجاتی ہے بلکہ سچ تو یہ  
 ہے کہ اللہ کی محبت، اس کی اطاعت کا احساس ہی ہمیں بندوں کے حقوق ادا کرنا سکھاتا ہے۔ اسی کی محبت ہماری زندگی  
 کے تمام معاملات کو ریگولیٹ کرتی ہے باضابطہ اور باقاعدہ بناتی ہے۔“

”آپ وائس پرنسپل کی اسامی کے لیے انٹرویو دے رہی ہیں۔ یہ بتائیے کسی تعلیمی ادارے میں وائس پرنسپل کی  
 اہمیت و افادیت کیا ہے؟“

اس سوال اور اس کے جواب کے درمیانی وقفے میں ایک دوسرے رکن بورڈ نے اس سوال کی وضاحت یوں کی۔

”یعنی کسی تعلیمی ادارے میں وائس پرنسپل کی آخر ضرورت کیا ہے؟ کیا یہ محض ایک اضافی پوسٹ نہیں؟“  
”ہرگز نہیں، ایک اچھا وائس پرنسپل ادارے کے پرنسپل کا دست راست ہوتا ہے۔ اس کی عدم موجودگی اور عارضی یا طویل رخصت کے دوران اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔ وہ ساتھی اساتذہ طلبہ اور ان کے والدین اور پرنسپل کے درمیان زیادہ موثر اور مضبوط رابطے کا ذریعہ ہوتا ہے۔“

”آپ وائس پرنسپل بن کر کیا کرنا چاہتی ہیں؟“

”ایک اچھا پرنسپل میسر آجانے کی صورت میں اس تعلیمی ادارے کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنادینا۔“

”یعنی پرنسپل کا اچھا ہونا شرط ہے؟“

”جی بالکل کیونکہ کسی تعلیمی ادارے میں بنیادی اہمیت پرنسپل ہی کی ہوتی ہے۔ وائس پرنسپل تو اس کا تابع و محکوم ہوتا ہے۔“

”اور اگر اچھے پرنسپل کا ساتھ نہ مل سکا تو؟“

”تو سر وائس پرنسپل اور ادارہ دونوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔“

سوال کرنے والے صاحب مسکرا دیے۔

منتہا کی نظر ڈائریکٹر صاحب کی جانب اٹھی، وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

”انہیں جانتی ہیں؟“ مرکزی نشست پر متمکن صاحب نے اس کی توجہ قصداً ڈائریکٹر صاحب کی جانب مبذول

کرائی۔

”جی سر۔“

”کون ہیں؟“

”ڈائریکٹر نظامت تعلیمات۔“

”ڈائریکٹر صاحب آپ ان سے کوئی خاص سوال پوچھنا چاہیں گے؟“

”جی۔“ ڈائریکٹر صاحب نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پہلو بدلا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”بی بی!

فرض کیجئے آپ کو اپنے پرنسپل کی غیر حاضری کے دوران مارنگ اسمبلی میں بچوں سے خطاب کرنا ہے۔ آپ ان سے

کیسے خطاب کریں گی؟“

وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”تصور کر لیجئے کہ ہم سب جو آپ کے روبو بیٹھے ہیں آپ کے اسٹوڈنٹس ہیں جن سے آپ کو مارنگ اسمبلی میں

اسکول کے روزمرہ معاملات یا کسی خاص حوالے سے بات کرنی ہے۔“

بڑا مشکل مرحلہ تھا۔

اس نے ہمت سے کام لیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر انٹرویو بورڈ کے اراکین کے روبو کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم بچو! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ چھٹیاں اچھی گزری ہوں گی اور آپ نے سیر و تفریح

اور کھیل کود میں سارا وقت گنوانے کے بجائے چھٹیوں سے قبل آخری دن ہماری ہدایات کے مطابق اپنی تعلیمات کے

دوران پڑھائی کو بھرپور وقت دیا ہوگا۔ آپ نے ایسا کیا ہے یا نہیں اس کا اندازہ جلد ہی اس وقت ہو جائے گا جب آپ

اپنی ہوم ورک کاپیاں چیکنگ کے لیے اپنے اپنے ٹیچرز کو دیں گے اور ٹیچرز آپ سے کلاس میں سوالات کے ذریعے یہ

دیکھیں گے کہ آپ نے کتنا کچھ پڑھا ہے کیا کچھ یاد کیا ہے۔ بہت جلد ہمارے سامنے امتحانات بھی متوقع ہیں۔ ان



امتحانات کے نتائج سے بھی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ نے چھٹیاں کیسے گزاری ہیں۔ اب جبکہ اسکول ڈھائی ماہ کی تعطیلات کے بعد دوبارہ کھل چکا ہے۔ اپنی توجہ پڑھائی پر رکھئے۔ آپ کا یونیفارم صاف ستھرا ہونا چاہیے اور آپ کو صرف جماعت ہی میں نہیں جماعت سے باہر بھی نظم و ضبط کا پابند رہنا چاہیے۔ امید ہے آپ ادارے کی نیک نامی کا باعث ہوں گے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔"

فرضی طلبہ سے اپنا خطاب ختم کر کے اس نے دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ انٹرویو بورڈ کے اراکین کے چہروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ "تھینک یو ویری میچ" مس منتہا۔ "یہ گویا اعلان تھا اس امر کا کہ انٹرویو ختم ہو چکا تھا اور وہ جاسکتی تھی۔" "تھینک یو سر۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

جاتے جاتے اس نے کن انکھیوں سے ڈائریکٹر صاحب کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے مطمئن سے بیٹھے تھے۔ کمرے سے نکل کر وہ جو نئی اس ہال میں پہنچی جہاں امیدوار اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"برا لمبا انٹرویو تھا!"

"کیسا رہا؟"

"کیا کیا پوچھا؟"

"کتنے لوگ بیٹھے ہیں؟"

"کوئی سوس ہوگی آپ کی جو اتنا ٹائم دیا ان لوگوں نے آپ کو۔"

"ہاں بھی جن کی سوس ہوتی ہے ان کا ہر کام بن جاتا ہے۔"

"او خدا یا!"

ایسی بدگمانی ایسی قنوطیت!

لوگ اللہ پر توکل اور اپنی صلاحیت و اہلیت کا احتساب کرنا سیکھ کر معاشرے کو اس بدگمانی اور قنوطیت سے کیوں نہیں بچا لیتے!



نیمہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ مسز ظہیر اور ظہیر صاحب اس سے انتہائی محبت کا رویہ رکھتے تھے۔ لیلیٰ روایتی نندوں سے بالکل مختلف اور دوستوں کی طرح اس کے ساتھ مل جل کر رہتی تھی۔ عدنان کا اسے بھابی کہتے منہ سوکھتا۔ مختصر سا کنبہ تھا اور سب کے سب بڑے خلوص، مہذب، محبت کرنے والے اور... بے ریا لوگ۔

مسز ظہیر نے فرحان کو ہدایت کر کے بھیجا تھا کہ وہ نیمہ کو جلد از جلد اپنے پاس بلوانے کی کوشش کرے۔ وہاں صرف ایک مسئلہ تھا اور وہ تھا رہائش کا مسئلہ۔ فی الوقت تو تعلیم، نیمہ اور فرحان مشترکہ طور پر ایک فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ نیمہ ظاہر ہے ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ فرحان کو علیحدہ گھر کا بندوبست کرنا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ نیمہ کو اپنے پاس بلا سکتا تھا۔

"مگر ہم یہ نہیں چاہیں گے فرحان کہ اس سلسلے میں کوئی غیر ضروری تاخیر ہو۔ فیلی یکجا ہی اچھی لگتی ہے۔ نیمہ کو ہمیں جلد از جلد اپنے پاس بلانا ہے۔"

مسز ظہیر نے فرحان سے کہا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں امی۔" فرحان نے انہیں اطمینان دلایا اور نیمہ کو بھی۔

"مجھے وہاں جاب مل جائے گی نا فرحان؟" نیمہ یہ بات اس سے پہلے بھی کئی بار پوچھ چکی تھی۔

”تمہیں جاب کی اتنی فکر کیوں ہے؟“

”بھئی وہاں آپ پیسہ کمانے کے لیے ہی تو گئے ہوئے ہیں نا اور نہ کس کا جی چاہتا ہے اپنے گھر سے دور رہنے کو۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے تو جلد اپنے وطن واپس آسکیں گے۔ ہم اپنا اسپتال کھول لیں گے جس کے ایڈمنسٹریٹر آپ ہوں گے۔“

”اور میرے ڈپلوے کا کیا بنے گا؟“

”وہ بھی کام آئے گا۔“

دہلی سے فرحان کا ہر دوسرے تیسرے دن فون آجاتا۔ مسز ظہیر کی کوشش ہوتی کہ نیہہ اس سے زیادہ بات کرے۔ نیہہ متردد ہوتی انہیں اور ظہیر صاحب کو فون تھمانے کی کوشش کرتی تو مسز ظہیر کہتیں ”ارے بھئی ہم تو بچپن سے فرحان میاں کی غول غاں سنتے چلے آ رہے ہیں۔ اب تمہارا وقت ہے تم بات کرو۔ فون کرے میں لے جاؤ۔“

کتنی اچھی ساس تھیں مسز ظہیر! وہی کیا ظہیر صاحب کچھ کم تھے کیا۔ بڑے پیار سے اسے بو صاحب کہتے۔ باہر جاتے تو اس کی حاجتیں اور فرمائشیں دریافت کر کے واپس لوٹتے تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر۔ لیلیٰ سے اس کا ایسا سہلایا ہو گیا تھا کہ وہ فہیم کے بارے میں اپنے چھوٹے چھوٹے راز اسی سے شیئر کرنے لگی تھی۔

”اللہ بھائی رات کو جب آپ سب لوگ سو گئے تو پتا ہے کیا ہوا؟ فون کی گھنٹی بجی ہم نے کال ریسیو کی جواب آیا۔ بی بی وینٹائن ڈے۔ فہیم تھے۔ سچ ہمیں تو یاد ہی نہیں تھا کہ آج وینٹائن ڈے ہے۔ فرحان بھائی نے شام کو آپ کو دس کیا تھا کیا؟“

”میں کیوں بتاؤں۔“

”اللہ بتائیے نا۔“

”ہوں.... کیا تھا۔“

”آپ تو انشاء اللہ جلدی وہاں چلی جائیں گی پھر جب میں بھی آجاؤں گی تو وینٹائن ڈے ہم لوگ اکٹھے منایا کریں گے۔“

”نہیں بھئی اکٹھے کیوں علیحدہ علیحدہ۔ اپنی اپنی پرائیویسی کے ساتھ۔“

”چلیے جیسے آپ کی مرضی۔“

لیلیٰ نے چپکے سے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ فہیم کو مذاقاً مجنوں کہتی تھی۔

جن دنوں نیہہ کی ڈے ڈیوٹی ہوتی لیلیٰ رات کو اس کے کمرے میں آجاتی اور کبھی آلتی پالتی مار کر کبھی اپنے گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھ کر کبھی اس کے پہلو پہ پہلو لیٹ کر باتیں کرنے لگتی۔ باتوں ہی باتوں میں وہ فہیم کا ذکر نکال لیتی اور پھر سرگوشیاں شروع ہو جاتیں۔ کبھی کبھی عدنان بھی دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بہ آواز بلند کہتا۔ ”کیا ہو رہا ہے سیلیو؟“

”تم بھی آجاؤ۔“ نیہہ جواب دیتی۔

دروازہ کھلتا اور وہ مسکراتا ہوا کمرے میں آجاتا۔

”ہیلو ابوری بڈی۔“ یہ اس کا مخصوص انداز تھا۔

”ہیلو نو بڈی۔“ لیلیٰ مسکرا کر جواب دیتی۔

”مے آئی جوائن یو مادلر؟“



”شیور شیور۔“ نیہہ کہتی۔

اور وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاتا پھر نہ جانے کہاں کہاں کے قصبے چھڑ جاتے۔ نیہہ لیلیٰ کی تسلی کو بہانے بہانے فہم کا ذکر چھیڑتی رہتی۔

روز مرہ کے ان معمولات سے قطع نظر خاندان میں آئے دن مختلف النوع تقریبات کا سلسلہ اس تو اتارے جاری رہتا کہ ہر دوسرے تیسرے دن نیہہ کو سسرال والوں کے ساتھ خاندان کے کسی نہ کسی گھرانے کی خوشی یا غمی میں شرکت لازم ہوتی۔ کبھی کسی کا عقد، کسی کا ولیمہ، کسی کا جوڑا کٹائی، کسی کی گود بھرائی۔ کہیں بسم اللہ بڑھائی، کہیں آمین، کسی بچے کی مسلمانی کسی کا عقیقہ، کسی کے ہاں قرآن خوانی، کسی کے گھر میلاد، کسی کی تدفین، کسی کا چھلم، کسی کو امتحان میں کامیابی کی مبارکباد دینا ہوتی کسی کو نئی ملازمت کی مبارکباد الغرض ہر دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں جانا لگا رہتا اور ایسے تمام مواقع پر مسز ظہیر اور گھروالے نیہہ کو سب سے آگے رکھتے۔ وہ پیچھے چھپنا چاہتی تو مسز ظہیر بڑے پیار سے سمجھاتیں۔ ”بھئی“ اب ہم لوگ تو بس مسمان ہیں تم ہی نے گھر کی بڑی بہو ہونے کے ناتے ہمارے گھرانے کی نمائندگی کرنی ہے ہر جگہ۔“

”ہو صاحب“ آپ خاندان بھر میں اپنے گھر کی سفیر ہیں۔“ ظہیر صاحب کہتے اور ایک ایک سے نیہہ کا بار بار تعارف کراتے ”یہ ہماری ہو صاحب ہیں“ فرحان میاں کی دلہن ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔“

”ای یہ ابو کو کیا ہو گیا ہے جہاں جاتے ہیں بھابی کو ہر مرتبہ لوگوں سے یوں متعارف کراتے ہیں جیسے وہ بھابی سے اور بھابی ان سے پہلی بار مل رہی ہوں۔“ لیلیٰ کہتی۔

”تمہارے ابو اپنی ہو صاحب سے بہت خوش ہیں۔“ مسز ظہیر کہتیں۔

”وہ تو ہمیں معلوم ہے۔“

”معلوم ہے تو پھر اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ بیٹا ہمیں اور تمہارے ابو کو بہت عرصے بعد خوشی ملی ہے۔ ہم دونوں ہی ایکسا ٹنڈ ہیں۔ ابھی تو تم دیکھنا جب تمہارے ابو دادا ابابینس گے تو خوشی سے کیا حال ہو گا ان کا۔“

شادی کے پہلے ہی مینیے نیہہ امید سے بھی ہو گئی تھی اور یہ بات اس نے تیسرے مینیے سب کو بتائی تھی اس خوش خبری پر سسرال میں جو خوشی تھی سو تھی می اور منتہا کی مسرت سوا تھی۔ یہ کھاؤ وہ پوایسے چلو ویسے بیٹھو۔ نیہہ جب میکے آتی جب سسرال سے میکے فون کرتی می اسے احتیاطی تدابیر اور مشوروں سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتیں۔

نیہہ مسکرا دیتی۔

”می! آپ کی بیٹی ڈاکٹر ہے سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہے۔“

”تجربے کا کوئی مول نہیں ہوتا۔“ می کہتیں۔

”اور تجربہ بھی می کا!“ منتہا بڑی محبت سے نیہہ کو دیکھتے ہوئے اپنی بانہیں می کے گلے میں حائل کر دیتی۔

ادھر سسرال میں اور ادھر میکے میں ننھے مسمان کے پُرتاک استقبال کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ منتہا جب بازار جاتی کوئی نہ کوئی ننھی متی سی چیز خرید لاتی جسے دیکھ کر می کی باچھیں کھل جاتیں ان ساری چیزوں کو وہ ایک بڑے چری صندوق میں سینت کر رکھے جاری تھیں۔

”خدا کی شان ہے، تم اب تک جتنی چیزیں خرید کر لائی ہو سب کی سب بیٹے کی معلوم ہوتی ہیں۔“ ایک روز می نے اس سے کہا۔

”جی ہاں بس اتفاق کی بات ہے۔“

”خدا کرے بیٹا ہی ہو، نیہہ کے سسرال والے خوش ہو جائیں گے۔“

”نیہہ کے سسرال والے تو بیٹی کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیں گے والدہ“ یہ تو جابلوں کا کام ہے کہ بیٹا پیدا ہوا تو خوش ہو

گئے بیٹی ہوئی تو ناخوش۔

”ارے میرا بچہ ناخوشی بیٹی کی پیدائش کی تھوڑی ہوتی ہے رونا تو اس کی قسمت کا ہوتا ہے۔ خدا بخشے ہماری امی بتایا کرتی تھیں کہ میری پیدائش پر تمہارے نانا جان نے حلوائی سے کھوئے کے اسپیشل لڈو بنوا کر چاندنی کی پلیٹوں میں تقسیم کرائے تھے کیا پتا تھا انیس کہ ان کی بیٹی کی قسمت میں کیا لکھا ہے پرانی باتیں یاد کرتی ہوں تو دل دکھنے لگتا ہے۔“

”بڑے دن گزر گئے والدہ اب آپ اچھی اچھی باتیں سوچا کریں۔ میں نے فضلہ سے ملیب کے لیے کوئی اچھی لڑکی دیکھنے کو کہا ہے۔ اس کا حلقہ احباب کافی وسیع ہے۔“

”مئی کو دل گرفتہ دیکھ کر منتہا نے اچانک موضوع بدل دیا۔

”کیا مطلب؟“ اب منتہا نے چونک کر مئی کو دیکھا۔

”نہیہ کی شادی پر بھائی جان اور بھالی نے اپنی ساری زیادتیوں کی تلافی کر دی اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نہ ہوتے تو اس وقت کون نہیہ کو رخصت کرنے ہمارے ساتھ کھڑا ہوتا۔“

”حیرت ہے! آپ نے یکدم ان کی ساری زیادتیاں درگزر کر دیں۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ ماموں جان اور ممانی جان کا ہم لوگوں کے ساتھ رویہ کیوں بدلا ہے۔“

”جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اب جبکہ ان کی ضرورت ہم سے انکی ہے اگر ہم بھی ان کی طرح آنکھیں پھیر لیں تو پھر ان میں اور ہم میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا اور کیا پتا کہ کل پھر ہمیں کس وقت ان کی ضرورت پڑ جائے۔ بچے رنجشوں کو بردھنا نہیں چاہیے ختم کرنے کی کوششیں کرنی چاہیے۔“

”ملیب کے مستقبل کی قیمت پر!“ منتہا کے لہجے میں استعجاب آمیز استفہام تھا ”نہیہ والدہ یہ بہت مرنگا سودا ہو گا۔ ملیب کی شادی ہم خاندان سے باہر ہی کریں گے مسز ظہیر کی طرح کے لوگوں میں۔“

”بیٹا بچیوں کے رشتوں کی تو مجبوری ہوتی ہے خاندان میں ان کے لیے برابر کا رشتہ نہ ملے تو مجبوراً خاندان سے باہر نکلتا پڑتا ہے۔ ملیب کے لیے تو مدیحہ موجود ہے۔ گھر کی لڑکی ہے میرا بھی ہمیشہ نہ سہی کبھی تو خیال کرے گی ہی۔“

”خدا کے واسطے مئی ملیب کو ممانی جان کا ریشمال بنانے کی نیت مت رکھیے۔“

”اچھا چلو جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔“

”وقت آئے گا کیا آچکا ہے۔ فلیٹ کا قبضہ ملتے ہی ملیب کی شادی کر دیں گی۔“

”اس کی شرط سن رکھی ہے نا تم نے۔“

”وہ تو پاگل ہے۔“

”پتا نہیں وہ پاگل ہے یا تم۔۔۔ وہ تو دو ٹوک کہتا ہے جب تک آپا کی شادی نہیں ہوتی میرے بارے میں سوچے گا بھی مت۔“

”اے کہنے دیں بڑی آپ ہیں کہ وہ۔۔۔ حکم اس کا چلے گا کہ آپ کا۔“

”چھوٹی تو میں تم سے بھی نہیں۔“

منتہا نے چونک کر مئی کو دیکھا پھر مسکرا دی اور مئی کی فحش آمیز نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنی بانہیں ان کے گلے میں جامل کر دیں۔



نہیہ کا برتھ ڈے تھا اور مئی اور منتہا کو ہمیشہ کی طرح یاد آ رہی ان تینوں بھائی بہنوں کے جنم دن اور مئی ڈیڈی کی شادی کی سالگرہ ہمیشہ بڑے اہتمام سے منائی جاتی رہی لیکن ڈیڈی سے علیحدگی کے بعد اور بہت سی خوشگوار روایتوں کی طرح یہ سب کچھ بھی قصہ پارینہ بلکہ قصہ دردین کر رہ گیا تھا۔ مئی اور ڈیڈی کی شادی کا دن آتا اور



چپ چاپ گزر جاتا۔ منہا کے برتھ ڈے پر نہ اسے کارڈ، پھول اور کوئی تحفہ دے دیتی۔ نہ اور ملیب کے جنم دنوں پر منہا اپنی اور مٹی کی جانب سے انہیں مشترکہ کارڈ، پھول اور تحائف دیتی اور بس نہ کوئی تقریب، نہ ہلا گلانہ کہیں باہر آتا جاتا۔

نہ کی شادی کے بعد اس کی پہلی سالگرہ آئی تو منہا نے اسے اپنی اور گھروالوں کی طرف سے ایک مشترکہ کارڈ، پھول اور ایک نفیس سارنڈی میڈ جوڑا بذریعہ کوریئر سروس اس کی سرال کے پتے پر بھجوا دیا۔ کوریئر سروس کا کارکن پھول اور گفٹ بیک پہنچانے آیا تو ریسپر دستخط منظر ظہیر نے کیے بڑے سے مستطیل ڈبے کے ساتھ ایک گلدستہ تھا جس کے پھولوں کو اس خوبصورتی اور مہارت سے ترتیب دے کر باندھا گیا تھا کہ ”بھئی برتھ ڈے“ لکھا نظر آ رہا تھا۔

”او گاڈ! امی آج تو بھالی کی برتھ ڈے ہے۔“ لیلیٰ نے گلدستے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی، ہمیں تو پتا ہی نہیں تم ہی بتا دیتیں۔“ منظر ظہیر نے لیلیٰ سے کہا۔

”ہمیں کب پتا تھا امی، اس گلدستے کو دیکھ کر خیال آیا کہ اگر بھالی کو ان کے گھروالوں نے برتھ ڈے دے دیا ہے تو شاید ان کا برتھ ڈے ہی ہو گا۔“

”ارے بے وقوف لڑکی شاید نہیں یقیناً۔ آج نہ کا برتھ ڈے ہے۔“ منظر ظہیر نے پیار سے لیلیٰ کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔

”پھر تو ہم لوگوں کو بھی انہیں دے دینا چاہیے۔“

”صرف دے دینا ہی نہیں پارٹی کا بندوبست کرو بھئی۔“

”پارٹی کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے امی، اس وقت ڈیڑھ بج رہا ہے بھالی اسپتال میں اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ ابو اپنے دفتر میں ہیں عدنان اپنے آفس میں۔ میں نے اسکول سے آنے کے بعد ابھی چینیج تک نہیں کیا۔ گھر پر اس وقت میں اور آپ ہیں بس پارٹی کی تیاری کون کرے گا؟“

”ارے بھئی پارٹی کی تیاری میں کون سے... بل بیل لگتے ہیں۔ لگن میاں زندہ باد پائینڈ باد۔ تم چینیج کرو، نماز پڑھو ہم اس دوران تمہارے ابو اور عدنان کو فون کرتے ہیں کہ دفتر سے سیدھے گھر واپس آئیں پھر بازار سے منگوائی جانے والی چیزوں کی لسٹ بناتے ہیں اور لگن میاں کو بازار دوڑاتے ہیں۔ بو اسے کہتے ہیں کہ کچن میں جائیں اور جو کچھ بنا سکتی ہیں بنا ڈالیں۔ انڈسٹرل ہوم میں سے ایک دو بچیوں کو ان کی مدد کے لیے بلائے لیتے ہیں۔ بیکری والا ہمارا اپنا ہے فون کیے دیتے ہیں ہم اسے کہ پانچ چھ بجے تک ہمیں کیک تیار چاہیے کیا خیال ہے کتنے پائینڈ کا کافی رہے گا۔“

”دیکھ لیں۔“

”ارے بھئی، تم بھی تو کچھ بتاؤ۔“

”سوری امی، ہمیں کچھ اندازہ نہیں۔“

”حالانکہ ہونا چاہیے۔ شادی کے بعد وہاں دعائی میں اکیلی رہو گی تو کیا اپنے گھر میں پارٹیز ارنج کرنے کے لیے ہمیں فون کر کے پوچھا کرو گی کہ فلاں پارٹی کے لیے کیک کتنا بڑا بنوا میں۔“

”وہاں تو شاید خود ہی بنانا پڑے۔“

”خود بنانے کے لیے تو اندازے کی درستی اور بھی زیادہ ضروری ہے۔“

”وہاں بھالی ہوں گی نا صلاح مشورے کے لیے۔“

”بہت خوب! ارے بھئی پردیس میں زندگی گزارنے کے لیے خود انحصاری سیکھو۔ سنا ہے بہت مصروف اور تیز رفتار ہے پردیس کی زندگی۔“

”امی جان میرے خیال میں تین چار پائینڈ کا ایک بہت رہے گا۔ بس ہم گھروالے ہوں گے نا؟“

نہیہ کی والدہ اور بہن بھائی کو بھی انوائیٹ کیے لیتے ہیں۔“  
 ”دیری گڈ آئیڈیا..... بھابی کو ان کے اسپتال فون کر دوں میں۔“  
 ”نہیں بھئی، انہیں تو ہم سریر اندر دینا چاہتے ہیں۔ بارہ بجے وہ گئی ہیں آٹھ بجے ڈیوٹی آف ہوگی۔ ہم چھ بجے انہیں فون کر دیں گے کہ کچھ ایمرجنسی ہے گھر آجائیں۔“  
 ”کیا ایمرجنسی؟“  
 ”کچھ بھی.... مثلاً فرحان کا فون آئے گا انہوں نے ساڑھے چھ بجے فون کرنے کو کہا ہے۔“  
 ”وہ کہیں گے انہیں اسپتال کا نمبر دے دیں۔“  
 ”ہم کہیں گے اسپتال میں ایکسیجنگ کے ذریعے فون کرنے میں خواہ مخواہ کال لمبی ہوگی ان کی۔“  
 ”اف ای، آپ کتنی عمدہ پلانر ہیں۔ بھابی کے فرشتوں کو بھی شبہ نہیں گزرے گا کہ آپ کی منصوبہ بندی کیا ہے۔ ہاں شاید انہیں بھائی کے فون نہ آنے پر تھوڑا سا افسوس ضرور ہو۔“  
 ”وہ بھی نہیں ہوگا۔ فرحان کے نام ایک منٹ کی کال کر کے ہم صاحب زادے سے کہہ دیں گے آج تمہاری نصف بہتر کا برتھ ڈے ہے دوش ضرور کروڑا۔“  
 ”ای! لیلیٰ نے بہت پیار سے انہیں دیکھا۔“  
 ”سزن ظہیر نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اس کا گال تھپتھپایا اور چمکار کر بولیں ”جاؤ شاباش تم چینیج کر کے نماز پڑھ لو پھر ہم دونوں کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد پارٹی کی تیاری کے لیے کمر کتے ہیں۔“  
 ”اوکے۔“



وارڈ کا چکر لگانے کے بعد نہیہ جونہی راہداری میں نکلی اس کے اوور کوٹ کی جیب میں پڑا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے جیب سے موبائل فون سیٹ نکال کر کال ریسیو کی۔ چھوٹی سی ڈسپلے اسکرین پر ہویدا نمبر اس کے گھر کا تھا۔  
 ”ہیلو!“  
 ”نہیہ!“  
 ”السلام علیکم امی جان۔“  
 ”جیو، پھلو پھلو۔“ اس کی ساس سزن ظہیر کا لہجہ گواہ تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے دعا دے رہی تھیں ”کیا ہو رہا ہے؟“  
 ”وہی امی جان جو ایک ڈاکٹر کو اپنی ڈیوٹی کے دوران کرنا پڑتا ہے۔“ وہ خوش گوار لہجے میں بولی۔  
 ”آج جلدی گھر آسکتی ہو؟“  
 ”خیریت!“  
 ”فرحان کا فون آیا تھا۔ وہ شام چھ سات کے درمیان فون کریں گے تمہیں۔“  
 ”ان کے پاس میرے اسپتال کا نمبر ہے تو سہی۔“  
 ”بھئی ہوگی کوئی ایسی بات جو وہ اسپتال کے نمبر پر نہیں گھر کے نمبر پر کرنا چاہتے ہیں۔“  
 ”میں تو آٹھ بجے فارغ ہوں گی۔“  
 ”تھوڑا جلدی آجاؤ، یہ ناممکن تو نہیں۔“  
 ”کوشش کرتی ہوں۔“  
 ”کوشش نہیں ساڑھے چھ بجے تمہیں گھر پر ہونا ہے۔“



"او... او کے امی جان۔"

کچھ وقت ہوئی مگر اس نے گھر جلدی جانے کا بندوبست کر ہی لیا۔ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے چھ بجانے کو تھیں جب وہ گھر پہنچی۔ گھر کا دروازہ لیلیٰ نے کھولا اور مسکراتے ہوئے بولی "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔"

"خیریت تو ہے!"

"الحمد للہ، سب خیریت ہے۔ آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

"ان کا فون تو نہیں آیا۔"

"ان کا کن کا کون کا؟"

نہہ نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

جونہی وہ لیلیٰ کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئی یہی برتھ ڈے ٹویو۔ کی مترنم صداؤں اور ایک خوش رنگ پیش منظر نے اس کا سواگت کیا۔ مئی، مستہ اور ملیب کی موجودگی اس منظر کو اور دلکش بنا رہی تھی۔

"خدا ایسی ہزاروں خوشیوں بھری سالگرہ ہیں نصیب کرے تمہیں۔" مئی نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"بھئی برتھ ڈے۔" منتہا نے دس کیا۔

"تھینک یو۔"

"بھئی برتھ ڈے۔" ملیب نے کہا۔

منز ظہیر، ظہیر صاحب، لیلیٰ، عدنان، گلن میاں، بواجی، انڈسٹریل ہوم کی دو لڑکیاں رابعہ اور نرگس بھی اس منظر میں موجود تھیں۔

"ساگرہ مبارک ہو صاحب۔" ظہیر صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ دھرا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"کتنے دنوں! کتنے برسوں بعد کوئی مشفق ہاتھ اس کے سر پر آیا تھا۔"

"لاؤں بھی ہم بھی اپنی بہو کو ساگرہ کی مبارک باد دے دیں۔" منظر ظہیر نے اپنی بائیں ذاکے اس کی طرف بڑھیں اور جونہی انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگایا یہی برتھ ڈے کا شور مچ گیا۔

مئی کو یوں لگا جیسے نہہ کو اس سے بہتر گھر مل ہی نہ سکتا تھا۔

○☆☆○

فضہ چار دن کی اتفاقی رخصت پر تھی۔ اس کی سب سے چھوٹی نند کی شادی تھی اور وہ اس شادی میں شرکت کے لیے خینوں بچوں کے ہمراہ سسرال گئی ہوئی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے منتہا سے کہا تھا "بہت عرصے بعد سسرال جا رہی ہوں میرے حق میں دعائے خیر کرنا۔ دوستوں کی رعائیں ساتھ ہوں تو بندے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔"

منتہا چند لمحے اسے تنگ باندھے دیکھتی رہی پھر اس نے بڑے خلوص دل سے کہا۔

"دش یو آل دی بیسٹ۔"

"تھینک یو... اب میں خود کو اسٹرائنگ لیل کر رہی ہوں۔"

"اسٹرائنگ تو تم ویسے بھی ہو۔"

"پتا نہیں کیوں۔" فضہ کے لبوں پر دھیمی سی کرب آمیز مسکراہٹ پھیل گئی "کیوں لوگوں کو میرے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ میں اسٹرائنگ ہوں حالانکہ میں تو بہت کمزور اور ٹوٹی پھوٹی سی عورت ہوں۔ اپنی مرضی کے خلاف ملنے والی زندگی سے سمجھوتا کی ہوئی عورت!"

اس کے آخری فقرے کا لفظ لفظ کرب میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"اپنی مرضی کے خلاف ملنے والی زندگی!" منہا نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔  
 "ہاں۔" اس نے دھیرے سے کہا "ایسی زندگی کا تو کبھی وہم و گمان بھی نہیں تھا مجھے۔ میں تو بڑی رو مینٹک بست  
 آر ٹسٹک سی زندگی کے خواب دیکھا کرتی تھی سنتا مگر... ہر خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"  
 "مگر تم تو مختار بھائی کو بھی یوں چاہتی ہو جیسے وہی تو تمہاری پہلی اور آخری تمنا تھی۔"  
 وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"شاید اس لیے کہ میرے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں۔"  
 "واپسی کب ہوگی؟"  
 "بدھ کو۔"

"بچے بھی جارہے ہیں۔"  
 "ہاں.... تینوں بست ایکسا لنڈ ہیں پھوپھی کی شادی کے خیال سے۔"  
 "جب تم چھٹی پر ہوتی ہو تو میں بست مٹس کرتی ہوں تمہیں۔"  
 "میرا بھی یہی خیال ہوتا ہے ڈیر۔"

فصہ کو گئے تیسرا دن تھا اور منہا خود کو بست اکیلی اکیلی محسوس کر رہی تھی۔ تیسرے پیرڈ میں جبکہ وہ لان پر بیٹھی  
 دھوپ تاپنے کے ساتھ بچوں کی کاپیاں بھی چیک کر رہی تھی۔ چراسی سلیم نے اسے سونلگی صاحب کا پیغام پہنچایا۔  
 "بھنو! سونلگی صاحب نے کہلوایا ہے جب آپ فری ہوں تو ان سے جرور بالجرور مل لیجیو۔"  
 "اچھا۔" اس نے کہا۔

سلیم تو پیغام پہنچا کر واپس پلٹ گیا۔ اس کا دل نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا شکار ہو گیا۔ خدا جانے آج سونلگی  
 صاحب کیا کہنا چاہتے تھے۔ اس نے تو اس دن کے بعد دفتر کی طرف جانا ہی کم کر دیا تھا۔  
 کچھ دیر وہ متذبذب سی بیٹھی رہی پھر اس خیال سے کہ کیا عجب سونلگی صاحب نے اسے کسی اور سبب ہی بلایا ہو۔  
 کاپیاں سمیٹ کر وہ انھی اور سونلگی کے پاس جا پہنچی۔  
 "آپ نے مجھے بلایا سونلگی صاحب؟"

"ہاں.... ہاں بابا.... بیٹھو۔"  
 وہ سونلگی کے روبرو بیٹھ گئی۔

تیل میں چڑے بال، سرمہ لگی آنکھیں اور چہرے پر انتہائی مسکینی اور عاجزی کا تاثر۔ یہ تھا سونلگی کی شخصیت کا  
 لب لباب۔

سونلگی نے پہلو بدلا ایک نظرا سے دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھ کر آہستگی سے کہا "میں منہا میں نے آپ سے ایک  
 ریکوئسٹ کی تھی۔"

"کیسی ریکوئسٹ سونلگی صاحب۔" اس نے جانتے بوجھتے تباہل عارفانہ سے کام لیا۔

"کوئی خاتون میرے کوہانے کی جس سے میں دوسری شادی کر سکوں۔"

"سوری سونلگی صاحب۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"آ.... آپ تو شاید غصہ ہو گئیں۔"

"بات ہی غصے والی ہے سونلگی صاحب۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسری شادی کا ارادہ کرتے ہوئے آپ کو  
 شرم آنی چاہیے۔"

"شرع اجازت دیتا ہے بابا۔"



"شرع تو اور بھی بت کچھ کہتی ہے سونگلی صاحب۔" اس نے تلخ لہجے میں کہا پھر ناگواری سے بولی "پلیز آئندہ آپ اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات مت کیجئے گا۔"

"میرا خیال تھا آپ مجھے کوئی اچھی سی خاتون بتائیں گی.... اپنے جیسی۔"

"سوری.... میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے مس منتہا ناراض کیوں ہوتی ہو بابا۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی سونگلی کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

○☆○

فضہ اپنی زندگی شادی میں شرکت کے بعد واپس آئی تو منتہا نے سکون کا سانس لیا۔

"تمہارے بغیر تو میں اسٹاف روم بدر ہو جاتی ہوں۔" منتہا نے اس کی واپسی پر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نہیں ہوتی ہو تو اسٹاف روم میں بیٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔"

"یہ تمہاری محبت ہے۔"

"شادی کیسی رہی؟"

"ٹھیک ٹھاک۔"

"اور مختار بھائی کیسے رہے؟"

"مت پوچھو۔ شادی میں شرکت کے لیے انگلینڈ سے میری زندگی ہونے والی جیٹھانی اور ان کے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔ مختار تمام وقت اسی خاتون پر ریشہ خطمی ہوتے رہے اور میں دل ہی دل میں کڑھتی رہی۔ مختار کی چالاکی دیکھو اس عورت پر یہ ظاہر کیا جیسے ہاتھ دیکھنا جانتے ہیں۔ ایک روز اس کا ہاتھ پکڑ کر جو بیٹھے تو چھوڑنے کا نام نہ لیا۔

"مبارک ہو!" منتہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فضہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بس یہی ایک شکایت باقی رہتی تھی تمہیں مختار بھائی سے وہ بھی پوری ہو گئی۔"

"اس معاملے میں تو وہ ہمیشہ سے تیز ہیں۔ خاتون اول کے طلاق لینے کی بڑی وجہ یہی تھی۔"

"مگر تم نے تو اس سے پہلے مختار بھائی کی اس خصوصیت کا مجھ سے کبھی تذکرہ نہیں کیا۔"

فضہ کے لبوں پر بڑی کرب آمیزی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ان کے کن کن خصائص کا ذکر کروں منتہا وہ تو مجموعۃ الحقائق ہیں۔"

"اور تمہیں پھر بھی ان سے محبت ہے!"

"مجبوری۔ میرے پاس کوئی اور راستہ جو نہیں۔ ہم مشرقی عورتوں کے پاس دوسرا راستہ ہوتا ہی کہاں ہے۔ ہم سے تو دنیا بس ایک ہی توقع رکھتی ہے۔ ڈو اور ڈائی۔ کرو یا جان سے گزر جاؤ۔"

"اس پر تم کہتی ہو کہ میں بھی پھانسی کا یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال لوں۔"

"ہم عورتوں کا مقدر یہی ہے ڈنیر۔"

"نو۔ نیور۔ میں اسے اپنا مقدر ہرگز نہیں بنے دوں گی۔ اپنی مرضی سے جیوں گی اپنی مرضی سے مروں گی۔"

"ڈونٹ بی سلی۔"

"میں تمغہ دانش مندی اپنے سینے پر سجا نا بھی نہیں چاہتی۔"

○☆○

دہی سے فرحان کا فون آیا ہوا تھا اور مسز ظہیر نے نیہہ کو فرحان سے بات کرنے کے لیے حسب معمول پوری پرائیویسی دی ہوئی تھی۔  
 ”گڑبڑ کرنی تھی تو یہاں آکر ہی کر لیتیں۔ میرے لیے مشکل کروی تم نے۔“ فرحان نے اس سے شاکی لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب!“ نیہہ بولی۔  
 ”ای کہتی ہیں اب تمہاری بیوی اور بیٹا اکٹھے ہی تمہارے پاس آئیں گے۔“  
 ”ٹھیک تو کہتی ہیں۔“  
 ”ٹھیک تو کہتی ہیں۔“ فرحان نے اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔  
 وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔  
 ”ہنس لو ہنس لو۔ مجھے غریب الوطن کے حال پر ہنس لو۔ اللہ میاں تم سے حساب لیں گے۔“  
 ”غریب الوطن نہیں تارک وطن کیسے جناب!“  
 ”سوچا تھا تم یہاں آؤ گی تو پھر سے ہنی مون منائیں گے پر تم نے سارا پروگرام ٹھپ کر دیا۔“  
 ”میں نے یا آپ کے ہونے والے صاحب زادے نے؟“

بچوں میں الرجی نسجاً عام ہے پہلے وقت ضرور لیں

**الرجی دمرہ چنبیل**

1 پیر ملان سے بھر  
5 فلت، طرقات، مہلک  
11 مرض کو کم کرنے سے پہلے بے مکر کرنا چاہیے

چھینکیں کیرا حلق مرگی ناک کان گلے سردرد شقیقہ گردہ خراٹے نکسیر سانس

جیسی دائمی ضدی علامات کیلئے **الرجی سٹیبلائزیشن** بذریعہ **الڈاکٹر اسامہ شاکر** دیکھو

تفصیل:- جوابی انفادہ، ویب سائٹ (اردو) یا ملاقات (وقت لیکر) **www.smamah.com.pk**

ڈاکٹر کیپٹن (ر) میاں مسلم ملانہ ایم پی پی ایس، ایف سی جی پی سپیشلسٹ ان الرجی سٹیبلائزیشن

اسلام آباد: پیر تابعدہ پشاور موڈ 4-G9 سڑک 55 H-63 فون نمبر: 051-2853821 موبائل: 0300-9565571

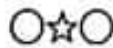
Ph: 0333-4666727, 0333-7560349, 7596559, 0320-4664189



”بد معاش کی وہ ٹھکانی لگاؤں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا۔ نامعقول کہیں کا، تھوڑا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“  
 ”ایک بات بتائیے فرحان اگر... اگر صاحب زادی ہوئی تو؟“  
 ”تو قابلِ معافی ہوگی۔ اسے کچھ نہیں کہوں گا۔“  
 ”ریلی!“

”ہوں۔ امی کہتی ہیں بیٹی خدا کی رحمت ہوتی ہے اور رحمت سے کون خفا ہو سکتا ہے بھلا۔“  
 ”اچھا آپ صاحب زادے پر بھی خفا نہ ہوں۔ بس چند مہینوں ہی کی تو بات ہے پھر ہم اکٹھے ہوں گے۔“  
 ”چند مہینے! کتنی آسانی سے کہہ دیا تم نے بس چند مہینوں ہی کی تو بات ہے۔ ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا ہے تمہارے بغیر۔ تنہائی سے گھبرانے لگا ہوں۔“  
 ”تنہائی کیوں! نسیم اور نسیم بھائی تو ہیں نا وہاں۔“  
 ”یار سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ دونوں ٹھہرے نیپلر اور میں ہو گیا ہوں شادی شدہ۔ ان کی اور میری دلچسپیاں اور مشاغل اب جدا ہو چکے ہیں۔ وہ میوزک سے جی بسلاتے ہیں، میں تصویر جاناں کیے بیٹھا رہتا ہوں۔ وہ رات کو لمبی ٹان کر سو جاتے ہیں، میں ساری رات تمہارے پیچھے لپکتا رہتا ہوں۔“  
 ”ادھو ہو ہو یہ تو بڑی خراب علامات ہیں۔“  
 ”مذاق مت اڑاؤ ورنہ...“

”ورنہ؟“  
 ”وہ ٹھکانی لگاؤں گا اس بد معاش کی کہ یاد کرے گا۔“  
 ”نہہ کھلکھلا کر ہنس دی۔“  
 ”بے چارہ!“  
 ”کون؟“ وہ چونک کر بولا۔  
 ”آپ کا برخوردار۔“  
 ”وہ ہنس دیا۔“



منتہا نہم میں اپنا پیریڈ لے رہی تھی کہ سلیم حسبِ عادت بنا اجازت طلب کیے جماعت میں داخل ہوا اور اس کے بالکل نزدیک پہنچ کر اپنے مخصوص پُر اسرار سے انداز میں آہستہ سے بولا ”بھنو! ایک پرانا اسٹوڈنٹ ملنا چاہ رہا ہے آپ سے۔“

”کون؟ کیا نام ہے اس کا؟“  
 ”نام تو میں نے نہیں پوچھا پر ہے اپنا ہی بچہ، میں پہچانتا ہوں اسے۔“  
 ”اس سے کھوا انتظار کرے پیریڈ ختم ہونے پر ملتی ہوں۔“  
 ”بھنو میری، یہی تو برا کلم ہے نسیم نہیں ہے اس کے پاس باہر گیٹ پر گاڑی کھڑی ہے ڈیور کے ساتھ۔“  
 ”سلیم نے پراہلم کو پراہلم، نسیم کو نسیم اور ڈیور کو ڈیور کہا تھا۔“  
 ”وہ خود کہاں ہے؟“

”باہر کھڑا ہے۔“

”کہاں؟“

”کہہ تو رہا ہوں باہر برآمدے میں۔“

منتہا نے دروازے کے رخ پیش قدمی کی اور لڑکوں کو خاموش رہنے کا اشارہ دیتی جماعت سے باہر نکل آئی۔  
چھ فٹ کا ایک طویل القامت نوجوان فضائیہ کی مخصوص یونیفارم پہنے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے نیاز مندی سے سلام کیا اور مسکراتا ہوا اس کی جانب بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا سر اس کے سامنے خم کر دیا۔

”یا سرنیاز!“ منتہا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔

”ان بلیو ایبل میم۔ اٹس ریگی ان بلیو ایبل!“ اس کی آنکھوں میں جہاں بھر کی حیرت سمی محسوس ہوتی تھی۔

”کیوں! اس میں ناقابل یقین ہونے کی کیا بات!“

”مجھے تو میرے کالج کے زمانے کے دوست بھی نہیں پہچانتے آپ نے کیسے پہچان لیا!“

”خوشبو سے۔“ یہ بات وہ اپنے ان تمام شاگردوں سے کہہ چکی تھی جو اس کی یادداشت پر حیران ہوتے رہے تھے۔

”خوشبو سے!“

”ہاں۔“ اس نے پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھا ”اس خوشبو سے جو ایک ٹیچر کو اپنے اسٹوڈنٹس کے پاس سے آتی ہے۔ کہاں ہوتے ہو؟“

”اس وقت تو ہمیں آپ کے سامنے ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”واقعی انٹرنورس میں ہو یا شوقیہ یونیفارم پہن لی ہے۔“

وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

”میرا اسپیشل سائز ہے میم کسی اور جی ڈی پی کی یونیفارم فٹ نہیں آتی مجھے۔“

وہ مسکرا دی۔

”اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟“

”بس میم جی پہلے پڑھائی پھر ٹریننگ چلتی رہی اس کے بعد پوسٹنگز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔“

”آج کل کہاں ہے پوسٹنگ؟“

”سیاچن سے آرہا ہوں۔“

منتہا نے اسے تعظیم سے دیکھا۔

”ٹانگ اب ٹھیک ہے میڈم۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ انہیں شن کھڑا ہو گیا اور اسے سیلیوٹ کرنے کو اپنا ہاتھ مخصوص انداز میں اپنی پیشانی تک لے گیا۔

سیاچن کے گاؤں کی مہک کہیں آس پاس ہی سے آ رہی تھی!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



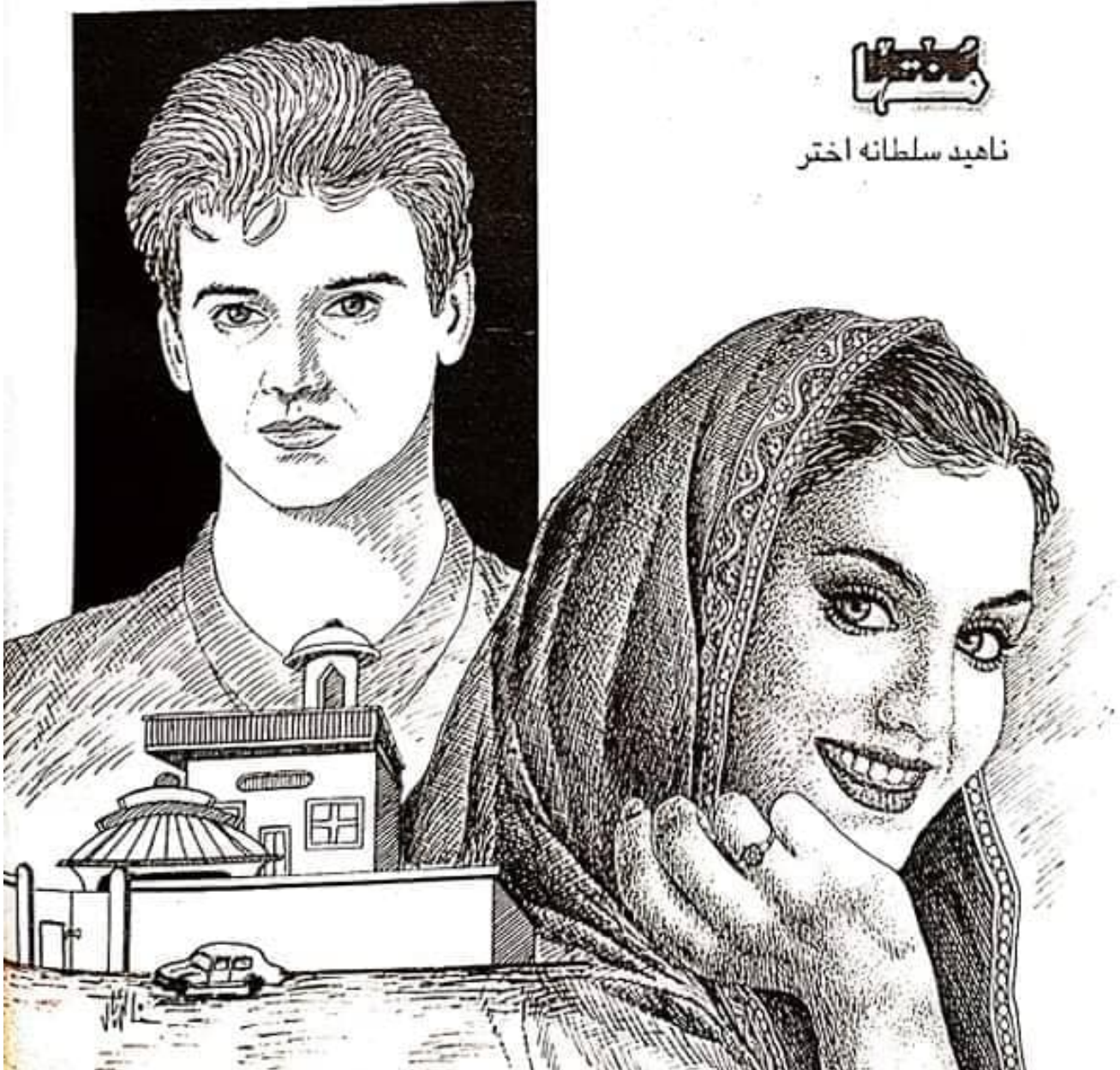
دکم کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکم تو دکم ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کارش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہری بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

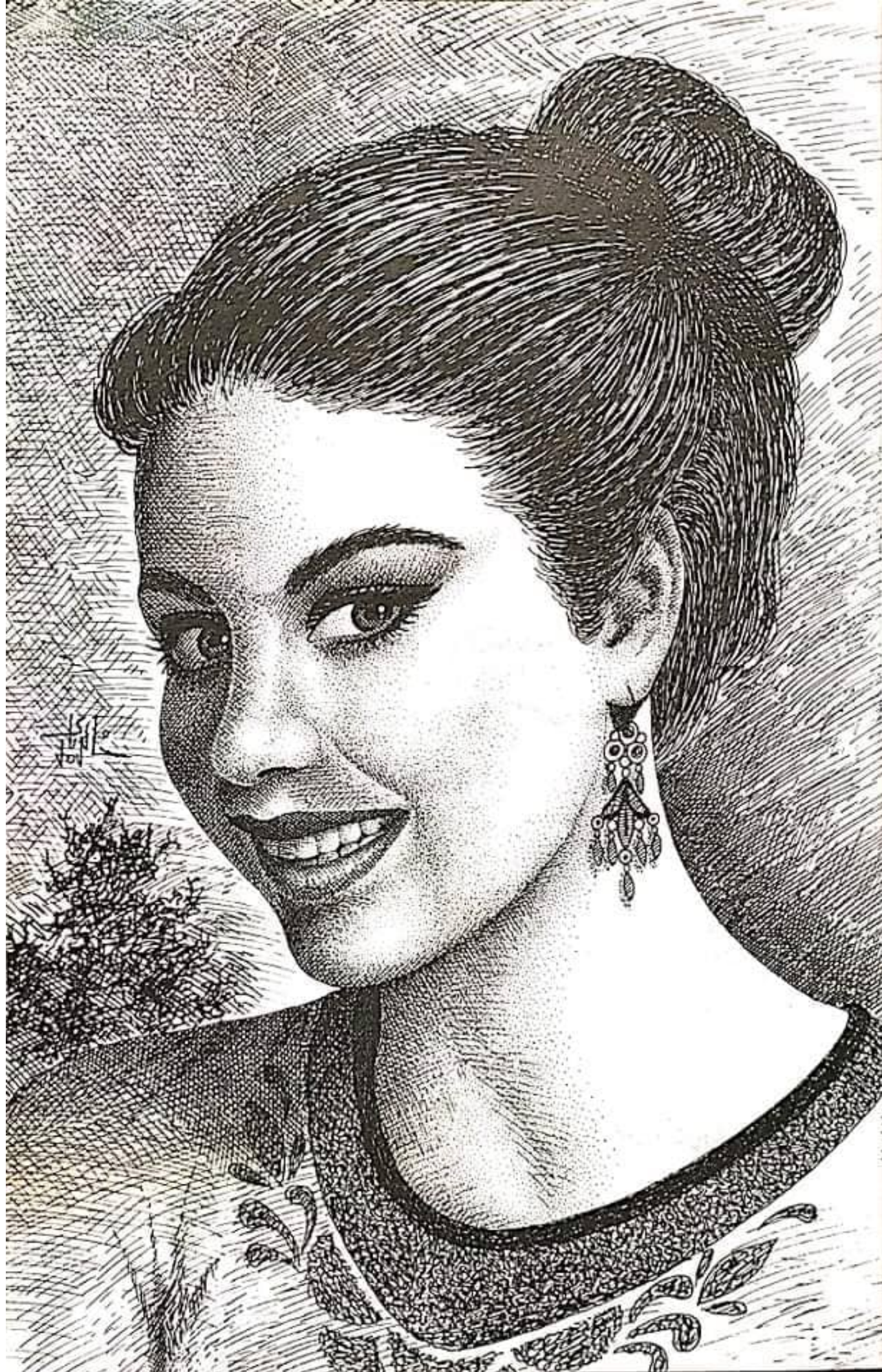
محبتوں سے گزرے حاور یقین سے بندھے رشتوں کے چاک مسار ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانہ اختر









”کیا سیاچن میں بھی تمہارا کوئی اثر ہے؟“ منتہا کی نظرس اُس کی بے شکن وردی پر تھیں۔  
 ”نو... نویم!“  
 ”تو پھر؟“

”میم پوسٹنگ تو میری رسالپور میں ہے... ایکچوئیلی سیاچن میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا ہوا تھا... اوہ  
 لیس!“ اس نے چٹکی بجائی ”آپ کا اسٹوڈنٹ بھی رہا ہے وہ... شاید آپ کو یاد ہو... راشد ڈار... جس کے فادر ریلوے  
 میں ہوتے تھے۔“

”راشد ڈار!“ منتہا نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا ”وہ جس کی آنکھیں بلیو تھیں اور بہت شرمیلا سالز کا؟“  
 ”گریٹ! میم“ آپ کی یادداشت کی داد دینی پڑتی ہے۔ آپ نے تو اس کی آنکھوں کا رنگ تک یاد رکھا ہوا ہے پر  
 اب وہ شرمیلا نہیں رہا۔ ہی از این آری مین... کیپٹن ہے... ہم دونوں نے اسکول چھوڑنے کے بعد ایک ہی کالج سے  
 ایف ایس سی کیا اور پھر اکٹھے آئی ایس ایس بی بھی۔ لیکن اس نے آری میں جانا پسند کیا اور میں نے انر فورس میں۔ وہ  
 ان دنوں سیاچن میں ہے۔ میں نے گھر والوں سے ملنے کے لیے کچھ چھٹی اپلائی کی تو بس اچانک ہی راشد کے پاس بھی  
 اس کے بیس کیپ تک جانے کا پروگرام بنالیا۔“

”سنا ہے سیاچن کی برف میں گلاب بھی کھلتے ہیں؟“  
 ”تبھی تو وہ وہاں ہے“ یا سر مسکرا دیا۔  
 ”کیا مطلب؟“

”آپ کو اس کی آنکھوں کا رنگ تو یاد ہے اور یہ بھی کہ وہ بہت شرمیلا سالز کا تھا پر یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کیسی  
 رو مینٹلک فطرت رکھتا تھا۔ سیاچن کی برف پوش بلند یوں کو وہ اپنی ذاتی شاعری سے گرما گرم رکھتا ہے۔“  
 ”واقعی! یہ مجھے معلوم نہیں تھا اور معلوم بھی کیسے ہوتا“ اسکول کے زمانے میں تو وہ کونوں کھدروں میں دبک کر  
 بیٹھنے والا لڑکا ہوتا تھا۔“  
 وہ مسکرا دیا۔

”کونوں کھدروں کی تلاش میں تو وہ بقول خود اب بھی رہتا ہے اور میم“ شاعری تو وہ اسکول کے زمانے میں بھی کرتا  
 تھا۔“

”یقین نہیں آتا۔“

”یقین کر لیجئے۔“

”چلو تم کہتے ہو تو کیسے لیتی ہوں۔“

”بہت شکریہ میم!“

”کتنے دن کی چھٹی پر ہو؟“

”بس واپس جا رہا ہوں۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے سیاچن سے آ رہا ہوں۔“

”جی بالکل“ وہ دھیرے سے مسکرایا پھر بولا ”سیاچن سے آکر واپس جانا ممنوع تو نہیں ویسے بھی میری چھٹی ختم  
 ہو رہی ہے۔“

”چھٹی پر کب تک ہو؟“

”میم جی“ عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن“ ایک سفر میں ایک راشد کے ساتھ اور دو یہاں۔ کل صبح رپورٹ  
 کرنا ہے۔ انرپورٹ جا رہا تھا۔ گاڑی اسکول کے قریب سے گزری تو سوچا آپ کو بھی سلام کرتا جاؤں۔“

”سلام کرنے کا خیال اتنے عرصے بعد آیا؟“  
 ”سوری میم!“ وہ کچھ جھل ہو کر بولا لیکن اگلے ہی لمحے وہ بڑا شانت دکھائی دینے لگا ”کیا آپ یقین کریں گی میم کہ میں اتنے عرصے میں آپ کو کبھی نہیں بھول پایا۔ کالج میں، اکیڈمی میں، زمین پر فضاؤں میں، صحراؤں اور برف پوش پہاڑوں کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے میں نے آپ کو پتا نہیں کہاں کہاں یا دیکھا، کن کن مقامات پر یاد رکھا۔“  
 ”تھینک یو!“

”تھینک یو تو مجھے کہنا چاہیے میم... آپ... آپ میرے زخمی دل پر مرہم نہ رکھتیں تو شاید میں آج اس یونیفارم میں نہ ہوتا“ جذبات کی شدت سے اس کی آواز رندہ گئی۔

”اوہ نو... یہ یونیفارم تمہیں تمہاری صلاحیتوں اور اہلیت کی بنیاد پر ملی ہے، تم یقیناً اس کے مستحق تھے۔“  
 ”نہیں میم!“ اس نے سر جھکا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا پھر وہ جھل آواز میں بولا ”میں تو امداد کی راتوں میں کھڑا تھا میم... اکیلا، زخم خوردہ اور اداں... آپ نے میرا ہاتھ تمام کمزیرے تپلی دی اور میری ہمت بندھائی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو مگر مجھے آپ کے الفاظ آج بھی یاد ہیں، آپ نے کہا تھا یا سر! بچے، جب تم پڑھ لکھ جاؤ گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا... آپ کو یہ بات کیسے معلوم تھی میم!“

”کون سی بات؟“

”یہی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟“

”ہو گیا؟“ منتہا نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

”کیا؟“ اس نے چونک کر منتہا کو دیکھا۔

”سب ٹھیک۔“

”اوہ یس!“ وہ کھل کر مسکرا دیا ”اب سب ٹھیک ہے میم! بلکہ مجھے شاید یہ کہنا چاہیے کہ اب سب لوگ ٹھیک ہیں۔“

”مگر آپ کو کیسے معلوم تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا؟“

منتہا نے اس کی طرف دیکھا اور اسے اچانک ہی مسز ظہیر کا خیال آیا۔ امداد کی سیاہ راتوں میں جب خود وہ بھی اکیلی، زخم خوردہ اور اداں تھی تو مسز ظہیر نے بھی تو اس کا ہاتھ تمام کرا سے سہارا دیا تھا، ہمت بندھائی تھی۔  
 ”یونہی ہوتا ہے یا سر!“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھیگی بھیگی سی آواز میں بولی ”زندگی میں کبھی نہ کبھی ہم میں سے ہر ایک کو امداد کی رات دیکھنی پڑتی ہے لیکن اندھیری رات میں ایک بیک ایک لمحے کو برق کوندتی ہے اور ہماری ڈھارس بن کر ہمیں منزل سمجھا جاتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے اور ہمت بندھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہم اگلوں سے دیں کہتے ہیں جو پچھلے ہم سے کہہ گئے ہوتے ہیں۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ زندگی کی زنجیر یونہی تو بنتی ہے نا بچے!“

وہ ٹکٹ باندھے اسے دیکھے چلا گیا اور اس کے خاموش ہونے پر قدرے خفت سے مسکراتے ہوئے بولا ”سوری میم! میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔“

”سمجھ جاؤ گے“ منتہا کے لبوں پر دھیمی اور دل گرفتہ سی مسکراہٹ تھی ”سمجھ جاؤ گے جب ایک دن تم بھی کسی اکیلی، زخم خوردہ اور اداں روح کو دلا سادیے ہوئے اس سے کہو گے ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”ہاں... پوچھو!“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”مانڈ مت کیجئے گا“ وہ مشروط لہجے میں بولا۔



”نہیں... نہیں... تم جو پوچھنا چاہتے ہو، پوچھو۔“  
 منہا کو جیسے یقین تھا کہ وہ کوئی غلط بات ہرگز نہیں پوچھے گا۔  
 ”آپ... آپ نے کبھی اماوس کی رات دیکھی میم؟“  
 یہ کیا پوچھ بیٹھا تھا وہ۔

کس زخم پر نوکِ نشتر رکھ دی تھی اس نے!  
 چند لمحوں کو اسے یوں لگا جیسے اس کی قوتِ گویائی جاتی رہی ہو پھر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے  
 دھیمی آواز میں کہا ”میں نے کمانا ہر انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی اماوس کی رات ضرور آتی ہے۔“  
 ”وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں میم کہ آپ نے کبھی دیکھی اماوس کی رات۔“  
 ”ہاں“ اس نے دھیرے سے کہا۔  
 وہ چونک کر اسے ابھی ابھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔  
 ”میم جی، کب؟“

”بہت پہلے....“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر مزید کہا ”جب میں کالج اسٹوڈنٹ ہوا کرتی تھی.... میرے  
 والد اچانک ہم سب کی زندگی سے نکل گئے تھے۔“  
 کیسا تھا یہ رشتہ، یہ تعلق جس نے اسے زندگی میں پہلی بار از خود کسی سے اپنا وہ دکھ بیان کرنے کا حوصلہ دیا تھا جو وہ  
 سب سے چھپاتی رہی تھی۔ مسز ظہیر نے بھی اس کا یہ دکھ خود ٹٹولا تھا۔  
 ”اوہ میم!“ یا سر کی نگاہوں میں ترحم آمیز بے یقینی جھلکنے لگی ”آئی جسٹ کانٹ بلیواٹ۔“  
 ”کیوں؟“ منہا نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

”مجھے یاد ہے ہم نے آپ کو ہمیشہ کمپوزڈ دیکھا۔ آپ واحد ٹیچر تھیں میم جن کے پیریڈ کا ہمیں انتظار رہا کرتا تھا۔  
 آپ کا پیریڈ شروع ہوتے ہی ہمیں ایک عجیب سی تاڑگی، ایک خاص قسم کی خوشی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ ہمارے دل  
 کچل اٹھتے مگر ہم مکمل نظم و ضبط میں آجاتے۔ ہمیں پڑھنا بے مزہ نہیں پُر لطف عمل محسوس ہوتا۔ مجھے یاد ہے کلاس  
 میں آنے کے بعد سبق شروع کرنے سے قبل آپ ہر روز خواہ منٹ بھر کو ہی سہی کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کرتیں جسے  
 ہم سب انتہائی توجہ اور انہماک سے سنتے اور اس میں ہماری اخلاقی تربیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکلتا اور آپ کے  
 پڑھانے کا انداز میم جی... زبردست! ریاضی جیسے خشک مضمون کو بھی آپ ہمارے لیے اتنا دلچسپ بنا دیتیں کہ جب  
 آپ پڑھاتیں تو یوں لگتا جیسے کوئی دریا دھیرے دھیرے لہراتا بل کھاتا چلا جا رہا ہو... ہم نے آپ کو کبھی چیختے چلاتے،  
 غصہ کرتے یا جھنجھلاتے نہیں دیکھا... آپ ہمیشہ بہت کمپوزڈ رہتیں۔ کیسے میم جی؟ اتنے بڑے واقعے کے بعد آپ ہمیشہ  
 اتنی...“ اس نے پل بھر کو یوں توقف کیا جیسے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا ہو پھر بولا ”متحمل کیسے رہیں؟“  
 وہ ایک بار پھر دھیرے سے مسکرا دی۔

”واقعے اور حادثے ہونے ہی کے لیے ہوتے ہیں یا سر... ان کے ردِ عمل میں بکھر کر انسان کو کبھی کچھ ہاتھ نہیں  
 آتا۔“

”اسکول کے زمانے میں ہم نے کبھی کسی سے ایسی کوئی بات سنی بھی نہیں کہ آپ کے فادر...“  
 ”میں نے کسی کو کبھی بتایا جو نہیں۔ دوستوں، ساتھی، اساتذہ اور طلبہ میں تم پہلے ہو جسے میں نے اتنے اطمینان سے  
 یہ بات بتائی ہے اور میں حیران ہوں کہ یہ بات تمہیں بتا کر میں قطعاً پریشان نہیں ہوں۔ نہ مجھے اپنی ذلت محسوس ہو رہی  
 ہے نہ رازِ مشترکہ جانے کا خوف ستا رہا ہے۔“  
 یا سر کے چہرے پر کرب آمیز سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شاید اس لیے میم جی کہ ہم دونوں ہی اماؤس کی راتیں دیکھ چکے ہیں۔"

"ہاں... شاید" منتہا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"سوری میم.... میں نے آپ کا بہت وقت لیا.... آپ کی کلاس میں خارج ہوا۔ مجھے یاد ہے کلاس کے دوران اگر کبھی پرنسپل صاحب کی طرف سے بھی آپ کا بلاوا آجاتا تو آپ پیغام بر سے کہا کرتی تھیں 'ان سے کہہ دو کلاس لے رہی ہوں۔'"

منتہا انتہائی انکساری سے مسکرا دی۔

"آئی ایم رینلی سوری میم.... فلائٹ مرس ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں آپ کی کلاس میں ہرگز خارج نہ ہوتا۔" "کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے مل کر تمہیں اس یونیفارم میں دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"مگر میں آپ کی خوشی کو محسوس کر سکتا ہوں میم!"

"کیسے!" منتہا نے استعجاب سے کہا۔

"آپ کی نگاہوں سے۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں.... خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"تھینک یو میم!.... اب اجازت چاہوں گا۔"

"ہمارے بچوں سے نہیں ملو گے؟"

وہ بے ساختہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"میری کلاس کے بچوں سے۔ بے چارے مستقل متجسس نگاہوں سے ادھر ہی دیکھ رہے ہیں" منتہا نے دروازے اور کھڑکیوں کی طرف نگاہیں مبذول کیے طلبہ کی جانب دیکھتے ہوئے یا سر سے کہا۔

"شیوہ! آپ اجازت دیں گی تو ضرور۔"

"او۔"

منتہا نے اپنے ساتھ لیے جماعت کے کمرے میں در آئی۔ لڑکوں کی نگاہوں میں ہلکورے لیتا تجسس بڑھ گیا۔

"تجھو! آپ ان کا نام بتا سکتے ہیں؟" منتہا نے مسکراتے ہوئے تمام طلبہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

لڑکوں کی نگاہیں یا سر کے یونیفارم پر آراستہ پلاسٹک نیم پلیٹ پر مرکوز ہو گئیں اور ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں "یا سر!"

"یا سر نیاز!" منتہا نے اس کا پورا نام بتایا پھر خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ طلبہ سے پوچھا "اب ذرا یہ تو بوجھ کر یہ کرتے کیا ہیں؟"

بیشتر لڑکے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جو بوجھ گئے تھے ان میں سے دو لڑکے بے تابانہ اپنی نشستوں سے اٹھے اور انہوں نے ایک ساتھ کہا "جی ڈی پائلٹ۔"

"گڈ!" منتہا نے بتانے والوں کو شاباش دی۔ نخریہ نگاہوں سے یا سر کی جانب دیکھا پھر لڑکوں کو بتایا "چند برس پہلے یہ بھی اس اسکول میں اسی طرح ہمارے اسٹوڈنٹ ہوا کرتے تھے جیسے آج آپ لوگ ہیں۔"

لڑکوں کی نگاہوں میں حیرانی اور قدرے بے یقینی ڈولنے لگی۔

"ہاں۔" منتہا نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی "صرف چند سال پہلے.... آپ لوگ دل لگا کر پڑھیں گے، محنت کریں گے تو آپ بھی ایسی ہی یونیفارم پہن سکتے ہیں۔"

"اور ایک بہت راز کی بات بتاؤں میں آپ کو دوستو! یا سر نے لڑکوں سے کہا اور ان کی نگاہوں میں ہلکورے لیتے



تجسس نے اشتیاق کی صورت دھار لی۔  
 ”مجھے یہ یونیفارم میم منتہا کی بدولت ملی ہے۔ اگر مجھے میم منتہا جیسی ٹیچر نہ ملی ہوتیں تو میں زندگی کی دوڑ میں کہیں  
 بہت پیچھے رہ گیا ہوتا۔“ اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت لڑکوں کی جانب اٹھائی اور بولا ”آپ سب بھی  
 میری طرح خوش قسمت ہیں کہ آپ کو میم منتہا جیسی ٹیچر بڑھاری ہیں۔“  
 لڑکوں کی نگاہیں منتہا پر مرکوز ہو گئیں اور چہروں پر ایک احساس نفاخہ ڈولنے لگا۔  
 دفعتاً یا سر نے انہیں شن پوزیشن اختیار کی اور اپنا بازو موڑ کر ہاتھ مخصوص انداز میں پیشانی تک لے جاتے ہوئے  
 بولا ”آئی سلیوٹ میم منتہا!“

لڑکوں کی آنکھیں دکنے لگیں اور چہرے تہمتا تے لگے۔  
 منتہا خود کو ایک ناقابل بیان کیفیت سے دوچار پانے لگی۔ ”کاڈ پلیس یو! خدا آپ کو بہت ترقی دے... اور آگے  
 لے جائے“ اس نے یا سر کو دعا دی پھر روئے سخن لڑکوں کی طرف کرتے ہوئے بولی ”بات یہ ہے بچو کہ ایک ٹیچر بھی اسی  
 وقت اچھے نتائج دے سکتا ہے جب اسے تیز دار، محنتی اور استاد کا کہنا ماننے والے شاگرد ملیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی  
 عار نہیں کہ یا سر میرے ایسے ہی شاگردوں میں سے ایک تھے....“ اس نے یا سر کی جانب دیکھا اور بولی ”آئی لیل پر اوڈ  
 یا سر... مجھے فخر ہے کہ میں آپ کی ٹیچر رہی۔“  
 ”ٹھینک یو میم... ٹھینک یو دیری مچ!“ یا سر اپنا ہاتھ نیچے لے گیا۔  
 ”اجازت میم؟“ اس نے منتہا سے کہا۔  
 ”اوکے!“

”خدا حافظ میم.... خدا حافظ دوستو!“  
 لڑکے اسے خدا حافظ کہنے کو احتراماً اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔  
 منتہا اسے رخصت کرنے کے لیے جماعت کے کمرے کے دروازے تک گئی اور اس وقت تک وہاں کھڑی اسے  
 دیکھتی رہی جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ وہ واپس پلٹی تو اسے لڑکوں کی نگاہوں میں ایک نئی جوت  
 دکھائی دی!

○☆☆○

ہاسپٹل سے گھر واپس آنے کے بعد نیہہ ستانے کو اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی  
 کھٹکناہٹ سنائی دی۔ اس نے بند آنکھیں کھول کر دروازے کی جانب دیکھا اور کچھ کہنے ہی کو تھی کہ دروازہ آہستہ  
 سے کھلا اور لیلیٰ نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا ”ہم آجائیں۔“  
 ”آؤ آؤ“ نیہہ نے اٹھ کر بیٹھنے کا قصد کیا۔  
 ”نہ، نہ، نہ بھابی جان! آپ اٹھئے گا نہیں“ لیلیٰ بڑے دلکش انداز میں انتہائی سرعت سے اس کے بیڈ کی جانب  
 بڑھی۔

”کوئی بات نہیں، تم آؤ“ نیہہ اٹھ بیٹھی۔  
 ”اونہوں“ لیلیٰ نے اسے مسکرا کر دیکھا ”ایسے تو ہم ایزی لیل نہیں کریں گے۔“  
 ”تو پھر کیسے ایزی لیل کریں گی آپ؟“ نیہہ نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔  
 لیلیٰ نے اس کے شانوں پر ہاتھ دھر کر ہلکا سا دباؤ دیا اور وہ کسی ردیوٹ کی طرح بستر پر واپس لیٹ گئی۔ لیلیٰ نے  
 چپیل پاؤں سے اتاریں اور آلتی پالتی مار کر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی ”ایسے۔“  
 نیہہ نے تکیے پر تکیہ دھرا اور سراونچا کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

”سوری بھابی، ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

”بالکل نہیں۔“

”اصل میں آپ ہیں ہی اتنی اچھی کہ ہمیں آپ سے پیار ہو گیا ہے۔“

نیمہ دھیرے سے مسکرا دی اور بولی ”ویسے میں بتاؤں، اصل بات کیا ہے۔“

”کیا؟“ لیلیٰ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہر انسان ایک آئینہ ہوتا ہے اور دوسرے انسان کو اس آئینے میں دیکھنے پر اپنا ہی عکس دکھائی دیتا ہے“ وہ تھمی

پھر بولی ”یہ میری منتہا باجی کا قول ہے۔“

”سوری!“ لیلیٰ نے منہ بسورا ”ہم اگر اتنے عقلمند ہوتے کہ اتنی مشکل باتیں ہماری عقل میں آسکتیں تو آج ہم

بھی آپ کی طرح ڈاکٹر نہ ہوتے۔“

”اچھا ہے کہ نہیں ہو۔“

”کیوں؟“

”سخت دل سخت جان بناتا ہے۔“

”مگر آپ تو نرم و ملائم ہیں، بالکل ریشم کی طرح۔“

”کون سی ریشم؟“

”وہ والی نہیں، ہم جاپانی سلک کی بات کر رہے ہیں۔“

”اس سلک کی جس کا سوٹ تمہیں فہیم نے بھجوا یا ہے“ نیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دو دن قبل ہی دہلی سے آنے والے ایک شاساکے توسط سے فہیم اور فرحان کی جانب سے تحائف اُن تک پہنچے

تھے۔

لیلیٰ کے عارض ہلکوں ہو گئے۔

”اُف اللہ بھابی، آپ بات کو کس طرف لے گئیں۔“

”سچ کہو، کیا تمہیں میرا بات کو اس طرف لے جانا اچھا نہیں لگا؟“

”او مائی گاڈ!“ لیلیٰ کے عارض دہک اٹھے ”آپ تو بچاؤ کا کوئی راستہ ہی نہیں رہنے دیتیں۔“

”ویسے فہیم کی چوائس اچھی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ لیلیٰ نے سٹپا کر اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے جو تحائف انہوں نے بھجوائے ہیں، اے دن ہیں۔“

”تھینک یو!“ لیلیٰ شرمکربولی لیکن اگلے ہی لمحے چٹکی ”فرحان بھائی کی چوائس کے بارے میں کیا خیال ہے جناب

کا۔“

”زبردست بھئی۔ اور کیوں نہ ہوگی بھلا آخر کو فہیم کے برادران لائیں۔“

”اللہ بھابی، آپ ہر بات میں انہی کا ذکر نکال بیٹھتی ہیں۔“

نیمہ نے پیار سے اس کا گال چھوا اور بولی ”تمہیں خوش کرنے کے لیے۔“

”آپ اتنی اچھی ہیں کہ ہمیں اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا ہے کہ ہمیں اللہ میاں نے اتنی اچھی بھابی دی

ہیں۔“

”اور مجھے اچھی ممانی کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ انہیں اللہ میاں اتنی اچھی...“

”ہمیں پتا ہے آپ کیا کہنے جا رہی ہیں۔“



”اور مجھے بھی پتا ہے کہ تم کیا سننا چاہتی ہو۔“  
 ”اے اللہ!“ لیلیٰ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چھپالیا۔

○☆☆○

ان دونوں گھر میں منتہا اور می کے درمیان دو موضوعات پر گفتگو گرم رہتی۔ نیسہ کا دنیا میں آنے والا پہلا بچہ اور ملیب کے لیے کسی بہت ہی اچھی سی لڑکی کا انتخاب۔

نیسہ کے پہلے بچے کے لیے می اور منتہا دونوں ہی مل جل کر چھوچھک تیار کر رہی تھیں۔ ملیب کے لیے لڑکی کی تلاش کا منتہا کے تمام ساتھیوں میں چرچا عام ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں ہر ایک خاطر خواہ مدد کو آمادہ تھا۔ کسی کے اپنے گھر میں بیٹیاں تھیں، کسی کی بھانجیاں بھتیجیاں تھیں۔ کسی کے میکے میں لڑکیاں تھیں، کسی کی سرال میں۔ غرض لڑکیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

ملیب کی ہونے والی دلہن کے لیے منتہا کا ایک معیار تھا۔

می کی خواہش پوری کرنے اور ممانی جان کے سامنے آنکھیں نہ ہونے کے لیے لڑکی کا خوبصورت اور مدد سے ہر صورت زیادہ اسماٹ ہونا شرط اولین تھی۔ سرال والوں کے ساتھ اچھی طرح گزارہ کرنے کے لیے لڑکی کا خوش سیرت ہونا اور اپنے پرابوں پر اچھا تاثر قائم کرنے کے لیے اس کا خوش اطوار ہونا بھی ضروری تھا۔ لڑکی کا خاندانی پس منظر اور اس کے متعلقین کا معقول ہونا بھی از بسکہ لازم تھا۔

تین چار لڑکیاں دیکھ لی تھیں مگر اب تک کہیں بات آگے نہ بڑھ پائی تھی۔

منتہا نے اس سلسلے میں مسز ظہیر کی مدد لینے کا ارادہ کیا تو می نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اگر انہوں نے اپنے ہی خاندان کی کوئی لڑکی بتادی تو مشکل ہو جائے گی۔

”کیسی مشکل والدہ؟“

”نئی نئی اس خاندان سے رشتے داری ہوئی ہے۔ نیسہ رچ بس لے۔ خاندان میں گھوم پھر لے تو پتا چلے گا کہ کون کس مزاج کا ہے۔ بعض لوگ بیٹی دے کر اس کے شوہر اور سرال والوں کے سامنے سر جھکائے کی بجائے الناسر چڑھنے لگتے ہیں۔ پھر خود لڑکیوں کا بھی پتا نہیں ہوتا کہ کون کس مزاج کی ہے۔ یہ تو جب نیسہ ملے جلے گی تبھی معلوم ہو گا۔“

”والدہ! یہ تو دوسرے خاندان کی کسی بھی لڑکی کے بارے میں پتا نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک کہتی ہو تم لیکن..... جس خاندان میں ہم نے اپنی بیٹی دے رکھی ہو اس سے تو کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں کیا جاسکتا ورنہ اس کا اثر ہماری اپنی بیٹی پر پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔“

می کی بات اس کے دل کو گلی اور اس نے ملیب کے لیے لڑکی کی تلاش میں مسز ظہیر کی مدد لینے سے گریز کر رکھا تھا۔

دو لڑکیاں فضا نے اپنے ملنے والوں میں دکھائیں، ایک مسز بیچی نے اپنی رشتے کی مند دکھائی۔ چوتھی مس قیوم بانو کی بھانجی تھی مگر منتہا کو فضا کی بتائی ہوئی دو لڑکیوں میں سے پہلی کو خوش شکل مگر عمر میں ملیب سے کچھ بڑی دکھائی دی۔ دوسری کا گھرانہ بہت آزاد خیال لگا۔ مسز بیچی کی مند بہت عام نک سک کی تھی تاہم گھرانہ خاصا معقول تھا۔ مس قیوم بانو کی بھانجی منتہا کو ہر لحاظ سے اچھی لگی۔ گھرانہ بھی اچھا تھا مگر جب ملیب سے برد کھوے کی بات ہوئی تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ جب تک منتہا کی شادی نہیں ہو جاتی اس کے بارے میں قطعاً نہ سوچا جائے۔ منتہا نے اسے مختلف حیلے بہانوں سے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے پیچھے ہٹا ہوا نہ دھرنے دیا۔

”بھئی میں بھی کر لوں گی، پہلے تمہاری ہو جائے۔“

”بڑا کون ہے آپ یا میں؟“  
”بات بڑے چھوٹے کی نہیں۔“  
”تو پھر؟“

”والدہ کی تنائی کا مسئلہ ہے۔ میں شادی اس وقت کروں گی جب مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مئی کے پاس کوئی ہے۔ تمہاری شادی سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا۔“  
”براہ کرم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کیجئے۔“  
”تو بھلا مجھے کیا ضرورت ہے تمہیں بے وقوف بنانے کی، تم تو بنے بنائے بے وقوف ہو۔ بھلا آج کل کے زمانے میں کوئی لڑکا شادی سے انکار کرتا ہے اور اگر کرتا ہے تو اس سے بڑا بے وقوف کون۔“  
”جلئے آپ یونہی خوش ہو جائیے۔ مجھے بے وقوف سمجھ لیں۔“  
”پلیز!“ منتہا خوشامد پر اتر آئی۔  
”نو۔“

”فارمائی سیک! میری خاطر۔“  
”کسی کی خاطر نہیں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔  
”مئی کی خاطر بھی نہیں۔“  
”اوسوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
”دیکھو! اچھی لڑکی ہے۔“  
”آپ دس پوائنٹس اور بھی گنوا دیں گی تب بھی نہیں۔“  
”ایسا کرو ایک مرتبہ ان کے گھر تو چلے چلو۔“  
”خواہ مخواہ دوسروں کا اور اپنا وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔“  
”پلیز! میری عزت کا سوال ہے، اس کی خالہ میری کولیک ہیں، کیا کہیں گی وہ۔“  
”سوری۔“

”میرا اچھا بھائی۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔  
”آپ بے شک مجھے برا کہہ دیں مانتہ نہیں کروں گا۔“  
”ملیب!“ وہ گڑگڑاہی تو دی۔  
اس نے پھر نفی میں سر ہلادیا۔  
”والدہ! پلیز آپ ہی سمجھائیں اسے۔“  
”ملیب! کتنا گڑگڑا رہی ہے، بسن! کیا احساس نہیں تمہیں کہ اس بسن نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔“  
”سوری مئی اس معاملے میں کوئی بھی مجھے جذباتی بلیک میلنگ کا شکار نہیں بنا سکتا۔ میرا جو فیصلہ ہے میں سنا چکا ہوں۔“

مئی نے منتہا کو دیکھا، ان کی نگاہوں میں بے بسی اور لاچارگی تھی!

○☆○

منتہا اس مرتبہ گھر آیا تو خلاف معمول بہت خوش تھا اور خلاف عادت فضا اور تینوں بچوں کے لیے تحائف بھی لایا تھا۔ فضا کے لیے موتیوں کے کام والا سوٹ، راول کے لیے جو گرز اور دھوپ کا چشمہ، رانیل کے لیے کالج بیک اور سانول کے لیے مائیکل بیکن کی شبیہ کے چھاپے والی ٹی شرٹ۔



”اماں! آپ کے ہسینڈ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ سب سے پہلے راول نے فضلہ کے کان میں سرگوشی کی۔  
”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”زندگی میں پہلی بار وہ ہم سب کے لیے گنٹس لائے ہیں اور آپ فرماتی ہیں کیا ہوا! ارے اماں یہ تو انقلاب  
فرانس سے بھی بڑا انقلاب ہے۔“

”بھائی! انقلاب فرانس یا انقلاب روس۔“ رائیل نے لقمہ دیا۔  
فضلہ نے نظر ترچھی کر کے رائیل کو دیکھا۔ وہ اپنے شانے اچکا کر گردن کو دونوں شانوں کے بیچ دبکاتے ہوئے زیر  
لب مسکرا دی۔

”اب کچھ دیر میں باپ کو زار روس سے تشبیہ دے دینا۔“  
”نہیں اماں۔“ راول نے بڑے پھو کے منہ سے کہا اور رائیل کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے بولا۔ ”زار  
روس کا ہمارے باپ سے کیا مقابلہ ہمارے بابا تو۔۔۔“ وہ یک لخت چپ ہو گیا۔  
”کہہ دو۔“ فضلہ نے راول کو گھورا ”کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے بابا تو ہٹلر ہیں۔“  
”کیوں ہٹلر کی توہین کرتی ہیں اماں! وہ بے چارہ تو بڑا شریف آدمی تھا۔“  
”کیسی نالائق اولاد ہے۔“ فضلہ نے راول کو پھر گھورا۔ ”ہٹلر کو باپ کے مقابلے میں شریف آدمی کہتے شرم تو  
نہیں آتی۔“

”آتی تو ہے اماں پر کوئی دوسری مثال ذہن میں نہیں آتی۔“

”بد معاش!“ فضلہ نے پیار سے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”ویسے ماما جاتا تو کریں قصہ کیا ہے۔“ رائیل بولی۔

”کون سا قصہ؟“

”یہی۔۔۔ گنٹس کا۔ بابا کی کوئی لائری شاعری تو نہیں نکل آئی۔“

”ہو سکتا ہے کوئی پرائز بانڈ نکلا ہو۔“ سانول جو بڑی دیر سے چپ تھا اپنا قیاس ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

”آم کھانے سے غرض رکھو، گھٹلیاں مت گنو۔“ فضلہ نے تینوں کو طائرانہ نظر سے دیکھا۔

”کیا بابا آم بھی لائے ہیں ماما؟“ سانول چونکا۔

”بے وقوف! آم آج کل کہاں ہے؟“ رائیل نے سانول کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی۔

”ماما ابھی خود ہی تو کہہ رہی تھیں، آم کھاؤ گھٹلیاں مت گنو۔“

”بے وقوف! ماما محاورہ بول رہی تھیں۔“ رائیل نے کہا پھر فضلہ کی جانب دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں بولی۔

”ماما جی محاورہ یا ضرب الثقل؟“

”تمہارا سرا!“ فضلہ نے اسے گھڑکا۔

”میرا سرا!“ رائیل نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے سر کو چھوا ”کیا ہوا میرے سر کو؟“

”اس میں شیطان گھس گیا ہے۔“

”مائی گاڈ!“ رائیل نے کن انکھیوں سے راول کو دیکھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور شرارت آمیز  
مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”پھر تو مجھے کسی سائیں بابا کے پاس جانا چاہیے شیطان کو دماغ سے نکلوانے کے لیے۔“

”یا رکھا ضرورت ہے سائیں بابا کے پاس جانے کی لاؤ میں نکال دیتا ہوں۔“ راول نے شرارتاً رائیل کی پونی ٹیل  
اپنی مٹھی میں جکڑ لی۔

”آف! بھائی! چھوڑیں نا میرے بال۔“

”شیطان نکال رہا ہوں۔“  
”اماں، پلیز دیکھیں نا بھائی کو میرے بال کھینچ رہے ہیں۔“  
”انتر منتر شو منتر۔“  
”آف!“

”بھئی شیطان کو بھگا رہا ہوں تمہارے دماغ سے۔“  
”پہلے تم اپنا شیطان تو بھگاؤ۔“ فضہ نے راول کا کان دبوج لیا۔  
”معافی اماں معافی۔“ راول نے بے ساختہ رائیل کے بال چھوڑ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر فضہ کے سامنے کر دیئے۔  
سانول کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔  
”جانے دیں اماں معاف کر دیں۔“ رائیل نے سفارش کی۔  
فضہ نے اسے گھورا۔

”تم لوگوں کا یہی ہے پہلے شکایت کرتے ہو پھر سفارش۔“  
اور آہستگی سے راول کا کان چھوڑ دیا۔

”اماں، وہ قصہ تو درمیان ہی میں رہ گیا۔“ راول دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔  
”کون سا قصہ؟“ فضہ چونکی۔

”کنفس والا۔ ذرا اچھا بن تو کریں؟ بابا آج کنفس کس خوشی میں لائے ہیں؟“  
”کہہ تو دیا نالائقی نکلی ہوگی یا پرائز بانڈ۔“ سانول بولا۔

”ویسے۔“ راول نے کن انگلیوں سے ماں کو دیکھا اور اس کے لبوں پر بڑی شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔  
”آج اخبار میں ایک خبر بھی آئی ہے۔“  
”کیسی خبر؟“ فضہ نے چونک کر پوچھا۔

”ایک بینک میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔“  
فضہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور بولی۔ ”کیا قیامت ہے اولاد باپ پر ڈکیتی کا الزام لگا رہی ہے۔“  
”میں تو شبہ ظاہر کر رہا ہوں اماں۔“  
”دوب مرو۔“

”کہاں؟“ وہ ترکی بہ ترکی بولا۔

”چلو بھربانی میں۔“

”سانول، یا رلانا تو ذرا چلو بھربانی۔“

فضہ نے پھر راول کو گھورا اور بولی ”چلو بھربانی سے کچھ نہیں بگڑے گا تمہارا۔“  
”میرا بھی یہی خیال ہے؟“ راول نے برجستہ کہا۔

”او مائی گاڈ!“ فضہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ”تم لوگ مجھے پاگل کر کے دم لو گے۔“

”ہم پاگل کیا کریں گے، آپ کو تو کسی اور ہی نے پاگل کر رکھا ہے۔“

”کس نے؟“ اس نے چونک کر راول کو دیکھا۔

”پاپائے۔“ راول کے بجائے رائیل بولی۔

”تم لوگ ہمیشہ اس آدمی سے جلتے ہی رہنا۔“

”ہاں، کیونکہ آپ نے انہیں ہمارا رقیب بنا دیا ہے۔“ راول بے دھڑک بولا۔



”کیا مطلب؟“ فضا نے اسے چونک کر دیکھا۔

”ہم آپ سے پیار کرتے ہیں اور آپ اُن سے۔ ہم جلیں گے نہیں تو پھر اور کیا کریں گے۔“ راول کا منہ پھول گیا تھا۔

فضا دھیرے سے مسکرا دی۔ اس نے سر اٹھا کر راول کو دیکھا اور اس کے شانے پر بڑے پیار سے ہاتھ دھرتے ہوئے بولی ”میں تو تم لوگوں سے بھی پیار کرتی ہوں میری جان۔“  
”بھی!“ راول نے اس ایک لفظ پر گویا اس کی پکڑ کی۔  
فضا ہنس دی۔

”اچھا یہ بتاؤ۔“ اس نے بہت محبت سے نوجوان بیٹے کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے باپ سے پیار نہ کروں تو پھر کس سے کروں۔“

”صرف ہم سے!“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا ”کیونکہ ہم آپ سے پیار کرتے ہیں اور وہ... وہ شخص جب اسے آپ کی پروا نہیں تو آپ کیوں مری جاتی ہیں اس کے لیے۔“  
”وہ تمہارا باپ ہے.... میرا شوہر ہے۔“

”سو کالڈ!“ اس کا لہجہ یکسر بدل گیا ”باپ ایسے ہوتے ہیں شوہر ایسا ہوتا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد ایک دوسرے کو صورت دکھائی پھر غائب۔ کبھی انہوں نے آپ کا یا ہمارا اس طرح سے خیال رکھا جیسے انہیں رکھنا چاہیے تھا۔“  
”شش!“ فضا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”آہستہ بولو، وہ ساتھ والے کمرے میں آرام کر رہے ہیں۔“

”ادمنہ!“ راول نے سر کو جھٹکا اور تلخی سے فضا کے الفاظ دہرائے۔ ”آرام کر رہے ہیں۔ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے آئے ہیں نا جو آرام کر رہے ہیں۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ فضا نے اسے بازو سے جھنجھوڑا۔

”پاگل ہو گیا ہوں۔“ وہ اپنا پاؤں زور سے زمین پر پٹختے ہوئے بولا۔

رائیل اور سانول دم بخود بڑے بھائی کے بدلے ہوئے تیار دیکھ رہے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مذاق مذاق میں ہونے والی بات ناگواری اور تناؤ میں بدل گئی تھی۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے بیٹے۔“ فضا نے ناگواری سے کہا۔

”اتنے برسوں میں آج وہ ایک سوٹ لے آئے آپ کے لیے تو میں آپ کو پاگل دکھائی دینے لگا ہوں۔“ راول غرایا۔

”ادمانی گاڈ!“ فضا نے اپنا سر ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

”آئی ہیٹ ہم آئی ہیٹ ہم۔“ راول نے بڑی بے لحاظی سے کہا۔

”شٹ اپ!“ فضا نے اسے ڈانٹا۔

راول نے کرسی کو اتنی زور سے لات ماری کہ وہ اونڈھی ہو گئی۔ رائیل اور سانول نے سہم کر اسے دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

راول لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔ فضا نے دوپٹے سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ رائیل سہمی سہمی سی فضا کے نزدیک آکھڑی ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ فضا کے شانے پر دھرتے ہوئے مری مری سی آواز میں کہا ”پلیز ماما۔“  
شاید اس کا خیال یہ تھا کہ ماں رو رہی تھی۔

فضا نے دوپٹا آنکھوں سے ہٹایا اور گردن موڑ کر رائیل کو خشونت سے دیکھتے ہوئے بولی ”دیکھ لیا اپنی بے نیکی

زبانیں چلنے کا نتیجہ!

”سوری اماں۔“ اس نے کان دبا کر کہا پھر دھیمی آواز میں بولی ”بھائی نے پہلے تو کبھی اس طرح نہیں کیا۔“  
”فکر مت کرو، اب اکثر کیا کرے گا۔“ فضلہ نے جلتے بھنے لہجے میں کہا پھر مزید بولی۔ ”بد تمیزی ایک دفعہ شروع ہو جائے تو پھر رکتی نہیں۔“  
”ایسا مت کہیں اماں۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور خبردار جو آج کے بعد میں نے تم لوگوں کو باپ کے لیے کوئی چھپوری بات کرتے دیکھا۔“

”ہمارا وہ مطلب تو نہیں ہوتا ماما، ہم تو بس آپ کو خوش کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔“  
”کوئی ضرورت نہیں مجھے خوش کرنے کی میں ناخوش ہی بھلی ہوں۔“ اس نے بھبھک کر کہا اور رائیل کا ہاتھ جھٹک کر اپنے شانے سے ہٹا دیا۔

رائیل اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر سکھنے لگی۔ فضلہ نے کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا، اس کا دل دکنے لگا۔ جو بچے اسے اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز تھے ان کی آنکھوں میں آنسو!

وہ ان والدین میں سے نہیں تھی جو اپنے اور اولاد کے درمیان اونچی فاصلہ حاصل رکھتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی ماں بھی تھی، ان کے باپ کے فرائض بھی ادا کیے تھے اور ان کی دوست بھی تھی۔ وہ اپنے دل کی ہر بات بے دھڑک اس سے کہہ دیتے۔ اندر باہر کی ہر بات اسے بتا دیتے۔ اس کے اور ان کے درمیان کوئی پردہ کوئی دوری نہیں تھی۔ وہ اس سے بے تکلفانہ ہنسی مذاق کرتے۔ مختار کے معاملے میں اکثر اس سے چیخڑ چھاڑ کرتے اور اس سلسلے میں اس سے ان کی ایک چیخڑ چھاڑ تو عموماً ہی رہتی اور وہ یہ کہ اماں کی دوسری شادی کروا کے موجودہ بے پروا باپ کے بدلے کوئی اچھا اور امیر سا باپ لے آیا جائے۔ ان کے اس مذاق پر وہ اکثر انہیں گھڑکتی اور ڈانٹتی بھی رہتی تھی مگر آج سے پہلے کبھی کسی بچے نے اس سے اس طرح بد تمیزی نہیں کی تھی جیسے رادل کچھ دیر پہلے کر گیا تھا۔

کیوں؟ ایسا کیوں ہوا تھا؟

یہ سوال بگولے کی طرح اس کے ذہن میں چمک پھیراں کھائے جا رہا تھا۔  
کہاں؟ کس مقام پر کوئی ایسی بھول سرزد ہو گئی تھی جس نے رادل کو ایک تہذیب یافتہ نوجوان کے بجائے بھرا ہوا نوجوان بنا دیا تھا۔ کس بڑی طرح وہ کرسی کو لات مار کے گیا تھا!  
فضلہ کو اپنا دل و دماغ آنکھوں کی زد میں محسوس ہو رہا تھا۔  
دفعۃً اسے مختار کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا کہہ رہا تھا ”میم صاحب! چائے نہیں ملی ابھی تک۔“

میم صاحب!

اس سے پہلے تو اس نے کبھی اسے اتنے پیار سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ دم بخود اسے دیکھنے لگی۔  
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ وہ اس کے بالقابل آکھڑا ہوا۔ اس کے لبوں پر خلافِ عادت مسکراہٹ تھی۔  
”کچھ... کچھ نہیں۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔  
وہ مسکراتا ہوا بچوں کی طرف بڑھا اور سانول کے کندھے پر ہاتھ دھر کر بولا ”کیوں یار، ٹی شرٹ اچھی لگی؟“  
”جی۔“

”اور تمہیں اپنا بیگ پسند آیا؟“ اب اس کا روئے خن رائیل کی طرف تھا۔  
”جی.... جی بابا۔“ رائیل کی نگاہیں فضلہ کی نگاہوں سے ملیں۔



”اور وہ ہمارا بڑا شہزادہ کہاں ہے؟“ مختار راول کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔  
 ”اماں کہاں ہیں بھائی؟“ رائیل نے ماں سے مخاطبت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔  
 ”پتا نہیں۔“ اس نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف مڑ گئی۔

ادھر راول کے رویے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ مختار کی کایا پلٹ اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ تو ایک اذیت پسند شخص تھا۔ نرم مزاجی، ہنسی، تحائف یہ تو اس کے لیے بڑی انجانی سی باتیں تھیں۔ وہ تو جب بھی گھر آتا اسے اور بچوں کو اپنی باتوں سے اذیت دینے، نشتر چھونے کے لیے۔ فضا اور بچوں کو یکجا دیکھ کر تو اس کی پیشانی پر ہمیشہ بل پڑ جایا کرتے تھے اور تحفے تحائف کا تو خیر ذکر ہی کیا اسے تو بیوی بچوں کی روز مرہ اور عمومی ضروریات کا بھی کوئی خیال نہ رہتا۔ تحائف لا کر بچوں سے یہ پوچھنا کہ انہیں پسند آئے تھے یا نہیں بہت دور کی بات تھی۔ اس نے تو اس سے پہلے کبھی بچوں سے یہ بھی نہ پوچھا تھا کہ ان کے پیٹ میں روٹی تھی یا نہیں۔ فضا نے خود پامردی اور استقلال سے کام نہ لیا ہوتا، اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو کون جانے آج حالات کیا ہوتے۔ بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت اور تمام ضرورتیں بطریق احسن پوری ہونا تو کجا انہیں روٹی بھی مل پاتی یا نہیں۔

مختار کے لیے چائے بنانے کے دوران وہ تمام وقت راول اور مختار کے تبدیل شدہ رویوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ راول کی بدتمیزی پر تشویش اور دکھ تو بجا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مختار کو اس کے سابقہ رویے کے برخلاف ایک بہتر آدمی کے روپ میں دیکھ کر بھی اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب سی بے چینی اور عدم اطمینان کی کیفیت تھی! مختار کے لیے چائے بنانے کے بعد اس نے راول کی تلاش میں گھر کے تینوں کمرے جھانکے، برآمدے میں دیکھا۔ صحن میں نظر دوڑائی پھر ہاتھ رومز جھانکے مگر وہ کہیں نہ تھا۔ خدا جانے کہاں نکل گیا تھا وہ!  
 فضا کے سینے میں ماں کا دل راول کے لیے بے چین اور متشکر تھا!



راول تین چار گھنٹے تک گھر سے غائب رہا۔ فضا اس دوران متفاد قلبی کیفیات کا شکار رہی۔ کبھی اسے راول پر غصہ محسوس ہوتا، کبھی دل اس کے لیے متشکر اور بے چین ہونے لگتا، طرح طرح کے وہم اور خدشے دل میں سر اٹھانے لگتے۔

رائیل اور سانول بھی منہ ڈالے بیٹھے رہے اور فضا نے راول کے بارے میں اپنی تشویش اور بے چینی چپکے چپکے ان دونوں کو ڈپٹ گھرک کر نکالی۔

مختار لمبی مائے سوتا رہا۔  
 تین چار گھنٹے بعد راول گھر واپس لوٹا تو اس کا منہ ہنوز پھولا ہوا تھا۔ اس کے آتے ہی فضا کی بے قراری ختم ہو گئی اور اس نے راول پر یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس سے خفا تھی۔  
 ”تشریف لے آئے آپ!“ اس نے راول کو تادیبی نظروں سے دیکھا۔

وہ چپ رہا۔

”کہاں رہے اتنی دیر؟“

وہ کچھ نہیں بولا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے۔“ وہ اس کے روبرو جا کھڑی ہوئی اور اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے بولی ”جواب دو، کہاں تھے اتنی دیر؟“

”آپ کو کیا؟“ وہ گنبد لہجے میں بولا۔

فضا کو دھچکا سا لگا۔ اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی اُسے۔

"بہت خوب!" اس نے راول کی ٹھوڑی چھوڑ دی پھر درد بھرے لہجے میں بولی۔ "میں بے وقوف تھی جو آج تک اس خوش فہمی میں رہی کہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو میرے بھی دن بدل جائیں گے۔"

راول بلبلاتا کھڑا ہوا اور پاؤں زور سے زمین پر بیچ کر بولا "ہاں اگر ہم لوگوں سے امید لگائے بیٹھی ہیں تو اس شخص کے لائے ہوئے چپ سے تحفے لے کر خوش کیوں ہو گئیں۔"

"آہستہ بات کرو۔" فضلہ نے اسے تنبیہ کی پھر گھورتے ہوئے بولی۔ "اور اپنی زبان سنبھالو وہ کوئی شخص نہیں تمہارا باپ ہے۔"

"بد قسمتی سے!" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"کیا چاہتے ہو؟" فضلہ پھر اس کے روبرو جا تھی۔

"ان سے کہیں ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔" وہ اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے بولا۔

"کیا ڈسٹرب کیا انہوں نے؟" فضلہ نے تیوری لگا کر پوچھا۔

"بتا دوں.....؟" راول نے بے ساختہ تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔

"ہاں، بتاؤ۔"

وہ چند لمحے دم بخود اسے دیکھتا رہا پھر یک بیک پھٹ پڑا۔

"آج تک ہم میں سے کسی کے لیے کبھی کچھ نہیں لائے وہ آج کیسے خیال آگیا۔"

"ارے تو کیا غضب ہو گیا، یہ تو ان کا فرض ہے۔"

"اتنے عرصے فرض کیوں بھولے رہے۔ اب جب آپ بہت سی تکلیفیں جھیل چکی ہیں بس تھوڑی سی باقی رہ گئی ہیں، وہ کیوں یہ ڈراما رچانا چاہتے ہیں کہ انہیں آپ کا یا ہمارا خیال ہے۔ ہم جیسے ہیں جس حال میں ہیں ویسے ہی خوش رہنے دیں ہمیں۔" اچانک اس نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "آپ اگر کچھ امیدیں لگائے بیٹھی ہیں تو کچھ خواب ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ آپ کی تکلیفوں کو آرام میں بدل دیتا میرا سب سے بڑا خواب ہے۔ آپ کو ایک اسٹرگل فری اور اچھی سی زندگی دیتا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ وہ کہاں سے آگئے میری اس ایسی شین کو ہائی جیک کرنے۔ میں تو آپ کے لیے سیکڑوں کپڑوں کے جوڑے، بے شمار ساڑیاں جمع کر دیتا چاہتا ہوں، وہ ایک سوٹ لے کر کہاں سے آگئے۔" وہ مسلسل بولتا چلا گیا۔

فضلہ ٹھنکی باندھے اسے دیکھتی رہی اس کی بات سنتی رہی اور جب وہ چپ ہوا تو اس کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اپنا سر اس کے سینے سے لگا کر کھلکھلا کر ہنس دی۔ یہاں تک کہ ہنسی ہنسی میں اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رو دی۔ نوجوان بیٹے کے سینے سے سر ہٹا کر اس نے بیگی بیگی آنکھوں سے اسے دیکھا اور اس کے بازوؤں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "بس اتنی سی بات تھی بیٹے۔" اس کی آواز شدید بھراہٹ میں ڈوب گئی۔ "تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔ میں تو سمجھی نہ جانے کہاں کس مقام پر مجھ سے ایسی چوک ہو گئی جو تم میرے سامنے اکھڑے ہوئے اور مجھ سے بد تمیزی کی۔"

راول بے ساختہ چونکا اور اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ماں کو دیکھا پھر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پہلے انہیں چوما پھر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ "اماں، وہ میرا آخری دن ہو گا جب میں آپ سے بد تمیزی کروں۔ مجھے ان کا گفنس لانا اور اس پر آپ کا خوش ہونا اچھا نہیں لگا۔ یہ کام تو میں کرنا چاہتا ہوں آپ کے لیے..... راتیل اور سانول کے لیے۔ مجھے معاف کر دیں اماں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اس وقت مجھے شاید میں جیل میں ہو گیا تھا ان سے....."

فضلہ دھیرے سے مسکرا دی اور اس کا گال بہت پیار سے چھوتے ہوئے بولی۔ "گندے بچے اپنے باپ سے جیل میں



اس کی ساری پریشانی جاتی رہی تھی۔ کوفت کی جگہ اب وہ ایک راحت اور طمانیت محسوس کر رہی تھی۔ راول سے اس کی بد تمیزی کا گلہ جاتا رہا تھا۔ مختار کی جانب سے بچوں کو جو بے اعتنائی اور محرومیاں ملی تھیں ان کا آخر کچھ نہ کچھ ردِ عمل تو سامنے آنا ہی تھا اور خود اس نے بچوں کے لیے جو جدید مسلسل کی تھی اس کا بھی کوئی ردِ عمل لازم تھا۔

صد شکر کہ وہ نقصان میں نہیں رہی تھی۔

راول کی باتوں نے اس کا حوصلہ دو چند کر دیا تھا۔

نیمہ اسپتال سے دودن کی چُھٹی لے کر میکے میں رہنے آئی ہوئی تھی۔ مُمی اور منتہا اس کے آنے سے بہت خوش تھیں اور حسب معمول اس کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھیں۔ خوش تو اس کے آنے سے علیل بھی بہت ہوتا مگر حسب عادت اپنے جذبات کے اظہار میں قدرے محتاط رہتا۔ نیمہ کو آئے دوسرا دن تھا۔ علیل دفتر سے واپس لوٹا تو اس نے مُمی کو دو شاپنگ بیگز لٹا دیے۔ ایک میں مٹی کی گڑوی تھی دوسری میں کلہر۔

”لو بھئی“ آج بھائی تمہارے لیے دی بڑی اور ر بڑی لایا ہے۔“ مُمی نے نیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ر بڑی اور دی بڑی نیمہ کو بہت مرغوب تھے۔

”تم تو شادی کے بعد ہمارے گھر کے لیے وی آئی پی بلکہ وی وی آئی پی ہو گئی ہو نیسے۔“ مستہانے مسکراتے ہوئے کہا۔

APRIL 2003 ○ PAKEEZA ○ 59

”آپ بھی شادی کر لیں تاکہ آپ بھی وی وی وی آئی پی بلکہ وی وی وی آئی پی ہو جائیں۔“ نیہہ نے برجستہ کہا۔  
”معافی!“ منتہا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ملیب ان کی باتیں سنتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”اے سمجھاؤ نیہہ۔“ ممی نے نیہہ سے منتہا کی بابت کہا۔

”اوہو! اب ان بڑی بی سے مجھے سمجھانے کا کام لیا جائے گا۔“ منتہا نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جب بڑے بے عقلی کی باتیں کریں تو چھوٹوں ہی کو بڑا بننا اور سمجھانا پڑتا ہے۔“ ممی نے شاکی نگاہوں سے منتہا کی جانب دیکھا پھر نیہہ سے بولیں۔ ”اے سمجھاؤ کہ اپنے ساتھ بھائی کا وقت بھی برباد نہ کرے۔“

منتہا نے ہڑبڑا کر ممی کی طرف دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہی تھیں وہ!

”میں! والدہ میں کیا وقت برباد کر رہی ہوں اس کا....!“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”تمہاری شادی ہو تو وہ بھی ہاں کرے اپنے لیے۔“

”میں نے اسے منع تو نہیں کیا۔“

”مگر وہ اپنی ضد پر اڑا ہوا تو ہے کہ جب تک باجی کی نہیں ہو جاتی میں بھی نہیں کروں گا۔“

”بے جا ہے اس کی ضد۔“

”جایا بے جا بہر حال ہے تو سہی۔“

”اس میں میرا کیا قصور؟“

ممی نے اسے خشونت سے دیکھا پھر کہا ”پچھتاؤ گی۔“

اس نے بڑے پیار سے ممی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ”کسی کو دوش نہیں دوں گی کیونکہ یہ فیصلہ میرا اپنا ہے۔“

ممی نے اُسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

وہ اُن سے چٹ گئی۔

”پلیز! ایسی نظروں سے نہ دیکھا کریں۔“ وہ بڑے احترام اور محبت سے اُن کے رخسار کو چومتے ہوئے بولی ”جب آپ مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی ہیں نا والدہ تو میرا دم نکل جاتا ہے۔“

”نکو مت!“ ممی نے اسے گھر کا پھر نیہہ سے ملب کی لائی ہوئی چیزوں کی بابت بولیں۔ ”ابھی کھاؤ تو نکال لاؤں۔“

”نہیں ممی ابھی نہیں، تھوڑی در پہلے ہی تو چائے کے ساتھ اتنا کچھ کھایا ہے۔“

”اچھا تو پھر میں یونہی فریق میں رکھے دیتی ہوں دونوں چیزیں جب جی چاہے کھالینا۔“

ممی کے جانے کے بعد نیہہ نے منتہا سے کہا ”آپ مان کیوں نہیں جانتیں؟“

”فار گاڈ سیک۔“ منتہا نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اسے دیکھا ”اب تم بھی شروع نہ ہو جاؤ۔“

”آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں۔“ وہ اس کے نزدیک آ بیٹھی۔

”اچھی ممانی کے بیٹے نعیم بھائی میں کیا برائی تھی آخر جو آپ نے منع کر دیا؟“

منتہا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

یہ بات تو صرف اس کے اور مسز ظہیر کے درمیان تھی۔ نیہہ کو اس کا علم کیونکر ہو گیا تھا۔

”تم... تم سے کس نے کہا؟“



”مجھے لیلیٰ نے بتایا ہے۔“

”اور اسے کس نے بتایا؟“

”اس قدر انکوائری کی کیا ضرورت۔ گھر میں کوئی بات ہو تو گھر کے سبھی لوگوں کو پتا چل جاتی ہے۔ میں اُس گھر میں گئی تو مجھے بھی پتا چل گیا۔ امی سے پوچھا تو انہوں نے مجھ سے کہا تم منتہا سے ذکر نہ کرنا کیونکہ انہوں نے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ مجھے پابند کر دیا تھا کہ میں تمہاری والدہ سے اس رشتے کا ہرگز ذکر نہ کروں۔“ نیہہ نے پل بھر کو توقف کیا پھر کہا ”کیوں کیا آپ نے یہ پاگل پن۔“

منتہا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”نیہہ کیا یہ بات کافی نہیں ہے، تم سب کے لیے کہ میں ایسے ہی بہت خوش ہوں۔“

”مان لیا... لیکن... ملب! اس کی شادی... وہ جو ضد باندھ کر بیٹھ گیا ہے۔ ذرا سوچیں تو می کو کتنی خواہش ہوگی اس کی شادی کی۔ ایک ہی تو ان کا بیٹا ہے اور ہمارا بھی ایک ہی بھائی۔ کیا آپ کا جی نہیں چاہتا کہ ملب کی شادی ہو۔ اس کی دلہن گھر آئے۔ اس گھر میں بھی کچھ رونق کچھ ہنگامہ ہو۔ می بے چاری کو زندگی میں کیا خوشی ملی ہے اب تک۔“ نیہہ جذباتی لہجے میں بولی۔

”انشاء اللہ بہت خوشیاں ملیں گی انہیں۔“

www.smamah.com پر 24 گھنٹے کی مسلسل سروس  
100% سٹیبلائزیشن کی ضمانت  
پیشہ اور انسانی طور پر جانچا ہوا اور تصدیق شدہ نسخہ

EARLY STABILIZATION IS SAFE & EFFECTIVE WHERE OTHERS FAIL

نہ دوائی ویکسین

بچوں میں الرجی نسجاً عام ہے پہلے وقت ضرور لیں



الرجی دمرہ چنبیل

1 پریمز ملاج سے بہتر

5 ففٹ، طوالت، ہلک

11 مرض کو کم کرنے سے پہلے بے کمر کرنا چاہیے

چھینکیں کیرا حلق مرگی ناک کان گلے سردرد شقیقہ گردہ خراٹے نکسیر سانس

لندن، امریکہ اور بیرون ممالک سے آئے ہوئے مریضوں کے تاثرات کی ویڈیو خود یہاں آکر ملاحظہ فرما سکتے ہیں

جیسی دائمی ضدی علامات کیلئے الرجی سٹیبلائزیشن بذریعہ الشراسمان و فوٹو تھراپی

www.smamah.com.pk تفصیل:- جوابی لفافہ، ویب سائٹ (اردو) یا ملاقات (وقت لیکر)

ڈاکٹر کیپٹن (ر) میاں مسلم ملانہ ایم بی بی ایس، ایف سی جی پی سپیشلسٹ ان الرجی سٹیبلائزیشن

اسلام آباد: پیر تابدہ پشاور موڑ 4-G9 سٹریٹ 55 H-63 فون نمبر: 051-2853821 موبائل: 0300-9565571

پیشہ کیلک: 0300-9565571 042-7550349 7586556 0320-4641188

”ملیب راضی ہو گا تب نا۔“  
 ”وہ بھی راضی ہو جائے گا۔“  
 ”مگر آپ اپنی ضد نہیں چھوڑیں گی، ہے نا۔“ ”نہہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔“  
 ”یہ ضد نہیں نہہ۔“  
 ”تو پھر کیا ہے؟“  
 ”تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔“  
 ”کاش!“ ”نہہ نے ایک گہری سانس کھینچی ”کاش کوئی آپ کو سمجھا سکے۔“  
 منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

دو دن میکے میں رہنے کے بعد نہہ اپنی سرال چلی گئی۔ وہاں سب لوگ اسے بہت یاد کر رہے تھے۔ بقول مرزا ظہیر گھر میں ہو صاحبہ کے نہ ہونے سے سر صاحب سب سے زیادہ اُداس تھے۔



منتہا بچوں کے ٹیسٹ پیپر زچیک کر رہی تھی۔ می بہت دیر سے ملیب کے کمرے میں تھیں۔ پندرہ سولہ پرچوں کی پڑتال کے بعد وہ کچھ دیر کو وقفہ لینے کا ارادہ کر رہی تھی کہ می ملیب کے پاس سے واپس آکر اس کے نزدیک آ بیٹھیں اور بولیں۔ ”ملیب ایک رشتہ بنا رہا ہے۔“  
 منتہا نے چونک کر ایک نظر می کو دیکھا۔

”اس کے دفتر میں کوئی صاحب ہیں انہوں نے اس سے کہا ہے۔۔۔“  
 ”کہ ان کی نظر اس پر ہے۔“ ”وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔“  
 ”پہلے پوری بات تو سن لو۔“  
 ”سوری والدہ۔“

”دو بھائی ہیں ایک بن، بڑے بھائی ملیب کے آفس میں ہیں۔ انہیں چھوٹے بھائی کے لیے رشتہ درکار ہے۔ بن اور بڑے بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ ملیب نے ان سے کہیں ذکر کیا ہو گا تمہارا۔۔۔“  
 ”میرا!“ اس نے سٹپٹا کر می کو دیکھا۔

”ہاں“ آج انہوں نے ملیب سے کہا کہ بھائی کی شرط یہ ہے کہ وہ لڑکی کو پہلے خود دیکھے گا۔ ملیب کا خیال ہے اسے تمہارے اسکول بھیج دیا جائے۔“

”اوہ نو۔“ وہ بے ساختہ ہڑبڑا کر بولی ”ایسا ہرگز مت کیجئے گا۔“  
 ”کیوں کیا ہرج ہے؟“

”ہرج یہ ہے کہ اسکول میں، میں پڑھانے جاتی ہوں اس لیے نہیں کہ لوگ وہاں مجھے دیکھنے اور پسند یا ناپسند کرنے آئیں۔“

”یونہی بہانے سے دیکھا جاتا ہے لڑکیوں کو، وہ بھی کسی بہانے سے دیکھنے آئے گا تمہیں۔“

”اوہ میرے خدا!“ اس نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! مجھ سے کوئی پیرنٹ بھی ملنے آئے گا تو میں یہی سمجھوں گی کہ۔۔۔ ملیب نے یہ کیا حماقت کی۔۔۔ کیوں میرے اسکول کا پتا دے دیا اُس نے انجانے لوگوں کو۔“ ”وہ انتہائی پریشان ہو گئی تھی۔“

”انجانے لوگ ہی جانے بوجھے بن جاتے ہیں“ می بہت اطمینان سے بولیں۔ وہ اُن کا منہ دیکھتی رہ گئی۔



”دو چار دن کپڑے وپڑے ذرا اچھے پس کر جانا، کیا پتا کس دن آجائے وہ۔“  
 ”میں ملیب کو ایسی ڈانٹ لگاؤں گی کہ یاد کرے گا۔“

”ہمت ہے اتنی!“  
 واقعی اتنی ہمت کہاں تھی اس میں کہ ملیب کو ڈانٹ سکتی۔ مگر اس میں شک نہ تھا کہ می کی بات نے اسے  
 حد درجہ پریشان کر دیا تھا۔

○☆○

اگلے روز اپنی اس پریشانی کا اس نے فضلہ سے ذکر کیا تو وہ می سے بھی زیادہ اطمینان سے بولی۔ ”وہ آئیں تو مجھے  
 ضرور دکھانا۔“  
 ”نار گاڈ سیک فضلہ!“ منتہا نے اسے تادیبی نظروں سے دیکھا ”میں پریشان ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“  
 ”جو لڑکیاں تمہاری طرح ڈھیلی ڈھالی ہوں ان کے گھروالوں بے چاروں ہی کو اس قسم کی کوششیں کرنا پڑتی  
 ہیں۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”مطلب یہ کہ عقل مند لڑکیاں تو خود رشتے گھیر گھار کر اپنے گھر لے جایا کرتی ہیں اور تم اتنی بے وقوف ہو کہ گھر  
 آتے رشتوں کو دور ہی سے بھگا دیتی ہو، ظاہر ہے ان حالات میں گھروالوں ہی کو دوا دارو کرنا پڑے گی۔“  
 منتہا نے اسے گھورا۔

”اس بے چارے کو خدا نخواستہ ایسی نظروں سے مت گھور لینا کہیں۔“  
 ”کیا بات ہے، بہت شوخی سوجھ رہی ہے تمہیں؟“  
 فضلہ مسکرا دی اور اس کے نزدیک ہو کر سرگوشی میں بولی۔ ”ساتھیوں میں اعلان کر دو کہ کوئی مشکوک آدمی اسکول  
 میں دکھائی دے تو فوراً اس کی مشکلیں کس دی جائیں۔“

”خدا یا! تمہیں ہو کیا رہا ہے؟“  
 ”مجھے! مجھے انتہائی خوشی ہو رہی ہے کہ ملیب نے بالآخر یہ ثبوت دے ہی دیا کہ بھائی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، بہر حال  
 مرد ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”مطلب یہ کہ اُس نے تمہارے لیے رشتہ تلاش کر ہی لیا۔“

”رشتوں کا پہلے بھی کوئی کال تو نہیں تھا۔“

”ہاں، یہ تو خیر میں جانتی ہوں۔“

”وہ آئے تو سہی، میں اسے ایسا بھگاؤں گی یہاں سے کہ یاد کرے گا۔“

”پہلے آئے تو دو بے چارے کو۔“

اگلے چند دن منتہا کو اسکول میں دکھائی دینے والے ہر اجنبی چہرے پر اسی کا گمان گزرتا رہا اور آنے والا اس کے  
 اسی گمان کے درمیان اپنی بہن کے بیٹے کو اسکول میں داخل کروانے کے لیے ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بہانے  
 اس سے ہمکلام ہو کر چلا بھی گیا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہری تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبوں سے گدھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سار ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانہ اختر









اس واردات کا علم منہا کو می کی زبانی ان الفاظ میں ہوا ”وہ لوگ تمہیں دیکھ گئے ہیں اور پسند بھی کر لیا ہے۔“  
 ”کو... کون؟“ اس نے بے ساختہ ہڑبڑا کر می کی طرف دیکھا۔  
 ”وہی جن کو ملیب نے تمہارے اسکول کا پتا دیا تھا۔“  
 ”مائی... گاڈ! کک... کب... میرا مطلب ہے... کک... کیا... وہ... میرے اسکول آئے تھے؟“ اس کے لہجے اور آنکھوں سے حیرانی مترشح تھی۔  
 ”ہاں۔“ می نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”کب؟“

”کل۔“

”کل!“

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس وقت اسے غصہ آرہا تھا یا وہ کوفت محسوس کر رہی تھی۔  
 ”کس وقت؟“

”بھئی وقت کا تو مجھے علم نہیں بہر حال وہ دیکھ گئے ہیں تمہیں۔“  
 کل!

اس نے اپنے ذہن پر زور دے کر یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ گزشتہ کل اسکول میں وہ ایسے کتنے لوگوں سے ملی تھی جو اس کے لیے انجانے تھے۔  
 ملنے اور سامنا ہونے میں فرق تھا۔

اسکول میں دن بھر ”وزیٹرز“ کی آمد و رفت جاری رہتی۔ کیا پتا کب کون کسی کو دیکھتا ہوا گزر جائے۔  
 ”لڑکا اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا“ می اس کے ذہن میں ہونے والی کھدبہ سے قطعاً بے نیاز دکھائی دیتی تھیں۔  
 لڑکا اپنی بہن کے ساتھ!

اسے یاد آیا گزری کل نہم الف میں اپنا پیریڈ ختم ہونے کے بعد جب وہ جماعت کے کمرے سے نکلی تو اس نے راہداری میں ایک خوش پوش مرد کو ایک نوجوان خاتون کے ہمراہ کھڑے دیکھا تھا۔ گوپرنیل صاحب کے احکامات کے مطابق ملاقاتیوں کا کمرہائے جماعت کی طرف براہ راست جانا ممنوع تھا مگر بعض ملاقاتی اس کی خلاف ورزی کر جاتے۔ اس نے ایک سرسری نظر ان دونوں پر ڈالی اور ان کے نزدیک سے گزر گئی۔  
 ”ایک کیو زی مس!“ مرد نے تیزی سے اسے آلیا۔

وہ ہنسمس۔

خاتون بھی مرد کے نزدیک آکھڑی ہوئی۔

”اگر آپ ماسٹرنہ کریں تو ہم آپ کا تھوڑا سا ناٹم لینا چاہیں گے“ مرد نے بڑی شائستگی سے کہا۔  
 ”جی... فرمائیے۔“

”یہ میری ہمیشہ ہیں“ اس نے اپنے ساتھ کھڑی خاتون کا تعارف کرایا ”اپنے بیٹے کو یہاں داخل کرانا چاہتی ہیں۔  
 براہ مہربانی یہ بتائیے کہ یہاں ایڈمیشن کا طریقہ کار کیا ہے؟“

منہتا نے استفسار کرنے کی بجائے اس کے ساتھ کھڑی خاتون کو دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی پھر کہا ”میرے خیال میں یہ بعد کا سوال ہے پہلا سوال یہ ہونا چاہئے کہ یہاں ایڈمیشن مل سکتا ہے یا نہیں؟“  
 ”کیا بہت مشکل ہے؟“ خاتون نے کہا۔

”جوئے شیر لانے کے برابر۔“



”جوئے شیر تو تبھی نکل سکے گا تا مس صاحبہ، جب طریقہ کار معلوم ہوگا“ مرد نے کہا۔  
”میرا خیال ہے، آپ اس سلسلے میں پرنسپل صاحب یا وائس پرنسپل سے مل لیں، وہ آپ کو زیادہ بہتر بتا سکیں گے۔“

”آپ نہیں بتانا چاہیں گی؟“ مرد نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اصل میں یہ میرا شعبہ نہیں۔“

”آپ کا شعبہ کیا ہے؟“

”مدرسہ۔“

”تھینک یو دیری مچ... معاف کیجئے گا، ہم نے آپ کا وقت لیا۔“

”اٹس آل رائٹ۔“

”تھینک یو“ خاتون نے کہا۔

منتہا آگے بڑھ گئی۔

اپنا فری پیریڈ اسٹاف روم میں بچوں کی کاپیوں کی پڑتال میں گزارنے کے بعد جب وہ اگلا پیریڈ لینے کے لیے دہم ”ج“ کی طرف جا رہی تھی تو چپراسی اللہ داد نے اس سے کہا ”منتہا بی بی! پانچویں پیریڈ میں کوئی صاحب آپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔“

”کون؟“ وہ بے ساختہ چونکی۔

”ایک صاحب تھے جی، ایک عورت کے ساتھ، آپ کا پوچھ رہے تھے کہ مس منتہا کدھر ملیں گی۔ آپ ناویں اے میں میں تھیں، میں نے ان کو بتا دیا۔ ان دونوں کو میں نے آپ کی کلاس کے باہر برآمدے میں آپ کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔“

وہ مطمئن ہو گئی کہ وہ تو وہی شخص تھا جو اس سے اسکول میں کسی بچے کے داخلے کا طریقہ کار معلوم کر رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بے ایمان وہ تھا جو اسے اس بہانے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔

اوہ خدا! کیسا چالاک آدمی تھا۔ کس ہوشیاری سے اس سے مل کر چلتا بنا کہ شک تک نہ ہونے دیا۔ اب می نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا تو دھیان اس کی طرف گیا۔  
غصہ اور کوفت دوچند ہو گئے۔

”لڑکے کے بھائی نے ملیب سے کہا ہے کہ اب وہ لوگ گھر آنا چاہتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس مجھے نہیں کرنی شادی وادی!“

”واہ، یہ اچھی ہٹ دھری ہے تمہاری، میں اب تمہاری ایک نہیں سنوں گی، تمہاری وجہ سے میرے بچے کا وقت بھی ضائع ہو رہا ہے۔“

”میں نے منع تھوڑی کیا ہے، کر دیں اس کی۔“

”وہ ان بھائیوں میں سے نہیں ہے جو بڑی بہنوں کے گھر میں بیٹھے ہوئے خود سہرا باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔“

”اس میں ہرج تو کوئی نہیں۔ بہنوں کی اگر ساری زندگی نہ ہو اور بھائی ان کی ہونے کے انتظار میں کنوارے بیٹھے

رہیں تو یہ کوئی غفلندی کی بات تو نہیں۔“

”اچھا خیر میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ جتنے کو میں بلاری ہوں ان لوگوں کو۔“

”بلا لیجئے، میں اسکول سے گھر ہی نہیں آؤں گی۔“  
 می نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”گھر نہیں آؤگی تو پھر کہاں جاؤگی؟“  
 ”کہیں بھی.... اللہ میاں کی زمین بہت بڑی ہے۔“  
 ”قاضی کی دوڑ مسجد تک۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”جاؤگی کہاں! مسز ظہیر کے ہاں.... لیکن یہ سمجھ لینا کہ اب وہ بہن کی سرال ہے۔ اس بے چاری کو کیوں شرمندہ کروانا چاہتی ہو، سرال والوں کے سامنے۔“  
 ”آپ اطمینان رکھیں، میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔“  
 ”اتنی بے وقوف نہیں ہو تو ذرا یہ بتادو کہ غفلت کتنی ہو؟“  
 وہ دھیرے سے مسکرا دی پھر می کے گلے میں بڑے پیار سے اپنی بانہیں حائل کر کے بولی ”بس اتنی کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔“  
 ”میری فکر چھوڑ دو۔“

”تو پھر کس کی فکر کروں؟“  
 ”بھائی کی.... کیا اپنی ضد میں اسے بھی بوڑھا کر دینے کا ارادہ ہے؟“  
 ”ارے نہیں والدہ وہ تو ابھی بچہ ہے۔“  
 ”تجے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میرے کوئی دو چار تو ہیں نہیں، اندھے کی ایک ہی آنکھ۔“  
 ”شیرنی کا ایک شیر کئے۔“  
 ”تم سے تو باتیں بنالو۔“  
 ”ناراض نہ ہوں۔“

”ناراض نہ ہوں تو پھر کیا کروں، تم کوئی خوش کرنے والی بات تو کرو۔“  
 ”کروں گی، کروں گی۔ خوش کرنے والی بات بھی کروں گی۔“  
 می بے یقینی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔  
 ”نہ... نہ... نہ... آپ غلط سمجھ رہی ہیں، میرا مطلب کچھ اور ہے۔“  
 ”کیا ہے تمہارا مطلب؟“ می نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”بتا دوں گی۔“  
 ”ملیب کو بھی ذرا خود ہی جواب دینا۔ نہ جانے کیا کہا سنا ہو گا اس نے لڑکے کے بھائی سے اور جب بات بننے کو آئی تو تمہاری وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔“  
 ”ملیب کو ضرورت کیا تھی میرے نام کے اشتہار بانٹنے کی؟“ وہ قدرے ناگواری سے بولی۔  
 ”یہ تم خود ہی پوچھنا اُس سے۔ سخت ناراض ہو گا اس مرتبہ۔“  
 ”کیوں؟ اس مرتبہ کوئی خاص بات ہے؟“  
 ”خاص بات یہ ہے کہ لڑکے کا بھائی اس کے آفس کے ساتھیوں میں سے ہے۔“  
 ”تو کیا ہوا؟“  
 ”اُسے شرمندگی تو ہو گی نا۔“



”اور مجھے جو شرمندگی ہوئی؟“

”تمہیں کیا شرمندگی ہوئی؟“

”اسکول میری ملازمت کی جگہ ہے۔ مجھے دیکھنے اور پسند یا ناپسند کرنے کی جگہ تو نہیں۔ انجانے لوگوں کو میرے کام کی جگہ پر اس مقصد کے لیے بھیجنے سے پہلے عیب کو مجھ سے پوچھ تولینا چاہئے تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس سے ذکر کریں گے وہ لوگ کہ فلاں اسکول میں ہم فلاں لڑکی کو دیکھنے گئے تھے۔ عیب نے اچھا نہیں کیا والدہ۔“

”خیر، اس بے چارے نے تو تمہارے اچھے ہی کے لیے کیا، تم نہ سنو نہ مانو تو وہ علیحدہ بات ہے۔ اس نے تو آج دفتر سے اتنی خوشی خوشی آکر مجھے یہ خبر سنائی کہ کیا بتاؤں۔ کیا کہے گا وہ جب میں اس سے یہ کہوں گی کہ تمہاری بہن تو اسکول سے گھر واپس آنے ہی سے انکار کر رہی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، میں خود بات کر لوں گی اس سے۔“

ممی نے نظر لگا کر اسے دیکھا۔

اس نے نظریں چڑالیں۔

\*\*\*

اچھی بھالی ادارہ امراض قلب کے شعبہ انتہائی نگہداشت میں تھیں۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اور اتنا شدید کہ بقول ان کے معالجین اگر انہیں طبی امداد ملنے میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو یہ دورہ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

مرکز ظہیر کے خاندان میں یوں تو سبھی ایک دوسرے کا ادب احترام ملحوظ رکھتے لیکن اچھی بھالی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا۔ گوری جی، کچھڑی بالوں والی اچھی بھالی کی شخصیت ظاہراً بھی ایسی تھی کہ ملنے والوں کے دل آپ ہی آپ ان کے احترام کی جانب ملتفت ہو جاتے۔ وہ ہمیشہ سفید لباس میں ملبوس رہتیں۔ صوم و صلوة کی انتہائی پابند اور تہجد گزار تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے بھری جوانی میں بیوگی کا جس حوصلے سے سامنا کیا اور راضی برضائے معبود ہوئیں اس نے ان کی شخصیت کو ایک وقار عطا کر دیا تھا۔ جوانی سے ادھیڑ عمری تک کبھی کسی نے انہیں اللہ سے گلہ کرتے یا اس کی ناشکری کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا۔ شاذ ہی کسی نے انہیں منہ کھول کر قہقہہ لگاتے دیکھا ہو۔ خوشی میں مسکرا دیتیں، کوئی بہت پُر لطف یا پُر مزاح بات ہوتی تو بہت دھیمی آواز میں ہنس پڑتیں۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ذکرِ الہی کا ورد زبان پر رکھتیں۔ خاندان میں ان کا بڑا احترام تھا۔

چنانچہ بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوئیں تو سارا خاندان ان کی عیادت کو امنڈ آیا۔ تیمارداری کے خواہش مند بہت سے تھے مگر معالجین نے انہیں انتہائی نگہداشت میں رکھا ہوا تھا جہاں اسپتال کا عملہ ہی تیمارداری کر سکتا تھا۔ دونوں بیٹوں کو خبر ہوئی تو وہ پہلی دستیاب پرواز سے ان کے پاس پہنچے۔ مرکز ظہیر سے سدھیانہ تھا لہذا ان کا پورا گھرانا نعیم اور نعیم کی ڈھارس بندھانے کو شانہ بہ شانہ کھڑا تھا۔ نیمہ کا ڈاکٹر ہونا سونے پر سہاگا کے مترادف ثابت ہوا۔ آئی سی یو میں جہاں اوروں کی آمدورفت پر پابندی تھی وہ بلا روک ٹوک آ جا رہی تھی اور اہل خاندان کو اچھی بھالی کی حالت سے لمحہ بہ لمحہ باخبر رکھے ہوئے تھی۔ فرحان دہی میں ہوتے ہوئے بھی پاکستان میں اپنے اہل خانہ اور اچھی بھالی کے دونوں بیٹوں سے رابطہ رکھے ہوئے تھا جو پاکستان پہنچنے کے بعد ماں کے لیے ایک ٹانگ سے کھڑے تھے۔ ان کے سوتے ہوئے متفکر چہرے ماں سے ان کی بے پناہ محبت کے غماز دکھائی دیتے تھے۔ ماں کے علاج معالجے میں وہ کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھنا چاہتے تھے اور خاندان کے دیگر افراد ان کو باحوصلہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اپنی ایک بزرگ خاتون کے لیے اس پورے خاندان کی یک جہتی اسپتال کے عملے اور مریضوں کو یہ احساس دلا رہی تھی کہ اس خاتون کی ذات اس بھرے پڑے خاندان کے لیے انتہائی اہم تھی۔

اس میں شک بھی کیا تھا۔

اچھی بھالی پانچ دن آئی سی یو میں رہیں اور اس دوران میں اسپتال میں ان کے متعلقین کا آنا بند ہوا۔ دو جاتے چار آجاتے۔ چار جاتے چھ آجاتے۔ خوش پوش، منذب اطوار اور خاندانی چہروں مہروں والے لوگ۔ نیہ نے اپنے اسپتال سے چھٹی لے کر اچھی بھالی کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کیے رکھا۔ فرحان نے فون پر اس سے کہا تھا ”میں اچھی ممانی کو دیکھنے کے لیے نہیں آسکا ہوں، تمہیں میری کمی بھی پوری کرنی ہوگی“ سو وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہتی تھی۔

می اور ملیب کے ہمراہ منتہا بھی اچھی بھالی کی عیادت کے لیے اسپتال آئی۔ انہیں آئی سی یو میں جانے کی اجازت تو نہ ملی، باہر رانداری میں کھڑے ہو کر ہی انہیں دیکھا۔ البتہ ان کے دونوں بیٹوں سے اظہار ہمدردی کیا۔ نعیم اور فہیم دونوں ہی کو دیکھ کر منتہا کو حیرانی ہوئی۔ کہاں وہ نیہ کی شادی اور ولسے میں چونچالیاں کرتا فہیم اور خوش پوش باوقار نعیم اور کہاں ماں کی علالت کے باعث متفکر چہروں اور اداس آنکھوں والے یہ بیٹے۔

پانچ دن انتہائی نگہداشت میں رہنے کے بعد چھٹے دن جب اچھی بھالی کی اسپتال کے برائیسٹ وارڈ میں منتقلی کی خبر ملی تو منتہا ایک مرتبہ پھر می کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے اسپتال گئی۔ اچھی بھالی کے کمرے میں یہاں وہاں پھول ہی پھول تھے۔ گلاب کے پھول، زگس کے پھول۔ نعیم اور فہیم کی آنکھوں سے اداسی چھٹ چکی تھی اور وہ ماں کی دیکھ بھال میں یوں لگے ہوئے تھے جیسے وہ ان کی ماں ہی نہ ہوں کوئی چھوٹا سا بچہ ہو جس کی نگہداشت انتہائی احتیاط کی متقاضی ہو۔

اس روز گھرواپسی پر می نے کہا ”جیسی اولاد خدا نے نیہ کی میا ساس کو دی ہے ہر ایک کو دے۔ کیا سعادت مند بیٹے ہیں۔ ایک سہارا دے کر اٹھاتا تھا تو دوسرا سرہانے تکیے لگاتا تھا۔ بڑے نے چچہ چچہ سوپ پلایا تو چھوٹے نے سبج سبج ماں کا منہ پونچھا۔“

”آپ کی اولاد بھی ایسی کوئی ناخلف تو نہیں ہے والدہ!“ منتہا بولی۔

”ہاں، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے مگر پھر بھی مجھے ان پر رشک آیا۔ جتنے کا جتن کھڑا تھا مزاج چڑی کو۔ ایک ہم ہیں.... اکیلے۔“

”اکیلے کیوں والدہ...! ہم سب ہیں نا ایک دوسرے کے ساتھ۔“

”ہم سب!“ می نے اس کے الفاظ دہرائے پھر بولیں ”کتنے؟ گئے چنے تین افراد، ایک میں دوسری تم، تیسرا ملیب۔“

”نیہ بھی تو ہے اور پھر فرحان بھی۔ اور اب تو مسز ظہیر کے پورے گھرانے سے ہماری رشتہ داری ہے۔“ می نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

منتہا نے کن آنکھیوں سے انہیں دیکھا اور اپنا بازو ان کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے بولی ”قابل رشک تو آپ ہیں والدہ کہ آپ نے تین تنہا ساری تکلیفیں سہیں، اچھی بھالی کا ساتھ تو بڑے وقت میں ان کے پورے خاندان نے دیا۔ آپ سے تو بڑے وقت میں آپ کے سگے بھائی اور بھالی نے بھی نظریں بدل لی تھیں۔“ می نے پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”کاش، میں بھی نیہ کی میا ساس کی طرح بیوہ ہو کر جیتی۔“

منتہا نے چونک کر می کی طرف دیکھا۔

”بیوہ عورت کو اپنے پرائے عزت دے دیتے ہیں مگر مجھ جیسی عورتوں کو سب گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں، طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔“

”خاک ڈالیں ایسے لوگوں پر۔“



مئی نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی نادانی کی بات کہہ دی تھی پھر سر جھکا کر بولیں ”بھابی جان نے ایک بات کہی تھی جو اس وقت تو مجھے بہت بُری لگی تھی مگر اب اتنے برس گزر جانے کے بعد سوچتی ہوں انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔“

”کیا؟“

”مجھے تمہارے باپ کا گھر نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ اس نے پھر چونک کر مئی کی جانب دیکھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تمہارے ڈیڈی مجھے دھکے دے کر بھی نکالتے تو بھی مجھے اُس گھر سے نہیں نکلنا چاہئے تھا۔ عزت تو رہتی، تم لوگ بھی اتنی تکلیفیں نہ جھیلنے، میں بھی لوگوں سے نظریں نہ چراتی۔ خوشی غمی میں نیسہ کی سرال میں چلی تو جاتی ہوں پر شرمندہ شرمندہ رہتی ہوں۔“

”آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ جس شخص نے ایک تھرڈ کلاس معمولی عورت کی خاطر آپ کو بے وقور کر کے رکھ دیا، آپ اس کا گھر چھوڑنے پر پچھتا رہی ہیں اور وہ بھی اتنے برسوں بعد! آپ نے ڈیڈی کا گھر چھوڑ کر بہت اچھا کیا۔“

”تم نہیں سمجھو گی۔“ مئی کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

”میں سب سمجھتی ہوں۔“

”نہیں سمجھتیں.... بے وقورہ عورت نہیں ہوتی جس کا تعلق کسی ان پڑھ اور بچ گھرانے سے ہوتا ہے۔ بے وقورہ عورت ہوتی ہے جس کے سر سے تحفظ کی چادر کھینچ جائے، جسے مرد کا تحفظ حاصل نہ رہے۔ بے وقورہ نہیں تھی، وہ تو تمہارے ڈیڈی سے شادی کر کے موقر ہو گئی، عزت دار ہو گئی.... بے وقور تو میں ہو گئی۔ اس گھر سے نکل کر، اس گھر کو چھوڑ کر... اور اپنے ساتھ میں نے تم لوگوں کو بھی بے وقور کر دیا۔ اس گھر میں رہتے تو تم باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کے بن کر تو نہ رہتے۔ منظر نظیر کے بن باپ کے بھتیجیوں سے کتنے پیار سے پیش آرہے تھے خاندان والے۔ تم لوگوں کے سر پر ہاتھ رکھنے والا تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے بڑی غلطی کی اپنے ساتھ تم لوگوں کو بھی اکیلا کر دیا۔“

”او خدا یا! مجھے پتا ہوتا کہ آپ اچھی بھابی کو دیکھنے کے لیے جا کر اتنی ڈسٹرب ہو جائیں گی تو میں آپ کو ہرگز نہ لے جاتی، خود ہی اکیلی جا کر دیکھ آتی انہیں۔“

”اپنی غلطی کا انسان کو ایک نہ ایک دن احساس ہو ہی جاتا ہے۔“

”خدا کے واسطے والدہ!“ اس نے مئی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں کے درمیان دبوچ لیے اور اُن کی جانب دیکھتے ہوئے بولی ”کوئی سن لے آپ کی بات تو واقعی یہی سمجھے کہ آپ نے کوئی غلطی کی ہے۔“

”کی ہے نا۔“

”جی نہیں.... کوئی غلطی نہیں کی... آپ نے جو کیا، بہت صحیح کیا۔ اسی میں عزت تھی، آپ کی بھی اور ہم لوگوں کی بھی۔“

”بھی۔“

مئی نمٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”سب لوگ نیسہ کی سرال والوں کی طرح اعلیٰ ظرف نہیں مل جاتے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”بھائی کا رشتہ لے کر جاؤ گی نا کسی انجانے گھر میں تو پتا چلے گا۔“

”کیا پتا چلے گا؟“

”لوگ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ سات پشتیں کھنگال ڈالتے ہیں۔ باپ کون تھے؟ کیا کرتے تھے؟ مر گئے تو کب مرے؟ کیسے مرے؟ زندہ ہیں تو ساتھ کیوں نہیں کہاں گئے؟“

”آپ ڈرتی کیوں ہیں؟“

”کیونکہ ماں کے طعنے اولاد ہی کھاتی ہے۔“

”ہم اصل حقیقت بتادیں گے۔“

”حقیقت کا اعتبار کون کرتا ہے؟“

”مسز ظہیر جیسے لوگ۔“

”جو قسمت سے ملتے ہیں اور کم ملتے ہیں۔“

”مگر ناپید نہیں.... انشاء اللہ پھر مل جائیں گے۔“

”بہتر ہے باہر مت دیکھو۔ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں، مدیحہ میں کوئی برائی نہیں۔“

”سوائے ایک کے۔“

”وہ کیا؟“ ”مئی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔“

”وہ ممانی جان کی بیٹی ہے۔“

”لوگوں کو معاف کرنا سیکھو۔“

”آپ جیسا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں... آپ تو اس شخص کی زیادتی کو بھی اپنی غلطی سمجھ لینا چاہتی ہیں جس نے

آپ سے بے وفائی کی۔ مجھے تو وہ کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آتے۔ کبھی مل جائیں کہیں تو دیکھوں اور گزر جاؤں۔“

”میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کتنی عجیب بات ہے تمہارے باپ سے صرف ایک ہی رشتہ تو نہیں تھا میرا۔ دور کی ہی

سہی مگر خاندانی رشتے داری بھی تھی ان سے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ رشتے داری ہونے اور ایک ہی شہر میں رہنے

کے باوجود اتنے برسوں میں کبھی ان سے کہیں ملنا نہیں ہوا۔“

”انہوں نے کوشش کی ہوتی تب نا۔ وہ تو اپنی دوسری بیگم صاحبہ کے ساتھ مگن ہیں۔ وہ خود غرض ہیں والدہ... اپنی

ذات اپنی خواہشات کے اسیر۔ ہمیں تو ان سے نفرت کرنی چاہیے۔“

”بڑی بات!“ ”مئی نے اسے متنبہ نظروں سے دیکھا پھر بتایا ”باپ ہیں تمہارے۔“

”بد قسمتی سے میں اس رشتے سے منکر نہیں ہو سکتی۔“

”منتہا!“

”پلیز!“ اس نے مئی سے نظریں چراتے ہوئے کہا ”میں جھوٹ نہیں بول سکتی اور بولنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے

ڈیڈی سے اپنے رشتے پر شرمندگی ہے۔ کاش وہ میرے باپ نہ ہوتے۔“

”منتہا!“ ”مئی کے لہجے میں اب پہلے سے بڑھ کر تادیب و تنبیہ تھی۔“

”سوری والدہ میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ کم از کم آپ سے تو ہرگز بھی نہیں۔ جس شخص نے آپ کو ذرا سا بھی

دکھی کیا وہ میرے نزدیک ناقابل معافی ہے۔ ممانی جان بھی اسی لیے اچھی نہیں لگتیں مجھے۔“

”مئی اس کا منہ دیکھنے لگیں۔“

”اُس نے مئی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی عقیدت اور احترام سے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے محبت

بھرے لہجے میں کہا ”آئی لو یو۔“

”اچھا سنو، صلیب آج صبح پھر مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کب بلایا جائے۔“ ”مئی نے اچانک ہی موضوع

بدل دیا۔“



”میں خود اُس سے بات کر لوں گی۔“

”اس دن بھی تم نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا۔“

”ٹالا نہیں تھا بس وہ سنز ظہیر کی بھابی کو دیکھنے کے لیے ہا پٹل آنا جانا جو لگ گیا۔“

جبکہ امر واقعہ یہ ہرگز نہ تھا۔ ملیب سے اس موضوع پر پہلے جب بھی بات ہوئی ناگواری پر ہی منہج ہوئی۔ اس مرتبہ وہ اس سے فیصلہ کن بات کرنا چاہتی تھی اور اس کے گئے اسے باضابطہ تیاری کرنا تھی۔ ملیب اس سے کافی چھوٹا سہی مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ جو بردباری اس نے اپنے اوپر طاری کر لی تھی وہ اس سے قدرے احتیاط سے بات کرنے کی متقاضی ہوتی اور یہ معاملہ تو تھا ہی غیر معمولی اہم اور حساس!

\*\*\*

منتہا نے کمرے کے دروازے کی چوکھٹ کو دھیرے سے کھٹکھٹایا۔ ملیب نے اخبار سے نظر ہٹائی اور گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”حاضر ہو سکتی ہوں سر؟“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

منتہا کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے روبرو جاتھی اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں!“

”دیکھ رہی ہوں کہ تم ایسے کتنے بڑے ہو گئے جو ایسی حرکتیں کرنے لگے۔“

”کیسی حرکتیں!“ وہ سپٹا کر بولا۔

منتہا نے اس کے گردا گردیوں چکر لگایا جیسے اس کے گرد حصار باندھ دینا چاہتی ہو پھر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر بولی ”بائی دی وے تم نے اپنے ان جاننے والوں کو میرے اسکول کا راستہ کیوں دکھایا۔“

ملیب جو تذبذب میں تھا قدرے مطمئن دکھائی دینے لگا۔

”بولو، جواب دو۔“

”جواب تو آپ نے دینا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”بیٹھو اور میری بات سنجیدگی سے سنو۔“

وہ بیٹھ گیا۔

”ان کے اچھے یا بُرے ہونے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

ملیب نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”میرا جو جواب ہو گا وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”آپ بے وقوف ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر منتہا نے نظریں چڑالیں اور اثبات میں سر ہلا کر دھیرے سے بولی ”مانتی ہوں، مانتی ہوں کہ میں بے وقوف ہوں، احمق ہوں، گدھی ہوں، اگر نہ ہوتی تو تم مجھ سے چھوٹے ہوتے ہوئے بھی مجھے بے وقوف کیوں کہتے۔“

ملیب کچھ خفیف دکھائی دینے لگا۔

”مگر تم بے وقوفی کیوں کرنا چاہتے ہو۔“

ملیب نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔  
”میری وجہ سے تم اپنا وقت ضائع کیوں کر رہے ہو۔ والدہ کی خواہش ہے اور... میری بھی کہ تمہاری شادی ہو جائے۔“

ملیب کے تیور یک بیک بدل گئے۔

”میری فکر نہ کریں۔“

”کیسے نہ کریں!“

”جب آپ کسی کی بات سننے کو تیار نہیں تو دوسرے سے یہ توقع کیسے رکھتی ہیں کہ وہ آپ کی بات مئے گا۔“

”میری تو مجبوری ہے۔“

”کیا مجبوری ہے!“ اس نے منہا کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

”تم نہیں سمجھ سکو گے۔“

”بچہ نہیں ہوں۔“

وہ مذذب دکھائی دینے لگی۔

”یا تو آپ مجھے قائل کر دیں یا میری سن لیں۔“

”میں... میں مئی کو تمنا نہیں چھوڑ سکتی۔“

”وہ تمنا ہیں بھی کب... میں جو ہوں۔“

”نہیں... نہیں ملیل... مئی کا خیال میں خود ہی رکھنا چاہتی ہوں۔“

”آپ سمجھتی ہیں وہ... صرف آپ ہی کی ماں ہیں۔ آپ سے بہتر خیال رکھ سکتا ہوں میں اُن کا۔“

”ہاں، اس بات کا تو مجھے یقین ہے۔“ اس نے ملیل کو بہت پیار سے دیکھا۔

”تو پھر اس بات کو اپنے انکار کا جواز کیوں بناتی ہیں۔“

”میرا خیال ہے بات سے بات نکلتی اور بڑھتی چلی جائے گی۔ بہتر ہو گا کہ ہم صرف تمہاری بات کریں۔ تم اندازہ

نہیں کر سکتے ملیل کہ مئی کو اور ہم دونوں بہنوں کو تمہاری شادی دیکھنے کی کتنی تمنا ہے۔“

”بہتر ہو گا کہ ہم اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔“

”میں تو تمام عمر شادی نہیں کروں گی تو کیا تم بھی تمام عمر اپنی ضد پر...“

”ہاں۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی بولا پھر اس نے اپنی دائیں انگشت شہادت اس کی طرف

اٹھاتے ہوئے اسے خشونت سے دیکھا اور انتہائی ناگواری سے بولا ”اور... سن لیجئے اچھی طرح کہ اس کی واحد ذمے

دار آپ ہوں گی۔“

اس نے ہڑبڑا کر ملیل کو دیکھا۔

ملیب کی نگاہوں میں شدید ناگواری کی کیفیت تھی۔

”پلیز!“ اس نے لجاجت سے کہا۔

ملیب نے اسے بے پناہ جیبتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا ”کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو۔ کوئی بہت

غیر معمولی چیز ہیں آپ، جس ماں سے آپ کو محبت کا دعویٰ ہے اسے مسلسل ایک ذہنی کوفت سے دوچار کر رکھا ہے

آپ کے مسلسل انکار نے۔ مئی کا تو بہانہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ آزاد رہنا چاہتی ہیں۔ پابندیوں سے آزاد رہنا

چاہتی ہیں اور بس۔“

منہا دم بخود رہ گئی۔



اس سے پہلے ملیب نے کبھی اُس سے اس لمحے میں بات نہیں کی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اندیل دیا گیا تھا۔

ملیب پاؤں پٹختا کرے سے نکل گیا اور اس نے جاتے ہوئے دروازے کے پٹ پر بھرپور قوت سے مٹکا مارا۔  
منہا کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ می کمرے کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھیں۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے مردہ سی آوازیں کہا اور اپنے لبوں کو پوری شدت سے باہم بھیجنے کو اپنی آنکھوں میں اُمٹنے آنے والے آنسوؤں کو می سے چھپاتی آڑی ہو کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

\*\*\*

”یہ تو ہونا ہی تھا ایک نہ ایک دن۔“ می نے بعد میں اسی کی زبانی تمام صورتِ حال علم میں آنے پر کہا۔  
اس نے چونک کر می کو دیکھا۔

”لڑکا ہے وہ بھی آخر کب تک انتظار کرے گا۔ سوائے تمہارے کوئی اور ایسی ذمہ داری ہے نہیں جس کی وجہ سے اس کا اپنا معاملہ ٹل رہے۔“

اسے افسوس ہوا کہ می بھی اسی کی حمایت میں بول رہی تھیں۔

”میں نے اسے روکا تو نہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

”تم روکنا نہ روکو وہ تو بھائی ہونے کے ناتے بہنوں کو ان کے اپنے اپنے گھر کی کردینا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔“

”نہ سمجھے۔ میں نے کہہ دیا نا کہ۔۔۔“

”تمہیں شادی نہیں کرنی ہے۔“ می نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

اس نے شاکی نگاہوں سے می کو دیکھا۔

”آج تو بھائی کا کما ساندل سے لگا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ کل جب وہ تھک ہار کر اپنا گھر بسالے گا تو بھابھ کی سنی پڑیں گی اور ہو سکتا ہے اس وقت ہم بھی نہ ہوں تمہاری غلطی جتانے اور ماں ہونے کے ناتے تمہیں تسلی دینے کو۔“

اس نے تڑپ کر می کو دیکھا۔

کیسی باتیں کر رہی تھیں وہ!

”میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ تم اور ملیب دونوں ہی میرے دل کے ٹکڑے ہو۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی کہ تم دونوں بھائی بہن کو ایک دوسرے سے رنجش ہو گئی ہے تو میں پریشان نہ ہوتی۔ بھائی بہن کا دل ایک دوسرے سے کتنا ہی بُرا ہو جائے بالآخر گلہ شکوہ دور ہو جاتا ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بات یہیں نہیں رکنی اور تم دونوں کے درمیان ہی نہیں رہتی۔ تیسرے فرد کو بھی آنا ہے اس گھر میں جو اگر غیر ہوئی تو شاید اس گھر میں تمہیں کیا مجھے بھی آسانی سے قبول نہ کرے اور اپنے گھر کی لڑکی لانے کی تم مخالفت کرتی ہو۔“

می کو مدد کی حمایت میں بولنے کا موقع ملا۔

وہ ملیب کے رویے سے اتنی شکستہ دل ہو رہی تھی کہ اپنی مددافت اور مدد کی مخالفت میں کچھ نہ بول پائی۔

”اپنے گھر کی لڑکی ہوگی تو کتنی بھی بُری ہوگی غیر سے پھر بھی اچھی رہے گی۔“

وہ بدستور چپ رہی۔

دل بہت دکھ رہا تھا اس کا۔

ملیب سے اسے ایسی تلخ مگوئی کی توقع نہ تھی۔

مگر یہ زندگی ہے۔

اور زندگی میں تو اور بھی بہت کچھ دیکھنا اور سہنا پڑتا ہے انسان کو۔

”اول تو میں کہتی ہوں اب بھی ہوش کے ناخن لو۔ حالانکہ کئی رشتے تمہاری نہ نہ کی نذر ہو گئے مگر اب بھی وقت ہے، دیر ہو گئی ہے مگر ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی کہ وقت پکڑائی میں نہ آئے۔ اس گھر میں بیٹھ کر کل کو اس سے بھی زیادہ بُرے وقت کا انتظار کرنے اور دل دکھانے سے بہتر ہے کہ عقل پکڑو اور اپنا گھر بساؤ۔ لڑکی اپنے گھر میں ہی بھاری ہوتی ہے۔“

”اپنا گھر!“ اس نے بو جھل آواز اور دل شکستہ لہجے میں کہا ”گھر چاہے کوئی بھی ہو مرد ہی کا ہوتا ہے۔ آپ نے ڈیڈی سے شادی کے بعد کتنی قربانیاں دیں۔ اپنی ذات کو پس پشت ڈالے رہیں، مگر اس کے باوجود وہ گھر آپ کا نہ بن سکا۔ گھر کے مرد نے جب چاہا آپ کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔“

”میں تو بد قسمت تھی۔“ ممی نے دل گرفتگی سے کہا۔

”اس معاملے میں ہر عورت بد قسمت ہوتی ہے والدہ، اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ گھر اس کے باپ، بھائی، شوہرا بیٹے کا ہوتا ہے۔ جیسے آج مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ گھر علیل کا ہے جو مجھے جب اور جس طرح چاہے ذلیل کر سکتا ہے۔“ اس کی آواز رُندھ گئی۔

”بڑی بات! ایک ہی تو بھائی ہے اس کی طرف سے دل میلا مت کرو۔ اس کی خیر کی دعا مانگو۔ بھائی کے حق میں بہنوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔“

”آپ نہ بھی کہیں تو بھی میرے دل سے اس کے لیے دعا ہی نکلتی گی۔“ اس کی آنکھوں میں اچانک آنسو بھر آئے اور آواز بھرا گئی ”وہ مجھے جو مرضی آئے کہہ دے میں نہ تو کبھی اسے زبان سے بُرا کہوں گی نہ دل میں اس کے خلاف کوئی شکایت جڑ پکڑنے دوں گی۔ مجھے اس سے بے غرض محبت ہے والدہ۔“

ممی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”اسے بھی تم سے محبت ہے تبھی تو وہ فکر مند ہے تمہاری طرف سے اور میں بھی کچھ کم فکر مند تو نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے بس یہی دعا رہتی ہے میری اپنے اللہ سے کہ تم دونوں بھائی بہن کے گھر بس جائیں۔ زندگی میں اور مجھے ملا ہی کیا ہے سوائے تم لوگوں کے۔ تمہاری چھوٹی چھوٹی خوشیاں دیکھ جاؤں تو سمجھوں گی زندگی رائیگاں نہیں مگنی ورنہ بہت مایوس ہوں گی۔“

منہا ٹٹکنکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔

”ماں باپ کی خوشی کی خاطر تو کبھی کبھی اولاد بڑی قربانی دے جاتی ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی یاد کرو، باپ کی خاطر گردن تک کٹا دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ کیا تم ماں کی خاطر اپنی ضد نہیں چھوڑ سکتیں۔“

ضد!

یہ ضد تو نہیں تھی۔

عہد تھا۔

خود اپنے آپ سے اس کا عہد کہ ممی کو کبھی بھی اکیلا نہیں چھوڑے گی۔

❖❖❖

مگر زندگی نے اسے دورا ہے پر لاکھڑا کیا تھا۔

کئی سال بعد فضا ایک مرتبہ پھر امید سے ہو گئی تھی اور ان دنوں یوں گھبرائی گھبرائی تھی جیسے کوئی الحزدو شیزہ شادی کے پہلے ہی مینے میں امید سے ہو کر گھبرائی شرمائی جا رہی ہو۔ ایک بار پھر ماں بننے کا احساس بہر حال جاں فزا بھی تھا۔



جیسے خشک دھرتی میں خوابیدہ بڑا کوئی بیج مناسب حالات میں سر آنے پر بیدار ہو گیا ہو۔ اپنے قریبی متعلقین اور دوستوں میں اس نے یہ خبر سب سے پہلے منہا کو سنائی۔  
 ”گڈ!“ منہا اچھل ہی تو پڑی ”مبارک ہو۔“  
 ”مجھے تو سخت وحشت ہو رہی ہے۔“  
 ”کیوں؟“

”جوان بچوں کی ماں ہو کر پھر اس سلسلے سے گزرنا اچھا تو نہیں لگتا۔“  
 ”مگر تمہاری آنکھیں تو کچھ اور کہہ رہی ہیں۔“  
 ”کیا؟“

”کہ تم خوش ہو۔“  
 فضا شرما کر مسکرا دی۔  
 ”ماں بننے کے خیال سے خوش ہونا تو شاید ہر عورت کی مجبوری ہے ورنہ....“  
 ”ورنہ؟“

”ورنہ ایک مرتبہ ماں بننے کی تکلیف سے گزرنے کے بعد کوئی عورت دوسری مرتبہ اس کرب سے گزرنا پسند نہ کرتی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ سے تو اگر کوئی پوچھے کہ شادی کا فائدہ کیا ہے تو میں آنکھ بند کر کے کہہ دوں گی ماں بننا۔ اس نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر سرشار سے لہجے میں بولی ”بہت تکلیف دہ مگر بار آور..... اور..... ہم پھر بھی ماؤں کی وہ قدر نہیں کرتے جو ان کا حق بنتا ہے، کتنی بہت سی باتوں پر انہیں ناخوش اور ناراض کرتے چلے جاتے ہیں ہم۔“  
 منہا کو اک احساس جرم نے آیا۔

خود وہ بھی تو می کو کتنے عرصے سے اس ایک بات پر ناخوش اور ناراض کرتی چلی آ رہی تھی۔  
 ”تو تم خوش بھی ہو اور.....“

”شرمسار بھی۔“ فضا نے اس کا جملہ مکمل کر دیا پھر بولی ”بچے کیا سوچیں گے۔“

”بچوں نے بھلا کیا سوچنا ہے انہیں تو ایک جیتا جاگتا کھلونا مل جائے گا۔“

”اف اللہ!“ فضا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا ”میں تو یہ سوچ سوچ کر وحشت زدہ ہوئی جا رہی ہوں کہ راول اور سانول کا سامنا کیونکر کروں گی..... ادا مال گا! ایک دو دن نہیں نو مہینے تک!“  
 ”تم ہر سال میٹرٹی لیو پر جانے والی ٹیچر کو کتنا برا بھلا کہا کرتی تھیں۔“

”ہاں..... ان کے پیریڈز جو لینے پڑتے تھے تین مہینے تک۔“

”اب تم دوسروں کو یہ موقع دو گی۔“ منہا کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”او خدا فردری میں میری چھٹی شروع ہو گی اور فردری کے آخر میں بچوں کے امتحانات ہوں گے..... کیسے ہو گا سب کچھ۔“

منہا نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی ”یہ بات تو تمہیں اس خوبصورت واردات سے قبل سوچنی چاہیے تھی۔“

”میرے اختیار میں تھوڑی تھا یہ تو اللہ میاں کی مرضی سے ہوا ہے۔“

”تو پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ جس اللہ نے یہ کیا ہے وہی سب کچھ کرے گا۔“

فضا نے اثبات میں سر ہلایا جیسے کلی طور پر اس کی بات سے متفق ہو۔

”تمہارے میاں کے تاثرات کیا ہیں؟“

”انہیں ابھی بتایا کس نے ہے۔ ڈاکٹر نے کل شام پر گنسنی کنفرم کی اور تم پہلی فرد ہو جسے میں بتا رہی ہوں۔ ابھی تو اپنی بہنوں میں سے بھی کسی کو نہیں بتایا ہے میں نے۔“

”ایک مرتبہ پھر مبارکباد!“

فضہ کے عارض گلابی ہو رہے تھے۔

\*\*\*

منتہا اور ملیب کے مابین ہفتہ عشرہ تک بات چیت بالکل بند رہی پھر دھیرے دھیرے پہلے بالواسطہ پھر بلاواسطہ بات چیت شروع ہو گئی مگر بات چیت دوبارہ شروع ہونے کے بعد اس موضوع پر ان کے مابین کوئی بات نہ ہوئی جس پر ان کے درمیان کشیدگی ہو گئی تھی۔ البتہ می سے ملیب نے ضرور پوچھا کہ ان لوگوں کو جو منتہا کو پسند کیے بیٹھے تھے کیا جواب دیا جائے۔

”میں کیا بتاؤں بیٹا۔“ می نے یوں نظریں چرائیں جیسے مجرم وہی تھیں۔

”کچھ تو بتائیں۔“

”تمہاری بہن تو بیٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی۔“

”ٹھیک ہے میں منع کیے دیتا ہوں ان لوگوں کو۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ظاہر ہے منع ہی کرنا پڑے گا۔“

”ہے غلط بات۔“

”میں کب صحیح کہتی ہوں اسے۔“

”نہہ اچھی تھی اس نے پریشان نہیں کیا۔“

”بیٹا بڑی تو یہ بھی نہیں۔ اس بہن نے تو بہت کڑے وقت میں تم لوگوں کے سر پر ہاتھ رکھا۔ کسی کی نیکی نہیں بھولنی چاہیے میرے بچے۔“

وہ خاموش رہا۔

”میں جانتی ہوں..... جانتی ہوں بیٹا کہ ہم سب..... میرا مطلب ہے تم، میں، منتہا اور نہہ ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ہماری زندگیوں میں ایک دوسرے کے سوا اور ہے کیا..... ہم ایک دوسرے سے وقتی طور پر خفا ہو سکتے ہیں، چند دن کی بول چال بند کر سکتے ہیں مگر ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت ہی محبت ہے۔“

\*\*\*

اچھی بھابی اسپتال سے گھر آچکی تھیں۔ ان کی طبیعت اب بہت بہتر تھی۔ بیماری کے دوران معالجین نے ان کی صحت پابی کے لیے جو کیا سو کیا یہ نہ ان کی تیمارداری میں دن رات ایک کر کے اپنے سرالیوں کے دل جیت لیے تھے۔ نعیم اور فہیم اظہارِ شکر گزاری کرتے نہ تھکتے۔

”بھابی آپ نے امی کا بہت خیال رکھا۔“

”یہ تو میرا فرض تھا۔“

”تھینک یو دیری مچ۔“

نعیم اور فہیم کو واپسی کی فکر بھی تھی اور یہ فکر بھی کہ ماں کو کس کے آسرے پر چھوڑ کر جائیں گے۔ بجا کہ اس خاندان میں ایک بہت تھا۔ ان کی ماں کی بیماری پر سارے خاندان والے ایک پاؤں سے کھڑے ہو گئے تھے مگر ہر ایک کی اپنی اپنی ذمے داریاں تھیں۔ ہر مولیٰ اپنے پتوں پر بھاری تھی۔ خاندان کے کسی ایک گھرانے پر وقت پڑنے پر سارے خاندان کا وقتی طور پر اکٹھے کھڑے ہو جانا اور بات تھی مگر مستقبل کسی کا دکھ درد بٹانے کے لیے اپنی ذمے داریوں میں



سے مسلسل وقت نکالنا دوسری بات۔ نعیم اور فہیم دونوں ہی کو اس بات کا احساس تھا کہ اب پہلے کی طرح ماں کو اکیلے چھوڑنا مناسب نہ ہو گا۔ بجا کہ ان کی خدمتگاری اور گھریلو امور کی انجام دہی کے لیے کل وقتی ملازمہ گھر میں تھی مگر ایک پر خطر علالت کے بعد انہیں ملازمہ کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جاسکتا تھا۔ کوئی مستقل اور مناسب بندوبست لازم تھا۔

خاندان کے قریبی بزرگوں کی رائے یہ ٹھہری کہ اس مسئلے کا اس سے بہتر حل اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اچھی بھابی کی اس خواہش کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے جس کا اظہار انہوں نے اسپتال میں بستری علالت پر بھی بہ اصرار کیا تھا اور اسپتال سے گھر آنے کے بعد بھی بار بار اس کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ اپنے دونوں بیٹوں کے گھر بے دیکھنے کی آرزو مند تھیں۔

فہیم کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، گھر کی لڑکی سے اس کی نسبت ملے تھی۔ لڑکی والے تو اشارے کے خطر تھے۔ اشارہ پاتے ہی انہوں نے لڑکی کی رخصتی کا اسباب باندھ دیتا تھا۔ مسئلہ تھا نعیم کا جس کے لیے ابھی لڑکی دیکھنے بھالنے کا مرحلہ بھی ملے نہ ہوا تھا۔ اور وہ عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

سو اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کی شادی پہلے یا دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ کرنے کی خواہش پس پشت ڈال کر چھوٹے کی پہلے کرنے کی اجازت دیں۔

اچھی بھابی کو تامل ہوا۔ مسز ظہیر جن سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سن لیتی تھیں، اُن سے ملنے کو آئیں تو انہوں نے کہا ”فارح! نعیم کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھو۔ دونوں بھائیوں کی شادی اکٹھے ہو جائے تو فہم اور نہ کم از کم اتنا تو ہو کہ ہم بڑے کی نسبت ملے کر دیویں۔ یہ تو اچھا نہیں لگے گا کہ چھوٹے کے سر پر ہم سراسر سجادیں اور بڑا بے چارہ دیکھتا رہ جائے۔“

”لڑکیوں کی کمی نہیں اچھی بھابی مگر نعیم کے لیے ویسی ہی سمجھدار اور ذمے دار لڑکی ہونی چاہیے جیسے کہ وہ خود ہیں۔ فرحان میاں کی بڑی سالی پر ہماری نظر اسی لیے تھی۔“

”جہاں تیل منڈھے نہیں چڑھ سکی اب اس کا کیا ذکر، تمہارے تو ماشاء اللہ کافی لوگوں سے تعلقات ہیں، کوئی اور لڑکی دیکھو!“

”انشاء اللہ دیکھتے ہیں۔“

”دیکھتے ہیں نہیں بس دیکھ ڈالو جلد از جلد۔“

نعیم نے خوش دلی سے کہا ”پھوپھی جان ذرا خیال رکھئے گا جلدی میں کہیں کوئی غلط پیس ہاتھ نہ لگ جائے۔“

”کیوں بد فال منہ سے نکالتے ہو۔“

نعیم نے جھک کر ان کے گھٹنے پکڑ لیے اور عاجزی سے بولا ”ای جان! آپ کا کہا ہم دونوں بھائیوں نے کبھی نہیں

ملا۔ ایک بات آپ بھی مان لیں۔“

”مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”ہماری مجبوری پھوپھی جان کے بلکہ پورے خاندان کے سامنے ہے۔ میں چاہتا ہوں واپس جانے سے قبل فہیم

کی شادی کر کے جاؤں۔“

اچھی بھابی نے چونک کر اسے دیکھا اور بولیں ”جلدی مجھے بھی ہے مگر اس طرح ہتھیلی پر سرسوں کب جمتی

ہے۔“

”مجھے یقین ہے ہماری مجبوریوں کے پیش نظر پھوپھی جان کو تامل نہیں ہو گا۔ میں اور فہیم اپنی چھٹی بڑھوا لیتے

ہیں۔ شادی کے بعد میں چلا جاؤں گا فہم آٹھ دس روز اور یہاں گزار کر لیلیٰ کو یہاں آپ کے پاس چھوڑ کر وہاں آجائے گا۔ لیلیٰ کے آپ کے پاس ہونے سے ہم دونوں ہی کو اطمینان رہے گا کہ آپ اکیلی نہیں ہیں۔“

”شادی کے بعد ہر لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ میں بہوؤں کو خدا نخواستہ اپنے ساتھ باندھ کر تھوڑی بٹھاؤں گی۔ وہ تم لوگوں کے ساتھ خوش رہیں۔“

”فی الحال مجبوری ہے۔ ورنہ شاید آپ کی تنہائی کا احساس ہمیں وہاں اطمینان کے ساتھ کام نہیں کرنے دے گا۔ میں نے فہم سے بھی بات کی ہے۔ وہ بھی میرے اس پروگرام سے متفق ہیں۔ پھوپھی جان سے بات کرنے کے لیے آپ کی اجازت چاہیے بلکہ ہم پھوپھی جان اور پھوپھا جان کو یہاں بلا کر بات کر لیں گے۔“

”الٹی لنگا بھانا چاہتے ہو۔ لڑکی والے یہاں آئیں!“

”اوہو امی جان گھر کی بات ہے انہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر نے آپ کو مکمل آرام کی ہدایت کر رکھی ہے۔“

اچھی بھابی نے فہم کو متذبذب نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور گڑگڑا کر بولا ”پلیز“ منع مت کیجئے گا۔ یہ بہت ضروری ہے اور بہت سے مسائل کا حل بھی۔“

”مگر یہ کب اچھا لگے گا بیٹے کی نئی دلہن ایک بیمار بڑھیا کے ساتھ بندھ کر بیٹھ جائے۔“

”تھوڑے دنوں کی بات ہوگی امی جان سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم سب انشا اللہ یہاں یا وہاں اکٹھے ہی رہیں گے۔ آخر فرحان بھی تو اپنی بیگم کو چھوڑ کر گئے کہ نہیں۔ نیسہ بھابی کتنی اچھی طرح رہ رہی ہیں سسرال میں۔“

”بڑی خدمت کی ہے اس لڑکی نے میری خدا اسے خوش رکھے۔ بہو کے معاملے میں فارحہ بہت خوش قسمت ہیں۔“ اچھی بھابی نے رشک سے کہا۔

\*\*\*

اسکول میں وقفہ ختم ہوئے پندرہ بیس منٹ گزر چکے تھے۔ رواں پیرڈ میں جو ٹیچرز فری تھیں اسٹاف روم میں بیٹھی تھیں۔ منتہا بھی ان میں شامل تھی اور اس وقت اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی اپنے کلاس رجسٹر میں طلباء سے وصول شدہ فیسوں کا اندراج کر رہی تھی۔ اس کے سامنے میز پر بڑا تال کے لیے آنے والی کاپیوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ یہ انبار تو ختم ہونے ہی میں نہ آتا۔ ایک کلاس کی کاپیاں جاتیں تو دو کی آجاتیں۔ ریاضی میں تحریری کام بھی تو روزانہ ہی ہوتا جس کی بڑا تال بھی ضروری ہوتی۔ ریاضی ہی کیا احساس زبے داری رکھنے والوں کے لیے تو ہر مضمون ہی میں کام تھا۔ فرائض کی زبے داری کے سلسلے میں فاروقی صاحب کی سختی شوق نہ رکھنے والوں کو بھی جبراً کام پر مجبور رکھتی۔

منتہا پورے استغراق کے ساتھ رجسٹر کے کام میں محو تھی کہ سلیم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”منتہا بی بی!“

وہ اسٹاف روم کے دروازے پر کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”پر نسل صاحب بلا رہے ہیں۔“

”مجھے؟“

”ہاں۔“

سلیم کی عادت تھی کہ جب کسی خاتون ٹیچر کو کسی دوسرے کی موجودگی میں مخاطب کرتا تو کبھی اس کے نام سے پہلے مِس یا نام کے بعد بی بی استعمال کرتا لیکن جب کسی خاتون ٹیچر کو اکیلے میں مخاطب کرتا تو بڑے پیار سے ”بھٹو“ کہتا۔ منتہا کو اس کا ”بھٹو“ کہنا ہمیشہ اچھا لگتا مگر اس وقت اس کے ”بھٹو“ کہنے کا موقع نہ تھا۔

”جائیے بڑی سرکار سے بلاوا آیا ہے۔“ ٹانگ پر ٹانگ دھرے چائے کی چسکیاں لیتی مسز نقوی بولیں۔

منتہا نے ایک نظر انہیں دیکھا اور اور رجسٹر بند کر دیا۔ سلیم ہنوز دروازے پر کھڑا منتظر لگا ہوں سے اُس کی جانب



دیکھ رہا تھا۔

”آ رہی ہوں۔“ اس نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پلٹ گیا۔

منتہا نے اپنا بیگ شانے پر لٹکایا اور پرنسپل صاحب کے دفتر کی طرف چل دی۔ شولڈر بیگ تو جیسے لیڈی ٹیچر کا جزو لازم بن چکا تھا۔ بیگ کے بغیر ٹیچر کا تصور ہی نامکمل تھا۔ صبح جب وہ اسکول آنے کے لیے گھر سے نکلتی تو سڑکوں پر بس اسٹاپوں پر بسوں میں کندھوں پر بیگ لٹکائے خواتین دور ہی سے پہچانی جاتیں کہ ٹیچر ہیں۔

فاروقی صاحب دفتر میں اکیلے بیٹھے کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔

”مے آئی کم ان سر؟“ منتہا نے ان کے دفتر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔

فاروقی صاحب نے سر اٹھا کر دروازے کے رخ پر دیکھا اور مسکرا دیے۔

”آئیے آئیے، مس منتہا۔“ انہوں نے بڑی گرجوشی سے کہا ”مبارک ہو!“

اس نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا کہ کس بات کی مبارکباد دے رہے تھے وہ اُسے۔

”کس بات کی مبارکباد سر؟“

”ڈائریکٹریٹ سے خبر ملی ہے کہ پبلک سروس کمیشن نے آپ کی بحیثیت وائس پرنسپل تقرری کی سفارش کی ہے۔ ڈائریکٹریٹ، کمیشن کے لیٹر کی کاپی ایک آدھ روز میں ہمیں بھجوا دے گا، آپ کو اپنی کاپی ملی؟“

”نہیں سر..... ملی ہوتی تو آپ کو ضرور بتاتی۔“

”کمیشن کو خط و کتابت کے لیے ایڈریس آپ نے گھر کا دیا تھا یا اسکول کا؟“

”گھر کا سر۔“

”چلے نہیں ملا ہے لیٹر تو مل جائے گا۔ ڈاک میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال ڈائریکٹریٹ کی کمیشن کی جانب سے لیٹر کی کاپی مل گئی ہے۔ قواعد کے مطابق انشا اللہ تعالیٰ آپ کو دو ماہ کے اندر اندر ڈائریکٹریٹ سے باقاعدہ تقرری بھی مل جائے گی..... دیکھتے ہیں کہاں پوسٹ کرتا ہے محکمہ آپ کو۔ بہر حال مجھے بہت خوشی ہوئی۔“

”میں اندازہ کر سکتی ہوں سر۔“

”حالانکہ آپ کی کسی اور ادارے میں تعیناتی سے یہ ادارہ ایک اچھی ٹیچر سے محروم ہو جائے گا مگر مجھے پھر بھی بہت خوشی ہوئی۔“

”تھینک یو سر۔“

”مٹھائی کب کھلا رہی ہیں؟“

”جب آپ کہیں ویسے لیٹر مجھے نہیں ملا ہے ابھی۔“

فاروقی صاحب مسکرا دیے۔

”گویا ہم ایسے غیر معتبر ٹھہرے کہ آپ ہماری زبانی کلامی بات کا اعتبار کرنے کو آمادہ نہیں۔“

”اوہ نو سر! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ خفیف ہو گئی۔ ”دراصل سر لوگوں کو مٹھائی کے جائز ہونے کا یقین اسی وقت آئے گا جب وہ لیٹر دیکھ لیں گے۔“

فاروقی صاحب ہنس دیے۔

”یہ آپ نے مٹھائی کے جائز ہونے کی بات بھی خوب کی۔ کیا مٹھائی ناجائز بھی ہو سکتی ہے؟“

”سر! رشوت میں دی جانے والی مٹھائی تو ناجائز ہی ہوگی۔“

فاروقی صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بولے ”ویسے آپ اتنی ایکسائٹڈ نہیں ہوئیں اس خبر سے جتنی کہ میں توقع

کر رہا تھا۔

”سرا! سچی بات یہ ہے کہ میں نے آپ کے کہنے پر اپلائی تو کر دیا تھا اور انٹرویو بھی دے دیا تھا مگر... اس اسکول سے میں اتنی زیادہ وابستگی کا احساس رکھتی ہوں کہ میرے لیے یہاں سے کہیں اور جانے کا تصور بھی تکلیف دہ ہے۔“

”اونہوں!“ فاروقی صاحب اس کی جذباتی کیفیت بھانپتے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولے ”علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پوشیدہ قرار میں اجل ہے..... انسان کو ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی سعی کرتے رہنا چاہیے۔“

”لیکن سر انسانوں، چیزوں، اداروں اور اپنے دوستوں سے وابستگی بھی تو اہمیت رکھتی ہے۔ میں..... میں آج سے پہلے یہ بات آپ سے کبھی نہیں کہہ سکی مگر آج کہہ رہی ہوں۔ آپ کی سرپرستی میں کام کرنا مجھے کچھ ایسا احساس دیتا تھا جیسے میں....“

”رک کیوں گئیں؟“

”سرا! آپ مجھے باپ کی طرح شفیق لگے۔“

اُس کے دل کے اندر کہیں گہری ٹیس انٹھی کہ اس کی یہ بات اس کی حقیقی زندگی میں کیسا تلخ تضاد رکھتی تھی۔ محبت کرنے والے باپ نے جب یک بیک نگاہیں بدلیں تو اس سے زیادہ نامشفق اور نامہربان آدمی اور کوئی نہ رہا۔

”آئی ویش یو آل دی مسٹ۔“ فاروقی صاحب بولے۔

”تھینک یو سر۔“

”جائیے جا کر یہ خوشخبری اپنے ساتھیوں کو سنائیے تاکہ انہیں بھی آگے بڑھنے کی تحریک ملے۔“

”سر لیٹر تو آجائے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ کو میری بات کا یقین واقعی نہیں آیا۔“

”اوہ نو سر۔“ وہ پھر شرمندہ سی ہو گئی۔ ”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ ساتھی اگر پوچھیں گے تمہیں کیسے پتا چل....؟“

”تو کہہ دیجئے گا ڈائریکٹریٹ سے اطلاع آئی ہے۔“

”اوکے سر!“ اس نے نہایت تابعداری سے کہا۔

\*\*\*

منتہا نے سب سے پہلے فضا کو بتایا۔

”بہت مبارک ہو!“ وہ فرط مسرت سے بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ اس سے پرے ہٹ گئی اور اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا!“ منتہا نے حیرانی سے کہا۔

”بے ایمان!“ فضا نے دھیرے سے اس کے بازو پر مٹکا لگایا پھر شاکی لہجے میں بولی ”مجھے چھوڑ جاؤ گی۔“

”یقین کرو یہی بات میں نے بھی کہی فاروقی صاحب سے کہ اس ادارے میں میرے دوست ہیں جنہیں چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔“

”انہوں نے جواب میں تمہیں عمدہ سی تقریر سنا دی ہو گی۔“

منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

”کیوں یہی ہوا؟“

”ہاں ہوا تو یہی، کہنے لگے انسان کو آگے بڑھنے کی سعی کرتے رہنا چاہیے۔“



”ہو رہے ہیں نا اگلے سال ریٹائر“ دیکھتے ہیں کتنا آگے جاتے ہیں۔“ فضہ بولی۔  
 ”میں نے سنا ہے ریٹائرمنٹ کے بعد کئی پرائیویٹ اسکولز ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ منتہا نے کہا۔  
 فضہ اُسے ٹھٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔  
 ”لگتا ہے تمہیں میری خبر سے خوشی نہیں ہوئی؟“  
 فضہ کے لبوں پر قدرے محزون سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”بہت خوشی ہوئی۔“ اس نے کہا پھر بولی ”مگر میں تمہیں  
 بہت مس کروں گی۔“

منتہا نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔  
 ”ارے بھی، ابھی تو کمیشن نے سفارش کی ہے۔ فاروقی صاحب بتا رہے تھے ڈائریکٹریٹ سے پوسٹنگ آنے میں  
 دو تین ماہ لگیں گے۔“ اس نے فضہ کا دل رکھنے کی کوشش کی۔  
 فضہ اپنی چھٹکلیاں آنکھوں کے کوپے خشک کرنے لگی۔  
 ”کہیں دور پوسٹنگ ہوئی تو جانے سے انکار کر دوں گی۔“  
 فضہ نے چونک کر اسے دیکھا ”ایسا ہرگز مت کرنا۔“  
 ”کیوں؟“

”آگے بڑھنے کے موقع زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے۔ جہاں بھی پوسٹنگ ملے ضرور جانا۔“  
 ”عجیب خاتون ہو۔“  
 ”کیوں؟“

”ایک طرف سے روتی ہو اور دوسری طرف سے یہ مشورہ کہ ضرور جانا۔“  
 فضہ دھیرے سے مسکرا دی۔  
 ”دوستوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔  
 منتہا کو فضہ کے علاوہ کسی اور کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ فاروقی صاحب نے وائس پر نسل کو بتایا اور  
 خبر مشتر ہوتی چلی گئی۔ منتہا کو ہر طرف سے مبارکباد ملنی شروع ہو گئی۔  
 نائب قاصد سلیم کو جو کسی کام سے اسکول سے باہر گیا ہوا تھا چھٹی کے وقت خبر ملی۔ وہ اسے تلاش کرتا اسکول بس  
 تک آپہنچا اور بولا ”بھٹو بڑی بڑی مبارکباد ایمان سے بہت خوشی ہوئی۔“  
 ”شکریہ۔“

❖❖❖

مسز ظہیر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچھی بھالی ایک روز قبل نعیم کے لیے لڑکی دیکھنے کو کہیں گی اور اگلے ہی  
 دن نعیم اور لیلیٰ کی شادی کی تاریخ طے کر دینے کی خواہش ظاہر کریں گی اور وہ بھی ہفتہ بھر کے اندر اندر۔ گو بیٹی کو جلد  
 رخصت کر دینا ان کی اپنی بھی خواہش تھی مگر اس قدر عجلت کا گمان نہیں تھا انہیں، سوانہوں نے نعیم سے جو اس سلسلے  
 میں خاصی گرجوشی سے پیش پیش تھا کہا ”نعیم میاں، دس پندرہ دن تو دیتے ہمیں۔“  
 ”ارے پھوپھی جان، دس پندرہ دن کس لیے آخر۔ دس پندرہ دن میں تو نعیم میاں کو تین چار دن ہنی مون منا کر  
 ڈیوٹی پر بھی واپس چلے جانا ہو گا۔“  
 ظہیر صاحب اور مسز ظہیر کی نظریں باہم ملیں۔ مسز ظہیر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن سے پوچھا ”کیا خیال  
 ہے؟“

”ہو جائے گا سب ہو جائے گا۔“ ظہیر صاحب بڑے لاابالی انداز میں بولے اور مسز ظہیر کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے

انہوں نے مزید کہا ”ارے بھی گھبراتی کیوں ہو تم تو مردانہ وار کام کرنے کی عادی ہو؟“  
 ”یہ بیٹی کو رخصت کرنے کا معاملہ ہے ظہیر صاحب کام بہت ہوں گے۔“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”جو میرے کرنے کے ہیں مجھے بلا تکلف بتائیے۔“ نعیم نے اپنی خدمات پیش کیں۔  
 ”میاں! بس کو دو جاؤ میدان میں۔“ ظہیر صاحب مسکرائے۔  
 ”سب سے پہلے تو فرحان میاں کو اطلاع کی جائے۔“  
 ”بس سمجھئے ہو گئی۔“ نعیم نے کہا۔  
 ”کام بہت ہیں اور.....“

”مقابلہ سخت۔“ ظہیر صاحب نے خوش دلی سے مسز ظہیر کی بات پر گرہ لگائی۔  
 ”فکر ہی نہ کیجئے پھوپھا جان۔“ نعیم مسکرایا ”ہم مقابلہ جیت کر رہیں گے۔“  
 ”وہ تو آپ جیتے جتائے ہیں نعیم میاں آخر کو لڑکے والے جو ہوئے آپ۔“  
 ”مجھے تو آپ لڑکی والا ہی سمجھئے۔ نعیم اگر میرا چھوٹا بھائی ہے تو لیلیٰ بہن۔“  
 ”جیتے رہے جیتے رہے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں اپنے عروج کو جا پہنچیں۔ وقت کی کمی اور کام کی زیادتی کے پیش نظر مسز ظہیر نے چاہا کہ مایوں اور مہندی کی رسمیں سادگی سے کر لی جائیں مگر خاندان کے لڑکے لڑکیوں نے واویلا مچا دیا کہ ان رسموں کے بغیر بھی کوئی شادی اچھی لگتی ہے بھلا۔ انہی رسموں سے تو شادی کی رونق دو بالا ہوتی ہے۔ نعیم نے ان کی ہاں میں ہاں ملا کر مسز ظہیر کے ہاتھ پاؤں اور بچھلا دیے۔  
 مگر یہ بھی سچ تھا کہ نعیم اپنی طرف ہی کی نہیں ان کی طرف کی تیاریوں میں بھی دامے درے سخنے ان کے شانہ بشانہ تھا۔ وسائل کی کمی نہ تھی بھائی کی شادی پر وہ دل کھول کر پیسہ خرچ کر رہا تھا۔  
 نیسہ جس کی اپنی ملازمت سے قبل از ولادت رخصت شروع ہو چکی تھی اپنی طبیعت کے بوجھل پن کے باوجود شادی کی تیاریوں میں سسرال والوں کا حتی المقدور ہاتھ بٹا رہی تھی۔  
 شادی سے دو دن قبل فرحان بھی آگیا۔  
 نیسہ کا دل کھل اٹھا۔  
 وصال، فراق، وصال  
 کیسی خوبصورت مثلث تھی۔

اور یہ کتنی عجیب بات کہ وہ جو اپنی نوعمری میں ایک مرد کے رویے سے جو اس کا حقیقی باپ تھا اتنی دل برداشتہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ ہی ترک کر دیا تھا ایک مرد ہی کو اپنی بہار زندگی محسوس کر رہی تھی۔  
 لیلیٰ کی شادی کے ہنگاموں میں اسے فرحان کے حوالے سے اپنا آپ بڑا محفوظ و مامون محسوس ہو رہا تھا۔  
 ایک مرد نے زندگی پر اس کے اعتماد کو متزلزل کیا تھا تو دوسرے نے اس اعتماد کو بحال کر دیا تھا۔  
 زندہ باد اے زندگی زندہ باد!  
 تو کبھی قاتل ٹھہرے اور کبھی میاں!!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں





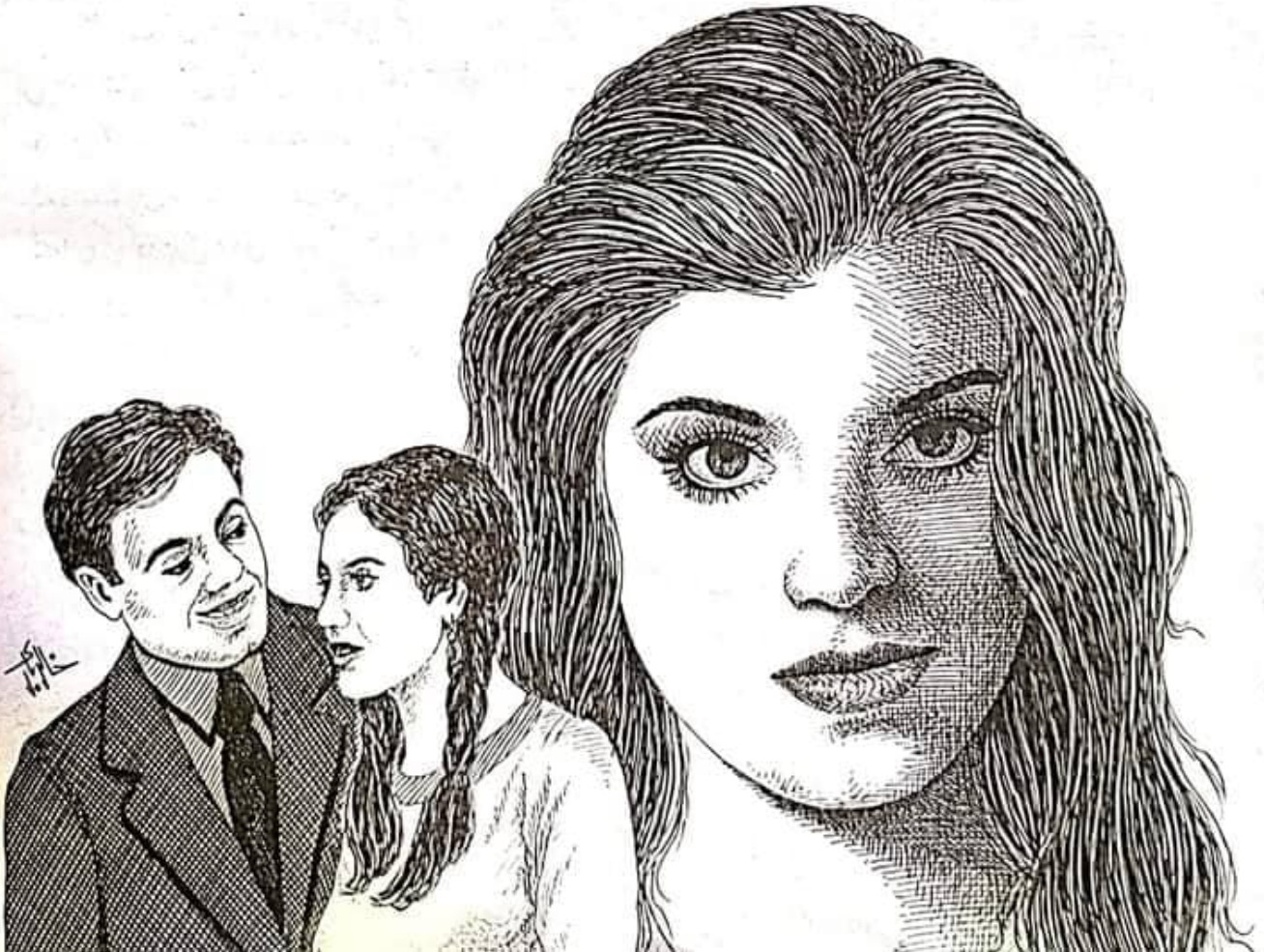
دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمیر پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تہمتیں نہیں دیتے بلکہ آکے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہری تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

**محبتوں سے گزرے اور یقین سے بندھے رشتوں کے چاک سار ہونے کی دل گداز داستان**

ناہید سلطانہ اختر

قسط 12









لیلیٰ کی شادی کے سلسلے میں ہونے والی مختلف تقاریب میں مُمی، منبتا اور علیب خصوصی اہتمام سے شریک ہوئے تھے۔ آخر کو سمدھیانہ تھا اور سمدھیانہ بھی ایسا جس نے اُن کے گھر کی بیٹی کو اپنی بیٹیوں کا سا پار دے کر رکھا ہوا تھا۔ ہر موقع پر مسز ظہیر نیسہ کو آگے آگے رکھے رہیں اور مُمی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں کہ جس نے اپنی رحمت سے اتنے اچھے لوگوں سے نانا جزوا دیا تھا۔

فرحان کے آجانے سے نیہ اتنی خوش تھی کہ ایسی حالت میں بھی جبکہ عورت کو اپنا آپ بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے وہ ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی۔ فرحان اسے محبت بھری میٹھی میٹھی ننگا ہوں سے دیکھے جاتا۔ جھوم سے ہٹ کر وہ تنہائی میں آتے تو فرحان کی آنکھوں میں جہاں بھری محبوبیت سمٹ آتی۔

”تم نے مجھے یاد کیا؟“ اس نے ایک دفعہ نہیں کئی بار پوچھا۔

”بہت..... اور آپ نے؟“

”اس دل سے پوچھو۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے سینے پر رکھ لیتا۔ وہ شرماتا جاتی۔  
 ”گن گن کردن گزار رہا تھا۔ خدا بھلا کرے اچھی ممانی کے ہارٹ اٹیک کا جو لیلیٰ کی شادی اچانک طے پا جانے  
 کی وجہ سے مجھے مقررہ وقت سے پہلے ہی آنے کا موقع فراہم کر دیا ورنہ مجھے تو اگلے ماہ آنا تھا۔“  
 ”بڑی بات! کیا کہہ رہے ہیں آپ خدا بھلا کرے اچھی ممانی کے ہارٹ اٹیک کا!“  
 ”ہاں۔“ وہ مسکرا دیا ”تم سے جھوٹ نہیں بول سکتا میں۔ دیکھو نا اگر اچھی ممانی کو ہارٹ اٹیک نہ ہوتا تو نفیم سے  
 پہلے نفیم کی شادی کیسے ہو سکتی تھی۔“  
 ”کیوں نہیں ہو سکتی تھی۔“

”اچھی ممانی کا فیصلہ تھا کہ یا تو نعیم کی فہیم سے پہلے ہوگی ورنہ دونوں کی ایک ساتھ۔“

”چلے اچھا ہوا امی جان کو لیلیٰ کی بہت فکر تھی۔“

”اب بتاؤ اچھی ممانی کے ہارٹ اٹیک کو میں بھلا کیوں دعا نہ دوں۔“

”اللہ توبہ! پھر وہی بات۔“

”بھئی میں تو بار بار کہوں گا سو بار کہوں گا اور صرف تمہارے سامنے ہی کہوں گا ورنہ اوروں کے ہاتھوں سے پٹوں گا۔ تھینک یو! اچھی ممانی کے ہارٹ اٹیک تھینک یو تم نے وقت سے پہلے ہی مجھے میری سوئیٹ ہارٹ سے ملوایا۔“

نہ نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور مسکرا دی۔

تھلے میں وہ دونوں کھلی آنکھوں مستقبل کے خواب دیکھنے لگتے۔

”جب تم میرے پاس آ جاؤ گی تو ہم دوبارہ اپنا ہنی مون منائیں گے۔“

”کہاں؟ یورپ میں؟“

”ارے نہیں بھئی ہمیں یورپ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یا ر لوگوں نے دبی کو یورپ بنا رکھا ہے۔ یورپ والے تو خود چھٹیاں گزارنے اور ریٹائرمنٹ کے بعد آرام کرنے کی غرض سے وہاں آتے ہیں۔“

نہہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”رہی!“

”ہاں ہاں تم آؤ تو سہی۔ موقع ملا تو یورپ بھی دکھا دوں گا۔ میں نے تو نہیں دیکھا لیکن جنہوں نے یورپ بھی دیکھ رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ دہلی یورپ سے کم نہیں۔“

”ارے میں تو مرا جا رہا ہوں تمہیں دہی دکھانے کو۔ صابزادے کو آنے دو ذرا اس دنیا میں وہ جوتے لگاؤں گا کہ اس کے بچے بھی منجے پیدا ہوں گے۔ ایسی جلدی کیا تھی تمہارے وہاں آنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“  
نیمہ ہنس پڑی۔

”اور ایک امی ہیں روک لیا کہ بہو کو میں اس حال میں نہیں جانے دوں گی حالانکہ شادی سے پہلے یہ رٹ لگا رکھی تھی کہ شادی کے بعد تم دلہن کو اپنے ساتھ ہی رکھنا۔“

”اچھا بھئی اچھا غصہ تھوک دیں بس اب تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہے۔“  
”زندگی کا ایک دن کا بھروسہ نہیں اور تم کہتی ہو تھوڑا ہی ٹائم رہ گیا ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا ناکون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک اور میں کہتا ہوں کون جیتا ہے صابزادے کی ولادت تک۔“

”توبہ کریں فرحان، تمہکاریں۔“

”کیا مطلب؟“

”ممی کہتی ہیں زبان سے خدا نخواستہ کوئی بد شگون کی بات نکل جائے تو تمہکے کا رونا چاہیے۔“

”عجیب عورت ہوا!“

”کیوں؟ اس میں عجیب ہونے کی کیا بات!“

”ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہو اور یقین رکھتی ہو صدیوں پرانی باتوں پر۔“

”ایم بی بی ایس ڈاکٹر کے کوئی پر تو نہیں نکل آتے۔ عورت ہوں ہر لڑکی کی طرح میں نے بھی وہی سیکھا ہے جو مجھ سے پچھلی نسل کی عورت یعنی میری ماں نے مجھ سے کہا۔“

”دیے یا تمہاری امی یعنی میری ساس ہیں بہت اچھی۔“

”کچھ عجیب اتفاق ہے۔“

”کیا؟“

”مرد کو اپنی ساس بہت اچھی لگتی ہے۔“

”اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے۔“

”کیا؟“

”کہ اکثر عورتوں کو اپنی ساسیں اچھی نہیں لگتیں مگر تم اور تمہاری ساس ایک دوسرے پر جان دیتی ہیں۔“

”میری ساس ہیں ہی اتنی اچھی۔“

”ماں کس کی ہیں۔“

”اور بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”سُرب بلکہ ایکسٹرا سُرب! آئی لویو..... آئی لویو نیمہ۔“

”مئی ٹو فرحان۔“

فرحان کے آنے سے نیمہ کو زندگی زیادہ خوبصورت، زیادہ نکھری نکھری محسوس ہو رہی تھی۔

\*\*\*

لیلیٰ کی مہندی اور برات میں منہا کی نعیم سے دور دور سے رسمی علیک سلیک رہی مگر ویسے کی تقریب میں جب وہ می کے دولہا کو سلامی دینے کے لیے ڈانس کی طرف چلے جانے کے بعد اکیلی بیٹھی گرد و پیش کے نظادوں میں کھوئی ہوئی تھی مسز ظمیر اس کے پاس آ پہنچیں۔  
”آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں بھئی؟“



”والدہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اٹھ کر اُدھر گئی ہیں۔“ اس نے اسٹیج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”آئیے نا۔“ مسز ظہیر نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”سب لوگ مودی بنوا رہے ہیں دولہا اور دلہن کے ساتھ آپ بھی بنوائیں۔“

”مجھے..... مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ مسز ظہیر کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کو کچھ اچھا بھی لگتا ہے! اٹھئے۔“ مسز ظہیر نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔

”ارے پھوپھی جان آپ کہاں ہیں، میں آپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

منہتا اور مسز ظہیر دونوں ہی چونک پڑیں۔

نعیم سلک کے کرتا شلوار میں ملبوس ان کے نزدیک کھڑا تھا۔

”آداب!“ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جاتے ہوئے منہتا کو دیکھا۔

منہتا نے فقط سر ہلا کر آداب کا جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”ہاں، کو کیا بات ہے کیوں ڈھونڈ رہے تھے ہمیں۔“ مسز ظہیر نے دھیرے سے منہتا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”سوری! پتا نہیں کیا بات تھی بھول گیا مگر تھی ضروری بات۔“ وہ کچھ خفیف ہو کر بولا۔

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔“ مسز ظہیر معنی خیز انداز میں مسکرا دیں۔

”کیسا؟“ نعیم نے پوچھا۔

”آدمی کسی نئی صورت حال کو دیکھ کر بہت ضروری بات بھی بھول جاتا ہے۔“ مسز ظہیر کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی اور انہیں کن آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر منہتا نے نگاہیں چُرالیں۔

”خیر جب یاد آجائے تو بتا دینا کہ کیا ضروری بات تھی۔“ مسز ظہیر نے نعیم سے کہا۔ منہتا اور نعیم کی نگاہیں ملیں۔

مسز ظہیر نے اپنا دایاں ہاتھ نعیم کے شانے پر دھر دیا اور اسے بہت محبت سے دیکھتے ہوئے منہتا سے بولیں ”ہمیں

اپنے بہن بھائیوں کے بچوں میں سب سے زیادہ محبت ان سے ہے۔“

نعیم نے نیاز مندانہ انداز میں سر جھکا دیا۔

”کیونکہ یہ ہمارے بڑے بھیا کی کاپی ہیں۔“ مسز ظہیر کی آنکھیں یک لخت بھر آئیں اور گلہ رندہ گیا۔ ”بہت پیار

تھا ہمیں اپنا بڑے بھیا سے۔“ مسز ظہیر نے مزید کہا ”ان کے انتقال کی خبر ہمیں فون پر ملی تھی پھر برسوں ہم فون کی سختی

سے ڈرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد تین چار سال تک تو ہم نے اپنے گھر کا فون ہی کٹوا کر رکھا مگر پھر دوبارہ لگوا

پڑا۔ زندگی کی ضرورتیں آپ کو وہ کام بھی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں جن سے آپ ڈرتے ہیں یا انہیں ناپسند کرتے ہیں۔

بھیا کے انتقال کے وقت یہ اتنے بڑے رہے ہوں گے۔“ مسز ظہیر نے اپنے بازو کو اوندھا کر نعیم کے بچپن کی قامت کا

اندازہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”آج بڑے بھیا ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔“ مسز ظہیر بھیگی ہوئی آواز میں بولیں۔

انہیں مرحوم بھائی کی یاد سے دل گرفتہ پا کر نعیم نے اپنا بازو بہت محبت سے ان کے شانوں پر دراز کر دیا اور انہیں

تسلی دیتے ہوئے بولا ”پھوپھی جان یہی زندگی ہے۔“ پھر اچانک اس نے اپنے لہجے میں ایک نئی جوت جگاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہم یہ ساری باتیں ان کے سامنے کیوں کر رہے ہیں۔“

اس کی مراد منہتا سے تھی۔

مسز ظہیر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر منہتا کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولیں ”کیونکہ یہ ہماری اپنی ہیں۔“

نعیم نے کچھ اس طرح اسے دیکھا نیسے کہتا ہو ”اچھا! تو تم میری پھوپھی جان کے لیے اتنی اہم ہو۔“

”ہماری تو بڑی خواہش تھی اور اب بھی ہے کہ نیسہ کی طرح یہ بھی ہمارے ہی خاندان کی فرد بن جائیں۔“

منتہا نے سٹپا کر پہلے مسز ظہیر کو دیکھا پھر اس کی نگاہیں ایک لمحے کو نعیم کی نگاہوں سے ملیں اور دوبارہ مسز ظہیر کی جانب پلٹیں۔ ”نیہہ کے رشتے سے تو میں ہوں نا آپ کے خاندان کی فرد۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

”آپ نے ہماری بات پر غور نہیں کیا، ہم نے کہا ہماری خواہش ہے کہ نیہہ کی طرح آپ بھی ہمارے خاندان میں شامل ہو جائیں اور نیہہ شادی ہو کر ہمارے خاندان میں آئی ہیں یہی خواہش ہماری آپ کے لیے بھی تھی بلکہ ہے۔“

منتہا نے نظریں چڑالیں۔

”ای! ڈاکس کی جانب سے یہ آواز بلند پکارا گیا۔

مسز ظہیر نے گردن موڑ کر ڈاکس کی جانب دیکھا ”نعیم اور منتہا کی نگاہیں بھی اسی طرف اٹھیں۔

بیلا ہاتھ بلند کیے مسز ظہیر کو ڈاکس کی طرف بلا رہی تھی جہاں دو لہا ڈالمن کے ساتھ ایک فیملی گروپ بنوانے کی تیاری تھی۔ مئی دو لہا کو سلامی دے کر نہ جانے کس طرف نکل گئی تھیں۔

”آتے ہیں۔“ مسز ظہیر نے بیلا سے کہا۔

”جلدی آجائیے۔“

”اچھا بھی اچھا۔“ مسز ظہیر نے باری باری ان دونوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے نعیم سے بولیں ”ہم ذرا مووی بنوالیں تب تک تم یاد کرنے کی کوشش کرو کہ ہمیں کیوں تلاش کر رہے تھے۔“

مسز ظہیر کے جانے کے بعد وہ دھیرے سے کھنکھار پھر اس نے اپنے لمبے حزم و احتیاط پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”پچھلی مرتبہ جب میں فرحان کی شادی میں پاکستان آیا تھا تو پھوپھی جان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ..... آپ کی والدہ سے بات کرنا چاہتی تھیں مگر آپ نے انہیں منع کر دیا تھا۔“

منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی طرف سے یوں براہ راست اور بلا تمہید استفسار کی توقع نہ تھی اُسے۔

”آئی ایم سوری..... شاید آپ کو میرا یہ پوچھنا برا لگا ہو لیکن میں نے اس لیے پوچھ لیا کہ ہم دونوں ہی میں سے کوئی بھی ٹین ا۔ بجر نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں مجبوراً افراد کو اپنے ہمہ اقسام مسائل براہ راست گفت و شنید سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے.... آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔“

”جی..... جی نہیں۔“

”گڈ! مجھے یہی امید تھی..... کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گی کہ کیوں منع کر دیا تھا آپ نے؟“

”سوری یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“

”درست!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا ”لیکن یہ بالواسطہ طور پر میرا بھی معاملہ ہے۔“

منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے ایک نظر اپنے گرد و پیش پر دوڑائی پھر منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”آج کی تقریب کا میزبان ہوں۔ اصولاً مجھے اس وقت مہمانوں بالخصوص مرد مہمانوں کے درمیان گردش میں ہونا چاہیے مگر پھوپھی جان کی تلاش میں آکر یہاں رکا ہوں تو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ کیا پتا پھر کبھی آپ سے بات کرنے کا موقع ملے نہ ملے۔ امی جان کی بیماری کے دوران نیہہ بھابی نے جس تندہی اور اپنائیت سے ان کی دیکھ بھال کی اس سے آپ کے بارے میں میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔“

منتہا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ وہ قطعاً سنجیدہ اور دو ٹوک کیفیت میں دکھائی دیتا تھا جیسے اسے اپنے لفظ لفظ کی درستگی اور صداقت کا یقین ہو۔ ”مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ پچھلی مرتبہ جب پھوپھی جان نے آپ کی تعریف کی تو میں نے اسے اتنی اہمیت نہیں دی تھی مگر اس بار امی جان کی بیماری کے دوران نیہہ بھابی کے رویے نے مجھے آپ





و لیے کے بعد اگلے ہی دن نعیم اور لیلیٰ اپنے مختصر سے ہنی مون پر نکل گئے اور نعیم نے دعویٰ واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ نعیم اور لیلیٰ کے واپس لوٹنے ہی وہ چلا جانا چاہتا تھا۔ نعیم کو ہنی مون سے واپسی کے بعد چند دن لیلیٰ اور امی کے پاس رہ کر واپس لوٹنا تھا۔

”میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔“ اچھی بھابی نے نعیم سے کہا۔

”میں..... سمجھا نہیں۔“ نعیم نے چونک کر کہا۔

”سمجھتے تو خیر سب ہوا نجان بننے کی ضرورت نہیں۔“

نعیم دھیرے سے مسکرایا۔

اچھی بھابی نے وہ تمام لڑکیاں جو اُن کی نظر میں تھیں گنوائیں پھر بولیں ”جہاں تمہارا ارادہ ہو بتاؤ تاکہ تمہارے جانے سے پہلے بات چکی کر دی جائے۔“

”ارے نہیں امی جان۔“ وہ سٹپٹا کر بولا۔

”کیوں؟“

”جلدی کی کیا ضرورت ہے۔“

”اب بھی جلدی کہتے ہو۔ یہ جلدی ہے تو پھر دیر کیا ہوگی۔ تمہاری ضد کے آگے ہتھیار ڈال کر میں نے تمہارے چھوٹے بھائی کی شادی تم سے پہلے کر ڈالی پھر بھی تم کہتے ہو جلدی کی کیا ضرورت ہے۔“

”میرا مطلب یہ ہے امی جان کہ مجھے تو دو چار دن میں چلے جانا ہے، آپ دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر اطمینان سے فیصلہ کیجئے گا۔“

”میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے ماشاء اللہ تم خود سمجھدار ہو۔ جو لڑکیاں نظر میں ہیں وہ سب تمہاری بھی دیکھی بھالی ہیں۔ تم اپنی مرضی ظاہر کر دو باقی کام ہمارا۔“

”میری صرف ایک خواہش ہے۔“

”وہ کیا؟“

”آپ کا خیال رکھنے والی ہو۔“

”ارے بیٹا، ہم اب کئے دن کے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ تم میرا نہیں اپنا سوچو۔ جس لڑکی کے ساتھ تم نے زندگی گزارنی ہے، وہ تمہاری پسند کی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اپنی پسند بتاؤ تاکہ بات کی جائے۔ تمہارے جانے سے پہلے کچھ تو سلسلہ چل پڑے۔“

”اتنا وقت نہیں ہے امی جان، میں تو نعیم اور لیلیٰ کے واپس لوٹنے ہی چلا جاؤں گا۔“

”بیٹا وقت تو میرے پاس کم ہے۔ موت کی دہلیز پر جا کر پٹی ہوں۔ تھوڑی سی مہلت مانگی ہے اللہ میاں سے..... بس اتنی کہ تم دونوں بھائیوں کے گھر بے دیکھ لوں۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ ایک خوشی دکھا دی۔ دوسری خوشی دیکھنے کی بھی جلدی ہے مجھے۔ کیا معلوم کب فرشتہ اجل پھر سر پر آکھڑا ہو۔“

نعیم نے اپنا بازو ماں کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے انہیں تسلی دی ”ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ نے ابھی بہت سی خوشیاں دیکھنی ہیں۔ ہمارے بچے کھلا میں گی۔“

اچھی بھابی نے گردن موڑ کر اسے متا بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا ”پہلے ہو تو آئے۔“

”ایک آؤ گئی ہے۔“

”دوسری بھی آجانی چاہیے..... اچھا اب تم مجھے باتوں میں نہ لگاؤ، یہ بتاؤ تمہارے لیے پہلے کہاں بات کی جائے۔“



نعیم سوچ میں پڑ گیا۔  
 اچھی بھالی نے کچھ دیر انتظار کیا پھر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اسے مسلسل غور و خوض کی کیفیت میں دیکھتے ہوئے بولیں ”بتا بھی چکو۔“  
 ”نہ بھالی جیسی لڑکی دیکھئے۔“  
 اچھی بھالی نے سٹپا کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“  
 ”بست جلد گھل مل گئی ہیں وہ پھوپھی جان اور اُن کے گھر والوں ہی سے نہیں بلکہ ہمارے پورے خاندان سے۔“  
 ”اس میں شک نہیں۔“  
 ”بس ایسی ہی کوئی لڑکی دیکھئے۔“  
 ”جو ڈاکٹر بھی ہو!“ اچھی بھالی نے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔  
 ”ڈاکٹر ہونا شرط نہیں۔“  
 ”تو پھر؟“

”آپ کا اسی طرح احترام کرے جیسے نہ بھالی پھوپھی جان کا کرتی ہیں۔ میرے مسائل کو اسی طرح سمجھے اور شیر کرنے کی کوشش کرے جیسے نہ بھالی نے فرحان کے ساتھ کیا ہے۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک شور مچا چکی ہوتی دہی جانے کے لیے۔“  
 ”ٹھیک کہتے ہو مگر بیٹا پنچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں کسی میں کوئی خوبی ہوتی ہے کسی میں کوئی۔ میری تو دعا ہے تمہارے لیے نہ سے بھی اچھی لڑکی ملے۔“  
 ”بس تو جلدی مت کیجئے۔“ ویسے بھی ابھی تو نعیم کی شادی کی تھکن ہی نہیں اتری ہے۔  
 اچھی بھالی اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔  
 ”تھکن نہیں اتری ہے تو جاکوں رہے ہو کچھ دن آرام کرو۔ چھٹی بڑھو الو۔“  
 ”اتنا آسان نہیں ہے امی جان۔“  
 ”کیوں! کیا مشکل ہے۔“

”باہر کی دنیا میں مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے امی جان۔ زیادہ چھٹی کرنے والوں کی بالکل ہی چھٹی کر دی جاتی ہے اور پڑوسی بغلیں بجاتے خالی ہونے والی جگہ کو فوراً پُر کرنے آ جاتے ہیں۔ ہندوستانی، بنگلہ دیشی اور دوسرے ورکرز کا اگر بس چلے تو ہمیں وہاں سے نکال باہر کریں۔“  
 ”انہیں کیا تکلیف!“

”تکلیف ہے نا تبھی تو تاک میں رہتے ہیں وہ۔“  
 ”ارے بیٹا لاکھ تاک میں رہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ قرآن حکیم میں صاف صاف لکھا ہے کہ رب کریم جس کی چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے۔ نہ جانے کیوں ہم اللہ پر بھروسہ نہیں کرتے۔“  
 ”ہم تو کرتے ہیں امی جان وہ نہیں کرتے۔“  
 ”بجلیتیں گے۔“ اچھی بھالی نے انتہائی وثوق سے کہا۔  
 بات نعیم کی شادی کے ذکر سے کہاں جا پہنچی تھی!

\*\*\*

انظامت تعلیم نے پہلے پبلک سروس کمیشن کی۔ فارش سے تحریراً مطلع کیا اور دس پندرہ دن بعد منتہا کی تعیناتی کے احکامات بھی بھجوا دیے۔ گو اس کا اقرار بحیثیت وائس پرنسپل کیا گیا تھا مگر تعیناتی ایک جوئیئر پبلک اسکول کی قائم مقام

پرنسپل کے طور پر کی گئی۔ نظامت کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں یہی طریقہ رائج تھا۔ وائس پرنسپل کی حیثیت سے ترقی پانے یا پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر براہ راست منتخب ہو کر آنے والے وائس پرنسپلز کو یا تو کسی ہائی اسکول میں وائس پرنسپل کی خالی آسامی پر تعینات کیا جاتا یا پھر کسی جونیئر اسکول میں پرنسپل کی خالی آسامی پر آفیشیٹنگ پرنسپل مقرر کر دیا جاتا۔ نظامت کے ماتحت تمام جونیئر اسکولوں میں وائس پرنسپل ہی قائم مقام پرنسپلز کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ جس اسکول میں منہا کی تعیناتی کی گئی تھی اس کی پرنسپل تقریباً دو ماہ قبل ملازمت سے سبکدوش ہو چکی تھیں اور ان کے جانے کے بعد ادارے کے سینئر ماسٹ ٹیچر نے اسکول کا انتظام و انصرام سنبھال رکھا تھا۔ منہا کو ہفتہ بھر کے اندر اندر اپنے نئے مقام تعیناتی پر فرائض منصبی سنبھالنے کا حکم دیا گیا تھا۔

وہ خلیان میں پڑ گئی۔

کسی تجربے کار پرنسپل کے ساتھ بطور وائس پرنسپل کام کرنا اور بات تھی مگر ایک ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے کرتے اچانک ہی کسی ادارے کی سربراہی سنبھالنا دوسری بات۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ کسی ہائی اسکول میں بحیثیت وائس پرنسپل تعیناتی عمل میں آئے گی اور وہ پرنسپل کی مددگار بن کر کام کرے گی مگر یہاں تو سرمنڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات ہوئی۔

اس نے سب سے پہلے گھر میں ای کو اپنی اس پریشانی سے آگاہ کیا۔

”منع کر دو۔“ مئی نے بے ساختہ کہا ”اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کہنا میں ٹیچر ہی بھلی ہوں.... انکار تو کر سکتی ہوں؟“

”جی..... جی..... میں اگر چاہوں تو منع کر سکتی ہوں۔ بس ایک نقصان ہو گا۔“

”وہ کیا؟“

”اس وقت ڈائریکٹ ستر حواں گریڈ مل رہا ہے۔ ٹیچر رہوں گی تو خدا جانے کتنا عرصہ لگے گریڈ ستر ملے میں۔“

”مگر یہ بھی تو دیکھو کہ اس وقت تمہیں صرف ایک کام ہے اور وہ ہے پڑھانا، پرنسپل بنو گی تو سیکڑوں بکھیرے ہوں گے۔ ہر آدمی جی چاہے گا کہ اس کی سنی جائے اور جس کی نہیں سنو گی وہی برا کہے گا۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ بے چارے فاروقی صاحب کا حال دیکھتی ہوں میں۔“ منہا بولی۔

”اور سیٹ پر بیٹھا انسان اگر شریف اور حلیم ہو تو پھر تو لوگ چیل کوں کی طرح اس کا ماس نوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کام کر دیا جس کا وہ تو کرے گا واہ واہ اور جس کو کیا انکار اس سے سنیں گالیاں۔“

منہا نے جھرجھری لی پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی ”والدہ آپ جو کہہ رہی ہیں سو فی صد درست مگر آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم!“

”تجربہ ہے اور کیسے۔“

منہا سوچ میں پڑ گئی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ٹھیک ہے میں منع کر دیتی ہوں لیکن ڈائریکٹریٹ والے کہیں گے کیا مذاق ہے اگر انکار کرنا تھا تو اتنی جستجو کیوں کی۔“

”کہہ دینا تجربہ حاصل کرنے کے لیے۔“

”ہاں..... آسان ترین جواب تو یہی ہو گا..... ٹھیک ہے میں منع کیے دیتی ہوں۔“

لیکن جب اس نے اسکول کے توسط سے ڈائریکٹریٹ کو اپنا جواب بھجوانے کے لیے فاروقی صاحب سے بات کی تو وہ چونک کر بولے ”بھولے سے بھی ایسی غلطی مت کیجئے گا۔ ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں ملا کرتے۔“

”مگر سر خواہ مخواہ کا کسٹراگ ہے یہ۔ میری والدہ بھی منع کر رہی ہیں۔“

فاروقی صاحب دھیرے سے مسکرا دیے۔



”کیوں منع کر رہی ہیں والدہ؟“  
 ”وہ کہتی ہیں بہت مشکل ہے۔ سیٹ پر بیٹھے انسان کو دوسرے لوگ چیل کووں کی طرح ٹھونکیں مارتے ہیں۔“  
 فاروقی صاحب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

”واقعی یہ تو ہے۔ میرا سر دکھ رہی ہیں نا آپ.....“  
 منتہا نے فاروقی صاحب کی چمکتی چندیا کو ایک نظر دیکھا۔  
 ”لوگوں ہی نے گنجایا ہے۔“ فاروقی صاحب اپنی بات کے تسلسل میں بولے۔  
 منتہا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ فاروقی صاحب اس کے بے ساختہ چونکنے پر ہنس دیے۔  
 ”محاورتا کہا ہے مس منتہا۔“

”جی سر میں سمجھتی ہوں۔“ وہ جھینپ کر بولی۔  
 ”گڈ! یہ بھی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں کہ متکلم اور مخاطب ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہوں ورنہ ایک مرتبہ یہ لطیفہ بھی گزرا ہے کہ ہمارے ایک رفیق کار نے اپنے ایک دوست سے دوسرے کی بابت کہا کہ انہیں تو فلاں صاحب نے الو کا گوشت کھلادیا ہے، ان کی مراد یہ تھی کہ موصوف ان کے سوا کسی اور کی سنتے ہی نہیں مگر جن سے کہا گیا انہوں نے عوام میں یہ بات اس طور آگے بڑھائی کہ فلاں صاحب کہیں سے الو پکڑ کر لائے، اسے ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون بھان کر ان دوسرے صاحب کو کھلادیا۔ دروغ برگردن راوی سنا ہے کہ جن لوگوں کو انہوں نے یہ بات بتائی ان میں سے اکثر نے منہ بگاڑ کر کہا لا حول ولا قوۃ! کتنی غلط حرکت کی انہوں نے اور یہ بھی سننے میں آیا کہ بعضوں نے بتانے والے صاحب سے پوچھا الو کا گوشت ہوتا کیسا ہے!“  
 منتہا مسکرا دی۔

”دیے سر اگر میں ہوتی تو میں بھی ان سے یہی پوچھتی کہ الو کا گوشت کیسا ہوتا ہے۔“  
 فاروقی صاحب ہنس دیے۔

”تو آپ جوائن کر رہی ہیں۔“ انہوں نے قدرے توقف سے کہا۔  
 ”سر!“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”آئی لوپچنگ... مجھے کلاس روم میں رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔“  
 ”نوڈاؤٹ... نوڈاؤٹ مس منتہا، پچنگ بڑا مقدس کام ہے لیکن... ایک کلاس روم میں پڑھانا اور ایک تعلیمی ادارے کو چلانا، اس کا نظم و نسق سنبھالنا دو مختلف امور ہیں۔ مختلف تجربے ہیں۔ آپ کلاس روم میں پڑھانے کے تجربے سے گزر چکی ہیں اب دوسرے تجربے سے بھی گزر کر دیکھیے۔ آپ کو یوں لگے گا جیسے آپ ایک ایسی تصویر بنا رہی ہیں جو کبھی مکمل نہیں ہوتی ہر روز نئے فنشنگ پٹرن مانگتی ہے۔ مجھے یقین ہے آپ اس دوسرے تجربے کو پہلے سے بڑھ کر مسرت انگیز اور طمانیت بخش پائیں گی۔ یوڈولواٹ!“  
 منتہا ان کا منہ تکتے لگی۔

”یس۔ یس مس منتہا آئی کین اشیوریو۔“  
 ”سر!“

”ادمنوں! اب ایک لفظ نہیں۔ کوئی پہاوتھی نہیں۔ آپ اپنی نئی ذمے داریاں سنبھال رہی ہیں۔ یہ میرا آرڈر ہے اور ریکونٹ بھی۔“  
 منتہا تذبذب میں پڑ گئی۔

”ہمارے تعلیمی اداروں کو نئے خون کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے محنتی، فرض شناس اور فعال افراد کی ضرورت ہے۔ آپ ایک بار کسی ادارے کی سربراہی سنبھال کر تو دیکھیے اتنا کچھ سیکھیں گی کہ مزہ آئے گا۔ ہر روز ایک نیا تجربہ

ہر روز ایک نئی بات۔“  
 ”لیکن... لیکن سر سیکھوں گی کیسے؟ کس سے؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا جاتا۔“  
 فاروقی صاحب مسکرا دیئے۔

”سیٹ پر تو بیٹھ سکتی ہیں نا؟ میرا مطلب ہے کرسی پر بیٹھنا تو آتا ہے نا؟“  
 ”سر وہ تو سبھی کو آتا ہے۔“

”لیکن کرسی مستقل طور پر سب کو جگہ نہیں دیتی کسی کسی کو دیتی ہے۔ ہمارے نظام میں یہ خرابی تو ہے کہ تعلیمی اداروں کے سربراہوں کی عملی تربیت کا کوئی نظام نہیں مگر کرسی پر بیٹھنے کے بعد آپ آہستہ آہستہ خود ہی سب کچھ سیکھتے چلے جاتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ تجربات آپ کے معلم بن جاتے ہیں۔“  
 ”ویسے سر، سربراہ کی عملی تربیت کا نظام ہونا ضرور چاہیے، آخر لیچرز کے لیے بھی سی ٹی، بی ایڈ اور ایم ایڈ جیسے کورسز ہیں کہ نہیں۔“

”مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔ تعلیمی اداروں کے نو منتخب سربراہان کی قبل از تعیناتی تربیت کا ضرور بندوبست ہونا چاہیے تاکہ ان کے بھٹکنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے یا غلط باتھوں میں پھنس جانے کا احتمال نہ رہے۔“  
 ”غلط باتھوں سے آپ کا کیا مطلب ہے سر؟“ وہ چونکی۔

”ہر تعلیمی ادارے میں کچھ گرگ باراں دیدہ، چالاک، تجربہ کار، گھاگ اور زمانے کے سرد و گرم سے بخوبی آشنا لوگ تدریسی اور غیر تدریسی ہر دو قسم کے اسٹاف میں موجود ہوتے ہیں جو نئے سربراہان ادارہ پر اپنے جال بھینکنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات سربراہان اپنی لاعلمی اور نا تجربے کاری کی وجہ سے ان کے جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ تربیت کا نظام ہو تو سربراہ ادارہ ایسوں کے جال سے چوکنار ہے گا۔ نئے سربراہ کو سب سے پہلے تو اس کا دفتری عملہ اپنے جاں میں بچانے کی کوشش کرتا ہے پھر تدریسی عملے میں بھی بعض مفاد پرست لوگ ہوتے ہیں جنہیں یہ اپنی عزت کی پروا ہوتی ہے نہ دوسرے کی۔ بہر حال آپ پریشان نہ ہوں عملی تربیت کے فقدان کے باوجود وقت اور تجربہ سیکھنے کی لگن رکھنے والوں کو اسی طرح سب کچھ سکھا دیتا ہے جیسے دریاؤں کی موجیں اور سمندروں کی لہریں مچھلی کے بچوں کو بغیر استاد کے تیرنا سکھا دیتی ہیں۔“

”منہا چپ چاپ مگر انتہائی انسہاک سے ان کی بات سنتی رہی۔“  
 ”جی... تو پھر کیا ٹھہرا؟“ فاروقی صاحب نے قدرے توقف سے پوچھا۔  
 ”سر! میں والدہ سے مشورہ کروں گی۔“

فاروقی صاحب دھیرے سے مسکرا دیئے۔

”ضرور کیجئے مگر خود کو پریشان ظاہر کرتے ہوئے نہیں پُر اعتماد ہو کر۔ ان سے یہ مت کہیں کہ امی مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں بلکہ یہ کہئے مجھے اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“  
 منہا کے دل کے کسی چور گوشے میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی۔

سامنے بیٹھا شخص کتنا نرم خو اور مہربان تھا۔ اس کی باتیں مخاطب کے دل میں خود بخود اپنی جگہ بناتی چلی جاتیں۔ مسائل کا بوجھ گھٹتا چلا جاتا۔ اس کے پاس بیٹھ کر دل کا بوجھ بتدریج کم ہوتا چلا جاتا۔ وہ بھی تو ایک مرد ہی تھا۔

اور

وہ بھی ایک مرد ہی جس کا نام لینے، جس سے اپنا تعلق ظاہر کرنے میں اسے اب شرم سی محسوس ہوتی تھی۔  
 تھا کوئی ڈاکٹر نجیب احمد جو کبھی اس کا باپ ہوتا تھا۔



ایک انٹو تعلق بھی کیسا بے جان ہو گیا تھا۔  
جیسے کوئی ریت کا زمیں بوس گھروندا۔  
جیسے کوئی کرم خوردہ چوٹی تختہ جو ہو کر بھی نہیں تھا۔



فاروقی صاحب سے ہونے والی گفتگو اور ان کا مشورہ می کے گوش گزار کرنے کے بعد منتہا نے پھر ان سے مشورہ مانگا تو وہ بولیں ”میں کیا کہوں تم خود دیکھ لو۔“

”میرا خیال ہے مجھے جو اسن کر لینا چاہیے۔“

”اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“ می نے مانگے بنا ہی اسے دعا دے ڈالی۔

”آپ کی دعائیں ساتھ ہوں تو پھر کس بات کی پروا۔“

”میرے دل سے تو تم تینوں بھائی بہنوں کے لیے اٹھتے بیٹھتے دعائیں نکلتی ہیں۔ نیہہ کی طرف تو ان دنوں دن رات دھیان لگا رہتا ہے۔ نیہہ بتا رہی تھی فرحان بہن کی شادی کی وجہ سے وقت سے پہلے چھٹی پر آگئے اب اس کی ڈیوری تک نہ ٹھہرائیں گے۔“

”بہن کی شادی میں آنا بھی تو ضروری تھا نا والدہ۔“

”ہاں یہ میں نے کب کہا کہ ضروری نہیں تھا مگر نیہہ کی بھی تو یہ پہلی ڈیوری ہے ایسے موقع پر ہر عورت کو اپنی ماں اور شوہر کی موجودگی سے تسلی رہتی ہے۔“

”کیا کیا جائے والدہ، نوکری بہت مجبور کر دیتی ہے انسان کو۔“

”بھئی سچی بات یہ ہے کہ مجھے مسز ظہیر کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی کہ نیہہ کو یہاں کیوں روک کر رکھا۔ فرحان کے پاس چلی گئی ہوتی تو دونوں اکٹھے بھی رہتے اور نیہہ کو بھی شوہر کے پاس رہنے سے تسلی رہتی۔ عورت کو بڑی ڈھارس ہوتی ہے اپنے مرد سے۔“

منتہا کو می کے کنبے میں دل گرفتگی کا احساس ہوا۔

”بس کچھ دنوں کی بات اور ہے والدہ پھر نیہہ انشاء اللہ فرحان کے پاس ہی رہے گی۔“

”اللہ تعالیٰ دونوں کو خوش رکھے۔ ہاں بھئی وہ... لیلیٰ کی دعوت بھی تو کرنی ہے۔ سنا ہے لیلیٰ کے جیٹھ کو ان دونوں کے واپس لوٹتے ہی دعویٰ واپس چلے جانا ہے، میں تو کہتی ہوں اس کی موجودگی ہی میں دعوت کر دی جائے۔ فرحان کی اور اس کی دوستی بھی ہے اور فرحان کو دعویٰ بلایا بھی اسی نے تھا۔“

منتہا نے مسکرا کر می کو دیکھا۔

”یعنی آپ اس کی موجودگی میں لیلیٰ کی دعوت کر کے فرحان پر اس کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہیں۔“

”احسان تو ذرا سا بھی پہاڑ برابر ہوتا ہے۔ احسان کا بدلہ چکانا کب ممکن ہوتا ہے بھلا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دعوت میں لیلیٰ کی سسرال سے سبھی شریک ہو جائیں تو اچھا ہے۔ کنبہ ہی بڑا مختصر ہے۔ ماں، دو بیٹے اور بہو۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“

”میں مسز ظہیر سے کہے دیتی ہوں پہلی دعوت ہمارے ہاں ہی رکھوا دیں۔ ٹھیک ہے نا؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”سمدھیانے کی دعوت ہوگی بندوبست اچھا کرنا ہوگا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ سب بندوبست ہو جائے گا۔ آپ دعوت کا دن تو مقرر کروائیں۔“

”میں فون کرتی ہوں۔“

”اب مجھے غصہ آرہا ہے۔“ فرحان نے نیسہ کے بالوں میں دھیرے دھیرے اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

نیسہ جو اس کے سینے پر اپنا سر دھرے آڑی ہوئی نیم دراز تھی چونک کر سیدھی ہو بیٹھی ”کس پر؟“

”اپنے اوپر۔“

”کیوں؟“

”خواہ مخواہ پہلے آگیا۔ مجھے اگلے مہینے آنا چاہیے تھا۔“

نیسہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”کوئی خاص بات!“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

جواباً فرحان اسے ٹٹلی باندھ کر دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں۔“

”تمہیں۔“ اس کی آنکھوں میں بیکراں دار فتگی سمٹ آئی۔

نیسہ مسکرا دی۔ ”اب تو پرانی ہو گئی ہوں جناب۔“

”بتا ہے آٹھ مہینوں میں ہم صرف کتنے دن اکٹھے رہ سکے ہیں۔ میں تمہیں جی بھر کر دیکھ بھی نہیں پایا ہوں۔“

”فکر مت کیجئے، تنگ آجائیں گے دیکھتے دیکھتے۔ ہاتھ جوڑ کر کہا کریں گے کچھ دنوں کو پاکستان چلی جاؤ۔“

”تم نہیں جانتیں ہمارے خاندان کے مرد اپنی بیویوں کے کیسے عاشق صادق ہوتے ہیں۔“

”اتنی انجان بھی نہیں رہی تھوڑا تھوڑا جان گئی ہوں۔“

”گڈ! تب تو تمہیں یہ پتا ہونا چاہیے کہ میں کتنا بے قرار ہوں تمہیں اپنے ساتھ اپنے پاس رکھنے کے لیے۔ دینی

آوگی تو دیکھنا میں نے اپنے کمرے میں تمہاری کتنی تصویریں لگا رکھی ہیں۔“

”اُف اللہ! آپ کے دوست آتے ہوں گے تو کیا کہتے ہوں گے۔“

”کوئی نہیں آتا۔ دوستوں سے میں باہر کی دوستی رکھتا ہوں۔“

”نعیم بھائی اور نعیم تو اسی فلیٹ میں رہتے ہیں۔“

”ان سے کیا پردہ۔ انہوں نے تمہیں بھی دیکھ رکھا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میرے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے۔“

”کیسا ظلم؟“ نیسہ چونکی۔

”رقیب روسیہ نے تمہیں میرے پاس آنے کی مہلت ہی نہیں دی۔“

”رقیب روسیہ!“

”ولی عہد۔“

”بڑا ہو جائے گا تو بتایا کروں گی اسے کہ تمہارے ابا تمہاری پیدائش سے قبل ہی تمہارے حریف بن گئے تھے۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا پھر اپنا سر آگے جھکا کر نیسہ کی پیشانی سے اپنی پیشانی مس کرتے ہوئے بہت قریب سے اس

کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ”نسم سے مرا جا رہا ہوں وہ دن دیکھنے کے لیے جب...“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا

پھر اپنا سر سیدھا کرتے ہوئے نیسہ کو بدستور محبوبیت سے دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”بچے تو سبھی کو اچھے لگتے ہیں۔“ نیسہ دھیمی آواز میں بولی۔

”ڈاکٹر صاحبہ! مجھے دو نہیں ڈھیروں بچے چاہئیں۔“

نیسہ نے منہ پھاڑ کر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔



”ہاں، مجھے پوری ٹیم چاہیے بلکہ بارہواں کھلاڑی بھی۔“  
 ”او گاڈ! پھر تو آپ کو شیوخ کی طرح اپنے حرم میں دو چار خواتین رکھنی ہوں گی۔“  
 ”نو..... نو..... نو ڈارلنگ... خاتون ایک ہی کافی ہے۔“ اس نے نیسہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا ”مائی فرسٹ اینڈ لاسٹ لو۔“  
 ”پھر تو آپ کو دو بچوں پر ہی قناعت کرنی پڑے گی۔“  
 ”ارے صاحب ہم تو ایک پر بھی کرنے کو تیار ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

\*\*\*

ہنی مومن سے واپسی کے دوسرے ہی دن می نے لیلیٰ اور نعیم کی دعوت کر ڈالی۔ دولہا اور دلہن کے علاوہ مدعوئین میں اچھی بھابی، نعیم اور مسز ظہیر کے جملہ اہل خانہ شامل تھے۔ گواچھی بھابی کی ہمت ساتھ نہ دے رہی تھی مگر می نے اتنے اصرار اور محبت سے مدعو کیا کہ وہ آنے پر مجبور ہو گئیں۔  
 دعوت خاصی پُر تکلف تھی۔ منتہا نے دعوت کے انتظامات میں اپنی فطری مستعدی اور نفاست کا مظاہرہ کیا۔ مہمانوں کی آمد کے بعد اس نے می کو مہمان خواتین اور علیب کو مردوں کے ساتھ بٹھایا اور خود انتہائی مستعدی اور سرعت سے ان سب کی خاطر داری کی۔ اچھی بھابی جن کے آرام اور سہولت کا اس نے خاص خیال رکھا تمام وقت اسے پھر کی طرح کام کرتے اور ہمہ وقت انتہائی خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے موقع پاتے ہی مسز ظہیر سے کہا ”سنو! مجھے تو یہ لڑکی بڑی اچھی لگ رہی ہے۔“  
 مسز ظہیر مسکرا دیں اور بولیں ”اچھی بھابی اچھی تھی تبھی تو ہم نے آپ سے تذکرہ کیا تھا۔“  
 ”کہیں ہوئی اس کی بات؟“  
 ”جی نہیں ابھی تک تو نہیں ہوئی۔“  
 ”تو تم بات کر کے دیکھو۔ مجھے اپنے نعیم کے لیے ایسی ہی سمجھ دار لڑکی کی ضرورت ہے۔“  
 ”اصل میں..... ہم نے آپ کو بتایا تھا ناں یہ اپنی والدہ کی وجہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے وہ اکیلی رہ جائیں گی۔“

”ارے بھئی ماں آخر کتنے دن بیٹھی رہیں گی!“  
 ”یہ سمجھانے کی کوشش بارہا کی ہم نے۔“  
 ”پھر؟“

”بس وہی ایک جواب۔“

”اور ماں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔“

”نہیں ایسی بات نہیں۔ وہ بے چاری تو کافی فکر مند رہتی ہیں اس کی طرف سے بلکہ اس کی وجہ سے بھائی بھی شادی سے رکا ہوا ہے۔“

”ارے چھوڑو آج میں بات کر کے دیکھتی ہوں۔“

”آپ کی مرضی۔“ مسز ظہیر نے معاملہ کھلتا انہی پر چھوڑ دیا۔

اور اچھی بھابی نے باتوں باتوں میں می سے بات چھیڑ ڈالی۔ می کا اگر بس چلتا تو گھڑی کے عشرے میں ہاں کر ڈالتیں۔ نعیم کی صورت شکل، انھنا بیٹھنا، بول چال، گھربار، نوکری سب کچھ جانا بوجھا تھا پھر نیسہ نے سسرال میں اچھی بھابی اور ان کے دونوں بیٹوں کی تعریفیں سن کر می کو بتا رکھا تھا کہ اس کی سسرال میں نعیم اور نعیم کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس گھر سے گھر بیٹھے منتہا کے لیے رشتہ آجانا نعمتِ خداوندی نہیں تو اور کیا تھا! مگر منتہا ٹیڑھی کھیرنی ہوئی تھی سو

میں نے گول مول جواب دیا "میں بچوں سے بات کروں گی۔"  
 "دیکھیے لڑکی ہماری دیکھی بھالی ہے لڑکے کے بارے میں آپ جس طرح اپنا اطمینان کرنا چاہیں کر لیں، آپ کی  
 سہ ماہی یہاں بیٹھی ہیں، آپ کی بچی ان کے گھر میں ہے۔ انہیں قسم دے کر ان سے پوچھ لیجئے کہ ہمارے بچوں کو انہوں  
 نے کیا دیکھا کیا پایا ہے... کیوں بھی؟"

مسز ظہیر نے کمرے کی کھلی کھڑکی سے چھوٹے سے لاؤنج کی طرف دیکھا جہاں واحد میزبان مرد علیب اور مرد  
 مہمان کھانے کے بعد باتوں میں مصروف تھے پھر مہم کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "سچ پوچھئے تو ایسے لڑکے چراغ لے کر  
 ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ہمارے اپنے بیٹوں میں کوئی برائی ہو سکتی ہے لیکن اچھی بھالی کے بچوں میں نہیں اور نعیم  
 کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ خدا ایسی سعادت مند اولاد سب کو دے۔"

"آمین!" اچھی بھالی کی آواز فوراً جذبات سے گھٹ کر رہ گئی۔  
 "نعیم کو تو ہمارا پورا خاندان رشک سے دیکھتا ہے اور ہم تو نعیم کے ممنون احسان ہیں کہ ہمارے فرحان کو انہی کی  
 مہربانی سے دہی میں جاب ملی ورنہ یہاں روزگار اول تو مشکل سے ملتا ہے اور ملتا ہے تو پیسے اتنے کم ملتے ہیں کہ آدمی  
 سوچتا ہے کون سی ضرورت پوری کرے کے پس پشت ڈال دے۔"

"آپ گھر میں آج ہی بات کر لیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ نعیم کے جانے سے پہلے کوئی رسم ہو یا نہ ہو بات پکی  
 کر دی جائے۔" اچھی بھالی نے کہا۔

"اچھی بھالی کو اب نعیم کی شادی کی بہت جلدی ہے۔" مسز ظہیر بولیں۔  
 "تم جلدی کہتی ہو، میرا بس چلے تو... کیا بتاؤں تمہیں۔" اچھی بھالی نے بڑی دل گرفتگی سے کہا "موت کی دہلیز پر  
 جا کر شاید انہی بچوں کی وجہ سے واپس لوٹی ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار پہلے بھی نہیں تھا اور اس بیماری کے بعد تو سمجھو  
 بالکل ہی اعتبار نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں، اپنی آنکھوں کے سامنے نعیم کا گھر بھی آباد کر جاؤں۔" اچھی بھالی نے توقف  
 کیا پھر روئے سخن مہم کی جانب کرتے ہوئے بولیں "منتہا کو میں کافی عرصے سے ان کے گھر آتے جاتے دیکھ رہی ہوں۔  
 اب تو ماشاء اللہ آپ کی ایک بیٹی ان کی ہو بھی ہے۔ اصل میں ہم اس وقت بھی آپ کے ہاں نعیم میاں کا رشتہ لے کر  
 آنے والے تھے جب فرحان کے لیے آپ کی بچی کا سلسلہ چل رہا تھا مگر... شاید خدا کو اس وقت میری زبان سے یہ بات  
 کھلوانا منظور نہ تھا... نہسہ بھی، تم چپ چاپ بیٹھی کیا سن رہی ہو، نعیم کی بھالی ہو، تم بھی تو کچھ کہو۔"  
 نہسہ دھیرے سے مسکرائی اور بولی "کوشش کرتے ہیں اچھی ممالی باجی کو پکڑنے کی۔"  
 "پکڑنے کی!" اچھی بھالی نے حیرانی سے کہا "کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے ان کا گھیراؤ کرنا بڑے گا۔ آسانی سے تو وہ اب تک قابو میں نہیں آئی ہیں۔"  
 "دیر کس بات کی، جلدی کرو۔" اچھی بھالی نے پاس ہی بیٹھی مہم کے شانے پر ہاتھ دھرا اور بولیں "بدھ کی سیٹ  
 کروار کھی ہے نعیم نے لیکن اگر آپ لوگوں کی طرف سے مثبت جواب ملا تو میں نعیم کو زبردستی روک لوں گی۔ کہوں گی  
 چھٹی بڑھوالیں۔ بات پکی کرنے کے ساتھ کوئی رسم بھی کر ڈالیں گے۔ کیوں...؟ کیا خیال ہے؟" اچھی بھالی نے مسز  
 ظہیر سے رائے لینا چاہی۔

"بالکل ٹھیک اچھی بھالی!"

اور منتہا اس تمام گفتگو سے بے خبر کچن میں مہمانوں کے لیے کافی بنانے میں مصروف تھی۔ لیلی کچن کے  
 دروازے پر کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔

کھانا گھایا جا چکا تھا۔ کافی کے بعد مہمانوں نے جانے کی اجازت طلب کرنی تھی۔ مہم کو خیال آیا لیلی اور نعیم کے  
 لیے انہوں نے پھولدار لفافوں میں علیحدہ علیحدہ پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں رسم مشایعت کے وقت



لفافے ذہن سے نہ نکل جائیں، وہ دوسرے کمرے سے لفافے لانے کے لیے انھیں تو اچھی بھالی نے نیسہ سے کہا "تم منتہا سے ابھی بات کیوں نہیں کر لیتیں؟"

نیسہ نے مسز ظہیر کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیں اور بولیں "اچھی بھالی کو اس بار بہت ہی جلدی ہے۔" "بھئی بات یہ ہے، نعیم گئے تو سال چھ مہینے سے پہلے تو ان کی واپسی ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ نہ کرے پھر کوئی ایسی بات ہو جائے جیسے اب کی بار میری بیماری کی وجہ سے انہیں جلدی آنا پڑ گیا۔" "خدا نہ کرے... اللہ میاں آپ کو صحت مندر رکھے۔" مسز ظہیر نے کہا۔ "انسان کو اچھی بُری ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" اچھی بھالی بولیں۔ "جی... وہ تو خیر آپ ٹھیک ہوتی ہیں لیکن ہمارا خیال ہے نیسہ بعد میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر بات کریں منتہا سے تو اچھا ہے۔"

"بھئی یہ تو ابھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی نکل لیں گی گھر جانے کو بات کل پرسوں پر ٹل جائے گی۔ نعیم اگر واپس جانہ رہے ہوتے تو ہمیں اتنی جلدی نہ ہوتی مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ جارہے ہیں۔" "آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم نیسہ کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ یہ اور فرحان بعد میں آجائیں گے۔" "خدا تمہیں خوش رکھے۔"

"امی جان! آپ خود جو بات کر لیں باجی سے۔ آپ کا تو وہ بہت احترام کرتی ہیں۔" نیسہ نے کہا۔ "ارے ہاں، بھئی تم خود ہی کیوں نہیں بات کر لیتیں۔" اچھی بھالی نے مسز ظہیر سے کہا۔ "ہمیں بات کرنے میں کوئی اعتراض نہیں... کیے لیتے ہیں... کہاں ہیں منتہا۔" "جی... حاضر ہوں۔" منتہا کی آواز نے ان تینوں کو چونکا دیا۔ وہ کافی کی ٹرے دونوں ہاتھوں سے پکڑے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ لیلیٰ اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"آج تو تم تھک گئی ہو گی؟" اچھی بھالی نے منتہا سے کہا۔ "قطعاً نہیں۔" منتہا مسکرائی۔ "اچھی بھالی یہ اسٹیل کی بنی ہوئی ہیں۔" مسز ظہیر نے مسکراتے ہوئے منتہا کو دیکھا۔ "اور اسٹیل بھی اچھی ممانی اسٹین لیس!" لیلیٰ نے گرہ لگائی پھر لمحے بھر کے توقف سے بولی "ہم نے تو مس منتہا کو ہمیشہ تازہ دم اور پُر سکون ہی دیکھا ہے۔" "تم نے پھر انہیں مس منتہا کہا۔" مسز ظہیر نے لیلیٰ کو ٹوکا۔ "اف امی! برسوں کی عادت مہینوں میں تھوڑی جاتی ہے۔ ویسے بھی ہمیں مس منتہا کو مس منتہا کہنا ہی زیادہ اچھا لگتا ہے۔" لیلیٰ بولی۔

ممی اپنے ہاتھ میں دو لفافے لیے کمرے میں داخل ہوئیں اور اب سب کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ "یہ تمہارے لیے بہت دعاؤں کے ساتھ۔" انہوں نے ایک لفافہ لیلیٰ کو دیا۔ "آئی! اس کی کیا ضرورت تھی؟" "بیٹا! یہ ضرورت نہیں، رسم ہے۔ خدا تمہیں بہت خوشیاں دے۔" ممی نے لیلیٰ کی پیشانی چومی۔ "آمین!" اچھی بھالی انتہائی خشوع و خضوع سے بولیں۔ "یہ تمہارے دولہا کے لیے۔" ممی نے دوسرے لفافے کی بابت لیلیٰ سے کہا اور ایک لمحے کو لفافہ اس کی طرف بڑھایا پھر بولیں "چلو میں خود ہی دے آتی ہوں۔ منتہا بچے مرانے میں کافی سب کو دے دی؟" "جی والدہ!"

مئی نعیم کی طرف چلی گئیں۔  
 اچھی بھالی نے مسز ظہیر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیا کہ منتہا سے بات کریں۔  
 ”منتہا، ہمیں ایک گلاس پانی چاہیے۔“ مسز ظہیر نے اٹھنے کو بہانہ تراشا۔  
 ”آپ بیٹھے، میں لاتی ہوں۔“ انہیں اٹھتے دیکھ کر منتہا نے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں، ہمارا انا گھر ہے بھی!“ مسز ظہیر اس کے ساتھ ساتھ کمرے سے نکل آئیں۔  
 اچھی بھالی نے معنی خیز مسکراہٹ سے نیہہ کو دیکھا۔  
 ”کوئی خاص بات ممانی جان؟“ لیلیٰ چونکی۔  
 ”ہاں۔“  
 ”کیا ہوا؟“

”تمہاری امی منتہا سے خاص بات کرنے کو اٹھی ہیں۔“  
 ”کون سی بات؟“ لیلیٰ چونکی ہو کر بولی۔  
 ”نعیم کے رشتے کی۔“ اچھی بھالی نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔  
 ”اوہ!“ لیلیٰ مسکرا دی ”ممانی جان اگر ایسا ہو جائے تو دونوں کی آئیڈیل جوڑی ہوگی۔ بھالی جان اٹھئے نا، ہم لوگ بھی چلتے ہیں نعیم بھالی کی وکالت کرنے کو۔“  
 ”نہیں نہیں... پہلے اپنی امی کو بات کر لینے دو۔“ اچھی بھالی نے کہا۔  
 ”چلے جیسے آپ کی مرضی۔“

منتہا نے عرق کیوڑہ ملے پانی کی بوتل سے پانی شیشے کے شفاف گلاس میں انڈیلا اور مسز ظہیر کی جانب بڑھا دیا۔  
 ”پانی پینے کے لیے اٹھنا تو محض بہانہ تھا۔“ مسز ظہیر نے گہری مسکراہٹ سے منتہا کو دیکھا۔  
 ”جی!“ وہ چونکی ”میں سمجھی نہیں۔“

مسز ظہیر نے پانی کا گلاس فریج کے اوپر رکھتے ہوئے کہا ”پاس نہیں ہے ہمیں اس لیے ایک آدھ گھونٹ بھر کر پورا گلاس ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ پانی پینے کے لیے اٹھنا تو تم سے ایک ضروری بات کرنے کا بہانہ تھا۔“  
 وہ چونک کر استفہامیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ مسز ظہیر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”تمہاری اور ہماری دوستی اگر خطرے میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہو تو ہم تم سے ایک بات کریں؟“

”جی!“ وہ انہیں الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”نعیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

اس نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

مسز ظہیر نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھرا اور دھیمی آواز میں بولیں ”اچھی بھالی نے تمہاری والدہ سے بات کی ہے مگر بات کو آگے بڑھانے کے لیے تمہاری رضادر کار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ایک بار انکار کر چکی ہو لیکن ہم پھر بھی تم سے بات کر رہے ہیں، جانتی ہو کیوں؟“  
 منتہا نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ اتنی اچھی کہ اگر ہمارا فرحان سے بڑا کوئی اور بیٹا ہوتا تو ہم آپ کو زبردستی اپنے ہی گھر لے جاتے۔“ دفعتاً مسز ظہیر کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھری ”خیر یہ بھی اچھا ہی ہوا اور نہ اپنے بیٹے کے لیے تو ہم آپ کا انکار سننے کے بعد آپ کو اغوا کرالینے سے بھی دریغ نہ کرتے اور گن پوائنٹ پر آپ سے ہاں



کرواتے۔“

منتہا مسکرائے بنانہ رہ سکی۔

”خیر یہ تو مذاق تھا۔“ مسز ظہیر دوبارہ سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولیں ”منتہا“ لڑکیوں کی شادی کا ایک وقت، ایک عمر ہوتی ہے اور یہ وقت جب ایک بار گزر جائے تو پلٹ کر نہیں آتا بلکہ پیچھتاوا بن جاتا ہے۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے اتنی خوبیاں دی ہیں کہ جب تم یہ خوبیاں اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرو گی تو ایک آئیڈیل فیملی وجود میں آئے گی۔ اس دنیا کو اچھی ماؤں اور ان کے ہاتھوں میں پرورش پانے والے اچھے انسانوں کی اشد ضرورت ہے۔“

منتہا چپ چاپ سنتی رہی۔

”نعیم کا اور تمہارا جوڑ جیج ایک آئیڈیل جوڑ ہو گا۔ زندگی میں جدوجہد تم دونوں ہی نے کی ہے۔ مشکلات سہی ہیں۔ راحت کی قدر جانتے ہو۔ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکو گے۔ اور انسان وہی اچھا جو خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر گزاری ظاہر کرے۔“

وہ بدستور چپ رہی۔

”منتہا!“

”جی!“

”کیا کہتی ہو؟“

”کس سلسلے میں؟“

”بہت خوب! تمہارا وہی حساب ہوا کہ پوری رات داستان سنی، صبح پوچھنے لگے زلیخا عورت تھی یا مرد۔ ارے بھئی، ہم جو اتنی دیر سے تمہارے کان کھا رہے ہیں۔ تمہارے انکار کو اقرار میں بدلوانے کی کوششوں میں اپنی تمام تر فراست اور ذخیرہ الفاظ کو بروئے کار لانے میں ہانپ چلے ہیں، اس کا کچھ اثر ہوا کہ نہیں؟“

وہ پھر چپ رہی۔

”بولو بھئی... بتاؤ نا۔“

اس نے مسز ظہیر کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی ”کیا بتاؤں مسز ظہیر!“

”نعیم سے تمہاری بات چلے تو انکار تو نہیں کرو گی؟“

منتہا خود کو ایک شدید اضطراب و اضطراب سے دوچار محسوس کرنے لگی۔

”اچھا نہیں کریں گی آپ نہ اپنے ساتھ نہ اپنی والدہ کے ساتھ۔“

اس کے لبوں کے گوشے لرزنے لگے۔

”جو... جو... والدہ کی مرضی ہو... کریں۔“

مسز ظہیر نے چونک کر اسے دیکھا اور بولیں ”گویا آپ... آپ راضی ہیں؟“

اس نے مسز ظہیر کو دیکھا پھر سر جھکا کر شکست خوردہ لہجے میں بولی ”میں سرنڈر نہیں کرنا چاہتی تھی مگر والدہ اور

علیب نے مجھے مجبور کر دیا۔“

”بھئی واہ! علیب میاں زندہ باد!“ مسز ظہیر نے خوش ہو کر کہا۔

\*\*\*

اچھی بھالی کو جو جلدی تھی سو تھی، مسز ظہیر نے بات چیت طے کرانے میں بے مثال کارکردگی دکھائی۔ دعوت والی شب وہ جملہ معاملات طے کرا کے ہی انھیں۔

طے پایا کہ نعیم کو اپنی دینی واپسی میں تین دن تاخیر کرنا ہوگی۔ بات چیت طے پانے کے دو دن بعد منگنی کی رسم

انجام پائے گی جو وقت کی کمی کے باعث دونوں گھرانوں کی مشترکہ تقریب ہوگی۔ شادی نعیم کی اگلی مرتبہ چھٹی پر وطن آنے کے بعد ہوگی۔

نعیم، نعیم اور مسز ظہیر کے گھر والوں نے مل جل کر منگنی کی تقریب کے وہ انتظامات کیے کہ شادی کا سماں پیدا کر دیا۔ مہربان کو بھی ان انتظامات میں پیش پیش رکھا گیا مگر اخراجات کا کوئی بار ڈالے بغیر۔ مہربان کے ایمان پر مہربان نے اس سلسلے میں معاونت کرنی بھی چاہی تو نعیم نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ روک دیا۔

منگنی کے بعد اگلے روز مہربان نے اچھی بھابی اور مسز ظہیر کے گھر والوں کو ایک ہوٹل میں کھانے پر مدعو کیا۔ مہربان کی مسرت دیدنی تھی۔ منہتا اور نعیم کی جوڑی بہت شاندار لگ رہی تھی۔ اچھی بھابی بار بار آیات و وظائف پڑھ پڑھ کر دونوں پر پھونکتی رہیں۔ مہربان کا دل خدا کے حضور سجدہ ریز ہوا جاتا تھا۔ جانے کون سی نیکی تھی ان کی جس کے انعام میں اللہ نے ان دونوں بیٹیوں کو ایسے اچھے گھر دلوا دیے تھے۔

ہوٹل میں مسز ظہیر نے منہتا اور نعیم کو دانستہ ایک علیحدہ میز پر بٹھوایا اور کھانے کے بعد کچھ دیر ان دونوں کو ہوٹل کے سبزہ زار پر چل قدمی اور بات چیت کا موقع بھی فراہم کر دیا۔

منہتا اپنی جذباتی کیفیت پر حیران تھی۔ اس کا دل بڑی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ تنہائی میسر آنے پر جب نعیم نے اس کا ہاتھ دھیرے سے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”تھینک یو منہتا!“ اس نے دھیرے سے کہا ”میں اپنی پھوپھی جان سے پیار بھی کرتا ہوں اور ان کی عزت بھی بہت کرتا ہوں۔ والدہ کے بعد وہ میرے لیے دوسری قابل احترام خاتون ہیں۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ میں اس لڑکی سے نسبت جوڑ رہا ہوں جسے وہ انتہا سے زیادہ پسند کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے منہتا کہ آپ کا انتخاب ہمارے گھر اور فیملی کے لیے خوشی اور سکون کا باعث ہوگا۔ تھینک یو... تھینک یو دیری مچ منہتا کہ آپ نے میرے لیے ہاں کر دی۔“

اس کا ہاتھ نعیم کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ہمراہ دھیرے دھیرے نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے وہ خود کو بہت معتبر بہت موقر محسوس کر رہی تھی۔ مسرت انگیز لمحوں کے بیچ نہ جانے کہاں سے اچانک اسکول کا خیال اس کے دل میں در آیا۔

منگنی کی تقریب میں اس نے اسکول سے فضا کے سوا کسی کو مدعو نہیں کیا تھا۔ صبح جب وہ منگنی کی منگنی کے ساتھ اسکول پہنچی تو ساتھیوں کی طرف سے مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ کلاسوں میں گئی تو لڑکے اسے شرمائی شرمائی نظروں سے دیکھا کیے۔

فاروقی صاحب نے کہا ”آئی ایم سوہیسی مس منہتا کہ کل جب آپ نئے اسکول میں جوائننگ دینے جا رہی ہیں تو آپ کی ایک بہت بڑی ذاتی مسرت بھی آپ کے ہم رکاب ہے... آئی ویش یو آل دی بیسٹ!“

”تھینک یو سر!“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”مے... میرے اسکول... میری جاب کا کیا ہوگا؟“ اس نے ہوٹل کے سبزہ زار پر نعیم کے ہمراہ چل قدمی کرتے ہوئے پوچھا۔

ایسے مدہوش کن لمحوں میں جب انسان کا خود اپنے آپ کو بھی بھول جانے کو جی چاہے اسے اسکول کا یاد آجانا بظاہر بڑی عجیب سی بات تھی!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکم کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکم تو دکم ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امانڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھربڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گزرے اور یقین سے بندھے رشتوں کے چاکلے سہاروں کی دل گداز داستان

ناہید سلطانہ اختر

قسط نمبر 13









نعیم نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں نے سنا ہے آپ اپنی فیملی کو وہیں دہلی میں اکٹھے رکھنا چاہتے ہیں۔“ اس نے قدرے ہنچکے ہوئے کہا۔  
وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”جی ہاں.... چاہتا تو یہی ہوں بشرطیکہ امی جان راضی ہوئیں۔“

منتہا کا دل اس خیال سے ڈوبنے لگا کہ اسے مئی کو چھوڑ کر دور جانا پڑے گا۔

”اور اگر وہ راضی نہ ہوئیں تو؟“

”تو ہم دونوں بھائی اپنی بیویوں کو باری باری ان کے پاس چھوڑا کریں گے۔ جب آپ وہاں ہوں گی تو لیلیٰ  
یہاں اور جب لیلیٰ وہاں ہوں گی تو آپ یہاں امی جان کے پاس.... سوری، آپ کی بات تو درمیان ہی میں رہ گئی۔“  
”کون سی بات؟“

”آپ اپنے اسکول، اپنی جاب کا کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”جی.... وہ.... اگر.... وہاں رہنا پڑا تو.... میری جاب کا کیا بنے گا؟“

”ظاہر ہے چھوڑنی پڑے گی۔“ نعیم نے بڑے اطمینان سے کہا۔

منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا؟“

”میں.... میں جاب نہیں چھوڑنا چاہتی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”لیکن مستقل وہاں یا کبھی یہاں کبھی وہاں رہنے کی صورت میں آپ جاری بھی تو نہ رکھ سکیں گی۔ میرا خیال ہے  
بار بار چھٹی ملنا تو مشکل ہوتا ہو گا۔“

”جی.... ہوتا تو ہے۔“

”بلاوجہ مشکل میں رہنے سے فائدہ!“

”جس کام سے آدمی کو عشق ہو اس کی خاطر مشکل میں رہنے میں بھی مزہ آتا ہے۔“

وہ چلتے چلتے تھم گیا اور ٹمکنی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

”منتہا نے جینپ کر نظریں چرائیں۔“

”اتنا عشق ہے آپ کو اپنی جاب سے!“

”آئی لو!ٹ۔“

”آں ہاں۔“ اس نے پل دوپل کو توقف کیا پھر بولا ”زندگی میں ہماری ترجیحات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی  
جاتی ہیں۔ جو چیز آج ہمارے لیے انتہائی اہم ہوتی ہے آنے والی کل قطعاً غیر اہم بن جاتی ہے۔ آپ کی جاب بقول  
آپ کے آپ کا عشق ہے، ہو سکتا ہے آنے والی کل آپ کے لیے غیر اہم قرار پا جائے اور آپ کا گھر آپ کی تمام تر  
توجہ کا مرکز بن جائے۔“

منتہا کو اپنی شادی شدہ کو لیکز کے جملے یاد آنے لگے۔

”اؤ خدا! یہ مرد! ان سے کوئی نہیں جیت سکتا بابا۔ ہزار منطقیں ہوتی ہیں ان کے پاس عورت کو چپ کرانے کے  
لیے۔“

”ہماری نوکریاں! ارے کب خاطر میں لاتے ہیں یہ مرد۔“

”عورت سے جاب کروانا چاہیں تو جبر و تشدد سے بھی گریز نہیں کریں گے اور اگر نہ کروانا چاہیں تو ایک لفظ نہیں

نہیں گے۔ بس فیصلہ ہے نہیں کرو گی نوکری۔“

تو یہ وقت گویا اس پر بھی آپڑا تھا۔

”ابھی تو وہ بڑے نکل اور اطمینان سے بات کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ابھی صرف منگنی ہی ہوئی تھی۔ کیا عجب شادی ہونے کے بعد وہ بھی اس کی شادی شدہ گولنگز کے شوہروں کے لیے بات کرنے لگتا۔“

”بہر حال ترجیحات آپ خود ہی مقرر کریں گی۔ میری جانب سے کوئی ڈکٹیشن نہیں ملے گی آپ کو۔ جو فیصلہ کریں گی آپ خود ہی کریں گی۔ میری آپ سے صرف ایک ہی ڈیمانڈ ہوگی اور وہ ہے امی جان کو خوش رکھنا۔ اس کے عوض آپ کو میری جانب سے ہر معاملے میں احترام بھی ملے گا تعاون بھی۔“ اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور لہجے میں ٹھنڈک تھی۔

منتہا کے دل کو تشلیک و تذبذب نے آگھیرا۔

یہ ٹھہراؤ اور ٹھنڈک عارضی تھی یا دیریا!

اسے اپنے ان کے سوال کا جواب نعیم کی آنکھوں سے ملا۔

”شاپنگ میں وہیں کروں گا.... خود.... کوئی خاص فرمائش ہو تو بتا دیجئے گا۔“

منتہا نے اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔

”ارے نہیں.... آپ ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ مجھے کیا خاک شاپنگ کرنا آتی ہوگی.... یقین کیجئے میری چوائس بہت اچھی ہے۔ وہ دوست جن کی تمہیلز ان کے ساتھ نہیں ہیں چھٹی پر جانے لگتے ہیں تو اپنے گھر کی خواتین کے لیے خریداری کرنے کو مجھے ساتھ لے جاتے ہیں۔“ اس نے بڑے مزے سے بتایا۔

”میں نے دیکھا ہے چوائس تو فرحان کی بھی بہت اچھی ہے۔ نیہ کے لیے جب بھی بھجوائی عمدہ ہی چیز بھجوائی۔“

”مجھے داد دیجئے۔ نیہ بھابی اور گھر کے باقی لوگوں کے لیے فرحان کی شاپنگ میرے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔“

”ریلی!“

”جناب!“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ دھر کر سر کو قدرے جھکاتے ہوئے نیاز مندانہ انداز میں بولا۔

”نیہ بتاتی ہے فرحان کی آپ سے بہت انڈراشینڈنگ ہے۔“

”بہت.... کزنز ہونے کے ناتے انڈراشینڈنگ تو پہلے بھی تھی لیکن جب سے ہم دبئی میں یکجا ہوئے ہیں تب سے تو کچھ زیادہ ہی دوستی ہو گئی ہے ہم دونوں میں اور اب مزید بڑھ جائے گی۔“ آخری فقرہ اس نے منتہا کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ادا کیا۔

”سنا ہے ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں آپ لوگ۔“

”جی ہاں.... لیکن اب دلا لینا پڑے گا۔ تمہیلز کے ساتھ ایک فلیٹ میں گزارہ ممکن نہ ہوگا۔ بے چارہ فرحان تو

موجودہ فلیٹ سے سخت تنگ آیا ہوا ہے۔“

”کیوں؟“ منتہا نے چونک کر پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”نیہ بھابی کے وہاں آنے کے انتظار میں دن گن گن کر گزار رہا ہے۔ جب شام ہوتی ہے تو ہم ہنس کر پوچھتے ہیں ہاں بھی فرحان صاحب کہنے کیا حال چال ہے؟ منہ لٹکا کر کہتا ہے میں تو شادی کے بعد بھی پیچلرز ہاسٹل میں رہ رہا ہوں۔“

”تو کیا فرحان ہاسٹل میں رہتے ہیں؟“

”فلیٹ کو بیزاری سے ہاسٹل کہتا ہے وہ۔“

”آئی سی۔“



”خدا اس کی مشکل آسان کرے۔“

”بس تھوڑے سے دنوں کی بات ہے۔“

”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“

”جی۔“

”آپ.... منگنی سے خوش ہیں؟“

”بہت مشکل ہے اس سوال کا جواب دینا۔“

”کیوں؟“

”میری والدہ میری زندگی کی پہلی ترجیح رہی ہیں۔ انہیں چھوڑنا ایک بہت کڑی منزل ہوگی میرے لیے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر کہا ”پھوپھی جان نے بتایا تھا مجھے۔“

”کیا؟“ وہ چونکی۔

”یہی کہ آپ اپنی والدہ سے بہت محبت کرتی ہیں، انہی کی وجہ سے.... شادی سے بھی انکار کرتی رہی ہیں۔“

”اے محبت نہ کہئے.... مجھے ان سے عشق ہے۔“

”اپنی ماؤں سے عشق تو شاید ہم سبھی کو ہوتا ہے۔“

”شاید!“ وہ دھیرے سے بولی ”اور آپ مرد حضرات اس اعتبار سے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ جب تک آپ خود

نہ چھوڑنا چاہیں اپنی ماؤں کو، دوسرا کوئی شخص آپ کو ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا جبکہ ہمیں بادل نا خواستہ ایسا کرنے

پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اگر میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں والدہ کو کبھی نہ چھوڑتی۔“

”آپ دلگیر نہ ہوں آپ کی والدہ میرے لیے بھی ماں کا درجہ رکھتی ہیں اور اس ناتے وہ ہمارے ساتھ بھی تورہ

سکتی ہیں۔“

منتہا نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے آہستگی سے منتہا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور منتہا کا دل بے اوسان ہو گیا۔

”ہاں!“ اس کی محبت بھری نگاہیں منتہا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

\*\*\*

اگلی صبح اسے جو نیر پبلک اسکول نمبر چار میں یہ حیثیت آفیشینگ پر نپل جو اننگ دینا تھی۔ اسکول کی سابق پر نپل کچھ عرصہ قبل ملازمت سے سبکدوش ہو چکی تھیں۔ ان کے بعد سے اسکول کا انتظام وانصرام اسکول کی سینئر موٹ نیچر مسز غزالہ ناصر کے ہاتھوں میں تھا۔ منتہا کو انہی سے چارج لینا تھا۔ دو روز قبل جب ڈپٹی ڈائریکٹر نظامت تعلیمات اس کے سابقہ اسکول میں زیر تعمیر سماعت گاہ کا جائزہ لینے کے لیے آئے تو انہوں نے اسے فاروقی صاحب کے دفتر میں بطور خاص بلوا کر اس سے کہا ”بی بی! آپ جس اسکول میں جا رہی ہیں، وہاں آپ کو یوں تو بہت سے مسائل کا سامنا ہو گا لیکن دو ایسے مسائل جنہیں فوری بنیادوں پر توجہ دینا ہوگی صفائی ستھرائی اور نظم و ضبط ہیں۔ اسکول قلب شہر میں واقع ہے۔ ارد گرد زیادہ تر بڑھے لکھے لوگوں کی آبادی ہے۔ اسکول بہت بڑا ہے۔ بلڈنگ بہت کشادہ، گراؤنڈ وسیع و عریض مگر اس ادارے کی بد قسمتی کہ اسے اپنے قیام سے اب تک تقریباً چھ بیس سال کے عرصے میں ماسوا ایک دو سربراہان کے سبھی بس وقت کو دھکا دینے والے ملے، جنہوں نے خلوص دل سے اس کے لیے کام کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ نظامت کو یقین ہے کہ اگر یہ ادارہ کسی فعال اور مخلص سربراہ کے ہاتھوں میں چلا جائے تو اس کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہے اور اس کے ابتدائی دور کا مسز راشدہ یعقوب والا دور واپس آ سکتا ہے۔ ان دنوں شہر کے بارسوخ طبقے کے لوگ اپنے بچوں کو اس ادارے میں تعلیم دلوانا اپنے لیے اعزاز کی بات جانتے تھے مگر اب یہ حال ہے کہ اسکول کے

قرب وجوار میں رہنے والے متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے لوگ بھی اپنے بچوں کو یہاں داخل کرانا پسند نہیں کرتے۔ بے چارے غریب، مجبور اور محدود وسائل والے لوگ ہی اپنے بچوں کو یہاں داخل کراتے ہیں حالانکہ اس کا محل وقوع، کشادگی اور عمارت اسے ایک عمدہ درگاہ بنانے میں اہم کردار رکھتے ہیں۔ نظامت کی خواہش ہے کہ یہ ادارہ پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ آپ کمیشن سے منتخب ہو کر آئی ہیں۔ آپ کے موجودہ ادارے میں آپ کی ریپوزیشن بڑی اطمینان بخش ہے۔ خدا کرے، آپ اپنے نئے اسکول کی ترقی کے لیے مناسب اقدامات کر سکیں۔

”میں پوری کوشش کروں گی سر!“ اس نے کہا۔

”دی وٹس یو آل دی بیسٹ۔“

”تھینک یو سر!“

”اسکول کی بہتری کے لیے کئے جانے والے اقدامات میں ڈائریکٹریٹ آپ کو ہر قسم کی مدد دینے کے لیے تیار ہوگا۔“

”تھینک یو ڈیری چیئر۔“

”سر! کام کرنے کی امنگ رکھنے والوں کو افسرانِ بالا کا یہی تعاون ناقابلِ بیان تقویت فراہم کرتا ہے۔“ فاروقی صاحب نے شش انگیزی میں کہا۔

”اوکے مس منتھا! ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نئے چیلنجز سے کیوں کر عمدہ برآہوتی ہیں۔“

اسکول کے معروف محل وقوع نے منتھا کو بغیر کسی دشواری کے وہاں تک پہنچنے میں مدد دی۔ پہلا دن تھا۔ اس نے کسی دشواری سے بچنے کے لیے ٹیکسی لے لینے کو ترجیح دی تھی۔ ویسے بھی گزشتہ رات ہوٹل سے ایک بجے کے لگ بھگ واپسی ہوئی تھی۔ سوتے سوتے ڈیڑھ بج گیا۔ صبح وہ گھر سے نکلنے لگی تو می نے کہا ”دیر سے جاتیں تو ملیں تمہیں چھوڑ دیتا۔“

”کوئی بات نہیں والدہ میں چلی جاؤں گی۔“

”پہلا دن تھا دیر سے بھی چلی جاتیں تو کیا تھا، بھائی آرام سے پہنچا رہتا۔“

”نہیں، والدہ پہلے دن ہی تو وقت پر پہنچنا ضروری ہے تاکہ روزانہ وقت پر پہنچنے کی بنیاد پڑ جائے۔“

”نئی جگہ ہے، اسکول ڈھونڈنے میں دشواری ہوئی تو؟“

”نہیں ہوگی۔ بڑا مشہور و معروف علاقہ ہے۔“

”اچھا۔“ می نے نیم دلی سے کہا ”جاؤ اللہ کی امان میں.... رات کی تھکی ہوئی ہو، ٹیکسی لے لینا۔“

مین گیٹ پر ٹیکسی رکوانے کے بعد اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی سے اتر گئی۔ جوق در جوق اسکول پہنچتے بچوں اور ان کے ہمراہ آنے والے والدین اور سرپرستوں نے اسے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اس نے ایک طائرانہ نظراپنے پیش منظر پر ڈالی۔

اسکول کا مین گیٹ چوٹ کھلا ہوا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار نما کسی انسان کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ ہزاروں گز لمبی باؤنڈری وال کی حدود میں علیحدہ علیحدہ دو وسیع و عریض اور بلند وبالا عمارت اس کے پیش نظر تھیں۔ چوٹ کھلے میں گیٹ سے اسکول کے اندر کا منظر بھی کچھ دور تک واضح تھا۔ بے رنگ دروغن باؤنڈری وال میں جا بجا شگاف اور دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ باؤنڈری وال کی حدود میں واقع دونوں عمارت کا بیرونی نقشہ ”گھوسٹ ہاؤسز“ کی تفسیر پیش کر رہا تھا۔ مین گیٹ کے بائیں پہاؤ میں نصب احاطے کی دیوار کے بیرونی رخ پر واقع پختہ تختہ سیاہ پر چاک سے ان گنت آڑی ترچھی لکیروں کے ہجوم میں درج تھا ”یہ پاگل خانہ ہے۔“ منتھا کو اس جملے سے سخت خفت محسوس ہوئی۔

اسکول کے نزدیک سے گزرنے والے ہر شخص کو دعوتِ نظارہ دیتے چوٹ کھلے گیٹ سے جوق در جوق اندر داخل



ہونے والے طلبہ میں نو عمر بچے اور بچیاں ہی نہیں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں جو یقیناً ہائی اسکول کی طالبات تھیں۔ منتہا کی معلومات کے مطابق ہائی اسکول بھی اسی احاطے میں واقع تھا۔ اسکول گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ایک نیا منظر کچھ اس طرح سامنے آیا جیسے کسی الہم میں چپاں ایک تصویر کو دیکھ کر ورق الٹ دیا جائے۔

بچے گراؤنڈ میں بھاگتے دوڑتے، چیختے چلاتے پھر رہے تھے۔ دونوں عمارتوں میں سے ایک کے برآمدوں میں بھی کچھ یہی منظر تھا۔ دوسری عمارت میں البتہ حالات قدرے بہتر نظر آتے تھے۔ دو منزلہ اس عمارت کے برآمدوں میں مجو حرکت نوجوان بچیاں اس امر کی غماز تھیں کہ مذکورہ عمارت ہائی اسکول کی عمارت تھی۔ بھاگتے دوڑتے اور چیختے چلاتے بچوں سے زیادہ شور اسکول کے احاطے میں جا بجا استاد سفیدے، سرو، شیشم اور توت کے گھنے اور اونچے درختوں پر نوع پرندوں نے مچا رکھا تھا۔ ان پرندوں میں کوؤں کی آوازیں سب سے اونچی تھیں۔

اسکول گراؤنڈ بہت بڑی مگر بہت گندی تھی۔ جا بجا پولی تھیں کی رنگ برنگی اور گندی سندی تھیلیاں اور رنگے رنگے ریپرز۔ گراؤنڈ میں پانی کی ایک بہت بڑی پختہ فٹکی تھی جس کے چار اطراف ٹوئیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس فٹکی کے نزدیک زیر زمین ایک حوض نما پختہ کوڑا دان تھا جس میں سے کوڑا کرکٹ ابلے پڑ رہا تھا۔ اس حوض نما کوڑے دان سے ذرا ہٹ کر خاردار آہنی تاروں کی باڑھ کھینچی ہوئی تھی اور اس باڑھ کے درمیان ایک سرسبز یاغیچہ لہلہا رہا تھا۔ پانی کی فٹکی، اس کے چار اطراف کالی زدہ نالیاں، حوض نما کوڑے دان اور اس سے ابلتا کوڑا، گراؤنڈ میں جا بجا پڑی پولی تھیں کی تھیلیاں اور ریپرز اور سرسبز یاغیچے میں لہلہاتے پودے اور پھل پھول ایک ایسا مالا جلا منظر تھا جسے دیکھ کر تضاد کے معنی سمجھ میں آتے تھے۔

منتہا نے آثار و شواہد سے پرائمری اسکول نظر آتی عمارت کا رخ کیا۔ اس عمارت کے سامنے درختوں کے ایک بے ہنگم جھنڈ تلے چھوٹے بڑے بے شمار گلے جن میں سے بعض مٹی کے اور بعض سینٹ کے بنے ہوئے تھے، بڑی بے ترتیب، اجاڑ اور ابتری حالت میں رکھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے عرصے سے ان کی خبر گیری نہ کی ہو۔ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر منتہا برآمدے میں جا پہنچی اور ٹھنک کر طائرانہ نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ چند کمروں کے دروازوں پر چوبی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔

پرنسپل۔

آفس۔

اسٹاف روم۔

پرنسپل کے کمرے کے باہر ایک کرسی پر درمیانی عمر کا ایک شخص کلف دار کڑی شلوار میں ملبوس اور مانگ پٹی کے ٹانگ پر ٹانگ دھرے انتہائی لاابالی سے انداز میں بیٹھا تھا۔ منتہا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔

”کھنٹی نہیں بجے گی؟“ اس نے کرسی پر بیٹھے آدمی سے پوچھا۔

اس نے نگاہ اٹھا کر اسے انتہائی نخوت سے دیکھا جیسے اس کی یہ دخل اندازی ایک آنکھ نہ بھائی ہو پھر پہلو بدل کر دونوں ہاتھ اک اداے خاص سے سینے پر باندھتے ہوئے بولا ”بج جائے گی، جلدی کیا ہے؟“

”جلدی کیا ہے!“

منتہا کو اس کے جواب پر اچنبھا ہوا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“  
 وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا پھر بولا ”یہ وہ اقبال ہے جو ہمیشہ وقت سے پہلے آتا ہے۔ ناچیز کو محمد اقبال کہتے ہیں۔“  
 ”پرنسپل صاحبہ تشریف رکھتی ہیں؟“  
 وہ پھر مسکرا دیا۔

”ابھی کہاں جی... نوبے تشریف رکھیں گی، آپ کو ان سے ملنا ہے تو اندر کمرے میں تشریف رکھیں۔ دو تین پرمانٹ لوگ اور بھی بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو بھی اخبار کا کوئی ٹکڑا پڑھنے کے لیے مل جائے۔“  
 ”پرمانٹ لوگ!“ منتہا نے اس کا یہ فقرہ سوا لیہ لہجے میں دہرایا۔  
 ”ہاں جی... اپنے بچوں کو اسکول چھوڑ کر انہوں نے اپنے کاموں پر جانا ہوتا ہے۔ یہاں اخبار پڑھ کر پھر جاتے ہیں۔“

منتہا آگے بڑھی اور اس نے پرنسپل کے کمرے میں جھانکا۔ واقعی وہاں تین افراد اپنے اپنے منہ سے اخبار لگائے بیٹھے تھے۔

”وہ کمرہ جس کے دروازے پر ”آفس“ کی تختی لگی تھی، مقفل پڑا تھا۔“

”آفس اسٹاف بھی نہیں آیا ابھی تک؟“

”بابو ساڑھے آٹھ تک آتے ہیں۔“

”اور ٹیچرز؟“

”کچھ آگئی ہیں، جو نہیں آئیں وہ آجائیں گی“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”گیٹ پر چوکیدار بھی نہیں ہے۔“

”اپنے حجرے میں ہو گا۔“

”حجرے میں؟“

”اپنے کوارٹر میں جی... ویسے آپ کو پرنسپل سے کام کیا ہے؟“ اس نے منتہا کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، بھاری تن و توش کی ایک عورت سلور کے ایک بڑے دیگے کا ڈھکنا اسٹیل کی کفگیر سے بجاتی برآمدے میں وارد ہوئی اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے، چیختے چلاتے بچے پہلے سے بھی زیادہ شور مچاتے دیوانہ وار گراؤنڈ کی طرف بھاگنے لگے۔ گراؤنڈ کی طرف جانے میں تساہل کا مظاہرہ کرنے والوں کو ڈھکنا بجانے والی عورت نے بہ آواز بلند ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔

”اوئے! بے غیر تو جلدی کرو۔ اسمبلی کا ٹیم ہو گیا ہے۔“

اقبال اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر دو تین بچوں کے سروں پر چپتیں رسید کیں۔ اس کی چپتوں نے عمل انگیز کام کیا۔ برآمدے میں رہے سے بچے بھی تیزی سے گراؤنڈ کی جانب لپکنے لگے۔

ڈھکنا بجانے والی عورت اپنا کفگیر والا ہاتھ روک کر واپس پلٹتے ہوئے منتہا کے نزدیک سے گزری تو اس نے پوچھا۔

”ماسی! اسکول میں بیل نہیں ہے کیا؟“

عورت نے ٹھنک کر اسے دیکھا پھر بولی ”ادھر چور بہت ہیں جی۔ ان کا بس چلے تو بندوں کو بھی چرا کر چور بازار میں

بیچ آئیں۔“ اچانک اس کا لہجہ بدل گیا ”آپ نے بچے کو میسٹر دلوانا ہے؟“

”نہیں... انہوں نے میڈم غزالہ سے ملنا ہے“ منتہا کے بجائے اقبال نے کہا پھر وہ ڈھکنا بجانے والی عورت سے

بولی ”آپا صغیراں، ذرا فون کا خیال رکھنا، میں اسمبلی کرانے جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے“ آپا صغیراں نے کہا اور اقبال کے جانے کے بعد منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے اقبال کی خالی چھوڑی



ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولی "اندر کمرے میں تو مرد بیٹھے ہیں تم ادھر بیٹھ جاؤ بی بی!"

"اسمبلی اقبال کراتا ہے؟" منتہا نے پوچھا۔

"اقبال اور پی ٹی سر دونوں مل کر۔"

"پی ٹی سر کہاں ہیں؟"

اچانک گیٹ کی جانب سے زوردار و سل سنائی دی اور منتہا نے شلوار قمیص میں ملبوس ہاتھ میں ڈانڈا لیے اور منہ میں سیٹی دبائے ایک معمر شخص کو گیٹ سے گراؤنڈ کی طرف پیش قدمی کرتے دیکھا۔

"پی ٹی سر یہ ہیں؟" اس نے آپا صغیراں سے تائید چاہی۔

"ہاں جی۔"

برآمدے سے گراؤنڈ کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا تھا۔ وہاں وہ بد نظمی تھی کہ الاماں! بچے ایک دوسرے پر پلے پڑ رہے تھے۔ بعض شرارتی اور بد تمیز بچے ایک کو دوسرے پر دھکا دے رہے تھے۔ متعدد بچے اور بچیاں بد نظمی کا مظاہرہ کرتے اس جھوم سے الگ تھلک انتہائی کسمندی سے کھڑے تھے۔ دیر سے اسکول پہنچنے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ چند بچے پانی کی ٹنکی میں لگی ٹونٹیوں پر جھکے پانی پی رہے تھے۔ ڈنڈا بردار پی ٹی آئی نے ایک مرتبہ پھر زوردار و سل بجائی، ایک دو ڈنڈے پانی پیٹے بچوں کو لگائے اور ایک دو گراؤنڈ میں کسمندی سے کھڑے بچوں کو رسید کیے۔ ہر بڑا کر سب کے سب ہل بازی کرتی قطاروں کی جانب لپکنے لگے۔ پی ٹی آئی ان کے پیچھے لپکا کیے۔

اسمبلی میں نیچر کا دور دور تک کوئی پتا نہ تھا۔ بچوں کے اسمبلی میں چلے جانے کے بعد برآمدوں میں اب خاموشی تھی۔ اسٹاف روم سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پی ٹی آئی بچوں کی قطاروں پر تابڑ توڑ ڈنڈے برسا رہے تھے اور بچے سم سم کر سٹے جارہے تھے۔ اقبال بھی قطاروں کے درمیان کبھی یہاں کبھی وہاں محو حرکت اور گاہے گاہے ہاتھ چلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ ان دونوں کو چھوٹے بچوں پر اس قدر بے رحمی سے ہاتھ چلاتے دیکھ کر منتہا کو سخت کوفت ہوئی مگر یہ تو شاید روزانہ کا معمول رہا ہو گا۔

"کیا اسمبلی میں بچوں کی روزانہ یونہی پٹائی ہوتی ہے؟" منتہا نے آپا صغیراں سے پوچھا۔

آپا نے چونک کر اسے دیکھا اور یوں پس و پیش میں پڑ گئی جیسے بولنے سے پہلے الفاظ تول لینا چاہتی ہو۔

"زبان سے بچے قابو بھی تو نہیں آتے بی بی!"

اسمبلی میں شور ختم ہو گیا تھا۔

پرنسپل کے کمرے سے ایک شخص انگریزی لیتا برآمد ہوا اور منتہا پر ایک اچھتی سی نظر ڈال کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

"اٹنیشن! اسمبلی گراؤنڈ میں چبوترے پر کھڑے اقبال نے بلند آہنگی سے کاشن دی۔ اسمبلی فائر عجیب و غریب آوازیں پیدا کرنے لگا۔ بچے ان آوازوں کو سن کر منہ چھپا چھپا کر ہنسنے لگے۔ اقبال نے اسمبلی فائر کا سوئچ آف کر دیا۔

"قرأت کے لیے کون آئے گا؟" اقبال نے پوچھا۔

کامل سکوت رہا۔

"کوئی نکلتا ہے کہ نہیں؟"

ایک دبلا پتلا سالز کا سما سما اپنی قطار سے نکلا اور اسمبلی کے چبوترے کی طرف چل دیا۔

چند استانیات ہنستی بولتی اسٹاف روم سے نکلیں اور خراماں خراماں برآمدے میں چلتی سیڑھیوں تک پہنچیں۔ آہنگی سے سیڑھیاں عبور کیں اور گراؤنڈ کی طرف چل دیں۔ منتہا کا خیال تھا وہ اسمبلی میں جائیں گی مگر نہیں وہ تو گراؤنڈ میں بنے باغیچے کے نزدیک رک کر اسے دیکھنے اور باتیں کرنے لگیں۔

دُبلے پتلے بچے کی قرأت اتنی دھیمی تھی کہ اس کی آواز برآمدے تک نہ پہنچ پائی۔  
قرأت کے بعد پی ٹی آئی نے بچوں کو کاشن دی۔  
”امین شن!“

”قوی ترانا“ اقبال نے کہا۔

بچے جوش سے عاری آوازوں میں قوی ترانا پڑھنے لگے۔  
منتہا کو اپنے اسکول کی اسمبلی یاد آگئی۔ جس روز لڑکے قوی ترانا پڑھنے میں ذرا سا بھی تساہل کا مظاہرہ کرتے،  
فاروقی صاحب دوبارہ سہ بارہ پڑھواتے۔ اول تو ایسی نوبت شاذ ہی آتی۔  
باغیچے کے نزدیک کھڑی استانیوں میں سے ایک نے آہنی باڑھ میں سے ہاتھ بڑھا کر ایک پھول توڑا اور اپنے  
بالوں میں اڑس لیا۔  
اسمبلی ختم ہو گئی تھی۔

”مارچ!“ پی ٹی آئی نے بہ آواز بلند کہا۔

ایک ساتھ متعدد قطاریں چل پڑیں۔ بعض شرارتی بچے ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے اور بعض ایک کو دوسرے  
پر دھکیلتے دکھائی دیے۔ ایک لڑکے نے دوسرے کی راہ میں ٹانگ اڑائی اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔  
پرنسپل کے دفتر میں بیٹھے اخبار پڑھتے دیگر حضرات بھی کمرے سے برآمد ہوئے اور انہوں نے مین گیٹ کا راستہ  
پکڑا۔

اقبال اسمبلی گراؤنڈ سے لوٹا اور اس نے اسٹاف روم کے دروازے پر پہنچ کر بہ آواز بلند ہانک لگائی ”بچے کلاسوں  
میں آگئے ہیں جی۔“

باغیچے کے نزدیک کھڑی استانیاں جیسے خراماں خراماں گئی تھیں ویسے ہی واپس بھی آرہی تھیں۔ اقبال کے ہانک  
لگانے پر اسٹاف روم سے تین تین چار چار استانیوں کے غول ٹکٹنا شروع ہوئے۔

دو تین استانیاں اسمبلی ختم ہونے اور بچوں کے کلاس رومز میں چلے جانے کے بعد اسکول پہنچتی دکھائی دیں۔  
”بابو کا کمرہ تو بند ہے“ آپ پرنسپل کے دفتر میں بیٹھ جائیں، کھڑے کھڑے تو آپ تھک جائیں گی“ اقبال نے کہا۔  
”پرنسپل کب آئیں گی؟“

”آپ کو بتایا تو ہے جی نوبت“ اقبال نے کہا اور برآمدے سے گزرتے ہوئے کلاسوں کو یوں دیکھتا چلا گیا جیسے  
پرنسپل پہلا راولڈ لے رہا ہو۔“

بابو جی ساڑھے آٹھ بجے کے بعد تشریف لائے۔ پرنسپل صاحبہ کی تشریف آوری بابو کی آمد کے بیس پچیس منٹ  
بعد ہوئی۔ آپا صغیراں نے انہیں منتہا کی بابت بتایا کہ وہ بڑی دیر سے ان کی منتظر تھی۔ ”جی بتائیے کیا کام ہے؟“  
موصوفہ نے منتہا کو بلوا کر پوچھا۔

”مجھے اس اسکول میں جوائننگ دینی ہے۔“

”اچھا اچھا... ہمارے ہاں اسٹاف کی کمی ہے۔ میں نے ٹیچرز کے لیے ڈیمانڈ دے رکھی تھی ڈائریکٹ کو... آپ  
کس اسکول سے آئی ہیں؟“

”مٹی پبلک اسکول سے۔“

”آئی سی... وہاں سے تو نئی پرنسپل بھی آنے والی ہیں یہاں۔“

”جی... میں وہی ہوں۔“

قائم ہجام پرنسپل سٹپٹا کر سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔



”کیا! کیا آپ...؟ وہ آئی ایم سوری میڈم! بالی گاڈ“ میں نے آپ کو پہچانا ہی نہیں“ خفت کے مارے ان کی سفید رنگت گلابی پڑ گئی۔

منتہا دھیرے سے مسکرائی۔  
”آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔“  
”میڈم“ آپ کے آنے کا تو ہم لوگ اتنے دنوں سے سن ہی رہے تھے نا، مجھے آپ کو پہچان لینا چاہیے تھا۔ ہائے اللہ میں کتنی بے وقوف ہوں۔ آپ نے کہا کہ آپ سٹی پبلک اسکول سے آئی ہیں اور میں پھر بھی نہیں پہچانی بلکہ التائیہ کہہ رہی ہوں کہ وہاں سے تو ہماری نئی پرنسپل بھی آنے والی ہیں۔ میڈم“ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔ اف اللہ میڈم“ آپ وہاں صوفے پر کیوں بیٹھی ہیں“ آپ یہاں اپنی سیٹ پر بیٹھیں نا۔“  
”کوئی بات نہیں آپ بیٹھے۔“

”اللہ نہیں میڈم“ اب میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ بالی گاڈ میڈم میں تو کب سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ آپ آئیں اور سیٹ سنبھالیں۔“ انہوں نے نیل بجائی۔ اقبال لپک کر اندر آیا۔  
”اقبال تم کتنے فضول آدمی ہو۔ نئی پرنسپل آئی ہیں اور تم نے انہیں بٹھایا بھی نہیں۔“  
اقبال نے ہڑبڑا کر منتہا کی جانب دیکھا۔  
”کوئی بات نہیں۔“ منتہا دھیرے سے مسکرائی ”ویسے اقبال ہے بہت کام کا آدمی۔“  
”آپ ہنڈ ریڈ پرنسٹ ٹھیک کہتی ہیں میڈم! سچ پوچھیں تو اسکول کو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔“  
”جی... مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔“

”اقبال جاؤ نا میڈم کے لیے کولڈ ڈرنک لے آؤ۔“  
”نہیں... کچھ نہیں... میرا خیال ہے پہلے میں جوائننگ دے دوں پھر چارج دینے اور لینے کی کارروائی ہو جائے۔“

”بابو کو بلاؤ اقبال۔“  
”بستر ہے جی۔“ اقبال تیزی سے باہر چلا گیا۔  
”میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“  
”غزالہ ناصر۔“  
”آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھے نا۔“  
”جی... جی میڈم بیٹھتی ہوں۔“ غزالہ ریو الونگ چیئر سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔  
بابو جی اپنی آنکھوں میں اشتیاق سمیٹے پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے بڑی انکساری سے سلام کیا پھر اپنا تعارف کرایا۔ ”ایل ڈی سی تاج محمد۔“  
”بابو جی میڈم کی جوائننگ اور چارج ٹیکنگ...“ غزالہ نے تاج محمد سے کہا۔  
”جی ابھی کر لیتے ہیں۔“

”بینک اکاؤنٹس کتنے ہیں اسکول کے؟“ منتہا نے جوئے اسکول میں اپنے عہدے کا چارج لینے کے سلسلے میں فاروقی صاحب اور آفس سپرنٹنڈنٹ سے ضروری ہدایات لے کر چلی تھی بڑے اعتماد سے پوچھا۔  
”پانچ ہیں میڈم جی۔“

”کس کس ہیڈ کے ساتھ؟“  
”پبلک اکاؤنٹ، بلڈنگ فنڈ، اسٹوڈنٹس فنڈ، ایگزٹام فنڈ اور وین فنڈ۔“

”بینک سے آج کی تاریخ میں ان تمام اکاؤنٹس کی اسٹیٹمنٹس تو منگوا لیجئے۔“  
 تاج محمد نے معنی خیز نگاہوں سے غزالہ کو دیکھا پھر کہا ”رائٹ میڈم!“  
 ”میں اسکول میں موجود تمام لہجہ زبانی دیکھنا چاہوں گی۔“  
 ”اوکے میڈم!“

”جوائننگ رپورٹ آپ تیار کر دیجئے ڈائریکٹریٹ بھجوانی ہے۔“  
 ”کوئی مسئلہ نہیں میڈم“ اب تو آپ آگئی ہیں جب چاہیں جوائننگ بھجوا سکتی ہیں۔ آپ جوائن کر لیں ڈائریکٹریٹ  
 کو رپورٹ آرام سے بھجوا دیں گے۔“  
 ”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا تاج محمد صاحب، قاعدے کے مطابق ڈائریکٹریٹ کو اپنے ہر ملازم کی جوائننگ یا  
 ریلیونگ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پہنچانا لازم ہے۔“

تاج محمد خفیف ہو گیا۔  
 ”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم“ قانون یہی ہے لیکن میڈم... قانون اور قاعدوں ضابطوں کی پابندی کون کرتا ہے۔“  
 ”اکثریت کرتی ہے تاج محمد صاحب اور جو نہیں کرتے انہیں جلد یا بدیر جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ میرا اصول یہ ہے  
 کہ زندگی میں سوری کہنے کے مواقع کم سے کم آنے چاہئیں۔“  
 ”بہت اچھا میڈم۔“ تاج محمد نے کہا ”مجھے اجازت؟“  
 ”بینک اسٹیٹمنٹس اور لہجہ زبانی تاج محمد صاحب۔“ منہانے یاد دلایا۔  
 ”اوکے!“

تاج محمد کے جاتے ہی آگے پیچھے متعدد استانیاں کمرے میں در آئیں۔ اقبال نئی پرنسپل کی آمد کی خبر جو پھونک آیا  
 تھا۔

”السلام علیکم میڈم... وعلیکم میڈم!“  
 ”وعلیکم السلام... شکریہ۔“  
 نگاہوں میں اشتیاق تھا۔  
 ”میڈم آپ ہی ہماری نئی پرنسپل بن کر آ رہی ہیں نا؟“  
 ”آپ جلی ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔  
 ”تھینکس گاڈ! اب کچھ تو سنبھلے گا نظام۔“  
 غزالہ ناصر کے تاثرات دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔  
 ”شکر ہے اس مرتبہ کوئی ایسی پرنسپل نہیں آئیں جن کی ریٹائرمنٹ قریب ہو۔“ ایک خوش ادا نوجوان ٹیچر نے  
 کہا۔

”ہاں ورنہ یہاں تو ہمیشہ ایسی ہی پرنسپل آتی رہیں جن کی ریٹائرمنٹ میں دو تین سال باقی رہے ہوتے تھے۔“  
 ”تھینکس گاڈ! پرنسپل کی سیٹ پر اب ایک اسمارٹ اور خوش شکل خاتون نظر آیا کریں گی۔“  
 ”غالباً آپ لوگ اپنی کلاسز چھوڑ کر آئی ہوئی ہیں؟“ منہانے لہجے میں استغناء تھا۔  
 استانیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔  
 ”میم ہم تو آپ کو دیکھ کر آئے تھے۔“ ایک نے سب کی عزت رکھنے اور انہیں شرمندگی سے بچانے کو کہا۔  
 ”تھینک یو دیری میچ!“  
 ”اوکے میڈم!“



”او کے اب تو ہمارا آپ کا آدھے دن ساتھ رہا کرے گا۔“

”انشاء اللہ!“

استانیوں کے جانے کے بعد اقبال اور اس کے ہمراہ چار پانچ دیگر افراد جن میں آپا صغیراں بھی شامل تھی کمرے میں داخل ہوئے۔

”سوری میڈم مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ہماری نئی میڈم ہیں۔“ اقبال نے تجھپنے۔ تجھپنے انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“

”میڈم جی تجھے اسمبلی کراتے دیکھتی رہیں۔“ آپا صغیراں بولیں۔

”جی پی ٹی آئی کمرے میں در آئے۔“

”السلام علیکم سر!“ انہوں نے اپنا ہاتھ سیلوٹ کرنے والے انداز میں پیشانی تک لے جا کر کہا۔

”پی ٹی آئی صاحب!“

”سر!“

”آپ کا ڈنڈا بہت بے رحم ہے پی ٹی آئی صاحب۔“

”اچھا جی!“ پی ٹی آئی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو گھما پھرا کر دیکھتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔

غزالہ ناصر نے کمرے میں موجود افراد کو متعارف کرایا۔

”میڈم‘ پی ٹی آئی صاحب اور اقبال سے تو آپ واقف ہو ہی چکی ہیں۔ یہ ہماری آپا صغیراں ہیں۔ نان ٹچنگ اسٹاف کی واحد خاتون۔ وہ ہے ہمارا مالی نصیب خان، اور یہ جو اس طرف کھڑے ہیں ڈرائیور محمد جمیل، اور اس کے ساتھ سوپر ارشد مسیح۔“

”چوکیدار کہاں ہے؟“

غزالہ نے سٹپا کر اقبال کی جانب دیکھا اور بے ساختہ بولیں ”چوکیدار کہاں ہے اقبال؟“

اقبال معنی خیز انداز میں مسکرا دیا پھر بولا ”آپ کو پتا تو ہے میڈم غزالہ۔“

غزالہ جھینپ گئیں۔

”اوہ یس میڈم اس کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے۔“

”دن میں گیٹ پر کون ہوتا ہے۔“

”کو... کوئی نہیں میڈم...“

”ہونا چاہیے۔ اقبال آپ ڈسٹر لے کر جائیں اور گیٹ کے باہر نوٹس بورڈ کو صاف کر آئیں۔“

کمرے میں موجود تمام افراد کو اچنبھا سا ہوا۔

یہ بھلا کیا بات تھی!

منتہا نے ان سب کی نگاہوں میں ہلکورے لیتا استعجاب بھانپ لیا اور ان کی تشفی کو کہا ”کسی نے شرارت میں کچھ

نامناسب سی بات لکھ رکھی ہے وہاں اور وہ بورڈ ایسی جگہ پر ہے کہ ہر آتے جاتے شخص کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ چوکیدار

کو ان باتوں پر نظر رکھنی چاہیے مگر وہ وہاں ہے ہی کب۔“

”میڈم اس کی ڈیوٹی دن میں لگائیں۔“ اقبال نے مشورہ کیا۔

”فی الحال تو آپ وہ کام کریں جا کر جو میں نے آپ سے کہا ہے۔“

اقبال جھینپ گیا۔

”اور ہاں میں نے دیکھا ہے مین گیٹ کے ایک حصے میں ایک چھوٹا دروازہ موجود ہے۔ مین گیٹ کو صرف اس

وقت کھولا جائے جب کسی گاڑی کو اندر آنا ہو۔ لوگوں کی آمد و رفت کے لیے صرف چھوٹا دروازہ کھولا جائے۔

”جی، بہتر کل سے ایسا ہی ہو گا۔“ اقبال نے کہا۔

منتہا کو یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ غیر تدریسی عملے میں اقبال خاصا تیز اور سمجھ دار آدمی تھا۔

”کل سے نہیں آج ہی ہے۔“ اس نے اقبال سے کہا۔

”بہتر ہے میڈم... ابھی اسی وقت جا کر مین گیٹ بند کرتا ہوں۔“

”آپ سب آئے بہت شکریہ۔“ منتہا نے کمرے میں موجود افراد سے کہا۔

”اب آپ لوگ جائیں۔“ غزالہ نے ان سے کہا۔

وہ سب آگے پیچھے بڑی انکساری سے کمرے سے نکل گئے۔

”میڈم جب تک بابو جی آپ کی جوائنٹنگ رپورٹ تیار کریں آپ اسکول دیکھ لیں۔“ غزالہ نے منتہا سے کہا۔

”ضرور۔“ منتہا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

غزالہ نے اسے جونیر اسکول کا چپا چپا دکھایا۔ کلاس رومز، اسٹاف روم، بابو کا کمرہ، لائبریری، اسٹور، باتھ رومز ہر جگہ صورت حال انتہائی مخدوش دکھائی دی۔ چار کلاس رومز ایسے نظر آئے جن میں بچے کرسیوں اور ڈیسکوں کی بجائے فرش پر بچھی پھٹی پرانی اور میلی میلی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ غزالہ نے بتایا فرنیچر کی کمی کی وجہ سے بچے دریوں پر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ تقریباً پورا اسکول ہی بد روغن ہو رہا تھا۔ کمروں کی دیواریں چیکٹ اور مخدوش نظر آتی تھیں۔ دیواروں پر پینسلوں سے اتنا کچھ لکھا اور بنا ہوا تھا کہ دیکھنے سے وحشت ہوتی۔ وہ چار کمرے جن میں بچے فرش پر بچھی دریوں پر بیٹھے تھے ان کی دیواروں کے زیریں حصے میں پلاسٹر جا بجا ادھڑا ہوا تھا اور اتنے سوراخ اور شکاف تھے کہ منتہا اس کا سبب پوچھنے پر مجبور ہو گئی۔

”میڈم شرارتی بچے ہیں، اپنے گھروں سے پرکار اور نیل کٹر لے آتے ہیں اور پرکار کی نوک یا نیل کٹر کے چاقو سے دیواریں کریدتے رہتے ہیں۔“

”اگر پڑھائی میں مصروف رہیں تو شاید ایسا نہ ہو۔“ منتہا نے سوچا۔

بیشتر کمرہائے جماعت میں استانیوں کو کرسیوں پر بیٹھے اور بچوں کے چہرے تکتے یا کھڑکیوں دروازوں سے باہر نظارہ کرتے دیکھ کر منتہا سمجھ گئی تھی کہ اسکول میں پڑھائی نہ ہونے کا مسئلہ بھی تھا۔ کوئی اکاؤنٹ کراہی تھا جس میں اسے نیچر کرسی پر بیٹھے ہونے کی بجائے کھڑی اور پڑھاتی ہوئی نظر آئیں۔ بعض کلاسوں میں نیچرز سرے سے موجود ہی نہ تھیں۔ بچوں کے باتھ رومز میں اتنی سڑاند تھی کہ الاماں!

اسٹاف روم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خستہ حال فرنیچر، ملے پردے، ادھر ادھر پڑی کاپیاں، چائے کے جھوٹے مک اور پلیٹیں اور یہاں وہاں میزوں پر دھری یا کرسیوں کی پشت پر لٹکی استانیوں کی چادریں اور عبائیں۔ منجمد سویوں والا دال کلاک اور مرغ بھل کی طرح پھڑپھڑاتا کیلنڈر۔

لائبریری نام نہاد تھی۔ غزالہ نے بتایا، کوئی لائبریرین نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی الماریاں شاذ ہی کھلتی تھیں۔ جس نیچر کے پاس گزشتہ کئی برس سے اعزازی طور پر لائبریری کا چارج تھا اس کے تدریسی پیریڈز اتنے تھے کہ وہ لائبریری کے لیے کوئی کام کرنے کو وقت ہی نہ نکال سکتی تھی۔

بابو کے کمرے کی حالت سوا تھی۔ میز پر الماریوں میں فرش پر کھڑکیوں کی چوکھٹوں کے اندرونی جانب فائلیں ہی فائلیں تھیں یا پھر بے ترتیبی سے پڑے کاغذ۔ کمرے میں موجود الماریاں انتہائی بد رنگ ہو رہی تھیں۔ بابو نے گلہ کیا کہ اس کے کمرے میں موجود الماریاں اس قدر اناٹ بھری ہوئی تھیں کہ بعض اہم فائلوں کو بھی باہر کھلا چھوڑنا پڑتا تھا۔ یہ گلہ کرتے ہوئے اس نے ایک الماری کے پٹ کھول کر منتہا کو صورت حال دکھانی چاہی تو چند فائلیں دھڑام



سے زمین پر آگریں اور ان میں سے ایک میں سے کاغذ نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ تو بچوں کے داخلہ فارم تھے۔

”تاج محمد صاحب یہ تو داخلہ فارم ہیں۔“ منتہا نے کہا۔  
”جی... جی میڈم!“

”اتنی اہم دستاویز اور اس طرح۔ یہ کوائف تو بچوں کے ساتھ تمام عمر رہتے ہیں۔ کبھی کسی مرحلے پر ان کوائف کی تصدیق درکار ہو تو پرائمری اسکول کا ریکارڈ ہی کھنگالا جاتا ہے۔“

”آپ درست فرماتی ہیں۔“ بابو نے کہا۔

”میری جوائننگ رپورٹ تیار ہو گئی؟“

”جی میڈم آپ آفس میں تشریف رکھیں میں لا رہا ہوں۔“

”اور بینک اسٹیٹمنٹس؟“

”نائب قاصد گیا ہوا ہے لینے کے لیے۔“

بابو کے کمرے سے نکل کر منتہا اس کمرے سے متصل پرنسپل آفس میں داخل ہو گئی۔ غزالہ اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔

\*\*\*

”میں سوچ رہی ہوں منگنی سے بہتر تو ہم نکاح ہی کر لیتے۔“ اچھی بھالی نے کھانے کی میز پر کہا۔

”خیریت! ایسا کیوں سوچ رہی ہیں آپ؟“ نعیم نے پہلے چونک کر پھر مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”اور اطمینان ہو جاتا۔“

”کس بات کا؟“

”کہ لڑکی اب ہماری ہی ہے۔“

”ممائی جان! انشاء اللہ وہ اب ہماری ہی ہیں۔“ لیلیٰ نے سالن کا ڈونگا نعیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں تو کہتا ہوں امی جان آپ کو نکاح ہی نہیں رخصتی بھی کر لینی چاہیے تھی۔ اگر ڈیڑھ دو ہفتے میں میری شادی

ہو سکتی ہے تو ان کی تین چار دن میں کیوں نہیں۔“ نعیم نے مسکراتے ہوئے نعیم کو دیکھا۔

”آپ بھول رہے ہیں صاحب زادے کہ شادی سے پہلے تین چار سال آپ کی منگنی بھی رہی ہے۔“ نعیم نے نعیم سے کہا۔

”اچھا! مجھے یاد نہیں۔“ نعیم نے بڑے پھو کے منہ سے کہا۔

”مگر ہم سب کو باجماعت یاد ہے۔“

”حیرت ہے مجھے کیوں یاد نہیں۔“

”یہ تو یاد ہو گا کہ ویک اینڈ پر پاکستان کے لیے سب سے لمبی کال تمہاری ہی ہوا کرتی تھی۔“

”جس کا بل آپ کو ادا کرنا ہوتا تھا۔“ نعیم مسکرا دیا۔

”خیر یہ کوئی قابل بیان بات نہیں۔ میں اور تم دو تھوڑی ہیں یار۔“

”خدا کرے تم دونوں بھائیوں میں یہ محبت ہمیشہ اسی طرح رہے۔“

”انشاء اللہ رہے گی امی جان۔“ نعیم بولا۔

”خاندان کو بندھا رکھنے میں گھر کی بہوئیں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیلیٰ پر تو مجھے پورا بھروسہ ہے۔ میرے

اپنے گھر کی بچی ہے۔“ اچھی بھالی نے لیلیٰ کو پیار سے دیکھا پھر مزید کہا ”ویسے تو میں نے منتہا کی بھی بہت تعریف سنی

”ہے۔“

”وہ واقعی بہت اچھی ہیں ممانی جان۔ اپنی فیملی کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد کی ہے اور امی کہتی ہیں جو لڑکیاں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے مخلص ہوتی ہیں وہ اپنی سرالوں کو بھی مایوس نہیں کرتیں۔“

”تمہاری امی کے تجربے اور ان کی باتوں کے تو ہم ہمیشہ سے مداح ہیں۔ دل کی باتیں سرال بھر میں جتنی ہم نے تمہاری امی سے کی ہیں شاید ہی کسی سے کی ہوں۔ ہر اچھے برے وقت میں اپنے دل کی بات سب سے پہلے انہی سے کی ہم نے۔“

”اسی لیے تو خاندان میں سب لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ کیسی مند بھانج ہیں جو ایک دوسرے کی بہترین دوست ہیں۔“ نعیم نے کہا۔

”خدا جانے کیوں بدنام کر رکھا ہے لوگوں نے بعض رشتوں کو۔ سچ کہتی ہوں مجھے تو تمہاری پھوپھی جان تمہاری خالائوں سے زیادہ اپنے نزدیک محسوس ہوئیں۔ تمہارے ابو کے انتقال کے بعد جتنے آنسو میرے تمہاری پھوپھی جان نے اپنے دامن میں سیٹھے شاید کسی اور نے نہیں۔ دونوں مہینوں بلکہ اب بھی جب ہم دونوں اکٹھے بیٹھتے ہیں تو تمہارے ابو کو یاد کر کے روئے بغیر نہیں اٹھتے۔“ اچھی بھابی کی آواز بھرا گئی۔

نعیم نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر بولا ”خلیل جبران ایک عظیم دانشور کہتا ہے، میں ان لوگوں کو بھول گیا جنہوں نے خوشی میں میرے ساتھ قہقہے بکھیرے مگر انہیں ہمیشہ یاد رکھا جو غم کی گھڑیوں میں میرے ساتھ روئے۔“

”واقعی نہ دکھ کی گھڑیاں بھلائی جاتی ہیں نہ وہ لوگ جو دکھ میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔“ اچھی بھابی بولیں۔

”تو آپ کیا کہہ رہی تھیں کہ منگنی سے بہتر تو ہم لوگ نکاح کر لیتے۔“ نعیم نے ماں کو دل گیر پائیکریا کا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں۔“ اچھی بھابی کا لہجہ گواہ تھا کہ نعیم کی کوشش ناکام نہیں رہی تھی۔ ”خیر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“

”انشاء اللہ شادی جلدی کریں گے۔“

”حضرت! ایک سال سے پہلے تو آپ اس کا خواب بھی مت دیکھے گا۔ پہلے عرفان کی شادی پھر امی جان کی وجہ سے دو مرتبہ چھٹی لے کر آنا پڑا۔ اب کمپنی ایک سال سے پہلے نہیں آنے دے گی۔“

”اجی چھوٹیے، اگر آپ کی شادی ایک سال سے پہلے مقدار میں ہوئی تو کمپنی تو کیا کمپنی کے چچا جان بھی نہیں روک سکیں گے۔ میں تو چاہتا ہوں آپ کی شادی کل کی ہوئی آج ہی ہو جائے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں کہ تمہیں میری شادی جلد ہونے سے کیوں دلچسپی ہے۔“ نعیم نے زہر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ نعیم نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔

”لیلیٰ کو وہاں بلانے کے لیے امی جان کے پاس رہنے کو کوئی متبادل بندوبست ہونا چاہیے۔“

”اوہ! یہ بات نہیں۔“ نعیم جھینپ کر بولا۔

”صاحبزادے! یہ تو میں نہیں جانتا کہ باپ کو اپنے بیٹے سے کیسی اور کتنی محبت ہوتی ہوگی مگر اتنا بہر حال جانتا ہوں کہ تم مجھے ہمیشہ ایک چھوٹا سا بچہ محسوس ہوئے ہو جس کی انگلی پکڑ کر میں اس کے دل کی دھڑکنیں تک سن سکتا ہوں۔“

نعیم نے چونک کر بھائی کو دیکھا۔ چند ثانیے ٹنگی باندھے دیکھتا رہا اور ایک لخت اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اپنی کیفیت بھائی سے چھپانے کو اس نے نظریں چرائیں۔

”امی جان آپ لوگ ایمر جنسی میں شادی کرنے کے لیے تیار رہیے گا۔ مجھے اگر ہفتہ بھر بھی مل گیا نا کسی وقت تو



میں آدھکوں گا۔“  
 اچھی بھالی اور لیلیٰ نے چونک کر نعیم کی جانب دیکھا کہ ابھی ذرا دیر قبل تو وہ کہہ رہا تھا برس بھر سے پہلے شادی کا کوئی امکان نہیں۔  
 ”نعیم بھائی! ان کا کیا ہو گا۔“ لیلیٰ نے نعیم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ارے بھی ان کا تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“

لیلیٰ شرمانے لگی۔  
 ”نہیں... ہمارا مطلب ہے انہیں چھٹی کیسے ملے گی۔“ اس نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔  
 ”جیسے مجھے ملے گی۔“ نعیم نے نعیم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”دیکھا نعیم ایسی ہوتی ہیں شوہر پرست بیویاں۔“  
 ”خدا ان دونوں میں یہ محبت ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔ ارے ہاں بیٹا نعیم تم آج منتہا کو فون ضرور کر لینا، کل تو چلے ہی جاؤ گے تم اور صبح تا دوپہر منتہا اپنے اسکول میں ہوں گی۔“  
 ”آج نئے اسکول میں ان کی جوائننگ بھی تو تھی۔ پرنسپل بن کر گئی ہیں۔“ لیلیٰ نے کہا۔  
 ”شام کو ہم لوگ بھی مبارکباد دے دیں گے پرنسپل بننے کی۔ ویسے تو خیر انہیں اب کتنے دن نوکری کرنی ہے۔“  
 اچھی بھالی بولیں۔

نعیم نے اس سلسلے میں گزشتہ شب منتہا سے ہونے والی بات چیت کے حوالے سے کوئی بات کہنا ضروری نہیں سمجھی۔ بہت سی باتوں کو وقت خود ہی ظاہر کرتا ہے اور خود ہی فیصلہ بھی صادر کرتا ہے سو وہ منتہا کی ملازمت کے سلسلے میں فیصلہ وقت ہی پر چھوڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس نے یا اس کے گھر والوں نے کوئی شرط نہیں رکھی تھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ خود منتہا کی طرف سے اس خواہش کا اظہار بھی کہ وہ ملازمت جاری رکھنے کی خواہش مند تھی بہت جھجکتے جھجکتے اور انتہائی حزم و احتیاط سے ہوا تھا۔  
 زندگی کچھ مان کر کچھ منوا کر گزارنی پڑتی ہے تو چین سے گزرتی ہے ورنہ بے سکونی رہتی ہے۔  
 اور نعیم زندگی کو محبت سے برتنے والوں میں سے تھا۔

\*\*\*

اچھی بھالی نے تو منتہا کو مبارکباد دینے کے لیے فون کرنے کو کہا تھا مگر لیلیٰ نے نعیم کو اکسایا کہ فون پر مبارکباد دینے کی بجائے مٹھائی یا کیک کے ساتھ بنفس نفیس مبارکباد دینے کے لیے منتہا کے گھر ہو آیا جائے۔ نعیم نے والدہ سے اس بات کی اجازت چاہی تو وہ بولیں ”ہاں ہاں ضرور ہو آؤ۔“  
 ”آپ چلیں گی؟“

”ارے نہیں بیٹا مجھ میں اب ہمت نہیں ہے زیادہ کہیں آنے جانے کی، میں فون پر بات کر لوں گی۔“  
 ”جی بہتر۔“

شام کو اچھی بھالی نے فون کیا۔ می اور منتہا دونوں سے باری باری بات کی پھر لیلیٰ اور نعیم مبارکباد دینے آئے۔ وہ بیٹھے ہی تھے کہ فضلہ بھی سائل اور رائیل کے ہمراہ مبارکباد دینے آئیں۔ رات کو نعیم کا فون آگیا۔ اس نے پہلے می سے بات کی پھر منتہا سے۔ منتہا کو ریسور تھا کہ می ادھر ادھر ہو گئیں۔

”کتنے کیسا رہا آج کا دن؟“ نعیم نے پوچھا۔

”بہت اچھا۔ جوائننگ پھر چارج لینے میں ہی گزر گیا۔“

”تھک گئی ہوں گی۔“

”جس کام کو آپ انجوائے کرتے ہوں اس میں تھکن نہیں ہوتی۔ ویسے بھی میں ان لوگوں میں سے نہیں جو

چھوٹے چھوٹے کاموں سے تھک جاتے ہیں۔ آخر میں تو تھک ہی جانا ہے ابھی سے تھکن کیوں طاری کر لی جائے۔“  
”گڈ! ویسے آپ جیسے لوگ تو شاید آخر میں بھی نہیں تھکتے ہوں گے۔“  
”کچھ کہہ نہیں سکتی۔“

”میں تو کل چلا جاؤں گا“ امی جان سے رابطہ رکھنے لگی۔“

”آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔“

”ہاں اتنا تو مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر معاملے میں کمٹڈ ہوتے ہیں۔ اپنے فرائض اور ذمے داریاں نبھانا جانتے ہیں۔“

”یو چھہ سکتی ہوں یہ اندازہ آپ کو کیسے ہوا؟“

”کچھ تو سنا ہے۔“

”کس سے؟“

”پھوپھی جان سے اور کچھ.....“

”کچھ؟“

”کل رات اندازہ ہوا۔“

”کیسے؟“

”ان لمحوں میں بھی جو زندگی میں بار بار نہیں آتے آپ کو اپنے فرائض اور ذمے داریوں کی فکر تھی۔ اپنی ملازمت کی فکر.... والدہ کی فکر.... ایس گرینٹ!“

”احساسِ ذمے داری کے سلسلے میں تو میں نے آپ کی بھی بہت تعریف سنی ہے۔“

”کس سے؟“

”آپ کی پھوپھی جان سے۔“

”پھوپھی جان بھی کمال کی چیز ہیں۔“

”ہیں تو!“

”اچھا ایک بات بتائیے اگر میں دعی سے کبھی کبھی فون کر لیا کروں تو آپ کے گھر والوں کے مائنڈ کرنے کا تو احتمال نہیں۔“

”یہ بات تو آپ کو آج بھی فون کرتے ہوئے سوچنی چاہیے تھی۔“

”آج تو جواز تھا کہ آپ لوگوں کو خدا حافظ کہنا ہے اور آپ کو پرنسپل شپ کی مبارکباد بھی۔“

”ہو سکتا ہے وہاں بھی جواز مل جائیں۔“

”میچورڈ ہونا بھی ایک مسئلہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”نہ آپ شرمارہی ہیں نہ میں گھبرا رہا ہوں، کتنے اطمینان سے ترکی بہ ترکی گفتگو فرما رہے ہیں ہم دونوں۔“

”میں تو شاید اپنی مین ایج میں بھی ایسی ہی تھی۔“

”میرے ساتھ بھی معاملہ کچھ مختلف نہ تھا۔ والد کے سائے سے محرومی نے وقت سے پہلے مجھے سنجیدہ کر دیا۔“

وہ گویا اس کے دل کی بات کہہ گیا تھا۔ اس کے اپنے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ نعیم اپنے باپ کی موت کے باعث ان کے سائے سے محروم رہا تھا اور وہ باپ کے جیتے جی اس کے سائے سے محروم رہی تھی۔ خدا جانے مسز ظہیر نے اس سلسلے میں کیا بتایا تھا اور بتایا بھی تھا کہ نہیں۔ وہ تشویش میں پڑ گئی۔



”ایک بات بتائیے آپ کو کلر کیسے پسند ہیں، میرا مطلب ہے آپ کس قسم کے رنگوں کے کپڑے پہننا پسند کرتی ہیں۔ شوخ یا ڈل۔“

”موسم اور ماحول کی مناسبت سے شوخ بھی ہو سکتے ہیں ڈل بھی مگر یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”آپ کے لیے شاپنگ کرنے کو۔“

”میرا خیال ہے اب آپ مجھے خدا حافظ کہہ دیں۔ والدہ کہیں گی کیا رام کہانی سنانے بیٹھ گئے یہ لوگ۔“

”اوکے..... خدا حافظ! اینڈ آل دی بیسٹ.....“

”میلب کو بھی خدا حافظ کہہ دیجئے گا میری طرف سے۔“

”وہ بہت خوش ہو گا اگر آپ خود کہہ دیں گے اے۔“

”آپ کی می بتا رہی تھیں وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”کل صبح کہہ دیجئے گا۔ میں آپ کو اس کے آفس کا نمبر بھی دیئے دیتی ہوں۔“

”یہ ٹھیک ہے..... بتائیے نمبر۔“

منتہا نے اسے میلب کا نمبر نوٹ کر لیا۔ خدا حافظ کہا جواباً اس نے ایک مرتبہ پھر خدا حافظ کہا اور فون رکھ دیا۔ اس رات منتہا بستر پر لیٹی تو دیر تک نعیم کی آواز اور الفاظ اس کی سماعت میں بازگشت بن کر اس کے دل کو ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار کیے رہے۔ کتنی اپنائیت اور مٹھاس تھی اس کے لہجے میں!

\*\*\*

مختار نے اپنی جون پوں بدلی تھی کہ فضا اور تینوں بچے ہی نہیں فضا کے بہن بھائی بھی حیران تھے۔ کہاں وہ ازیت پسند آدمی اور کہاں یہ محمل مزاج شخص۔ بیوی بچوں کی بنیادی احتیاجات زندگی بھی نظر انداز کر دینے والا آدمی تحائف پر تحائف لانے لگا تھا۔ اس بار آیا تو فضا کے لیے چار طلائی چوڑیاں لے کر۔

”یہ کہاں سے آئیں؟“ فضا نے چونک کر پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”آم کھانے سے مطلب رکھو۔“

”کیا مطلب؟“

مختار نے اس کے شانوں پر ہاتھ دھر دیے اور یوں مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر پل بھر کو تو فضا کو وہ کوئی اور ہی آدمی لگا۔

”یہ بتائیے اتنے پیسے کہاں سے آنے لگے ہیں آپ کے پاس۔“

”جان من! تمہارے لیے پیسوں کی کیا کمی۔“

فضا کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ حس لطیف سے عاری وہ ازیت پسند شخص کتنے میٹھے لہجے میں بول رہا تھا۔

”پہلے تو کبھی اتنے مہربان نہیں رہے آپ؟“

”تم نے محبت کرنا سکھانے کی کوشش ہی نہیں کی خود ہی سیکھا ہوں۔“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا

پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”لاؤ پہنا بھی دوں۔“

فضا پر سرشاری سی طاری ہونے لگی۔ اس شخص کی محبت کو تو وہ گزرے برسوں میں بوند بوند ترستی رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہننانے کے بعد اس نے پوچھا ”کیسی ہیں؟“

”بہت اچھی!“ وہ اپنی کائی کوالٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم بھی تو بہت اچھی ہو۔“ اس نے کہا۔

فضا نے بے ساختہ چونک کر بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھا۔

وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے بولا ”کتنی خوبصورت ہو تم!“  
فضہ نے مجھوب ہو کر نگاہیں چرائیں اور ایک مرتبہ پھر اپنی کلائی میں پڑی چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے بولی ”اتنے قیمتی تحفے کا شکریہ!“

”تم سے زیادہ قیمتی نہیں۔“  
”تھینک یو!“ اچانک اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئیں اور وہ شرماتے ہوئے بولی ”ایک تحفہ میں بھی دوں گی آپ کو۔“

”زہے نصیب!“

”میں نے.... میں نے بے بی کنسیو کر لیا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔  
”کیا!“ وہ ہڑبڑا کر بولا۔

”ہاں۔“ فضہ نے کہا ”اب ہمارے چار بچے ہو جائیں گے۔“  
”اے.... اے ضائع کرا دو۔“ وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے قدرے ناگواری سے بولا۔  
فضہ کو دھچکا لگا۔

وہ تو اس خوش گمانی میں بیٹھی تھی کہ وہ خوش ہو گا۔  
”کیوں؟“ وہ دل شکستہ لہجے میں بولی۔

”یار! یہ کوئی عمر ہے اس قسم کے کاموں کی! بچے جوان ہو گئے ہیں۔“

اردو۔ انگریزی۔ پنجابی۔ سندھی۔ پشتو

**لکھیں آپ — کتابی شکل بہم دیں گے**

اپنی قلمی کاوشیں \* آپ بیتی \* افسانے \* ناول \* غزلیں \* نظمیں \* سفرنامے خاندانی حالات پر مبنی داستانیں اور دیگر ہر قسم کی نگارشات جن کو آپ یادگار بنانے کے خواہش مند ہیں یا اپنے وہ قابل قدر تجربات و مشاہدات جنہیں آپ دوسری نسل تک منتقل کرنے کے متمنی ہیں، اس کی تصحیح و ترتیب اور اشاعت کیلئے ہماری خدمات حاصل کریں ہمارے ادارے کو مستند قلم کاروں، شاعروں ادیبوں اور صحافیوں کا تعاون حاصل ہے جو آپ کی نگارشات کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔

نوآموز لکھنے والوں کے لیے نادر موقع • مسودات کی تصحیح بھی مناسب معاوضہ پر کی جاتی ہے۔

**معیاری طباعت و اشاعت کا ایک قابل اعتماد ادارہ**

14۔ نابھہ روڈ۔ لاہور (پاکستان) فون: 042-7230230

فیکس: 042-7224363 ای میل: zulfi9211@hotmail.com

**ایبلاغ**



اچھا تو یہ سبب تھا۔  
 وہ دھیرے سے مسکرا کر اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی ”بچے جوان ہو گئے ہیں تو کیا!.... آپ کو اس بات کی خوشی  
 نہیں کہ ہم بھی ابھی بوڑھے نہیں ہوئے۔“  
 ”لوگ کیا کہیں گے!“ وہ دھیرے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولا۔  
 ”کیا کہیں گے! خدا نخواستہ کوئی ناجائز بچہ تو ہے نہیں جو ہم لوگوں سے ڈریں اور ان کی پروا کریں۔“  
 ”بہر حال میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“  
 ”نہیں مختار میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ مجھے بس بچوں کی وجہ سے دو چار دن لحاظ آتا رہا لیکن اب..... اب تو  
 مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے..... مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں مردگی سے دوبارہ زندگی میں لوٹ آئی ہوں۔ یہ بچہ تو میرا  
 سب سے پیارا سب سے خوش بخت بچہ ہو گا۔ کیا پتا اسی کی قسمت سے آپ اتنے بدل گئے ہوں۔“  
 ”کیا پتا اس کی یا کسی اور کی۔“ وہ زو معنی لہجے میں بولا۔  
 ”کسی اور کی کس کی؟“ فضا نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا اور اس کی ناک کو دھیرے سے چھوتے ہوئے بولا ”ہو سکتا ہے تمہاری۔“  
 ”نہیں۔“ وہ یک لخت اداس ہو گئی ”میں اتنی خوش قسمت کب ہو سکتی ہوں بھلا۔“  
 ”مجھ سے پوچھو تم کتنی خوش قسمت ہو۔“  
 فضا نے الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔  
 ”ہاں۔“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا ”ایک خبر سناؤں گا تو تم خوشی سے اچھل پڑو گی۔“  
 ”کیا؟“ فضا نے چونک کر پوچھا۔  
 ”سنا دوں؟“  
 ”ہاں ہاں۔“  
 ”واقعی سنا دوں؟“  
 ”بھئی سنا بھی چکیں اب۔“  
 ”بے ہوش تو نہیں ہو جاؤ گی۔“  
 ”میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔“  
 ”واقعی!“  
 ”آزمائیں۔“  
 ”اچھا دل تھام کر سنو۔“  
 ”تھام لیا دل بس اب سنا بھی دیں۔“  
 ”تم یقین نہیں کرو گی۔“  
 ”مالی گاڈ!“ فضا زچ ہو گئی۔  
 ”اچھا سنو..... میں لندن جا رہا ہوں۔“  
 فضا نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا۔  
 کیا وہ سچ کہہ رہا تھا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکے کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکے تو دکے  
ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا  
ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے  
پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیسی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے  
بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔  
اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی  
نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔  
گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی  
کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے  
بھنور میں پھنس گیا تھا۔

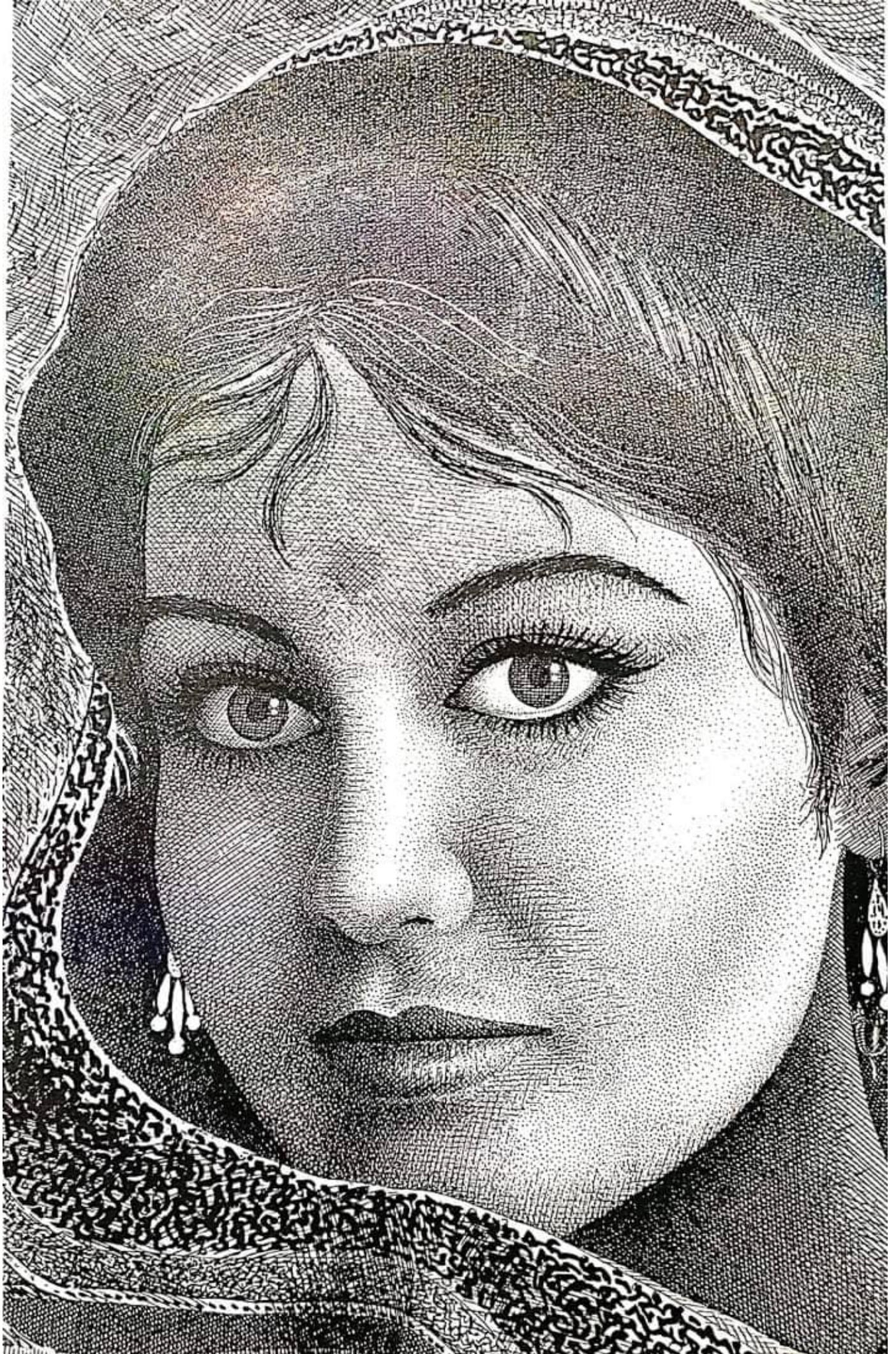
**محببتوں سے گنہگار یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سار ہونے کی دل گداز داستان**

ناہید سلطانہ اختر

قسط 14









”مذاق مت کیجئے۔“

”مذاق نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”اتنی لمبی گپ ہانکنے کی کیا ضرورت پیش آگئی آپ کو۔“

”میں نے کہا تھا تا تم یقین نہیں کروں گی۔“

”بات کچھ یقین کرنے والی بھی تو ہو۔“

اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے اپنی پتلون کی پچھلی جیب میں اڑسا ہوا ایک دبیز کاغذی لفافہ نکالا اور فضا کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے!“

”میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ۔“

”جھوٹ مت بولیں۔“

اس نے لفافہ کھولا اور اس میں سے ایک پاسپورٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ”خود دیکھو لو“ پاسپورٹ کے درمیان ٹکٹ بھی موجود ہے۔“

فضا نے ایک کشمکش کے عالم میں اسے دیکھا۔

”لو دیکھ لو پاسپورٹ ویزا، ٹکٹ سب اصلی ہیں..... لو دیکھو۔“ اس نے بااصرار پاسپورٹ اور اس کے صفحات کے سچ دہکا ٹکٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

فضا نے اسی کشمکش کی کیفیت میں پاسپورٹ کھول کر دیکھا۔ پاسپورٹ واقعی مختار ہی کا تھا۔ ٹکٹ ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کا تھا اور اسی کے نام پر تھا۔ مختار نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لیا پھر ایک مخصوص صفحہ کھول کر اس پر چپاں ویزا دکھاتے ہوئے بولا ”ویزا بھی دیکھ لو اصلی ہے۔“

فضا نے ابھی ابھی نظروں سے اسے دیکھا اور اٹکتے ہوئے بولی ”کے..... کیسے..... کیوں..... کس لیے جارہے ہیں؟“

وہ مسکرا دیا پھر بولا ”کیسے کا کیا مطلب جیسے سب جاتے ہیں ویسے ہی میں بھی جا رہا ہوں اور کیوں اور کس لیے کا جواب یہ ہے کہ پیسہ کمانے اور کچھ عیش عشرت کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے زندگی پر۔“

”اور..... ہم لوگوں کا کیا بنے گا؟“ فضا کے لہجے میں تشویش تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”فکر کیوں کرتی ہو جان من تمہیں بھی وہیں بلا لوں گا۔“

”اتنا آسان ہے کیا!“

”کیوں؟ مشکل بھی کیا ہے۔“

”سنا ہے ویزا ہی نہیں دیتے۔ آپ کو کیسے مل گیا؟“

”بس ایک مہربان نے لگوادیا۔“

”کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔“ وہ یک لخت بھر کر بولی۔

”کیوں بھی؟“ اس نے چونک کر فضا کو دیکھا۔

”بس..... اپنا دلیس اپنا ہوتا ہے۔“

”یار! تھوڑا پیسہ ویسہ بنا کر واپس لٹ آؤں گا۔“

”نہیں چاہیے مجھے پیسہ..... مجھے اپنے اور بچوں کے لیے صرف آپ کی ضرورت ہے۔“



”عجیب عورت ہوا!“

”کیوں؟ اس میں عجیب ہونے کی کیا بات ہے۔“

”عورتیں پیسہ مانگتی ہیں، عیش آرام مانگتی ہیں، زیور کپڑا مانگتی ہیں اور تم کہتی ہو پیسہ نہیں چاہیے۔“

”اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی طلب کی بات ہے۔ میں انسانوں سے پیار کرنے والوں میں سے ہوں اُن میں سے نہیں جو بے جان مادی چیزوں سے پیار کرتے ہیں۔“

”نہیچر ہونے کا بڑا نقصان یہی ہے۔“

”کیا! اس نے چونک کر مختار کو دیکھا۔“

”فورا لیکچر شروع ہو جاتا ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں لندن لندن جانے کی۔ یہاں رہتے ہوئے تو کئی کئی ہفتوں بعد شکل دکھاتے ہیں وہاں جا کر تو شاید..... اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اسے شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔“

”شاید؟“ مختار نے اس سے بات کی تکمیل چاہی۔

”پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک چاہنے والے نے ویزا لگوا دیا بلکہ.... ٹکٹ بھی وہی دے رہا ہے۔ ایک مرتبہ چکر لگا کر آجاؤں گا تو پھر راستہ کھل جائے گا۔“

”ایسا کون چاہنے والا ہے آپ کا جس نے ویزا بھی لگوا دیا اور ٹکٹ بھی دے رہا ہے۔“

”ہے کوئی۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ”ہو سکتا ہے میرے جانے سے تمہارے اور بچوں کے لیے بھی کوئی راستہ نکل آئے۔ یہاں کیا رکھا ہے بھی۔“

”فضہ نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا اور بولی ”یہ تو ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے۔“

”اوہ! پھر وہی ثقیل الفاظ..... آسان..... آسان زبان بولا کہ..... پتا ہے تم ایک پڑھی لکھی خاتون ہو..... یاں کیا بن گیا ہے ہمارا قومی مزاج؟“

”ہم ایک ناشکری قوم ہیں۔ کیا نہیں ملتا ہے ہمیں یہاں۔ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، عزت اور سب سے بڑھ کر آزادی اور ہم پھر بھی بہانے بہانے اپنے دیس کو کوسے پیٹتے رہتے ہیں۔ باہر جا کر ڈش واشنگ کرنے اور دوسرے تیسرے درجے کا شہری بن کر رہنے میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں۔“

”وہاں ڈش واشنگ میں اتنا مل جاتا ہے جو یہاں افسری میں بھی نہیں ملتا۔“

”لوگ ایمانداری سے کام کرنے لگیں اور اتنی ہی محنت یہاں بھی کریں جتنی باہر جا کر کرتے ہیں تو شاید اپنا دیس بھی انہیں اتنا ہی دینے کے لائق ہو جائے۔“

”اچھا بھی اچھا استانی جی، تم جیتیں میں ہارا لیکن لندن بہر حال جاؤں گا۔“

”ایسے کہہ رہے ہیں جیسے لندن میں کوئی اہم کام انکا پڑا ہو۔“

”ہاں ہے تو۔“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں بولا۔

”کیا ہے؟“

”اپنے اسی مہمان سے ملنا ہے جس کی وجہ سے ویزا ملا ہے اور جس نے ٹکٹ دیا ہے۔“

”اتنے برسوں میں پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا آپ نے اس کا۔“

”دوست تھا مگر دوستی اتنی گہری نہیں تھی۔“

”شادی شدہ ہے؟“

"خاہر ہے.... جس سے میری دوستی ہوگی وہ کوئی بچہ تو ہو گا نہیں.... شادی شدہ ہے۔ بچے بھی ہیں۔ دو بیٹیاں بڑی بڑی مگر...."

"مگر؟"

"گھر ٹوٹ گیا ہے اس کا۔"

"گھر ٹوٹ گیا ہے؟"

"ہاں.... علیحدگی ہو گئی میاں بیوی میں۔"

"کیوں؟"

"بس اس کا دل کسی اور پر آگیا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا۔"

"بے مروت.... بے وفا کہیں کا.... ایسے آدمی سے دوستی رکھتے ہیں آپ جو بیوی کا نہ ہوا وہ کسی اور کا کب ہو گا۔"

"بھئی کبھی کبھی حالات عجیب ہو جاتے ہیں۔ آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔"

"کہیں آپ بھی نہ ہو جائیے گا۔" فضا نے اسے تکی کی نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر جھینپ کر نظریں چرائیں۔

"جانے کا پروگرام کب ہے؟"

"سولہ تاریخ کو۔"

"اسی مہینے!"

"ہاں ہاں۔"

"کتنے دن کے لیے؟"

"ویزا تو چھ مہینے کا ہے۔ بڑھ سکا تو بڑھوا بھی لوں گا۔"

فضا نے سٹپا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں! اتنے دن رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوست ہی سے تو ملنے جا رہے ہیں۔"

"بھئی کمانا پیسہ بھی بنانے کی کوشش کروں گا۔ وہاں کا ایک پونڈ یہاں کے اتنی بچاسی روپے۔"

فضا کا دل اس خیال سے پکھلنے لگا کہ وہ دنوں نہیں مہینوں کے لیے اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"یار! تم تو ایسے رو رہی ہو جیسے میں مرنے جا رہا ہوں۔"

"خدا نہ کرے۔" وہ اس کے گریبان میں اپنا منہ چھپاتے ہوئے بولی۔

وہ دھیرے دھیرے اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

فضا کا جی بھر آیا۔ اپنی سسکیاں سینے میں گھونٹنے کو اس نے اپنے ہونٹ باہم بھیجنے لیے۔ یہ احساس انتہائی تکلیف دہ تھا کہ برسوں بعد اب جبکہ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا تو سمندر پار جا رہا تھا۔ آنے والے دنوں میں تو اسے مختار کی ضرورت تھی!

\*\*\*

منتہا کو نئے اسکول میں اپنے فرائض منصبی سنبھالے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اب تک کی اجمالی روداد یہ تھی کہ پہلا دن جوائننگ دینے، چارج لینے اور اسکول کا ایک سرسری دورہ کرنے کے علاوہ چند فوری اور ضروری ہدایتوں اور اقدامات میں گزرا تھا۔ بابو تاج محمد کو اس نے فوری طور پر ایک گھنٹی بازار سے منگوانے کی ہدایت کی تھی۔ گھنٹی کی جگہ



دیکھنے کے ڈھکنے کو چمچ سے بجانا انتہائی مضحکہ خیز بات تھی۔  
 ”میڈم جی کھنٹی کی پرچیز کے لیے پہلے کوڈل پرو-سجر پورا کرنا ہو گا۔“ تاج محمد نے کہا۔  
 ”کیا ہے کوڈل پرو-سجر؟“ اس نے پوچھا۔

تاج محمد اس کے اس استفسار پر پہلے چونکا پھر مسکرایا کہ پرنسپل صاحبہ کا اسکول کی کھنٹی خریدنے کے محکمہ جاتی طریقہ کار سے ناواقف ہونا تو خاصانیک شگون اور خوش آئند بات تھی۔

”میڈم جی!“ اس نے دونوں ہاتھ اپنی ناف کے مقام پر باندھتے ہوئے انتہائی منکسر المزاجی سے کہا ”پہلے ہمارے پاس ڈیمانڈ آئے گی کسی ٹیچر یا پی ٹی آئی سر کی طرف سے کہ اسکول کے لیے ایک عدد کھنٹی کی ضرورت ہے۔ اسکول آفس اس ڈیمانڈ کو آپ کے سامنے ”پٹ اپ“ کرے گا۔ آپ اس کے جینوئن ہونے یا نہ ہونے کا یقین کریں گی اور ضروری رہنما رکس دیں گی۔ اگر ڈیمانڈ جینوئن ہوئی تو کیس لوکل پرچیز کمیٹی کو فارورڈ کر دیا جائے گا۔ خریداری آپ کی اپنی پاور میں ہوئی تو پرچیز کمیٹی کے ممبران مارکیٹ کا سروے کریں گے اور کم سے کم ریٹ پر بہترین آئٹم خریدنے کی کوشش کریں گے۔ ویسے کوئی سپلائر بھی سپلائی دے سکتا ہے۔ پرچیز آپ کی پاور میں نہ ہونے کی صورت میں کوئٹیشنز کال کی جائیں گی۔“

بابو تاج محمد دست بستہ خاصی دفتری عبارت اور ایک مرتبہ میں یاد نہ ہونے والی اصطلاحات بول گیا تھا۔ منتا کو اس خیال سے وحشت ہونے لگی کہ ایک کھنٹی خریدنے کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کار۔  
 ”یہ تو مجھے معلوم ہے تاج محمد صاحب۔“ اس کے چپ ہو جانے پر منتا نے اپنی لاعلمی پر بڑی خوبی سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

”اچھا جی!“ بابو تاج محمد چونکا پھر مسکرایا مگر اب کے بار اس کی مسکراہٹ پہلے سے قطعاً مختلف تھی ”پھر کیا مشکل ہے جی۔ پرچیز آپ کی اپنی پاور میں ہے۔ کھنٹی کی قیمت ہی کتنی ہوتی ہے۔ اقبال بازار جا کر سنگل کوئٹیشن پر خرید لائے گا۔“

”اقبال کیوں! یہ اس کا کام تو نہیں۔“ منتا نے کہا ”اور پہلے تو آپ ڈیمانڈ منگوائیے۔“

”میڈم جی! سنگل کوئٹیشن پر تو اکثر اقبال ہی پرچیز کرتا ہے۔ ڈیمانڈ بعد میں آتی رہتی ہے۔ کھنٹی کی ڈیمانڈ بھی آتی رہے گی اور پرچیز کمیٹی نے کیا کرنا ہوتا ہے کاغذوں پر دستخط جو اکثر میں خود ہی کر لیتا ہوں۔“ بابو تاج محمد نے یک بیک گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور پرچیز کو آسان بنا دیا۔

”نہیں تاج محمد صاحب، آپ آئندہ کسی اور کے دستخط خود نہیں کریں گے۔ کھنٹی کی خریداری مروجہ طریق کار کے تحت مگر آج ہی کی جائے گی۔ ڈیمانڈ منگوائیے، مجھے پٹ اپ کیجئے۔ اسکول کے پاس اپنی وین موجود ہے ہی پرچیز کمیٹی کا سینئر ممبر مارکیٹ میں جائے اور کھنٹی خرید لائے۔“

”میڈم جی پیسے..... بیٹی کیش میں تو شاید اتنے پیسے نہیں ہوں گے۔“

”بیٹی کیش!“ منتا کے کان کھڑے ہوئے۔ یہ کیا بلا تھی!

”ہم تو جی عام طور پر یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی چھوٹی موٹی چیز خریدنی ہو جس کی قیمت پرنسپل کی پاور میں ہو تو ادھر ادھر کسی سے پیسے پکڑ کر خریداری کروا لیتے ہیں پھر اسکول فنڈ سے پیسے نکالے اور ادھار چکا دیا۔ کیونکہ دکاندار تو کوئی بھی ادھار نہیں دیتا۔“

”پیسوں کی آپ فکر نہ کیجئے۔“

”اچھا جی!“ بابو نے چونک کر اسے دیکھا۔

”پیسے فی الحال مجھ سے لے لیجئے۔ جائیے آپ پی ٹی وی سے ڈیمانڈ لیں۔ کل صبح دیکھنے کا ڈھکنا نہیں بجا چاہیے۔“

”بستر میڈم جی۔“

\*\*\*

اگلی صبح آپا صغیراں بڑے خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے نئی کھنٹی بجا رہی تھی اور ادھر ادھر دوڑتے بھاگتے شور مچاتے بچوں کو گزری کل کی طرح ڈپٹ بھی رہی تھی ”اوائے بد بختو گروڈنڈ میں چلو سبلی کا ٹیم ہو گیا ہے۔“

آپا کھنٹی بجانے اور بچوں کو گھڑکنے میں اتنی محو تھی کہ اسے یہ ہوش بھی نہ تھا کہ نئی پر لپل اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی اسے دیکھ ہی نہیں سن بھی رہی تھی!

طویل برآمدے کے آخری سرے تک کھنٹی بجانے کے بعد آپا صغیراں پٹی تو منتہا خود بھی برآمدے میں نکل آئی اور اس نے آپا کو اپنی طرف آنے کا اشارہ دیا۔ وہ ایک ہاتھ میں پیتل کی دائروں کی کھنٹی اور دوسرے میں چھوٹی سی چوٹی ہتھوڑی لیے اس کی طرف لپکی۔

”جی میڈم جی۔“

”آپا صغیراں۔“ منتہا نے بڑی نرمی سے کہا ”آج کے بعد بچوں کو اس طرح نہ ڈانٹنا، ڈپٹنا... ٹھیک ہے۔“

”میڈم جی یہ سنتے جو نہیں ہیں۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”کیوں نہیں سنیں گے۔ پیار کی بات تو جلدی اثر کرتی ہے۔ یہ بات آپ یوں بھی تو کہہ سکتی ہیں، پیارے بچو اسبلی کا ٹیم ہو گیا ہے گراؤنڈ کی طرف دوڑو شاہاش۔ آپ دیکھئے گا کیسے شوق سے دوڑیں گے سب کے سب۔“

”ٹھیک ہے میڈم جی۔“ آپا نے نیم دلی سے کہا۔

آپا صغیراں کو نرمی سے تنبیہ کرنے کے بعد منتہا نے تیزی سے اسبلی گراؤنڈ کا رخ کیا۔ بچے حیران ہو ہو کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے استفہامیہ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔ پی ٹی وی جو منہ میں وصل دبائے اسے بجاتے اور ہاتھ میں ڈنڈا لیے گیٹ سے گراؤنڈ کی طرف آرہے تھے۔ منتہا کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھ کر ان کی رفتار بھی بڑھ گئی اور وہ جلد ہی منتہا تک پہنچے۔

”السلام علیکم۔“ منتہا نے کہا۔

”اوہو میڈم آپ نے تو مجھے سلام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ آپ ہماری سربراہ ہیں، آپ کو بڑائی حاصل ہے۔ اصولاً مجھے پہلے سلام کرنا چاہیے تھا آپ کو۔“

”بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مخصوص ہے قدیر صاحب۔ بندے کا مقام عجز و انکساری کے سوا کچھ نہیں۔“

”سبحان اللہ! کیا عمدہ خیالات ہیں آپ کے۔“

”میرے نہیں قدیر صاحب، یہ تو بنیادی اسلامی تعلیم ہے۔“

”بے شک!“

”آج آپ کا مولا بخش اداس نظر آتا ہے۔“ منتہا نے تیز تیز چلتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

پی ٹی وی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو ایک نظر دیکھا پھر جھینپ کر مسکراتے ہوئے اسے اپنی بغل میں دبایا اور بولے ”میڈم خوشی سے نہیں مجبور استعمال کرنا پڑتا ہے۔“

”مجبور ابھی ترک کر دیجئے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا جسمانی سزا کی ڈائریکٹریٹ کی طرف سے سخت ممانعت ہے۔“

”جی۔“ وہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولے۔



اسمبلی کے چبوترے پر اقبال کل کی طرح آج بھی مستعد کھڑا تھا۔ منتہا کو آتے دیکھ کر اس نے اور بھی فرض شناس نظر آنے کی کوشش کی اور اپنی آواز میں مصنوعی نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا ”بچو! قرأت کے لیے کون آئے گا؟“

”ایک منٹ اقبال۔“ منتہا نے اسے ٹوکا پھر اشارے سے چبوترے سے نیچے اتر آنے کی ہدایت کی۔ وہ نیچے اتر آیا۔

”آپ اپنی اصل ڈیوٹی پر جائیں۔ دفتر میں اس وقت کوئی نہیں۔ کوئی فون آسکتا ہے۔“

”میڈم جی اتنی صبح کس کا فون آتا ہے۔“

”کسی کا بھی آسکتا ہے۔“ منتہا کو اس کا جواب اچھا نہ لگا تھا۔

”نہیں آتا میڈم جی۔“

”بحث نہیں اقبال۔“ منتہا نے قدرے ناگواری سے کہا۔

”میڈم میں چلا جاؤں گا تو اسمبلی کون کرائے گا۔“

”یہ تمہارا کام نہیں ہے۔“

”جی ہست۔“ وہ خفیف ہو گیا۔

اقبال کے جانے کے بعد منتہا نے پی ٹی آئی کی طرف دیکھا اور بولی ”اسمبلی آپ کرائے قدر صاحب!“

”بہت اچھا کیا میڈم جی آپ نے۔ یہ اقبال تو خود کو پرنسپل سمجھتا ہے۔“ پی ٹی آئی دھیرے سے بولے ”ویسے اس

کے یہاں سے جانے کا ایک فائدہ اور بھی ہوگا، وہ نیچرز کو جا کر بتائے گا کہ میڈم اسمبلی گراؤنڈ میں ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ

اسمبلی میں آجائیں، یہاں تو جی نیچرز اسمبلی میں آنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں جو آتی بھی ہیں تو یوں دور دور رہتی

ہیں جیسے اسمبلی کا ٹھیکا پی ٹی آئی اور اقبال نے لے رکھا ہے۔ چلیں آج اقبال کی تو چھٹی ہوئی۔“

”مگر آپ کی نہیں ہوگی۔“ منتہا نے مسکرا کر کہا۔

”خادم ہوں میڈم!“ پی ٹی آئی نے دست بستہ کہا۔

”خادم تو جناب ہم سب ہی ہیں سرکار کے۔“ منتہا بولی۔

”بے شک... بے شک!“

”نیچے اسمبلی کے منتظر ہیں۔“ منتہا نے کہا۔

پی ٹی آئی نے سرعت سے اسمبلی کے چبوترے پر پیش قدمی کی۔

گزری کل کی طرح پھر قرأت، نعت اور قومی ترانے کے لیے بچوں کو با اصرار بلانا پڑا اور اس دوران گزشتہ روز کے

برعکس متعدد نیچرز جن میں غزالہ ناصر بھی شامل تھیں لپک جھپک اسمبلی گراؤنڈ میں آ پہنچیں۔ پی ٹی آئی کا قیاس

درست ثابت ہوا۔ یقیناً یہ اقبال کی خبر سنانی کا نتیجہ تھا۔

منتہا کا خیال تھا پی ٹی آئی یا غزالہ ناصر بچوں سے اسے متعارف کرائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ نعت خوانی کے بعد

پی ٹی آئی نے بچوں کو قومی ترانے کے لیے اٹھین شین کھڑے ہونے کی کاشن دے دی۔

”ایک منٹ قدر صاحب!“ منتہا کو انہیں روکنا پڑا اور کسی کے مدعو کیے بغیر از خود مائیک پر آ گئی۔

”السلام علیکم بچو۔“ اس نے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ پُر جوش انداز میں جواب ملا۔

”کیسے ہیں آپ سب؟“

”ٹھیک۔“

”گڈ! میں نے سوچا میں خود ہی آپ سے اپنا تعارف کرا دوں۔ میرا نام مس منتہا احمد ہے۔ آپ کے اسکول میں

پرنسپل کی حیثیت سے کام کرنے آئی ہوں، یعنی میں آپ کی نئی پرنسپل ہوں۔ آپ کا اسکول بہت اچھا ہے بہت بڑا ہے۔ انشاء اللہ آنے والے دنوں میں ہماری آپ سے باتیں بھی بہت ہوں گی اور بہت سے کام بھی ہوں گے۔ آپ کی یونیفارم پر لگا ہوا بیچ چپکے سے ہر ایک کو بتا رہا ہے کہ آپ اس اسکول کے طالب علم ہیں لہذا کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے کسی کو آپ سے شکایت ہو یا آپ کے اسکول کی بدنامی ہو۔ صبح جب اسمبلی کی بیل بجے تو آپ کا کام ہے اچھے بچوں کی طرح تمیز سے مگر تیزی سے اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچیں۔ شور مچاتے یا چیختے چلاتے ہوئے نہ آئیں۔ اپنی لائن میں کھڑے ہوں۔ سیدھی لائن بنائیں۔ اسمبلی میں خاموش رہیں۔ قوی ترانہ جوش سے پڑھیں اور اسمبلی کے بعد بہت تمیز سے اپنے اپنے کلاس روم کی طرف جائیں۔ آج میں دیکھوں گی کہ آپ لوگ کس طرح اپنے کلاس رومز کی طرف جاتے ہیں، آج کے لیے بس اتنی ہی باتیں۔ تھینک یو ویری میچ!

بچوں نے ہدایات کی پاسداری کی۔ تمام لائنیں انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ اسمبلی گراؤنڈ سے اپنے کلاس رومز کی جانب گئیں۔ منتہا آخری لائن کے جانے تک اسمبلی کے چوتھے پر کھڑی بغور جائزہ لیتی رہی۔ بچوں کی ایک خاطر خواہ تعداد اسمبلی کے دوران بلکہ اسمبلی کے بعد بھی اسکول پہنچتے ہوئے دیکھی گئی منتہا ان سے علیحدہ بات کی۔

اسمبلی کے بعد منتہا نے اسکول کا ایک تفصیلی راؤنڈ لیا۔ ایک ایک کلاس روم میں گئی۔ بچوں سے بات کی۔ ان کے مسائل کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ روغن ادھڑی اور پنسلوں، رنگ برنگے قلموں اور روشنائی کے چھینٹوں سے انی دیواروں، میلے فرشوں، خستہ بام و دروں والے نیم تاریک کمرہائے جماعت میں بیٹھے بچوں کے چہرے بھی مدقوق سے لگ رہے تھے۔ ان کمروں میں بجلی کے پوائنٹس تھے مگر لمب یا ٹیوب ندرد۔ کچھ تھے مگر بیشتر ناکارہ۔ دو چار کمروں میں دیواروں پر کیلنڈر، ٹائم ٹیبل اور تعلیمی چارٹس بھی لکے دکھائی دیئے مگر بیشتر جماعتیں ان آرائشوں سے بے نیاز دکھائی دیں۔ فرنیچر بعض کلاسوں میں تو نیچر کی کرسی کے سوا تھا ہی نہیں، بچے میلی کچلی دریوں یا نیچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور جن میں تھا اس کی حالت انتہائی ناگفتہ تھی۔ ٹوٹے ہوئے، لڑکھرائی ٹانگیں، ادھوری پشتیں، تکلیف دہ نشستیں۔ نیچر ٹیبل اور چیرے بعض کمروں میں تھیں بعض میں نہیں۔

غزالہ ناصر اور پی ٹی آئی بھی منتہا کے ساتھ ساتھ تھے۔

"اسکول بلڈنگ پر رنگ روغن کب سے نہیں ہوا؟" منتہا نے پوچھا۔

"پی ٹی آئی صاحب اندازاً کتنا عرصہ ہو گیا ہو گا؟" غزالہ نے پی ٹی آئی کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کافی عرصہ ہو گیا۔" پی ٹی آئی نے سوچ بچار کے بعد گول مول سا جواب دیا۔

"بہت خراب ہو رہی ہے حالت کلاس رومز کی بلکہ پوری ہی بلڈنگ کی۔ جن کمروں میں صفائی اور روشنی کا معقول بندوبست نہ ہو وہاں بچوں کا کیا دل لگے گا پڑھائی میں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسے نیم تاریک اور گھٹے گھٹے کمروں میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ بچوں کو بٹھانا مضرت بھی ہے۔"

"میڈم جی رنگ روغن کروائیں بھی تو کیا۔ ٹھیکے دار سخت بے ایمان! چونے میں رنگ گھول کر لگا جاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے بد تمیز، کاپیوں پر کم دیواروں پر زیادہ لکھتے ہیں۔ تیسری جماعت سے قلم لگوا دیتے ہیں نیچر۔ نیچے روشنائی دیواروں پر چھڑک چھڑک کر ان کی حالت تباہ کر دیتے ہیں۔" پی ٹی آئی نے مدلل مکالمہ ادا کیا۔

"انہیں تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ سمجھایا جائے تو نہیں کریں گے۔" منتہا نے کہا۔

پی ٹی آئی اور غزالہ ناصر کی نگاہیں معنی خیز انداز میں ملیں اور دونوں زہر لب مسکرا دیئے۔

منتہا نے کن انگلیوں سے ان کے تاثرات دیکھے۔

راہداریوں میں جا بجا کاغذ، رہبرز اور پنسلوں کے تراشے پڑے دکھائی دیئے۔ دور دور تک کوئی خاک دان موجود نہ تھا۔ خاک دان تو کلاس رومز میں بھی شاذ ہی دکھائی دیئے تھے۔ جہاں تھے بھی وہاں تیل یا گھی کے خالی ڈبوں کو خاک



دان کے طور پر رکھا گیا تھا۔

”ڈسٹ بنز نہیں ہیں؟“ منتہا کا روئے سخن غزالہ کی طرف تھا۔  
”میڈم! ایک دوستے لوگ چڑا کر لے گئے۔“ غزالہ کے لہجے میں اب خفت تھی۔  
”کون لوگ؟“

غزالہ کو روہانسا ہوتے دیکھ کر پی ٹی آئی نے دست تعاون دراز کیا ”میڈم جی بیس آس پاس کے لوگ۔ ایک ہی چار دیواری میں دو ادارے ہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کون کس کی کس چیز پر ہاتھ صاف کر گیا۔“  
ہاتھ رومز اہل رہے تھے۔ ٹوئیٹوں میں پانی برائے نام آ رہا تھا۔ دس یونٹوں پر مشتمل ہاتھ روم بلاک میں صرف تین یونٹوں میں لوٹے تھے باقی بغیر لونوں کے۔

”لوٹے ہیں نہیں بچے پانی کیونکر استعمال کرتے ہوں گے؟“ منتہا نے پوچھا۔  
”میڈم جی لوگ چڑا لے جاتے ہیں۔“ غزالہ اس بار سچ بچ روہانسی ہو گئیں۔  
”لوٹے بھی چڑا لے جاتے ہیں۔“ غزالہ کو روہانسی دیکھ کر منتہا نے اپنی مسکراہٹ سے اسے خاطر جمع رکھنے کا حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”میڈم صاحبہ لوٹے تو لوگ پہلے لے جاتے ہیں۔“ پی ٹی آئی بولے۔  
”جی ہاں لوٹے اور چھپے ہمارے ہاں ہمیشہ ان ڈیمانڈز رہتے ہیں۔“ منتہا نے ذومعنی لہجے میں خوش دلی سے کہا۔  
”جی! پی ٹی آئی چونگے۔“

”میڈم بڑی گہری بات کہہ گئی ہیں۔“ غزالہ مسکرا دیں۔  
”تھینکس گاڈ غزالہ آپ مسکرائیں تو۔“ منتہا نے غزالہ کی جانب دیکھا پھر بڑی رسانیت سے بولی ”آپ قطعاً ٹینس نہ ہوں۔ میں تنقید کرنے کی نہیں یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہمیں فوری طور پر کیا کیا کام کرنے ہوں گے۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے اپنا ہاتھ غزالہ کے شانے پر دھرتے ہوئے مزید کہا ”اور مجھے پورا یقین ہے غزالہ کہ ان فوری توجہ طلب کاموں میں آپ اس اسکول کی سینئر ماسٹر ٹیچر ہونے کے ناتے میری دست راست ہوں گی۔“

”بے شک!“ پی ٹی آئی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انتہائی خشوع و خضوع سے تائید کی۔  
منتہا نے گردن موڑ کر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف دیکھا پھر بولی ”شک تو اس میں بھی نہیں کہ اسکول کے نظم و ضبط میں پی ٹی آئی یا ڈی پی ای سربراہ ادارہ کا دست راست ہوتا ہے۔“  
”حاضر میڈم!“ پی ٹی آئی نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔  
”تھینک یو۔“

کلاس رومز، کارڈورز اور ہاتھ رومز کے معاملے کے بعد وہ تینوں اسکول گراؤنڈ میں آئے تو منتہا کو دو تین چیزیں بہت کھنکھیں۔ پینے کے پانی کی ٹنکی کے زیریں حصے میں فالتو پانی کے نکاس کے لیے کالی بلکہ کچھ زردہ نالی، ٹنکی کے بالکل نزدیک کچرا گھر اور چوکیدار کی کونھڑی کے سامنے وسیع قطعہ زمین پر بنا پھل پھول دار باغیچہ جس کے نامناسب محل وقوع نے اسکول گراؤنڈ ہی نہیں خود اس باغیچے کا حسن بھی مار رکھا تھا۔  
کچھ زردہ پانی کی نالی کے بارے میں غزالہ اور پی ٹی آئی نے مشترکہ طور پر بتایا کہ خاکروب اس نالی کی صفائی کرنا اپنے دائرہ کار سے باہر قرار دیتے ہوئے اس کی صفائی سے قطعاً غفلت برتا تھا۔ اس سلسلے میں سابق سربراہان ادارہ بھی اس سے کام لینے سے قاصر رہے تھے۔

کچرا گھر کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ وہ زیر زمین ٹینک تھا جو برسوں قبل اسکول بلڈنگ کی تعمیر کے وقت پانی ذخیرہ

کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اور بعد ازاں اسے پرائمری ہی نہیں ہائی اسکول کے خاکروب نے بھی کچرا گھر بنالیا تھا۔ دونوں اسکولوں کا کچرا خاکروب اس ٹینک میں پھینکتے رہتے تا آنکہ وہ ابلنے لگتا پھر اس میں آگ لگادی جاتی اور کچرا خاکستر ہو جانے کے بعد بیچے سے اس ٹینک سے خاک شدہ کوڑا کرکٹ نکال کر اسکول کے قرب وجوار میں کہیں ڈھیر کردیا جاتا جسے میونسپلٹی کی گاڑی اٹھا کر لے جاتی اور ٹینک دوبارہ استعمال کے لائق بن جاتا۔

”میونسپل کارپوریشن نے شہر میں جا بجا بڑے بڑے کوڑے دان رکھوائے ہوئے ہیں، کیا یہاں آس پاس کوئی نہیں؟“ منتہا نے پوچھا۔

”جی ہے تو۔“ غزالہ نے کہا۔

”ہمارے سو پیرز وہاں کیوں نہیں ڈالتے کوڑا؟“

”میڈم یہ لوگ کہتے ہیں دور جانا پڑتا ہے اور روزانہ کئی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ یہ ان کے لیے آسان ہے کہ تین چار ہفتے کوڑا یہاں جمع کرتے رہتے ہیں پھر ایک روز صفائی کر دیتے ہیں۔“

”ان کی اس سہولت کی قیمت اسکول گراؤنڈ بلکہ پورے اسکول کی بدنامی ہے۔“ منتہا بولی۔

غزالہ اور پیٹی آئی کی نگاہیں باہم ملیں اور جھک گئیں۔

باغیچے کے بارے میں پتا چلا کہ یہ اسکول کے چوکیدار اور اس کے اہل خانہ کا جو چوکیدار کے ساتھ ہی اسکول کی حدود میں مفت رہائش، مفت بجلی، مفت پانی کی بنیاد پر مقیم تھے مشترکہ شوق و مشغلہ تھا۔ اس باغیچے میں وہ موسمی پھل، پھول اور سبزیاں لگاتے اور خود بھی کھاتے دوسروں کو بھی ممنون احسان کرتے۔

غزالہ نے بتایا کہ چونکہ محکمے کی جانب سے اسکول کے لیے مالی کی کوئی پوسٹ تا حال منظور نہیں کی گئی تھی اس لیے برسوں سے مذکورہ چوکیدار ہی اسکول کے لیے مالی کام بھی کر رہا تھا جس کے عوض اسے اسکول فنڈ سے ماہانہ اعزازیہ دیا جاتا تھا۔

منتہا نے ایک نظر چوکیدار کے کوارٹر کے مقابل آراستہ باغیچے پر ڈالی اور دوسری اسکول بلڈنگ کے سامنے ایک ہی جگہ پر دھڑے بے شمار گملوں پر پھر اس کی نظر اسکول بلڈنگ کے بے آب و گیاہ برآمدوں اور راہداریوں کی جانب اٹھی اور وہ چشم تصور سے ان یکجا رکھے بے شمار گملوں کو اسکول کے بے آب و گیاہ برآمدوں اور راہداریوں میں جگہ پاتے اور انہیں خوش نمائی بخشتے دیکھنے لگی۔

گراؤنڈ سے دفتری جانب پیش قدمی کرتے ہوئے غزالہ نے بڑی انکساری سے اور دھیمے سُر میں کہا ”میڈم آج بریک میں پارٹی ہے۔“

”پارٹی! کس سلسلے میں؟“ منتہا نے پوچھا۔

”اسٹاف ممبرز آپ کو ویل کم ر۔ لپشن دے رہے ہیں۔“

”اوہ نو غزالہ۔“ منتہا ٹھٹک گئی ”اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”میڈم جی جانے والے کو فیرویل اور آنے والے کو ر۔ لپشن دینا تو اسکول کی روایت ہے۔“

”آئی ایم سوری غزالہ میں اس قسم کی روایتوں اور شکافت کے بجائے کام کی قائل ہوں۔“

”میڈم! روایتوں کا اپنا ایک حُسن ہوتا ہے۔“

”مگر ان کی پاسداری میں انسان اکثر زحمت ہی اٹھاتا ہے۔ وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔“

”میڈم اب تو سب کچھ اریج ہو چکا۔“ غزالہ نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”مجبوری!“ منتہا دھیرے سے مسکرائی۔

”اس بہانے تمام اسٹاف کا آپ سے تعارف بھی ہو جائے گا۔“



”بالآخر آپ نے اس پارٹی کا ایک معقول جواز ڈھونڈ ہی لیا۔“ منتہا نے کہا۔  
 ”میڈم صاحبہ! ہماری مسز غزالہ ناصر اس سلسلے میں بڑی سمجھ دار ہیں۔“ پی ٹی ٹی آئی بولے۔  
 ”مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔“ منتہا نے غزالہ کی جانب دیکھا۔

غزالہ بڑی انکساری سے مسکرائیں۔

اپنے دفتر میں داخل ہونے سے قبل اس نے اقبال سے جو اسے آتے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا، پوچھا۔  
 ”آج وہ لوگ نظر نہیں آئے جو کل آفس میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔“

”میڈم جی آئے تھے، میں نے کہہ دیا نئی میڈم آگئی ہیں اب یہاں نہ بیٹھیں۔“  
 ”انہیں پہلے بھی نہیں بیٹھنے دینا چاہیے تھا، یہ پرنسپل کا دفتر ہے انتظار گاہ نہیں۔ تاج محمد صاحب ابھی نہیں آئے؟“ اس نے اپنے دفتر سے متصل کلرک کے کمرے کا دروازہ مقفل پا کر پوچھا۔  
 ”نہیں جی۔“ اقبال نے مختصر سا جواب دیا۔

”کیوں؟“

”میڈم جی بابو تو بادشاہ ہیں جب مرضی آئیں جب مرضی جائیں۔“  
 ”مجھے اجازت ہے میڈم... اب آپ آگئی ہیں تو میں اپنا ٹائم ٹیبل سیٹ کر لوں۔“ غزالہ نے کہا۔  
 ”ضرور۔“

”میڈم صاحبہ تھوڑی سی تبدیلی میں بھی چاہتا ہوں اپنے ٹائم ٹیبل میں۔“ پی ٹی ٹی آئی بولے۔  
 ”جی دیکھ لیتی ہوں۔“

”اجازت میڈم۔“ پی ٹی ٹی آئی نے غزالہ کے ساتھ جانے کی اجازت چاہی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ اپنے دفتر میں آگئی۔ اقبال نے دروازے پر پڑے پردے پھیلا دیئے۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ گھٹا گھٹا سا کمر، گنجائش سے کہیں زیادہ فرنیچر، کھڑکیوں اور دروازوں پر دبیز پردے۔ دیواروں پر ایک نہیں تین کیلنڈرز، ٹیک بورڈز پر بڑی بے ترتیبی سے لگی ڈھیروں تصاویر جن میں سے بعض کے رنگ بھی پھیکے پڑ چکے تھے۔ غلط وقت ظاہر کرتی دیوار گیر گھڑی۔ ایک گوشے میں استادہ بڑے سائز کی فولادی الماری، پرنسپل کی میز کا دلچسپ شیشہ اور اس پر دھرا ڈھیروں اسباب۔ سائڈ ریک پر اوپر تلے دھری ڈھیروں فائلیں اور رجسٹروں کا پلندا۔ چوٹی ڈبے میں مقفل ٹیلی فون سیٹ۔ گرد آلود ڈکٹریاں، کالج کے زخمی پیپر ویٹ۔ پانی کا جگ اور گلاس۔ دیوار پر نصب کی بورڈ جس کے تمام ہک خالی تھے۔

منتہا کو یوں لگا جیسے اس کمرے میں آکر وہ باقی اسکول سے بالکل الگ تھلگ ہو گئی تھی۔ اس کمرے سے باہر کیا ہو رہا تھا وہ کچھ نہ دیکھ پا رہی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھی اور اس نے پہلے دروازے پر پڑے پردے دائیں بائیں سمیٹے پھر کھڑکیوں پر پڑے پردے سرکانے لگی۔ اقبال جو اسے دروازے پر پڑے پردے سمیٹتے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا کمرے میں در آیا۔

”میڈم جی پردے ہٹانے ہیں؟“

”ہاں۔“

”آپ بیٹھیں میڈم میں ہٹا دیتا ہوں لیکن پردے ہٹنے سے آپ ڈسٹرب ہوں گی جی بچوں کا شور اور لوگوں کا آنا جانا۔“

”یہی سب تو میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اقبال حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگا مگر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر پایا اور خاموشی سے ایک ایک کر کے کھڑکیوں پر

بڑے پردے سینے لگا۔ منتہا دوبارہ اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ پردے سمٹ جانے سے کمرانہ صرف روشن بلکہ کشادہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ دائیں بائیں آگے پیچھے کھلی کھڑکیوں اور دروازے سے وہ نہ صرف ایل شپ اسکول بلڈنگ کے بڑے حصے پر بلکہ گراؤنڈ پر بھی خاصی دور تک نظر رکھ سکتی تھی۔ پردے ہٹنے سے منظر کس قدر بدل گیا تھا۔ پردے ہٹانے کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ باقی اسکول سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھنے کا احساس دل سے جاتا رہا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ بابو تاج محمد کے آتے ہی اس نے انہیں بلوا بھیجا۔

"خیریت تاج محمد صاحب؟"

"جی میڈم۔" وہ بہت اطمینان سے بولا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو دیر کیوں ہو گئی۔"

"دیر سے تو نہیں آیا میڈم جی۔"

"اسکول لگے تو کافی دیر ہو گئی۔"

"میڈم جی آفس کا ٹائم تو اسکول سے الگ ہوتا ہے ناجی۔"

"تھکے کی جانب سے کوئی حکم نامہ ہے اس سلسلے میں؟"

"جی نہیں مگر یہ انڈرا سٹڈ ہوتا ہے کہ دفتر کا ٹائم..."

"سوری تاج محمد صاحب میں جس اسکول سے آرہی ہوں وہ غالباً ہماری ڈائریکٹریٹ کے زیر انتظام سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے اور وہاں دفتر کا تمام عملہ اسکول لگنے سے پہلے اسکول پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ میں چاہوں گی آپ بھی اسکول لگنے سے قبل نہ سہی اسکول لگنے کے وقت تو اپنے دفتر میں موجود ہوں۔"

"جی بہتر۔" تاج محمد نے بادل ناخواستہ کہا۔

منتہا کی نظر سامنے انھی تو اس نے دیکھا اقبال کھڑکی سے کان لگائے دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔

"میڈم جی کل کی ڈاک دیکھیں گی؟" بابو نے اپنی خفت دور کرنے کی کوشش کی۔

"ضرور تاج محمد صاحب۔"

وقتے تک وہ مختلف النوع کاموں میں مصروف رہی۔ ملاقاتیوں کی آمدورفت بھی جاری رہی۔ چوتھے پیریڈ کے آغاز پر وہ ایک مرتبہ پھر اسکول کاراؤنڈ لینے کے لیے انھی۔

وقتے میں وہ نیچرز کی جانب سے دیئے جانے والے استقبالیے میں شرکت کے لیے غزالہ کی معیت میں ہال میں پہنچی تو خاصا پر تلکلف اہتمام دیکھا۔ بیشتر نیچرز بھی خاصی بنی سنوری نظر آتی تھیں۔ غزالہ نے تمام ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے استقبالیہ کلمات ادا کیے، جو ابنا سے بھی شکریہ ادا کرنا پڑا پھر خورد و نوش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"میڈم آپ کو ہمارا اسکول کیسا لگا؟" ایک نوجوان نیچر نے پوچھا۔

"اب تو میرا بھی ہے۔" منتہا دھیرے سے مسکرائی۔

"آئی ایم سوری۔" سوال کرنے والی جھینپ گئیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ... اسکول تو سبھی اچھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی اچھا ہے مگر اچھے کو بہت اچھا بنانے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔"

بعض نیچرز نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور ان کی آنکھیں مسکرا دیں۔

منتہا ان کی نگاہوں میں درج تحریر بخوبی پڑھ سکتی تھی۔

"سوری میڈم! اس قسم کے مکالمے یہاں نہیں چلیں گے۔"

اگلے روز اسمبلی کی گھنٹی بجنے کے بعد اسمبلی گراؤنڈ کا رخ کرنے کے بجائے وہ کچھ دیر اپنے دفتر کے باہر آمد



میں کھڑی گردو پیش کا جائزہ لیتی رہی۔ گھنٹی بجنے کے بعد بھی چند نیچر ڈیر سے اسکول پہنچتی دکھائی دیں۔ منہا کو برآمدے میں کھڑی دیکھ کر ان میں سے ایک دو بڑے اطمینان سے اور ایک دو کچھ نجل ہو کر اسٹاف روم کی جانب چلی گئیں۔ اسٹاف روم سے چند نیچرز خراماں خراماں نکلتی نظر آئیں۔ منہا کو دیکھ کر ان میں سے ایک سرعت سے واپس پلٹی اور پھر فوراً ہی اسٹاف روم سے باہر نکل آئی۔ منہا کو اشارے سے سلام کرتی وہ سب برآمدے کی میزھیوں کی طرف بڑھیں اور انہوں نے اسمبلی گراؤنڈ کا رخ کیا۔ منہا ایک دو منٹ اور برآمدے میں کھڑی باقی نیچرز کے اسٹاف روم سے نکلنے کی منتظر رہی مگر کوئی آثار نہ پا کر اس نے خود اسٹاف روم کی جانب پیش قدمی کی۔

”ارے ابھی میڈم برآمدے میں کھڑی ہیں۔“ اسٹاف روم کے قریب پہنچنے پر اس نے کسی نیچر کو کہتے سنا۔ منہا ٹھٹک گئی۔

”کھڑی رہیں۔ ابھی کیا فرق پڑتا ہے۔“ ایک دوسری آواز سنائی دی۔

”ایسی کئی مدائیں آئیں اور گزر گئیں۔“ ایک اور بولیں۔

”جناب!“ کسی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”مسز مجید آپ چل رہی ہیں اسمبلی میں؟“ یہ غزالہ کی آواز تھی۔

”غزالہ گراؤنڈ میں دھوپ بہت ہوتی ہے۔“

ادھر غزالہ اسٹاف روم سے نکلیں ادھر منہا دروازے پر پہنچی اور اس نے ایک طائرانہ نظر سے دیکھا۔

ایک خاتون اسٹاف روم کی ایک دیوار پر لگے آئینے کے روبرو کھڑی اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھیں۔

دوسری تھریاس فلاسک سے چائے گگ میں انڈیل رہی تھیں۔

اسٹاف روم کے ایک گوشے سے آواز ابھری ”مسز حسن“ آج آپ نے بہت خوب صورت پرنٹ پن رکھا ہے کماں سے لیا؟“

منہا نے دروازے کو کھٹکھا کر ان سب کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہ آواز بلند کہا ”ایکسیو زمی پلیز! بچے اسمبلی میں ہمارے منتظر ہیں۔“

آن کی آن اسٹاف روم کا منظر بدل گیا۔

کوئی بیک اٹھا کر، کوئی دوپٹا سنبھالتی ہوئی، کوئی نظر چراتی، کوئی پیلو بچاتی سب اسمبلی میں جانے کو اسٹاف روم سے نکل آئیں۔ خود منہا ان سے پہلے ہی گراؤنڈ کا رخ کر چکی تھی۔

\*\*\*

نہیم اور فرحان بھی دعویٰ واپس جا چکے تھے۔ دونوں ہی اس مرتبہ بادل ناخواستہ گئے تھے۔

”جلدی آئیے گا۔“ لیلیٰ نے نہیم کی اتر پورٹ روانگی سے قبل اس کے گریبان کا بٹن چھوتے ہوئے بھیگی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

”تم رو رہی ہو!“

”نہیم.... نہیں تو۔“ اس نے نہیم کے سینے سے اپنا سر ٹکاتے ہوئے چپکے سے اپنے آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

”ادھر میری طرف دیکھو۔“ وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

لیلیٰ نے اس کی طرف دیکھنے اور زبردستی مسکراتے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں میں ایک بیک سیل رواں اثر آیا۔

”ارے ارے ارے.... یا رالے تو کام نہیں چلے گا۔ یہ آنا جانا تو لگا رہے گا۔ کیا تم ہمیشہ رویا کرو گی!“

وہ اسے بھیگی بھیگی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

"دعا کرو۔" وہ اس کی ناک کو بڑے پیار سے چھوتے ہوئے بولا "نعم بھائی کی جلدی سے شادی ہو جائے پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"کون سا کوئی ہمیشہ کے لیے۔" لیلیٰ نے منہ بسور کر کہا۔

"یار جب ہم چار ہوں گے نا تو مل کر امی جان کو راضی کر لیں گے کہ وہ بھی وہیں رہیں ہمارے ساتھ۔ فرحان اور نیہہ بھابی بھی ہوں گے اور تمہارا تو میکا بھی ہو گا وہاں۔ واہ بھی کیا ٹھاٹھ ہوں گے آپ کے!"

"وہ جب ہو گا تو ہو گا ابھی تو میں آپ کو بہت مس کروں گی۔"

"ہم دونوں تصور میں ایک دوسرے کو اپنے پاس بلا لیا کریں گے۔"

"تصور تو تصور ہی ہوتا ہے۔"

"مگر کچھ دیر کو دل تو خوش کر دیتا ہے، اچھا یار" وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولا "اب چلنا چاہیے، دیر ہو رہی ہے اور ہاں دیکھو مجھے سی آف کرنے چل تو رہی ہو مگر ائر پورٹ پر رونے کی نہیں ہوگی ورنہ میرا سفر اداس گزرے گا۔ اوکے!" نسیم نے اس کی ناک کو پھر چھوا۔

لیلیٰ نے اداس اداس سی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"ایک بار مسکراتو دو۔"

لیلیٰ نے بادل ناخواستہ مسکرانے کی کوشش کی اور شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی "آپ لوگوں نے میری جاب خواہ مخواہ چھڑوا دی۔"

"خواہ مخواہ کیوں؟ امی جان کو اور اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"اور آپ کو؟"

"یار تمہیں تو میں تم سے چڑا کر اپنے دل میں ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ دعا کرنا امیگریشن والوں کی نظر نہ پڑے۔"

لیلیٰ نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

"آئی لوو" وہ انتہائی محبت سے بولا۔

"تمہیں کیا معلوم مجھے تم سے کتنا پیار ہے" لیلیٰ نے دل ہی دل میں کہا۔

فرحان کی روانگی دو دن بعد تھی۔

"دل نہیں چاہ رہا تمہیں چھوڑ کر جانے کو" فرحان ائر پورٹ روانگی سے قبل اپنے کمرے کی خلوت میں نیہہ سے بولا۔

"مگر جانا تو پڑے گا۔"

"شٹ!"

"بڑی بات! زبان گندی ہو جاتی ہے۔ اور ایک بات بتائیں اگر جاتے ہوئے اتنے ہی ڈسٹرب ہوتے ہیں تو گئے کیوں تھے؟"

"اس وقت تم کب تھیں یہاں۔"

"اور سب تو تھے۔"

"ایک بات بتاؤں تمہیں؟" وہ محبوبانہ نگاہوں سے اس کے چہرے کا طواف کرتے ہوئے بولا "شادی سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ امی جیسی محبت مجھے دنیا میں کسی اور سے نہیں ہو سکتی مگر۔"

"مگر؟"

"شادی کے بعد پتا چلا کہ بیوی تو ماں کی محبت کا ہوا کر ڈالتی ہے۔"



"بڑی بات! مجھ پر خواہ مخواہ الزام تراشی مت کیجئے۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔"

"فرحان بھائی جلدی کیجئے!" باہر سے عدنان کی آواز سنائی دی۔

"چلتے ہیں یا ر!" فرحان نے دروازے کے رخ منہ کر کے بہ آواز بلند کہا پھر نیبہ کی طرف پلٹ کر اسے تنگی باندھ کر دیکھنے لگا۔

"وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں" نیبہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"جی بھر کر دیکھ لینے دو" وہ اسے میٹھی میٹھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے بالکل نزدیک آگیا اور اسے اپنی بانسوں کے حصار میں جکڑتے ہوئے بولا "کیا پتا پھر کب ملیں؟"

چند لمحے بے خودی میں گزرے پھر وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا "اپنا خیال رکھنا۔"

"آپ بھی.... آپ بھی اپنا خیال رکھیے گا۔"

"اور اس بد معاش کو پہلی پتی میری طرف سے دیتا۔"

"او گاڈ" فرحان مجھے تو ڈر ہے کہ آپ کہیں اس کا نام ہی یہ نہ رکھ دیں۔"

"بد معاش؟" وہ مسکراتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں بولا۔

نیبہ دھیرے سے ہنس دی۔

"فرحان بھائی! عدنان کی آواز پھر آئی" دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا یا ر! اچھا!" اس نے بہ آواز بلند کہا پھر نیبہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "جانا ہی پڑے گا۔"

نیبہ کو اس کی موجودگی میں بھی اس کی دوری کا احساس آزرہ کرنے لگا۔

\*\*\*

چند ہی دنوں میں اسکول میں نمایاں تبدیلیاں دکھائی دینے لگیں۔ کمروں اور برآمدوں کے گندے فرش صاف ستھرے نظر آنے لگے۔ خاکروب صبح اور وقفے کے بعد دو مرتبہ صفائی کرتا، برآمدوں میں پونچھا لگاتا۔ گراؤنڈ سے کوڑا کرکٹ صاف ہو گیا۔ کچرا گھر کے طور پر استعمال ہونے والے زیر زمین ٹینک کو پڑا دیا گیا۔ بیت الخلا روزانہ دو مرتبہ دھوئے جاتے۔ ایک جگہ دھڑے سیکڑوں گملوں کو پورے اسکول میں جا بجا آراستہ کر دیا گیا۔ حالانکہ جب منتانے انہیں جا بجا رکھنے کو کہا تو جو کیدار جو جزوقتی مالی کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا، بڑا چپس بہ جیس ہوا۔

"میڈم جی، بچے بھاگتے دوڑتے ہیں توڑ دیں گے" اس نے کہا۔

"کیسے توڑ دیں گے، انہیں اسمبلی میں سمجھا دیا جائے گا۔"

"دیکھ لیں میڈم، اس سے پہلے کبھی گملے برآمدوں میں اور کمروں کے باہر میٹھیوں پر نہیں رکھے گئے۔"

"کوئی بات نہیں، اب رکھ کر دیکھتے ہیں" منتانے بڑے اطمینان سے کہا۔

"میڈم، ایک ایک گملا ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپے کا ہے۔ ٹوٹیں گے تو بہت نقصان ہو گا۔"

"جب تک نقصان نہیں ہو گا، بچے سیکھیں گے بھی نہیں۔ تھوڑا بہت نقصان تو برداشت کرنا ہی پڑے گا تبھی

بچوں کی تربیت ہوگی۔ جب انہیں یہ احساس دلادیا جائے گا کہ یہ اسکول ان کا اپنا ہے، اس اسکول کی چیزیں ان کی اپنی

ہیں، ان کی حفاظت کرنا انہی کا کام ہے تو انشاء اللہ وہ محتاط رہیں گے۔ نقصان کا اندیشہ تو انسان کے قدم اٹھانے میں

بھی ہوتا ہے مہتاب، کیا پتا پہلے قدم پر ہی گر پڑے لیکن اس خوف سے یہ تو نہیں ہوتا ناں کہ آدمی ایک ہی جگہ پر سر

ڈال کر بیٹھ جائے جیسے یہ بے چارے گملے پڑے رہتے ہیں۔ ان ڈور پودوں کو کلاس رومز کے باہر راہداری میں رکھیں،

برآمدوں میں رکھیں، میٹھیوں پر رکھیں اور باقی باہر اس طرح رکھے جائیں کہ اسکول خوش نما محسوس ہو۔"

”جی بہتر“ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔

تیسرے دن لی جانے والی اسٹاف میٹنگ میں اس نے ٹیچرز کو بڑی رسانیت سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ایک ٹیم لیڈر کے طور پر کام کرنے کے لیے آئی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ ٹیم بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرے، اس میٹنگ میں اس نے انہیں روزمرہ معمولات کے سلسلے میں ضروری ہدایات کے علاوہ تدریس سے قطع نظر چند ذمے داریاں بھی تفویض کی تھیں، بعض کو انفرادی طور پر اور بعض کو گروپ کی صورت میں۔ دو ٹیچرز کو اس نے صبح اسمبلی کرانے کی ذمے داری سونپی تھی اور ان سے کہا تھا ”ہر صبح جب بچے اسمبلی میں آئیں تو انہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ آج کی صبح کل سے مختلف اور زیادہ خوش گوار ہے۔ جب وہ اسمبلی سے جائیں تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور لے کر جائیں جو ان کی کردار سازی میں معاون ہو۔ انہیں اسمبلی پروگرام میں بھی ہر روز ایک تنوع کا احساس ہونا چاہیے۔“

اس نے اس میٹنگ میں بلا تامل یہ بات واضح کر دی تھی کہ اسکول میں نظم و ضبط اور حتی الوسع اچھی پڑھائی اس کی اولین ترجیحات ہوں گی۔ جو ساتھی ان ترجیحات میں اس کے معاون ہوں گے وہ اس کے دوست بھی ہوں اور عزت بھی پائیں گے لیکن جنہوں نے ان بنیادی ترجیحات کو نظر انداز یا پامال کرنے کی کوشش کی ان سے تعلقات ناگوار بھی ہو سکتے ہیں جو کہ وہ کسی قیمت پر نہیں چاہے گی۔

اسکول میں نظم و ضبط چند ہی دن میں خاصا بہتر ہو گیا تھا۔ بچوں، نوے فیصد اساتذہ اور تدریسی عملے نے وقت پر آنا شروع کر دیا تھا۔ صبح اسمبلی کی گھنٹی بجنے پر اکثر ٹیچرز بچوں سے پہلے اسمبلی گراؤنڈ کی جانب لپکتی دکھائی دیتے۔ چونکہ صبح کو گیٹ پر اپنی ڈیوٹی سنبھالنے سے قبل ہی پودوں اور درختوں کو پانی دے چکا ہوتا۔ وہ گملے جو اس نے بادل ناخواستہ اسکول میں جا بجا تقسیم کر کے رکھے تھے، ان میں سے اب تک دو تین گملوں ہی کے شہید ہونے کی خبر ملی تھی۔ منہتا کو یقین تھا آئندہ حالات اور بہتر ہو جائیں گے۔

ہر دوسرے تیسرے دن اس کی فاروقی صاحب سے فون پر بات ہوتی اور وہ خوش ہو کر کہتے ”ویل ڈن! ویل ڈن! میں منہتا!“

نیا اسکول جوائن کرنے کے تقریباً دو ہفتے بعد جب سابقہ اسکول میں اسے اس کے اعزاز میں دی جانے والی روایتی الوداعی تقریب میں مدعو کیا گیا تو فاروقی صاحب نے ایک مجلد کتابچہ اسے دیتے ہوئے کہا ”برسوں قبل ہماری ڈائریکٹریٹ نے سربراہان مدارس کی رہنمائی کے لیے مختلف معاملات کے سلسلے میں اصول و ضوابط پر مبنی یہ کتابچہ اداروں میں تقسیم کیا تھا۔ ویسے تو یہ آپ کے اسکول میں بھی موجود ہونا چاہیے مگر میں نے احتیاطاً آپ کے لیے اپنی کاپی سے ایک فوٹوکاپی بنوا کر جلد بند ہوا دی ہے۔ اسے ایک بار پڑھ ڈال لے گا پھر وقتاً فوقتاً پڑھتی رہے گا کام آئے گی۔“

”تھینک یو دیری میچ سر!“

\*\*\*

زندگی کے دوسرے معاملات بھی جاری و ساری تھے۔  
نعیم دینی سے دو تین مرتبہ فون کر چکا تھا۔ وہ جب بھی فون کرتا تھا، ”میں“ مایب اور اس سے فرداً فرداً بات کرتا۔ اس کا انداز گفتگو، لہجے کی تلاوت اور اپنائیت سننے والوں کے دل میں گھر کرتے چلے جاتے۔  
منہتا، اچھی بھالی اور لیلیٰ سے وقتاً فوقتاً فون پر بات کرتی رہتی۔ میں بھی خیر و عافیت پوچھ لیتیں بلکہ وہ تو نعیم کے جانے کے بعد ایک مرتبہ مایب کے ہمراہ ان سے ملنے بھی گئی تھیں اور واپسی پر انہوں نے منہتا کو بہت رشک سے بتایا تھا۔ ”بھئی کیا سعادت مند اولاد دی ہے اللہ میاں نے تمہاری ساس کو!“  
”والدہ نے تو انہیں ابھی سے ساس بنادیا“ منہتا نے جی ای جی میں سوچا۔



”جب تمہارے رشتے کی بات چلی اور ہم لوگ وہاں گئے تو اس وقت بس ڈرائنگ روم ہی دیکھا تھا۔ آج تمہاری ساس کا کرا بھی دیکھا۔ بیٹوں نے ان کے کمرے کو کسی بڑے اسپتال کا وی آئی پی روم بنا رکھا ہے۔ خدا نخواستہ کسی ایمرجنسی میں فوری طبی امداد کا پورا بندوبست کروا رکھا ہے کمرے میں۔ اور لیلیٰ وہ تو ایک پاؤں سے کھڑی رہتی ہے ساس کی خدمت کو۔“

”اچھی لڑکی ہے“ منتہا نے تائید کی۔

ایک روز لیلیٰ نے اس سے کہا ”منتہا باجی، کبھی آپ بھی تو چکر لگائیں یہاں کا۔“  
”دیکھو بھئی لیلیٰ!“ منتہا نے کہا ”میں کوئی انیس سو چالیس کی لڑکی تو ہوں نہیں جو تمہاری اس بات پر اپنا پورا دوپٹا انگلی پر لپیٹ ڈالوں، کسی روز آج بھی جاؤں گی۔“

”سچ! پھر تو بہت مزہ آئے گا۔ ممانی جان بھی بہت خوش ہوں گی۔ بس کسی دن آجائیں جلدی سے۔“

”تم تو سچ سچ سیریس ہو گئیں۔“

”ہو گئیں کا کیا مطلب! میں واقعی ہوں۔“

”تم خود کیوں نہیں آجاتیں ہماری طرف؟“

”اللہ نہیں منتہا باجی، یہ مشکل ہے۔“

”کیوں بھئی؟“

”ممانی جان اپنی بیماری کی وجہ سے بہت کم کہیں آتی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے میں بھی گھر پر ہی رہتی ہوں۔ امی کے ہاں بھی بس کھڑے کھڑے ہی جانا ہوتا ہے۔ دیکھئے نا اتنی ایمرجنسی میں میری اور فہیم کی شادی کا مقصد دراصل یہی تو تھا نا کہ ممانی جان تنہا نہ رہیں تو پھر اس بات کا خیال کیوں نہ رکھا جائے؟“

”گڈ گرل!“

”تو پھر آپ کب آ رہی ہیں؟“

”فی الحال تو مشکل ہے۔“

”کیوں؟“

”نیر نے ہمیں اسٹینڈ بائی کر رکھا ہے، کیا پتا کس وقت کال آجائے۔“

”ہاں، بھالی کی طرف تو سارا وقت میرا دھیان بھی لگا رہتا ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو خیال انہی کی طرف جاتا ہے۔ ویسے تو خیر ڈاکٹر نے چوبیس تاریخ دے رکھی ہے مگر امی کہا کرتی ہیں، اللہ میاں کا حکم کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اور امی کو ہم نے یہ بھی کہتے سنا ہے کہ بیٹا ہو تو کبھی کبھی وقت سے کچھ پہلے ہی دنیا میں آجاتا ہے۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے منتہا باجی، بھالی کے ہاں بیٹا ہو گیا بیٹی؟“

منتہا مسکرا دی۔ لیلیٰ اس سے ایسے پوچھ رہی تھی جیسے اسے غیب کا علم آتا ہو۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بھئی دیکھئے ہماری فیملی میں تو مدتوں بعد کوئی متا پیچہ آئے گا لہذا بیٹا بیٹی جو بھی ہو، سب کو پیارا ہو گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے ہماری فیملی میں بچوں کی لائن لگی ہوئی ہے؟“

لیلیٰ بے ساختہ ہنس دی۔ ”اللہ نہیں ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”بہر حال میرا مطلب وہی ہے جو تمہارا تھا“ منتہا نے خوش دلی سے کہا۔

”اچھا ایک بات بتائیے.... سچ سچ، نعیم بھائی آپ کو کیسے لگے؟“

”بُرے نہیں۔“

”اف اللہ منتہا باجی، کیا گول مول جواب دیا ہے آپ نے مگر میں سمجھ گئی ہوں۔ واقعی بہت اچھے ہیں نعیم بھائی۔ ہمارے خیال میں تو آپ دونوں ہی خوش قسمت ہیں کہ انہیں آپ اور آپ کو وہ مل گئے۔ خدا کرے وہ دن جلدی آئے جب آپ ہمیشہ کے لیے اس گھر میں آجائیں۔“

\*\*\*

نیسہ کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ مسز ظہیر کے گھر والے، ’ممی‘، منتہا اور ملیب سب بے حد خوش تھے۔ دونوں گھرانوں میں برسوں بعد ایسی خوشی آئی تھی۔ فرحان نے خبر ملتے ہی اسپتال فون کیا تھا۔

”نیسہ‘ میں اتنا خوش ہوں، اتنا خوش کہ بتا نہیں سکتا۔“

”آپ کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں اندازہ کر سکتی ہوں۔“

”آئی ایم سوری جان! جب تمہیں میری ضرورت تھی تو میں تمہارے پاس نہیں تھا۔“

”کوئی بات نہیں آپ کی بھی تو مجبوری تھی۔“

”یہ کیسی مجبوری ہے یا رکھ میں باپ بنا ہوں اور اپنے بچے کو دیکھنے، اسے گود میں لینے، پیار کرنے اور اس کی ممتی منی انگلیوں کو چھو کر دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔“

”فکر مت کیجئے، کچھ دنوں میں صاحب زادے بنفس نفیس آپ کے پاس ہوں گے۔“

”پتا نہیں ہو گا کہ نہیں ہو گا.... کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔“

آپ بھی میری طرح اپنے حسن میں اضافہ کیجئے۔

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

برسہاڑس کے تجربے اور تحقیق کے بعد جتنی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور مرقات سے تیار کردہ: بدقادرانغ، مہاسوں کو بھی صاف کر کے چہرے کی رکت نکالتی ہے۔

یونانی کریم  
گلکسی



اسٹاکسٹ:

- |  |  |  |
|--|--|--|
| <ul style="list-style-type: none"> <li>□ ہارٹا جی ائی اے آرک</li> <li>□ شامہ دھرم پور</li> <li>□ اسمن گورنمنٹ ہسپتال</li> <li>□ مرادی دھرم پور</li> <li>□ جی ائی اے آرک</li> <li>□ دکن ہسپتال</li> <li>□ اسٹاکسٹ</li> <li>□ سید ائی اے آرک</li> <li>□ دھرم پور</li> <li>□ شامہ دھرم پور</li> </ul> | <ul style="list-style-type: none"> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> </ul> | <ul style="list-style-type: none"> <li>□ طاہر شاہ</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> <li>□ ملی ہسپتال</li> </ul> |
|--|--|--|

اسٹریٹریٹریٹریٹ

□ مقیم الدین برادرز کچی گلی نمبر 41 سو ہال کراچی۔ فون: 2433682 □ ریاض محمود 69 نیو عالم مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون: 7666264

□ باب الاشفادہ دواخانہ اندرون بخاری مارکیٹ گٹہ کھڑکیاں۔ فون: 574058 □ شامی لٹری دواخانہ بوہڑ بازار راولپنڈی۔ فون: 5505519

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی بی پارسل منگوانے کے لئے

حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159، کراچی۔ 74600 پاکستان۔



"توبہ کیجئے، کیسی باتیں کرتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، بد معاش کیا کس پر ہے؟"

"ابھی تو کچھ پتا نہیں" نیہ نے لیٹے لیٹے فرحان سے بات کرتے ہوئے نگاہ ترچھی کر کے پنگوڑے میں سوتے

متورم آنکھوں والے بچے کو دیکھا اور بولی "مجھے تو نیو بورنز سب ایک جیسے لگتے ہیں۔"

"نیو بورنز سب ایک جیسے لگتے ہیں" فرحان نے اس کا جملہ قدرے تشویش سے دہرایا پھر بولا "اے سنبھال کر

رکھنا بابا، کیس بدل بدل نہ جائے کسی سے۔"

"ڈونٹ وری" وہ دھیرے سے مسکرا دی "اے ڈیوری روم سے باہر نکالنے سے قبل ہی اس کے ہاتھ میں اس

کے نام کا پتہ پنا دیا گیا تھا۔"

"کیا! نام بھی رکھ دیا تم لوگوں نے.... مجھ سے پوچھتے بغیر ہی.... یا ریتا تو دیتے کیا نام رکھنے جا رہے ہو؟" وہ ایک ہی

سانس میں بولا۔

"نام ابھی نہیں رکھا ہے۔ امی کہہ رہی تھیں آپ سے مشورہ کر کے رکھیں گی۔"

"مگر تم تو ابھی کہہ رہی تھیں اس کے ہاتھ میں اس کے نام کا پتہ پنا دیا گیا ہے؟"

"بے بی آف ڈاکٹر نیہ عرفان لکھا ہے اس پر۔"

"آئی سی!"

"امی پوچھیں گی تو کیا نام بتائیں گے انہیں؟"

"بد معاش!" وہ ہنس دیا "کر کیا رہا ہے اس وقت؟"

"سورہا ہے.... اتنا پیارا اتنا معصوم ہے فرحان کہ آپ دیکھیں گے تو عاشق ہو جائیں گے اس پر۔"

"میری جان! ہم تو دیکھتے بغیر ہی سودا کی ہو رہے ہیں۔"

"کوئی اچھا سا نام بتائیے گا امی کو۔"

"تم نے کچھ سوچا ہو تو بتا دو۔"

"ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔"

"لا حول ولا قوۃ! کیسے گھاڑاں باپ ہیں ہم دونوں۔ سنا ہے لوگ پرگنسی کنفرم ہوتے ہی پانچ سونا موموں کی لسٹ

بنا ڈالتے ہیں اور اپنا یہ حال کہ بیٹا دنیا میں آچکا اور ہم نے اب تک کوئی نام بھی نہیں سوچا۔"

"سوچتے تو تب کہ جب کچھ دن فرصت سے اکٹھے رہنے کا موقع ملتا۔ شادی کے بعد تھوڑے سے دن اور اب لیلیٰ

کی شادی کے موقع پر کچھ دن۔"

"ہاں۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"نام جو بھی ہو، آپ کے نام سے ملتا جلتا ہونا چاہیے۔"

"میرے نام سے ملتا جلتا؟ ہوں... بے ایمان کیسا رہے گا؟"

"مرضی ہے... آپ کا بیٹا ہے، جو جی چاہے رکھ دیجئے۔"

"صرف میرا نہیں میری جان! ہم دونوں کا بیٹا ہے۔ ہمارے ملن کی نشانی ہے۔ یہ اُن انمول لمحوں کی یادگار ہے

نیہ جو ہم دونوں نے اکٹھے گزارے۔ اے میری طرف سے بہت میٹھا سا پیار کرنا اور اس کے کان میں چپکے سے کہنا

بد معاش، تیرا باپ تجھے دیکھنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔"

نیہ کا جی بھر آیا اور آنکھیں چمک اٹھیں۔

کیسی مجبوری اور حسرت تھی فرحان کے لہجے میں!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث طبع ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

معاش کی مجبوری انسانوں کو اپنے پیاروں سے دور کہاں کہاں کھینچ لے گئی تھی۔

\*\*\*

مستہانے اسکول کا چپا چپا دیکھ ڈالا تھا۔ صبح اسمبلی کے بعد وہ کم از کم آدھ پون گھنٹا اسکول کا راؤنڈ لیتی پھر دفتر میں آکر آنے اور جانے والی ڈاگ دیکھتی۔ دن بھر استانیان اپنی اپنی جماعتوں کے مسائل لے کر اس کے پاس آتی رہتیں، اسمبلی میں بچوں سے یہ کہنے کا کہ اگر کوئی خاص مسئلہ ہو تو وہ براہ راست اس کے پاس آسکتے ہیں یہ اثر ہوا تھا کہ کبھی کبھی بچے بھی اپنے مسائل کے ساتھ براہ راست اس کے پاس آجاتے۔ والدین، سرپرستوں اور دیگر ملاقاتیوں کا بھی دن بھر آنا جانا لگتا رہتا۔ مستہانہ کو جہاں ذرا فرصت میسر آتی وہ کلاسوں میں تدریسی عمل کا جائزہ لینے اور اسکول کا طول و عرض کھنگالنے کے لیے اٹھ جاتی۔ اس نے گوشہ گوشہ دیکھ ڈالا تھا۔ غزالہ ناصر جن سے اس کی چند ہی دنوں میں غیر معمولی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی، ایک روز مسکراتے ہوئے بولیں ”میڈم! آپ تو اسکول کے ان حصوں میں بھی جا پہنچی ہیں جو میں نے اس اسکول میں اپنی بارہ سالہ سروس کے دوران بھی نہیں دیکھے تھے۔“

”مثلاً“ مستہانے پوچھا۔

”مثلاً چوکیدار کے کوارٹر کا عقبی حصہ... ہم میں سے کسی نے کبھی وہاں جانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی مگر آپ نے تو وہاں ایک نئی دنیا دریافت کر لی۔“

مستہانہ مسکرا دی۔

”اس نئی دنیا کی مرمت کے لیے ڈائریکٹریٹ سے منظوری لے لی ہے ہم نے۔ انشاء اللہ ایک آدھ روز میں کام شروع ہو جائے گا۔“

”ریٹلی میڈم! ہمارے تو فرشتوں کو بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ ہو رہا ہے؟“

”لوگوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے غزالہ!“

”واقعی!“

قصہ یہ تھا کہ ایک روز مستہانہ اسکول کے طول و عرض کھنگالتی چوکیدار کے کوارٹر کے عقبی حصے میں پہنچی تو وہاں ٹوٹے فرنیچر کا انبار لگا دیکھا۔ اس انبار کی اوپری سطح پر اسے کچھ چیزیں قابل مرمت دکھائی دیں۔ اس نے پی ٹی آئی کو بلوا کر ان سے اس انبار کی بابت استفسار کیا کہ کب سے وہاں پڑا تھا۔ وہ تو شاید موقع کی تلاش ہی میں تھے، انہوں نے بتایا کہ ہر روز کلاسوں سے ایک دو کرسیاں اور ڈیسک ٹوٹ پھوٹ کر اس ڈھیر میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور اسکول کا چوکیدار اس ٹوٹے فرنیچر کو اپنے کوارٹر میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ عرصے سے جاری ہے اور باوجود اس کے کہ تقریباً ہر سال ہی گورنمنٹ بجٹ سے اسکول کو کچھ نہ کچھ ضرور فراہم کیا جاتا ہے، نیز اسکول فنڈ سے بھی کئی مرتبہ نیا فرنیچر خریدا جا چکا ہے اسکول میں فرنیچر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے یہی وجہ تھی کہ کئی کمروں میں بچے فرش پر بیٹھنے پر مجبور تھے۔

”لیکن چوکیدار ٹوٹا فرنیچر ایندھن کے طور پر استعمال کرنے کا مجاز تو نہیں۔“



”میڈم جی، یہاں مجاز اور غیر مجاز کون دیکھتا ہے۔ لوگ بس اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔“

”حیرت ہے!“

”نہیں، ایسی حیرت کی بات بھی نہیں“ پی ٹی آئی معنی خیز لہجے میں بولے۔

”میرا مطلب ہے چونکہ کسی نے روکا نہیں؟“

”آپ روکنے کی بات کرتی ہیں میڈم جی! وہ تو نوکنے کی بھی اجازت نہیں دیتا، برامان جاتا ہے۔“

”برامانتا ہے تو مانا کرے، یہ سرکاری امانت ہے، اس میں خرد برد نہیں ہونی چاہیے۔ ڈائریکٹریٹ کی ایس او پی یہ ہے کہ ہر سال فرنیچر کی اسٹاک ٹیکنگ کی جائے، ناقابل استعمال فرنیچر کو ناکارہ قرار دینے کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا جائے اور اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اگر کنڈم کیا جانے والا فرنیچر سرکاری بجٹ سے لیا گیا ہے تو سرکاری خزانے میں اور اگر وہ اسکول فنڈ سے خریدا گیا ہے تو اسکول فنڈ میں جمع کی جائے۔۔۔ کیا یہاں سالانہ اسٹاک ٹیکنگ نہیں کی جاتی؟“

”کی جاتی ہے مگر سب بوگس، لیجرز میں جتنا فرنیچر درج ہے، اسکول میں آپ کو اس سے شاید آدھا ہی ملے گا۔“

”اوہ! یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔ ہمیں ڈائریکٹریٹ کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔“

”میڈم، انکوائری کمیٹی بیٹھ جائے گی اور ہاتھ کچھ آئے گا نہیں کیونکہ چور اپنے ہاتھ صاف رکھے ہوئے ہے۔ آپ مفت میں پریشان ہوں گی اور اسکول بدنام۔ مجھے ناچیز کی رائے یہ ہے کہ فرنیچر کے اس ڈھیر میں سے جتنا فرنیچر قابل مرمت ہے، اس کی مرمت کروالی جائے اور باقی کو کنڈم کروا کے فرنیچر لیجرز میں بھی حساب کتاب درست کر لیا جائے۔“

”اس ڈھیروں فرنیچر میں سے قابل مرمت فرنیچر نکالے گا کون؟“

”آپ مجھے دو تین بندے دیں، میں نکلا دوں گا۔“

”کب؟“

”کل۔۔۔ پرسوں۔۔۔ جب بھی۔“

”کل پرسوں نہیں آج ہی قدیر صاحب! ورنہ لوگ ہاتھ کی صفائی بھی دکھا سکتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ پی ٹی آئی نے تائید کی۔

”تو پھر بسم اللہ۔“

”بہتر۔“

منتہا نے اسی وقت اسکول کے تمام درجہ چارم ملازمین کو بلا کر پی ٹی آئی کے سپرد کیا۔

وقفہ ہونے سے قبل ٹوٹے فرنیچر کے اس انبار سے دو سو ستاون ہتھے والی اور ایک سو بہتر بغیر ہتھے والی کرسیوں،

دو سو بیالیس ڈیسکوں، سات بیدی کرسیوں اور تین میزوں کے قابل مرمت ہونے کی خبر موصول ہو چکی تھی۔

بقیہ فرنیچر کی بابت منتہا نے چونکہ اس کو سختی سے ممانعت کی کہ وہ اس کا ایک تنکا بھی بطور ایندھن استعمال نہیں کرے گا ورنہ اس کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

قابل مرمت فرنیچر کے لیے اس نے ڈائریکٹریٹ سے رابطہ کیا۔ چونکہ بڑا کام تھا، اسے کروانے کے لیے ڈائریکٹریٹ کی منظوری ضروری تھی۔ تین چار دن میں اس کی باضابطہ منظوری آگئی۔ ڈائریکٹریٹ کے وضع کردہ طریقہ کار سے گزرنے کے بعد اس نے فرنیچر کی مرمت کا ٹھیکا ایک ترکھان کو دے دیا تھا۔

بظاہر یہ کام دوسرے لوگوں کے لیے غیر اہم اور معمولی تھا مگر منتہا کو اس میں انتہائی طمانیت اور سرخوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ میلی کپیلی دریوں یا ننگے فرش پر بیٹھے بچوں کے کرسیوں پر بیٹھنے کی امید بندھ گئی تھی! (باقی آئندہ)



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا .... دکھ تو دکھ ہے ..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے ..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمے نہیں دیتے بلکہ آکے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاروش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

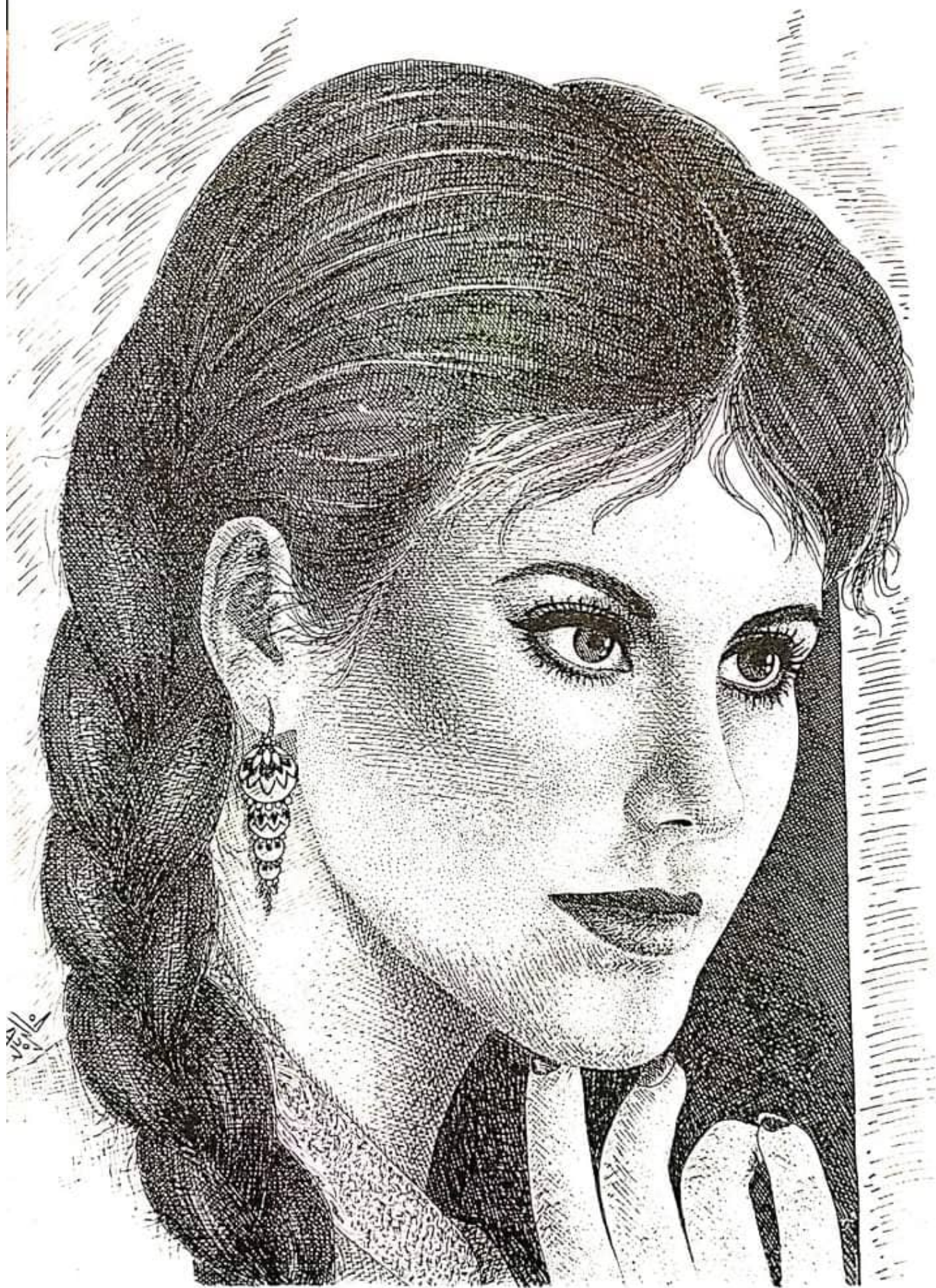
**محبوبوں سے گندے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سمار ہونے کی دل گداز داستان**

ناہید سلطانہ اختر

قسط 15









منتہا کو نئے اسکول میں آئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ ان دو مہینوں میں اس نے اسکول کا نقشہ پلٹ دیا تھا۔ گو اداروں کی تاریخ میں دو ماہ کا عرصہ کچھ بھی نہیں ہوتا مگر خدمت کا جذبہ کام کرنے کی لگن اور احساس فرض شناسی ہو تو برسوں کے کام مہینوں، مہینوں کے ہفتوں اور ہفتوں کے دنوں میں ہو جایا کرتے ہیں، سو منتہا نے بھی مہینوں کے کام ہفتوں میں کر دکھائے تھے۔ ادھر ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کی مرمت شروع کروائی ادھر اسکول کی عمارت کو اسکول فنڈ سے اندر باہر رنگ و روغن کروانے کے لیے ڈائریکٹریٹ کی منظوری حاصل کرنے کو درخواست داغ دی۔ بابو تاج محمد نے دستاویزی شواہد کے ساتھ بتایا تھا کہ اسکول کی عمارت پر تقریباً پانچ سال قبل رنگ کروایا گیا تھا۔ رنگ کیا تھا چونے میں پیلی مٹی گھول کر دیواریں لپ پوت دی گئی تھیں جنہیں امتداد زمانہ نے کہیں بے رنگ اور کہیں پٹری زدہ کر دیا تھا۔

رنگ و روغن کے لیے ڈائریکٹریٹ کی منظوری حاصل کرنے کے لیے درخواست ارسال کرنے سے قبل منتہا نے چار پانچ ٹھیکے داروں کو بلوا کر ان سے بات کی تھی۔ ہر ایک نے ڈیڑھ دو لاکھ کا تخمینہ دیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ رہی۔ رواں مالی سال قریب انہیں تھا اور ڈائریکٹر صاحب بھی اسکول فنڈ سے ایک وقت میں حد سے حد پچاس ہزار کا کام کروانے کی منظوری دینے کے مجاز تھے۔ ڈیڑھ دو لاکھ کا کام کروانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پچاس ہزار روپے سے زائد کا کام کروانے کی صورت میں ٹینڈر طلب کرنے پڑتے جو دیر طلب معاملہ تھا جبکہ منتہا کی یہ کیفیت تھی کہ اگر الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ جاتا تو سب سے پہلے اسکول بلڈنگ کی ضروری مرمت اور رنگ و روغن کا کام کرواتا۔

ڈائریکٹریٹ کے وضع کردہ اصول و ضوابط اور فاروقی صاحب سے صلاح مشورے کی روشنی میں اس نے اسکول بلڈنگ کی مرمت اور رنگ و روغن کا کام مرحلہ وار کروانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے کلاس رومز پھر راہداریاں اور برآمدے اس کے بعد بلڈنگ کا بیرونی حصہ اور سب سے آخر میں احاطے کی دیواریں۔

پہلے مرحلے میں کلاس رومز کی مرمت اور رنگ و روغن کروانے کے لیے منظوری حاصل کرنے کو درخواست ڈائریکٹریٹ ارسال کرنے کے بعد اس نے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو فون کیا اور ان کا وعدہ یاد دلایا ”سر“ آپ نے کہا تھا نا اسکول کے حالات بہتر بنانے کی کوششوں میں مجھے آپ کا تعاون حاصل رہے گا۔“

”بالکل بالکل!“ وہ گرم جوشی سے بولے۔

”بلڈنگ کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اگر پوری بلڈنگ کی ریمویشن ایک ساتھ کروائی تو ٹینڈر کا چکر ہو گا۔ میں نے فاروقی صاحب سے مشورہ کیا تھا، ان کی رائے یہ ہے کہ مرحلہ وار کام کروایا جائے تاکہ ڈائریکٹر صاحب کو سائنکشن دینے میں دقت نہ ہو، میں نے پہلے فیز میں کلاس رومز کی مرمت، ڈسٹمبر اور اینٹل کروانے کے لیے کیس ڈائریکٹریٹ بھیجوا یا ہے۔ براہ کرم آپ ڈائریکٹر صاحب سے جلد منظوری کی سفارش کر دیجئے گا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے۔ سمجھئے سائنکشن مل گئی۔ ڈائریکٹر صاحب۔۔۔ خود بھی آپ کے اسکول کی بہتری میں دلچسپی رکھتے ہیں۔“

”تحقیق یو دیری جی سر۔“

دو دن بعد ڈائریکٹریٹ سے مذکورہ کام کی منظوری آگئی۔ کئی ٹھیکے دار کام کرنے کے امیدوار تھے مگر منتہا اندھا دھند بھروسہ کرنے کی بجائے سوچ سمجھ کر اور اپنی مرضی کے مطابق معیاری کام کروانا چاہتی تھی سو اس نے ان ٹھیکے داروں کے سامنے شرط رکھی کہ میٹرل انہیں خرید کر دیا جائے گا وہ صرف اپنی اجرت بتائیں۔ اس شرط پر ماسوا دو کے سب رفو چکر ہو لیے۔ دو میں سے ایک سے منتہا نے اسکول کی شرائط پر کام کا معاہدہ کر لیا۔

پہلے کلاس رومز میں ضروری مرمت کروائی گئی۔ ٹائم ٹیبل، تعلیمی چارٹس اور دیگر آرائشیں لگانے کے لیے دیواروں پر چولی پٹیاں لگوائی گئیں پھر رنگ و روغن شروع ہوا۔ چھتوں پر اعلیٰ درجے کا ڈسٹمبر، دیواروں پر سب سے مٹکا مگر معیار کے لحاظ سے اعلیٰ ترین پلاسٹک اعلشان، دروازوں اور کھڑکیوں پر درجہ اول اینٹل۔ کلرا سکیم منتہا نے بالکل



ہی بدل ڈالی۔ میٹرل کی خریداری کے وقت بابو تاج محمد نے دبی زبان سے کہا ”میڈم جی اسکول کے لیے اتنا منگوا میٹرل لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس قسم کا میٹرل تو لوگ کوٹھیوں بنگلوں میں لگاتے ہیں۔“

”تاج محمد صاحب یہی تو ہماری اجتماعی بد قسمتی ہے کہ ہم اپنے گھروں کو تو سجا لیتے ہیں اداروں پر توجہ نہیں دیتے۔ سرکاری تعلیمی اداروں کی شہرت تو عوام میں ویسے ہی کچھ زیادہ اچھی نہیں، ان کا ظاہری نقشہ بگاڑ کر ہم عوام الناس کی اس رائے پر گویا مہر لگا دیتے ہیں۔ ڈائریکٹر کی پالیسی کے مطابق اسکولوں کو ہر تین برس بعد رنگ روغن کرانے کی اجازت ہے۔ اگر ہم نے ناقص میٹرل لگوا یا تو وہ تین سال کیا تین مہینے ہی میں ہمارا منہ چڑانے لگے گا۔“

”جی یہ تو ہے۔“

”اداروں کے لیے تو ہمیشہ بہترین میٹرل استعمال کیا جانا چاہیے۔“

”بے شک!“ تاج محمد نے جواب بھی کچھ دیر پہلے منگے میٹرل کی مخالفت کر رہے تھے تائید کی۔

کلر اسکیم کے بارے میں سب سے پہلے غزالہ ناصر نے اپنی رائے دی ”میڈم جی، پیلے رنگ کو آف وائٹ اور سرخ کو گرے سے بدل کر آپ نے کلاس رومز کو بہت سوبر اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا تاثر دلوایا ہے۔“

”تعلیمی اداروں کو پولیس اسٹیشن اور اسپتالوں سے مختلف دکھائی دینا چاہیے غزالہ۔“ منتہا نے خوش دلی سے کہا۔

کلاس رومز، راہداریاں، برآمدے، عمارت کا بیرونی رخ سب پر رنگ و روغن کیا جا چکا تھا اور اب آخری مرحلے میں احاطے کی دیوار پر ڈسپلنریاں لگائی جا رہی تھیں۔ منتہا نے ٹھیکے دار کو اپنی مرضی کا میٹرل دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے کام پر ہمہ وقت نظر رکھی تھی۔ میٹرل کو چوری سے بچانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی۔ صبح اسکول پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے یہی جائزہ لیتی کہ گزشتہ روز کتنا کام کیا گیا تھا اور کتنا میٹرل استعمال ہوا تھا۔ میٹرل اس نے پی ٹی آئی کی نگرانی میں اسپورٹس روم میں مقفل رکھا تھا۔ ٹھیکے دار کو جتنے مال کی ضرورت ہوتی لے لیتا۔ ایک روز وہ منتہا سے بولا۔

”میڈم بہت کام کیا ہے میں نے اب تک گھروں کا، دفتروں کا، اسپتالوں کا، اسکولوں کا... جتنی دلچسپی سے آپ اپنے اسکول کا کام کر رہی ہیں بہت سے لوگ اتنی توجہ اور شوق سے اپنے گھروں کا کام بھی نہیں کرواتے۔“

”یہ میرا فرض ہے کنٹرولر صاحب۔“

اس کام کے دوران منتہا کو غزالہ ناصر اور پی ٹی آئی گاہے گاہے صلاح مشورے دیتے رہے۔ غزالہ کے بارے میں منتہا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو دوسرے لوگوں کے مزاج تاثر لینے میں کمال رکھتے ہیں اور خود کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ادارے کی سینئر ترین ٹیچر ہونے کے ناتے منتہا کو اکثر معاملات میں غزالہ کی مدد لینی پڑتی۔ بہت کم وقت میں غزالہ نے منتہا کا مزاج اور انداز کار سمجھ کر اس سے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی۔ پی ٹی آئی قدر صاحب بعد اذیت دار آدمی تھے۔ اپنے بچوں کی ذمہ داریوں سے عمدہ بر آہو چکے تھے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ میں ڈیڑھ سال باقی تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خود آگے بڑھ کر کوئی ذمہ داری لینے سے گریز کرتے ہیں لیکن جب کوئی ذمہ داری انہیں تفویض کر دی جائے تو اسے بحسن و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ منتہا نے انہیں اسکول کے عمومی نظم و ضبط میں تواپنا دست راست بنائی لیا تھا اور بھی بہت سے روز مرہ امور میں وہ انہی کو چھوٹی موٹی ذمہ داریاں تفویض کیے جاتی۔ وہ ناک بھوں چڑھائے بغیر بڑی خندہ پیشانی سے ذمہ داریاں قبول کرتے۔ منتہا ان کے تعاون پر اکثر ان کا شکریہ ادا کرتی۔ حوصلہ افزائی بھی کرتی، دوسروں کے سامنے ان کی تعریف بھی کرتی چنانچہ اسکول کے رنگ و روغن اور ٹوٹے فرنیچر کی مرمت کے سلسلے میں وہ شروع تا آخر اس کے مدد و معاون رہے۔ ٹوٹے فرنیچر کے انبار سے اتنا فرنیچر لاؤٹ کر مرمت نکل آیا تھا کہ اسے مرمت کروانے کے بعد اب پورے اسکول میں کوئی ایک فریق بھی فرنیچر سے محروم نہ رہا تھا۔ بتدریج بدلتے حالات سے بچے اور ان کے والدین بہت خوش تھے۔ اکثر

والدین اور سرپرست اس کے پاس براہِ راست آ پہنچتے اور اعتراف کرتے کہ جب سے وہ اس اسکول میں آئی تھی حالات بہت بہتر ہو گئے تھے۔

ایک روز صبح اسمبلی کے بعد حسب معمول اسکول کا راؤنڈ لے کر اپنے دفتر میں پہنچی تو اقبال نے اطلاع بہم پہنچائی کہ کسی بچے کی والدہ اس سے ملاقات کی منتظر بیٹھی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ملاقاتیوں کی آمد و رفت کبھی کبھی تو صبح اسکول لگنے سے قبل ہی شروع ہو جایا کرتی تھی اور منتہا کسی بھی ملاقاتی کو دیر تک انتظار میں نہ رکھتی چنانچہ اس نے اقبال سے کہا ”بھجوا نہیں۔“

وہ آئیں تو انہوں نے علیک سلیک کے بعد کہا ”میڈم میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئی ہوں کہ آپ نے ہمارے بچوں کو فرش سے اٹھا کر کرسیوں پر بٹھا دیا۔“

”شکریہ کی کوئی بات نہیں خاتون“ اس اسکول کی پرنسپل ہونے کے ناتے بچوں کو صاف ستھرا ماحول اور ممکنہ سہولتیں فراہم کرنا تو میرا فرض ہے۔“ منتہا نے انکساری سے کہا۔

”میڈم سب ایسا کہاں سوچتے ہیں۔ یقین کریں میں تو اسکول کے حالات سے اتنی تنگ آ گئی تھی کہ اپنے بچے کو یہاں سے اٹھا کر کسی دوسرے اسکول میں داخل کروانے کا سوچ رہی تھی۔ نہ یہاں پڑھائی ہوتی تھی نہ بچوں کو تمیز سکھائی جاتی بلکہ بد تمیز ہوئے جارہے تھے۔ میرے بچے کی کلاس پچھلے دو سال سے فرش پر بیٹھ رہی تھی۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ منہ جو گندے ہوتے سو ہوتے نیچے بیٹھنے سے اسے ایک بری عادت ٹنگڑی دینے کی پڑ گئی تھی۔“

”وہ کیا ہوتی ہے؟“ منتہا نے پوچھا۔

خاتون دھیرے سے مسکرائیں پھر اپنی دائیں ٹانگ کو آہستگی سے آگے بڑھا کر اسے افتاً مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولیں ”کسی کی ٹانگوں کے بیچ میں اپنی ٹانگ اڑا کر گرا دینے کو ٹنگڑی مارنا کہتے ہیں میڈم...“

”آئی سی۔“

”میڈم میرے بچے کو بھی نیچے بیٹھنے کی وجہ سے دوسروں کو ٹنگڑی دینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کیونکہ یہاں ٹیچرس تو آتی نہیں تھیں کلاس میں اور اگر آتی بھی تھیں تو کرسی پر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ بچے سارا دن یا تو شور مچاتے رہتے یا مستیاں کرتے۔ ایک دوسرے کو مارتے، ٹنگڑیاں اڑاتے۔ میرا بچہ گھر میں بھی اپنے سے چھوٹے ہی نہیں بڑے بھائی بہنوں کو بھی ٹنگڑی مار کر گرا دیتا جس سے ان کو چوٹیں بھی لگ جاتیں۔ محلے والے بھی شکایتیں کرتے۔ ایک روز کیا ہوا ہمارے گھر مہمان آئے میری بڑی بیٹی کو دیکھنے کے لیے۔ اس بد تمیز نے کیا کیا لڑکے کے باپ کو ٹنگڑی دے کر گرا دیا۔ انہوں نے تو ایسا برا منایا کہ کیا بتاؤں۔ ان کے جانے کے بعد میرے شوہر نے اس نامراد کی وہ دھڑمچی لگائی کہ اللہ کی پناہ! بس اس کی ٹانگیں ٹوٹنے کی کسر رہ گئی۔ گھر آیا رشتہ تو ہاتھ سے نکل گیا بہر حال اس دن کی پٹائی کے بعد اس نے لوگوں کو ٹنگڑی دینا چھوڑ دیا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”یہی کوئی تین چار ماہ پہلے کی بہر حال آپ نے انہیں فرش سے اٹھا کر کرسیوں پر بٹھا کر ان بچوں پر ہی نہیں ہم والدین پر بھی بڑا احسان کیا۔ خدا کا شکر ہے اب ٹیچرس پڑھانے بھی لگی ہیں اور آپ کے آنے سے بچوں کو صبح اسمبلی میں جو اچھی باتیں بتائی جانے لگی ہیں ان کا بھی بہت اثر ہوتا ہے بچوں پر۔ میرا بچہ تو بہت سدھ رہا ہے۔“

منتہا نے بڑی توجہ سے ان کی بات سنی پھر کہا ”دیکھیے فرش پر بیٹھنے میں تو کوئی برائی نہیں۔ اپنے ارد گرد آپ کو ایسے بہت سے لوگ مل جائیں گے جنہوں نے ناٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ برائی ہے بچوں کی اخلاقی تربیت نہ کرنے میں۔ یہ ہم اساتذہ اور آپ والدین کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ بچوں کی اخلاقی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔“



”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم۔“  
 ”اور ہاں آپ کے شوہر نے جو بچے کو اس کی غلطی پر مارا اچھا نہیں کیا۔ بچوں کو مار سے نہیں پیار ہے سدھایا اور رام کیا جاتا ہے۔“

”بس میڈم ان کا غصہ تیز ہے ذرا۔“ خاتون جھینپ کر بولیں پھر انہوں نے انھنے کا قصد کرتے ہوئے کہا ”اچھا میڈم آپ کا بہت وقت لیا۔ شکریہ بہت بہت آپ کے آنے سے اسکول واقعی بہتر ہو گیا ہے۔“  
 اس میں شک بھی نہ تھا۔ اسکول کا مدرسہ اور غیر مدرسہ کی عملہ اور بچے وقت پر اسکول پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اسمبلی کی گھنٹی بجتے ہی بچے غیر معمولی جوش و خروش کے ساتھ اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچتے۔ ٹیچرز بھی سب کی سب اسمبلی میں اپنی اپنی جماعت کی قطار کے روبرو موجود ہوتیں۔ اسمبلی پر وگرام عمدہ ہوتا۔ بچے اس میں خاطر خواہ دلچسپی لیتے اور تقریباً روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اچھی بات اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ دن بھر کلاسوں میں باقاعدگی سے پڑھائی ہوتی۔ اسکول میں مکمل نظم و ضبط رہتا۔ بچوں کی یونیفارمز، جوتوں، کتابوں، کاپیوں، عمومی رویے غرض ہر معاملے میں نمایاں تبدیلی آتی جا رہی تھی جو خاصی خوشگوار تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ منہا بچوں سے اسمبلی میں مختصر سی بات چیت کرتی۔ کبھی ان کی ذہنی سطح کے مطابق دینی تعلیمات کے حوالے سے، کبھی روزمرہ امور کے سلسلے میں، جب انہیں ہدایات دینے کی ضرورت ہوتی ہدایات دیتی اور جب کسی معاملے میں تنبیہ کی ضرورت پاتی تنبیہ بھی کرتی۔ کسی بھی حوالے سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو شاباش دینے میں بخل نہ دکھاتی اور مسابقت کے لیے انہیں سازگار ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرتی۔ اسکول کے عمومی قواعد و ضوابط کے معاملے میں وہ اپنا رویہ سخت اور سب سے یکساں رکھتی۔

فاروقی صاحب اکثر کہا کرتے تھے جزا اور سزا کا تصور واضح کیے بغیر آپ بچوں کو نہ تو نظم و ضبط سکھا سکتے ہیں نہ صحیح خطوط پر ان کی اخلاقی تربیت کر سکتے ہیں۔ جو سزا کا مستحق ہو جب تک اسے سزا نہیں ملے گی دوسرے جزا پانے کی تگ و دو میں نہیں لگیں گے۔ ایک اور بات جو وہ فاروقی صاحب کی ماتحتی میں رہ کر سیکھ آئی تھی اور اب اس کا اطلاق اپنے نئے ادارے میں بھی سختی سے کر رہی تھی یہ تھی کہ رو رعایت کسی بھی معاملے میں کسی سے بھی نہیں۔ فاروقی صاحب کہا کرتے تھے بگاڑ وہیں پیدا ہوتا ہے جب آپ ایک ہی قسم کی صورت حال میں دو مختلف افراد سے یکساں رویہ نہیں رکھتے۔

\*\*\*

نیہہ کے بچے کا نام نعمان رکھا گیا تھا۔ ننھا نعمان گھر بھر کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا۔ مزظہیر دن بھر اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتیں۔ نیہہ کا کمرارنگ برنگے چھوٹے بڑے کھلونوں سے سج گیا تھا۔ مزظہیر نے چھٹی اور چلہ پورا ہونے پر گھر میں تقریبات منعقد کی تھیں۔ چھٹی والے دن بچے کا عقیقہ بھی کر دیا گیا تھا۔ می نے چھو چھک بڑے اہتمام سے دیا۔ فرحان نے کسی جاننے والے کے ذریعے بچے کے لیے کپڑے، کھلونے، مختلف سازندوں کے فیڈرز کا ایک خوب صورت سیٹ اور پرام بھجوائی تھی۔ نیہہ کو اس نے ایک بریسلٹ بھیجا تھا۔ گھر کے دیگر افراد کے لیے بھی چند سوغاتیں تھیں۔

”پرام بھجوانے کی کیا ضرورت تھی۔“ فرحان کا فون آنے پر نیہہ نے کہا۔  
 ”بھئی جب یہاں آؤ گی تو وہاں اور یہاں دونوں ایئر پورٹس پر لاؤنج میں تمہیں اس کی ضرورت ہوگی۔“  
 ”فرحان! ابھی بہت چھوٹا ہے وہ... پرام میں بیٹھنے کے لائق نہیں، میری گود میں ہی رہے گا۔“  
 ”کیا ٹھٹا ہیں بھئی!“

”اور کھلونوں کی بھی ضرورت نہیں تھی ابھی۔ وہاں آتا تو ذرا بڑا ہونے پر خرید لیتے، ابھی تو اسے اپنا ہی ہوش

نہیں ہے۔"

"یہاں آنے تو دو ڈھیر لگا دوں گا اس کے لیے کھلونوں کے۔ تمہیں اپنا بریل سلٹ پسند آیا؟"

"بہت خوب صورت ہے۔"

"یہ تمہارے بیٹے کی پیدائش کی یادگار بن کر تمہارے ہاتھ میں رہے گا۔"

"ہمارا بیٹا فرحان۔"

"جب تک میرے پاس نہیں آجاتا تمہارا ہی ہے۔"

"اے اپنا بیٹا کہنے کے لیے اگر اس کا پاس رہنا شرط ہے تو پھر تو میرا بھی نہیں ہے، وہ اپنی داد اور دادا کا ہے۔"

میرے پاس تو بس فیڈ لینے آتا ہے۔ ڈیوٹی جوائن کر لوں گی تو صاحب زادے فیڈ پر آجائیں گے۔"

"کیا! کیا! کیا! ڈیوٹی جوائن کر رہی ہو۔ یہاں نہیں آتا ہے کیا؟"

"میٹرنٹی لیو ختم ہونے پر جوائن کروں گی پھر لیو آن پرائیویٹ ایفرز ایلائی کروں گی۔"

"چھوڑ دیا رچھٹی دٹی کے چکر میں مت پڑو۔ ریزائن کرو۔"

"گورنمنٹ جاب ہے فرحان، جب چھٹی مل سکتی ہے تو ریزائن کیوں کروں۔ کیا پتا کل حالات کیا ہوں۔ باہر کتنا

بھی عرصہ رہ لو ایک نہ ایک دن تو اپنی جگہ واپس لوٹنا ہی پڑتا ہے، اچھی بھلی ملازمت کیوں چھوڑوں۔"

"فیملی ویزا پروسس میں ہے، ملتے ہی تم دونوں کے ٹکٹس کے ساتھ روانہ کروں گا۔ دن گن گن کر گزار رہا

ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ویزا ملنے کے بعد مجھے تمہارے یہاں آنے کا زیادہ انتظار کرنا پڑے۔"

"نہیں کرنا پڑے گا، میں جوائن کرتے ہی چھٹی کے لیے ایلائی کروں گی۔ ایک سوری ہے ایسا جس نے چھٹی جلد

منظور کروا دینے کی یقین دہانی کرائی ہے، اسی کے مشورے پر میں ایکس پاکستان لیو کی بجائے لیو آن پرائیویٹ ایفرز ایلائی

کر رہی ہوں۔"

"لیکن اگر ویزا ملنے تک تمہاری چھٹی منظور نہ ہوئی تو! فرحان کے لہجے میں بے تابی تھی۔"

"تو تھوڑا سا انتظار کر لیجئے گا۔"

"ہرگز نہیں، تمہیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوراً یہاں آنا پڑے گا۔ میں اس بد معاش کو دیکھنے کے لیے مراجارہا

ہوں۔"

"خدا یا کیسے غلط سلط الفاظ نکالتے ہیں آپ منہ سے۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیا "مرنے کے نام پر ڈر گئیں۔ اچھا سنو ہم لوگوں نے دلا لے لیا ہے، دو تین دن میں وہاں

شفٹ ہو جائیں گے۔ یار لگتا ہے نعیم تو تمہاری بہن پر پکے پکے عاشق ہو گئے ہیں۔"

وہ چونکی۔

"آپ کو کیسے پتا؟ کیا انہوں نے آپ سے کچھ کہا؟" اس نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔

"ایسی باتیں کہ بغیر ہی سمجھ میں آجاتی ہیں۔"

"اچھا! کچھ پتا تو چلے، کیسے؟"

"حضرت وقت سے پہلے چھٹی لینے کے لیے مسلسل دیر دیر تک کام کر کے باس کا دل برمانے کی کوشش کر رہے

ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ منتہا باجی کی محبت کروا رہی ہے۔"

"ضروری نہیں، کوئی اور سبب بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً نعیم بھائی کی اپنی امی سے محبت... دیے بھی نعیم بھائی میچور ڈاڈی ہیں ان سے طوفانی قسم کے عشق کی توقع



حال ہے۔“  
 ”بھئی تمہاری بہن ان کی منگیتر ہیں اور منگیتر سے عموماً عشق ہو ہی جایا کرتا ہے۔“  
 ”نعم بھائی جیسے سنجیدہ، حقیقت پسند اور عملی لوگ منگیتر تو کجا بیویوں سے بھی بہت سوچ سمجھ کر عشق کرتے ہیں۔“  
 وہ بے ساختہ ہنس دیا پھر بولا ”ایک پڑھی لکھی اور ورکنگ دو مین سے شادی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ اسے قائل کرنا آسان نہیں ہوتا۔“  
 ”بھئی!“ نیہ نے زور دیتے ہوئے کہا ”بائی دی وے اور کیا نقصانات ہوتے ہیں ایک پڑھی لکھی اور کام کرنے والی عورت سے شادی کے۔“  
 ”آرگومنٹ بہت کرتی ہے۔ میرے یار نعیم کی طرح عملیت پسند ہوتی ہے اور...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
 ”اور؟“

”اور... اور بندہ آپ ہی آپ اس کے عشق میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ آئی ریٹلی لو یو نیہ۔“  
 ”آئی لو یو ٹو فرحان۔“

\*\*\*

مختار کو انگلیٹنڈ گئے کافی دن ہو چکے تھے۔ وہ خوش تھا۔ فضلہ کو اس نے وہاں سے تین چار مرتبہ فون کیا تھا۔ ہر مرتبہ اس کے لمبے میں پہلے سے زیادہ سرخوشی اور شگفتگی ہوتی۔ بات بات پر ہنستا۔ فضلہ کو چڑانے کو بار بار گوریوں کا ذکر کرتا۔  
 ”سارا دن کھٹ پٹ کرتی پھرتی ہیں اور کیا چال ہے ان کی، بندہ دیکھتا ہی رہ جائے۔“  
 ”کہیں دیکھتے ہی نہ رہ جائے گا۔“ فضلہ نے ذومعنی لمبے میں کہا۔  
 ”سوچ تو رہا ہوں ایک دیکھ ہی لوں۔ وہ سعودیہ والے کیا کہتے ہیں.... اقامہ، وہ مل جائے گا۔“  
 ”قتل کر دوں گی۔“  
 ”کسے؟“

”دونوں کو۔“

وہ ہنس دیا۔

”اتنی دور تک مار کرنے والا ہتھیار تو ابھی یہاں بھی ایجاد نہیں ہوا۔“

”میں ہوں نا، وہیں پہنچوں گی۔“

وہ تہمتہ مار کر ہنس پڑا۔

”بہت خوش ہیں!“

”بہت، میری جان... کالیاں بھی اپنے ہاں کی طرح نہیں ہوتیں۔ ناک میں بلاق ڈالے، گود میں ناک بہتے بچے کو چڑھائے۔ بعض تو گوریوں سے زیادہ فٹ فٹ ہوتی ہیں۔“  
 ”شرم کیجئے۔“

”کیوں! شرم کی کیا بات؟“

”لگتا ہے وہاں گوریوں، کالیوں کو تھکنے ہی کے لیے گئے ہیں۔“

”اللہ میاں نے انہیں بنایا کس لیے ہے۔“

”جوان بچوں کے باپ ہیں کچھ تو لحاظ کیجئے۔“

”جوان بچوں کی ماں ہو کر تم نے کچھ لحاظ نہ کیا تو میں تو مرد ہوں۔“  
 وہ چونکی۔ ”کیوں! میں نے کیا کیا؟“  
 ”تین کم تھے جو ایک اور بنا بیٹھیں۔“  
 فضا کو شرم آگئی۔

”وہاں جا کر آپ کچھ زیادہ ہی بے حجاب نہیں ہو گئے!“ وہ ہنس دیا۔  
 ”میرے دوست کا بھی کچھ یہی خیال ہے کہ یہاں آکر میں کچھ زیادہ ہی کھل گیا ہوں۔“  
 ”بس بہت ہو گئی سیر و تفریح اب سیدھی طرح گھر واپس آئیں۔“  
 ”نی الحال تو نہیں۔“  
 ”کیوں؟“

”میرا دوست کہتا ہے وہ میرا دیرا بڑھوا لے گا۔“  
 ”نہیں نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔“  
 ”کیوں؟“

”بس، یہاں مجھے اور بچوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ہا پٹل جاؤں گی تو بچوں کے پاس کون رہے گا۔“  
 ”بھئی بڑے بچے ہیں چھوٹے تو نہیں اور... تمہارے گھر والے ہیں نا ان کے پاس رہنے کو۔“  
 ”میرے گھر والوں کی ذمہ داری تو نہیں ویسے بھی آپ کو پتا ہے مجھے کسی کا احسان لینا اچھا نہیں لگتا۔“  
 ”کال لمبی ہو گئی ہے بند کر رہا ہوں۔“  
 ”مختار! پلیز جلدی واپس آجائیں۔ آئی نیڈیو۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“  
 ”ہو سکتا ہے کسی اور کو تم سے بھی زیادہ ضرورت ہو میری۔“  
 ”کے!“ وہ پھر چونکی۔  
 ”مذاق کر رہا ہوں۔“

لیکن مختار کے اس مذاق کی حقیقت اس وقت کھل کر فضا کے سامنے آگئی جب اسے مختار کی ایک رشتہ دار کی زبانی پتا چلا کہ اسے اس کے کسی دوست نے انگلیں نہ نہیں بلوایا تھا بلکہ اسے تو وہ عورت اپنے ساتھ لے گئی تھی جس کا ہاتھ اس نے بہن کی شادی کے دوران دیکھا تھا۔  
 ”مگر وہ مختار کو ساتھ کیوں لے گئی بھلا!“ فضا نے حیرانی سے کہا۔

”باجی!“ مختار کی مذکورہ رشتہ دار دھیرے سے ہنسی ”بہت بھولی ہو آپ... کیوں لے جاتی ہے ایک عورت کسی مرد کو اپنے ساتھ۔ بے حیا ہے وہ“ اپنے مرد کو تو اس نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہاں کی گورنمنٹ بھی تو ایسی ہی ہے نا عورت کا ساتھ دیتی ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ سنا ہے مختار بھائی کے پاسپورٹ پر اس نے انہیں اپنا دوسرا خاوند ظاہر کر کے ویزا لگوا دیا ہے۔“  
 ”کیا!“ فضا ہڑبڑا گئی۔

”ہاں باجی جی۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔  
 ”تمہیں کیسے پتا؟“

”مجھے کیا ادھر ہمارے علاقے میں ساری برادری کو معلوم ہے۔ آپ کو میرا یقین نہیں تو مختار بھائی کی بہن اور اس کے بچوں سے پوچھ لو وہ تو ادھر ہی آپ کے محلے میں رہتی ہے۔“  
 ”انہیں معلوم ہے؟“



”بالکل معلوم ہے۔ وہ بے شرم عورت لندن سے آکر چار پانچ ہفتے ادھر رہی۔ مختار بھائی اور وہ اکٹھے گھومتے پھرتے تھے کرائے کی گاڑی میں۔ لندن بھی اکٹھے گئے ہیں۔ مختار بھائی کے گھر والے تو کہتے ہیں اس نے مختار کے پاسپورٹ پر ویزا لگوانے کے لیے جعلی نکاح نامہ بنوایا تھا لیکن کیا پتا باجی دونوں نے سچ مچ ہی نکاح پر حوالا دیا ہو۔“

فضہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ کیمادھو کے بازو تھا مختار! اسے کیا بتایا اور پس پردہ کمائی کیا تھی! مختار کو ویزا دلوانے اور ٹکٹ فراہم کرنے والا دوست مرد نہیں عورت تھی!

”آپ کے ادھر رہنے کا فائدہ اٹھایا ان لوگوں نے۔ اب تو مختار بھائی کے تمام گھر والے لندن جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایک سے کہتے ہیں مختار چلا گیا اب ہم لوگ بھی چلے جائیں گے۔“

”دیکھتی ہوں کیسے جاتے ہیں۔“ فضہ نے غصے سے کہا ”سب سے پہلے تو میں اس کی بہن سے پوچھوں گی۔ مجھ سے تو وہ کہہ رہی تھی بھائی بچوں کے مستقبل کی خاطر گیا ہے۔“

”باجی۔“ مختار کی رشتے دار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر فضہ کے سامنے کر دیے اور لجاجت بے بولی ”میرا نام نہ آئے۔“

”تم فکر نہ کرو مگر شبہ آئے گا تم ہی پر کیونکہ وہاں سے ان دنوں تم ہی آئی ہوئی ہو یہاں۔“ فضہ نے کہا۔

”شبہ کو تو میں نمٹ لوں گی بس آپ کی طرف سے یہ بات نہ ہو کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ آپ نہیں جانتیں باجی کتنے لڑا کا ہیں یہ لوگ۔“

”میں جانتی ہوں۔ مجھ سے بہتر کون جانے گا انہیں۔“ فضہ کے لمبے میں کرب تھا۔



ڈائریکٹریٹ کے زیر انتظام بیشتر اداروں کو اسکول فنڈ سے خریدی جانے والی اسکول وین کی سہولت حاصل تھی۔ بنیادی طور پر اس سہولت کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ اداروں کے روزمرہ امور میں آسانی رہے۔ ادارے کے لیے کوئی خریداری مطلوب ہو تو کرائے کی گاڑی نہ لینی پڑے۔ بچوں سے وصول کی گئی فیس بینک میں جمع کرانی ہوں یا ادارے کی کسی ضرورت کے لیے اسکول فنڈ سے رقم نکالوا کر لانی ہو۔ پہلی تاریخ کو اسٹاف کی تنخواہوں کی بڑی رقم بینک سے لانی ہو تو پیدل آنے جانے کی صورت میں کوئی خطرہ مول لینے کی بجائے اسکول وین استعمال میں آئے۔ نیز بچوں یا کسی اسٹاف ممبر کو خدا نخواستہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں یہی وین استعمال کی جائے۔ علاوہ ازیں سربراہ ادارہ کو اپنی رہائش گاہ سے اسکول آنے اور چھٹی کے بعد واپس جانے کے لیے بھی اس وین کے استعمال کی اجازت تھی جس کے عوض سربراہ ادارہ کو سرکاری طور پر ملنے والا کنویں الاؤنس اسکول فنڈ میں جمع کروانا پڑتا۔ سربراہ ادارہ کے روزمرہ روٹ پر آنے جانے والے اساتذہ بھی اپنے کنویں الاؤنس کے عوض اس سہولت سے مستفید ہو سکتے تھے۔ معمولی الاؤنس کے عوض ملنے والی یہ سہولت یقیناً ایک خاطر خواہ سہولت تھی۔

اب یہ اور بات تھی کہ بیشتر سربراہان مدارس محکمے کی جانب سے ملنے والی اس مراعت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ سرکاری گاڑی کو اپنی ذاتی ملکیت باور کرتے ہوئے وہ اس میں ہر طرح سے تصرف کرتے اور گاڑی کے بنیادی اغراض و مقاصد کو پس پشت ڈالتے ہوئے اسے ان مقاصد کے لیے استعمال میں لاتے جن کے لیے وہ ہرگز نہیں خریدی گئی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ اس گاڑی میں اپنے ذاتی کام کرتے پھرتے۔ دوستوں سے ملنا ملنا۔ ہم مرتبوں سے ان کے اداروں میں جا کر گپ شپ کرنی ہوتی۔ کسی بیمار کی عیادت کو جانا ہوتا۔ بازار سے خود یا کسی فرد خانہ کو خریداری کرنی مطلوب ہوتی یا بچوں کو اسکول کالج پہنچانا یا لینا ہوتا، کسی مہمان کو ریلوے اسٹیشن یا ایئر پورٹ سے لینا یا لے جانا ہوتا۔ یا نظامت کے کسی افسر کے گھر والوں یا مہمانوں کو گھمانا پھرانا ہوتا بڑی فیاضی سے اسکول وین استعمال کی جاتی۔ اگرچہ گاڑی کی روزانہ ”رننگ“ اور ایندھن کے استعمال کا ایک گوشوارہ بھی بنتا جو ہر ماہ پڑتال کے لیے نظامت

بھی بھجوا یا جاتا لیکن سرکاری ملازمت میں خیانت کرنے والے کانڈوں کا پیٹ بڑی خوبی اور صفائی سے بھرتے اور گاڑی سربراہ ادارہ کے ذاتی تصرف میں رہنے کی بجائے بیمار بچوں کو اسکول سے اسپتال لے جاتی اور اسپتال سے ان کے گھروں کو پہنچاتی دکھائی جاتی اور یوں گوشوارے سے یہ پتا چلتا جیسے یہ کسی اسکول وین نہیں کسی ایسولینس کی بھاگ دوڑ کا کھاتا تھا۔ اس کھاتے کی تیاری کے لیے خائن سربراہان ادارہ اپنے کلرک یا کسی نیچر کا اعتماد حاصل کرتے۔

نظامت اس قسم کی خیانتوں اور بے قاعدگیوں سے ہرگز لاعلم نہیں تھی مگر اول تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا دوسرے یہ بھی تو تھا کہ بیشتر سربراہان مدارس نظامت کے اکثر افسران کو خوش اور مٹھی میں رکھنے کے لیے یہی گاڑیاں ایندھن بھروا کر مع ڈرائیور دست بستہ اکثر و بیشتر ان کے تصرف میں دیے رہتے تھے۔ سرکاری گاڑی نجی تصرف میں کسی دوسرے شہر کا چکر بھی لگا کر آ جاتی اور گوشوارے میں دس بارہ بچوں کے یکے بعد دیگرے پیٹے میں مبتلا ہونے کے باعث اسپتال پہنچانے، ان کے گھروں میں اطلاع دینے اور انہیں طبی امداد ملنے کے بعد ان کے گھر پہنچانے کے اندراجات دکھا کر گاڑی کی طویل ”رنگ“ کی تاویل پیش کر دی جاتی۔

مشتا نے اسکول کا چارج لیا تو پیٹرول کا دو ماہ کا بیل جو بقول بابو تاج محمد غزالہ ناصر کے قائم مقام پر نیل بننے سے قبل سبکدوش ہو کر جانے والی پر نیل ادھار چھوڑ گئی تھیں غیر سرکاری طور پر ”آف دی ریکارڈ“ فنڈ سے ادا کر دیا گیا تھا مگر سرکاری طور پر ریکارڈ پر ہنوز واجب الادا تھا۔ اسی قرضداری کے باعث غزالہ نے چارج لینے کے بعد اس گاڑی کو گیراج میں کھڑا کر کے گاڑی اور ڈرائیور دونوں کی گلو خلاصی کرا رکھی تھی۔ گاڑی کو دوبارہ حرکت میں لانے کے لیے منتبا کو مبلغ گیارہ ہزار تین سو بارہ روپے اناسی پیسے کا واجب الادا پیٹرول بیل اسکول فنڈ سے ادا کرنے کے لیے نظامت کی خصوصی منظوری لینے پڑی۔ غزالہ نے بتایا سابقہ پر نیل صبح اسکول آ کر حاضری لگانے کے بعد آئے دن کسی میننگ میں یا آؤٹ آفس جانے کے لیے گاڑی لے کر نکل جاتیں اور چھٹی کے بعد ڈرائیور خالی گاڑی اسکول میں لاکھڑی کرتا۔ بابو تاج محمد نے بتایا ان دنوں اسکول پر ڈرائیور کے حکم کا سکہ چلتا تھا۔

منتبا کو گاڑی کی سمولت میسر آنے پر مئی بہت خوش ہوئیں اور بولیں ”بھئی یہ اسکول تو اچھا ہے۔ تمہیں بسوں کے پیچھے بھاگنے دوڑنے سے نجات ملی۔ گھر کے کاموں میں بھی آسانی ہو جائے گی۔“

”گھر کے کاموں میں!“ وہ چونکی۔

”ہاں۔“ مئی نے بڑے اطمینان سے کہا ”گھر آ کر جانے کے بجائے اسکول سے گھر آتے ہوئے راستے ہی سے

شاہنگ وغیرہ کرتی ہوئی آیا کرتا۔“

”نہیں والدہ! ایسا نہیں ہو سکتا اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔“

”کیوں!“ مئی کے لہجے میں استفسار سے زیادہ حیرانی تھی۔

”سرکاری گاڑی ہے۔“

”تبھی تو کہہ رہی ہوں۔“ مئی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”کیا مطلب!“

”بھئی سرکاری گاڑیوں میں تو لوگ اپنے تمام کام نمٹاتے ہیں۔“

”مگر میں ایسا نہیں کروں گی والدہ۔“

”کیوں؟“

وہ ان کے نزدیک بیٹھ گئی اور ان کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولی ”کیونکہ سرکاری گاڑیاں اس لیے نہیں ہوتیں۔ وہ جس مقصد کے لیے ہوتی ہیں انہیں اسی مقصد کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ مجھے اسکول دین پک اینڈ ڈراپ دے دیتی ہے میرے لیے یہی بہت ہے بلکہ سچ پوچھتے تو میں اسے بھی اسکول فنڈ پر ایک بوجھ سمجھتی ہوں۔“



”اچھا!“

”جی۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ آخر ہمارے سارے کام پہلے بھی تو سرکاری گاڑی کے بغیر چل ہی رہے تھے۔ مجھے یہی بہت بڑا اطمینان ہے کہ تم گھر سے گاڑی میں بیٹھتی ہو گھر آکر اتر جاتی ہو۔“

”سو سوئیٹ!“ اسے مئی پر بے ساختہ پیار آگیا ”آپ اتنی مفاہمت پسند نہ ہوتیں، اتنی جلدی ہتھیار نہ ڈال دیا کرتیں تو ڈیڈی جان آپ کو اتنی آسانی سے دھوکا نہ دیتے۔“

مئی نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا پھر بہت محبت سے اس کے چہرے پر اپنا بازو پھیرتے ہوئے بولیں ”آج کتنے عرصے کے بعد تم نے کہا ہے ڈیڈی جان۔“

”سوری!“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی ”میں بے دھیانی میں کہہ گئی۔“

”تمہیں کبھی یاد نہیں آتے اپنے ڈیڈی؟“ مئی کے لہجے میں کرب تھا۔

اس نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا پھر کہا ”آپ کی طرح وسیع القلب نہیں ہوں والدہ۔“

مئی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر دل شکستہ لہجے میں دھیرے سے بولیں ”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“

”آپ اتنی آسانی سے مفاہمت کیوں کر لیتی ہیں والدہ..... لڑنا سیکھئے..... اگر آپ کو لڑنا آتا ہوتا تو شاید دوسری عورت اتنی آسانی سے آپ کی جگہ نہ لے سکتی تھی۔“

”یہ میرا مقدر تھا۔“

”پھر وہی!“ وہ مئی کے قدموں میں بیٹھ گئی اور ان کے گھٹنے پکڑتے ہوئے بہت پیار سے بولی ”ماں جی! لڑنا سیکھو۔“

”اب کس سے لڑنا ہے بھلا!“

”بہو سے اور کس سے۔“

”خدا نہ کرے..... خدا نہ کرے جو میں بہو سے لڑوں۔ ایک ہی تو میرا بچہ ہے، اس کی دلہن کو تو میں اپنی آنکھوں کا سرمہ بنا کر رکھوں گی۔“

”میں مذاق کر رہی تھی۔“

”جانتی ہوں۔“ مئی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”جانتی ہوں کہ تمہیں خود بھائی سے کتنا پیار ہے۔“

منتہا نے سر اٹھا کر مئی کو دیکھا اور بولی ”اس نالائق کی ضد پوری کر دی ہے میں نے لیکن ایک بات بتا دوں میں آپ کو جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی میں اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔“

مئی نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولیں ”اب یہ خواہ مخواہ کی ضد مت باندھنا۔ نعیم کو اگر درمیان میں بھی چھٹی کا موقع مل گیا تو وہ شادی کے لیے آدھمکے گا اور اگر تمہاری یہی شرط ہے تو دیکھو ملیب کے لیے کوئی لڑکی۔ تم نے میری بات مان لی ہوتی تو لڑکی گھر آ جاتی۔ میں کسی پردے کے بغیر اس سے اپنا دکھ سکھ کہہ سن سکتی۔ خیر اب تو اس کی دوسری جگہ بات کی ہو چکی۔“ مئی نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

منتہا کی منتگنی کے آٹھ دس روز بعد مدحت کی بات اس کے اپنے عم زاد سے پکی ہو گئی تھی۔ مئی کو اس کا بہت قلق تھا۔

”آپ فکر نہ کیجئے انشاء اللہ ملیب کے لیے کوئی بہت اچھی لڑکی ملے گی۔“ منتہا نے مئی کے دل سے رنج رفع کرنے کی کوشش کی۔

”اگر تمہاری شرط یہی ہے کہ پہلے وہ آئے گی تو تم جاؤ گی اس گھر سے تو دیر کس بات کی جلدی دیکھو۔“

”میں تلاش میں ہوں والدہ۔“

”تم نے مختار بھائی کے گھر والوں سے پوچھا؟“  
فضہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے منتہا کے پاس آئی ہوئی تھی۔  
”ہاں۔“

”انہوں نے کیا بتایا؟“

”مکار، جھوٹے، اول درجے کے فراڈیے ہیں سب کے سب۔ بڑی بہن تو صاف مکرگئی قسمیں کھانے لگی کہ مجھے تو پتا نہیں کہ میرے بھائی کو وہ عورت اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ ساس صاحبہ کو فون کیا تو فرمانے لگیں۔ ویرا لگوانے کے لیے جھوٹا نکاح نامہ بنوایا تھا دونوں نے۔“  
”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“ منتہا نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے منتہا۔ مختار کے ایک بھائی اور بھادج کی ان دنوں اپنے گھر والوں سے کچھ کھٹ پٹ ہے، ان لوگوں نے کفرم کیا کہ باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔“  
”سچ سچ کا؟“

”ہاں، ہاں۔“

”اومائی گاڑا! اب کیا ہو گا؟“ فضہ کے متے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے منتہا کو اپنے زخم ہرنے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ڈیڈی کی دوسری شادی کے انکشاف نے می کو بھی تو کچھ اسی طرح سوگوار کر دیا تھا۔  
”اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی ان دونوں کو۔“ فضہ کا ردِ عمل می کے ردِ عمل سے کس قدر مختلف تھا۔  
”کیا کرو گی؟“

”میں نے یہاں برٹش کونسل کے ویزا سیکشن اور ان سے ایڈریس لے کر انگلینڈ میں ہوم آفس، پاکستانی سفارت خانے اور ملکہ کو لکھ دیا ہے کہ میرا شوہر بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے اس نام کی ایک پاکستانی عورت سے جو برطانوی شہریت کی حامل ہے نکاح کر کے اس کے شوہر کی حیثیت سے انگلینڈ پہنچا ہوا ہے اگر وہ ویزے میں توسیع کے لیے درخواست دے تو اس کے ویزے میں توسیع نہ کی جائے اور اگر وہ غیر قانونی طور پر وہاں ٹھہرنے کی کوشش کرے تو اسے ڈی پورٹ کیا جائے۔ مختار کی شناخت کے لیے میں نے اس کی تصویر بھی بھیج دی ہے ہر جگہ۔“  
”گڈ! یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔“

”مگر برٹش کونسل سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا ہے مجھے۔ ان کا کہنا ہے اگر آپ برٹش نیشنل ہوتیں تو آپ کا شوہر آپ کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ برطانوی قانون کے مطابق وہاں مرد بیک وقت دو بیویاں نہیں رکھ سکتا لیکن چونکہ آپ برطانوی شہریت کی حامل نہیں لہذا آپ اس برطانوی قانون کا فائدہ نہیں حاصل کر سکتیں۔“  
”پھر؟“

”پھر بھی میں نے ان سب جگہوں پر درخواست بھیجوا دی ہے اور لکھ دیا ہے کہ مجھے کسی قانون قاعدے کے تحت نہیں انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر میرا شوہر اور میرے بچوں کا باپ واپس لوٹایا جائے۔ مجھے جہاں تک بھی جانا پڑا جاؤں گی منتہا۔“

منتہا ممکنہ باندھ کر اس کا منہ تکلنے لگی۔

می اور فضہ دونوں ہی عورتیں تھیں۔

بجا کہ ٹائم فریم میں ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر کھڑی ہوئی۔



مگر ایک دوسرے سے کتنی مختلف!  
ایک پہلے ہی ہلے میں مسارا اور دوسری آخری حدوں تک لڑنے کو تیار۔

اسے فضا کا یہ جارحانہ روپ اچھا لگا۔

”بائی دی وے کہاں تک جاؤ گی؟“

”وقت بتائے گا۔“

”ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں۔“

”جو شخص تمہارے ساتھ وفادار نہیں اس کے پیچھے کیوں جانا چاہتی ہو؟“

فضا کے لبوں پر موم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ابھی اس رشتے کی زنجیر میں بندھی نہیں ہو میری جان جب بندھ جاؤ گی تو کھلے گا کہ اپنی تمام تر بے اعتباری کے باوجود عورت کو معتبر یہی رشتہ بناتا ہے۔ آج مجھ پر دنیا کا اعتبار اسی بے اعتبار شخص کی وجہ سے قائم ہے۔ یہ چادر میرے سر سے ہٹ جائے تو تم دیکھو دنیا کیا کیا فسانے بناتی ہے۔ اتنی کہانیاں گھڑ لی جائیں گی کہ میں ان میں تار عنکبوت کی طرح الجھ کر رہ جاؤں گی۔“

”بچوں کو پتا چلا؟“

”ہاں۔“

”کیا رد عمل رہا؟“

”انتہائی خوفناک۔ راول بولا میں دونوں کو قتل کر دوں گا۔“

”اس عورت اور اپنے ابا جان کو؟“

”ہاں..... رائیل کہنے لگی اماں جان اگر اس عورت کا گھر یہاں ہوتا تو میں اپنے جسم پر بم باندھ کر اس کے گھر میں گھس جاتی۔“

”اور سانول؟“

”مجھے کہنے لگا اب اگر کبھی بابا پاکستان آئے نا تو ہم انہیں اپنے گھر میں نہیں آنے دیں گے۔“ فضا نے توقف کیا پھر بولی ”تینوں نے باپ کے خلاف ٹھیک ٹھاک رد عمل کا اظہار کیا۔“

منتہا کو اس خیال سے سکی محسوس ہوئی کہ جب ڈیڈی نے می سے نگاہیں پھیریں تو وہ ’نہہ اور ملیب اس موقع پر ایسا ہی کوئی رد عمل ظاہر کیے بغیر کس قدر پسائی کے ساتھ ڈیڈی کی زندگی سے نکل آئے تھے!

مگر روٹیوں کے اس تفاوت کے باوجود درد کی شدت تو شاید یکساں ہی تھی۔ فضا کے بچوں کو پہنچنے والی زہنی ازیت کا وہ بخوبی اندازہ کر سکتی تھی۔ نہہ بے چاری کا ان دنوں کیا حال ہو گیا تھا اور خود اس کا اپنا بھی۔ کالج میں وہ دونوں ساتھی لڑکیوں سے یوں منہ چھپائے پھرتی تھیں جیسے کوئی جرم سرزد ہو گیا تھا اور ملیب وہ تو ایک خول میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ آج بھی اس کی شخصیت پر ان دنوں کے اثرات مرتب تھے۔

”مگر میں نے انہیں گول ڈاؤن کیا“ انہیں سمجھایا کہ وہ شخص اگر ایک نہیں دس شادیاں بھی کر لے تو ان کے لیے اس دنیا کا اہم ترین آدمی رہے گا۔“ فضا نے کہا۔

”کیوں؟“ منتہا چونکی۔

”اس لیے کہ وہ ان کا باپ ہے۔“

”تم عورتیں بھی عجیب ہوتی ہو۔“

”تم سے تمہارا کیا مطلب! کیا تم عورت نہیں ہو؟“

”بد قسمتی ہے۔“

”بائی دی وے کیوں ہوتی ہیں ہم عورتیں عجیب!“

”میری ماں سے میرے والد نے بے وفائی کی اور وہ تمہاری طرح کسی جارحانہ ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر ہم بھائی بہنوں سمیت خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل آئیں مگر آج بھی انہیں یاد کرنے کا کوئی بہانہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ اپنے ہسپتال کی دغا بازی پر تمہارا رویہ میری والدہ کے برعکس جارحانہ ضرور ہے مگر پھر بھی تم اس شخص سے اپنے رشتے کی برقراری کو اہم سمجھتی ہو۔“

”فقط اہم نہیں منتہا یہ میرے لیے موت اور زندگی کا معاملہ ہے۔ وہ جیسا بھی ہے کتنا ہی برا سہی میرے بچوں کا باپ ہے۔ کل رائیل کا رشتہ آئے گا تو میں کیا بتاؤں گی لوگوں کو۔ اگر اس نے سچ سچ اس عورت سے دوسری شادی کر بھی لی ہے تو اس کا دوسری شادی کر لینا اتنی ہولناک بات نہیں جتنا مجھے اس کے نام سے ملنے والے تحفظ اور شناخت کے بغیر رائیل کے رشتے کے لیے آنے والے لوگوں کا سامنا کرنا مشکل ہو گا۔ اور پھر وہ بچہ بھی جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں، خدا نخواستہ اس کے باپ سے اپنا رشتہ توڑ کر میں اسے کیا بتا سکوں گی اس کے باپ کے بارے میں۔ رشتہ برقرار رہے گا تو وہ کتنی ہی دور نکل جائے کبھی تو واپس لوٹے گا اور اگر نہ بھی لوٹا تو خود میرا اس کی طرف جانے کا کوئی توجواز رہے گا میرے پاس سو میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔ وہ چاہے گا بھی تو میں اسے گم نہیں ہونے دوں گی۔ پاتال میں بھی اتر گیا تو اسے وہاں سے کھینچ نکالوں گی۔ مذاق تھوڑی ہے میں نے اپنی زندگی کے سنہری سال اس کی نذر کیے ہیں۔“

فضہ کڑے تیوروں کے ساتھ بولی۔

”بس شاید یہی فرق ہے تم میں اور میری والدہ میں۔ انہوں نے اپنے شوہر کو چپ چاپ دوسری عورت کے حوالے کر دیا اور تم اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتیں۔“

فضہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”مجھے دعاؤں کی ضرورت ہے منتہا، می سے کہنا وہ بھی میرے لیے دعا کریں۔“

”ضرور..... تم نے اپنے گھر والوں کو بتایا؟“

”ہاں بتا دیا مگر..... بھابیوں کی نگاہیں! اف خدا! میں تمہیں بتا نہیں سکتی منتہا کہ ان کی نگاہوں میں کتنے سوال کتنی تحقیر اور کاٹ تھی۔“ فضہ کی آواز ڈوب سی گئی۔

اسے تسلی دینے کے لیے منتہا کو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے نزدیک جانا پڑا۔

چند لمحوں بالکل خاموشی میں گزرے پھر فضہ نے کہا ”تم سناؤ۔ گھر میں سب خیریت ہے؟“

”اللہ کا کرم ہے۔“

”یہہ کا کیا حال ہے؟“

”ٹھیک ٹھاک ہے۔ چھوٹے کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ دونوں کا ویزا آگیا ہے۔ فرحان مصر میں کہ جلدی آؤ۔ یہہ

اپنی چھٹی کی منظوری کا انتظار کر رہی ہے، لیٹر آتے ہی چلی جائے گی۔“

”ملیب کے لیے کوئی لڑکی ملی؟“

”ہاں..... می کی ایک جاننے والی ہیں انہوں نے اپنے رشتے داروں میں ایک لڑکی دکھائی تو ہے بہت پیاری سی۔

ملیب بھی ان لوگوں کو پسند آگیا ہے اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ملیب نے پہلے باجی کی رٹ چھوڑ کر

پہلے اپنی شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔“

”بھئی!“



”میں نے اس سے اور می سے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ لوگوں کی خواہش کے سامنے میں نے ہتھیار ڈال دیے مگر پہلے علیل کی دلہن گھر آئے گی تو میں اس گھر سے جاؤں گی۔“

”اس کا مطلب ہے علیل کی شادی جلدی ہوگی۔“

”انشا اللہ تعالیٰ۔“

”اسکول کیسا چل رہا ہے؟“

”کسی روز آؤنا میرے اسکول۔“

”کوشش کروں گی۔ ویسے سن رہے ہیں کہ تم زبردست جا رہی ہو۔ کافی تبدیلیاں لے آئی ہو اسکول میں۔“

”خدا کا شکر ادا کرتی ہوں فضا کہ اس نے اس کام میں لگا رکھا ہے جو پیغمبروں کا منصب رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو ہم جیسوں کے لیے روزی کا وسیلہ بھی بنا دیا۔ بڑا کرم ہے اس کا۔“

”نعیم کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہی ہوں گے۔“

”ادھر میری طرف دیکھو۔“

”متھانے اس کی طرف دیکھا۔“

”اتنی بے نیازی دکھانے کی کوشش بیکار ہے۔ تمہارا چہرہ اور تمہاری آنکھیں تمہارے دل کی چغلی کھا رہے ہیں۔“

”کیا بھلا!“

”مجھ سے نہیں اپنے دل سے پوچھو۔“

”متھادھیرے سے مسکرا دی۔“

”یہ سچ تھا کہ نعیم کا نام آتے ہی اس کے دل کی کیفیت ہی بدل جاتی تھی۔“

\*\*\*

”نخنہ نعمان کی آمد سے مسز ظہیر کے گھر ہی نہیں اہل خانہ کے قلب و نظر کی دنیا میں ہی بدل گئی تھیں۔ مسز ظہیر کو اس کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں ایک عجیب لطف محسوس ہوتا۔ اسے اپنی گود میں لیتیں تو مسرت و طمانیت کا ایک ناقابل بیان احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔ اسے سینے سے لگاتیں تو دل میں ٹھنڈک سی پڑ جاتی۔ ظہیر صاحب اسے بڑی محبت سے اپنے بازوؤں میں اٹھائے پھرتے۔ دونوں پھوپھیاں اور چچا اس سے کسی عفتا کھلونے کی مانند کھیلے اور اس کے لیے بڑے چاؤ سے نوع بنوع چیزیں خرید کر لاتے۔ یہ نہ کہ وہ ہاتھ ہی نہ لگتا۔“

”میں، متھنا اور علیل کا بھی کم و بیش وہی حال تھا جو مسز ظہیر کے گھر والوں کا تھا۔ میں اور متھنا بازار جاتیں تو جہاں اس کے استعمال کی کوئی چیز، کوئی اچھا بابا سوٹ، کوئی نیا کھلونا دیکھتیں اس کے لیے خرید لاتیں۔“

”فرحان کا جب فون آتا، یہ نہ کہ یہ ہدایت کرنا نہ بھولنا کہ وہ نعمان کا زیادہ سامان ساتھ نہ لے کر آئے۔“

”لیلیٰ خوش ہو ہو کر بتاتی ”نعمیم کا جب فون آتا ہے، کہتے ہیں ”فرحان نے بیٹے کی زسری ایسی سبائی ہے کہ تمہاری بہابی آکر دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔“

”نعمیم نے فون پر متھنا سے کہا ”جیسے کوئی آرٹسٹ اپنے کسی شاہکار پر تندہی سے کام کرتا ہے فرحان ان دنوں کچھ اسی طرح اپنی بیگم اور بیٹے کے استقبال کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔“

”یہ نہ کہ اپنے میکے اور سسرال والوں سے کہتی ”فرحان بار بار کہہ رہے ہیں ”زیادہ سامان ساتھ نہ لے کر آنا“ آپ اوگ منے کے لیے کیوں اتنی چیزیں جمع کیے دے رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں، میرے مرنے کے کام آجائیں گی، آپ کے مرنے کے لیے جمع کی ہوئی یہ چیزیں“ ایک روز عدنان نے شرارتاً کہا۔

”اُف خدا، عدنان! تم کتنے بے شرم ہو گئے ہو؟“ نیہہ نے اسے پیارے سے گھورا۔

”کیوں بھی؟ بے شرمی کی اس میں کیا بات؟ ایک نہ ایک دن تو ایسا ہونا ہے۔“

”مالی گاڈ! امی ابو نے سن لیا تو؟“

”ابو تو خیر اس وقت گھر میں نہیں ہیں مگر ہم نے سن لیا ہے“ نیہہ اور عدنان کو آس پاس ہی سے مسز ظہیر کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ نہ جانے کب کمرے کے دروازے پر آکھڑی ہوئی تھیں۔

عدنان جھینپ گیا۔

”یہ دیکھئے امی، آج عدنان مرنے کے لیے پھر ایک کھلونا خریدا لائے۔“

”مجھے اچھا لگا، بس میں لے آیا۔“

”بھئی نیہہ، بات یہ ہے کہ اس گھر میں برس ہا برس بعد کوئی بچہ آیا ہے، اس لیے ہم سب بہت ایکساٹنڈ ہیں۔ تم فرحان کے پاس چلی جاؤ گی تو ہم سب بہت مس کریں گے اسے۔“

”ویسے اس کا ایک حل تھا۔“

”وہ کیا؟“ عدنان کی بات پر مسز ظہیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”بھابی اور مرنے کو وہاں بلوانے کے بجائے فرحان بھائی خود یہاں آجاتے، جاب تو انہیں یہاں بھی مل سکتی ہے۔“

”بات تو ٹھیک ہے“ نیہہ نے تائید کی ”میں نے بھی ایک باریبی کہا تھا ان سے۔“

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”یہی کہ یہاں اتنے پیسے نہیں مل سکتے۔“

مسز ظہیر نے ایک سرد آہ کھینچی پھر دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”اصل میں گھر تو اپنا کوئی بھی خوشی سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر میں جتنے لوگ بھی روزگار کی خاطر اپنے گھروں یا وطن سے نکلے ہوئے ہیں وہ مجبوریوں یا محرومیوں کے مارے ہوئے لوگ ہیں“ انہوں نے پھر ایک سرد آہ کھینچی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہمارے بچوں نے بھی اتنی محرمیاں سہی ہیں کہ اب ان کے ازالے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہم تو دعا کرتے ہیں کہ خدا انہیں اور ان کے بچوں کو اتنی خوشیاں دکھائے کہ کوئی محرومی ان کا دل نہ دکھائے۔“

”بھابی، انشاء اللہ امی، ابو اور میں آپ سے ملنے کے لیے دیہی آئیں گے“ عدنان نے نیہہ سے کہا۔

”ضرور۔“

”بھئی، پہلے یہ خود تو پہنچ جائیں۔ چھٹی ہی منظور نہیں ہو کر آرہی ہے ان کی۔ توبہ! ہمارے ہاں دفتری کارروائیاں اتنی ست روی سے انجام پاتی ہیں کہ کبھی کبھی گاڑی نکل جاتی ہے اور مسافر اسٹیشن پر کھڑا رہ جاتا ہے۔“

”سب کے لیے ایسا نہیں ہے امی۔ تعلقات، سفارش اور لال ہرے نوٹوں کی خوشبو مسافر کو گاڑی میں سوار کرانے کے لیے اسٹیشن کو گاڑی سمیت مسافر کے گھر کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے“ عدنان نے کہا۔

مسز ظہیر نے عدنان کی بات سنی پھر نیہہ کی طرف دیکھ کر بولیں ”سنا تم نے! محرومیاں سننے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو زندگی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے۔“

نیہہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسز ظہیر کے نزدیک جا بیٹھی اور دھیمی آواز میں بولی ”اس گھر میں آکر مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا امی کہ میں کسی دوسرے گھر میں آئی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ہمیشہ سے یہیں رہ رہی تھی، اسی گھر کا حصہ تھی۔“



"ہاں ہونا" مسز ظہیر نے اس کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا "پرائی تو بیلا اور لیلیٰ تھیں، اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ تم... تم ہماری اپنی ہو۔ اس گھر کا انٹ انگ ہو۔ ہماری اگلی نسلوں کی امین ہو۔ تم جہاں بھی رہو، خدا تمہیں خوش رکھے۔"

نیمہ نے سر اٹھا کر انہیں تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ "اس گھر میں مجھے اتنی عزت، اتنا پیار ملا ہے امی کہ میں جہاں بھی رہوں گی یہ گھر اور آپ سب لوگ میرے دل کے نزدیک رہیں گے۔ بالخصوص آپ سے میں نے اتنے تھوڑے سے دنوں میں اتنا کچھ سیکھا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"تھوڑا بہت تو کر ہی دیں ماما کہ اوروں کا بھی بھلا ہو" عدنان نے شوخی سے لقمہ دیا۔

نیمہ نے پُر احترام نگاہوں سے مسز ظہیر کو دیکھا پھر عدنان کی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

"امی مجسم محبت ہیں۔ بہادر اور توانا ہیں۔ میری اپنی ماں تو بہت کمزور سی سہمی ہوئی سی عورت ہیں، عدنان یہاں آکر امی کو نزدیک سے دیکھ کر میں نے یہ جانا کہ ایک خاتون بھی کس قدر جری اور توانا ہو سکتی ہے۔"

"بس بس بس... اب اور تعریف نہ کریں ورنہ امی کو نیچے لانا مشکل ہو جائے گا اور ہاں ذرا ایک تصویر لے لوں آپ دونوں کی" عدنان نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کمرے سے تصویر کھینچنے کے انداز میں سیٹ کیا اور ایک آنکھ میچتے ہوئے بولا "یہ تصویر اس کیپشن کے ساتھ گینز ورلڈ ریکارڈ کو بھجوائی جائے گی کہ ان دونوں خواتین میں ساس بہو کا رشتہ ہے۔"

مسز ظہیر دھیرے سے مسکرا دیں اور نیمہ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے عدنان سے بولیں "رشتوں کو تو لوگوں نے خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے۔ رشتے نہیں لوگ اچھے یا بُرے ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں داماد بھی بہت اچھے ملے ہیں اور بہو بھی۔"

نیمہ نے سر اٹھا کر مسز ظہیر کو دیکھا اور بولی "آئی لو یو امی!"

"بھئی کچھ خدا کا خوف کیجئے.... میری والی کے لیے زیادہ مشکلات پیدا نہ کریں" عدنان نے پھر شوخی دکھائی۔

"تم اپنی کو آنے تو دو" اسے اس گھر میں دو سائیں ملیں گی" نیمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے باپ رے!" عدنان نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا اور منہ چھپا کر ہاگ لینے کی اداکاری کی۔

مسز ظہیر اور نیمہ نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔

\*\*\*

اسکول کی بہتری کے لیے منتہا کے اقدامات پر تدریسی اور غیر تدریسی ملازمین کا ردِ عمل ملا جلا تھا۔ فرض شناس اور کام کی لگن رکھنے والے خوش تھے اور ان کی استعداد کار میں اضافہ ہو گیا تھا، کام چوروں کو پتا چل گیا تھا کہ جلد یا بدیر انہیں راہِ راست پر آنا ہوگا۔ پابندی وقت نہ کرنے والوں کو وقت کی پابندی اور کام سے جی چرانے والوں کو کام کرنے کی عادت اپنانی ہوگی، کام کرنا ہوگا تبھی کام چلے گا ورنہ مشکل!

غیر تدریسی ملازمین کی بڑی شامت آئی ہوئی تھی۔ دن بھر بھاگے دوڑے پھرتے۔ ایک کام ختم نہ ہونے پاتا کہ دوسرا زے لگادیا جاتا۔ اس حد تک تو روا تھا کہ نئی پرنسپل کو اسکول ہر وقت صاف ستھرا، چمکا ہوا اور آراستہ و پیراستہ دیکھنے کا مینیا تھا مگر محترمہ کو بعض کام تو عجیب و غریب سوجھ رہے تھے۔

گراؤنڈ ہموار ہونی چاہیے۔

احاطے سے خود رو جھاڑیاں صاف ہو جانی چاہئیں۔

گراؤنڈ میں پتھر پڑے دکھائی نہ دیں۔

گملوں کی ترتیب متوازن نظر آئے۔

اسکول بلڈنگ کے مقابل بنجر بڑے قطعہ زمین پر گھاس لگائی جائے۔

نئی کاریاں بنا کر ان میں پھولدار پودے لگائے جائیں۔

بابو کے دفتر میں کانگذاات کی فائلنگ کا نظام بہتر بنایا جائے۔ دفتری ریکارڈ کی از سر نو فائل بندی کی جائے۔

بچوں کے داخلہ فارم ردی کانگذاات کی طرح بڑے نظر آنے کے بجائے ان کی سال وار جلد بندی کروائی جائے۔

دفتر میں کانگذاات منتشر بڑے نہ دکھائی دیں۔

ڈاک کی بروقت ترسیل اور وصولی کو یقینی بنایا جائے۔

ایک کمرے میں بچوں کے لیے باقاعدہ لائبریری بنائی جائے اور اس لائبریری تک بچوں کی رسائی آسان ہو۔

ایک جماعت کے کمرے میں عرصہ دراز سے بند کھڑی الماری کا تالا تڑوانے پر اس میں سے بچوں کی بہبود کے لیے کوشاں ایک بین الاقوامی ادارے کی جانب سے عطیہ کردہ ڈھیروں لائبریری بکس کیا برآمد ہوئیں، اسکول کی ہر الماری کا پوسٹ مارٹم شروع ہو گیا۔ وہ وہ نوادرات دستیاب ہوئے کہ خدا کی پناہ! کہیں برس ہا برس پرانی اشیائے خوردنی کی پڑیاں، کہیں خالی ڈبے اور بوتلیں، کہیں سے ملگے رومال، بالوں میں لگانے والے رنگ آلود پین، تنگھے امتداد زمانہ سے رنگ بدل لینے والی لپ اسٹک، ٹوٹے دستے والی چھری، چمچ، ہوائی چپلوں کی باہم چپکی جوڑی، پرانے رجسٹرز، ڈھیروں کانگذاات، دس برس قبل گم ہونے والا امتحانی پرچوں کا ایک غیر بڑا تال شدہ سیٹ جس کا پوسٹ مارٹم کرنے پر غزالہ نے اپنا سر ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا ”اوہ مائی گاڈ میڈم! اس سیٹ کے گم ہو جانے پر تو اسکول میں ایسا کھرام مچا تھا کہ کیا بتاؤں۔ سالانہ امتحان کے پرچے تھے۔ بات ڈائریکٹریٹ تک جا پہنچی۔ دوبارہ پرچہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اس مضمون میں ہر بچے کو پاس کرنا پڑا مگر جس پیپر کا پرچہ تھا اس بے چاری کو ڈائریکٹریٹ نے بطور سزایہاں سے بیس میل دور ٹرانسفر کر دیا۔ بے چاری اپنی ریٹائرمنٹ تک وہیں کی خاک چھانتی رہیں۔“

شوئی قسمت ایک روز بارش ہو گئی۔ مین گیٹ سے اسکول بلڈنگ تک وہ کچھڑ ہوئی کہ برآمدے اور کمرے ہائے جماعت بھی بچوں اور دیگر افراد کی آمدورفت سے لت پت ہو گئے۔ موسم کھلتے ہی غیر مدرسہ کی ملازمین کی شامت آگئی۔ ہائی اسکول کی عمارت کے عقب میں آثار قدیمہ کی مانند بڑے بلے کے ڈھیر سے سالم اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کو نکال کر اپنی مدد آپ کے تحت اسکول گیٹ سے مین بلڈنگ تک ایک نیم پختہ راستہ بنانے کی تجویز صادر ہوئی اور بتدریج حکم بن گئی مگر بقول غزالہ ناصر ”آؤٹ پیٹ“ زبردست رہا۔

غیر مدرسہ کی ملازمین موقع پاتے ہی آٹھ آٹھ آنسو رونے بیٹھ جاتے اور گئے دنوں کو یاد کر کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے۔

”میڈم فریدہ جنتی عورت تھی۔ اس بے چاری نے کبھی پلٹ کر پوچھا ہی نہیں کہ اسکول میں کیا ہو رہا ہے کیا ہوتا ہے۔ بس اسے تو ہر گھنٹے بعد چائے کی ایک پیالی کی طلب ہوتی تھی جو آپا صغیراں اسے بنا کر دے دیتی تھی۔“

”ساتھ آدھی پیالی خود بھی پی لیتی تھی۔“

”لگاؤں تیرے جو تا“ آپا صغیراں لقمہ دینے والے کو گھورتی۔

”میڈم رحمانہ کو تو چائے کی طلب بھی نہیں تھی۔ اللہ کی بندی سارا دن کرسی پر بیٹھی یا تو تسبیح کے دانے گھماتی رہتی تھی یا فون کے نمبر۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

”ہائے ہائے اپنی میڈم گلزار فاطمہ کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ آئیں حاضری لگائی، بابو سے دو چار باتیں کیں، گاڑی پکڑی اور کبھی ایک اسکول میں ایک پرنسپل سے ملنے چلی گئیں، کبھی دوسری سے۔ پھر بازار سے گھر کا سودا سلف خرید کر گاڑی میں رکھوایا۔ بارہ سو بارہ اسکول کا ایک چکر لگایا، پانچ دس منٹ سیٹ پر بیٹھیں پھر گھر... بڑا اچھا وقت گزارا ہم لوگوں نے پچھلے لوگوں کے ساتھ۔“



”سیانے بچ کہتے ہیں کہ ہر اگلا دن پچھلے دن سے اور ہر آنے والا حاکم جانے والے سے زیادہ برا ہوتا ہے۔“

”نئی میڈم نے تو اقبال بھائی کے سفید سوٹوں کے لشکارے ہی ختم کرا دیے۔“

اوروں کا جو حال تھا سو تھا، اقبال کا واقعی برا حال تھا۔ کہاں تو یہ عالم کہ کلف دار سوٹ پہنے دفتر کے باہر کرسی پر بیٹھا رہتا یا اسکول کے نظم و ضبط میں خاطر خواہ کردار ادا کرتا کہاں یہ حال کہ کبھی پانچے چڑھائے، پیلے ہاتھ میں لیے گراؤنڈ میں کھڑا ہے، کبھی کھڑکیوں کے شیشے رگڑ رگڑ کر چکا رہا ہے۔ ایک روز چالیس فٹ اونچے چھبے پر ٹکا اسکول کے دھاتی سائن بورڈ کی گرد جھاڑتے پایا گیا۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ نئی پرنسپل اس قسم کی مہم جوئیوں کے لیے محض احکامات صادر کرنے پر ہی قناعت نہ کرتی تھی، ان کا بنفس نفیس جائزہ لینے کے لیے موقع پر بھی پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ جب اقبال چھبے پر چڑھا سائن بورڈ صاف کر رہا تھا، نئی پرنسپل نیچے کھڑی گردن اٹھائے، چلپلاتی دھوپ سے چندھیائی آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*

نیمہ کی متوقع دینی روائی کے پیش نظر ایک چھوٹی سی تقریب میں عیوب کی منگنی کر دی گئی تھی۔ خوش حال اور مہذب گھرانہ تھا۔ لڑکی کے والد مقامی بینک میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی، جو دونوں بھائیوں سے بڑی تھی۔ نام اس کا صدف تھا۔ خوبصورت اور اسماٹھ تھی۔ گریجویٹیشن کر رکھا تھا۔ فرحان کی شرکت ممکن ہوتی تو می اور منتہا منگنی کے بجائے شادی ہی کر دالتیں مگر بقول می پہلا اور اب تک اکلوتا داماد اس کی شرکت کے بغیر تقریب پھینکی بھی رہتی اور پھر لوگ کیا کہتے، داماد کی شرکت کی بھی پروا نہ کی۔ فرحان کا آنا فی الحال تو قطعاً ممکن نہ تھا لہذا یہ ٹھہرا کہ فی الحال منگنی کر کے بات پکی کر لی جائے اور عیوب کی شادی منتہا کی شادی تک ملتوی رکھی جائے۔ عیوب کا ولیمہ ہو اور منتہا کی برات۔ اس طرح منتہا کی شرط بھی پوری ہو جائے گی۔

می، منتہا اور نیمہ عیوب کی منگنی سے بہت خوش تھیں۔ عیوب کی منگنی کے تیسرے دن نیمہ کی بیرون ملک رخصت منظور ہونے کا پروانہ بھی آگیا۔ مسز ظہیر نے فرحان کو فون پر فوری اس امر کی اطلاع دی اور عدنان نیمہ کی سیٹ اوکے کروا آیا۔ جمعہ کی سہ پہر کو روائی گئی تھی۔

”دلہن صاحب! آپ جانتی ہیں مگر مرنے کے بغیر ہمارا دل بہت اداس ہو گا۔“ ظہیر صاحب نے نیمہ سے کہا۔

”آپ کہتے تو نہ جاؤں؟“ نیمہ نے ان کا دل رکھنے کو کہا۔

”ارے بھی کیوں نہ جاؤں؟“ مسز ظہیر بولیں ”فیملی اکٹھے ہی اچھی لگتی ہے۔ میاں بیوی ساتھ ہوں تو بھاری بوجھ بھی ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے اور چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی دوچند دکھائی دیتی ہیں۔ شوہر کیس بیوی بچے کہیں کم از کم ہمیں تو یہ بات بالکل پسند نہیں۔“

”بجا ارشاد فرماتی ہیں آپ کی ساس صاحب!“ ظہیر صاحب نے نیمہ کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

\*\*\*

سوموار کی صبح مسز ظہیر نے ناشتے کی میز پر نیمہ سے کہا ”ایک دو دن می کے پاس رہ آؤ، عدنان تمہیں چھوڑ آئیں گے۔“

”اور مرنے کو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ؟“ ظہیر صاحب بولے۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ننھا سا بچہ ماں کے بغیر کیسے رہے گا؟“ مسز ظہیر بولیں۔

”ویسے ہی جیسے ہو صاحب کی ڈیوٹی کے دوران میں رہا کرتا تھا۔“

”وہ اور بات تھی... مجبوری تھی۔ کوئی ماں خوشی سے اپنے بچے کو نہیں چھوڑتی۔“

”آپ کبھی ہماری طرف داری مت کیجئے گا“ ظہیر صاحب شاکی لہجے میں بولے۔  
 ”غلط بات میں کیوں کی جائے کسی کی طرف داری... ظہیر صاحب، بچوں کو اپنی ماؤں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔  
 بالخصوص ملازمت پیشہ ماؤں کو تو اپنی ملازمت کے بعد جتنا وقت ملے، اپنے بچوں کے ساتھ ہی گزارنے کی کوشش کرنی  
 چاہیے کیونکہ ملازمت کرنے والی ماؤں کے بچے اپنی ماؤں سے بہت کم وقت لے پاتے ہیں۔“  
 ”بیگم صاحبہ، اس پورے فسانے میں کہیں باپ کا بھی ذکر ہے؟“ ظہیر صاحب مسکرائے۔  
 ”بالکل ہے“ مسز ظہیر بولیں ”کم از کم ہمیں ایسے باپ بالکل اچھے نہیں لگتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام بس کما کر  
 بیوی بچوں کو کھلار دینا ہے۔ ان کی کچھ جذباتی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کی تشفی اتنی ہی ضروری ہے جتنا ان کی بھوک  
 کاٹنا۔“

”ٹھیک ہے، بہو صاحب، آپ جاییں، ہم سُننے کو اپنے پاس رکھنے کی فرمائش واپس لیتے ہیں“ ظہیر صاحب نے  
 نیہہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابو، اتنی جلدی سرینڈر کر دیا آپ نے؟“ عدنان مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”صاحب زادے، تمہاری والدہ کے سامنے تو ہم ساری زندگی ہی سرینڈر کیے رہے۔“  
 ”اب اتنی کس نفسی بھی مت دکھائیے۔ آپ کے بچوں نے تو آپ کا دوسرا روپ دیکھا ہے، یہ ہم ہی جانتے ہیں کہ  
 شروع میں آپ کس قدر غصہ ور اور ضدی ہوا کرتے تھے۔ جو کہہ دیا سو کہہ دیا“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”بائی واوے شروع سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”ہماری اور آپ کی شادی کا ابتدائی عرصہ۔“  
 ”آپ نے اب تک یاد رکھا ہوا ہے؟“ ظہیر صاحب خوش دلی سے بولے۔

”ساری زندگی نہیں بھولیں گے ہم۔“

ظہیر صاحب دھیرے سے ہنس دیے۔

”ہمارا خیال ہے تم آج اپنی مہی کے ہاں چلی جاؤ۔ بدھ کی شام آجانا“ مسز ظہیر نے نیہہ سے کہا۔  
 ”جی بہتر“ مہی کے ہاں جانے کے خیال سے نیہہ کو خوشی اور دکھ کا ملا جلا احساس تھا۔ وہ پردیس جا رہی تھی، نہ  
 جانے پھر کتنے دن بعد اپنے پیاروں سے ملنا نصیب ہونا تھا۔  
 سہ پہر کو عدنان اسے مہی کے ہاں پہنچا آیا۔ مہی اور منتہا بہت خوش ہوئیں۔ نیہہ تو شادی کے بعد اس گھر کے لیے  
 وی آئی پی بن ہی گئی تھی، مٹاوی وی آئی پی بن کر آیا۔  
 شام کو دفتر سے واپس آنے کے بعد علیب بھانجے کو گود میں لے کر گھر سے باہر شلاتا پھرا۔ نیہہ، مہی اور منتہا  
 آنے والے دنوں کی باتیں کرتی رہیں۔

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط،  
 کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے تنک  
 (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا  
 ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کروں تاکہ یہ ضائع نہ ہوں۔ ای  
 میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔



نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر مالک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے  
 ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)



”باجی بھی شادی کے بعد وہیں آجائیں گی۔ پھر ہم دونوں بہنیں کوشش کر کے آپ کو ملیں اور اس کی دُہن کو بھی وہیں بلا لیں گے“ نیسہ نے کہا۔

”بیٹا، میرا کیا ہے، بہت گزر گئی تھوڑی سی باقی ہے، یہ بھی گزر ہی جائے گی“ مُمی کے لمبے میں دھیمی سی دل گرفتگی تھی ”خدا تم بھائی بہنوں کو خوش رکھے“ آخری جملہ مُمی کے دل کی گہرائیوں سے نکلا۔

”اللہ کا کرم ہے مُمی، ہم دونوں بہنوں کو بہت اچھے اور قدردان لوگ مل گئے۔ یہ سب آپ کی نیکی اور صبر کا بدلہ ہے“ نیسہ نے کہا۔

”نیسہ، میں نے یہ بات آج نوٹ کی ہے کہ تمہارا الب دلجو تو بالکل مسز ظہیر کی طرح کا سا ہو گیا؟“ منتہا نے کہا۔

”کیوں نہیں؟“ گگا بھئی، وہ آخر کو ہماری ساس ہیں۔ شی از سونا کس باجی، کہ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے ایک ماں میری اس گھر میں ہیں اور ایک اس گھر میں۔“

دفعۃً دروازے پر لگی گھنٹی بجی اور ان کی گفتگو میں خلل پڑ گیا۔

”میلیب ہو گا۔ بہت خوش ہے بھانجے کے آنے سے“ مُمی نے کہا۔

منتہا نے اٹھنے کا قصد کیا۔

”آپ بیٹھی رہیں، میں دیکھتی ہوں“ نیسہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے پر مسز ظہیر، ظہیر صاحب اور عدنان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ تینوں کے چہرے متے ہوئے تھے۔ نیسہ نے ان کی اس غیر متوقع آمد پر انہیں حیرانی سے دیکھا۔ ان کے چہروں سے مترشح گہیرا تاثرات نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

”خیریت تو ہے امی!“ اس نے مسز ظہیر کی جانب دیکھا اور ایک طرف کو ہٹ کر انہیں اندر آنے کو راہ دیتے ہوئے بولی ”آپ لوگ اندر تو آئیے۔“

تینوں مردہ قدموں سے اندر آ گئے۔

”ابو جی، آپ لوگ اتنے خاموش کیوں ہیں؟“ نیسہ کے دل پر ایک انجانی سی وحشت طاری ہونے لگی۔

ظہیر صاحب نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا۔

مسز ظہیر کے لبوں پر تھر تھراہٹ سی طاری ہو گئی اور آنکھوں میں آنسو امانڈ آئے۔

”کیا ہوا عدنان!“ نیسہ نے عدنان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولا بلکہ اس نے اپنے ہونٹوں کو باہم پوری شدت سے بچھینچ لیا۔

مسز ظہیر نے نیسہ کا چہرہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں کے درمیان لیا اور اسے بھگی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”ایک بری خبر ہے نیسہ، مگر ایسے نہ رونا تم کہ ہمارا کلیجا پھٹ جائے۔ بہت ہمت کر کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں... سنو... سنو بیٹا... ذرا صبر سے... ہمت سے... حوصلے سے سنو بیٹا... فرحان... ہمارے دل کا ٹکڑا... تمہارے سر کا تاج... اور ہمارے نئے کا باپ... وہ اتنا پیارا تھا کہ اسے اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا۔“

نیسہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

”ہاں بیٹا... وہ چلا گیا“ مسز ظہیر گھٹ گھٹ کر رونے لگیں۔

”نیسہ بیٹا! کون ہے؟“ مُمی یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکلیں اور ان سب کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔

منتہا بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے موجود منظر دیکھ کر دھچکا سا لگا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی تو وہ، مُمی اور نیسہ کتنی خوش تھیں مگر چند منٹوں میں منظر یکسر بدل گیا تھا۔

ایک بیک زندگی کے یوں نگاہیں پھیر لینے کا یہ منظر انتہائی جاں سوز تھا!

(باقی آئندہ)

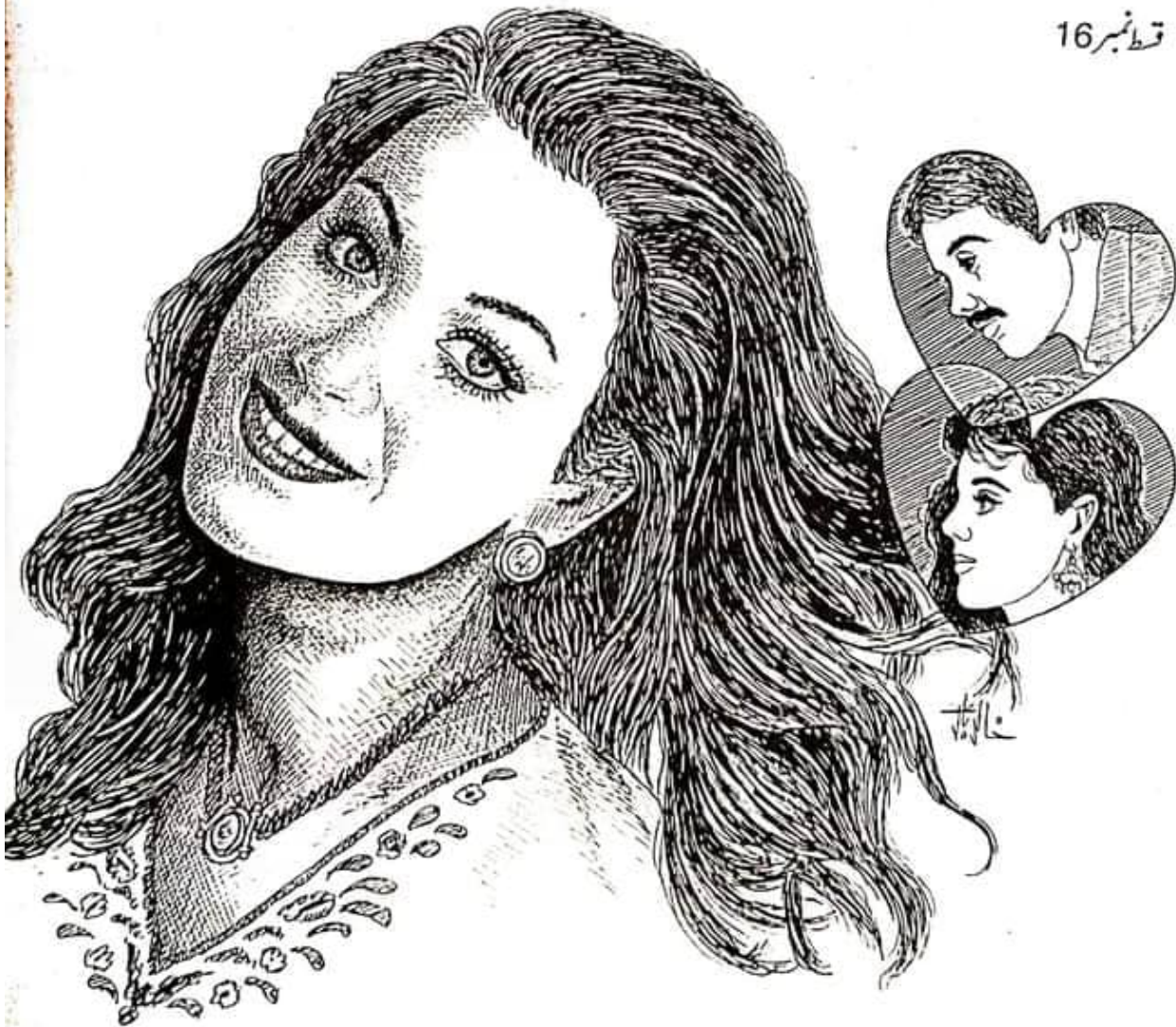
دکھو دکھو کوئی رنگ، کوئی مذهب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھو تو دکھو  
ہم جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا  
ذریعہ اظہار ہیں، ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ رین پر محبت کے  
بہول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے  
بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔  
اس سے پہلے ان کے کئی شاعکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی  
نئی کارش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔  
گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی  
کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے  
بھنور میں پھنس گیا تھا۔

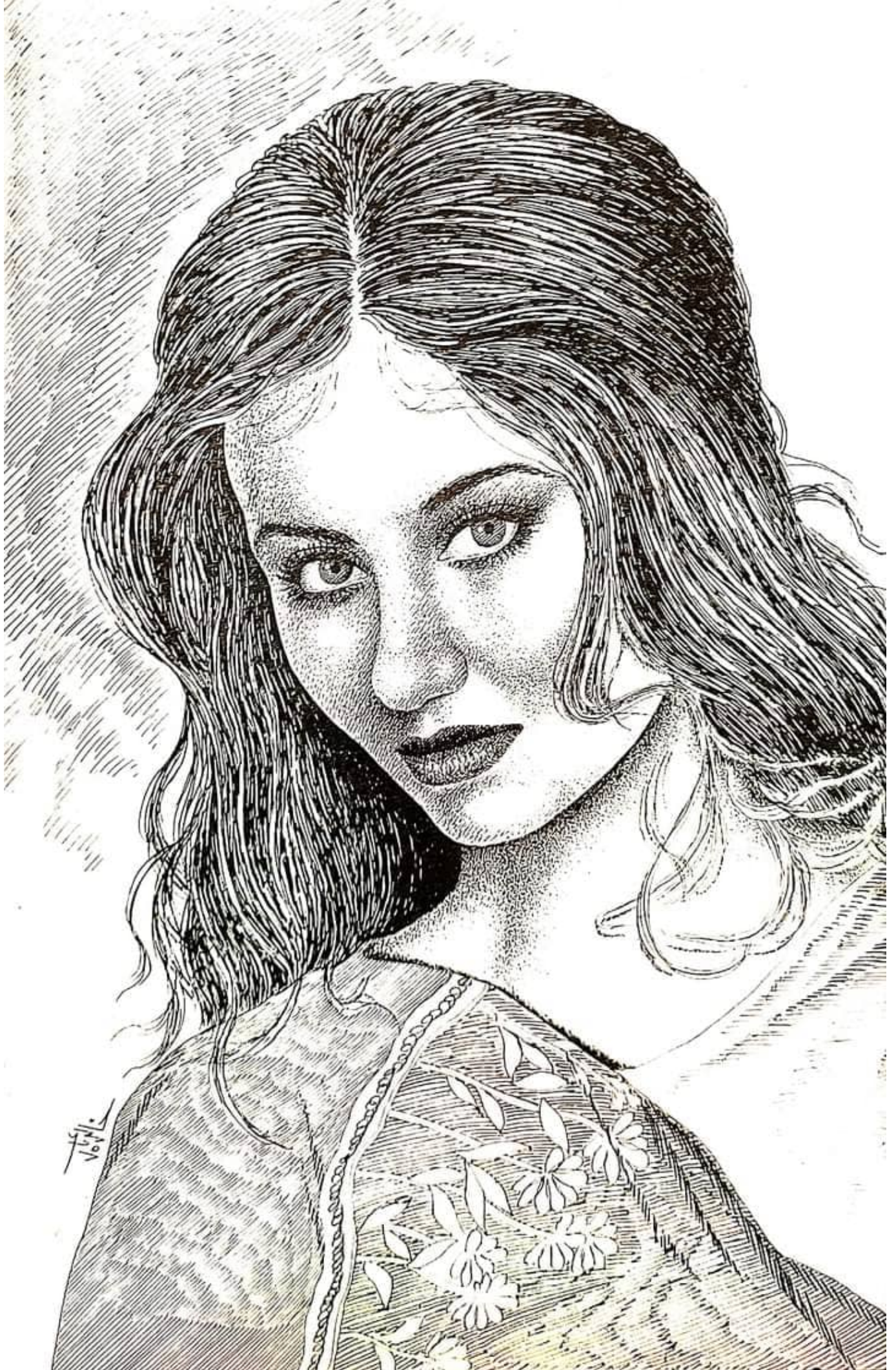
محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کا چاک مسارہونے کی دل گرداڑاستان

ناہید سلطانہ اختر

قسط نمبر 16









فرحان کی ناگہانی موت کی خبر نے اپنے پرایوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ دہی سے موصولہ اطلاع کے مطابق وہ اور نعیم کسی کام کے سلسلے میں دہی سے اس النہیہ جا رہے تھے کہ گاڑی تیز رفتاری کے باعث بے قابو ہو کر الٹ گئی۔ نعیم کو جو گاڑی چلا رہا تھا معمولی چوٹیں آئیں جبکہ فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھا فرحان گردن پر شدید ضرب کے باعث ڈیڑھ دن کو مایں رہا اور جانبر نہ ہوسکا۔

نعیم کے بارے میں یہ بات پورا خاندان جانتا تھا کہ وہ انتہائی تیز رفتار ڈرائیونگ کا عادی تھا اور غالباً یہ واحد بات تھی جو اس کے عمومی مزاج کے برخلاف تھی تاہم یہ ضرور تھا کہ اس کی تیز رفتار ڈرائیونگ میں مشاقی بھی تھی۔ گاڑیوں کے اثر دہام سے وہ اپنی گاڑی ایسی مہارت اور برق رفتاری سے نکال لے جاتا کہ مشاق ڈرائیور بھی اس کی مہارت کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے۔ سننے میں آیا تھا کہ دہی میں اس نے بیش قیمت آٹو بیک گاڑی رکھی ہوئی تھی جو عموماً ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی۔

میت کو وطن لانے کے انتظامات کے جا رہے تھے۔ نعیم، فہیم اور دہی میں فرحان کے دوست اس سلسلے میں ضروری انتظامات کر رہے تھے اور لواحقین سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔

پورا خاندان مسز ظہیر کے گھر امنڈ آیا تھا۔ کیا اپنے کیا پرانے..... دوستوں، محلے داروں اور ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ دو جاتے چار آ جاتے۔ ہر ایک دلگیر، ہر شخص انگشت بدنداں کہ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔ ہنسا ہنسا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ اہل خانہ کی حالت غیر تھی۔ ظہیر صاحب کے تو جیسے گھٹنے ٹوٹ گئے تھے۔ عدنان کا چہرہ سُت گیا تھا۔ بیلا اور لیلیٰ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ میہہ سکتے میں تھی۔ اسے نہ اپنا ہوش تھا نہ بچے کا۔ می اور منہا کے دل کٹے جا رہے تھے۔ کتنی خوش تھی میہہ فرحان کے پاس جانے کے خیال سے! کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قضا کا ہاتھ اس کی ساری خوشی ملیا میٹ کر کے رکھ دے گا۔ مسز ظہیر غیر معمولی صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے کبھی ایک بٹی کو گلے لگاتیں کبھی دوسری کو دلاسا دیتیں۔ کبھی عدنان کو ہمت سے کام لینے کی تلقین کرتیں کبھی ظہیر صاحب کو راضی برضا رہنے کو کہتیں۔

”خدا کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔“ وہ متحمل لہجے میں کہتیں۔

میت کے انتظار میں ہر لمحہ قیامت بن کر گزرا۔ میت تیسرے دن وطن پہنچ پائی۔ نعیم اور فہیم کے علاوہ فرحان کا ایک قریبی دوست سمیع بھی میت کے ہمراہ تھا۔ نعیم کی پیشانی اور ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ دائیں رخسار پر نیل تھا اور چہرے پر چند معمولی خراشیں تھیں۔ رنج کی شدت سے اس کا چہرہ بری طرح اتر ا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی تھی۔ شاید یہ شرمندگی اس احساس کا ردِ عمل تھی کہ حادثے کے وقت گاڑی وہی چلا رہا تھا۔

تابوت گھر پہنچا تو فرحان کا آخری دیدار کرتے ہوئے میہہ پر بیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کی فلک شکاف چیخوں نے اپنوں ہی نہیں غیروں کے دل بھی دہلا دیے۔ حادثے کی خبر ملنے کے بعد اس پر جو سکتہ طاری ہوا تھا وہ ایسا ٹوٹا کہ مسز ظہیر کا صبر و استقامت بھی جواب دے گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔

”صبر کرو بچے، خدا کو یہی منظور تھا۔“ می نے اسے بھرائی ہوئی آواز میں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”کیوں؟ آخر کیوں؟ خدا کو یہی کیوں منظور تھا؟“ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپی۔

اور اس کے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

تجے کو فرحان کے تابوت کے نزدیک لایا گیا تو میہہ کی آہ بکانے قیامت برپا کر دی۔

”پلیز! پلیز فرحان! ایک مرتبہ تو آنکھ کھول کر اسے دیکھ لو۔“

چینتے چینتے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔



جنازہ اٹھا تو ہر آنکھ اشک بار تھی اور ہر دل محزون! وہ نگاہیں جو نعیم کو محبت، احترام اور رشک سے دیکھا کرتی تھیں اس سانچے کا ذمے دار قرار دے رہی تھیں۔ مسز ظہیر اور ان کے اہل خانہ کے دلوں میں نعیم اور نعیم کے خلاف یہ گلہ پنچے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا کہ انہوں نے ڈیڑھ دن تک حادثے کی خبر ان لوگوں کو کیوں نہیں دی تھی۔ فرحان کے مرنے کا انتظار کیوں کیا تھا۔

خدا جانے اس ڈیڑھ دن میں کیا کچھ ہوا ہوگا! شاید حادثے کی بروقت اطلاع پہنچ گئی ہوتی تو ادھر سے کوئی وہاں پہنچ جاتا۔ دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھ گئے ہوتے اور کیا عجب کہ کوئی معجزہ ہو جاتا۔

شاید! شاید کسی دعا کے طفیل فرحان کی سانس کی ڈور بندھی ہی رہتی۔ آخر اسی حادثے میں نعیم بھی تو محفوظ و مامون رہا تھا۔

☆☆☆

بیہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ چہرے سے برسوں کی بیمار لگتی۔ آنکھوں میں گویا جہان بھر کی ویرانی سٹ آئی تھی جو دیکھنے والوں کو دل گرفتہ کر دیتی۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کسی بات سے دلچسپی۔ بصورتِ بت چپ بیٹھی خلاؤں میں یوں تکتی رہتی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ اسے دیکھ کر مئی کا کلیجہ منہ کو آتا۔

مسز ظہیر کے حوصلے کی داد دینی پڑتی۔ گھر کے ایک ایک فرد کو راضی برضا رہنے کی تلقین کرتیں، حقیقت پسند ایسی کہ یہ جانتے ہوئے کہ بیہ کو اس موقع پر جو سلی اپنی ماں سے مل سکتی تھی کسی اور سے نہیں مئی سے کہا ”بیہ کو اس کڑے وقت میں جتنی ڈھارس آپ دے سکتی ہیں کوئی اور نہیں بندھا سکتا۔ آپ ان کے پاس رہیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔“

مئی مستقل بیہ کے پاس تھیں۔ منتہا بھی اسکول سے واپسی پر وہیں آ جاتی۔ شام کو علیٰ اپنے آفس سے واپسی پر اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے گھر جاتا۔

سچ تو یہ تھا کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پہلی بار منتہا کا دل اسکول سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ اسکول جاتی تو بیہ کی صورت نگاہوں میں پھرتی رہتی۔ سوگوار چہرہ، اداس آنکھیں، خالی کلاسیاں، سفید دوپٹا!

خدا یا!

تصویرِ زندگی کتنی بے رنگ و روپ ہو گئی تھی۔

اسٹاف کے ایک ایک فرد نے منتہا کو بڑسہ دیا تھا۔ سابقہ اسکول سے بھی ساتھی تعزیت کے لیے اس کے پاس آئے۔ اسے آنسو روکنا محال ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے حلق جیسے چٹخا جا رہا تھا اور دل! کسی پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ تعزیت کرنے والے اظہارِ افسوس کر رہے تھے اور اسے جواب میں کچھ کہنے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

خدا یا!

زندگی میں یہ مقام کرب و اہلا بھی آتا تھا۔

اپنے منصب کا لحاظ رکھنے کو اسے اپنے آنسوؤں کو دل میں اتار لینا پڑا۔

مگر فاروقی صاحب کے سامنے وہ بیک بیک کمزور پڑ گئی۔

”حوصلہ! حوصلہ! مس منتہا۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔

”بہت..... بہت مشکل ہے سر۔“ اس کی آواز میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔  
 ”یقیناً۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولے ”مگر کرنا تو پڑے گا ورنہ بہن کے زخمی دل پر مرہم کیونکر لگا پائیں گی آپ۔“

اس کی آنکھوں میں سیل رواں امد آیا۔  
 ”سر! بہن تو ٹوٹ گئی ہے، بکھر گئی ہے۔“

”وقت سمیٹ دے گا مس منجہا۔“ فاروقی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر دھیمے سُرور میں بولے ”وقت قاتل بھی ہے، میجا بھی۔ ایک ہاتھ سے زخم لگاتا ہے دوسرے سے اسی زخم پر پچا ہا بھی دھر دیتا ہے۔“  
 ”سر!“ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسا سخت مقام بھی آئے گا۔  
 ”سوچتا کوئی بھی نہیں مس منجہا مگر.....“ فاروقی صاحب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا ”اسکول کیسا چل رہا ہے؟“  
 ”پتا نہیں سر۔“ وہ انتہائی دل گرفتہ لہجے میں بولی۔  
 ”کیا مطلب!“ وہ چونکے۔

”آج کل تو اسکول میں دل ہی نہیں لگ رہا۔ زبردستی چلی آتی ہوں۔“  
 ”صبح جب اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا کریں تو اپنے آپ سے کہا کریں خدا کا کتنا احسان ہے کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی خوشی اپنے غم کے حصار میں رہتے ہیں بلکہ میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنہیں خدا نے خدمتِ خلق کا موقع عطا کر رکھا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نامیری بات؟“  
 ”جی سر!“ اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

”ملازمت عموماً ایک پابندی، ایک جبر بلکہ بعض لوگوں کو تو قید خانہ محسوس ہوتی ہے مس منجہا لیکن جب انسان اپنے اندر گھٹن محسوس کرنے لگے تو یہ ملازمت ایک آؤٹ لیٹ بن جاتی ہے، اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کا ذریعہ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی ہمشیرہ بھی اپنے بیروں پر کھڑی ہیں۔ ابھی زخم تازہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب تکلیف کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ان کی ملازمت بھی ان کے لیے زندان میں آکسیجن کا کام دے گی۔ میری ایک عزیزہ کو بھی بیوگی کا غم سینا پڑا تھا۔ وہ اپنے تجربے کی بنا پر کہا کرتی ہیں ملازمت کرنے والی عورت کا شوہر مر جائے تو وہ پوری نہیں آدھی بیوہ ہوتی ہے۔ آج ان کے بچے جوان ہو چکے ہیں اور وہ پہلے سے زیادہ تازہ دم ہیں۔“  
 منجہا کو فاروقی صاحب کی باتوں سے ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہوا۔

”مسائل، مصائب اور بحران میں کام کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے مس منجہا۔ آج تو شاید آپ کو اپنے رنج و غم کی شدت میں اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دینا مشکل اور ناگوار لگ رہا ہو لیکن دو چار، یا دس سال بعد جب آپ گزرے وقت کو یاد کریں گی تو آپ کو یہ احساس ایک عجیب مسرت اور فرحت بخشنے کا کہ آپ نے اپنے ذاتی مسائل اور مصائب میں بھی اپنے فرائض منصبی سے منہ نہیں موڑا۔“

”سر! آپ کی باتیں عمل انگیز کا کام دیتی ہیں۔“

”آپ نے اگر ایسا محسوس کیا ہے تو بہت اچھا!“

”میں بہن کو یہ بات بھی ضرور بتاؤں گی کہ ملازمت کرنے والی عورت پوری نہیں آدھی بیوہ ہوتی ہے۔“  
 ”ابھی نہیں مس منجہا۔ چوٹ لگتی ہے تو کچھ دیر کو تو انسان کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور چوٹ جتنی شدید ہوتی ہے حواس معطل ہونے کا احساس بھی اسی قدر شدید ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ شاید آپ کی ہمشیرہ خود بخود یہ بات سمجھ جائیں گی۔“



”واقعی سر! وہ تو ان دنوں بالکل حواس میں نہیں ہے۔“ مناجا نے زندگی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”خدا آپ لوگوں کو یہ غم برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔“ فاروقی صاحب نے بے خلوص لہجہ میں کہا۔  
 ☆☆☆

ممی اور مسز ظہیر بیہ کے کمرے میں اس کے پاس بیٹھی تھیں۔  
 ”بیٹا! کب تک ایسے گم صم رہو گی۔ بولا کرو۔“ ممی نے بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 وہ نظر اٹھا کر ممی کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔“ مسز ظہیر نے کہا۔  
 بیہ کی نگاہوں کا رخ اب مسز ظہیر کی جانب تھا۔ اس کی نگاہوں میں ناقابل بیان دکھ اور بے بسی تھی۔  
 مسز ظہیر کا دل کٹنے لگا۔

”بولا کرو..... بولا کرو بیٹا۔“ انہوں نے بیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”پتھر کی طرح چپ بیٹھی رہتی ہو۔ تمہاری یہ خاموشی ہمیں مارے ڈالتی ہے۔“  
 وہ لب سر بمبر کیے کھٹکتی باندھے نہیں دیکھتی رہی۔  
 ”ہم سے فرحان کی کوئی بات کرو۔“ مسز ظہیر نے کسی بچے کی طرح بڑی معصومیت سے فرمائش کی۔  
 اس کے لبوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔  
 ”بتاؤ..... سناؤ ہمیں..... فرحان کی کوئی بات سناؤ بیٹا۔“ مسز ظہیر کی آواز میں رقت تھی۔  
 بیہ کی آنکھوں میں سیل رواں اٹھ آیا اور وہ ایک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔  
 مسز ظہیر نے اسے اپنے گلے سے لگالیا۔

”ہم تمہیں رلانا تو نہیں چاہتے تھے۔ فرحان کا ذکر کرنے سے ہمیں تسلی ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے ساری دنیا اور ہم خود بھی بس فرحان ہی کا ذکر کیے جائیں۔ ہم نے سوچا تمہیں ان کے ذکر سے شاید ویسی ہی تسلی ہو جیسی ہمیں ہوتی ہے۔“

بیہ کی سسکیاں بتدریج دھیمی پڑتی چلی گئیں۔  
 ”ہمت سے کام لو بیٹا۔“ ممی نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔  
 وہ ایک مرتبہ پھر بلک بلک کر رونے لگی۔  
 ”بیہ! ہماری جان!“ مسز ظہیر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے چکارتے ہوئے کہا ”صبر کرو اللہ کی مرضی یہی تھی۔“

”نہیں آتا..... نہیں آتا صبر۔“ وہ تڑپ کر بولی۔  
 ”کلمہ طیبہ اور درود شریف پڑھتی رہا کرو اور اپنے لیے صبر و استقامت کی دعا مانگا کرو۔“  
 ”میر دعا نہیں قبول نہیں ہوتیں۔ میں تو فرحان کے لیے بھی بہت دعائیں مانگا کرتی تھی۔“  
 ”ایسی بات نہیں کرتے، وہ تو سب کی سنتا ہے۔“  
 ”میری کیوں نہیں سنی اس نے!“ وہ بلبلاتا کر بولی۔  
 مسز ظہیر اور ممی بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔  
 ”بیٹا شاید اسے ہمارا امتحان مقصود ہو۔“ مسز ظہیر نے کہا۔  
 ”ہمارا ہی کیوں! اور بھی تو بہت سے ہیں۔“

”وہ کسی پر اس کی سہارے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ مَئے کی خاطر خود کو سنبھالو۔“  
”مجھے چین نہیں آتا امی..... نہیں آتا۔“ وہ پھر رونے لگی۔

اسے واقعی قرار نہیں آ رہا تھا۔ فرحان کے ساتھ اس نے گئے چنے دن گزارے تھے مگر اب ان دنوں کا ایک ایک پل جیسے قرونوں پر محیط ہو گیا تھا۔ اب وہ تھی اور ان لمحوں کی یادیں!  
کیلی کی شادی کے بعد دہی واپس جاتے ہوئے وہ کتنا دل گرفتہ تھا۔  
”دل نہیں چاہ رہا تمہیں چھوڑ کر جانے کو۔“ اس نے کہا تھا۔  
”اگر جاتے ہوئے اتنے ہی ڈسٹرب ہوتے ہیں تو گئے کیوں تھے!“  
”اس وقت تم کب تھیں یہاں۔“

”اور سب تو تھے۔“  
”ایک بات بتاؤں تمہیں..... شادی سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ امی جیسی محبت مجھے دنیا میں کسی اور سے نہیں ہو سکتی مگر.....“  
”مگر؟“

”شادی کے بعد پتا چلا کہ بیوی تو ماں کی محبت کا بٹوارا کر ڈالتی ہے۔“  
جاتے جاتے اس نے میٹھی میٹھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا ”جی بھر کر دیکھ لینے دو..... کیا پتا پھر کب ملیں۔“

اس وقت فرحان کی یہ بات اسے رومان انگیز محسوس ہوئی تھی مگر آج اس کے ان فقروں کی بازگشت میں وہ ایک ناقابل بیان کرب محسوس کر رہی تھی۔  
کیا پتا پھر کب ملیں!  
کیا اسے معلوم تھا کہ پھر ملنا نہیں ہوگا۔

اوہ خدا!  
چھٹی حس انسان کی زبان سے کبھی کبھی کیا کچھ کہلوا دیتی ہے۔  
بیمہ کو اس کی ایک ایک بات یاد آتی اور دل دکھا دیتی۔  
راتوں کو وہ خواب میں فرحان کو دیوانہ وار پکارتی، آبلہ پا پھرتی اور آنکھ کھلنے پر یہ دل خراش حقیقت اس کا دل اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی کہ فرحان اب اس دنیا میں نہیں تھا۔  
دنیا جہان کے خزانے بلکہ پوری کائنات مول دے کر بھی وہ اب اس دنیا میں فرحان کی ایک جھلک دیکھنے سے قاصر تھی۔  
انسان کتنا انمول ہے!

☆☆☆

فہیم تو مریم کے بعد دہی واپس چلا گیا تھا۔ نعیم البتہ ابھی یہیں تھا۔ چوٹیں اگرچہ معمولی مگر ابھی ہری تھیں۔ ایکسڈنٹ کا شاک اپنی جگہ تھا۔ اس شاک اور چوٹوں سے زیادہ تکلیف دہ امر پھوپھی کے گھر والوں کی خاموش ناراضگی تھی۔ وہ وہاں جاتا تو پھوپھی کے سوا سب بڑی سرد مہری سے بات کرتے۔ پھوپھی کے رویے میں بھی پہلے کی سی گرجوٹی تو نہ رہی تھی۔ تاہم گھر کے دیگر افراد کی نسبت وہ پھر بھی رخ دے کر بات کر لیتیں۔ نعیم روزانہ وہاں جاتا اور ہر روز پہلے سے زیادہ دل گرفتہ ہو کر واپس لوٹتا۔



منہا سے اس کی تقریباً ہر روز ہی بات ہوتی۔  
 ”کیا آپ کے گھر والے بھی مجھ سے اسی طرح خفا ہیں جیسے پھوپھی جان کے گھر والے؟“ ایک روز اس نے منہا سے کہا۔  
 ”جی نہیں۔“

”بیہہ بھابی کیا کہتی ہیں؟“

”وہ بے چاری تو کچھ بھی نہیں کہتی۔ وہ تو اپنی سُدھ بُدھ کھوئے بیٹھی ہے۔“  
 ”میں تو پہلے ہی شرمندہ تھا۔ پھوپھی جان کے گھر والوں کی خفگی مجھے مارے ڈالتی ہے۔“  
 ”بُرا مت مانیے گا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ سے ایک غلطی تو ہوئی۔“  
 ”کہ میں نے حادثے کی فوری اطلاع نہیں دی۔“  
 ”آپ نے میرے کہے بغیر کیسے جان لی یہ بات۔“  
 ”خاندان والوں سے پھوپھی جان اور ان کے گھر والوں نے یہ بات کہی ہے۔“

”میرا خیال ہے ان کا یہ گلہ بے جا بھی نہیں۔“

”دیکھیے میں تو شاک میں تھا بلکہ اب تک ہوں اور شاید زندگی بھر اس حادثے کو نہیں بھلا پاؤں گا۔ میں کسی معجزے کے انتظار میں رہا۔ میں نے انتظار کیا اس بات کا کہ فرحان کی حالت میں کچھ افادہ ہو جائے تو گھر والوں کو خبر دی جائے مگر..... خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ فرحان کو ماسے نکل ہی نہ پائے۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ فرحان کی موت نے مجھے کتنی شرمندگی اور احساسِ خطا سے دوچار کر رکھا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ حادثہ میری تیز رفتاری کی وجہ سے پیش آیا۔“

”بہر حال اب کیا ہو سکتا ہے۔“ منہا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی ”جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“  
 ”کیا آپ کے گھر والے بھی مجھ سے ناراض ہیں؟“

”یہ گلہ تو انہیں بھی ہے کہ آپ نے بروقت اطلاع کیوں نہیں دی۔“

”میں نے بالکل دیانت داری سے وجہ بتادی ہے آپ کو۔ کیا آپ کو اب بھی گلہ ہے مجھ سے! مجرم سمجھتی ہیں مجھے!“

”مجرم اور قصور وار ہونے میں فرق ہوتا ہے۔ نادانستگی میں ہونے والا قصور قابلِ معافی ہو سکتا ہے۔“

”ایسا مہلک حادثہ دانستہ کون کر سکتا ہے۔ بلیک جھپکنے میں ہوا سب کچھ۔“ اس نے توقف کے کیا پھر بولا ”بیہہ“

بھابی سے کہنے اپنے دل میں میرے خلاف کسی بدگمانی کو جگہ نہ دیں۔ فرحان کوئی میرا دشمن تو نہیں تھا جو میں اس کے مرنے کا انتظار کرتا اور اس کے گھر والوں کو تاخیر سے حادثے کی خبر دیتا۔ وہ تو میرا بھائیوں جیسا کزن تھا اور دوست بھی۔ اس کی موت سے تو میرا بھی ذاتی نقصان ہوا۔ میں ایک بھائی، ایک دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔“

”بیہہ ابھی کچھ سمجھنے بوجھنے کی کیفیت میں نہیں۔ اس صدمے کے اثرات آہستہ آہستہ ہی کم ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے..... میں تو یہاں نہیں ہوں گا۔ آپ کو میری وکالت کرنی ہوگی۔“

”کوشش کروں گی۔“

☆☆☆

فرحان کے انتقال پر رفقائے کار نے جس خلوص سے منہا کا دکھ بٹانے کی کوشش کی تھی اس سے منہا اور اسٹاف ممبرز میں ایک قربت سی پیدا ہو گئی تھی۔ بیہہ گویا اس فیملی کی ایک ممبر بن گئی تھی۔ صبح جب وہ اسکول پہنچتی تو تقریباً تمام

ہی ساتھیاں بڑے خلوص اور اپنائیت سے اس کا حال پوچھتیں۔

”بہن کا کیا حال ہے میڈم؟“

”میہ کیسی ہیں؟“

اسے یوں لگتا جیسے میہ اب صرف اس کی اور علیب کی بہن نہیں رہی تھی۔ ایک بڑے کنبے کی فرد بن کر بہت سوں کی بہن بن گئی تھی۔

میہ کا حال چال پوچھتے ہوئے اس کے رفقاء کے لہجے میں دل سوزی ہوتی۔  
غزالہ ناصر نے ان دنوں میں منتہا کا دل یوں مٹھی میں لیا کہ وہ اسے فضلہ کی طرح اپنی اپنی سی لگنے لگیں۔ اس کے اس ذاتی صدمے میں دل جوئی سے قطع نظر فرائض منصبی کی ادائیگی میں وہ بڑھ چڑھ کر اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتیں۔ اسکول کے روزمرہ امور کی انجام دہی ہوتی یا ملاقاتیوں سے ملنا غزالہ ان دنوں میں ایسی پیش پیش رہیں کہ منتہا کو اپنی دست راست محسوس ہونے لگیں۔ فرحان کی تدفین کے بعد جب وہ اگلے روز اسکول گئی تو اس نے وقفے میں چائے نہیں پی تھی۔ اس سے اگلے دن وقفہ ہونے پر جب اقبال نے حسب معمول اس کے دفتر کے دروازے پر پردے کھینچ دیئے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی کہنیاں میز کے شیشے پر ٹکا کر اپنی آنکھیں ہتھیلیوں کے کناروں سے دبا کر بیٹھ گئی۔ دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلے ہی کچھ کم محرومیاں تھیں جو اب یہ ایک نیا دکھ گلے آ لگا تھا۔  
اور دکھ بھی کیسا!

دفعتاً غزالہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”آ سکتی ہوں میڈم۔“

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور دروازے کی جانب دیکھا۔

غزالہ، آ پاصغیراں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ آ پاصغیراں نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔

”آپا نے مجھے بتایا کل آپ نے چائے نہیں پی تھی۔“ غزالہ نے منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں چاہا تھا غزالہ۔“

”چائے جی کے لیے تھوڑی تازہ دم ہونے کے لیے پی جاتی ہے۔“ غزالہ نے کہا پھر آ پاصغیراں سے بولیں۔

”میڈم کے لیے چائے بنا دیں آپا۔“

”غزالہ بالکل موڈ نہیں ہے۔“ منتہا نے کہا۔

”موڈ ہو یا نہ ہو آپ کو چائے پینی پڑے گی۔“

منتہا کو غزالہ کے لہجے پر قد رے اچنبھا ہوا۔

وہ تکلف، وہ احتیاط اور اندازِ ماتحتی کہاں چلا گیا تھا!

غزالہ تو آج ایسے لہجے میں بات کر رہی تھیں جیسے کوئی بہت ہی قریبی شخص کرے۔

”آج سے آپ کے نارمل ہونے تک میں آپ کی کیئر فیکر ہوں۔“ غزالہ نے کہا۔

منتہا مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔

”اجازت ہو تو میں اپنا چائے کا گمک بھی یہیں منگوا لوں؟“

”شیور۔“

غزالہ دروازے تک گئیں اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکتے ہوئے بولیں۔

”اقبال اسٹاف روم میں میری چائے رکھی ہے ذرا لاتو دو۔“



غزالہ واپس پلٹیں۔  
آپا صغیراں منتہا کے لیے چائے پیالی میں انڈیل رہی تھیں۔ غزالہ نے ٹرے میں رکھی بسکٹوں کی پلیٹ اٹھائی اور منتہا کے سامنے لا دھری۔

”اوہ غزالہ آپ نے تکلیف کیوں کی! آپا دے دیتیں۔“ منتہا نے کہا۔  
”آپا اسے خوشامد نہ سمجھیے گا۔ خوشامد میری فطرت میں ہے ہی نہیں۔ سادہ سی عورت ہوں۔ کوئی محبت سے مانگے تو دل بھی دے دیتی ہوں۔“

منتہا ایک مرتبہ پھر مسکرانے پر مجبور ہوئی تاہم اس کی مسکراہٹ میں حزن یہ تاثر غالب رہا۔  
”کسی کو دیا بھی؟“

”دیا تھا میڈم!“ غزالہ کے لہجے اور مسکان میں منتہا کو ہلکی سی دل گرفتگی محسوس ہوئی۔  
”اچھا!“ منتہا چونکی ”پوچھ سکتی ہوں کسے؟“  
”ایک بے وفا کو۔“

اقبال اسٹاف روم سے غزالہ کی چائے اور بسکٹ اٹھا لایا تھا۔ آپا صغیراں نے منتہا کی چائے اس کے سامنے لا دھری۔

”شکریہ آپا۔“

”پانی لاؤں میڈم جی۔“

”نہیں آپا ضرورت نہیں۔“

”میں جاؤں میڈم۔“ آپا صغیراں نے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے اجازت چاہی۔  
”جی آپا۔“

آپا صغیراں کے چانے کے بعد غزالہ نے منتہا کی جانب توجہ کی اور بولی ”ناصر کہتے ہیں چائے ہمارے جسم میں جا کر عمل انگیز کا کام کرتی ہے۔“

”بشرطیکہ ہمارے اندر باہر کے حالات نارمل ہوں۔“

”نارمل نہ بھی ہوں میڈم تو زبردستی نارمل کرنے پڑتے ہیں۔ ہم انسان بہت مجبور اور بے بس ہیں میڈم۔ ہمیں اوپر والے کی رضا میں راضی ہونا پڑتا ہے ورنہ زندگی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔“ غزالہ کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ”جب مانی کے ابو کی ڈتھ ہوئی تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے دنیا اندھیروں میں ڈوب گئی ہے۔“  
”مانی کے ابو کی ڈتھ!“ منتہا نے چونک کر کہا۔

”جی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”مانی سے تو آپ ملی ہیں نا..... میرا بیٹا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اس کے لیے اپنے ابو کی تو ڈتھ ہو چکی ہے۔ میں..... میں دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میرے بہن بھائیوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ ناصر بہت اچھے، شریف اور نیک سے آدمی ہیں۔ نکاح کے بعد میں نے ان سے صرف ایک بات کہی، مجھے اپنے لیے نہیں اپنے بچے کے لیے محبت چاہیے۔ آپ یقین کیجئے میڈم، انہوں نے اسے اتنا پیار دیا ہے کہ شاید اس کا اپنا باپ بھی نہ دے پاتا۔“

”ریلی!“

”جی میڈم۔“

”کب ہوئی مانی کے ابو کی ڈیڑھ؟“

”چھوٹا سا تھا..... بہت چھوٹا..... میں تو ڈیوری کے لیے میکے گئی ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں پہلے بچے کی پیدائش پر عورت اپنے میکے آ جایا کرتی ہے۔ میرا چھٹا بھی پورا نہیں ہوا تھا اور اس رات مجھے یاد ہے مانی پوری رات کمرے کی چھت کو دیکھتا رہا تھا۔ میں کبھی سوتی، کبھی جاگتی رہی۔ آنکھ کھلتی تو مانی اپنی منی منی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتا نظر آتا۔ اسے یوں مسلسل جاگتے دیکھ کر فجر کے وقت مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ میری بھابی نماز کے بعد میرے کمرے میں آئیں تو میں نے ان سے کہا مٹنے کو پتا نہیں کیا تکلیف رہی ہے جو رات بھر جاگتا رہا۔ بھابی نے کہا مگر دیا تو نہیں۔ میں نے کہا، ہاں اسی بات پر میں بھی حیران ہوں کہ اس نے آواز تک نہیں نکالی بس چھت کو تکتا رہا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بڑا آدمی دیکھتا ہے۔ دیکھ لیجئے، اب بھی کیسے تنگی باندھے چھت کو دیکھ رہا ہے، کہیں اس پر کوئی سایہ وارہ تو نہیں ہو گیا۔ بھابی نے ہنس کر میری اس بات کی نفی کی، میں چونکہ رات بھر کبھی سوتی، کبھی جاگتی رہی تھی اس لیے صبح ہونے پر گہری نیند سو گئی۔ کوئی نو سوانو بجے کے لگ بھگ مجھے بھابی نے آہستگی سے ہلا کر جگایا۔ آنکھ کھلی تو مجھے اپنا دیور کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی اور میں نے کہا، خیریت تو ہے؟ کہنے لگا آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا۔ ایسے کیسے مناسوا مینے کا ہو جائے، تب ہی جاسکوں گی تا میں وہ بولا آپ کا چلنا ضروری ہے۔ بھابی بہت بیمار ہیں۔ مانی اس وقت بھی چھت کو تک رہا تھا۔ دیور کی بات پر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ آن کی آن ایک عجیب سی وحشت طاری ہو گئی دل پر۔ میں بستر سے اٹھی اور میں نے اپنے دیور کے نزدیک جا کر کہا، سچ بتاؤ، کیا بات ہے، تم نے مسلسل نظریں کیوں چرا رہی ہیں۔ وہ رونے لگا۔ بھابی نے میرے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے آہستگی سے کہا، صبر کرو غزالہ، خدا کی مرضی یہی تھی۔ تمہارا اور بابر کا ساتھ بس اتنا ہی تھا“ غزالہ کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے۔

”ہوا کیا تھا انہیں؟“ منجھانے پوچھا۔

”ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔“

”پہلے کوئی تکلیف تھی؟“

”کچھ بھی نہیں میڈم، بالکل صحت مند تھے۔ ہینڈسم اتنے کہ پورے خاندان میں کوئی ان جیسا نہ تھا۔ رات کو بارہ بجے کے لگ بھگ سینے میں تکلیف ہوئی، میرے دونوں دیور انہیں اسپتال لے گئے۔ دو بجے کے لگ بھگ ڈیڑھ تھ بھی ہوئی۔“

”اور آپ کو صبح اطلاع ملی؟“

”دوسرا شہر تھا تا میڈم! سسرال والوں نے اچانک اطلاع دینے کے بجائے میرے دیور کو پہلی فلائٹ سے میرے میکے بھیجا۔“

”پھر؟“

”پھر کیا میڈم! زندگی خواب پریشاں بن کر رہ گئی۔ مانی کو سینے سے لگائے میں کئی سال بھگتی پھری۔ کبھی بہن کے ہاں، کبھی بھائی کے گھر۔ اسکول میں جاب شروع کر دی۔ دوسرے شہر ٹرانسفر ہوئی تو کچھ عرصہ اسکول ہی میں رہائش پذیر بھی رہی۔ بڑے مشکل دن تھے۔ لگتا تھا اداسی، تنہائی اور بے بسی کبھی ختم ہی نہ ہوگی۔ میری مشکلات کو دیکھتے ہوئے مجھے نے دوبارہ میرے اپنے شہر میں تبادلہ کر دیا تو مجھے پھر کبھی بہن بھی بھائی کے ہاں رہنا پڑا۔ مانی دوسرے بچوں کو



اپنے باپوں کے ساتھ دیکھتا تو احساس محرومی میں مبتلا ہو جاتا۔ بالآخر گھر والوں نے مجھے نکاح ثانی پر مجبور کر دیا۔ مجھے یاد ہے، ناصر سے نکاح ہونے کے بعد جب میں پہلی بار ان کے کرائے کے چھوٹے سے گھر میں آئی تو مانی خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ بہن اور بھائی کے گھر میں ہم ماں بیٹا دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری بن کر رہتے تھے۔ ناصر کے ساتھ ان کے گھر میں آنے کے بعد جب میں نے مانی کو بتایا کہ اب یہ ہمارا گھر ہے تو اس نے پہلے حیرانی اور بے یقینی سے مجھے دیکھا پھر اس کا یہ حال تھا کہ دو کمروں، کچن اور باتھ روم پر مشتمل اس گھر میں کبھی ایک کمرے کا دروازہ کھول کر مجھ سے کہتا ”امی یہ بھی ہمارا کمرہ ہے، کبھی دوسرے کمرے میں جھانک کر کہتا، امی کیا یہ کمرہ بھی سچ ہمارا ہے۔ کبھی کچن میں جاتا، کبھی باتھ روم میں کھس کر واش بیسن کا ٹل کھول دیتا اور بہ آواز بلند کہتا ”امی، بہت اچھا ٹھنڈا پانی آرہا ہے۔ خالہ کے گھر میں تو اتنا ٹھنڈا پانی نہیں ہوتا تھا۔“

”پھر؟“

غزالہ مسکرا دیں۔

”کہاں تک سنیں گی میڈم! یہ داستان تو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔“

”کتنا عرصہ ہوا، اس بات کو؟“

”یہی کوئی چھ سات سال!“

”خوش ہیں آپ؟“

غزالہ کے لبوں پر بڑی کرب آمیزی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کچھ ایسی ناخوش بھی نہیں ہوں میڈم! دوسری شادی میں نے اپنے لیے نہیں مانی کے لیے کی۔ وہ بُری طرح

احساس محرومی کا شکار ہوئے جا رہا تھا۔“

”اب خوش ہے وہ؟“

”ایسا ویسا! ناصر اس کی کوئی بات رو نہیں کرتے۔ مانی اپنی ہر فرمائش انہی سے کرتا ہے۔ مانی کے لیے ناصر مشکل

سے مشکل وقت میں سے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے لوگوں سے ادھار تک کر لیتے

ہیں۔ کل ہی ساڑھے تین ہزار روپے کی بائیسکل خرید کر دی ہے اسے۔ میں ان کے ان الٹے تللوں پر اعتراض کروں تو

دونوں باپ بیٹا میرے خلاف سازشیں کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے، بہت پیار ہے انہیں بیٹے سے؟“

”بہت! انہیں ہی نہیں، ان سے بیٹے کو بھی اتنا ہی پیار ہے۔“

”اپنے ابو کو یاد کرتا ہے کبھی؟“

”کچھ اس طرح..... کبھی کہے گا، عجیب آدمی تھا میرے بڑے ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا، چلا گیا۔ کبھی مجھ سے

پوچھے گا، وہ شخص تھا کیسی شکل کا؟“

”کیوں؟ تصویریں تو دیکھی ہوں گی اس نے اپنے ابو کی؟“

غزالہ کے لبوں پر بڑی کرب انگیزی مسکان ابھری ”میڈم! مرد کتنا ہی شریف، مسکین اور دتو کیوں نہ ہو، مرد ہوتا

ہے۔ میرے پاس تین لکھ تھیں جن میں مانی کے ابو سے میری شادی کی اور پھر بعد کی بے شمار تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

ناصر نے تینوں لکھ جلا ڈالیں۔“

”کیوں؟“ ”ماتہا نے چونک کر پوچھا۔

”میں کبھی کبھی چپکے چپکے انہیں دیکھنے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ ناصر نے انہیں خاکستر کر ڈالنے کا جواز یہ پیش کیا کہ میں

تمہیں اداس نہیں دیکھنا چاہتا مگر اصل بات یہ نہیں تھی۔“  
”تو پھر کیا تھی؟“

”وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا مرد میری یادوں میں رہے۔“ غزالہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔  
”تو کیا تصویریں جلادینے سے آپ مانی کے ابو کو بھول گئیں؟“ غزالہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ نظر اٹھا کر منتہا کی طرف دیکھا اور بس!

منتہا کو غزالہ کی آنکھوں میں بن جل مچھلیوں کی سی تڑپ محسوس ہوئی۔  
وقفہ ختم ہونے کی کھنٹی بج گئی تھی۔

”آئی ایم سوری میڈم! آج تو میں نے آپ کی پوری بریک اپنی لن ترانی سنانے میں ضائع کرادی۔“  
”نہیں غزالہ..... ایسی کوئی بات نہیں..... آج کی بریک نے آپ کو مجھ سے پہلے سے بھی زیادہ نزدیک کر دیا ہے۔“  
”بہہ کا دکھ میرا اپنا دکھ ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اور آپ ایک ہی دکھ کی زنجیر میں بندھے ہیں۔“  
”ناٹم بہت بڑا اہلرے میڈم۔ وہ کیا کہتے ہیں چارہ گر، دکھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شدت میں کمی آتی چلی جاتی ہے۔ آپ کی بہن کا زخم ابھی تازہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا، وہ نارمل ہوتی چلی جائیں گی..... میری طرح۔ شروع شروع تو مجھے یوں لگتا تھا میڈم، جیسے جی ہی نہ پاؤں گی مگر اب، ہنستی بھی ہوں۔ اچھے کپڑے بھی پہنتی ہوں۔ زیور بھی پہنتی ہوں! میک اپ بھی کرتی ہوں۔ کوئی مجھے دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ اس دل پر کتنا بڑا گھاؤ لگا تھا۔ اوہ! آئی ایم سوری میڈم!..... میں نے تو پھر اپنی لن ترانی شروع کر دی۔“  
”اب آپ روزانہ بریک میں میرے ساتھ ہی چائے پیا کریں گی؟“ منتہا نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔  
وقفہ ختم ہو چکا تھا، اسے حسب معمول اسکول کا راؤنڈ لینے کے لیے اٹھنا تھا۔

کمرے سے باہر آتے ہی اسے اپنے اپنے کمرے کی جانب لپکتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر ایک عجیب سی فرحت اور زندگی کا احساس ہوا۔

خدا کا کتنا احسان تھا۔

جسے لوگ ملازمت کہتے تھے، سمجھتے تھے، وہ تو زندگی کی کٹھنائیوں میں ایک ایسا جھروکا تھا جس سے در آنے والے جھونکے کبھی کبھی حیات کے مردہ پڑتے جسم میں نئی روح پھونک دیتے تھے۔

☆☆☆

دہی واپسی سے قبل نعیم پھوپھی اور ان کے اہل خانہ کو خدا حافظ کہنے کے لیے آیا تو اس نے اپنے ناکردہ احساسِ جرم کو دل سے اتار بیٹھنے کی کوشش کی۔

”پھوپھی جان، مجھے لگتا ہے، آپ لوگ مجھ سے ناراض ہیں۔“  
”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“

”غلط کیوں کہتی ہو؟“ ظہیر صاحب جو نزدیک ہی بیٹھے تھے، ناگوار لہجے میں بولے ”ہاں، ہم ناراض ہیں اور ہمیں اس کا پورا حق ہے۔ خدا جانے ہمارے بچے کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ کس حال میں دم توڑا ہوگا اس نے۔ ہمیں آخر فوراً اطلاع کیوں نہ کی گئی حادثے کی؟ ہمارے دل میں تو سو سو سے آتے ہیں“ ظہیر صاحب پھٹ ہی تو پڑے۔  
شرمندگی کے مارے نعیم کے کانوں کی لودیں سرخ ہو گئیں۔

”یقین کیجئے پھوپھا جان، فوری اطلاع نہ دینے میں کوئی بد نیتی شامل نہیں تھی۔ میرا خیال تھا فرحان کی حالت سنبھل جائے تو اطلاع کر دوں گا۔“



”ہم سے زیادہ کوئی چاہنے والا ہو سکتا تھا فرحان کا؟“ ظہیر صاحب غصے سے بولے۔  
 ”آپ کی ناراضگی بجا ہے مگر بخدا میں نے صرف اسی وجہ سے اطلاع نہیں کی۔ حالانکہ فہیم نے مجھ سے بہت کہا  
 لیکن میں نے اس سے کہا کہ فرحان کو ہوش آجائے تو اطلاع کر دیں گے۔ میرا دل کہتا تھا کہ فرحان اپنے بیٹے کو دیکھنے  
 کے لئے آنکھیں کھول کر زندگی میں واپس آ جائیں گے۔“  
 ظہیر صاحب یک بیک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

مسز ظہیر کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے مگر انہوں نے اسی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا جس پر وہ فرحان کی موت  
 کے بعد سے کار بند رہی تھیں۔ یہ نہیں کہ انہیں دکھ نہ تھا۔ وہ تو ماں تھیں، جو ان بیٹے کی موت نے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا  
 تھا۔ مگر وہ صبر اور ضبط کا پیکر بنی ہوئی تھیں۔ ساری زندگی جتنی دھوپ میں چلی تھیں، بس دو گھڑی کو سایہ میسر آیا تھا۔ پھر  
 وہی دھوپ وہی کڑی مسافت! بہو کا سو گوار چہرہ دیکھتیں تو کلیجہ منہ کو آتا۔ بن باپ کے ننھے سے بچے کو سینے سے  
 لگاتیں تو دل پھٹ پڑنے کو تیار ہوتا!  
 خدایا کیسی کڑی آزمائش تھی۔

ظہیر صاحب تو اس حادثے سے ڈھے گئے تھے۔ اس وقت انہیں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر  
 نعیم کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

## ٹھہریے اپنی ناک کا آپریشن کرانے سے پہلے

نزلہ آگئی ہو یا الرجک یا موسمی تبدیلیوں سے ناک کی ہڈی  
 یا گوشت کے بڑھنے سے ہو سردرد و قتل ہو ناک بند  
 ہونا یا سانس لینے میں دشواری کیلئے مجرب دوا ہے۔

جدید ہومیو پیتھک سائنسی تحقیق اور تجربہ سے تیار کردہ انتہائی زود اثر دوا

# Naricol Tablet

ایک منٹے ضررہ استعمال کر کے دیکھیں انشاء اللہ ضرور شفا ہوگی

اشاکست:

مہرا تیکس آر اے باغ روڈ، کراچی: 2628814  
 احمد ہومیو اسٹور یو پی ٹی مارچ کراچی: 6957528  
 شیراز ہومیو پیتھک سٹور اینڈ کلینک 34 نمبر روڈ لاہور: 042-6369691-93  
 مسلم ہومیو پیتھک اسٹور لجنٹ روڈ حیدر آباد فون: 720208  
 نیو مدی ہومیو اسٹور گلشن اقبال بال قنابل اردو سائنس کالج کراچی  
 الجنت ہومیو پیتھک اینڈ اسٹور 5 عبداللطیف خان پلازہ منڈیاں ایسٹ آباد

بائسن ہومیو اسٹور ناظم آباد پورڈ آفس فون نمبر: 6614030  
 انصاری ہومیو اسٹور ناظم آباد، پورڈ آفس: 6681127  
 طلحہ سیکل اسٹور نعمان دیو ایوان منصہانی روڈ گلشن  
 جزمین ہومیو اسٹور انور: 6366372  
 محمدی ہومیو اسٹور ملیر کالابورڈ: 4506620  
 جزمین ہومیو اسٹور مسجد روڈ کوئٹہ: 081-824645

ایک ماہ کا کورس 180 روپے۔ گھر بیٹھے V.P پارسل منگوانے کیلئے خط لکھیں

مرض کی تشخیص و علاج ریڈونک کپیوٹر کی مدد سے (خون یا تھوک کے نمونے سے ٹیسٹ)  
 دیگر امراض کے لئے خط و کتابت بالمشافہ ملاقات کے لئے کلینک پر رابطہ کیا جاسکتا ہے  
 ہومیو ڈاکٹر شوکت علی (پینل - اسٹیٹ بینک آف پاکستان)

موبائل اپارٹمنٹس شاپ نمبر 2 SC-19 باک N تہہ ناظم آباد کراچی ٹیلی فون نمبر: 6647312 موبائل 0300-9229413  
 کلینک کے اوقات (صبح 11 سے 1 شام 6 سے 10) E-mail: hdr\_shoukatall@hotmail.com

”میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں آپ سب سے۔“  
ظہیر صاحب نے اسے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا اور بولے ”ہمیں تم سے ساری زندگی گلہ رہے گا۔“  
نعیم کا سر جھک گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر نعیم نے کہا ”فرحان کا سامان جو وہاں موجود ہے، اسے یہاں لانے کے لیے اگر یہاں سے کوئی وہاں آنا چاہے تو میں اس سلسلے میں ضروری بندوبست کیے دیتا ہوں۔ بصورت دیگر سامان بذریعہ کارگو یہاں بھجوا یا جاسکتا ہے۔“

”ہمارے بچے کے کپڑے اور استعمال کی چیزیں ہوں گی؟“ مسز ظہیر کے لہجے میں استفہام تھا۔  
”اس سے زیادہ میہ بھائی اور بچے کے استعمال کی چیزیں اور کھلونے“ نعیم نے کہا۔  
ظہیر صاحب پھر رونے لگے۔

”یہاں سے بھلا کون آئے گا وہاں؟“ مسز ظہیر آنسوؤں میں بھیگی آواز سے بولیں۔  
”ٹھیک ہے، تو پھر میں وہاں پہنچنے کے بعد کارگو کیے دیتا ہوں۔ پھوپھی جان ایک بار پھر آپ سے میری التجا ہے کہ میری طرف سے آپ لوگ اپنا دل صاف کر لیں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ آپ لوگوں کو حادثے کی اطلاع کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے تھی مجھے۔ میں نے خواہ مخواہ غفلت بننے کی کوشش کی۔“  
”اب کیا چاہتے ہو تم؟“ ظہیر صاحب بھک کر بولے۔

”میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیجئے آپ لوگ۔ یقین کیجئے، آپ کی نگاہوں سے جھلکتی ناراضی مجھے مارے ڈالتی ہے۔“

”سننا چاہتے ہو تو سنو، فرحان کو تمہاری تیز رفتاری نے مارا ہے۔ سارا خاندان جانتا ہے کہ تم گاڑی کس رفتار سے چلاتے ہو۔ سارا خاندان کہتا ہے کہ حادثے کے ذمے دار تم اور تمہاری تیز رفتاری ہے۔“  
نعیم کا سر پھر جھک گیا۔

”کیا تمہارے سوری کہہ دینے سے ہمارا بیٹا واپس آ سکتا ہے؟ ہماری نو جوان بہو کو اس کا شوہر اور اس کے ننھے سے بچے کو اس کا باپ مل سکتا ہے؟ تم ایک نہیں تین زندگیوں کے قاتل ہو۔ وہ بچہ اب تمام عمر بن باپ کا بن کر رہے گا۔  
چلے جاؤ یہاں سے..... چلے جاؤ۔“  
”سوری پھوپھا جان!“

”میں کہتا ہوں چلے جاؤ اور آئندہ یہاں آنے کی غلطی مت کرنا“ ظہیر صاحب شدت رنج سے لرزے لگے۔  
نعیم چپ چاپ اٹھا۔

”خدا حافظ!“ اس نے گہیر لہجے میں کہا۔  
”خدا حافظ!“ مسز ظہیر نے کہا۔ انہیں ظہیر صاحب اپنے غصے میں حق بجانب محسوس ہو رہے تھے۔ پرانی کہاوت ہے کہ جس کی چیز جاتی ہے، اس کا دل پہلے بے ایمان ہو جاتا ہے، یہاں تو چیز نہیں ایک جیتا جاگتا انسان نعیم کی تیز رفتاری کی نذر ہو کر ہمیشہ کے لیے دنیا سے چلا گیا تھا۔

اور اس ایک غلطی نے نعیم کو مسز ظہیر کے گھر والوں کی نظروں میں آسمان سے زمین پر لا پٹا تھا۔ وہی جسے اُن کا گھر انا کبھی اپنا محسن و مربی سمجھا کرتا تھا، اب اپنی خوشیوں کا قاتل گردان رہا تھا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



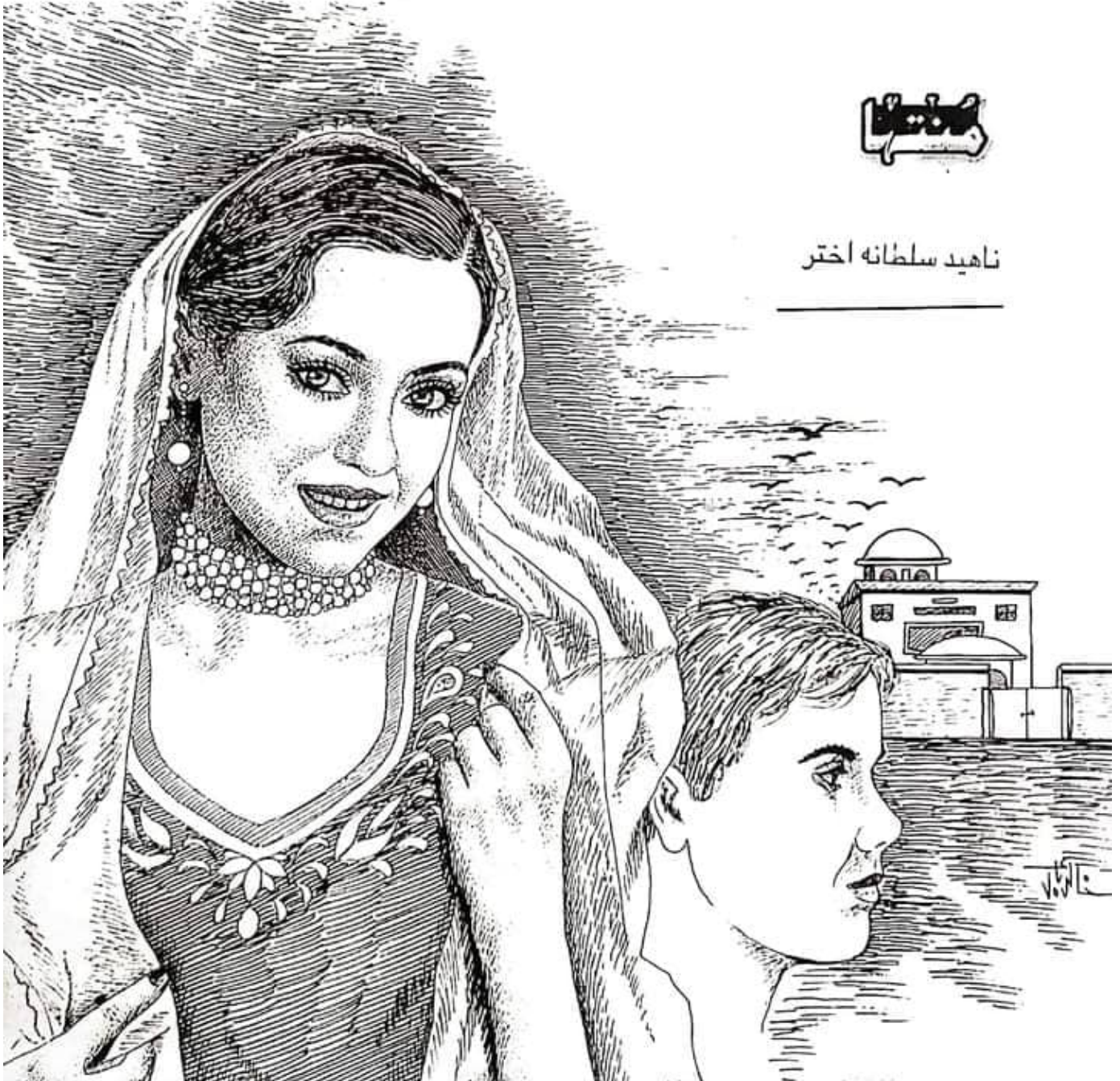
دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمے نہیں دیے لکھ آکے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سار ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانہ اختر









موسم کے تیور بدل رہے تھے۔

فرحان کی ناگہاں موت کا صدمہ دھیرے دھیرے مندل ہوتا جا رہا تھا۔ اسکول گراؤنڈ کی خوشنمائی کے لیے منعجا کے ایجنڈے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ موسم تبدیل ہونے پر چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے آراستہ باغیچہ ہٹا دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ چوکیدار کو آنے والے موسم کے لیے پیوری لگانے سے روک دیا جائے۔

چوکیدار مہتاب برسوں سے اسی ادارے میں تعینات تھا۔ پکا ملازم تھا۔ چونکہ محکمے کی جانب سے ادارے کے لیے مالی کی اسامی منظور نہیں کی گئی تھی اس لیے مہتاب ہی اسکول کے لیے مالی کام بھی کر رہا تھا جس کے عوض اسے اسکول فنڈ سے ماہانہ اعزاز یہ بھی دیا جاتا۔ تیز آدمی تھا۔ تھوڑے سے اعزاز بے کے عوض زیادہ مشقت سے بچنے کو اس نے اپنا ایک مددگار نصیب خان رکھ چھوڑا تھا۔ نصیب خان پیشہ ور مالی تھا۔ بنگلوں، کوٹھیوں میں مالی گیری کرتا۔ ہفتے میں دو دن مہتاب کی ماتحتی میں کام کرنے کے لیے اسکول آتا اور تین چار گھنٹے کام کرتا جس کے عوض مہتاب اسے تھوڑے سے پیسے دے دیتا۔ یہ گویا نوکر کے آگے چاکر والی بات تھی مگر اس سے دونوں کا کام چل رہا تھا۔ مہتاب کو اسکول فنڈ سے مالی گیری کا اعزاز یہ مل جاتا اور وہ معمولی معاوضے پر نصیب خان سے کام لے کر زیادہ مشقت سے بچ جاتا۔ تاہم مہتاب کو اپنے کوارٹر کے سامنے لگے باغیچے سے بہت انس تھا۔ وہ زیادہ تر اسی کی آبیاری میں لگا رہتا۔

مہتاب قدرے میزھے مزاج کا آدمی تھا۔ چونکہ برسوں سے اسی ادارے میں تعینات تھا لہذا بہت سے معاملات میں ادارے کو گویا اپنی جاگیر سمجھنے لگا تھا۔ کام کے دنوں میں چھٹی کے بعد اور تعطیل کی صورت میں صبح تا شام اسکول میں اس کی حکمرانی ہوتی۔ اس کے بچے بے تکلف اسکول کی راہداریوں اور برآمدوں میں کھیلتے کودتے اور فلاں نہیں بھرتے پھرتے۔ اس کے مہمان پرپل کے دفتر میں نرم صوفوں پر استراحت فرماتے اور اس کی بیوی گاؤں سے آئے مہمانوں پر رعب ڈالنے کو شام کے وقت اسٹاف روم سے آرام کرسیاں نکال کر مہمانوں کے ساتھ گراؤنڈ میں بیٹھ جاتی اور رات کو گراؤنڈ میں خراماں خراماں چہل قدمی کرتی۔ اسکول بند ہوتے ہی مہتاب اپنے بال بچوں اور مہمانوں کے لیے ٹیچرز کا ہاتھ روم کھول دیتا جسے وہ سب بلا تکلف استعمال کرتے۔ مہتاب کے خاص مہمان پرپل کے دفتر کا ”اٹیچڈ ہاتھ“ استعمال کرتے جہاں وہ نہ صرف حوائج ضروریہ سے فراغت پاتے بلکہ نہاتے دھوتے اور میلے کپڑے بھی بہ اطمینان دھوتے۔ الحمد للہ پانی کی کوئی کمی نہ تھی۔

کھلی جگہ، تازہ ہوا، وافر پانی، مفت بجلی، مفت گیس اور مفت ٹیلی فون..... مہتاب اور اس کے بال بچوں ہی نہیں قریب و دور کے متعلقین کے بھی مزے تھے۔ پرپل صاحبہ اگر ٹیلی فون سیٹ کو چوبی ڈبے میں مقفل کر کے جاتی تھیں تو کیا ہوا مہتاب نے تالے کی چابی بنوا رکھی تھی جسے وہ جب چاہتا استعمال میں لاتا۔ مفت کی پینے والوں کے بھی کیا مزے ہوں گے جو مہتاب کے تھے!

مہتاب کو باغیچے میں نئے موسم کی پییریاں لگانے کی تیاری شروع کرتے دیکھ کر منعجا نے ایک روز اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور بڑے اطمینان سے کہا ”مہتاب! میں چاہتی ہوں گراؤنڈ سے باغیچہ ختم کر دیا جائے۔“ مہتاب نے ہڑبرا کر اسے دیکھا اور غزالہ ناصر بھی جو اس وقت کسی کام سے منعجا کے دفتر میں موجود تھیں بے ساختہ چوکیں۔

”کون سا باغیچہ میڈم؟“ مہتاب نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

”وہی جو تمہارے کوارٹر کے سامنے ہے۔“

مہتاب اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔

”نئے موسم کی پیری مت لگانا وہاں۔“

مہتاب کا منہ بن گیا۔

غزالہ نے منعہا کو ابھی ابھی نگاہوں سے یوں دیکھا جیسے کہتی ہوں یہ آپ کیا کر رہی ہیں! ”باغیچے بننے سے گراؤنڈ کی کشادگی میں اضافہ ہوگا۔ انشاء اللہ میرا پروگرام یہ ہے کہ گراؤنڈ میں بچوں کے لیے مختلف کھیلوں کے لیے کورٹس اور اتھلیٹکس کے لیے ٹریکس بنوائی جائیں۔“

”پر میڈم جی باغیچے میں تو پھل دار پکے بوٹے بھی لگے ہیں۔“ مہتاب نے دبی زبان سے کہا۔

”آہستہ آہستہ انہیں بھی ہٹوانا پڑے گا جنہیں ہم دوسری جگہ منتقل کر داسکے کر دایں گے۔“

”بعض تو بہت بڑے ہیں۔“

”انہیں کٹوانا پڑے گا۔“

”میڈم کہتے ہیں پھل دار درختوں کو نہیں کاٹنا چاہیے۔“ غزالہ نے کہا۔

”مجبوری ہے غزالہ۔ میں دیکھ رہی ہوں اتنا اچھا گراؤنڈ ہے ہمارا اور ہم اس کا صحیح استعمال ہی نہیں کر رہے۔“

”میڈم اسبلی ہوتی تو ہے۔“

”گراؤنڈ صرف اسبلی ہی کے لیے تو نہیں ہوتا غزالہ۔ اسکول گراؤنڈ کو ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے بھی استعمال

میں آنا چاہیے۔ میں جب سے آئی ہوں میں نے اس گراؤنڈ کو بچوں کی ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے اس طرح استعمال ہوتے نہیں دیکھا جیسے کہ اسے ہونا چاہیے، یہاں تو ہم کھیلوں کے مقابلے اور دوسرے فنکشنز کر داسکتے ہیں۔“

”میں جاؤں میڈم!“ مہتاب نے کہا۔

”ہاں۔“ منعہا نے اس کی طرف دیکھا ”پھل دار پودوں کو آہستہ آہستہ دوسری جگہ منتقل کرو۔ بہتر ہوگا کہ انہیں

باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ لگا دو۔“

”میڈم جی دوسری جگہ نہیں گئے نہیں مرجائیں گے۔“

”گہری کھدائی کر کے جڑوں کو مٹی سمیت نکال کر دوسری جگہ لگاؤ گے تو شاید چل پڑیں نہ چلے تو مجبوری۔ اصولاً یہ

باغیچے اس جگہ لگایا ہی نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس کی موجودگی گراؤنڈ میں رکاوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں میڈم صاحب جو بھی اسکول میں آتا ہے اس باغ کی خوب صورتی کی تعریف کرتا ہے۔“

”میں خوب صورتی کی بات نہیں کر رہی ہوں مہتاب، اس باغ کی وجہ سے گراؤنڈ کی کشادگی دب گئی ہے۔ اسکول

کے بچوں کو ایک بہتر کھیل کا میدان فراہم کرنے کے لیے ہمیں اس باغیچے کو یہاں سے ہٹانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جی جیسے آپ کی مرضی۔“ مہتاب نے دست بستہ کہا اور جانے کو مڑ گیا۔

اس کے جانے کے بعد منعہا کی نگاہیں غزالہ کی جانب پلٹیں تو وہ بڑی تشویش سے بولیں ”میڈم، مہتاب ناراض

ہو جائے گا۔“

”کیوں؟“

”جو باغ آپ اسے ہٹانے کو کہہ رہی ہیں وہ تو اس نے برسوں سے لگا رکھا ہے۔“

”تو کیا ہوا غزالہ!“ منعہا نے بڑے اطمینان سے کہا ”برسوں سے باغ لگے ہونے کا یہ مطلب کہاں ہے کہ اسے

ہٹایا نہیں جاسکتا۔ میں تو اس بات کی قائل ہوں کہ عوامی بہبود کے اداروں کی بہتری میں حائل ہر رکاوٹ کو گرا دینا

چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میڈم!“ غزالہ خفیف ہو کر بولیں ”مگر.....“



”مگر؟“

”مہتاب اسکول کا چوکیدار ہے میڈم۔“

”سو ہاٹ!“

”میڈم جی اسکول کی نگرانی کرتا ہے۔“

”یہ اس کی ذمہ داری ہے۔“

”اسکول کی چھٹی کے بعد یہاں کی ہر چیز اسی کے رحم و کرم پر ہوتی ہے میڈم۔“

”تو کیا ہم چوکیدار کے رحم و کرم پر ہو جائیں۔ یہ اسکول ہے، ایک ادارہ ہے غزالہ، یہاں ہمیں کسی بھی فرد کو اپنی کمزوری بنائے بغیر اصول اور قاعدوں کے تحت کام کرنا چاہیے۔ مہتاب اسکول کی نگرانی کرتا ہے تو یہی اس کی ذمہ داری ہے اور وہ اپنے اس کام کا معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ ہم میں سے کسی پر یا ادارے پر احسان نہیں کرتا۔“

غزالہ خفت کے مارے گلابی پڑ گئیں۔

”نو میڈم جی میرا یہ مطلب نہیں تھا ہر گز بھی۔ میں تو دراصل یہ کہنا چاہتی تھی کہ مہتاب کی موجودگی میں ہمیں اسکول کی طرف سے کوئی پرابلم نہیں۔ چیزوں کا خیال رکھتا ہے، انہیں ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا۔ اپنے کوارٹر کے سامنے اس نے بڑے شوق سے باغ لگا رکھا ہے۔ اسے اور اس کے بچوں کو سبزیاں اور پھل مل جاتے ہیں اس باغ سے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ باغ ہٹوانے پر یہ برا مانا جائے اور ہمیں کوئی پرابلم ہو۔“

”کیا پرابلم ہو سکتی ہے غزالہ؟“

”کچھ بھی میڈم، دو چار کرسیاں ہی ادھر ادھر ہو جائیں تو!“

”آپ کو شاید یاد نہیں دو چار کیا سیکڑوں کرسیاں ادھر ادھر ہوئی پڑی تھیں اور ہمارے نیچے فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔ ادھر ادھر ہوئی سیکڑوں کرسیوں کو اٹھوا کر ان کی مرمت کروائی تو آج نیچے باعزت طریقے سے کلاسوں میں بیٹھے ہیں۔ ورنہ اسی مہتاب نے تو کرسیوں کو ایندھن بنا رکھا تھا۔ میرے نزدیک تو یہ بھی بددیانتی ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ جس کی زمین کا چچا چچا اس کے طلبہ کے لیے وقف ہونا چاہیے اس میں ایک چوکیدار بڑے رقبے پر ایک ایسا باغ آراستہ کر کے بیٹھ جائے جسے وہ اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا ہو۔ میں نے سنا ہے اسکول کے اوقات کار کے دوران مہتاب اور اس کے گھر والے اسکول کی کسی بچی کو اس باغیچے کے قریب پھنکنے بھی نہیں دیتے۔“

”جی میڈم یہ تو ہے۔“

”پھر بھی آپ کو مہتاب کی ناراضی کی فکر ہے۔“

”اوہ نو میڈم! میرا مطلب ہے آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو۔“

ملتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

”غزالہ جی ایک کہات ہے۔ اوکھلی میں سردیا تو موصولوں کا کیا ڈر۔ سو وہ حساب اپنا ہے۔ اگر اس ڈر سے کہ ہمیں کوئی پرابلم نہ ہو تو ہم خود کو ادارے کے ملازمین کی خواہشات اور ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو پھر ہمارے یہاں ہونے کا نہ کوئی فائدہ ہے نہ جواز..... کیا خیال ہے؟“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم!“ غزالہ نے نگاہیں چرائیں۔

ملتہا دھیرے سے مسکرا دی۔

☆☆☆

اگلے روز چھٹی سے کچھ دیر پہلے جب ملتہا اسکول کا آخری راؤنڈ لے کر اپنے دفتر میں لوٹی تو سائڈ ریک پر پولی

تھین کا ایک سیاہ فربہ تھیلا رکھے پایا۔ اس نے تھیلے کے اندر جھانکا۔ ہری پیاز، کرلیے، توریاں، ہری مرچیں، ہر ادھنیا اور ناشپاتیاں تھیلے میں موجود تھیں۔

اس نے کھٹی بجائی۔ اقبال لپکا ہوا اندر آیا۔  
”یہ کیا ہے اقبال؟“ اس نے تھیلے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”میڈم! مہتاب رکھ گیا ہے جی۔“

”کیوں؟“

”کہتا تھا میڈم کے ساتھ جائے گا یہ تھیلا۔“

”میرے ساتھ! کیوں؟ کہاں؟“

”آپ کے گھر میڈم۔“

”میرے گھر! وہ چونکی۔“

”ہاں جی۔“

”لیکن کیوں؟“

”پکانے کے لیے۔“

”مہتاب کو بلاؤ۔“

”اچھا جی۔“

مہتاب آیا تو اس نے اس تھیلے کی بابت مہتاب کے استفسار پر بڑے ہی نیاز مندانہ انداز میں کہا ”میڈم جی یہ گھر کے لیے سوغات ہے۔“  
”کیسی سوغات!“

”یہ چیزیں باغ سے اتری تھیں، میں نے سوچا کچھ میڈم جی کے گھر بھی چلی جائیں۔ بالکل تازہ ہیں جی۔ آج صبح ہی اتاری ہیں میں نے، میری گھر والی کرلیے اور ہری پیاز پکاتی ہے جی بڑی لا جواب ترکاری بنتی ہے۔“

”مہتاب میرے گھر میں تو کوئی بھی کڑوی سبزی پسند نہیں کرتا۔“

”کوئی بات نہیں میڈم جی کرلیے میں نکالے لیتا ہوں۔ آپ اصغراں کو دوں گا تو خوش ہو جائے گی۔ باقی میں گاڑی میں رکھوائے دیتا ہوں۔“

”نہیں مہتاب۔“

مہتاب ہنسنے لگا۔

”میں اس میں سے کچھ بھی نہیں لے کر جاؤں گی۔ دینا چاہو تو یہ سبزی اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دو ورنہ اپنے گھر میں استعمال کر لیتا۔“

”میڈم جی آپ لے جاتیں۔ پچھلی میڈم تو بڑے شوق سے لے جاتی تھیں بلکہ وہ تو جی فرمائش کر کر کے کرلیے اور توریاں اتر والی تھیں۔“

”شکر یہ مہتاب! میں نہیں لے جاؤں گی۔“

”اچھا جی۔“ مہتاب کا منہ لنگ گیا۔

”تھیلا اٹھا لو۔“

مہتاب آگے بڑھا اور اس نے خاصی مایوسی کی کیفیت میں ریک پر سے تھیلا اٹھالیا۔



”تھینک یو۔“  
 ”میڈم جی تاکیں تو رکھ لیتیں۔“  
 ”تاکیں!“

”ناشپاتیاں میڈم جی۔“  
 ”نہیں مہتاب تم اپنے بچوں کو دینا۔“  
 ”میڈم جی ان کے توجہ بھر گئے ہیں کھا کھا کر۔“

”میرے گھر میں تین افراد ہیں اور ہم تینوں میں سے کسی کو بھی کھانے پینے کا کچھ زیادہ شوق نہیں۔ بازار سے بھی جو فروٹ آتا ہے اس میں سے آدھا بلکہ کبھی کبھی تو اس سے بھی زیادہ ماسی کو دے دیتی ہیں میری والدہ۔“ اگرچہ منہا کو یہ بات کہنی اچھی نہ لگی مگر مہتاب کو رخصت کرنے کے لیے کہنا ضروری ٹھہری۔

”اچھا جی۔“ مہتاب نے مردہ سی آواز میں کہا اور تھپلا اٹھا کر دروازے کی طرف مڑ گیا۔  
 منہا اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لیتی رہی۔

”پچھلی میڈم تو بڑے شوق سے لے جاتی تھیں بلکہ وہ تو فرمائش کر کر کے کر لے اور تو ریاں اتر داتی تھیں۔“  
 مہتاب کے الفاظ بازگشت بن کر اس کی سماعت میں گونج رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ لوگ کتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں، بے وقعت چیزوں اور حقیر فائدوں پر اپنی عزت اور وقار قربان کر دیتے ہیں!

☆☆☆

مئی کے صبح بیہ کے پاس آ جانے اور شام کو علیپ کے ساتھ گھر واپس جانے کے معمول میں دھیرے دھیرے فرق آتا چلا گیا تھا۔ آخر اپنے گھر کی بھی ذمے داریاں تھیں ان پر۔  
 بیہ کی بیرون ملک طویل رخصت کو منسوخ کرا کے اسے عدت کی چھٹی لینا پڑی تھی۔  
 انسان کے منصوبے اور ارادے کیا ہوتے ہیں اور خدا کی مرضی کیا۔  
 واقعی انسان مجبور اور بے بس ہے۔

چند ہی ہفتوں میں بیہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ اس کا سڈول جسم غم کی آنچ میں کھل کر رہ گیا تھا۔ چلتی پھرتی تو یوں لگتا جیسے کوئی زبردستی دھکے دے دے کر قدم اٹھانے پر مجبور کر رہا ہو۔ وہ کپڑے جو اسے فٹ ہوا کرتے تھے اب پہنتی تو ایسے لگتا کسی اور کے کپڑے پہن لیے ہوں۔ سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ کمزوری اور شدت گریہ سے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں میں ہمہ وقت اداسی رہتی۔ اس کا ہنسنا، بولنا، چہچہانا گویا قصہ ماضی بن گیا تھا۔ بت کے مانند چپ بیٹھی خلاؤں میں ٹکتی رہتی۔ فرحان کی موت کے صدمے نے اسے بچے سے بھی بے نیاز کر ڈالا تھا۔ بچے کی دیکھ بھال دادی، دادا کر رہے تھے۔ دادا گھنٹوں اسے اپنے سینے سے لگائے ٹھلاتے پھرتے۔ اوپر کا دودھ لگا دینے کا نقصان یہ ہوا تھا کہ بچہ بھی ماں کی آغوش میں جانے کی حاجت محسوس نہ کرتا۔

مسز ظہیر بچے کو سینے سے لگاتیں تو نفسِ سینہ میں گرفتار دل گویا مرغِ بلبل کی صورت تڑپنے لگتا۔ ان کا جی چاہتا بلک بلک کر رو دیں۔ یہ وہ بچہ تھا جس کی رگوں میں ان کے جگر گوشے کا لہو بھی موجزن تھا۔ اسے سینے سے لگاتیں تو ایک اُن کہا درد، ایک ناقابلِ بیان دکھ کا احساس ان کے وجود میں سرایت کر جاتا۔ ان کی رگوں میں موجزن ہر قطرہ لہو بیتا بانہ فرحان کو پکارنے لگتا۔

اوہ خدا، کیسی اذیت تھی!  
 کتنا کرب!

اور کیسا درد!

خدا اس آزمائش سے کسی دشمن کو بھی دوچار نہ کرے۔  
میرہ کی سونی کلاٹیاں، سوگوار چہرہ اور سفید دوپٹا دیکھ کر ان کے دل میں درد کی ایک لہری اٹھتی۔ اس لڑکی کے گھر  
میں آنے سے روز و شب کتنے بدل گئے تھے۔ اس کا رنگین سراپا بہار بن کر گھر میں اتر اٹھا۔  
”ارے بھئی، بہو صاحب ڈیوٹی پر چلی جاتی ہیں تو گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔“ وہ اسپتال چلی جاتی تو ظہیر  
صاحب اکثر کہتے۔

اپنے محبت آمیز رویے سے اس لڑکی نے ان کے گھر کے ہر فرد کو کس خوبصورتی سے اپنا بنا لیا تھا۔ لیلیٰ اور بیلا اپنی  
سسرالوں سے میکے آتیں تو ان کا پہلا سوال یہی ہوتا ”بھابی کہاں ہیں؟“  
وہ گھر میں ہوتی تو مسکراتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ نند اور بھاوج میں وہ گرجبوش معافتحہ ہوتا کہ کیا  
دو گہری سہیلیوں میں ہوتا ہوگا اور اب.....!

اب وہ آتیں تو بہت دھیرے سے اور کرب آمیز لہجے میں پوچھتیں ”بھابی، کیسی ہیں؟“  
ان کے آنے پر میرہ کمرے سے نہ نکلتی۔ انہیں خود اس کے پاس جانا پڑتا۔  
”کیسی ہیں بھابی؟“ وہ دلسوز لہجے میں پوچھتیں۔  
میرہ کے لب کپکپانے لگتے۔ آنکھوں میں نمی امنڈ آتی۔  
”ٹھیک ہوں“ وہ کھٹی کھٹی آواز میں کہتی۔  
مگر وہ ٹھیک کب تھی؟

وہی گھر جہاں اس کے آنے سے بہار اتر آئی تھی، دھنک نے اپنے رنگ بکھیر دیے تھے، خزاں کے مٹالے پن  
میں ڈوب گیا تھا۔

اوہ خدا یا!

کیسا الم رسیدہ ہو گیا تھا گھر!

مسز ظہیر اردو کی ٹیچر رہی تھیں۔ گھر کے سناٹے اور ویرانی کو دیکھ کر انہیں بار بار ایک شعر یاد آتا

کوئی دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا ہے  
ویرانی سی ویرانی

دردنا قابل برداشت ہو جاتا تو میرہ کے پاس جا بیٹھتیں اور فرحان کی باتیں شروع کر دیتیں۔ کبھی اس کے بچپن کی  
باتیں، کبھی نوجوانی کی باتیں۔ کبھی اس کے اسکول کے زمانے کی یادوں کو کھنگالنے لگتیں، کبھی کالج کی یادوں کو ٹٹولنے  
لگتیں۔

”ایک بار کیا ہوا میرہ، فرحان گم ہو گئے۔ چھوٹے سے تھے۔ ہمارے ساتھ بازار گئے۔ ساتھ ساتھ تھے، چلتے چلتے  
اچانک کسی اور طرف نکل لیے۔ ہمیں پتا ہی نہ چلا۔ جب احساس ہوا کہ فرحان ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو ہماری تو جیسے  
جان ہی نکل گئی۔ خریداری چھوڑ چھاڑ ہم دیوانوں کی طرح واپس پلٹے۔ ہمیں نہیں یاد کہ ہم نے کتنوں کو پرے دھکیلا،  
کتنے لوگوں کے پاؤں کپلے، بس پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھتے واپس پلٹے۔ کسی نے ہمیں حواس باختہ دیکھ کر کہا، اس  
عورت کو کیا ہوا ہے، ہم نے رو ہانسی آواز میں کہا، ہمارا بچہ گم ہو گیا ہے اور یہ کہتے ہی ہم دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔  
اچانک آواز سنائی دی۔ امی! کوئی بچہ رو رہا تھا اور ایک آدمی اس سے پوچھ رہا تھا۔ امی کہاں ہیں۔ بچے کی آواز،  
ارے وہ تو ہم آوازوں کے جھوم میں بھی پہچان سکتے تھے۔ ہم لپکے اور ہم نے نیچے جھک کر فرحان کو گلے سے لگالیا۔



فرحان بولے ”آپ کہاں چلی گئی تھیں۔“ ہم نے کہا، تم کہاں چلے گئے تھے؟ ہم ماں بیٹا دونوں ہی رو رہے تھے۔ ہم نے توبہ کی کہ آئندہ کبھی فرحان ہمارے ساتھ ہوئے تو ہم ان کا ہاتھ ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے ہاتھ چھوڑا بھی نہیں میہ۔ ہم تو اب بھی ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہی تھے۔ جب ساری دنیا سوئی ہوئی تو ہم جانناز پر بیٹھے اپنے بچوں کے لیے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے۔ فرحان کے لیے تو بطور خاص مگر فرحان نے خود ہی ہاتھ چھڑا لیا۔ نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔“ مسز ظہیر کی آنکھوں سے سیل رواں بہہ نکلا۔

میہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ اس کی اپنی آغوش میں گرنے لگے۔  
 ”بس ایک لمحے میں جیسے کسی غیبی قوت نے ہمیں احساس دلایا کہ فرحان ہمارے ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔ خدا نخواستہ ہم زیادہ دور نکل جاتے اور پھر احساس ہوتا تو.....“ مسز ظہیر کی آواز میں سیلن تھی ”مگر کتنی عجیب بات ہے کہ اتنا بڑا حادثہ ہونے سے پہلے ہمیں کسی بھی طرح ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ فرحان ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے جا رہے ہیں۔ نہ کوئی خواب، نہ کوئی اشارہ، نہ ہی دل پریشان تھا۔ ہم تو اس خیال سے بہت خوش تھے کہ تم اور ممتا فرحان کے پاس جا رہے ہو، اب وہ اکیلے نہیں رہیں گے۔ ان کی طرف سے ہماری فکر کم ہو جائے گی۔“

میہ پھر پہلے کی طرح گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔  
 ”یوں نہ رویا کرو..... گھٹ گھٹ کر..... چپکے چپکے..... ہمیں تکلیف ہوتی ہے..... ایک بار کھل کر رولو، خوب کھل کر“ مسز ظہیر کی آواز بھرا رہی تھی۔  
 میہ سر جھکائے رو رہی تھی۔

”لیلیٰ بتا رہی تھیں فہیم کا فون آیا تھا۔ فہیم تو فرحان کا سارا سامان بھجوانا چاہ رہے تھے۔ اس میں وہ سامان بھی شامل تھا جو فرحان نے تمہارے اور ممتے کے لیے خرید کر رکھا تھا مگر فہیم نے انہیں روک دیا۔ لیلیٰ بتا رہی تھیں۔ فہیم کہتے ہیں جب تک میہ بھابی ایک مرتبہ ممتے کے ساتھ آ کر یہ نہیں دیکھ لیتیں کہ فرحان نے ان کے اور ممتے کے لیے کتنے پیار سے کمر اٹھایا تھا، کمر اجوں کا توں سجا رہے گا۔“

میہ جس کی سسکیاں تھم گئی تھیں مسز ظہیر کی بات ٹھنکی باندھ کر سنتی رہی اور ان کے چپ ہونے پر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مسز ظہیر نے اسے اپنے گلے سے لگالیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں ”رولو..... جی بھر کر رولو..... ہم تو ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے خود کہہ رہے تھے ایک مرتبہ خوب کھل کر رولو۔“

ظہیر صاحب نے اپنے سینے سے لگائے تیزی سے لپکے ہوئے کمرے میں در آئے۔ اور انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسز ظہیر سے میہ کے اس قدر بلکنے کا سبب پوچھا۔

مسز ظہیر کچھ نہ کہہ پائیں۔

ظہیر صاحب آگے بڑھے اور میہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلسوز لہجے میں بولے ”ایزی..... ایزی بہو صاحب! آپ تو بہت باہمت ہیں۔“

انہوں نے ممتے کو میہ کی آغوش میں دے دیا اور کرسی کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھتے ہوئے بولے ”اب آپ کو اپنے لیے نہیں، ممتے کے لیے جینا ہے۔ یہ سمجھئے کہ فرحان جاتے جاتے آپ کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ تھا ممتے ہیں، جس کی روشنی میں آپ کو زندگی کے تاریک راستے سے گزرتا ہے“ ظہیر صاحب نے اس کا سر دھیرے سے تھپتھپایا اور بولے ”بچہ آپ کے لیے جس قدر اہم ہے سو ہے، ہمارے لیے بھی یہ آئندہ زندگی گزارنے کا ایک بہانہ، ایک جواز ہے ورنہ اگر سچ پوچھئے تو ہم تو اس لمحے مر گئے تھے جب ہمیں یہ خبر ملی کہ فرحان میاں، اس دنیا میں نہیں رہے۔ بہت

مشکل ہوتا ہے بہو صاحب! یہ ہمیں تجربے نے سکھایا کہ بڑھاپے میں جوان اولاد کی موت کا صدمہ بہنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر اس بچے کے سہارے ہم اس کڑی منزل سے گزر گئے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے فرحان ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ اب ہمیں اور آپ کو اسی امید کے سہارے زندگی کے راستے پر چلنا ہے۔ آپ ہماری بات سمجھ رہی ہیں نا بہو صاحب!

بیہوش نے ایک بار بھیگی آنکھوں سے ظہیر صاحب کو دیکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔  
مسز ظہیر دوپٹے کے پاد سے اپنی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔

۵۲۲ ۵۲۲ ۵۲۲

منجبا اپنے دفتر میں کوئی فائل دیکھنے میں منہمک تھی۔  
”میں حاضر ہو سکتا ہوں میڈم!“ دروازے کی سمت سے مہتاب کی آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ اس نے گردن کی خفیف سی جنبش سے اسے گویا اندر آنے کی اجازت دی۔  
وہ پیش قدمی کرتا اس کی میز کے اگلے کنارے سے ذرا پرے اس کے روبرو آتھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تہ شدہ کاغذ تھا۔

”ہاں مہتاب، کیا بات ہے؟“ منجبا نے اپنی توجہ فائل سے بالکل ہٹا کر کہا۔  
مہتاب نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس کی طرف بڑھادیا۔  
منجبا نے کاغذ کی تہ کھولی اور اپنی نگاہیں کاغذ پر درج عبارت پر مرکوز کر دیں۔  
چند لمحوں بعد اس نے نظر اٹھا کر مہتاب کی طرف دیکھا۔ وہ چہرے پر ایک گیمبر سائٹاثر لیے کھڑا تھا۔  
”ٹھیک ہے مہتاب!“ منجبا نے بڑے اطمینان سے کہا ”ہم تمہاری درخواست ڈائریکٹریٹ بھجوائے دیتے ہیں۔“

مہتاب نے شپٹا کر اسے کچھ اس طرح دیکھا، جیسے اسے اس سے اس رد عمل کی توقع نہ تھی۔  
”میڈم! یہ میرے تباد لے کی درخواست ہے“ اس نے گویا جتایا۔  
”میں نے دیکھ لی ہے۔ آج تو ڈاک جا چکی ہے۔ انشاء اللہ کل ہم اسے اپنے کورنگ لیٹر کے ساتھ ڈائریکٹریٹ بھجوادیں گے۔“

”جی بہتر“ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔  
منجبا نے دوبارہ اپنی توجہ مذکورہ فائل پر مبذول کرنا چاہی۔  
مہتاب بدستور کھڑا ہوا تھا۔  
”ہاں، کوئی اور بات مہتاب!“ منجبا نے ایک اچھٹی سی نظر اس پر ڈالی۔  
”نو میڈم!“

”اوکے!“ منجبا نے پھر بظاہر اپنی توجہ فائل پر کی مگر اب وہ کن آنکھوں سے مہتاب کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
”میڈم جی.....!“ وہ منمنایا۔  
منجبا نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔  
”میڈم، میں اس اسکول سے جانا نہیں چاہتا۔“  
”تو پھر تباد لے کی درخواست کیوں دے رہے ہو؟“



”میڈم جی، یہ میری عزت کا سوال ہے۔“

”تبادلہ؟“

”نہیں جی۔“

”تو پھر؟“

”بچے کا اپنی جگہ پر رہنا۔“

”کیا مطلب؟“

”میڈم، اتنے سال ہو گئے مجھے اس اسکول میں چوکیداری کرتے۔ میرے رہتے ہوئے پانچ چھ پرنسپل آئیں اور چلی گئیں، کسی نے مجھے بچے ہٹانے کا آرڈر نہیں دیا۔ خدا مغفرت کرے، مسز ابراہیم کے زمانے میں لگایا تھا میں نے یہ باغ، ان کے بعد چار میڈمیں اور آئیں، کسی نے نہیں کہا اسے ہٹاؤ۔“

”انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی مہتاب!“ منجبا نے تحمل لہجے میں کہا ”میں اس کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔“

”میڈم! آپ برائے مہربانی سمجھنے کی کوشش فرمائیں، یہ میری عزت کا سوال ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا مہتاب کہ باغچے ہٹانے میں تمہاری کیا بے عزتی ہو جائے گی؟“

”سامجھی نہیں مگے جی۔ سب کے سب میرے باغ سے جلتے تھے۔“

”کیوں؟“

”بس جی..... کوئی کسی کو کھاتے دیکھ سکتا ہے بھلا۔“

منجبا زیر لب مسکرائی۔

”ویسے مہتاب، ہے تو یہ بات ٹھیک کہ اسکول سب کا اور تازہ سبزی، پھل صرف تمہارے؟“

”محنت بھی تو میں کرتا ہوں میڈم جی!“

”صرف اس باغچے پر ہی کیوں۔ اسکول میں مالی کے فرائض انجام دینے کے لیے تم اسٹوڈنٹس فنڈ سے معاوضہ لیتے ہو مگر تمہاری نظرم کرم صرف اس باغچے پر ہے۔ نصیب خان ہفتے میں دو تین مرتبہ آ کر کام نہ کرے تو شاید یہ دو چار بچوں کا پودے بھی نہ دکھائی دیں اسکول میں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں میڈم جی!“

”بالکل یہی بات ہے۔“

”میڈم جی، آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“

”آئندہ شکایت تو تب ہوگی جب تم یہاں رہو گے تم نے تو تبادلے کی درخواست دے دی ہے۔“

”میڈم جی! باغچے نہ اجازت آجائے تو میں درخواست واپس لینے کو تیار ہوں۔“

”نہیں مہتاب! تم درخواست واپس لو یا نہ لو باغچے تو گراؤنڈ سے ہٹانا ہوگا۔“

”معاف کرنا میڈم صاحب، یہ تو پھر ضد والی بات ہوئی۔“

”ضد ہے نہ خواہش..... یہ ادارے کی ضرورت ہے۔ میں اسکول گراؤنڈ میں بچوں کے لیے کھیلوں کی بہتر سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے اس باغچے کو گراؤنڈ سے ہٹوانا چاہتی ہوں۔“

”میڈم! جگہ تو بہت ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتی مہتاب! تم اس ادارے میں رہو یا نہ رہو۔ باغچے کو گراؤنڈ سے

ہٹانا ہوگا کیونکہ یہ ادارے کی ضرورت ہے۔“

وہ چند ثانیے چپ کھڑا رہا پھر بولا ”میں نے اسکول کی بہت خدمت کی ہے میڈم!“

”تھینک یو ویری مچ!“

”میڈم! کیا میری خدمت کا صلہ یہ ہے کہ میرا تبادلہ دوسری جگہ کر دیا جائے؟“

”عجیب آدمی ہو! تم نے خود ہی تو درخواست دی ہے تبادلے کی۔“

”میں درخواست واپس بھی لے سکتا ہوں اگر آپ چاہیں تو.....“

”میں تو صرف یہ چاہتی ہوں مہتاب کہ اداروں کو بلیک میل نہ کیا جائے۔ تم اس ادارے میں اپنی خدمات جاری رکھنا چاہو تو مجھے یقیناً خوشی ہوگی لیکن اگر تم یہاں سے کہیں اور جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، ہر شخص کو اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا حق ہے۔“

”میڈم جی! میری تو مرضی یہیں رہنے کی تھی، خیر آپ غور کر لیں۔“

”مجھے غور کرنے کی ضرورت نہیں مہتاب!“

”اجازت!“

”بہت خوشی ہے۔“

مہتاب کمرے سے نکل گیا۔

چند ہی کھول بعد اقبال دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

”اجازت ہے میڈم!“

”ہاں..... آؤ۔“

”میڈم!“ اقبال جھجکتے ہوئے بولا ”سنا ہے مہتاب نے ٹرانسفر کی درخواست دی ہے؟“

”منہتا نے ابرو تکیھی کر کے اسے دیکھا ”ہاں دی تو ہے۔“

”میڈم جی! بال بچے دار آدمی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”تبادلہ ہوگا تو پریشان ہو جائے گا۔“

”اقبال!“ منہتا کے لہجے میں سرزنش اور تنبیہ کی کیفیت تھی ”تبادلے کی درخواست اس نے دی ہے۔ پریشان تم ہو رہے ہو۔ اس کے بال بچوں کا اس سے بڑھ کر کوئی ہمدرد ہو سکتا ہے۔“

”نہیں جی!“ اقبال جھینپ کر کان کھجاتے ہوئے بولا۔

”عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ آدمی اپنے کام سے کام رکھے۔ اپنی فکر کرے، کیا سمجھے؟“

”سوری میڈم“ اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

”میڈم غزالہ کو میرے پاس بھیج دو۔“

وہ جانے کو پلٹا۔

”لیکن دیکھو، اگر وہ کلاس لے رہی ہوں تو ان سے کہنا پیریڈ لینے کے بعد میرے پاس آئیں۔“

”اوکے میڈم!“

مڈل پاس اقبال اپنی روزمرہ گفتگو میں چند زبان زد عام انگریزی الفاظ عموماً استعمال میں رکھنے کا عادی تھا۔ اقبال کے جانے کے بعد منہتا دوبارہ اپنے سامنے کھلی فائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دفتر کا ریکارڈ اور فائل سسٹم



انتہائی زبوں حالی کا شکار تھے۔ نظامت کے جاری کردہ کسی پالیسی لیٹر کی ضرورت ہوتی تو تاج محمد ایک سرکلر تلاش کرنے میں دو دن لگا دیتا۔ ادارے کے ملازمین کی پرسنل فائلیں، سروس بکس، مختلف عنوانات سے متعلق دفتری کاغذات، روزمرہ ڈاک بہتری کے لیے سربراہ ادارہ کی بھرپور توجہ کے متقاضی تھے۔ لگتا تھا پیشرو خواتین سربراہوں نے دفتری امور کی جانب خاطر خواہ توجہ دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ سب سے اہم معاملہ ملازمین ادارہ کے سروس ریکارڈز کا تھا جو درستی اور مکمل ہونے کا متقاضی تھا۔ ادارے کے روزمرہ امور کے ساتھ ملتا ہوا دفتری امور کی بہتری کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ ضرور نکالتی۔ چہرے کی خوبصورتی کے لیے صرف اوپری لیپا پوتی ہی تو کام نہیں آتی۔ پورے جسم کا اندرونی نظام بہتر کرنا پڑتا ہے۔ رگوں میں صاف ستھرا خون دوڑ رہا ہو تو چہرے پر کسی مصنوعی لیپا پوتی کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اداروں کی بہتری اور خوبصورتی کے لیے پورے نظام کو شفاف رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نظام کی بہتری میں اہم ترین کردار سربراہ ادارہ کا ہوتا ہے۔

غزالہ ناصر شاید پیریڈ لینے میں مصروف تھیں۔ وہ گھنٹی بجنے کے بعد آئیں۔

”میڈم آپ نے مجھے بلایا تھا؟“

”ہاں غزالہ..... بیٹھیے۔“

غزالہ اس کے روبرو بڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ رہیں۔

”غزالہ آئندہ امتحانات میرے اس اسکول میں آنے کے بعد دوسرے امتحانات ہوں گے۔“

”جی میڈم۔“

”پہلا امتحان تو چونکہ میرے آنے کے چند ہی دنوں بعد شروع ہو گیا تھا لہذا اہم خاطر خواہ تیاری نہ کر سکے۔

امتحانات کے دنوں میں میری جو آبرزویشن رہی امتحانات کے بعد میں اس سلسلے میں پہلے آپ سے پھر اسٹاف میننگ میں چند باتیں کرنا چاہتی تھی مگر..... میرے بہنوئی کی اچانک ڈتھ نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ پھر دوسرے بہت سے امور کی جانب توجہ رہی۔ میں چاہتی ہوں آئندہ امتحانات کے لیے ہم بہتر انداز میں تیاری کریں۔“

غزالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”بچھلے امتحانات سے آپ مطمئن نہیں تھیں میڈم جی؟“

”اگر سچ پوچھے تو نہیں۔“

غزالہ کی سفید رنگت میں سرخی حلول کر گئی۔

”بچیوں کو امتحانی شیڈول دو دن پہلے تختہ سیاہ کے ذریعے نوٹ کرایا گیا اور بعد ازاں اسے کسی نے چیک کرنے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ تمام بچے یکساں محتاط نہیں ہوتے چنانچہ متعدد بچیوں نے تختہ سیاہ سے امتحانی پروگرام نقل کرنے میں غلطیاں کر ڈالیں اور چونکہ ٹیچرز نے اس کو چیک نہیں کیا تھا لہذا مجھے والدین کی جانب سے ایسی شکایات ملیں کہ جس دن پر چہ تھا بچہ اسکول نہیں آیا کیونکہ اس نے اپنی کاپی پر کچھ اور نوٹ کر رکھا تھا یا پرچہ انگریزی کا تھا بچی کسی دوسرے مضمون کی تیاری کر کے آگئی۔ متعدد بچیوں نے وہ کاغذ ہی کم کر دیا جس پر امتحانی پروگرام نوٹ کیا تھا۔“

”میڈم جی بچیوں کی ان غلطیوں میں ہمارا کیا قصور؟“

”ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نے ان کا نوٹ کردہ امتحانی پروگرام چیک نہیں کیا۔“

”میڈم ٹیچرز بے چاریاں ویسے ہی اوور ورکڈ ہیں۔ ایک ایک بچے کا امتحانی پروگرام بھی چیک کرنے بیٹھ جائیں

تو پھر تو اللہ ہی حافظ ہے۔“

”ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ بچیوں کو محتاط رہنا سکھائیں۔ ان سے کہا جائے کہ جو لکھا ہے اسے دوبارہ بارہ چیک

”کریں۔“

”کہتے ہیں میڈم مگر آج کل کے اسٹوڈنٹس میڈم..... خدا یا بہت ہی بے پرواہ ہیں۔“  
منہاج دھیرے سے مسکرائی۔

”غزالہ بچے بے پرواہی ہوتے ہیں۔ جس عمر کے بچے ہمارے پاس ہیں اس عمر میں شاید ہم بھی اسی طرح بے پروا تھے۔“

غزالہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”شاید نہیں میڈم میں تو اکثر اپنی کاپیاں اور کتابیں ڈیک میں بھول آیا کرتی تھی“  
”چلے، آپ مسکرائیں تو۔“ منہاج نے کہا ”ایسا ہے غزالہ اس بار ہم بچوں کو پرنٹڈ امتحانی پروگرام دیں گے۔ آخر ہم بچوں سے امتحانی فیس اسی لیے تولیتے ہیں کہ ان کا امتحان بہتر طریقے پر لے سکیں۔“  
”جی ٹھیک ہے۔“

”دوسری بات یہ کہ گزشتہ امتحان کے دوران میں نے دیکھا امتحانی پرچوں میں غلطیاں بہت تھیں۔“  
”میڈم اس کے لیے تو پرنٹر قصور وار ہے۔ ٹیچرز کے لکھے کو وہ کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔“

”کیا پرچوں کی پروف ریڈنگ کی جاتی ہے؟“  
”میں بھی نہیں میڈم۔“

”میرا مطلب ہے ہماری ٹیچرز جو پرچے بنا کر دیتی ہیں۔ پرنٹران کی کتابت یا کمپوزنگ کے بعد پریس میں بھیجنے سے قبل ان کی غلطیوں کی اصلاح کے لیے ٹائپ یا کتابت شدہ پرچے دوبارہ ٹیچرز سے چیک کرواتا ہے یا نہیں؟“  
”بکھی نہیں میڈم جی، ہم تو ایک دفعہ پرچے اسے دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں چھپے ہوئے پرچے ہی دیتا ہے۔“

”تبھی تو غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس مرتبہ ہم اسے پابند کریں گے کہ وہ کمپوزنگ کے بعد پرچے پروف ریڈنگ کے لیے ہمیں دکھائے۔“

”آپ کا مطلب ہے ٹیچرز کو؟“  
”جی ہاں۔“

”ٹیچرز اپنے پرچے کی پروف ریڈنگ خود کریں گی میڈم؟“

”ضروری نہیں، آپ کے پاس سبکیٹ اسپیشلسٹ تو ہوں گے۔ میرا مطلب ہے پانچویں جماعت کو پڑھانے والی ٹیچرز پہلی سے چوتھی جماعت تک کے پرچوں کی پروف ریڈنگ بہ آسانی کر سکتی ہیں۔ آپ ٹیچرز کا ایک ہینڈل بنا لیجئے گا۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک مختلف مضامین پڑھانے والی ٹیچرز میں سے ہر مضمون کے لیے ایک ایسی ٹیچرز کا انتخاب کر لیجئے گا جنہیں اپنے مضمون پر عبور ہو اور جو انتہائی محتاط طریقے سے کام کرتی ہوں۔ ان سے پہلی سے پانچویں جماعت تک ان کے مضمون کے تمام امتحانی پرچوں کی پروف ریڈنگ کروا لیجئے گا۔“

”گو یا پہلی سے پانچویں تک ہر مضمون کے تمام امتحانی پرچوں کی پروف ریڈنگ کے لیے ایک ٹیچرز؟“ غزالہ نے

پوچھا۔

”جی بالکل۔“

”لیکن میڈم شاید پرنٹرز کو بار بار پرچے لانے لے جانے پر اعتراض ہو۔ وہ تو ایک دفعہ تمام پرچے اکٹھے لے جاتا ہے اور پرنٹڈ پرچوں کے تمام بند پیکٹ ایک ساتھ ہمیں پہنچا جاتا ہے۔ پروف ریڈنگ کے لیے تو اسے دو مرتبہ اور آنا



پڑے گا۔“  
 ”دوسرے نہیں غزالہ..... اس وقت تک جب تک پرچوں میں آخری غلطی بھی درست کر کے متعلقہ ٹیچر سے پروف اوکے نہیں کرایا جاتا۔“  
 ”بہت مشکل ہے میڈم..... وہ تو دو سے تیسری مرتبہ آنے میں بھی سوخڑے دکھاتا ہے۔ اس کی ڈیمانڈ تو یہ ہوتی ہے کہ ایک ہاتھ سے چھپے ہوئے پرچے ہمارے حوالے کرے اور دوسرے ہاتھ سے بل وصول کر کے لے جائے۔ وہ اتنے چکر ہرگز نہیں لگائے گا۔“  
 ”نہ لگائے..... کام کرنے والے اور بہت غزالہ۔“

”میڈم جی پرانا آدی ہے..... برسوں سے ہمارے پرچے اور دوسری اسٹیشنری جھپا رہا ہے۔“  
 ”میں نے دیکھا ہے دفتر کی اسٹیشنری میں بھی بے شمار اغلاط ہیں کہیں جے غلط، کہیں جملہ غلط۔ حد تو یہ ہے کہ اسکول داخلہ فارم تک میں غلطیاں ہیں۔ میں تو سوچ رہی ہوں ڈائریکٹریٹ سے اجازت لے کر ایسی تمام اسٹیشنری جو کسی بھی حوالے سے ادارے سے عوام کے ہاتھوں تک جاتی ہو اور غلطیوں کی حامل ہو اسے رد کیا جائے اور اس کی جگہ ممکنہ حد تک غلطیوں سے پاک اسٹیشنری چھپوائی جائے۔ مجھے تو اس تصور ہی سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ تعلیمی ادارے کی اسٹیشنری اور اس میں جے اور قواعد کی اغلاط۔“  
 ”اس میں آپ کا کیا دوش! چھپوانے والوں کا قصور ہے۔“

”فی الحال ادارے کی سربراہی میرے ذمے ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں اس ادارے کی ہر اچھائی ہر برائی ہر خوبی کی ذمے دار ہوں۔“

”اف اللہ، میڈم جتنی باریکیوں میں آپ جاتی ہیں کون جاتا ہے بھلا۔“  
 ”جانا چاہیے غزالہ..... باریکیوں میں جانا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ عمارت کو ٹیڑھے پن اور بدنمائی سے بچانے کے لیے ہر اینٹ کو احتیاط کے ساتھ جوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ امتحانی پرچے ہوں یا عمومی اسٹیشنری والدین اور سرپرستوں کے ہاتھ میں جاتی ہوگی تو ان کی غلطیوں کے ذمے دار ہم ہی ٹھہرتے ہوں گے۔“  
 ”جی میڈم یہ تو ہے مگر پرنٹر ہمارا بہت پرانا آدی ہے۔“

”کتنا ہی پرانا تعلق کیوں نہ ہو اس کا اس ادارے سے۔ اگر وہ اطمینان بخش کام نہیں کرے گا تو ہم دوسرا آدی تلاش کریں گے۔“

غزالہ نے اسے متذبذب نگاہوں سے دیکھا۔  
 ”غزالہ!“ منجھانے انتہائی نرم لہجے میں کہا ”کام کرنے والوں کو اداروں کا تابع ہونا چاہیے نہ کہ اداروں کو لوگوں کی مرضی اور ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔“  
 ”دیکھ لیں میڈم، امتحانات نزدیک ہیں اگر آپ نے پرنٹر کو بھگا دیا تو دوسرا آدی ملنا مشکل نہ ہو جائے کہیں؟“  
 ”یہ سب آپ سے کس نے کہا کہ میں اسے بھگانا چاہتی ہوں۔ اگر اس نے اچھا کام کیا، احتیاط سے اور غلطیوں سے بڑا تو اسے میں کیا کوئی بھی نہیں بھگا سکتا۔ آپ فکر نہ کریں میں اسے بلا کر بات کر لوں گی۔ اپنی شرائط بتا دوں گی اسے۔ وہ ہماری شرائط پر کام کرنے کو آمادہ ہوا تو فہماں نہ کوئی اور آدی دیکھ لیں گے۔“  
 ”جی بہتر۔“

”یہ تو ہوئی امتحانی پرچوں کی بات۔ کل وقفے کے دوران ایگزامینیشن کمیٹی کی میٹنگ رکھے لیتے ہیں تاکہ دیگر امور اور امتحانی طریقہ کار طے کر لیا جائے اور ہاں غزالہ ایک بات اور گراؤنڈ فلور پر اسٹاف روم سے ملحق جو کرا خالی

پڑا ہے اس میں ہم اپنا شعبہ امتحان قائم کرنے جا رہے ہیں۔“

غزالہ ناصریوں مسکرا دیں جیسے ملتھانے کوئی ظریفانہ بات کر دی ہو۔

”میڈم جی! یہ برائمری اسکول ہے۔ کوئی یونیورسٹی تو نہیں جو یہاں شعبہ امتحان کھولنے کی ضرورت ہو۔“

”امتحان ہر سطح تعلیم پر ایک اہم شعبہ ہے غزالہ، اس میں یونیورسٹی یا اسکول کی قید نہیں۔ ہمارے لیے اپنے ادارے کی پہلی جماعت کا امتحان بھی اسی قدر اہم ہے جتنا کسی یونیورسٹی کے لیے گریجویشن یا ماسٹرز کا امتحان۔ اپنے اسکول کے گزشتہ امتحانات کے دور میں نے دیکھا نہ بچوں کو امتحانات کے دوران بٹھانے کا انتظام فول پروف تھا نہ بچوں کو امتحانی پرچوں کی تقسیم کا طریقہ کار درست۔ بچوں سے جوابی کاپیوں کی وصولی بھی بڑی غیر منظم سی تھی۔“

”میڈم اس وقت آپ نے کیوں نہیں کہا کچھ؟“

”بات یہ ہے کہ میری موجودگی میں وہ پہلا امتحان تھا۔ میرا طریقہ کاریہ ہے کہ پہلے خاموشی سے مشاہدہ کرتی ہوں پھر اگر ضروری سمجھوں تو وقت آنے پر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں۔ ہم تجربوں سے گزر کر ہی تو سیکھتے ہیں نا غزالہ! ایک راستے سے ایک دفعہ گزر جانے کے بعد ہی ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کہاں نشیب ہے کہاں فراز۔ دوبارہ اس راستے سے گزرتا پڑے تو ہم ان نشیب و فراز کا خیال رکھتے ہیں۔“

”جی میڈم۔“ غزالہ انکساری سے بولیں پھر انہوں نے پہلو بدلا ”میڈم جی، سنا ہے مہتاب نے ٹرانسفر کے لیے

درخواست دی ہے؟“

ملتھا دھیرے سے مسکرا دی۔

”تو آپ کو بھی خبر مل گئی!“

”جی میڈم۔“ غزالہ قدرے خفت سے مسکرائیں۔

”میں نے ابھی آپ سے کہا نا غزالہ کام کرنے والوں کو اداروں کا تابع ہونا چاہیے نہ کہ اداروں کو لوگوں کی مرضی اور ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ مہتاب اگر یہاں سے تبادلہ کرانا چاہتا ہے تو بھد شوق لیکن اس کے کوارٹر کے سامنے سے باغیچے کو ہٹانا اس ادارے کی ضرورت ہے۔“

”ایک بات کہوں آپ سے؟“

”جی..... ضرور۔“

”ماسٹرمٹ کیجئے گا میڈم..... آپ کے ساتھ کام کرنا مشکل مگر مزیدار لگتا ہے۔“

”تھینک یو۔“

”بہن کیسی ہیں میڈم؟“

ملتھانے ایک گہری سانس کھینچی۔

”کوشش کر رہے ہیں ہم سب..... اسے دوبارہ زندگی کی جانب لوٹانے کی۔“

”لوٹنا پڑتا ہے میڈم..... کبھی اپنے لیے کبھی اپنے پیاروں کے لیے۔ بھانجے کا کیا حال ہے؟“

”اس معصوم کو تو ہوش ہی نہیں کہ وہ کتنی بڑی دولت کھو بیٹھا ہے۔“

”مانی کی طرح!“ غزالہ کے لہجے میں کرب تھا۔ ”جب بڑا ہوا اور کچھ سمجھ آئی تو مجھ سے پوچھا کرتا تھا سب بچوں

کے ڈیڈی ہیں میرے کیوں نہیں ہیں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی کہ اس کے ڈیڈی اللہ میاں کے پاس چلے گئے

ہیں۔ وہ مجھ سے ڈھیروں سوالات کرتا۔ ڈیڈی اللہ میاں کے پاس کیوں چلے گئے؟ کب آئیں گے؟ وہاں کیا کرتے

ہیں؟ ان کا گھر کیسا ہے؟ ان کی صورت کیسی ہے؟ مجھے اس کے سوالات کے لئے سیدھے جوابات گھڑنا پڑتے۔ جب



ناصر سے میرا نکاح ہو گیا تو ایک روز ان سے بولا ڈیڈی آپ اللہ میاں کے پاس کیوں چلے گئے تھے؟ ناصر نے سُننا کر پہلے اسے دیکھا پھر مجھے دیکھنے لگے میں نے انہیں بتایا کہ یہ مجھ سے پوچھا کرتا تھا کہ میرے ڈیڈی کہاں ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اللہ میاں کے پاس۔ ناصر نے اسے پیار کیا اور بولے ہاں بیٹا میں صرف تمہارے لیے اللہ میاں کے ہاں سے واپس آ گیا ہوں۔ میڈم آپ تصور نہیں کر سکتیں کہ اس لمحے مانی کے چہرے پر کیسی مسرت اور فخر کا احساس تھا اور اسے خوش دیکھ کر میرے اپنے دل پر کیسی ٹھنڈک سی پڑ رہی تھی..... میڈم جی انشا اللہ آپ کی بہن اور ان کے معصوم بچے کے لیے بھی اللہ میاں نے کوئی خوشی ضرور محفوظ رکھی ہوگی۔“

”انہیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔“

”ضرور..... اچھا میڈم یہ بتائیں امتحانات کے لیے اسٹیشنری کا آرڈر دے دیا جائے؟“

”کل ایگزامینیشن کمیٹی کے ساتھ میٹنگ کے بعد..... گزشتہ امتحانات میں، میں نے دیکھا تھا سپلائی نے خاصی ناقص اسٹیشنری سپلائی کی تھی۔ کاغذ پر روشنائی بری طرح پھیل رہی تھی۔ اسٹیشنری دیکھ بھال کر خریدی جائے اور ہاں جوابی کاپیاں کھلی حالت میں ٹیچرز کے ہاتھوں میں تھمانے کے بجائے بڑے خاکی لفافوں میں ڈال کر ان کے حوالے کی جائیں تاکہ کوئی کاپی کم ہونے کا احتمال نہ رہے۔ لفافے پر جماعت اور مضمون لکھنے کے ساتھ اس جماعت میں بچوں کی کل تعداد، امتحان میں حاضر طلبہ کی تعداد اور غیر حاضر اگر کوئی ہے تو ضرور درج کیا جائے۔“

غزالہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

”آپ ہمارے پھو ہڑپن کو خوش سلیقگی عطا کرنا چاہتی ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں غزالہ! اصل میں، میں ایک بہت اچھے منتظم ادارہ کی رہنمائی میں کام کر کے آئی ہوں۔“

”اظہر فاروقی صاحب؟“ غزالہ نے تائید طلب لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں..... بہت اچھے منتظم ہیں وہ اور انتہائی فعال اور متحرک۔ گورنمنٹ منٹ کے نزدیک ہیں مگر ان کی مستعدی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ادارے کی چھوٹی چھوٹی جزییات کو بھی انتہائی اہمیت دیتے ہیں اور ادارے کو ساکن رکھنے کی بجائے متحرک رکھنا چاہتے ہیں۔ گاہے گاہے دوسرے تعلیمی اداروں کا دورہ کرتے ہیں اور جہاں کوئی اچھی بات پاتے ہیں اسے اپنے ہاں بھی رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں چاہوں گی کہ آپ بھی کسی روز اپنی ایگزامینیشن کمیٹی کو کئی اسکول لے کر جائیں اور ان کے طریقہ امتحان سے آگہی حاصل کریں۔“

”ضرور میڈم..... یہ تو بڑا اچھا آئیڈیا ہے۔“

”میں فاروقی صاحب سے بات کر لوں گی۔“

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ منجہا نے ریسیور اٹھاتے نے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”اچھا میڈم میں ذرا ایگزامینیشن کمیٹی کو کل کی میٹنگ کے بارے میں بتا دوں۔“ غزالہ نے اٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”اوکے۔“ منجہا نے کہا اور ریسیور کان سے لگا کر بولی ”ہیلو“

”نفسہ!“ دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔

”ہاں..... نفسہ..... کیسی ہو؟“ منجہا قدرے آرام دہ انداز نشست اختیار کرتے ہوئے بولی۔

”رائیل کو بہن کی بہت خواہش تھی بہن آگئی ہے۔“

”مبارک! آئی ایم سوسوری ڈیر، کافی دنوں سے تم سے بات ہی نہیں ہو پائی۔“

”کوئی بات نہیں۔ تم بیہ کی وجہ سے ڈسٹرب جو ہو۔“

”پتلی کتنے دن کی ہے؟“  
 ”آج صبح ساڑھے چار بجے ہوئی ہے۔“  
 ”اوہ ریلی! تمہیں تو پھر ہاسپٹل میں ہونا چاہیے۔“  
 ”ہاں، ہاسپٹل ہی میں ہوں۔“  
 ”دوہیں جہاں رجسٹریشن کرایا تھا؟“

”ہاں۔“  
 ”گھر سے کوئی ہے تمہارے پاس؟“  
 ”ہاں چھوٹی بہن ہے۔ اسی کے موبائل سے بات کر رہی ہوں۔ وہ چائے پینے کے لیے کینٹین گئی ہے۔ جاتے ہوئے اپنا موبائل مجھے دے گئی۔ میرا جی چاہا کسی اپنے سے بات کرنے کو میں نے تمہارا نمبر ملا لیا۔“  
 ”منتہا کو اس کی آواز میں آنسو گھلے محسوس ہوئے۔“  
 ”منتہا بھائی کو مس کر رہی ہو؟“  
 ”تم سے کس نے کہا؟“  
 ”تمہاری آواز نے۔“

”کہتے ہیں منتہا میاں بیوی کا رشتہ قربت کا رشتہ ہوتا ہے مگر..... یہ کیسی قربت ہے اور کیسا رشتہ! درد شروع ہونے کے بعد کل آٹھ بجے شب میں اپنا بیگ لے کر اکیلی ہاسپٹل پہنچی اور یہاں سے بہن کو فون کیا کہ اگر آ سکتی ہو تو اس وقت آ جاؤ ورنہ صبح آ جانا۔ آخراں کا بھی تو اپنا گھر، شوہر، بچے اور ذمے داریاں ہیں۔“  
 ”تم ہاسپٹل میں اکیلی گئیں!“ منتہا نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں تو پھر کیا کرتی۔ درد جو شروع ہو چکے تھے۔ رائیل کو میں اکیلا چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ راول کو اسی کے پاس رہنا تھا۔ ویسے بھی یہ اچھا کب لگتا کہ میں بچوں میں سے کسی کو ساتھ لے کر ہاسپٹل پہنچتی۔ خیر نمٹ گئی اس مرحلے سے بھی۔“  
 ”بہن کب پہنچیں تمہارے پاس؟“

”اس کے شوہر کی بڑی مہربانی رات ہی پہنچا گیا تھا اسے لیکن..... لیکن منتہا..... مجھے..... اس وقت اس بے مروت آدمی کی بھی تو ضرورت تھی۔“ فضا کی آواز رندھ گئی۔

”فارگٹ ہم فضا..... اس کا خیال ہی دل میں مت لاؤ۔“

”تم نہیں سمجھ سکتیں منتہا۔“

”کیا! کیا نہیں سمجھ سکتی۔“

”آئی نیڈ ہم..... میں نے مختار کی کمی، اس کی عدم موجودگی شدت سے محسوس کی..... شاید ہر عورت اس موقع پر اپنے مرد کو اپنے نزدیک دیکھنا چاہتی ہے۔“ فضا کے لہجے میں رقت تھی۔

”لیکن اب تو وہ مرحلہ بھی گزر چکا ہے فضا..... ریلیکس۔“

”ہاں..... اب تو وہ مرحلہ بھی گزر گیا لیکن اب..... میرے ارد گرد..... نوزائیدہ بچوں کے باپ آرہے ہیں جارہے ہیں۔ اپنے اپنے بچوں کو دیکھتے ہیں چومتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، ان کی بیویاں انہیں غرور سے دیکھتی ہیں اور میں..... میں تصورِ حسرت بنی کبھی کن آنکھیوں سے انہیں کبھی اپنے نزدیک پگاڑے میں لپیٹی بچی کو دیکھنے لگتی ہوں۔ جو دنیا میں آنے کے بعد سے اب تک جتنی مرتبہ بھی روئی ہے مجھے اس کی آواز میں کرب محسوس ہوا ہے۔“  
 فون پر فضا کے گھٹ گھٹ کر رونے کی آواز سنائی دی۔



”ایزی..... ایزی فضہ..... تمہارے آس پاس لوگ دیکھ رہے ہوں گے..... کیا سوچیں گے!“  
 ”میں نے چادر ڈھانپ لی ہے منہ پر.....“ فضہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔  
 منتہا کا دل اس کے لیے بے حد دکھ رہا تھا۔

اقبال ہوتے تو دیکھتے کہ وہ عورت جسے انہوں نے تصور کائنات کا رنگ قرار دیا تھا، کیسے کیسے درد سہتی ہے!  
 فرحان کو تو دست اجل نے اچک کر یہیہ کونو جوانی میں بیوگی کا لبادہ اوڑھا دیا تھا یہ بیوگی کی کون سی قسم تھی کہ فضہ شوہر کے زندہ ہوتے ہوئے بھی اسے رو رہی تھی!  
 اس روز اسکول سے واپسی پر منتہا گلہ ستہ اور تہنیتی کا رڈ لیے فضہ کے پاس جا پہنچی۔

☆☆☆

نعیم سے مسز ظہیر کے گھرانے کی کشیدگی نے منتہا اور اس کے گھر والوں کو بھی الجھن میں ڈال رکھا تھا۔  
 الجھن میں تو شاید خود مسز ظہیر کا اپنا گھرانہ بھی تھا۔

نعیم جس سے انہیں فرحان کی موت کے سلسلے میں شکایتیں حکایتیں پیدا ہوئی تھیں اس گھر کا فرد تھا جہاں ان کی اپنی بیٹی بیاہ کر گئی ہوئی تھی۔ لیکن جب میکے آتی اپنی سسرال سے میکے والوں کے گلے شکوے دور کرانے کے لیے حتی الامکان سسرال کی وکالت کرتی۔

”امی دیکھئے نا، نعیم بھائی نے جان بوجھ کر تو حادثہ نہیں کیا ہوگا بس اتفاقی امر تھا۔“  
 ”ہم جانتے ہیں۔“

”تو پھر نعیم بھائی سے ناراضی کیوں؟ اچھی ممانی بے چاری بھی خواہ مخواہ مجرم بنی ہوئی ہیں۔“

مسز ظہیر سے نجات پائیں خود ضرورت اور اسرار نظر آئیں



**نیو کیلورک سلیم سسٹم**  
 نددوائی۔ نہ ورزش نہ سائیڈ ایفیکٹ  
 کی مدد سے صرف 30 دن میں  
 آپ اپنا 15 سے 20 پاؤنڈ وزن  
 اور 5 انچ کمر کم کریں۔

**نسوانی حسن کی نشوونما کیلئے**  
 100% گارنٹی  
 خواتین لیڈی انٹرکمز کی زیر نگرانی  
 3in1 امریکن انشرومنٹ سے اپنے  
 نسوانی حسن کو پُرکشش اور جاذب نظر بنائیں

**فرنج سلمنگ سینٹر**  
 قیمت 3000 SUNDAY  
 لانف ٹائم گارنٹی OPEN

**ہوم ڈیلیوری سروس**  
 500 روپے کی خصوصی روایت  
 محدود مدت کیلئے

مٹی آرڈر بھیج کر بذریعہ TCS منگوائیں

پلاٹ نمبر 2، پلاٹ C-26، سٹریٹ 14، لین 4، خیابان شیریڈینس فیر V، کراچی۔ وقت المیہ کیساتھ

**Ph: 021-5849778-0300-9220520**

”اٹھی بھالی ہے چاری کا کیا قصور۔“

”بب آپ یہ بھی مانتی ہیں کہ حادثہ اتفاقی امر تھا یہ بھی کہتی ہیں کہ اٹھی ممانی کا کوئی قصور نہیں تو پھر ناراضی کیوں؟“

”ہم تو ناراض نہیں ہیں۔ شروع میں ضرور یہ صدمہ تھا کہ حادثہ نعیم کی تیز رفتاری کی وجہ سے پیش آیا۔ یہ قصہ بھی تھا کہ نعیم اور نعیم نے ہمیں بروقت اطلاع کیوں نہیں دی مگر رفتہ رفتہ دل کو قرار آ گیا۔ صبر کر لیا ہم نے کہ شیت ایز دی ہی تھی۔“

”تو پھر آپ پہلے کی طرح اٹھی ممانی سے گرم جوشی سے کیوں نہیں پیش آتیں۔ نہ پہلے کی طرح روزانہ فون کرتی ہیں۔ کئی کئی دن ہو جاتے ہیں آپ کو ہمیں بھی فون کیے۔“

”تمہارے ابو اس حقیقت کو اب تک تسلیم نہیں کر پارے ہیں کہ وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ اور نعیم کے ہمیں بروقت اطلاع نہ کرنے میں خدا نخواستہ کوئی بد نیتی شامل نہیں تھی۔ اپنے ابو کی ضدی طبیعت سے تم تو واقف ہی ہوتا۔“

”تو کیا اگر ابوساری زندگی یہ حقیقت تسلیم نہیں کر پائے تو دونوں گھرانوں میں یوہی دوری رہے گی۔ مجھے ابھما نہیں لگتا امی۔ میرے لیے تو آپ لوگ بھی اہم ہیں اور نعیم اور ان کے گھر والے بھی۔ کاش! میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو..... میں ان حالات میں تو اس گھر جانے سے انکار کر دیتی۔ کبھی کبھی تو میں بھی شرمندہ ہونے لگتی ہوں اچھی ممانی سے بھی اور نعیم بھائی اور نعیم سے بھی کہ ہم لوگ ان باتوں کو ناراضی کا جواز بنائے بیٹھے ہیں جن پر انسان کا کوئی زور کوئی بس نہیں۔ حادثہ ہونا تھا اسی طرح ہونا تھا۔ فرحان بھائی کی موت اسی طرح لکھی تھی۔“

”ہم جانتے ہیں مگر یہ بات تمہارے ابو کو کون سمجھائے۔ ان کے ساتھ زیادہ بحث و تحیص کی نہیں جاسکتی۔ اعصابی مریض ہیں۔ ذرا سی دیر میں ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ برس ہا برس ان کی بیماری کے ساتھ جس طرح ہم نے زندگی گزاری ہے ہم ہی جانتے ہیں۔ فرحان کے انتقال کے بعد ملازمت کو دوبارہ خیر باد کہہ بیٹھے مگر ہم اسی کو بہت نفیست سمجھتے ہیں کہ وہ پہلے کی طرح بستر پر نہیں پڑے ہیں۔ چلتے پھرتے اور لوگوں سے بات چیت کر لیتے ہیں۔ مٹا ان کی زندگی کا محور بن گیا ہے کو یا۔“

”کوشش کریں امی کسی طرح حالات بہتر ہو جائیں۔ میں بٹ کر نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ لوگ بھی عزیز ہیں اپنا گھر بھی۔“ لیلیٰ رو ہلکی ہو گئی۔

”وقت گزرنے کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کتنا وقت؟“

”یہ ہم نہیں جانتے۔“

دہی سے نعیم اور نعیم بھی گا ہے گا ہے مسز ظہیر کے ہاں فون کرتے رہتے۔ مسز ظہیر ان سے بات کر لیتیں۔ دونوں بیٹے تھے اور نعیم سے تو دامادی کا رشتہ بھی تھا۔ ان کا فون آتا تو ظہیر صاحبہ شدید خفگی کا اظہار کرتے۔

”ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کو اب کیوں فون کرتے ہیں یہ لوگ بار بار؟“ غصے کے مارے میں ان کی آنکھیں اٹنے لگیں۔

مسز ظہیر کبھی چپ رہتیں کبھی انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ جو کچھ ہوا اسے خدا کی رضا جان کر صبر کر لیں۔ اس رو بھی وہ نعیم کا فون آلے پر خفا ہوئے۔

”یہ بد معاش اب کیوں فون کرتا ہے یہاں؟“

”رشتے داری ہے ظہیر صاحب۔ دوہری رشتے داری امار اسد حیانہ بھی ہے وہ۔“





بینی احمد، لائینز ایریا کراچی

## غزل

یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ دانائی  
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہر جائی  
جذبوں کے سمندر میں ہوتی ہے شام سے کیوں یہ طغیانی  
یادوں کے ریلے اور دشت چہروں کے ہولے، تنہائی  
ہیں چاہنے والے میرے بھی دنیا کو مگر معلوم نہیں  
ہر غم کو مجھ سے محبت ہے ہر دکھ ہے میرا شیدائی  
میں اس کا رستہ کیوں دیکھوں میں اس کے پیچھے کیوں جاؤں  
میرا بھی شخص ہے کوئی ہے مجھ میں بھی تو رعنائی  
اس رنگ دبوکی دنیا میں ہر سمت نظارے بکھرے ہیں  
اک پھول ہی یہ موقوف نہیں گلشن میں بہت ہے زیبائی

ہے جرم محبت گر بینی وہ بھی تو شریک جرم رہا  
کیوں لوگ مجھے بدنام کریں کیوں یک طرفہ ہو رسوائی

”ختم کر دوں گا اس رشتے کو بھی۔“

مسز ظہیر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”لیلیٰ آجائے اب کی بار گھر نہیں جانے دوں گا اسے وہاں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں؟“

”خدا کی قسم نہیں جانے دوں گا اسے۔“ ظہیر صاحب کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور غصے کی حالت میں ان کا پورا

جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

لیلیٰ کو پتا چلا تو اس نے کہا ”میں وہاں آؤں گی ہی نہیں۔“

”ہم پر کیا گزرے گی یہ سوچا۔“ مسز ظہیر رو ہانسی ہو رہی تھیں۔

”امی آپ خود سوچئے خدا خواستہ ابو نے ہمیں گھر بٹھالیا تو کیا ہوگا۔ ہم اپنا گھر کسی قیمت پر برباد نہیں کرنا

چاہتے۔ نعیم ہمارے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ اچھے تو نعیم بھائی بھی بہت ہیں بس بد قسمتی کہ یہ سب کچھ ہونا تھا۔“

☆☆☆

نعیم فون پر ملتہا اور اس کے گھر والوں سے بھی وقتاً فوقتاً بات کرتا رہتا۔ ان سے اسے بیہ اور اس کے بچے کے

حالات بھی پتا چلتے رہتے۔

اس شام بھی اس کا فون آیا ہوا تھا اور ملتہا اس سے بات کر رہی تھی۔

”سنا ہے بیہ بھابی کی عدت آئندہ ہفتے ختم ہو رہی ہے؟“ نعیم نے کہا۔

”جی ہاں۔“

”پھر کیا پروگرام ہے؟“



میں نے احمد، لائیزا میریا کراچی

ہے جرم محبت گریختی وہ بھی تو شریک جرم رہا  
کیوں لوگ مجھے بدنام کریں کیوں ایک طرف ہو رسوائی

## غزل

یہ میری عقل کا دھوکا ہے یا اس کی ہے یہ دانائی  
میں بیٹھ گئی اک منزل پر، وہ منزل منزل ہر جا کی  
جذبوں کے سمندر میں ہوتی ہے شام سے کیوں یہ طغیانی  
یادوں کے ریلے اور دشت چروں کے ہولے، تہائی  
ہیں چاہنے والے میرے بھی دنیا کو مگر معلوم نہیں  
برغم کو مجھ سے محبت ہے ہر دکھ ہے میرا شیدائی  
میں اس کا رستہ کیوں دیکھوں میں اس کے پیچھے کیوں جاؤں  
میرا بھی شخص ہے کوئی ہے مجھ میں بھی تو رعنائی  
اس رنگ دبو کی دنیا میں ہر سمت نظارے بکھرے ہیں  
اک پھول ہی یہ سوقوف نہیں گلشن میں بہت ہے زیبائی

”ختم کر دوں گا اس رشتے کو بھی۔“

مسز ظہیر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”لیلیٰ آجائے اب کی بار گھر نہیں جانے دوں گا اسے وہاں۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں؟“

”خدا کی قسم نہیں جانے دوں گا اسے۔“ ظہیر صاحب کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور غصے کی حالت میں ان کا پورا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

”لیلیٰ کو پتا چلا تو اس نے کہا ”میں وہاں آؤں گی ہی نہیں۔“

”ہم پر کیا گزرے گی یہ سوچا۔“ مسز ظہیر رو ہانسی ہو رہی تھیں۔

”امی آپ خود سوچئے خدا خواستہ ابو نے ہمیں گھر بٹھالیا تو کیا ہوگا۔ ہم اپنا گھر کسی قیمت پر رہا نہیں کرتا چاہے۔“ نعیم ہمارے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ اچھے تو نعیم بھائی بھی بہت ہیں بس بد قسمتی کہ یہ سب کچھ ہونا تھا۔“

☆☆☆

نعیم فون پر ملتہا اور اس کے گھر والوں سے بھی وقتاً فوقتاً بات کرتا رہتا۔ ان سے اسے مینہ اور اس کے بچے کے حالات بھی پتا چلتے رہتے۔

اس شام بھی اس کا فون آیا ہوا تھا اور ملتہا اس سے بات کر رہی تھی۔

”سنا ہے مینہ بھابی کی عدت آئندہ ہفتے ختم ہو رہی ہے؟“ نعیم نے کہا۔

”جی ہاں۔“

”پھر کیا پروگرام ہے؟“

KSK Silsilay-War Novels

02-SEP-2022

NOVEMBER.2003 OPAKEEZA O63



MESSAGE KSK SILSILAY-WAR NOVELS



1

Photo saved to this device



Like



Comment



Share



”اس بے چاری کے تو سارے پروگرام دھرے رہ گئے۔“  
 نعیم نے ایک سرد آنکھیں کھینچی ”ہم انسان مجبور محض ہیں منہا، سوچتے کچھ ہیں اور ہو کچھ جاتا ہے۔ آپ کی اور میری  
 منگنی سے امی جان اتنی خوش تھیں کہ میں نے خود کو شرمندہ محسوس کیا کہ کیوں انہیں اتنے عرصے اس خوشی سے محروم رکھا!  
 کیوں اتنی تاخیر کی! ارادہ تھا کہ شادی میں غیر ضروری تاخیر نہیں کروں گا مگر..... وہی بات کہ انسان کچھ سوچتا ہے خدا  
 کچھ چاہتا ہے۔ فرحان کی ڈیڑھ کے بعد مجھے بار بار حضرت علیؑ کا وہ قول یاد آتا ہے کہ میں نے اللہ کو اپنے اردوں کے  
 ٹوٹنے سے پہچانا۔“  
 منہا کا دل دکھنے لگا۔

ایک حادثے نے کتنے بہت سے لوگوں کو دل گیر کر رکھا تھا۔  
 اس حادثے کی وجہ سے علیب کی شادی کا پروگرام بھی درمیان ہی میں رہ گیا تھا۔ ورنہ شاید اب تک اس کی دلہن  
 اس گھر کے روز و شب سے مانوس بھی ہو چکی ہوتی اور کیا عجب کہ وہ خود بھی نعیم کے ساتھ زندگی کے ایک نئے سفر پر  
 گامزن ہو چکی ہوتی۔

”میں بھی صرف می کے اطمینان اور خوشی کے لیے شادی پر آمادہ ہوئی تھی۔“  
 ”ورنہ؟“  
 ”ورنہ شاید کبھی ہاں نہ کرتی۔“

”چلے یہ اچھا ہوا کہ آپ نے ہاں کر دی۔“ نعیم کے لہجے میں اچانک ہی شگفتگی کا احساس ہوا ”امی جان فرحان  
 کے انتقال کے بعد سے خاصی ڈسٹرب ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ بہ بھالی گی عدت ختم ہونے کے بعد مناسب وقت دیکھ کر  
 شادی کا پروگرام طے کر لیا جائے اور شادی کے بعد آپ، لیلیٰ اور امی جان تینوں کو یہیں بلا لیا جائے۔“  
 ”اوہ نو..... ابھی نہیں۔“ وہ ہنسا کر بولی۔  
 ”کیوں؟“

”یہ کچھ بہتر ہو جائے۔“

”آپ نے انہیں بتایا کہ میری اور نعیم کی خواہش ہے کہ ایک بار یہاں آ کر وہ یہ ضرور دیکھیں کہ فرحان نے اُن  
 کے اور اپنے بیٹے کے استقبال کے لیے کیا تیاری کر رکھی تھی؟“ وہ استغہامیہ لہجے میں بولا۔  
 ”ہاں، آپ نے مجھ سے کہا تھا مگر ہمت نہیں ہوئی۔ غالباً مسز ظہیر نے اسے بتایا ہے۔“  
 ”آپ رشتے داری کے باوجود انہیں بڑے تکلف سے مسز ظہیر کہتی ہیں۔“  
 ”ان کے سامنے تو اب ہمت نہیں ہوتی پیچھے کہہ دیتی ہوں۔ وہ میری محسن ہیں۔ بہت احترام ہے اُن کا میرے  
 دل میں۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ آج کی مادہ پرست اور خود غرض دنیا میں کون کے اپنا محسن مانتا ہے۔ آپ کی یہی  
 باتیں میرے دل میں آپ کی محبت میں اضافہ کیے چلی جاتی ہیں۔“  
 وہ صرف محبت نہیں محبت میں اضافے کی بات کر رہا تھا!  
 یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی اور نہ ہی اس کا پھیلاؤ۔  
 آپ ہی آپ، غیر محسوس طریقے پر اس کے اپنے دل میں بھی نعیم کی محبت روز بروز اپنا پھیلاؤ بڑھاتی جا رہی تھی!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

# KSK Novels

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا۔ دکھ تو دکھ ہے۔ جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امانڈ پڑتا ہے۔ سو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے بھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تہنہ نہیں دیتے بلکہ اکے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کارش ہے، جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گہری تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گدھے اور یقیں سے بندھے رشتوں کے چاکلے سہارے کی دل گداز داستان

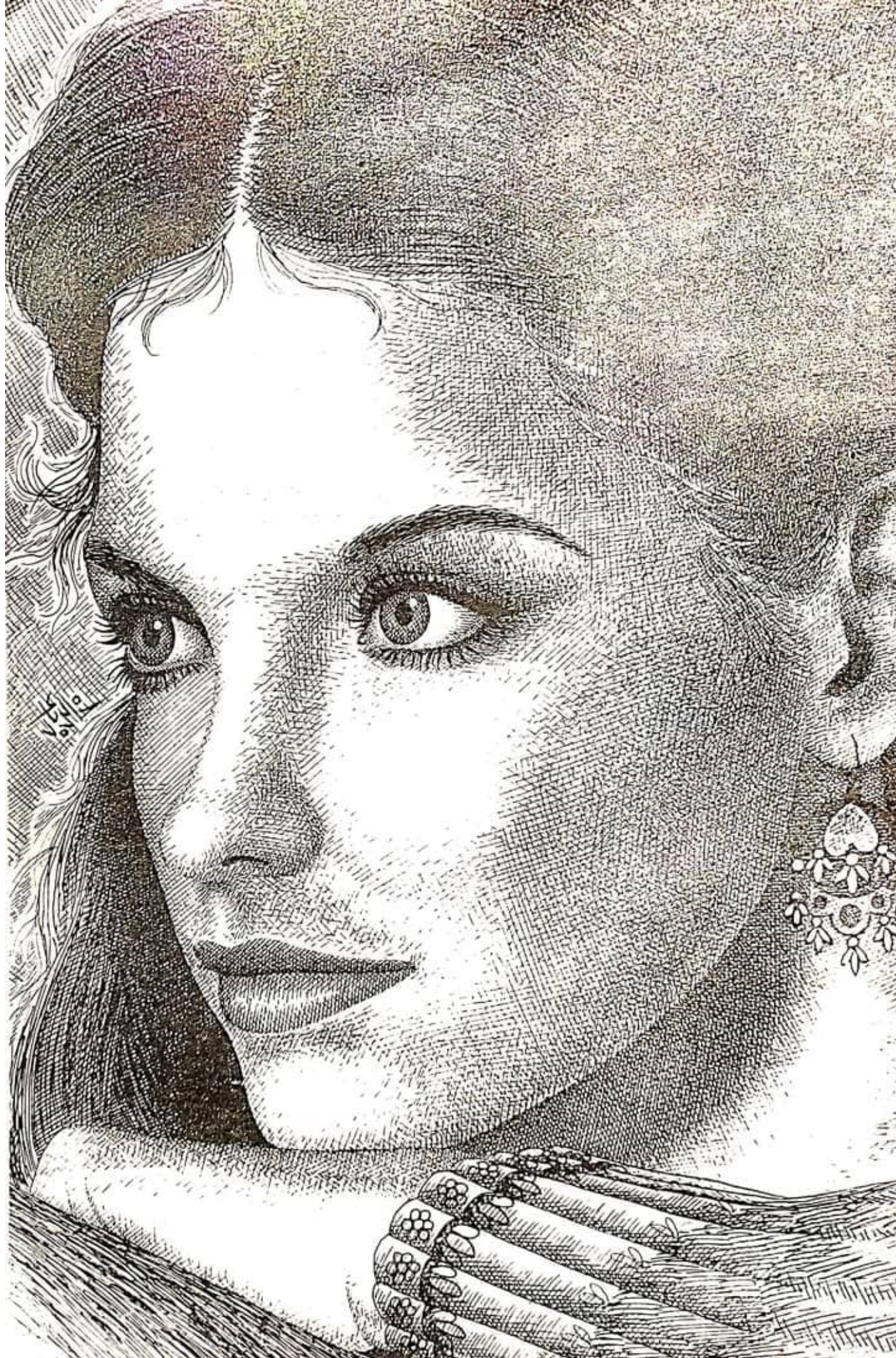
منتہا

ناہید سلطانہ اختر

قسط نمبر 18









یہ بات منہا بھی اچھی طرح جانتی تھی اور خود مہتاب بھی کہ اس کے تبادلے کی درخواست محض ایک ناک تھا۔ تبادلے کی درخواست داغ کر وہ منہا کو گویا بلیک میل کرنا چاہتا تھا کہ اسے باغیچہ ہٹانے کے لیے نہ کہا جائے مگر منہا نے دباؤ میں آنے کے بجائے خود مہتاب کو دباؤ میں لینے اور آئندہ کے لیے نہ صرف اسے بلکہ اوروں کو بھی اس قسم کی بلیک میلنگ سے باز رکھنے کے لیے مہتاب کی درخواست ڈائریکٹریٹ بھجوا دی۔ وہ جانتی تھی، اس قسم کی درخواستوں پر درخواست دہندہ کی خواہش کے مطابق کارروائی ہونے میں کچھ نہیں بلکہ کافی وقت لگتا ہے۔ اسے یقین تھا، مہتاب اپنی درخواست ڈائریکٹریٹ بھجوائے جانے کی خبر ملتے ہی ہوش کے ناخن پکڑے گا اور درخواست واپس لینے کے لیے معافی تلانی کرے گا اور وہ اسے زبردستی کے بعد ڈائریکٹریٹ کو ایک سفارشی خط ارسال کر کے مہتاب کی درخواست تبادلہ منسوخ کروادے گی۔

مگر یہ سب کچھ ہونے سے پہلے ہی ڈائریکٹریٹ نے مہتاب کے تبادلے کے احکامات صادر کر دیے۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ درجہ چہارم کے کسی ملازم کی دوسرے ادارے میں تبادلے کی درخواست پر اتنی جلدی کارروائی عمل میں آ گئی تھی۔ مہتاب تو حواس باختہ ہو کر رہ گیا بلکہ وہ کیا اس کے بیوی بچے بھی! سو طرح کی آسانیاں تھیں یہاں۔ اس کے پانچوں بچے پرائمری اور ہائی اسکول کی مختلف جماعتوں میں زیر تعلیم تھے۔ ان کی نہ صرف فیسیں معاف تھیں بلکہ کتابوں، کاپیوں، یونیفارم اور دیگر چھوٹے موٹے تعلیمی مصارف بھی ان دونوں اسکولوں کی استانیاں کا رخیہ سمجھ کر خوشی خوشی برداشت کرتی تھیں۔ مہتاب کے تبادلے کا مطلب تھا پانچوں بچوں کی بھی خواری۔ کون جانے نئے اسکول میں کس قسم کے حالات کا سامنا ہوتا۔

”اور دے تبادلے کی درخواست!“ سب سے پہلے تو مہتاب کی بیوی نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”نیک بخت، میں نے کوئی اس لیے دی تھی درخواست“ وہ منمنایا۔

”تو پھر کس لیے دی تھی؟“

”میں تو میڈم کو ذرا رعب میں لینا چاہتا تھا۔“

”لے لیا رعب میں!“ مہتاب کی بیوی استہزائیہ لہجے میں بولی۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ سچ مچ تبادلہ ہو جائے گا۔“

”میں کب سے کہہ رہی تھی میڈم نے درخواست آگے بڑھا دی ہے، اسے رکوا مگر تیرے کان پر جوں ہی نہیں رہتی۔“

”بھاگو ان! اتنی جلدی تبادلہ کس کا ہوتا ہے۔“

”تیرا اور کس کا..... جا اب بھگت۔ جتنا آرام ہمیں اس جگہ ہے اور کہیں ہوگا بھلا۔ بچوں کا گھر بھی یہیں اسکول بھی یہیں۔ کواٹر سے نکلے اور اسکول پہنچ گئے۔ خود تیرے ہی منہ سے سنا ہے میں نے کہ جس اسکول میں تیری بدلی ہوئی ہے وہاں تو چوکیدار کا کواٹر بھی نہیں۔ کہاں رہے گا تو اور کہاں پڑیں گے ہم سب۔ اچھے بھلے بیٹھے ہوئے تھے، ایک بچے کے لیے تو نے بھرے گھر کو اجاڑ دیا“ مہتاب کی بیوی منہ پر دوپٹا رکھ کر سسکنے لگی۔

”نہ رو۔“

”تو پھر کیا کروں؟“ مہتاب کی بیوی نے آنکھوں پر سے دوپٹا ہٹا کر اسے خشمگین نگاہوں سے دیکھا۔

”کرنا ہوں میڈم سے بات۔“

”کیا بات کرے گا اب۔ اور وہ سنے گی کب..... وہ سنتی ہی کب ہے کسی کی..... ظالم عورت..... سارے تنگ

آئے ہوئے ہیں اس سے۔“

”تجھے کیسے پتا!“



”اسی چار دیواری میں رہتی ہوں۔ اسکول والوں سے زیادہ خبر رہتی ہے مجھے اسکول کی۔ تیری میڈم اور ٹیچرس تو چھٹی کے بعد گھروں کو چلی جاتی ہیں۔ میرا اسکول ان کے جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ آس پاس محلے کی عورتیں آتی جاتی رہتی ہیں میرے پاس چھٹی کے بعد۔ سب تنگ آئے ہوئے ہیں اس میڈم سے۔ پانچ منٹ صبح بچہ دیر سے اسکول پہنچا نہیں کہ اسکول گیٹ بند۔ تو بھی پاگل کا بچہ ہے جو گیٹ بند کر دیتا ہے۔“

”نیک بخت، میڈم کا آڈر جو ہے۔“  
 ”آڈر! گیٹ اس کے باپ کا ہے؟“  
 ”نی الحال تو ہے۔“

”ارے جارہے دے۔ ایسی نہ پہلے کبھی اس اسکول میں دیکھی نہ سنی۔ ٹیچرس پہلے مزے سے نوکری کیا کرتی تھیں۔ سردیوں میں کھٹا کھٹ سلائیوں پر سویٹر پہ سوئیٹر اتارتی تھیں۔ اب تو جسے دیکھو کلاسوں کی طرف دوڑتی بھاگتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ تیرے ارشد مسج کے ہاتھ سے تو جھاڑو اور یو چار اہی نہیں چھوٹا۔ گر وڈ سے کاغذ جن جن کر بے چارے کی کمر لٹ گئی ہوگی اور وہ آپا صغراں، بے چاری کبھی کوئی رجسٹر لیے کلاس کلاس گھومتی دکھائی دیتی ہے، کبھی دروازوں کی جھاڑو پونچھ کرتی دکھائی دیتی ہے، تو کبھی کھڑکیوں کے شیشے اخبار سے رگڑ رگڑ کر چکارہ ہی ہوتی ہے۔ سنا ہے میڈم دروازوں کھڑکیوں پر انگلی پھیر کر چیک کرتی ہے کہ دھول مٹی جی ہے یا نہیں۔“

”بڑی معلومات ہیں بھئی!“ مہتاب تبادلے کے صدمے کو بھول کر بیوی کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”ارے مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ ہر روز صبح اسمبلی کے بعد وہ ہاتھ روموں میں جا کر انہیں بھی سوگھتی ہے“ مہتاب کی بیوی رونا بھول گئی۔

مہتاب تہقہہ مار کر ہنس پڑا۔  
 ”ہاتھ روموں کو سوگھتی ہے؟“

”تو ہنسا کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”ارے نہیں نیک بخت، میں تو تیری معلومات پر حیران ہو رہا ہوں۔ کواٹر میں بیٹھی رہتی ہے مگر باہر کی پوری خبریں ہیں تجھے۔“

”ہاں مجھے ایک ایک بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ ابھی پرسوں ترسوں ہی تو میں نے دیکھا اسکول کی گاڑی میں ڈھیروں سامان آیا ہے بازار سے۔ جھاڑوئیں، پچارے، فی ٹیل کے ڈبے، جالے صاف کرنے والے ڈنڈے، دے پر، اور بڑا کچھ۔“

”تو نے کہاں سے دیکھا؟“

”اپنے کواٹر کی کھڑکی سے۔“

”بڑی ہشیار ہے۔“

”وہ تو میں ہوں۔“

”مگر میڈم سے زیادہ ہشیار نہیں ہو سکتی تو۔ اس نے تو اپنے بھائی اقبال کو بھی کنارے لگا دیا۔“

”آپا صغراں بتا رہی تھی اب تو اقبال بھی ڈھنگ کرتا ہے۔“

”ٹھیک سنا ہے تو نے۔ ارے ایسی بد نصیب عورت پلے پڑی ہے اس دفعہ کہ کسی کو دو گھڑی چین سے بیٹھے ہی نہ دیکھ سکتی ہے۔ دو دفٹے پہلے کسی کو بیچلے، کسی کو پھاؤ ڈا، کسی کو کینٹی اور کسی کو درانتی دے کر اس کام پر لگا رکھا تھا کہ اسکول سے جنگلی بڑی بوٹیوں کا صفایا کرنا ہے۔ اب سارے اس کام پہ لگے ہوئے ہیں کہ اسکول میں جہاں جہاں اینٹیں روڑے

پڑے ہیں انہیں ڈھوکر گراؤنڈ میں پہنچاؤ۔“

”کیوں؟“ مہتاب کی بیوی چونک کر بولی۔

”بچھلی بار جو بارش ہوئی تو گیٹ سے اندر بلڈنگ تک آنے والوں کو کچڑ سے گزر کر آنا پڑتا تھا۔“

”کون سی نئی بات! یہ تو برسوں سے ہو رہا ہے۔ گرونڈ بلڈنگ سے پتلی ہے، پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور گرونڈ میں

کچڑ بن جاتی ہے۔“

”سنا ہے میڈم نے ٹھیکے دار کو بلا کر پوچھا کہ گیٹ سے بلڈنگ تک راستہ پکا کروانے کا کیا خرچہ ہوگا، اس نے لبا خرچہ بتایا۔ بات ختم ہوگئی پر پچھلے دنوں جب گراؤنڈ کی صفائی اور جڑی بوٹیاں ہٹانے کا کام چل رہا تھا، میڈم کی نظر بلڈنگ کے پچھواڑے لمبی پڑی دیوار کی پرانی اینٹوں پر پڑ گئی۔“

”وہ جو تین چار سال پہلے بوئڈری کی دیوار گرنے کے بعد سے وہیں پڑی تھیں۔“

”ہاں وہی، میڈم نے آڈر کر دیا کہ دو کلاس فور انہیں ڈھوکر گراؤنڈ میں پہنچائیں اور دو ان اینٹوں کو زمین پر

جما جا کر بلڈنگ سے گیٹ تک راستہ بنائیں۔“

”ہا!“ مہتاب کی بیوی اپنے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے معترض ہوئی۔ ”یہ کیا بات ہوئی کلاس فور ہیں کوئی مزدور اور

راج مستری تو نہیں۔“

”نیک بخت، مجھے تو لگتا ہے پرانی چیزوں سے نئی بنوانا اس کا خاندانی پیشہ ہے۔ فرنیچر کا قصہ تو یاد ہے نا، اب گری ہوئی دیوار کے بلے سے نیا راستہ بنے گا جی! کہتی ہے اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنا سیکھیں، پیسہ خرچ کر کے دوسروں سے تو سبھی کام کروا لیتے ہیں، اصل مزہ اس میں ہے کہ آدمی کم خرچے میں اپنے زور بازو سے کام کر کے دکھائے۔“

”بات ہے تو ٹھیک..... دل کو لگتی ہے۔“

”لے بھئی، تو بھی اس کی حمایت میں ہو لی۔ بھاگوان، جب سے یہ عورت اس اسکول میں آئی ہے، اس نے لوگوں کو تنگ کر رکھا ہے۔ چین سے بیٹھا آدمی تو جیسے اسے چبھنے لگتا ہے۔ نہ خود آرام سے بیٹھتی ہے، نہ دوسرے کو آرام سے بیٹھنے دیتی ہے۔ چھلاوا بنی پھرتی ہے پورے اسکول میں۔“

”پھرے..... ہماری بلا سے..... پھٹنی کے بعد تو پورے کا پورا اسکول ہمارا ہی ہوتا ہے۔ تو اوروں کی فکر چھوڑ، کسی طرح اپنا تبادلہ رکوانے کی کورنہ بڑی مشکل ہو جائے گی۔ کسی نئی جگہ جا کر بیٹھو تو برسوں لگ جاتے ہیں قدم جمنے میں۔“

”ہاں، یہ بات تو سو فیصد ٹھیک ہے۔“

”میڈم سے جا کر معافی تلافی کر لے۔ اپنے مطلب کے لیے تو انسان گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔“

”ایک بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔“

”کیا؟“

”اپنے مطلب کے لیے انسان گدھے ہی کو باپ کیوں بناتا ہے، گدھے کو بھی تو ماں بنا سکتا ہے“ مہتاب نے معنی خیز لہجے میں کہا اور تہہ بہ مار کر ہنس دیا۔

☆☆☆

”ایکسکسڈ میڈم!“

ملتانے اسٹاف رول سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

غزالہ ناصر کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ ان کے عقب میں مہتاب تھا۔ جھجکا جھجکا، شرمندہ شرمندہ سا۔

”ہاں، غزالہ آئیے!“



غزالہ ناصر حسبِ عادت انکسار نہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر لیے اس کی میز کے نزدیک آ پہنچیں۔ مہتاب دروازے کے نزدیک ہی قہقہہ مچا رہا تھا۔  
 ”میڈم جی!“ غزالہ نے نظر اٹھا کر مہتاب کی جانب دیکھا اور بولیں۔ ”مہتاب آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔“

”ہاں..... کہو..... کیا بات ہے مہتاب؟“  
 مہتاب دست بستہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔  
 ”وہ میڈم جی!..... میں..... میں معافی چاہتا ہوں۔“  
 ”کس بات کی؟“

”میں نے آپ کی حکم عدولی کی۔ بچے کو نہیں ہٹایا..... اب ہٹا دوں گا جی! بالکل ہٹا دوں گا۔ صاف کر دوں گا اسے..... نام نشان نہیں رہنے دوں گا اس کا..... پر.....“

”میں ادھر ہی رہنا چاہتا ہوں۔ کہیں اور نہیں جانا چاہتا..... میرا تبادلہ رکوادیں جی..... ساری زندگی دعائیں دوں گا آپ کو“ مہتاب نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔  
 ”دیکھو مہتاب! تبادلے کی درخواست تو تم نے خود دی تھی۔“  
 ”غلطی ہوئی جی..... اب پیچھتا رہا ہوں۔“ وہ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔  
 ”یہ تو ہم میں سے اکثر انسانوں کی بد قسمتی ہے کہ ہم غلطی کر کے پچھتاتے ہیں۔ غلطی کرنے سے پہلے نہیں سوچتے۔“

”میڈم جی، شرمندہ ہوں“ مہتاب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔  
 ”بہر حال اب کیا ہو سکتا ہے تمہیں جانا تو پڑے گا۔“  
 وہ یوں چونکا جیسے بھڑنے کا ٹ لیا ہو۔  
 ”میڈم جی! آپ چاہیں تو میرا تبادلہ رک سکتا ہے۔ آڈر کنسل ہو سکتے ہیں۔“  
 اب منتہا چوکی۔

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں چاہوں تو آڈر کنسل ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائریکٹریٹ کا آرڈر ہے۔“  
 مہتاب نے دزدیدہ نگاہوں سے غزالہ کی جانب دیکھا پھر منتہا سے کہا ”ڈائریکٹریٹ آپ کی سنتا ہے جی۔“  
 ”اومامی گاڈ! کس قدر وثوق سے کہہ رہے ہو، تم یہ بات۔“ بھٹی میں بھی تمہاری طرح ڈائریکٹریٹ کی ایک ادنیٰ سی ملازم ہوں۔ اس کے احکامات کی پابند ہوں، کیوں غزالہ؟“ منتہا نے غزالہ سے اپنی بات کی تائید چاہی۔  
 غزالہ نے اس کی طرف دیکھا، اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں پھر بولیں ”میڈم جی! کہہ تو رہا ہے ٹھیک۔“  
 ”کیا!“ منتہا پھر بے ساختہ چوکی ”آپ بھی!“

”میڈم! بے چارہ غریب آدمی ہے۔ اس کے پانچوں بچے یہیں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے امتحان بھی نزدیک ہیں۔ بے چارے ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ یہاں تو دونوں اسکولوں کا اسٹاف مل ملا کر ان کے تعلیمی اخراجات کا بھی خیال رکھتا ہے۔ دوسرے اسکول میں نہ جانے کس قسم کے حالات ہوں۔“ غزالہ نے مہتاب کی جانب دیکھا اور سرزنش کرنے والے لہجے میں بولیں ”تم انتہائی نا عاقبت اندیش آدمی ہو مہتاب! بے سوچے سمجھے ٹرانسفر کی درخواست دے ڈالی، بچوں کا بھی خیال نہ کیا۔“  
 مہتاب کی آنکھیں پھر ڈبڈبائیں۔

”بس جی، بے وقوف کا بچہ ہوں میں۔“  
 ”نہیں اپنی گانٹھ کے تو تم پورے ہو۔ لعن طعن بھی کر رہے ہو تو خود کو نہیں اپنے باپ کو۔“  
 ”جی!“ مہتاب نے چونک کر منتہا کی جانب دیکھا۔  
 ”خود کو بے وقوف کا بچہ کہہ کر اپنے باپ کی توہین کیوں کرتے ہو۔“  
 ”سوری میڈم جی، آئندہ یہ غلطی نہیں ہوگی۔ میڈم جی، بچے کی باڑھ تو میں آج ہی نکال کر پھینکتا ہوں۔ بالکل لیبل کر دوں گا اسے۔“

”لیبل کر دوں گا!“ منتہا نے اس کے الفاظ دہرائے۔  
 ”میڈم جی! اس کا مطلب ہے لیول کر دوں گا“ غزالہ ناصر بولیں۔  
 ”میں سمجھ رہی ہوں“ منتہا نے لفظ بھر کو توقف کیا پھر بولی ”میں وعدہ تو نہیں کرتی تمہارا تبادلہ رکوانے کی بات کروں گی ڈائریکٹر سے اگر وہ مان گئے تو تمہاری قسمت۔“  
 ”مہربانی..... بہت بہت مہربانی میڈم!“ مہتاب سراپا تشکر بن گیا پھر قدرے لجاجت سے بولا ”ابھی بات کر لیں میڈم جی!“  
 ”دیکھو، میں نے تم سے جو بات کہہ دی ہے اس کا اعتبار کرو۔ مجھے یہ بتانے کی کوشش مت کرو کہ میں کیا اور کب کروں۔“

”سوری میڈم!“ وہ خفیف ہو کر بولا۔  
 غزالہ نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ دیا کہ وہ رخصت کی اجازت چاہے اور کمرے سے نکل جائے۔  
 مہتاب نے اس کے بموجب کیا۔  
 مہتاب کے جانے کے بعد منتہا نے مسکراتے ہوئے غزالہ کی طرف دیکھا اور بتایا ”ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب پندرہ دن کی چھٹی پر ہیں۔ میں انہی سے بات کروں گی۔“

☆☆☆

نبیہ کی عدت اور اس سلسلے میں اسے اپنے محکمے کی جانب سے سرکاری قواعد و ضوابط کے مطابق ملنے والی رخصت بھی ختم ہو گئی تھی۔ عدت کے بعد وہ میکے آئی تو مومی کو بے ساختہ وہ شام یاد آ گئی جب وہ فرحان کے پاس دبی جانے سے پہلے ایک دوروز میکے میں گزارنے کے لیے اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس روز وہ کتنی خوش تھی اور اس کا سراپا کتنا پر بہار لگ رہا تھا۔ بات بات پر اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔  
 ”باجی بھی شادی کے بعد وہیں آ جائیں گی تو ہم دونوں آپ کو بھی وہیں بلا لیں گے“ اس نے مومی سے کہا تھا۔

مگر تھوڑی ہی دیر بعد!  
 زندگی بدل گئی تھی۔  
 یکسر!

آف خدا! کتنا تکلیف دہ تھا وہ سب کچھ۔

عدت کے بعد اس نے اپنی ڈیوٹی ری زیوم کر لی تھی۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتی۔ گھر والوں، ہمدردوں اور یہی خواہوں کا مشورہ بھی یہی تھا کہ اسے اپنی ڈیوٹی ری زیوم کر لینی چاہئے۔

”بیٹا، یہ مت سمجھنا کہ ہمیں خدا نخواستہ تمہاری ملازمت سے کوئی دلچسپی ہے یا تمہاری ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتے ہم۔ ڈیوٹی ری زیوم کرنے کا مشورہ اس لیے دے رہے ہیں کہ گھر سے باہر نکلو گی تو دل کچھ پہلے گا۔ دوسروں کے دکھ اور مسائل دیکھ کر اپنے دکھ سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوگا“ مسز ظہیر نے اسے سمجھایا تھا۔



وہ خود بھی یہ سب کچھ جانتی تھی۔ اس کے تو کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دکھ، آزاری کا مستقل سامنا رہتا۔ مریضوں اور ان کے متعلقین کے مسائل و مصائب چارہ گروں کے دل بھی اکثر چاک کر دیتے۔

”منے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولی۔  
 ”ہم اور کون؟ تمہیں کیا پتا تم اور منّا فرحان کے بعد ہمارے لیے کس قدر قیمتی اثاثہ بن گئے ہو۔ اس دنیا میں تم دونوں ہمارے لیے ہمارے فرحان کا جیتا جاگتا حوالہ ہو۔“ مسز ظہیر دل گرفتہ ہو رہی تھیں۔  
 اس کا سر آپ ہی آپ ان کے شانے سے جا لگا۔

”ایک بات اور بیٹا!“ مسز ظہیر نے دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 وہ منتظر رہی کہ وہ آگے کچھ کہیں مگر وقفہ طویل ہونے لگا تو اس نے ان کے شانے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔  
 مسز ظہیر کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔

وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہ کر سکی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔  
 کچھ دیر بعد انہوں نے کٹھنی کٹھنی آواز میں کہا ”اس معاملے میں تم پر کوئی جبر کوئی سختی نہیں کہ تم منے کے ساتھ کہاں رہنے کا فیصلہ کرتی ہو۔ یہاں یا..... اپنے میکے میں..... تمہیں پورا اختیار ہے۔“  
 اس کا جی بھر آیا۔

”کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں..... میں وہاں چلی جاؤں؟“ وہ دھیرے سے بولی۔  
 مسز ظہیر نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا ”ہرگز نہیں..... ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں بیٹا“ ان کے لہجے میں معذرت خواہی تھی ”تم ایک پڑھی لکھی باشعور بیٹی ہو۔ ہم تمہیں تمہاری زندگی کے ہر معاملے میں فیصلے کا اختیار تمہی کو سونپنا چاہتے ہیں۔“

”میں یہیں رہوں گی امی..... کہیں نہیں جاؤں گی۔“  
 ”ہمارا دل ٹھنڈا رہے گا..... جیتی رہو۔“

اسے خیال ہوا کہ فرحان بھی اس لیے تو اتنا اچھا تھا کہ وہ اتنی مہربان اور دوسروں کے احساسات و جذبات کا خیال رکھنے والی ماں کا بیٹا تھا!

ڈیوٹی دوبارہ شروع کر دینے کے مثبت اثرات جلد ہی سامنے آنا شروع ہو گئے۔ گھر سے باہر جانا ہوتا تو اپنے حلیے کا بھی خیال رکھنا پڑتا۔ عدت کے دوران..... تو بعض دفعہ دو دو تین تین دن اس نے بالوں میں لکھی کا خیال نہ کیا تھا۔ اکثر مسز ظہیر یا مبی برش لے کر اس کے بال سنوارنے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ وہ تو دن بھر اپنے غم کے حصار میں چپ چاپ بیٹھی رہا کرتی تھی۔ اب گھر سے باہر جاتی تو فرائض منصبی کی انجام دہی میں اسے اپنا دکھ اکثر یاد ہی نہ رہتا۔ لوگوں کے دکھ اور مصائب کا ہجوم اپنے بارے میں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیتا۔ ابھی سینئر ڈاکٹر کے ساتھ راولپنڈی پر جانا ہے۔ اب فلاں مریض کو دیکھنا ہے۔ فلاں کی کچھ معاشی مدد بھی کرنی ہے۔ آج اولیٰ ڈی ہے تو کل آپریشن ڈے۔ ہر وقت ایک بھاگ دوڑ ہمہ وقت مصروفیت رہتی۔ اسپتال پہنچ کر تو جیسے وہ خود کو، گھر کو، حتیٰ کہ منے کو بھی بھول جایا کرتی تھی۔ مصروفیت کے دوران میں کبھی فرصت مل جاتی تو وہ گھر فون کر لیتی۔

”منّا کیسا ہے؟“

”ماشاء اللہ ٹھیک ہیں۔ ماما کا انتظار کر رہے ہیں منے میاں!“ مسز ظہیر کہتیں۔

کال ظہیر صاحب ریسیو کرتے تو بڑی گرم جوشی سے کہتے ”منے سے آپ خود بات کیجئے بہو صاحب!“  
 ظہیر صاحب ماؤتھ پیس منے کے منہ کے سامنے کر دیتے۔ پس منظر سے ان کی اپنی آواز آتی رہتی۔  
 ”ہاں جناب، بات کیجئے ماما سے..... آداب کیجئے..... پوچھئے کیسی ہیں آپ؟ یار، کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے

بٹھے ہو! بولونا بھی، اماں والدہ ہیں تمہاری..... دیکھو بول دو ورنہ ہم تمہاری یہ ساری سنجیدگی نکال دیں گے..... یار کیا کہیں گی وہ؟ کیسے دادا پوتا ہیں! دادا نے کہا مٹے سے بات کیجئے اور مٹے میاں کا کچھ اتا پتا نہیں، کچھ تو بولو.....“

میرہ اپنے کان سے ریسیور لگائے ان کی آواز سنے جاتی۔ کبھی کبھی ان کی آواز کے بیچ کہیں دھیمی سی، ننھی سی غوں غاں سنائی دے جاتی اور یہ ننھی سی آواز اس کے رگ و پے میں مسرت کا احساس پھونک دیتی۔

”یار! اب ہم تمہیں گد گدائیں گے تاکہ تم ہنسو“ ظہیر صاحب کی آواز سنائی دیتی۔

پھر ایک معصوم سی قلقار سنائی دیتی۔

میرہ کو اس کی ہنسی کرب انگیز محسوس ہوتی۔

یہ ایک بن باپ بچے کی ہنسی تھی۔

ایسے بچے کی آواز جو اس دنیا میں آنے کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی اپنے باپ کا لمس نہیں پاسکا تھا۔

میرہ کا دل دھکنے لگتا۔ آنکھیں بھیگ جاتیں۔

نئے کارونا بھی اسے درد آ میر لگتا۔ وہ روتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی ننھی سی روح شدید کرب سے دوچار تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے مناجا جانتا تھا کہ زندگی اسے ایک ایسا زخم لگا گئی تھی جس کی چارہ گری کبھی ممکن نہ ہو سکتی تھی!

کبھی کبھی میرہ کا دل اس خیال سے بے حد دھکنے لگتا کہ مناجب بڑا ہوگا اور اس سے پوچھے گا، میرا باپ کہاں ہے تو وہ اسے کیا جواب دے گی! کیسے بتا پائے گی اسے کہ اس کا باپ وہاں ہے جہاں جانے کے بعد کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

ڈیوٹی آف کرنے کے بعد جب وہ گھر واپس پہنچتی تو باوجود یکہ وہ اسے ہر اعتبار سے ٹھیک ٹھاک ملتا اسے گود میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے اس کی آنکھیں اکثر اس خیال سے چپکے سے بھیگ جاتیں کہ اس بچے کے سر پر باپ کا سایہ نہیں تھا۔ بچا کہ دادا، دادی اسے جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے، پھوپیاں اور چچا اس پر واری ٹار ہوئے جاتے تھے۔ ثانی کی آنکھ کا تارا اور ماموں، خالہ کا راج دلارا تھا مگر جو کی، جو خلا تھا وہ ان میں سے کوئی بھی پُر نہ کر سکتا تھا اور اس خیال سے کہیں زیادہ تکلیف دہ یہ احساس تھا کہ مٹے کو اپنی زندگی کا سارا سفر باپ کے بغیر ہی طے کرنا تھا۔

☆☆☆

اسکول میں سالانہ امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ بچوں کو رول نمبر زد دیے جانے.....، پرچوں کی کتابت، طباعت، طلبہ کو اسکول کی جانب سے فراہم کی جانے والی امتحانی کاپیوں کے معیار، کمرہائے امتحان میں نشستوں اور طلبہ کی ترتیب، بچوں میں امتحانی پرچوں کی تقسیم غرض ہر معاملے میں منتہا نے ذاتی دلچسپی لی تھی اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی اسکول کی اساتذات کو سابقہ اسکول میں اپنے تجربے کی بنیاد پر رہنمائی فراہم کی تھی۔ غزالہ ناصر ان تمام معاملات میں اس کی دست راست بنی ہوئی تھیں۔ مگر کبھی کبھی وہ دہلی زبان سے تنقید بھی کر جاتیں۔

حسب پروگرام اس نے اسکول کا ایک کمرہ جو خالی پڑا تھا، شعبہ امتحان کے طور پر آراستہ کر لیا تھا۔ ایک سینئر ٹیچر اس شعبے کی نگران قرار دی گئی تھیں اور دو استانیاں ان کی معاونت کے لیے نامزد کی گئی تھیں۔ تین اسٹاف ممبرز پر مشتمل اس امتحانی کمیٹی کو اس کے فرائض کے اجمالی خاکے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

نظامت تعلیم نے اپنے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں سال بھر میں تین امتحانات رائج کر رکھے تھے۔ سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان۔ ان امتحانات کے حوالے سے ہونے والی ایک اسٹاف میٹنگ میں..... منہجائے نامزد امتحانی کمیٹی کو بتا دیا کہ اس کمیٹی کو ان امتحانات کے بروقت انعقاد کے لیے تیاری رکھنا ہوگی۔ ہر امتحان کے انعقاد سے کم از کم ایک ماہ قبل امتحانی پرچوں کی تیاری، پھر ان کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور دیگر مراحل۔ کم از کم ایک ہفتہ قبل بچوں کو امتحانی پروگرام سے آگاہ کر دینا ضروری ہوگا۔ بچوں کو امتحانی پروگرام نوٹ بکس میں نوٹ کروانے کے بجائے



طباعت شدہ دیا جائے گا تاکہ کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ کراہئے امتحان میں ایک روز قبل نشستوں کو امتحان کے لیے بطور خاص نئی ترتیب دے کر ان پر بچوں کے رول نمبرز چاک سے لکھ دیے جائیں گے۔ بچوں کو امتحانی کمرے میں ملا جلا کر اس طرح بٹھایا جائے گا کہ ایک ہی جماعت کے دو بچے پہلو بہ پہلو ساتھ نہ بیٹھے ہوں تاکہ نقل کا امکان نہ رہے۔

بیشتر اساتذہ کا خیال تھا کہ پرائمری اسکول کے بچوں کے لیے اس قسم کے ”سینگ آرٹجمنٹ“ کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ چونکہ پہلی بار اسکول میں ایسا ہو رہا تھا، لہذا بعض جہانگیر اور تجربہ کار خواتین اس پر خاصی جھنجھلائی ہوئی بھی تھیں۔ ان کے خیال میں چھوٹے بچوں کے لیے وہی طریقہ کار زیادہ بہتر تھا کہ ہر بچہ اپنے ہی جماعت کے کمرے میں بیٹھ کر امتحان دے۔ مگر منتہا سختی سے اس طریقہ کار پر جی رہی جو اسٹاف میننگ میں بتا دیا گیا تھا۔

امتحان کے پہلے دن بچوں کو جو دوسرے کمروں میں امتحان دینے کے عادی نہ تھے، اپنے امتحانی کمرے اور رول نمبرز تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ ان کی بھگدڑ دیکھ کر نئے امتحانی نظام پر معترض ہونے والی استانیاں فاتحانہ انداز میں مسکراتی رہیں۔ منتہا کو تھوڑی سی خفت ضرور ہوئی مگر وہ پریشان ہرگز نہ ہوئی۔

”میڈم جی، میرے خیال میں تو پہلا ہی طریقہ ٹھیک تھا“ غزالہ نے بھی دلی زبان سے کہا۔  
”پریشان نہ ہوں، آج پہلا دن ہے کل سے بچے عادی ہو جائیں گے۔ بلکہ آپ دیکھیں گی چھوٹی جماعتوں کے وہ بچے جنہیں بڑی جماعتوں کے کمروں میں بیٹھنے کا موقع ملے گا، وہ بہت خوش ہوں گے۔“

”مگر میڈم، ہر صبح یہ بھگدڑ!“

”ہرگز نہیں۔ بچے اسمبلی کے بعد سیدھے اپنے امتحانی کمروں میں جایا کریں گے۔“

”اور حاضری؟“

”وہ بھی ہو جائے گی۔ اسمبلی کے بعد ہر کلاس ٹیچر اپنی اپنی کلاس کے سامنے کھڑے ہو کر حاضری لے لیا کریں گی۔“

”جی ٹھیک ہے“ غزالہ نے بادل ناخواستہ کہا۔

بچے ایک دودن میں اس نئے نظام کے عادی ہو گئے۔ خلط ملط بیٹھے بچوں کو ایک دوسرے کے جوابی پرچوں کی طرف دیکھنے کی حاجت نہ رہی، نقل کے امکانات تقریباً معدوم ہی ہو گئے۔ وہی استانیاں جو نئے نظام امتحان کے آغاز پر ناک بھوں چڑھاتی اور معترض ہوتی دیکھی گئی تھیں، جلدی قائل ہو گئیں کہ یہ طریقہ زیادہ بہتر اور کراہئے امتحان میں نظم و ضبط قائم رکھنے میں خاصاً مؤثر ثابت ہو رہا تھا۔ غزالہ ناصر کے توسط سے ٹیچرز کی یہ رائے منتہا تک پہنچی تو اسے ایک گونہ اطمینان محسوس ہوا اور وہ مسکرا کر بولی ”بات یہ ہے غزالہ کہ تبدیلی سب کو بھاتی ہے۔“

”میڈم جی، یہ صرف تبدیلی برائے تبدیلی تو نہیں، واقعی بہتری آئی ہے اور ہم سب ٹیچرز حیران ہیں کہ پہلی اور دوسری جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے کیونکر اپنے رول نمبرز نہ صرف یاد رکھے بلکہ جوابی پرچوں پر اپنے ناموں کی جگہ رول نمبرز بھی درست لکھے۔ اکاؤنٹ غلطیاں بھی کی ہیں بچوں نے مگر ہزار بارہ سو بچوں کی تعداد میں یہ چند غلطیاں قابلِ معافی کہی جاسکتی ہیں۔“

”جس عمر کے بچے ہمارے پاس ہیں، اس عمر میں بچوں کے نئی باتیں سیکھنے کی صلاحیت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اوسط ذہانت کا حامل ایک بچہ پرائمری تعلیم شروع کرنے سے قبل ہی اپنی مادری یا ارد گرد استعمال ہونے والی زبان کا بڑا ذخیرہ الفاظ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ جبکہ ایک نئی زبان کو سیکھنا اور اس کے ذخیرہ الفاظ کو نہ صرف یاد رکھنا بلکہ مناسب طور پر استعمال بھی کرنا کوئی آسان کام نہیں۔“

”درست میڈم جی!“

”ایک بات اور غزالہ..... برائمری اسکول میں سمجھتی ہوں ہائی اسکول کے لیے نرسری کا درجہ رکھتے ہیں۔ جو باتیں، جو طریقے بچوں نے ہائی اسکولوں میں جا کر سیکھے ہیں، بچوں کی ذہنی استطاعت کے مطابق اگر ان کا آغاز چھوٹی جماعتوں میں ہی کر دیا جائے تو وہ ہائی اسکول پہنچنے تک ان کے عادی ہو جاتے ہیں۔“

غزالہ نے تائید میں سر ہلایا۔

☆☆☆

طے شدہ پالیسی کے مطابق شعبہ امتحان ہر پرچے کی جوابی کاپیاں امتحان والے دن ہی متعلقہ ممتحن کے سپرد کر دینے کا پابند تھا۔ آخری پرچے سے ایک دن قبل منہا کو شعبہ امتحان کی جانب سے خبر ملی کہ جماعت اول کے فریق ب میں بچوں کی تعداد اڑتالیس تھی اور حاضری رجسٹر کے مطابق اس روز اس جماعت کے تمام بچے حاضر تھے۔ بقول نگران جماعت اس نے حاضری لیتے وقت ایک ایک بچے کے واقعتاً حاضر ہونے کا یقین کرنے کے بعد ہی رجسٹر میں حاضری لگائی تھی۔ اس جماعت کے بچے تین مختلف کمرائے امتحان میں بٹھائے گئے تھے مگر اس روز جب ایک کمرائے امتحان میں نگران نے پرچے کا وقت ختم ہونے کے بعد تمام موصولہ جوابی کاپیوں کو جماعت وار علیحدہ علیحدہ شمار کیا تو معلوم ہوا کہ جماعت اول کا ایک پرچہ کم تھا۔ بقول نگران اس نے فوری طور پر کمرے میں گھوم پھر کر دیکھا۔ ڈیسکوں کے ڈھکنے کھول کھول کر ان کی تلاشی لی مگر پرچہ نہ ملا۔ بچے امتحان دے کر جا چکے تھے۔ جس بچے کا پرچہ کم تھا نگران جماعت کے بقول وہ نہ صرف حاضر تھا بلکہ پرچہ دینے کے بعد اپنے کندھے پر پانی کی بوتل لٹکائے اس کمرائے امتحان کے سامنے سے گزرا تھا جہاں وہ نگران امتحان تھیں۔ پرچہ کم پائے جانے پر مذکورہ بچے کی تلاش میں ہر کارے دوڑائے گئے تو پتا چلا، وہ گھر جا چکا تھا۔ رائے یہ ٹھہری کہ بچے کے گھر فون کر کے پوچھا جائے کہ کہیں وہ غلطی سے جوابی پرچہ اپنے ساتھ تو نہیں لے گیا تھا۔

”میڈم جی، فون کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیں“ غزالہ نے دلی زبان سے کہا۔

”کیا! کیا سوچ لیں؟“

”بچے کے گھر والے کہیں یہ نہ سوچیں کہ کیسے غیر ذمے دار ہیں اسکول والے، ہم سے پوچھ رہے ہیں کہ بچہ جوابی پرچہ ساتھ تو نہیں لے آیا؟“

”اگر وہ ایسا سوچیں گے تو حق بجانب ہوں گے۔“

غزالہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ انو جلیٹر کی ذمے داری تھی کہ وہ جوابی پرچوں کو احتیاط سے وصول کرتیں اور یہ یقین ہو جانے پر ہی کہ تمام بچوں نے کاپیاں دے دی ہیں، بچوں کو کمرائے امتحان سے جانے کی اجازت دیتیں۔“

”میڈم، ایسا ہی کر رہی ہیں تمام انو جلیٹرز۔“

”تو پھر..... پھر پرچہ کہاں گیا؟“ منہا کو غصہ آ رہا تھا۔

اس سوال کا جواب غزالہ ہی کیا، اس وقت تو کسی کے بھی پاس نہ تھا۔

بچے کے گھر فون کیا گیا تو فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر کال ریسپونڈ نہ کی گئی۔ آدھ پون گھنٹا وقفے وقفے سے یہ کوشش جاری رہی مگر کوئی جواب نہ ملا۔

”اب کیا، کیا جائے میڈم!“ غزالہ نے کہا۔

”اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر گھر جانے کو اٹھا جائے“ منہا کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اس ناخوشگوار واقعے پر خاصی ڈسٹرب تھی۔

واقعتاً ایسا تھا بھی۔



سالانہ امتحان تھا۔ بچے کا پرچہ گم ہو جانے پر والدین نے تو ادارے کی جان کو آ جانا تھا۔ پلک جھپکتے میں بات نظامت تعلیمات تک جا پہنچی تھی۔ ادارے کی جو بدنامی ہوتی سو ہوتی، اس کی اپنی ساکھ! اوہ خدا!.....!

منتہا گھر چلی تو گئی مگر رات کو نیند آنے تک اس کے ذہن پر یہی ایک فکر سوار رہی۔ ظہر، مغرب، عشاءتینوں نمازوں کے بعد اس نے ہر نماز کے ساتھ دو رکعت نفل ادا کئے اور بدنامی سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ مئی کو بتایا تو وہ اگرچہ متشکر ہوئیں مگر انہوں نے تسلی بھی دی اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی۔

”دیکھو بیٹا، جب تم اپنے فرائض نیک متی اور ایمان داری سے ادا کرتی ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو“ انہوں نے اسے سمجھایا۔

رات کو جب آنکھ کھلی، گشدرہ پرچے کا خیال آیا۔ صبح جاگی تو طبیعت مکدر تھی۔ حسب معمول تیار ہو کر اسکول پہنچی تو چپراسی نے بتایا، ایک خاتون ملاقات کی منتظر تھیں۔

”بھیجوا نہیں“ منتہا کی عادت تھی، ملاقاتیوں کو خواہ مخواہ انتظار میں نہ رکھتی۔

خاتون دفتر میں داخل ہوئیں تو جھل جھل سی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”میڈم صاحبہ! میرا بچہ وقاص علی آپ کے اسکول میں دن بی میں پڑھتا ہے۔“

منتہا چو کرنا ہو گئی۔

وقاص احمد۔ دن بی!

یہ تو وہی بچہ تھا جس کا کل پرچہ گم ہو گیا تھا۔

تو کیا والدین کو خبر ہو گئی تھی!

مگر کیسے؟

منتہا کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

”جی..... ہم کل بہت کوشش کرتے رہے آپ سے فون پر رابطہ کرنے کی مگر شاید کوئی گھر پر نہیں تھا یا پھر فون خراب تھا۔“ منتہا کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”جی..... وہ..... ہم لوگ نا وقاص کو یہاں سے پک کر کے اپنے ایک رشتے دار کی تدفین میں چلے گئے تھے۔ وہاں سے شام کو واپس ہوئی۔“ خاتون نے منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی گود میں رکھے بیک کی زپ ٹوٹی اور اسے کھولتے ہوئے کہا ”وقاص نے بہت حماقت کی۔ پلیز آپ اسے معاف کر دیجئے گا۔“

منتہا سیدھی ہو بیٹھی۔

خاتون نے بیک میں سے دوہری تہ والی ایک امتحانی کاپی نکالی اور صوفے پر سے اٹھ کر منتہا کی میز کے نزدیک آ کھڑی ہوئیں اور امتحانی کاپی منتہا کی جانب بڑھاتے ہوئے خفیف لہجے میں بولیں ”یہ آنسر کاپی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“

جوابی کاپی تھامتے ہوئے منتہا نے توفیق طلب نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔

”میڈم! شام کو گھر واپس آنے کے بعد جب میں نے اس کے شوز اور پھر موزے اتارے تو اس نے یہ کاپی اپنے ایک موزے میں اڑس رکھی تھی۔“

”موزے میں!“ منتہا نے چونک کر کہا۔

”جی میڈم..... آئی ایم سوری میڈم..... معصوم بچہ ہے، اس سے غلطی ہو گئی۔ پلیز آپ اس کا پرچہ کینسل مت کیجئے گا۔ آپ یقین کریں وہ پرچہ گھر ضرور لے گیا ہے مگر خدا آگواہ ہے کہ ہم نے اس میں کہیں نقطہ بھی نہیں لگایا جیسا وہ لے گیا تھا میں ویسا ہی واپس لے آئی ہوں۔“

منجہا جو وقاس کا جوابی پرچل جانے کی خبر پر انتہائی پریشانی کی کیفیت سے باہر نکل آئی تھی بچے کی ماں کو بیٹھنے کا اشارہ دیتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی ”آپ نے بچے سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے پرچہ موزے میں کیوں اڑس لیا تھا؟“

خاتون جو دوبارہ صوفے پر بیٹھ چکی تھیں اور خفیف دکھائی دے رہی تھیں منجہا کے سوال پر یک بیک دل برداشتہ نظر آنے لگیں اور سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”میں نے اسے بہت مارا..... اتنا کہ شاید پہلے کبھی بھی نہیں مارا ہوگا۔ آپ دیکھ لیں اسے بلا کر اس کی کمر پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔“

”اوہو! بچوں کو اتنا تو نہیں مارا جاتا۔“  
 ”تو اور کیا کرتی ہیں۔“ خاتون کی آنکھوں میں آنسو امٹا آئے اور آواز بھرا گئی ”میں تو اس شاک میں تھی کہ اس کا سال ضائع ہو گیا۔ اسکول والے تو اس کا پرچہ کینسل کر دیں گے۔ میڈم صاحبہ مہربانی کریں۔“ خاتون نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیئے پھر اچانک دوپٹا آنکھوں پر رکھ کر رونے لگیں۔  
 ”دیکھیں محترمہ پرچہ کینسل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو ہمارا ایگزام سیل کرے گا مگر مجھے افسوس یہ ہے کہ آپ نے بچے کو اتنی بے دردی سے مارا کہ بقول آپ کے نیل ڈال دیئے اس کے جسم پر۔ کیا مارنے سے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا؟“

”ضرور ہوا ہوگا۔ جب اس کا جسم رات کو دکھا ہوگا نا تو ضرور احساس ہوا ہوگا اسے اپنی غلطی کا۔“ انہوں نے بڑے وثوق سے کہا۔

”میں آپ سے ایک بات کہوں؟“  
 ”جی۔“

”بچے کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے اس کا ہمدرد اور دوست بننا پڑتا ہے۔ آپ اسے مارنے کے بجائے اس سے یہ پوچھتیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا پھر اسے بتائیں کہ اس غلطی کا اسے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، اس غلطی کے نتائج و عواقب سے اسے آگاہ کریں۔“

”بس میڈم صاحبہ کیا کہیں، ماحول ہی ایسا بگڑا جا رہا ہے کہ بچے جو اپنے بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں وہی کرنے لگتے ہیں۔ نتیجے کی پروا ہی نہیں کرتے۔ سمجھاتی تو میں اپنے بڑے بیٹے کو بھی بہت ہوں مگر کوئی نصیحت پر کان دھرے تب نا۔ چھوٹے والے نے یہ حرکت اسی سے سیکھی ہے۔“ خاتون کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔  
 ”کیا مطلب!“

”جب میں نے موزے میں سے پرچہ نکلنے پر اس سے پوچھا کہ تو یہ پرچہ کس کو دینے کے بجائے اپنے ساتھ کیوں لے آیا تو کہنے لگا..... بھائی بھی تو اپنے موزے میں کاغذ رکھ کر امتحان دینے جاتا ہے۔“  
 منجہا مسکرائے بنانہ رہ سکی۔  
 ”پھر؟“

”پھر کیا میڈم صاحبہ۔ پہلے تو میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی پھر میں نے بڑے والے سے کہا، بے شرم تو امتحان میں نقل کرنے کے لیے پھرے اپنے موزوں میں اڑس کر اسکول جاتا ہے، تیری دیکھا دیکھی یہ معصوم اسکول سے اپنا پرچہ لے آیا ہے پھر میں نے دو چار ہاتھ تو بڑے کو لگائے اور اس چھوٹے کو تو روٹی کی طرح دھنک ڈالا۔ میڈم کیا کریں گی آپ اس کے پرچے کا؟“

”میں نے آپ سے کہا نا اس کا فیصلہ ہمارا ایگزام سیل کرے گا۔“



”میڈم صاحبہ بچہ معصومیت میں غلطی کر گیا۔“ خاتون گڑگڑائیں۔  
 ”آپ اطمینان رکھیں۔ میں نے آپ کی بات سن لی ہے۔ جو کچھ آپ نے بتایا وہ خود ساختہ نہیں لگا ہے مجھے بلکہ سچ اور حقیقت محسوس ہوا ہے بلکہ سچ حقیقت! میں امتحانی کمیٹی سے سنوارش کروں گی کہ آپ کے بچے کے ساتھ سختی اور سزا کے بجائے زخم کی چارہ مہر کی کاروتیہ رکھیں۔ آپ کے بچے نے اپنے بڑے بھائی کی نقل میں جو غلطی کی وہ دراصل ہمارے تعلیمی نظام کو امتحان میں نقل کے رجحانات کی صورت تلخ زخم کی کٹک ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے بچے کے اس بڑے کا فیصلہ کلاس میں اس کی کارکردگی اور پچھلے امتحانی نتائج کی بنیاد پر کیا جائے۔“  
 ”شکریہ میڈم صاحب بہت بہت شکریہ۔“ خاتون نے کہا اور صوفے سے اٹھتے ہوئے بولیں ”اجازت ہے میڈم۔“

”بچوں کو ان کی غلطیوں پر مارنے پینے کے بجائے پیار محبت سے سمجھانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کیا کریں۔ وقاص کو ہم خود بھی سمجھائیں گے۔“  
 ”مگر انہیں کون سمجھائے گا میڈم جو کچے ہو چکے ہیں اور جن کی دیکھا دیکھی معصوم بچے بھی بگڑ رہے ہیں؟“  
 ایک سادہ سی گھریلو عورت بڑا گہرا اور چبھتا ہوا سوال کر رہی تھی۔  
 اس سوال کا جواب کہاں تھا! کس کے پاس تھا!

☆☆☆

لیلیٰ باپ کی اس بات سے خوف زدہ ہو کر کہ وہ اسے میکے بٹھالینے کی قسم کھا بیٹھے تھے کچھ دن تو میکے نہ آئی لیکن پھر گھر والوں سے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ڈرتے سمیتے میکے آنے جانے لگی تھی۔  
 ظہیر صاحب کو بھی یا تو شاید اپنا قسم کھا لینا یاد نہ رہا یا پھر وہ جان بوجھ کر بھلا بیٹھے۔  
 انسان زندگی میں نہ جانے ایسی کتنی غلطیاں، کتنے گناہ صغیرہ کر بیٹھتا ہے اور پھر خود ہی ان سے اسی طرح چشم پوشی بھی اختیار کرتا ہے۔ جیسے شاید ظہیر صاحب نے کر لی تھی۔  
 فرحان کی موت کے بعد اچھی بھائی دونوں بیٹوں کی طرف سے انتہائی متشکر رہنے لگی تھیں۔ اٹھتے بیٹھے، لیٹے کھڑے آیات قرآنی، وظائف اور دعائیں ورد میں رکھتیں۔ آئیہ الکرسی پڑھتیں اور دونوں بیٹوں کا تصور کر کے دن رات میں نہ جانے کتنی مرتبہ ان کے گرد حصار باندھتیں۔ کبھی دل ہی دل میں کبھی زیر لب ان کی درازی عمر اور ہر حادثے ہر بلا اور ناگہانی سے ان کے محفوظ و مامون رہنے کی دعائیں مانگتے جاتیں۔ ایک عجیب سا خوف، ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا ان کے دل کو۔

خدا انخواستہ..... خدا انخواستہ کبھی فہیم کو کچھ ہو جائے اور لیلیٰ..... وہ ہول سی جاتیں۔  
 اپنے اس لایعنی خوف اور دھڑکے پر دل ہی دل میں شرمسار ہوتیں، خدا کی پناہ چاہتیں۔  
 کبھی دل میں ایک انجانا سا خدشہ پاؤں پیار نے لگتا۔

اللہ نہ کرے.....

اللہ نہ کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ نعیم کے سرسہرا بھی نہ بندھنے پائے اور ایک روز فون کی گھنٹی بجے اور خبر ملے کہ فرحان کی طرح خدا انخواستہ نعیم بھی.....

وہ دھیرے دھیرے اپنے گال پیٹنے لگتیں۔

خود کو، اپنے دل کو برا بھلا کہتیں جو گویا منفی خیالات کا گڑھ بن گیا تھا۔

دوسروں کو پیش آنے والے حادثات انسان کو اپنے پیاروں کے بارے میں شاید اسی طرح متشکر و محزون کر دیا کرتے ہیں جیسے کہ ان دنوں اچھی بھالی تھیں۔

میبہ کی عدت ختم ہونے تک تو وہ لب سیئے بیٹھی رہیں لیکن اس کی عدت ختم ہونے کے بعد سے ان کے دل کو بس یہی فکر لگی ہوئی تھی کہ جلد از جلد نعیم کی شادی بھی ہو جائے۔ اب تو وہ دونوں بیٹوں کے ساتھ رہنے کے لیے دینی بھی جا رہے کو تیار تھیں اور لیلیٰ سے بارہا کہہ چکی تھیں ”نعیم کی شادی ہو جائے بس پھر ہم سب وہیں رہیں گے اکٹھے۔“  
 نعیم کے ساتھ رہنا لیلیٰ کی اپنی بھی خواہش تھی۔ جیسے اچھی بھالی کو دابے اور دھڑ کے لگے رہتے تھے اسی طرح دابے اور خدشات چپکے چپکے اسے بھی ستانے لگے تھے۔ ٹیلی فون کی کھنٹی بجتی تو اس کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگتا۔ کمر آنے والا کوئی شخص گیٹ پر لگی کھنٹی بجاکر اپنی آمد کی اطلاع دیتا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ دن تو جوں توں گزر جاتا مگر رات کو وہ اپنے آپ کو انتہائی غیر محفوظ تصور کرتی۔ نعیم کا فون آتا تو وہ اکثر رد ہاکی ہو جاتی۔  
 ”نعیم میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔“

میبہ کا سوگوار چہرہ، آنکھوں میں بکھری اداسی، سونی کلاسیاں اور سادہ لباس دیکھ کر وہ دل ہی دل میں نعیم کی درازی عمر کی دعائیں مانگنے لگتی۔  
 شاید جگ بیتوں کو ہم انسان اسی طرح اپنی آپ بیتی کے آئینے میں منعکس ہوتے دیکھ کر اپنے لیے نئی راہیں متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔  
 فرحان کی موت نے نعیم سے لیلیٰ کی محبت کو عشق کی راہ بھادی تھی!

☆☆☆

”آج تمہاری ساس کا فون آیا تھا۔“ منجہا کی اسکول سے واپسی پر می نے اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے بتایا۔

می جب بھی ”تمہاری ساس“ کہتیں اسے عجیب سا لگتا۔ ابھی تو نعیم کی والدہ سے اس کا رشتہ ادھورا تھا بلکہ کچا اور بے یقین۔ مشکلیاں ٹوٹ بھی تو جاتی ہیں بلکہ توڑنے والے تو نکاح توڑنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔

اس نے یہ پوچھنا کہ فون کیوں آیا تھا ضروری نہ سمجھا۔

می نے خود ہی بتایا ”ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اب انہیں شادی کی جلدی ہے۔“

منجہا نے چونک کر می کو دیکھا۔

”ابھی ایسی کوئی بات نہ کیجئے گا۔“

”کیوں؟“

”میبہ کو اسٹے بل ہو لینے دیں۔“

”اور کیا اسٹے بل ہوگی بے چاری..... دوبارہ ملازمت پر جانا شروع کر دیا۔ اچھا ہوا کہ اس نے استعفا نہیں دیا تھا چھٹی لی تھی۔“

”مجھے اچھا نہیں لگے گا می کہ میبہ کے ہاتھ ننگے ہوں اور میں.....“

”خدا کی مرضی..... میبہ کے مقدر میں بھی یہ تکلیف..... اب اس وجہ سے تم بھی تو ساری عمر نہیں بیٹھی رہ سکتیں، پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں تو کئی کئی بچوں کی مائیں ہوتی ہیں۔“

”آپ کو یاد ہوگا پہلے علیب کی شادی ہمارے پروگرام میں تھی۔“

”اب بھی ہو سکتی ہے۔“

منجہا قدرے مطمئن دکھائی دینے لگی۔

”بس تو پہلے علیب کی۔“

”پہلے اور بعد کی کیا بات۔ علیب کا ولیمہ تمہاری رخصتی۔“



”نہیں می..... میری ابھی نہیں..... یہہ اتنے بڑے صدمے سے گزری ہے کہ میں ابھی کچھ عرصے تک اس سلسلے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ہاں علیہ کے لیے البتہ بسم اللہ کریں۔“

”مجھے کی کوشش کرو۔ ان لوگوں کے بھی مسائل ہیں۔ دونوں بیٹے اب یہ چاہتے ہیں کہ ماں کو وہ ہیں اپنے پاس رکھیں۔ تمہاری ساس کی خواہش ہے کہ دوسرے بیٹے کی بھی شادی کر کے دونوں بہوؤں کے ساتھ وہیں چلی جائیں۔“

”مئی مسائل ان کے ہیں تو ہمارے بھی ہیں۔ فرحان کی ڈیڑھ کے بعد ان لوگوں اور یہہ کے سرال والوں کے درمیان جو رنجش پیدا ہوئی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابھی اس معاملے کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہی رکھا جائے۔“

”خاندانی رنجشیں بعض دفعہ برسوں چلتی ہیں۔ آخر کب تک انتظار کریں گے ہم۔“

”جلد بہتری کی دعا تو کی جاسکتی ہے۔“

”تم نے شادی کے لیے نہ نہ کی ایسی رٹ لگا رکھی تھی کہ اچھا بھلا کام ہوتے ہوئے رک گیا۔ اللہ کے واسطے اب تو اپنی یہ رٹ چھوڑ دو۔“ مئی زچ ہو گئیں۔

”پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔“

”تو کیا شادیاں بجاؤں۔ ایک کی تو یہ صدمہ دیکھنا پڑا۔ دوسری کی ہونے کی نوبت ہی نہیں آرہی۔ جوان جہان بچہ تھا فرحان مگر موت آئی اچک کر لے گئی۔ ہم تو بچے پان ہیں۔ کیا بھروسہ ابھی ہمارے ہاں آجائے۔“

”ایسی باتیں نہ کریں۔“ وہ سہم کر بولی۔

”تمہیں کیا پتا کتنی فکر ہوتی ہے ماؤں کو بیٹیوں کی۔“

”صرف بیٹیوں ہی کی کیوں۔“

”بیٹیوں کی بھی ہوتی ہے مگر ان کے لیے تو جب کرنے کا ارادہ کر لو مشکل نہیں۔ اصل مشکل بیٹیوں کی ہوتی ہے۔ خدا بھلا کرے یہہ کی ساس کا جن کی وجہ سے یہ رشتہ مل گیا۔ دیر لڑ کے والوں کی طرف سے ہوتی ہے یہاں ہم ٹال رہے ہیں۔“

”ٹال نہیں رہے حالات کے پیش نظر تھوڑی سی مہلت چاہتے ہیں۔ آپ خود سوچیے کیا یہہ کی سرال والوں کے شریک ہوئے بغیر ہم یہ شادی کر سکتے ہیں۔“

”مئی مذہب نگاہوں سے اس کا منہ ٹکٹے لگیں۔“

”انشاء اللہ کچھ دنوں میں حالات بہتر ہو جائیں گے۔ یہہ کی نند اس گھر میں ہے اور وہ بڑی سمجھ دار لڑکی ہے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ تو بہ!“ مئی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”کیسی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ علیہ کی شادی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں یہہ کے سرال والے آئیں گے اور وہ لوگ بھی۔ ہو سکتا ہے اسی بہانے ان کے تعلقات بحال اور بہتر ہو جائیں۔“

☆☆☆

”ننھی کوئل فنفہ کے گھر میں گویا نویدِ مسرت بن کر آئی تھی۔ تینوں بہن بھائی بہت خوش تھے۔ کبھی ایک اسے چومتا کبھی دوسرا گود میں اٹھا لیتا۔ رائیل چلائی ”بہنا میری ہے۔“

”جی نہیں میری۔“ سانول کہتا۔

”بے وقوف تم تو دو بھائی ہو میں اکیلی ہوں اس لیے بہنا میری۔“

”میں چھوٹا ہوں اس لیے چھوٹی بہن میری۔“ سانول دعویٰ ٹھوکتا۔

”نہیں بھئی راول سے میری لڑائی ہو جاتی ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”تم کرو یہ اتنے بھائی کہ راول کے بھائی بن جاؤ۔“

”وہ تو میں ہوں۔“

”میرا مطلب ہے ہمارے گھر میں ایک سیٹ بھائیوں کا ایک ہم دونوں بہنوں کا۔“

”مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔“

”لو بھلا مجھے کوشش کرنے کی کیا ضرورت وہ تو تم ہو۔“

”ماما!؟“ سانول ایسے موقعوں پر اپنی پوری قوت سے ماں کو پکارتا۔

”کیا ہوا؟“ وہ لپکی ہوئی آتی۔

”رائیل مجھے بہنا نہیں دے رہی۔“

”تو بہ ہے ایسے چلاتے ہو تم لوگ کہ دوسرے آدمی کے ہاتھ پاؤں پھول جائیں۔“

”دوسرا آدمی! کیا مل گیا ماما؟“ رائیل کی رگِ ظرافت پھڑکتی۔

”رائیل! فضلہ اسے گھورتی۔“

”سوری ماما جی۔“ رائیل کان دبا کر کہتی۔

اپنی نوعیت کا ایک تھایہ کنبہ کہ جہاں سیر براہِ خانہ کی پردیس ضروری کے بعد ملنے والی اس کی دوسری شادی کی خبر بھی اس کنبے کو قنوطی بنانے میں ناکام رہی تھی۔ اس کی فضاؤں میں اب بھی وہی تازگی، وہی نیرنگی، وہی لطافت اور وہی نزاکت تھی۔ ماں اور بچوں کے درمیان ہلکا پھلکا ہنسی مذاق چلتا رہتا۔ ماں اپنے بچوں کی دوست بن کر رہتی۔ ان کا دیکھ سکھ سنا بچھا تھا۔

گھر کی فضا کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا سہرا فضلہ کے سر جاتا تھا۔ اس کے اپنے دل میں جو تھا وہی جانتی تھی۔ کون عورت اپنے شوہر کی دوسری شادی کی خبر سن کر مستحکم اور مضبوط رہ سکتی ہے۔ اپنے معمولات اور مزاج کو جوں کا توں برقرار رکھ سکتی ہے اور شوہر بھی وہ جو ہر اعتبار سے اس سے کم تر تھا۔ اس کی دوسری شادی فضلہ کو اپنی ذات کی توہین محسوس ہوئی تھی مگر اس نے اپنے دل کی کیفیت بچوں پر ظاہر نہ ہونے دی تھی۔ بلکہ جب رائیل اس خبر پر اداس ہوئی تو اس نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا ”ماما مکی جان! تم نے منہ کیوں لٹکا لیا۔ ہمیں تمہارے باپ کی دوسری شادی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو پہلے بھی مہمانوں کی طرح آیا کرتے تھے۔ اب آئے تو دلایت پلٹ ہو کر آئیں گے شاید انگریزی بولتے ہوئے۔“

”مجھے شک ہے۔“ راول نے چونچ کھولی۔

”کس بات پر؟“

”کہ فادر ڈیڑا انکلینڈ میں رہ کر بھی کبھی انگریزی بول سکیں گے۔“

”اب اتنے جاہل بھی نہیں ہیں تمہارے باپ۔“ فضلہ بولی۔

”آپ کو تو اس آدمی کے خلاف کوئی ایک لفظ سننا بھی گوارا نہیں۔“

”کیوں گوارا ہو، میرے شوہر ہیں وہ۔“

”میں خوش ہوں کہ وہ یہاں نہیں رہے۔“ راول بولا۔

”بے ایمان!“ فضلہ نے اسے گھورا ”باپ کے لیے ایسا کہتے ہو۔“

”باپ نے کیا کیا! دوسری شادی کی اور انکلینڈ فرار۔“



”تمہیں کچھ فرق پڑا۔ کوئی ضرورت پوری ہونے سے رہی۔“  
 ”فارگاڈ سیک ماما اتنی میٹرلیٹک ہو کر نہ سوچیں۔ مادی ضرورتوں کے علاوہ بھی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں انسان کی۔“

”مثلاً؟“ اس نے چونک کر راول کی طرف دیکھا۔  
 ”محبت، تحفظ، یقین..... جو ہمیں اس شخص کی طرف سے کبھی نہیں ملا۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔  
 فضا کنگلی باندھے چند ثانیے اسے دیکھتی رہی۔ اس کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر بچوں کی خاطر وہ خود پر ضبط کیے رہی۔  
 ”میں جو ہوں تمہیں یہ سب دینے کو۔“ اس نے راول کا بازو تھامتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا۔

”آپ ہی نے تو دیا ہے سب کچھ۔“ وہ بولا۔  
 فضا کو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی سی رو دکھائی دی۔  
 ”اپنے باپ کے خلاف دل میں شکایتوں کو جگہ مت دیا کرو۔“ اس نے راول کو سمجھایا۔  
 ”ماما آپ کو اب بھی ان سے نفرت نہیں ہوئی۔“ رائیل حیرت سے بولی۔  
 ”کبھی ہو بھی نہیں سکتی میری جان..... وہ جہاں بھی رہیں میرے بچوں کے باپ ہیں اور اب تو تین بھی نہیں چار

## ٹھہریے اپنی ناک کا آپریشن کرانے سے پہلے

جدید ہومیو پیتھک سائنسی تحقیق اور تجربہ سے تیار کردہ انتہائی زود اثر دوا  
**Naricol Tablet**  
 نزلہ آگئی ہو یا الرجک یا موسمی تبدیلیوں سے ناک کی ہڈی  
 یا گوشت کے بڑھنے سے ہوسر درد متقل ہو ناک بند  
 ہونا یا سانس لینے میں دشواری کیلئے مجرب دوا ہے۔  
 ایک ہفتے ضرور استعمال کر کے دیکھیں انشاء اللہ ضرور شفا ہوگی

اشاکٹ :  
 ہائمن ہومیو اسٹور تا علم آباد بورڈ آف فزفون نمبر: 6614030  
 انساری ہومیو اسٹور تا علم آباد بورڈ آف فزفون نمبر: 6681127  
 شامی ہومیو ڈرگ بینک سکندر پور پٹنہ روڈ نمبر: 2571776  
 ظفر ہومیو اسٹور اقبال بازار تاجن چورنگی تار تھہ کراچی 6946508  
 سوئی ہومیو اسٹور آرام باغ روڈ کراچی  
 انشاء اللہ میڈیکل اسٹور انیسوا سکو انرا ایف بی ایریا  
 مہرا نیکیس آرام باغ روڈ کراچی: 2628814  
 احمد ہومیو اسٹور یو پی تار تھہ کراچی: 6957528  
 شیراز ہومیو پیتھک شورا اینڈ کلینک 34 انیس روڈ لاہور فون: 042-6369591-93  
 مسلم ہومیو پیتھک اسٹور بچت روڈ حیدر آباد فون: 720208  
 نیو جمہی ہومیو اسٹور کاشن اقبال با مقابل اردو سائنس کالج کراچی  
 البخت ہومیو پیتھک اینڈ اسٹور عبد اللہ فیضان بازار منڈیاں ایبٹ آباد  
 الانف ہومیو اسٹور آرام باغ روڈ کراچی

ایک ماہ کا کورس 180 روپے۔ گھر بیٹھے V.P پارسل منگوانے کیلئے درخواستیں  
 مرض کی تشخیص و علاج ریڈونک کپیوٹر کی مدد سے (خون یا تھوک کے نمونے سے ٹیسٹ)  
 دیگر امراض کے لئے خط و کتابت بالمشافہ ملاقات کے لئے کلینک پر دراصل کیا جاسکتا ہے  
 ہومیو ڈاکٹر شوکت علی (پینل - اسٹیٹ بینک آف پاکستان)  
 مڈل پائرنس شاپ نمبر 2 SC-19 باک N تار تھہ تا علم آباد کراچی ٹیلی فون نمبر: 6647312 0300-9229413  
 کلینک کے اوقات (صبح 11 سے 1 شام 6 سے 10) E-mail: hdr\_shoukatali@hotmail.com

بچوں کے باپ!“  
 ”کیا بتائیں گی آپ کو ان کے بارے میں!“ راول کے لہجے میں تلخی تھی۔  
 ”ارے بیٹا تم کیا سمجھتے ہو کیا وہ ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہیں۔“  
 ”کاش ایسا ہوتا!“

عجب تماشا تھا!

ایک طرف تو اس کی اولاد باپ سے محبت، تحفظ اور یقین کی متقاضی تھی اور دوسری طرف اس درجہ نفرت! بچوں کی جذباتی کیفیت کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کے لیے فضا بظاہر خود کو مستحکم رکھے ہوئے تھی مگر اس کے اپنے اندر دن رات کتنی شکست و ریخت رہتی تھی اس کا اندازہ اسی کو تھا!

☆☆☆

دن رات ظہیر صاحب کے ہاتھوں میں رہنے کی وجہ سے منان سے اتنا ہل گیا تھا کہ میہ کی بھی کم ہی پروا کرتا۔ اس کے کپڑے، بچھونے اور ضرورت کا دیگر اسباب ظہیر صاحب نے مستطاف اپنے ہی کمرے میں رکھ چھوڑا تھا۔ میہ ماں تھی۔ ملازمت کے اوقات کار میں گھر اور بچے سے اس کی دوری تو ایک مجبوری تھی مگر گھر آنے کے بعد وہ بچے کو اپنے پاس ہی رکھنا اور اسے اپنی آغوش کی گرمی دینا چاہتی تھی جبکہ ظہیر صاحب کا عالم یہ کہ رات کو بھی اسے اپنے ہی پاس سلانا چاہتے۔ میہ اسے اپنے کمرے میں سلا بھی لیتی تو اسے کسی کے ہاتھ منگوا لیتے یا کمرے کے دروازے پر دستک دے کر خود کمرے میں در آتے اور بچے کو اٹھا لے جاتے۔

میہ اگرچہ زبان سے کچھ نہ کہتی مگر وہ بچے کے بارے میں ظہیر صاحب کے اس طرز عمل پر دل ہی دل میں بڑی جڑ بڑھتی۔ بجا کہ یہ بچہ ان کے مرحوم بیٹے کی نشانی تھی۔ اس سے ان کی غیر معمولی محبت و انسیت سے بھی انکار نہ تھا مگر وہ بھی تو آخر ماں تھی اس کی۔

منے کی بابت ظہیر صاحب کے اس طرز عمل کو گھر میں سبھی نے نوٹ کیا تھا۔ مسز ظہیر اکثر انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ میہ جب گھر میں ہو تو منے کو زیادہ تر اسی کے پاس ہونا چاہیے۔ رات کو بھی اسے اپنی ماں کے پاس ہی سونا چاہیے مگر ظہیر صاحب ان کے سمجھانے کو خاطر میں نہ لاتے۔

”تم میری فیملی کو نہیں سمجھ سکتیں۔“ وہ کہتے۔

”ہم سمجھتے ہیں..... سب سمجھتے ہیں..... ہم سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے آپ کی فیملی کو..... ہم جانتے ہیں آپ کو منے کے وجود سے فرحان کی خوشبو آتی ہے۔“

”جب جانتی ہو تو پھر روک ٹوک کیوں رکھتی ہو۔“

”ماں بھی بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ میہ بھی چاہتی ہوں گی کہ منان کے پاس رہے۔“

”میہ کو مجھ سے زیادہ محبت نہیں ہو سکتی منے سے۔“ ظہیر صاحب لایعنی دعوؤں پر اتر آتے۔

مسز ظہیر ان سے بحث و تجویس کرنا مناسب نہ سمجھتیں۔ اعصابی مریض رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں چیخنے چلانے لگتے اور بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا۔

میہ سے انہوں نے اس سلسلے میں بارہا معذرت کی تھی۔

”بیٹا ہم منے کے بارے میں تمہارے جذبات سے بخوبی آشنا ہیں۔ منے کے لیے ظہیر صاحب کا اتنا یوزیو ہونا شاید تمہیں شاق گزرتا ہو۔ بہت سمجھاتے ہیں ہم انہیں مگر کیا کریں سننے ہی نہیں۔ اعصابی مریض ہیں اس لیے ہم کہنے سننے میں بھی احتیاط ہی رکھتے ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں امی، ان کا بھی تو پوتا ہے۔“ وہ بڑے تحمل سے کہتی۔



مگر حقیقت وہی تھی کہ وہ منے کے بارے میں ظہیر صاحب کے اتنا پوزیو ہونے پر اکثر زچ ہونے لگی تھی۔ اپنی اس بیزاری کا اظہار اس نے دو تین مرتبہ مٹی اور منہ پر بھی کیا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔“ مٹی اس کے دل سے شکوہ رفع کرنے کی کوشش کرتی۔ ”شکر کیا کرو کہ باپ کے بعد تمہارے بچے سے کوئی اتنی محبت کرنے والا بھی موجود ہے۔ ورنہ ایسے بچوں کی دنیا میں کمی نہیں جنہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ منا خوش قسمت ہے کہ اس سے دادا، دادی، پھوپھی، چچا سب بے حد پیار کرتے ہیں۔“

”اتنی محبت بھی نہ کرے کوئی کہ دوسرے آدمی کا دم گھٹنے لگے۔“

”کوئی بات نہیں منا جہاں بھی رہے جس کے پاس بھی رہے وہ ہے تمہارا ہی۔ ایک پرانی مثل ہے ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔“

”میبہ ملازمت پیشہ ماؤں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کے بچوں کی مناسب دیکھ بھال ہوتا ہے۔ بے بی سنگ کی اجرت ادا کرتے ہیں، تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارا بیٹا محبت کرنے والے ہاتھوں میں پل بڑھ رہا ہے۔“ میبہ کے دل سے گلہ رفع کرنے میں منہا بھی اپنا حصہ بنانے کی کوشش کرتی۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں باجی، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں یہاں آتی ہوں تو وہ منے کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ منہا بڑا ہو جائے گا تو اپنا ہاتھ ان سے چھڑا کر تمہارے ساتھ خود یہاں آ جایا کرے گا۔“

اس روز بھی کچھ ایسی ہی گفتگو کے بعد مٹی نے بہت احتیاط سے علیب کی شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”میبہ بیٹے لڑکی والے مسئلے کے بعد ایک طرح سے بندھے بیٹھے ہیں، کیا خیال ہے اب پہلے تمہارے بھائی پھر بہن کی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش نہ ہوا جائے۔“ مٹی نے میبہ سے کہا۔

”ضرور۔“

”تو پھر کسی دن وقت نکالو۔“

”کس لیے؟“

”لڑکی والوں کے ہاں جانے کے لیے۔“

”پلیز مٹی آپ لوگ چلے جائیں۔“

”تم کیوں نہیں۔ وہی تو نہیں ہو۔ بھائی کی خوشی میں ایک شریک نہ ہو تو باقی کون؟“

میبہ نے سر جھکا لیا۔ مٹی کو یوں لگا جیسے وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

”بیٹا زندگی ایسے تو نہیں گزرے گی۔ حوصلے سے کام لو۔ زندگی دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے۔“

اس نے گھائل نگاہوں سے مٹی کی جانب دیکھا۔

”ایسی کڑی دھوپ مٹی!“ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط، کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے تنگ (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کریں تاکہ یہ ضائع نہ ہوں۔ ای میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔



نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر مماثلک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے۔ (ادارہ)

مئی کا جی کٹ کر رہ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی ”ہو سکتا ہے کسی اگلے موڑ پر کہیں بہت ٹھنڈی چھاؤں بھی مل جائے۔“  
 بیسہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

☆☆☆

مہتاب کے تبادلے کے احکامات رکوانے کے لیے منتہا نے ڈائریکٹریٹ جا کر ڈپٹی ڈائریکٹر کو مہتاب کے تبادلے کی درخواست کا پس منظر بتانا ضروری جانا۔

”سفارش کر رہی ہیں مس منتہا۔“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔  
 ”سر بہت گزر گزار ہاتھا وہ۔“

”سنا ہے آپ تو رونے والوں کی بھی نہیں سنتیں۔“  
 ”جی سر!“ وہ چونکی ”میں سمجھی نہیں۔“

”ڈائریکٹریٹ کو آپ کے بارے میں بڑے تواتر کے ساتھ زبانی اور تحریری شکایات مل رہی ہیں کہ آپ کسی کی نہیں سنتیں۔“

”ایسا نہیں ہے سر! جائز اور معقول بات تو میں اپنے دشمن کی بھی ضرور سنتی ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے دشمن بھی ہیں آپ کے۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔

”جس کا کوئی دشمن نہیں اس کے بارے میں یہ بات یقینی ہے سر کہ وہ اعلیٰ درجے کا منافق ہوگا۔“

ڈپٹی صاحب نے اپنی عینک درست کی۔ ”بہت خوب!“

”میں پوچھ سکتی ہوں سر کہ لوگوں کو کس قسم کی باتیں نہ سنی جانے کی شکایات ہیں مجھ سے۔“

”صبح اسکول لگنے کے بعد اسکول کا مین گیٹ بند کروادیا جاتا ہے اور دیر سے آنے والوں کو واپس جانا پڑتا ہے۔“

”تاکہ اگلے روز بروقت پہنچیں۔“ منتہا نے لقمہ دیا۔

”اکیلے آنے والے بچوں کے لیے اکیلے واپس جانا مشکل ہوتا ہے۔“

”اکیلے آتے بھی تو ہیں سر! آئی ایم سوری سر، ایک طرف تو ہم پابندی وقت کا راگ الاپتے ہیں اور دوسری طرف اس میں رعایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔“

”سنا ہے یونیفارم کی چیکنگ اتنی سختی سے کرواتی ہیں آپ کہ جو توں تک میں ذرا رعایت نہیں۔ سب کے ایک جیسے چاہتی ہیں آپ۔“

”یونیفارم کا اور مطلب کیا سر..... جوتے بھی بچوں کی یونیفارم ہی کا حصہ ہیں۔ آپ ذرا دیکھتے تو سہی سر کہ شروع میں جب میں یہاں آئی تو بچے کیسے کیسے جوتے پہن کر آیا کرتے تھے۔ مسلسل کوششوں سے اب تقریباً نوے پچانوے فیصد بچے ڈائریکٹریٹ کے منظور کردہ ڈیزائن کے مطابق جوتے پہن کر آ رہے ہیں اور سر اور کیا شکایات ہیں لوگوں کو؟“

”سنا ہے جن لڑکوں کے بال بڑھے ہوتے ہیں۔“ آپ اسمبلی میں ان کے بالوں کو قینچی لگا دیتی ہیں۔“

”دوسرے دارنگ دینے کے بعد سر!“

”لوگوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ آپ بچیوں کو چوڑیاں، بالیاں اور چھوٹی موٹی آرائشی چیزیں استعمال کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتیں۔“

”سر، اسکول کی بوجھ بچیاں سادہ ہی اچھی لگتی ہیں۔ جب ہم انہیں سادگی کا درس ہی دیتے ہیں تو عملاً بھی اسی؛



کار بند کیوں نہ کریں انہیں۔“  
 ”سنا ہے کوئی بچہ ایک دن چھٹی کر لے تو اگلے دن اس سے گراؤنڈ میں پڑا کوڑا کرکٹ چنوا یا جاتا ہے۔“  
 ”سر، ایسا صرف ان بچوں سے کروایا جاتا ہے جو بغیر اطلاع دیئے چھٹی کرتے ہیں اور اگلے دن بھی بغیر درخواست لیے اسکول آتے ہیں۔ اس سزا سے انہیں اول تو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے دوسرے کام کی عادت پڑتی ہے تیسرے ہماری گراؤنڈ صاف ہو جاتی ہے۔ جو کام ہمارا ایک خاکروب شاید دو گھنٹے میں بھی نہ کر سکے، یہ بچے ذرا سی دیر میں کر جاتے ہیں۔“

”بہر حال والدین اور سرپرستوں کو اس بات پر سخت اعتراض ہے، ان کا کہنا ہے ہم بچوں کو اسکول تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں زمین پر سے کوڑا کرکٹ اٹھوانے کے لیے نہیں۔ یہ جمہداروں کا کام ہے۔“  
 ”سچی تو ہماری گلیاں اور محلے اتنے گندے رہتے ہیں۔ اگر ہم کوڑا زمین سے اٹھا کر کوڑے دان میں ڈال دینے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھیں تو ہماری گلیوں اور محلوں میں جا بجا اتنا کوڑا کرکٹ نہ دکھائی دے۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ یہ صرف خاکروبوں کا کام ہے۔ ہم اپنے تعلیمی اداروں میں بچوں کو محنت کی عظمت، کام میں کوئی عیب نہیں اور ڈنٹنی آف لیبر قسم کے عنوانات پر اچھے اچھے مضامین تو لکھنا سکھا دیتے ہیں عملاً انہیں کچھ نہیں سکھاتے۔“  
 ”ایک شکایت آپ سے ڈائریکٹر صاحب کو بھی ہے۔“

”جی سر..... مجھے معلوم ہے۔ ایک صاحب جن کا کسی بل اسٹیشن سے یہاں ٹرانسفر ہوا ہے ڈائریکٹر سے سفارشی رقعہ لے کر آئے تھے کہ ان کے بچے کو جو وہاں تیسری جماعت میں پڑھ رہا تھا اور اسے اپنے والد کے تبادلے کے باعث سالانہ امتحان سے کچھ عرصہ قبل ہی یہاں آنا پڑا تھا چوتھی جماعت میں بٹھا دیا جائے میں نے معذرت کر لی۔“

”معذرت یا انکار؟“ ڈپٹی صاحب نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

”یہی سمجھئے سر!“

”کیوں انکار کیا ہے آپ نے؟ کیا آپ ڈائریکٹر کی اس پالیسی سے واقف نہیں کہ اگر کسی طالب علم کو کسی بل اسٹیشن سے اپنے والدین کے ٹرانسفر کے باعث سالانہ امتحان سے قبل میدانی علاقے میں آنا پڑے تو اسے اگلی جماعت میں داخلہ دیا جائے گا۔“

”مگر گزشتہ جماعت میں سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کے نتائج کی بنیاد پر سر..... ڈائریکٹر نے جس بچے کو میرے پاس بھجوایا اس کی دونوں امتحانات میں کارکردگی صفر تھی۔“  
 ”سو وہاں! آپ کو پتا ہے جو رقعہ آپ کو ڈائریکٹر سے بھجوایا گیا اس پر کس کے دستخط تھے؟“ ڈپٹی صاحب ذرا کڑک کر بولے۔

”جی سر مجھے معلوم ہے..... ڈائریکٹر صاحب کے۔“

”ڈائریکٹر کے کسی حکم سے سر تالی کا مطلب سمجھتی ہیں!“

”جی سر!“ اس نے سر جھکا کر آنکھوں سے کہا ”ہارڈ ایریا میں ٹرانسفر۔“

”جی!“ وہ جی پر زور دے کر بولے پھر انہوں نے کہا ”مہتاب کا ٹرانسفر کو ان کی بات تو بعد میں کیجئے گا پہلے آپ اپنا ٹرانسفر کو ان کے لیے سفارش ڈھونڈیں۔“  
 اس نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

دکے کا۔ ٹی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں، موت۔ دیکھ تو دیکھ  
ہے جو دا۔ نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے۔ سو ہی دیکھوں کا  
ذریعہ اظہار۔ ن آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنکد لاخ۔ اس پر محبت کے  
پھول کیلتے۔ ہس۔ یہ شبیسی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے  
بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانیہ اختر کا نام نیا نہیں۔  
اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی  
نئی کارش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔  
گہر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی  
سافی ہوتی ہے۔ ایک ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک اس مصائب کے  
بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے چاکم سار ہونے کی دل گداز داستان

منتہا

ناہید سلطانیہ اختر









”لیس بس منہا، ڈائریکٹر صاحب آپ سے اس قدر ناراض ہیں کہ کسی بھی وقت آپ کے کسی ہارڈ ایریا میں ٹرانسفر کے احکامات جاری کر سکتے ہیں۔“

وہ چند ثانیے کے لئے جھپٹتا رہا لیکن جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور ڈپٹی صاحب پر اپنی پریشانی عیاں ہونے دیے بغیر بظاہر بڑے اعتماد سے بولی ”میں کیا کہہ سکتی ہوں سر۔“

”نہیں نہیں آپ جو کہنا چاہتی ہیں کہہ ڈالیے۔ آپ کی صاف گوئی کے بہت چرچے سنے ہیں ہم نے۔“ ڈپٹی صاحب کے لہجے میں طنز تھا۔

”آئی ایم سوری سر! صاف گوئی اگر جرم ہے تو مجھے اپنے اس جرم کا اقرار ہے۔“

”اب وہ بھی کہہ ڈالیے جو آپ کہنا چاہتی تھیں۔“

وہ مذہذب دکھائی دینے لگی۔

”ہاں ہاں..... بولیے۔“

”سر! ڈائریکٹر صاحب کا اس درجے زور درخ ہونا ان کے عہدے کے منافی اور ختم مزاج ہونا اس عہدے کی توہین ہے۔“

ڈپٹی صاحب نے چونک کر کچھ اس طور اس کی جانب دیکھا جیسے انہیں اپنی سماعت کا اعتبار نہ ہو۔

”کیا! کیا کہا آپ نے!“

”سوری سر! میں جانتی ہوں آپ کو برا لگا ہے..... مگر سر مجھے بھی..... مجھے بھی افسوس ہوا ہے..... آپ کو شاید یاد ہو..... اس اسکول میں میری جوائننگ سے قبل آپ نے مجھ سے کہا تھا جس ادارے میں آپ جا رہی ہیں اس کی بد قسمتی یہ ہے کہ اسے اپنے قیام سے اب تک ماسوا ایک دو ہیڈز کے سبھی وقت کو دھکا دینے والے ملے۔ ڈائریکٹر میٹ کی خواہش تھی کہ یہ ادارہ کسی مخلص اور متحرک سربراہ ادارہ کے ہاتھوں میں جائے تاکہ یہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ آپ کو یاد ہے نا سر؟“

”جی بالکل یاد ہے۔“

”اور آپ نے یہ بھی کہا تھا سر کہ ادارے کی بہتری کے لیے کیے جانے والے اقدامات میں مجھے ڈائریکٹر میٹ کی جانب سے ہر ممکن مدد اور تعاون حاصل رہے گا۔“

ڈپٹی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

”سر! جس حال میں مجھے یہ ادارہ ملا تھا اور جس حال میں یہ آج ہے مجھے اس سلسلے میں خود کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ ادارہ زبان حال سے خود اس کی گواہی دے گا۔“ اس نے توقف کیا پھر قدرے دل برداشتہ لہجے میں بولی ”مجھے نہیں یاد سر کہ کتنے دن ایسے ہیں جب میں چھٹی کے بعد دو دو تین تین گھنٹے دیوانہ وار کام کرتی اور کروائی رہی ہوں۔“

”ہاں.....!“ ڈپٹی صاحب کو جیسے کوئی اہم بات یاد آئی ”آپ کے بارے میں ایک یہ شکایت بھی موصول ہوئی ہے ڈائریکٹر میٹ کو کہ آپ اپنے ماتحتوں کو اسکول کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی دیر تک روکے رکھتی ہیں۔“

”ہمیشہ نہیں سر! جب کبھی ضرورت پڑی ہے تب۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا جب کبھی ضرورت پڑی ہے سے؟“ ڈپٹی صاحب قدرے تڑخ کر بولے۔

ملتانے چونک کر انہیں دیکھا۔ کس قدر کٹی تھی ان کے لہجے میں!

”سر جب کبھی میں نے اپنے اسٹاف ممبرز کو روکا ہے میں ان کے ساتھ خود بھی رکی ہوں۔“

”آپ کو کیا فرق پڑتا ہے نہ خانگی ذمے داریاں نہ شوہر نہ بچے۔“



وہ دم بخود رہ گئی۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب اس حد تک ذاتیات پر اثر آئیں گے!  
 ”لوگوں کو نوکریاں بھگتانے کے علاوہ بھی سو کام ہوتے ہیں۔ کوئی اسکول کے بعد پارٹ ٹائم کرتا ہے۔ کوئی بے چاری ٹیچر ٹیوشن پڑھاتی ہوگی۔ کسی کے گھر والے منتظر ہوتے ہوں گے، کسی کا بچہ بیمار ہو سکتا ہے مگر آپ کو کیا! آپ تو ان تمام معاملات سے بری الذمہ ہیں۔“ ڈپٹی صاحب نے پہلے سے بھی زیادہ درستی سے سلسلہ کلام جاری رکھا۔  
 ملتجی کا جی بھر آیا۔

کچھ زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا اسے اس نئے اسکول میں بحیثیت پرنسپل اپنی ذمہ داری سنبھالے ہوئے مگر اس قلیل عرصے میں اس نے اپنی ان تھک محنت، لگن اور غیر معمولی دلچسپی سے ایک بگڑے ہوئے ادارے کی حالت ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ ادارہ جہاں نہ صفائی ستھرائی تھی نہ نظم و ضبط۔ قوانین و قواعد کا احترام تھا نہ بہتری اور ترقی کی امنگ۔ اب ایک نئی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ بچے، والدین اور اساتذہ کی اکثریت اس تبدیل شدہ صورت حال سے مطمئن اور خوش تھی۔ ابھی دو روز پہلے ہی تو غزالہ ناصر صبح اسمبلی کے بعد گراؤنڈ میں اس کے ساتھ کھڑی بڑے فخر سے اسکول کی عمارت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں ”میڈم جی آپ نے تو اسکول کی حالت ہی بدل ڈالی۔ بچے، ان کے والدین اور کام کرنے والے ٹیچرز بھی بہت خوش ہیں۔ میں چونکہ اسی علاقے میں رہتی ہوں اس لیے مجھے خبریں ملتی رہتی ہیں کہ بچوں کے والدین اور سرپرست آپ کے آنے سے کتنے خوش ہیں اور ہم لوگ بھی میڈم جی۔ اب واقعی اسکول میں کام کرنے میں لطف آتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات، نئی تبدیلی مزہ دیتی ہے۔ کلاسوں میں ٹیچرز کے باقاعدگی سے جانے سے پڑھائی کے حالات بھی کافی بہتر ہوئے ہیں۔“ غزالہ ناصر کی اس بات پر اس نے کہا تھا ”ابھی کہاں غزالہ ابھی تو ہم دو گام ہی چلے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ہم اپنی تمام کلاسز کے مروجہ نصاب کو ایسی تخلیقی نوعیت کی تقریری اور تحریری فعالیتوں سے ہم آہنگ کر دیں گے کہ بچے زیادہ دلچسپی سے پڑھیں گے۔“  
 اس کی آنکھوں کے کنارے اس خیال سے نم ہو گئے کہ اس نے تو بیہ کی بیوگی کے صدمے کو بھی اپنے منصبی فرائض پر حاوی نہ آنے دیا تھا۔

نہ جانے کتنے دن تھے ایسے جب وہ اسکول کی تنظیم نو کے کاموں میں ابھی چھٹی کے بعد بھی دو دو تین تین گھنٹے اسکول میں رکی رہی تھی، کبھی کبھی تو می بھی خفا ہو جاتیں ”ایسے کوئی نوکری نہیں کرتا۔“  
 ”والدہ ایک مرتبہ لائن پر آ جائے گا نا ادارہ تو پھر کوئی پریشانی نہیں ہوگی نہ مجھے دیر تک رکنے کی ضرورت ہو کرے گی۔“

اسکول پہنچنے کے بعد صبح سے دوپہر تک اور دیر تک رکنے کی صورت میں سہ پہر تک وہ بے ٹکان کام کرتی رہی تھی۔ کبھی رنگ و روغن، کبھی گراؤنڈ کی ناہمواری کو ہموار کرنے کی تک و دو، کبھی گملوں اور کھارپوں کی ترتیب نو کی فکر، کبھی ٹوٹے فرنیچر کی مرمت، کبھی بچوں اور معلمات کو اپنے اپنے جماعت کے کمرے کی آراستگی کی ترغیب تو کبھی تعمیری کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی تحریک۔ کبھی کمرہ ہائے جماعت کا معائنہ تو کبھی بچوں کو معلمات کے کردائے گئے کام کی پڑتال۔ کبھی بابو کے کسی ڈرائفٹ کی اصلاح تو کبھی دفتری ریکارڈ کی ترتیب نو اور درستی کی فکر۔ وہ تو وقفے کے دوران چائے کے لیے بھی صرف پانچ سات منٹ لیتی تھی۔ غزالہ ناصر جو کافی دنوں سے اس کے ساتھ ہی چائے پی رہی تھیں اکثر کہتیں، میڈم آپ ہر ایک میں تو تمھوڑا سارے لیکس کر لیا کریں۔ وہ مسکرا دیتی اور کبھی گراؤنڈ میں جا کر بچوں کی حرکات اور رویوں کا جائزہ لینے لگتی، کبھی اپنے دفتری میں کسی کام میں مصروف ہو جاتی۔  
 محض چند ہی ماہ کے قلیل عرصے میں اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے دو سال کا کام کر ڈالا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا کہ کئی سالہ بگاڑ کو سدھا دیا تھا۔

اور ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب!

ڈائریکٹر ایٹ کے سرور اور انسپری اعلیٰ سے بے بھاؤ کی سنانے کے درپے ہو رہے تھے!  
 ”سر! آئی ایم سوری سر! آئی ایم ریلی سوری..... کہ میں ڈائریکٹر ایٹ کی توقعات پر پوری نہیں اتر سکی۔“ اس کی آواز رندہ رہی تھی۔

ڈپٹی صاحب کچھ نہیں بولے اور وہ کچھ دیر منتظر رہی کہ وہ کچھ بولیں۔ اس توقف نے اسے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پانے میں مدد دی۔

”سر! اگر بدتری کو بہتری اور تنزی کو ترقی سے بدلنے کی کوشش کرنا جرم ہے، اگر اپنے فرائض منصبی کو دیانت اور محنت سے انجام دینا خطا ہے تو مجھے اپنے جرم و خطا کا اعتراف ہے۔ قواعد و ضوابط کا احترام اگر ایک سنگین غلطی ہے تو مجھے اپنی اس غلطی کا بھی اعتراف ہے۔ ڈائریکٹر صاحب اگر اتنے زور درخ اور خشم مزاج ہیں کہ مقررہ قواعد و ضوابط سے ہٹ کر ان کی مرضی کے مطابق کسی کو فیور نہ دینے پر میرا جادلہ کسی ہارڈ ایریا میں کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کر دیں۔ مگر میں وہی کروں گی جو قواعد و ضابطہ کہتا ہے۔ آئی ایم سوری سر، اپنے ادارے کی بہتری کے لیے میں خود بھی اور ٹائم کروں گی اوروں سے بھی کرواؤں گی چاہے ڈائریکٹر ایٹ میرے اس جرم کی سزا میں مجھے ہارڈ ایریا میں ٹرانسفر کرنے کی بجائے سولی پر ہی کیوں نہ لٹکا دے۔ میں تو صرف چند ماہ سے اس ادارے میں ہوں۔ جن لوگوں کی اس ادارے میں چھ چھ سات سات، یا بارہ، پندرہ، پچیس اور تیس تیس سال کی نوکریاں ہیں ان کی عدم دلچسپی اور نکلے پن کی وجہ سے ادارہ ان حالوں کو جا پہنچا کہ اس کی درستگی کے لیے گزشتہ چند ماہ سے میں بے ٹکان کام کر رہی ہوں اور ان سے بھی کردار ہی ہوں۔ میں جانتی ہوں دیر تک روکنے کی شکایات انہی لوگوں کی طرف سے پہنچی ہیں جو نکلے پن کے عادی ہیں مگر ان دنوں شرمناک صورتی کام کر رہے ہیں۔ سر ان شکایات کی وجہ سے میں کام کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔ جب تک یہاں ہوں اسی طرح کام کروں گی اور ہارڈ ایریا سے بھی ڈائریکٹر ایٹ کو میرے بارے میں ایسی ہی شکایات ملیں گی۔“

”بی بی اتنا طویل مکالمہ آپ ایک سانس میں بول گئیں، درمیان میں سانس تو لے لیتیں۔“

”رہنے دیجئے سر کیا کروں گی سانس لے کر۔“ اس کے لہجے میں دل گرنگی بھی تھی غلطی بھی۔

ڈپٹی صاحب بے ساختہ مسکرا دیے۔

”سانس لینا زندگی کے لیے ضروری ہے۔“ ڈپٹی صاحب کا لہجہ بدل گیا۔

وہ خاموش رہی۔

ڈپٹی صاحب دھیرے سے کھنکھارے پھر بولے ”کام کرنے والی آپ واحد نہیں ہیں منجہالی بی، بہت سے

ہیں۔ ہمارے اپنے ہی ڈائریکٹر ایٹ میں بیسیوں مگر آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ بہت تیز چلنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

شعبہ چل چلیں ہاتھ پاؤں بچا کر چلیں۔“

”کس کے ہاتھ پاؤں سر؟“

ڈپٹی صاحب دھیرے سے مسکرا دیے ”اپنے بھی، دوسروں کے بھی۔“ انہوں نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر بولے۔

”ملازمت میں دس مصلحتوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ میں..... ڈائریکٹر صاحب سے آپ کی سفارش کرنے کی کوشش

کروں گا۔“

”رہنے دیجئے سر۔“

”کیوں؟“ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”نہ میں کسی سفارش پر ملازمت میں آئی ہوں نہ سفارش پر رہنا پسند کروں گی۔ ڈائریکٹر صاحب جہاں بھی میرا

ٹرانسفر کرنا چاہتے ہیں کر دیں۔ مجھے مشکل ہوئی تو.....“



”تو؟“

”ریزائن کر دوں گی۔“

ڈپٹی صاحب نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک فیصلہ کن کیفیت تھی۔  
”سرکاری نوکری آسانی سے نہیں ملتی بی بی۔“

”جانتی ہوں سر۔“

”پھر ایسی بات کیوں کرتی ہیں۔ ریزائن کرنے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ افسران کی ناراضگی سے بچتے ہیں۔“

”آئی ایم سوری سر، افسران کی خوشنودی کے لیے میں غلط کام نہیں کر سکتی۔“

”بی بی افسر، افسر ہوتا ہے۔ اسلام بھی کہتا ہے امیر کی اطاعت کرو۔“

”سر! اسلام میں امیر کا تصور بھی تو دیکھیے۔ جواب دہی سے مبرا نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے پہلے خطبے میں

قوم سے فرماتے ہیں جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے راستے پر چلوں میرا ساتھ دینا اور جب مجھے اس کے راستے سے رُگردانی کرتے دیکھوں میرا ساتھ چھوڑ دینا۔ حضرت عمر فاروقؓ سے ایک کُرتے کا حساب طلب کرتا ہے ایک شخص اور خلیفہ دومؓ خندہ پیشانی سے حساب دیتے ہیں۔ امیر زمانہ کو اس معیار کا یا را کہاں سر!“

ڈپٹی صاحب کچھ خفیف سے دکھائی دینے لگے۔

”میڈم ملہتا میں کوشش کروں گا کہ آپ کے بارے میں ڈائریکٹر صاحب کی رائے بدل سکوں۔ سر دست میں

آپ کو یہ یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ آپ جس کام کے لیے میرے پاس آئی تھیں انشاء اللہ وہ ہو جائے گا۔ مہتاب کا ٹرانسفر آرڈر میں آج ہی کینسل کروا دیتا ہوں۔“

”تھینک یوسر..... تھینک یو دیری میچ۔“

”ویسے ایک بات پر تو میں بھی آپ سے ناراض ہوں۔“

ملہتانے چونک کر انہیں دیکھا۔

”کس بات پر سر؟“

”ایک خاتون کو بھیجا تھا میں نے آپ کے پاس ان کی بچی کے داخلے کے سلسلے میں۔ آپ نے انکار کر دیا۔“

”سر! اس سلسلے میں تو بہت سے لوگ ناراض ہیں مجھ سے۔ کلاسیں کھپا کھچ بھری پڑی ہیں۔ بچوں کو بٹھانے کے

لیے نہ کمروں میں گنجائش ہے نہ فرنیچر۔ مزید داخلے کیونکر دیئے جائیں۔“

”بہر حال بعض لوگوں کو ادبلا کر لانے کے لیے گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔“

ملہتا دھیرے سے مسکرا دی۔

”آپ کے پاس میرے بارے میں یہ شکایت نہیں پہنچی سر کہ میری وجہ سے بہت سے بچے اسکول چھوڑنے پر مجبور

ہو گئے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ بغیر ایڈمیشن کے کلاسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔“

”کیا مطلب؟“

”لوگوں کو ادبلا کر لانے کے چکر میں چراسی، جمعدار، چوکیدار، کلرک، ٹیچرز سب ہی نے اپنے اپنے جانے

دالوں کے بچوں کو بغیر ایڈمیشن کے کلاسوں میں بٹھا رکھا تھا۔ تقریباً ہر سیکشن میں ایسے چار چھ بچے بیٹھے ہوئے تھے۔

میرے علم میں ایک دو کیسز آئے تو میں نے فریق دار بچوں کے داخلہ ریکارڈ کی چھان بین شروع کر دی۔ اس کارروائی

کے نتیجے میں کلاسوں میں غیر قانونی طور پر بیٹھے کافی بچے تو چپ چاپ گھر بیٹھ گئے۔ جو آتے رہے ان کے والدین اور

سرپرستوں کو مطلع کیا گیا کہ ان کے بچے بغیر داخلہ کلاسوں میں بیٹھے ہیں تو انہوں نے داویا مچا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تو بچوں کی فیس بھی باقاعدگی سے ادا کرتے رہے ہیں۔“

”ریلی!“

”جی سر۔“

”اور فیس کہاں جاتی رہیں؟“

”آف دی ریکارڈ اسکول کا ایک غیر قانونی کھانا چل رہا تھا۔ ان کی فیس اس میں چلی جاتیں اور اسکول کے تمام ایسے اخراجات جن میں اسکول آڈٹ کے بکھیروں سے بچنا چاہتا اس کھاتے سے پورے کیے جاتے۔“

”اوہ گاڈ! مگر سوال یہ ہے کہ اس منہا کہ ایسے بچے پرائمری اسکول پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول میں کیونکر داخلہ پاتے ہوں گے۔“

”یہ میں نہیں جانتی سر۔“

”مگر آپ نے یہ جاننے کی ضرورت تو ضرور محسوس کی ہوگی کہ ان بچوں کو اسکول میں بٹھانے والا آخر کون ہے!“

”سر بالفرض اگر کوئی بیرونی ہاتھ بھی ہو تو بھی ایسے کام اس وقت تک نہیں کیے جاسکتے جب تک انہیں اندر والوں کی سپورٹ نہ ہو۔ پہلے دن حاضری لیتے ہی کلاس پیپر کو پتا چل جاتا ہے کہ اس کی کلاس میں کون سا بچہ ہے جو رجسٹر میں نام لکھے بغیر کلاس میں بیٹھا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“

”سیدھی بات یہ ہے سر کہ اس کا رخیر میں جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا مجھے تو حسبِ توفیق سبھی حصہ بٹاتے محسوس ہوئے۔“

”آپ کا مطلب ہے ٹیچنگ اسٹاف بھی!“

”سب نہیں سر مگر ان میں سے بھی کئی۔“

”آپ نے ہمیں اس معاملے کی اطلاع نہیں کی!“

”سر! میں نے فاروقی صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ وہ کہنے لگے ڈائریکٹریٹ رپورٹ کریں گی آپ تو وہ انکوائری بٹھا دے گا۔ آپ کا روزمرہ کام متاثر ہوگا۔ اسٹاف آپ کو برا بھلا کہے گا کچھ عجب نہیں کہ متنفر ہو جائے، ادارے کی بدنامی ہوگی اور چور جیسا کہ ہمارے ہاں عموماً ہوتا ہے صاف بچ نکلیں گے لہذا بہتر یہ ہے کہ ہر فریق کا داخلہ ریکارڈ خود چیک کریں۔ ایک ایک طالب علم کے داخلہ ریکارڈ کی چھان بین کریں۔ غیر قانونی طور پر کلاسوں میں بیٹھے بچے خود ہی بھاگ لیں گے اور جو نہیں بھاگیں گے ان کے والدین اور سرپرست از خود ان لوگوں کی نشان دہی کر دیں گے جو ان کی پشت پر موجود رہے ہوں گے۔ میں نے ایسا ہی کیا سر۔“

”نشان دہی ہوئی ان لوگوں کی؟“

”جی سر..... بالکل ہوئی۔“

”اچھا!“ ڈپٹی صاحب چونکے ”آپ نے ہمیں رپورٹ بھجوائی؟“

”نہیں سر۔“

”کیوں؟“

”سر! آپ لوگوں کو دوسرے کام کچھ کم ہیں کرنے کو..... اور سر ہم سربراہانِ مدرسہ بھی اپنے اپنے اداروں میں ڈائریکٹریٹ ہی کے نمائندے تو ہیں۔“

”مگر آپ لوگوں کے اختیارات محدود ہیں۔ ایسے معاملات کی رپورٹ ہمیں ضرور آنی چاہیے تاکہ غلط اور ناجائز



کام کرنے والوں کے خلاف انضباطی کارروائی کی جاسکے۔“  
 ”بات یہ ہے سر کہ ایسے لوگوں کے چہرے ضرور پہچانے جاتے ہیں مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسے لوگ اپنے ہاتھ ہمیشہ صاف رکھتے ہیں۔ دستانے چڑھا کر واردات کرتے ہیں۔“  
 ”گویا ثبوت کے ساتھ کسی کو نہیں پکڑ سکیں آپ؟“

”سر! میرے خیال میں مجرم کو پکڑنے سے زیادہ اہم اور ضروری امر یہ ہے کہ جرم کا قلع قمع کیا جائے۔ میں نے ایک ایک کلاس پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ ہر بچے کا داخلہ ریکارڈ چیک کر رہی ہوں۔ انشاء اللہ میرے ہوتے کوئی دوبارہ یہ جرات نہیں کر سکے گا کہ ایک بچے کو بھی داخلے کے بغیر کسی کلاس میں بٹھا دے۔ ویسے سر جن بچوں کو اسکول چھوڑنا پڑا مجھے ان کا بہت افسوس ہوا۔ تصور ان کے والدین اور سرپرستوں کا تھا یا ان لوگوں کا جن کی ملی بھگت سے وہ بچے داخلے کے بغیر اسکول میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بے چارے بچوں کا کیا تصور مگر وہ ایک مثل ہے تاکہ کرنا کوئی ہے بھرتا کوئی ہے۔“

”آپ کو اختیار تھا چاہتیں تو ان بچوں کے داخلے ریگولرائز کر سکتی تھیں۔“ ڈپٹی صاحب بولے۔  
 ”میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا سر! ناجائز کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کے لیے۔ جن لوگوں کے بچے اسکول چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں ان میں سے دو چار نے تو ان لوگوں کی خبر ضرور لی ہوگی جنہوں نے انہیں غلط راستہ بچھایا ہوگا۔ اپنے ایک درجہ چہارم ملازم کے بارے میں مجھے اطلاع ملی کہ ایسے ہی ایک بچے کے باپ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے سر راہ خوب مارا۔“

ڈپٹی صاحب مسکرا دیے۔  
 ”خوب! تو گویا آپ لوگوں کی مرمت لگوا کر خوش ہو رہی ہیں۔“  
 ”سر! غلط کام کرنے والوں کا تو بھر کس نکال دینا چاہیے لوگوں کو۔“  
 ڈپٹی صاحب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

”آپ سے ملاقات پُر انکشاف رہی مس منیہا۔ ایڈمیشن کے بغیر بچوں کو اسکول میں بٹھائے جانے کا تذکرہ ضرور کروں گا ڈائریکٹر صاحب سے تاکہ انہیں بھی پتا چلے کہ ہمارے اداروں میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔“  
 ”سر! پھر تو ڈائریکٹر صاحب میرا تبادلہ یقینی طور پر ادھر کر دیں گے۔“ منیہا نے اپنی دائیں انگشت شہادت سے اوپر اشارہ کیا۔

ڈپٹی صاحب ہنس دیے۔  
 ”لگتا ہے بہت خائف ہو گئی ہیں آپ اُن سے۔“  
 ”میری والدہ کہا کرتی ہیں گھوڑے کی دولتی اور افسر کی ناراضگی سے دور ہی رہنا چاہیے۔“  
 ڈپٹی صاحب پھر ہنس دیے۔

☆☆☆

علیب کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور بری کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ ممی اور منیہا کے بازاروں کے پھیرے لگ رہے تھے۔ کبھی عروسی ملبوسات کی دکانوں پر، کبھی جیولرز کے ہاں۔ مگر اس تیاری میں وہ خوشی اور جوش و خروش کم تھا جو علیل کے اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے ان تیاریوں میں نظر آنا چاہئے تھا اور اس کا سبب وہ سانحہ تھا جو بیہ کو بھری جوانی میں بیوگی کا روگ لگا گیا تھا۔  
 نعیم کو بھی شادی کی تاریخ سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اس نے خواہ دو دن کے لیے ہی سہی اس شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ظہیر صاحب کو پتا چلا تو وہ بولے ”اگر وہ آ رہا ہے تو ہمارے ہاں سے کوئی بھی اس شادی میں نہیں جائے گا۔“ انہوں نے ”کوئی بھی“ پر بطور خاص زور دیتے ہوئے کن انکھیوں سے میہ کے کو دیکھا۔  
”یہ کیسے ممکن ہے ظہیر صاحب!“ مسز ظہیر نے نرمی سے کہا ”ہماری بہو کے بھائی کی شادی ہے اور بھائی بھی اکلوتا اور..... نعم سے ان لوگوں کا ایک رشتہ قائم ہونے جا رہا ہے بلکہ شرفا میں تو جہاں زبان دے دی سمجھے رشتہ قائم ہی ہو گیا۔“

”اب ایک رشتہ رہے گا یا تو ہم سے یا ان سے“ ظہیر صاحب کا لہجہ دو ٹوک تھا۔  
”ہم ماں ہیں، ہم سے زیادہ تکلیف نہیں ہو سکتی کسی کو فرحان کی موت کی جب ہم نے معاف کر دیا نعم کو تو آپ بھی کیوں نہیں کر دیتے۔“  
”تا قیامت نہیں کروں گا“ ظہیر صاحب جذبات کی شدت سے کانپنے لگے۔

مسز ظہیر نے بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا۔  
میہ نے یہ سارا قصہ می کو سنایا تو وہ متفکری ہو گئیں۔  
”تمہارے سر نے تو بغض معاویہ کو مات کر دیا۔ نعم نے کوئی جان بوجھ کر تو حادثہ کیا نہیں۔ بس وقت کی بات تھی۔ بول کہو فرحان بے چارے کی یونہی لکھی تھی اللہ کی مرضی یہی تھی۔“  
”مگر کبھی کبھی مجھے بھی یہ خیال آتا ہے کہ اگر ہمیں فرحان کے انتقال سے قبل حادثے کی اطلاع مل گئی ہوتی تو شاید..... شاید ہماری دعائیں..... ہمارے آنسو انہیں بچا لیتے“ میہ کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز بھرا گئی۔  
”جس کی آگئی اے کون بچا سکتا ہے بیٹا!“ می نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”دعائیں بچا لیتی ہیں می..... بڑے بڑے معجزے ہوتے ہیں اسپتالوں میں..... لا علاج مریض صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ دم توڑتے مریضوں کی سانسیں واپس آ جاتی ہیں۔ آخری سانسوں میں اسپتال لائے جانے والے اپنے چاہنے والوں کی دعاؤں سے جی اٹھتے ہیں۔“

”بس بچے اب تو جو ہونا تھا ہو چکا صبر کرو..... منہا کے سامنے کبھی ایسی بات نہ کرنا ورنہ وہ سمجھے گی کہ تمہارے دل میں بھی نعم کی طرف سے رنجش اور گلہ ہے۔“  
”میں سمجھتی ہوں آپ فکر نہ کیجئے۔“  
”اچھا یہ بتاؤ“ منا کیسا ہے؟“

”دادا! اس کی جان چھوڑیں تو مجھے پتا چلے کہ وہ کیسا ہے؟“ میہ کے لہجے میں دل گرفتگی کے ساتھ بیزاری بھی تھی۔  
”کوئی بات نہیں بیٹا، خوش قسمت بچہ ہے کہ اسے اتنا پیار کرنے والے لوگ موجود ہیں“ می نے ہمیشہ کی طرح اس کا دل رکھنے کی کوشش کی۔

”ماشاء اللہ بغیر سہارے کے بیٹھنے لگا ہے۔“  
”ماشاء اللہ! تم دیکھتی جاؤ ابھی بیٹھنا سیکھا ہے پھر چلنے اور بھاگنے دوڑنے بھی لگے گا۔ بچے تو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو جاتے ہیں۔“

خوش آئند دلوں کا تصور میہ کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ کی صورت کھیلنے لگا۔

☆☆☆

ڈپٹی صاحب نے حسب وعدہ مہتاب کے تبادلے کے احکامات کی منسوخی کا پروانہ جاری کر دیا تھا۔ مہتاب انتہائی شکر گزار ہوا۔ اس کی بیوی بھی شکر یہ ادا کرنے کے لیے بطور خاص منہا کے پاس آئی۔  
مہتاب کے کوارٹر کے سامنے باغیچے کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ باغیچہ اور اس کے ارد گرد موجود ہاڑھ کے ہٹ



جانے سے گراؤنڈ کی کچھ اور ہی صورت نکل آئی تھی۔ اس کی کشادگی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسکول کی مرکزی عمارت سے دکھائی دینے والے گراؤنڈ کا منظر ہی بدل گیا تھا۔ اس مثبت تبدیلی کا اعتراف اب وہ بھی کر رہے تھے جنہوں نے بچے کا قصہ چھڑنے پر درپردہ مہتاب کے دل میں پرنسپل کے خلاف باغیانہ جذبات کو ہوا دینے کی کوشش کی تھی۔

پی ٹی آئی صاحب ایک روز کہنے لگے ”میڈم صاحبہ! یہ آپ ہی کی ہمت تھی جو آپ نے مہتاب سے اس کے کوارٹر کے سامنے سے باغ ہوا دیا۔“

”ایسی بات نہیں ہے پی ٹی آئی صاحب! یہ کام تو آپ بھی کر سکتے تھے بلکہ ہر وہ شخص جسے ادارے کے آؤٹ لک اس کی خوشنمائی سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی۔“

پی ٹی آئی صاحب معنی خیز انداز میں مسکرا دیے اور بولے ”میڈم صاحبہ! ادارے کے آؤٹ لک اور اس کی خوشنمائی سے کسی کسی کو دلچسپی ہوتی ہے۔ صاحبان اختیار میں سے اکثر کو اپنے گھروں کے آؤٹ لک اور خوشنمائی سے دلچسپی ہوتی ہے اور بس!“

”کیا مطلب پی ٹی آئی صاحب؟“

”میڈم صاحبہ! پچھلی میڈم صاحبات تو مہتاب کو اپنے گھروں میں گارڈننگ کے لیے اپنے اپنے گھر بھیج دیا کرتی تھیں۔ اسی لیے اسے کچھ کسی سستی ہی نہیں تھیں۔ یہ تو آپ ہیں جنہوں نے اسے اپنے گھر کا راستہ نہیں دکھایا ہے اب تک۔ پچھلی میڈمات تو یہاں سے پیریاں اور گلی تک گھر بھجوا دیتی تھیں۔“

وہ چپ رہی۔ اپنے حقد میں کے بارے میں پی ٹی آئی کا یہ تبصرہ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ جانے والوں کو ان کے جانے کے بعد برا کہنا اخلاقاً مناسب نہ تھا گو مناسب تو وہ بھی نہ تھا جو پی ٹی آئی کے الفاظ میں ”پچھلی میڈم صاحبات“ اور ”میڈمات“ کرتی رہی تھیں۔ سرکاری افرادی قوت اور سرکاری وسائل کو ذاتی تصرف میں لینا کہاں کا انصاف تھا؟ سراسر پیشہ ورانہ بددیانتی تھی۔

”میڈم صاحبہ! یہ تو آپ ہی ہیں جو آپ نے مہتاب جیسے آدمی کو قابو میں کر لیا اور مہتاب ہی کیا میڈم صاحبہ! اقبال کچھ کم تھا کیا۔ کلاسوں کی ڈسٹنگ پہلی بار ان گنہگار آنکھوں نے اسے آپ ہی کے دور حکومت میں کرتے دیکھی ہے۔ آپ کو تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ وہ کس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہا کرتا تھا۔“

منتہا کو ان کی بات پھر اچھی نہ لگی۔ بجا کہ ادارے میں اقبال کے بہت سے ناجائز اور غیر قانونی کاموں میں ملوث رہنے کے شواہد مل چکے تھے۔ وہ بچوں کو غیر قانونی طور پر کلاسوں میں بٹھانے، سالانہ امتحانات میں قبل ہو جانے والوں کو الٹے سیدھے طریقوں سے اعلیٰ جماعتوں میں چڑھوا دینے، اپنی خدمات کے عوض بچوں کے والدین اور سرپرستوں سے چھوٹے موٹے نذرانے لینے کا مرتکب پایا گیا تھا مگر پی ٹی آئی کو اس پر یوں انگشت نمائی کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہر انسان کمزوریوں اور شہزادیوں سے متصف ہوتا ہے۔ اقبال میں منتہا کے نکتہ نظر سے ایک وصف تو تھا اور وہ یہ کہ اس نے اپنی غلطیوں پر جھوٹ کے پردے ڈالنے کی بجائے شرمساری سے سر جھکا دیا تھا۔

”میں نے سنا ہے پی ٹی آئی صاحب آپ بھی مارنگ اسمبلی کے بعد اسکول میں کم کم ہی نظر آیا کرتے تھے۔“

انہوں نے بے ساختہ ہڑا کر اسے دیکھا اور اٹکتے ہوئے بولے ”کو..... کون..... کون کہتا ہے میڈم؟“

”بات یہ ہے پی ٹی آئی صاحب کہ ہم میں سے ہر انسان کے ساتھ اللہ میاں نے کرانا کاتبین کی جوڑی تو رکھ ہی رکھی ہے، ان کے علاوہ بھی ہم میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی خبر رساں لگا ہوا ہے جو موقع پاتے ہی ہماری رپورٹنگ کی کوشش کرتا ہے۔“

”آپ کو غلط اطلاع ملی ہے میڈم صاحبہ۔“

”مجھ میں یوں تو بے شمار عیب ہیں پی ٹی آئی صاحب لیکن ایک بڑا عیب یہ ہے کہ میں سنی سنائی کی بجائے آنکھوں

دیکھی کو اہمیت دیتی ہوں۔ جو ہوتا رہا اسے جانے دیں، میرے ساتھ تو سب ہی بہت تندہی اور دلچسپی سے کام کر رہے ہیں۔ میں آپ لوگوں کے اس تعاون پر آپ سب کی شکر گزار ہوں۔“

پلی لی آئی صاحب قدرے مطمئن دکھائی دینے لگے۔

”میڈم صاحبہ سربراہ پُر جوش ہو تو سب ساتھ چل پڑتے ہیں۔ خداوند کریم نے تو ہر انسان کو کام ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بعض کام کرنے والے کام لینے والے بھی بن جاتے ہیں۔ جیسے آپ! یہ کام لینے والے کی قابلیت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کام کرنے والوں سے کیا اور کتنا کام لیتا ہے۔ آپ کو کام لینا آتا ہے۔“

”ادھو پلی لی آئی صاحب ایک ضروری بات یاد آئی۔ ہائی اسکول اسپورٹس ٹورنامنٹ کی افتتاحی تقریب میں ہمارے اسکول کو پلی ٹی منٹو پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آپ تیاری شروع کر دیں۔“

”جی بہتر..... بس آپ مجھے ایک ٹیچر دے دیں۔ ہیلپر کے طور پر۔“

”آپ کے خیال میں کون بہتر رہیں گی۔“

”مس فریجہ بہت اکیٹو ہیں اور اس قسم کی سرگرمیوں میں دلچسپی بھی رکھتی ہیں۔ اگر آپ انہیں عارضی طور پر دو پیریڈز اس شوکی تیاری کے لیے فری دلوادیں تو انشاء اللہ اچھے نتائج کی امید ہے۔“

”میں فریجہ کے لیے ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کر دئے دیتی ہوں۔“

”شکریہ۔“

☆☆☆

نفسہ کو چوکی لڑنا پڑ رہی تھی!

وہ اکیلی تھی اور زندگی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ حملہ آور! ادھر خانگی اور بیرون خانہ ذمے داریاں۔ ادھر روزمرہ احتیاجات زندگی اور ان کے مصارف، ایک طرف بچوں کے روز افزوں تعلیمی مصارف تو دوسری جانب ہوشربا گرانہ!

زندگی کے مقابل وہ تنہا ضرورت تھی مگر صد شکر کہ نہتی نہ تھی۔ زندگی کے تابڑ توڑ حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس ایک ایسا ہتھیار تھا جو اسے مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنی قوت سے حوصلہ دے رکھتا اور یہ ہتھیار تھا اس کی ملازمت!

اماں کہا کرتی تھیں عورت کا سب سے بڑا سہارا اس کا مرد ہوتا ہے مگر نفسہ کا تجربہ کہتا تھا مرد بے وفائی کر جاتا ہے مگر نوکری ساتھ دیتی ہے اسی لیے وہ دونوں بیٹوں ہی نہیں بیٹی کی تعلیم کو بھی انتہائی اہمیت دے ہوئے تھی۔ چوتھی سب سے چھوٹی تو ابھی اس شمار میں نہ تھی۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی تھی کہ تینوں بچے اپنے اپنے تعلیمی میدان میں نمایاں تھے اور بڑے دونوں بچے تو نفسہ سے ٹیوشن لینے کے لیے گھر آنے والے بچوں کو پڑھانے میں اس کی مدد کر کے اپنے تعلیمی مصارف میں گویا اس کے ممد و معاون تھے۔

گویا زندگی کی گاڑی ایک پہرے پر بھی چل رہی تھی!

مختار کی رشتے دار خاتون کی زبانی اس کی دوسری شادی کی خبر سن کر اسے بہت غصہ آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا مختار کی بہن اور اس کے دوسرے گھر والوں کو وہ خوب ذلیل و رسوا کرے گی۔ ان سے پوچھے گی کہ اس کی دوسری بلکہ تیسری شادی اور اس کے اگلینڈ فرار ہو جانے کے اصل سبب سے اسے بے خبر رکھ کر انہوں نے اس سے کب کی اور کون سی دشمنی کا حساب بے باق کرنے کی کوشش کی تھی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اب پوچھ گچھ اور گلے شکوے سے کیا فائدہ تھا! اسے تو جو کرنا تھا وہ کر چکا تھا۔ نفسہ کی برداشت اور تحمل کا عالم تو یہ تھا کہ اس نے خود مختار سے بھی جو وہاں سے بڑی ڈھٹائی اور صفائی کے ساتھ فون کیا کرتا تھا کچھ نہیں پوچھا تھا۔ حالانکہ رابیل اکثر کہتی تھی۔ ”آپ ان سے پوچھتیں



کیوں نہیں۔“

”کیا پوچھوں بیٹا؟“

”یہی کہ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں۔“

”جو انہیں کرنا تھا کر چکے پوچھنے سے فائدہ!“

”نہ پوچھنے کا فائدہ؟“

”نہ پوچھنے کا فائدہ یہ ہے... میری جان کہ اس کے دل میں چھپا چورا سے ڈرانا رہے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی تو تمہارا باپ اس غلط فہمی میں ہے کہ ہم لوگوں کو کچھ معلوم نہیں اس لیے اسے تھوڑا یا بہت یہ خوف تو ہو گا کہ کہیں ان لوگوں کو پتا نہ چل جائے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو پتا چل چکا ہے تو اس کے دل سے یہ ڈر جاتا رہے گا۔ حالانکہ مجھے شبہ ہے کہ اسے کوئی ڈر کچھ شرم و حیا بھی ہوگی لیکن بالفرض محال اگر ہے تو میں چاہتی ہوں وہ برقرار رہے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا ڈر بھی انسان کو فائدہ دیتا ہے بیٹا۔“

راول نے باپ کے ذکر کو گویا ذکرِ ممنوعہ سمجھ لیا تھا۔ مختار کے بارے میں گھر میں کوئی بات ہو بھی رہی ہوتی تو وہ انجان بن جاتا۔ ان سنی کر دیتا۔

”یار! تم اپنے باپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔“ ایک روز ماموں نے اس سے کہا۔

”آئی جسٹ ڈونٹ ڈانٹ ٹو ماموں۔“ اس کے لہجے میں کرب انگیز تھی۔

فضہ کی نگاہیں بھائی کی نظروں سے ملیں اور جھک گئیں۔

☆☆☆

نیا تعلیمی سال شروع ہو چکا تھا۔ سالانہ امتحانات کے نتائج کے بعد کافی دن تو بچوں کے والدین، سرپرستوں اور سفارشیوں سے اسی بحث و تمحیص میں گزر رہے کہ بچہ فیل ہے اس لیے اسے پاس کرنا ممکن نہیں۔ نہ جانے کیوں والدین کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بڑھائی میں کمزور بچے کو دھکا دے کر آگے بڑھا دینا نہ ان کے حق میں فائدہ مند تھا نہ بچے کے لیے یا شاید وہ اس بات کو سمجھتے بوجھتے بھی نہیں سمجھنا چاہتے تھے۔ پہلی جماعت میں فیل ہو جانے والے بچے کو رعایتی درجے میں پاس کروانے کے لیے والدین علاقے کے کونسلر سے لے کر ایوانِ صدر اور وزیراعظم کے معتمدِ خاص تک کی سفارشیں لے آئے۔

اودھا! کس مشکل میں جان تھی اور کتنا کڑا مرحلہ!

آدمی کس کو خوش کرے، کس کو ناراض۔

ڈائریکٹریٹ سے بھی بے شمار سفارشیں موصول ہوئیں۔

منہا ایک ہی اصول پر عمل پیرا رہی۔

”بچے کا جو نتیجہ دیا جا چکا وہی حتمی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔“

یہ اصول وہ فاروقی صاحب سے سیکھ کر آئی تھی۔

اس اصول کو اپنے ادارے میں لاگو کیا تو منہا کو یوں لگا جیسے یہ تو نسخہ شفا تھا۔

اپنے ہی اسکول کی ٹیچر کی سفارش ہو یا وزیراعظم کے معتمدِ خاص کا سفارشی رقعہ یہ نسخہ شفا تیر بہدف ثابت ہوا۔ گونا گونا گویاں بہت ہوئیں، دھمکیاں بھی ملیں۔ تھنیک بھی کی گئی۔ برے انجام کے ڈرواے دیے گئے۔ خانہ دار خواتین نے پلے پیار پیار کر بددعا میں بھی دیں مگر وہ انتہائی ثابت قدمی سے جی رہی۔

غزالہ ناصر نے ایک دن بڑی ہی خواہی سے کہا ”میڈم جی آپ ذرا احتیاط سے کام لیں۔“

”کسی احتیاط غزالہ؟“  
”مہتاب بتا رہا تھا کل اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد ایک خطرناک سا آدمی آپ کے گھر کا پتا پوچھنے آیا تھا۔“ وہ مسکرا دی۔

”بتا دیا اس نے؟“  
”نہیں میڈم جی مگر وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اس آدمی کے ارادے کچھ خطرناک لگتے تھے۔ اونچا قد تھا۔ سیاہ رنگت اور موٹی موٹی مونچھیں۔ مہتاب نے مجھ سے کہا ہے آپ میڈم کو سمجھائیں کہ احتیاط کریں۔“  
”یہ بات مہتاب خود بھی تو کہہ سکتا تھا مجھ سے۔“  
”وہ آپ سے ڈرنے لگا ہے۔“  
”اچھا! کب سے؟“

”جب سے آپ نے اس کا ٹرانسفر رکوا دیا ہے۔“  
وہ بے اختیار ہنس دی۔

”بڑی مضحکہ خیز بات ہے! اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ مشکور ہونے اور ڈرنے میں فرق ہے۔“  
”وہ کہتا ہے میڈم بڑی سوریس فل ہیں۔“  
”اچھا! یہ انکشاف اس نے کس وجہ سے کیا؟“  
”اپنا ٹرانسفر کینسل کیے جانے پر۔“

غزالہ پر اپنا بھرم رکھنے کو وہ خاموش رہی۔ اپنے ”سوریس فل“ ہونے کا اندازہ اسی کو تھا۔ ڈائریکٹر صاحب ذرا سی بات پر ناراض ہو کر بقول ڈپٹی صاحب اس کا اپنا تبادلہ ”ہارڈ ایریا“ میں کر دینے کو تیار تھے۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ مہتاب کا تبادلہ رکوانے کے لیے سفارش کرنے وہ ڈپٹی صاحب کے پاس جا پہنچی۔ طویل نشست رہی۔ ابتدا تو ان کے تیور بھی بگڑے ہوئے تھے۔ بات چیت ہوئی تو دھیرے دھیرے ان کے تیور اعتدال پر آئے۔ دس بارہ دن کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے انہیں از خود نوں کیا اور دل کے اندر براجمان ٹرانسفر کے خوف کو دباتے ہوئے بظاہر بڑے اعتماد سے قدرے شگفتہ لہجے میں بولی ”سر! وہ میرے ہارڈ ایریا میں ٹرانسفر کا کیا بنا؟“  
”چاہتی ہیں کہ ہو جائے؟“ ڈپٹی صاحب نے الٹا سوال داغ ڈالا۔  
”نہیں سر، میرا مطلب ہے اگر احکامات صادر ہونے والے ہیں تو میں باعزت طور پر جانے کے لیے سامان باندھ لوں۔“

”میں نے بات کی ہے ڈائریکٹر صاحب سے۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں بتایا ہے کہ آپ ماضی کے ایک اچھے اسکول کی تین مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کتنی لگن اور محنت سے کام کر رہی ہیں۔ انہیں یہ بھی بتایا ہے میں نے کہ آپ نے کچھ ہی عرصے میں اسکول کا نقشہ بدل ڈالا ہے۔ وہ کچھ تو میری باتوں سے ٹھنڈے ہوئے اور کچھ آپ کے اسکول کا چکر لگا کر۔“  
وہ بے ساختہ چونکی۔

”اسکول کا چکر لگا کر! کیا مطلب سر؟“

”ڈائریکٹر صاحب اور میں ایک روز آپ کے اسکول آئے تھے۔“

”کب سر؟ میں..... میں تو روز آتی ہوں اور تمام وقت اسکول میں موجود رہتی ہوں۔“

”تین چار دن پہلے۔ پہر کے وقت آئے تھے ہم دونوں، اسکول بلڈنگ کا چکر لگایا۔ درود یوار کا جائزہ لیا۔ کلاس رومز میں کھڑکیوں کے شیشے سے جھانک جھانک کر دیکھا۔ گراؤنڈ دیکھا۔ ہاتھ رومز دیکھے۔ تقریباً گھنٹے سوا گھنٹے ہم



لوگ وہاں رہے تھے۔“

”ادہ! لیکن چوکیدار نے مجھے نہیں بتایا۔“

”وہ ہوتا تو بتاتا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ آٹھ دس بجے گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے اور ہمارے استفسار پر اُن میں سے ایک لڑکے نے بتایا کہ چوکیدار سبزی خریدنے بازار گیا ہوا ہے اس لڑکے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ آپ کے چوکیدار کا بیٹا ہے۔“

”لیکن سرنہ تو مجھے چوکیدار نے بتایا نہ اس کے بیٹے نے کہ آپ لوگ آئے تھے؟“

”ہم نے اپنی شناخت ظاہر نہیں کی۔ دیے آپ کے چوکیدار کا بیٹا بھی آدھا چوکیدار معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں گراؤنڈ میں دیکھ کر اس نے کڑک کر پوچھا، آپ لوگ اس وقت اسکول کے اندر کیوں آئے ہو؟“

”جی سر، خاصا تیز بچہ ہے۔ ہمارے اپنے اسکول میں ففٹھ کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے۔“

”چوکیدار کو ہدایت کیجئے کہ اسکول کے بعد جب کسی کام سے باہر جائے تو گھر والوں کو ہدایت کرے کہ گیٹ اندر سے بند رکھیں اور ہاں آس پاس کے بچوں کا داخلہ بھی ممنوع ہونا چاہیے۔“

”سر! آپ کے آنے کا ایک فائدہ یہ تو ہوا کہ مجھے چھٹی کے بعد اسکول کے حالات کا کسی قدر علم ہوا۔“

”بس متبہا آپ کے ہاں تو ہم نے خاصے بہتر حالات پائے۔ بعض اسکولوں میں تو چھٹی کے بعد سرائے خانے کھلتے پکڑے ہیں ہم نے۔“

”کیا مطلب سر؟“

”چوکیدار اسکول کے کمروں کو لوگوں کی شب ب سری کے لیے کرائے پر اٹھا کر رکھتے ہیں۔“

”اچھا سر!“

”جی۔“

”سر! تو پھر میرے لیے ڈائریکٹر صاحب کے احکامات؟“ وہ ہنوز نیم درجا کی کیفیت میں تھی۔

”اسکول کی کاپلاٹ دیکھ کر تو مطمئن ہوئے ہیں وہ۔“

”سر آپ انہیں اسکول کے کام کے اوقات کے دوران کیوں نہیں لائے؟“

”ہمارا طریقہ واردات عموماً یہی ہوتا ہے۔ دفتر سے اٹھے تو راستے میں ایک دو ادارے سربراہان کی بے خبری میں دیکھتے ہوئے گزر گئے۔“

”گویا آپ سربراہان کی بے خبری میں اداروں سے باخبر رہتے ہیں۔“

”اکثر ان کی باخبری میں بھی چکر لگاتے ہیں۔“

”ہمارے ادارے کے لیے بھی کسی روز وقت نکالنے سر! اداروں میں افسران کی آمد و رفت رہے تو بہت سی چیزیں سنبھل جاتی ہیں۔“

”انشا اللہ آئیں گے مس متبہا ضرور آئیں گے۔ آپ کی موجودگی میں بھی آئیں گے۔“ ڈپٹی صاحب نے کہا۔

”سر! میری موجودگی کے دوران..... میرا مطلب ہے میرے ہارڈ ڈایری یا ٹرانسفر سے قبل۔“

”اطمینان سے کام کیجئے۔“

”جھینک یو سر۔“

ڈپٹی صاحب سے اس بات چیت کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی مگر سالانہ امتحانات کے بعد فیل شدہ بچوں کو پاس کرانے والوں کے اڑدھام میں ایک شخص ڈپٹی صاحب کا سفارشی رقعہ بھی لے آیا۔ انہوں نے اپنی مخصوص ڈیسک چٹ پر انگریزی میں لکھا تھا ”محترمہ! حامل رقعہ ہذا میرے قریبی دوست ہیں ان کی بھانجی دو مضامین میں فیل

ہے تعاون فرمائیں۔“  
وہ ککھش میں پڑ گئی۔

ہارڈ ایریا میں اس کے ٹرانسفر کی بات گو نہ جانے کہاں دب دبا گئی تھی مگر بہر حال یہ قصہ چھڑا تو تھا۔ ڈپٹی صاحب مہربانی نہ کرتے تو کیا عجب کہ ٹرانسفر ہو ہی گیا ہوتا۔

اور اب ڈپٹی صاحب کا سفارشی رقعہ!  
احسان کا جواب احسان سے نہ دینا طوطا چشی اور بے مردتی کے زمرے میں آتی۔  
مگر وہ بے شمار لوگ جنہیں وہ مایوس کر چکی تھی!  
وہ ان گنت سفارشی رقعے!

ان میں سے بعض بچے تو ایک ایک مضمون میں فیل تھے۔  
اور پھر ان کے علاوہ بھی تو..... بہت سے فیل شدہ بچے ایسے بھی ہوں گے جن کی سفارش کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔  
ان میں سے نہ جانے کون یتیم ہوگا۔ کس کی بیوہ ماں محنت مزدوری کر کے اسے پڑھانے لکھانے کی کوشش کر رہی ہوگی، نہ جانے کتنوں کے باپ بے روزگار ہوں گے، بیمار ہوں گے اور کیا عجب کہ فیل ہونے والا کوئی بچہ یا بچی امتحان کے دوران خود ہی بیمار رہی ہو۔ محدود اور کمتر وسائل والے والدین کے بچے تو بے شمار تھے اسکول میں۔ کیا ان کے بچوں کو فیل ہو جانے پر صرف اسی لیے پرانی کلاس میں روکنا اور اگلی جماعت میں ترقی نہ دینا جائز تھا کہ وہ ڈپٹی صاحب کے شناسانہ تھے اور ان سے سفارشی رقعہ نہیں لاسکتے تھے!

ڈپٹی صاحب کا سفارشی رقعہ اس نے اپنی میز کے شیشے پر پیپر دیٹ کے نیچے رکھ لیا اور سفارشی رقعہ لانے والے صاحب سے کہا ”بچی کا دو مضامین میں فیل ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ پڑھائی میں کمزور ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے اسی کلاس میں رہنے دیں۔“

”میڈم بچی اور رائج ہو چکی ہے۔“  
سفارش لانے والے عموماً جواز و دلائل بھی ساتھ لے کر آتے۔  
”آپ..... کل تشریف لائیں۔“

”سوئٹس آف یو..... امید ہے آپ فیور دیں گی۔“  
مذکورہ شخص کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر ککھش میں بیٹھی رہی۔ پائے رفتن نہ جانے ماندن والی صورت حال تھی، پھر انھی اسکول کا راولڈ لیا۔ ذہن مسلسل بو جھل رہا۔ پہلے ڈائریکٹر صاحب کو خطا کیا تھا کیا اب ڈپٹی صاحب کو۔  
ککھش اور ذہنی تناؤ بدرجہ غصے میں ڈھل گیا۔

شرم نہیں آتی سفارش کروانے والوں کو۔ سفارش کرنے والوں کو بھی تو خیال کرنا چاہیے۔  
مگر..... کیا ڈپٹی صاحب نے اس کی اپنی سفارش بھی نہیں کی تھی ڈائریکٹر صاحب سے!  
اس کا کیس اس کی عدم موجودگی میں گویا انہوں نے ہی لڑا تھا!  
سفارش تو اس کی بھی ہوئی تھی۔

لاحول ولاقوة۔

اسے خفقان سا ہونے لگا۔  
ابھمن اتنی تھی کہ چہرے سے بھی جھلکنے لگی تھی تبھی تو مسز ماجدہ رؤف نے پوچھا۔  
”خیریت تو ہے میڈم آپ کا چہرہ بہت اترا اتر اتر گیا ہے؟“  
”نہیں..... بالکل ٹھیک ہوں۔“



جھٹنی ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔  
 ”آج پھر ابھی ہوئی گھر گئی تو والدہ ضرور پوچھیں گی، کیا ہوا۔ خواہ مخواہ ٹیشن رہے گی۔ شاید رات کو سو بھی نہ پاؤں۔ اس قصے کو اسی وقت نمٹا دینا چاہیے۔“ اس نے سوچا۔  
 مگر کیونکر!

احسان کا بدلہ احسان سے ادا کر کے یا.....!  
 نہیں..... کسی ایک کو فیور دینا اور وہ بھی سراسر ناجائز انتہائی غلط ہوتا۔  
 ہار ڈا ایر یا ٹرانسفر ہوتا ہے، ہو جائے۔  
 ڈپٹی صاحب خفا ہوتے ہیں، ہوا کریں۔

جو غلط ہے غلط ہے۔  
 اگرچہ غلط اور صحیح کا فیصلہ بہت نجلی سطح پر ہے۔ ایک پرائمری اسکول بھلا کس شمار میں۔  
 مگر نہیں غلطی نیچے ہی سے تو اوپر کی جانب چلتی ہے۔  
 بات چھوٹی ہی تو بڑی بنتی ہے۔ بگاڑ نیچے سے ہی اوپر چلتا ہے۔  
 اور پھر تعلیمی ادارہ!

پرائمری اسکول!

بنیاد!

بنیاد میں غلطی کیوں کی جائے۔

یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ تو ایک معمولی سا پرائمری اسکول ہے اگر کسی فیل شدہ بچے کو پاس کر دیا تو کون سی قیامت آجائے گی۔

غلط بات غلط ہے۔ خواہ نجلی سطح پر ہو یا اوپر۔ اہل قریش میں دیگر برائیوں کے ساتھ ایک برائی یہ بھی عام تھی تاکہ جب کوئی کمزور آدمی غلطی کرتا تو اسے دبا لیتے اور بااثر افراد کی بڑی بڑی خطائیں بھی نظر انداز کر دیتے۔  
 شدید کشمکش کے بعد بالآخر اس نے ڈپٹی صاحب سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔  
 عارضی مصلحت، وقتی فائدے اور ذاتی مفاد کی خاطر ادارے کی عزت کو داؤ پر لگا کر اپنی ہی نظروں میں گر جانے سے بہتر تھا کہ سرخروئی کے ساتھ نقصان برداشت کرنا قبول کیا جاتا۔  
 نیتوں کا حال جاننے والا اور پر میزان لیے بیٹھا ہے۔

فون پر اس کی آواز سنتے ہی ڈپٹی صاحب نے غیر معمولی گرمجوشی سے کہا ”جی مس ملجہ میں خود آپ کو فون کرنے والا تھا۔“

”یقیناً اسی سلسلے میں۔“ اس نے سوچا۔

”سر! وہ..... ایک صاحب..... آئے تھے..... میرے پاس..... آپ کی چٹ لے کر۔“ اس نے اکتے ہوئے کہا۔

”جی..... جی..... اسی ازاے گڈ فرینڈ آف مائن..... آپ نے انہیں غالباً کل بلایا ہے۔“

”جی سر۔“ وہ ڈپٹی صاحب کی باخبری پر حیران رہ گئی۔

”مجھے امید ہے آپ نے ان کا کام کر دیا ہوگا۔“

کیسا ذمہ داری تھا۔ ڈپٹی صاحب کا آخری فقرہ۔

ان کا کام کر دیا ہوگا!

کاش ایسے لوگوں کا کام تمام کیا جاسکتا۔  
سفارش حاصل کرنے والے کہاں کہاں پہنچ جاتے تھے۔  
ایم پی ای، ایم این ای، ہنٹرز، بیورو کریٹس، پریذیڈنٹ ہاؤس، پرائم منسٹر ہاؤس!  
ایک سرکاری پرائمری اسکول میں داخلے اور نا اہل بچوں کو اعلیٰ جماعتوں میں ترقی دلوانے کے لیے!  
زندگی کے باقی شعبوں میں جہاں کھیل ہی کچھ اور تھا، مفادات کی نوعیت ہی انتہائی حساس تھی۔ خدا جانے کیا کچھ  
ہوتا ہوگا۔

”سوری سر۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا ”ان کی بچی کو پروموٹ کرنا ممکن نہیں ہے۔“ اور یہ کہتے ہی اسے یوں  
لگا جیسے وہ برزخ سے نکل آئی تھی۔ جنت یا جہنم کا فیصلہ آگے ہوتا تھا۔  
”میں..... سمجھا نہیں میڈم۔“ ڈپٹی صاحب بولے۔

”سر! یہ سالانہ امتحان کا نتیجہ تھا۔ ہم نے بچوں کے جوابی پرچے بہت احتیاط اور حتی الامکان غیر جانبداری سے  
چیک اور ری چیک کر دائے۔ نتائج بعد احتیاط مرتب کیے گئے۔ کلاس ٹیچرز کے ساتھ ایک ایک بچے کا نتیجہ میں نے  
فرداً فرداً ڈسکس کیا۔ کامیاب اور ناکام ہر دو قسم کے طلبہ کے گزشتہ دو امتحانات کے نتائج پر بھی نظر رکھی گئی۔ یہ دیکھنے  
کے لیے کہ کامیاب قرار پانے والوں نے اس امتحان میں گزشتہ امتحانات کے مقابلے میں کس مضمون میں بہتر  
کارکردگی دکھائی ہے اور کس میں پیچھے چلے گئے ہیں۔ اسی طرح ناکام قرار پانے والوں کے گزشتہ دو امتحانات کے  
نتائج کو مد نظر رکھ کر ہم نے یہ اندازہ کرنے کی کوشش کی کہ کمزوری کہاں اور کس درجے کی ہے سر! دیکھنے میں یہ آیا کہ  
سالانہ امتحان میں وہی بچے ناکام ہوئے جو گزشتہ دو امتحانات میں بھی کمزور رہے تھے اور ہم ان کے والدین اور  
سرپرستوں کو اسکول بلا کر نہ صرف ان کی کمزوریوں سے آگاہ کر چکے تھے بلکہ ہم نے انہیں گزشتہ دو امتحانات کے نتائج  
دیتے وقت ان کے جوابی پرچے بھی ان کے والدین، سرپرستوں اور ٹیوٹرز کو اس لیے دکھائے تھے کہ وہ اپنے بچوں کی  
پڑھائی میں کمزوری کی نوعیت اور اسباب بھی جان سکیں اور آئندہ امتحانات تک ان کی کمزوریوں پر قابو پانے میں  
اپنے بچے کی مدد اور رہنمائی کر سکیں۔“

”میڈم! آپ مجھے یہ ساری تفصیل کیوں بتا رہی ہیں۔ مجھے اس سے چنداں دلچسپی نہیں کہ آپ کے ادارے کا  
طریقہ کار گزشتہ دو امتحانات میں یا سالانہ امتحان میں کیا رہا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں نے جن صاحب کو  
آپ کے پاس بھیجا تھا، ان کی بچی کا آپ کیا کرنے جا رہی ہیں؟“

”سر! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمیں درست سمت میں کام کرنے کی قوت ڈائریکٹریٹ سے ملتی ہے۔  
ہماری قوت اور توانائیوں کا سرچشمہ آپ ہیں سر اور سر میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اداروں کی جانب سے تعلیمی نتائج کو  
شفاف اور حتمی ہونا چاہیے اور ان نتائج کو طلبہ اور والدین کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے کیونکہ ہمیں اپنے طلبہ کو یہی  
سکھانا ہے مگر کہ انہیں وہی کاٹنا پڑے گا جو وہ بونئیں گے۔“

”اوہ مس منجھا..... پلیز مختصر بات کیجئے..... ٹو دی پوائنٹ..... آپ اپنا بھی وقت ضائع کر رہی ہیں میرا بھی۔  
مجھے یہ بتائیے کہ آپ اس بچی کو پروموٹ کر رہی ہیں یا.....“ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی سر..... آپ کی بات پوری ہو جائے تو میں اپنا جواب عرض کرتی ہوں۔“ اس نے بڑے نستعلیق انداز میں  
کہا۔

”اگر آپ کو اس بچی کو پروموٹ کرنے میں کوئی تردد ہے تو میں ڈائریکٹر صاحب سے آرڈرز ایٹو کرواؤں۔“  
ڈپٹی صاحب کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”آپ بہتر سمجھتے ہیں سر لیکن ایک بات ہے۔“



”وہ کیا؟“

”اگر آپ اس بچی کو پروموٹ کرنے کے آرڈر ایٹھ کراتے ہیں تو میری آپ سے یہ درخواست ہوگی کہ ایک یا دو مضامین میں پبل شدہ تمام ہی بچوں کو ترقی دی جائے کیونکہ سریہ بچی دو مضامین میں پبل ہے۔ اگر یہ ترقی پاتی ہے تو دو مضامین میں پبل دوسرے بچوں کو بھی پروموٹ ملنی چاہیے اور جب انہیں ملے گی پروموٹ تو پھر ایک مضمون میں ناکام امیدوار تو ترقی نہ دیے جانے پر ہمارے خلاف عدالت تک جانے کا حق رکھتے ہیں۔“

”ایک بات بتائیے، آپ دوسرے بچوں کا کیس پلینڈ کر رہی ہیں یا ڈائریکٹریٹ کو کورٹ کی دھمکی دے رہی ہیں۔“

”دونوں میں سے ایک بھی بات نہیں سر..... میں تو حق و انصاف اور عدل و مساوات کی بات کر رہی ہوں..... سرفر سٹریشن، احساس محرومی اور احساس کمتری اسی طرح تو انسانوں اور معاشروں میں سرایت کرتا ہے نا کہ جب یکساں حالات میں دو افراد کے ساتھ یکساں رویہ نہ رکھا جائے ایک کو فیور دیا جائے اور دوسرے کو نظر انداز کر دیا جائے۔“

”مس منجہا، آپ بھول رہی ہیں کہ آپ معلم اخلاقیات یا ماہر سماجیات نہیں ایک پرائمری اسکول کی پرنسپل ہیں۔“

”سوری سر استاد معلم اخلاقیات بھی ہوتا ہے ماہر سماجیات بھی..... اور میں ایک درخواست کروں گی آپ سے کہ آپ مجھے احسان فراموش نہ سمجھئے گا جو باتیں میں آپ سے کر رہی ہوں یہ انصاف کا تقاضا ہے۔ میں جانتی ہوں سر کہ ڈائریکٹر صاحب کی میرے بارے میں رائے بدلنے میں آپ نے مجھ پر بہت کرم فرمائی کی ہے لیکن سر اگر میں اس بچی کو پروموٹ کر دیتی ہوں اور دوسروں کو جو اس سے بہتر ہیں پچھلی جماعتوں میں روک لیتی ہوں تو میں آپ اپنی نظروں میں گر جاؤں گی۔ مجھے اپنے ادارے کے تمام بچے یکساں طور پر عزیز ہیں۔ میں ان کے ساتھ منافقانہ طرز عمل اختیار نہیں کر سکتی۔ سر اپنے اس جرم کی یاداش میں، میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔“

ڈپٹی صاحب کی طرف کا مل سکوت طاری رہا۔  
”ہیلو!“

”جی..... میں سن رہا ہوں۔“

”سر! میں جانتی ہوں آپ مجھے..... دل ہی دل میں نالائق، بدتمیز، احسان فراموش، طوطا چشم اور جانے کیا کچھ کہہ رہے ہوں گے لیکن سر اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ ہونے سے یہ سب کچھ بہتر ہے..... آئی ایم سوری سر.....“ اس کی آواز رندھ گئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ڈپٹی صاحب کی گہیر آواز سنائی دی۔

”مجھے خوشی ہوئی مس منجہا..... مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ ہمارے اداروں میں آپ جیسی باضمیر، نڈر اور غلط و صحیح میں تخصیص رکھنے والی خواتین بھی موجود ہیں۔ وہ صاحب آپ کے پاس آئیں تو انہیں میرے پاس بھیج دیجئے گا اول تو میں خود ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں اگر میری ان سے بات ہو جاتی ہے تو انہیں آپ کے پاس آنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔“

”تھینک یو دیری میچ سر..... تھینکس اے لاٹ۔“ منجہا کی آواز بھرا مٹی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔

”اطمینان سے اپنا کام کیجئے۔“ ڈپٹی صاحب نے مزید کہا۔

”آئی ایم گریٹ فل سر!“

”منجہا کی کیفیت یوں تھی جیسے کوئی کھلاڑی ایک پرمشقت کھیل کھیلنے کے بعد سرخرو ہو کر میدان سے واپس لوٹ

علیب کی مہندی تھی۔ مسز ظہیر نے بیہ کو بڑی مشکل سے یہ باور کرایا تھا کہ فرحان کی موت نے اچھے کپڑوں، زیورات، چوڑیوں اور مہندی سے اس کا حق نہیں چھین لیا تھا۔

مئی اور ملتہا خوش تھیں۔ اتنے عرصے بعد کوئی خوش گھر آئی تھی۔ مئی اپنے ان رشتے داروں کو بھی دعوت نامے بھجوانا چاہتی تھیں جن سے اپنا گھر ٹوٹنے کے بعد ان کا شاذ ہی رابطہ رہا تھا اور جنہیں انہوں نے بیہ کی شادی میں بھی مدعو نہیں کیا تھا مگر ملتہا، بیہ اور علیب کی مشترکہ رائے یہ ٹھہری کہ انہیں بھولا رہنا ہی بہتر ہوگا۔ مئی کو تو شاید وہ تینوں اجازت دیتے تو وہ ڈیڈی کو بھی مدعو کر لیتیں جو علیحدگی کے دو ڈھائی برس بعد ہی لاہور جا بے تھے اور سننے میں آتا تھا کہ وہاں انہوں نے اپنی دوسری بیوی کے لیے محل نما گھر بنالیا تھا۔ اس دوسری بیوی سے ان کے ہاں ایک بیٹا ہونے کی خبر بھی ملی تھی۔

مہندی کی رات جب یہ لوگ مہندی کی رسم کے لیے لڑکی کے گھر پہنچے تو بیہ نے اپنی عقبی نشستوں پر سے سرگوشیاں سنیں ”وہ کریم کلر کے سوٹ میں لڑکے کی والدہ ہیں اور وہ جوآن کے دائیں طرف بیٹھی لڑکے کی بڑی بہن ہیں اور یہ۔۔۔ یہ جو خالدہ آئی کے بالکل آگے بیٹھی ہیں نایہ لڑکے کی دوسری بہن ہیں۔ ڈاکٹر ہیں اور دوڑ ہیں۔“

”ہائے اللہ لگتی تو نہیں کہ بیوہ ہیں۔ کیسا زبردست سوٹ پہن کر آئی ہیں۔“ یہ دوسری آواز تھی ”اف اللہ ہاتھوں میں بھری بھری چوڑیاں بھی ہیں۔“

”آگے جا کر فرنٹ سے دیکھو جیولری، میک اپ سب بہت شاندار ہے۔“ یہ آواز پہلی دو آوازوں سے مختلف تھی۔

”یار، تیسری امی کہتی ہیں کہ آج کل کی بیوائیں اپنے آپ کو اتنی ٹیپ ٹاپ سے رکھتی ہیں کہ انہیں کنواری لڑکیوں سے زیادہ اچھے رشتے مل جاتے ہیں۔“

”تو پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“ تیسری آواز نے کہا۔

”کس سلسلے میں؟“ یہ پہلی آواز تھی۔

”بیوہ ہونے کے بعد بہتر رشتے کے لیے۔“ تیسری آواز نے شوخی سے کہا۔

”بد تمیز! بے شرم کہیں کی..... تیرے منہ میں خاک۔“ پہلی آواز نے کہا۔

بیہ دم بخود بیٹھی تھی!

دلہن کو انچ پر لا بٹھانے کے بعد مہندی کی رسم شروع ہوئی تو ممانی نے سب سے پہلے مئی کو بلایا پھر خود دلہن کی ہتھیلی پر دھرے بڑے اور اس پر رکھے گلاب کے پھول کے نزدیک تھوڑی سی مہندی تپے پر لگائی پھر لڑکی کو مٹھائی کھلائی پھر اس کا صدقہ اتار کر پیسے ایک بڑی بوڑھی خاتون کو تھمائے جو لڑکی کے نزدیک اسی مقصد کے لیے بٹھائی گئی تھیں۔

ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ لڑکیاں مہندی کے گیت الاپ رہی تھیں، ہنس رہی تھیں، قہقہہ لگا رہی تھیں۔

رنگ، لور، خوشبوؤں اور قہقہوں کے حسین امتزاج نے منظر کو تابناک بنا رکھا تھا۔

”آؤ بھئی ملتہا تم بھی بھابی کے مہندی لگا دو۔“ ممانی نے ہانک لگائی۔

ملتہا نے رسم ادا کی۔

ملتہا کے بعد بیہ از خود آگے بڑھ آئی۔ اسے دیکھتے ہی ممانی کے تاثرات یکسر بدل گئے اور انہوں نے مہندی کی تھالی جو ایک لڑکی ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اپنے ہاتھ کی ادٹ سے پرے ہٹاتے ہوئے بیہ کی جانب دیکھ کر دو ٹوک انداز میں لٹی میں سرہلاتے ہوئے اسے رسم میں شریک نہ ہونے کا اشارہ دیا پھر لیلی کے کان میں جوآن کے نزدیک ہی



کھڑی تھی کچھ سرگوشی کی۔ لیلیٰ آہستہ سے بیہ کی جانب بڑھی اور اس نے بیہ کا بازو تھامتے ہوئے کہا ”آپ رہنے دیجئے بھابی۔“

بیہ کا چہرہ فٹن ہو گیا۔

”ارے بھی کیوں وقفہ آ گیا؟“ کسی نے کہا۔

”کوئی اور آ جائے۔“ ممانی نے ہانک لگائی۔

”بیہ کو تو لگانے دیں۔“

”او نہوں!“ ممانی نے من بھر کا سر ہلایا۔

”ارے بھی، یہ سب فضول باتیں ہیں..... واہے ہیں۔“ مسز ظہیر ممانی کے انکار کا مطلب سمجھ گئیں۔

”ارے واہ! بڑے بوڑھوں کی باتیں فضول کیسے ہو سکتی ہیں۔ نہ بھی نہ یہ بدشگونیاں نہیں ہوں گی۔“ ممانی تڑخ کر بولیں۔

بیہ کو لگا وہ چکر اگر گر پڑے گی۔ لیلیٰ نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید وہ گر بھی پڑی ہوتی۔

”بھابی پلیز آپ بیٹھ جائیں۔“ بیلا نے جو اس کی کیفیت کو تاڑ کر اس کے نزدیک آ کھڑی ہوئی تھی اسے دوسری

جانب سے سہارا دینے کی کوشش کی۔

مہندی کی اس مخلوط تقریب میں موجود عدد نان خاموشی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

بیہ کو اپنا سارا وجود بے جان محسوس ہو رہا تھا۔

مئی اور منجہا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مئی نے ممانی سے سرگوشی میں کچھ کہا جواباً انہوں نے صاف انکار کیا۔ منجہا

## ”بھلا دیا نا۔؟“

قیمت 140 روپے

میں نے سمجھا تھا سمندر تم کو  
’تھا‘ کا مطلب تمہیں آتا ہوگا



میں نے خوشبو کی حقیقت پوچھی  
پھول خاموش رہا دیر تلک  
اُس نے کچھ اور کہا تھا شاید  
میں نے کچھ اور سنا دیر تلک

جیسے خوبصورت اشعار کی خالق فاخرہ بتول کا

(1) پلکیں بھیگی بھیگی سی (2) چاند نے بادل اوڑھ لیا (3) کہو وہ چاند کیسا تھا؟

(4) اب بھرے شہر میں مجھے ڈھونڈو (5) سمندر پوچھتا ہوگا (6) ”دور مت نکل جانا“

کے بعد ساتواں شعری مجموعہ ”بھلا دیا نا.....؟“ شائع ہو چکا ہے۔

7314169 اردو بازار لاہور فون نمبر

اور می نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دلہن کی بڑی بہن، بھانج، می اور ممانی کے مابین کچھ کھسک پھسک ہوئی اور می جیسے بے بس ہو گئیں۔

لیکن اور بیلا نے یہہ کو کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ مسز ظہیر اس کے پاس آ بیٹھیں اور انہوں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ سے تھپکتے ہوئے گویا اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔  
ظہیر صاحب ہوتے تو کیسی سکی ہوتی۔ علیب کی شادی اور دوسری رسموں میں شرکت کے لیے انہوں نے ظہیر صاحب کی کتنی منت سماجت کی تھی۔

”جس تقریب میں ہمارے بچے کا قاتل ہوگا ہم نہیں شریک ہوں گے۔“ انہوں نے کہا تھا۔

”اچھا ہم لوگ تو شریک ہو سکتے ہیں؟“ مسز ظہیر نے کہا۔

”مجھے نیلی سے علیحدہ سمجھتی ہو! نکال پھینکنا چاہتی ہو!“ ظہیر صاحب نے بھبک کر شاکی لہجے میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ مسز ظہیر بولیں اور ظہیر صاحب کو سمجھانے بجھانے میں انہیں کئی دن لگے۔

”کیسی ماں ہو؟“ ظہیر صاحب نے کہا۔

”مسئلہ ہمارا نہیں ظہیر صاحب، یہہ کے اکلوتے بھائی کی شادی ہے۔“

”بہو صاحب جانا چاہتی ہیں شوق سے جائیں۔“

”بہو صاحب نے فرحان کے بعد ہماری فیملی کا فرد بن کر رہنا پسند کیا ہے اور ہم انہیں تنہا چھوڑ دیں۔ نہیں ظہیر

صاحب ان کا اور ہمارا دکھ سکھ اب مشترک ہے۔“

”اچھا بھئی تم لوگ جانا چاہتے ہو جاؤ مگر مجھ سے کوئی نہ کہے چلنے کو۔“

وہ واقعی نہیں آئے تھے۔

شادی میں شرکت کے لیے پہنچا تو ابھی نعیم بھی نہیں تھا اسے کل دوپہر پہنچنا تھا۔

اس رات مہندی کی تقریب سے گھر واپسی پر یہہ نے اپنی ڈرائنگ ٹیبل کے شوکیس سے تمام چوڑیاں اور ای می ٹیشن جوہری اور ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے سے میک اپ کا بیشتر سامان اٹھا کر ایک شاچنگ بیگ میں ڈالا اور اگلی صبح گھر کے بڑے ڈسٹ بن کے پہلو میں رکھ آئی!

لیکن.....!

گھر کے خاکدانوں سے کوڑا کرکٹ سیٹھنے کے لیے جمعدارنی کے آنے سے قبل ہی عدنان اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے اور اس کی جانب سے اجازت ملنے کے بعد آہستگی سے دروازہ کھول کر اس کے رُوبرو آ کھڑا ہوا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے وہی شاچنگ بیگ جو وہ باہر صحن میں گھر کے بڑے ڈسٹ بن کے نزدیک رکھ آئی تھی ہاتھ کو ادھر پر کر کے، اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔  
وہ چند ثانیے اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔  
اپنی عمر سے کتنا بڑا لگ رہا تھا عدنان!



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں پوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور لہجے سے بندھے رشتوں کے چاک مساموٹے کی دل گداز داستان

قسط 20









”تم اسے کیوں اٹھالائے؟“  
 ”آپ نے وہاں کیوں رکھ دیا تھا۔“ وہ تھملا ہاتھ میں لیے آگے بڑھا اور اس کے نزدیک آ کر بولا ”امی ناشتے کے بعد بلڈ پریشر کی دوا لے کر سو گئی ہیں۔ وہ دیکھ لیتیں تو!“  
 ”تم کیوں اٹھالائے!“ اب اس کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری تھی ”اسے وہیں رکھ آؤ۔“  
 ”جی نہیں۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولا ”آپ یہ ساری چیزیں استعمال کریں گی۔“  
 اس نے چونک کر لیٹے بھر کو اس کی طرف دیکھا ”پرانی ہو گئی ہیں اور اب تو کوڑے دان کے پاس رکھے جانے کی وجہ سے نجس بھی۔“  
 ”پلیز غلط بیانی مت کیجئے۔“  
 وہ پھر چونکی۔

عدنان اس کے رُوبرو آتھا تھا۔  
 ”یہ.....“ وہ پولی تھین کا بھاری بھر کم تھملا اونچا کر کے اس کی نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا ”یہ آپ..... رات والے واقعے کی وجہ سے وہاں رکھ آئی تھیں..... ہے ناں؟“  
 ”کون سا واقعہ!“ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔  
 ”میں بھی وہیں تھا..... جاہل عورتیں۔“ وہ بڑبڑایا۔  
 ”کسے کہہ رہے ہو!“  
 ”وہی جو علیپ بھائی کی دلہن کو مہندی لگوا رہی تھیں۔“  
 ”میری ممائی ہیں۔“

”سوری۔“ وہ جھینپ کر بولا ”جانتا ہوں پر مجھے رات بھی ان پر بہت غصہ آیا تھا اس وقت بھی آ رہا ہے۔ آئی ایم سوری ریلی سوری! مجھے اچھی نہیں لگی تھی ان کی حرکت۔ انہیں کیا حق تھا آپ کو دلہن کے ہاتھ پر مہندی لگا دینے سے روک دینے کا۔“  
 ”غلطی میری تھی مگر مجھے اپنی غلطی کا بعد میں احساس ہوا۔“  
 ”کیا غلطی تھی؟“

میسہ نے الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ واقعی اس کی غلطی سے آگاہ نہ تھا یا تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔  
 ”کوئی ڈوڈا اس قسم کی رسموں میں شرکت نہیں کیا کرتی۔“ اس نے بظاہر بڑے اعتماد سے کام لینے کی کوشش کی۔  
 ”رہش!“ اس نے اپنا سر جھٹکا پھر بولا ”کہاں لکھا ہے یہ!“  
 ”لکھا ہوا یا نہ لکھا ہو بدشگولی بھی جاتی ہے یہ۔“ اس نے اپنی آواز میں رقت ظاہر نہ ہونے دینے کی بھرپور کوشش کی اور آنکھوں کو یکے بعد دیگرے اپنی چھٹکیا سے مسلتے ہوئے آنکھوں میں اتر آنے والی نمی کو اگلی پور میں جذب کر لینا چاہا۔

”آپ اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی ایسی باتوں پر یقین رکھتی ہیں!“  
 ”بات میرے یقین کرنے یا نہ کرنے کی نہیں۔“  
 ”تو پھر؟“

”بس..... ہمیشہ سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ ہندو تو دھوا عورتوں کو زندگی سے بالکل الگ تھلگ بالکل علیحدہ کر کے ایک طرف بٹھا دیتے ہیں۔ پریم روگ تو دیکھی بھی نا تم نے۔“

”ہم ہندو نہیں ہیں، سمجھیں آپ!“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ”ہم مسلمان ہیں اور ہمارے مذہب میں ایسی کوئی لغویات نہیں۔ اسلام تو ایسی بدشگونوں کے خلاف ہے۔“ اس نے توقف کیا اور اس کی ڈرینگ ٹیبل کے نزدیک جا کر بھاری بھر کم تھملا آہستگی سے اس پر رکھتے ہوئے بولا ”پھر ایسی حماقت نہ کیجئے گا۔“

”عدنان! پلیز.....“ وہ مری مری سی آواز میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔  
وہ پلٹا اور دوبارہ اس کے رُوبرو آکھڑا ہوا ”شام کو آپ کل سے بھی زیادہ اچھی طرح تیار ہو کر جائیں گی علیہ بھائی کی شادی میں۔“  
وہ دم بخود تھی۔

”ہم سب آپ کو اور مٹنے کو بہت خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“  
اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”رات مہندی سے دلہن پر امی متاسف تھیں کہ آپ کو کیوں ساتھ لے آئیں، آپ کو تو آپ کی امی کے ہاں چھوڑنا چاہیے تھا مگر میں نے انہیں یہ سمجھا کر ان کا ملال دور کرنے کی کوشش کی کہ آپ تو کل شادی میں بھی ہماری شرکت کی ضمانت بن کر ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ آپ کی وجہ سے ابو ہمارے جانے کو بھی برداشت کر لیں گے۔ آج کا دن تو ابو کو بہت کٹھن لگے گا ناں۔“  
”کیوں؟“

”نعیم صاحب جو آرہے ہیں۔“  
نعیم صاحب!

فرحان کے انتقال کے بعد سے نعیم کی بابت عدنان کا لہجہ بھی پہلے جیسا نہ رہا تھا۔  
”شام کو آپ کس رنگ کے کپڑے پہن رہی ہیں؟“  
”کیوں؟“ نیہہ نے چونک کر اسے دیکھا ”تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو!“  
”ایسے ہی۔“

”امی کی پسند سے سلوائے تو فیروز کی رنگ کے تھے۔“  
”تھے کا کیا مطلب!“

”بہت برائے کلر ہے اچھا نہیں لگے گا۔“  
”یہ تو آپ کو سلوانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“  
نیہہ نے اسے جربز ہو کر دیکھا۔

اتنی بحث کیوں کر رہا تھا!  
اور وہ بھی ایک ایسے معاملے پر جو اس سے قطعاً غیر متعلق تھا۔  
”آپ وہی کپڑے پہنیں گی جو آپ نے سلوائے ہیں۔“  
اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
اسے کیا حق تھا اسے ڈکٹیشن دینے کا!

عمر، رشتہ، تجربہ ہر معاملے میں وہ اس پر سبقت رکھتی تھی۔  
”امی کی پسند کو ہم میں سے کوئی بھی رد نہیں کر سکتا۔ آپ بھی تو اسی گھر کی فرد ہیں۔“  
”تم..... تم کہیں جارہے ہو؟“ نیہہ نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔  
”آپ اتنی آسانی سے امی کی پسند کو رد نہیں کر سکتیں۔“



”یہ..... تم سے..... کس نے کہا کہ میں..... امی کی پسند کو رد کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”ادکے۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا ”تو شام کو آپ کو اس کا ثبوت دینا ہو گا..... وہی کپڑے پہن کر جو آپ نے امی کی پسند سے سلوائے ہیں..... اور ہاں مہندی..... مہندی بھی لگوائیں گی آپ۔“  
 ”فارگا ڈسک عدنان! تمہیں کیا ہو رہا ہے..... کپڑے، ان کا رنگ، مہندی یہ سب..... آئی مین تمہیں ان ساری باتوں سے کیا مطلب۔“

”مطلب ہے نا بھی تو پوچھ رہا ہوں۔“  
 ”کیا مطلب ہے!“

اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور گنہگار لہجے میں بولا ”فرحان بھائی کے بعد..... ہمارے گھر کی فضا ہی بدل گئی ہے۔ امی کو دیکھا ہے آپ نے کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔ ابو..... اگر ممتا نہ ہوتا ان کا دل بہلانا تو شاید وہ پہلے سے بھی زیادہ سائیکو کیس بن گئے ہوتے۔ بیلا آپا اور لیلی آتی ہیں تو چپ چپ..... کبھی کسی بات پر ہنستی بھی ہیں تو جیسے ڈر ڈر کر..... اور آپ..... گھر میں ہوتی ہیں تو خاموش باہر سے آتی ہیں تو اداس..... اس فضا کو اب بدلنا چاہیے۔“  
 ”اپنا ذکر بھول گئے تم!“

اس نے چونک کر بیہ کو دیکھا اور آن کی آن اس کی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی۔  
 ”اپنا ذکر کیا کروں۔“ وہ بوجھل آواز میں بولا ”یوں لگتا ہے جیسے اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔“  
 بیہ کا جی بھر آیا۔

قدرے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا ”اگر ہمیں جینا ہے تو ہمیں فرحان بھائی کو بھلانے کی کوشش کرنا ہوگی۔“  
 بیہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔  
 ”کیا یہ ممکن ہے!“ اس کی آواز میں بھرا ہٹ تھی ”ہم میں سے کون بھول سکتا ہے انہیں اور کیسے!“  
 ”جانتا ہوں بہت مشکل ہے مگر ہم سب جو فرحان بھائی کے ساتھ جیتے جی مر گئے ہیں ہمارے جی اٹھنے کی بس یہی ایک صورت ہوگی اور اس کے لیے ہم سب کو مل کر کوشش کرنا ہوگی۔“

وہ چپ رہی۔  
 ”امی اور ابو کا غم بہت گہرا ہے۔ آپ کو اور مجھے بھی کچھ کم صدمہ نہیں ہے مگر امی ابو کی نسبت ہم شاید بلکہ یقیناً زیادہ ہمت زیادہ حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ دونوں تو عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں کمزوری ہر اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے اور آپ کو مل کر ان دونوں کی ہمت بندھانی ہوگی۔ ان کی خاطر ہمیں ہنسنا بھی ہوگا، مسکراتا بھی ہوگا۔ قنوطیت سے نکلتا ہوگا اور نہ چاہتے ہوئے ہی سہی وہ سب کچھ کرنا ہوگا جس کو فرحان بھائی کے بعد ہمارا قطعاً دل نہیں چاہتا۔“ اس نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولا ”آئی ایم سوری، میں..... کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر گیا ہوں آپ سے مگر..... وہ اس لیے کہ آپ اب اس گھر کی اہم ترین فرد جو بن چکی ہیں۔“  
 بیہ نے اسے مذہذب نگاہوں سے دیکھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا ”یہ سچ ہے..... حقیقت ہے کہ ہم سب کسی بات پر اپنا رد عمل ظاہر کرنے سے پہلے آپ کو دیکھتے ہیں۔“  
 ”میں جانتی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”تو پھر آج شام علیب بھائی کی شادی میں ہم سب کو خوش دیکھنے کے لیے آپ کو وہی کپڑے پہننے ہوں گے جو آپ نے امی کی پسند سے سلوائے تھے۔ مہندی بھی لگوائی ہوگی۔ چوڑیاں بھی پہننی ہوں گی اور اچھی طرح تیار بھی ہونا

ہوگا۔ دے ہی جیسے آپ پہلے ہوا کرتی تھیں۔  
 وہ کشمکش سے دو چار دکھائی دینے لگی۔  
 ”بہت مشکل ہے عدنان۔“  
 ”کیوں؟“  
 ”بس۔“

”ہم سب کی خاطر!“ وہ لجاجت سے بولا۔  
 ”اچھا ٹھیک ہے..... میں..... میں کپڑے وہی پہن لوں گی۔“  
 ”اور مہندی؟“  
 ”کسی صورت نہیں۔“ اس کے لہجے میں ناگواری اور جھٹا ہٹ تھی۔  
 ”ادکے۔“ اس نے رسائیت سے کہا پھر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا ”تھینک یو دیری مچ! آپ نے میری  
 آدھی بات تو مان لی۔“  
 بیہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ اڑ سے ہوئے وہ اسے اتنی گہری نگاہوں  
 سے دیکھ رہا تھا کہ وہ جی جان سے لرز کر رہ گئی!  
 اسے خوف سا آنے لگا۔

یہ کیا ہو گیا تھا!  
 گل کے بچے کو وقت نے آج کس روپ میں اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا!

☆☆☆

گزشتہ رات کے واقعے نے ممی اور ملہا کو بھی بہت ڈسٹرب کر رکھا تھا۔ چنانچہ اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی  
 دونوں نے ذرا سی دیر کو بیہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔  
 عدنان کو گئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ دونوں آ پہنچیں۔ بیہ کے لیے ان کی آمد قطعاً غیر متوقع تھی۔  
 ”خیریت!“ وہ ان کی غیر متوقع آمد پر چونکتے ہوئے بولی۔  
 ”نیلر سے والدہ کا بلاؤز لینا تھا سوچا تمہیں بھی دیکھتے چلیں۔“ ملہا نے دزدیدہ نگاہوں سے ممی کو دیکھتے ہوئے  
 بات بنائی۔

”شادی بیاہ میں یہی ہوتا ہے۔ آخردن تک درزی کے ہاں کے چکر لگتے رہتے ہیں۔“ ممی بولیں۔  
 ”جی..... یہ تو ہے۔“

”تمہاری ساس کہاں ہیں؟“  
 ”دوالے کر سوئی تھیں دیکھتی ہوں شاید جاگ گئی ہوں۔“  
 ”آرام کرنے دوا نہیں۔ میں تو بس تمہیں دیکھنے آئی تھی..... تم ٹھیک تو ہونا۔“  
 ”جی..... جی.....“ بیہ نے اپنی جھوٹی مسکراہٹ سے ممی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور ان کے گلے میں اپنی  
 بانہیں جامل کرتے ہوئے بولی ”مجھے کیا ہونا ہے بھلا۔“  
 ممی رونے لگیں۔

”ارے ارے ارے! آپ کو کیا ہوا ارے کیوں لگیں؟“  
 ملہا آگے بڑھی اور اس نے اپنا ہاتھ بیہ کے شانے پر دھر دیا۔ بیہ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”والدہ تمہاری طرف سے بہت پریشان تھیں بیہ۔“



”کیوں؟“

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی می نے بیسہ کا چہرہ یک یک اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے بھٹکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”رات بھائی جان نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا میرے بچے۔“

”ادو!“ بیسہ نے پھر زبردستی مسکرا نے کی کوشش کی ”تو آپ اس لیے پریشان ہیں کیا!“

”ہاں..... رسم کے بعد سے اب تک آنکھ نہیں جھپک سکی ہوں۔ دھیان تمہاری ہی طرف انکار رہا۔ یہی خیال رہا کہ تم یہ بات اپنے دل پر لے گئی ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ بیسہ نے متحمل مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

”بھائی جان بھی شاید تمہاری دل آزاری نہ کرنا چاہتی ہوں۔ رسم و رواج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کر بیٹھی ہوں۔ ان کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔“ می نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بیسہ کے سامنے کر دیے۔

”پلیز!“ بیسہ نے چونک کر می کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور انہیں چومتے ہوئے بولی ”مجھے گناہ گار نہ کیجئے۔“

”میں اس وقت والدہ کو لے کر تمہارے پاس اسی لیے آئی ہوں کہ ان کی پریشانی کچھ کم ہو جائے۔ مسلسل ایک ہی فکر لگی ہوئی تھی انہیں کہ کہیں تمہیں ممانی جان کی بات کچھ زیادہ ہی بری نہ لگ گئی ہو۔“

”باجی! زیادہ بری لگ بھی جاتی تو کیا۔ جو حقیقت ہے سو ہے۔ غلطی میری اپنی تھی مگر..... مجھے شاید یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میں ایسی کسی رسم میں شریک ہونے کی اہل نہیں رہی۔“

”ایسی دل دکھانے والی بات مت کرو، میرے بچے میرا دل کٹنے لگتا ہے۔“

”سوری..... سوری.....“ بیسہ نے پھر مسکرا نے کی کوشش کی ”نہیں کروں گی اب ایسی کوئی بات۔“

”والدہ بس اب چلنے کی کیجئے ڈھیروں کام پڑے ہیں۔“

”امی کو جگاؤں؟“

”نہیں نہیں رہنے دو، مٹا کہاں سے؟“

”دادا جان لے کر نکلے ہوئے ہیں کہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ آج تو میں چھٹی پر ہوں آج تو اسے میرے پاس رہنے دیجئے۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا کوئی بات نہیں۔ جوان بیٹے کی جدائی کا صدمہ وہ اس کی اس نشانی کے سہارے ہی کاٹ رہے ہیں۔ تم مٹنے کے ان کے پاس رہنے کا بالکل بھی برا نہ منایا کرو..... اچھا اب ہم چلیں گے۔ وقت کم ہے شام دیکھتے ہی دیکھتے سر پر آ پہنچے گی اور ہاں دیکھو تم لوگ ذرا جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا۔ سات بجے سہرا بندی ہے۔“

”انشا اللہ تعالیٰ ہم وقت سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔“

”او کے بیسہ۔“ منہانے اسے پیار کیا۔

”سہ پہر کو نعیم بھی آرہے ہیں۔“ می نے گویا بیسہ کو مطلع کیا۔

بیسہ کچھ نہیں بولی تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ نعیم کا تذکرہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

شام کو غلیب کی سہرا بندی کے وقت می کے دل کی جو حالت تھی وہی جانتی تھیں۔ ان کی نگاہیں بیٹے پر تھیں مگر دل اس بے مہر اور بے مروت شخص کی طرف تھا جس نے کبھی پلٹ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس عورت اور اس

کے بچوں پر کیا گزری تھی جنہیں وہ ایک دوسری عورت کی خاطر چھوڑ گیا تھا۔  
سہرا بندی کے موقع پر ہونے والی رسموں کے دوران بیہ نے قصداً دور دور رہنے کی کوشش کی۔ سہرا بندی کے وقت می ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ اپنے پرایوں کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ نعیم بھی مع اہل خانہ قریب میں شریک تھا۔

علیب کی سہرا بندی کے وقت مسز ظہیر کو فرحان کی سہرا بندی کا منظر ستا رہا۔ ایسی ہی ایک دلفریب شام تو تھی وہ بھی جب فرحان کے سر پر سہرا سجایا گیا تھا۔ اس قریب میں بھی نعیم اسی طرح موجود تھا جیسے آج اس قریب میں۔  
علیب کی سہرا بندی سے قبل نعیم بطور خاص ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس آیا اور ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر انتہائی احترام سے ان کے ہاتھ کو چومنے کے بعد اسے چند ٹائیے اپنی آنکھوں سے لگائے ان کے نزدیک بیٹھا رہا۔

”پھوپھی جان آپ اب بھی ناراض ہیں مجھ سے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔  
”نہیں۔“ انہوں نے بھی جواب آہستگی سے دیا ”وہ مشیتِ ایزدی تھی بیٹا۔“  
”بہر حال میں شرمندہ ہوں..... ساری زندگی شرمندہ رہوں گا آپ سے اور خود کو آپ کا مجرم سمجھتا رہوں گا۔“  
”بھابی جان نہیں آئیں؟“

”اب زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا ان سے..... جلدی تھک جاتی ہیں اس لیے نہیں آئیں۔“  
”تمہاری شادی میں تو آنا پڑے گا۔“

”وہ تو پھر ایک بڑی اور ان اداؤں کی ایل مجبوری ہوگی۔“

”کب تک ارادہ ہے؟“

”ہماری طرف سے تو کوئی دیر نہیں۔“

”اللہ بہتر کرے۔“

”پھوپھا جان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ نہیں آئے ہیں۔“

”ہاں۔“

”خیریت تو تھی؟“

”بس..... وہ بھی کچھ تنہائی پسند ہو گئے ہیں فرحان کے بعد۔“

”نعیم کا سر جھک گیا۔“

برات کی روائی کے وقت می نے چاہا کہ ملنے اور بیہ دونوں بھائی کے لیے سجوائی گئی گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھ کر جائیں مگر بیہ نے مسز ظہیر اور عدنان کے ہمراہ اپنی سسرال کی گاڑی میں جانا پسند کیا۔ صد شکر کہ آج مئے کو دادا جان نے ماموں جان کی شادی میں شرکت کی اجازت دے کر ان کے ہمراہ کر دیا تھا ورنہ وہ بہت دلگیر ہوتی۔ شادی گاہ میں دوران قریب وہ زیادہ تر مسز ظہیر کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ممتا اپنی معصوم حرکات سے ان دونوں کو اپنی جانب متوجہ کیے رہا۔ کھانے کے بعد عدنان مردانے حصے سے آکر کچھ دیر کو ممتا کے ساتھ لے گیا۔

آر سی مصحف کی رسم ہو رہی تھی اور بیہ اسٹیج کے ایک جانب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ ممتا اس کے پاس واپس آچکا تھا اور اس وقت اس کی گود میں تھا۔

اسے یاد آیا جب اس کی اپنی شادی کے موقع پر یہ رسم ہوئی تو سرخ زرتار دوپٹے تلے فرحان نے آہستگی سے کہا تھا۔  
”آنکھیں تو کھول لیں۔“ اور اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ سنہری حاشیے والے آئینے میں فرحان مسکرا رہا تھا۔  
فرحان!



فرحان!

فرحان!

کہاں چلے گئے تم فرحان!  
اس کا دل مرغ بکل کی مانند تڑپنے لگا۔

اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

کتنا مختصر سا ساتھ تھا!

مگر تعلق اتنا گہرا کہ لگتا تھا یہ تعلق اس کی روح میں اتر گیا تھا۔ خوشی، غمی، دکھ، سکھ ہر موقع پر وہ اتنی شدت سے یاد آتا کہ دل کسی پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا۔ ایسے ہی جیسے اس وقت دکھ رہا تھا۔

سب کتنے مسرور تھے۔

مگر وہ کتنی ادا اس تھی۔

چہار سو رو فیض تھیں۔

مگر اس کے ارد گرد وحشتیں اور سناٹا۔

اس کا اپنا ماں جایا دو لہا بنا اسٹیج پر اپنی دلہن کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اسے بے حد چاہنے والی بہن اس وقت اپنے مگیتیر کے پہلو بہ پہلو کھڑی خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔

اس کی ذرا سی تکلیف بے بکل ہو جانے والی ماں بیٹے اور بہو کو دیکھ کر کھلی پڑ رہی تھی۔

سب اتنے خوش تھے کہ لگتا تھا کہ اس کا خیال اس وقت کسی کے بھی دل کو بھولے سے بھی چھو کر نہیں گزر رہا تھا۔

اور اس کا اپنا دل اتنا دکھ رہا تھا کہ دل کا درد رقیق ہو کر اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

اچانک اسٹیج پر کسی بات پر تہمتہ پڑا اور ہنسنے ہنسنے نعیم کی نظر بے ساختہ اس پر پڑی۔

اس کی ہنسی کو جیسے بریک لگ گیا۔

منتہا چونکی اور اس نے گردن گھما کر نعیم کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں۔

انہیں اپنی طرف متوجہ پا کر بیہوشی نے رخ پھیر لیا اور انجان سی بن گئی۔ منظر ٹھہر کے پاس واپس لوٹنے سے قبل وہ

اپنے آنسو پی لینا چاہتی تھی۔

منتہا کو وہیں اسٹیج پر چھوڑ کر نعیم تنویری کی کیفیت میں اسٹیج پر سے اتر اور بیہوش کے نزدیک آ پہنچا۔

”ایکسکوز می“ اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے چونک کر گردن موڑتے ہوئے اسے دیکھا اور آن کی آن اس کی نگاہوں میں ڈولتی ہوئی بے بسی نے

ناگواری کا روپ دھار لیا۔

”آپ..... آپ اوپر اسٹیج پر کیوں نہیں آئیں؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔

”بہت کیوٹ بچہ ہے!“ اس نے ہاتھ بڑھا کر منے کا گال چھوتے ہوئے کہا۔

اس نے منے کو یوں پرے ہٹا لیا جیسے نعیم کے چھونے سے وہ پتھر کا ہو جائے گا۔

”آپ بھی ناراض ہیں مجھ سے!“ وہ دو قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔

دونوں اب روبرو تھے۔

منتہا اسٹیج پر کھڑی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا..... آپ..... آپ بھی مجھے مجرم سمجھتی ہیں؟“

اس نے گھائل نگاہوں سے نعیم کی جانب دیکھا۔ چند ٹاپے ٹنگی باندھے دیکھتی رہی پھر بولی ”میں مجرم نہ بھی سمجھوں تو ابو کی ایک بات تو سمجھ میں آتی ہے۔“

”کیا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔  
”گاڑی کا ہیڈ آؤن کو لیون ہوا مگر صرف فرحان ہی اتنے زخمی کیوں ہوئے آپ بھی تو ہو سکتے تھے۔ آپ نے صرف خود کو بچایا انہیں بچانے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ اس نے زہر میں بجھے لہجے میں کہا۔  
”ادہ نو!“

”بس! اور اسی لیے آپ نے ہمیں حادثے کی بروقت اطلاع بھی نہیں دی۔ فرحان کے مرجانے کا انتظار کیا۔“  
”یہ غلط ہے..... سراسر غلط۔“

اس نے زہرناک نگاہوں سے اسے دیکھا اور مٹنے کو اپنے سینے سے لگائے وسیع و عریض تقریب گاہ میں آراستہ بے شمار میزوں کے درمیان سے گزرتی اس میز کی طرف چل دی جہاں وہ مسز ظہیر کو لیلیٰ اور بیلا کے ساتھ بیٹھے چھوڑ آئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ منہا بھی اسٹیج سے اتر کر نعیم کے پاس آ پہنچی تھی۔  
”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میہ بھابی مجھ سے اتنی متنفر ہو چکی ہوں گی۔“ وہ الجھے الجھے سے انداز میں بولا۔  
”کیا کہا میہ نے؟“

”جانے دیں، یہ ان باتوں کا موقع نہیں۔“  
وہ منہا کے ہمراہ دوبارہ ڈانس کی جانب بڑھ گیا مگر موڈ دونوں ہی کا وہ نہ رہا تھا!

☆☆☆

اسکول سے تین دن کی باضابطہ رخصت کے بعد ویسے سے اگلی صبح منہا حسب معلوم اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے لیے اسکول میں حاضر تھی۔ ہر اسٹاف ممبر نے اسے فردا فردا مبارکباد دی۔ اسمبلی کے بعد پہلا پیریڈ اسکول کے تفصیلی راولڈ میں گزرا اور دوسرا پیریڈ گزشتہ تین دن کے دوران دفتر کی کارکردگی اور ڈاک دیکھنے میں۔ تیسرے پیریڈ کے دوران ایک ملاقاتی خاتون کی آمد کی اطلاع اور نعیم کی فون کال آگے پیچھے موصول ہوئیں۔ اس نے چپراسی کو ہدایت کی کہ ملاقاتی خاتون کو انتظار گاہ میں بٹھائے اور نعیم کی فون کال سننے لگی ”میرا خیال تھا گزشتہ رات بہت رات گئے ویسے کی تقریب کے بعد گھر واپسی پر آپ تھک کر ایسی سوئی ہوں گی کہ گھر فون کرنے پر آپ کے بخواب ہونے کی خبر ملے گی مگر آئی نے بتایا کہ آپ تو علی الصبح اسکول جا چکیں۔“

”میں رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوؤں صبح فجر کے وقت آنکھ کھل جاتی ہے۔“

”گھڑی کا الارم لگا کر سوتی ہوں گی۔“

”جی نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

”تو پھر صبح آنکھ کیسے کھلتی ہے!“

”ہر آدمی کے اپنے اندر ایک الارم ہوتا ہے بس اسے ذرا سیٹ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”اچھا! یہ تو آج پہلی بار سنا ہے۔ باقی دی وے کیسے سیٹ کیا جاتا ہے یہ الارم؟“

”سونے سے پہلے خود کو اپنا نام لے کر مخاطب کیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ مجھے فلاں وقت جگا دینا۔ ٹھیک اسی وقت پر آنکھ کھلے گی۔“

”مذاق کر رہی ہیں!“

”جی نہیں قطعاً سنجیدہ ہوں۔ آزما کر دیکھ لیجئے۔“



”رہی!“

”جی.....جی.....آپ یقین کیجئے اگر میں کسی روز اپنے آپ سے یہ کہہ کر سو جاؤں کہ مجھے پانچ بج کر پانچ منٹ پر جگا دینا تو آنکھ کھلنے پر گھڑی کی جانب دیکھتی ہوں تو پانچ بج کر پانچ منٹ ہی ہو رہے ہوتے ہیں۔“

”بہت خوب! پھر تو آزمانا پڑے گا۔ اچھائیں مجھے واپس بھی جانا ہے اور جلد جانا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کچھ دیر کہیں اکٹھے بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔“

”کیا بات؟“

”سچ بولوں یا جھوٹ۔“

”مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا یا نہیں بولتی۔ البتہ کوشش کرتی ہوں کہ قصداً جھوٹ نہ بولوں۔ شاید اسی لیے مجھے دوسروں سے بھی سچ ہی سنا اچھا لگتا ہے۔“

”گڈ! تو پھر میں سچ ہی بولوں گا..... بات یہ ہے کہ آنٹی سے میں نے بات کی تھی..... آپ کی..... میرا مطلب ہے ہم دونوں کی شادی کے بارے میں..... انہوں نے کہا دیر صرف آپ کی طرف سے ہے اگر آپ آج راضی ہو جائیں تو کل شادی ہو سکتی ہے۔ ان کی اجازت سے میں آپ سے براہ راست بات کرنا چاہ رہا تھا حالانکہ عموماً ایسا ہوتا نہیں ہے۔“

”کیسا؟“

”کہ خاتون سے پوچھا جائے کہ وہ کب کی تاریخ دے رہی ہیں۔“

”اسی لیے غلمند حضرات کم عمر لڑکیوں سے شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔“

”خیر عمر میری ترجیح کبھی نہیں رہی۔ میں ایک تعلیم یافتہ اور میچور ڈسٹرکٹ زندگی کا خواہشمند تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔“ اس نے پل بھر کو توقف کے بعد مزید کہا ”تو پھر آج کچھ دقت نکالنے، شام کو تو شاید آپ گھر میں مصروف ہوں اگر مناسب سمجھیں تو میں آپ کے اسکول آ جاؤں، آپ کے آفس میں بیٹھ کر یا پھر کہیں باہر جا کر بات کیے لیتے ہیں۔“

”نو..... نو..... اسکول میں تو ہر گز بھی نہیں۔“

”تو پھر کہیں باہر۔“

”دیکھئے میں آج تین دن کی چھٹی کے بعد اسکول آئی ہوں۔ بہت سے کام ہیں۔“

”گولی مار لے اسکول کو۔“

”پلیز ایسا نہ کہیں۔ اسکول میری کٹ منٹ ہے۔“

”شادی ہونے تک!“

”جیلے یونہی سہی..... مان لیا..... مگر اس سے پہلے بے مہری کیوں کی جائے۔“

”پر تپیل صاحبہ! آپ اگر اپنی اگلی کٹ منٹ کے لیے اپنی اس موجودہ کٹ منٹ میں سے کچھ دقت نکال سکیں تو بندہ تا عمر مشکور و ممنون رہے گا۔“

”دیکھئے اس وقت تو ایک ملاقاتی خاتون انتظار گاہ میں بیٹھی مجھ سے ملاقات کی منتظر ہیں اور آپ سے بات کرتے ہوئے میرا دھیان انہی کی طرف ہے۔ میرا اصول ہے کہ میں وزیٹر کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرواتی، خدا جانے کون کتنے ضروری کام سے آیا ہو۔“

”میڈم! میں بھی بہت ضروری کام سے آیا ہوں اور بہت دور سے۔“

”میں آپ کو نون کرتی ہوں..... گھر ہی پر ہیں نا آپ، کہیں باہر کا پروگرام تو نہیں۔“

”اگر ہو بھی تو آپ کی فون کال میرے لیے زیادہ اہم ہے۔“

”تھینک یو۔“

نعیم کی فون کال سننے کے بعد اس نے ملاقاتی خاتون کو بلوا بھیجا۔ کچھ ہی دیر میں ایک دہلی پتلی خاتون اس کے دفتر کے دروازے پر تھیں۔

”میں آ سکتی ہوں میڈم؟“

”جی..... جی آئیے۔“

خاتون کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”تشریف رکھئے۔“

وہ اس کی میز کے دائیں جانب پڑی تباہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”میڈم..... مجھے..... آپ سے..... ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ خاتون نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

”جی..... فرمائیے۔“

”وہ..... میڈم..... میرا بچہ..... آپ کے اسکول میں..... کلاس ون سی میں پڑھتا ہے..... کل اس کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے میں اور اس کے ابورات بھر نہیں سوسکے..... وہ بھی میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ ہم تو صبح ہی آنا چاہتے تھے لیکن..... پھر یہ سوچ کر کچھ دیر سے آئے کہ آپ یہ نہ کہیں کہ صبح سویرے شکایت لے کر نازل ہو گئے۔ ہم نہ آتے میڈم مگر بات ایسی ہے کہ آئے بنا چارہ نہ تھا۔ میرے شوہر آپ کے دفتر کے باہر کھڑے ہیں اندر اس لیے نہیں آئے کہ بات شرم کی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا میڈم بھی عورت ہیں تم بھی عورت، تم ان سے کھل کر بات کر لو گی میں نہیں کر سکوں گا۔“

”آپ بات تو بتائیں۔“

”وہ..... میڈم..... میرا بچہ ون سی میں پڑھتا ہے۔“

”جی یہ تو آپ بتا چکی ہیں۔“

”میڈم سمجھ میں نہیں آ رہا کیسے بات شروع کروں..... شرم کی بات ہے۔“ خاتون کی رنگت میں سرخی غالب آ گئی۔

”آپ کھل کر بات کیجئے۔“ منتہا ہمتن خاتون کی جانب متوجہ ہو بیٹھی۔ خاتون نے پہلو بدلا اور مذہذب دکھائی دیئے لگیں۔

”جو بھی بات ہے اطمینان سے کیجئے۔“

”میڈم! میرے شوہر صبح بچے کو اسکول چھوڑ کر اپنے آفس جاتے ہیں اور دوپہر کو آفس سے واپسی پر بچے کو اسکول سے لیتے ہوئے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ چھٹی کے بعد بچہ اسکول گیٹ کے نزدیک ان کا انتظار کرتا ہے۔ کل بھی وہ ان کا انتظار کر رہا تھا کہ اسی اسکول کا کوئی بڑا لڑکا اسے بہانے سے اپنے ساتھ لے گیا اور باتھ روم میں جا کر بولا.....“

خاتون کی سانولی رنگت دہک اٹھی اور قدرے توقف کے بعد اس نے جو کچھ بیان کیا اس نے منتہا کو دم بخود کر دیا۔ خاتون آنسوؤں سے رونے لگیں۔

”میڈم! خدا کی قسم پوری رات نہیں سو سکے ہیں ہم دونوں میاں بیوی اور بچہ! وہ تو اتنا ڈر گیا ہے کہ اس نے کہہ دیا میں اسکول ہی نہیں جاؤں گا..... آج اسکول نہیں آیا ہے وہ..... اس کی ذہنی حالت ہی تباہ کر دی ہے کل کے واقعے نے..... ڈر گیا ہے وہ اسکول سے۔“

”مائی گاڈ!“ منتہا زیر لب بڑبڑائی پھر اس نے خاتون سے پوچھا ”کس کلاس کا لڑکا تھا وہ؟“



”پانہیں میڈم۔“ خاتون نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”آپ کے بیٹے نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”جی نہیں۔ اسے اس کا نام بھی نہیں معلوم۔ بس اتنا بتایا اس نے کہ وہ لڑکا اور والی کسی کلاس میں پڑھتا ہے۔“

”اور تو ہماری ففٹھ کلاس کے چار سیکشنز بیٹھتے ہیں۔“

”جی تو بس انہی میں سے کسی سیکشن کا ہوگا۔ میرا بیٹا ہمارا تھا بڑا سال لڑکا ہے اور بریک میں وہ اکثر چھوٹے بچوں کو

مارتا پیٹتا بھی ہے اور ڈرا دھمکا کر ان کی چیزیں بھی کھا پی جاتا ہے۔“

”ایسا کون سا لڑکا ہے۔“ منتہا خود کلامی کی کیفیت میں بڑبڑائی ”آپ کا بچہ اسے پہچان تو سکتا ہوگا۔“

”جی جی..... کہہ رہا تھا کہ اس کے دانت پیلے پیلے ہیں۔“

”دانت تو بہت سوں کے پیلے ہو سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کا بچہ اسے اس کے چہرے سے تو شناخت کر سکتا

ہوگا۔“

”جی بالکل کر لے گا کیونکہ وہ ہمارا تھا کہ اس کی ایک بہن بھی اسی اسکول میں کلاس ٹو میں پڑھتی ہے اور چھٹی کے

بعد دونوں بھائی بہن اکثر بہت دیر دیر تک اسکول میں رہتے ہیں۔“

”غالباً آپ کا بچہ بھی چھٹی کے بعد دیر تک اسکول میں رہتا ہوگا؟“ منتہا نے کہا۔

”جی میڈم..... مجبوری ہے..... میرے شوہر اسپتال میں کام کرتے ہیں، دو بچے ان کی چھٹی ہوتی ہے۔ چھٹی کے

بعد وہ ڈھائی پونے تین بجے تک بچے کو لینے کے لیے اسکول پہنچتے ہیں۔“

”ہوں۔“ منتہا نے ایک گہری سانس کھینچی ”آپ کا بچہ اگر اس نالائق کی نشاندہی کر دیتا ہے تو اس سے تو ہم نمٹ

ہی لیں گے لیکن مجتر مہ ایک غلطی بحیثیت والدین آپ لوگوں کی بھی ہے۔“

خاتون نے چونک کر منتہا کی جانب دیکھا اور بولیں ”ہماری کیا غلطی میڈم!“

”اسکول کی چھٹی ایک بجے ہو جاتی ہے اور آپ کا کہنا ہے کہ آپ کے شوہر بچے کو اسکول سے گھر لے جانے کے

لیے ڈھائی پونے تین بجے تک پہنچتے ہیں۔ یہ غلطی ہے یا نہیں۔ چھوٹے بچوں کے والدین کو تو چھٹی سے بائیس دس منٹ

قبل اسکول گیٹ کے باہر موجود ہونا چاہیے تاکہ چھٹی ہوتے ہی اپنے بچوں کو بحفاظت گھر لے جائیں۔ چھٹی کے بعد

جو بچہ ڈیزہ پونے دو گھنٹے باپ کے انتظار میں اسکول گیٹ پر بیٹھا رہے گا اس بے چارے کے ساتھ تو کچھ بھی ہو سکتا

ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم مگر..... والدین کی بھی مجبوری ہوتی ہے۔“

”مجھے والدین کی مجبوریوں اور مشکلات سے انکار نہیں۔ یقیناً ہوتی ہوں گی ان کی کچھ مجبوریاں مگر سوال یہ ہے کہ

ان کی مجبوریوں کا نقصان بچے ہی کو کیوں پہنچے۔ وہی کیوں اسکول کی چھٹی کے بعد پچتی دو پہروں یا ٹھہرتے موسم میں

اسکول گیٹ پر بیٹھ کر باپ کا انتظار کرے، باپ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر اسے وقت پر لینے کے لیے اسکول

کیوں نہ آئے۔“

”میڈم میرے شوہر اسپتال میں کام کرتے ہیں۔ انہیں دو بجے چھٹی ہوتی ہے۔ درمیان میں اٹھ کر بچے کو لینے

کے لیے اسکول نہیں آ سکتے۔“

”آپ لینے کے لیے آیا کریں۔“

”اور تلے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی وجہ سے کم ہی باہر نکلتی ہوں۔“

”کوئی اور بندوبست کیجئے مگر..... بچے کو دیر تک اسکول میں چھوڑے رکھنا مناسب نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ

ہماری بار بار تنبیہ اور یاد دہانی کے باوجود بہت سے والدین اس سلسلے میں غفلت برتتے ہیں۔ بعض والدین تو یوں لگتا

ہے کہ بچوں کو اسکول پہنچا کر انہیں چھٹی کے بعد واپس لینا ہی بھول جاتے ہیں۔ آپ یقین کریں گی کہ دو بچے ہمارے ہاں ایسے بھی ہیں جنہیں ان کے والدین اپنے دفتر کی چھٹی کے بعد چار بجے کے لگ بھگ اسکول سے لے کر جاتے ہیں۔ چونکہ ارادہ ڈیوٹی مسٹر۔ سر کے بارہا شکایت کرنے پر میں نے کئی مرتبہ بچوں کے گھر فون کیا۔ والدہ سے بات کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ بچوں کو جلدی لینے کے لیے کوئی اور بندوبست کیا جائے گا مگر آخر میں وہی ڈھاک کے تین پات۔“

”اس کا مطلب ہے آپ اس لڑکے کو کچھ نہیں کہیں گی!“ خاتون نے اپنے تیور بگاڑتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا!“  
 ”آپ کی باتوں سے۔“

”تو پھر آپ غلط سمجھی ہیں۔ اس لڑکے کی نشاندہی ہو جائے تو پھر آپ دیکھیں گے کہ ہم اس کے خلاف کیا ایکشن لیتے ہیں۔ بہتر تھا کہ آپ اپنے بچے کو بھی ساتھ لے آئی ہوتیں تاکہ وہ اس لڑکے کی شناخت کر سکتا۔“  
 ”میڈم وہ تو بے حد ڈرا ہوا ہے کیونکہ اس بد بخت نے اسے یہ دھمکی بھی دی کہ تو نے اگر کسی کو بتایا تو میں تجھے مار دوں گا۔ وہ تو کہتا ہے میں اب اسکول جاؤں گا ہی نہیں۔“

”تب تو آپ کو اسکول پر بچے کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اسے جلد از جلد اسکول لانا چاہیے تھا اگر ممکن ہو اور آپ اسے یہ آسانی لاسکیں تو آج ہی لے آئیں تاکہ ہم برائی کے خلاف جلد کوئی قدم اٹھا سکیں اور وہ نالائق آج کسی دوسرے بچے کو.....“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم۔ ایسے بد بختوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ میں اپنے شوہر سے کہتی ہوں چل کر بچے کو لے آئیں۔ بے چارے شرم کے مارے آپ کے دفتر میں نہیں آئے۔“  
 ”لے آئیں تو اچھا ہے ایسے معاملات کو التوا میں نہیں ڈالنا چاہیے۔“  
 خاتون کے باہر جاتے ہی منہ ہانے گھٹی بجائی اور چہرہ اسی سے غزالہ ناصر کو بلالانے کو کہا۔

☆☆☆

”اُف خدا! میڈم یہ تو بہت خوفناک بات ہے۔“ غزالہ ناصر اپنے دونوں ہاتھ گالوں سے لگاتے ہوئے شرم کے مارے گلنار ہو گئیں۔

”ایسی دیسی! ماں بے جاری تو اتنی ڈسٹرب تھی کہ روہانسی ہوئی جا رہی تھی۔“  
 ”ایسے بچے کو تو فوراً اسکول سے نکال دینا چاہیے میڈم جی۔“

”کہاں کہاں اور کس کس کو نکالیں گی غزالہ..... فاروقی صاحب کو تو آپ جانتی ہیں تاکتے اچھے اینڈ مسٹر۔ ارادہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھنے والے منتظم ہیں مگر ان کے ادارے میں جن دنوں میں وہاں ہوا کرتی تھی اس سے بھی زیادہ خوفناک واقعہ ہوا تھا۔“

غزالہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میٹرک کا ایک طالب علم جو نیر سیکشن میں تیسری کلاس کی طالبہ اپنی ہی سگی بہن کے ساتھ چھٹی کے بعد اسکول کے ہاتھ روم میں غلط حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔“

”ادہ خدا! میڈم ایسی بات نہ کریں۔“ غزالہ نے آنکھیں موند لیں۔

”ایسا ہوا غزالہ اور ہوتا ہے اس نالائق کو پکڑنے والا کون تھا! ہمارے اسکول کا خاکروب! بچی سے پوچھ گچھ کرنے پر پتا چلا بھائی تو روزانہ ہی اسے چھٹی کے بعد ٹوائلٹ میں لے جاتا ہے۔“

”ہائے اللہ میڈم میرے تو دل کو کچھ ہونے لگا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے تو بہ تو بہ۔“ غزالہ نے اپنے رخسار پیٹ



ڈالے۔ ”پھر کس کا اعتبار کرے انسان..... پھر فاروقی صاحب نے کیا کیا اس بد تمیز کا؟“  
 ”اس کے باپ کو بلا کر بتایا گیا اور جو نیر اسکول میں بچوں کے ٹوائٹلٹس بلاک پر ایک جمہدار کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ گاہے گاہے ٹوائٹلٹس کی خبر گیری کرتا رہے اور چھٹی کے فوراً بعد ٹوائٹلٹس کے مین دروازے پر تالا ڈال دیا جائے۔“  
 ”میڈم جی جب سگے بھائی کا اعتبار نہیں تو جمہدار کی ڈیوٹی لگا کر فاروقی صاحب نے ایک اور خطرے کو دعوت نہیں دی کیا؟“

”اس پر فاروقی صاحب خود نظر رکھتے تھے۔ اب ہمیں بھی یہی کرنا ہوگا غزالہ۔“  
 ”کیا میڈم جی؟“ غزالہ نے چونک کر منتہا کی جانب دیکھا۔  
 ”جمہدارنی سے کہیں گے اسکول ٹائم کے دوران کبھی کبھی بچوں کے ہاتھ رومز میں جھانک لیا کرے اور چھٹی کے فوراً بعد ہاتھ رومز کی دھلائی صفائی کر کے تالا ڈال دیا کرے دروازے پر۔“  
 ”میڈم ڈیوٹی میچرز سے بھی کہیں کہ دن میں ایک آدھ مرتبہ کسی وقت بچوں کے ہاتھ رومز کی اچانک چیکنگ کر لیا کریں۔“  
 ”اسمبلی کے بعد اپنے پہلے راؤنڈ کے دوران تو میں بچوں کے ہاتھ رومز کی صفائی کا جائزہ لیتی ہوں مگر آئندہ میں اور آپ صبح کے علاوہ بھی بچوں کے ہاتھ رومز کا جائزہ لیا کریں گے۔“  
 ”آئی ایم سوری میڈم، مجھے یہ ڈیوٹی نہ دیں۔“

”کیوں؟“  
 ”آپ کے صبح کے راؤنڈ کے دوران کبھی کبھار جب میں شرماء حضوری آپ کے ساتھ ہاتھ رومز میں جھانکتی ہوں تو میرا دل تھلانے لگتا ہے۔ آپ ہی کی ہمت ہے جو اندر تک چلی جاتی ہیں۔“  
 ”اچھا مجھے بھی نہیں لگتا غزالہ مگر بہت سے کام ناگوار ہوتے ہوئے بھی ہمارے فرائض منصبی کا حصہ ہوتے ہیں اور پھر بھی آپ یہ دیکھئے کہ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں ممکنہ حد تک ہمارے محتاط ہونے کے باوجود اس قسم کے واقعات رونما ہوتے ہیں جو ہماری انفرادی ساکھ ہی نہیں پورے ادارے کی شہرت کو متاثر کر دینے کو کافی ہوتے ہیں۔“  
 ”میڈم اس بات کو باہر نہ نکلنے دیجئے گا ورنہ ہمارے ساتھ کے دوسرے اسکولوں میں بہت باتیں بنیں گی۔“  
 ”مجھے اس سے زیادہ فکر اس بات کی ہے غزالہ کہ پہلی جماعت کا وہ معصوم بچہ جو بقول اس کی ماں کے اسکول سے خوفزدہ ہو گیا ہے اسکول پر اس کا اعتماد کیونکر بحال ہوگا؟“  
 ”اس بچی کا کیا ہوا تھا میڈم؟“  
 ”کون سی بچی کا؟“

”وہی جس کا بھائی فاروقی صاحب کے اسکول میں.....“  
 ”اچھا اچھا..... وہ بے چاری اسکول سے بھائی کے فارغ التحصیل ہونے تک اسی طرح اس کے ساتھ آتی جاتی رہی۔“

”حالانکہ ان کے والدین کو بچی کو لانے لے جانے کے لیے کوئی متبادل بندوبست کرنا چاہیے تھا۔“  
 ”شاید نہ کر سکتے ہوں..... کوئی مجبوری ہو ان کی..... باپ کو صبح ہی کام پر جانا ہوتا ہو اور ماں کو گھر کے دھندوں سے فراغت نہ ملتی ہو..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رشتوں کے تقدس اور اخلاقی قدروں کی پامالی کے بارے میں بے حس ہوں۔“

”میڈم جی! کیا اتنے بے حس بھی ہو سکتے ہیں لوگ۔“  
 ”ارے غزالہ یہ دنیا ہے۔ لڑکیاں گھروں سے فرار ہو جاتی ہیں اور ان کی بازیابی پر گھر والے انہیں قبول کر لیتے

ہیں۔ باہر جرائم کر کے آنے والے مرد اپنے ہی گھر والوں کے ہاتھوں پناہ پا جاتے ہیں۔ آپ اور ہم جسے بے حسی کہتے ہیں شاید ان لوگوں کے نزدیک وہ درگزر اور محبت ہوتی ہو یا پھر کوئی مجبوری۔  
 ”سوری میڈم جی لعنت ہو ایسی درگزر، محبت اور مجبوری پر۔“  
 ”منجھا کے لیوں پر موہوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔“

”ہم ننّا نوے فی صد انسان منافقت کی زندگی بسر کرتے ہیں غزالہ۔ اوروں کی جو بات ہمارے نزدیک ناقابل معافی جرم ہوتی ہے اسے اقربا اور خود اپنے لیے ہم اسے روا سمجھتے ہیں۔ مثلاً میرا بھائی خواہ اس میں خدا نخواستہ کتنے ہی عیب اور خامیاں کیوں نہ ہوں مجھے اچھا ہی لگے گا۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ بڑی حقیقت پسندانہ سوچ ہے آپ کی۔“ غزالہ نے توقف کیا پھر گویا ہوئیں ”میڈم اتنی گہری باتیں تو لوگ مائیاں اور بابے بن کر کر پاتے ہیں، آپ نے وقت سے پہلے کہاں سے سیکھ لیں!“  
 ”زندگی سے غزالہ اور کہاں سے۔“ منجھا کے لیوں پر درد آمیز مسکراہٹ تھی۔

غزالہ کو کیا معلوم کہ اسے تو زندگی نے اس کی کانٹ لائف میں ہی گہری باتیں سوچنے والی مائی بنا دیا تھا۔ دل پر گہری ضرب پڑے تو بچپن بھی بڑھاپے میں بدل جاتا ہے۔

☆☆☆

پہلی جماعت کا وہ کسن بچہ جس کا نام زاہد تھا ڈراما سہا سا اپنی ماں کی آڑ میں چھپا چھپا اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ باپ غالباً پہلے کی طرح باہر ہی رگ گیا تھا۔

”ادھر آجئے بیٹا میرے پاس۔“ منجھا نے پیار سے کہا۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ ماں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔  
 ”یہاں آؤ بیٹے۔“

”جائیٹا۔“ ماں نے چکارا۔

”نہیں۔“ بچے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور روہا نسا نظر آنے لگا۔

منجھا کو اپنی نشست پر سے اٹھنا پڑا۔ زاہد کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لیے وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

”بیٹا اپنی امی کو تو آپ نے بتا دیا اب مجھے بتائیے کہ کل ہاتھ روم میں آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

”شش!“ ماں کے منہ سے بے ساختہ آواز نکلی اور منجھا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ماں اپنی جگہ سے اٹھی

اور منجھا کے نزدیک آ کر سرگوشی میں بولی ”میڈم! میں نے آپ کو سب کچھ بتا تو دیا ہے، اس سے نہ پوچھیں پریشان ہوتا ہے۔“

”نہیں ہوگا۔“ منجھا نے بڑے اطمینان سے کہا پھر خاتون سے پوچھا ”آپ نے کبھی کسی ڈاکٹر کے ہاں ڈسپنر کو کسی زخم کی صفائی کرتے دیکھا ہے؟“

خاتون اس کے اس غیر متعلق سوال پر قدرے حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

”جب وہ روئی کے پھائے پر کوئی جراثیم کش دوا لگا کر اسے زخم پر پھیرتا ہے اور اسے دبا دبا کر بار بار اس میں سے

پس نکالتا ہے تو بہت بے رحم اور سفاک سا محسوس ہوتا ہے۔ مریض کو تکلیف بھی ہوتی ہے۔ زخم میں مریضیں بھی لگتی ہیں۔

ٹیسس اٹھتی ہیں لیکن زخم کی صفائی کر کے اس کی آلودگی باہر نکال کر جب ڈسپنر زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دیتا ہے تو

مریض کو زخم میں ٹھنڈک اور آرام محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہمارے ذہن کو کوئی زخم لگ جائے تو اسے بھی صاف کرنے

اور آہستہ آہستہ دبا کر اس کے اندر کی غلاظت کو باہر نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ قطعاً پریشان نہ ہوں بالکل

اطمینان سے بیٹھیں، میں وہی کر رہی ہوں جس کی اس وقت آپ کے بچے کو ضرورت ہے..... پلیز آپ تشریف



رکھیں۔“

خاتون بادل نا خواستہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

”ہاں بیٹا بتائیے کیا ہوا تھا کل۔“

بچہ جڑ بڑ دکھائی دینے لگا۔

”شاباش! کم آن! جلدی سے بتاؤ۔“ منتہا نے اسے چکارا۔

بچے کی نگاہوں میں شک ڈالنے لگا جیسے اسے منتہا کا چکارنا سچ نہ لگا ہو۔

”ہاں ہاں بتاؤ بیٹا، میں آپ کی امی کی طرح آپ کی دوست ہوں۔ آپ سے پیار کرتی ہوں۔ آپ مجھے پہلے کل والی پوری بات بتائیں ویسے تو آپ کی امی نے بتا دیا ہے مجھے مگر میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں کیونکہ ہو سکتا ہے آپ کی امی کوئی بات بھول بھی گئی ہوں اور انہوں نے مجھے نہ بتائی ہو۔ جب آپ پوری بات شروع سے آخر تک ایک مرتبہ مجھے بتادیں گے تو پھر ہم اس لڑکے کو تلاش کریں گے۔“

لڑکے کے ذکر پر بچہ سہم کر سٹ سا گیا۔

”ڈرنے کی ضرورت نہیں بیٹا، آپ دیکھنا تو ہم اس کا کیا حال کرتے ہیں۔“ بچہ بے یقینی سے منتہا کو دیکھنے لگا۔

”ہاں ہاں۔“ منتہا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”چلو شاباش بتاؤ۔“

بچہ کسمسایا پھر منمننا کر بولا ”وہ..... وہ مجھے مارے گا۔“

”ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا وہ تمہیں۔“

”اس کے ہاتھ بہت گندے ہیں۔“ بچے کے لہجے میں نفرت تھی۔

”وہ پورے کا پورا ہی گندا ہے۔“ منتہا نفسیاتی حربے آزماری تھی۔

بچہ چونکا۔

”آپ نے اسے دیکھا ہے؟“ اس نے منتہا سے سوال کیا۔

”آپ اسے دکھاؤ گے نا مجھے۔“

”اور والی کلاس میں پڑھتا ہے۔“

”ہم دونوں اور چلیں گے اور اسے تلاش کریں گے..... ٹھیک ہے نا؟“

بچے نے اثبات میں سر ہلایا لیکن اگلے ہی لمحے سہم کر بولا ”نہیں وہ مجھے مارے گا۔“

”اگر اس نے آپ کو مارا تو ہم اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے اور پولیس اسے بچوں کی جیل میں بند کر دے گی۔“

”بند کر دیں۔“ بچہ بولا۔

”لیکن پہلے آپ مجھے پوری بات تو بتاؤ۔“

”بتا دو میڈم کو پوری بات بتا دو۔“ ماں نے کہا۔

بچہ ماں کو دیکھنے لگا۔

”میڈم اس کی وہ مرمت لگائیں گی کہ وہ یاد کرے گا۔“ ماں اپنی جگہ سے اٹھ کر بچے کے دوسری جانب آ بیٹھی

اور اسے چکارے ہوئے بولی ”ماں صدقے بتا دے میڈم کو۔“

بچے نے اچکپاتے ہوئے زبان کھولی اور آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بتا دیا جو اس کی ماں نے منتہا کو بتایا تھا۔ بچے کے بولنے کے دوران ماں کے چہرے کی کیفیت دیدنی تھی۔

”اب ہم اوپر والی کلاسوں میں چلیں گے اور آپ دیکھو گے کہ وہ آج اسکول آیا ہے یا نہیں اور آیا ہے تو کس

کلاس میں بیٹھا ہے..... اوکے؟“  
 ”میڈم آپ اسے جیل میں بند کرادیں گی نا؟“ بچے نے یقین دہانی چاہی۔  
 ”اگر اس نے تمہیں مارا یا کچھ کہا تو..... اب چلیں؟“

بچے نے اثبات میں سر ہلایا۔  
 ”گڈ!“ منتہا نے اس کا سر تھپتھپایا۔

”میں بھی چلوں میڈم؟“ ماں نے پوچھا۔  
 ”ضرورت تو نہیں لیکن اگر آپ ساتھ آنا چاہتی ہیں تو آ جائیں۔“ منتہا نے بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
 منتہا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ جاتے ہی بچے پہلے کے مقابلے میں پُر اعتماد اور مغرور سا دکھائی دینے لگا۔  
 منتہا بچے اور اس کی ماں کے ساتھ اپنے دفتر سے نکلی تو باہر راہداری میں کھڑے ایک شخص نے اسے سلام کرتے ہوئے بتایا کہ وہ بچے کا باپ ہے۔

اسکول کی عمارت کی بالائی منزل پر واقع کمرہائے جماعت کے باہر راہداری میں پہنچنے پر منتہا نے بچے کی ماں سے راہداری میں ٹھہرنے کو کہا اور بچے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے پہلے کمرے میں داخل ہو گئی۔  
 ”ایکسیکوزمی۔“ اس نے جماعت کے کمرے میں موجود ٹیچر سے کہا ”ہم تھوڑی دیر آپ کی کلاس کو ڈسٹرب کریں گے۔“ بچے کا ہاتھ آہستگی سے چھوڑتے ہوئے اس نے جھک کر بچے سے کہا ”اب آپ میرے ساتھ اس کلاس کا ایک چکر لگاؤ اور ایک ایک بچے کو غور سے دیکھتے جاؤ اور پھر مجھے بتاؤ کہ وہ یہاں بیٹھا ہے یا نہیں۔“  
 بچہ اور منتہا ساتھ ساتھ چلنے لگے مگر بچے کا ہاتھ اب منتہا کے ہاتھ میں نہ تھا۔  
 پہلے کمرے میں تلاش بار آور نہ ہوئی۔

دوسرے کمرے میں بھی بچہ ایک ایک چہرے کو دیکھتا چلا گیا مگر تلاش لا حاصل رہی۔  
 تیسرے کمرے میں مجرم پکڑا گیا۔

لیے قد اور مضبوط جسامت کا لڑکا جسے اپنے قد کا ٹھکے حساب سے کم از کم آٹھویں جماعت میں ہونا چاہیے تھا۔  
 جونہی بچے نے اس کی شناخت کی وہ گھبرا کر منتہا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”نومیڈم ہم نے کچھ نہیں کیا۔“  
 منتہا نے اسے کان سے پکڑ کر سیٹ پر سے اٹھایا اور کلاس میں موجود ٹیچر سے کہا ”میں اسے اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں۔“

”شیور میڈم۔“

اسے اپنے ساتھ لیے منتہا اپنے دفتر میں آ گئی۔

☆☆☆

کوئی بہت ہی ڈھیٹ لڑکا تھا۔ پہلے تو بہت دیر تک وہ جوتوں سمیت منتہا کی آنکھوں میں مگھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر اس نے اقبال جرم کر لیا۔

”کیوں کی تم نے یہ حرکت!“ منتہا نے اس کا کان پکڑ کر زور سے جھٹکا۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا اس پر۔

”میڈم! میڈم! اب نہیں کروں گا۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

”اور یہ بتاؤ کہ.....“ منتہا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ کتنا مشکل مرحلہ تھا! مگر کسی نہ کسی طور گزرنا تو تھا اس مرحلے

سے ”یہ غلیظ حرکت تم نے سیکھی کہاں سے؟“

”سوری میڈم۔“

”تمہارے فادر کہاں کام کرتے ہیں؟“



”میڈم آفس میں۔“

”کس آفس میں؟“

”پتا نہیں۔“

”جھوٹ بولتے ہو تمہیں سب کچھ معلوم ہوگا۔“

”نومیڈم قسم خدا کی ہمیں نہیں پتا۔“

”شٹ اپ! قسم مت کھاؤ..... امی کہاں ہوتی ہیں؟ گھر پر یا کہیں جاب کرتی ہیں۔“

”گھر پر۔“

”فون ہے گھر پر؟“

”جی۔“

”نمبر بتاؤ۔“

اس نے اٹکتے ہوئے نمبر بتایا۔

”تمہارا نام؟“

”دلاور۔“

منتہانے نمبر ملایا اور اپنا تعارف کرانے کے بعد دلاور کی ماں سے کہا ”آپ کے بیٹے کے خلاف ایک ایسی شکایت ملی ہے ہمیں کہ آپ کو فوری اسکول سے رابطہ کرنا ہوگا۔“

آپ کی طبیعت کے گھٹنے اور ہونا اس کے لئے سخت مسائل  
کر کے پتھر کے کوئی ضرورت و سادہ پرکٹس بنا سکتے ہیں

جدید ہومیو پیتھک اور سائنسی تجربہ سے تیار کردہ انتہائی زوداثر

# Famacnol Tablet

فیمکنول ٹیبلٹ چہرے کے کیل مہاسوں و پھنسیوں کے علاج کیلئے منفرد ہومیو پیتھک شافی دوا کے استعمال سے انشاء اللہ چند ہفتوں میں شفا ہوگی۔

فیمکنول ٹیبلٹ کی تیاری میں چہرے پر کیل مہاسوں و پھنسیوں کے تین بنیادی اسباب کو مد نظر رکھا ہے۔ جلد کے سہم کی پیدائش میں اضافے۔ ہارمون کا توازن۔ اور جلد کے پی ایچ توازن میں خرابی۔

صرف گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوا سکتے ہیں، ایک ماہ کا کورس 300 روپے

ہومیو ڈاکٹر شوکت علی (پینل۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان)

مبوش اپائنٹمنٹس شاپ نمبر 2 SC-19 بلاک N تار تھ ناظم آباد کراچی ٹیلی فون نمبر: 6647312 موبائل 0300-9229413  
کلیٹک کے اوقات (صبح 11 سے 1 شام 6 سے 10) E-mail: hdr\_shoukatali@hotmail.com

”میڈم کل آ جاؤں؟“ دلا در کی ماں نے کہا۔  
”جی نہیں..... آج ہی..... چھٹی سے پہلے۔“  
”کوشش کرتی ہوں۔“

”کوشش نہیں محترمہ آپ کو آنا ہو گا ورنہ آپ کا بچہ کل اسکول نہیں آئے گا۔“  
”اچھا جی..... آتی ہوں۔“

دلا در کو اس نے اپنے دفتر کے باہر کھڑا ہونے اور چپراسی کو اس پر نظر رکھنے کی ہدایت کی اور زاہد کے والدین کو اطمینان دلایا کہ دلا در کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا۔

”میڈم ہم لوگ دلا در کی والدہ کے آنے تک ٹھہریں؟“ زاہد کی ماں نے کہا۔  
”آپ کی مرضی ہے لیکن کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ کب تک آئیں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر ہم لوگ جاتے ہیں مگر میڈم کچھ کیجئے گا ضرور در نہ ہمیں تسلی نہ ہوگی۔“  
”آپ اطمینان رکھیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے بچے کو اسکول بھیجیں مگر چھٹی کے بعد اسے وقت پر اسکول سے پک بھی کریں۔“

”انشا اللہ میڈم! اب پوری کوشش کروں گا میں اسے چھٹی کے بعد فوراً ہی اسکول سے لے جانے کی چاہ ہے مجھے کتنی ہی دقت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔“ زاہد کے باپ نے کہا۔  
”میڈم ابھی دو چار دن میں بچے کو اسکول نہیں بھیجوں گی۔“  
”کیوں؟“ منبتا نے چونک کر بچے کی ماں کو دیکھا۔

”کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ سے سزا پا کر وہ بد بخت یا اس کے ماں باپ انتقام میرے بچے کے ساتھ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھیں۔“

”آپ اطمینان رکھیں ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ آپ بچے کو پورے اطمینان کے ساتھ اسکول بھیجیں۔ اسکول کے اوقات کے دوران وہ ہماری ذمہ داری رہے گا مگر چھٹی کے بعد آپ کی۔“  
”اوکے میڈم۔“ باپ نے کہا۔

”میڈم میں کل پھر آؤں گی آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کیا ہوا۔“ ماں نے کہا۔  
”شوق سے آئیں۔“

ان کے جاتے ہی منبتا کے دفتر کے باہر تعینات چپراسی کمرے میں در آیا ”میڈم آج تو آپ اتنی مصروف رہیں کہ بریک گزر گئی اور آپ نے چائے بھی نہیں پی، اب چائے لے آؤں جی؟“  
”لے آؤ۔“ اس نے نیم دلی سے کہا۔

دفنٹا ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔

”ہیو! منبتا نے کال ریسیو کی۔“

”آپ کو غالباً انتظار کی کیفیت کا اندازہ نہیں ہے۔“ نعیم کے لہجے میں گلہ تھا۔

”اکثر ہوتا ہے، اس وقت بھی اپنے ایک اسٹوڈنٹ کی والدہ کی منتظر ہوں۔“

”پھر تو مجھے میڈم کا وہ گانا..... جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا گنگناتے ہوئے ریسیور رکھ دینا چاہیے۔“

”نہیں نہیں اتنی مایوسی کی بھی ضرورت نہیں۔ اسکول کے بعد ہم انشا اللہ مل رہے ہیں۔“

”کہاں؟“

”گھر پر۔“



”کس کے؟“

”ظاہر ہے میرے۔“

”دہاں سب لوگ ہوں گے اور آپ بھی شاید مصروف ہوں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پڑتا ہے۔ میں آپ سے بہت اطمینان اور سکون کے ماحول میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہمارے گھر میں آپ کو یہ دونوں چیزیں مل جائیں گی۔“

”چلے جیسے آپ کی ضد۔“

”اے خدمت کہئے۔“

”تو پھر کیا کہوں؟“

”مجھے اپنا گھر اس دنیا میں سب سے اچھی جگہ لگتی ہے جہاں میں بغیر کسی تصنع کے بڑے اطمینان سے ہر طرح کی بات کر سکتی ہوں۔“

”گھر میں آپ کی مٹی بھی ہوں گی۔“

”یہی تو سب سے اچھی بات ہے۔ مٹی آس پاس موجود ہوں تو میں خود کو بہت ایزی بہت ریلیکس محسوس کرتی ہوں۔“

”تو کیا آپ ان کی موجودگی میں بات کریں گی مجھ سے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ مٹی میری بہت اچھی دوست بھی ہیں۔ اپنے دل کی ہر بات میں ان سے کہہ دیتی ہوں۔ جو بات کسی سے نہ کہہ سکوں وہ بھی میں بتا دیتی ہوں۔ آپ بے فکر ہو کر ہمارے گھر آئیں اور مٹی کی موجودگی میں بھی بڑے اطمینان سے بات کریں۔“

”ادکے۔“ اس کے لہجے میں نیم دلی عیاں تھی۔

”اب اجازت۔“

”خدا حافظ۔“

چہرہ اسی چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے منہا سے کہا ”میڈم وہ لڑکا جسے آپ نے اپنے آفس کے باہر کھڑا کیا تھا اسے آپ نے کلاس میں واپس بھیج دیا ہے کیا؟“

”نہیں..... نہیں تو۔“

”میڈم وہ تو باہر نہیں کھڑا ہے اب۔“

”اچھا!“ منہا کو حیرت ہوئی ”اس کی کلاس میں جا کر دیکھو۔“

”نفقہ کا بچہ ہے شاید۔“

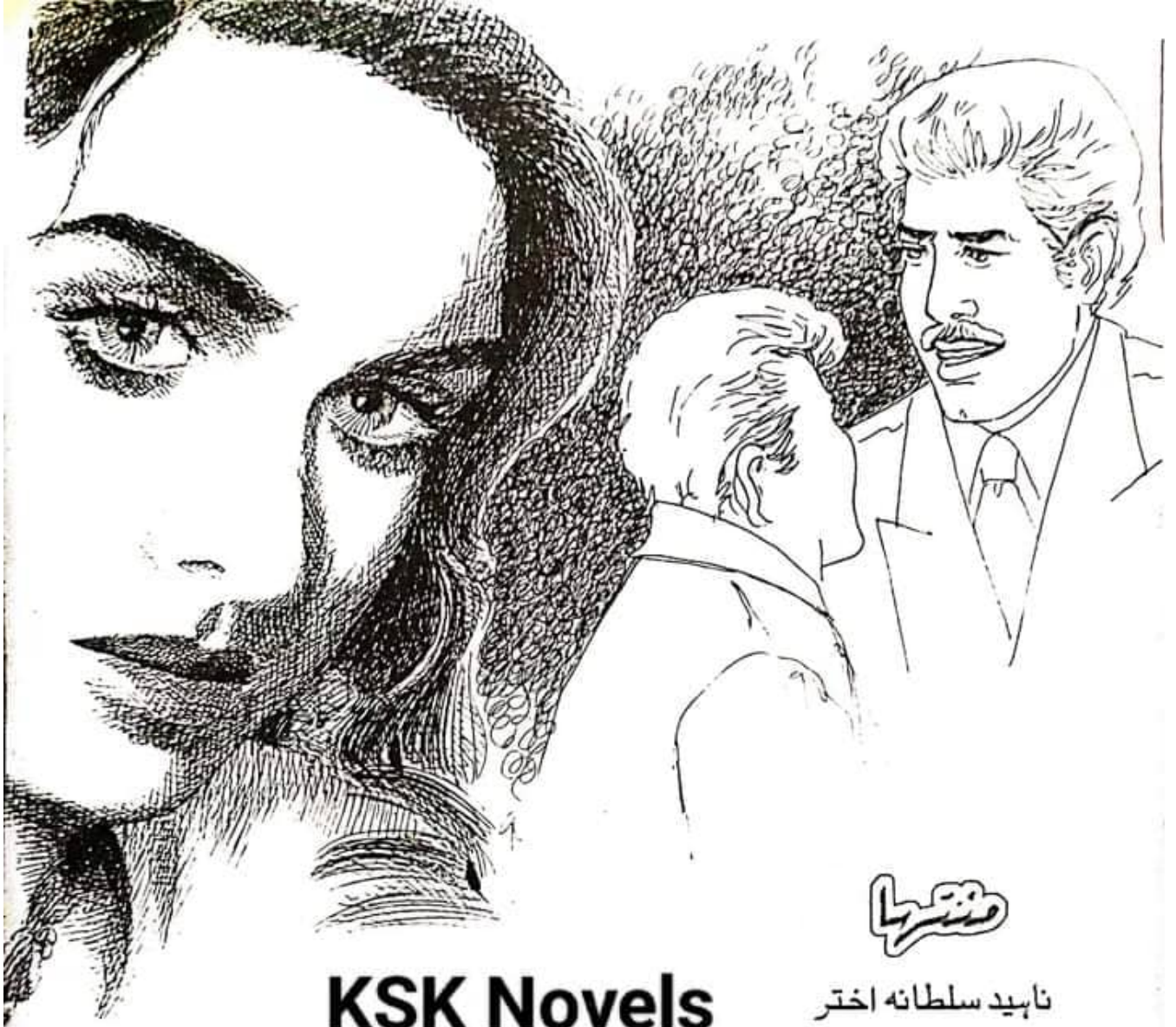
”ہاں نفقہ سی کا۔“

چہرہ اسی نے چائے منہا کے سامنے رکھی اور کمرے سے چلا گیا۔

منہا نے چائے کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لی ہی تھی کہ چونک کر گھبرا ہوا کمرے کے دروازے پر دروازہ اور اس نے کہا ”میڈم صاحبہ اچھی ابھی اپنے اسکول کا ایک لڑکا بوئڈری وال پھلانگ کر اسکول سے باہر بھاگ گیا ہے۔“

”کیا!“ منہا چائے کی پیالی واپس رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دھیان فوری طور پر دلاور کی طرف گیا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



منتہا

**KSK Novels**

ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

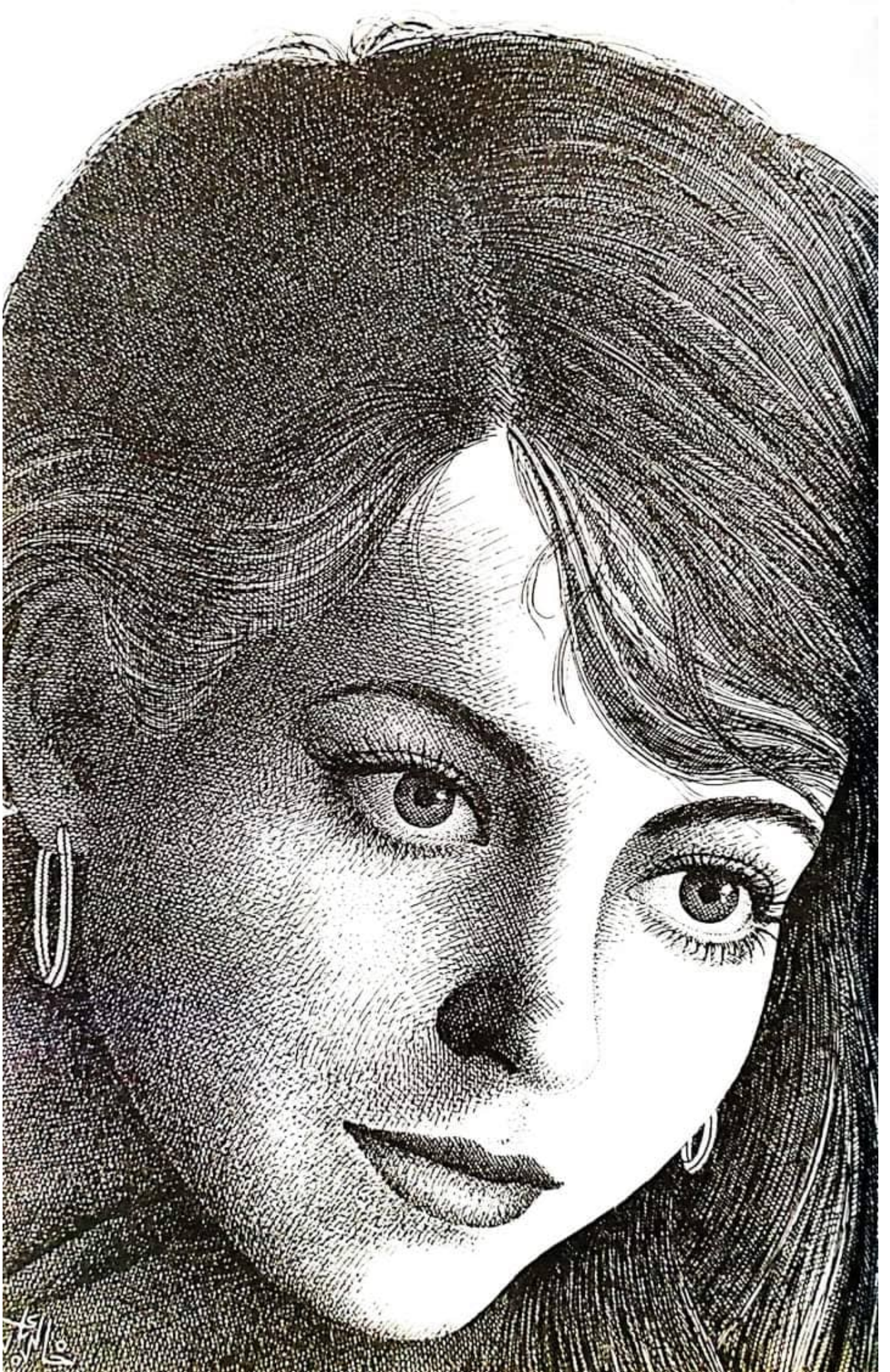
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے شتوں کا چائیک مسامحہ کی دل گداز داستان

قسط نمبر 21

APRIL 2004 PAKEEZA 114







فرار ہونے والا لڑکا دلا درہی تھا۔ کیونکہ چہرہ اسی خبر لایا کہ وہ کلاس میں نہیں گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اسکول بھر میں کہیں بھی موجود نہ پایا گیا!

ابھی اسکول میں اس کی تلاش جاری تھی کہ اس کی ماں آ پہنچی۔ منجہا نے اسے بچے کے بھاگنے کی خبر فوری طور پر سنانی مناسب نہ سمجھی۔

”بچھے۔“

”خیریت تو ہے نامیڈم؟“ اس نے بیٹھے ہوئے پرتشویش لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ منجہا کوئی جواب دے پاتی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”میں ذرا فون سن لوں پھر آپ سے بات کرتی ہوں۔“ اس نے دلاور کی ماں کی جانب دیکھتے ہوئے ریسیور کریڈل پر سے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا۔

فون کال تیسری جماعت کی ایک بچی کی والدہ کی تھی جو اپنی بچی کی تعلیمی ترقی کا احوال معلوم کرنے کے لیے اس کی نگران جماعت سے بات کرنے کی خواہش مند تھیں۔

”معاف کیجئے گا محترمہ، بچی کی پروگریس معلوم کرنے کے لیے ٹیچر سے بات کرنے کو آپ اسکول تشریف لائیں۔ فون پر ٹیچر سے بات کروانا ممکن نہیں۔“

”نامیڈم میں بیمار ہوں اسکول نہیں آ سکتی۔“ حالانکہ آواز سے بٹاشت ٹپک رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں آپ ٹھیک ہو جائیں تو آ جائیے گا۔“ منجہا نے کہا۔

”پلیز نامیڈم!“

”آئی ایم سوری! مس نشاط کا اس وقت پیریڈ ہے اور وہ اپنی کلاس میں ہیں۔ ویسے بھی ہم کسی ایمر جنسی کے سوا ٹیچرز کی والدین سے فون پر بات نہیں کر داتے۔“

”ٹھیک ہے نامیڈم۔“ وہ بادل نا خواستہ بولیں۔

ریسیور واپس رکھنے کے بعد منجہا دلاور کی ماں کی جانب متوجہ ہوئی۔

”میں نے آپ کو اس لیے زحمت دی کہ آپ کے بچے کے بارے میں انتہائی خراب شکایت ملی ہے مجھے۔“

”کیسی شکایت نامیڈم؟“

”شکایت تو ایسی ہے جسے بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے لیکن بتانا بھی ضروری ہے۔“ منجہا نے مختصر تمہید باندھی پھر محتاط الفاظ میں جملہ قصہ دلاور کی ماں کے گوش گزار کر دیا۔ وہ جیسے جیسے سنتی گئی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا چلا گیا۔ لگتا تھا وہ انتہائی شرمندہ ہو رہی تھی۔

”آپ کے بچے کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ وہ چھٹی کے بعد کافی دیر تک اسکول میں بیٹھا اپنی دین کا انتظار کرتا رہتا ہے۔“

”جی نامیڈم دین والا دیر سے آتا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس نے کئی اسکولوں کے بچے لگا رکھے ہیں۔ دوسرے بچوں کو لیتا ہوا یہاں آتا ہے۔ اسے آتے آتے دیر ہو جاتی ہے۔ اس کی بھی مجبوری ہے ہماری بھی مجبوری۔ اس کی روزی کا معاملہ ہے۔ بچے لے گا تو گاڑی چلے گی اور ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے علاقے سے بس یہی ایک دین آتی ہے اس اسکول کی طرف۔“ دلاور کی ماں نے بڑی تفصیل سے جواب دیا۔

”اگر آپ کا بچہ وقت پر اسکول سے گھر جا رہا ہوتا تو شاید یہ واقعہ رونما نہ ہوتا۔“



دلاور کی ماں کا سر جھک گیا۔  
 ”میں نے اسے اپنے آفس کے باہر کھڑا کر رکھا تھا مگر وہ آپ کے آنے سے تھوڑی دیر قبل اسکول گیٹ سے نکل  
 بھاگا ہے۔“

دلاور کی ماں نے ہڑبڑا کر نظر اٹھائی۔ ”کہاں میڈم؟“

”ظاہر ہے گھر ہی گیا ہوگا۔“

”گھر جائے تو خیر ہے، کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ میں..... میں گھر فون کر کے معلوم کر لوں میڈم؟“ دلاور  
 کی ماں انتخابی پریشان دکھائی دینے لگی۔

”ضرور۔“ منجہا نے ٹیلی فون سیٹ آگے بڑھایا۔

دلاور کی ماں اپنی جگہ سے اٹھی اور نمبر ملانے لگی۔ منجہ چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہی۔

”ہیلو! ممتاز دلاور تو گھر نہیں پہنچا؟“

دوسری جانب سے یقیناً اثبات میں ہی جواب ملا تھا۔

”اس کا خیال رکھنا، ادھر ادھر مت نکلنے دینا..... بس جس تھوڑی دیر میں آتی ہوں..... وجہ آ کر بتاؤں گی۔“

ریسیور واپس رکھنے کے بعد دلاور کی ماں منجہا کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی ”جی میڈم میری دیورانی آئی ہوئی  
 ہیں، انہوں نے بتایا کہ وہ گھر پہنچ گیا ہے۔“

”اب آپ بتائیں آپ کے بچے کے بارے میں ایسی غلط شکایت ملنے کے بعد اسے کیا سزا دی جائے۔“

”اسے معاف کر دیں میڈم؟“

منجہا نے چونک کر دلاور کی ماں کی طرف ناگواری سے دیکھا اور بے حد غصے سے بولی ”ایسی شرمناک غلطی اور  
 آپ کس قدر اطمینان سے کہہ رہی ہیں معاف کر دیں۔ جس بچے کے ساتھ اس نے یہ حرکت کی ہے اس کی والدہ کو  
 دیکھا ہوتا آپ نے تو شاید اتنی آسانی سے معافی کی بات نہ کر پائیں۔ وہ بے چاری پوری بات نہیں سوئیں۔“  
 ”میڈم میں آپ کو کیا بتاؤں میں تو مہینوں نہیں سو سکی تھی۔“ دلاور کی ماں کی آواز بگڑا گئی اور آنکھوں میں آنسو  
 اُمڈ آئے۔

”کیا مطلب!“ منجہا نے کڑھکی سے کہا۔

”کیا بتاؤں آپ کو۔“ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

منجہا کو گمان گزرا کہ وہ اپنے بچے کے بچاؤ کے لیے آنسو بہا کر اس کی ہمدردی بٹورنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 ”دیکھئے محترمہ، آپ کو اپنے بچے کے خلاف کسی سخت کارروائی کے لیے تیار رہا ہوگا۔“ منجہا کے تیور بگڑے

ہوئے تھے۔

”میڈم میرے بچے کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی..... مگر اس زیادتی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔“

”کس زیادتی کی بات کر رہی ہیں آپ! کوئی زیادتی نہیں ہوئی آپ کے بچے کے ساتھ۔“

”آپ کو کیا معلوم!“

”آپ ہمیں مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے اسے آپ کے آنے تک آفس کے باہر کھڑا کیا

تھا۔ وہ کسی کو ہتائے بغیر بھاگ گیا۔ اس میں زیادتی کی کیا بات!“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں میڈم..... میں آپ کو تو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو اس بد بخت کی بات کر رہی ہوں جو

میرے بچے کو نہ جانے کتنے دن اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہا۔“

”کو..... کو..... کون..... کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ منجہا چونک کر بولی۔

”میڈم! ہمارے پرانے محلے میں رہا کرتا تھا۔ چھڑا تھا کجنت..... پڑھا لکھا تھا، نوکری بھی تھی مگر بیوی کو طلاق دے رکھی تھی۔ نوکری سے واپس آتا تو محلے کے بچوں کو کبھی ٹانی چاکلیٹ کا لالچ دے کر اور کبھی انہیں پڑھانے کے بہانے اپنی کوٹھری میں بلا لیتا۔ میرے دلاور کو کبھی لے جاتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس لیے..... کوئی دو سال پہلے کی بات ہے ایک روز دلاور اس کے پاس سے آیا تو مجھے اس کے گال پر دانتوں کے نشان دکھائی دیے۔ میں نے اس سے پوچھا تو گھبرا گیا۔ پہلے تو آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی پھر رونے لگا اور اس نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ حرام زدہ اس کے ساتھ کرتا رہا تھا۔ دوسرے بچوں کے ساتھ بھی کرتا ہوگا میڈم! خبیث نے میرے معصوم بچے کو ڈرا دھمکا رکھا تھا کہ اگر تو نے گھر میں کسی کو بتایا تو میں تجھے جان سے مار دوں گا۔“

”پھر؟“ منہا جو دم بہ خود سن رہی تھی تو یہی سی کیفیت میں بولی۔

”پھر کیا میڈم! میں نے اپنے شوہر کو بتایا۔ انہوں نے ان لوگوں سے بات کی جن کے بچوں کو وہ بہانے بہانے اپنے ساتھ کوٹھری میں لے جایا کرتا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے بچوں سے پوچھا تصدیق ہوگئی مگر جب سب نے جا کر اس سے بات کی تو وہ صاف مکر گیا، بے ایمان قسم اٹھا گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور جب اسے پتا چلا کہ بات ہمارے گھر سے شروع ہوئی ہے تو اس نے علی الاعلان کہا کہ میں اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میڈم ہم نے تو ڈر کے مارے محلہ ہی چھوڑ دیا اور بچوں کے اسکول بھی تبدیل کر دیا۔ دلاور آپ کے پاس ہے۔ اس سے چھوٹے دو بہن بھائی یہاں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اب بتائیے میڈم میرے بچے کے ساتھ زیادتی ہوئی کہ نہیں اور اس بد بخت انسان کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے تھی کہ نہیں مگر الٹا ہی کو محلہ چھوڑنا پڑا۔“

منہا کو دلاور کی ماں سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

”میں یہ نہیں کہتی میڈم کہ میرے بچے نے غلطی نہیں کی..... ضرور کی ہوگی۔ پہلی جماعت کا معصوم بچہ جھوٹ اور وہ بھی ایسا جھوٹ کیوں بولے گا بھلا مگر میڈم میرا بچہ بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے ساتھ ہوا۔“

”مگر یہ اچھی بات تو نہیں۔“

”میں کب کہتی ہوں کہ یہ اچھی بات ہے، بہت بری بات ہے۔ مگر بچہ اس دنیا کو وہی لوٹاتا ہے جو دنیا اسے دیتی ہے۔“ دلاور کی ماں نے بیٹے کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے محترمہ کسی ایک فرد کو دنیا سے کوئی تکلیف پہنچنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ساری دنیا کو مبتلائے مصیبت کر دیا جائے۔ آپ کا بچہ اگر کسی بے راہ فرد کی زیادتی کا نشانہ بنا ہے تو اس کا یہ مطلب کب ہے کہ وہ یہی زیادتی دوسرے کے ساتھ اور دوسرا تیسرے کے اور تیسرا چوتھے کے ساتھ دہرائے۔ یوں تو یہ دنیا جہنم بن جائے گی۔“

”میڈم! مبینوں نہیں سو سکی تھی میں جب میرے بچے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ کمینہ انسان اس معصوم جان کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے وقت اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا کرتا تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ!“ منہا کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔

”اور آپ کو میں کیا بتاؤں کہ میرے بچے کے ساتھ بعد میں کیسے کیسے مسئلے ہو گئے تھے۔ کھڑے کھڑے اس کا پیشاب خطا ہو جاتا تھا۔ رات کو سوتے میں بری طرح ڈر جاتا تھا، اب بھی کبھی کبھی ڈر جاتا ہے اور اس بد معاش کا بال بھی بیک نہیں کر سکا کوئی۔“

”بہر حال..... آپ کے بچے کو اصلاح درکار ہے۔“

”میڈم!“ اس دفعہ اس کی غلطی معاف کر دیں انشاء اللہ آئندہ آپ کو ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”اس کے سلسلے میں کوئی فیصلہ ہماری ڈسپلن کمیٹی کرے گی۔ کیونکہ کوئی معمولی غلطی نہیں کی ہے آپ کے بچے



نے۔

”میں مانتی ہوں۔“ دلاور کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ ”مگر میڈم غلطی تو ہم انسانوں کے مائی باپ سے بھی ہوئی تھی۔ وہ گندم کا دانہ نہ چکھتے تو ہم آج یہاں کا ہے کوہوتے۔“  
”دیکھئے غلطی غلطی ہے اور ہر غلطی کی سزا بھی بہر حال ہوتی ہے۔“  
”میڈم بس ایسی سزا ہو کہ میرے بچے کی تعلیم متاثر نہ ہو بڑی مشکل سے اس اسکول میں داخلہ ہوا ہے اس کا۔“  
”ایک غلطی تو اور بھی کی اس نے۔“  
”وہ کیا میڈم؟“ دلاور کی ماں نے چونک کر کہا۔

”میں نے اسے سزا میں کھڑا کیا اور وہ کسی کو بتائے بغیر یہاں سے گھر بھاگ گیا۔“  
”ڈر گیا ہوگا میڈم کہ اللہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔ میں..... میں ابھی جا کر اسے کان سے پکڑ کر لاتی ہوں تاکہ اسے پتا چلے کہ اسکول سے بھاگنا اتنا آسان نہیں۔“  
”ابھی تو آپ اس کا بیک لے جائیں۔ کل صبح آپ اور اس کے والد دونوں اسے اپنے ہمراہ لے کر آئیں۔“  
”نہیں میڈم اللہ کے واسطے اس کے ابو کو نہ بلوائیں، وہ تو اسے بہت ماریں گے۔“ دلاور کی ماں گھبرا کر بولی۔  
”لیکن انہیں لاعلم بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بچوں کا مخصوص لڑکوں کی تربیت اور انہیں سدھارنے میں باپ کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔“

”وہ بہت غصیلے ہیں میڈم، میں تو بچوں کی زیادہ تر باتیں ان سے چھپا جاتی ہوں۔“  
”غلط کرتی ہیں۔ گھر کے سربراہ کو پتا ہونا چاہیے کہ اس کے بچے کیا کر رہے ہیں۔ میں کل ان سے ملنا چاہوں گی۔“

”میڈم پلیز اس دفعہ رعایت دے دیں جو بات کرنی ہے میں ماں ہوں، مجھ سے کر لیں۔“  
”سوری، میں آپ سے جو بھی بات کروں گی دلاور کے والد کی موجودگی میں کروں گی۔ ویسے بھی کل صبح اس بچے کے والدین بھی آئیں گے، میں چاہوں گی کہ آپ کی اور ان کی ملاقات ضرور ہو۔“  
”میڈم میں اپنے بھائی کو لے آؤں گی۔“ دلاور کی ماں نے لجاجت سے کہا۔  
”جی نہیں، میں آپ کے بھائی سے نہیں آپ کے مسینڈ سے بات کرنا چاہوں گی۔ نہ جانے کیوں آپ کی طرح اکثر مائیں بچوں کے معاملات باپ سے چھپائے رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ میں ایک بات آپ کو بتا دوں اس دنیا میں آپ کے بچے کا سب سے بڑا ہی خواہ اس کے والد ہی ہو سکتے ہیں۔“  
”میڈم آپ سمجھ نہیں رہیں وہ بہت غصے والے ہیں۔“

”جلاد ہی کیوں نہ سہی۔ باپ سے بڑھ کر اولاد کا بھلا چاہنے والا کوئی اور ہو سکتا ہے بھلا! مجھے ایک بات بتائیے..... جس شخص نے آپ کے بچے کے ساتھ زیادتی کی اس سے باز پرس کے لیے آپ کے ہاں سے کون گیا؟“  
”ظاہر ہے میڈم میرے شوہر! میں تو جان نہیں سکتی تھی۔“  
”کیوں؟ آپ کیوں نہیں جاسکتی تھیں؟“

دلاور کی ماں نے ملتہا کو یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی قابل اعتراض بات کہی ہو پھر بولی ”مرد کا گریبان مرد ہی پکڑ سکتا ہے میڈم؟“

”گویا بچے کو اس بد فطرت انسان کے شکنجے سے آپ کے شوہر نے چھڑایا؟“  
”جی بالکل۔“

”بچے کی بہتری اور کنبے کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے آپ کا پرانا محلہ چھوڑنے کا فیصلہ کس نے کیا؟“

”دلاور کے ابو نے۔“

”آپ کے خیال میں یہ ایک بڑا فیصلہ تھا یا نہیں؟“

”جی بہت بڑا..... وہاں ہم برسوں سے رہ رہے تھے۔ میں اسی محلے میں پلی بڑھی وہیں میری شادی ہوئی وہیں بچے ہوئے۔ اس محلے کو چھوڑنا ایک بہت بڑا قدم تھا۔“

”اور اس فیصلے پر عمل درآمد کس نے کیا؟ میرا مطلب ہے کیا آپ تنہا یہ سب کچھ کر لیتیں؟“

”تو بہ کریں میڈم، یہ مجھے عورت کے بس کی بات کہاں تھی۔ یہ تو دلاور کے ابو ہی کی ہمت تھی جو اتنا بڑا فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل بھی کیا۔“

”جو شخص آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے اتنے بڑے بڑے مرحلوں سے گزر جاتا ہے اسے آپ بچوں کی اخلاقی تربیت کے معاملے سے دور اور بے خبر کیوں رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ اس شخص کا حق ہے اور اسی میں آپ کی اور اس کے بچوں کی بہتری ہے کہ اسے معلوم رہے کہ بچے کیا کر رہے ہیں۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے اور بچوں کو کس معاملے میں سنبھالنے اور راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ کیا کرتے ہیں آپ کے شوہر؟“

”میڈم سرکاری دفتر میں ملازم ہیں۔ وہاں سے چھٹی کے بعد ایک اور جگہ پارٹ ٹائم کرتے ہیں۔ رات کو ایک ڈاکٹر کے ہاں ڈپنٹری میں کام کرتے ہیں۔“

”کس کے لیے کر رہے ہیں وہ یہ ساری جدوجہد؟“

”ظاہر ہے میڈم بچوں کے لیے۔“

”ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کے بچوں کے لیے ان کے والد سے زیادہ مخلص؟“

”دلاور کی ماں نے پورے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔“

”اور آپ اس شخص کو اپنے بچے کی ایک ایسی اخلاقی برائی سے بے خبر رکھنا چاہتی ہیں کہ جس کے سدھار کے لیے آپ کو اس سے بڑھ کر مخلص شخص اس پوری دنیا میں شاید ہی مل پائے۔“

”سوری میڈم!“ دلاور کی ماں کے لہجے میں ندامت تھی ”آپ ٹھیک کہتی ہیں، مگر غلط تو میں بھی نہیں کہتی ان کا غصہ واقعی بہت تیز ہے۔ نہ برتن دیکھتے ہیں نہ کرسی میز بس دے مارتے ہیں۔“

”دین بھر کا تھکا ہوا آدمی اور بھلا کیا کرے گا، بے چارہ۔“

”واقعی محنت تو بہت کرتے ہیں وہ اور یہ کجخت دلاور پڑھائی میں بالکل ٹھس، بس اسی پر غصہ آتا ہے انہیں کہ جب میں اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہوں، فیس دیتا ہوں، گاڑی لگوار کھی ہے ٹیوشن لگوار کھی ہے تو پھر نتیجہ اچھا کیوں نہیں دکھاتا۔“

”پھر تو ان کا غصہ اور بھی بجا آپ انہیں کل ساتھ لے کر آئیے۔“

”بس میڈم آپ ذرا ہم پر مہربانی کریں۔“ دلاور کی ماں نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے لجا جت سے کہا ”دلاور ایسا نہیں تھا۔ دوسری جماعت تک فرسٹ آیا ہے۔ میرے باقی دونوں بچے بھی پڑھائی میں برے نہیں۔ دلاور تو بس اس قصے کے بعد سے پڑھائی میں بھی پیچھے ہو گیا۔ ایک مرتبہ تیسری میں فیل ہوا ایک بار چوتھی میں۔ اسے تو اب ساتویں میں ہونا چاہیے تھا۔“

ایک بچے کے انفرادی مسئلے نے ایک تعلیمی ادارے کو کیسے مسئلے سے دوچار کر دیا تھا!

☆☆☆

دلاور کی ماں کے جاتے ہی منجانب سے اسکول کی ڈسپلن کمیٹی کو اپنے دفتر میں طلب کیا۔ غزالہ ناصر اس کمیٹی کی سینئر مونسٹ رکن تھیں۔ دلاور کی حرکت آگ کی طرح پھیل کر تمام اسٹاف کے علم میں آ چکی تھی۔ منجانب سے سرسری سی تمہید



کے بعد کمیٹی کے ارکان سے کہا ”میں نے آپ لوگوں کو اس لیے زحمت دی ہے کہ کل دلاور کے والد سے بات کرنے سے قبل ہم یہ طے کر سکیں کہ اس کی سزا کیا ہونی چاہیے۔“

”میڈم اسے فوراً اسکول لیونگ سٹریٹکٹ دے دیا جائے۔“ مسز ہاشمی نے کہا۔

”میڈم دلاور اور راج بھی ہے۔ اس کا ہمارے اسکول میں رہنا ٹھیک نہیں۔ بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ خدا نخواستہ کل کلاں کو اس نے کسی لڑکی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو ادارہ بدنام ہو جائے گا۔“ مس ادیبہ نے کہا۔

”ادارہ تو اب بھی بدنام ہو ہی گیا ہے مس ادیبہ۔“ مسز ہاشمی بولیں۔

”غزالہ آپ کیا کہتی ہیں؟“ منتہا نے غزالہ سے پوچھا۔

”میڈم ہے تو بہت سیریس بات، یہ لڑکا اسکول میں رکھے جانے کے لائق تو نہیں ہے۔“

”کہاں جائے گا؟“

”کہیں بھی جائے ہماری بلا سے میڈم۔“ مس ادیبہ نے کہا۔

”مس ادیبہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس حقیقت کو مد نظر رکھیں کہ خطا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔“

کمیٹی کے اراکین نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر غزالہ ناصر نے کہا ”آپ کا مطلب ہے میڈم، دلاور کی بدتمیزی کو نظر انداز کر دیا جائے!“

”ہرگز نہیں۔ میرا یہ مطلب قطعاً بھی نہیں۔“

”تو پھر؟“

منتہا نے پہلو بدلا۔

”دلاور کو اسکول چھوڑنے کا سٹریٹکٹ دے دینا اس مسئلے کا آسان اور محفوظ ترین حل ہوگا لیکن میری معلومات کے مطابق اس کا باپ ایک ایسا محنت کش آدمی ہے جسے شاید سونے کے لیے بھی پورا وقت نہیں ملتا ہوگا۔ دلاور کو ایس ایل سی دے کر ہم اس کے محنت کش باپ کو مزید مسائل سے دوچار کر دیں گے۔ بے چارہ کہاں مارا مارا پھرے گا اس کے دوسرے اسکول میں داخلے کے لیے، میں سمجھتی ہوں اپنے لیے اس آسان حل کے بجائے ہمیں دلاور کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ایک مدد ہوگی اس لوئر مل کلاس گھرانے کے لیے۔“

”میڈم! ہم پیچرز ہیں رفا رمر نہیں۔“ مس ادیبہ نے کہا۔

”استاد بنیادی طور پر مصلح ہی ہوتا ہے مس ادیبہ۔ جہاں شاگرد نے غلطی کی اور آپ نے اس کی غلطی کی اصلاح کی بس سمجھتے رفا رمر کا کام شروع ہو گیا۔ سیدھے بیٹھو، شور مت کرو، خاموش رہو یہ ہدایتیں کیا ہیں مس ادیبہ؟ رفا رمرنگ! استاد ہر لمحے بلا واسطہ یا بالواسطہ مصلح کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ دلاور کی اصلاح ذرا دوسری طرح کی بات ہوگی۔ اسے سمجھانا ہوگا کہ انسان اور حیوان میں فرق ہوتا ہے۔ اسے بتانا ہوگا کہ جو چہرہ اس کے تجربے میں آیا وہ شیطان کا چہرہ تھا اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کا اپنا چہرہ شیطان کا نہیں انسان کا چہرہ ہو۔“

”میڈم جی کلاس فائیو کا ایک کند ذہن طالب علم اتنی فلسفیانہ باتیں کہاں سمجھے گا بھلا!“ غزالہ نے تائید طلب نگاہوں سے کمیٹی کے دوسرے اراکین کی جانب دیکھا۔

”اتنا فلسفہ تو کلاس ون کا بچہ بھی سمجھ لے گا غزالہ۔“ منتہا نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ حسب عادت بہت اطمینان سے کہا۔

غزالہ خفیف ہو گئیں۔

”الحمد للہ ہمیں خدا کی طرف سے بہت اہم کام سونپا گیا ہے۔ وہ کام جو بیٹمبروں کا تھا۔ انسانوں کو جہالت سے آگہی کی طرف لانا۔ تاریکی سے اجالے میں آنے کی دعوت۔ یہ بہت آسان ہوگا کہ ہم ایک شخص کو اندھیرے میں ہی

بھٹکنے دیں مگر اسے اجالے میں لانے اور آگئی کا راستہ دکھانے کے لیے ہمیں خود بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنا ہوگا۔ اگر خطا انسان کی سرشت ہے تو معاف کر دینا عظمت۔ ہم عظمت کا مظاہرہ کیوں نہ کریں۔ درگزر کر کے، ہاتھ پکڑ کر، راستہ دکھا کر ہی ہم بحیثیت استاد سرخرو ہو سکتے ہیں۔ میں ڈسپلن کمیٹی سے پُر زور سفارش کروں گی کہ دلاور کو اس کی اصلاح کا موقع فراہم کیا جائے۔“ منجانب سے کسی ماہر وکیل کی طرح کہا۔

کمیٹی کے اراکین نے پھر معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”میڈم! سفارش کی کیا بات ہے آپ کو پورا اختیار ہے۔ ادارے کے سیاہ و سفید کی مالک ہیں آپ۔“ مسز ہاشمی کے لہجے میں طنز بھی تھا ناگواری بھی۔

”یہ بات نہیں مسز ہاشمی! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نے کبھی ڈکٹیٹر شپ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ الحمد للہ ہمارے ادارے کی فضا جمہوری ہے۔ میں نے دلاور کی شخص سفارش کی ہے اس سفارش کو قبول کرنا یا رد کر دینا دونوں اس کمیٹی کے اختیار میں ہے۔“

کمیٹی کے اراکین کی نگاہیں پھر ایک دوسرے کی جانب انھیں۔ تینوں بے مابین کچھ سرگوشیاں ہوئیں پھر غزالہ نے کہا ”میڈم جی دلاور اسکول میں رکھنے کے لائق ہے تو نہیں لیکن اگر آپ اسے معاف کر کے ایک موقع دینا چاہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔“

”اتنی بے دلی سے نہ کہیں غزالہ۔“

غزالہ کلکوں ہو گئیں۔

”مگر میڈم دلاور پر سختی سے نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔“ مسز ہاشمی نے کہا۔

”مسز ہاشمی، دلاور ہی کیا ہمیں تو ہر بچے پر نظر رکھنی چاہیے۔ ہر بچے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے۔ یہ والدین اور ہم ہیچرز کا کام ہے کہ ہر بچے کی دنیا میں جھانک کر دیکھتے رہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ افسوس کہ ہم دلاور کی دنیا سے بے خبر تھے۔“

☆☆☆

”شام ہو چکی تھی۔ علیب کچھ دیر قبل ہی اپنی دہن کو ساتھ لے کر اس کے میکے گیا تھا۔ اس کی شادی نے گھر کی فضا کو یکسر بدل دیا تھا۔ عروسی کمرے سے اٹھتی گلاب اور ان عطریات کی ملی جلی خوشبو نے جو علیب اور اس کی دہن جاتے ہوئے لگا کر گئے تھے گھر کی فضا کو مہکا رکھا تھا۔“

ممی بہت خوش تھیں۔

خوش ملتہا بھی تھی۔

فرحان کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو یہ خوشی دو چند محسوس ہوتی۔

نعیم آ رہا تھا اور ملتہا نے مہمان کی آمد سے قبل ہی اس کی خاطر تواضع کے انتظامات حسب عادت مکمل کر رکھے تھے۔ وقت کے وقت بھاگ دوڑ اسے قطعاً اچھی نہ لگتی تھی۔ گھر اور اسکول دونوں جگہوں پر اس کا طریقہ کار ایک ہی تھا۔ وقت سے پہلے کام مکمل رکھتی۔

ممی اور وہ مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی ہی تھیں کہ نعیم آ پہنچا۔ دروازہ ممی نے کھولا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے اپنا سر خم کر دیا۔

”جیتے رہو۔“ ممی نے دروازے پر کھڑے کھڑے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”اجازت؟“

”ہاں ہاں۔“ ممی نے بڑے تپاک سے کہا ”اجازت کی کیا ضرورت تمہارا اپنا گھر ہے۔“



”شکریہ۔“ وہ اندر آ گیا۔

ممی دروازہ بند کر کے پلٹیں۔

”چلو بیٹا۔“ ممی نے ڈرائنگ روم کی سمت اس کی رہنمائی کی اور منہجہ کو پکارا ”منہجہ! نعیم میاں آئے ہیں۔“

”آتی ہوں والدہ۔“ کمرے سے جواب آیا۔

”بیٹھو بیٹا۔“ ممی نے نعیم سے کہا اور خود بھی اس کے روبرو دوسرے صوفے پر بیٹھ گئیں ”علیب تو اپنی دلہن کے

ساتھ سرال گئے ہیں۔ میں نے تمہارے آنے کا قصد اذکر نہیں کیا ان سے مبادادہ سرال جانے کا پروگرام ملتوی کر دیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“

”السلام علیکم!“ منہجہ دروازے پر تھی۔

وہ اس کے سلام کا جواب دیتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ممی کو اس کا اٹھنا اچھا لگا۔ اس کا مطلب تھا وہ خواتین کا احترام کرنا جانتا تھا۔ ممی نے باری باری دونوں کو دیکھا کیسا متناسب جوڑ تھا۔ عمر، قد کاٹھ، صورت شکل ہر اعتبار سے۔

”خدا انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“ ممی نے دل ہی دل میں دعا کی۔

”تشریف رکھیے۔“ منہجہ نے اس سے کہا۔

”پلیز!“ اس نے پہلے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”منہجہ ممی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ بھی دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

”امی کیسی ہیں؟“ ممی نے اس کی والدہ کی خیریت دریافت کی۔

”الحمد للہ، ٹھیک ہیں۔“

”شادی میں ان کی کمی بہت محسوس ہوئی۔“

”بس ان کی مجبوری ہے زیادہ دیر بیٹھتی ہیں تو طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔“

”نعیم میاں ٹھیک ہیں؟“

”الحمد للہ! میں جاؤں گا تو انشاء اللہ دو چار دن کے لیے وہ آئیں گے یہاں۔“

”دینی اور آس پاس کے دوسرے ملکوں میں ملازمت کرنے والے پاکستانیوں کو یورپ اور امریکا میں جانے

والوں کی نسبت یہ آسانی ہے کہ جلدی گھر کا چکر لگا سکتے ہیں۔“ ممی بولیں۔

”جی ہاں بشرطیکہ وسائل اجازت دیں ورنہ ان علاقوں میں بھی ایسے تارکین وطن کی کمی نہیں جو دو دو تین تین سال

گھر کا منہ نہیں دیکھ پاتے۔“

”روزگار کی مجبوری نہ ہو تو شاید کوئی بھی اپنے گھر سے دور جانا پسند نہ کرے۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

منہجہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ ممی نے کیسے حساس موضوع پر بات شروع کر دی تھی!

دفعتاً راہداری میں لگی اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز گونجی۔

”اس وقت کون آ گیا!“ ممی نے بے ساختہ کہا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منہجہ انٹھی۔

دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کا سفید کوٹ ہتار ہا تھا کہ وہ ہاسپٹل سے آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی منہجہ کھل اٹھی۔

”اس کا مطلب ہے آج تم نے بھی چھٹی نہیں کی۔“

”کیوں!“ ”یہہ چونکی“ ”چھٹی کس بات کی۔“

”بھئی گزشتہ رات بھائی کا ولیمہ تھا۔ آج تو تھکن اتارنے کا دن تھا۔“  
 ”چھوٹے بہن بھائی بڑوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں جناب۔“  
 ”گڈ!“

”دولہا دلہن کہاں ہیں؟“

”سسرال۔“

”اوہو، بیہ ٹھنک گئی“ میں تو انہی سے ملنے آئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں..... اور لوگ تو ہیں۔“ ملتہا کارخ ڈرائنگ روم کی جانب تھا۔ بیہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتی ڈرائنگ روم کے دروازے پر جا پہنچی۔ مئی اور نعیم بہت دھیمی آوازوں میں ہم کلام تھے۔ نعیم پر نظر پڑتے ہی بیہ جہاں کی تہاں تھم گئی اور اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔ نعیم اسے دیکھ کر چونکا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”ارے بیہ! اچھا ہوا تم بھی آگئیں۔“ مئی خوش ہو کر بولیں۔

”آداب!“ نعیم اپنا ہاتھ پیشانی تک لے گیا۔

بیہ ایک بیجانی کیفیت سے دوچار نظر آنے لگی۔

”آؤ، بیٹا۔“ مئی نے کہا۔

مگر وہ آگے بڑھنے کے بجائے ایک لخت الٹے قدموں پلٹ گئی۔

ملتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے اور مئی کے مشترکہ بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی۔ ملتہا نے خفیف ہو کر نعیم کو دیکھا اور اسے بڑے جھینپے جھینپے انداز میں اپنی ہی طرف دیکھتے پا کر اس سے نظریں چڑھائیں۔

مئی اور ملتہا کی نگاہیں باہم ملیں۔

”بیٹھو بیٹا۔“ مئی نے نعیم سے کہا۔ ان کے لہجے سے خفت عیاں تھی۔

وہ بیٹھ گیا۔

”تم..... تم کچھ خیال نہ کرنا..... بیہ..... ڈسٹرب رہنے لگی ہے۔“ مئی کالب دلچہ معذرت خواہانہ تھا۔

”میں..... میں ان کی فیملی کو سمجھ سکتا ہوں۔“ نعیم نے کہا۔

”ایکسکوز می..... میں ابھی آتی ہوں۔“ ملتہا نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی

جانب تھا۔

قدموں کی آہٹ پر بیہ نے جو کھڑکی کے نزدیک کھڑی باہر دیکھ رہی تھی گردن موڑ کر دیکھا۔ ملتہا اس کے نزدیک جا پہنچی۔

”آئی ایم سوری۔“ بیہ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”سوری فار وہاٹ؟“ ملتہا نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا۔

”پتا نہیں..... پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔“ بیہ الجھے الجھے لہجے میں بولی۔ ”اس شخص کو دیکھتے ہی مجھے.....

فرحان کا خیال آ جاتا ہے۔“

کتنی حقیر تھی اس کے لہجے میں!

”اس شخص“ کے بجائے وہ نعیم بھائی، نعیم صاحب یا صرف نعیم بھی تو کہہ سکتی تھی کہ آخروہ اس کا ہونے والا برادر

نسبتی تھا مگر اس نے قطعاً بیگانگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”اِس آل رائٹ۔“ ملتہا نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔



اس نے بے یقینی سے منعہا کو دیکھا۔  
 ”مجھے پتا ہے آپ کو اچھا نہیں لگا ہوگا۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔  
 ”یہ کیسے سمجھ لیا تم نے!“  
 ”میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔  
 ”تم سے بڑھ کر پیارا کوئی اور ہو سکتا ہے مجھے۔“ اس نے کہا۔  
 ”میںہ کی آنکھوں سے پھر بے یقینی جھلکنے لگی۔  
 ”ہاں۔“ منعہا نے زور دے کر کہا ”تم سے زیادہ اور کوئی عزیز نہیں ہو سکتا مجھے۔“  
 ”میںہ کٹکٹش سے دو چار دکھائی دے لگی۔  
 ”ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں۔“ نعیم کو اپنی غلطی کا خود بھی احساس ہے۔“ منعہا نے کہا۔  
 ”کون سی غلطی؟“ ”میںہ بے ساختہ بولی۔  
 ”اپنی تیز رفتاری کا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ لوگ تو پھر بھی اس کی خاطر داریوں میں مصروف اور اسے گلے لگانے کو تیار بیٹھے ہیں۔“ ”میںہ کے لہجے میں گلہ تھا۔  
 ”اگر تم نہیں چاہو گی تو ہرگز نہیں۔“  
 ”میںہ نے چونک کر ایک مرتبہ پھر بے یقینی سے اسے دیکھا۔  
 ”ہاں میںہ۔“ منعہا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔  
 ”میںہ کی آنکھیں بھر آئیں۔  
 ”آپ یہ مت سمجھئے گا کہ میں یہ نہیں چاہتی کہ خدا خواستہ آپ کی شادی نہ ہو۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔  
 ”میں جانتی ہوں۔“ منعہا نے بڑے متحمل لہجے میں کہا۔  
 ”آپ کے لیے اس سے بھی بہتر رشتہ مل سکتا ہے۔“  
 ”نہ ملے مجھے پروا نہیں۔ میں تو صرف والدہ کی خوشی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ منع کر دوں گی، ٹال دوں گی، کوئی بہانہ کر دوں گی۔“ اس نے میںہ کی جذباتی تسکین کی خاطر کہا پھر قدرے توقف کے بعد اس کا ردِ عمل دیکھنے کی خاطر اس سے تائید چاہی ”کیوں ٹھیک ہے نا؟“  
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔  
 منعہا کو ایک جھٹکا سا لگا۔

کتنی جلدی اور کس قدر آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک ہے! یہ سوچے بنا کہ فرحان اگر اس کا شوہر تھا تو بہن کے لیے نعیم بھی کوئی نامالوس اچھی تو نہیں تھا۔ بچا کہ قول و قرار نہیں ہوا تھا۔ دو بول نہیں پڑھائے گئے تھے مگر جس طرح فرحان سے بعد از مرگ بھی اس کی ایک انیسیت تھی بہن کی بھی اپنے منگیتر سے ایک جذباتی وابستگی فطری امر تھا۔  
 ”بظاہر نارمل دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہوئے باطن سے وہ بیجان میں مبتلا ہو گئی۔ میںہ نے صرف اپنے جذبات کو اہمیت دی تھی اس کے جذبات کی پروا نہیں کی تھی۔  
 یونہی ہوتا ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے۔“

”مگر اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔ آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا کروں گی کہ بجائے ہماری طرف سے انکار ہونے کے نعیم اور ان کے گھر والے خود ہی انکار کر دیں۔ ڈیلے ٹیکس، تاخیر کا حربہ کارآمد رہے گا۔۔۔۔۔ جب کسی کام سے دامن بچانا ہو تو اتنی دیر کر دی جائے کہ اس کے ہونے یا نہ ہونے کی کوئی اہمیت ہی نہ رہے۔“

”بہت ہوشیار ہیں آپ!“ یہہ مسکرائی۔ اس کا موڈ بدل گیا تھا۔  
 ”وہ تو میں ہوں۔“ منجہا نے آپ بھی مسکرانے کی کوشش کی۔  
 کاش! یہہ جانتی کہ نعیم وہ پہلا شخص تھا جس نے اس کے دل میں گھر کیا تھا۔  
 ”تم تھوڑی سی دیر کو..... مصلحتاً ہی..... آ جاتیں۔“ اس نے یہہ سے کہا۔  
 ”کہاں؟“

”ڈرائنگ روم میں۔“  
 ”سوری! میں اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“  
 منجہا کو بچر دھچکا لگا۔  
 ”اوکے!“ اس نے اپنی باطنی کیفیت کو دباتے ہوئے کہا ”تم بیٹھو، میں انہیں رخصت کر کے آتی ہوں۔“  
 ”انہیں!“ یہہ نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا ”اے!“  
 ”اوکے۔“

ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے منجہا کو اپنے پاؤں من من بھر کے محسوس ہوئے۔ نعیم تو شادی کا پروگرام طے کرنے کے لیے اس سے بطور خاص ملنے آیا تھا اور یہہ..... وہ اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ ہو رہی تھی۔  
 ”اوہ خدا! کیسا مشکل مرحلہ تھا اس کے لیے۔“  
 ایک اتفاقی حادثے کو نعیم کے اپنے ہی لوگوں نے اس کے لیے ایسی خطا ایسا گناہ قرار دے ڈالا تھا کہ وہ راندہ درگاہ بن کر رہ گیا تھا۔

”منجہا کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔  
 ایک اچھے بھلے خوش باش گھرانے کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔  
 وہ ڈرائنگ روم میں واپس پہنچی تو مٹی نے آنکھوں میں ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

یہہ نے کچھ کہا؟  
 ناراضگی کا اظہار کیا؟  
 ساتھ کیوں نہیں آئی؟  
 کہاں ہے؟

اس نے مٹی سے نظریں چڑالیں۔  
 نعیم بھی صورت حال بھانپ گیا تھا۔  
 لاؤنج میں دھرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ منجہا نے چاہا کہ پلٹ جائے مگر مٹی نے اسے روک لیا۔  
 ”منجہا بیٹے ٹھہرو! میں دیکھتی ہوں، ہو سکتا ہے علیب کا فون ہو۔“  
 منجہا ٹھہم گئی اور مٹی کمرے سے چلی گئیں۔ نعیم نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”آئی کیل سوری۔“ منجہا نے اس سے نظریں چڑاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔  
 ”سوری ناروہاٹ؟“ اس نے اپنے تجاہل عارفانہ سے منجہا کو شرمساری سے بچانے کی کوشش کی۔  
 ”مجھے یہہ کے رویے پر شرمندگی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے بڑے محل سے کہا ”ان کی جگہ آپ ہوتیں تو آپ کا رویہ بھی شاید یہی ہوتا۔“  
 منجہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

”امی جان کہا کرتی ہیں، جس کی چیز جاتی ہے، اس کا ایمان پہلے جاتا ہے۔ یہہ بھالی کا تو نا قابلِ تلافی نقصان



ہوا ہے۔ میری تھوڑی سی بے احتیاطی کی وجہ سے“ اس نے سر جھکالیا اور شرمسار لہجے میں بولا ”گاڑی درمیانی رفتار سے بھی تو چلائی جاسکتی ہے مگر نہ جانے کیوں ہم ڈرائیورز یہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری تیز رفتاری کسی باہر والے کی نہیں ہمارے اپنے ہی کسی آدمی کی جان بھی لے سکتی ہے..... میں اپنی اس غلطی پر ساری زندگی پچھتا رہا ہوں گا۔“

منجہا کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے؟ بس ابھی ابھی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔  
کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے کہا ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“  
منجہا نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر آہستگی سے بولی ”ایک بات کہوں آپ سے؟“  
”جی..... ضرور۔“

اس نے اپنی انگلیاں موڑیں اور نگاہیں ناخنوں پر مرکوز کر دیں۔ اس کے لبوں پر تھر تھراہٹ سی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ دھیمی آواز میں گویا ہوئی ”آپ..... آپ..... آپ کو شاید..... میری بات عجیب لگے، سمجھ میں نہیں آ رہا، کیسے کہوں؟“  
نعیم نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ چند ثانیے ابھی ابھی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا ”جو بات ہے، کہہ ڈالیے“ اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دھیمے سروں میں بولا ”فرحان کی موت کے بعد پھوپھی جان اور ان کے گھر والوں کے روتے کی وجہ سے خاندان بھر میں ہم دونوں بھائیوں کے بارے میں جو شکوک و شبہات رہے ہیں، ان کے بعد مجھے اب کوئی بھی بات عجیب نہیں لگتی۔ یہ کتنی سنگین آپ جیتی ہے کہ کبھی کبھی ہم اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود مشکوک اور متنازع قرار پا جاتے ہیں۔“

اس کے لہجے کی دل گرنگی نے منجہا کو خفیف کر دیا۔  
”پلیز، آپ جو بھی بات کہنا چاہتی ہیں، بلا تکلف کہئے۔“  
”یہہ کا مسئلہ ہے“ وہ دھیمے سروں میں بولی۔  
”یہہ کا..... میں سمجھا نہیں؟“

”وہ..... شاید..... خوش نہیں ہوگی۔ میرے اور آپ کے رشتے سے۔“  
وہ دم بخود رہ گیا اور کچھ دیر بعد دل شکستہ لہجے میں بولا ”کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ..... آپ اپنی اور میری نسبت کو کنارے لگانا چاہتی ہیں؟“

منجہا نے شہتا کر اس کی جانب دیکھا۔  
”جی نہیں..... آپ غلط سمجھے ہیں۔“  
”تو پھر کیا مطلب ہے آپ کا؟“  
”یہہ..... ہمیشہ اس طرح تو نہیں رہے گی۔“  
”کیا مطلب؟“

”اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کا گھر پھر آباد کرنا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ دوبارہ اپنے گھر میں سہل ہوگی تو آپ کے بارے میں بھی اس کے خیالات اور رویے تبدیل ہو جائیں گے۔“  
”میں آپ کا مطلب کسی حد تک سمجھ رہا ہوں“ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا ”بہتر ہوگا کہ آپ کھل کر بات کریں۔“

منجہا کشمکش سے دوچار نظر آنے لگی۔  
”پلیز!“ نعیم نے اسے ایزی کرنے کی کوشش کی۔  
اس نے ابھی ابھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر کہا ”مجھے اپنی اور آپ کی شادی کے بارے میں عجیب و غریب فکریں ستاتی رہتی ہیں۔“

”مثلاً.....؟“

”مثلاً یہ کہ بیہ کے اس گھر میں رہنے کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کے بھوپا جان اسے ہماری شادی میں شریک ہی نہ ہونے دیں۔ علیٰ کی شادی میں بھی انہوں نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ اس میں شرکت کے لیے آپ جو آ رہے تھے۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہماری بہت مختصر سی دنیا رہی ہے..... والدہ، ہم دونوں بہنیں اور علیہ۔ میں کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں کروں گی کہ میری شادی میں بیہ یا تو شریک ہونے سے روک دی جائے یا شریک ہو تو بادلِ ناخواستہ..... کیا آپ اتنی مہلت دیں گے کہ بیہ دوبارہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے؟“

اس نے چونک کر منتہا کی طرف دیکھا۔

”آپ مجھے ایک لانگ ٹرم انتظار میں ڈالنا چاہتی ہیں؟“

”میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہوگا۔ بیہ خوش شکل ہے، ڈاکٹر ہے، گورنمنٹ جاب کر رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئی مناسب رشتہ مل جائے گا اس کے لیے۔“

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر بولا ”ایک بات کہوں، آپ سے؟“

”جی!“

”آپ کے خوف اور خدشات اپنی جگہ..... مگر..... ہے یہ زیادتی!“

منتہا نے ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”نہ..... نہ..... نہ.....“ وہ اس کی نگاہوں سے جھانکتے احساسِ شرمندگی کو پا گیا تھا ”یہ گلہ نہیں ہے..... مجھے تو

آپ سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ..... آپ اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔“

وہ چپ رہی۔

”بیہ بھالی کے لیے آپ کی فیملی کو قابلِ احترام ہیں..... یو آر گریٹ..... کون کرتا ہے دوسروں کے لیے اپنی

ذات کی اس طور نفی.....“

”سوری..... بیہ کا شمار دوسروں میں نہ کیجئے، وہ بہن ہے میری۔“

”میں جانتا ہوں..... جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی فیملی بہت عزیز ہے۔“

”صرف عزیز نہیں..... میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ!“ وہ دھیرے سے بولی۔

”مگر اپنی زندگی کو آپ ایڈ ہاک بنیادوں پر کیوں گزارنا چاہتی ہیں؟“

”میں سمجھی نہیں؟“

”بیہ بھالی کی دوسری شادی بڑا گنجلک مسئلہ ہے۔ خدا جانے کتنا عرصہ لگ جائے؟“

وہ خاموش رہی۔

”سوچ لیں؟“ وہ قدرے توقف سے بولا۔

”جی..... سوچ سمجھ کر ہی بات کر رہی ہوں۔“

وہ کچھ مضطرب سا دکھائی دینے لگا۔

”میں..... میں آپ کو.....“ وہ اٹکتے ہوئے بولی ”پابند نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھے..... مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر

آپ کسی اور جگہ.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اپنی انگلی میں پڑی انگلی کو بے تابانہ کھمانے لگی۔



وہ دم بخود چند ثانیے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ایک بیجانی کیفیت سے دو چار دکھائی دیتی تھی۔ نعیم اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے نزدیک آ رہا اور بڑے ٹھہرے ٹھہرے سے انداز اور فیصلہ کن لہجے میں بولا ”مجھے اگر قیامت تک بھی انتظار کرنا پڑا تو کروں گا۔“

منجانبے ہڑبڑا کر اس کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ انتہائی پُر وقار انداز میں کھڑا اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ منجانبہ کو اپنا آپ بڑا محفوظ دامن اور معتبر سامحوس ہوا۔

☆☆☆

نعیم کے جاتے ہی می نے بیہ سے علیحدگی میں اس سے آہستہ سے پوچھا ”کیا کہا نعیم نے؟“

”کہنا تو میں نے تھا، والدہ!“

”تم نے کیا کہا؟“

”وہی جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔“

”کیا آخر؟“ می کے لہجے میں بے تاب تھی۔

”بیہ کو گھر جانے دیجئے پھر بتاؤں گی۔ پلیز! آپ چائے اس کے پاس، میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

”اپنے سرال والوں کے ساتھ بیہ بھی کچھ پاگل ہو گئی ہے“ می نے ناگواری سے کہا۔

”پلیز!“ منجانبہ نے ہڑبڑا کر می کو دیکھا ”آہستہ“ اس نے سن لیا تو اور ناراض ہو جائے گی۔“

”ہو جائے..... نعیم کو کی دشمن تو نہیں تھا فرحان کا..... نہ جانے یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آتی ان سب کے۔“

”صدمہ بڑا ہو تو انسان کے سونے سمجھنے کی قوت بھی سلب ہو جاتی ہے۔“

”اولاد ہونے کی محبت اپنی جگہ مگر بیہ کی آج کی حرکت مجھے اچھی نہیں لگی۔ گھر آئے مہمان اور وہ بھی ہونے والے بہنوئی سے بھلا ایسا رویہ رکھا جاتا ہے؟“

”جانے دیں والدہ!..... آپ اس کے پاس جا کر بیٹھیں۔“

چائے دھڑپتے ہوئے منجانبہ کا ذہن الجھا رہا۔ وہ جانتی تھی کہ می کو جب یہ معلوم ہو گا کہ اس نے نعیم سے کیا کہا ہے تو وہ سخت خفا ہوں گی۔

واقعی، ایسا ہی ہوا۔

بیہ کے جاتے ہی می نے جب اس سے پھر وہی استفسار کیا تو اس نے کسی غلط بیانی سے کام لینے کے بجائے می کو وہ سب کچھ بتا دیا جو اس نے نعیم سے کہا تھا۔ می سر پکڑ کر رہ گئیں۔

”کیا ضرورت تھی یہ کہنے کی؟“

”ضرورت تھی نا والدہ! آپ نے دیکھا نہیں، نعیم کو دیکھتے ہی بیہ کا موڈ کتنا بگڑ گیا تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میری شادی ہو اور بیہ یا تو شریک نہ ہو یا منہ بنا کر شامل ہو۔“

”زیادہ عاقلہ بننے کی ضرورت نہیں، مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا؟“

”پلیز! ناراض نہ ہوں۔“

”تو کیا شادیاں بجاؤں کہ ایک بیٹی بیوہ ہو گئی، دوسری بنی بنائی بات کو بگاڑنے کے درپے۔ ادہ میرے خدا! کیسی قسمت بنائی تو نے میری..... دکھ یہ دکھ“ می رو مانسی ہو گئیں۔

”پریشان نہ ہوں..... کچھ نہیں بگڑا ہے، کچھ نہیں بگڑے گا۔“

”اچھے رشتوں کا کال ہے۔ نعیم جیسے کماؤ لڑکوں کو رشتے بہت۔ وہ تو کہو خدا کی رحمت تھی اور مسز ظہیر کی مہربانی جو اتنا اچھا رشتہ مل گیا۔ سولہ برس کی تو ہوئیں تم کہ ایک رشتہ گنوا کر دوسرے کے لیے انتظار کر لیا جائے گا۔ میں نے بُرا کیا

جو یہ سوچ کر کہ جب اتنا بڑا اسکول چلاتی ہو، دس کوراہ بھاتی ہو، عقل دیتی ہو..... نعیم کو ڈائریکٹ تم سے بات کرنے کو کہہ دیا۔ صبح جو پنج سورہ پڑھتی ہوں، اس کے آخری صفحات میں کہیں لکھا ہے کہ عورت کو کسی بھی عمر میں اس کی مرضی پر نہیں چھوڑنا چاہئے، آج اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔“

”میں نے زندگی میں کبھی آپ سے جھوٹ نہیں بولا والدہ، اسی لیے میں نے آپ کو بتا دیا کہ میں نے نعیم سے کیا کہا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی پریشان اور خفا ہوں گی تو شاید میں کوئی جھوٹ ہی گھڑ لیتی آپ کے لیے۔“

”بچن سے چھری لاؤ اور میرے گلے پر پھیر دو۔“ مٹی روہانسی ہو گئیں۔

”کیسی بات کر رہی ہیں؟“

”ماں بنو گی تو پتا چلے گا کہ اولاد اور خاص طور پر بیٹیوں کی کتنی فکر ہوتی ہے ماں کو۔ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی کہ کب علیب کی شادی ہو اور تمہاری یہ سچ ہے کہ پہلے علیب کی دلہن گھر آئے گی پھر تم شادی پر تیار ہو گی۔ اب تم نے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔ تم دیکھ لینا، وہاں سے اب یہی جواب آئے گا کہ آپ اپنی بیٹی کو اپنے پاس ہی رکھیں، ہم کہیں اور دیکھے لیتے ہیں۔“

”دیکھ لیں، میں بھی کوئی مری نہیں جا رہی ہوں شادی کے شوق میں۔“

”مگر میں تو مری جا رہی ہوں تمہاری شادی کی فکر میں!“

”کیوں فکر کرتی ہیں، میں پڑھی لکھی ہوں، اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں لوگ، لڑکیوں کو زیادہ آزادی اور خود مختاری نہیں دینی چاہئے اور اسی لیے مخالفت کرتے

ہیں لوگ لڑکیوں کو نوکری کروانے کی۔“

”والدہ! آپ تو بڑی اچھی بہت سمجھدار ماں ہیں، کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے نعیم سے جو کچھ کہا، اس پر مجھے نہ تو شرمندگی یا پریشانی ہے نہ کوئی پچھتاوا۔ ہمیں پہلے ہیسہ کو سینل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ جب تک وہ پریشان رہے گی ہم بھی خوش نہیں رہ سکتے رہی نعیم اور ان کے گھر والوں کے اکھڑ جانے کی بات تو یہ بات آپ اچھی طرح جان چکی ہیں کہ نعیم کے گھر میں وہی ہوتا ہے جو ان کی امی چاہتی ہیں اور ان کی امی ایسی کوئی بات پسند نہیں کرتیں جو نعیم کی مرضی کے خلاف ہو، نعیم سے میں نے خود ہی کہا کہ اگر وہ چاہیں تو کہیں اور شادی کر سکتے ہیں۔“

”کیا!“ مٹی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا ”تم نے یہ تک کہہ دیا!“

”جی..... مگر نعیم کا جواب بھی تو سن لیجئے۔“

مٹی دم بخود تھیں۔

”انہوں نے کہا مجھے قیامت تک بھی انتظار کرنا پڑا تو کروں گا۔“

”اور تم نے اعتبار کر لیا! منٹ بھر میں بدلتے ہیں لوگ اور یہ مرد! اپنے باپ کو نہیں دیکھا!“

”کیا فرق پڑا! اب بھی نہیں بڑے گا۔“

مٹی بے بسی سے اس کا منہ تکنے لگیں، بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”پڑے گا فرق۔“

”ادھو!“ منتہا نے مٹی کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا ”جب میں یہ فیصلہ کر کے خوش اور مطمئن ہوں تو آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“

مٹی رونے لگیں۔

منتہا دھیرے دھیرے اُن کے بال سمیٹتے ہوئے انہیں چکارنے لگی۔ اسے اپنے دل میں بہت ٹھہراؤ اور اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے لئے تو سب ہی جیتے ہیں مگر وہ اپنی ذات کی نفی کر کے دوسروں کے لئے جینے کی کوشش کر رہی تھی۔



اگلی صبح منجھا اسکول پہنچی تو دلاور کے والدین اس کے دفتر کے باہر موجود تھے دلاور بھی اُن کے ہمراہ تھا۔  
 ”میں آپ سے اسبلی کے بعد بات کروں گی“ منجھا نے دلاور کے والدین سے کہا اور اقبال کو ہدایت کی کہ انہیں ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھائے اسکول میں ملاقاتیوں کے لئے پہلے کوئی انتظار گاہ نہ تھی کچھ عرصہ قبل ہی تاج محمد کے کمرے میں ایک چوبی آڑ کھڑی کر دیا کے منجھا نے ملاقاتیوں کے بیٹھنے کے لئے ایک عارضی سی انتظار گاہ بنوا دی تھی۔  
 اسبلی کے بعد اس نے معمول کے مطابق اسکول کا تفصیلی راؤنڈ لینے کے بجائے ایک سرسری ساراؤنڈ لیا اور دلاور کے والدین سے ملاقات کے لئے اپنے دفتر میں آگئی دلاور کے والدین کو بلوانے کے لئے اس نے اقبال کو طلب کرنے کی خاطر کھنٹی بجائی ہی تھی کہ غزالہ ناصر اجازت لیتی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور ان کے پیچھے پیچھے اقبال بھی کمرے میں در آیا۔

”جی میڈم!“ اس نے بڑے ادب سے کہا۔  
 منجھا نے ایک نظر غزالہ کو دیکھا اور اقبال سے بولی ”وزیٹر روم میں ایک بچے کے والدین بیٹھے ہیں انہیں بھیجو۔“  
 ”ایکسیکو زمی میڈم پہلے ذرا آپ میری بات سن لیں پھر انہیں بلوائے گا۔“  
 ”ٹھیک ہے اقبال میں پہلے میڈم کی بات سن لوں پھر بھیجنا انہیں۔“  
 ”جی بہتر!“ اقبال نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔  
 منجھا نے غزالہ کی جانب توجہ کی۔  
 ”میڈم جی سارا اسٹاف دلاور کو اسکول میں رکھنے کی مخالفت کر رہا ہے“ غزالہ نے کہا۔  
 ”کیا مطلب؟“ منجھا چونکی۔

”میڈم سب کا خیال ہے کہ ایسے بچے کو اسکول میں رکھنے سے ماحول بگڑے گا دلاور پھر ایسی حرکت کر سکتا ہے..... سو ری میڈم مجھے تو کل گھر جانے کے بعد بھی بار بار اس کا خیال آتا رہا سچ پوچھیں تو مجھے دلاور کے تصور ہی سے گھن محسوس ہوتی رہی تمام دن۔“  
 ”ادہ لو غزالہ..... اسے راندہ درگاہ مت قرار دیجئے ورنہ آپ اس کی اصلاح میں بھی اپنا کردار ادا نہیں کر پائیں گی۔“

”تو بہ تو بہ میڈم ایسے بچے کی اصلاح! کیا کہیں گے ہم ٹیچرز اس سے کس آئندہ کسی بچے کو ہاتھ روم میں نہ لے جانا..... اف اللہ میڈم ایسی گندگی کہ زبان ہی ساتھ نہیں دے پانی اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہمارے اسکول میں.....“  
 ”کون جانے!“

”کیا مطلب میڈم جی!“ غزالہ نے چونک کر کہا۔  
 ”آپ یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں غزالہ کہ اس سے پہلے اسکول میں ایسا واقعہ نہیں ہوا کیا پتا ہوا ہو علم میں نہ آیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دلاور کی بھی یہ پہلی واردات نہ ہو اس سے پہلے بھی.....“  
 غزالہ نے جھرجھری لی اور کہا ”آپ ٹھیک کہتی ہیں اسی لئے دلاور کو تو فوراً اسکول سے نکال دینا چاہئے تاکہ اگر کسی اور بچے کے دل میں کوئی شیطان ہو تو وہ بھی عبرت پکڑے۔“  
 ”غزالہ آدم کی غلطی پر اگر اللہ میاں چاہتے تو انہیں عرش سے فرش پر اس بری طرح پھینکتے کہ وہ چور چور ہو جاتے مگر اپنا نہیں ہوا اللہ میاں نے آدم کو سہولت سے فرش پر اتارا اور خود ہی معافی کا طریقہ بھی سکھا دیا پھر اصلاح احوال کا موقع بھی دیا سزاوردی مگر معافی بھی قبول کی۔ ہم نعوذ باللہ اللہ سے بڑھ کر تو نہیں۔“

غزالہ کچھ خفیف ہو گئیں۔

”مگر میڈم سارا اسٹاف جو مخالفت کر رہا ہے۔“  
”میں ان سے صرف ایک سوال کرنا چاہوں گی۔“

”وہ کیا میڈم؟“

”خدا نخواستہ یہ حرکت اگر ان میں سے کسی کا بچہ کرتا تو ان کا ردِ عمل کیا ہوتا۔“

”خدا نہ کرے میڈم جو ہم میں سے کسی کا بچہ ایسی حرکت کرے۔“

”غلطی تو کوئی بھی کر سکتا ہے غزالہ دلیوں کے ہاں شیطان پیدا ہو جاتے ہیں۔“

”بہر حال میڈم میں نے یہ دیکھ کر کہ دلاور کے والدین آپ سے ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں آپ کو اسٹاف کی

شتر کر رائے سے باخبر کر دینا ضروری سمجھا آگے آپ کی مرضی..... میں تو آپ کی دلیل دہرہوں میڈم۔“

”آئی نو..... آئی نو غزالہ کہ آپ میری بھی خواہ ہیں..... مجھے اسٹاف کی رائے سے آگاہ کرنے کا شکر یہ۔“

غزالہ کے جانے کے بعد منجہا نے دلاور کے والدین کو بلوایا۔ دلاور کا باپ بہت جھینپا جھینپا سا تھا۔

”آپ کو آپ کی سز نے بتا تو دیا ہوگا کہ میں نے آپ کو کیوں بلوایا ہے“ منجہا نے دلاور کے باپ سے کہا۔

”جی میڈم“ شرمسار سادہ آدمی اور بھی شرمندہ دکھائی دینے لگا۔

”اب آپ خود ہی بتائیے کہ ایسے بچے کی سزا کیا ہو؟“

دلاور کے باپ نے منجہا کی جانب دیکھا اور گڑبگڑا کر بولا ”معافی چاہتا ہوں میڈم صاحبہ میں نے کل اسے بہت

مارا ہے“ اس نے وہی بات کی جو کل اس کی بیوی نے کی تھی۔

”باہر کھڑا ہے آپ اسے بلا کر دیکھ لیں انہوں نے مار مار کر اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر نیل ڈال دیئے ہیں۔“ دلاور

کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ تو آپ نے بُرا کیا“ منجہا نے دلاور کے باپ سے کہا۔

”تو پھر کیا کرتا میڈم صاحبہ دن بھر محنت کرتا ہوں اس امید پر کہ بچے بڑے ہو جائیں گے پڑھ لکھ جائیں گے تو ان

کی زندگی بھی میری طرح نہیں گزرے گی اور میں بھی چار دن زندگی کے آرام سے گزار لوں گا پر اس لڑکے نے تو

لٹیا ہی ڈبو دی منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا اس نے اسکول والوں کو خاندان میں کسی کو پتا چل جائے تو بات آگ کی طرح

پھیلے گی نہیں گے سب مجھ پر کہ یہ گل کھلایا ہے ان کی اولاد نے۔“

”بچوں کو سمجھایا جاتا ہے مارا پیٹا نہیں جاتا“ منجہا نے کہا۔

”سمجھانے کے لئے ٹائم کس کے پاس ہے میڈم صاحبہ صبح دفتر جاتا ہوں وہاں سے چھٹی کے بعد ایک جگہ پارٹ ٹائم

کرتا ہوں پھر ایک ڈاکٹر صاحب کے مطب میں ڈسپینسر کا کام کرتا ہوں رات کو جب گھر واپس لوٹتا ہوں تو بچے

سورہ ہوتے ہیں انہیں بس دیکھ ہی سکتا ہوں صبح جاگتے ہیں تو سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔“ دلاور کے باپ کی

آنکھوں میں سرخی اٹھ آئی۔

منجہا کو دلاور کے باپ سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

”کس کے لئے کر رہے ہیں آپ اتنی محنت اتنی تک ددو؟“

”ظاہر ہے میڈم صاحبہ بچوں کے لئے!“

”لیکن اگر بچوں کی تربیت صحیح نہ ہو جائے وہ اچھے انسان نہ بن سکیں تو آپ کی اس ساری محنت اور ریاضت کا

کیا فائدہ؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دل شکستہ لہجے میں کہا۔



”بچوں کی صرف مادی ضروریات پوری کر دینا ہی کافی نہیں ہوتا اور نہ ہی انہیں تعلیم کے لئے اسکول بھیجنا کافی ہوتا ہے ان کی تربیت بھی لازمی ہوتی ہے۔ بچوں کی اخلاقی تربیت والدین اور اساتذہ کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔“

”میڈم صاحبہ صبح سے دوپہر تک ہمیں اطمینان ہوتا ہے کہ بچے آپ لوگوں کے پاس ہے اچھی باتیں سیکھ رہا ہے۔“

”ہم کوشش کرتے ہیں کہ بچے اسکول سے اچھی بات ہی سیکھ کر جائے لیکن اسکول کے بعد بچے کیا کرتا ہے یہ دیکھنا آپ لوگوں کا کام ہے۔“

”یہ خیال رکھتی ہے بچوں کا“ دلاور کے باپ نے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔

”صرف یہی کیوں آپ کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہئے بچوں کی تربیت میں مانا کہ آپ انہی کے لئے صبح سے رات تک معاش کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں مگر بچوں کی کچھ جذباتی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کی تسکین کرنا لازمی ہوتا ہے۔ آپ شاید یہ کہیں کہ یہ کام ان کی والدہ کر دیتی ہیں مگر میں یہ سمجھتی ہوں کہ بچوں بالخصوص لڑکوں کے بعض جذبات اپنی تسکین کے لئے باپ کی توجہ اور محبت کے محتاج ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت میں باپ کا ایک خاص کردار ہوتا ہے۔“

”ایک ایک منہا کو علیب کا خیال آگیا ”جن لڑکوں کو باپ کی توجہ اور محبت نہیں مل پاتی ان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی کمزوری رہ جاتی ہے یا تو وہ ایک خول میں محصور ہو جاتے ہیں یا پھر بے لگام ہو جاتے ہیں۔“

”آپ درست کہتی ہیں۔“ دلاور کا باپ دل شکستہ دکھائی دینے لگا۔

”دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ نہیں تو دو تین گھنٹے ضرور نکالیں اپنے بچوں کے لئے۔ ان کی سنیں انہیں اپنے بچپن اور لڑکپن کے قصے سنائیں ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں ان سے پوچھیں کہ دن کیسا گزرا کہاں کہاں گزرا اور کس کے ساتھ گزرا۔ بچے کو اپنے رعب داب سے ڈرانے کے بجائے اس کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آئیں اسے یہ احساس دیں کہ آپ سے بڑھ کر اس کا ہمدرد دوست اور بھی خواہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اسے اتنا اعتماد دیں کہ وہ آپ سے کوئی بات نہ چھپائے ہر بات کھل کر بتائے۔ یہ سب کچھ کرنے کے لئے اگر آپ کو ڈاکٹر صاحب کے ہاں اپنی ملازمت بھی چھوڑنی پڑے تو چھوڑ دیں۔ جب آپ رات کا کھانا اپنے بچوں کے ساتھ کھائیں گے تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا۔ ایسے روزگار کا کیا فائدہ جو آپ کو اپنی پیملی کے ساتھ بیٹھنے اور ہنسنے بولنے کی بھی مہلت نہ دے۔“

وہ لگا تار بولتی چلی گئی۔

دلاور کے باپ نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور بولا ”معاف کیجئے گا میڈم صاحبہ آپ ہم جیسوں کی مجبوریاں نہیں سمجھ سکتیں جب چنگیر میں آدھی روٹی ہوگی تو پیملی کے ساتھ بیٹھنے اور کھانے میں کیا خاک مزہ آئے گا۔“

”میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں نا ہموار معاشی حالات اور روز افزوں مہنگائی نے ہمارے معاشرے میں ایک نام آدمی کی زندگی واقعی مشکل بنا دی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اپنے بچے کو محبت اور تحفظ کا احساس دے کر آپ اس کی زندگی ضرور آسان اور بہتر بنا سکتے ہیں۔“

دلنہا منہا کی نظر برآمدے کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف اٹھی اور اسے زاہد کی ماں کا چہرہ دکھائی دیا اس نے کھٹی بجا کر اقبال کو کمرے میں طلب کیا اور اس سے کہا ”اقبال باہر کاریڈور میں جو خاتون کھڑی ہیں انہیں میرے کمرے میں بھیجو۔“

”میڈم ان کے ساتھ ایک صاحب بھی ہیں۔“ اقبال نے بتایا۔

”دو لوں کو بھیجو۔“

چند ہی لمحوں بعد زاہد کے والدین منہا کے کمرے میں تھے۔

”تشریف رکھیے“ منہا نے ان دونوں سے کہا اور انہیں اور دلاور کے والدین کو باہم متعارف کرایا۔

”ہم اپنے بچے کی حرکت پر آپ سے شرمندہ ہیں“ دلاور کے باپ نے سر جھکا کر زاہد کے والدین سے کہا۔

”آپ کے شرمندہ ہونے سے ہمارے معصوم بچے کے ذہن پر لگنے والا زخم بھرتو نہیں جائے گا“ زاہد کا باپ بولا۔

دلاور کے باپ نے سر جھکا لیا۔  
”اللہ نے چاہا تو ہم پوری کوشش کریں گے کہ ہمارا بچہ اچھا بچہ بن کر رہے اسکول میں.....“ دلاور کی ماں نے کہا۔  
زاہد کے باپ نے چونک کر ملتہا کی جانب دیکھا اور بولا ”میڈم کیا ان کا بچہ اب بھی اسکول میں رکھیں گی آپ؟“

”ہم ان سے نکھوالیں گے کہ ان کے بچے نے خدا نخواستہ آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو اسے اسکول سے نکال دیا جائے گا“ ملتہا نے رمان لہجہ میں کہا۔

”نکال دیا جائے گا کا کیا مطلب میڈم اسے تو آپ کو پہلی فرصت میں نکال دینا چاہئے۔“ زاہد کے باپ نے تیور بگاڑ کر کہا۔

”بھائی صاحب ایسا نہ کہیں میری بد قسمتی کہ غلطی میرے بچے نے کی، میرے بچے کی جگہ آپ کا اپنا بچہ بھی ہو سکتا تھا“ دلاور کے باپ نے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ زندہ گاڑ دیتا میں تو ایسے بچے کو“ زاہد کا باپ بھر کر بولا۔

”آپ کے بچے کی تربیت صحیح نہیں“ زاہد کی ماں نے کہاں۔

”بالکل“ زاہد کے باپ نے تائید کی ”بچہ جو کچھ سیکھتا ہے اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔“

دلاور کی ماں نے اپنے شوہر کو دیکھا اس نے سر جھکا لیا پھر جیسی آواز میں بولا ”آپ کو حق ہے کہ جوجی میں آئے کہیں میں برا نہیں مناؤں گا۔“

”آپ برا مننا بھی کیسے سکتے ہیں میں اگر چاہوں تو آپ کو آپ کے بیٹے سمیت تھانے پکھری بلوا سکتا ہوں۔ اس عمر میں اتنا لفنگا ہے آپ کا بیٹا تو بڑا ہو کر خدا جانے کیا کرے گا“ زاہد کے باپ نے دلاور کے باپ کو انتہائی تحقیر سے دیکھا۔

”پلیز تحمل سے کام لیں، بہتر ہوگا کہ مسئلے کو الجھانے کے بجائے سلجھانے کی کوشش کی جائے۔“ ملتہا نے کہا۔

”میڈم!“ زاہد کے باپ نے ملتہا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”اس مسئلے کا صرف ایک حل ہے اور وہ یہ کہ ایسے بد معاش لڑکے کو فوراً اسکول سے نکال دیا جائے۔“

”آپ زیادتی کر رہے ہیں۔“ دلاور کے باپ نے کہا۔

”زیادتی!“ زاہد کے باپ نے دانت پیٹتے ہوئے غرا کر دلاور کے باپ کو دیکھا۔

”اطمینان سے بات کیجئے، ملتہا نے پھر مداخلت کی۔

”میڈم!“ زاہد کے باپ نے اپنی دائیں انگشت شہادت کھڑی کرتے ہوئے ملتہا کو تنبیہی نگاہوں سے دیکھا ”آپ نے اگر کوئی اسٹیپ نہ لیا ان کے بیٹے کے خلاف تو میں آپ کے ڈائریکٹریٹ جاؤں گا۔“

”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ڈائریکٹریٹ جانے سے یہ مسئلہ زیادہ بہتر طور پر حل ہوگا تو ضرور جائیں۔“ ملتہا کے لہجہ میں جیسی سی ناگواری تھی۔

زاہد کی ماں نے چپکے سے اپنے شوہر کا ہاتھ دبایا اور متحمل لہجہ میں ملتہا سے بولی ”چلئے میڈم آپ ہی بتائیں کیا ہو سکتا ہے اس کا حل؟ کس طرح ہو سکتا ہے ہمارے بچے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ!“

اس نے ملتہا کو آزمائش میں ڈال دیا۔

”دیکھئے محترمہ اس زیادتی کا ازالہ تو کسی طور بھی ممکن نہیں، یہ واقعہ تو شاید ساری زندگی آپ کے بچے کے ذہن پر



نقش رہے گا۔“

”اللہ آپ کو خوش رکھے“ زاہد کی ماں نے کہا۔

”لیکن غلطی کرنے والا بھی ایک بچہ ہی ہے۔“

”بچہ نہیں شیطان کہتے میڈم بچہ تو بہت معصوم ہوتا ہے“ زاہد کے باپ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”آپ.....“ دلاور کے باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر منہا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور زاہد کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم یعنی ہم نے یقیناً انسان کو بہتر ساخت پر پیدا کیا ہے دنیا کا ہر بچہ اسی فطرت سے اپنی زندگی کی ابتدا کرتا ہے وہ خود سے نہیں جانتا کہ نیکی کیا ہے بدی کیا یا کیا اچھا ہے کیا برا۔ اس کے ارد گرد کے ماحول میں بسنے والے لوگ جن سے اس کا سابقہ پڑتا ہے اسے یہ بتاتے ہیں کہ کیا بات اچھی ہے اور کیا بری۔ چنانچہ ہر بچے کی طرح دلاور کی ابتدا بھی یقیناً بہترین ساخت پر ہوئی مگر جس غلطی کا اس نے ارتکاب کیا وہ یقیناً اس کے ارد گرد کے ماحول کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں میڈم“ زاہد کی ماں نے پُرزور تائید کی اور دلاور کے والدین کو تحقیر سے دیکھتے ہوئے بولی ”ان کے گھر کا ماحول غلط ہے۔“

”ضروری نہیں“ منہا نے مخالفت کی ”بچہ صرف اپنے گھر کی چار دیواری ہی میں تو نہیں رہتا وہ گھر سے باہر بھی نکلتا ہے جہاں اس کا سابقہ مختلف لوگوں سے پڑتا ہے کیا پتا کون کس رنگ میں ہو اور بچے کو کوئی غلط بات سکھا دے۔“

”میڈم آپ خواہ مخواہ طرف داری کر رہی ہیں۔“ زاہد کے باپ کے لہجے میں جھلٹا ہٹ گئی۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہی۔“ منہا نے کہا۔

”یہ طرف داری نہیں تو پھر کیا ہے کہ آپ ایک لڑکے کی غلطی پر اسے سزا دینے کے بجائے اس کی دکالت کر رہی ہیں۔“ زاہد کے باپ نے نظر بٹکا ڈی۔

”میڈم میں ان سے بات کر سکتا ہوں؟“ دلاور کے باپ نے اجازت چاہی۔

”جی۔“

”بھائی صاحب میں دیکھ رہا ہوں بات بڑھتی چلی جا رہی ہے۔“ دلاور کے باپ نے زاہد کے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سر جھکا کر بولا ”اگر آپ میرے بچے کو اسکول سے نکلوانا ہی اس کی غلطی کی آخری سزا سمجھتے ہیں تو آپ بے شک نکلوا دیں لیکن اس سے پہلے میری عرض بھی سن لیں۔ ہم غریب اور شریف سے لوگ ہیں گھر کا ماحول الحمد للہ صاف ستھرا ہے نہ میرا بچہ فطرتاً برا تھا نہ گھر کا ماحول جیسا کہ آپ کی بیگم صاحبہ نے کہا خراب ہے میرے بچے کو اس غلط حرکت کا تجربہ محلے کے ایک بظاہر شریف مگر درحقیقت شیطان صفت آدمی سے ہوا۔ ہم نے اپنے بچے کو اس شیطان کے چنگل سے کس طرح نکالا وہ ایک لمبی داستان ہے مگر ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز ہمارا بیٹا خود بھی وہی حرکت کر بیٹھے گا۔“ دلاور کے باپ کی آواز بھرا گئی اور اس نے اپنا چہرہ دلوں ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے یوں سر جھکا لیا جیسے زاہد کے باپ کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔

زاہد کے والدین دم بخود دکھائی دیتے تھے۔

”میں..... میں یہ بات شاید ہر گز بھی نہ بتاتا اگر آپ لوگ میرے بچے کو اسکول سے نکلوانے پر اصرار نہ کرتے۔“

دلاور کے باپ نے ہنوز اپنا چہرہ دلوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے اپنے بچے کو آپ کے سامنے برہنہ کر دیا ہے۔ اس اسکول سے نکال کر کہاں لے جاؤں گا میں اسے..... کہاں لے جاؤں گا“ اور دلخندا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

منہا کے تصور میں بھی نہ تھا کہ دلاور کا باپ اس حد تک جذباتی ہو جائے گا۔

دلادر کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو اُڑ آئے۔  
 زاہد کے والدین بھی کچھ پیچھے ہوئے دکھائی دینے لگے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر باپ نے کہا ”ٹھیک ہے میڈم ہم اپنے بچے کو اس اسکول سے لے جاتے ہیں۔“  
 ”کہاں..... کیوں؟“ منجہا نے چونک کر ایک ساتھ دو سوال کئے۔  
 ”کہیں بھی میڈم..... یہاں تو ہم اسے غیر محفوظ سمجھتے رہیں گے۔“ زاہد کے باپ نے اس کے دونوں سوالوں کے جواب دیئے۔

”ایسا نہیں ہے..... انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا“ اس واقعے نے ہمیں غیر معمولی تشویش سے دوچار کیا ہے۔ ہم آئندہ انتہائی محتاط رہیں گے، ایک ایک بچے پر نظر رکھیں گے اب روزانہ ایک کے بجائے دو پیچرز ڈے ڈیوٹی مسٹریز ہوں گی جو صبح اسکول لگنے سے آدھا گھنٹہ قبل اسکول پہنچا کریں گی اور تمام دن انتہائی الرٹ رہیں گی۔ وقفے کے دوران اسکول کے چتے چتے پر نظر رکھیں گی اور چھٹی کے بعد آخری بچے کے جانے تک اسکول میں ٹھہریں گی اس سلسلے میں آپ والدین کا یہ تعاون درکار ہوگا ہمیں کہ بچوں کو صبح بہت جلدی اسکول نہ بھیجیں اور دوپہر کو چھٹی کے بعد انہیں اسکول سے گھر واپس لے جانے میں تاخیر نہ کریں کیونکہ ایک طرف اگر یہ مسئلہ ہے کہ بعض بچے چھٹی کے بعد بہت دیر سے گھر واپس جاتے ہیں تو دوسری طرف میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ بغض والدین اور دین ڈرائیور اپنی سہولت کی خاطر اسکول لگنے سے گھنٹا ڈیڑھ گھنٹہ قبل بچوں کو اسکول پہنچاتے ہیں جو اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ بچے کا چھٹی کے بعد دیر سے واپس جانا ہم اس سلسلے میں جلد ہی والدین اور سرپرستوں کو ایک سرکلر بھیجوا رہے ہیں۔“

زاہد کے والدین نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا پھر باپ نے کہا ”میڈم، بچہ ہمارا بہت ڈر گیا ہے اسکول سے۔“  
 ”آپ فکر نہ کریں ہم آپ کے بچے کو تحفظ کا احساس اور اعتماد دیں گے اور دوسرے بچے کی اخلاقی تربیت میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ دونوں ہی والدین کے بچوں کے مسائل کو جتنا بہتر طور پر اس اسکول کے اساتذہ سمجھ سکتے ہیں اتنا شاید کوئی نیا ادارہ نہ سمجھ سکے۔“  
 ”میڈم ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں“ زاہد کا باپ بولا۔

”بالکل نیچے وقت اور سوچتے وقت اس نکتے پر ضرور غور کیجئے گا کہ ان کے بچے کی جگہ اگر آپ کا بچہ ہوتا اور آپ کے بچے کی جگہ ان کا بچہ تو پھر کیا فیصلہ کرتے۔“

”خدا نہ کرے میڈم!“ دلادر کے باپ نے تڑپ کر کہا ”خدا نہ کرے کہ کسی اور بچے کے ساتھ وہ ہو جو میرے بچے کے ساتھ ہوا۔ میں اور میری بیوی اب تک اس اذیت کو نہیں بھول پائے ہیں۔“ زاہد کے باپ نے بیٹھے ہی بیٹھے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور دلادر کے باپ کے شانے پر دھریا۔

اور منجہا کو یوں لگا جیسے رگ سنگ سے خوشبو کے سوتے پھوٹ پڑے ہوں درد آشنائی کا یہ منظر اسے اپنے دل پر نقش ہوتا محسوس ہوا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

ہر ماہ اپنا پسندیدہ ماہنامہ پاکیزہ بذریعہ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک گھر بیٹھے حاصل کیجئے

بیردن ملک کے قارئین کے ذراقت یا انٹرنیشنل منی آرڈر کرانچی میں واقع کسی بینک میں قابل ادائی ہونا ضروری ہیں۔ بصورت دیگر بینک کمیشن کی رقم بھی ارسال فرمائیں جو اس ڈالرنک ہو سکتی ہے۔  
 FOR BANK TRANSFER : JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS, A/C No. 400094-78 HAHB BANK LTD.,  
 MANSFIELD STREET BRANCH, KARACHI, PAKISTAN.

رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے زرسالانہ مع ڈاک خرچ  
 اندرون ملک کے لئے 550 روپے  
 ایشیا یورپ اور افریقا کے لئے 1800 روپے  
 امریکا کینیڈا اور آسٹریلیا کے لئے 2400 روپے



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبہی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے پہنور میں پھنس گیا تھا۔

محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے اچانک سارہونے کی دل گداز داستان

قسط نمبر 22









علیب کی شادی کے بعد نعیم کا اپنی ہونے والی سسرال بطور خاص جانا تو اچھی بھالی اور لیلیٰ دونوں کے ہی علم میں تھا لیکن اس خصوصی حاضری کے سیاق و سباق سے دونوں ہی لاعلم تھیں۔ چنانچہ جب والدہ کے یہ کہنے پر کہ وہ آیا ہوا تو تھا ہی گئے ہاتھوں اگر اپنی شادی کی تاریخ بھی طے کر دیا جاتا تو اچھا تھا، اس نے کہا ”ابھی نہیں“ تو وہ چونک کر بولیں۔ ”کیا مطلب؟“

”اگلی بار دیکھیں گے“ نعیم نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”اگلی بار دیکھیں گے کا کیا مطلب!“

”ہو سکتا ہے مجھے ایک ٹریننگ کورس کرنا پڑے“ اس نے سوچنے سمجھے مصلحت آمیز جھوٹ سے کام لینے کی کوشش کی۔

”کورس شادی سے منع کرے گا کیا؟“

”بہت پڑھنا پڑے گا۔ توجہ بٹ گئی تو ٹھیک سے نہ پڑھ پاؤں گا۔“

”میں اور لیلیٰ تو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ تمہاری شادی ہو تو ہم بھی وہیں چل کر رہیں تم لوگوں کے ساتھ“ وہ ایک لخت اداس ہو گئیں۔

”انشاء اللہ میں بہت جلد آپ دونوں کے دیزوں کے ساتھ فہیم کو یہاں بھیج رہا ہوں، آپ لوگوں کو وہاں لانے کے لیے۔“

”کام ادھورے چھوڑ کر جانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں اپنی زندگی کا مقصد پورا سمجھوں۔“

”میری شادی کو آپ اتنا اہم کام سمجھتی ہیں“ وہ بہت پیار سے ان کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔ اچھی بھالی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور بولیں ”جتنا تم سمجھے ہو اس سے بھی زیادہ“ انہوں نے پل بھر کو توقف کیا پھر بولیں ”بیٹا میری زندگی میں تم دونوں بھائیوں کے سوا اور ہے ہی کیا۔ میرا تو جینا مرنا خوشی آرام سہی دونوں بھائیوں کے دم سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے فہیم کی خوشی تو دکھادی۔ اب تمہاری اور ہو جائے اور دونوں کے ہاں ایک ایک خوشی اور دیکھ لوں بس پھر کچھ اور تمنا نہیں کروں گی۔“

”اب کی بار واپس جا کر میں آپ کو اور لیلیٰ کو وہاں بلانے کا بندو بست کرتا ہوں“ میری شادی جب ہونا ہوگی ہو جائے گی۔“

”تم بار بار ایسی بے یقینی کی بات کر رہے ہو کہ میرے تو دل کو کچھ ہوا جاتا ہے۔“

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ ”دل کو کیا ہوا جاتا ہے!“

”کیا بتاؤں تمہیں۔“ وہ دل گرنگی سے بولیں۔

نعیم نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور انہیں بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے بولا ”میری شادی کو فی الحال کچھ عرصے کے لیے ملتوی سمجھئے۔“

”وہی کورس کی مصیبت!“ اچھی بھالی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”جی ہاں“ وہ ان سے نظریں چراتے ہوئے بولا ”کورس بھی اور اس لیے بھی کہ پھوپھی جان کے گھر والوں کا موڈ بھی ذرا بدل جائے“ دوسرا سبب اس نے قدرے دلی زبان سے بیان کیا۔

اچھی بھالی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر دل گرنگی سے بولیں ”تمہاری پھوپھی کا آنا جانا کیا رکاز، میں تو اپنے دل کی بات کہنے سننے سے بھی گئی۔“

نعیم نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا۔ ”لیلیٰ ہے نا“ وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنے بچوں سے نہیں دوستوں سے کی جاتی ہیں اور ان سے صلاح مشورہ کیا جاتا ہے۔“

”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھوپھی جان کو ہم وہاں بلائیں گے۔“ اس نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔  
”وہ بھلا آئیں گی۔“

”کیوں نہیں آئیں گی وہاں ان کی بیٹی کا گھر ہے، بھابی اور بھتیجیوں کا گھر ہے۔“  
”خدا تمہاری زبان مبارک کرے اور میں بھی ان کے وہاں آنے کا منظر دیکھوں لیکن ابھی پہلے ہم خود تو پہنچیں وہاں۔“

”بس آپ یوں پہنچیں،“ نعیم نے چٹکی بجائی۔  
”میں تمہاری شادی سے پہلے یہاں سے ہلوں گی نہیں۔“  
”لیکن ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ پھوپھی جان کے وہاں آنے کا منظر دیکھنا چاہتی ہیں۔“  
”ہاں مگر وہ بھی تمہاری شادی کے بعد۔“

”گویا اب آپ کے نزدیک ہر بات ہر کام میری شادی سے شرط ہے“ وہ اپنی باطنی کیفیت کو دبائے ہوئے بظاہر بڑے خوشگوار کجے میں بولا۔ ماں کو کیسے بتا سکتا تھا وہ کہ ملتہا نے اس سے کیا کہا تھا۔  
”بالکل“ اچھی بھابی بولیں ”اور ایک بات بتاؤ، یہ جو تم شادی میں دیر کرنے کو کہہ رہے ہو، لڑکی والے کیا کہیں گے کہ یا تو جلدی لگی ہوئی تھی یا اب دیر سے کرنے کو کہا جا رہا ہے، ان کی بھی تو سوچو۔“

وہ چپ رہا۔  
”نہیں ابھی نہیں۔ یہ اچھی بات نہیں، لڑکی کی چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی اب چھوٹے بھائی کی بھی ہو گئی۔ اس بے چاری کا کیا قصور کے مزید تاخیر ہو۔ لڑکیوں کی والدین پر ذمہ داری ہوتی ہے۔ بے چاری ماں نہ جانے کتنی بے چینی سے اس فرض کی ادائیگی کی منتظر ہوں گی۔ تمہارا کورس ہو یا کوئی اور مصروفیت میں دیر کرنے کے خلاف ہوں۔ تم خیر سے واپس جاؤ، ہم تاریخ لے کر تمہیں اطلاع کر دیں گے۔“  
”نعیم نے چونک کر انہیں دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔“

بجائے اس کے کہ انہیں اصل صورت حال دوسری طرف سے پتا چلتی خود ہی بتا دینا بہتر تھا۔ اچھی بھابی نے ساری بات ایک تحیر کی کیفیت میں سنی پھر بولیں ”بیٹا بظاہر تو ملتہا بہت شریف سی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“  
”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا امی جان۔“ نعیم نے کہا۔

”میرا مطلب ہے یہ ہم نے پہلی ہی مرتبہ سنا کہ لڑکی خود ہی اپنے منگیتر سے یوں معاملات طے کر رہی ہے۔“  
”امی جان پہلی بات تو یہ کہ..... بقول پھوپھی جان ملتہا کے گھر آنے نے والد کے بعد زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور ملتہا اس مقابلے میں پیش پیش رہی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اسے گھر میں ملتہا کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔“  
”بہر حال بیٹا، مجھے اچھی نہیں لگی یہ بات..... میں تو پریشان ہو گئی ہوں یہ سب کچھ سن کر..... عجیب بات ہے پہلے ملتہا کی شرط یہ رہی کہ پہلے بھائی کی ہو جائے تاکہ ماں اکیلی نہ رہیں، اب بہن کی شادی کا مسئلہ کھڑا کر دیا کیا معلوم کتنا عرصہ لگ جائے۔ رشتوں کا وہ کال ہے کہ اچھی بھلی کنواری لڑکیاں اپنے گھروں میں بیٹھی ہیں، میہ کا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ بیوہ اور ایک بچے کی ماں اور پھر وہ اپنی سسرال میں رہ رہی ہے، خدا جانے ان لوگوں کی رائے کیا ٹھہرے۔ نہیں ابھی ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ میں یا تو لیلیٰ کو ان کے گھر بھیجوں گی بات کرنے کے لیے یا خود نوں پر بات کر دوں گی۔“

”نعیم نے بڑبڑا کر انہیں دیکھا اور بولا ”دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں امی جان، نہ آپ خود اس سلسلے میں کوئی



بات کیجئے گا ان لوگوں سے نہ ہی لیلیٰ کو وہاں بھیجئے گا بلکہ لیلیٰ کو تو آپ یہ سب کچھ بتائیے گا بھی مت۔“

”کیوں؟“

”کیا پتا پھوپھی جان اور ان کے گھر والے بیسہ بھابی اور ان کے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہوں۔ آپ نے لیلیٰ سے یہ بات کی اور لیلیٰ نے اپنے گھر میں ذکر کر دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو جائے۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو مگر بیٹا تمہاری شادی کا مسئلہ بھی تو کسی صورت حل کرنا ہی ہے۔ منتہا سے نہ سہی کسی اور سے سہی۔“

نعیم ان کے برابر سے اٹھ کر قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ دھرتے ہوئے لجاجت سے بولا۔

”ای جان میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ آپ کی حکم عدولی اور نافرمانی نہ کروں اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ابو کے بعد میں نے آپ سے کوئی ضد نہیں کی مگر آج میں آپ سے ایک درخواست کروں گا۔“ اس نے چند ثانیے توقف کرنے کے بعد کہا ”جب تک میں آپ سے نہ کہوں نہ تو منتہا کے گھر والوں سے اس سلسلے میں کوئی بات کیجئے گا اور نہ ہی مجھے کہیں اور شادی کرنے کا کہئے گا۔“

اچھی بھابی کے چہرے کے تاثرات متغیر دکھائی دینے لگے۔ ”تم چاہتے ہو میں تمہارا سہرا دیکھے بغیر اس دنیا سے چلی جاؤں۔“

”پلیز امی جان ایسا مت سوچیں ایسا نہ کہیں۔“

”تو پھر تم ایسی بات کیوں کر رہے ہو۔“

اچھی بھابی کے گھٹنوں پر نعیم کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھ گیا اور اس نے سر جھکا کر بوجھل سی آواز میں کہا ”شاید آپ کو یہ بات عجیب محسوس ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں خود کو ایک نہیں دو گھرانوں کا مقروض سمجھتا ہوں..... پھوپھی جان کا گھرانا اور..... منتہا کا گھرانا..... میری تیز رفتاری فرحان کی موت کا سبب بنی بیسہ بھابی کے دوبارہ کسی گھر میں آباد ہونے تک منتہا سے اپنی شادی کا انتظار کر کے شاید میں کچھ سکون پاسکوں۔“ اس کی آواز رندہ گئی اور اپنا سراں کے گھٹنوں پر اوندھا کر وہ کسی بچے کے طرح سسکنے لگا۔ فرحان کی موت کے بعد یہ پہلی بار تھا کہ وہ یوں رو دیا تھا۔

اچھی بھابی کا دل بھر آیا۔

یہ وہ بیٹا تھا کہ جس نے اپنی سعادت مندی سے خاندان بھر میں ان کا سراونچا کئے رکھا تھا مگر ایک نادانستہ خطا، ایک حادثے نے اس کا اپنا ہی سر جھکا دیا تھا۔

نعیم کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔“

☆☆☆

علیب کی شادی سے ایک طرف تو گھر کے منظر میں ایک خوشگوار تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ افراد کنبہ میں ایک خوش رولز کی کا اضافہ ہو گیا اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ می کی صبح یا دو پہر تنہائی کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

دو پہر کو اسکول سے گھر آنے کے بعد منتہا کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ می کو گھر میں اکیلے چھوڑ کر کہیں نہ آئے جائے، کہیں آنا جانا ہوتا بھی تو انہیں عموماً ساتھ ہی لے جاتی۔ اسکول کی مسلسل مصروفیت میں اسے جو نئی وقفہ میسر آتا می کا خیال آتا۔ انٹرول میں غزالہ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے وہ تقریباً روزانہ ہی می سے فون پر مختصر سی بات چیت کر لیتی تو اسے قدرے اطمینان ہو جاتا۔ گو علیب کی شادی کے بعد بھی اس کا یہ معمول برقرار تھا مگر اب وہ می کی تنہائی کے خیال سے ان کے بارے میں پہلے کی طرح متشکر نہ ہوتی تھی۔

می علیب کی شادی ہو جانے سے بہت خوش تھیں۔ بیٹے اور بہو کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتیں۔ دونوں گھر سے باہر

کہیں جاتے تو آیت الکرسی پڑھ کر دم کرتیں اور حصار باندھے بغیر انہیں گھر سے نکلنے نہ دیتیں۔ واپس لوٹتے تو شکرانے کے نفل ادا کرتیں، دوسرے تیسرے دن ان کی نظرات اترتیں اور آئے دن صدقہ خیرات کرتیں۔

علیب کی دلہن ثروت فطرتاً ایک نیک طبع لڑکی تھی۔ ماں کی طرف سے اچھی تربیت نے گویا سونے پر سہاگے کا کام دکھایا تھا۔ شادی کے بعد پہلی ہی صبح فجر کی اذان کے وقت اس نے علیل سے آہستگی سے کہا تھا ”نماز کا وقت ہونے والا ہے، مجھے نماز کی تیاری کرنی ہے۔“

”تضا پڑھ لیٹا۔“

”نہیں بلکہ آپ بھی اٹھ جائیں۔ اماں کہتی ہیں جو لوگ فجر کے وقت نہیں اٹھتے نیکی کے فرشتے اُن پر ملامت کرتے ہیں۔“

”اچھا جناب“ وہ اٹھ بیٹھا اور اسے محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ”مُمی تو آپ کی ایسی باتوں سے بہت خوش ہوں گی۔“

عروسی کے کمرے سے باہر آ کر علیل نے مُمی کو جو حسب معمول تہجد کے وقت سے جاگ رہی تھیں بتایا کہ ثروت کو نماز کی تیاری کرنا تھی۔

”ماشاء اللہ!“ مُمی کو یک گونہ مسرت کا احساس ہوا کہ ایک ایسے دور میں جب بہو بیٹیاں دن چڑھے تک بستر پر اینڈتے رہنا اپنی شان سمجھتی ہیں انہیں خوش قسمتی سے ایک صبح خیز بہو میسر آ گئی تھی، کمرے میں جا کر انہوں نے دلہن کی بلائیں لیں اور غسل کے بعد اس کے سینے کے لیے بری کے جوڑوں میں سے ایک بھاری جوڑا نکالا۔

اگلے روز ثروت نے فجر کی اذان سے قبل ہی نہادھو کر نماز کی تیاری کر لی اور پہلی اذان کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مُمی حسب معمول جاگی ہوئی تھیں، انہیں سلام کر کے دعائیں لینے کو وہ ان کے نزدیک جھک گئی۔

”ماشاء اللہ آج تو تم نے خود ہی نماز کی تیاری کر لی“ ثروت کو نہایا دھویا دیکھ کر مُمی نے کہا۔

”جی“ وہ محبوب ہو کر بولی۔

”علیب کو بھی جگا دو۔ فجر کے وقت اسے اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔“

”وہ جاگ گئے ہیں..... ہاتھ روم میں ہیں۔“

”بھئی واہ!“ مُمی خوش ہو کر بولیں۔

شادی کے تیسرے دن دونوں ہنسی مون پر چلے گئے۔ ہفتہ بھر بعد واپسی ہوئی، دونوں بہت خوش تھے۔ وہ مُمی منجہا، مہیہ اور اس کے بیٹے کے لیے سو غنائیں بھی لائے تھے۔ مُمی کتنی ہی حلیم الطبع سہمی نئی نئی ساس بنی تھیں، انہوں نے ٹوٹنے کو علیل سے آہستگی سے پوچھا ”دلہن نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا کیا خریدا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

مُمی کو یقین نہ آیا بلکہ صدمہ پہنچا کہ بیٹا ان سے چھپا رہا تھا۔

”کیوں؟“ انہوں نے تعجب آمیز بے یقینی سے کہا۔

”پتا نہیں۔“

”اور ہم لوگوں کے لیے چیزیں کس نے خریدیں؟“

”ثروت نے۔“

مُمی کا اشتباہ اب بھی دور نہ ہوا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ثروت نے ساس نندوں کے لیے تو سو غنائیں خریدی ہوں اور اپنی ماں بہنوں کے لیے نہ خریدی ہوں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یا تو بیٹا ان سے چھپا رہا تھا یا نئی نویلی بہو نے کچھ ہیر پھیر



شام کو جب علیب ثروت کو اس کے گھر والوں سے ملوانے کے لیے سرال جانے لگا تو دونوں کو خالی ہاتھ گھر سے جاتے دیکھ کر مئی کا ہاتھ اٹھکا۔

”دلہن خالی ہاتھ گھر جا رہی ہو!“ مئی نے ٹوکا۔

”جی نہیں۔“ ثروت چونک کر بولی ”یہ پرس ہے میرے ہاتھ میں“ اس نے اپنے ہاتھ میں دبا چھوٹا سا پرس مئی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے سفر سے آنے کے بعد گھر جا رہی ہو۔ اپنی امی اور بہنوں کے لیے کچھ نہیں لے جا رہی؟“

”جی نہیں۔“ ثروت جھینپ کر بولی۔

”کیوں؟“

”شادی کے دوسرے دن جب ہم لوگ مٹھائی لے کر گئے تھے تو امی نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ آج کے بعد کبھی کچھ نہ لانا“

”کیوں؟“

”باجی کے ساتھ بھی امی کا یہی رویہ رہا۔ اپنی شادی کے بعد باجی یا دولہا بھائی شروع شروع کچھ لے آتے تھے تو امی دولہا بھائی سے تو کچھ نہ کہتیں باجی پر سخت خفا ہوتیں اور باجی کی دلپس بردہ چیز ان کے ساتھ ہی کریتیں، امی کہتی ہیں بیٹیوں کو دیا جاتا ہے ان سے لینا اچھا نہیں لگتا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اگر کچھ لائی تو امی رکھیں گی ہی نہیں اس لیے میں نے ان میں سے کسی کے لیے کچھ خریدا ہی نہیں۔“

”ایسا ہوتا تو نہیں، بیٹیاں اپنے گھر والوں کو دیا لیا ہی کرتی ہیں۔“

”امی کہتی ہیں ہمارے لیے تو اب تم مہمان ہو، وہی تمہارا گھر ہے۔“

”خیر یہ تو بڑی اچھی تربیت ہے۔“

”اجازت ہے مئی؟“ ثروت نے کہا، تیار ہونے سے پہلے بھی اس نے ان کے پاس آ کر کہا تھا ”علیب امی کے ہاں جانے کو کہہ رہے ہیں اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ہو آؤں۔“

مئی کو اس کے اس طرح اجازت طلب کرنے سے اپنی ذات بڑی اہم اور معتبر محسوس ہوئی۔ اب جاتے وقت بھی جب ثروت نے ان سے جانے کی اجازت مانگی تو وہ بولیں ”ٹھہرو، میں ذرا دم تو کر دوں تم دونوں پر۔“

مئی نے دونوں کے محفوظ دامون رہنے کے لیے زیر لب دعائیں کلمات پڑھے اور دم کر کے دونوں کو سپردِ خدا کیا۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد مئی دبے پاؤں انھیں اور علیب کے کمرے میں جا کر الماری اور کونوں کھدروں کا بغور جائزہ لینے لگیں۔

”کیا تلاش کر رہی ہیں والدہ؟“ ملتہا نے انہیں کمرے کی چیزوں کو احتیاط سے اٹھتے پلٹتے دیکھ کر کہا۔

مئی نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولیں ”دیکھ رہی ہوں کہ آخر ایسی کون سی چیزیں لائی ہیں علیب کی دلہن اپنی ماں بہنوں کے لیے جو اس وقت ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا انہوں نے۔“

ملتہا نے قدرے تعجب سے مئی کو دیکھا اور بولی ”والدہ! ثروت نے آپ کو بتایا تو کہ وہ کچھ نہیں لائیں۔“

”ایسا ہو سکتا ہے بھلا کہ کوئی لڑکی ساس نندوں کے لیے تو تحفے لے آئے، ماں بہنوں کے لیے نہ لائے۔“

ملتہا پہلے چونکی پھر صورت حال پورے طور سمجھ میں آ جانے پر دھیرے سے مسکرا دی اور مئی کے نزدیک جا کر جو اس وقت بیڈ کی سائیڈ بورڈ کی درازوں کی تلاشی لینے میں محو تھیں محتاط لہجے میں بولی ”آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں والدہ۔“

ممی نے ہاتھ روک کر سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں ”ہاں کہو۔“  
 ”ثرودت پر ابھی سے شک و شبہ کرنے لگنا بہت قبل از وقت بات ہوگی۔“  
 ”کیا مطلب؟“ ممی نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا۔  
 ”منجہاد حیرے سے مسکرا دی“ میرا مطلب ہے..... کل تک تو آپ ایسی نہیں تھیں۔“  
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

منتہا نے بڑے پیار سے اپنی باہیں ممی کے گلے میں حائل کر دیں اور مسکراتے ہوئے کہا ”ثرودت کی اس بات کا اعتبار کر لینے میں کوئی حرج نہیں والدہ کہ وہ اپنی امی اور بہنوں کے لیے واقعی کچھ نہیں لائیں ورنہ اس کمرے کی تلاشی آپ کو ہلکان بھی کرے گی اور آپ مزید شک و شبہ میں بھی مبتلا ہو سکتی ہیں۔“  
 ممی نے منجہاد کو تنبیہی تیوروں سے دیکھا اور بولیں ”میں دنیا کو بری ہوئی عورت مجھے سکھا رہی ہوں۔“  
 ”توبہ! توبہ! منجہاد نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”میری یہ مجال کہاں والدہ۔“  
 ممی اسے بدستور اسی طرح دیکھتی رہیں اور بولیں ”انہونی باتوں پر اعتبار وقت کے ساتھ آتا ہے۔“  
 ”یہ اتنی بھی انہونی بات نہیں والدہ“ منجہاد نے ایک لمحے کو خاموشی اختیار کی پھر کہا ”میں مانتی ہوں زندگی کے بارے میں آپ کا تجربہ بہت زیادہ بہت گہرا ہے مگر گھر سے باہر نکلنے اور لوگوں کے ساتھ ربط ضبط رکھنے سے زندگی کی تھوڑی بہت سمجھ مجھے بھی آگئی ہے۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں بلکہ اکثر تجربے میں آتے ہیں جو اپنی شادی شدہ بیٹیوں سے کوئی مادی توقع باندھنا اپنی اقدار کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا خود آپ نے بھی ہمیشہ یہی پسند نہیں کیا کہ بیسہ کو حسب استطاعت دیا ہی جائے اس سے لیا کچھ نہ جائے۔ مجھے یاد ہے فرحان نے ایک بار آپ کے لیے دو ساڑیاں خرید کر بھجوائی تھیں تو آپ نے وہ بیسہ کو واپس کر دی تھیں، ثرودت کی امی بھی آپ ہی کی ہم خیال ہو سکتی ہیں۔“  
 ممی جن کے نزدیک منتہا اپنی عمر تجربے اور بالغ نظری کے باوجود ہنوز ”بچی“ ہی تھی دل میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ اسے کتنی سمجھداری کی باتیں کرنا آگئی تھیں! اور یہ کوئی پہلی بار نہ تھی۔ ان گنت مرتبہ پہلے بھی ایسے مواقع آئے تھے جب ممی اس کے بارے میں ایسا ہی سوچنے پر مجبور ہوئی تھیں۔  
 ”تم ٹھیک کہتی ہو بیٹا مگر مجھے..... یوں لگا جیسے علیب اور ثرودت دونوں مجھ سے چھپا رہے ہیں۔“  
 ”ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ ممی نے نیم دلی سے کہا۔  
 ”مجھے اپنی ایک سینئر ٹیچر کی ایک بات بہت اچھی لگی تھی جو انہوں نے دو دوسری ساتھیوں میں جن کے درمیان خواہ مخواہ کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں، صلح کراتے وقت کہی تھی..... کہنے لگیں، ہم انسانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں ہمیشہ نیک گمان رکھنا چاہئے۔“  
 ”یہ شیطان کج بخت کیسا درغلانا ہے ہمیں، سارا کمراد دیکھ لیا، ثرودت شاید واقعی کچھ نہیں لائیں۔“  
 ”آئندہ اس کے درغلانے میں نہ آئیں والدہ“ منجہاد حیرے سے مسکرائی اور بستر پر چھٹی چادر کی شکنیں نکالتے ہوئے بولی ”میری ایک کولیگ کہا کرتی تھیں.....“  
 ”ایک تو تمہاری ہر دوسری بات میں کسی نہ کسی ٹیچر اور کولیگ کا ذکر خدا جانے کیوں نکل آتا ہے“ ممی نے بیزاری سے کہا۔

”منتہا خفیف ہو گئی۔ اس نے گردن موڑ کر ممی کی جانب دیکھا اور ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے اپنی کولیگ کا کہا انہیں بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ تو ان سے یہ کہنے کی ہمت بھی نہ کر سکی کہ اسکول کولیگز اور سٹوڈنٹس کو تو وہ اپنا آدمی زندگی باور کرتی تھی، اس لیے ہر دوسری بات میں ان کا ذکر نکل آتا تھا۔“



مئی کے چہرے اور لہجے سے عیاں بیزاری کا سبب وہ بخولی جانتی تھی۔ نعیم سے ہونے والی اس بات چیت علم میں آنے کے بعد سے مئی اس سے خفا خفا سی تھیں۔ ان کی فحش بجا بھی تھی۔  
 ”تم جو اتنی بڑی حماقت کر بیٹھیں، کم از کم کسی بڑے چھوٹے سے مشورہ ہی کر لیتیں۔“ انہوں نے علیب اور ثروت کے کئی مون پر جانے کے بعد اسے خوب ڈانٹا تھا۔  
 ”وہ جواباً مسکرا دی۔“

”حماقت کرنے کے لیے بھی مشورے کی ضرورت ہوتی ہے کیا والدہ۔“  
 مئی نے اسے گھورا۔

”پلیز ایسی ظالم نظروں سے نہ دیکھیں“ اس نے اپنی باہیں ان کے گلے میں حائل کر دیں۔  
 ”زیادہ باتیں بتانے کی ضرورت نہیں..... ارے تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ میہ کی زندگی کے لیے کوئی فیصلہ کرنے والی تم کون ہوتی ہو۔“

”کیا مطلب!“ اسے جھٹکا سا لگا ”بڑی بہن ہوں میں اس کی۔“  
 ”وہ کوئی بچی تو ہے نہیں ایک بچے کی ماں ہے اب۔ یہ تو ہم سوچتے ہیں نا کہ اس کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے بالفرض..... وہ یہ کہہ دے کہ میں نے تو اب شادی کرنی ہی نہیں۔“

”اگر وہ انکار کر دے گی تو کیا ہم اسے ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔“  
 ”زبردستی ہاں بھی نہیں کروائی جاسکتی اور پھر رشتے کوئی درختوں پر آگ رہے ہیں کیا!“  
 ”میہ جیسی کو ایفائیڈ لڑکیوں کے لیے درختوں پر ہی اُگتے ہیں والدہ۔“  
 مئی نے اسے میڑھی نظروں سے دیکھا پھر بولیں ”عقل مند ہوتیں تو شادی کر کے نعیم کے ساتھ دبئی جاتیں اور وہاں میہ کے لیے بھی کوئی راستہ بناتیں۔“

”ہاں“ اس نے اثبات میں سر ہلایا ”آئیڈیا تو یہ بھی اچھا ہے مگر اصل مسئلہ تو یہ ہے نا والدہ کہ نعیم کو میہ کے سرال والے ہی نہیں خود میہ بھی نفرت کی نظر سے دیکھنے لگی ہے۔“  
 ”خدا رحم کرے ان پر بھی اور ہم پر بھی۔“  
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔“

”پریشان! سوچ سوچ کر میرے تو دماغ کی رگیں پھٹے جا رہی ہیں۔“  
 ”آپ نے اس روز نعیم کو دیکھ کر میہ کی کاری ایکشن دیکھا تھا نا..... کیا میں ان حالات میں نعیم سے شادی کا رسک لے سکتی تھی۔ اس سے تو میں یونہی بھلی۔“  
 ”کیسا مقدر لکھا ہے خدا نے میرا“ مئی روہانسی ہو گئیں۔  
 ”ملتہا نے انہیں بمشکل دلا سا دیا۔“

☆☆☆☆

چند ہی دنوں میں ثروت سرال والوں سے ایسے کھل مل گئی جیسے ہمیشہ سے انہی کے ساتھ رہتی چلی آئی تھی۔ فجر کی اذان سے قبل ہی وہ بستر چھوڑ دیتی اور اذان ہونے تک نہادھو کر نماز کی ادائیگی کے لیے تیاری کر چکی ہوتی۔ اذان ہوتے ہی وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیتی۔ مئی کے کمرے میں آکر انہیں سلام کرتی۔ ملتہا بھی عموماً اذان فجر کے ساتھ ہی بیدار ہو جانے کی عادی تھی لیکن اگر کسی روز اسے اٹھنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو ثروت آہستہ سے مئی سے پوچھتی ”بابی کو جگا دوں؟“

”ہاں“ پھر مئی خود ہی بڑے پیار سے پکارتیں ”ملتہا! بچے اٹھ جاؤ۔“

می کی ایک آواز پر وہ ساری کسلمندی چھوڑ کر اٹھ بیٹھتی۔  
 ثروت نے علیہ کو بھی صبح سویرے جاگنے کا عادی بنادیا تھا۔ نماز ادا کرنے کے بعد ثروت قرآن مجید کی تلاوت کرتی پھر کچن کا رخ کرتی۔ شروع شروع میں نے اسے بہت منع کیا، منعہا نے اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے کچن سے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر وہ مسکراتے ہوئے پھر کچن میں در آتی۔  
 ”ارے بھئی چلی جاؤ تمہارا میاں کیا کہے گا“ منعہا کہتی۔  
 ”کیا کہیں گے!“

”کہ میری بیگم کو اتنے ہی کچن میں کام سے لگا دیا۔“  
 ”آپس کی بات ہے“ وہ ایک روز مسکرا کر بولی ”یہ مرد حضرات ہم خواتین کو کچن میں دیکھ کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر میں تو اما جی کی باچھیں کھل اٹھتی ہیں امی جی کو کچن میں دیکھ کر۔“  
 ”اچھا!“ منعہا بھی مسکرا دی۔

”جی..... امی جی کے سوا کسی اور کے ہاتھ کا پکا کھانا انہیں اچھا نہیں لگتا۔“  
 ”کھانا مزیدار پکاتی ہوں گی نا بھئی۔“  
 ”اس میں شک نہیں امی جی کے ہاتھ میں بڑی لذت ہے۔ کھانا ہی کیا امی جی تو سارے کاموں میں کمال رکھتی ہیں۔ ہم سب بہنوں کو بھی انہوں نے گھرداری کی عادت ڈالی ہے۔ وہ کہتی ہیں عورت کی پہچان اس کے گھر سے ہوتی ہے۔ جس کا گھر جتنا اچھا وہ اتنی ہی اچھی عورت۔“

”بات تو ٹھیک ہے۔“  
 ”تو پھر مجھے کیوں روکتی ہیں آپ اور می کام کرنے سے۔“  
 ”بھئی ابھی تمہارا ہاتھ کھیر میں ڈلوانا ہے۔“  
 ”دیر کس بات کی ڈلوا دیں۔“  
 ”جلدی کا ہے کی۔“

”امی جی نے ہم سب بہنوں کو کام کرنے کی عادت ڈالی ہے، فارغ مینہیں تو ابھن ہونے لگتی ہے۔ امی جی نے تو کبھی گھر میں کوئی ملازمہ وغیرہ نہیں رکھی، ہم لوگ تو جھاڑو پونچھا بھی خود ہی کیا کرتے ہیں۔ امی جی کہتی ہیں گھر کے کام کاج کرنے سے خواتین سلمنگ سینئرز میں جائے بغیر اسماٹ رہتی ہیں۔“  
 شروع شروع میں کو اس کی یہ باتیں ملمتہ کاری سی لگیں۔ غیر گھرانوں میں بیاہ کر آنے والی لڑکیاں خواہ وہ اپنے گھروں میں بے زبان جانوروں کی طرح کام کیوں نہ کرتی آئی ہوں اپنے سسرال والوں کو یہ یاد کرانے نہیں کھلسیں کہ ان کے میکے میں تو نوکروں کی فوج ظفر موج ہوا کرتی تھی جس کی موجودگی میں خود انہیں کبھی پھلی تک پھوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی اور ان کی بہو! وہ یہ کہتی تھی کہ گھر کا سارا کام ہم لوگ خود ہی کیا کرتے ہیں۔  
 ثروت کا انداز کا رسلقہ مندی اور پھرتی دیکھ کر می کو اس کی باتوں کا جلد ہی یقین آ گیا۔  
 کھیر میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے پہلے وہ گھر کے تقریباً ہر کام میں ہاتھ ڈال چکی تھی!

☆☆☆

دلا در کو زاہد کے والدین کی طرف سے تو معافی مل گئی مگر وہ بُری طرح اسکول کے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی نگاہوں میں آ گیا۔ منعہا کو آئے دن اس کے بارے میں شکایات ملنے لگیں۔  
 ”کنا ہے۔“  
 ”ہوم ورک نہیں کرتا۔“



پڑھائی کے معاملے میں بدشوق ہے۔  
 پاس نہیں ہوگا۔  
 آج اس نے یہ کیا۔  
 آج وہ کیا۔

اور ان شکایات کی تان بالآ آخر اس بات پر آ کر ٹوٹی ”میڈم یہ لڑکا اسکول میں رکھے جانے کے لائق نہیں تھا۔“  
 دلاور اور زاہد کے والدین سے ہونے والی بات چیت کے بعد منتہا نے بطور خاص ایک اسٹاف میٹنگ بلا کر  
 استانیوں سے بڑی دلسوزی سے درخواست کی تھی کہ دلاور کی اخلاقی تربیت کو ایک کارِ خیر سمجھ کر اس میں اپنا حصہ بنائیں  
 مگر یہ درخواست زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔

کلاس ٹیچر نے دلاور کو جماعت کے باقی تمام بچوں سے یوں الگ تھلگ کر کے بٹھا دیا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو۔  
 منتہا نے اسکول کا راولڈ لیتے ہوئے یہ بات نوٹ کی اور دلاور کی کلاس انچارج کو اپنے آفس میں بلا کر ان سے بات  
 کی تو وہ بڑے رازدارانہ انداز میں بولیں ”میڈم میں نے اسے باقی بچوں سے الگ کر کے سامنے اس لیے بٹھایا ہے  
 کہ اس پر نظر رہے۔ بچوں کے درمیان بیٹھ کر تو وہ گڑبڑ کر سکتا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں ٹیچر وہ بچیلٹ ہو، بچوں پر نظر رکھے۔ کلاس روم میں جا کر کرسی پر نہ بیٹھ جائے بلکہ کھڑے ہو کر  
 پڑھائے اور تحریری کام کے دوران کلاس روم کا راولڈ لے کر بچوں کی مصروفیت کا جائزہ لیتی رہے تو بچہ گڑبڑ کر ہی نہیں  
 سکتا۔“

”میڈم آپ عام بچوں کی بات کر رہی ہیں۔“

”جی ہاں..... دلاور بھی ایک عام ہی بچہ ہے۔“

”اوہ نو میڈم..... وہ..... وہ تو اسکول کے ماتھے پر بدنامی کا داغ ہے، جس روز چلا جائے گا ہمارے اسکول سے تو  
 کوئی اور پڑھے یا نہ پڑھے میں شکر ان کے نفل ضرور پڑھوں گی۔ میڈم چار پیر یڈ ہوتے ہیں روزانہ میرے اس کلاس  
 میں اور جتنی دیر میں کلاس میں ہوتی ہوں دلاور میرے اعصاب پر سوار رہتا ہے، گھن آتی رہتی ہے مجھے اس سے۔“  
 ”فارگا ڈز سیک مسز صبح..... بچوں کی غلطیاں معاف کرنا سیکھے۔“

”سوری میڈم، غلطی اور گناہ میں فرق ہوتا ہے..... گناہ معاف کرنے کا اختیار صرف اللہ میاں کو ہے۔“  
 ”وہ تو ہم انسانوں کے نہ جانے کتنے گناہ معاف کر دیتا ہے مگر ہم انسان ایک دوسرے کی غلطیوں کو بھی معاف  
 نہیں کرتے۔“

”میڈم آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ دلاور نے غلطی نہیں گناہ کیا۔“

”بہر حال مسز صبح میں چاہوں گی کہ دلاور کلاس کے باقی بچوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھے۔“

”اوکے..... مگر نتائج کی ذمہ داری میں نہیں ہوں گی میڈم۔“

”نیک امید رکھیے۔“

دلاور کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر رد کا ٹوکا جانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھی جانے لگی۔

ایسے کیوں بیٹھے ہو؟

ویسے کیوں چل رہے تھے؟

ہنسے کیوں؟

بولے کیوں؟

فلاں کی طرف کیوں دیکھا؟

اسے چھو کیوں؟  
اس سے کوئی غلطی ہوتی تو استانیاں ایک دوسرے سے طنز کہتیں ”اسے کچھ مت کہو بھئی، وہ تو میڈم کا لالہ ڈالا ہے۔“

اس روز منہتا وقفہ ختم ہونے کے بعد گراؤنڈ فلور کاراؤنڈ لے کر ادھر پہنچی تو اس نے دیکھا، دلا در اپنے کمرہ جماعت کے باہر برآمدے میں کھڑا ہوا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس نے ایک مجلد کتاب پکڑ رکھی تھی جسے اپنے چہرے کے سامنے کئے وہ چوری چوری کبھی ادھر کبھی اُھر دیکھ رہا تھا۔ منہتا کو راؤنڈ پر دیکھ کر وہ اپنا چہرہ کتاب سے چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر وہ ٹھنک گئی۔

”سزا ملی ہے؟“ اس کے لہجے میں رعب بھی تھا دلسوزی بھی۔  
دلا در نے کتاب جوں کی توں اپنے چہرے کے سامنے رکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
”کیوں؟“

وہ چپ رہا۔  
”ہاں، تمہیں کیوں سزا ملی ہے آپ کو؟“  
”پتا نہیں میڈم“ وہ منمننا کر بولا۔  
”کیا!“ منہتا نے تعجب سے کہا ”آپ کو سزا ملی ہے اور آپ کو یہ معلوم نہیں کہ کس بات پر۔“  
وہ کچھ نہیں بولا۔

”کچھ تو کیا ہوگا آپ نے جو آپ کو سزا ملی۔“  
”نو میڈم..... ہم نے کچھ نہیں کیا۔“  
یہ ناقابل یقین بات تھی۔

منہتا نے دلا در کی کلاس میں جھانکا، مضافاتی علاقے کے ایک اسکول سے تبادلہ ہو کر آنے والی ٹیچر مس فرح بڑے انہماک سے بچوں کو ریاضی پڑھا رہی تھیں۔  
”ایکسکوز می مس فرح“ منہتا نے ٹیچر کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مس فرح چونک کر تختہ سیاہ کی طرف سے پلٹیں اور انہوں نے دروازے کی جانب دیکھا۔  
”سوری میڈم!“

”نو نو ایس آل رائٹ“ منہتا نے انہیں دروازے پر آنے کا اشارہ دیا۔ وہ چند قدم آگے بڑھیں اور اس کے نزدیک آئیں۔ منہتا دروازے سے ہٹ کر برآمدے میں آگئی اور مس فرح نے اس کی تقلید کی۔  
”آئی ایم سوری مس فرح، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“  
”ناٹ ایٹ آل میڈم!“

”میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس بچے کو آپ نے سزا دی ہے یا کسی اور نے؟“ منہتا نے ایک نظر دلا در پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”میڈم میں نے۔“  
”میں پوچھ سکتی ہوں کس بات پر۔“  
”وہ..... میڈم..... میں نے سنا ہے..... یہ..... اچھا لڑکا نہیں ہے۔“ مس فرح اکتاتے ہوئے بولیں۔  
”آپ کی کلاس میں کچھ گڑبگڑ کی اس نے؟“  
”نو..... لو میڈم..... بس میں نے احتیاطاً اسے باہر نکال دیا۔“



احتیاطاً! یہ کیسی احتیاط تھی جو ایک بچے کو اس کے سبق سے محروم کئے دے رہے تھی۔  
 ”پلیز اسے کلاس میں بٹھائیے، ہم اس سلسلے میں مزید بات بعد میں کریں گے۔“  
 ”اوکے میڈم!“ مس فرح چھپ کر بولیں۔

”ٹھینک یو“ ملتا آگے بڑھ گئی اور مس فرح نے دلاور کی طرف قدم بڑھائے۔ راولڈ لینے کے بعد ملتا اپنے  
 آنس کی طرف آئی تو تاج محمد کے کمرے سے مسز اشتیاق کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھنک گئی اور  
 اس نے کھڑکی سے کمرے میں جھانکا۔

”مجھے ابھی اور اسی وقت لیٹر کی کاپی چاہیے۔“ مسز اشتیاق کی آواز سے غصہ جھٹک رہا ہے۔ ٹیچرز کو تاج محمد کے  
 بارے میں اکثر عدم تعاون کی شکایت رہا کرتی تھی۔

”سوری مس، اس وقت تو میں مصروف ہوں، کل آڈٹ ہوتا ہے، میں ضروری فائلیں ترتیب سے رکھ رہا ہوں۔  
 اس کام سے نمٹ کر آپ کو لیٹر کی کاپی کروادوں گا۔“ تاج محمد نے کہا۔

”میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا“ مسز اشتیاق پہلے سے زیادہ چراغ پا ہو کر بولیں۔

”سوری جی میں بھول گیا۔“ تاج محمد نے ملائمت سے کہا۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھے ابھی چاہیے۔“

”ابھی تو ممکن نہیں۔“

”تاج محمد صاحب مجھے ابھی چاہیے۔“

”مس ابھی نہیں دے سکتا۔“ تاج محمد اپنا کام بھی کئے جا رہے تھے۔

”آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔“

”میں کس لائق ہوں مس جی جو اپنے آپ کو کچھ سمجھوں گا۔“

”لیکن ایکٹ تو آپ یوں کرتے ہیں جیسے ڈی جی لگے ہوئے ہیں۔“

”اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں میڈم“ تاج محمد نے مسکرا کر کہا۔ ملتا کھڑکی کے نزدیک کھڑی ان  
 کا مکالمہ سن رہی تھی۔

”بہت روڈ ہیں آپ۔“

”میڈم میں نے تو آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔“

”یہ گستاخی نہیں تو پھر کیا ہے کہ میں کل سے آپ سے لیٹر کی کاپی مانگ رہی ہوں اور آپ مجھے ٹر خا رہے ہیں۔“

”میڈم ٹر خا نہیں رہا۔ آپ نے کل چھٹی کے وقت کہا، میں بھول گیا، آج اگر آپ صبح ہی مجھے یاد دلا دیتیں تو

میں نکال دیتا مگر اس وقت میں آڈٹ کی تیاری میں لگا ہوا ہوں اور آپ جو لیٹر مانگ رہی ہیں وہ دس بارہ سال پرانا

پالیسی لیٹر ہے، اسے فائلوں میں ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”ڈھونڈیے..... یہ آپ کا کام ہے۔“

”سوری میڈم میرا جو کام ہے میں جانتا ہوں برائے مہربانی آپ اس وقت مجھے پریشان نہ کریں، کل لے لیں

لیٹر کی کاپی مجھ سے“ تاج محمد نے اب ناگواری سے کہا۔

”مجھے ابھی چاہیے“ مسز اشتیاق تڑخ کر بولیں ”ورنہ میں میڈم کو رپورٹ کروں گی۔“

”جائیں کر دیں۔“

”شٹ اپ!“

”تمیز سے بات کریں میڈم..... اپنے لہجے کو قابو میں رکھیں۔“

”ارے آپ ہیں کس کھیت کی مولیٰ میں تو اپنے شوہر سے بھی اسی لہجے میں بات کرتی ہوں۔“

”میں آپ کا شوہر نہیں ہوں میڈم“ تاج محمد نے بے ساختہ کہا۔

مزاشتیاق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اور تاج محمد کا چہرہ یک بیک اتنا سرخ ہو گیا جیسے سارے جسم کا خون وہیں مجتمع ہو گیا ہو۔

منتہا کھڑکی کے پاس سے پلٹی تو اس نے دیکھا اقبال اور آبا صغراں کان لگائے کھڑے تھے انہیں اپنے اپنے کام سے مطلب رکھنے کی ہدایت کر کے وہ تاج محمد کے کمرے میں جا پہنچی۔

”کیا بات ہے مزاشتیاق کیوں اتنی خفا ہو رہی ہیں آپ بے چارے تاج محمد صاحب پر!“

”میڈم! میڈم یہ..... یہ بہت بدتمیز آدمی ہیں“ مزاشتیاق روہانسی ہو رہی تھیں۔

”سن لیجئے میڈم“ تاج محمد کے لہجے میں شکوہ تھا۔

”میں نے سب کچھ سن لیا ہے“ منتہا دھیمے لہجے میں بولی ”اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ باہر اقبال اور آبا صغراں

بھی سن رہے تھے۔ ہم پڑھے لکھے لوگوں کو کچھ تو اپنا بھرم قائم رکھنا چاہیے ان لوگوں پر.....“

”میڈم..... میں..... میں آپ کو کیا بتاؤں انہوں نے مجھے کیا کہا..... ایسی بات کہ میں..... میں لرز کر رہ گئی

ہوں۔“

”آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں مزاشتیاق میں نے خود سن لیا ہے“ آپ ماسٹڈ نہ کیجئے گا۔ شوہر سے بھی ایسے لہجے

میں بات کرنا اچھا نہیں ہوتا اور تاج محمد صاحب آپ کو خواتین سے بات کرتے ہوئے الفاظ کے استعمال میں محتاط رہنا

چاہئے۔“

”سوری میڈم.....“ تاج محمد خفیف ہو کر بولے۔

”آئندہ خیال رکھیں۔“ منتہا نے انہیں تنبیہ کی پھر مزاشتیاق سے بولی ”تاج محمد صاحب آڈٹ کی تیاری میں

مصرف ہیں“ مزاشتیاق اگر آپ کو بہت ایمر جنسی ہے تو میں آپ کو مطلوبہ لیٹر خود تلاش کئے دیتی ہوں ورنہ آپ کل

لے لیں۔“

”ٹھیک ہے میڈم کل ہے لے لوں گی۔“

”تھینک یو۔“

مزاشتیاق جھینپی جھینپی سی تاج محمد کے کمرے سے نکل گئیں۔

منتہا نے تاج محمد کی طرف دیکھا ان کی نگاہوں میں خفت تھی۔

”سوری میڈم! واقعی غلط بات نکل گئی میری زبان سے۔ میں تو ان عورتوں سے زیادہ بات کرنا پسند ہی

نہیں کرتا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا تاج محمد صاحب..... عورت تو میں بھی ہوں؟“

”لو میڈم میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

”آپ کا جو بھی مطلب ہو ایک دوسرے کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔“

”میں ان سے احترام ہی سے بات کر رہا تھا۔“

”جی، میں نے دیکھا آپ بہت تحمل سے بات کر رہے تھے میں آپ کی اس بات کو بھی جس پر مزاشتیاق کو

اعتراض ہوا اتفاقاً امر سمجھتی ہوں مگر مجھے آپ کی یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ میں ان عورتوں سے زیادہ بات کرنا پسند

نہیں کرتا۔ یہ سب پڑھی لکھی خواتین ہیں تاج محمد صاحب! معاشی تک ددو میں اپنے گھر کے مردوں کی شریک! میں ماننی

ہوں کہ مزاجاً سب ایک جیسی نہیں لیکن اپنے اپنے مزاج سے قطع نظر خواتین ہونے کے ناتے یہ احترام کی مستحق ہیں یہ



مائیں بہنیں بیٹیاں ہیں تاج صاحب۔“  
 ”میڈم ہم بھی تو کسی کے باپ بھائی اور بیٹے ہیں۔“ تاج محمد کے لہجے میں دل گرنگی تھی۔  
 ”اسی لیے میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں۔“

تاج محمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اُن کے چہرے سے جھلکتی دل شکستگی اور ملال نے لحوں میں شادابی اور طمانیت کا روپ دھار لیا۔

”تھینک یو ویری مچ میڈم“ تاج محمد کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

☆☆☆

لیلیٰ نعیم کے اہل خانہ میں سے تھی۔ نعیم کی شادی موخر ہونے کا سبب اس سے کیونکر پنہاں رہ سکتا تھا بالآخر افشا ہو کر رہا۔ اچھی بھالی اسے نہ بتاتیں تو اور کس سے کہتیں۔ نعیم کے جانے کے بعد سے انہیں اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ لیلیٰ نے بھی کئی بار پوچھا۔ ”اچھی ممانی آپ تو کہتی تھیں اس مرتبہ نعیم بھائی کے آنے پر تاریخ مقرر کر دیں گی۔ نعیم بھائی چپ چاپ کیوں چلے گئے۔“ لیلیٰ کو نعیم اور منتہا کی شادی کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ ہونے پر فکر اس لیے تھی کہ اس کا دینی جا کر نعیم کے ساتھ رہنا، ان دونوں کی شادی سے مشروط ہوتا تھا۔

”مگر تم اپنے گھر میں اس بات کا ذکر نہ کرنا۔“ اچھی بھالی نے بھی اسے منتہا سے نعیم کی ملاقات کا قصہ سنانے کے بعد محتاط لہجے میں ہدایت کی۔

”کیوں ممانی جان؟“

”تمہاری امی کا دل دکھا ہوا ہے۔ کہیں یہ نہ سوچیں کہ فرحان کی تو ابھی برسی بھی نہیں ہوئی اور ان لوگوں کو بیسہ کی دوسری شادی کی فکر ہو گئی۔“ لیلیٰ چپ رہی۔

”لیکن حق بات یہ ہے بیٹا کہ بیسہ کو بھی زندگی گزارنے کے لیے کوئی تو سہارا چاہیے ہی نا پہاڑی زندگی کیونکر گزارے گی۔“

لیلیٰ نے ایک دبی دبی سی سرد آہ کھینچی۔

”بہت مشکل ہوتا ہے عورت کے لیے تنہا زندگی گزارنا۔“

”تنہا کہاں ممانی جان، ہمارے گھر میں سب لوگ بھالی کا اتنا خیال رکھتے ہیں، امی، ابو، عدنان سب ہی ان کی اور مٹنے کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔“

”بیٹا خیال تو سارے خاندان نے تمہارے ماموں کے انتقال کے بعد میرا اور دونوں بچوں کا بھی بہت رکھا مگر کون سادہ تھا کہ جب میں نے ان کی محسوس نہیں کی۔ خوشی، غمی، پیاری، آزادی، عید، تہوار ان کی آپ ہی آپ محسوس ہونے لگتی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ساری ضرورتیں بھی پوری ہوئیں۔ بچے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر بھی کھڑے ہو گئے مگر وہ جو ایک خانا تھا تمہارے ماموں کی موت کے بعد وہ کبھی پُر نہ ہو سکا۔“

”آپ بُرا نہ منائیں تو ایک بات پوچھوں ممانی جان؟“

”ہاں..... پوچھو۔“

”اچھا چھوڑیں..... جانے دیں۔“

”نہیں نہیں..... پوچھو۔“

”آپ کہیں گی کیسی بے ادب لڑکی ہے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو لیکن تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ لیلیٰ نے چونک کر نہیں دیکھا۔

”ہاں۔“

”بتائیے تو کیا؟“

”تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ..... مجھے..... تمہارے ماموں جان کے انتقال کے بعد کبھی دوسری شادی کا خیال آیا یا نہیں۔“

لیلیٰ ان کی معاملہ فہمی پر جھنجھپ سی گئی۔

”کیوں یہی بات ہے نا؟“

”جی..... جی ممانی جان۔“ اس نے نظریں جراتے ہوئے کہا۔

اچھی بھابی نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولیں۔ ”جب بچے چھوٹے تھے ان کی نگہداشت میں لگی رہی مگر جوں جوں وہ بڑے ہوتے گئے گھر میں ایک مرد کی کمی کا احساس توں توں بڑھتا چلا گیا۔ دونوں بچوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی۔ گو خاندان نے بہت ساتھ دیا مگر بے شمار موقع آئے زندگی میں جب بچوں کو اور خود مجھے بھی ایک مرد کی کمی کا احساس ہوا۔ لوگ کہتے ہیں تنہا عورت کی زندگی دشوار ہوتی ہے مگر میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ سمجھتی ہوں کہ بچوں والی عورت ہر مرد کے بغیر زندگی گزارنا زیادہ مشکل ہے۔ بیہ کے گھر والے بجا طور پر فکرمند ہیں ان کے لیے۔“

”مگر نعیم بھائی کی شادی کا اس سے کیا تعلق۔ منہا با جی کو اپنی فکر کرنی چاہیے نہ کہ دوسروں کی۔ وہ تو خواہ مخواہ ہم لوگوں کو انکائے دے رہی ہیں۔“

لیلیٰ جو یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ نعیم کی شادی کے بعد اس کا دینی جا کر نعیم کے ساتھ رہنا ممکن ہو سکے گا نا گوار لہجے میں بولی۔

اس کے لہجے سے اچھی بھابی کو یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں تھا کہ اسے نعیم کی شادی کا معاملہ التوا میں پڑ جانا سخت ناگوار گزارا تھا۔

”بیٹا! میں نعیم میاں سے کہوں گی تمہیں اپنے پاس بلا لیں۔“

لیلیٰ نے چونک کر نہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں امید افزا چمک تھی ”آپ بھی چلیں گی نا ممانی جان؟“

”نہیں بیٹا، میں تو نعیم میاں کا گھر بسنے تک یہیں رہوں گی۔“

لیلیٰ کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک معدوم ہو گئی۔

”پھر میں کیسے جاسکوں گی بھلا..... آپ کو اکیلا چھوڑ کر جانا تو ممکن نہیں۔“

”چند! میں پہلے بھی آخر ہا کرتی تھی اکیلی یا نہیں۔“

”تب کی بات اور بھی ممانی جان۔“ لیلیٰ نے کہا ”میرا تو خیال ہے منہا با جی اور ان کے گھر والوں سے ہم لوگوں کو بالکل دودھنوک بات کرنی چاہیے۔“

”کیا بات؟“

”یہی کہ خواہ مخواہ دیر مت کریں ورنہ ہم کوئی اور لڑکی دیکھتے ہیں۔“

”بیٹا کوئی اور لڑکی دیکھنے کی بات تو ہم تب کریں جب نعیم راضی ہوں۔ وہ تو کہتے ہیں خواہ کتنا ہی انتظار کرنا پڑے شادی کریں گے تو منہا ہی سے کریں گے۔“

”کیا واقعی؟“ لیلیٰ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”ہاں۔“



”آپ سے کس نے کہا؟“

”خود نے۔“

لیلیٰ کے چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔

”نعم اپنی بات پر پکے رہنے کے عادی ہیں۔ جس کو زبان دے دی سودے دی جس سے وعدہ کیا اسے نبھانا لازم ٹھہرا ان کے لیے۔“

”مگر ممانی جان یہاں تو وہ لوگ پھر رہے ہیں اپنے وعدے سے۔ منہا باجی کی شرط یہی تھی تاکہ پہلے بھائی کی ہو جائے تاکہ ان کی والدہ کے اکیلے رہنے کا مسئلہ نہ ہو۔ پھر اب کیا ہوا! بیہ بھابی درمیان میں کہاں سے آگئیں اور..... منہا باجی کون ہوتی ہیں ان کی دوسری شادی کرانے والی۔ وہ کریں نہ کریں یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی بچی تو نہیں ہیں وہ ایک بیٹے کی ماں ہیں۔ ان کا، تے کا ہمارے گھر میں ہر طرح خیال رکھا جاتا ہے ابو تو نئے کو ذرا دیر کے لیے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتے۔“

اچھی بھالی چپ رہیں۔

لیلیٰ کی برہمی کا سبب وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ فہیم کے ساتھ رہنا اس کا جائز، جذباتی اور معاشرتی حق تھا۔

☆☆☆

مہتاب کے کوارٹر کے سامنے سے باغیچہ کیا اجڑا پورا اسکول گل و گلزار ہو گیا۔ وہی مہتاب جو اپنے اصل فریضہ منہی سے غافل ہو کر دن بھر اپنے کوارٹر میں پڑا لٹی تان کر سویا کرتا تھا اب ایک ڈنڈا ہاتھ میں لیے صبح تا دوپہر اسکول کے گیٹ پر نظر آتا اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتا۔ چھٹی کے بعد آخری بچے کے جانے تک وہ اسکول گیٹ پر رہتا۔ سہ پہر کو وہ مالی کی حیثیت میں اپنی اضافی ذمے داریاں پوری کرتا۔ منہا نے ڈائریکٹریٹ میں اس کی سفارش کر کے مالی کی حیثیت میں اس کے اضافی کام کے لیے ملنے والا معاوضہ بھی ڈیڑھ گنا کر دیا تھا۔ مہتاب کو بس اب ایک شکایت تھی اور وہ یہ کہ وہ چوبیس گھنٹے اسکول کی نگرانی کرنے سے قاصر تھا۔ گو کہ وہ کرتا رہا تھا مگر اس کا کہنا یہ تھا کہ فقط ایک چوکیدار ہونے کے باعث وہ دکھ سکھ، بیماری آزاری عید تہوار تک پر اپنے گاؤں جانے سے قاصر رہا کرتا تھا۔ اس کی شکایت حق بجانب تھی اور منہا اس کوشش میں تھی کہ اسکول کو ڈائریکٹریٹ کی جانب سے ایک اور مستقل چوکیدار مل جائے یا پھر اسٹوڈنٹ فنڈ سے ایک اعزازی چوکیدار ملازم رکھنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ آدھا دن وہ اور آدھا دن مہتاب ڈیوٹی کرے۔

مالی کی حیثیت سے اس کی اضافی ذمے داریوں کے سلسلے میں منہا نے اس سے صرف ایک بات کی تھی اور وہ یہ کہ اس کا کام نظر آنا چاہیے۔ آدمی سمجھ دار تھا۔ سمجھ چکا تھا کہ مفت کی تنخواہ لینے کے دن ہوا ہوئے اب تو کام کیے بنا گزارا ممکن نہیں چنانچہ صبح سے دوپہر تک اسکول گیٹ پر اپنی ڈیوٹی پوری کرتا اور سہ پہر کو پودوں کی آبیاری کرتا۔ کچھ پودے منہا نے اسے اسکول فنڈ سے منگو کر دیے تھے۔ کچھ اس نے ادھر ادھر سے پیئیریاں لا کر جمائے تھے اور ایک بڑی تعداد پودوں کی ایسی تھی جو طلبہ کی جانب سے آئی تھی۔

اسکول کے نکھار.... اور آراستگی میں طلبہ کو شریک کرنے کے لیے ان کے دل میں صرف اس احساس کو جاگزیں کرنا پڑا تھا کہ یہ ادارہ ان کا اپنا ہے جس طرح وہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی اور آرائش کا خیال رکھتے ہیں اپنے والدین اور گھر کے دیگر افراد کے مدد و معاون ہوتے ہیں اسی طرح انہیں اپنے اسکول کو صاف ستھرا اور آراستہ رکھنے میں اپنی ٹیچرز اور غیر تدریسی عملے کی مدد کرنی چاہیے۔ دو یا تین افراد کو اتنے بڑے ادارے کی صفائی ستھرائی کا ذمے دار سمجھ لینا اچھی بات نہیں سب کو بل جل کر کوشش کرنی چاہیے۔

منہا نے ایما پر صبح اسبلی سے قبل پی ٹی آئی صاحب ایک وصل بجا کر بچوں سے پاٹ دار آواز میں پوچھتے ”ہماری



دنیا کی خوب صورتی کا دشمن کون؟

”کوڑا کرکٹ!“ بچے ایک آواز میں جواب دیتے۔

”شاباش! دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ دیکھتے ہیں کہ کون سی کلاس دشمن کو زیادہ گھیرتی ہے۔“

پی ٹی آئی دسل بجاتے اور گراؤنڈ میں ہیکل سی میج جاتی۔ یہاں سے وہاں تک بچے بھاگتے، دوڑتے، جھکتے، اٹھتے، لپکتے ہوئے ٹافوں، بسکٹوں اور نمکو کے ریپرز، درختوں کے پتے، کاغذ کے ٹکڑے، ڈبل روٹی کے ادھ کترے ٹکڑے، ادھ کھائے پرائٹھے، کینٹین سے خریدی گئی سوٹ ڈرنکس کی خالی بوتلیں اور الم غلم چنتے پھرتے۔ ذرا سی دیر میں ہر فریق اسبلی گراؤنڈ میں اپنی لائن کے مقررہ نشان کے سامنے اپنا اپنا جمع کیا ہوا کوڑا ڈھیر کر دیتا۔

پی ٹی آئی صاحب دسل بجاتے اور سارے بچے اپنی اپنی قطار میں کھڑے ہو جاتے۔

”اٹینشن!“ پی ٹی آئی کاشن دیتے پھر یہاں سے وہاں تک کوڑے کے ڈھیروں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اعلان کرتے ”آج..... کلاس نے سب سے زیادہ دشمن مار گرایا ہے۔ اس کلاس کے لیے تالیاں۔“

بچے جوش و خروش سے تالیاں بجانے لگتے۔ اس دوران میں دونوں خاکروب ٹالیاں لیے ہوئے آتے اور بہ مشکل ڈیڑھ دو منٹ میں کوڑے کے تمام ڈھیر سمیٹ لے جاتے۔

وقفے کے بعد بھی بچوں کے کلاسوں میں جانے سے قبل پی ٹی آئی صاحب اسی طرح گراؤنڈ صاف کر داتے اور خاکروبوں کا کام آسان کر دیتے۔ اگرچہ شروع شروع میں اس طریقہ کار پر طلبہ خاصے متردد ہوئے والدین... علی الاعلان معترض ہوئے بلکہ اکثر ٹیچرز نے بھی ناک بھودیں چڑھائیں۔ والدین نے کہا ”ہم اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے اسکول بھیجتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ چننے کے لیے نہیں۔“

”بچے صرف کتابیں پڑھنے کے لیے اسکول نہیں آتے۔ تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی ضروری ہے۔ ہم تربیت کر رہے ہیں۔ بچوں کو اپنے ارد گرد کا ماحول صاف رکھنا سکھا رہے ہیں۔“ منتہا کا جواب تھا۔

”یہ خاکروبوں کا کام ہے۔“ اعتراض کرنے والوں نے کہا۔

”بچوں کو یہ سمجھانا ضروری ہے کہ کام خواہ نچلے درجے کا ہی کیوں نہ ہو اسے کرنے میں ذلت اور عار محسوس نہ کریں۔ ہم بچوں کو محنت کی عظمت سے عملاً آشنا کر رہے ہیں۔“ منتہا نے جواب دیا۔

”یہ کیا تماشا ہے۔ اگر بچوں ہی سے صفائی کروانی ہے تو پھر سو پیرز کس کام کے۔“ اکثر رفقاء کار نے بھی ڈھکے چھپے منتہا کے اس اقدام کی مخالفت کی۔

”سو پیرز کے لیے اسکول بلڈنگ کے اندر ہی کام بہت ہے۔ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ روزانہ گراؤنڈ کی صفائی بھی کریں، محال ہے۔ وہ کام جو یہ بے چارے شاید دو گھنٹے میں بھی نہ کر پائیں، بچے دو تین منٹ میں کر جاتے ہیں۔

کہاں دو سو پیرز کے چار ہاتھ اور کہاں تیرہ سو بچوں کے چھبیس سو ہاتھ۔“ منتہا ہر مخالفت کے سامنے ڈلی رہی۔ اسکول میں مستقل خاکروب تو ایک ہی تھا۔ دوسرا اس نے ڈائریکٹریکٹ سے بار بار استدعا کر کے اسٹوڈنٹ فنڈ سے لگایا تھا۔

”میڈم! یہ نکلے کرتے کیا ہیں چھٹی کے بعد کمروں میں جلدی جلدی الٹی سیدھی جھاڑو لگائی اور کام ختم۔ صبح برآمدوں میں پچھرا لگا دیا اور بس پھر تو سارا دن بیٹھے ہی رہتے ہیں۔“ ایک روز ایک سینئر ٹیچر بولیں۔

”مسز فاروٹی چھٹی کے بعد یہ دونوں تین بجے تک کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ اپنے گھروں میں ہم خواتین دو کمروں کی جھاڑ پونچھ کر کے ہی کمر پکڑنے لگتے ہیں۔ ان بے چاروں کو تو ستائیس کمروں، دس ہاتھ روزمر، لمبے لمبے

برآمدوں اور گراؤنڈز کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔“

”میڈم گراؤنڈ کی صفائی تو آپ بچوں سے کر داتی ہیں۔“



”بچے صرف ادھر ادھر کا کوزا کرکٹ چھنے میں مدد کرتے ہیں۔ گراؤنڈ میں جھاڑو تو ہمارے سوپر ہی لگاتے ہیں۔“

”دوسرے تیسرے دن میڈم!“  
 ”میں سمجھتی ہوں یہ بھی غیبت ہے۔ بعض ادارے ایسے بھی ہیں جہاں سوپر سال میں ایک مرتبہ بھی گراؤنڈ میں جھاڑو دینے کی زحمت نہیں کرتے۔“  
 ”یہاں بھی پہلے ایسا ہی ہوتا تھا۔ گراؤنڈ کی روزانہ صفائی کی روایت تو آپ نے ڈالی ہے۔“  
 ”برا کیا؟“

”نہیں میڈم۔“ مسز فاروقی جھینپ کر بولیں ”صفائی تو نصف ایمان ہے مگر بچے یہ کام کرتے اچھے نہیں لگتے۔“  
 ”جن بچوں کو اپنا ماحول صاف رکھنے کی عادت نہیں پڑتی وہ بڑے ہو کر کبھی گراؤنڈ میں سال سال بھر جھاڑو نہیں لگواتے۔“ منجانب لائٹ موڈ میں کہا۔  
 مسز فاروقی خفیف ہو کر ہنس دیں۔

ادارے کی بہتری کے لیے کیے جانے والے اقدامات میں منجانب کی نیک نیتی اس کے مخالفین کو اکثر یونہی خفیف کر دیا کرتی تھی۔ اعتراض کرنے والوں کو بالآخر قائل ہونا پڑتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پہلا اعتراض عموماً اس کے ساتھیوں کی جانب سے آتا۔

ادارے میں پودوں اور گلوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے جب اس نے پہلی بار بچوں کو بھی اس مہم میں شریک کرنے کے لیے اسٹاف میننگ میں یہ تجویز رکھی کہ تعطیلات کے دوران ہر بچے کو تحریری اور زبانی ہوم ورک کے ساتھ ایک کام یہ بھی تفویض کیا جائے کہ ہر بچہ ایک گما خرید کر اس میں ایک پودا لگائے گا یا اپنے کسی بڑے سے لگوائے گا پھر چھٹیوں میں اس کی دیکھ بھال کرے گا اور تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے پر یہ گما اسکول لائے گا۔ جو کلاس سب سے زیادہ اور اچھے پودے جمع کرے گی، اسے ایک شیلڈ دی جائے گی تو اس کی اس تجویز پر پہلا اعتراض ایک اسٹاف ممبر کی جانب ہی سے آیا۔ ”میڈیم والدین اعتراض کریں گے۔“  
 ”کیسا اعتراض؟“

”بعض والدین کے ہمارے ہاں پانچ پانچ چھ چھ بچے پڑھ رہے ہیں۔ چھ بچوں کے لیے گملے خریدنے سے باپ بے چارے کے بجٹ پر اثر پڑ سکتا ہے۔“

اعتراض کرنے والے کتنی دور کی سوچتے تھے!  
 جائز اعتراض پر منجانب خواہ مخواہ کی بحث میں الجھنے کے بجائے کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کرتی۔  
 ”ٹھیک ہے ایسی صورت میں ہم یہ کر سکتے ہیں کہ جن والدین کے ہمارے ہاں ایک سے زیادہ بچے پڑھ رہے ہیں۔ ان سب کو ایک مشترکہ گما لانے کے لیے کہا جائے۔“  
 ”لیکن میڈم ایسا گما جمع کس کے کھاتے میں ہوگا؟“  
 ”سب سے بڑے بہن بھائی کی کلاس میں۔“

”چھوٹے بہن بھائیوں کی کلاسیں تو پھر نقصان میں رہیں گی۔ شیلڈ بڑوں کو چلی جائے گی۔“  
 ”شیلڈ تو محض ایک ان سینئر ہوگی۔ بچوں کو اس مہم میں جوش و خروش دلانے کے لیے۔ ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ اس بہانے بچوں کی جانب سے بھی اسکول کے لیے کچھ پودوں اکٹھے کر لیے جائیں۔ اسٹوڈنٹ فنڈ اس قسم کے اخراجات کا بس ایک حد تک ہی متحمل ہو سکتا ہے اور وہ ہم کر چکے ہیں۔“  
 تعطیلات سے ایک روز قبل منجانب نے اسمبلی میں بچوں سے اس مجوزہ مہم کے بارے میں خود بات کی۔ رفقاء کار

نے زیرِ لب دہلی دہلی مسکراہٹوں کے ساتھ سنا اور بعد میں اسی روز اسٹاف روم میں تبادلہ خیال بھی ہوا۔ اکثریت کا خیال یہ تھا کہ تعطیلات کے دوران بچے بھی بھول بھال جائیں گے اور شاید خود پر پزل صاحبہ بھی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

تعطیلات کے بعد اسکول کھلنے پر گملوں کی لائن لگ گئی۔ بچوں کے والدین اور سرپرست خود گملے پہنچانے کے لیے اسکول آئے۔ منہا کی خوشی دیدنی تھی۔ بچا کہ تمام بچے نہ لائے مگر کوئی سات آٹھ سو گملے تو اکٹھے ہو ہی گئے۔ ٹیچرز کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس نے سب سے زیادہ اور سب سے اچھے پودے جمع کرنے والے فریق کا تعین کیا۔ اسمبلی میں اس کا اعلان کیا گیا اور شیلڈ متعلقہ فریق کے مانیٹرز اور بچوں کے سرکردہ گئی۔

منہا نے گیردی رنگ کا روغن منگوایا اور تین چار دن میں تمام گملوں پر یکساں روغن کر دیا کہ انہیں اسکول کی راہداریوں، برآمدوں، سیڑھیوں، اسمبلی کے چبوترے اور جا بجا گراؤنڈ کی زیب و زینت بنو دیا!

نصابی معاملات میں بہتری کے لیے بھی منہا نے متعدد اقدامات کر ڈالے تھے۔ پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک اس نے ہر جماعت کے لیے ایسی ”اسکیم آف اسٹڈیز“ مرتب کر دئی تھی کہ تعلیم کا عمل بچوں کے لیے مجموعاً ایک خوش گوار تجربہ اور آسندہ تعلیمی منازل کے لیے ایک ٹھوس بنیاد بن جائے۔ پہلی جماعت کے بچوں کو ٹیچرز تمام حروف تہجی اور دو، تین، چار حرفی الفاظ کے جوڑ توڑ میں الجھائے رکھتے تھے۔ بچوں کی کاپیاں بس انہی مشقوں سے بھری پڑی تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسری جماعت کے اکثر بچے پہلی جماعت کے نصاب میں بھی کچے پائے گئے۔ چوتھی اور پانچویں جماعت کے اکثر بچوں کے اردو اور انگریزی ذخیرہ الفاظ محدود، املا کمزور اور خط بے حد خراب تھا۔ منہا نے جب ادارے میں تعلیمی معیار بہتر بنانے کے لیے معیار برتد ریس کی بات کی تو بیشتر استاتیاں ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں اور دہلی دہلی مسکراہٹ سے بہتہ دیکھنے لگی تھیں۔ مگر اس نے ان کی معنی خیز نگاہوں اور دہلی دہلی مسکراہٹوں کی پروا کیے بغیر انہی میں سے دو کمیٹیاں تشکیل دے کر انہیں یہ کام سونپا تھا کہ ایک کمیٹی پہلی اور دوسری جماعت کے لیے اور دوسری کمیٹی تیسری سے پانچویں جماعت تک کے لیے مجوزہ نصاب کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسی تعلیمی فعالیتیں ترتیب دیں کہ سرکاری اسکول میں پڑھنا بچوں کے لیے ایک خشک اور مایوس کن تجربہ نہیں بلکہ ایک خوش گوار اور قابلِ فخر تجربہ بن جائے! آغاز کار میں دونوں کمیٹیاں بڑی اکھڑی اکھڑی سی رہیں مگر منہا کی صدق نیتی، ثابت قدمی، رہنمائی اور لگن نے بالآخر ان سے کام لے ہی لیا اور پہلی سے پانچویں جماعت تک ہر مضمون کے لیے ایک ایسا مد ریس منصوبہ تیار کر لیا گیا جس کا مقصد بچوں کو ایک مضبوط تعلیمی بنیاد فراہم کرنا تھا۔

چنانچہ پہلی جماعت جسے سال بھر حروف آشنائی اور الفاظ کے جوڑ توڑ میں الجھا کر رکھا جاتا تھا اب اردو اور انگریزی دونوں مضامین میں الفاظ کو اپنے جملوں میں بھی استعمال کرنا سیکھ رہی تھی اور مختلف عنوانات پر چھوٹے چھوٹے مضامین بھی لکھ رہی تھی۔ ریاضی کے بنیادی قاعدوں اور کلیوں میں بھی ان کی استعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ تعلیمی فعالیتیں اس طور ترتیب دی گئی تھیں کہ پہلی سے پانچویں تک ان میں تدریج اور تسلسل رہے۔

ادارے کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ پانچویں جماعت کے وظیفہ امتحان کی تیاری میں طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کا شوق اور لگن دیکھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا تھا!

مگر اس بدلی ہوئی فضا میں بھی کبھی کبھی ایسے واقعات ہو جاتے جو منہا کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے کہ بچوں کی تربیت میں ان کے گھریا اسکول کسی نہ کسی جانب سے کوتاہی ضرور ہو رہی تھی۔

اس روز بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا تھا۔ وہ اپنے دفتر میں تھی کہ جماعت دوم ب کی نمران مس آمنہ ایک بچے کے ساتھ دفتر کے دروازے پر وارد ہوئیں اور انہوں نے دفتر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔



”جی.....جی..... آئیے۔“ منہا نے حسبِ عادت بڑی گرمجوشی سے کہا۔  
 ”میڈم! یہ میری کلاس کا بچہ ہے اس کے بارے میں شکایت ملی ہے کہ یہ..... سگریٹ پیتا ہے۔“  
 منہا نے بے ساختہ چونک کر بچے کی طرف دیکھا۔  
 ”نومیڈم۔“ بچے سہم کر کہا۔

”میڈم کلاس کے ایک دو نہیں ہیں پچیس بچے اس کے سگریٹ پینے کی گواہی دے رہے ہیں۔ بچے کہتے ہیں کہ اس نے آج بھی انٹرول کے دوران سگریٹ پی ہے۔ اس کے پاس سے سگریٹ کی بو بھی آرہی ہے۔“  
 ”ان بلیو اسیبل مس آمنہ..... اتنا چھوٹا بچہ اور سگریٹ!“ منہا نے کہا۔  
 ”میڈم..... میں نے نہیں لی سگریٹ۔“ بچہ بولا۔

”میڈم! یہ بہت ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے۔ پورا پیریڈ میں اس کے ساتھ لگی رہی ہوں مگر یہ قبول کر ہی نہیں دیتا۔  
 آپ اس کا منہ سونگھ لیں میڈم، سگریٹ کی بو آرہی ہے۔ میڈم بچے جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔“  
 ”اوکے..... اوکے مس آمنہ ابھی معلوم کیے لیتے ہیں۔“  
 ”میڈم یہ بہت ڈھیٹ ہے۔“

”ادھر آؤ میرے نزدیک۔“ منہا نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔  
 ”نومیڈم..... میں..... میں نہیں پیتا۔“ بچہ اس کے پاس آنے کے بجائے سہم کر پیچھے ہٹا۔  
 ”جاؤ نامیڈم بلا رہی ہیں!“ مس آمنہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے منہا کی جانب دھکیلنے کی کوشش کی۔  
 منہا کو ان کا اسے اس طرح دھکیلنا اچھا نہیں لگا۔

”مس آمنہ پلیز، آپ رہنے دیں یہ خود میرے پاس آئیں گے۔“  
 ”میڈم میرا پیریڈ ہے میں جاؤں؟“ مس آمنہ خفیف ہو کر بولیں۔  
 ”جی..... جی۔“

مس آمنہ کے جانے کے بعد منہا اپنی کرسی سے اٹھی اور بچے کی جانب بڑھی۔ وہ چھوٹی موٹی کی طرح اپنا جسم چرانے کی کوشش کرنے لگا۔ منہا نے اس کا بازو آہستگی سے پکڑا ”ڈرومت، میں کچھ نہیں کہوں گی۔“  
 بچے نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا مگر سہمی سہمی نظروں سے۔  
 منہا نے اسے چکارا۔

”شاباش، آپ ادھر آؤ میرے ساتھ۔“  
 منہا اسے اپنے ہمراہ لیے صوفے پر جا بیٹھی۔  
 ”سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ آپ کی کلاس کے بچے آخر کیوں کہہ رہے ہیں کہ آپ سگریٹ پیتے ہیں؟“  
 بچہ کان دبا کر منہا کو دیکھنے لگا۔

”سچ بات بتا دینے والے بچوں کو میں کبھی سزا نہیں دیتی۔ مجھے جھوٹ بولنے والے بچوں پر غصہ آتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی کلاس کے بچے جھوٹ بول رہے ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ایسا جھوٹ بول رہے ہیں اور اگر وہ جھوٹ نہیں بول رہے تو آپ مجھے سچ بات بتادیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر آپ کی غلطی ہوئی تو آپ کے سچ بولنے پر میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی بلکہ میں آپ سے خوش ہوؤں گی کہ آپ نے سچ بولا۔“  
 بچہ اسے متذبذب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“  
 ”عارف علی۔“

منتہا نے اپنی ناک اس کے نزدیک کر کے ایک گہری سانس کھینچی۔ واقعی سگریٹ کی بو تو آرہی تھی۔  
”عارف علی! بچے میں سچ بات سننا چاہتی ہوں..... سگریٹ پی آپ نے؟“ منتہا نے بڑی نرمی سے پوچھا۔  
وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔  
”عارف!“

”لیس میڈم۔“  
”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے..... کیا آپ کی کلاس کے بچے سچ کہہ رہے ہیں؟“  
”لیس میڈم۔“ وہ دھیرے سے بولا۔  
منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔  
”سگریٹ پی آپ نے؟“  
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”کب؟“

”روز میڈم۔“  
”کیا! روز!“  
”لیس میڈم۔“  
”سچ سچ کی سگریٹ!“  
”لیس میڈم۔“  
”تمہیں پتا ہے سگریٹ کس طرح پی جاتی ہے!“  
اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔  
”کیسے؟“

”جلا کر!“ وہ آہستہ سے بولا۔  
منتہا کو اچنبھا ہوا۔  
”آپ کو جلائی آتی ہے سگریٹ؟“  
”نومیڈم۔“  
”تو پھر کیسے کہتے ہو کہ آپ نے سگریٹ پی ہے۔“  
”میڈم لالا جلا کر دیتا ہے۔“ وہ منسنا کر بولا۔  
”لالا کون؟“ منتہا پھر چونکی۔  
”وہ جو باہر گیٹ پر کھڑا ہوا ہے چھٹی والا۔“  
”کون سے گیٹ پر؟“  
”اسکول کے گیٹ پر۔“  
”کیا! اسکول کے گیٹ پر! ہمارے اسکول گیٹ پر؟“  
”لیس میڈم۔“

”وہ آپ کو سگریٹ کیوں دیتا ہے؟“  
”ایک روپے میں میڈم۔“ عارف علی نے معصومیت سے کہا۔  
”میں نے یہ نہیں پوچھا کتنے میں..... میں پوچھ رہی ہوں کیوں دیتا ہے وہ آپ کو سگریٹ؟“



عارف چپ رہا۔  
 ”ہاں بھئی..... بولو۔“  
 عارف نے سر جھکا لیا۔  
 ”بتاؤ؟“

”میڈم! بھائی جان لوگ بھی لیتے ہیں۔“ اس نے اپنے سر کو مزید جھکاتے ہوئے کہا۔  
 ”بھائی جان کون؟“

عارف نے نظر اٹھا کر ذرا کی ذرا منتہا کو دیکھا پھر دوبارہ سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولا ”بوائز اسکول والے بھائی جان۔“

منتہا سمجھ گئی کہ وہ بوائز اسکول کے لڑکوں کی بات کر رہا تھا جن کے غول کے غول اکثر اس کے اپنے اسکول کے آس پاس اس لیے آوارہ گردی کرتے دکھائی دیتے تھے کہ ہائی اسکول کی اکثر طالبات جو نیز اسکول کے گیٹ سے ہی آتی جاتی تھیں۔

”آپ کے علاوہ کوئی اور بچہ بھی ہمارے اسکول کالالا سے سگریٹ خریدتا ہے؟“  
 ”نو میڈم! وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا ”کسی کو یہی نہیں آتی۔“  
 ”آپ کو کیسے آگئی؟“  
 ”چاچو نے سکھائی ہے۔“  
 ”کیا! منتہا حیران ہوئی ”چاچو نے؟“  
 ”یس میڈم۔“

منتہا نے ایک گہری سانس کھینچی پھر کہا ”عارف علی! بچے مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا سچ بولو گے تو میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گی..... میں واقعی آپ کو نہیں ڈانٹوں گی مگر بیٹا سگریٹ ہے بہت خراب چیز..... سگریٹ تو بڑوں کو بھی نہیں پینی چاہیے آپ تو بہت چھوٹے سے بچے ہو۔ میں نے آج پہلی مرتبہ سنا ہے کہ آپ جتنا کوئی بچہ بھی سگریٹ پی سکتا ہے اور وہ بھی خرید کر!“  
 عارف نے اپنا سر اتنا جھکا لیا کہ اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔  
 ”جس آدمی سے آپ سگریٹ خریدتے ہو وہ چھٹی کے وقت بھی ہوتا ہے؟“ منتہا نے پوچھا۔  
 ”یس میڈم۔“

”اوکے..... اکتے کی دیتا ہے وہ آپ کو سگریٹ؟“  
 ”میڈم..... ایک..... روپے کی!“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

منتہا نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک روپیہ نکال کر عارف کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی ”آج آپ اس سے چھٹی کے وقت سگریٹ لو گے۔“  
 وہ چومک کر منتہا کو دیکھنے لگا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں پوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا تریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

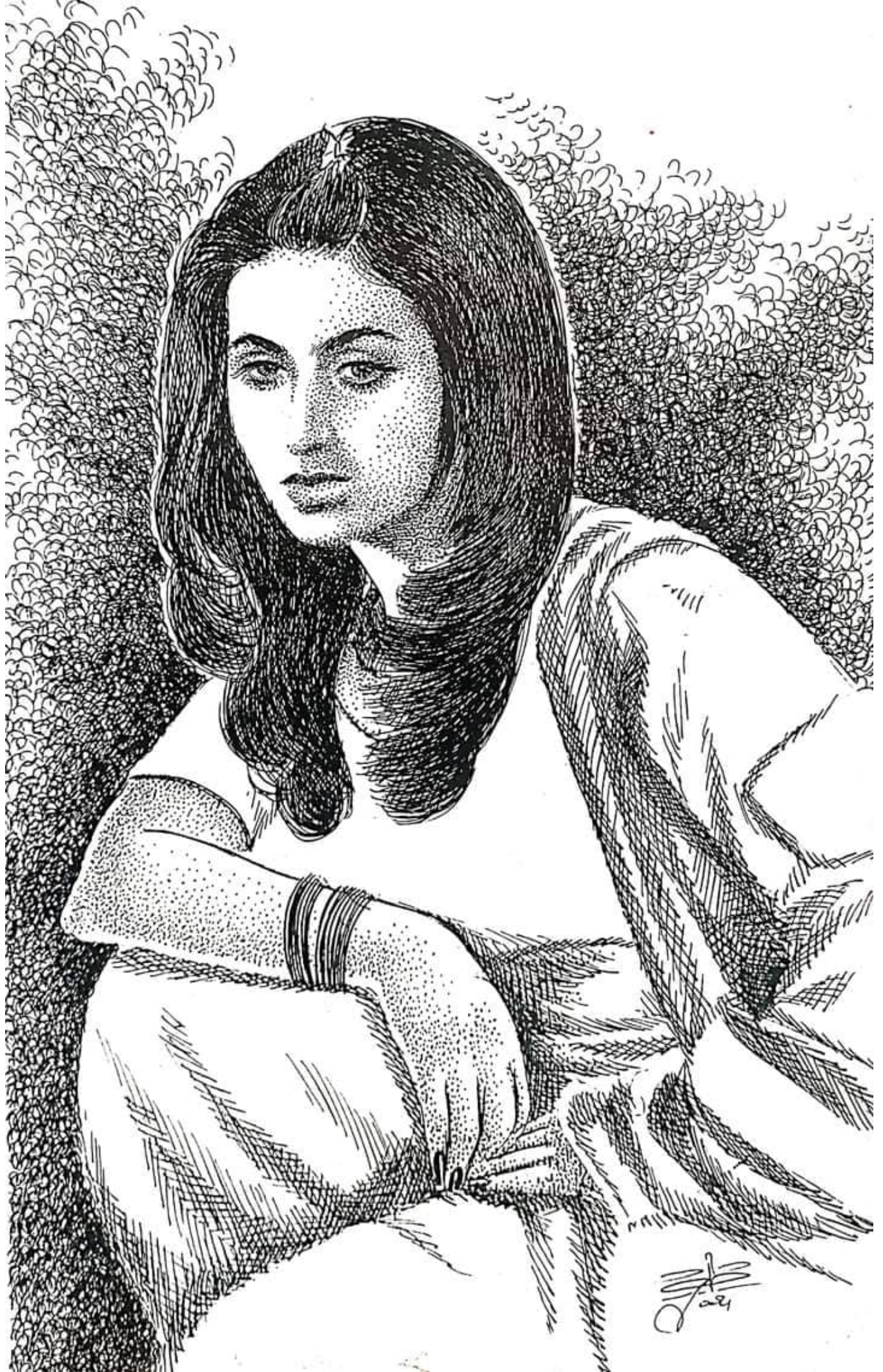
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوب سے گندھے اور لہجے سے بندھے رشتوں کے چاکر سار ہونے کی دل گداز داستان

قسط 23









منتہا نے اس کی نگاہوں میں ڈولتی حیرانی کا سبب بھانپ لیا۔  
”صرف آج پھر کبھی نہیں۔“

اس نے نظریں جھکاتے ہوئے سرفی میں ہلایا جیسے کہتا ہو نہیں میں نہیں خریدوں گا!  
”بیٹا ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کو سگریٹ دیتا کیسے ہے مگر آپ نے یہ بات اسے نہیں بتائی ہے۔ آپ اسے  
یہ نہیں بتاؤ گے کہ پھر اور پرنسپل کو پتا چل گیا ہے۔“  
اس کا انکار تذبذب میں بدل گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے پریشان مت ہو مگر بچے آج کے بعد آپ نے کبھی جھوٹ موٹ کی سگریٹ بھی منہ میں نہیں  
لیتی۔ جانتے ہو کتنا نقصان ہوتا ہے سگریٹ پینے والوں کو..... کھانسی رہنے لگتی ہے، سینہ کزور ہو جاتا ہے۔ کیفر ہو جاتا  
ہے۔ منہ سے بو آنے لگتی ہے۔ ہونٹ سیاہ ہو جاتے ہیں..... آپ سمجھ رہے ہونا؟“  
”یس میڈم۔“

”گڈ بوائے! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا اور یہ بات ہم آپ کے امی ابو کو ضرور بتائیں  
گے۔“ منتہا نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔  
منتہا کا خیال تھا وہ یہ سن کر کہ وہ یہ بات اس کے والدین کو بتانے کا ارادہ رکھتی تھی پریشان ہو جائے گا مگر اسے یہ  
دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہ منہ دبا کر مسکرائے لگا۔  
”اب آپ کلاس میں جائیں۔“

اس نے ہاتھ میں پکڑا نوٹ منتہا کی طرف بڑھادیا۔  
عارف کے جانے کے بعد منتہا نے غزالہ کو بلوایا اور تمام ماجرا نہیں سنایا۔  
”آف میڈم! کیسی کیسی شکایتیں آرہی ہیں بچوں کی! کلاس ٹو کا بچہ اور سگریٹ! مجھے تو یقین نہیں آتا۔“ غزالہ  
اپنے مخصوص لہجے میں بولیں۔  
”یقین تو مجھے بھی نہیں آتا غزالہ مگر بچے نے اقرار کیا کہ وہ سگریٹ پیتا ہے۔“  
”میڈم جھوٹ بول رہا ہوگا۔“  
”لیکن کیوں؟“

”آپ سے ڈر کر..... بچے بعض اوقات خوف زدہ ہو کر بھی ایسی باتوں کا اقرار کر لیتے ہیں جو انہوں نے کی ہی  
نہیں ہوتی ہیں۔“  
”آپ ٹھیک کہتی ہیں ایسا بھی ہوتا ہے مگر سوال یہ ہے غزالہ کہ..... اس کی کلاس کے بچوں نے اس پر یہ الزام  
تراشی کیوں کی۔“

”میڈم جی! بچے کبھی کبھی عجیب و غریب کہانیاں گھڑ لیتے ہیں اپنے ذہن میں۔ آپ کو یاد ہوگا جب آپ نئی نئی  
یہاں آئی تھیں تو ان دنوں بعض بچوں نے یہ افواہ اڑا رکھی تھی کہ ہاتھ روم میں ایک چڑیل رہتی ہے اور اکثر بچے ان  
دنوں ہاتھ روم میں جاتے ڈرا کرتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے چند بچوں سے پوچھا کہ چڑیل کی شکل کیسی  
ہے تو انہوں نے کیسی کیسی تصویریں کھینچی تھیں چڑیل کی۔“ غزالہ مسکرائے لگیں۔  
”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”غزالہ کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔“ اور میڈم جب میں نے بچوں سے پوچھا کہ چڑیل کپڑے کیسے پہنتی ہے تو  
آپ کو یاد ہے نا کیسے کیسے فیشن ایبل ملبوسات بیان کیے گئے تھے۔ کسی نے کہا جینز پہنتی ہے، کسی نے کہا چڑیل ساڑی  
باندھ کر آتی ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں میڈم، یونہی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔“



”بہر حال غزالہ ہمیں پھر بھی دیکھنا ہوگا کہ اس معاملے میں مس آمنہ کی کلاس کے بچوں نے کس حد تک کہانی گھڑی ہے اور کیوں! اور اگر انہوں نے جھوٹ بولا ہے تو اس بچے نے اس جھوٹ پر اتنی آسانی سے سچ کی مہر کیوں لگا دی؟

”میڈم جی اس نے آپ کے ڈر سے ایسا کیا ہوگا ورنہ آپ کے یہ کہنے پر کہ آج چھٹی کے وقت سگریٹ خریدے بقول آپ کے پریشان نہ ہو گیا ہوتا۔“  
”میں اتنی خوف ناک تو نہیں۔“

”بچوں پر آپ کا رعب تو بہت ہے۔“  
”میں تو اس خوش فہمی کی شکار ہوں کہ نیچے مجھ سے خاصے بے تکلف ہیں۔“  
”وہ تو ہیں۔ نیچے آپ سے پیار بھی بہت کرتے ہیں مگر ڈرتے بھی ہیں۔“  
”خاصی متضاد باتیں ہیں۔“

”میڈم جی جس سے آدمی پیار کرتا ہے اس کی ناراضی سے ڈرتا بھی ہے جیسے میں۔“  
”میں کبھی نہیں۔“

غزالہ کے عارض دہک اٹھے۔

”آپ اسے خوشامد یا چالوسی نہ سمجھئے گا میڈم! خدا جانے کیا بات ہے آپ..... حالانکہ آپ ہم سب سے خوب ڈٹ کر کام لیتی ہیں۔ ہماری غلطیوں پر روک ٹوک بھی کرتی ہیں اور آپ کے بارے میں ایک عمومی رائے یہ قائم ہو چکی ہے کہ آپ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو خاصائف قائم دیتی ہیں پھر بھی آپ مجھے اتنی اچھی لگنے لگی ہیں کہ گھر جا کر میں اپنے میاں اور بیٹے سے بہانے بہانے آپ ہی کا ذکر کرنے لگتی ہوں۔“  
”اس محبت کا شکر یہ غزالہ۔“  
”نہیں میڈم یہ محبت نہیں۔“  
”تو پھر کیا ہے“

”شاید احترام..... شاید عقیدت..... یا پھر رشک۔“  
”رشک!“

”آپ بہت انرجیک، بہت آرٹسٹک، بہت ریلیٹک ہیں میڈم!“  
”گویا زور ہے کافی پر!“

غزالہ دھیرے سے ہنس دیں۔

”تھینک یو فار دی کھلمنٹ غزالہ..... ہاں وہ اس بچے کی بات تو درمیان ہی میں رہ گئی، ہم اس معاملے کو نظر انداز نہیں کر سکتے غزالہ، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ سچ کیا ہے۔“  
”اس کے پیرنٹس کو بلوالیں میڈم۔“

”انہیں تو لازماً بلوانا پڑے گا مگر بنا ثبوت کے ان سے کہا کیا جائے۔“

”بتا دیں انہیں کہ آپ کے بچے کے بارے میں یہ شکایت ملی ہے۔“

”اگر وہ الٹا ہی سے یہ سوال کر بیٹھے کہ کیا آپ یقین کر سکتی ہیں کہ کلاس ٹوکا بچہ سگریٹ نوشی کر سکتا ہے تو..... تو کیا

جواب دیں گے ہم انہیں۔“

”جی..... بات تو ٹھیک ہے اور میڈم اگر کوئی سر پھرے والدین ہوئے تو وہ بگڑ بھی سکتے ہیں کہ آپ بچوں کے کہنے پر کیا الزام لگا رہی ہیں ہمارے بچے پر۔“

”میرا خیال ہے والدین تک بات پہنچانے سے قبل پہلے ہم اپنے طور پر تحقیق کر لیں کہ اصل بات کیا ہے۔ کلاس فور ملازمین میں سے کسی کی ڈیوٹی لگانی ہوں کہ وہ چپ چاپ بالکل رازداری کے ساتھ اس بچے کی نگرانی کریں۔ اگر واقعی یہ بات سچ ہے تو وہ ضرور بالضرور یہ حرکت کرے گا۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ آخر وہ کون سا چھٹی والا ہے جو اتنے چھوٹے بچے کو سگریٹ دیتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے چھٹی والے تو دو تین ریڑھیاں لگاتے ہیں اسکول کے باہر۔ کتنی مرتبہ کوشش کی ہم نے ان خواجہ فروشوں کو اسکول کے سامنے کھڑا ہونے سے باز رکھنے کی مگر ہر بار یہ دو چار دن کو ادھر ادھر ہو کر پھر گیٹ کے باہر آ کھڑے ہوتے ہیں۔“

”میڈم جی یہ بے چارے بھی پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہیں۔“

”مگر جو شخص ہمارے کسی معصوم بچے کو یا بوائز اسکول کے نو عمر لڑکوں کو سگریٹ نوشی کی عادت ڈال دے وہ کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہو سکتا غزالہ..... ماں غزالہ کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے اس قصے میں کیونکہ اس بچے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چھٹی والا بوائز اسکول کے لڑکوں کو بھی سگریٹ فروخت کرتا ہے۔“

”میڈم جی اقبال تیز ہے، اسے نگرانی پر لگا دیں۔ وہ تو اڑتی چڑیوں کے پر کاٹ لاتا ہے۔“

منتہا مسکرا دی۔

”غزالہ! اڑتی چڑیا کے پر گن لینے کا محاورہ تو سنا تھا پر کاٹ لینے والی بات آج آپ ہی سے سنی۔“

غزالہ جھینپ گئیں۔

☆☆☆

اقبال کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق مذکورہ چھٹی والا بوائز اسکول کے نو عمر طلبہ کو چرس بھری سگریٹیں فروخت کرنے میں ملوث تھا۔ پہلے وہ بوائز اسکول کے سامنے ہی اپنا ٹھیلہ لگایا کرتا تھا اور وہاں بھی درپردہ یہی کام کرتا تھا مگر یہ معاملہ بوائز اسکول کی انتظامیہ کے علم میں آنے اور اپنے خلاف کارروائی کیے جانے کے بعد اس نے کچھ عرصے سے پرائمری اسکول کے باہر ٹھیلہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ آوارہ گرد لڑکوں کی ٹولیاں خود اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ پرائمری اسکول کے بارے میں اقبال کی رپورٹ یہ تھی کہ عارف پرائمری اسکول کا غالباً واحد بچہ تھا جو اس سے سگریٹ نہ صرف لیتا بلکہ کش لیتا بھی دیکھا گیا۔

مگر سوال یہ تھا کہ اتنا چھوٹا بچہ آخر اس عادت بد میں کیونکر مبتلا ہوا تھا اور کیا یہ بات اس کے والدین کے علم میں نہ تھی!

والدین کو طلب کرنے اور یہ معاملہ ان کے علم میں لانے پر انکشاف ہوا کہ بچے کی شوقیہ سگریٹ نوشی کی عادت تو ان کے علم میں تھی البتہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اسکول کے اوقات کے دوران بھی اپنے اس شوق کی تسکین کیا کرتا تھا۔ منتہا والدین کے اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی۔

”آپ کے علم میں ہے یہ بات!“ اس نے عارف کی ماں اور باپ دونوں کو حیرانی سے دیکھا۔

”جی میڈم۔“ ماں جھینپ کر بولی۔

باپ نے پہلو بدلا اور کہا ”میڈم! اس نے اپنے چاچو سے یہ حرکت سیکھی ہے۔“

”جی..... اس نے کیا تھا چاچو کا ذکر۔“

”اصل میں یہ ہمارا ایک ہی بچہ ہے، گھر کے سب لوگ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں تو خیر سگریٹ نہیں پیتا مگر میرا چھوٹا بھائی اس لت میں ہے۔ بس اسی کی دیکھا دیکھی ہمارا بچہ بھی کاغذ کی نلکیاں بنا کر منہ میں دبائے لگا جیسے سگریٹ پی رہا ہو۔ میرے بھائی نے پیار میں اسے سچ مچ کی سگریٹ بھی پینا سکھا دی۔“

”یہ کیسا پیار ہے!“



”میڈم، میں بہت منع کرتی تھی مگر میرے ساس، سر، نندیں اور دیوار سب بہت خوش ہوتے ہیں اسے سگریٹ پیتے دیکھ کر۔ میری ساس تو اس کی بلائیں لینے لگتی ہیں۔ نظر اتارتی ہیں۔ میں ڈروں گی نہیں ان کے سامنے ہی کہوں گی۔“ عارف کی ماں نے ایک نظر اپنے شوہر پر ڈالتے ہوئے کہا ”یہ خود بھی بہت خوش ہوتے ہیں اسے سگریٹ پیتے دیکھ کر بلکہ اپنے بھائی سے فرمائش کرتے ہیں کہ عارف کو سگریٹ کا کش لگا کر دو اور جب بچہ کش لیتا ہے ناجی تو یہ تہمت لگاتے ہیں۔“

عارف کے باپ نے بیوی کو گھورا پھر ملتہا کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ”ایک ہی بچہ ہے گھر میں۔ ہم سب کے لیے تو وہ ایک کھلونے کی طرح ہے۔“

”پلیز، اس سے بچو مت کھیلیں۔“ ملتہا کے لہجے میں دسوزی تھی اور آنکھوں میں ناگواری۔

”سوری میڈم، کوشش کریں گے کہ آپ کو آئندہ شکایت نہ ہو۔“ باپ خفیف ہو گیا۔

”دیکھئے مجھے شکایت ہونے یا نہ ہونے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنے معصوم بچے کی جسمانی اور اخلاقی صحت کا خیال کریں۔ جس چھلی والے سے آپ کا بچہ سگریٹ خرید کر پیتا دیکھا گیا ہے اس کے بارے میں رپورٹ یہ ملی ہے کہ وہ بعض نوعمر لڑکوں کو چرس بھری سگریٹیں فراہم کرنے کا گھناؤنا کام کرتا ہے۔ کل خدا نخواستہ آپ کا بچہ بھی اس کا شکار ہو سکتا ہے اور کیا پتا کہ وہ اب بھی آپ کے بچے کو کس قسم کی سگریٹ دیتا ہو۔“

عارف کی ماں اور باپ دونوں نے بیک وقت چونک کر ملتہا کی جانب دیکھا۔

”اور آپ کے بچے کی دیکھا دیکھی اس ادارے کے دوسرے بچے بھی اس بُری لت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کیجئے میڈم، میں آج ہی اس بد معاش کا پتا صاف گراتا ہوں یہاں سے۔“ عارف کے باپ نے کہا۔

”اس سے تو خیر ہم نمٹ لیں گے۔ آپ کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اپنے بچے کی آپ آخر کیا تربیت کر رہے ہیں جس بچے کو آپ کو یہ سمجھانا چاہیے کہ میٹھی چیزیں زیادہ کھانے سے اس کے دانت خراب ہو سکتے ہیں، اسے سگریٹ کے کش لگوا کر آپ اس کا ننھا سائینہ کھوکھلا کر دینے کے درپے ہیں اور اس پر خوش ہو رہے ہیں!“

”میں انہیں سمجھاتی ہوں میڈم! ان سب کو کہتی ہوں، ان کی اماں ابا، بھائی بہنوں سب کو کہ اپنے ذرا سی دیر کے تماشے میں تم لوگ میرے بچے کی زندگی خراب مت کرو۔ اسے سگریٹ پینے کی لت پڑ گئی تو کہیں کا نہیں رہے گا۔“ ماں نے کہا۔

”پڑ کیا گئی پڑ چکی ہے محترمہ! ابھی تو وہ ان پیسوں سے جو آپ شاید اسے بڑیک کے دوران کوئی چیز خریدنے کو دیتی ہوں سگریٹ خرید کر پیتا ہے۔ کتنے پیسے دیتے ہیں آپ لوگ اسے اسکول میں خرچ کرنے کو؟“

”پانچ روپے۔“ ماں نے بتایا۔

”کل سے اس کے پیسے بند۔“ باپ نے گویا حکم نامہ جاری کیا ”اور آج میں اس بات پر اس کی مرمت بھی لگاؤں گا۔“

”کس بات پر؟“ ملتہا نے سوال کیا۔

باپ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر قدرے خفیف ہو کر بولا ”چھلی والے سے سگریٹ لینے پر۔“

”تین مرمت لگانے سے پہلے ایک مرتبہ یہ ضرور سوچ لیجئے کہ غلطی کس کی ہے؟“ ملتہا نے کہا۔

”میڈم وہ تو ایسے ہی گھر میں بس ذرا غفلت کرتے تھے ہم لوگ۔ یہ تھوڑی کہا تھا اس سے کہ وہ باہر بھی غفل شروع کر دے۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔“ ملتہا دھیرے سے مسکرائی ”بھوسے کے ڈھیر کو چنگاری لگا کر آپ اس گمان میں ہیں

کہ آگ نہیں پھیلے گی۔ اس عمر میں تو بچہ اچھی مری ہر بات بہت جلد سیکھتا ہے۔“

”کیا کروں میڈم ایک ہی بچہ ہے، گھر بھرنے اسے اپنی آنکھوں کا تارا بنا رکھا ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں، اس کی ہر حرکت پر خوش ہوتے ہیں۔ مجھے بھی سب کی خوشی میں خوش ہونا پڑتا ہے۔“

”آپ کو سب کی بے معنی خوشی عزیز ہے یا اپنے بچے کی صحت، اخلاق اور اس کا مستقبل!“

”ظاہر ہے میڈم مجھے اپنے بچے سے بڑھ کر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی۔“ عارف کے باپ نے کہا۔

”تو پھر کہہ دیجئے سب سے کہ آئندہ کوئی اس سے سگریٹ کے کش لینے کی فرمائش نہ کرے۔“

”میڈم سگریٹ ہی نہیں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ دادا، دادی، چچا، پھوپھیاں سب مل کر اسے بگاڑ رہے ہیں۔ کوئی اسے چٹورا بنا رہا ہے، کوئی چغلی کرنا سکھا رہا ہے۔ میں کس بات پر اس کی تربیت کی کوشش کروں، ڈانٹوں، ماروں تو ادھر سے دادا آ جاتے ہیں، ادھر سے دادی۔ پھوپھیاں لڑنے لگتی ہیں کہ ہمارے بھائی کی اولاد ہے، اسے ڈانٹنے مارنے کی ضرورت نہیں۔ چچا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھلانے پلانے کو باہر نکل جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں سرال والوں کے ساتھ رہ کر بچے کی تربیت ہو ہی نہیں سکتی۔“

عارف کے باپ نے بیوی کو گھورتے ہوئے پہلو بدلا اور اس کے آخری جملے پر تڑپ کر بولا ”ان کی خواہش یہ ہے میں انہیں گھر والوں سے علیحدہ رکھوں۔ کیسے رکھوں علیحدہ۔ ماں باپ جنہوں نے مجھے مشکلوں سے بالاپوسا، پڑھایا لکھایا، اپنے قدموں پر کھڑا کیا۔ بہن بھائی جو میرے دکھ درد کے ساتھی ہیں انہیں چھوڑ دوں اور پھر انہیں تو عقل نہیں، زمانہ خراب ہے، آئے دن اخباروں میں ایسی سیدھی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ جوان بیوی اور ایک بچے کو صبح سے شام تک زمانے کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہوں میں۔“

”آپ کے شو ہر ٹھیک کہتے ہیں۔“ منتہا نے عارف کی نو جوان ماں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میڈم میرا بچہ جو بگڑا جا رہا ہے سب کے درمیان رہ کر۔“ ماں روہانسی دکھائی دینے لگی۔

”بچہ لوگوں کے درمیان رہنے سے کبھی نہیں بگڑتا، بچہ بگڑتا ہے بڑوں کے غلط رویوں سے۔ آپ کا بچہ تو خوش قسمت ہے کہ اسے پیار کرنے والے رشتوں کی چھاؤں میسر ہے۔ میرے اسٹاف ممبرز میں کئی ایسی خواتین ہیں جو تنہا رکھتی ہیں کہ ان کے گھر میں دادی، دادا، پھوپھی قسم کی کوئی چیز ہوئی تو بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت میں انہیں کچھ آسانی رہتی۔ مانا کہ جوائنٹ فیملیز میں رہنے والے بچوں کے مختلف وجوہات کی بنا پر بگڑ جانے کا مسئلہ بھی ہوتا ہے مگر یہ آپ دونوں کا کام ہے کہ بچے کو بگڑنے نہ دیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے میڈم! بچہ دوسروں کے لاڈ پیار کو سنے گا یا ہماری سختی کو۔“ ماں نے کہا۔

”خاتون! ایک بات میں آپ کو بتا دوں، بچے پر سب سے زیادہ ہولڈ اس کے والدین کا ہوتا ہے اور ان میں بھی ماں کا زیادہ..... دوسرے رشتے دار خواہ اپنا دل نکال کر ہی اس کے ہاتھ پر کیوں نہ رکھ دیں، سنے گا وہ اپنے ماں باپ ہی کی بات بلکہ جیسا کہ میں نے کہا اپنی ماں کی زیادہ۔ میں تو آپ کے بچے کے بگاڑ کی ذمہ دار زیادہ آپ ہی کو سمجھتی ہوں۔“

”مجھے!“ ماں نے ہڑبڑا کر کہا پھر قدرے ناگواری سے بولی ”میڈم کون ماں اپنے بچے کا بُرا چاہ سکتی ہے!“

”وہ جو اپنے بچے کو پیار کرنے والوں کے غلط رویے کی محبت سے اصلاح کی کوشش کرنے کے بجائے بچے کو ان رشتوں سے محروم کر دینے کی خواہش مند ہے۔“

ماں کے تاثرات سے لگا کہ اسے منتہا کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔

باپ کا چہرہ دمک اٹھا۔

”میڈم! آپ فکر نہ کریں، ہمارے بچے سے آپ کو آئندہ اس قسم کی شکایت نہ ہوگی۔“



”میں نہیں چاہوں گی کہ آپ بچے پر جسمانی یا ذہنی تشدد کریں، مجھے بہ مشکل دو منٹ لگے اس سے یہ اگلاؤں میں کہ وہ چھلی والے سے سگریٹ لیتا ہے۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر وہ سچ بول دے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

”انشاء اللہ ہم بھی ایسا ہی کوئی راستہ اختیار کریں گے۔ میڈم ویسے بھی وہ ہمارا اکوٹا بچہ ہے۔“

”تھینک یو دیری میچ۔“

”میڈم شکریہ تو ہمیں ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے بروقت ہمیں اطلاع دے کر بچے کو مزید بگڑنے سے بچالیا۔ میں آج ہی بھائی سے کہوں گا کہ اپنی سگریٹ میرے بچے کے سامنے نہ جلائے اور آئندہ خود بھی پینے سے توبہ کرے۔“

”یا کم از کم بچے کے سامنے پینے سے گریز کریں کیونکہ بچے اپنے بڑوں کو کاپی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گھروں میں بچوں کے لیے اچھے رول ماڈلز ہونے چاہئیں تاکہ وہ بھی اچھا بننے کی کوشش کریں۔“

”بے شک۔“ باپ نے تائید میں گردن ہلائی پھر کہا ”میڈم! چھلی والے کا کیا بندوبست کر رہے ہیں آپ لوگ؟“

”قریبی تھانے میں رپورٹ کر دی ہے ہم نے۔ وہ انشاء اللہ جلد ہی اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے گھات لگائیں گے۔“

”اچھا میڈم، بہت زیادہ وقت لے لیا ہم نے آپ کا۔“

”صبح اسکول لگنے سے چھٹی ہونے تک میرا سارا وقت میرے اسکول ہی کے لیے ہے۔“

”آپ کے جذبہ خدمت کی علاقے میں خاصی دھوم ہے۔“ عارف کے باپ نے کہا۔ ملتان انتہائی نیاز مندی سے مسکرا دی۔

☆☆☆

سسرال والوں کا بہوؤں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سسرال کے کسی معاملے میں میکے سے رازداری برتیں گی اکثر اوقات کچھ اسی طرح خام خیالی ثابت ہوتی ہے جسے اچھی بھائی نے لیلیٰ سے یہ توقع باندھی کہ وہ نعیم کی شادی التوا میں پڑ جانے کا سبب اپنے میکے والوں سے پنہاں رکھے گی۔ لیلیٰ ماں سے بات کیے بنا نہ رہ سکی۔ مسز ظہیر تحمل مزاج عورت تھیں۔ انہوں نے تحمل سے سنا پھر بولیں ”بیٹا ہم ہوتے ہیہ کے گھر والوں کی جگہ تو ہم بھی ایسا ہی سوچتے۔“

”ابھی تو فرحان بھائی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا امی۔“ لیلیٰ دل گرفتہ ہو کر بولی۔

مسز ظہیر نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ دھر کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”ہم لوگوں کا دینی جانا بھی کھٹائی میں پڑ گیا حالانکہ ممانی جان تو کہتی ہیں کہ تم چلی جاؤ مگر میرا جانا بھی مشکل لگتا ہے۔ ممانی جان کے اکیلے رہنے کا مسئلہ جو ہوگا۔“

”اللہ مالک ہے بیٹا، بزرگوں کی خدمت کرو گی، دعائیں لو گی تو پھلو پھو لو گی۔“ مسز ظہیر نے کہا۔

اچھی مائیں بیٹیوں کی یونہی تربیت کیا کرتی ہیں اور سمجھ دار بیٹیاں اس تربیت پر عمل پیرا ہو کر زندگی کو خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی خوش گوار بنادیتی ہیں۔

☆☆☆

ثروت کے آنے سے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ اگرچہ می نے شروع شروع میں روایتی ساسوں والا طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کی مگر ثروت کی متحمل مزاجی اور ملتان کی سمجھ داری نے جلد ہی می کو اپنا طرز عمل تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

ثروت نے دیکھتے ہی دیکھتے سارا گھر سنبھال لیا تھا۔ می اور علیب کی خدمت گزاری میں وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے

کی کوشش کرتی۔ منہا کے ساتھ اس کا رویہ چھوٹی بہنوں کا تھا۔ صبح اسے ناشتا بنا کر دیتی۔ دوپہر کو اسکول سے واپسی پر ابھی وہ چنچ ہی کر رہی ہوتی کہ کھانا گرم کر کے میز پر لگا بھی دیتی۔ ابھی وہ کھانا کھا ہی رہی ہوتی کہ چائے بھی میز پر چنچ جاتی۔ شروع شروع میں منہا متردد ہوئی مگر ثروت اس کے منع کرنے کے باوجود اپنے ان معمولات پر کاربند رہی۔

شام کو منہا کچن خود سنبھالنا چاہتی مگر ثروت بڑھ بڑھ کر زبردستی اس کے ہاتھ سے کام لینے لگی۔ ”آپ رہنے دیجئے باجی میں کرلوں گی۔“ وہ بڑی اپنائیت سے کہتی۔

”بھئی صبح کا سارا کام تمہی تو کرنی ہو۔ تھک گئی ہوگی، اب مجھے کرنے دو۔“ منہا کہتی۔

”بالکل بھی نہیں۔ مجھے تو بالکل تھکن نہیں ہوتی۔ کام ہی کتنا ہوتا ہے۔“

چنانچہ شام کے وقت یہ معمول بن گیا تھا کہ دونوں مل جل کر گھر کا کام کرتیں۔ می سے جو بھی بن پڑتا کر لیتیں حالانکہ انہیں ثروت اور منہا دونوں ہی منع کیے جاتیں۔

علیب کی ضرورت کی ہر چیز بروقت تیار ملتی۔ شام کو دفتر سے واپس لوٹتا تو گھر کی پرسکون فضا میں ثروت اپنی نرم نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی۔ کبھی کبھی جب علیب اسے کہیں باہر گھمانے پھرانے کے لیے لے جانا چاہتا تو وہ می اور منہا سے بھی چلنے پر اصرار کرتی۔ کبھی وہ اس کے اصرار کے سامنے بے بس ہو جاتیں کبھی معذرت کر لیتیں۔ چاروں ساتھ جاتے تو ثروت می کو علیب کے ساتھ گاڑی کی اگلی نشست پر بٹھاتی اور خود منہا کے ساتھ پیچھے بیٹھتی۔

عجیب لڑکی تھی!

اور بھی بہت سے حیران کن کام کرتی تھی اکثر۔ پہلی بار جب منہا کو اپنے میلے کپڑوں کے دو جوڑے دھلے ہوئے ملے تو اس نے بڑی حیرانی سے می سے پوچھا ”والدہ میرے کپڑے کس نے دھوئے؟“

”ثروت نے۔“

”کیوں بھئی؟“

”ہماری مرضی۔“ ثروت مسکرا کر بولی۔

”پلیز آئندہ مت دھونا۔“

”مجھے می نے بتا دیا ہے کہ آپ اپنے کپڑے خود ہی دھوتی ہیں، ماسی سے بھی نہیں دھلواتیں مگر آپ اطمینان رکھیں میں نے خوب اچھی طرح پانی سے نکالے ہیں۔ پاک بھی کر دیے ہیں۔“

”بات اچھی طرح دھونے یا پاک کرنے کی نہیں ثروت۔“

”تو پھر؟“

”مجھے سخت شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”کیوں شرمندگی کی کیا بات۔ کیا چھوٹی بہنیں بڑی بہنوں کے کام نہیں کرتیں۔“

”اوہ ثروت، اپنی ایسی باتوں سے تو تم ہم سب کو اپنا دیوانہ بنائے لے رہی ہو۔“ منہا نے اسے اپنے گلے سے

لگا لیا۔

اب منہا کی کوشش ہوتی کہ اس کا کوئی میلا کپڑا ثروت کے ہاتھ نہ لگے مگر شام کو جب وہ اگلے دن اسکول کے لیے اپنے کپڑے استری کرنے کھڑی ہوتی تو ثروت اکثر اس کے ہاتھ سے استری اور کپڑے جھپٹ لیتی۔

”چھوڑ دیں بس۔“ وہ کہتی۔

”پلیز!“ منہا گڑ گڑاتی۔



”آپ بس باتیں کیا کریں، مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔“  
 منتہا کو بخش کرنے لگی کہ کپڑے ثروت کے سامنے استری نہ کرے مگر ہوا یہ کہ اسے استری شدہ کپڑے الماری میں  
 لٹکے ہوئے ملنے لگے۔  
 رات کو وہ می کے کمرے میں آ کر ان کے پاؤں دبانے بیٹھ جاتی۔ می لاکھ ٹانگیں سیٹھیں پاؤں چراتیں مگر وہ ان  
 کے پاؤں نہ چھوڑتی۔  
 یہہ آتی تو وہ اس کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ منے کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ آئے دن اس  
 کے لیے تحائف خرید کر لاتی اور یہہ سے فرحان کی باتیں انتہائی انتہاک سے سنتی۔  
 غرض تھوڑے سے عرصے میں ہی ثروت نے اپنے حسن سلوک سے گھر میں وہ اہمیت حاصل کر لی تھی جو بہت سی  
 لڑکیاں اپنی سسرالوں میں برسوں میں بھی حاصل نہیں کر پاتیں۔

☆☆☆

سزا شفاق چھٹی پر تھیں۔ منتہا نے ان کے ٹائم ٹیبل کا ایک پیریڈ اپنے نام لگوا لیا تھا۔ وہ عموماً ایسا کیا کرتی تھی۔  
 چھٹی پر جانے والی ٹیچرز کے ایک دو پیریڈز اپنے نام پر لگوا کر وہ ان کی کلاسوں میں خود چلی جاتی۔ اس کے دو فائدے  
 ہوتے۔ بچوں سے براہ راست رابطہ اور رخصت پر گئی ٹیچرز کے کام کا جائزہ۔ ایک دو کے سوا بھی ٹیچرز وقتاً فوقتاً اتفاقاً  
 رخصت لیتی رہتی تھیں لہذا اند کو یہ طریقہ کار کے تحت منتہا کو تقریباً سبھی ٹیچرز کے کام کا جائزہ لینے کا موقع مل جاتا۔ کبھی  
 کبھی وہ ایک ہی پیریڈ میں کسی ایک جماعت میں تمام ہی مضامین کی تدریس کا سرسری جائزہ لے لیتی۔ یوں اسے نہ  
 صرف یہ خبر رہتی کہ کس جماعت میں کون ٹیچر کیا اور کس معیار کا کام کر رہی تھی بلکہ اسے ایک ہی جماعت کے مختلف  
 فریقوں میں تدریس کا تقابلی جائزہ لینے میں بھی آسانی رہتی۔

اس روز وہ چارم ب میں سزا شفاق کا پیریڈ لینے کے بعد اپنے دفتر کی طرف آرہی تھی کہ فون کی کھنٹی بجی۔ اقبال  
 ڈاک لے کر ڈائریکٹریٹ گیا ہوا تھا۔ آیا صفراں بھی کہیں ادھر ادھر تھی۔ اس کے دفتر کے باہر کوئی آدمی موجود نہ تھا۔  
 فون کی کھنٹی کی آواز سن کر اس نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ تیسری کھنٹی پر تاج محمد اپنے کمرے سے نکل کر تیزی سے اس کے  
 کمرے میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچی تو تاج محمد ریسور میز کے شیشے پر رکھ کر پلٹتے دکھائی دیے۔  
 ”میڈم جی، آپ کا فون ہے“ تاج محمد نے اس کو کمرے کے دروازے پر دیکھ کر بتایا۔  
 تاج محمد دروازے کی طرف اور وہ اپنی میز کی جانب بڑھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ریسور اٹھایا۔  
 ”ہیلو!“

”جناب!“

”تو ہمیں کی آواز تھی۔“

”پرپل صاحبہ کلاس لے آئیں؟“

”یہ اطلاع اسے یقیناً تاج محمد ہی نے فراہم کی تھی۔“

”جی ہاں۔“

”آپ کیسی پرپل ہیں بھئی جو کلاس بھی لیتی ہیں۔“

”اصولاً تو اسکول کے نظام الاوقات میں میرا کسی ایک کلاس میں روزانہ ایک پیریڈ ضرور ہونا چاہیے مگر میں تمام

کلاسوں پر نظر رکھنے کے لیے تقریباً روزانہ ہی باری باری ہر کلاس میں ایک پیریڈ لے لیتی ہوں۔“

”گڈ! اور سنائیے۔“

”آپ سنائیں۔“  
 ”ہم کیا سنائیں مجھ کو انتظار ہیں۔“  
 وہ سمجھ گئی کہ وہ کس انتظار کی بات کر رہا تھا۔  
 ”گھر میں سب خیریت؟“ وہ لمحہ بھر کے توقف سے بولا۔  
 ”الحمد للہ!“

”امی سے بات کرنا ہوں تو وہ آپ کا ذکر ضرور کرتی ہیں، ہو سکے تو کبھی کبھی انہیں فون کر لیا کریں۔“  
 ”کوشش کروں گی۔“

”مشکل ہے کیا جو کوشش کرنی پڑے گی۔“

”آپ نہیں سمجھیں گے۔“

”آپ سمجھانے کی کوشش کریں تو شاید سمجھ سکوں۔“

وہ چند لمحوں کو الجھن میں پڑ گئی۔

”جی میں منتظر ہوں“ وہ بولا۔

”جب سے آپ نے مجھے یہ بتایا ہے کہ آپ نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے سخت شرمندگی ہوتی ہے، اس خیال سے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں ہوں گی، میں تو اب لیلیٰ کو بھی فون کرنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔“

”میری ماں بہت صابر و صابر دشا کر عورت ہیں۔ آپ سے کبھی کوئی گلہ نہیں کریں گی وہ۔“  
 ”مگر میں تو کٹھنی فیل کرتی ہوں۔ لیلیٰ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہے کہ آپ سے کس قدر محبت کرتی ہیں وہ اور آپ کی شادی کی کتنی تمنائیں کرتی ہیں۔“

”مجھے یقین ہے کہ مجھ سے ان کی یہی محبت انہیں حوصلہ دے رہے گی۔“

”بیماروں اور کمزوروں کو ایسی توقعات کی صلیب پر چڑھادینا بہت زیادتی ہے۔“

”مجبوری تھی۔“

”آپ کو بھلا کیا مجبوری تھی؟“

”شاید میں بتا بھی نہ سکوں یا شاید آپ جاننے کے باوجود بھی انجان بنی رہیں..... کیونکہ ہم دونوں ہی آئی لو یو کہنے کے دور سے آگے نکل چکے ہیں۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔

کمرے کے دروازے پر سلور گرے بالوں والی ایک پُر وقار خاتون ٹھنکی کھڑی تھیں۔ منتہا کی نظر ان کی طرف اٹھی۔

”حاضر ہو سکتی ہوں؟“

”جی..... جی..... آئیے۔“

”کون ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”کوئی وزیٹر ہیں“ وہ دھیرے سے بولی۔

”جائے جناب، آپ اپنے ملاقاتیوں کو بھگتائیں اور ہم بھگتائیں لو کری“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ٹھیک یو فار کا ٹنگ!“

”ٹھیک یو فار لسننگ..... خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“



ریسیور رکھ کر وہ آنے والی خاتون کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ مسکراتی ہوئی صوفے پر سے اٹھیں ”میں یہاں آپ کے سامنے بیٹھ سکتی ہوں“ انہوں نے ملتہا کی میز کے دوسری جانب رکھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

”جی..... جی..... ضرور۔“

وہ اس کے رُوبرو آ بیٹھیں۔

”میرا نام سعیدہ احسان ہے، ڈاکٹر سعیدہ احسان۔ آپ کا کچھ وقت لینا چاہوں گی۔“

”جی ضرور..... فرمائیے۔“

”میں..... چائلڈ اسپیشلسٹ ہوں..... ڈاؤ سے ایم بی بی ایس کیا پھر ایف آر سی ایس کرنے باہر چلی گئی۔ تقریباً سترہ اٹھارہ سال انگلینڈ میں کام کیا۔ اب یہیں ہوتی ہوں۔ شام کو اپنی پرائیویٹ کلینک کرتی ہوں۔ دن سوشل ورک میں گزارتا ہے۔ سوشل ورک میں بھی بچے میری خصوصی دلچسپی ہیں۔ ایم بی بی ایس کے زمانے سے اب تک یہ سمجھئے کہ کوئی تیس برس ہونے کو آئے، بچوں کے سلسلے میں، میں ایک خاص حوالے سے کام کر رہی ہوں اور وہ ہے چائلڈ ایبوز۔“

ملتہا نے بے ساختہ چونک کر اپنے رُوبرو بیٹھی ڈاکٹر سعیدہ احسان کی جانب دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”آپ کا چونکنا میرے لیے قطعاً غیر متوقع نہیں۔ جب میں لوگوں سے ملتی ہوں اور انہیں بتاتی ہوں کہ بچوں پر جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھانا اور معاشرے کو اس سلسلے میں آگاہی دینا میری خاص دلچسپی بلکہ یہ سمجھئے کہ نصب العین ہے تو لوگ اسی طرح چونکتے ہیں جیسے آپ چونکی ہیں۔“

ملتہا جھینپ گئی۔

”دراصل اس سے پہلے کبھی کسی نے اس طرح کی بات نہیں کی“ اس نے خفیف ہو کر کہا۔

”جی ہاں، یہ بھی ایک المیہ ہے۔ ذرائع ابلاغ کسی دوشیزہ کے اغوا، کسی لڑکی کے ساتھ ہونے والی زیادتی یا کسی خاتون کی بے آبردی کی خبریں تو بڑی دسوزی کے ساتھ جماتے ہیں لیکن کسی بچی یا بچے کے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی اور زیادتی کے بعد کیے جانے والے قتل کی صرف تین چار سٹری خبر لگاتے ہیں۔ اس موضوع پر زیادہ بات ہی نہیں کی جاتی۔ ایک معصوم بچہ اغوا ہوتا ہے، دو روز بعد اس کی نعش مل جاتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے بچے کو قتل کرنے سے قبل قاتل نے زیادتی کا نشانہ بھی بنایا..... اور قصہ ختم!“

ملتہا نے جھرجھری لی۔

”یس میڈم پریسل! یہی ہوتا ہے، نہ صرف ہمارے ترقی پذیر معاشرے میں بلکہ دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی“ ڈاکٹر سعیدہ احسان نے گھائل لہجے میں کہا ”ہم عورت پر جنسی تشدد کے خلاف چیختے چلاتے ہیں، ریلیاں نکالی جاتی ہیں، سیمینارز منعقد کرائے جاتے ہیں مگر ہم یہ نہیں دیکھتے کہ معصوم بچوں پر کیا بیت رہی ہے۔“

ملتہا کی نگاہیں ڈاکٹر سعیدہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”معاف کیجئے گا..... میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے عموماً یونہی جذباتی ہو جاتی ہوں..... دراصل میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ مجھے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ قبل آپ کے ادارے میں بھی کسی بچے پر زیادتی کا واقعہ ہوا ہے۔“

ملتہا دم بخود رہ گئی۔ گھر کی بات باہر کیونکر جا پہنچی تھی؟

”مہیا پوچھ سکتی ہوں آپ سے یہ بات کس نے کہی؟“

ڈاکٹر سعیدہ دھیرے سے مسکرا دیں ”یہ مت پوچھئے، نہ ہی میں بتاؤں گی۔ ہمارے ذرائع معلومات بے شمار ہیں لیکن آپ یہ مت سمجھئے کہ میں محض اس واقعے کے علم میں آنے کی وجہ سے یہاں آئی ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ میں بچوں کو ان کی حفاظت کے بارے میں آگاہی دینے کے لیے جہاں ضرورت سمجھتی ہوں، پہنچ جاتی ہوں۔ تعلیمی اداروں میں چونکہ مجھے بیک وقت بچوں کی بڑی تعداد سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے چنانچہ اب تک بے شمار اداروں میں جا کر بچوں کو لیکچر دے چکی ہوں۔ میں چاہوں گی کہ آپ مجھے اپنے اسکول کے بچوں سے بھی بات کرنے کا موقع دیں تاکہ وہ اپنی حفاظت کرنا سیکھیں۔“

منہا سوچ میں پڑ گئی۔  
 ”کس قسم کی..... میرا مطلب ہے، کیا بات کریں گی آپ بچوں سے؟“  
 ”چھوٹی چھوٹی چند ہدایتیں ہوتی ہیں۔“  
 ”مثلاً۔“

”مثلاً یہ کہ اپنے والدین سے کبھی کوئی بات نہ چھپائیں۔ گھر سے باہر اکیلے مت جائیں۔ کسی کے گھر میں اکیلے نہ جائیں، والدین کی اجازت کے بغیر کسی سے کوئی چیز نہ لیں۔ کسی اجنبی سے بات نہ کریں۔ ہمیشہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ ہی کھیلیں، اپنے سے بڑے بچوں کے ساتھ نہ کھیلیں۔ اپنے جسم کی حفاظت کرنا سیکھیں۔ کسی واقف یا ناواقف شخص کو اپنے جسم کے کسی حصے کو چھونے نہ دیں اور اگر کوئی بڑا ان سے کوئی ایسی بات چھپانے کو کہے جو بُری ہو تو ہرگز نہ چھپائیں بلکہ اچھی بُری ہر بات اپنے والدین کو ضرور بتائیں کیونکہ ماں باپ سے بڑھ کر ان کا دوست کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“ ڈاکٹر سعیدہ نے توقف کیا پھر بولیں ”بس اسی طرح کی کچھ ہدایتیں ہوتی ہیں۔ ہم ہمیشہ اپنے بچوں کو یہی سمجھاتے ہیں کہ انہیں بڑوں کا ادب کرنا چاہئے ان کی ہر بات ماننی چاہئے لیکن انہیں یہ سمجھانا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اگر کوئی بڑا، چاہے وہ جاننے والا ہو یا اجنبی، انہیں چھونے یا ان کے جسم سے کھیلنے یا کوئی بُرا مذاق کرنے کی کوشش کرے اور ان باتوں کو اپنے گھر والوں سے چھپانے کو کہے تو اس کی بات ہرگز نہ مانیں۔“

منہا کو بڑا عجیب سا لگا۔ فرشتوں جیسے معصوم بچوں سے اس طرح کی باتیں!  
 ڈاکٹر سعیدہ اپنی بات پوری کر چکنے کے بعد جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔  
 ”آ..... آپ کی باتیں بہت اچھی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! مگر..... مجھے افسوس ہے کہ ڈائریکٹریٹ کی اجازت کے بغیر بچوں سے آپ کی بات ممکن نہ ہو سکے گی۔“ منہا نے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں، آپ ڈائریکٹریٹ سے اجازت لے لیں۔“  
 منہا شپٹا گئی۔

”وہ..... بات یہ ہے میڈم کہ..... ڈائریکٹریٹ سے اس قسم کے لیکچر کی بات کرنا ہی اچھا نہیں لگتا۔“  
 ”کیوں؟“ وہ چونکیں۔

”معصوم اور نا سمجھ بچوں سے ایسی باتیں کرنا.....!“  
 ”بچوں ہی سے تو ایسی باتیں کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بڑے تو خود سمجھ جاتے ہیں اور اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔“  
 ”اصل میں..... ہمارے پاس مختلف طبقات فکر سے تعلق رکھنے والے گھرانوں کے بچے آتے ہیں۔ ممکن ہے بعض والدین یہ پسند نہ کریں کہ ان کے بچوں سے اس قسم کی بات کی جائے۔“  
 ڈاکٹر سعیدہ احسان نے ایک گہری سانس کھینچی اور اپنے روپہلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں ”میں آپ کی پرابلم سمجھ سکتی ہوں..... یہ بھی ایک البیہ ہے ہمارے معاشرے کا کہ ہم اپنے بچوں کو نقصان سے بچاؤ کا طریقہ سکھانے کے بجائے انہیں آنکھیں بند کر کے جینا سکھاتے ہیں۔“



ملجبا خفیف سی ہو گئی۔

”مشکل یہ ہے کہ والدین اپنے اور بچوں کے درمیان ایسے اعتماد کی فضا بھی پیدا نہیں کرتے کہ بچے ان سے ہر موضوع پر بات کر سکیں..... بہر حال پرنسپل صاحبہ، آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنا وقت دیا۔“

”ڈاکٹر صاحبہ! میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے ہمارے ڈائریکٹریٹ کے زیر انتظام کسی اور ادارے میں بھی لیکچر دیا؟“

”جی نہیں، مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کی طرف سے اب تک ویسا رسپانس نہیں ملا جیسا کہ اس اہم اور حساس نوعیت کے کام کا تقاضا ہے۔ میرا زیادہ کام چھوٹی چھوٹی مضافاتی بستیوں، چکی آبادیوں اور دیہاتوں میں رہا ہے یا پھر چند رفاہی اداروں میں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچوں کا استحصال صرف چکی آبادیوں، چھوٹی بستیوں اور دیہاتوں ہی میں نہیں، معاشرے کے متوسط اور اعلیٰ طبقات میں بھی کچھ کم نہیں، جہاں خواتین بچوں کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں اور بسا اوقات یہ نوکر ہی ان بچوں کا استحصال کر رہے ہوتے ہیں کبھی کسی پارک میں گھمانے ٹھلانے اور بھلانے کے بہانے اور کبھی گھر سے اسکول لے جاتے اور کبھی واپس لاتے ہوئے راستے میں کہیں ادھر ادھر گاڑی روک کر۔“

”اودھ خدایا!“ ڈاکٹر سعیدہ احسان کسی جراح کی طرح زخم کو نشتر پر نشتر لگا رہی تھیں۔

”تھینک یو دیری مچ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”امید ہے آپ نے بُرا نہیں مانا ہوگا۔ دیے ڈھکے چھپے لفظوں میں ہم بچوں کو سمجھاتے تو رہتے ہیں کہ انہیں اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔“ ملتھانے کہا۔

”ہمارے اور آپ کے طریقہ کار میں فرق ہو سکتا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“

”ہم بچوں کو ان شیطانیوں کے خلاف مزاحمت کرنا سکھاتے ہیں جو ان کی معصومیت اور ناجحی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ذہنی معذور بچوں کے ایک رفاہی ادارے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں خانساں نے..... ایک نو عمر ذہنی معذور بچی کو پریگنٹ کر دیا تھا۔“

”اومالی گاڈ!“

”ایسی بے شمار تلخ حقیقتیں معاشرے میں بکھری پڑی ہیں اور ہم ان بد صورتیوں کو آئینہ دکھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔“

”ایک بات پوچھ سکتی ہوں آپ سے؟“ ملتھانے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جی ضرور۔“

”آپ کو اس سلسلے میں کام کرنے کا خیال کیسے آیا؟“

ڈاکٹر سعیدہ دھیرے سے مسکرا دیں پھر بڑے نرم لہجے میں گویا ہوئیں ”جن دنوں میں ہاؤس جاب کر رہی تھی اپنے والد کے جادلے کی وجہ سے مجھے کچھ عرصہ اپنی والدہ کی ایک سیکنڈ کزن کے ہاں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے انہوں نے گھر کی پہلی منزل پر کمرادے رکھا تھا۔ رات کو جب میں کمرے میں سوئی تو چھت پر بنے کمرے سے کچھ عجیب سی آوازیں سنائی دیتیں۔ ایک روز میں یہ دیکھنے کو کہ یہ آوازیں آخر کیوں آتی ہیں دبے پاؤں اور چاہنچی جہاں میری ان رشتے کی خالہ کا نو عمر ملازم چھت پر بنے کمرے میں رہا کرتا تھا، کمرے کا دروازہ بند تھا، کھڑی کھلی ہوئی تھی اور مدقوق سی روشنی میں نے کھڑکی سے کمرے میں جھانکا تو ایک عجیب ہی منظر دکھائی دیا۔ میری ان خالہ کا نو جوان اکلوتا بیٹا اپنے نو عمر ملازم کے ساتھ غلط حرکت کر رہا تھا میں دم بخود رہ گئی اور مجھے اپنی خالہ کے بیٹے سے سخت گھن آئی۔“

دبے پاؤں کمرے میں واپس لوٹی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ کل ہی ہاسٹل چلی جاؤں گی رات بھر میں سو نہیں سکی۔ صبح جب ملازم لڑکا مجھے ناشتے کے لیے بلانے آیا تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔۔۔ اور غصے سے کہا بد تمیز لڑکے تم رات چھوٹے صاحب کے ساتھ کیا کر رہے تھے وہ شپٹا گیا۔ میں نے کہا بتا دوں بیگم صاحب کو وہ ڈر گیا میں نے کہا یہ بتاؤ چھوٹے صاحب تمہارے کمرے میں آئے کیسے؟ بولا وہ تو روز آتے ہیں میں نے کہا کیوں؟ بولا بس ان کی مرضی میں نے غصے سے کہا تم منع کیوں نہیں کرتے کہنے لگا وہ مجھے پانچ روپے روز دیتے ہیں میں سن رہ گئی اور اس لڑکے سے مجھے شدید نفرت محسوس ہوئی میں نے کہا تم پانچ روپے کی لالچ میں برا کام کراتے ہو شرم نہیں آتی وہ بولا جس گھر میں میں پہلے نوکری کرتا تھا وہاں تو دو بھائی تھے اور ان میں سے کوئی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا تھا۔ بس یہ بات تھی جس نے مجھے بچوں کی حفاظت کے لیے کام کرنے پر راغب کیا۔“

منتہا گنگ تھی۔

”مگر افسوس کہ ایک طویل مدت اس کام میں گزارنے کے باوجود مجھے آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کی جانب سے بھی ویسا رسپانس نہیں ملتا جیسا ملنا چاہیے۔“

منتہا کو یوں لگا جیسے ڈاکٹر سعیدہ احسان کی اس بات کے جواب میں کچھ کہنے کو الفاظ کہیں گم ہو گئے تھے۔

”اجازت؟“ وہ بولیں۔

”آپ کے آنے کا شکریہ۔“

”اور آپ کے عدم تعاون کا شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہنس پڑیں پھر بولیں ”بہر حال پھر بھی آپ سے ملنا اور آپ کا صاف ستھرا ہر ابھر اسکول دیکھنا اچھا لگا۔“

انہیں رخصت کرنے کے لیے منتہا گیٹ تک گئی گیٹ کے باہر لشکارے مارتی ایش گھرے کار میں ڈرائیور ان کا منتظر تھا۔ ڈاکٹر سعیدہ کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے کار سے اتر اور اس نے لپک کر ان کے لیے گاڑی کا دروازہ دیا کیا۔ ڈاکٹر سعیدہ کو خدا حافظ کہنے کے بعد اپنے دفتر کی جانب لوٹتے ہوئے منتہا کو یہی خیال ستاتا رہا کہ اس نے ڈاکٹر سعیدہ کو ایک حساس موضوع پر بچوں سے بات کرنے میں تعاون کرنے کے بجائے کترانے کا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔

ڈاکٹر سعیدہ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم آئینے میں بد صورتی دیکھتے ڈرتے ہیں انہوں نے کہا تھا ہم بد صورتیوں کو آئینہ دکھاتے ڈرتے ہیں۔

کیا ان کی بات کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اخلاقی طور پر اتنے کمزور ہیں کہ بدکاروں کے ہاتھ پکڑنے کے بجائے اپنے ہاتھ چرا لیتے ہیں!

☆☆☆

منٹا گھر کی رونق بن گیا تھا۔ اپنی معصوم حرکتوں اور توہلی زبان میں بولے جانے والے چھوٹے چھوٹے فقرہوں سے وہ گھردالوں کو دن بھر خوش رکھتا۔

فرحان کے انتقال کے بعد گھردالوں نے اس کی ایک تصویر کو انظارِ جہاں کے لاؤنج میں آراستہ کر دیا تھا جہاں گھردالوں کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا رہتا۔ ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے لاؤنج سے ضرور گزرنا پڑتا لہذا گھر آئے گئے ہر شخص کی نظر فرحان کی اس تصویر پر ضرور پڑتی۔ منے کا زیادہ وقت بھی گھردالوں کے ساتھ لاؤنج ہی میں گزرتا۔ فرحان کی تصویر کو گھردالوں نے منے کے لیے بھی غیر معمولی توجہ کا مرکز اور کشش کا سبب بنا دیا تھا۔

جب منا بولتا نہیں تھا صرف دیکھتا اور سنتا تھا گھر کے افراد اکثر اسے اپنی گود میں لے کر فرحان کی دیوار گیر تصویر کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور تصویر کی جانب انگلی اٹھا کر منے سے کہتے ”یہ منے کے بابا ہیں۔“



شروع شروع میں تو مٹا بہت سا تاثر دیا کرتا تھا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے تھے۔ تصویر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور وہ یوں ہمک ہمک کر تصویر کی طرف بڑھتا جیسے کہتا ہو ”مجھے گود میں لے لو۔“

پھر منے سے کہا جانے لگا ”بابا کو پی کرو۔“  
وہ سر آگے جھکنا پیشانی کو تصویر سے مس کرتا اور اپنے ننھے ننھے ہونٹوں کو بھی تصویر سے مس کر دیتا۔  
”اب منا بابا کو پی دے گا۔“

اور منے میاں اپنا گال تصویر سے مس کر دیتے۔  
”آں..... پیچ“ چکار کی آواز آتی اور منے میاں سچ سچ یہ سمجھتے کہ بابا نے انہیں پیار کیا تھا۔  
منے نے بولنا سیکھنا شروع کیا تو پہلا لفظ ہی ”بابا“ سیکھا۔

”یہ کون ہیں؟“ گھر والے فرحان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھتے۔  
”بابا!“ منا دکتی آنکھوں کے ساتھ کہتا۔

”یہ منے کے پیارے پیارے بابا ہیں۔“ اسے بتایا جاتا۔  
منے نے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنا شروع کئے تو اس سے پوچھا جانے لگا ”منے کے بابا کیسے ہیں؟“  
”پالے پالے“ وہ تو تلی زبان میں جواب دیتا۔  
”منے کے بابا بہت دور رہتے ہیں۔“ اس سے کہا جاتا۔  
”بابا منے کے لیے کھلونے لے کر آئیں گے۔“  
”منے کے بابا جہاز میں بیٹھ کر آئیں گے۔“

چنانچہ منے میاں اب جب بھی آسمان پر کسی جہاز کو پرواز کرتے دیکھتے تو ہونٹوں کو گولائی میں سیٹھ کر آنکھیں پھیلا کر کہتے ”منا..... بابا جاج آیا۔“  
ہوائی جہاز کی محض آواز سنتے ہی منے کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ چونک کر کہتا ”بابا آیا۔“  
”آیا نہیں آئے..... بابا آئے۔“ منے کو سمجھایا جاتا۔  
”بابا آئے۔“ وہ دہراتا۔

فرحان کی بے جان تصویر منے کی زندگی اور اس کی تربیت میں کسی جاندار فرد کی طرح مدخل رکھی جانے لگی تھی۔  
صبح منے کے جاگنے پر ظہیر صاحب اسے فرحان کی تصویر کے سامنے لے کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے ”بابا کو سلام کرو۔“

منا تصویر کو سلام کرتا بلکہ اب تو کسی کے کہے بنا خود ہی سلام کرنے لگا تھا۔  
گھر سے کہیں باہر جاتے وقت بھی منے کو بابا کو خدا حافظ کہہ کر جانے کی عادت پختہ کر دی گئی تھی۔ اب اگر گھر والے بھول بھی جاتے تو منے کو یاد رہتا کہ گھر سے باہر جانے سے قبل بابا کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہنا ہے۔  
کسی بات پر منے کی تعریف کرنا ہوتی یا کسی غلطی پر تنبیہ مقصود ہوتی فرحان کی تصویر سے خاطر خواہ مدد لی جاتی۔  
”بھئی منے کے بابا ہمارے منے میاں تو بڑے اچھے نیچے بن گئے ہیں۔ آج ناشتے میں انڈا بھی کھایا اور دودھ بھی پورا پیا۔“ ظہیر صاحب فرحان کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے پھر منے کی طرف دیکھ کر کہتے ”بابا تو یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔“

منے کا معصوم چہرہ دکنے لگتا۔

”منے کے بابا آج ہمیں آپ سے ایک چھوٹی سی شکایت کرنی ہے منے میاں کی!“

ظہیر صاحب تصویر کے رُوبرو جا کر کن انکھیوں سے منے کو دیکھتے ہوئے کہتے ”شام کو جب منے میاں دادا ابو کے ساتھ باہر جاتے ہیں تو اپنا ہاتھ نہیں پکڑاتے دادا ابو کو۔“

”منے دیکھو تو بابا کیا کہہ رہے ہیں۔“ مسز ظہیر کہتیں۔

منا بڑی معصومیت سے تصویر کی جانب دیکھنے لگتا۔ ظہیر صاحب تصویر کی جانب کان لگائے دکھائی دیتے۔

”بابا کہہ رہے ہیں منے سے کہئے ضد نہ کیا کریں۔“ ظہیر صاحب پلٹ کر مسز ظہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے پھر ان کا روئے سخن منے کی جانب ہو جاتا ”کیوں بھی منے میاں اب تو آپ دادا ابو کو اپنا ہاتھ پکڑائیں گے نا؟“

منا اثبات میں سر ہلا دیتا۔

منا کسی بات پر روتا، ضد کرتا یا مچلتا تو فوراً اس کی توجہ اسی تصویر کی جانب مبذول کرائی جاتی ”ارے ارے، بابا خفا ہو جائیں گے!“

اور منہ روتے روتے چپ ہو جاتا۔ محل رہا ہوتا تو مچلنا چھوٹ جاتا، سوری کرتا، کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ گھر والوں میں سے کوئی منے کے لیے کوئی سوٹ، کھلونا، بسکٹ یا چاکلیٹ کا ڈبا لے کر آتا اور اسے یہ کہہ کر دیتا کہ وہ چیز اس کے لیے بابا نے بھجوائی تھی۔

”بابا کو تھینک یو بولو۔“ منے کو ہدایت کی جاتی۔

اور منے میاں تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے ”تھینک یو۔“

منے کے لیے بابا کی طرف سے اب تک متعدد تحفے آچکے تھے۔ ماما اس کے لیے کوئی چیز لاتیں تو کہتیں ”یہ منے کے بابا نے بھجوا یا ہے منے کے لیے“ عدنان چاچو کوئی تحفہ لاتے تو یہ کہہ کر دیتے۔ ”یہ بابا نے بھیجا ہے منے کے لیے۔“

ناؤ خالہ جانی اور ماموں بھی اکثر یہی کہتے۔

یوں بابا کا خیال منے کے لیے ایک زندہ حقیقت بنا دیا گیا تھا۔ اس دنیا میں نہ ہوتے ہوئے بھی فرحان منے کے لیے ایک خیالی وجود رکھتا تھا!

اسے یاد رکھایا جاتا کہ بابا جو بہت دور رہتے ہیں ایک روز اس کے لیے ڈھیروں کھلونے لے کر آئیں گے۔

دیوار پر لگی فرحان کی تصویر سے منے کو انتہائی انس ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پرائمری وظیفہ امتحان سر پر آ پہنچا تھا۔ منہا کے اسکول سے اس امتحان میں نوے بچے شریک ہو رہے تھے، بچے جو تیاری کر رہے تھے سو کر رہے تھے ان کے ٹیچرز کا جوش مسابقت دیکھنے اور محسوس کرنے کی بات تھی۔ تدریس کے لیے زیادہ وقت حاصل کرنے کی خاطر بعض خواتین اساتذہ تو اسکول لگنے سے گھنٹا بھر پہلے ہی اسکول پہنچ جاتیں۔ بچے ان سے بھی پہلے پہنچنے کی کوشش کرتے۔ صبح اسمبلی سے قبل وقفے کے دوران اور کبھی کبھی پٹھسی کے بعد بھی پانچ سات منٹ تک ٹیچرز ان بچوں کو پڑھاتی دیکھی جاتیں۔

یہی اسکول تھا اور یہی ٹیچرز وظیفہ امتحان پہلے بھی ہوتا رہا تھا بلکہ برسوں سے ہر سال ہو رہا تھا مگر بقول غزالہ ناصر ایسا جوش و خروش پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

فاروقی صاحب کہا کرتے تھے ”جذبہ مسابقت کو ہوا دینے کے لیے کبھی اہلکاروں کی صلاحیتوں کو ہمیز کرنا پڑتا ہے کبھی ان کی نگاہ آگے نکل جانے والوں پر مرکوز کرنا پڑتی ہے۔ کبھی ان کی ستائش ضروری ہوتی ہے اور کبھی صلہ بھی متعین کرنا پڑتا ہے۔“

منہا بچوں کو وظیفہ امتحان کی تیاری کرانے والی رفقاء کار پر یہ تمام حربے آزمایا ہی تھی۔ مذکورہ امتحان کے لیے بچوں کو تیاری کرانے والی تقریباً تمام ہی ٹیچرز نے گویا سردھڑکا زور لگا دیا تھا۔ ان بچوں کو وقت سے پہلے ہی ختم کر دیا



جانے والا نصاب بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ گزشتہ برسوں کے امتحانی پرچہ جات بچوں کو بار بار حل کروائے جا رہے تھے ہم عصر اداروں کی کارکردگی کا اندازہ کرنے کے لیے ان کے طلبہ کی مشقی کاپیاں منگوا کر دیکھی جا رہی تھیں۔ امیدواروں کو پرچہ حل کرنے کے موثر ترین انداز سکھائے جا رہے تھے۔ ان پیچرز نے موسم سرما کی تعطیلات کے دوران بھی بچوں کی پڑھائی جاری رکھی تھی شاید ان کا بس چلتا تو ہفتہ واری تعطیل کو بھی پڑھائی جاری رکھتیں مگر یہ ممکن نہ تھا۔

فاروقی صاحب ایک بات اور بھی کہا کرتے تھے اور وہ یہ کہ بہترین تعلیمی نتائج کے لیے صرف شاگردوں ہی نہیں استادوں کو بھی محنت کرنا پڑتی ہے اور محنت کا شوق اندر سے پھوٹتا ہے۔

فاروقی صاحب سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا اور اسی آموختگی کی بنیاد پر اس نے اپنے ان رفقاء کار کو بھی جنہیں ابتدا میں ست رو پایا تھا بالآخر ایک مضبوط ٹیم کا حصہ بنالیا تھا۔ سب چل پڑے تھے۔ بعض شوق سے بعض ترغیب دلانے پر اور بعض..... بہر حال اب سبھی چل رہے تھے اور شاید اب سبھی شوق سے!

اس کا روان شوق میں طلبہ بھی یکساں طور پر ہم رکاب تھے تبدیلی اندر سے آئی تھی شور مچاتی ہوئی غیر منضبط جماعتیں اب انتہائی منضبط دکھائی دیتیں پیچرز کی عدم موجودگی میں مانیٹرز کلاسوں کی نگرانی کرتے۔ باقاعدہ رائے شماری کے ذریعے منتخب ہونے والے مانیٹرز اور ان کے معاون ڈپٹی مانیٹرز اپنی اپنی جماعت کے نظم و ضبط صفائی ستھرائی اور مختلف معاملات و مسائل میں اپنی نگرانی جماعت استانی کی پوری پوری معاونت کرتے۔ ہر فریق کے لیے دو گارڈز بھی مقرر کئے گئے تھے جو صبح دعا کے وقت وقفے کے دوران اور کھیل کے پیریڈز کے دوران باری باری جماعت کی نگرانی کرتے اسکول میں گرلز گائیڈ اسکاؤٹس ریڈ کریسنٹ کے دستے بھی بڑے ذوق شوق سے کام کرنے لگے تھے۔ ان دستوں میں شامل بچے اور بچیاں اپنی اپنی مخصوص وردیوں پر بڑا فخر محسوس کرتے اور دوسرے بچے انہیں رشک سے دیکھتے۔ ان دو تنظیموں کے علاوہ ادارے میں ”فرینڈز“ کے نام سے بھی ایک تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس تنظیم میں شامل ہر کارکن طالب علم ادارے کے تمام بچوں کا دوست سمجھا جاتا۔ ننھے مگر انتہائی مستعد اور فعال رضا کاروں کی یہ تنظیم گویا سوسل ورکرز کا گروپ تھی یہ ننھے رضا کار اپنی دو نگرانی اساتذات کی رہنمائی میں اپنے باقی تمام ہم مکتبوں کی بہبود کے لیے کام کرتے۔ صبح دعا کے وقت اس تنظیم کے ارکان گرلز گائیڈ اسکاؤٹس ریڈ کریسنٹ کے دستوں کے پہلو پہلو اپنی اجلی سفید وردیوں میں ملبوس کھڑے دکھائی دیتے۔ کسی طالب علم کو فیس کی ادائیگی میں دشواری ہوئی، کتابیں کاپیاں خریدنے کو پیسے نہ ہوتے، یونیفارم کی حالت خستہ ہوتی، نئے جوتے درکار ہوتے، سردیوں میں سویٹر خریدنا مشکل ہوتا، اسکول میں بھاگتے دوڑتے چوٹ لگ جاتی یا کسی گھریلو مسئلے کی بنا پر پڑھائی متاثر ہو رہی ہوتی ”فرینڈز“ کی خدمات حاضر تھیں۔ اس تنظیم نے اسکول میں ”آپ کا بینک“ کے نام سے ایک بہبودی بینک قائم کر لیا تھا جہاں بہتر معاشی حالات کے حامل گھرانوں کے بچے اپنی استعمال شدہ کتابیں، پنسل، بکس، جیومیٹری بکس، قلم، چھوٹے ہو جانے والے جوتے، سویٹرز اور یونیفارم جمع کرا جاتے جو ضرورت مند طلبہ میں ان کی عزت نفس مجروح ہوئے بغیر بہت محبت سے تقسیم کر دیے جاتے۔ بعض مختیر گھرانوں کے بچے اس بینک کے لیے نئی اشیا بھی فراہم کر دیتے۔ نقد رقم کا حصول اس بینک میں ممنوع تھا۔ باقی اشیا کی وصولی اور تقسیم کے لیے باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا، لکھل عرصے میں یہ تنظیم اسکول میں خاصی مقبول ہو گئی تھی۔ ”فرینڈز“ گویا پورے اسکول کے دوست تھے!

☆☆☆

”سمجھ میں نہیں آتا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔“ می کے لہجے میں تشویش تھی۔  
 ”کس اونٹ کی بات کر رہی ہیں والدہ؟“ ملتھانے جانتے بوجھتے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔  
 ”ارے وہی، جو تم نے خواہ مخواہ کی بچ لگا دی۔“ می نے ناگواری سے کہا۔

”ہیں! یہ ادنٹ کے ساتھ بچ کا ذکر کب سے آنے لگا؟“ منتہا زریب مسکرائی، ”میں نے اسے گھورا۔“  
 ”خیریت تو ہے والدہ!“ اس نے اپنا بازو می کے شانوں پر دراز کر دیا تھا۔ ”میں نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔“  
 ”آرام سے نمٹ گئی ہوتی میں..... تم نے شاید یہ سمجھا تھا کہ رشتے درختوں پر لگے ہیں، جائیں گے اور میہ کے لیے توڑ لائیں گے، چھ مہینے ہونے کو آئے کتنوں سے کہہ دیکھا اب تک تو کوئی ایسا نظر نہیں آیا کہ میہ سے بات کئے جانے کے قابل ہوتا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“

”ارے کیسے فکر نہ کروں!“ میں نے اس کا ہاتھ بُری طرح جھٹک دیا۔ ”میں دن رات فکر میں کھلی جا رہی ہوں اور تم کہتی ہو فکر نہ کروں۔ شریف لوگ ہیں جو اب تک خاموش بیٹھے ہیں ورنہ کب کے منگنی توڑ چکے ہوتے، کب تک انتظار کریں گے وہ ایک نہ ایک دن پھٹ پڑیں گے۔ تمہاری آنکھوں پر تو ہے بے خبری کی پٹی، چند دن کی بہار اور ہے پھر نہ چہرے پر یہ رونق رہے گی نہ بالوں کی سیاہی۔“ میں نے لمبے لمبے غصے میں غصہ بھی تھا، رقت آمیزی بھی۔  
 ”ثروت می کے استری شدہ کپڑے لیے کمرے میں در آئی۔ ایک لمحے کو تنگی پھر کپڑوں کی الماری کی طرف جانے کے بجائے می اور منتہا کی طرف بڑھ گئی۔“

”کیا ہوا باجی؟“

”می کو اس کی یہ بے وقت مداخلت نہ بھائی مگر وہ پیچھے نہ ہٹی۔ ماں کی تربیت یہی تھی کہ سرال والوں کے درمیان بیٹھنے کے لیے اسے خود جگہ بنانی ہوگی۔“

”میں نے آپ کے کپڑے استری کر دیئے ہیں می۔“ ثروت نے کہا۔

”الماری میں رکھ دو۔“ میں نے لمبے لمبے سر دھری تھی۔

اتنا تو وہ خود بھی جانتی تھی کہ کپڑے الماری ہی میں رکھے جانے تھے۔ کپڑے الماری میں رکھ کر وہ پھر ان دونوں کی جانب آگئی اور می کے نزدیک بیٹھ گئی۔ ”می کو خفقان سا ہونے لگا، بعض باتیں نہیں بھی تو بتائی جاتیں مگر بہو عجیب و غریب تھی دھرتا دے کر بیٹھ جاتی جیسے اس وقت بیٹھ گئی تھی۔“

”می ناراض ہیں۔“ منتہا سے زیادہ دیر برداشت نہ ہو سکا۔

”کس سے؟“ وہ چونکی۔

”مجھ سے۔“

”کیوں؟“

”اسی بات پر جو میں نے تمہیں بتائی تھی۔“

”میں نے بے ساختہ چونک کر منتہا کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں نے منتہا سے کہا۔“

”تو کیا تم نے اسے بھی بتا دیا!“

”جی والدہ..... ثروت سے اب کیا چھپانا۔“ منتہا نے کہا۔

”بہت خوب!“ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں می۔“ ثروت نے اپنا ہاتھ می کے شانے پر دھرتے ہوئے کہا، ”امی کی ایک دوست ہیں جو رشتے کرائی ہیں، میں نے امی سے کہا ہے ان سے میہ باجی کے لیے کوئی رشتہ دیکھنے کو کہیں۔“

”می کو حیرانی نے آلیا۔ ثروت کی باتیں اور اس کا رویہ اکثر انہیں اسی طرح متعجب کر دیا کرتا تھا۔“

”اللہ میاں ضرور کوئی اچھا سا راستہ نکالیں گے۔“ اس نے می کو تسلی دی۔

”مجھے میہ سے زیادہ اس کی فکر ہے۔“ میں نے منتہا کو ایک نظر دیکھا۔



”اللہ میاں اپنے بندوں سے ان کی ماؤں سے ستر گنا زیادہ محبت رکھتے ہیں۔“ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ماں کی تربیت یا بی ثروت نے محل سے کہا۔  
 ”مگر گھر آئی نعمت سے منہ موڑ لینا اللہ میاں کو کب پسند ہے۔“ ممی بولیں۔  
 ”اللہ پاک نیتوں کو دیکھتے ہیں، باجی نے ایسا کیا ہے انہیں اجر ضرور ملے گا۔“  
 ثروت کی بات ممی کے دل کو لگی۔  
 ☆☆☆

آپ بھی میری طرح ایسے حسن میں اضافہ کیجئے۔

یہ دین کے لئے ہے اور جنت کے لئے ہے جو دین کے لئے ہے  
 اور جنت کے لئے ہے۔ اور جنت کے لئے ہے۔ اور جنت کے لئے ہے۔  
 مال کے لئے ہے۔ اور جنت کے لئے ہے۔ اور جنت کے لئے ہے۔

## اسٹاکسٹ:

- |    |   |    |  |
|----|---|----|--|
| ۱  | طیوح استور سر کرگوات                    | ۱  | قادر شاہ بیگزلی ازاد گاہ                 |
| ۲  | طیوح استور اقبال، راجپوتی چکر راہ پٹنڈی | ۲  | طیوح استور ہرمڑاں                        |
| ۳  | لطیف بیست ہالو چکر راہ پٹنڈی            | ۳  | انگڑےسہ طوہ استور سدہ والا               |
| ۴  | ہجڑا دانگنٹن ازاد گاہ                   | ۴  | راجہ برادر دھیل ازاد گاہ گوت             |
| ۵  | میاں طوہ استور گلا چکر ساہوال           | ۵  | اکتین جزل استور بھلی ازاد گاہ چکر سرگرم  |
| ۶  | لعل جزل استور بھلی، راجہ، راجہ گوت      | ۶  | طیوح بیگم تلپوہ چکر گت سنڈا دھیل ازاد    |
| ۷  | دین جٹ استور گتو گڑا راجہ، گاڑی خان     | ۷  | شاہی شہزاد جٹ ازاد گاہ                   |
| ۸  | ٹالہ دانگنٹن راجپوت گت شاہ ازاد گاہ     | ۸  | جلاپ جزل استور بھلی ازاد گاہ             |
| ۹  | رحمان جٹ سنڈا راجہ چکر ازاد گاہ         | ۹  | قادر شاہ جزل استور سدہ گت سنڈا دھیل ازاد |
| ۱۰ | میرا جٹ، جٹ ازاد گاہ                    | ۱۰ | چرن طوہ استور، ازاد گاہ گاہ              |

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لئے

حکیم اینڈ سنز۔ یوسٹ بکس 2159، کراچی۔ 74600 پاکستان۔

غلط ہو ہر فریق کا نتیجہ غلطی سے مبرا رکھے کے لیے مرتب شدہ نتائج بھی دوبارہ چیک کئے جاتے۔ گوسفارشیوں کا تانا  
نتیجے کے اعلان کے بعد بھی بندھا رہتا مگر منتہا کا بھی کو ایک جواب ہوتا ”ہم نے پوری احتیاط اور ذمے داری سے کام  
کیا ہے۔“

”میڈم! آپ مہربانی فرمائیں۔“ نفل شدہ بچوں کو پاس کر دینے کے خواہش مند گڑگڑاتے رہتے۔  
”سوری..... امتحان کے نتیجے کو حتمی ہونا چاہیے جو نتیجہ تبدیل کر دیا جائے وہ پھر نتیجہ تو نہ ہوا مذاق ہو گیا۔“  
سالانہ امتحان کے نتیجے کے بعد بیس پچیس دن بھی غفلت رہتا۔ پھر بدتر توجہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔  
منتہا کی میز پر رپورٹ کارڈز کے ڈھیر لگے ہوئے تھے وہ ہر رپورٹ کارڈ میں نتیجے پر نظر ڈال کر دستخط کرنے کے  
ساتھ ضروری ریمارکس بھی لکھے جا رہی تھی دفعتاً نوٹ کی گھنٹی بجی اس نے کال ریسیو کی۔  
”ہیلو۔“

”میڈم میں ڈائریکٹریٹ سے بول رہا ہوں، ہولڈ کیجئے گا ڈائریکٹر صاحب آپ سے بات کریں گے۔“  
”یقیناً کسی کی سفارش۔“ منتہا نے سوچا۔

دروازے سے غزالہ ناصر کمرے میں داخل ہوئیں۔  
”ہیلو!“ ایک بار عرب مردانہ آواز منتہا کی سماعت سے ٹکرائی۔  
”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام میڈم اینڈ کانگریگیشنز..... پرائمری وظیفہ امتحان میں پہلی تین پوزیشنیں آپ کے اسکول کے بچوں  
نے لے کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ڈائریکٹریٹ کی جانب سے آپ سب کو اور پوزیشنیں حاصل کرنے والے طلبہ  
کو ایک توصیفی مراسلہ بھجوا دیا جا رہا ہے۔“

”تھینک یو..... تھینک یو دیری میچ سر!“ شدت جذبات سے منتہا کی آنکھوں میں ہلکی سی آبی رو اُٹھ آئی۔  
ریسیور واپس رکھنے کے بعد وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔  
”مبارک ہو غزالہ، وظیفہ امتحان میں تینوں پوزیشنز ہماری ہیں۔“  
”رٹیل!“ غزالہ دم بھر میں حیرت و مسرت کا پیکر بن گئیں۔

منتہا رفقائے کار کو یہ خوشخبری خود سننے کے لیے تیزی سے کمرے کے دروازے سے باہر نکلی۔

مارچ کے آخری دن تھے لان لہلہا رہا تھا اور اس سے کہیں زیادہ منتہا کا دل!  
پھر تو مبارک باد کے پیغامات کی لائن لگ گئی، ڈائریکٹریٹ کے افسران، ہم عصر ریسرچ، مدراس، طلبہ کے والدین،  
منتہا کے اپنے دوستوں اور اقربا کی جانب سے!

فاروقی صاحب مبارکباد دینے کے لیے خود چل کر آئے۔

فضہ تازہ پھولوں کا گلدستہ اور اسٹاف کے لیے پانچ پونڈ کا ایک لے کر آئی۔  
اپریل کی دو تاریخ کو اسے نعیم کی ٹیلی فون کال موصول ہوئی تو اس نے کہا۔  
”بہت مبارک میڈم پرپل آپ نے تو تینوں پوزیشنوں پر قبضہ کر لیا۔“  
”آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ چونکی۔

”آج ہی پاکستان سے آنے والے اخبار میں خبر پڑھی ہے۔“

منتہا کو یوں لگا جیسے نعیم کی مبارکباد نے اس کی خوشی دو چند کر دی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ پیشہ معلمی اس  
کی ذاتی زندگی سے کبھی یوں تھی ہو جائے گا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناپید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناپید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

**محبتوں سے گندھے اور لہجوں سے بندھے رشتوں کا چاک مسار ہونے کی دل گداز داستان**

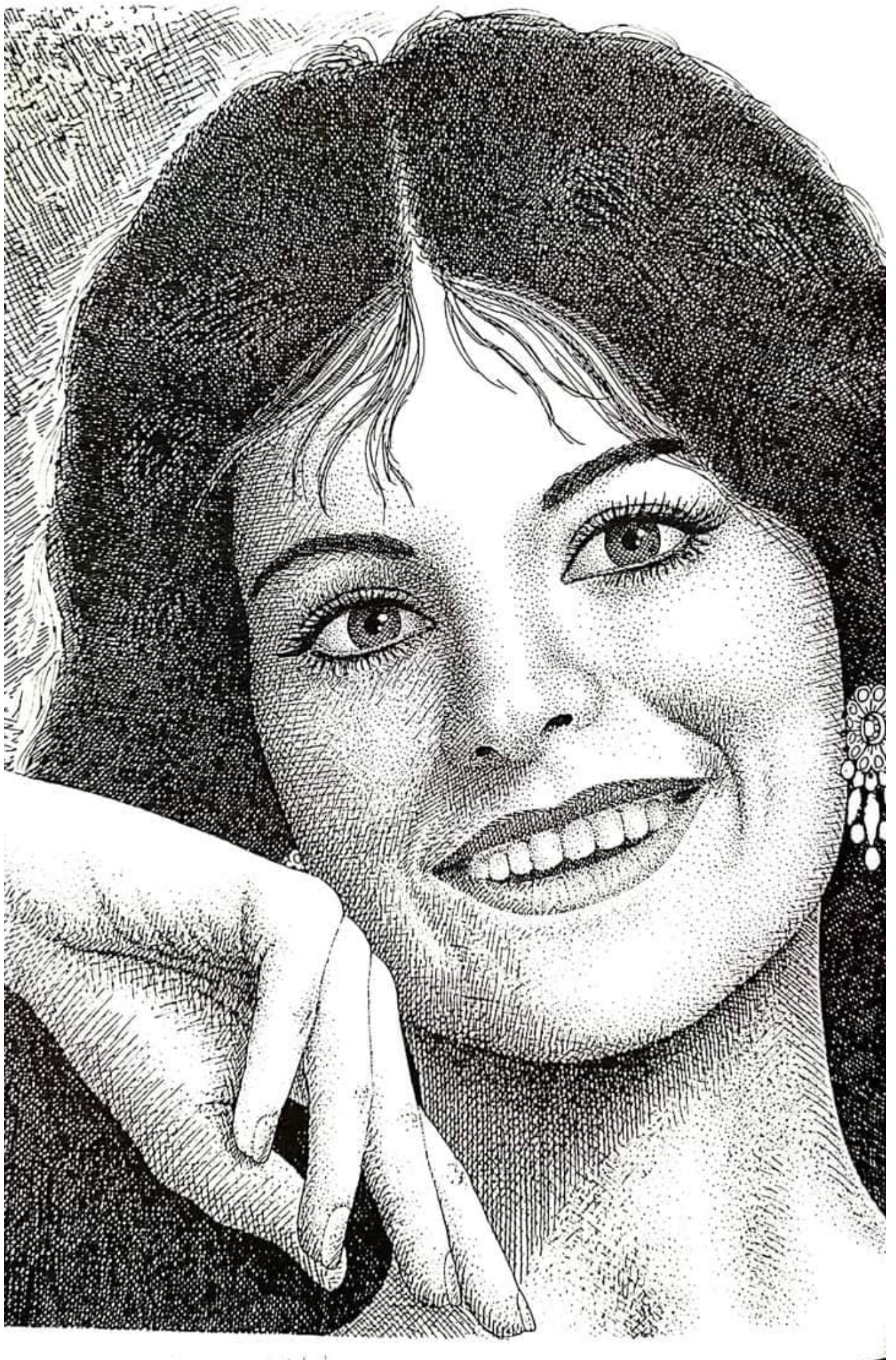
منتہا

ناپید سلطانہ اختر

قسط نمبر 24









پرائمری وظیفہ امتحان میں ادارے کی اس شاندار کامیابی پر ڈائریکٹر ایٹ کی جانب سے تعریفی خط موصول ہوا۔  
محترمہ منجہا احمد صاحبہ۔ السلام علیکم!

امسال پرائمری وظیفہ امتحان میں آپ کے ادارے کی غیر معمولی اور قابل تقلید کامیابی پر نظامت ہذا آپ کو، آپ کے ادارے کی تمام اساتذات، طلبہ اور ان کے والدین کو مبارکباد کا پیغام ارسال کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ آپ کا ادارہ آئندہ بھی اس اعزاز کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے گا۔ یہ غیر معمولی کامیابی بلاشبہ ایک مضبوط ٹیم ورک کا نتیجہ ہے جس کا سہرا سربراہ ادارہ کو جاتا ہے۔ دلی مبارکباد!

ڈائریکٹر نظامت تعلیمات

مراسلے کے اختتام پر ڈائریکٹر صاحب کے دستخط ثبت تھے۔

منجہا نے ڈائریکٹر ایٹ کی جانب سے موصولہ یہ پیغام اسبلی میں طلبہ کو پڑھ کر سنایا اور بعد ازاں یہ مراسلہ فردا فردا ہر ٹیچر کے پاس بھیجوا کر ہر ایک کے دستخط بھی لے لیے۔ ایسا کرنا ضروری تھا۔ تعریف کے دو بول انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ فاروقی صاحب کی جانب سے اس کی حوصلہ افزائی ہی تو تھی جس نے اسے سرک سرک کر آگے بڑھنے کے بجائے ایک ہی جست میں اپنے ہم عصروں سے آگے لاکھڑا کیا تھا۔ سابقہ اسکول میں اس کی اٹھانوے فیصد سینئر ساتھیوں بھی ہنوز ٹیچر ہی تھیں۔ فاروقی صاحب اسے ترغیب نہ دلاتے، اصرار کر کے پبلک سروس کمیشن کو درخواست ارسال نہ کر داتے، حوصلہ افزائی نہ کرتے تو شاید وہ بھی اب تک ٹیچر ہی ہوتی۔

ڈائریکٹر صاحب کے تعریفی مراسلے نے ٹیچرز کے دلوں میں ایک نئی جوت جگادی۔

”انشاء اللہ تعالیٰ میڈم ہمارا یہ اعزاز آئندہ بھی برقرار رہے گا۔“ بچوں سے امتیازی نتائج کا مظاہرہ کر دانے والی ٹیچرز نے کہا۔

”میڈم یہ سب آپ کی بدولت ہوا ہے۔“ مسز اشفاق بولیں۔

”نہیں نہیں مسز اشفاق، یہ آپ لوگوں کی محنت اور بچوں کی لگن ہے۔ میں تو خوش ہو کر تالیاں بجانے والوں میں ہوں۔“ منجہا نے انتہائی انکساری سے کہا۔

”میڈم جی ہم لوگ تو پہلے بھی تھے مگر کوئی اس طرح راہ دکھانے اور حوصلہ افزائی کرنے والا نہ تھا۔“ غزالہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”بے شک!“ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کی کلاس ٹیچر نے تائید کی ”یہی اسکول تھا، یہی ٹیچرز اور کم و بیش ایسے ہی بچے مگر پہلے کبھی اس اسکول کو ایسی کامیابی نہیں ملی۔“

”میڈم ہمارا تو سراونچا کر دیا ہے آپ نے۔ سٹی جونیئر اسکول والے بہت اترا یا کرتے تھے کہ وظیفہ امتحان میں پوزیشنز بس ابھی کے بچے لے سکتے ہیں۔ اب ہم بھی اترا آئیں گے۔“ مس نگہت چمکیں۔

”عاجزی مس نگہت۔“ منجہا نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے مس نگہت کو دیکھا ”ہم انکساری کا مظاہرہ کریں گے۔ یہ سب تو چھوٹی چھوٹی، وقتی اور عارضی کامیابیاں ہیں مس نگہت۔ بڑی کامیابی تو کہیں دور ہے۔“

”میڈم اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔ پہلی تینوں پوزیشنز ہماری۔“

منجہا کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ میں متحمل بردباری کا رنگ غالب آ گیا۔

”بڑی کامیابی یہ ہے مس نگہت کے آدمی اپنے رب کے سامنے جھٹکا اور جھٹکا ہی چلا جائے۔“

”یس میڈم۔“ مس نگہت یوں خفیف ہو گئیں جیسے کسی کو اپنی ناش غلطی کا احساس ہو جائے۔

”میڈم جی ہم سب اس خوشی میں کپکپ کر جانا چاہتے ہیں۔“ غزالہ اس قسم کی فرمائشوں کی ماہر سمجھی جاتی تھیں۔

”غزالہ نیا سیشن شروع ہوا ہے فی الحال تو کپکپ کر جانا ممکن نہیں۔“ منجہا نے کہا۔

”اچھا تو ایک زبردست سی پارٹی ہو جائے۔“  
”مگر ٹی پارٹی نہیں۔“ کسی نے کہا۔  
”لنچ۔“ تجویز آئی۔

”میڈم کی طرف سے۔“ تقاضا کیا گیا۔  
”ضرور۔“ منتہا نے خوش دلی سے کہا۔  
”ریٹلی میڈم۔“  
”ہاں ہاں۔“

”اوہ تھینک یو میڈم۔“  
”لنچ میڈم کی طرف سے۔“ مس انشاں نے اعلان کیا۔  
تالیاں بھیں۔  
”کب؟“ کسی نے پوچھا۔  
”کب میڈم؟“

”جب آپ چاہیں بس کلاسیں متاثر نہ ہوں۔“  
”سٹرڈے کو چھٹی کے بعد رکھ لیں میڈم؟“ غزالہ نے پوچھا۔  
”جیسے آپ کی مرضی، مگر بندوبست آپ ہی کو کرنا ہو گا غزالہ۔“  
”نوپرا بلیم میڈم۔“ غزالہ مسکرائیں۔  
”ٹھیک ہے۔“ منتہا نے گویا حتمی منظوری دی۔

”میڈم اچھا موقع ہے، ڈائریکٹر صاحب کو بھی انوائٹ کر لیں۔“ مسز اشفاق بولیں۔  
”ہر گز نہیں۔“ سب سے پہلے مس نگہت نے مسز اشفاق کی تجویز رد کی۔  
”بادب، بالما حظہ، ہوشیار رہنا پڑے گا ہمیں۔ ٹھیک سے کھاپی بھی نہیں سکیں گے ہم لوگ۔“  
”بالکل۔“

مسز اشفاق اس شد و مد سے اپنی مخالفت پر خفیف سی ہو گئیں۔  
”میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ڈائریکٹر صاحب نے تعریفی خط بھیجا ہے تو اس بہانے ان کا شکریہ بھی ادا ہو جائے گا۔“ مسز اشفاق نے کہا۔

”صرف ڈائریکٹر صاحب ہی کا کیوں، مسز اشفاق ڈائریکٹر صاحب نے کوئی ذاتی حیثیت میں تو تعریفی خط بھیجا نہیں ہے پورے ڈائریکٹریٹ کی نمائندگی کی ہے۔ پھر تو پورے ڈائریکٹریٹ کو انوائٹ کرنا چاہیے ہمیں۔“  
”بات تو ٹھیک ہے۔“

”آپ لوگوں کی مرضی۔“ مسز اشفاق بولیں۔  
”دیے میڈم ہماری طرف سے مٹھائی تو ضرور جانی چاہیے ڈائریکٹریٹ۔“ کسی نے تجویز دی۔  
”جی میڈم مٹھائی بھجوا دیں۔“

”ایر سیلشن لیٹر کے جواب میں ایک تھینک یو کارڈ کے ساتھ۔“  
”بلکہ میڈم آپ خود جائیں ڈائریکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔“  
”چلے جائیں گے۔“ منتہا نے بڑے فیاضانہ انداز میں کہا۔  
”بس میڈم یہ کام تو آپ کل ہی کر ڈالیں۔ ذرا ہماری اور واہ واہ ہو۔“



”سٹی اسکول والوں کو پتا چلے گا کہ میڈم ڈائریکٹر صاحب کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے بنفس نفیس ڈائریکٹر بیٹ گئی ہیں تو وہ تو جل کر رہ جائیں گے۔ ادھر! بہت اکڑا کرتی تھیں، سٹی اسکول کی ٹیچرز اپنی پوزیشنز آنے پر۔“

بچوں کی امتیازی کامیابی پر تمام ٹیچرز بچوں کی طرح خوش تھیں اور یہ ملتہا کی خوشی کی بھی انتہا ہی تو تھی کہ وہ جو ذرا سی بات پر سربراہان ادارہ کے ڈائریکٹر بیٹ دوڑے جانے اور کورٹس بجالانے کو ریسا نہ مدارس کی توہین سمجھا کرتی تھی مٹھائی لے کر ڈائریکٹر بیٹ جانے پر آمادہ ہو گئی۔

☆☆☆

”آپ ڈپٹی صاحب کے کمرے میں تشریف رکھیں میڈم! ڈائریکٹر صاحب کے پاس اس وقت ایک وزیٹر ہیں، ان کے نکلنے ہی میں آپ کو اندر بھجواتا ہوں۔“ ڈائریکٹر صاحب کے پلائے نے بڑے ادب و احترام سے کہا۔

ملتہا اکیلی نہ تھی۔ مسز حسن کو اس نے ٹیچرز کی نمائندگی کے لیے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

ڈائریکٹر صاحب کے پلائے نے اپنے چہرے کو ہدایت کی کہ دونوں خواتین کو ڈپٹی صاحب کے کمرے تک پہنچا آئے۔

ڈپٹی صاحب اپنے کمرے میں تھے۔

”آئیے آئیے میڈم۔“ وہ ملتہا کو دیکھتے ہی تپاک سے بولے۔

”سر! پلائے صاحب نے بولا ہے ڈائریکٹر صاحب کے فارغ ہونے تک آپ میڈم کو اپنے کمرے میں بٹھائیں۔“

ہمراہ آنے والے چہرے نے کہا۔

”بسر و چشم میڈم..... تشریف رکھیے۔ آپ کے ادارے نے تو اس سال وظیفہ امتحان میں کمال کر دکھایا۔ سٹی اسکول کے لیے یہ ایک بڑا سیٹ بیک ہے۔ گزشتہ گیارہ برس سے پہلی تین پوزیشنز پر انہی کا قبضہ تھا۔ آپ کے ادارے کا آگے بڑھنا ایک خوش گوار تبدیلی ہے۔“

”تھینک یوسر..... یہ ہماری سینئر ٹیچرز ہیں مسز حسن۔“

ڈپٹی صاحب نے سر کی خفیف سی جنبش اور لبوں پر دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ مسز حسن کو دوش کیا جس کا انہوں نے بھی سر ہلا کر جواب دیا۔

”اداروں کی ترقی میں لیڈر شپ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کی لیڈر شپ نے ادارے کو بریک تھر دیا ہے۔“

ڈپٹی صاحب کام چھوڑ کر ہمہ تن ملتہا کی جانب متوجہ تھے۔

”سر! مجھے ٹیم بہت اچھی ملی ہے۔“ ملتہا کے لہجے میں انکساری تھی۔

”ٹیم کتنی ہی اچھی ہو میڈم جب تک لیڈر شپ اچھی نہ ہو بات نہیں بنتی۔ کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔ کیوں میڈم؟“

ڈپٹی صاحب نے مسز حسن سے تائید چاہی۔

”جی سر، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ مسز حسن نے تائید کی۔

”آپ سب کی ذرہ نوازی ہے۔“

”میں تو اس ڈائریکٹر بیٹ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہا کرتا ہوں کہ فیمیل پرنسپلز میں میڈم ملتہا نمبر ون ہیں۔ میری عادت ہے کہ میں لوگوں کے بارے میں کافی غور و خوض اور مشاہدے کے بعد کوئی رائے قائم کرتا ہوں اور جب ایک بار کوئی رائے قائم کر لیتا ہوں تو اس پر قائم بھی رہتا ہوں۔ مجھے جو لوگ اچھے نہیں لگتے، نہیں لگتے اور جو اچھے لگتے ہیں، وہ ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔“

”تھینک یوسر!“

”آپ لوگ چائے پیئیں گے یا.....؟“

”تھینک یوسر..... کچھ نہیں۔“  
 ”آپ مہمان ہیں ہماری۔“ ڈپٹی صاحب نے چپراسی کو طلب کرنے کے لیے کھنٹی بجائی۔  
 ”سر تکلف نہ کیجئے کچھ نہیں۔“ منہجہا نے پھر کہا۔

”تکلف تو آپ کر رہی ہیں میڈم۔“

چپراسی کمرے میں در آیا تھا۔

”رحمت! بھی ایسا کرو کولڈ ڈرنک لے آؤ۔“

”سر پلیز..... بس سادہ پانی پلوادیں۔“

”سادہ کیوں میڈم، ہم آپ کو ٹھنڈا اور میٹھا پانی پلوادیں گے۔“

منہجہا نے مسر حسن کی جانب دیکھا۔ وہ زیر لب معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

ڈائریکٹر صاحب کے ہاں سے تقریباً بیس منٹ بعد بلاوا آیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے، مٹھائی پیش کرنے اور چائے پینے میں بیس چکس منٹ لگے۔ ڈپٹی صاحب بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ مسر حسن کو وہ ڈپٹی صاحب کے کمرے میں ہی بیٹھا چھوڑ آئی تھی۔

”میڈم آپ کے اسکول نے واقعی بہت اچھا رزلٹ دکھایا ہے۔ ویل ڈن! کیپ اٹ اپ۔“ ڈائریکٹر صاحب نے بڑے رسمی سے لہجے میں کہا۔

”تھینک یوسر، انشاء اللہ ہم اپنے اس اعزاز کو نہ صرف برقرار رکھنے بلکہ اس میں اور اضافہ کرنے کی کوشش کریں گے۔“

ڈائریکٹر صاحب دھیرے سے ہنس دیے۔

”پہلی تین پوزیشنز لے تو لیں آپ نے، اب اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے میڈم۔“

”سرتین پوزیشنیں تین سے زیادہ بچے بھی تو لے سکتے ہیں۔“

ڈائریکٹر صاحب قائل سے دکھائی دینے لگے۔

”آپ کے ادارے کے بارے میں ہمیں وقتاً فوقتاً مختلف ذرائع سے فیڈ بیک ملتی رہتی ہے۔“

منہجہا کا جی چاہا ان سے پوچھتے کیا فیڈ بیک ملتی ہے انہیں مگر وہ مصلحتاً دل کی بات زبان پر نہ لائی کہ آج تو وہ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئی تھی۔

”لوگوں کو آپ سے شکایات بھی رہتی ہیں۔“ ڈائریکٹر صاحب نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

اب چپ رہنے کی جانہ تھی۔

”کس قسم کی شکایات سر؟“

”لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے میڈم۔“

”آئی ایم سوری سر، لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے چکر میں آدمی کبھی کبھی خود مشکل میں پڑ جاتا ہے۔“

”کم سے کم اتنا تو کیا جاسکتا ہے میڈم کہ لوگوں سے ان کے حسبِ مراتب سلوک کیا جائے۔“ ڈائریکٹر صاحب کے لہجے میں سختی تھی۔

منہجہا کو ان کی تنگ دلی پر تاسف ہوا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ڈائریکٹر صاحب اس موقع پر پرانا حساب بے باق کرنے کی کوشش کریں گے۔

”مگر سر مذہب و اخلاق کے تمام ضابطے تو ہمیں مسادات اور رواداری کا سبق سکھاتے ہیں۔“ منہجہا نے بڑی بے خوفی سے کہا۔



ڈائریکٹر صاحب چونکے اور سیدھے ہو بیٹھے۔

”وہاٹ ڈو یو مین؟“ ڈائریکٹر صاحب کی تیوری پر بل تھے۔

”سر! میڈم غالباً یہ کہنا چاہتی تھیں.....“ ڈپٹی صاحب نے ملتہا کو کمک پہنچانے کی کوشش کی مگر ڈائریکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

”سر! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک غریب آدمی کوئی بات کہے تو ہم اسے دھتکار دیں اور وہی بات ایک خوش پوش، خوش حال، بااثر آدمی کہے تو ہم اسے سر آنکھوں پر جگہ دیں۔ معاشرے میں فرسٹریشن یونہی تو پھیلتی ہے۔“

ڈائریکٹر صاحب نے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولے۔

”میڈم مجھے اس وقت ایک میننگ میں شرکت کے لیے اٹھنا ہے ورنہ شاید آپ سے تفصیلی بات ہوتی۔ مٹھائی کی ضرورت نہیں تھی بہر حال آپ لے آئی ہیں تو شکریہ۔“

”تھینک یو دیری میچ سر۔“

ڈپٹی صاحب اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ملتہا کی جانب دیکھتے ہوئے بولے ”آئیے میڈم۔“

ملتہا کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سر آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا شکریہ۔“ ملتہا نے کہا۔

ڈائریکٹر صاحب اپنا دایاں ہاتھ پیشانی تک لے گئے۔ ان کے انداز میں خاصی سرد مہری تھی۔ ملتہا کو خفت سی محسوس ہوئی۔

ڈائریکٹر صاحب کے کمرے سے باہر آنے کے بعد ڈپٹی صاحب آہستگی سے بولے ”میڈم افسران کے سامنے کبھی کبھی چپ رہنے میں بھی عافیت ہوتی ہے۔“

ملتہا ٹھنک گئی۔ اس نے گردن گھما کر ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا اور بولی ”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی سر۔“

ڈپٹی صاحب دھیرے سے مسکرا دیئے۔ ”آپ کی مشکل یہی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں سر۔“

”آپ کی مشکل یہی ہے کہ آپ غلط بات نہیں کہتیں۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

ملتہا کوتلی ہوئی۔

غنیمت ہوا کہ مسز حسن کو وہ ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں نہیں لے گئی تھی ورنہ ان کے سامنے آج کتنی سکی ہوئی

ہوتی۔

ڈائریکٹر صاحب سے اسکول واپس لوٹتے ہوئے مسز حسن نے راستے میں اس سے کہا ”میڈم! ویسے ڈپٹی صاحب بے

چارے ہیں قابل رحم آدمی۔“

”کیوں؟“ ملتہا نے چونک کر پوچھا۔

”اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے۔“ مسز حسن بولیں۔

”کیا ہوا ان کے گھریلو حالات کو مسز حسن؟“

”آپ نہیں جانتیں!“ مسز حسن نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”جی نہیں۔“

”حیرت ہے! سب جانتے ہیں آپ نہیں جانتیں۔“

”کیا مسز حسن؟“

”ان کی سسر ڈیڑھ دو سال سے کوما میں ہیں۔“

”ریٹلی!“

”جی..... دماغ پر فالج پڑا پھر ہوش ہی میں نہیں آئیں۔ سنا ہے ڈپٹی صاحب بے چارے ہر شام ڈیڑھ دو گھنٹے اسپتال میں جا کر ان کے پاس بیٹھتے ہیں۔“

”مجھے آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا مسز حسن۔“

”حیرت ہے میڈم۔“ مسز حسن کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

☆☆☆

مُنا باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں اور معصومانہ حرکتیں دن بھر گھر میں ہلچل مچائے رکھتیں۔ اسے محفوظ مامون رکھنے کے لیے ظہیر صاحب اور مسز ظہیر کو دن بھر اس کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا۔ شام کو بیٹے میں ایک دو مرتبہ بیہوشی کے ہاں یا عدنان کہیں باہر گھمانے پھرانے لے جاتا۔ گھر بھر کی آنکھ کا تار بنا ہوا تھا وہ۔ بیہوش یا عدنان اسے باہر لے جاتے اور زرا دیر ہو جاتی تو ظہیر صاحب بولائے بولائے پھر لے لگتے۔

”ارے بھئی آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں آجائیں گے۔“ مسز ظہیر انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتیں۔

”ہزار دفعہ کہا ہے بچہ ساتھ ہو تو زیادہ دیر نہ کیا کرو۔“ ظہیر صاحب غصے سے کہتے۔

”کوئی سنے آپ کی بات تو کہے جیسے دیو کی جان طوطے میں تھی ویسے ہی ان بڑے میاں کی جان پوتے میں ہے۔“ ایک روز مسز ظہیر نے کہا۔

”کیا! کیا!“ ظہیر صاحب نے ان پر آنکھیں نکالیں۔ ”دیو کہہ رہی ہو مجھے!“

”جی نہیں“ مسز ظہیر دھیرے سے مسکرائیں۔ ”بڑے میاں۔“

”بڑے میاں ہوں گے میرے دشمن۔“

مسز ظہیر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”ہم آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مُنا کسی غیر کے ساتھ تو گیا نہیں ہے جو آپ اتنا پریشان ہو رہے ہیں۔ ماں کے ساتھ ہے، ماں سے زیادہ کون خیال کر سکتا ہے اس کا۔“

”ہم..... اور کون! ہم..... ہم سے زیادہ خیال نہیں رکھ سکتیں بہو صاحب مٹھے کا۔“

”چلئے مان لیا۔“ مسز ظہیر نے بحث میں الجھنے سے گریز کیا۔ ”پھر بھی ماں ہونے کے ناتے بیہوش کا اتنا تو حق ہے تاکہ وہ بچے کو جہاں چاہیں لے جائیں اور جتنی دیر چاہیں اسے ساتھ رکھیں۔“

”غلط طرف داری مت کرو تم بہو صاحب کی۔“ ظہیر صاحب بھبک کر بولے۔

”ہم طرف داری نہیں کر رہے حق بات کہہ رہے ہیں۔“

”حق بات یہ بھی تو ہے کہ منا ہماری اولاد کی اولاد ہے۔ ہم اسے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں۔“

”بے شک! مگر ذرا یہ بھی سوچئے کہ فرحان کے بعد بیہوش اگر منے کو لے کر اپنے میکے جانے کا فیصلہ کر لیں تو ہم کیا کر سکتے تھے، اور اگر اب بھی وہ ایسا کوئی فیصلہ کر لیں تو کیا ہم انہیں روک سکتے ہیں۔“

”مُنا کہیں نہیں جائے گا..... بہو صاحب اسے نہیں لے جا سکتیں۔“

”مذہب، قانون، اخلاق سب بیہوش کی اجازت دیتے ہیں۔“ مسز ظہیر بولیں۔

”ظہیر صاحب جزبہ دکھائی دینے لگے۔“

”میری..... میری لاش پر سے گزر کر جانا ہو گا انہیں۔“ ظہیر صاحب شدت جذبات سے کانپنے لگے۔

”آرام سے..... آرام سے ظہیر صاحب۔“ مسز ظہیر نے ان کے جذبات کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔

”غصہ دلا دیتی ہو تم۔“ ظہیر صاحب نے اپنی دائیں انگشت شہادت تنبیہی انداز میں کھڑی کرتے ہوئے کہا۔



”سوری!“

ظہیر صاحب نے دونوں کہنیاں اپنے رانوں پر ٹکائیں اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر ٹھوڑی تار خسار اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر گہرے مراقبے میں چلے گئے۔

مسز ظہیر کچھ دیر کن انکھوں سے دیکھتی رہیں پھر بولیں ”اب کیا سوچنے بیٹھ گئے۔“

ظہیر صاحب نے انھیں دیکھا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوئے ”سوچ رہا ہوں کیا کیا جائے جو بہو صاحب مئے کو کبھی ہم سے دور لے جانے کا نہ سوچ پائیں۔“

”یہ بھی سوچئے کہ وہ آخر بیٹھی بھی کب تک رہیں گی۔“

”کیا مطلب!“ ظہیر صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ مسز ظہیر نے نظریں چرائیں۔

”چپ کیوں ہو! جواب کیوں نہیں دیتیں!“ ظہیر صاحب کے لہجے میں بے تابی تھی۔

”آج نہیں کل ان کے گھر والے دوبارہ ان کا گھر سامنے کی ضرور سوچیں گے۔“

”منا کہیں نہیں جائے گا۔“

”ناخنوں سے گوشت کبھی جدا ہوا ہے بھلا۔“

”میں نے کہہ جو دیا۔“

”ہمیں حقیقت پسندی سے کام لینا ہو گا ظہیر صاحب۔“ مسز ظہیر نے دھیمے لہجے میں کہا ”بیہ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔ اس عمر میں تو بہت سی لڑکیاں مناسب رشتے کے انتظار میں اپنے ماں باپ کے گھر ہی بیٹھی ہوئی ہیں، یہ تو قسمت کی بات ہے کہ بڑی بہن بیٹھی رہ گئی اور بیہ ہمارے بیٹے کی دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئیں۔ میں نے سنا ہے کہ منہا کی شادی میں دیر بھی اسی لیے ہو رہی ہے۔“ مسز ظہیر کوشش کے باوجود اس بات کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکیں۔

”کس لیے؟“

”کہ پہلے بیہ کا گھر دوبارہ آباد کر دیا جائے۔“

ظہیر صاحب نے بلبلا کر مسز ظہیر کی جانب دیکھا۔ ”تم سے کس نے کہا؟“

”بس اڑتی اڑتی سن ہی لی ہم نے۔“ مسز ظہیر نے مصلحتاً لیل کا حوالہ دینے سے گریز کیا۔

”منا ہمارے ہی پاس رہے گا۔“ ظہیر صاحب کی آنکھوں میں سرخی امنڈ آئی۔

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ خدا خیریت رکھے انشاء اللہ بس دو ڈھائی ماہ بعد بیلا کا بچہ آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔ اور اب تو لیلیٰ بھی ذہیم کے پاس جانے والی ہیں پھر انشاء اللہ ادھر سے بھی کوئی خبر سن لیجئے گا۔“

”ہاں۔“ ظہیر صاحب نے اپنا سر اثبات میں ہلایا پھر رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ ”لیکن منامیرے فرحان کی نشانی اس کی یادگار ہے۔ مئے کی جگہ کوئی بھی بچہ نہیں لے سکے گا۔“

ظہیر صاحب نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور گھٹ گھٹ کر رونے لگے۔ مسز ظہیر کا دل کٹنے لگا۔

☆☆☆

اگست کا مہینہ تھا۔ موسم گرما کی تقریباً ڈھائی ماہ کی تعطیلات کے بعد اسکول دوبارہ کھل چکے تھے، اسکول کھلتے ہی میقات اول کے امتحان شروع ہو گئے تھے۔ امتحانات کا سلسلہ ماہ اگست کے اختتام تک جاری رہنا تھا۔ انہی دنوں اسکول کے سالانہ بجٹ کی تیاری بھی چل رہی تھی۔ خاصا توجہ طلب کام تھا۔ اعداد و شمار کی ذرا سی غلطی سارا کام بگاڑ دیتی۔ عام طور پر کلرک صاحبان یہ کام کرتے۔ سربراہان ادارہ بجٹ کی تیاری سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ بسا اوقات تو انہیں بجٹ کی الف ب بھی پتا نہ ہوتی۔ کلرک حضرات جو لکھ لکھا کر سامنے رکھ دیتے تو دستخط مع مہر ثبت کر دیے جاتے اور بس۔ بلکہ بعض ریسمان مدارس تو دستخط بھی کلرک صاحبان سے یہ پوچھ کر کرتے کہ کہاں کرنے ہیں۔ بالخصوص خواتین سربراہان

مدرس اعداد و شمار اور حساب کتاب کے سلسلے میں عموماً کوری ہی پائی جاتیں۔ مگر منتہا نے یہ بات فاروقی صاحب سے سیکھی تھی کہ آدمی جس میدان میں ہو اس کے گوشے گوشے پر نظر رکھے تاکہ دوسروں کے ہاتھوں میں ڈگڈی یا کٹہ پتلی بننے سے بچ سکے۔

ادارے کا چارج لینے کے بعد پہلے سال بجٹ کی تیاری کے سلسلے میں منتہا کا تجربہ رہا کہ تاج محمد ہفتہ عشرہ باقی تمام کام ترک کئے اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے شجر ممنوعہ بنے بجٹ کی تیاری میں مصروف رہے۔ دفتر کے باقی کام اس دوران التوا میں پڑے رہے۔ ایک صاحب جنہیں اپنے تبادلے کے باعث اپنے دو بچوں کے اسکول لیونگ سرٹیفکیٹس درکار تھے۔ تین دن مسلسل چکر لگانے کے بعد برس پڑے۔ ”یہ کیا تماشا ہے میڈم آج تیسری بار آیا ہوں میں اپنے بچوں کے اسکول سرٹیفکیٹس لینے کے لیے اور آپ کے کلرک کا کمرہ مجھے بند ملتا ہے۔ آج بھی دروازے کے باہر بیٹھا آدمی کہتا ہے بابو صاحب بجٹ بنا رہے ہیں، سوموار کو آئیں۔ بجٹ نہ ہوا شیطان کی آنت ہو گیا۔ اتنے دن تو شاید وزارت خزانہ بھی ملکی بجٹ پیش کرنے کے لیے اپنے دروازے بند نہیں رکھتی۔“

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن بابو صاحب واقعی مصروف ہیں۔“ منتہا نے رسالت سے کہا۔  
”سوری میڈم ہم بھی کوئی فارغ نہیں ہیں۔ مجھے فیملی کو لے کر لاہور جانا ہے، اپنے نئے آفس میں ڈیوٹی جوائن کرنی ہے۔“

”آپ وزیٹرز روم میں تشریف رکھیں، میں آپ کے بچوں کے سرٹیفکیٹس بنوانے کی کوشش کرتی ہوں۔“  
”کوشش نہیں میڈم، مجھے آج ہر حال میں چاہئیں۔“  
موصوف کے جانے کے بعد منتہا اپنے کمرے سے اٹھ کر خود تاج محمد کے کمرے میں گئی اور بچوں کے سرٹیفکیٹس بنانے کی بات کی۔

”میڈم! میں کیا کروں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے جو میں کر رہا ہوں۔“ تاج محمد کے لہجے میں دھیمی سی ناگواری تھی۔  
”ان کی بھی مجبوری ہے تاج محمد صاحب۔ انہیں جانا ہے۔ تین دن ہو گئے ہیں انہیں چکر لگاتے۔ جب سے آپ بجٹ میں لگے ہیں دفتر کے سارے کام رک گئے ہیں۔“  
”میڈم میں بھی کوئی فارغ تو نہیں بیٹھا۔ بجٹ کا کام پھر آپ کسی اور سے کروالیں۔“  
”کون کرے گا تاج محمد صاحب۔“ منتہا کا لہجہ بھی بدل گیا۔  
”مجھے کیا پتا اگر آپ کو پیرنٹس سے ہمدردی ہے باقی کاموں کے رک جانے کا گلہ ہے تو بجٹ کسی اور سے تیار کرا لیں۔“

”بہر حال اس وقت تو آپ بجٹ روک کر پہلے ان بچوں کے سرٹیفکیٹس بنادیں۔“  
تاج محمد نے اپنی میز پر پھیلے جہازی سائز کاغذ پر زور سے پیپر دیٹ رکھا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر آہنی الماری سے ایس ایل سی رجسٹر نکالا۔ منتہا کو تاج محمد کا انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ پانچ چھ دن سے تاج محمد وی آئی بی بنے ہوئے تھے۔ اقبال کو انہوں نے مستقل اپنے کمرے کے دروازے پر تعینات کر رکھا تھا تاکہ کوئی انہیں ڈسٹرب نہ کرے۔ آپا صغیراں ہر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد انہیں چائے پہنچاتی۔ تاج محمد چھٹی کے بعد دیر تک اسکول میں بیٹھتے۔ منتہا اپنی ذاتی پاکٹ سے ان کے اور چوکیدار کے لیے لُچ کا بندوبست کر کے جاتی اور آج کئی دن کے بعد جب ان سے ایک سرکاری ہی کام جو کہ انہی کی ذمہ داری تھی کرنے کے لیے کہا گیا تو انہیں یوں ناگوار گزرا جیسے ان سے کسی اور کا کام کرنے کو کہا جا رہا تھا۔

بجٹ تیار ہو گیا اور جمع کرا دیا گیا۔  
اگلے برس جب بجٹ کی تیاری کا مرحلہ آیا اور تاج محمد نے گزشتہ سال کی طرح پھر اپنی مصروفیات ان الفاظ میں پیش کیں ”میڈم بجٹ تیار کرنا ہے، سات آٹھ دن میں کوئی اور کام نہیں کروں گا۔ وزیٹرز ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اقبال کو مجھے



دبکتے تاکر وہ میرے کمرے کے باہر بیٹھا ہے۔“  
 ”کمراندر سے لاک کر لیں تاج محمد صاحب۔“

”میڈم لوگ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کرناک میں دم کر دیتے ہیں۔ میڈم صاحبہ بجٹ بنانا کوئی آسان کام نہیں، دماغ پھر جاتا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، اس مرتبہ میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گی بجٹ بنوانے۔“  
 تاج محمد نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا پھر بولے ”میڈم آپ کا کام نہیں ہے۔“  
 ”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا، اصل میں تو یہ ہم ہیڈز ہی کا کام ہے۔“  
 ”بجاء! تاج محمد جھینپ گئے“ مگر میڈم صاحبہ آپ کو سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بڑا ٹیکنیکل سا کام ہے جی۔“  
 ”دیکھتے ہیں تاج صاحب۔ سمجھ میں آ گیا تو ٹھیک ورنہ آپ سے معذرت کر کے اٹھ جاؤں گی۔“  
 ”آپ کی مرضی۔“

صرف تین دن اور وہ بھی اسکول کے اوقات کار میں ملتہا کو تاج محمد کے ساتھ بیٹھنا پڑا اور بجٹ تیار ہو گیا۔ ڈائریکٹریٹ کے متعلقہ شعبے میں جمع کیا گیا تھا ایک بھی غلطی نہ نکلی جبکہ گزشتہ برس دو مرتبہ بجٹ غلطیوں کی درستی کے لیے اسکول کو واپس کیا گیا تھا۔  
 ملتہا کی موجودگی میں یہ تیسرا بجٹ جا رہا تھا۔

”تاج محمد صاحب اس بجٹ میں دو نیچرز، ایک نائب قاصد اور ایک سوپر کی نئی اسامیوں کے لیے درخواست کرنی ہے۔ پرانے فرنیچر کی مرمت اور روغن کے علاوہ نئے فرنیچر کے لیے فنڈز کی فراہمی کی درخواست بھی کرنی ہے اور ہاں.....“  
 چوکیدار کے لیے ایک کمرے کی تعمیر کا مطالبہ بھی بجٹ میں ڈالنا ہے۔“  
 تاج محمد زیر لب مسکرا دیے۔

”میڈم صاحبہ! نہ نئی پوشیں مل سکتی ہیں نہ کچھ اور ملے گا خواہ خواہ وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔“  
 ”کیوں، کیوں نہیں ملے گا کچھ؟“

”میڈم! سرکار خود خسارے میں جا رہی ہے، وہ کسی کو کیا دے گی۔“  
 ”تاج صاحب اب ایسی بھی ناامیدی ظاہر مت کریں۔ سرکار ہی تو چلا رہی ہے یہ سب کچھ۔ آج اگر خسارہ ہے تو کیا انشاء اللہ کل حالات بہتر ہونے کی امید بھی رکھیے۔ اداروں کی بہتری کے لیے ڈیما نڈز پائپ لائن میں رہنی چاہئیں، کبھی نہ کبھی کچھ نہ کچھ تو مل ہی جاتا ہے۔“  
 ”جیسے آپ کی مرضی۔“

چنانچہ نئے بجٹ کے ساتھ ملتہا نے ادارے کے لیے اپنے مذکورہ مطالبات کا ضمیمہ بھی نتھی کر دیا۔  
 بجٹ سے نمٹتے ہی ملتہا کو ایک خیال سوچا جو اس نے غزالہ کے گوش گزار کر کے ان کی رائے مانگی۔ میقات اول کے امتحانات کے بعد وہ اسکول میں ہم نصابی سرگرمیوں کا ہفتہ منعقد کرانا چاہتی تھی۔  
 ”پہلے دن قرأت اور نعت خوانی کا مقابلہ، دوسرے دن بچوں کی دلچسپی کے کسی موضوع پر اردو تقریری مقابلہ، اس سے اگلے روز انگریزی تقریری مقابلہ پھر ملی نعمات کا مقابلہ، اس کے بعد ایک دن تصویر کشی پھر ایک دن کھیلوں کے مقابلے اور آخری دن تقسیم انعامات۔“ اس نے غزالہ کو بتایا۔

”میڈم آئیڈیا تو اچھا ہے۔ کھیلوں کے مقابلوں کے لیے ہمارے پاس گراؤنڈ بھی ہے مگر باقی مقابلے آپ کہاں کروائیں گی۔ کوئی ہال ہمارے ہاں ہے نہیں اور چار پانچ دن تک شامیالوں کا خرچہ بہت ہو جائے گا۔“  
 ”شامیالوں کی کیا ضرورت غزالہ؟“

”تو بچوں کو آپ کہاں بٹھائیں گی۔“  
 ”بھئی زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام رکھیں گے۔“  
 ”مگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے بھی بچوں کو بٹھانے کا بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا۔“  
 ”اسبلی کے فوراً بعد ہم اپنا پروگرام شروع کر دیا کریں گے۔“  
 ”غزالہ کی مسکراہٹ نے کہا آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“  
 ”میڈم! اسبلی کے بعد بھی تو آخر کہیں نہ کہیں بٹھانا تو ہوگا بچوں کو۔“  
 ”بٹھالیں گے۔“

”کہاں؟“  
 ”اسبلی گراؤنڈ میں۔“  
 ”کیسے؟“

”زمین پر۔“  
 ”اوہ نو میڈم..... کیا کہیں گے بچے اور کیا کہیں گی سب ٹیچرز..... ہائی اسکول والے نہیں گے کہ انہیں ہم نصابی سرگرمیوں کا شوق تو خرابا پھر بچوں کو بٹھانے کے لیے شامیانے اور دریاں تک نہیں۔“  
 ”غزالہ! وہ بھی تو لوگ تھے آخر کہ جنہوں نے برسوں تعلیم ہی زمین پر بیٹھ کر حاصل کی۔“  
 ”وہ زمانہ اور تھا میڈم جی۔“

”زمانہ صرف زمانہ ہوتا ہے اور دور کچھ نہیں ہوتا یہ ہماری اپنی اختراع ہے۔ آپ دیکھیے گا تو ہماری اوپن ایئر کوریکولر ایکٹوٹیز کیسی زبردست جاتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس بال نہیں یا ہم شامیانے لگوانا انورڈ نہیں کر سکتے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو ہم نصابی سرگرمیوں سے محروم رکھیں۔“  
 ”میڈم آخر اتنے عرصے سے بھی تو ہم ان سرگرمیوں کے بغیر چل ہی رہے ہیں۔“ غزالہ نے کہا۔  
 ”درست! اور اس سلسلے میں مجھے بھی اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے کہ گزشتہ ڈھائی تین برس کے دوران میں بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کروا سکی۔ بہر حال ہمیں جب بھی کسی اچھے کام کا خیال آ جائے اچھا ہے۔ میرا خیال ہے بسم اللہ کی جائے۔ جس روز آخری پرچہ ہوگا ہم ان مقابلوں کا اعلان اسبلی میں کریں گے اور بچوں کو دو تین دن تیاری کے دے کر یہ سلسلہ شروع کرادیں گے۔“  
 ”سوچ لیں میڈم!“

”منتہا دھیرے سے مسکرا دی۔“  
 ”غزالہ! اتنے عرصے میں آپ کو ایک بات کا اندازہ تو ہو ہی جانا چاہیے میرے بارے میں کہ..... میں اسکول کے لیے کوئی کام سوچے سمجھے بنا نہیں کرتی اور جب سوچ سمجھ لیتی ہوں تو پھر پیچھے نہیں ہٹی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں غزالہ کہ ادارے کی بہتری کے لیے آپ کے مشوروں، تجاویز اور عملی تعاون نے مجھے انتہائی مدد دی ہے۔ اس پروگرام کی کامیابی کے لیے بھی مجھے آپ کی بھرپور مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔“  
 ”حاضر ہوں میڈم۔“ غزالہ نے کہا۔

”تھینک یو!“  
 ”ایک بات کہوں میڈم.....“ غزالہ کے لہجے میں ایک خاص حزم و ہنسی تھی۔

”جی۔“  
 ”جتنا آپ اسکول کے بارے میں سوچتی ہیں اتنا کبھی اپنے بارے میں بھی سوچا؟“



ملتہا نے چونک کر غزالہ کی بات سنی پھر دھیرے سے بولی ”کبھی وقت ہی نہیں ملا۔“  
 ”دس انٹرنیٹ فیئر میڈم..... حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ساتھ بندے پر اپنی ذات کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔  
 دیے آپ نے کبھی اپنے بارے میں خود تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ آئی ایم سوری آج میں خود ہی پوچھنے کی جسارت کر بیٹھی.....  
 آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔“  
 ”نہیں غزالہ۔“

کچھ در کو دونوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔  
 ”پوچھ سکتی ہوں میڈم کیوں نہیں ملا وقت آپ کو اپنے بارے میں سوچنے کو؟“  
 ”کام بہت تھے۔“  
 ”آپ نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ وقت گزر جائے گا۔“  
 ”گزر رہی گیا غزالہ۔“

”نہیں میڈم جی، ابھی ہے۔ آپ ہمارے ڈائریکٹریٹ کی سیکسٹ ہیڈ ہیں۔“ ملتہا دھیرے سے ہنس دی۔  
 ”اب بیک کا لفظ بھی اچھا نہیں لگتا اس چہرے کے ساتھ اور آپ سیکسٹ کہہ رہی ہیں، پتا ہے کتنی عمر ہے میری؟“  
 ”جی..... ہم عورتیں ایک دوسرے کی عمر کے معاملے میں بہت کھوجی رہتی ہیں۔ مجھے آپ کی تاریخ اور سن پیدائش  
 معلوم ہے۔ میڈم اپنے ہی اسٹاف میں آپ سے بڑی عمر کی دو ٹیچرز رشتوں کی منتظر بیٹھی ہیں۔ میڈم آپ بڑا نہ منا میں تو  
 ایک بات کہوں۔“  
 ”آپ میرے بڑا ماننے کی پروا نہ کریں کہے جائیں۔“ ملتہا پھر مسکرائی۔  
 غزالہ شنجھل بنیٹھیں۔

”میرے ہسپنڈ کے ایک دوست ہیں۔ ایک ملٹی نیشنل ادارے میں کام کرتے ہیں۔ جس لڑکی سے وہ شادی کرنا  
 چاہتے تھے اس سے ان کی شادی نہیں ہو سکی پھر انہوں نے شادی کی ہی نہیں۔ چالیس بیالیس کے ہوں گے، اب اپنے گھر  
 والوں اور دوستوں کے سمجھانے بجھانے پر بمشکل راضی ہوئے ہیں شادی کے لیے۔ آپ اگر کہیں تو میں ان کے گھر والوں  
 سے آپ کا ذکر کروں؟“  
 ”نہیں غزالہ۔“  
 ”کیوں میڈم؟“  
 ”بس۔“  
 ”وجہ؟“

”آئی ایم آل ریڈی انگیجڈ۔“ ملتہا نے دھیرے سے کہا۔  
 ”ریڈی!“

ملتہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔  
 ”آف میڈم! ایسی بھی کیا رازداری، آپ نے آج تک کسی کو نہیں بتایا۔“  
 ”پتا نہیں غزالہ یہ سچ ہے یا غلط مگر میرا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح ماں اور بچوں کے درمیان محبت کے باوجود احترام کی  
 ایک پرت ہوتی ہے اسی طرح نگران اور ماتحت عملے کے درمیان بھی ہم آہنگی کار کے باوجود تکلف کی ایک ایسی پرت ضرور  
 ہونی چاہیے جو انہیں مخصوص حدود میں رکھے ورنہ شاید کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔“  
 ”مگر میں یہ پوچھتے بغیر نہیں رہوں گی میڈم جی کہ وہ ہیں کون؟“  
 ”ہے اللہ کا ایک بندہ!“



شازیہ چوہدری اپنے شوہر طارق کے ہمراہ

”اس بندے کا محل وقوع، حدود و اربعہ کچھ نہیں بتائیں گی۔“

منتہا نے نفی میں سر ہلادیا۔

”مجھے تو سخت تجسس ہو رہا ہے۔ اچھا ایک بات تو پوچھ سکتی ہوں..... بس آخری بات؟“

”جی پوچھیں۔“ منتہا مسکرا دی۔

”شادی کا کب تک پروگرام ہے؟“

”بس غزالہ اتنا ہی کافی ہے۔“

”میڈم جی مجھے تو اب آپ کے ارد گرد رومانس ہی رومانس محسوس ہوگا۔ کیا میں اسٹاف ممبرز کو بتا سکتی ہوں یہ بات؟“

”لیکن کوئی مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرے۔“ منتہا نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

☆☆☆

یہ کہہ دینا ہی آسان تھا کہ بیہ ڈاکٹر تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی اس کے لیے نکاح ثانی کو ہاتھوں ہاتھ اچھا رشتہ ملے گا۔ جو ملتا رہنڈا، مطلقہ، بچوں والا یا معاشی اور معاشرتی اعتبار سے کم تر۔ ایسے رشتوں کا مٹی، بیہ سے تذکرہ کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتیں۔ ایک دو جو ذرا گزارے کے قابل دکھائی دیئے ان کا اس سے تذکرہ کیا بھی تو اس نے رد کر دیا۔

یہ نہیں کہ اسے انکار تھا۔ عملی زندگی میں تھی، لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ہمدردوں اور بی خواہوں کا مشورہ یہی تھا کہ اپنے مستقبل کے لیے کسی جذباتی فیصلے کی صلیب پر چڑھنے کے بجائے اسے زندگی کی سنگلاخ حقیقتوں کا ادراک رکھتے ہوئے مناسب فیصلہ کرنا چاہیے۔ ایسا فیصلہ جو اس کے اور اس کے بچے کے محفوظ مستقبل کا ضامن بن سکے۔

گو شروع شروع بیہ کو ایسی باتوں، ایسے مشوروں سے سخت دہشت ہوتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو وہ ایسی باتیں کرنے والوں سے الجھ بھی پڑتی تھی۔ ناراض ہو جاتی، اپنی ناراضگی کا کبھی خاموشی سے کبھی بول کر اظہار کرتی۔



”زندگی مجھے گزارنی ہے آپ کو کیا!“

”نہ کیا کریں مجھ سے ایسی بات۔“

”یہ میرا پرستل معاملہ ہے۔“

”پلیز آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔“

”میں بچی نہیں ہوں اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتی ہوں۔“

مگر وقت! وقت نے اسے بدل دیا تھا۔ اچھے اچھوں کو بدل دیتا ہے۔

قلب و ذہن کی دنیا دھیرے دھیرے بدلتی چلی گئی تھی۔

اسے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی جو اسے اور مٹے کو بھرپور تحفظ فراہم کر سکتا۔

بچا کہ فرمان اس کی یادوں سے محو نہیں ہوا تھا مگر ساریوں کے پیچھے بھاگتے رہنے سے فائدہ!

مٹے کو اپنے ساتھ لے کر وہ باہر نکلتی تو اسے ان عورتوں پر رشک آتا جن کے بچوں کو اٹھانے کے لیے بچوں کے باپ بھی ساتھ ہوتے۔ وہ ان عورتوں کو لپکا کر دیکھتی جو بڑے ٹھسے سے گاڑیوں کی اگلی نشستوں پر گاڑی چلانے والے مرد کے پہلو میں بیٹھی ہوتیں۔ بازاروں میں شاپنگ کرتے اور باہر کھاتے بیٹے جوڑوں کو دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ تنہائی اور محرومی کا احساس بڑھ جاتا۔ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں کہ مٹے کے ساتھ وہ زیادہ عرصہ اکیلے نہیں چل سکے گی اسے کچھ زیادہ وقت نہیں لگا تھا اور اس حقیقت کا ادراک کرانے میں سب سے اہم کردار اس کی ایک سینیئر ساتھی ڈاکٹر نسیم نے ادا کیا تھا جو خود بھی یہ درد سہہ چکی تھیں۔

”نہیہ! یہ کہہ دینا بہت آسان ہوتا ہے کہ ہم جانے والے کی یادوں کے سہارے زندگی گزار لیں گے عملاً یہ بہت مشکل ہے۔ بچے بڑے ہوتے ہیں تو آپ کو قدم قدم پر ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور پھر ہمارے اپنے بھی تو کچھ جذباتی تقاضے ہوتے ہیں نہیہ۔ مرد پہلا ہو یا دوسرا تحفظ کا احساس عورت کی اولین ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ سدا کی کے ساتھ نہیں رہتے۔ بہن بھائیوں کی اپنی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ آپ کے ساس سرسرا کر تک بیٹھے رہیں گے اور پھر کیا ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اتنے ہی محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے دوسرے بیٹے کی اولاد آپ کے بیٹے سے ان کی محبت چھین لے۔ اپنے اور اپنے بچے کے لیے بالآخر آپ کو ایک علیحدہ گھر اور ایک آدمی کی ضرورت محسوس ہوگی۔“ ڈاکٹر نسیم کی باتوں کا لب لباب تقریباً یہی تھا۔

”میڈم! سوتیلے رشتے تو سوتیلے ہی ہوتے ہیں۔“

”ایک بات بتاؤں..... یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ سوتیلی مائیں کم کم اچھی ہوتی ہیں مگر سوتیلے باپ عموماً بڑے نہیں ہوتے۔ مائیں ان کے دلوں میں اپنے بچوں کے لیے جگہ بنا لیتی ہیں۔“

”آخر آپ نے بھی تو اتنی لمبی زندگی گزار ہی لی۔“

”یہ میں ہی جانتی ہوں کتنی مشکلات سہہ کر۔“ ڈاکٹر نسیم کے لہجے میں درد تھا۔ ”اور وقت سے پہلے ہی تھک گئی ہوں۔ ڈاکٹر زہرہ کو دیکھیں مجھ سے دو سال بڑی ہیں۔ خدا اُن کے شوہر کو سلامت رکھے، کتنی فریش دکھائی دیتی ہیں آج بھی۔“

”جی یہ تو ہے۔“

”تو آپ یہ غلطی نہ کرنا نہیہ۔ کسی اچھے سے آدمی سے شادی کر دو اور اپنا گھر بساؤ۔“

ادھر گھر میں مٹی اکثر سمجھائی رہتی تھیں۔

”بیٹا پہاڑی زندگی تنہا کیسے کاٹو گی۔ مٹے کو باپ کا پیار چاہیے۔“

”مٹے کی قسمت میں باپ کا پیار ہوتا تو اس کا اپنا باپ کیوں جانا اس دنیا سے۔“

”بیٹا خدا کے بھید وہی جانے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ مرد کے بغیر زندگی بہت کٹھن ہو جاتی ہے۔“



### شازیہ کی اپنی سہیلی کے ہمراہ کالج کی ایک یادگار تصویر

”آپ نے بھی تو گزاری۔“  
 ”تم جانتی تو ہو کس طرح..... اور بیٹا کوئی ماں کب چاہتی ہے کہ اس کی بد قسمتی کی چھاپ اس کی اولاد پر بھی لگے اور پھر منتہا کی یہ ضد ہے کہ جب تک تمہارا گھر دوبارہ نہیں بس جاتا وہ شادی نہیں کرے گی۔“  
 یہ شروع شروع میں کو بھی انکار میں جواب دیتی رہی مگر پھر اس کا رد عمل بدلتا چلا گیا۔ اب می سمجھاتیں تو وہ چپ ہو جاتی۔

خاموشی نیم رضا مندی ہوتی ہے۔  
 مگر کوئی مناسب رشتہ نہ مل رہا تھا۔ وہی دوہا جو، مطلقہ، بچوں والے یا معاشی و معاشرتی اعتبار سے یہہ سے کتر اعلیٰ کی سسرال کے توسط سے بھی دو تین رشتے آئے مگر می کا دل نہ ٹھکا۔  
 یہہ کی سسرال والے ان تمام کوششوں سے لاعلم تھے۔ می چاہتی تھیں کوئی رشتہ دل کو لگے، معیار پر سو فیصد نہ یہی کچھ کم ہی پورا اترے تو وہ ان لوگوں سے ذکر کریں۔ ایسے بات کرنا تو سوت نہ کیا اس جولا ہے سے ٹھم لٹھا کے مصداق ہوتی۔  
 بہر حال یہ امر بھی کچھ کم تسلی بخش اور حوصلہ افزا نہ تھا کہ یہہ جو فرحان کی موت کے بعد انتہائی یاسیت کا شکار ہو گئی تھی اور زور زنجی کی انتہا کو جا پہنچی تھی دوبارہ زندگی کی طرف پلٹ آئی تھی!

☆☆☆

پنڈال اور کرسیوں کے بغیر منایا جانے والا ہم نصابی سرگرمیوں کا ہفتہ بہت کامیاب رہا۔ بچوں نے اسمبلی گراؤنڈ کی زمین پر بیٹھ کر تمام پروگرام دیکھے۔ بہت مزہ آیا۔ ہفتہ بھر اسکول میں غیر معمولی جوش و خروش دیکھنے میں آیا۔ بچوں کے پوشیدہ جوہر ایسے کھلے کہ ٹیچر بھی حیران رہ گئیں۔ عقی نشستوں پر بیٹھنے والے کم صم بچوں میں بھی غضب کی صلاحیتیں دیکھنے کو ملیں۔





شازیہ چوہدری، کے لیے نذرانہ عقیدت

شازیہ کے نام

میں رنگ.... دیکھتی تھی

خوشبو میں سوچتی تھی

کھلیں جو آنکھیں تو سارے منظر دھنک کے اس پار رہ گئے

نہ رنگ میرے، نہ خواب میرے ہوئے تو بس عذاب میرے

نہ چاند راتیں، نہ پھول باتیں نہ نخل مہینیں نہ جھیل شامیں

نہ کوئی آہٹ نہ کوئی دستک، حروف منہ بوم کھو چکے ہیں

علامتیں بانجھ ہو چکی ہیں

گلابی خوابوں کے پیر ہن راکھ ہو چکے ہیں

حقیقتوں کی برہنگی، اپنی ساری سفاکیوں کے ہمراہ

جسم و جاں پر اتر رہی ہے، وہ مہرباں سایہ دار بادل

عذاب کی رتوں میں چھوڑ کر ہمیں جا چکا ہے

ادرا ب تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی ہے

(پردین شا کر کی روح سے)

(معذرت کے ساتھ)

رعنا ازبلا کامل، بی۔ اے۔ بھکر

آج مجھے قتلِ شفا کی یہ لطم بہت یاد آ رہی ہے۔

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص

اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے

جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

اس ایک شخص میں تھیں درباریاں کیا کیا

ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص

چھپایا ہے جسے پت جھڑ کے زرد پتوں نے

ابھی تک ہے بہاروں پہ حکراں وہ شخص

قتل کیسے بھلائیں گے اہل درد اسے

دلوں میں چھوڑ گیا اپنی داستاں وہ شخص

مریم احمد، لاہور

معصومہ عباس نقوی، لاہور

اچھی بھابی نے بھی بہت فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا۔ فہیم ہی نہیں نعیم سے بھی انہوں نے بار بار اصرار کر کے بالآخر لیلیٰ کو دی بھجوا دیا تھا۔

”ہر بیوی چاہتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے۔“ وہ فہیم کو سمجھاتیں۔

ان دونوں نے اصرار کیا کہ لیلیٰ کے ساتھ وہ خود بھی وہاں آ جائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

”پہلے تو آپ راضی تھیں؟“ نعیم نے کہا۔

”پہلے اور بات تھی۔“

”اور بات کیا تھی؟“

”تمہاری شادی بھی ہو جاتی تو ہم سب وہیں اکٹھے رہتے۔ اپنی زمین سے ہٹ جاؤ تو رشتے اور تعلق کمزور پڑنے لگتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے امی جان، لوگ وہاں رہ کر بھی وطن میں اپنے لوگوں سے تعلق کو مضبوط رکھتے ہیں۔“

”ارے بیٹا، تم فہیم سے کہو لیلیٰ کو اپنے پاس بلائیں میں یہیں خوش ہوں۔“

”آپ اکیلی جو رہ جائیں گی۔“

”تم میری فکر نہ کرو۔ میں آج ہوں کل نہیں۔ لیلیٰ کو فہیم کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ بیلا کے ہاں ماشاء اللہ بچہ بھی ہو گیا



اور لیلی شادی کے تیسرے سال بھی خالی گود پھر رہی ہیں یہ اچھی بات نہیں۔“ اچھی بھابی نے مجبوراً وہ بات بھی کہہ ڈالی جو بیٹوں سے کہتے شرم محسوس ہوتی تھی انہیں۔  
بالآخر لیلی چلی گئی۔

مسز ظہیر کو بھی اطمینان ہوا۔

لیلی نے دئی پہنچنے کے بعد پہلی بار میکے فون کیا تو بہت خوش تھی۔

”آف امی، دئی اتنا خوب صورت ہے کہ میں آپ کو کیا بتاؤں جب جہاز لینڈ کر رہا تھا اور میں نے نیچے دیکھا تو یوں لگا جیسے کوئی پینٹنگ نظروں کے سامنے ہے۔“

میسہ سے بات ہوئی تو اس نے محتاط لہجے میں کہا ”بھابی فرحان بھائی نے آپ کے اور مرنے کے لیے جو کرا سجا یا تھا اے ان لوگوں نے اب تک جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیلی؟“ میسہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

”ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے بھابی کبھی آپ کسی بہانے مرنے کو ساتھ لے کر یہاں آ جائیں اور دیکھیں کہ فرحان بھائی نے کتنی چاہت سے سجا یا تھا آپ کے اور مرنے کے لیے کرا۔“

”کسی بہانے سے بھی نہیں جب فرحان ہی نہیں رہے تو میرا اس گھر سے کیا تعلق۔“ لیلی کو اس کا جواب برا لگا۔

”چلیے میرے حوالے سے اس گھر سے آپ کا کوئی تعلق نہ سہی ملتہا باجی اور نعیم بھائی کی شادی کے بعد تو تعلق بن جائے گا نا پھر تو یہ آپ کی بہن کا گھر ہو گا۔“

”ناممکن ہے کہ یہ شادی ہو۔“

”کیوں؟“ لیلی نے چونک کر کہا۔

”بس۔“ میسہ کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”نعیم بھائی تو بہت سیریس ہیں ملتہا باجی کے لیے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔ باجی تو راضی نہیں۔“

”کیا! آپ سے کس نے کہا؟“

”میری بہن ہیں وہ ان کے دل کی خبر مجھ سے زیادہ کسے ہو سکتی ہے۔“

میسہ کے لہجے سے چھلکتے یقین نے لیلی کو ابھن میں ڈال دیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ نعیم ملتہا سے شادی کے انتظار میں کہیں اپنا وقت تو ضائع نہیں کر رہا تھا۔

اس کے سامنے یہ سوال پورے شد و مد کے ساتھ آکھڑا ہوا کہ یہ بات اسے ساس یا جیٹھ میں سے کسے بتانی چاہیے تھی اور بتانی بھی چاہیے تھی کہ نہیں! اس نے نعیم کو ہٹانا ضروری سمجھا مگر اصل صورت حال کی خبر نعیم سے زیادہ کسے تھی!

☆☆☆

”یہ دیکھیے جناب! یہ گاڑی آپ کے لیے بابا نے بھجوائی ہے۔“ عدنان آفس سے واپسی پر مرنے کے لیے ریموٹ کنٹرول کھلونا گاڑی خریدتا ہوا آیا تھا اور اسے اس کے بابا کی جانب سے تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔

منا بہت ایکا سٹنڈ تھا۔

”یہ دیکھو آگے بھی جاتی ہے پیچھے بھی اور مڑتی بھی ہے۔“ عدنان نے اسے ریموٹ کے ذریعے گاڑی کو کنٹرول کرنا سکھایا۔

منا سرت سے دیکھتا رہا۔

## تم کیوں چلے گئے

سوچوں یہ غم کی شال ہے تم کیوں چلے گئے؟  
ہر سمت ایک جال ہے تم کیوں چلے گئے؟  
تازہ تمام زخم بہاروں نے کر دیئے  
ہر پھول کا سوال ہے تم کیوں چلے گئے  
ہنسنا تو خیر اپنا مقدر نہ تھا کبھی  
رونا بھی اب محال ہے تم کیوں چلے گئے؟  
کیوں ہاتھ میں نہیں ہے مری جاں تمہارا ہاتھ؟  
کتنا برا یہ سال ہے تم کیوں چلے گئے؟  
تم نے تو جاتے جاتے ملاقات تک نہ کی  
اب تک یہی ملال ہے تم کیوں چلے گئے؟

شاعر! دانش

سمیرا اسلم خان، حافظ آباد

## حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو  
فردغ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں  
ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے  
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے  
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو  
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو  
جہاں میں آکے بھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو  
نہ قحط عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی  
کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے  
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی  
طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے  
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

منجانب! کشور + زاہدہ حبیب  
ضلع میانوالی

”لو اب آپ خود چلاؤ۔“ عدنان نے ریموٹ منے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

منا گاڑی چلانے لگا۔

”بھئی واہ بہت خوب!“ ظہیر صاحب نے خوش ہو کر تالی بجائی۔

”بابا کو تھینک یو کہو۔“ مسز ظہیر نے کہا۔

منے نے فرحان کی دیوار گیر تصویر کی جانب دیکھا چند ثانیے تکنگی بندھے دیکھتا رہا اور اس نے تھینک یو کہنے کے بجائے

کہا ”چاچو! بابا خود کیوں نہیں آتے؟“

ظہیر صاحب، مسز ظہیر، عدنان اور بیہ چاروں دم بخود رہ گئے۔

یہ کیسا سوال کر دیا تھا منے نے!

چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

منے کو خوش دیکھ کر خوشی سے فروزاں ہوئے چہرے بچھ سے گئے تھے۔

منا شعور و آگہی کی دلیز پر پہنچ گیا تھا!

ابھی تو ابتدا تھی۔

ایسے بہت سے استفسارات ہوتا تھے اس کی طرف سے۔

آخر کب تک پہلا سکتے تھے اسے گھروالے فرحان کی تصویر اور ان دل خوش کن فیٹنسیز سے جو انہوں نے اسے خوش

کرنے کے لیے گھڑ رکھی تھیں۔

☆☆☆

ثروت امید سے تھی۔ می بہت خوش تھیں۔ ثروت کی رجسٹریشن ایک پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم میں کروادی گئی تھی۔ جہاں



اسے باقاعدگی سے چپک اپ کے لیے جانا پڑتا۔ پہلا بچہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نے اسے احتیاط اور آرام کی ہدایت کر رکھی تھی مگر وہ چھوٹی موٹی بن کر پلنگ پر پڑنے کے بجائے پہلے کی طرح مستعد اور متحرک رہتی۔  
”تھک جاؤ گی لیٹ جاؤ، آرام کرلو۔“ می کہتیں۔

وہ مسکراتی۔

”عجیب لڑکی ہو تم!“ ایک روز می نے کہا ”عورتیں تو ایسے موقع پر لیٹنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں اور تم بار بار کہنے پر بھی نہیں آرام کرتیں۔“

ثروت پہلے تو مسکرا دی پھر قدرے شرماتے ہوئے آہستگی سے بولی ”امی کہتی ہیں ایسے دنوں میں جتنا ایک نور ہوا چھا رہتا ہے۔“

”گوثرث کا اکثر معاملات میں اپنی امی کا حوالہ دینا کبھی کبھی می کو کھلنے بھی لگتا مگر اس نے آج تک اپنی امی کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ کہی تھی جو قابل اعتراض ہوتی۔ بلکہ اکثر دل قائل سا ہو جاتا۔

”ہاں کہتی تو وہ ٹھیک ہیں۔ یہ تو اب کچھ دستور نکل گیا ہے کہ عورتیں شروع دنوں ہی سے پلنگ پکڑ لیتی ہیں۔ ہم نے اپنی ماں، خالہ، پھوپھی اور ممانیوں کو آخر وقت تک کام کرتے دیکھا۔ ہماری والدہ تو بچے کی پیدائش سے ایک دو روز پہلے گھر دھو دھلا کر ساری چیزیں یوں ستھری کر کے رکھ دیا کرتی تھیں جیسے کافی دنوں کا بندوبست کر رہی ہوں۔ بستر کی چادریں صاف ستھری ہوتے ہوئے بھی انہیں دھو کر پھیلا دیا کرتی تھیں۔ باورچی خانہ چمکا دیتیں۔ ابا کے تمام کپڑے استری کر دیتیں۔ ان کے استعمال کی ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھ دیتیں اور ہم یہ ساری تیاری دیکھ کر سمجھ جایا کرتے تھے کہ بس آج کل میں ہمارے ہاں پھر کوئی چھوٹا بھائی بہن آنے والا ہے۔ ماشاء اللہ گیارہ بچے ہوئے ہماری اماں کے ہاں۔“

”ہاں مگر زندہ بس ہم دو بہن بھائی ہی رہے باقی سب چھپن ہی میں مر گئے۔“ می نے کلوٹ کے بند کو آخری ٹانگا لگاتے ہوئے کہا۔ انہوں نے آنے والے پوتا پونی کے لیے ابھی سے کپڑے سینا شروع کر دیئے تھے۔ منجہا سے انہوں نے نرم کاٹن کے ڈھیروں کٹ پیس منگوا کر رکھ لیے تھے۔ ہر روز وہ ایک آدھ کپڑا اسی کراس جرمی صندوق میں رکھ دیتیں جو انہوں نے بطور خاص ننھے کپڑوں کے لیے ہی مخصوص کر لیا تھا۔ کلوٹوں کے لیے انہوں نے گھر ہی میں سے کاٹن کے استعمال شدہ کپڑے نکال کر انہیں لائڈری سے دھلوا لیا تھا اور جیسے جیسے وقت ملتا ان میں سے کلوٹ کاٹ چھانٹ کر سی کر صندوق میں رکھتی جا رہی تھیں۔ البتہ جھیلے، نہالے، تنکیوں کے غلاف وغیرہ وہ ننھے کپڑوں میں سے ہی رہی تھیں۔ منجہا بچے کے لیے بہت سی چیزیں لا کر رکھ چکی تھی۔ ثروت کے میکے میں بھی چھو چھک کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔

آنے والا بچہ خوش قسمت تھا کہ اس کے استقبال کی اتنی محبت سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ خوش قسمت تو اس کے ماں باپ بھی تھے کہ جنہیں اتنے بہت سے چاہنے والوں کی موجودگی میں بچے کے لیے کوئی تردد کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

☆☆☆

لیلیٰ کے جانے کے بعد سے منجہا نے اچھی بھالی کوروزانہ فون کرنا لازم کر لیا تھا۔ بنفس نفیس ان کے پاس جانے سے البتہ گریزاں رہتی کہ کچھ بھی سہمی وہ کتنی ہی میپورڈ سہمی شادی سے قبل اس کا ہونے والی سسرال میں آنا جانا مروجہ معاشرتی طریقے کے مطابق قرار نہ پاتا۔ ویسے بھی بیسہ کی وجہ سے وہ اس سلسلے میں محتاط ہی رہنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ الجھنے بھی لگتی۔ اس سے تو بہتر تھا یہ سلسلہ ختم ہو گیا ہوتا۔ نعیم اور اس کے گھر والے آخر کتنا انتظار کر سکتے تھے۔ جب سے لیلیٰ گئی تھی نعیم اپنی والدہ کے بارے میں انتہائی متشکر رہنے لگا تھا۔ جب بھی اس کی منجہا سے فون پر بات ہوتی وہ یہ ضرور پوچھتا کہ بیسہ کی دوبارہ خانہ آبادی کے سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں۔ اس کا لہجہ اس کے اضطراب کی چغلی کھاتا۔

”جب سے لیلیٰ یہاں آئی ہیں مجھے امی جان کے بارے میں پریشانی رہنے لگی ہے۔ اکیلی تو خیر وہ پہلے بھی رہتی تھیں مگر بیمار نہیں تھیں۔“ ایک روز اس نے کہا۔  
وہ چپ رہی۔

”ایک بات بتائیے اگر یہ ساری زندگی نہ ہوئی تو کیا ہماری بھی یونہی گزرے گی؟“  
”میں نے تو آپ سے کہا تھا کہیں اور کر لیں۔“

”بات صرف میری نہیں ہے منہا..... مسئلہ تو آپ کا بھی ہے۔ کبھی آپ نے اپنے بارے میں بھی سوچا!“  
”اپنے بارے میں تو کبھی سوچتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”جو نہیں سوچتے وہ غلطی کرتے ہیں۔ آدمی کو ففٹی پرسنٹ خود غرض ضرور ہونا چاہیے۔“  
”یہ آپ کہہ رہے ہیں!“ منہا کے لہجے میں حیرانی تھی ”میں نے تو سنا ہے اپنی فیملی کے لیے آپ کے ڈیوٹن کی مثالیں دی جاتی ہیں۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ میں دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔ میں جس طرح اوروں کے ساتھ سچا اور مخلص رہا ہوں اپنی ذات کے ساتھ بھی رہنا چاہتا ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ترجیحات بدلتی جاتی ہیں۔ میری بھی بدل گئی ہیں شاید!“

”آپ انتظار سے اکتا گئے ہیں؟“  
”کم از کم آپ سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ انتظار کی جہاں تک بات ہے تو وہ میں آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں۔ سچ یہ ہے منہا کہ لیلیٰ اور فہیم کو دیکھ کر اب میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کوئی میرا انتظار کرے۔ میں گھر آ جاؤں تو مجھ سے باتیں کرے۔ میرے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے باہر جائے۔ کیا مجھے ان خواہشوں کا حق نہیں؟“  
”بالکل ہے اور اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ..... آپ اپنے لیے کوئی اور فیصلہ کر لیں۔“  
”مشورے کا شکریہ! براہ کرم آپ یہہ کے لیے اپنی کوششیں تیز فرمائیں۔“  
”آپ دعا کیجئے۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔  
”بہت خوب! دعاؤں کے طالب سے دعا کرنے کو کہہ رہی ہیں۔“

☆☆☆

فرن لینڈ منے کی پسندیدہ جگہ تھی۔ چھٹی والے دن یہہ اسے اکثر وہیں لے جاتی مینا برقی کھلونوں کی سواری کر کے بہت خوش ہوتا اور بمشکل وہاں سے واپسی پر آمادہ ہوتا۔  
اس روز بھی چھٹی تھی۔ می کے گھر سے اپنے گھر واپس لوٹتے ہوئے یہہ منے کو اس کی فرمائش پر فرن لینڈ لے گئی تھی۔ منا ایک کے بعد دوسرے کھلونے میں ٹوکن ڈالتا اور سواری کر کے خوش ہوتا رہا۔  
یہہ کی مٹھی میں دس میں سے تین ٹوکن باقی رہ گئے تھے اور میناریل کے ایک چھوٹے سے انجن کی سواری سے محفوظ ہو رہا تھا کہ یہہ کی نظر دفعتاً ایک شناسا چہرے پر پڑی!  
وہ پیام تھا میڈیکل کالج میں اس سے دو سال سینئر۔  
منے کی تقریباً ہم سن ایک چھوٹی سی گول منول بچی کو گھوڑے کی سواری کراتے ہوئے وہ اسے انتہائی محبت سے دیکھ رہا تھا۔

ایمن!  
پیام کو دیکھتے ہی یہہ کو میڈیکل کالج ہی کی ایک لڑکی کا خیال آیا۔ وہ اور پیام ایک ہی جج کے تھے۔ دونوں کا شمار کالج



## قاریین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں، ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کے ذہن طلبہ میں ہوتا تھا اور دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی کا قصہ عام تھا۔  
بیہ کو تجسس ہوا۔

مُنے کے ریل کے کھلونا انجن پر سے اتر آنے کے بعد اس نے مُنے سے کہا ”اگلی رائیڈ تھوڑی دیر بعد۔ ابھی ہم ان انکل سے ملتے ہیں۔“ اس نے مُنے کی توجہ پیام کی طرف مبذول کرائی۔

مُنے کا ہاتھ تھا پیام کردہ پیام تک جا پہنچی۔

”ایکسکوز می!“ اس نے کہا۔

پیام نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”ڈاکٹر پیام؟“

”جی ہاں۔“

”شاید آپ کو یاد ہو میں بھی میڈیکل کالج میں ہوا کرتی تھی۔“

”جی بالکل یاد ہے مجھے آپ کا چہرہ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا نام یاد نہیں کر پا رہا۔“

”بیہ۔“

”ڈاکٹر بیہ!“

”جی بالکل۔“ بیہ دھیرے سے مسکرائی ”یہ میرا بیٹا ہے۔“

”ہیلو!“ پیام نے پیار سے مُنے کا گال چھوا۔

”اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو یہ کیوٹ سی بچی.....“ بیہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میری بچی ہے۔“

”السلام علیکم بیٹا۔“ بیہ نے اپنا ہاتھ بچی کی طرف بڑھایا۔ بچی نے بڑے اعتماد سے اس سے ہاتھ ملایا۔

”آپ کا نام؟“ بیہ نے پوچھا۔

”سمن۔“

”اجازت دیں تو ایک اندازہ اور ظاہر کر دوں؟“ بیہ نے کہا۔

”ضرور۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”سمن کی مدر کا نام ایمن ہے!“

”تھا!“ اس نے کہا۔

بیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



**KSK Novels**



ناہید سلطانہ اختر

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیلمی قطنے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

**محبور سے گندھے اور یقین سے بندھے شتوں کے اچانک مساموئے کی دل گداز داستان**

25 قسط

AUGUST.2004 □ PAKEEZA □ 186







”کیا مطلب؟“

”وہ اب ہمارے ساتھ نہیں۔“

”ڈیڈ!“ میہ نے یہ ایک لفظ بمشکل ادا کیا۔ ایمن سے اگرچہ اس کی دوستی تو نہ تھی مگر ہم مکتب ہونے کی وجہ سے اس سے شناسائی ضرور تھی۔ کبھی کبھی میڈیکل کالج کی بس میں کالج آتے جاتے ایک ساتھ بیٹھنا بھی ہو جاتا۔ وہ غیر معمولی مہذب لڑکی تھی۔

”ساتھ چھوٹنے کے لیے مرنا ضروری نہیں ہوتا۔“ پیام نے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ کر پائی کہ پیام سے اس کی فقط ہم مکتب ہونے کی آشنائی تھی۔ کالج کے زمانے میں تو وہ کبھی ایک دوسرے سے ہم کلام بھی نہ ہوئے تھے۔ اس کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ وہ اس سے دو سال سینئر تھا۔

”مُنے نے آہستہ سے اس کا بازو ہلایا۔“

”اچھا پیام صاحب۔“

”بائی دی دے آپ کہاں ہوتی ہیں..... میرا مطلب ہے کہیں جاب کر رہی ہیں یا.....؟“ اس نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی میں جاب کر رہی ہوں۔“ میہ نے اسے اپنے ہاسپٹل کا نام بتایا۔

”ماما چلیں نا۔“ مُنے نے دوبارہ اس کا بازو ہلاتے ہوئے بڑی بے تابی سے کہا۔

”اچھا بیٹا۔“ میہ نے مُنے سے کہا پھر پیام کی جانب دیکھتے ہوئے بولی ”بچوں کو بس اپنے کھیل کی جلدی رہتی ہے۔“

”مگر سمن کو عام بچوں کے برعکس کھیل کو دُسر و تفریح سے زیادہ دلچسپی نہیں۔“ پیام نے از خود ہی بتایا۔

”ماما، مٹا اب ٹھنک کر بولا۔“

”او کے پیام صاحب۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

مٹا اس کا ہاتھ تھام کر اسے ڈونلڈ ڈک کی طرف کھینچ لے گیا۔ ایک بچہ ڈک کی سواری کر رہا تھا دوسرا اپنی باری کا منتظر تھا۔

”بیٹا جی مکی ماؤس کی رائیڈ لے لو۔“ میہ نے مُنے سے کہا۔

”نہیں ماما میں نے ڈونلڈ ڈک پہ بیٹھنا ہے۔“ مٹا منمنایا۔

”او کے۔“

ڈونلڈ ڈک پر سواری کے بعد مٹا اگلی رائیڈ کے لیے برقی کھلونے کے انتخاب کو ادھر ادھر نظر میں دوڑا رہا تھا کہ پیام اپنی بیٹی کی انگلی پکڑے اس کے نزدیک آ پہنچا۔

”ایلیکٹریسیٹی۔“

میہ نے اس کی جانب توجہ کی۔

”ہمارے کالج میں ایک حنا جیل ہوا کرتی تھیں۔“

”وہ جو پوزیشن ہولڈر رہی تھیں؟“

”جی..... وہی..... ان کا کچھ اتا پتا ہے آپ کو۔“

”جی نہیں۔“ میہ نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”لو..... لو.....“ وہ بڑی قطعیت سے بولا ”ان کا اتا پتا معلوم کرنے میں میری دلچسپی کا سبب صرف یہ ہے کہ



.....میں نے کچھ عرصہ قبل ہی اپنی کلینک شروع کی ہے۔ فیمل سیکشن میں ایک خاتون ڈاکٹر کام تو کر رہی ہیں لیکن آپ جانتی ہیں نازندگی کے باقی عملی میدانوں کی طرح ہماری فیلڈ میں بھی باعتبار قابل ڈاکٹر کی کلنگریز ہوتی ہیں۔ سر دست ہم اپنی کلینک میں کوئی نامی گرامی خاتون ڈاکٹر تو فورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں البتہ میری یہ خواہش ضرور ہے کہ کوئی ایسی خاتون ڈاکٹر رکھی جائیں جو قابل ہوں اور ہم فی الحال اپنے محدود وسائل میں ان کی قابلیت سے اپنی کلینک کا اعتبار قائم کر سکیں۔“ پیام نے حنا جمیل کے بارے میں اپنے استفسار کا بڑی وضاحت سے سبب بیان کیا۔

”آئی ایم سوری! مجھے ان کے بارے میں بالکل علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔“ میہ نے معذرت چاہی۔  
 ”جلیے کوئی بات نہیں۔“  
 ”لیکن اگر آپ چاہیں تو میں اپنے ان ساتھیوں سے جن سے میرا رابطہ رہتا ہے، حنا کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کسی کو معلوم ہو۔“  
 ”میں مشکور رہوں گا..... لیکن آپ سے رابطے کی صورت؟“  
 ”جی..... آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیں..... ویسے تو خیر میں خود بھی بتا سکتی ہوں آپ کو اگر آپ اپنا نمبر مجھے دے سکیں۔“

”شیور“ پیام نے جیب میں سے والٹ اور والٹ میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا پھر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے قلم نکالتے ہوئے بولا ”آپ اپنا نمبر بتائیں گی پلیز؟“  
 ”جی..... لکھئے۔“  
 میہ نے اسے گھر اور ہاسپٹل دونوں کے فون نمبرز نوٹ کرادیئے۔  
 ”تھینک یو۔“

☆☆☆

منجہاراؤنڈرپتھی کہ اقبال بے لے ڈگ بھرتا اس تک پہنچا اور اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ”میڈم! فون ہے ڈیکٹریٹ سے ڈپٹی صاحب کا۔“  
 منجہاراؤنڈر اڈھورا چھوڑ کر اپنے دفتر میں پہنچی اور اس نے کال ریسیو کی۔

”السلام علیکم میڈم!“  
 ”وعلیکم السلام سر..... کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“  
 ”الحمد للہ..... آپ سنائیے۔“  
 ”اللہ کا شکر ہے۔“

”میڈم! آپ تو ڈائریکٹریٹ والوں کے کام نہیں کرتیں مگر ڈائریکٹریٹ آپ کو ممکنہ حد تک سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“  
 ”مکھور ہوں سر۔“

”میرے پاس لوگ اکثر آتے رہتے ہیں ان شکایات کے ساتھ کہ میڈم منجہرا بہت سخت ہیں۔ کسی کی سفارش نہیں سہیں داخلے نہیں دیتیں، لیل کو پاس کرنے یا کم از کم رعایتی ترقی دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتیں۔ چلیں یہ نہ سہی لیل شدہ طالب علم کو پاس کا سرٹیفکیٹ ہی دے دیا کریں تاکہ بچہ کسی اور اسکول ہی میں اگلی جماعت میں داخلہ حاصل کر سکے۔ مکھئے کے افسران کو آپ کے بارے میں یہ گلہ رہتا ہے کہ آپ انہیں بھی اوبلانج نہیں کرتیں، اپنی مرضی چلاتی ہیں.....“

”قطع کامی کی معافی سر! یہ شکایات تو اب بہت پرانی ہو چکیں.....“ منجہرا نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

ڈپٹی صاحب دھیرے سے ہنس دیئے پھر بولے ”لیکن گزشتہ ہفتے کی سنے، وفاقی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اپنے کسی عزیز کی بچی کو آپ کے اسکول میں داخل کروانے کے لیے ایک سفارشی رقعہ ڈائریکٹر صاحب کو بھیجا جو انہوں نے ضروری کارروائی کے لیے مجھے بھجوا دیا، درخواست پر بچی کے والد کا فون نمبر موجود تھا۔ میں نے انہیں فون کر کے بتایا کہ اس اسکول میں نئے داخلوں کی گنجائش نہیں۔ وہ اپنی پسند کا کوئی اور اسکول بتائیں تو بچی کا وہاں داخلہ کر دیا جائے۔ فرمانے لگے، دو سال سے کوشش میں ہوں کہ بچی کو اس اسکول میں داخل کروا سکوں۔ میں نے کہا، میڈم خاصی سخت ہیں چونکہ ان کے اسکول میں ہر کلاس میں گنجائش سے زیادہ بچے بیٹھے ہیں لہذا وہ مزید داخلے دینے کے حق میں نہیں اس لیے آپ کی بچی کو اس اسکول میں داخلہ نہیں دے سکتے ہم۔ بولے ٹھیک ہے، ایک کام تو کر سکتے ہیں آپ۔ میں نے پوچھا وہ کیا، کہنے لگے میڈم کا ٹرانسفر کہیں اور کر دیں۔ جب سے یہ آئی ہیں انہوں نے ہر معاملے میں سختی کر رکھی ہے۔“

”میں تیار ہوں سر..... جہاں بھی آپ ٹرانسفر کر دیں میں جانے کو تیار ہوں مگر جہاں بھی جاؤں گی میرا انداز کار یہی ہوگا۔ لوگوں کو اسی طرح شکایت رہیں گی مجھ سے۔“ منہا نے کہا۔

”مگر یہ بھی سچ ہے میڈم کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کی ایڈمنسٹریشن کے معترف ہیں۔ تسلیم کرتے ہیں کہ جب سے آپ آئی ہیں ادارے کا رنگ روپ ہی بدل گیا ہے۔“

”عجیب بات ہے سر، ایک طرف تو بقول آپ کے لوگ شکایات کرتے ہیں اور دوسری جانب ایڈمنسٹریشن کی تعریف۔“

”میڈم یہ دوسری بات ہی تو اس حد تک آپ کے حق میں جاتی ہے کہ ڈائریکٹر صاحب بھی قلم ہاتھ سے رکھ کر کہتے ہیں، بتائیے اس خاتون کا کیا کیا جائے جو پریذیڈنٹ ہاؤس اور پرائم منسٹر سیکریٹریٹ سے آنے والی سفارشوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔“

”قلم ہاتھ سے رکھ کر! میں سمجھی نہیں سر۔“

”بارہا یہ سوچا گیا کہ آپ کا کسی دور افتادہ چھوٹے سے اور غیر اہم اسکول میں تبادلہ کر دیا جائے مگر آپ کی کارکردگی نے ڈائریکٹر صاحب کو ایسے کسی فیصلے سے عاجز کر دیا۔ خیر.....“ ڈپٹی صاحب نے ایک گہری سانس کھینچی پھر بولے ”آپ نے اپنے اسکول کے لیے ایک ایل ڈی سی کی ڈیمانڈ کی تھی۔“

”جی سر..... اصل میں ایک ہی کلرک ہے میرے پاس۔ دو ہوں تو کام میں آسانی ہو جائے۔“

”خوش ہو جائیے میڈم، ہم آپ کے ہاں ایک ایل ڈی سی بھیج رہے ہیں۔“

”تھینک یو ویری میچ سر۔“ منہا خوش ہو کر بولی ”کب سے سر؟“ اس نے جاننا چاہا کہ نیالور ڈویژن کلرک کب سے ڈیوٹی جوائن کرنے آ رہا تھا۔

”پوسٹنگ آرڈر تو فوری اطلاق کی شرط کے ساتھ جاری ہوا ہے۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں بندہ آجائے گا آپ کے پاس۔“

”تھینک یو ویری میچ سر۔“

”یو آر ویلکم۔“

منہا کے پاس بولنے کو اب کچھ نہ تھا۔

”اور میڈم؟“ ڈپٹی صاحب بولے۔

”بس سر، میں شکریہ کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”نہیں نہیں اگر کچھ کہنا چاہتی ہیں تو ضرور کہئے۔ دل کی بات دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔“



”سر! آپ اس ادارے کے لیے جس طرح آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں اس سے مجھے کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔“

”بس آپ کام کئے جائیں۔ خواہ ڈائریکٹریٹ کے کام کریں یا نہ کریں۔“

منتہا چپ رہی  
”اوکے میڈم۔“  
”رائٹ سر۔“

دو دن بعد طارق نامی ایک نوجوان اور اسمارٹ ایل ڈی سی نے اسکول میں جوائننگ دے دی۔

☆☆☆

پیام کا فون تین مرتبہ آچکا تھا۔ پہلی مرتبہ میہ نے حنا جمیل کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ کر سکنے پر اس سے معذرت چاہی۔ دوسری بار اس کا فون آیا تو وہ گھر پر نہ تھی۔ تیسری مرتبہ اس کا فون آنے پر اس نے اسے بتایا کہ وہ حنا کی ایک دوست کی دوست کے ذریعے اس کا اتنا پتا معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چوتھی بار پیام کا فون آیا تو وہ حنا کے متعلق یہ معلومات حاصل کر چکی تھی کہ وہ اپنے ایک کزن سے بیاہی جانے کے بعد کنیڈا چلی گئی ہے اور اب مستقل طور پر وہیں اقامت پزیر تھی۔

”اچھی لڑکیوں کی مشکل یہ ہے کہ لوگ انہیں زیادہ عرصہ فارغ نہیں رہنے دیتے۔“

میہ کی زبانی حنا جمیل کی شادی اور بیرون ملک قیام کی خبر سننے کے بعد پیام نے خوش دلی سے کہا۔

”پیام صاحب ڈاکٹر ز تو اچھی بڑی ہر طرح کی جلد گھیر لی جاتی ہیں۔“ میہ جو تین چار مرتبہ پیام سے بات چیت ہونے کی وجہ سے اب قدرے بے تکلف ہو چکی تھی ایک لمحے کو توقف کرنے کے بعد شکفتہ لہجے میں پھر گویا ہوئی ”اور لوگوں کا طریقہ واردات دیکھئے صاحبزادے کسی دفتر میں بمشکل اسٹنٹ لگ پائے ہوں گے اور ان کی والدہ اور بہنوں کی خواہش یہ ہوگی کہ لڑکی ڈاکٹر ہو جیسے ڈاکٹر لڑکی نے تپسیا ہی ان کے لیے کافی تھی۔“

”واقعی تپسیا کا ثنا ہے میڈیکل کی پڑھائی۔ سفید کوٹ بہت مشکل سے ملتا ہے۔ باقی دیوے آپ کا گھیراؤ کرنے والے کون تھے؟“

میہ نے ایک دلی دلی سرد آہ کھینچی۔

”بہت اچھے پیام صاحب مگر میں بد قسمت تھی۔“

”کیا مطلب!“ وہ چونکا۔

”میرے ہسپتال دہلی میں جاب کرتے تھے۔ ایسوسی ایٹ انجینئر..... لیکن میں ان کے پاس جانے والی ہی تھی کہ میری روانگی سے تین دن قبل ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی ڈیوٹی تھ ہو گئی۔“

”اوہ! ویری سیڈ! بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ پیام نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ”تو اب آپ..... میرا مطلب ہے

کہ کس کے ساتھ رہتی ہیں آپ؟“

”اپنے ان لازم کے ساتھ..... آپ کے ساتھ کیا ہوا پیام صاحب..... میرا مطلب ہے ایمین.....“

”شادی سے پہلے وہ اور میں سمجھا کرتے تھے کہ ہم دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں مگر شادی کے بعد پتا

چلا کہ ہم دو مختلف دنیاؤں کی پیداوار تھے لہذا ہم نے علیحدہ ہو جانا مناسب سمجھا۔“

میہ فون پر پیام سے بات کر رہی تھی اور ظہیر صاحب جنہوں نے آج اور اس سے قبل بھی دو مرتبہ پیام کا فون ریسو کیا تھا بڑی رازداری سے مسز ظہیر سے کہہ رہے تھے ”ارے بھئی یہ کون ہیں ڈاکٹر پیام جن کا روز روز فون آنے لگا ہے۔“

”ڈاکٹر ہیں تو ظاہر ہے یہہ کے ساتھیوں میں سے ہوں گے۔“  
 ”لیکن پہلے تو اتنے تواتر کے ساتھ ان کے فون کبھی نہیں آئے۔“  
 ”ضرورت نہیں پڑی ہوگی۔“

”اب کیا ضرورت پڑنے لگی ہے۔“  
 ”ہمیں کیا پتا۔“

”پتا کرو..... آنکھیں بند نہیں رکھنی چاہئیں۔“

”کیا مطلب!“ مسز ظہیر نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

”انجان مت بنو۔“ ظہیر صاحب نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا ”تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ میرا مطلب کیا ہے۔“

”یہہ ورنگ و دھن ہیں۔ ان کا پروفیشن ایسا ہے کہ کسی مرد کا فون ان کے لیے آنا معیوب نہیں سمجھا جاسکتا۔“  
 ”مگر ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ کوئی مرد خواہ بہو صاحب کا ہم پیشہ ساتھی ہی سہی ہماری جوان بہو کو آخر کس ضرورت کے تحت فون کرتا ہے۔“

”دھیرے بولیں کہیں یہہ سن نہ لیں۔“

”میں تو چاہتا ہوں کہ وہ سنیں۔“

”اوہ خدا! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“

”بیاگل ہو گیا ہوں۔“ ظہیر صاحب بھبک کر بولے۔

مسز ظہیر نے بے بس نگاہوں سے انہیں دیکھا اور خاموش ہو جانے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

دن پلک جھپکتے میں ہوا ہوتے ہیں۔ سالانہ امتحانات کے نتائج کے بعد نیا تعلیمی سال شروع ہونا کل ہی کی بات محسوس ہوتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پہلی ٹرم کے امتحانات بھی ہو گئے۔ پہلی اور دوسری ٹرم کے نتائج سے والدین کو آگاہ کرنے کے لیے مہتمما نے ان دونوں ٹرمز کے اختتام پر ”پیرنٹس ڈے“ کا انعقاد رواج دیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر اچھا تعلیمی ادارہ والدین اور اساتذہ کے براہ راست رابطے کے لیے ”پیرنٹس ڈے“ کا انعقاد کرتا ہے۔ مہتمما کے اس ادارے میں آنے سے قبل یہاں ایسی کسی روایت کا رواج نہ تھا۔ پہلی اور دوسری ٹرم تو کجا سالانہ نتائج کے موقع پر بھی والدین کو باضابطہ طور پر مدعو کرنے کا رواج نہ تھا جو والدین اور سرپرست خود ہی آنا چاہتے آ جاتے۔ پہلی اور دوسری ٹرم کے امتحانات کے بعد بچے اپنے والدین کو پراگریس رپورٹ کارڈز دکھانے کے لیے گھر لے جاتے تو دونوں واپس نہ لاتے۔ فیل شدہ بچے والدین کی ڈانٹ اور مار کے خوف سے رپورٹ کارڈز اپنے بستوں میں چھپائے رہتے۔ بعض نتیجہ تبدیل کرنے کی کوشش میں رپورٹ کارڈ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔ بعض والدین کے بجائے خود ہی دستخط کر لاتے۔ بہت سے رپورٹ کارڈز کھوجانے کا بہانہ کر کے والدین اور اساتذہ دونوں کو چکما دینے کی کوشش کرتے۔ پیچرز رپورٹ کارڈز واپس کرنے کا تقاضا کر کے عاجز آ جاتیں اور اس سلسلے میں ہر روز کئی بچوں کی پرنسپل کے رُوبرو حاضری ہوتی۔

مہتمما نے ادارے میں آنے کے بعد ان تمام مسائل کے دفعیے کے لیے ”پیرنٹس ڈے“ کا پروگرام ساتھیوں کے سامنے رکھا تو مسز اشفاق بولیں ”میڈم! آپ جو والدین کو بچوں کی جوابی کاپیاں دکھانے کی بات کر رہی ہیں اس سے تو بہت مسائل پیدا ہوں گے۔“  
 ”مثلاً؟“ مہتمما نے پوچھا۔



”پیرئس کو بچوں کے جوابی پرچے دکھائے جائیں گے تو وہ تو عینکس لگا لگا کر ٹیچرز کی غلطیاں نکالیں گے۔ یہاں نمبر کم دیئے ہیں، فلاں سوال چیک ہونے سے رہ گیا۔ اس سوال پر نمبر نہیں دیئے۔ ٹوٹل غلط ہے۔ سپلیمنٹ غائب ہے۔“ مسز اشفاق ایک ہی سانس میں بولیں۔

”مسز اشفاق غلطیوں کی گنجائش چھوڑی ہی کیوں جائے۔“

”میڈم جی غلطی تو انسانی سرشت میں شامل ہے۔ غزالہ نے کہا۔

”درست۔“ منجہا نے تائید کی ”مگر انسان اپنی بساط کی حد تک کوشش تو کر سکتا ہے غلطی نہ کرنے کی۔“

”وہ تو میڈم ہم سب ہی کرتے ہیں۔“ مسز اشفاق نے کہا۔

”بس تو پھر ڈر کس بات کا۔ اتفاقی غلطیوں پر ہم والدین سے معذرت کر سکتے ہیں۔“ منجہا نے اپنے رُوبرو بیٹھی

اشاف ممبرز پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔

”ایک بات اور بھی میڈم۔“ عقبی نشستوں میں بیٹھی مس فرخ نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے منجہا کی توجہ حاصل

کرنی چاہی۔

”جی کہئے۔“

”میڈم“ آپ نے کہا اس دن اسکول میں معمول کے مطابق ریگولر کلاسیں نہیں ہوں گی۔ فرسٹ ٹرم کا رزلٹ

دینے کے لیے اسکول کے تمام بچوں کی ایک دن کی پڑھائی کا حرج بہت بڑا نقصان ہوگا۔“

”مس فرخ مجھے امید ہے کہ اس نقصان سے حاصل ہونے والا فائدہ کہیں زیادہ ہوگا۔ والدین بچوں کی

کمزوریوں سے آگاہ ہو کر انہیں سیکنڈ ٹرم کے لیے زیادہ بہتر تیاری کروا سکیں گے۔“

”میڈم فرسٹ اور سیکنڈ ٹرم میں تو ویسے بھی اکثر بچے قفل ہوتے ہیں۔ اتنے غیر اہم رزلٹ کے لیے والدین کو

کیوں بلایا جائے۔“ مسز روشن بولیں۔

”مسز روشن یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ فرسٹ ٹرم کا رزلٹ غیر اہم ہوتا ہے۔ فرسٹ اور سیکنڈ ٹرم کے نتائج تو

سالانہ امتحان کے نتیجے کی بنیاد بنتے ہیں۔ جو والدین اور اساتذہ اسکول کے پہلے دو امتحانات میں بچوں کی کمزوریاں

پکڑ لیتے ہیں اور ان کی بہتری کی کوشش کرتے ہیں انہی کے بچے سالانہ امتحان میں بہتر نتائج دکھاتے ہیں۔“

پیرئس ڈے کے سلسلے میں ہونے والی اس اشاف میٹنگ میں خاصی بحث و تجویس کے بعد بالآخر یہ طے پایا گیا کہ

فرسٹ ٹرم میں بچوں کا نتیجہ والدین تک پہنچانے اور والدین سے بچوں کے مسائل پر بات کرنے کے لیے پیرئس ڈے

ضرور منعقد ہوگا۔

”بچوں کے صرف تعلیمی ہی نہیں دیگر مسائل کے سلسلے میں بھی والدین سے بات کریں۔“ منجہا نے ٹیچرز سے

کہا ”مثلاً بعض بچے انتہائی شرمیلے ہوتے ہیں بعضوں میں خود اعتمادی کا فقدان ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کسی بچے کی جسمانی

صحت اچھی نہ ہو اور یہ جسمانی کمزوری ہی اس کی تعلیمی کمزوری کا بھی سبب ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی بچہ یا بچی انجیلی یا گیمز

پیریڈ کے دوران کلاس روم میں چھپ جانے کا عادی ہو یا ممکن ہے کسی بچے میں کوئی اخلاقی برائی ہو۔ والدین سے

بچوں کے مسائل پر بات کرنے کے لیے بھی یہ ایک کارآمد دن ہوگا۔ ہاں دیر سے اسکول آنے اور دیر سے گھر واپس

جانے والے بچوں کے والدین کو ہدایت کی جائے کہ وہ اسکول کے قاعدوں ضابطوں کی پابندی کریں۔“ منجہا نے

ٹیچرز سے کہا۔

”اسکول میں پہلے پیرئس ڈے پر بچوں کے والدین اور سرپرستوں کی جانب سے غیر معمولی جوش و خروش دیکھنے

میں آیا۔ صبح ہی والدین اپنے بچوں کے جوابی پرچے دیکھنے اور نتیجہ لینے کے لیے اسکول پہنچنا شروع ہو گئے۔ اپنے

اپنے بچوں کے کمرہ جماعت میں جا کر وہ فائل کور میں ملفوف اپنے بچوں کے جوابی پرچے دیکھتے، بچے کو جو ساتھ ہی بیٹھا

ہوتا اس کی غلطیاں دکھاتے اور سمجھاتے بجاتے۔ اپنے بچے کے بارے میں ٹیچرز سے بات کرتے، بچوں کے مسائل سے آگہی حاصل کرتے اور بچے کے بعض مسائل سے ٹیچر کو خود بھی آگاہ کرتے اور بہت مطمئن ہو کر واپس جاتے۔ دن بھر بڑی گہما گہمی رہی۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کے مسائل ڈسکس کرنے کے لیے منتہا سے بھی ملے۔ منتہا نے کئی مرتبہ اپنے دفتر سے باہر نکل کر خود بھی کلاس رومز کا جائزہ لیا اور والدین کے پاس جا کر ان سے بات چیت کی۔ والدین نے پیرنٹس ڈے کے انعقاد کو خاصا سراہا۔ ادارے میں رونما ہونے والی بہتری کی تعریف کی۔ اس موقع پر بطور خاص رکھوائے جانے والے رجسٹر میں اپنے تاثرات اور آراء درج کیں جنہیں بعد میں منتہا نے بغور پڑھا اور ٹیچرز کو بھی پڑھوایا۔ بعض والدین نے جوابی پرچوں کی پڑتال میں بعض اساتذات کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی۔

پیرنٹس ڈے کے انعقاد کے نتائج خاصے خوشگوار رہے۔ بعض ٹیچرز نے خود اعتراف کیا کہ بہت سے کمزور اور بے پروا بچوں کے والدین ان کی پڑھائی کے سلسلے میں خاصی دلچسپی اور سرگرمی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ بچے بھی جنہیں منتہا نے اسبلی میں یہ بتا دیا تھا کہ سیکنڈ ٹرم کے بعد پھر اسی طرح والدین کو ان کے جوابی پرچے اور نتیجے دکھانے کے لیے بلایا جائے گا نہ صرف پڑھائی بلکہ بہت سے معاملات میں محتاط ہو گئے۔

اگلی بار جب پیرنٹس ڈے منعقد ہوا تو منتہا نے اپنے دفتر کے باہر ایک مشورہ بکس بھی رکھوایا جس میں والدین نے بچوں اور ادارے کی مزید بہتری کے لیے بڑے اچھے مشورے لکھ کر ڈالے۔

سہ ماہی اور ششماہی امتحانات کے بعد یوم والدین اب ادارے کی گویا روایت بن چکا تھا۔ اس روز بھی ”پیرنٹس ڈے“ ہی تھا۔ والدین جوق در جوق اسکول آ رہے تھے جارہے تھے۔ منتہا دو مرتبہ اسکول کا راؤنڈ لے چکی تھی اور اس وقت ڈائریکٹریٹ سے آنے والی ڈاک دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک نے اسے دروازے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”مے آئی کم ان میڈم؟“

اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا ترنگا سوئڈ بوئڈ شخص دو بچوں کے ہمراہ اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں دوپورٹ کارڈز پکڑ رکھی تھیں۔ اس کے عقب میں ایک عورت سیاہ برقع اوڑھے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کے گرد نقاب اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ صرف آنکھیں اور پیشانی کا نصف زیریں حصہ بے نقاب تھا۔

”جی آئیے۔“

مذکورہ شخص آگے بڑھا اور اس کے ہمراہ دونوں بچے بھی ڈرے سہے سے آگے بڑھ آئے۔ عورت ان تینوں کے عقب میں رہی۔

”میڈم! میں ان دونوں بچوں کا فادر ہوں۔“ مرد نے خود کو متعارف کرایا۔

”تشریف رکھئے۔“

مرد جو ایک تناؤ کی کیفیت میں دکھائی دیتا تھا صوفے پر بیٹھ گیا، عورت اور بچے کھڑے رہے۔

”پلیز آپ بھی بیٹھئے۔“ منتہا نے خاتون سے کہا۔ وہ سمٹ کر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

”میڈم، یہ میری بیٹی آپ کے اسکول میں فقہہ کلاس کی سٹوڈنٹ ہے اور بچہ کلاس تھری میں پڑھتا ہے۔ اور یہ ان کا رزلٹ ہے۔“ مرد صوفے پر سے اٹھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی رپورٹ کارڈز تقریباً پھینکنے والے انداز میں منتہا کے سامنے اس کی میز پر ڈال دیں۔ منتہا کو اس کا یہ انداز قطعاً اچھا نہ لگا۔ کن آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ شدید



اعصالی تناؤ میں محسوس ہوا۔ منتہا نے میز پر پڑی رپورٹ کا رڈز اٹھائیں اور انہیں یکے بعد دیگرے کھول کر بچوں کا نتیجہ دیکھا۔ دونوں بُری طرح ٹیل تھے۔ اس دوران مرد اٹھا اور اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ منتہا اس کی اس حرکت پر چونکی۔

”میڈم میں سعودیہ میں ہوتا ہوں۔ اور یہ عورت بچوں کے ساتھ یہاں ہوتی ہے۔“ اس شخص کا لہجہ بھی اس کے ذہنی تناؤ کا غماز تھا۔

”یہ آپ کی.....؟“ عورت اور مرد کی ظاہری شخصیت کے درمیان زمین آسمان کے بُعد نے منتہا کو سوال ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

”جی..... بد قسمتی سے بیوی ہے میری۔“ مرد نے تلخ لہجے میں کہا۔

”بیٹا آپ لوگ بھی بیٹھے۔“ منتہا نے بچوں سے کہا۔

”ان کی صحت دیکھ رہی ہیں آپ!“ مرد نے دونوں بچوں کی طرف انگلی اٹھائی پھر بولا ”ایک بچہ اور ہے گھر پر وہ بھی انہی دونوں کی طرح مردہ دکھائی دیتا ہے۔ اس عورت نے اپنی جہالت اور بے وقوفی سے ان کی صحت، تربیت، تعلیم سب کچھ برباد کر رکھا ہے۔ میں گریجویٹ ہوں یہ ان پڑھ۔ ان بچوں کی وجہ سے پردیس میں پڑا ہوں اور یہ..... یہ مجھے یہ نتیجہ دکھا رہے ہیں۔“ مرد نے انگلی سے رپورٹ کا رڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر لحظہ بھر کر رک کر دل گرفتہ لہجے میں بولا ”ان کی کس ضرورت کا خیال نہیں رکھتا ہوں میں۔ کھانا، پینا، سیر و تفریح، اسکول، ٹیوشن، عید، بقرعید، مٹھی بھر بھر کے قمیص بھیجتا ہوں میں اس عورت کو اور یہ سب کچھ اپنے اور میرے رشتے داروں میں اڑا دیتی ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اسے کچھ خیال نہیں۔ جنگلی عورت!“ آخری دو الفاظ اس نے انتہائی تحقیر سے ادا کئے۔

ظاہری آثار و شواہد اور مرد کے انداز گفتگو سے منتہا کو یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ عورت اس کے لیے ناپسندیدہ تھی، مگر سوال یہ تھا کہ اس ناپسندیدگی کا اس قدر بے رحمی اور حقارت سے اظہار وہ اس کے دفتر میں کیوں کر رہا تھا۔ بچوں کے والدین اور سرپرست کبھی بھی اپنے ایسے خانگی مسائل بھی جن کا تعلق ان کے بچوں کی ذات سے بھی ہوتا ڈسکس کرنے اسکول آجایا کرتے تھے، مگر یہ پہلا اتفاق تھا کہ کوئی شخص اس کے دفتر میں بیٹھ کر اس قدر بے رحمی سے اپنی خانگی زندگی کے نیچے ادھیڑ رہا تھا۔

”دیکھئے جناب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ یہ سب کچھ آخر مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ یہ تو آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔“

”میڈم! اس جاہل عورت کو سمجھائیں۔“ مرد نے عورت کی جانب انگلی اٹھائی۔

”معاف کیجئے گا، میں یہاں لوگوں کی فیملی پر ایلمز سننے اور حل کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔“ منتہا کو عورت کی مسلسل توہین کرتے دیکھ کر مرد پر غصہ آ گیا۔

”تو پھر مجھے بتائیے میں کیا کروں؟“ مرد نے بے بسی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میں کیا بتا سکتی ہوں؟“ منتہا کے لہجے میں ناگواری برقرار تھی۔

”پلیز! انسانی ہمدردی کے ناطے ہی کچھ مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟“ مرد نے لجاجت سے کہا ”یہ عورت کوڑھ مغز ہے۔ جب چھٹی پر گھر آتا ہوں اسے طوطے کی طرح سبق پڑھا کر جاتا ہوں کہ بس اپنے گھر اور بچوں سے مطلب رکھو۔ رشتے داروں کو خوش کرنے کے لیے ان کی چٹنی چڑی باتوں میں آ کر میری محنت کی کمائی مت لٹاؤ۔ بچوں کی تعلیم پر توجہ دو مگر یہ ایک کان سے سنتی ہے دوسرے سے اڑا دیتی ہے۔ وہی کرتی ہے جو اس کا جی چاہتا ہے۔ کچھلی مرتبہ جب میں چھٹی پر گھر آیا جاتے ہوئے ایک لاکھ روپیہ اس کے پاس رکھوایا اور اچھی طرح سمجھایا کہ فلاں آدمی آئے گا اس کی امانت ہے اسے دینی ہے یہ رقم۔ میرے جانے کے بعد میرے اپنے بھانجے نے جسے اس رقم کا معلوم تھا اس



سے کسی ضرورت کے بہانے وہ رقم مانگی اور اس نے میری اجازت لیے بغیر ایک لاکھ روپا اس کے حوالے کر دیا۔ جب وہ آدی، جس کی وہ رقم امانت تھی، رقم لینے آیا تو اس نے اس سے کہہ دیا، میرے پاس تو کوئی رقم نہیں رکھوا کر گئے جبار صاحب۔ اس نے مجھے جھوٹا سمجھا اور فون کر کے گلہ کیا کہ جبار صاحب، آپ کی بیوی تو کہتی ہے آپ کی کوئی رقم امانت نہیں ہے میرے پاس۔ میں نے اسے فون کیا تو اس نے بڑے آرام سے کہا، تمہارے بھانجے کو ضرورت تھی، وہ رقم تو میں نے اسے دے دی۔ ایک لاکھ روپیہ مجھے اس آدی کو بھجوانا پڑا۔ میڈم، آپ اس سے پوچھیں تو یہ چاہتی کیا ہے؟“

منتہا کو سہی سہی عورت سے کچھ پوچھنے میں تردد ہوا مگر اس ناگہانی افتاد سے کسی صورت نمٹنا تو تھا۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا اور کچھ جھجکتے ہوئے کہا، ”مزر جبار، آپ کے مسیڈ جو شکایات کر رہے ہیں، کیا یہ درست ہیں؟“

”جی میڈم!“ عورت نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”ایک بات بتائیے،“ منتہا نے مرد کی طرف دیکھا، ”آپ اپنی مزر اور بچوں کو سعودیہ میں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟“

”اس گنوار عورت کو ساتھ رکھ کر میں نے اپنے دوستوں سے ہنسی اڑوانی ہے اپنی۔ اسے اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کی تو تمیز نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چیز لاتا ہوں سعودیہ سے، یہ ان کو ایسے استعمال کرتی ہے کہ اس کی بدسلوکی دیکھ کر غصہ آنے لگتا ہے مجھے۔ اس برقعے کے نیچے اس نے باہر کا سوٹ پہن رکھا ہے۔ آپ دیکھیں سلائی کیسی کردائی ہے اس نے، اتنے اعلیٰ سوٹ کی۔ دنیا کی سوئس صدی کی طرف جا رہی ہے اور یہ بیس سال پرانا فیشن کرتی ہے۔ پھوپھی کا خیال نہ ہوتا تو میں اب تک اسے.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان کی پھوپھی کا“ منتہا کے لہجے میں تجسس تھا۔

”نہیں جی..... اپنی پھوپھی کا..... اس کی والدہ میری پھوپھی لگتی ہیں۔“

”آئی سی۔“

”میں تو خاندان میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ہمارے بڑے..... خدا انہیں عقل دے، بس چند جملے رٹے ہوتے ہیں انہیں تو..... اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالے گا۔ گھر کی لڑکی ہے وفا کرے گی، چاہے گھر کی لڑکی کو اٹھنے بیٹھنے کی بھی تمیز نہ ہو۔ میں نے بی ایس سی کر رکھا ہے اور یہ..... اس نے اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ گاؤں سے اٹھی اور شہر میں آ کر بیٹھ گئی۔ دو سال پہلے نئی کوٹھی خریدی ہے میں نے۔ اسے فرنشڈ کرایا، سجاایا۔ آپ ذرا میرے ڈرائنگ روم کا کارپٹ آ کر دیکھیں، کتنے بڑے بڑے داغ پڑے ہوئے ہیں اس پر۔ گاؤں سے آئے سرسوں کے تیل کی بوتل قالین پر رکھ کر یہ بچوں کے اور اپنے سر میں تیل چھڑتی ہے۔ اوبائی گاڈ، اس عورت نے مجھے پاگل کر دیا ہے“ اس نے اپنا سر پھر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور دونوں بچوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولا، ”اسے ان پر بھی رحم نہیں آتا۔ ان کی صحت دیکھ رہی ہیں آپ؟ اس عورت کی بے پروائی نے انہیں ڈھانچا بنا رکھا ہے۔ سارا دن بس گھر سے باہر پھرتے ہیں، نہ ان کے آرام کا خیال نہ کھانے کا خیال، نہ تعلیم کی پروا..... میڈم پلیز! آپ بتائیں، میں کیا کروں؟“

آخری جملے پر اس کی آواز بھرا گئی۔

”معاف کیجئے، اب تک نہ خود آپ نے اپنا نام بتایا نہ میں پوچھ سکی ہوں۔“

”جبار احمد!“

”جبار صاحب، میرے اب تک کے کیریئر میں یہ پہلا اتفاق ہے کہ بچوں کے والدین میں سے کوئی صاحب اس طرح اپنے خاکی معاملات بیان کر رہے ہیں اور میں بھستی ہوں ایسا کسی انتہا کے بغیر ممکن نہیں یعنی کوئی بھی فرد اپنے گہرے مسائل کسی غیر کے سامنے اس وقت تک نہیں کھولتا جب تک وہ انتہائی مجبور اور بے بس نہ ہو جائے یقیناً آپ بھی



با امر مجبوری ہی میرے سامنے یہ سب کچھ بیان کر رہے ہیں۔ شاید آپ کے سامنے کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔“  
 ”آپ ٹھیک سمجھی ہیں میڈم! میں اسے اپنے گھر والوں سے اس کے اپنے گھر والوں سے عزیز رشتے داروں سے دوست احباب سے محلے داروں سے غرض ہر ایک سے سمجھوا سمجھوا کر تھک چکا ہوں۔ اب کوئی اور راستہ نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ اسے بچوں کے اسکول والوں کے سامنے ذلیل کروں۔ شاید یہ آپ کی زبان سمجھ جائے۔ بچوں کی ٹیچرز ہی اسے سمجھائیں۔“

”آپ ہمیں کچھ وقت دیں۔ ہم کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہ ہمارا دائرہ کار ہرگز نہیں لیکن صرف اس لیے کہ شاید ہماری کوششوں سے آپ کے گھر کے حالات بہتر ہو سکیں اور ان معصوموں کے چہروں پر خوف اور اندیشوں کے بجائے اطمینان اور مسرت دکھائی دے سکے ہم آپ کی سز کے ساتھ بات چیت اور انہیں سمجھانے بجھانے کے لیے وقت نکالیں گے مگر اس کے لیے انہیں گاہے گاہے ہمارے پاس آنا ہوگا۔“

”میں تو کہتا ہوں آپ اسے مستقل یہیں رکھ لیں“ مرد نے ناگواری سے کہا۔

”ایسا نہ کہیے، یہ آپ کے بچوں کی ماں ہیں۔“

”یہی تو مجبوری ہے ان بچوں کی وجہ سے ہی تو میں ہر سال چھٹی پر گھر آتا ہوں ورنہ میں اس عورت کا منہ بھی نہ دیکھوں۔“

”پھر وہی بات۔ دیکھیے بڑے تو بڑے بچے بھی اپنی انسلٹ برداشت نہیں کرتے۔“

”میں تنگ آ چکا ہوں میڈم!“

”اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ انشاء اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔“

”خدا کرے ایسا ہو جائے۔“

”سز جبار آپ کل میرے پاس آ سکتی ہیں؟“ منتہا نے بچوں کی ماں سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی ”مرد نے کہا“ نوپرا بلیم میڈم“ میں اسے چھوڑ دوں گا“ کتنے بچے؟“

”میں آج اپنی ان ٹیچرز سے جن کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اس سلسلے میں مددگار ہو سکتی ہیں بات کروں گی۔ گیارہ بجے ہماری بریک ہوتی ہے۔ کل آپ انہیں پونے گیارہ بجے کے لگ بھگ یہاں چھوڑ دیں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“

☆☆☆

اگلے دن پونے گیارہ بجے بجائے وہ دس بج کر پچیس منٹ پر ہی اپنی بیوی کو اسکول پہنچا گیا۔ خود اسے کسی کام سے صدر جانا تھا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک واپسی کا کہہ کر وہ چلا گیا۔

منتہا اپنی ایک دو ٹیچرز سے اس مسئلے پر بات چیت کر چکی تھی۔ مسئلہ بہت واضح تھا۔ ایک بے جوڑ شادی جس کے نتائج و عواقب فریقین ہی نہیں متعلقین بھی بھگت رہے تھے۔ معصوم بچوں کے چہروں پر لرزاں خوف کے سائے اس کے نقیب تھے۔

منتہا نے خاتون کی طرف دیکھا۔ اپنا آدھا چہرہ چادر سے چھپائے وہ آج بھی کل کی طرح سہمی سمٹی سی بیٹھی تھی۔

”آپ بالکل اطمینان سے بیٹھیں“ منتہا نے کہا۔

”جی..... میں..... میں ٹھیک ہوں۔“

”جی نہیں آپ آرام سے نہیں بیٹھی ہیں اس لیے میں کہہ رہی ہوں۔“

اس نے قدرے آرام دہ انداز نشست اختیار کر لیا۔

”بچے آج اسکول آئے ہوئے ہیں؟“

”ہاں جی۔“

”اور چھوٹا؟“

”اسے اس کی پھوپھی کے گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ ماما بھی لگتی ہے اس کی۔“

”یعنی؟“

”میری نند میرے بھائی سے بیاہی ہوئی ہے۔“

”آئی سی..... آپ کے بھائی تو خوش ہیں یا وہ بھی آپ کے ہسینڈ کی طرح.....؟“ منتہا نے اپنا سوال ادھورا

چھوڑ دیا۔

”اللہ کا شکر ہے، میاں بیوی دونوں بہت خوش ہیں۔“

”یہاں کوئی مرد نہیں ہے آپ اپنے چہرے سے نقاب ہٹا سکتی ہیں۔“

”کوئی آ تو سکتا ہے..... آپ کا کلرک چہرہ اسی۔“

”میں اس کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔“ منتہا نے گھٹی بجائی۔ اقبال کمرے کے دروازے پر وارد ہوا ”اقبال

دروازے کا پردہ کھینچ دو اور دیکھو کوئی مرد اندر نہ آنے پائے اور ہاں، مسز بصیر سے کہنا بریک ہوتے ہی میرے پاس

آئیں۔“

”جی بہتر!“ اقبال نے دروازے پر پڑا پردہ کھینچ دیا اور واپس پلٹ گیا۔

منتہا عورت کی طرف متوجہ ہوئی ”اب آپ اطمینان سے نقاب ہٹا سکتی ہیں۔“

عورت نے اپنے چہرے کا زیر نقاب حصہ عیاں کر دیا۔ وہ معمولی تک سبک کی ایک زرد رُو عورت تھی۔

”ایک بات بتائیے آپ کے شوہر کو آپ سے اتنی شکایات کیوں ہیں؟“

”میں تو شکایت بھی نہیں کر سکتی“ اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ منتہا نے چونک کر اسے دیکھا۔

عورت اپنا دایاں ہاتھ برقع کے اندر اپنی گدی سے سر کے اوپر تک لے گئی اور چند ہی لمحوں بعد اس نے اپنا ہاتھ

نکال کر منتہا کے سامنے کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں بالوں کا ایک گچھا تھا۔

”یہ کیا؟“

عورت کے لبوں پر بڑی کرب آمیزی مسکراہٹ پھیل گئی ”کسی تناور درخت کو بھی روز جھنجھوڑتے رہیں ناجی تو اس

کی جڑیں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

عورت کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک لہر امنڈتی دکھائی دی۔

”آپ سمجھیں گی بھی نہیں میڈم! میرے شوہر جب چھٹی پر گھر آتے ہیں ناجی تو میں اور بچے دعا مانگتے ہیں ان

کے جلد از جلد واپس جانے کی۔“

”کیوں؟“

”کون عورت چاہے گی کہ اسے بالوں سے نپکھ کے ساتھ لٹکا دیا جائے اور نہ مجھے آواز نکالنے کی اجازت ہوتی

ہے نہ بچوں کو رونے کی۔ کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر سکتے ہیں وہ۔ ان کی صحت دیکھی ہے نا آپ نے.....

خوف نے انہیں مار دیا ہے اور بیوی بچوں پر جو مال دولت لٹانے کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ناجی، صرف چار ہزار روپیہ

بجھواتے ہیں وہ ہمیں مہینے کا اس میں کھانا، پینا، بچوں کی فینیس، دکھ بیماری دینا دلا نا سب کچھ ہوتا ہے۔ ہاں جی، بیکلی اور

کس کے بل بھی۔ نام یہ ہے کہ جبار اپنے بیوی بچوں کو بہت عیش کراتا ہے، بس ایک گھر ہی اپنا ہے باقی کیا عیش ہیں



میں اور میرے بچے ہی جانتے ہیں۔“  
 ”حیرت ہے! آپ کے شوہر تو کل کچھ اور کہہ رہے تھے۔“  
 ”بس ایک بچوں کا اسکول ہی رہ گیا تھا ورنہ اس شخص نے مجھے کہاں کہاں اور کس کس طرح سے ذلیل نہیں کیا“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”ہاں مجھے خود بہت حیرت ہوئی کہ انہوں نے یہاں آ کر یہ سب کچھ کیوں کہا۔“  
 ”مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل کر کے اسے تسکین ملتی ہے۔“  
 ”آپ احتجاج نہیں کرتیں؟“  
 ”کیا میں کر سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں، مذہب، اخلاق، قانون سب عورت کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ مرد کی زیادتی پر احتجاج کر سکتی ہے۔“  
 ”یہ آپ پڑھی لکھی عورتوں کی باتیں ہیں میڈم! ہم تو مردوں کے پیروں کی جوتیاں ہیں“ اس کے لہجے میں کرب تھا۔

”آپ کے بھائی اپنی بیوی سے اس کے بھائی کی زیادتیوں کے خلاف کچھ نہیں کہتے؟“  
 ”پرانی آگ میں کون کودتا ہے جی، وہ دونوں خوش ہیں، ویسے بھی میں اپنے گھر والوں کو بہت کم کوئی بات بتاتی ہوں۔ باپ ہیں نہیں والدہ بوڑھی ہیں۔ انہیں دکھی کرنے سے فائدہ۔ بہن بھائی، بس ہم دو ہی ہیں۔ میں بھائی کو کچھ نہیں بتاتی۔ بھائی سے جو میری نند بھی ہے کہتی ہوں تو وہ الٹا بھائی کی حمایت میں بولنے لگتی ہے۔ اس کا خیال ہے میں اس کے بھائی کے لائق تھی ہی نہیں اور یہ سچ بھی ہے جی، اس کا بھائی اسمارٹ ہے، تعلیم یافتہ ہے۔“  
 ”اسمارٹ تو آپ بھی بن سکتی ہیں۔ خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی آپ نے؟“  
 ”کیا بدلوں اور کیسے بدلوں میڈم!“

”دیکھیے، ایک چیز ہوتی ہے سیلف گرونگ۔ انسان تھوڑی سی کوشش اور دلچسپی سے اپنی شخصیت کو بہت نکھار سکتا ہے۔ مرد کو بنی سنوری اور پُر اعتماد عورت اچھی لگتی ہے۔ بُرامت مانے گا، لگتا ہے آپ نے کبھی اپنی شخصیت کو اپنے شوہر کے مزاج کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“  
 ”میڈم! میں تو سیدھی سادی بے پڑھی لکھی عورت ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا“ وہ کچھ خفیف ہو کر بولی۔  
 ”آپ کو سیکھنا چاہیے تھا۔ مجھے ایک بات بتائیے آپ کے شوہر نے کبھی آپ سے یہ کہا کہ وہ آپ کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی انہوں نے آپ کو اچھے کپڑے یا میک اپ کا سامان لا کر دیا۔“  
 ”شروع شروع میں بہت چیزیں لاتے تھے۔“  
 ”اب؟“

”اب صرف کپڑے لاتے ہیں جی۔ میک اپ شیک اپ کا کبھی شوق ہی نہیں رہا مجھے۔ میں ان کی لائی ہوئی چیزیں ادھر ادھر بانٹ بانٹ دیا کرتی تھی۔“

”جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں آپ کا اور آپ کے شوہر کا مسئلہ ہی یہ ہے کہ آپ نے خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ دیکھیے شخصیت کے نکھار میں تعلیم کا بہت حصہ ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے ارد گرد بہت سی ایسی عورتیں مل جائیں گی جو کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی اپنے مردوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ انہیں اپنے آپ کو نمایاں رکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ آپ کو بھی خود کو بدلنا ہوگا۔“

”کیسے بدلوں میڈم! آدمی کا دل رو رہا ہو تو وہ ہنس کیسے سکتا ہے؟“

منجہا نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی ”وقفہ ہونے ہی والا ہے۔ میں آپ کو اپنی ایک ایسی ٹیچر سے ملواؤں گی جو اپنی زندگی سے زیادہ خوش نہیں ہیں لیکن آپ ان کا پہننا اوڑھنا دیکھیے گا۔ ان کی خوبصورت شخصیت کو دیکھ کر آپ کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ وہ اندر سے کتنی ٹوٹی پھوٹی ہیں۔“

بریک ہوتے ہی مز بصیر اس کے دفتر میں آ پہنچیں۔  
”بیٹھے مز بصیر!“

مز بصیر ایک اچھی ہوئی نظر منجہا کے کمرے میں بیٹھی خاتون پر ڈالتی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”مز بصیر یہ ہیں وہ خاتون جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ آپ کو ان کے لیے تھوڑا سا وقت نکالنا ہوگا۔ مسئلہ کم و بیش وہی ہے جس کا میں نے اندازہ کیا تھا۔ اگرچہ یہ ہمارے اور آپ کے دائرہ کار کی بات نہیں لیکن اگر ہماری تھوڑی سی کوشش اور رہنمائی سے ایک گھر کے حالات بہتر ہو جائیں تو یہ یقیناً ایک کارِ خیر ہوگا۔“

”میں پوری کوشش کروں گی میڈم!“ مز بصیر نے خاتون کی جانب دیکھا اور گرم جوشی سے کہا ”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مس میری ساری دلچسپی تو اپنے بچوں کے ساتھ ہے۔“

”مز بصیر ہماری بڑی اچھی ٹیچر ہیں۔ آج سے آپ انہیں اپنی دوست سمجھیے۔“ کیوں مز بصیر؟“

”بالکل میڈم!“ مز بصیر مسکرا دیں اور انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ خاتون کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”میڈم میں انہیں اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں؟“

”جی..... جی..... ضرور۔“

”جاؤں میڈم؟“ خاتون جو اٹھ کھڑی ہوئی تھی اجازت طلب لہجے میں بولی۔

”میری دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔“

عورت دھیرے سے مسکرا دی۔

چھپے پیر یڈ میں مز بصیر نے اسے رپورٹ دی ”میڈم! میں انہیں وزیٹر روم میں لے گئی تھی۔ بریک کے بعد میرا پیریڈ فری تھا لہذا کافی تفصیل سے بات ہوئی جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں مسئلہ صرف یہ ہے کہ ان محترمہ کے شوہر انہیں ٹیپ ٹاپ میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بالکل گاؤدی سی ہیں۔ میں نے انہیں کافی سمجھایا ہے۔ اپنے گھر بلایا ہے انہیں۔ آپ دیکھیے گا انشاء اللہ بدل جائیں گی۔ ہسپتال بھی آگئے تھے ان کے کہنے لگے جس کام سے گیا تھا وہ جلدی ہو گیا اس لیے آگیا ہوں۔ آپ بڑی اچھی ہیں اس لیے آپ کے نام شکریہ کا پیغام مجھے دے کر وہ اپنی منزل کو لے کر چلے گئے تھے۔ میڈم شوہر تو کافی اسارٹ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے الٹ لگتے ہیں۔ خاندانوں کی شادیوں میں بعض اوقات ایسے ہی بے جوڑ رشتے ہو جاتے ہیں۔“

”بہر حال اب بچوں کی وجہ سے ان دونوں کو گزارہ تو کرنا ہے نا مز بصیر!“

”بالکل میڈم..... آپ دیکھیے نا صرف اپنی بچیوں ہی کی وجہ سے میں مجبوراً اپنے شوہر کے ساتھ رہ رہی ہوں کہ نہیں۔ حالانکہ اس شخص نے میرے ساتھ کیا کیا؟“ مز بصیر کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے ”کیا کی تھی مجھ میں..... سوائے اس کے کہ میں..... میں ان کے لیے بیٹانہ پیدا کر سکی“ مز بصیر کی آواز بھرا گئی۔

خوش رو خوش قامت اور خوش لباس منزہ بصیر کے شوہر نے تقریباً دو برس قبل ان سے چپ چپاتے دوسری شادی کر لی تھی اور شادی کے تقریباً گیارہ ماہ بعد دوسری بیوی کے لطن سے بیٹے کی پیدائش پر اپنی دوسری شادی کا راز پہلی بیوی اور دونو جوان بیٹیوں پر افشا کر کے اس مختصر سے خوش باش کنبے کا سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ مز بصیر کی شخصیت میں اب بھی وہی دلکشی اور وقار پہننے اوڑھنے میں وہی سلیقہ اور رکھ رکھاؤ تھا مگر ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ



اندر سے تلپٹ ہو کر رہ گئی ہیں۔  
 ”میڈم! میں آپ کو تحترمہ کے بارے میں رپورٹ دیتی رہوں گی“ مسز بصیر نے کہا۔  
 ”تھنک یو مسز بصیر!“

لوگ گھر بیٹھی عورتوں کو مجبور و مقہور سمجھتے ہیں جبکہ گھر سے باہر نکل کر معاشی تک و دو میں مرد کا ہاتھ بٹانے والی بظاہر خود مختار اور خود کفیل ہر عورت بھی کسی نہ کسی حوالے سے مظلوم ہوتی ہے۔ وہ جن پر بظاہر کوئی بیرونی دباؤ یا تشدد دکھائی نہیں دیتا، وہ بھی گھر میں اور گھر سے باہر بیک وقت دو دو محاذوں پر زندگی سے لڑ لڑ کر بسا اوقات گھر بیٹھی عورتوں سے زیادہ تھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔

جب سے مسز بصیر کے شوہر نے دوسری شادی کی تھی، ان سے بات کرتے ہوئے ملتہا کو آپ ہی آپ فضا کا خیال آ جاتا۔ وہ بھی تو زندگی سے جو کبھی لڑ رہی تھی۔  
 فضا سے ملے، اب ان سے کبھی کبھی کئی کئی ماہ گزر جاتے۔ فون پر البتہ بات چیت رہتی کبھی فضا فون کر لیتی اور کبھی ملتہا خود اس کا نمبر ملا لیتی۔

مختار وہیں تھا، لندن میں۔ بھولے بسرے کبھی بچوں کو فون کر لیتا اور بس۔ فضا بچوں کو سیٹے بیٹھی تھی۔ راول انجینئرنگ یونیورسٹی میں تین سال مکمل کر چکا تھا۔ رائیل کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ سانول کالج میں تھا اور اب تو سب سے چھوٹی بھی اسکول جانے لگی تھی۔ اپنے باپ کے بارے میں اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا نام مختار تھا۔ وہ لندن میں رہتا تھا، وہاں کام کرتا تھا مگر اس کو وہاں اتنے پیسے نہیں ملتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو پیسے بھیج سکتا۔ کبھی کبھار جب وہ فون کرتا تو چھوٹی اس سے یوں شرما شرما کر بات کرتی جیسے وہ کوئی اجنبی ہو۔ مختار کا فون آتا تو فضا اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ راول بھی بس سرسری اور سرد لہجے میں ہیلو ہائے کرتا۔ اس کی بات چیت رائیل اور سانول سے ہوتی۔

فضا کا دل کبھی کبھی نہت دکھنے لگتا۔  
 لوگ کہتے ہیں شادی عورت کو تحفظ اور امان دیتی ہے مگر یہ کیسا تحفظ تھا اور کیسی امان کہ تنہا زندگی کی ناؤ کہتے کہتے اب تو اسے اپنے بازو شل ہوتے محسوس ہونے لگے تھے۔ گھریلو اور بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ صبح سے رات تک کو لھو کا بیل بنی رہتی۔ ملازمت اور پھر ٹیوشنز۔ بچے بھی اس کا ساتھ دیتے مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی اپنی تعلیم متاثر ہو اس لیے وہ ٹیوشنز کا زیادہ بوجھ خود ہی اٹھاتی۔ کام کی زیادتی سے اس کی صحت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ملتہا جب بھی اس سے ملتی فکر مند ہو جاتی۔

”اپنا بھی خیال رکھا کرو!“ وہ کہتی۔  
 فضا دیر سے مسکرا دیتی۔ اس کی محزون مسکراہٹ میں ایک داستانِ الم رقم ہوتی۔

☆☆☆

حاجیل کا باب بند ہونے کے بعد بھی ڈاکٹر پیام کے فون آتے رہے، کبھی گھر پر کبھی اسپتال میں۔ ظہیر صاحب کو سخت تشویش رہی۔ مسز ظہیر کے منع کرنے کے باوجود وہ ایک روز میہ سے پوچھ بیٹھے ”بہو صاحب! یہ ڈاکٹر پیام ڈاکٹر ہیں، اتنا تو ان کے نام سے ظاہر ہے مگر اس سے پہلے کبھی ان کے اتنے فون نہیں آئے۔“  
 میہ کو ان کا اس طرح سے نفیٹش کرنا ناگوار تو گزرا مگر اس نے بظاہر بڑے محل سے کہا ”میڈیکل کالج میں ہمارے سینئر ادا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ قبل اچانک ملاقات ہو گئی ان سے۔“

”اچھا اچھا“ گویا پرانی شناسائی ہے؟“  
 میہ کو ان کے الفاظ اور لہجہ پہلے سے بھی زیادہ ناگوار لگا مگر اس نے پھر تحمل کا مظاہرہ کیا ”ایک بیٹی بھی ہے ان

کی۔“

”اچھا!“ وہ چونکے پھر جیسے کچھ مطمئن سے ہو گئے۔

ڈاکٹر پیام کی بیوی کے بارے میں نہ انہوں نے کچھ پوچھا نہ میہ نے بتانا ضروری سمجھا۔ البتہ اس نے ڈاکٹر پیام سے یہ کہہ دیا کہ وہ اسے گھر کے نمبر پر فون کرنے سے ممکنہ حد تک احتراز کریں۔

”آپ..... آپ ماسٹرنہ کیجئے گا“ اس نے ڈاکٹر پیام سے کہا۔

”نو نو آئی کیمن انڈر اسٹینڈ“ ڈاکٹر پیام نے کہا۔

”تھینک یو۔“

اسپتال کے نمبر پر اس کے نام ڈاکٹر پیام کی فون کا لڑ آتی رہیں اور اسے خود بھی ان کی ٹیلی فون کال کا انتظار رہنے لگا۔ کم دیش یکساں حالات کے باعث ان کے درمیان ایک ہم آہنگی سی استوار ہو گئی تھی۔

پھر ایک روز وہ منے کے ساتھ ڈاکٹر پیام سے دوسری بار ملی۔ فاسٹ فوڈ اسپاٹ کے وسیع و عریض چکا چوند ہال میں منا اور سمن فریج فرائیز اور ملک شیک سے لطف اندوز ہوئے اور وہ دونوں گھونٹ گھونٹ اور نچ جوس پیجے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

گھر واپسی پر منے نے انکل اور سمن کا اتنا ذکر کیا کہ ظہیر صاحب ادب نے لگے ”اماں یار! کوئی اور بات کرو۔ اور ہاں! انکل کی آنٹی ساتھ نہیں تھیں کیا؟“ انہوں نے رازداری سے پوچھا۔

”تھیں دادا!“ منے کی معصومیت نے دادا ابو کے سوال کے جواب میں ان تمام آئیٹیوں کا تصور اس کے سامنے لا کر اکیا جنہیں وہ فوڈ اسپاٹ کے ہال میں دیکھ آیا تھا۔ ظہیر صاحب مطمئن سے ہو گئے۔

☆☆☆

منہا نے جس خاتون کو مسز بصیر کے سپرد کیا تھا، مسز بصیر اس کے ظاہری حلیے میں تو کوئی نمایاں انقلاب رونما نہ کر سکیں البتہ خاتون نے گویا اسکول کا راستہ تاک لیا۔ ہفتے عشرے میں وہ بہانے بہانے منہا کے پاس آنے لگیں اور منہا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی نا سمجھ یا بے وقوف عورت ہرگز نہ تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ بڑی گہری باتیں کر جاتی۔ اپنی بار بار آمد و رفت پر وہ کئی مرتبہ معذرت بھی کر چکی تھی۔

”میڈم! پہلے مجھے اسکول آتے شرم محسوس ہوتی تھی مگر اب خود بخود قدم اٹھتے ہیں۔ جی چاہتا ہے روز آپ کے پاس آؤں۔ میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کرتی میڈم!“

”جی نہیں“ منہا مردانہ کتنی حالانکہ خاتون کی بار بار آمد و رفت کبھی کبھی اس کی مصروفیات میں حارج ہو کر اسے کلکتے بھی لگتی تھی۔

اس روز بھی وہ اپنے دفتر میں کسی ضروری کام میں مصروف تھی کہ وہ آ پہنچیں۔

”آ سکتی ہوں میڈم؟“

منہا نے دروازے کی سمت دیکھا۔

”جی، آئے مسز جبار۔“

”السلام علیکم!“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام“ تشریف رکھے۔

”میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا میڈم؟“

”جی نہیں۔“



”میڈم بچوں کی ٹیچروں سے ان کی خبر لینے آئی تھی‘ میں نے سوچا آپ کو سلام کر لوں اور آپ سے اجازت بھی لے لوں ٹیچروں سے ملنے کی۔“

”آپ میڈم غزالہ سے مل لیں جو ٹیچرز فارغ ہوں گی ان سے وہ ملوادیں گی آپ کو جو فارغ نہیں ہوں گی اس وقت ان کا آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔“

”میڈم یہ بڑا اچھا اصول ہے آپ کا کہ آپ والدین کو کلاسوں میں نہیں جانے دیتیں۔ مجھے آپ کے اصول بہت پسند ہیں۔“

”شکریہ..... اور سنا ہے سب خیریت؟“

”جی اللہ کا شکر ہے!“

”منزل بصیر سے ملاقات رہتی ہے؟“

”جی ہاں! اسکول آتی ہوں تو ان سے ضرور مل کر جاتی ہوں ویسے فون پر بھی بات چیت رہتی ہے۔ بڑی اچھی مس ہیں مگر مجھ سے انہیں گلہ ہے کہ میں نے خود کو تبدیل نہیں کیا۔ میڈم کیا کروں گی تبدیل ہو کر۔ بچوں کے والد نے تو جو کرنا ہے وہ کرنا ہے۔“

”کیا کرنا ہے؟“

اس کے لبوں پر کرب آمیزی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ یقین کریں گی اب تک سترہ رشتے میں خود دیکھ چکی ہوں اپنے شوہر کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“ منتہا چونکی۔

”مجھے معلوم ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ یہ تو زبردستی کا جوڑ ہے۔ اب تک جیسے تیسے گزارہ بھی وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کی بہن میرے بھائی کے گھر میں ہے۔ سترہ رشتوں میں سے چار پانچ تو خاندان ہی کے تھے مگر جبار صاحب خاندان میں نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں خاندان سے ایک ہی بہت ہے بانی جو باہر دیکھے ان میں سے چند انہیں پسند نہیں آئے، بعض کو یہ پسند نہیں آئے۔ ایک لڑکی تو انہیں بہت ہی پسند آگئی تھی مگر لڑکی کے دادا کو اعتراض ہو گیا کہ لڑکے کی عمر زیادہ ہے۔“

”عمر پر اعتراض ہوا بیوی بچوں والا ہونے پر نہیں؟“ منتہا جو خاتون کی بے وقت آمد پر شروع میں نیم دلی سے بات کر رہی تھی اب ہمہ تن دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”انہیں بتایا ہی نہیں تھا کہ بیوی بچے بھی ہیں۔“

”یعنی.....؟“

خاتون دھیرے سے مسکرا دی ”جبار صاحب نے اخبار میں اشتہار دیا کہ ایک نوجوان آدمی کے لیے جو سعودیہ میں کام کرتا ہے خوش حال ہے اور مستقل طور پر سعودیہ ہی میں رہتا ہے خوبصورت رشتے کی ضرورت ہے۔ ڈھیروں فدا آگئے۔ ان میں سے ہم نے بارہ تیرہ رشتے دیکھے۔“

”ہم سے کیا مراد..... کیا آپ بھی؟“

”جی ہاں میں ان کے ساتھ جاتی تھی رشتے دیکھنے۔“

”مگر ابھی تو آپ بتا رہی تھیں کہ بیوی بچوں کا کسی کو نہیں بتایا۔“

”تم تو میں ان کی بھابی بن کر جاتی تھی ناجی!“

”ادام کی کاڈ!“

خاتون دھیرے سے مسکرا دی پھر بولی ”میڈم یہ کوئی اتنی عجیب بات تو نہیں ہے۔“

”آپ کو دکھ نہیں ہوتا تھا اپنے شوہر کی بھابی بن کر ان کے لیے لڑکیاں دیکھنے جانے پر؟“  
 ”ساری زندگی سک سک کر جینے سے ایک مرتبہ زہری لیٹا بہتر میڈم!“ اس نے کہا۔  
 منجھا کو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی رودکھائی دی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”اچھا میڈم تو میں میڈم غزالہ سے مل لوں، وہ مجھے ملوادیں گی نا بچوں کی ٹیچروں سے؟“  
 ”جی ہاں۔“  
 ”شکریہ!“

☆☆☆

سمن کا برتھ ڈے تھا۔ ڈاکٹر پیام نے فقط دو مہمان مدعو کیے تھے۔ میہ اور مننا۔ مقام تقریب تھا ایک جدید فاسٹ فوڈ اسپاٹ جہاں ایسی تقریبات کے لیے آراستہ و پیراستہ گوشے مخصوص تھے۔ بچوں کی تفریح طبع کے لیے چند ان ڈور گیمز کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ برتھ ڈے کی رسمی کارروائی اور تحائف کے لین دین کے بعد دونوں بچے ہال کے اس حصے میں چلے گئے جہاں بچوں کے کھیل کود اور دلچسپیوں کا سامان موجود تھا۔ میہ اور ڈاکٹر پیام اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ان دونوں پر نظر رکھ سکتے تھے۔

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟“ ڈاکٹر پیام نے میہ سے کہا۔  
 ”جی! میہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آپ نے اپنی اور بیٹی کی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ سوچا؟“  
 ”کیا؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اس عمر میں بچوں کو ماں اور باپ دونوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔“  
 ”اس عمر میں کیا ہر عمر میں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ہاں مگر اس عمر میں زیادہ۔“  
 ”شاید.....“

”آپ کے بیٹے کو باپ کی اور سمن کو ماں کی ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دونوں اپنے بچوں کی یہ بنیادی ضرورت پوری کر دیں؟“

میہ کا دل یکبارگی بے اختیار دھڑکنے لگا۔ اس کی ذات میں ڈاکٹر پیام کی دلچسپی یوں تو ان کی مسلسل ٹیلی فون کالز سے ظاہر تھی مگر تیسری ہی ملاقات میں پروپوز کر دینا کچھ عجبت تھی۔

ڈاکٹر پیام نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا پھر اسے مستقل خاموش دیکھ کر بولے ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”بہت مشکل ہے جواب دینا۔“  
 ”کیوں؟“

”میں..... میں اپنی والدہ کے گھر میں رہ رہی ہوتی تو صورت حال کچھ اور ہوتی مگر اپنے ان لازم کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اس سوال کا جواب دینا مشکل لگتا ہے۔“ میہ نے کہا۔

”کوئی مشکل نہیں، بس ذرا سی امت کر لیجئے..... اور یہ امت آپ کو آج نہیں کل کرنی ہی ہوگی اپنے لیے نہ سہی“  
 ”مٹے کے لیے سہی۔“

میہ کشمکش میں پڑ گئی۔  
 ”کیا سوچنے لگیں؟“



میہ نے ایک نظر ڈاکٹر پیام کی جانب دیکھا۔  
 ”اچھا چلیے ایک بات بتائیے..... بالفرض آپ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہ رہی ہوتیں تو تب آپ کا جواب کیا ہوتا؟“

”شاید میں ہاں کر دیتی۔“

”شاید کیوں؟“

”آپ کو شاید پسند نہیں تو ہٹا دیں۔“

ڈاکٹر پیام دھیرے سے ہنس دیے۔

”آل رائٹ، تو پھر یوں کرتے ہیں کہ میں آپ کے گھر والوں سے ملتا ہوں۔ ان سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں وہ لوگ آپ کے ان لازم سے خود بات کر لیں گے۔“

”نہیں، نہیں!“ وہ گھبرا کر بولی۔

”کیوں؟“

”مجھے..... باقی دن اس گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ ممتے کے دادا اعصابی مریض ہیں۔ ممتا ان کی جان ہے۔

خدا جانے ان کا ری ایکشن کیا ہوگا؟“

”ان کے ری ایکشن کے خوف سے کیا آپ ساری زندگی اسی طرح گزار دیں گی؟“

وہ چپ رہی۔

”صرف ایک لمحہ مشکل ہوتا ہے..... بلکہ وہ بھی مشکل نہیں ہوتا بس لگتا ہے کہ مشکل ہے پھر سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ بہت سی آسانوں کے لیے ایک مشکل لمحے کا سامنا کرنے سے کیوں ڈرا جائے..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو ہمت کیجئے۔“

میہ نے ڈاکٹر پیام کی جانب دیکھا ”ہمت کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔“

”نو پرابلم“ ڈاکٹر پیام مسکرا دیے ”آپ اطمینان سے وقت لیجئے مگر زیادہ نہیں۔“

”اوکے“ میہ بھی مسکرا دی۔

اس روز گھر واپس لوٹتے ہوئے وہ می کے ہاں ہوتی ہوئی آئی۔ می اور منتہا جو کچھ عرصے سے اس کی جون بدلے

دیکھ کر خاصی مطمئن تھیں اس روز اسے غیر معمولی خوش دیکھ کر نہایت شاد ہوئیں۔ میہ جتنی دیر وہاں رہی منے کی ہر

دوسری بات انکل پیام اور منمن سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہوتی رہی۔ می اور منتہا کے لیے ان کا ذکر ناما نوس نہ تھا۔ میہ

نے ان سے ان دونوں کا ذکر کر رکھا تھا لیکن بڑے عمومی سے انداز میں مگر آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ می اور منتہا سے

ان کا خصوصی انداز میں ذکر کرے۔ انہیں بتائے کہ ڈاکٹر پیام نے اسے پروپوز کیا تھا۔

”حلیم بنایا ہے کھا کر جانا“ می نے میہ سے کہا۔

”نہیں می کھانے پینے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ ہم دو بڑے تھے اور دو بچے اور میز کھانے پینے کی چیزوں سے لدی

پڑی تھی۔“

”بھئی ہمیں بلا لیا ہوتا“ منتہا نے مذاقاً کہا۔

”اچھا تو پھر میں نقن میں نکالے دیتی ہوں ساتھ لے جاتا“ می نے کہا۔

”تم جب تک حلیم کھا نہیں لوگی، می کو سکون نہیں ملے گا“ منتہا نے مسکراتے ہوئے میہ کو دیکھا۔

”اچھا تو پھر جلدی سے نکال دیں۔ ساڑھے پانچ بجے کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں ہم لوگ اور اس وقت دس بجے

والے ہیں۔ منے کے دادا کو تو خفقان ہو رہا ہوگا۔“

”بس ابھی لائی۔“

ممی تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔

میہ اور منتہا کی نظریں باہم ملیں اور میہ نے گہرا کر منتہا سے نظریں چرائیں۔ منتہا کو اس کا یوں نظریں چرائینا معنی خیز محسوس ہوا۔

”میہ!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ہوں.....“

”ادھر میری طرف دیکھو۔“

میہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”کوئی بات ہے؟“

”نہیں..... نہیں تو۔“

”مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں جان سکتا“ منتہا نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے کہا ”یہ تمہاری بچپن کی عادت ہے کوئی بات چھپانی ہو تو نظریں چرائینا۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔“

”واقعی!“ منتہا کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”ہاں!“ اس نے بڑے اعتماد سے منتہا کی جانب دیکھنے کی کوشش کی۔

”لو بھئی میں نے نفن کا ڈھکنا اچھی طرح بند کر کے نفن پولی تھین بیک میں لپیٹ دیا ہے“ ممی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”منے.....! آؤ بیٹا، گھر چلیں“ میہ نے منے کو جو کمرے سے باہر نکل گیا تھا پکارا۔

ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ وہ گھر پہنچی تو ظہیر صاحب اور مسز ظہیر برآمدے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ وہ گھر والوں کو بتا کر گئی تھی کہ ڈاکٹر پیام نے منے کو اپنی بیٹی کی سالگرہ پر مدعو کیا تھا۔

”بڑی دیر کر دی بہو صاحب!“ ظہیر صاحب کے لہجے میں دھیمی سی خفگی تھی۔

”واپسی پر ممی کی طرف چلی گئی تھی“ اس نے کہا۔

”یہ خیال کیا کریں بہو صاحب کہ منے کی وجہ سے میں پریشان ہونے لگتا ہوں۔“

”ہمارے بیٹے کو برتھ ڈے میں مزہ آیا؟“ مسز ظہیر نے ظہیر صاحب کی طرف سے کسی ناگواری سے بچنے کو موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”جی!“ منے نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت سارے لوگ آئے تھے؟“ مسز ظہیر نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”نہیں، بش انکل اور شمن“ منے نے معصومیت سے کہا۔

ظہیر صاحب نے مسز ظہیر کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر منے سے بولے ”آئی بھی تو ہوں گی نا بیٹی!“

اس سے پہلے کہ منا کچھ کہتا میہ نے کہا ”ڈاکٹر پیام اپنی مسز کو طلاق دے چکے ہیں۔“

ظہیر صاحب اور مسز ظہیر نے چونک کر پہلے میہ کو دیکھا پھر ان کی نظریں باہم الجھ گئیں۔

اور میہ کو یوں لگا جیسے آدھا مشکل لمحہ تو گزر گیا!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

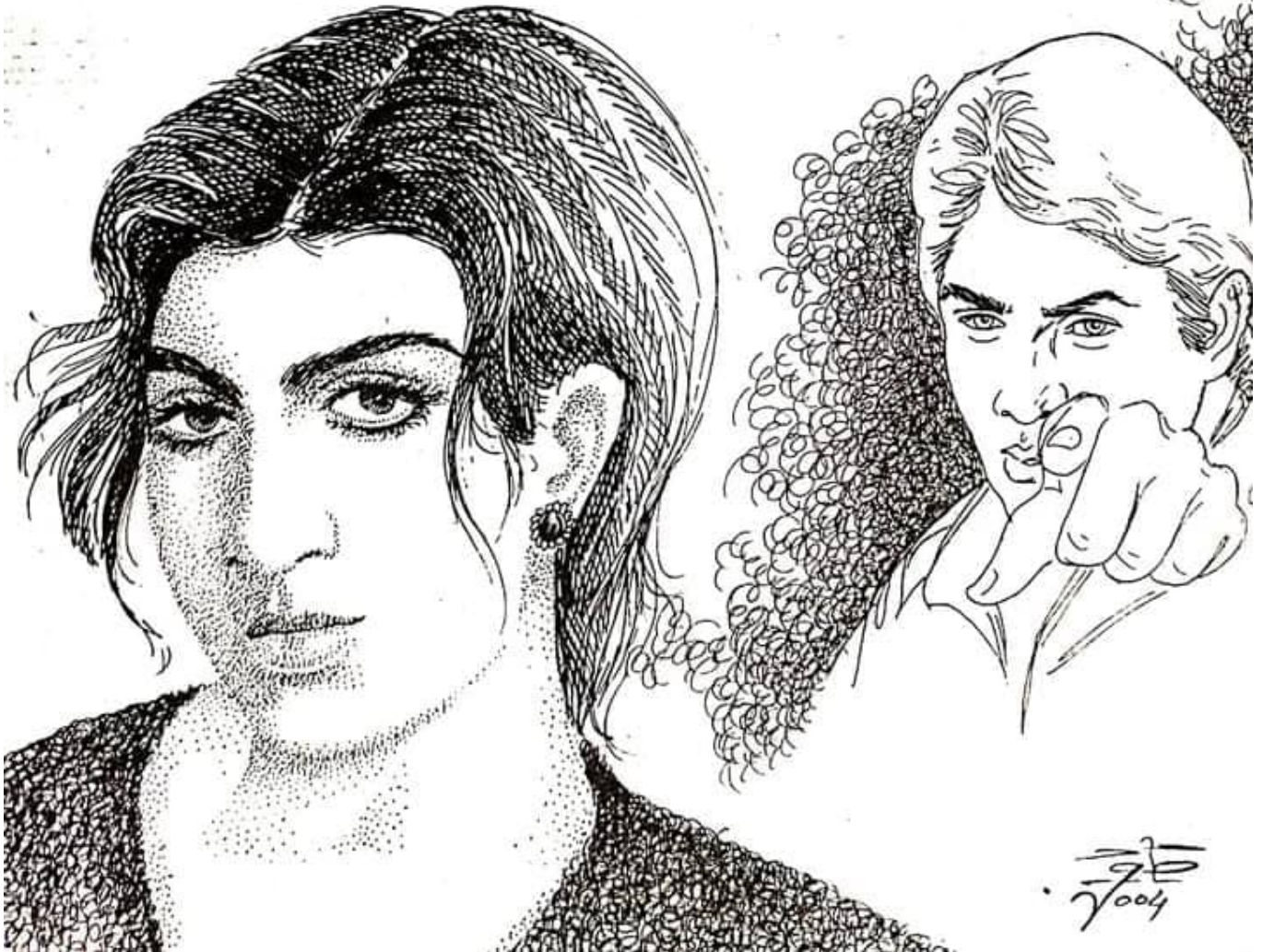


دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قسطے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

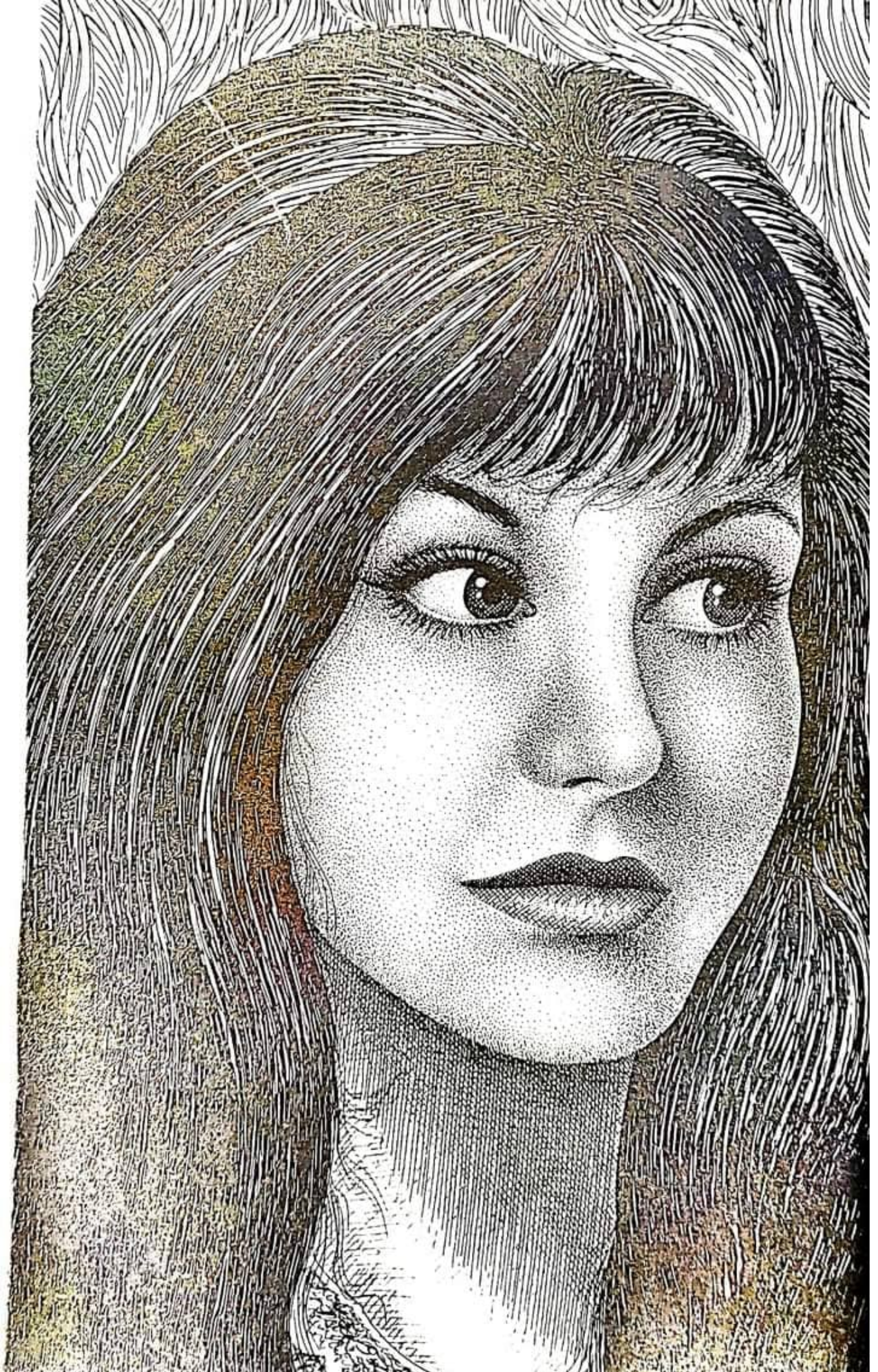
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ مفتاح ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوب سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کا چانک مساموٹنے کی دل گداز داستان

قسط 26









جب سے اسکول میں ایک نئے نو جوان ایل ڈی سی کا اضافہ ہوا تھا بعض غیر شادی شدہ ٹیچرز کے اطوار ہی بدل گئے تھے۔ ان ٹیچرز کی بابو تاج محمد کے کمرے میں اور کمرے کے باہر رانداری میں بہانے بہانے آمد و رفت رہنے لگی تھی۔ ان میں مس سطوت، مس عاتکہ، مس در شہوار اور مس آفرین جیسی نو جوان لڑکیاں ہی نہیں عمر اور مدت ملازمت کے اعتبار سے اسکول کے تدریسی عملے میں شامل ایک سینئر ٹیچر مس نگہت بتول بھی شامل تھیں۔ وہ بہانے بہانے بابو تاج محمد کے کمرے میں آنے جانے لگی تھیں۔ ان بہانوں کی نوعیت عموماً کچھ یوں ہوتی۔

”تاج محمد صاحب آج کا اخبار تو نہیں ہے آپ کے کمرے میں؟“

”تاج صاحب ڈائریکٹریٹ نے پرائمری اسکالرشپ ایگزام کا شیڈول نہیں بھجوا یا ابھی تک۔“

”تاج محمد صاحب تھوڑی دیر کے لیے ایسا کوڈ چاہئے مجھے۔“

”تاج محمد صاحب میرے ہارنگ کیس کا کوئی جواب آیا؟“

کبھی کبھی وہ طارق کو بھی مخاطب کر لیتیں۔

”طارق آپ کو کبھی فرصت ملے تو ذرا میرا لیوا کاؤنٹ چیک کر دیجئے گا۔ تاج محمد صاحب بتا رہے تھے کہ آؤٹ والے کچھ آنکیشن کر گئے ہیں میرے لیوا کاؤنٹ پر۔“

”طارق اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے لیٹر ٹائپ کروانا ہے آپ سے۔“

”دے دیں میں کر دوں گا۔“

”نہیں نہیں میں خود بیٹھوں گی آپ کے ساتھ، میری رائٹنگ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، میں بولتی جاؤں گی آپ ٹائپ کرتے جائے گا۔“

طارق سے بات کرتے ہوئے مس نگہت بتول کے چہرے کی کیفیت ہی بدل جاتی، طارق جھینپ جاتا۔ تاج محمد کن انکھیوں سے دیکھے جاتے۔

بہانے بہانے تاج محمد کے کمرے کے سامنے گزرنے والی ٹیچرز میں سے کبھی کوئی بلند آہنگی سے کھکھلا کر تاج محمد اور طارق سمیت آس پاس موجود دیگر افراد کو بھی اپنی جانب متوجہ کر لیتی۔ کبھی کبھی ایسی ہنسی منتہا کو بھی چونکا دیتی۔ شروع شروع دو تین مرتبہ تو اس نے ایسی کھکھلاہٹ کو بے اختیاری حرکت سمجھا۔ مگر جب یہ سلسلہ معمول ہی بننے لگا تو اس نے ایسے موقع پر فوراً متعلقہ ٹیچر کو اپنے دفتر میں بلوا کر شائستگی سے تنبیہ کرنا ضروری سمجھا۔

تاج محمد کے دفتر میں بعض ٹیچرز کی آمد و رفت میں اضافے کا منتہا خود بھی جائزہ لے رہی تھی لیکن جب تاج محمد خود بھی اس امر کے شاکي ہوئے کہ بعض ٹیچرز دفتر میں آکر انہیں اور طارق کو خواہ مخواہ کے معاملات میں الجھا کر ان کا کافی وقت ضائع کر دیتی ہیں تو اسے ایسی ٹیچرز کو تنبیہ کرنے کا گویا ایک ٹھوس جواز مل گیا۔

”تاج محمد صاحب مجھے ان ٹیچرز کے نام تو بتائیے ذرا۔“ اگرچہ یہ پوچھنا ضروری نہ تھا کیونکہ اس کا دن بھر متحرک اور فعال رہنا اسے ادارے کے چپے چپے میں ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہ رکھتا تھا تاہم اس معاملے کی نزاکت کے باعث اس نے اس سلسلے میں اپنے مشاہدے کی تاج محمد سے توثیق چاہی۔

”میڈم! دو تین ہیں۔ ایک تو اپنی مس سطوت ہیں، مس آفرین ہیں، مس در شہوار ہیں اور سب سے زیادہ تو ہمارا وقت ضائع کرتی ہیں مس بتول۔“

”یہ تو تین کہاں ہو میں تاج محمد صاحب یہ تو چار ہوئیں۔“ تاج محمد کو غیر معمولی سنجیدگی سے بات کرتے دیکھ کر ملجا کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

تاج محمد جھینپ کر مسکرا دیئے پھر بولے ”ایک دو اور بھی ہیں میڈم مگر وہ اتنا پریشان نہیں کرتیں جتنا.....“ تاج محمد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر قدرے توقف سے بولے ”جتنا یہ چار ٹیچرز اور ان میں بھی سب سے زیادہ مس نگہت

بتول..... انہیں تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے میڈم، طارق کے پاس ٹائپنگ کا ذاتی کام لے کر آ جاتی ہیں اور میڈم..... بس کیا کہیں میڈم۔“

”نہیں نہیں جو بات کہنی ہے ضرور کہیں تاج محمد صاحب۔“ جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے منتہا ان کے کہے بغیر بھی سمجھ سکتی تھی مگر اس ضمن میں ضروری کارروائی کے لیے تاج محمد کی زبان سے کہلوانا ضروری تھا۔

”میڈم! جس انداز سے مس بتول طارق سے بات کرتی ہیں وہ بہت معیوب لگتا ہے۔ اپنے کلاس فوران کی حرموں پر چپکے چپکے ہنستے ہیں اور طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ اچھی بھلی تھیں مس بتول بلکہ تمام کلاس فوران کی بہت عزت کیا کرتے تھے مگر جب سے طارق آیا ہے خدا جانے کیا ہو گیا ہے انہیں۔ چھٹی کے بعد تمام ٹیچرز چھٹی ہوتے ہی چلی جاتی ہیں مگر مس بتول آج کل چھٹی کے بعد اس وقت تک اسٹاف روم میں بیٹھی رہتی ہیں جب تک طارق گھر جانے کو نہیں اٹھتا۔ یہاں سے بس اسٹاپ تک دونوں اکٹھے جاتے ہیں۔“

”اچھا!“ منتہا چونکی ”آپ کو کس نے بتایا؟“

”میڈم میں سب سے آخر میں اٹھتا ہوں۔ یہ تماشا ایک ڈیڑھ ماہ سے دیکھ رہا ہوں ان گنہگار آنکھوں سے۔“

منتہا کو اپنی لاعلمی پر خفت ہوئی۔

”کیا یہ بات کنفرنڈ ہے تاج محمد صاحب۔“

”سو فیصد میڈم، کئی مرتبہ میں نے خود دیکھا ہے ان دونوں کو بس اسٹاپ پر اکٹھے کھڑے ہوئے۔“

”ہوں۔“ منتہا گہری سوچ میں پڑ گئی۔

”میڈم! ہائی اسکول یا ہمارے بچوں کے والدین میں سے بھی کوئی دیکھ سکتا ہے۔ کیا امپریشن لے گا دیکھنے والا ہمارے اسٹاف کے بارے میں۔“ تاج محمد جو شروع میں بات کرتے ہچکچا رہے تھے اب خوب کھل کر بات کر رہے تھے۔

”میڈم، مس بتول کو اپنے مرتبے کا پاس نہیں تو کم از کم اپنی عمر ہی کا لحاظ کر لیں۔ کہاں مس بتول اور کہاں وہ لڑکا طارق!“

”تاج محمد صاحب! ہو سکتا ہے مس بتول اس کے ساتھ مشفقانہ رویہ رکھ کر کوئی نیکی کرنا چاہتی ہوں۔“

تاج محمد یوں مسکرا دیے جیسے منتہا نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔

”معاف کیجئے گا میڈم نیکی بدنامی کو گلے لگا کر نہیں کی جاتی۔ آپ ان دونوں کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے اور باتیں کرنے کا انداز دیکھیں نا تو آپ کو بھی غصہ آ جائے۔“

منتہا کچھ دیر کو سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا ”میں..... آپ کے آفس میں مس بتول کا بار بار آنا جانا نوٹ کر رہی تھی تاج محمد صاحب مگر یہ سب کچھ جو آپ نے بتایا میرے علم میں نہیں تھا۔ میں بات کروں گی۔“

”کس سے؟“ تاج محمد چونک کر بولے پھر خود ہی کہا ”طارق سے؟“

”جی نہیں، مس سمجھت بتول سے..... اور میں آج ہی ٹیچرز کو یہ نوٹس بھجوا رہی ہوں کہ مجھے سبب بتائے بغیر کوئی ٹیچر آپ کے دفتر میں نہ جائے۔“

”میڈم! بعض دفعہ ضرور نا ہمیں بھی بلوانا پڑ جاتا ہے ٹیچرز کو۔“

”آپ بلوائیں تو بلوائیں کوئی خواہ مخواہ نہ جائے اور اگر جائے تو مجھے سبب بتا کر۔“

”میڈم آپ کی مصروفیت اور بڑھ جائے گی۔ سو معاملات ہوتے ہیں ٹیچرز کے جن کے سلسلے میں وہ آفس سے رابطہ کرتی ہیں، آپ کس کس کا مسئلہ سنیں گی۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ آپ بس مس بتول کو سمجھا دیں باقی خود بخود سمجھ جائیں گی۔“

”اوکے“ منتہا نے اثبات میں سر ہلایا اور تاج محمد کے مشورے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔



مس نگہت بتول سینئر ٹیچر تھیں ان سے بات کرنے کے لیے ملتہا کو پہلے تو یہ دیکھنا پڑا کہ تاج محمد نے جو کچھ کہا وہ درست تھا یا غلط دو تین دن مس بتول اور طارق چھٹی کے بعد اس کے زیر مشاہدہ رہے۔ اس دوران وہ اسکول سے گھر جانے کے لیے معمول سے کچھ زیادہ ہی تاخیر سے اسکول سے نکلی۔ ایک روز اس نے مس بتول اور طارق کو ایک ساتھ رکشا میں سوار ہوتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ گویہ ایک بات ہی مس بتول سے باز پرس کرنے کے لیے بہت کافی تھی مگر ان کی سینیارٹی اور عمر کا لحاظ کرتے ہوئے ملتہا نے بہت سوچ سمجھ کر اور محتاط انداز میں ان سے بات کی۔

پہلے تو وہ چونکیں پھر جھینپ گئیں مگر پھر دیدہ دلیری سے بولیں ”یہ میرا پرسنل معاملہ ہے میڈم۔“  
”مگر ادارہ آپ کے اس پرسنل معاملے سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔“ ملتہا جس نے انتہائی دھیمے لہجے میں ان سے بات کی تھی ان کی دیدہ دلیری پر قدرے خشونت سے بولی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ مس بتول نے تیوری چڑھائی۔  
”آپ سینئر ٹیچر ہیں وہ کلرک ہے، آپ مرتبے میں اس سے بڑی ہیں وہ آپ سے کم۔ اگر آپ اسے ازراہ شفقت و مروت بھی رکشے میں اپنے ساتھ بٹھا کر لے گئیں تو میں سمجھتی ہوں یہ نامناسب تھا میرے بجائے کوئی اور دیکھ لیتا اور کیا عجب کہ کسی نے دیکھ ہی لیا ہو تو وہ کیا سوچے گا۔“  
”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں مس بتول۔ طارق اگر آپ کا دور بار کا بھی کوئی عزیز ہوتا تو شاید کسی کو کچھ کہنے کی منجائش نہ ملتی۔ اپنے رشتے دار بچوں پر آدمی مہربانیاں کرتا ہی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ سب لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ آپ کے لیے غیر ہے۔ اس اسکول میں اس کی پوسٹنگ کے بعد آپ سے اس کی واقفیت ہوئی ہے۔ اس سے آپ کی بے تکلفی، چھٹی کے بعد آپ کا اسکول میں ٹھہرے رہنا پھر آپ دونوں کا اکٹھے بس اسٹاپ تک جانا اور جیسا کہ میں نے کل دیکھا ایک ہی رکشا میں بیٹھنا لوگ اس سے غلط معنی بھی نکال سکتے ہیں۔“  
”لوگ تو آپ کے لیے بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔“

”میرے لیے!“ ملتہا چونکی۔  
”جی ہاں۔“ مس نگہت بتول نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔  
”کیا مطلب؟“

”سوری میڈم..... ڈپٹی صاحب کون سا کوئی آپ کے رشتے دار ہیں۔“  
”مس بتول!“ ملتہا جو ایک دھچکے کی کیفیت میں تھی فقط اتنا ہی کہہ پائی۔  
”جی میڈم“ مس بتول نے کچھ اس طرح کہا جیسے کہتی ہوں کہیں کیسی لگی!  
”میں..... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ ملتہا کے لہجے میں استعجاب بھی تھا استفسار بھی۔  
مس بتول دھیرے سے مسکرائیں پھر الفاظ چبا چبا کر بولیں ”سنا ہے ڈپٹی صاحب کو جو لوگ اچھے لگتے ہیں بس اچھے ہی لگتے ہیں اور یہ بھی سنا ہے کہ..... ان کی مسز تو کئی سال سے بستر پر پڑی ہیں اور انہوں نے آپ کو پروپوز کر رکھا ہے۔“

”اوہ نومس بتول!“ ملتہا ایک ناقابل بیان صدمے کی کیفیت میں تھی۔  
”یس میڈم“ مس بتول کی چبھتی ہوئی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔  
”کون کہتا ہے! کس نے کی یہ بکواس آپ سے ا“ ملتہا کو اپنا سانس پھولتا ہوا محسوس ہوا۔  
”سب کہتے ہیں میڈم۔“

”سب کون؟“ منہا نے اپنی میز کے شیشے پر زور سے مکا مارا۔  
 ”آہستہ میڈم آپ کا ہاتھ نہ زخمی ہو جائے کہیں۔“ مس بتول کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔  
 ہاتھ!

وہ ہاتھ کی بات کر رہی تھیں، اسے تو اپنا دل زخمی لگ رہا تھا۔ کیسی کیسی خرافات گھڑ لیتے ہیں لوگ اپنے دلوں سے۔  
 اسے غصہ بھی آرہا تھا، شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یادداشت کی خوبی نے اسے یہ تو یاد دلایا تھا کہ ڈپٹی صاحب نے یہ بات کہ جو لوگ ہمیں اچھے لگتے ہیں بس اچھے ہی لگتے ہیں۔ مسز اشفاق کی موجودگی میں اس روز کبھی بھی جب وہ وظیفہ امتحان میں اپنے ادارے کے طلبہ کی غیر معمولی کارکردگی پر ڈائریکٹریٹ سے ملنے والے تہنیتی و توصیفی مراسلے کے جواب میں ڈائریکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مسز اشفاق کے ہمراہ ڈائریکٹریٹ گئی تھی اور ڈائریکٹریٹ سے واپسی پر اسی روز تو مسز اشفاق نے اسے بتایا تھا کہ ڈپٹی صاحب کی اہلیہ کافی عرصے سے بستر پر مفلوج پڑی تھیں۔  
 تو یہ سارا فساد مسز اشفاق کا پیدا کردہ تھا!

نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس سے کہا سنا ہوگا انہوں نے اور سننے والوں نے خدا جانے کتنی دور تک پہنچائی ہوگی یہ بات۔

خدا کی پناہ، کیا سے کیا بات بنا لیتے ہیں لوگ!  
 ڈپٹی صاحب کی اسے پروپوز کرنے والی بات کس قدر مضحکہ خیز تھی۔ وہ تو ہمیشہ بہت روت، شائستگی اور احترام سے پیش آتے رہے تھے، اس سے اور لوگوں کے اچھا لگنے والی بات بھی انہوں نے بڑی متانت سے کہی تھی۔ اس میں ہلکے پن کا شائبہ تک نہ تھا مگر خدا بچائے بات کا بتنگڑ بنا لینے والوں سے۔  
 اسے یہ خیال ستارہا تھا کہ اس کی ماتحت ٹیچروں نے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی یہ بات سن کر..... اور..... اور کیا عجب کہ یہ بات کلاس فور عملے تک بھی جا پہنچی ہو۔ اسے ان کا سامنا کرنے کے خیال سے شرم آرہی تھی۔  
 مگر نہیں۔

شرم اسے بھلا کیوں آرہی تھی۔  
 شرم تو جھوٹ بولنے والوں کو آنی چاہئے تھی۔  
 اس کا رُواں رُواں سلگ رہا تھا۔  
 خود اس سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ ڈپٹی صاحب کے اسے پروپوز کرنے والی بات میں کتنی حقیقت تھی۔  
 بل بھر بھی نہیں۔

”سوری میڈم مجھے ٹیٹ کا پیز چیک کرنی ہیں۔“ مس نگہت بتول نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ماتحتوں کو مختاروں کی کوئی کمزوری ہاتھ آجائے تو وہ یونہی زپر لب مسکرایا کرتے ہیں جیسے اس وقت مس بتول مسکرا رہی تھیں۔

ان کی مسکراہٹ نے منہا کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنے اعتماد کو مجتمع کرتے ہوئے کہا ”مس بتول مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا کہ اس بات میں کتنی حقیقت ہے۔ سراسر من گھڑت بات ہے یہ۔“  
 مس بتول کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی ”میڈم تو پھر مجھ سے بہتر بھی کوئی نہیں جانتا کہ طارق سے میرے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ وہ میرے لیے چھوٹے بھائیوں کی طرح ہے۔“

منہا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اسے یک بیک گہری نفثت نے آلیا ”ہم انسان بھی کتنے بے ایمان



ہوتے ہیں ذرا سی بات پر دوسروں کے بارے میں بدگمان ہونے لگتے ہیں۔“ اس نے آپ ہی آپ سوچا اور اسے تاج محمد پر جی ہی جی میں غصہ آنے لگا کہ اگر وہ لگائی بجھائی نہ کرتے تو شاید وہ بھی مس نگہت بتول کے بارے میں بدگمان نہ ہوئی ہوتی۔ ایک ہی ادارے میں کام کرنے والوں کے چھٹی کے بعد ایک ساتھ گھر کے لیے روانہ ہونے میں ایسا کیا عیب تھا۔ اور اس روزانہ کا ایک ساتھ رکشے میں سوار ہونا معیوب سہی مگر ہو سکتا ہے انہوں نے کرائے میں بچت کی خاطر یا کسی اور ضرورت کے تحت ایسا کیا ہو۔ واقعی کہاں مس بتول اور کہاں وہ نوجوان لڑکا طارق۔ پرانے وقتوں کی طرح اگر مس بتول تیرہ چودہ سال کی عمر میں بیاہی گئی ہوتی تو اس جتنا تو ان کا بیٹا ہوتا۔

لاحول ولا قوۃ دوسروں پر عیب جوئی کر کے لوگ اپنے اعمال بھی خراب کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بدگمان کرتے ہیں۔

اس نے بنا حیل و حجت مس نگہت بتول کی بات کا اعتبار کر لیا۔ حیل و حجت کی بظاہر جا بھی نہ تھی۔ مس بتول اور طارق میں بلحاظ عمر اور بہ اعتبار اسٹینٹس نمایاں فرق تھا۔ مس بتول چالیس سے اوپر تھیں جبکہ طارق بمشکل چوبیس پچیس سال کا نوجوان۔ مس بتول سترہ گریڈ کی سینئر لیچر تھیں اور طارق گریڈ پانچ میں بھرتی ہونے والا کلرک۔

☆☆☆

میہ کے اس انکشاف کے بعد سے کہ ڈاکٹر پیام اپنی بیوی کو طلاق دے چکے تھے، ظہیر صاحب کو انتہائی تشویش رہنے لگی تھی۔ وہ میہ کی ٹیلی فون کا لڑا اور اس کے باہر آنے جانے کے اوقات اور اطوار پر گہری نظر رکھنے لگے تھے۔ وہ منے کو اپنے ہمراہ باہر لے کر جاتی تو واپسی پر وہ منے سے چپکے چپکے باہر کی جملہ روئیدار لیتے۔ کہاں گئے تھے؟ کس سے ملے؟ کہاں بیٹھے؟ کیا کھایا پیا؟ کس سے کیا باتیں ہوئیں؟ منا اپنی سمجھ کے مطابق انتہائی معصومیت سے ان کے سوالوں کے جواب دیئے جاتا۔

ڈاکٹر پیام سے میہ کی اب جلدی جلدی ملاقات ہونے لگی تھی۔ گوان کے پروپوزل کا اس نے اب تک کوئی جواب نہ دیا تھا مگر بین السطور وہ اثبات میں فیصلہ کر چکی تھی۔

انکار کرنا عقل مند نہیں۔ اپنی ماں کی زندگی اور اپنے زمانہ نو عمری کے حالات سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مرد کے بغیر زندگی گزارنے والی عورت کی اپنی ہی نہیں اس کی اولاد کی زندگی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں احباب اور رفقاء کے کار کے صلاح مشورے بھی اسے یہی ترغیب دے رہے تھے کہ اسے کسی جذباتی فیصلے کی بجائے حقیقت پسندانہ سوچ رکھنی چاہئے۔ اس کی ایک سینئر ساسھی نے بالخصوص اس سلسلے میں اس کی خاصی برین واشنگ کی تھی۔ اس پر مستزاد منے کے روز افزوں استفسارات!

”میرے پاپا کیوں نہیں آتے؟“ منا اب گاہے گاہے پوچھنے لگا تھا۔

”وہ بہت دور رہتے ہیں اس لیے۔“ منے کو بہلانے کی کوشش کی جاتی۔

”دور کیوں رہتے ہیں؟“

”کیونکہ انہیں آپ کے لیے اچھی اچھی چیزیں خریدنے کو پیسے جو چاہئے ہوتے ہیں۔“

پاپا سے منے کی منت نئی فرمائشیں پورے کرنے کو عدنان اور میہ بالخصوص بازار چھان مارتے۔ کبھی اسے اڑنے والا گھوڑا چاہئے ہوتا، کبھی بولنے والا بندر، کبھی چمکنے والی گیند اور کبھی میوزیکل رینگ کار۔

”اف اللہ ایسی ایسی فرمائشیں کرتا ہے یہ لڑکا کہ بندہ بازار میں دکانیں جھانکتے جھانکتے تھک جائے۔“ میہ می سے کہتی۔

دکانیں جھانکنے کو اکثر ملتا بھی اس کے ساتھ ہولیتی۔ پھر ان چیزوں کو اس یقین کے ساتھ منے تک پہنچانے کے لیے کہ وہ واقعی اس کے پاپا نے بھجوائی تھیں اکثر پوسٹ مین کی مدد حاصل کی جاتی جو منے کو پاپا کی طرف سے بھجوا یا

جانے والا تحفہ پہنچانے کے لیے منے کو بطور خاص دروازے پر بلواتا اور کہتا ”منے میاں آپ کے ابو نے تحفہ بھیجا ہے آپ کے لیے۔“

منا بہت خوش ہوتا اور اپنا ہر تحفہ دنوں گھر آنے جانے والے لوگوں کو اور اپنے ساتھ گلی میں کھیلنے والے بچوں کو خوش ہو ہو کر دیکھاتا اور بتاتا کہ وہ تحفہ اس کے پاپا نے بھجوایا تھا۔

جب سے لیلیٰ دبئی گئی تھی منے کے لیے سچ گچ دبئی سے بھی چیزیں آنے لگی تھیں۔ کپڑے، جوتے، کھلونے اور کھیل ہی کھیل میں تعلیم دینے والی صوتی اور بصری معادلات۔ دبئی سے پاکستان آنے جانے والے شناساؤں کے ذریعے لیلیٰ کی جانب سے بھیجی جانے والی اکثر چیزیں بھی منے کو اس کے پاپا کا تحفہ بن کر ملتیں۔ منے کے دوست اس کی چیزیں دیکھ کر بہت لپچاتے۔ اس کی ریموٹ کنٹرول کار جس میں پانچ تا سات سال عمر کا ایک بچہ بیٹھ سکتا تھا اور جسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے چلایا بھی جاسکتا تھا اس کے دوستوں کی آنکھوں میں رشک پیدا کر دیتی۔ اسی گاڑی کی بنا پر ایک روز ایسا واقعہ ہوا جس نے منے سے زیادہ گھر والوں کو ڈسڑب کر دیا۔

ہوا یوں کہ پڑوسیوں کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ منا دادا ابو کی نگرانی میں گلی میں اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔ پڑوسیوں کا بچہ اپنے ہم عمر مہمان کے ساتھ کھڑا منے کو گاڑی چلاتے دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ان کے نزدیک سے گزری تو پڑوسیوں کے مہمان بچے نے جھک کر گاڑی کو چھونے کی کوشش کی۔ منا چلا کو بولا ”مت ہاتھ لگاؤ میری گاڑی گندی ہو جائے گی۔“

”بالکل بیکار تو ہے تمہاری گاڑی۔“ پڑوسیوں کے بچے نے کہا۔  
”جی نہیں“ منے نے کہا ”میری گاڑی اچھی ہے تمہاری سائیکل بیکار ہے، مجھے تو میرے پاپا نے بھیجی ہے یہ گاڑی۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ پڑوسیوں کے بچے نے کہا ”تمہارے پاپا تو مر بھی گئے۔“  
”دادا! منے نے اپنے دادا ابو کو پکارا ”یہ دیکھیں معاذ کہتا ہے تمہارے پاپا مر گئے۔“  
ظہیر صاحب دم بخود رہ گئے۔

”نہیں ناداد ابو۔“ منے نے ان کے نزدیک گاڑی روک کر کہا ”میرے پاپا مرے تو نہیں نا۔“  
ظہیر صاحب بچوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے اور انہوں نے منے کو اپنے سینے سے لگالیا۔ ان کے دل کا درد آنکھوں میں اتر آیا۔

”نہیں ناداد ابو۔“ منا جو دادا ابو کا چہرہ اپنے شانے کے اوپر سے دوسری سمت میں ہونے کے باعث ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا دوبارہ بولا۔

”نہیں بیٹا۔“ ظہیر صاحب نے منے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔  
یہ بات گھر میں پہنچی تو مسز ظہیر نے کہا ”آج تو آپ نے منے کو بہلا دیا مگر ایک نہ ایک دن تو یہ بات اسے معلوم ہونا ہی ہے۔ ہمارا خیال ہے منے سے اب اس سلسلے میں جھوٹ نہیں بولا جانا چاہئے۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا!“ ظہیر صاحب نے تیوری چڑھا کر انہیں دیکھا۔

”ہمارا مطلب ہے منے کو اب آہستہ آہستہ اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے کہ..... اس کے پاپا اللہ میاں کے پاس جا چکے ہیں۔“

”ہرگز نہیں..... اس کا اعتماد جاتا رہے گا..... وہ..... وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو جائے گا..... وہ آئندہ ہماری کسی بات کا اعتبار نہیں کرے گا۔“

”ہو سکتا ہے..... ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“



”ہو سکتا ہے کیا بالکل ایسا ہی ہوگا۔ وہ سوچے گا میرے دادا دادی چاچو پھوپھیاں ماما سب جھوٹے ہیں..... ہم نے.....“ ظہیر صاحب نے فرحان کی بڑی سی دیوار گیر تصویر کی جانب انگلی اٹھائی ”ہم نے اس تصویر کے بارے میں اسے جو کہانیاں سنائی ہیں جو یقین اس کے دل میں بٹھایا ہے وہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔“

”دھیرے دھیرے ظہیر صاحب، اسے دھیرے دھیرے بتانا پڑے گا۔ ہمیں یقین ہے وہ سمجھ جائے گا۔“ مزہ ظہیر بڑے حوصلے سے بولیں۔

ظہیر صاحب ایک کرب سے دو چار دکھائی دینے لگے۔

اس رات جب بیہ منے کو جورات کو دادا ابو کے پاس سویا کرتا تھا شب بخیر کہنے کے لیے اس کے پاس گئی تو اس نے پوچھا ”ماما میرے پاپا دبی سے کب آئیں گے؟“

”جلدی آئیں گے بیٹا۔“

”کب؟“

”جب انہیں آفس سے چھٹی ملے گی۔“ وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں گھماتے ہوئے بولی۔

”چھٹی کب ملے گی۔ اتنے بہت سے دن تو ہو گئے۔ انہیں بلائیں ناما، پتا ہے ماما معاذ جھوٹ بولتا ہے، میرے پاپا مرے تو نہیں ناں۔“ بیہ نے تڑپ کر اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”دادا ابو کہتے ہیں وہ جھوٹ بولتا ہے۔“

بیہ اس کے ننھے سے وجود کو دھیرے دھیرے یوں سہلانے لگی جیسے کسی زخم پر دھیرے دھیرے مرہم لگایا جائے۔ انتہائی محزون ہو کر وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی منے سے آخر کب تک یہ دروغ بیانی کی جاسکے گی کہ اس کا باپ زندہ تھا!

ڈاکٹر پیام کا پروپوزل اسے مجبور کر رہا تھا کہ اپنے لیے نہ سہی منے کی خاطر انکار نہ کرے۔

☆☆☆

اس روز صبح سے جھڑی لگی ہوئی تھی اور آسمان مسلسل ابر آلود تھا۔ بیہ کو ایسے موسم میں ڈپریشن ہونے لگتا تھا۔ صبح سے سہ پہر تک اس نے منے سے تین چار مرتبہ فون پر بات کی۔ سہ پہر کو منے نے اس سے بات کی تو کے ایف سی جانے کی فرمائش کی۔

”کیا کھانا ہے؟“ بیہ کو اپنے اس سوال کا جواب معلوم تھا۔

”فریج فرائیز۔“

”آپ گھر میں بنوا لو۔ دادو تو بڑے مزے دار فریج فرائیز بناتی ہیں۔“

”نہیں مجھے کے ایف سی جانا ہے۔“

”او کے بابا او کے، گھر آؤں گی تو لے چلوں گی۔“

”کب آئیں گی؟“

”چھٹی کے بعد بیٹا۔“

”آپ جلدی کیوں نہیں آ جاتیں۔“ منے نے ٹھنک کر کہا۔

”جب تک دوسری ڈاکٹر نہیں آ جائیں گی میں کیسے آ سکتی ہوں۔“

”انہیں فون کر دیں نا۔“

بیہ دھیرے سے مسکرا دی۔ مناب بڑوں کی طرح باتیں کرنے لگا تھا۔ مشورے اور تجویزیں دینے لگا تھا۔

”دادا اپنے وقت پر آئیں گی۔“

”آپ جلدی آئے گا۔“

”اوکے میری جان۔“

منے سے بات کرنے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے معصوم لہجے اور دل پزیر آواز کی سرشاری میں رہی پھر وارڈ میں داخل ایک مریض کی بلڈ ٹیسٹ رپورٹ دیکھنے لگی جو منے سے اس کی بات کے دوران لیبارٹری سے آئی تھی۔  
”ڈاکٹر بیڈنبر فور نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔“ وارڈ کاراؤنڈ لے کر آنے والی نرس نے نرسز اسٹیشن پر پہنچتے ہوئے بتایا۔

”کیوں، کیا ہوا؟“ نیبہ نے بلڈ رپورٹ سے نظر ہٹا کر نرس کو دیکھا۔

”سرجری کے بعد بین ہوتا ہی ہے مگر وہ تو بہت نازک مزاجی دکھا رہی ہے رونے لگتی ہے۔“

”ہر مریض کی قوت برداشت یکساں نہیں ہوتی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ڈاکٹر پر بندے کو کچھ تو حوصلہ کرنا ہی چاہئے۔“

”اور اگر وہ بندہ نہ ہو تو؟“ نیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ڈاکٹر؟“

”مطلب یہ کہ اگر بندی ہو۔“

”پھر تو اسے اف بھی نہیں کرنا چاہئے۔ عورت کو تو مرد سے زیادہ حوصلہ مند ہونا چاہئے پھر ہی گزارہ ہوتا ہے۔ اور تب ہی احترام بھی ملتا ہے عورت کو جیسے آپ کو ملا ہوا ہے۔ ہسپتال میں چھوٹا بڑا ہر ایک آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔“

”کیا ڈاکٹر پیام سے شادی کے بعد بھی یہ احترام برقرار رہے گا؟“ نیبہ نے اپنے آپ سے پوچھا۔  
شاید نہیں۔

بلکہ صرف ”نہیں۔“

مگر اس احترام کو برقرار رکھنے کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ وہ خود کو اس کی متحمل نہ پاتی تھی۔ اکیلے زندگی گزارنا واقعی مشکل تھا۔ عورت مجاشی طور پر خود کفیل ہو تب بھی! بجا کہ فرحان کے والدین کے ساتھ وہ اور منا اپنی مادی ضروریات کے اعتبار سے بڑی آسودہ زندگی گزار رہے تھے مگر کچھ جذباتی ضرورتیں بھی تو تھیں۔ منے کی اور اس کی اپنی بھی۔ اس کا بھی جی چاہتا تھا ڈیوٹی کے بعد اپنی سوزوکی ایف ایکس خود ڈرائیو کرتے ہوئے گھر جانے کی بجائے ڈرائیور سیٹ پر بیٹھنے کی ایسے شخص کے ہمراہ گھر جائے جو اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو، جو کبھی تو پوچھے ”کیا بات ہے آج بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔“ جو کبھی تو اس کے تھکے تھکے سے وجود پر اپنے لمس کے پھاہے رکھے۔ جو اسے چاہے سراسر اس کا ہو جائے۔

بجا کہ فرحان کے والدین کے گھر میں رہتے ہوئے اسے اپنے معاملات میں پوری آزادی اور خود مختاری حاصل تھی مگر اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی تو ہو کہ وہ جس کی پابند بن کر رہے۔ وہ منے کو اپنے ساتھ باہر لے جاتی تو اسے اپنی ہی نہیں منے کی زندگی میں بھی ایک خلا کا احساس ہوتا اور اس کے یہی خواہوں کا کہنا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خلا بڑھتا ہی جائے گا۔ اسے منے کے لیے بھی ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اس کے سر کی چھایا بن کر رہے۔  
یہی خواہ نہ بھی کہتے تو خود اپنی زندگی کے حوالے سے بھی اسے اس حقیقت کا ادراک تھا کہ مرد کے بغیر عورت اور باپ کے بننا بچوں کی زندگی کتنی مشکل ہو جاتی ہے!

ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے سے تقریباً دس منٹ قبل ڈاکٹر پیام نے اسے فون کیا۔

”کلینک جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ آپ کا خیال آ گیا۔“



”کیوں؟“

”برسات کے موسم میں آدمی اکیلا ہو تو طبیعت اداس ہونے لگتی ہے۔“

”ایک بات بتائیے..... مگر بالکل سچ سچ..... کبھی ایمین کا خیال بھی آتا ہے آپ کو؟“

ڈاکٹر پیام نے ایک گہرا سانس کھینچا ”میں نے کہیں پڑھا ہے اور لوگوں سے سمجھی سنا ہے کہ مرد اپنی پہلی بیوی اور عورت اپنے پہلے شوہر کو بھی نہیں بھولتی۔“

”غلط! پہلا شوہر اگر ظالم ہو تو ایسے آدمی کو کون عورت یاد رکھنا پسند کرے گی اسی طرح پہلی بیوی اگر اچھی نہ ہو تو اسے یاد کرنا حماقت ہی ہوگی۔“

”آج کیا پروگرام ہے آپ کا؟“ ڈاکٹر پیام نے موضوع بدل دیا۔

”گھر جانے کو بس اٹھ ہی رہی ہوں۔“

”ملاقات ممکن ہے؟“

”کب؟“

”آج“

”مگر آپ تو کلینک جارہے ہیں۔“

”ملازمت اور اپنے کام میں بس یہی فرق ہے کہ ملازمت میں وقت کی پابندی لازم اور اپنے کام میں دیرسور ہو جائے تو چلتا ہے۔“

”چلانے والے تو ملازمت میں بھی دیرسور چلا لیتے ہیں۔“

”جی ہاں یہ بھی درست۔“ ڈاکٹر پیام نے لمحہ بھر کو توقف کیا ”تو پھر ہم مل سکتے ہیں۔“

”اگر آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو تو۔“

”ناٹ ایٹ آل..... مجھے ہرگز کوئی پرابلم نہ ہوگی۔ عموماً سات بجے تک کلینک پہنچتا ہوں ابھی ٹائم ہے..... اتنا ٹائم کہ اہم کسی اچھی سی جگہ کافی پی سکیں۔“

”اوکے۔“

”آپ بلیوٹیل پہنچنے میں آپ کو وہیں ملوں گا۔“

”سمن کیسی ہے؟“

”شی از فائن..... اوکے دین۔“

”خدا حافظ۔“

وہ بلیوٹیل پہنچی تو ڈاکٹر پیام کو اپنا منتظر پایا۔

”اس روز جب ہم بچوں کے ساتھ فن لینڈ میں ملے تو میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آپ میرے لیے اتنی اہم ہو جائیں گی۔“

”کتنی؟“

”یوں لگتا تھا کہ آج اگر آپ سے ملاقات نہ ہوئی تو اندر اداسی اور بڑھ جائے گی۔“

”اب کیا حال ہے؟“ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”افاقہ ہے ڈاکٹر۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

ڈاکٹر پیام نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا۔

”آپ نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا مجھے۔“  
 ”کیا بتاؤں آپ کو کتنی الجھی ہوئی ہوں آج کل۔“  
 ”وجہ؟“

”سمجھ ہی میں نہیں آتا کس سے بات کروں اور کہاں سے شروع کروں۔“  
 ”اپنے گھر والوں سے کیجئے وہی آپ کے ان لاژ تک بہتر طور پر پہنچا سکیں گے یہ بات۔“  
 ”فرحان کے ابو نے کے بارے میں بہت پوزیسو ہیں، ڈرتی ہوں کہ کہیں وہ کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دیں۔“  
 ”آپ کے گھر والے ہی اس مسئلے کو بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں، آپ کوشش تو کیجئے۔“  
 ”جی بہتر ہے، میں بات کرتی ہوں گھر والوں سے۔“

☆☆☆

لرننگ ایج پانچ سال کے لگ بھگ شروع ہوتی ہے۔ اسی لیے ہر اچھے اسکول میں پہلی جماعت میں فائیو پلس کا بچہ لیا جاتا ہے۔  
 ”مگر امی! کلاس ون میں داخلے کے لیے بچے کو کچھ آنا جانا تو ضروری ہوتا ہے نا۔ نرسری اور کنڈرگارٹن والے یہ تیاری کروا دیتے ہیں۔“  
 ”بچے پر ہر روز اسکول آنے جانے کا اضافی بوجھ ڈالے بغیر گھر پر یہ تیاری کیوں نہ کروائی جائے۔ ماں سے بہتر کون تیاری کروا سکتا ہے بچے کو۔“  
 ”سوری امی! میرے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا۔“

”بھئی، ہم تمہاری تھوڑی ان ماؤں کی بات کر رہے ہیں جن کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے اور وہ بچوں کو نرسری اور پلے اسکول بھیج کر بچے کی منہمی سی جان اور شوہر کی جیب پر غیر ضروری بوجھ ڈالتی ہیں۔ تمہارا تو ہمیں معلوم ہے، دیکھتے ہیں ہم کہ صبح سے شام تک مصروف رہتی ہو۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں، ہم اور ظہیر صاحب مل جل کر مرنے کو جو نیر اسکول میں داخلے کی تیاری کروا میں گے اور تم دیکھنا، انشاء اللہ ہمارا منار نرسری اور کنڈرگارٹن اسکولوں سے پڑھ کر آنے والے بچوں سے بہتر ہی ہوگا۔“  
 ”انشاء اللہ۔“

سو منے میاں اب تک آزاد اور بے فکر رہے تھے۔ نہ اسکول جانے کی فکر نہ سبق یاد کرنے کی۔ دن بھر گھر میں اڑے اڑے پھرتے۔ ابھی دادی کے پاس تو ابھی دادا کے سینے سے لگے ہیں۔ کبھی چاچو پیار کرتے تو کبھی بیلا پھپھو لاڈ اٹھانے آ پہنچتے۔ ان حالات میں کے ایف سی کے مزوں نے تو بے تاب کرنا ہی تھا۔  
 نانوکا نمبر اسے بخوبی یاد تھا بلکہ نانوکا کیا، اسے تو دونوں پھوپھوں کے گھروں، چاچو کے آفس اور ماما کے اسپتال کا نمبر بھی زبانی یاد تھے۔

منے نے نانوکا نمبر ملایا اور ظہیر صاحب اسے نمبر ملاتے دیکھ کر خوش ہوا کیے۔ منے کی کال خالہ جانی نے ریسیو کی۔

”خالہ جانی، ماما ہیں؟“

”منے، میری جان! تم ہو؟“

”ہوں۔“

”ماما تو تمہاری یہاں نہیں آئیں، کیا بات ہے، گھر نہیں پہنچیں اب تک؟“

”نہیں، مجھے کے ایف سی جانا ہے۔“

”ماما، کیوں نہیں آئیں۔“



”پتا نہیں، انہوں نے بولا تھا کہ ایف سی جائیں گے۔“  
”ماما نے ایف سی لے جانے کو کہا تھا؟“  
”جی!“

”تو میری چھوٹی سی جان وہ ضرور لے جائیں گی تمہیں۔“  
”ابھی تک آئیں کیوں نہیں؟“

”آجائیں گی۔ ماما کو کوئی کام بھی تو پر دے سکتا ہے ناراستے میں؟“ منعہ نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔  
اور ظہیر صاحب مسز ظہیر کے پاس بیٹھے بڑی تشویش سے کہہ رہے تھے ”بہو صاحب کو اسپتال سے نکلے بھی ڈھائی گھنٹے ہو چکے۔ اب تک نہ یہاں پہنچی ہیں نہ اپنی والدہ کے گھر۔“  
”آجائیں گی“ مسز ظہیر نے ان کی بات کا کوئی خاص نوکس لیے بغیر کہا۔  
”آ تو جائیں گی ہی مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ گئی کہاں ہیں؟“

”آپ تو بس خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“  
”خواہ مخواہ نہیں“ ظہیر صاحب یک بیک بھڑک اٹھے ”میں تمہاری طرح آنکھیں بند کر کے نہیں رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، بہو صاحب اس وقت تمہارے اسی ڈاکٹر پیام کے ساتھ ہوں گی۔“  
”خدا نہ کرے ہمارا کیوں ہونے لگا وہ بھلا؟“  
”ارے بھئی یونہی تمہارے کا لفظ بس..... بے خیالی میں زبان سے نکل گیا۔ بہو صاحب آئیں تو ذرا پوچھنا ان سے۔“

”کیا؟ کیا پوچھیں؟“  
”یہی کہ اسپتال میں بھی نہیں تھیں، اپنی اماں کے گھر بھی نہیں تو پھر کہاں تھیں اتنی دیر؟“  
”جہاں بھی ہوں، ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔“  
”پابندی لگا دو..... کہہ دو کہ یہاں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔“  
”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ان پر پابندی نہ لگائی گئی اور ہم لوگ یونہی زبان بند کیے رہے تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا..... سمجھیں۔“

”دیکھیے۔“ مسز ظہیر بہت ہی نرم لہجے میں گویا ہوئیں ”بیہہ بچی تو ہیں نہیں۔ غیر شادی شدہ نہیں، گھر بیٹھی عورت نہیں۔ ایک بچے کی ماں ہیں۔ ملازمت کرتی ہیں اپنے پیروں پر کھڑی ہیں۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہیں۔ اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار رکھتی ہیں۔ بالفرض کوئی ایسی بات ہے بھی جس کا اندیشہ ہم آپ کے لہجے میں محسوس کر رہے ہیں، تو یہ بتائیے کہ کیا ہم کچھ کر سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں کر سکتے“ ظہیر صاحب نے ترخ کر کہا ”وہ اس گھر کی عزت ہیں اور ہم اپنے گھر کی عزت کو خاک میں ملنے نہیں دیکھ سکتے۔“

”عزت خاک میں ملنے کی کیا بات۔ بیہہ اگر..... دوسری شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں تو مذہب اور معاشرہ دونوں ان کو اس کا حق دیتے ہیں۔“

ظہیر صاحب نے جڑے بھینچ لیے اور شدید اعصابی تناؤ سے دو چار نظر آنے لگے۔  
”آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔“ مسز ظہیر نے ان کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔  
”خواہ مخواہ!“ ظہیر صاحب بھبھک کر بولے ”میں..... میں کوئی ایسی بات نہیں ہونے دوں گا جو منہ کو اس گھر سے

خدا انخواستہ دور کر دے۔ تم..... تم اپنی بہو کو بتا دینا کہ اگر وہ دوسری شادی کرتی ہیں تو منے کی صورت نہیں دیکھنے کو ملے گی انہیں۔“

”او خدا یا!“ مسز ظہیر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بولیں ”م سے کہتے ہیں سوت نہ کپاس جولا ہے لٹھم لٹھا۔“

”کیا مطلب؟“ ظہیر صاحب نے انہیں چونک کر دیکھا۔  
”مطلب یہ کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ بیہ اور ڈاکٹر پیام کے درمیان ہم پیشہ ہونے کے مراسم ہوں اور بس۔“

”بے وقوف مت بنو“ ظہیر صاحب غصے سے بولے۔  
”چلیے، آپ ہمیں عقلمند بننے کا نسخہ بتا دیجئے“ مسز ظہیر نے اپنی دھیمی دھیمی مسکراہٹ سے ظہیر صاحب کا اعصابی تناؤ دور کرنے کی کوشش کی۔

ظہیر صاحب نے انہیں گھورا اور ان کی مسکان گہری پڑ گئی ”اصل بات یہ ہے“ وہ بڑی نرمی سے بولیں ”کہ آپ کو منے کے علاوہ نہ کوئی دوسری دلچسپی رہی ہے نہ مصروفیت۔“

”ہاں“ ظہیر صاحب کی آنکھوں میں سرخی امند آئی ”وہ میری اولاد کی اولاد ہے، اس سے آگے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا“ ظہیر صاحب کی آواز شدت جذبات سے رندھ گئی۔  
مسز ظہیر کا دل دکھنے لگا۔

کیسا زخم لگا تھا دل پر۔  
بھرتا تھا نہ پرانا ہوتا تھا۔

یوں کہنے کو تو زندگی کے تمام سلسلے رواں تھے۔ بھوک بھی لگتی تھی۔ نیند بھی آ جاتی تھی۔ ہنسنے والی بات پر ہونٹ بھی بے اختیار کھل پڑتے تھے مگر فرحان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا کسی صورت نہ بھر پاتا تھا۔ بہانے بہانے اس کی یاد آ جاتی اور دل کسی پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر پیام سے ملنے کے بعد بیہ گھر جانے کی بجائے می کے ہاں جا پہنچی۔ دروازہ کھولنے پر بیہ کو دیکھتے ہی منتہا نے بے ساختہ کہا ”تم کہاں تھیں؟“

بیہ نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی ”کہیں نہیں۔“  
”کہیں نہیں“ منتہا نے معنی خیز لہجے میں اس کے الفاظ دہرائے ”تمہارے گھر سے دو تین مرتبہ فون آچکا ہے۔“

ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی منے نے فون کیا تھا۔  
می ان کی آوازیں سن کر کمرے سے نکل آئیں۔

”بیہ! بچے کہاں چلی گئی تھیں تم، ادھر تمہارے سرال والے پریشان ادھر ہم کہ بارش میں کہاں چلی گئیں۔“  
”ان لوگوں کی تو قسمت میں لکھا ہے پریشان ہونا“ بیہ نے ناگواری سے کہا۔

”بڑی بات ہے بیٹا، ایسے نہیں کہتے“ می نے ٹوکا۔  
”اچھا آؤ بیٹھو تو سہی“ منتہا نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”پہلے اپنے گھر فون کرو تا کہ تمہارے ساس سر کو اطمینان ہو“ می بولیں۔  
”منا کیا کہہ رہا تھا؟“ بیہ نے ٹیلی فون ریک کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔  
”اسے تم نے شاید کے ایف سی لے جانے کا وعدہ کیا تھا؟“



”اومائی گاڈ!“ میہ نے دھیرے سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا ”میں تو بھول ہی گئی۔“  
 ”ایسی کیا مصروفیت تھی، جو تم نے سے کیا ہوا وعدہ بھول گئیں؟“ منجہا نے کہا۔  
 ”میں نے چونک کر اسے دیکھا اور مذہب لہجے میں بولی ”آں..... ہاں..... کچھ نہیں۔“  
 ”ارے بھی پہلے گھر فون کر لو، بچہ بھی پریشان ہو رہا ہوگا“ می نے گویا یاد دہانی کرائی۔  
 ”میںہ نمبر ملانے لگی۔“

منجہا جو میہ کے آنے سے قبل کچن میں مصروف کار تھی۔ رات کے کھانے کے لیے چولہے پر دھری دیکھنی کے نیچے  
 آج دھیمی کرنے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔  
 ”میںہ کی فون کال مسز ظہیر نے ریسیو کی۔“

”السلام علیکم!“  
 ”وعلیکم السلام..... خیریت! کہاں ہو؟“ مسز ظہیر نے پوچھا۔  
 ”میںہ کے ہاں۔“

”اچھا! مگر ہم لوگوں نے تو دو تین مرتبہ فون کیا، پتا چلا نہیں ہو۔“  
 ”مجھے راستے میں کچھ کام بھی تھا۔“

”ایک کیا، باہر نکلنے والی عورتوں کو دس کام پڑ جاتے ہیں۔ بس ذرا فکر اس لیے تھی کہ ایک تو آج موسم ایسا ہے،  
 دوسرے منے کو آج تمہارا کچھ زیادہ ہی انتظار تھا۔“

”جی..... میں نے اسے باہر لے جانے کا وعدہ کیا تھا مگر مجھے کام پڑ گیا۔“ وہ اب قدرے خفیف ہو کر بولی۔  
 ”کوئی بات نہیں، تم آؤ گی تو عدنان تم دونوں کو لے جائیں گے۔ بلکہ ہم ایسا کرتے ہیں، عدنان سے کہتے ہیں،  
 منے کو لے کر تمہارے پاس پہنچ جائیں۔“

”رہنے دیجئے، میں اسے کل لے جاؤں گی۔“

”اس کا دل چھوٹا ہوگا۔“

”میں اسے سمجھا دوں گی۔“

”بلا میں ہم اسے۔“

”پلیز!“

”منے..... منے ماما کا فون آیا ہے“ مسز ظہیر نے پکارا۔

ذرا دیر بعد ہی منالائن پر تھا۔

”اٹی دیر ہوگئی ماما، آپ آئیں نہیں“ اس نے گلہ کیا۔

”بیٹا! ماما کو کچھ ضروری کام کرنا تھا۔ اچھا ایسا ہے بیٹا، آج تو دیر ہوگئی، ماما اب بہت تھک گئی ہے۔ آج تو ہم نہیں  
 جا سکیں گے، کے ایف سی کل یا پھر کسی اور دن۔ ہاں، میں تمہارے لیے فریج فرائیز لیتی ہوئی آؤں گی، اوکے!“

”اوکے۔“

”گڈ بوائے۔“

”میںہ منے سے بات کر کے پلٹی تو منجہا کافی ہنا چکی تھی۔“

”بھابی کہاں ہیں؟“

”علیب نے آج چھٹی کی تھی، موسم کا لطف اٹھانے کے لیے دونوں باہر نکلے ہوئے ہیں“ منجہا نے بتایا۔

”منجہا، میں وضو کرنے جا رہی ہوں، تم ذرا سالن دیکھ لینا“ می نے کہا۔

”میں نے آج دھبی کر دی ہے والدہ!“  
 می کے جانے کے بعد بیہ نے کچھ ہچکچاتے ہوئے منتہا سے کہا ”آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے مجھے۔“  
 ”ہاں ہاں، کہو“ منتہا نے چونک کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔  
 وہ مذہب دکھائی دینے لگی۔  
 ”چپ کیوں ہو گئیں، بولو کیا بات ہے؟“  
 ”با..... بات تو کچھ عجیب سی ہے“ اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔  
 ”کوئی بات نہیں، تم بتاؤ تو سہی“ منتہا نے نرم لہجے میں کہا۔  
 ”ڈاکٹر پیام سے تو واقف ہیں نا آپ؟“  
 ”براہ راست تو نہیں، تم سے اور منے سے ہی ذکر سنا ہے ڈاکٹر پیام اور ان کی بیٹی کا..... کیا ہوا ڈاکٹر پیام کو؟“  
 ”انہوں نے.....“ وہ ہچکچائی ”وہ..... مجھ سے.....“  
 ”تجہ میں پرو پوز کیا ہے انہوں نے؟“ منتہا نے یقین آمیز لہجے میں کہا۔  
 بیہ نے بے ساختہ چونک کر اس کی جانب دیکھا ”آپ کو کیسے پتا؟“  
 منتہا نے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اس کے شانے پر دھر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی ”ہم بہنیں ہیں، ہم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے ایک دوسرے کے دل کی بات۔ مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ می کو بتاتی ہوں۔“  
 ”انہیں بتانے سے پہلے مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟“  
 ”سب سے پہلے تو تم شکرانے کے نفل پڑھو۔ والدہ کتنی فکر مند تھیں تمہارے لیے، بائی داوے کب بات کی انہوں نے تم سے؟“

”تین چار ہفتے ہو گئے، جواب کے لیے دوسرے تیسرے دن یاد دہانی کر رہے ہیں، آج بھی مُصر تھے۔“  
 ”ہیں!“ منتہا کے لہجے میں حیرانی تھی ”تین چار ہفتے ہو گئے اور تم ہمیں اب بتا رہی ہو؟“  
 بیہ کچھ نہیں بولی۔  
 ”آدی تو شریف ہیں نا؟“  
 ”لگتے تو ہیں۔“

”کیا مطلب! کیا تم انہیں اچھی طرح نہیں جانتیں؟“  
 ”میڈیکل کالج میں ہمارے سینئرز میں سے تھے، یہ بھی اور ان کی محترمہ بھی۔ سوائے ان دونوں کی آپس کی پسندیدگی کے مجھے نہیں یاد کہ کبھی ہم نے کوئی ایسی ویسی بات سنی ہو ان کے بارے میں۔ شریف ہی تھے بھی تو بیگم اتنی جلدی چلی گئیں۔ بد معاش آدمی عورت کو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے نہیں جانے دیتا۔“  
 ”ارے! تم تو بڑے پتے کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ منتہا نے کہا۔  
 ”وہ تو خیر میں ہمیشہ ہی کرتی ہوں“ بیہ اتر کر بولی۔

منتہا کو اس کے اترانے پر پیار آ گیا۔ کتنے عرصے بعد وہ کچھ دنوں سے پہلے کی طرح خوش اور مطمئن دکھائی دینے لگی تھی۔ می اور منتہا سے ڈاکٹر پیام کے تذکرے کی ابتدا منے کے ذریعے ہوئی تھی اور می کے استفسار پر بیہ نے ڈاکٹر پیام کا ان سے غائبانہ تعارف کر دیا تھا۔ اس تعارف کی روشنی میں می اور منتہا کو بیہ کے موڈ میں تبدیلی کا سبب کافی حد تک سمجھ میں آ گیا تھا۔ ڈاکٹر پیام سے روبرو ملے بغیر ہی وہ دونوں کبھی بھی ایک ساتھ دعا گو ہو جاتیں کہ خدا ڈاکٹر پیام کے دل میں ایسی نیکی ڈال دے کہ وہ بیہ سے رشہ مناکحت کی طرف مائل ہو جائیں۔ ان دونوں میں سے کسی کے بھی گمان میں نہیں تھا کہ ان کی دعا اتنی جلد قبول ہو جائے گی۔



منتہا کو یک گونہ مسرت ہو رہی تھی۔ می وضو کر کے ہاتھ روم سے نکلیں اور کمرے میں آئیں تو منتہا سے ضبط نہ ہو سکا۔

”ایک خوشی کی خبر سنیں گی والدہ؟“

”سو بسم اللہ کر کے سنوں گی۔ کیا ہوا؟“

”وہ جو ڈاکٹر پیام ہیں نا.....“

”ہاں ہاں۔“ می سراپا اشتیاق نظر آنے لگیں۔

”انہوں نے بیہ کو پروپوز کیا ہے۔“

می نے دونوں ہاتھ دعا مانگنے والے انداز میں اوپر اٹھائے اور بولیں ”رَبُّ الْعِزَّتِ کَا لَاکھ لَاکھ شکر اور احسان ہے۔“ انہوں نے بیہ کی جانب دیکھا اور پوچھا ”تمہارے سرال والوں کے علم میں ہے؟“

بیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تین چار ہفتے پہلے بات کی تھی ڈاکٹر پیام نے۔ یہ آج ذکر کر رہی ہیں ہم سے۔“ منتہا نے می کو بتایا۔

”غلطی کی..... اچھے رشتے بھلا کب رکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کہیں اور.....“

”آپ اطمینان رکھیے رشتہ ہنوز مضی میں ہے۔“ منتہا نے خوش دلی سے کہا۔

”ارے تو پھر دیر کس بات کی۔ ہمیں لڑکے سے ملو آؤ۔“

”لڑکا نہیں ہیں وہ۔ اچھے بھلے آدمی ہیں۔“ بیہ بولی۔

”بچے آج کل کنواری لڑکیوں کے لیے بر مشکل سے ملتے ہیں۔ یہ اللہ نے غیب سے سبیل نکالی ہے۔“

”بالکل۔“ منتہا نے تائید کی اور اپنا ہاتھ دوبارہ بیہ کے شانے پر رکھتے ہوئے بولی ”میری بہن کتنی اچھی ہے

والدہ۔ جذباتیت کی بجائے عقل سے کام لے رہی ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ رہی ہے کہ اسے زندگی کو از سر نو شروع کرنا

چاہیے۔“

”فون نمبر ہوگا تمہارے پاس ان کا؟“ می نے بیہ سے پوچھا۔

”جی۔“

”بہن کو لکھو آؤ۔ ایک آدھ روز میں انہیں چائے پر گھر بلاتے ہیں پھر بات کریں گے۔“

”فرحان کے گھر والوں سے کون بات کرے گا؟“ بیہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”ہم کریں گے اور کون۔“

”بہت دیکھ بھال کر اور سوچ سمجھ کر بات کرنی ہوگی ان لوگوں سے۔“

”تم فکر نہ کرو، میں طریقے سے بات کروں گی۔“

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطبات کو پین والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے نمک (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کو پین کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کریں تاکہ یہ ضائع نہ ہوں۔ ای میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔



نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر ممالک میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)

”فرحان کے ابو باتوں باتوں میں کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ منہ کو وہ کبھی بھی اپنے سے دور نہیں جانے دیں گے۔“ یہ تو خیر ان کی محبت ہے۔ منا خوش نصیب ہے کہ ددھیال والے اس سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں نہ جانے کتنے ایسے بچے ہیں جن کے سروں پر باپ کے بعد کوئی ہاتھ رکھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ ہاں میہ یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر پیام تو منہ کے سر پر ہاتھ رکھنے کو تیار ہیں نا؟“ مئی نے پوچھا۔

میہ کی آنکھیں یک بیک ڈبڈبا گئیں ”آپ کو ایک بات بتاؤں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”اگر منانہ ہوتا تو میں ساری زندگی فرحان کے نام پر گزار دیتی مگر میں منہ کو اپنی طرح باپ کے سائے سے محروم نہیں رکھنا چاہتی۔ بہت فرق پڑتا ہے مئی، بچے سر پر باپ کے نہ ہونے سے احساس محرومی، کمتری اور عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔“

مئی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سر جھکا کر بولیں ”بیٹا میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ تم لوگ باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کے ہو کر زندگی گزارو۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کبھی کہ تمہارے ڈیڈی یوں نگاہیں بدل لیں گے۔“

منتہا نے اپنی بائیں مئی کے گلے میں حائل کر دیں اور بولی ”کیا فرق پڑ گیا ہمیں، میں تو سمجھتی ہوں کہ ان کے بغیر ہم نے زیادہ اعتماد سے جینا سیکھا۔ آج ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے علم، شعور، اعتماد اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے اور ہماری ماں کی نیکی اور صبر کا ثمر۔ کوئی اور یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس میں اس کا بھی کچھ حصہ ہے۔ ہمیں آپ پر فخر ہے والدہ۔“ مئی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

☆☆☆

شنید تھی کہ ڈائریکٹریٹ کے زیر انتظام ثانوی تعلیمی اداروں میں ہیڈز کی چند خالی اسامیوں کو پُر کرنے کے لیے چند وائس پرنسپلز کو ان کی سینیاریٹی اور کارکردگی کی بنیاد پر ترقی دینے کے لیے ڈی پی سی ہونے والی تھی۔ وزارت تعلیم کے ایک افسر نے جن کا بچہ منتہا کے اسکول میں زیر تعلیم تھا ایک روز فون کر کے اطلاع دی ”میڈم مبارک ہو پرموشن کے لیے جو نام زیر غور ہیں ان میں آپ کا نام اے سی آر کے اعتبار سے ٹاپ پر ہے۔ تھرو آؤٹ آپ کی اے سی آر اے ون ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی صلاحیت دی ہے۔“

”تھینک یو ویری میچ۔ ایک بات کہوں برا نہ منائیے گا۔“

”جی میڈم ضرور۔“

”اے سی آر کا فیڈنشل ہوتی ہے، اسے کا فیڈنشل ہی رہنا چاہیے۔“

”ارے میڈم اس ملک میں تو بڑے بڑے قومی راز کا فیڈنشل نہیں رہتے آپ اے سی آر کی بات کرتی ہیں۔“

”ہماری مشکل اور مشترکہ قومی المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملک پر نکتہ چینی کرنے اور قوم پر طعنہ زنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“

افسر مذکور کھسپاتی سی ہنسی ہنس دیئے۔

”میں نے سنا ہے میڈم بلکہ آپ کی اے سی آر میں آپ کے افسروں کے یہ ریمارکس بھی پڑھے ہیں کہ آپ بہت بہت آؤٹ سیوکن ہیں۔“

”جی مجھے اعتراف ہے کہ میں منافق نہیں ہوں اور میری اس خامی نے مجھے بزدل اور ڈرپوک بننے سے بچایا ہے۔“

”بہت خوب! ایک روز یہاں منسٹری میں آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی کہنے لگے بھئی وہ تو اصول کی بات پر اپنے ڈائریکٹر کے سامنے بھی ڈٹ جاتی ہیں۔“



## تاریکی، مشوج، دنوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں، ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”میں اپنے افران بالا کی مشکور ہوں کہ وہ مجھے میری تمام خامیوں کے باوجود برداشت کیے ہوئے ہیں۔“  
 ”مارویس میڈم! آپ کو گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ آپ کی پروموشن پکی ہے میڈم پیٹنگی مبارک باد!“  
 وہ چپ رہی۔  
 ”اوکے میڈم!“  
 ”خدا حافظ!“

☆☆☆

ممی اور منتہا مسز ظہیر کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ دونوں سمدھنوں کا ایک دوسرے کے ہاں کافی کافی دنوں بعد آنا جانا ہوتا تھا۔ ممی قصد ایسے وقت آئی تھیں جب میہ ڈیوٹی پر تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ممی اس وقت مدعا پر آگئیں جب ظہیر صاحب بھی موجود تھے تاکہ ان کا ریکارڈ بھی دیکھ سکیں۔  
 ”آپ لوگوں سے ایک بات کرنی ہے مجھے۔“

ان کے غیر معمولی محتاط لہجے پر مسز ظہیر کا ماتھا ٹھنکا۔  
 ممی نے کن انکھیوں سے منتہا کی طرف دیکھا پھر مسز ظہیر سے بولیں ”ہمت نہیں ہو رہی ہے میری آپ سے بات کرنے کی مگر کیا کروں مجبوری ہے۔“  
 مسز ظہیر جہاں دیدہ تھیں معاملہ تازہ گئیں۔

ممی نے ان کا ہاتھ دھیرے سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں گویا ہوئیں ”یقین کیجئے آپ اتنی شرمندہ ہو رہی ہوں میں آپ سے اس وقت بات کرتے ہوئے کہ بتا نہیں سکتی۔“ انہوں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر ہنسی بھری آنکھوں سے کہا ”میہ آپ کے لیے بھی بیٹی کی طرح ہے۔ مجھے تو علیب کی شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ دوسرے گھر سے آنے والی لڑکی کس طرح ہماری اجنبی بن جاتی ہے۔ بالکل اپنا بیٹیوں کی طرح گلے لگتی ہے۔“  
 ”بے شک!“ مسز ظہیر نے تائید کی۔

”مجھے معلوم ہے میہ کو اس گھر میں ہر طرح کا آرام ہے۔ عزت دی ہوئی ہے آپ سب نے اسے مگر.....“ ممی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

منتہا کو ممی کی مدد کرنے کے لیے ہمت کرنا پڑی۔  
 ”والدہ بہت فکر مند رہتی ہیں میہ کے لیے۔“

”ہم..... ہم ہیں نا..... ہم سب..... ان کا خیال رکھنے کو۔“ ظہیر صاحب بولے۔

”جی وہ تو ٹھیک ہے مگر والدہ چاہتی ہیں کہ اس کا اپنا..... گھر بن جائے۔“

”یہ گھر ان کا ہے۔“

ممی اور منتہا کی نظریں باہم ملیں۔ وہ سمجھ نہیں رہے تھے یا بات کو الجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

خدا یا! کتنا مشکل روز ہا تھا بات کرنا!

”اصل میں..... میہ کے لیے..... ایک رشتہ آیا ہے۔“  
 ظہیر صاحب اور مسز ظہیر نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ مئی اور منتہا کی نگاہیں باہم ملیں۔  
 ”رشتہ!“ ظہیر صاحب کی کیفیت ناقابل بیان تھی۔  
 ”جی بھائی صاحب۔“ مئی نے آہستگی سے کہا۔

”اور مئی کا کیا ہوگا؟“ ظہیر صاحب ایک صدمے کی کیفیت میں تھے۔  
 ”ظاہر ہے وہ میہ کے ساتھ ہی رہے گا۔“ مئی نے کہا۔  
 ظہیر صاحب اور مسز ظہیر کی نگاہیں پھر ملیں۔  
 ”نہیں.....“ ظہیر صاحب نے دونوں لہجے میں کہا ”ہم اپنے بچے کو کسی غیر آدمی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں

میں۔“  
 ”اس کی ماں ساتھ ہوگی۔“ مئی نے کہا۔  
 ”ہم تو نہیں ہوں گے۔“ ظہیر صاحب کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔  
 ”معاف کیجئے گا بھائی صاحب ماں سے بڑھ کر بچے کا خیال اور کون رکھ سکتا ہے۔“  
 ”ہم..... ہم رکھتے ہیں۔“ ظہیر صاحب نے کہا۔  
 ”ہم..... آپ آخر کب تک بیٹھے رہیں گے۔ میہ ابھی جوان ہے۔ بچہ چھوٹا ہے، کیسے کاٹے گی پہاڑی  
 زندگی..... اور کل جب منابڑا ہوگا تو کون اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائے گا، کون اسے راستہ دکھائے گا۔“ مئی بھی  
 کچھ جذباتی سی ہو گئیں۔

ظہیر صاحب اپنے دونوں ہاتھوں کو بے تابانہ ایک دوسرے پر گھمانے پھرانے لگے۔  
 ”بیٹیاں تو بے چاری گھر میں بیٹھی رہتی ہیں، بیٹوں کو اگلے سیدھے راستوں سے بچانے کے لیے سر پر کسی سمجھ دار  
 مرد کا ہونا ضروری ہوتا ہے بھائی صاحب۔“  
 ”ہم نہ بھی ہوئے تو چچا ہے اس کا۔“ ظہیر صاحب نے تیز لہجے میں کہا۔  
 ”خیر سے جب چچا کی اپنی فیملی ہوگی تو اس کی پہلی توجہ اپنے بچوں پر ہوگی۔“  
 ظہیر صاحب زچ سے دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے مدد طلب نگاہوں سے مسز ظہیر کی جانب دیکھا۔  
 مسز ظہیر نے نظریں جھکا لیں۔  
 ظہیر صاحب الجھن میں پڑ گئے۔

”منا جہاں بھی رہے، آپ ہی کارے گا بھائی صاحب۔“ مئی بولیں۔  
 ظہیر صاحب نے تڑپ کر نگاہیں اٹھائیں۔ ان کی آنکھوں میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔  
 ”منا کہیں نہیں جائے گا..... یہیں رہے گا۔“ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ان کی آواز میں ایک نیا طعنے  
 ایک غیر معمولی کیفیت تھی ”جب رشتہ گھر میں موجود ہے تو باہر جانے کی کیا ضرورت!“ انہوں نے مزید کہا۔  
 مئی، منجھا اور مسز ظہیر تینوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ مئی نے کچھ کہنے کو لب واکر کرنے چاہے مگر ظہیر  
 صاحب نے ان کے بولنے سے پیش تر ہی کہا ”عدنان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا۔۔۔ دکھ تو دکھ ہے۔۔۔۔۔ جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے۔۔۔۔۔ آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے نابید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ مفتی نابید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

**محبتوں سے کندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کا چانک سار ہونے کی دل گداز داستان**

ناہید سلطانہ اختر

قسط 27









”عدنان!“ می کے لہجے میں استعجاب بھی تھا، استفسار بھی۔  
 ”جی ہاں۔“ ظہیر صاحب نے کہا ”جب گھر میں رشتہ موجود ہے تو باہر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 مسز ظہیر جو دم بخود تھیں کچھ کہنے کا قصد کرتی نظر آئیں مگر ظہیر صاحب نے انہیں بیک وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”مگر..... وہ تو..... چھوٹا ہے میہ سے۔“  
 ”کیا ہوا..... دو تین سال کا فرق چلتا ہے۔ اپنے پیروں پر تو کھڑا ہے۔ گھر کے رشتوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ نہیں بنایا جاتا۔“ ظہیر صاحب بولے۔  
 می اور منتہا نے ایک دوسرے کو الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھا۔  
 ”اور..... اگر..... اگر میہ کو اعتراض ہوا؟“ می نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا اعتراض ہوگا۔ اس گھر سے اچھا گھر انہیں اور کہاں ملے گا جہاں ان کے بچے کو بھی پورا تحفظ اور محبت حاصل ہے۔ دوسرا آدمی خدا جانے کیا سلوک کرے بچے کے ساتھ۔“  
 می کشمکش میں پڑ گئیں۔

”پوچھنا پڑے گا میہ سے۔“  
 ”پوچھ لیجئے۔“ ظہیر صاحب بولے ”ویسے انہیں اعتراض ہونا تو نہیں چاہیے۔“  
 ”آ..... آپ اپنی مرضی کیوں تھوپنا چاہتے ہیں؟“ مسز ظہیر بالآخر بول ہی اٹھیں۔  
 ”مرضی تھوپنے کی کیا بات..... ہم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے فرحان کی اولاد کے لیے۔“  
 ”وہ میہ کی اولاد بھی ہے بھائی صاحب۔“ می نے دلی زبان سے کہا ”ہم بھی خدا نخواستہ بُرا نہیں چاہیں گے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ تو پھر اچھا تو یہی ہے کہ بہو صاحب اسی گھر میں رہیں۔“  
 ”اور اگر..... بالفرض عدنان راضی نہ ہوئے۔“ منتہا نے محتاط لہجے میں کہا۔  
 ”اس کا تو باپ بھی راضی ہوگا۔“ شدت جذبات میں ظہیر صاحب کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔  
 منتہا اور می کی نگاہیں پھر باہم ملیں اور ایک دوسرے کو کوئی چارہ کار نہ پانے کا پیغام دیتی پلٹ گئیں۔  
 ”عدنان کو وہ کرنا ہوگا جو ہم چاہیں گے۔“ ظہیر صاحب آمرانہ انداز میں بولے۔  
 ”مسز ظہیر نے می کی طرف دیکھا اور کچھ جھپکتے ہوئے کہا ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں..... میہ کے لیے رشتہ..... آیا کہاں سے ہے؟“

”وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“ می نے بتایا۔  
 ”میڈیکل کالج میں میہ کے سینئر ہوا کرتے تھے وہ۔“ منتہا نے بتایا۔  
 ”ڈاکٹر پیام تو نہیں۔“ ظہیر صاحب نے پوچھا۔  
 ”جی وی۔“ منتہا نے بے ساختہ چونک کر ان کی جانب دیکھا۔  
 ظہیر صاحب دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ سے انداز میں بیگم کو دیکھنے لگے۔ مسز ظہیر نے پہلو بدلا اور دھیرے سے کھنکھار کر ظہیر صاحب کو گویا کوئی ایسی ویسی بات کہہ دینے سے باز رہنے کی تنبیہ کی۔  
 ”ہمیں معلوم تھا۔“ ظہیر صاحب ان کی تنبیہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے منتہا کی طرف دیکھ کر بولے۔  
 ”کیا؟“

”کہ کون ہوگا بہو صاحب میں انٹر سٹڈ۔“  
 ”میہ نے شاید ذکر کیا ہوگا گھر میں۔“ منتہا جھینپ سی گئی تھی۔

”نہ بھی کیا ہو تو آخر تجربہ ہے میرا۔ اُڑتی چڑیا کے برکن لیتا ہوں۔“  
 ”اور سنا ئے علیب میاں کی دہن کیسی ہیں؟“ مسز ظہیر نے یک لخت موضوع سخن بدل دیا۔  
 ”ٹھیک ہیں۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔ بہت اچھی بہودی ہے اس نے ہمیں۔“ می کے لفظ لفظ سے تشکریاں  
 تھا۔

”ارے ہماری باتوں میں یہ مٹنا کہاں نکل گیا!“ ظہیر صاحب کچھ پریشان ہو کر اٹھے۔  
 ”گھر ہی میں ہو گا آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“  
 ظہیر صاحب نے کونہ سے چلے گئے۔

”نئے میں تو جیسے ان کی جان ہے۔“ مسز ظہیر نے کہا پھر می کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے خفت سے بولیں۔  
 ”آپ ظہیر صاحب کی باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ بس جوان کے دل میں ہوتا ہے کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ جو انہوں نے  
 آپ سے عدنان کے بارے میں بات کی ہے، چکے چکے ہم دونوں کے درمیان بارہا ڈسکس ہوئی مگر دو وجوہات کی بنا  
 پر ہم نے خود بھی یہ بات کسی اور کے سامنے نہیں کی اور ظہیر صاحب کو بھی باز رکھا۔ پہلی وجہ دونوں کی عمروں کا فرق اور  
 دوسری وجہ یہ کہ ہم اولاد پر بلکہ کسی پر بھی اپنی مرضی ٹھونسنے کے قائل نہیں مگر دیکھیے ہمارے منع کرنے کے باوجود انہوں  
 نے آج جذباتی ہو کر یہ بات آپ کے سامنے کہہ ہی ڈالی۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بھی نیک نیتی کے ساتھ ہی کہی ہے۔ سچ پوچھیں تو بات تو بھائی صاحب کی دل کو لگتی  
 ہے مگر بات آپ کی بھی سچ ہے کہ اولاد پر آدمی اپنی مرضی کیوں تھوپے۔ بہر حال میں یہہ سے بات کروں گی۔ دیکھتی  
 ہوں وہ کیا کہتی ہے۔“

مسز ظہیر مطمئن سی دکھائی دینے لگیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر منہا کا ہاتھ بہت محبت سے اپنے ہاتھ میں  
 لے لیا اور بڑی اپنائیت سے بولیں ”اتنی مصروف ہو گئی ہو کہ دوسروں کو اپنی صورت دکھانے سے ترسادیتی ہو۔“  
 منہا کچھ شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔

”آپ کو تو یہ اپنی محسن سمجھتی ہے بلکہ یہ کیا ہم سبھی۔ آپ نے اس وقت ہمیں سہارا دیا جب انہوں نے نظریں بدل  
 لی تھیں۔ آپ کا احسان ہم میں سے کون بھول سکتا ہے بھلا۔“ می انتہائی ممنونیت سے بولیں۔  
 ”ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ مسز ظہیر کے لہجے سے عجز جھلک رہا تھا ”ہم بھلا ہیں ہی کس لائق۔ آپ کے بچے  
 ماشاء اللہ خود بہت باصلاحیت ہیں۔“

”یہ آپ کی عظمت ہے کہ احسان کر کے بھی نہیں جانتیں۔“ منہا نے کہا۔  
 مسز ظہیر نے اسے پیار آمیز نگاہوں سے گھورا ”بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔ ہاں بھی ماشاء اللہ پرنسپل جو  
 ہو۔ ابھی پچھلے دنوں ایک تقریب میں ہماری ایک ملنے والی بہت تعریف کر رہی تھیں تمہارے اسکول کی اور تمہارے  
 انتظام والے اصرام کی۔“

”کون تھیں؟“ منہا کو تجسس ہوا۔  
 ”اچھی بھابی کی خالہ زاد بہن۔ ان کے پوتا پوتی پڑھتے ہیں تمہارے اسکول میں۔ بچوں کے والد باہر ہوتے  
 ہیں۔ اسی ادارے میں ملازم ہیں جہاں نعیم۔“  
 ”اچھا!“ منہا کو تعجب ہوا ”میرے علم میں نہیں۔“  
 ”انہیں کب رخصت کر رہی ہیں آپ؟“ مسز ظہیر نے می کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے منہا کے بارے میں  
 پوچھا۔

”میرا بس چلے تو پہلا کام یہی کروں مگر..... آپ سے بھلا کیا چھپانا آپ کو تو سب معلوم ہے۔“



مسز ظہیر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”بس..... یہ کہیے کہ حالات کو الجھنا تھا۔ ورنہ ہمارے اپنے دل کی اگر آپ پوچھیں تو نعیم اور فہیم ہمیں اپنے بچوں کی طرح پیارے ہیں۔ ہمارے مرحوم بھائی کی نشانیاں ہیں اوروں کے دلوں میں تو ہم داخل ہونے کے لئے مگر ہمارے اپنے دل کی حقیقت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہمیں فرحان کے بارے میں صبر بھی آ گیا اور..... نعیم کی طرف سے وقتی طور پر جو رجسٹر دل میں آگئی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ ایک سیڈنٹ تو بہانہ تھا فرحان کی زندگی ہی اتنی تھی۔“ مسز ظہیر کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں بھر آئیں۔

”مگر یہ..... نعیم کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔“ می نے کہا۔

مسز ظہیر نے پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور زندگی ہوئی آواز میں بولیں ”وقت ایسا مرہم ہے جو دل پر لگے بڑے بڑے زخم بھر دیتا ہے۔ یہہ جب اپنی زندگی کی از سر نو شیرازہ بندی کر لیں گی تو وہ بھی اس صدمے کو بھول جائیں گی۔ دیکھیے نا نعیم کو فرحان سے خدا نخواستہ کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ بس یہ دکھ اسی طرح ملنا اور سہنا تھا ہم لوگوں کو۔ لیکن جتنی تعریف فہیم کی کرتی ہیں اس سے کہیں زیادہ نعیم کی۔ وہ کہتی ہیں سگے بھائی بھی بہنوں کا کم ہی اتنا خیال رکھتے ہیں جتنا کہ نعیم ان کا رکھتے ہیں۔ وہاں جانے کے بعد تو وہ اتنی مداح ہو گئی ہیں نعیم کی کہ کہتی ہیں نعیم بھائی انسان نہیں فرشتہ ہیں۔“

فرحان کی موت کے بعد پہلی بار می کو مسز ظہیر کی باتوں سے یوں لگا جیسے ان کے دل سے نعیم کی بابت رجسٹر کی دھند چھٹ رہی تھی۔

”لیکن“ کا نعیم کو فرشتہ کہنا تو مبالغہ تھا۔ انسان تو انسان ہی ہوتا ہے مگر اس امر میں کوئی مبالغہ نہ تھا کہ نعیم ایک اچھا انسان تھا اور اس کے ثبوت کے لیے یہ ایک بات ہی بہت تھی کہ ایک ایسی دنیا میں جہاں لوگ خونی رشتوں کی ذرا ذرا سی بات پر دھجیاں بکھیر دیتے ہیں۔ اخلاقی ضابطوں کی پروا نہیں کرتے۔ ازدواجی بندھن کو توڑ دینا کھیل سمجھتے ہیں وہ منعہا سے اپنی نسبت کو قابلِ رشک ٹکرم دینے بڑے صبر و تحمل سے اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ یہہ نے بھر کر کہا۔

”بیٹا تھوڑا سا عمر ہی کا تو فرق ہے نا باقی تو سب ٹھیک ہے۔“ می نے رسانیت سے کہا۔

”کیا ٹھیک ہے!“

”تمہیں اور منے کو کہیں اور نہیں جانا پڑے گا۔ منے کے لیے دادا، دادی، پھوپھیاں سب وہی رہیں گے۔ عدنان تو پہلے ہی اس سے بہت پیار کرتا ہے۔“ می نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”جی..... اور مجھے..... منے کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ وہ عدنان کو چاچو کے بجائے ابا کہنا شروع کر دے۔“ یہہ طبعاً تھوڑی سی منہ پھٹ تھی۔

”ضروری نہیں، بے شک وہ چاچو ہی کہے۔“ می نے سادہ لوحی سے کہا۔

یہہ اپنا غصہ بھول کر بے ساختہ مسکرا دی اور می کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کرتے ہوئے بولی ”جو بات ممکن نہیں بہتر ہے ہم اس پر خواہ مخواہ سوچ بچار کر کے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔“

”ڈاکٹر پیام کے لیے تمہارے سر راضی نہیں ہوں گے۔“

”وہ کون ہوتے ہیں۔“ یہہ نے ابرو چڑھا کر کہا ”زندگی مجھے گزارنی ہے یا نہیں۔“

”بات تمہاری ٹھیک ہے مگر پوتے کو وہ آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔“

”ان کا پوتا بعد میں ہے پہلے وہ میرا بیٹا ہے۔“

”لیکن بیٹا اگر وہ اس معاملے کو قضیہ بنانے پر آگئے تو یہ سمجھ لو کہ تم عورت ہو اور نا تجربہ کار ہو۔ وہ مرد ہیں اور دنیا کو

کھنگالے ہوئے ہیں۔“  
 ”میں انہیں خاطر میں لانے والی نہیں۔“  
 ”بیٹا، میرے دل کو تو ان کی بات لگی۔ تم اسی گھر میں رہو گی۔ منے کو بھی پیار اور تحفظ جتنا اس گھر میں مل سکتا ہے  
 شاید کہیں اور نہ مل سکے۔“  
 ”میں منے ہی کو ایک نارمل زندگی دینا چاہتی ہوں۔“  
 ”میں سمجھی نہیں۔“

”ان بڑے میاں کی صحبت میں رہ کر وہ بھی بوڑھی روح بنتا جا رہا ہے۔“  
 ”بڑی بات ہے بیٹا، بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے بھی ان کا ادب سے ذکر کرتے ہیں۔“  
 ”آپ نہیں جانتیں مئی۔“ بیہ کے لہجے میں بیزاری تھی۔  
 ”میں سب جانتی ہوں۔ دیکھو میری رائے تو یہی ہے کہ باہر کے آدمی سے عدنان لاکھ درجے بہتر ہے۔“  
 بیہ کی نگاہوں سے ناگواری جھلکنے لگی ”آپ کیا سمجھتی ہیں، میں نے یہ فیصلہ شوقیہ کیا ہے۔ صرف منے کی خاطر کیا  
 ہے میں نے یہ فیصلہ تاکہ اسے محرومی کا احساس نہ ہو۔ عدنان سے شادی کرنے کے بجائے میں اپنی اور منے کی ساری  
 زندگی اسی طرح گزارنے کو ترجیح دوں گی۔“  
 مئی بے بسی سے اس کا منہ دیکھنے لگیں۔

منتہا جو کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی گھر واپس لوٹی تو بیہ مئی سے اس بات چیت کے بعد اپنے گھر جا چکی تھی۔  
 ”میں نے آپ سے کہا تھا نا والدہ کہ عدنان کے لیے بیہ شاید ہی آمادہ ہو۔“  
 ”تو یہ اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے گا۔ تمہارا بھی وقت نکلا جا رہا ہے۔“ مئی روہانسی دکھائی دینے لگیں۔  
 ”آپ پریشان نہ ہوں۔“ منتہا نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔  
 ”کیسے نہ ہوں پریشان، بیہ کے ساس سر کو جواب کیا دوں گی میں؟“  
 ”والدہ! بیہ سمجھ دار ہے۔ اس معاملے میں اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جاسکتی، زبردستی کرنی بھی نہیں چاہیے۔  
 یہ اس کی اپنی زندگی اور منے کے مستقبل کا معاملہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہمیں اس کے سسرال والوں کو صاف صاف  
 بتادینا چاہیے کہ وہ عدنان کے لیے بالکل بھی آمادہ نہیں۔ یہ اس کا جائز حق ہے والدہ کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ آپ  
 کرے۔“  
 منتہا کے ٹھنڈے ٹھنڈے نرم لہجے نے مئی کے بے چین دل کو جیسے قرار پکڑا دیا اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مئی کی ہر فکر  
 ہر پریشانی وہ ہمیشہ اسی طرح بٹالیا کرتی تھی۔

☆☆☆

”عدنان!“  
 ”جی ابو۔“ عدنان جو کہیں باہر جا رہا تھا ٹھنک گیا۔  
 ”ادھر آ بیٹے۔“  
 عدنان کو باپ کا لہجہ معمول سے کچھ مختلف لگا۔  
 ”جی۔“ وہ جاتے جاتے ان کی طرف پلٹ آیا۔  
 ”بیٹھو۔“

وہ ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔  
 ”تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔“



”جی ابو کہیے۔“

”کسی ضروری کام سے تو نہیں جا رہے تھے؟“

”آپ کی بات سننا اس سے زیادہ ضروری ہے۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”جیتے رہو!“ ظہیر صاحب نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دعا دی۔

”بیٹے! میں اور تمہاری امی سوچ رہے ہیں اب تمہاری بھی شادی کر دی جائے۔“

عدنان نے چونک کر انہیں دیکھا پھر دھیرے سے مسکرا دیا ”ابو جی ابھی مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو لینے دیں۔“

”تعلیم تم مکمل کر چکے ہو۔ جاب بھی ہے اور کس طرح کھڑا ہوا جاتا ہے پیروں پر۔“

”دس بارہ ہزار کی نوکری آج کل نوکری نہیں سمجھی جاتی۔“

”تو پھر کیا سمجھی جاتی ہے۔“

”بس گزارہ ہے۔“

”گزارہ ہی ہونا بھی چاہیے۔ میاں بیوی دونوں کھاتے ہوں تو گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔“

عدنان نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا ”جاب والی لڑکی سے تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔“

”کیوں!“ ظہیر صاحب چونکے۔

”ہمارے لیے امی کی نوکری ہی بہت تھی۔“

”کیا مطلب؟“ ظہیر صاحب کے لہجے میں استعجاب بھی تھا، استفہام بھی۔

”جس روز امی گھر پر ہوتی تھیں ہمیں عید کا دن لگا کرتا تھا اور امی بھی اس روز ہم لوگوں کے لیے کھانا پکا کر ہمارے

لیے کھانا لگا کر اور ہمارے چھوٹے چھوٹے بہت سے کام کر کے خود بھی بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ امی کی جاب کی وجہ

سے ہمیں ان کی وہ توجہ اتنی محبت مل ہی نہیں سکتی جتنی کہ ہم چاہتے تھے۔ نہیں ابو جی..... جاب کرنے والی لڑکی سے

شادی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اور ابھی اتنی جلدی تو بلا جاب والی سے بھی نہیں۔“

”ضروری ہے بیٹے اور جاب کرنے والی ہی سے ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔“ ظہیر صاحب بولے۔

”کیسی گڑبڑ ابو جی؟“ عدنان نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

”بہو صاحب کے گھر والے ان کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا ہے کہ ہم تم سے ان کی شادی

کرنے کو تیار ہیں۔“

”کیا!“ عدنان نے ہڑبڑا کر دیکھا ”آپ نے..... آپ نے ایسا کیوں کہا؟“

”مے کو اپنے پاس رکھنے کی خاطر۔“ ظہیر صاحب کا لہجہ درود آمیز تھا۔

”ابو جی آپ کو..... آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ ہلکی سی خفگی سے بولا۔

”میں مے کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا بیٹے۔ وہ فرحان کی نشانی ہے، تمہارے بھائی کی نشانی۔ اے اس گھر سے

دور نہ ہونے دینے کے لیے بہو صاحب سے تمہاری شادی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ لوگ بہو صاحب کی شادی کہیں اور

کر دیں گے اور منامیرے پاس سے چلا جائے گا۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا بیٹے۔“

”اور اگر میں بھی مر گیا؟“

ظہیر صاحب نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں ”ایسا مت کہو بیٹے، ہمیں تو

فرحان کی موت ہی نے مار ڈالا ہے۔“

”بھابی کیا سوچیں گی!“ عدنان الجھی الجھی سی کیفیت میں بولا۔

”تم ان کی پروا مت کرو۔ بس خود کو اس نیک کام کے لیے تیار کرو۔ منامیرے اپنے بھائی کی اولاد ہے۔ تمہارا

اپنا خون ہے۔ کوئی دوسرا آدمی اس کا سر پرست کیوں بنے۔ قیم بھتیجے کے سر پر تم خود ہی کیوں نہ ہاتھ رکھو، بڑا جرلے گا بیٹے۔“

عدنان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا، کیا کہے کیا کرے۔

”چپ کیوں ہو۔ جواب دو۔“

عدنان بدستور خاموش رہا۔

”بولو بیٹے۔“

”کیا بولوں ابو جی؟“

”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“

عدنان نے انہیں مذہب نگاہوں سے دیکھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔“

”آپ نے..... آئی ایم سوری ابو جی، آپ نے مجھے بہت اپ سیٹ کر دیا ہے ابو جی۔“

”ایسی کوئی بہت انہونی بات نہیں ہے یہ۔ ڈھونڈنا چاہو گے تو ایسی دو چار مثالیں تمہیں شاید آس پاس ہی مل جائیں گی۔ تمہاری اپنی خالہ کی جو نند ہیں سمجھ ان کی بیٹی کے ساتھ کیا ہوا یہی تو۔ اس کا شوہر اتر فورس میں تھا۔ جہاز کریش ہو گیا۔ دو بچے تھے بے چاری کے۔ گھر والوں نے ان بچوں کی خاطر بیوہ بہو سے چھوٹے بیٹے کی شادی کر دی۔ خوش ہیں دونوں اور بچے بھی در بدر ہونے سے بچ گئے۔ بہت پرانی بات ہے، ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے جاننے والوں میں ہوا تھا۔ خاتون جو بیوہ ہوئیں تین عدد بچیوں کی ماں تھیں۔ سسرال والوں نے ان بچیوں کی خاطر اس دیور سے ان خاتون کا نکاح کر دیا جو بقول خاتون کے ان کی شادی کے وقت بچہ تھا اور نکاح ثانی کے وقت صرف اٹھارہ سال کا۔ ہمارا لڑکپن تھا۔ ہم بہت حیران ہوا کرتے تھے یہ دیکھ کر کہ بیوی اتنی بڑی اور شوہر چھوٹا کیوں ہے۔ ایک روز ہماری والدہ نے سارا قصہ سنایا کہ ان کے پہلے میاں ہارٹ فیل سے مر گئے تھے۔ دیور سے ان کا نکاح ثانی کر دیا گیا۔ بیوی بڑی تھیں میاں چھوٹے مگر دونوں کی بہت اچھی گزری۔“

عدنان سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے جبروں کی ہڈیوں کے ابھار اس کے باطنی اضطراب کے غماز تھے۔

ظہیر صاحب نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا ”بیٹے اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں مگر دوسروں کے لیے قربانی دے کر جینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔“

عدنان نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا ”ابو جی، بھائی اور منے کا خیال ویسے بھی تو رکھا جاسکتا ہے۔“

”بیٹا ہم تو رکھے ہی ہوئے ہیں۔ ہم تو اپنی جان بھی دینے کو تیار ہیں منے کے لیے مگر.....“

”بہو صاحب دوسری شادی کرنا چاہتی ہیں اپنے گھر والوں کی سپورٹ پر اپنی پسند کے آدمی سے۔“

عدنان نے بے ساختہ چونک کر ان کی طرف دیکھا ”اپنی پسند کے آدمی سے!“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں..... کوئی ڈاکٹر ہے جو زمانہ طالب علمی میں ان کے ساتھ رہا اور اب بیوی سے علیحدگی کے بعد ایک بچی کے

ساتھ انہیں پھر کہیں لکرا گیا۔ اسی نے بقول بہو صاحب کی والدہ انہیں شادی کا پیغام دیا ہے۔“

عدنان کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

اس ان دیکھے انجانے شخص سے رقابت اور نفرت کا احساس جس نے اس کے بھائی کی بیوہ کو شادی کا پیغام دیا

تھا۔

وہ دتا کون تھا اس کے گھر کی عزت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے والا۔



اسے اپنا لہو گرم ہوتا محسوس ہوا۔  
 نہیں..... کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ منے کو پیار کرنے والوں سے چھین لے جاتا۔  
 منے کا ننھا سا وجود تو اس کے افرادِ خانہ کے لیے حیاتِ نو بن گیا تھا ورنہ فرحان کی جواں مرگ نے تو ان سب کو  
 ایک لختِ زندہ درگور کر دیا تھا۔  
 ”کیا تم پسند کرو گے بیٹا کہ تمہارے بھائی کی اولاد کسی غیر آدمی کے در پر جا پڑے، غیر کے ٹکڑوں پر پلے۔“ ظہیر  
 صاحب درد آ میز لہجے میں بولے۔  
 عدنان کو اپنا پورا وجود ایک تشنگی کیفیت سے دو چار محسوس ہونے لگا۔  
 ”ہرگز نہیں۔“ اس نے کہا۔  
 ”تو پھر اس بات سے انکار مت کرنا جو میں چاہتا ہوں۔ اسی میں ہم سب کی اور اس گھر کی عافیت ہے۔“  
 وہ کچھ نہیں بولا۔  
 ”راضی ہونا؟“  
 وہ کشتکش سے دو چار دکھائی دیا۔  
 ”بولو بیٹے۔“ ظہیر صاحب نے تقاضا کیا۔  
 ”میں..... میں کیا کہہ سکتا ہوں ابو۔“  
 ”بس انکار مت کرنا۔“  
 ”آ..... آپ نے..... امی سے..... بات کی؟“  
 ”یار جب تم ہاں کر دو گے تو ساری دنیا سے بات کر لوں گا۔“  
 ”آپ امی سے بات کیجئے۔“  
 ”امی تم سے ڈائریکٹ بات کیوں نہ کر لیں۔ انکار تو نہیں کرو گے نا اُن کے سامنے۔“  
 ”جیسے آپ کی اور امی کی مرضی۔“  
 ”جیتے رہو۔ تم نے میرا دل خوش کر دیا۔“ ظہیر صاحب خوش ہو کر بولے اور انہوں نے بہ آواز بلند بیگم کو پکارا۔  
 ”ارے بھئی کہاں ہو۔ ذرا یہاں آؤ جلدی سے۔“  
 مسز ظہیر کمرے سے برآمدے میں نکل آئیں ”خیریت!“ وہ ظہیر صاحب کے پاس بیٹھے عدنان کے چہرے کے  
 تاثرات بھانپ کر ٹھنک گئیں۔  
 ”بیٹھو اور خوش خبری سنو۔“  
 مسز ظہیر شوہر اور بیٹے کے روبرو بیٹھ گئیں۔  
 ”میں نے بیٹے سے بات کر لی ہے۔“ ظہیر صاحب نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ عدنان کے شانے پر دھر دیا اور  
 مسرت آمیز لہجے میں بولے ”میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔ تم بہو صاحب اور ان کے گھر والوں سے بات آگے  
 بڑھاؤ۔“  
 مسز ظہیر نے عدنان کی جانب دیکھا اور بڑے متحمل لہجے میں بولیں ”زبردستی نہیں بیٹا۔ یہ بہت سوچ سمجھ کر کرنے  
 والے فیصلے ہوتے ہیں۔ تمہارے ابو تو جذباتی آدمی ہیں۔ تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“  
 ”تم..... تم عجیب عورت ہو..... اسے ورغلانے کی کوشش کر رہی ہو.....“ ظہیر صاحب اپنے مخصوص لہجے میں  
 خاصی ناگواری سے بولے۔  
 ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”جب وہ راضی ہے تو تم اسے سوچنے سمجھنے کی تلقین کیوں کر رہی ہو۔“  
 ”ماں ہونے کے ناتے یہ ہمارا فرض ہے..... اور عدنان کا حق کہ وہ زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ ہمارے آپ کے یا کسی کے دباؤ کے تحت نہ کریں۔“  
 ”بھئی کوئی دباؤ نہیں ڈالا ہے میں نے فقط سمجھایا ہے۔ کیوں بیٹے یہی بات ہے نا؟“  
 ”جی۔“ عدنان نے آہستگی سے کہا۔

☆☆☆

اسکول کے سلسلے میں منہاج کے ذہن میں ہمہ وقت گویا گھڑی کی سوئیوں کی سی ٹک ٹک رہتی تھی۔ ادارے کو یکسانیت سے بچانے کے لیے وہ ہر وقت خود بھی متحرک رہتی دوسروں کو بھی فعال رکھتی۔ بچوں کے لیے اسکول کو خوشگوار اور پسندیدہ بنانے کے لیے اسے آئے دن نئے نئے پروگرام سوچتے رہتے۔ کبھی کھیلوں کے بین الجماعتی مقابلے تو کبھی بزم ادب کی سرگرمیاں۔ کبھی مقابلہ مصوری تو کبھی گورنر۔ مختلف قومی دن بھی پورے اہتمام سے منائے جاتے۔ کبھی قائد اعظم کا یوم ولادت تو کبھی یوم وفات، کبھی یوم پاکستان کے حوالے سے تقریب تو کبھی یوم آزادی کے سلسلے میں رنگارنگ پروگرام، کبھی شہدائے ستمبر کی یاد میں جلسہ تو کبھی ملی نغموں کا مقابلہ۔ ہر سہ ماہی اور ششماہی امتحان کے بعد سال میں دو مرتبہ یوم والدین منعقد کیا جاتا تو عید کے بعد عید ملن کی تقریب۔ چوکی جماعت سالانہ امتحانات سے کچھ دن قبل پانچویں جماعت کے اعزاز میں الوداعیہ دیتی تو میزبان اور مہمان دونوں جماعتوں کے بچے مل جل کر بڑا اچھا پروگرام پیش کرتے۔ آئے دن اتنے مختلف النوع پروگراموں کے باوجود منہاج کا ذہن مزید تنوع اور جدت کا متلاشی رہتا۔ اسکول تو جیسے اس کے رگ و پے میں رچ بس گیا تھا۔ کبھی کبھی جب نماز کی ادائیگی کے دوران بھی اسکول کا خیال آگھیرتا تو اسے ندامت اور وحشت ہونے لگتی۔ خدا کی پناہ! اللہ میاں کیا کہیں گے نماز میں بھی اسکول کا خیال۔ تو بہ تو بہ! کبھی کبھی تو اسے ادا شدہ نماز دوبارہ پھیرنی پڑ جاتی۔  
 ان دنوں ایک نئے پروگرام کی تیاری چل رہی تھی اور تمام ٹیچرز کو اس نے مجوزہ پروگرام کی تیاری میں شامل کر رکھا تھا۔

پروگرام یہ تھا کہ ایک دن صبح اسمبلی سے چھٹی تک اسکول کا جملہ انتظام و انصرام طلبہ کے سپرد کر دیا جائے۔ رنپل کی سیٹ پر بھی کوئی طالب علم یا طالبہ ہو۔ طلبہ ہی ٹیچرز کا روپ دھار کر درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دیں۔ کلرک صاحبان کی جگہوں پر بھی بچے بیٹھیں اور کام کریں۔ خاکروب نائب قاصد مالی، چوکیدار اور آیا کے روزمرہ معمولات بھی بچے ہی سرانجام دیں۔

منہاج نے اسٹاف میٹنگ میں یہ پروگرام ساتھیوں کے سامنے پیش کیا تو ان میں سے بعض نے بڑی گرم جوشی اور دلچسپی کے ساتھ اس کی تائید کی مگر چند ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرانے لگیں۔  
 ”میڈم! ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے یہ سب کام کہاں کر پائیں گے۔“ مسز اشفاق نے کہا۔

”مسز اشفاق، بچوں کو کام کرنا بڑے سکھاتے ہیں۔“  
 ”سوری میڈم بچوں کی استعداد بھی تو دیکھی جائے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھلا کہاں تو کلاسوں میں جا کر پڑھا سکیں گے اور کہاں دفتر کا انتظام سنبھال سکیں گے۔“

”اور میڈم والدین کو بھی اعتراض ہوگا کہ ہمارے بچوں کو سو پچھڑ اور نائب قاصد بنا دیا۔ چوکیدار بنا کر گیٹ پر کھڑا کر دیا۔“ ایک اور ٹیچر نے خدشہ ظاہر کیا۔

”منہاج سنبھال کر بیٹھ گئی۔“  
 ”بات یہ ہے کہ یوم طلبہ منانے کے دو بڑے مقاصد ہوں گے۔ اول بچوں کو اسکول کے روزمرہ معمولات سے



ہٹ کر ایک خوشگوار اور دلچسپ دن دینا اور دوسرے انہیں احساسِ ذمہ داری کام کرنے کی خوشی اور محنت کی عظمت سے آشنا کرانا۔ انہیں یہ احساس دلانا کہ کام کوئی بھی ہوا سے کرنے میں شرم یا ذلت محسوس نہیں کرنی چاہیے۔“

”میڈم بڑے کام میں تو شرم اور ذلت کا احساس ضرور ہونا چاہیے۔“ مس فرح نے گویا منہا کی زبان و بیان کی غلطی پکڑنے کی کوشش کی۔

”مس فرح!“ منہا کا لہجہ انتہائی متمثل تھا ”میں اچھے کام کی بات کر رہی ہوں۔“

”سوری میڈم!“ مس فرح اپنی شوخی بھول کر شرماسی ہو گئیں۔

”مجھے امید ہے یہ ہمارے بچوں کے لیے ایک دلچسپ اور خوشگوار دن ہوگا۔“ منہا نے پریقین لہجے میں کہا۔

منہا کے اس یقین کو ٹھیس نہیں پہنچی۔ یوم طلبہ نہ صرف اسکول کے بچوں بلکہ ٹیچرز کے لیے ایک خوشگوار بلکہ قدرے حیرت انگیز تجربہ رہا۔ اسکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے صبح سے دوپہر تک اتنی خوبی اور اعتماد سے اسکول کا انتظام و انصرام سنبھالا کہ اپنی ٹیچرز کو انگشت بدنداں کر دیا۔ پانچویں جماعت کی ایک بچی ایسے اعتماد سے اسکول کی پرنسپل بنی کہ منہا کو ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ پرنسپل اور کلرک کے دفاتر میں فرائض سرانجام دیتے طلبہ اور کمرہائے جماعت میں اپنے ہی ساتھیوں کو پڑھاتے نوعر ٹیچرز اور مختلف غیر تدریسی فرائض کی انجام دہی پر مامور بچوں کی تصاویر کھینچنے کے لیے ایک فوٹو گرافر کو بلوایا گیا تھا جس نے ان بچوں کی تصاویر کیسرے کی آنکھ سے سیاہ فیتے پر محفوظ کر لیں۔ اس روز اسکول میں مختلف النوع کاموں سے آنے والے طلبہ کے والدین بھی بچوں کو اسکول کا مکمل انتظام سنبھالے دیکھ کر انتہائی محظوظ ہوئے۔ چونکہ یوم طلبہ منانے کے لیے نظامت سے باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ وہاں سے تین چار افسران جن میں ڈپٹی صاحب بھی شامل تھے اس روز بطور خاص اسکول کا دورہ کرنے کے لیے آئے اور انہوں نے بھی بچوں کی صلاحیتوں اور کارکردگی کو بہت سراہا۔

تصویریں دھل کر آئیں تو منہا نے انہیں دفتر کے باہر راہداری میں لگے ایک سوفٹ بورڈ پر آراستہ کرادیا۔ بچے ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

یوم طلبہ کے انعقاد پر ادارے کو نظامت کی جانب سے ایک تعریفی خط موصول ہوا جسے بچوں کو اسمبلی میں پڑھ کر سنایا گیا اور ہر ٹیچر کو دکھا کر اس کے دستخط لیے گئے۔

ان تمام باتوں سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ مسز اشفاق نے جو تنقید برائے تنقید کے کتب سے تعلق رکھتی تھیں کہا۔ ”واقعی ہمارے بچوں میں بہت ٹیلنٹ ہے۔“ ان کا یہ اعتراف منہا کو یوم طلبہ کا حاصل محسوس ہوا۔

☆☆☆

لیکن یوم طلبہ پر ٹیچرز کے فرائض سرانجام دینے والے بچوں میں شامل جماعت دوم ب کی ایک خوبصورت سی گول مٹول بچی لائبہ کو نہ جانے کس کی نظر کھا گئی۔

سانحہ بہت دلخراش تھا۔

چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور اوپر تلے دو بھائیوں کے بعد تقریباً بارہ سال کے وقفے سے پیدا ہونے والی وہ بچی جو اپنے والدین اور بڑے بہن بھائیوں کی انتہائی لاڈلی تھی ایک شام اپنے اپارٹمنٹ سے جو عمارت کی تیسری منزل پر واقع تھا محلے کی دکان سے اپنے لیے کوئی چیز خریدنے کے لیے نیچے اتری۔ دکان سے چیز خرید کر گھر واپس لوٹتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی کی طرف دیکھا جہاں اس کی ماں اور ایک بھائی کھڑے چائے پی رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس نے اپنا ننھا سا ہاتھ ہلایا۔ بھائی نے کہا ”لائبہ اوپر آؤ،“ حاجی تمہارے لیے فریج فرائیز بنا رہی ہیں۔“ بچی نے یوں سر ہلایا جیسے کہتی ہو بس آرہی ہوں اور زینے کا رخ کیا۔ پانچ منٹ گزرے۔

لائیہ کی امی اور بھائی چائے پی کر بالکل کوئی سے اندر آ گئے۔  
دس منٹ گزرے۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔

ماں کو تشویش ہوئی ”لائیہ ابھی تک نہیں آئی۔“

”کھیلنے لگی ہوگی اپنی دوستوں کے ساتھ۔“ بھائی نے کہا۔

”جا کر بلاؤ اسے“ میں نے اس کے لیے چپس بنائے ہیں ٹھنڈے ہو جائیں گے۔“ بہن نے بھائی سے کہا۔

بھائی لائیہ کو بلانے کے لیے نیچے گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، کیاؤنڈ میں کھیلتی اس کی دوستوں سے ہی نہیں دوسرے بچوں سے بھی پوچھا مگر کسی نے اگر کچھ بتایا تو فقط یہ کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دکان سے چیز لے کر آئی تھی پھر کہاں گئی کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔

بہن نے بالکل کوئی میں آ کر نیچے دیکھا اور بھائی سے باواز بلند کہا ”حماد لائیہ کو بھیجونا!“

”وہ ہے ہی نہیں۔“ جواب آیا۔

لائیہ کی ڈھنڈیا پڑ گئی اوپر نیچے ایک ایک پڑوسی کا دروازہ کھٹکھا کر پوچھا گیا ”لائیہ تو نہیں آئی آپ کے ہاں۔“ ہر گھر سے جواب نفی میں ملا۔  
بھائی، بہن، ماں دیوانہ وار اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ باپ بھی دفتر سے گھر آ کر لائیہ کی تلاش میں نکل گیا۔

شام گہری پڑ گئی۔ رات ہو گئی۔ لائیہ نہیں ملی!

ماں باپ، بہن بھائیوں کے دل کٹنے لگے۔ قریبی رشتے داروں کو بھی اطلاع ہو گئی۔

گھر میں گہرام بپا ہو گیا۔

محلے میں خوف و ہراس چھا گیا۔

”لائیہ آخر گئی کہاں؟“ ہر لب پر یہی سوال تھا۔

لائیہ کی گمشدگی کی ایف آئی آر درج کرادی گئی۔ خاندان بارسوخ تھا۔ پولیس نے فوری طور پر ایکشن لیا۔ ماں اور بھائی کے اس بیان کی روشنی میں کہ آخری بار وہ گھر کو آنے والے زینے کی طرف بڑھتی دکھائی دی تھی پھر اس کے بعد کچھ پتا نہ چلا آس پاس کے گھروں سے تفتیش شروع کر دی گئی جس عمارت میں لائیہ اور اس کے گھر والے رہتے تھے اس کی دوسری منزل پر واقع ایک اپارٹمنٹ کے کینوں نے دوران تفتیش پولیس انسپکٹر کو بتایا کہ اس گھر کے تمام افراد سہ پہر سے اپنے کسی رشتے دار گھرانے میں سالگرہ کی ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے اُن کی عدم موجودگی میں نو عمر ملازم لڑکا گھر پر تھا۔ افراد خانہ کی واپسی رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ ہوئی تو انہیں معلوم ہوا کہ عمارت کی تیسری منزل پر واقع ایک محلے دار گھرانے کی بچی شام سے لاپتہ تھی اور اس کی تلاش جاری تھی۔ صاحب خانہ کے مطابق اس خبر نے جملہ اہل خانہ کو اداس کر دیا تھا۔

تفتیشی افسر نے مذکورہ گھرانے کے اس نو عمر ملازم سے بھی بات کی جو بقول افراد خانہ ان کی عدم موجودگی میں گھر میں تھا۔ لڑکے کی ایک انگلی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ افسر تفتیش کے استفسار پر لڑکے نے بتایا کہ اس کی انگلی الماری کے شے سے کٹ گئی تھی مگر پولیس افسر کے پے در پے سوالوں پر وہ گڑبڑا گیا۔ گواہ نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر تلبکے؟ آخر جھوٹ پکڑا گیا اور سترہ سالہ مجرم آٹھ سالہ بچی کے قتل کا مرتکب پایا گیا۔ مقتولہ کی لاش اس نے بستر کی ایک چادر میں باندھ کر گھر کے ایک ہاتھ روم کے روشن دان سے بلڈنگ کے عقبی جانب واقع ایک تنگ گلی میں پھینک دی تھی۔ معصوم بچی کے قتل کے اسباب و محرکات وہی تھے جو اس قسم کے واقعات میں عموماً ہوا کرتے ہیں۔



اسکول میں اس دلخراش سانحے کی اطلاع اس کے محلے دار ہم مکتبوں کے توسط سے اور تفصیل اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے ذریعے پہنچی۔ قاتل کے اعترافی بیان کے مطابق جب مقتولہ نے اپنے گھر کی بالکونی کے رخ پر دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلایا تو وہ بھی دوسری منزل پر اپنے بالکون کے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں کھڑا نیچے دیکھ رہا تھا۔ بچی خوش خوش زینہ چڑھتی اپنے اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے گھر کا دروازہ کھول کر اسے روک لیا اور طوطا دکھانے کے بہانے گھر کے اندر بلا لیا۔ بچی کی آواز گھونٹنے کو اس نے اس کے منہ میں کیڑا ٹھونس دیا تھا۔

یوم طلبہ پر پہنچی جانے والی سو فٹ بورڈ پر لگی تصاویر میں شامل لائیبہ کی ایک تصویر دیکھنے کو دن بھر بچے بڑے اُمڈے پڑتے رہے۔ اس تصویر میں بھی لائیبہ سر پر اسکارف باندھے اپنی ہم جماعتوں کو پڑھا رہی تھی۔ اس کی کلاس پیچرنے روتے ہوئے کہا ”وہ غیر معمولی ذہین بچی تھی۔“

مگر وہ غیر معمولی ذہین بچی کس آسانی سے ایک گھریلو ملازم کے چنگل میں آ کر اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھی تھی۔ منجہا کو نقرتی بالوں والی پُر وقار سی ڈاکٹر کا بار بار خیال آتا رہا جو ایک مرتبہ اس کے اسکول آئی تھیں۔

”معصوم بچوں کو درندوں سے بچانا میں نے اپنی زندگی کا مشن سمجھ رکھا ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے کہا تھا۔

اس روز منجہا کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ معصوم بچوں کو انسان نما درندوں کی سفاکی اور بھیمت سے بچانے کے لیے اپنی حفاظت کے سلسلے میں آگہی فراہم کرنا کتنا ضروری تھا۔

بچوں کا آنکھیں بند کر کے نہیں کھول کر چلنا ضروری تھا۔ چونکہ اپنے دفاع کے سلسلے میں وہ بڑوں کے مقابلے میں جسمانی طور پر کمزور تھے لہذا انہیں عقلی طور پر مضبوط بنایا جانا ضروری تھا۔ انہیں ان کے کمزور جسم کی حفاظت کے سلسلے میں آگہی دینا انتہائی لازم تھا۔

دن بھر اسکول کی فضا خاصی سوگوار رہی۔ بہانے بہانے لائیبہ ہی کا ذکر ہوتا رہا۔ وہ ٹیچرز جن کے اپنے بھی چھوٹے بچے تھے جنہیں وہ ملازمت کی خاطر کبھی دوسروں کے رحم و کرم پر اور کبھی خود ان کے اپنے ہی رحم و کرم پر غیر محفوظ چھوڑ آیا کرتی تھیں، غیر معمولی اداس دکھائی دیں۔ بعض نے اپنے گھروں پر فون کر کے ان بچوں کی خیر و عافیت بھی دریافت کی جنہیں وہ گھر پر چھوڑ کر آئی ہوئی تھیں۔

منجہا کا دل دن بھر لائیبہ اور اس کے گھروالوں کے لیے دکھتا رہا۔

اسکول کے بچوں کو ان کی ذاتی حفاظت کے لیے مذکورہ ڈاکٹر کی زبانی آگہی دلوانے کے لیے ڈائریکٹریٹ کی اجازت حاصل کرنے کو منجہا نے اسی روز ایک مراسلہ ڈائریکٹر صاحب کے نام تیار کروا دیا۔

بچوں کو انسان نما درندوں سے آنکھیں چرا کر چلنا سکھانے کے بجائے انہیں آنکھیں کھول کر چلنا سکھانا ضروری تھا۔

☆☆☆

بیمہ کے انکار پر ظہیر صاحب نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا ”ہم..... ہم ان کے لیے وہ سوچ رہے ہیں جو ہزاروں میں کوئی ایک ہی سوچتا ہے اور وہ.....“ غصے کے مارے ان کی باپھیں کف آلود ہو گئیں۔

”آپ اپنا بلڈ پریشر کیوں ہائی کرتے ہیں۔ بیمہ خود مختار ہیں زبردستی تو نہیں کی جاسکتی نا۔“ مسز ظہیر نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

ظہیر صاحب نے جڑے بھینچ لیے۔ ان کا دم پھولنے لگا ”اتنی آسانی سے نہیں کر سکتی وہ ہماری مرضی کے خلاف کسی غیر آدمی سے شادی۔“

”قانون اور مذہب انہیں اجازت دیتے ہیں۔“ مسز ظہیر کا لہجہ انتہائی متحمل تھا۔

”بجائے میرے تم..... تم اس بہو کی حمایت کر رہی ہو جو ہمارے گھر میں رہتے ہوئے لومیرج کے چکر میں ہے۔“

”آہستہ..... آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ شریف گھرانوں میں گھر کی بات گھر ہی میں رکھی جاتی ہے۔“ مسز ظہیر قدرے برا فروختہ ہو کر بولیں۔

”آج آجائیں تمہاری بہو بات کرتا ہوں میں ان سے۔“

”بہو صرف ہماری نہیں آپ کی بھی ہیں اور..... بھلا کیا بات کریں گے آپ ان سے!“

”تھہیں کیا جو میری مرضی۔“

مسز ظہیر نے انہیں محبت آمیز نگاہوں سے دیکھا ”بچوں کی طرح لڑ رہے ہیں آپ ہم سے۔ ذرا دیکھئے تو مٹا آپ کو اونچی آواز میں بولتے اور ہم پر آنکھیں نکالتے دیکھ کر کیسا سہم گیا ہے۔“

ظہیر صاحب نے گردن موڑ کر سننے کی طرف دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑا اپنی طرف کھینچا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

”دادا آپ دادو سے لڑتے کیوں ہیں؟“ مٹا منمنایا۔

”نہیں یار میں تو مذاق کر رہا ہوں۔“ ظہیر صاحب نے اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اور سر گھما کر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”اتنا بڑا اور مشکل فیصلہ میں نے صرف اس معصوم کی خاطر کیا تھا۔ کوئی کوئی دیتا ہے ایسی قربانیاں۔ عدنان عمر میں ان سے چھوٹا کنوارا مگر میں نے اس کے جذبات کی پروا کیے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔“

”بہت سوچ سمجھ کر کی جاتی ہیں اس قسم کی باتیں“ آپ نے تو اس دن بیہ کی والدہ اور بہن کے سامنے ایک دم منہ سے نکال دی یہ بات۔ ہم تو دم بخود رہ گئے۔ اب بیہ سے کوئی ایسی ویسی بات مت کر بیٹھے گا۔“

ظہیر صاحب کچھ نہیں بولے۔

”سن رہے ہیں نا آپ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔“

”سن رہا ہوں۔“

ظہیر صاحب نے بیگم کی بات سن تولی مگر کیا وہی جو ان کے دل میں تھا بیہ سے انہوں نے دو ٹوک بات کی۔

”میں پوچھ سکتا ہوں بہو صاحب عدنان میں آپ کو کیا برائی نظر آتی ہے۔“

بیہ دم بخود رہ گئی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس سے یوں براہ راست بات کریں گے۔

ظہیر صاحب نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا پھر بولے ”ہمیں اور آپ کو سب کو مننے کی بہتری کے لیے سوچنا چاہئے۔“

وہ بدستور خاموش رہی۔

”بخشتی محبت اور تحفظ مننے کو اس گھر میں حاصل ہے کسی دوسری جگہ کہاں مل سکے گا۔“

مسز ظہیر دھیرے سے کھٹکھٹا رہیں ظہیر صاحب نے ان کی طرف دیکھا ”انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ظہیر صاحب کو اس سلسلے میں مزید کوئی بات کرنے سے باز رہنے کا اشارہ دیا مگر وہ ان کی تنبیہ کو خاطر میں نہ لائے۔“

”آپ عدنان کو شرف قبولیت بخشی ہیں یا نہیں وہ ایک الگ بات ہے مگر ایک بات بہر حال طے ہے کہ مٹا یا تو اس گھر میں رہے گا یا آپ کے ساتھ آپ کی والدہ کے گھر میں۔ اس کے لیے کسی تیسرے گھر کا تصور بھی ممکن نہیں..... کم از کم میرے نزدیک۔“

بیہ کے چہرے کے تاثرات اس کے باطنی بیجان کے غماز دکھائی دینے لگے۔

”امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے ظہیر صاحب اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھے اور منظر سے اکل گئے۔

مسز ظہیر نفرت سی محسوس کرنے لگیں۔



”تم..... تم ان کی باتوں کا برا نہ منانا۔ اصل میں وہ بھی نئے سے اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔“ مسز ظہیر نے کہا۔  
 بیہ نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایسی کاٹ تھی کہ مسز ظہیر اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گئیں۔

☆☆☆

ڈائریکٹر ایٹ سے ڈپٹی صاحب کا فون تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ بچوں کو کسی ناخوشگوار واقعے یا خدائخواستہ المناک سانحے سے محفوظ رکھنے کے لیے دیئے جانے والے پیچھے کے خاص خاص نکات کیا ہوں گے۔  
 منہاج کو اول تو ان کے اس استفسار کے جواب میں تفصیلاً کچھ کہنا ہی مشکل محسوس ہوا دوسرے اس روز پہلی بار اسے ڈپٹی صاحب سے بات کرتے ہوئے ایک عجیب سی خفت کا احساس ہوتا رہا۔ یہ وہی افسر تھے جن سے وہ پہلے بڑی بے تکلفی سے بات کیا کرتی تھی۔ اسکول کے مختلف النوع مسائل و معاملات کے سلسلے میں ان کے تعاون کی طالب رہا کرتی تھی اور آج انہی سے بات کرتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ رہی تھی۔ مس بتول کی بے بنیاد بات نے اسے ایک عجیب سی خجالت سے دوچار کر دیا تھا۔

لاحول ولا قوۃ! انسانوں کی دوسرے انسانوں کے بارے میں بدگمانیاں اور بے بنیاد الزام تراشیاں بعض اوقات زندگی کی شفافیت پر کیسی دھندلاہٹ مسلط کر دیتی ہیں۔  
 ”سر! ڈاکٹر صاحبہ اسمبلی میں بچوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق بات کریں گی۔ انہیں یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کریں گی کہ بچے معاشرے میں رہتے ہوئے بڑے لوگوں سے خود کو کیونکر محفوظ رکھ سکتے ہیں۔“  
 ”ڈائریکٹر صاحبہ کی ہدایت یہ ہے کہ بچوں سے محتاط انداز میں بات کی جائے ایسا نہ ہو کہ کوئی ایٹو بن جائے۔“  
 ”ایٹو کیسا سر؟“

”یہاں ڈائریکٹر ایٹ میں ڈائریکٹر صاحب نے ماتحت افسران سے اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی۔ مجموعی خیال یہ تھا کہ ہم اخلاقی قیود کے پابند معاشرے کے افراد ہیں۔ مشرق کے باسی ہیں مغرب تو ہے نہیں جہاں بچوں کو تعلیم کی ابتدائی سطح پر ہی ان سے اساتذہ جنس کے موضوع پر بات کرنا بھی مائند نہیں کرتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحبہ کے پیچھے سے ہم پر یہ الزام لگ جائے کہ ہم تعلیمی اداروں میں فحش باتوں کا پرچار کر رہے ہیں۔“  
 منہاج جیسے ایک ہی لمحہ میں ڈپٹی صاحب سے تمام تر خفت اور خجالت کو بھلا بیٹھی۔ وہ چور جوڑھٹائی سے دل میں چھپا بیٹھا اس پر اپنے بدنمادانت نکوس رہا تھا آن کی آن رفو چکر ہو گیا اور منہاج ڈپٹی صاحب سے بات کرنے کے لیے فارم میں آگئی۔

”سر! زندگی کے راستے پر چلنے کی دو صورتیں ہیں۔ اس کے دشوار گزار مقامات سے آنکھیں کھول کر خطرات سے بچ بچ کر سفر طے کیا جائے یا پھر خطرات سے ڈر کر آنکھیں موند لی جائیں۔ ہماری اجتماعی مشکل یہ ہے کہ ہم خطرات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلنے کے بجائے ڈر کر آنکھیں موند لیتے ہیں اور گزر جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آنکھیں موند لینے سے زیادہ بڑے حادثے اور گہری چوٹ کا خدشہ ہوتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے معصوم بچوں سے بلا تکلف اس موضوع پر بات کی جائے جس پر ہم بڑوں سے بھی بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔“

”سر! اگر ہم نے بچوں کو اپنے وجود کی حفاظت کرنا نہ سکھایا تو پھر اس قسم کے سانحے اور ایسے حادثے ہوتے ہی رہیں گے جیسا کہ ہمارے اسکول کی بچی کے ساتھ پچھلے دنوں ہوا اور میڈیا کی اطلاعات کے مطابق روزانہ نہ جانے کتنے بچے ایسے حادثات کی نذر ہو جاتے ہیں۔“

”میڈم! آپ تو ہمیشہ دلائل اور وزن کے ساتھ بات کرتی ہیں۔ سامنے والے کو قائل کر دیتی ہیں۔ دیکھ لیجئے آپ۔ ڈائریکٹر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ کسی جانب سے ہمارے سیٹ اپ پر یہ انگشت نمائی نہ ہو کہ بچوں کے ذہنوں میں وہ بات ڈالی جا رہی ہے جو وہ نہیں جانتے۔“

”سر! بعض باتوں کا نہ جاننا بھی نعمت ہوتا ہے، مگر اکثر باتوں کا جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔ علم کو لاعلمی پر ہمیشہ فوقیت رہتی ہے۔“

”آل رائٹ میڈم منجھا..... گواہیڈ..... بس ذرا احتیاط کے ساتھ۔“ ڈپٹی صاحب نے کہا۔

”اطمینان رکھئے سر، مجھے اپنے ادارے کی عزت اور ڈائریکٹر سٹ کا احترام انتہائی عزیز ہے۔“

”ہمیں آپ جیسے سربراہانِ ادارہ پر بھروسہ ہے میڈم۔“

”تھینک یوسر۔“

☆☆☆

ڈاکٹر صاحبہ نے اسمبلی میں بچوں سے بات کرنے سے قبل ٹیچرز سے اجتماعی طور پر بات چیت کی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ بچوں کو جنسی تشدد سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ گھروں میں والدین اپنے بچوں کے ساتھ اور تعلیمی اداروں میں اساتذہ اپنے شاگردوں کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی رکھیں کہ وہ اپنی ہر بات بے جھجک اور بلا خوف انہیں بتا سکیں، نیز اپنے جسم کی حفاظت کے لیے اگر انہیں بڑوں کے ساتھ جارحانہ رویہ اختیار کرنا پڑے تو بے درخ ایسا کریں اور اس سلسلے میں کسی معمولی واقعے کو بھی اپنے والدین سے چھپانے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس سے انہیں کوئی بڑا خطرہ یا نقصان بھی لاحق ہو سکتا ہے۔

ٹیچرز کے ساتھ ڈاکٹر صاحبہ کی اس میٹنگ کے آغاز میں بعض ٹیچرز کے عارض شرم سے تمتا آٹھے۔ نظریں جھک گئیں اور بعض ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھنے لگیں۔ بعض کے تاثرات سے لگا کہ وہ اس میٹنگ میں ہونے والی گفتگو کو معیوب سمجھ رہی تھیں مگر جوں جوں ڈاکٹر صاحبہ بات کرتی گئیں، ٹیچرز کے تاثرات بدلتے گئے۔

ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ”والدین اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو سمجھائیں کہ اگر کبھی کوئی شخص انہیں بہلا پھسلا کر ڈرا دھمکا کر یا کوئی لالچ دے کر ان کے جسم کے کسی حصے کو چھونے کی کوشش کرے تو وہ فوری طور پر گھر کے بڑوں یا اپنے استاد کو بتائیں۔“

ڈاکٹر نے ٹیچرز کو جن میں سے بیشتر مختلف العمر بچوں کی مائیں تھیں ہدایت کی کہ وہ اپنے بچوں کو گھر پر اکیلا چھوڑنے سے ممکنہ حد تک گریز کریں۔ انہیں ملازموں بلکہ ناقابلِ اعتماد رشتے داروں کے رحم و کرم پر بھی نہ چھوڑیں کیونکہ بچوں پر جنسی تشدد عموماً ان کے قریبی افراد ہی کرتے ہیں۔

انہوں نے مزید کہا کہ جو بچہ جنسی تشدد کا شکار ہوتا ہے، اس کی ذہنی کیفیت تہ و بالا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی خود اعتمادی بڑی طرح متاثر ہوتی ہے اور لوگوں پر اس کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے۔ جنسی تشدد کرنے والا اگر اس کے رشتے داروں میں سے ہو تو وہ ساری زندگی رشتوں پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور سب سے زیادہ خوفناک امر یہ کہ تشدد کا نشانہ بننے والا کبھی کبھی خود بھی تشدد کرنے والا بن جاتا ہے۔

بچوں سے ڈاکٹر صاحبہ نے بہت رسائیت سے اور چھوٹی چھوٹی مثالیں دے کر بات کی۔ مثلاً چھوٹے بچے اپنی عمر سے زیادہ بڑی عمر کے بچوں سے دوستی نہ کریں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلیں تو کبھی بڑوں سے چھپ کر نہ کھیلیں۔ گھر سے باہر بلا ضرورت اور اکیلے نہ جائیں۔ کسی اجنبی کے نزدیک نہ جائیں۔ اس سے کوئی چیز لے کر نہ کھائیں۔ گھر میں یا گھر سے باہر اگر کوئی بڑا خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو، کبھی ان کے جسم کو چھونے کی کوشش کرے تو اپنے والدین کو یا ان لوگوں کو ضرور بتائیں جو ان کا خیال رکھتے ہیں۔ کسی کے بہلانے پھسلانے میں آ کر اسے اپنے



ساتھ کوئی ایسی حرکت نہ کرنے دیں جو انہیں پسند نہ ہو۔ اور ڈرانے دھمکانے پر خوفزدہ نہ ہوں۔ گھر والوں کو بلا جھجک بتادیں۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ظہیر صاحب نے کال ریسیو کی۔ ان کے ہیلو کہنے پر فون کرنے والے نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“  
”ڈاکٹر میہ گھر پر ہوں گی۔“  
”آپ کون؟“

”جی..... میں..... ڈاکٹر پیام بات کر رہا ہوں۔“  
”فرمائیے۔“ ظہیر صاحب نے لہجے میں بولے۔  
”ڈاکٹر میہ سے بات ہو سکتی ہے۔“

”پیام صاحب، یہ شریفوں کا گھر ہے براہ کرم آپ آئندہ اس نمبر پر فون کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔“ ظہیر صاحب نے یہ کہا اور ریسیور زور سے کریڈل پر رکھ دیا۔

”کس کا فون تھا جو اتنی زور سے پٹخا ہے آپ نے۔“ مسز ظہیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
”اسی لفنگے بد معاش کا...!“

”خدا کی پناہ! پہلے تو کبھی آپ نے اس قدر فصیح و بلیغ الفاظ استعمال نہیں کئے اپنی گفتگو میں۔“  
”جی میں آتا ہے قل کر دوں مردود کو۔“

”کچھ پتا تو چلے کون ہے جس کی شان میں اس قدر تسلسل سے قصائد پڑھے جارہے ہیں۔“  
”تمہیں مذاق سو جھڑ رہا ہے۔“ ظہیر صاحب نے انہیں خشونت سے دیکھا۔

”جی نہیں..... فکر مند ہو رہی ہوں کہ آج تک کسی کے لیے آپ کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں سنے۔“  
”وہی..... ڈاکٹر پیام کا بچہ۔“

مسز ظہیر نے اُن کا بازو پکڑ لیا اور بڑی لجاجت سے بولیں ”کیوں اتنے ٹینس رہنے لگے ہیں آپ۔“  
ظہیر صاحب انہیں بڑی بے بسی سے دیکھنے لگے۔ پھر دفعتاً ان کی آنکھوں میں سرخی اُٹھ آئی ”فرحان کی یاد میرے دل سے نہیں جاتی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔  
مسز ظہیر کی آنکھیں بھیگ گئیں ”آپ کیا سمجھتے ہیں۔“ ان کا ہاتھ بدستور ظہیر صاحب کے بازو پر تھا ”کیا ہم بھول گئے اپنے بچے کو!“

”بہو صاحب اور مرنے کو میں صرف اور صرف فرحان کے حوالے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
”بس شاید یہی فرق ہے ہم میں اور آپ میں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ والدہ کی فیملنگز کے حوالے سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یقیناً فکر مند رہتی ہوں گی بیٹی اور نواسے کے لیے۔“  
”کیا کی کیا پریشانی ہے ان کی بیٹی کو اس گھر میں۔ ہر ضرورت پوری ہوتی ہے ان کی۔“  
”زندہ انسانوں کی صرف مادی ضرورتیں ہی نہیں ہوتیں۔ عورت کی سب سے اہم ضرورت تو تحفظ ہے۔“  
”کیا یہاں تحفظ نہیں ہے انہیں۔“

”زندگی کے ساتھی سے ملنے والے تحفظ کی اور ہی بات ہوتی ہے۔ ہر ماں اپنی بیٹی کو سہاگن اور اپنے گھر میں آباد دیکھنے کی متنی ہوتی ہے۔“

ظہیر صاحب چند ثانیے انہیں ٹٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر بولے ”بہو کے لیے تو تم یوں وکالت کرتی ہو جیسے تم ہی

ان کی ماں ہو۔“  
 ”سمجھ کا فرق ہوتا ہے ورنہ اگر سچ پوچھئے تو دوسرے گھر کی بیٹی کو ہم اپنی بیٹی بنا کر ہی تو اپنے گھر لاتے ہیں ورنہ ویسے کون دیتا ہے اپنی اولاد ہمیشہ کے لیے دوسروں کو۔“  
 ظہیر صاحب لا جواب سے ہو کر ان کا منہ ٹکنے لگے۔

☆☆☆

منہا اپنے دفتر میں تھی۔ میز پر سروس بکس کا پلندہ رکھا تھا۔ تاج محمد تنخواہ میں سالانہ اضافے کا اندراج سروس بکس میں کر کے دستخط کے لیے اس کی میز پر رکھ گئے تھے۔ وہ ایک ایک سروس بک کھول کر مندرج عبارت کو پڑھ کر دستخط ثبت کر رہی تھی۔ آنکھیں بند کر کے دستخط کر دینا اسے کبھی گوارا نہ ہوتا۔  
 دفعتاً دروازے کے پٹ پر ہلکی سے کھٹکناٹ نے اسے کمرے کی داخلہ گاہ کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ نعیم دروازے پر کھڑا تھا۔ لمحہ بھر کو تو اسے حقیقت پر خواب کا گمان ہوا۔

نعیم!

پیشگی اطلاع کے بغیر پاکستان میں!

اور وہ بھی اس کے آفس کے دروازے پر!  
 جب سے ان دونوں کی منگنی ہوئی تھی وہ جب بھی پاکستان آیا اس نے آنے سے پہلے اسے بطور خاص فون کر کے اپنے پروگرام کی اطلاع دی تھی اور اسکول تو وہ کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ منہا نے اسے منع کر رکھا تھا۔ اپنی نجی زندگی اور ملازمت کو وہ ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
 نعیم کو یوں غیر متوقع طور پر اپنے دفتر کے دروازے پر دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس بار کافی دنوں سے اس کا فون نہیں آیا تھا اور وہ اس سلسلے میں فکر مند بھی تھی۔ ایک روز اچھی بھابی کو فون کیا تو ان سے اس کی خیریت البتہ مل گئی تھی۔  
 وہ تنویری کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آ سکتا ہوں؟“

”جی..... جی.....“ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ اس کی میز کے نزدیک آتھا۔

”آپ کب آئے؟“

”پچھلے ہفتے۔“

منہا کو اور حیرانی ہوئی۔ پچھلے ہفتے کا آیا وہ آج اپنے آنے کی خبر دے رہا تھا۔

”بیٹھے پلیز۔“

وہ اس کے رُوبرو بیٹھ گیا۔

لاہور ہفت روزہ

ماہ نامہ پاکیزہ میں شائع ہونے والے تمام اشتہارات اور مضامین نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔  
 قارئین اس بارے میں اطمینان کرنے کے بعد اپنی ذمہ داری پر پیش رفت کریں۔ ادارہ اس حوالے سے کسی بھی قسم کے لین دین اور نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے۔



منتہا بھی دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی حالت دگرگوں تھی۔ وہ یوں اچانک ایک روز اس کے اسکول میں آدھمکے گا اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

نعیم نے اس کے کمرے میں ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ منتہا کو اپنا دل سنبھالنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ نصرت فتح علی خاں مرحوم نے ”میرا پیا گھر آیا“ شاید ایسی ہی پبلیشنز کے لیے لکھی تھی۔

”بنا اطلاع کئے اور یہاں!“ منتہا نے کچھ دیر بعد دھیرے سے کہا۔  
 نعیم نے اس کی طرف دیکھا پھر بولا ”میں جانتا ہوں آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔“  
 ”نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے رسماً کہا۔  
 ”واقعی!“ اس نے منتہا کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔  
 ”جی ہاں۔“

”اوکے۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا پھر قدرے توقف سے بولا ”میں نے سوچا گھر پر شاید آپ سے اطمینان سے یہ بات نہ ہو سکے اور گھر سے باہر ملاقات شاید ممکن نہ ہو۔ اس لیے یہاں آ گیا ہوں۔ آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔ ایک اہم معاملہ نمٹانا تھا۔“

وہ سمجھ گئی۔ اب وہ اس سے میرے متعلق پوچھے گا کہ کہیں بات بنی یا نہیں۔  
 ”بات کر سکتا ہوں؟“

”جب آگئے ہیں تو کر ہی ڈالئے..... لیکن پہلے یہ بتادیں کہ چائے پیس گے یا.....؟“  
 ”کچھ نہیں۔“  
 ”پلیز!“

”میں آپ کی مصروفیات میں زیادہ دیر خارج نہیں رہنا چاہتا۔“  
 ”اتنی پر تکلف گفتگو نہ کیجئے۔“ منتہا نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر بولی ”میرا خیال ہے کوئلہ رک چلے گی۔“  
 ”دیکھئے آپ کسی تکلف میں نہ پڑیں میں اس بار اتنی دور سے صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ ایک ضروری بات کرنے کے لیے۔“

”سچی ایک ہفتے بعد اپنے آنے کی خبر دی ہے۔“ منتہا کے لہجے میں گلہ تھا۔  
 نعیم اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا مگر آج اس کی نگاہوں میں محبت نہیں، بے یقینی تھی۔ احترام نہیں شک تھا۔  
 ”مانسڈ نہ کیجئے گا..... بس اس لیے یہ بات کر رہا ہوں کہ معاملہ ایک طرف ہو جائے نہ آپ دو کشتیوں کی سوار رہیں نہ میرا وقت ضائع ہو۔“

اس کے لہجے کی سرد مہری نے منتہا کو چوکنا کر دیا۔  
 نعیم کی نگاہیں اب پوری طرح اس کے چہرے پر مرکوز تھیں ”مجھے پتا چلا ہے کہ..... آپ کے کوئی آفسر ہیں جنہوں نے آپ کو پروپوز کیا ہے اور آپ بھی ان میں انٹرسلڈ ہیں۔“  
 منتہا کو یوں لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین لٹکی چلی جا رہی تھی!

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر تونے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

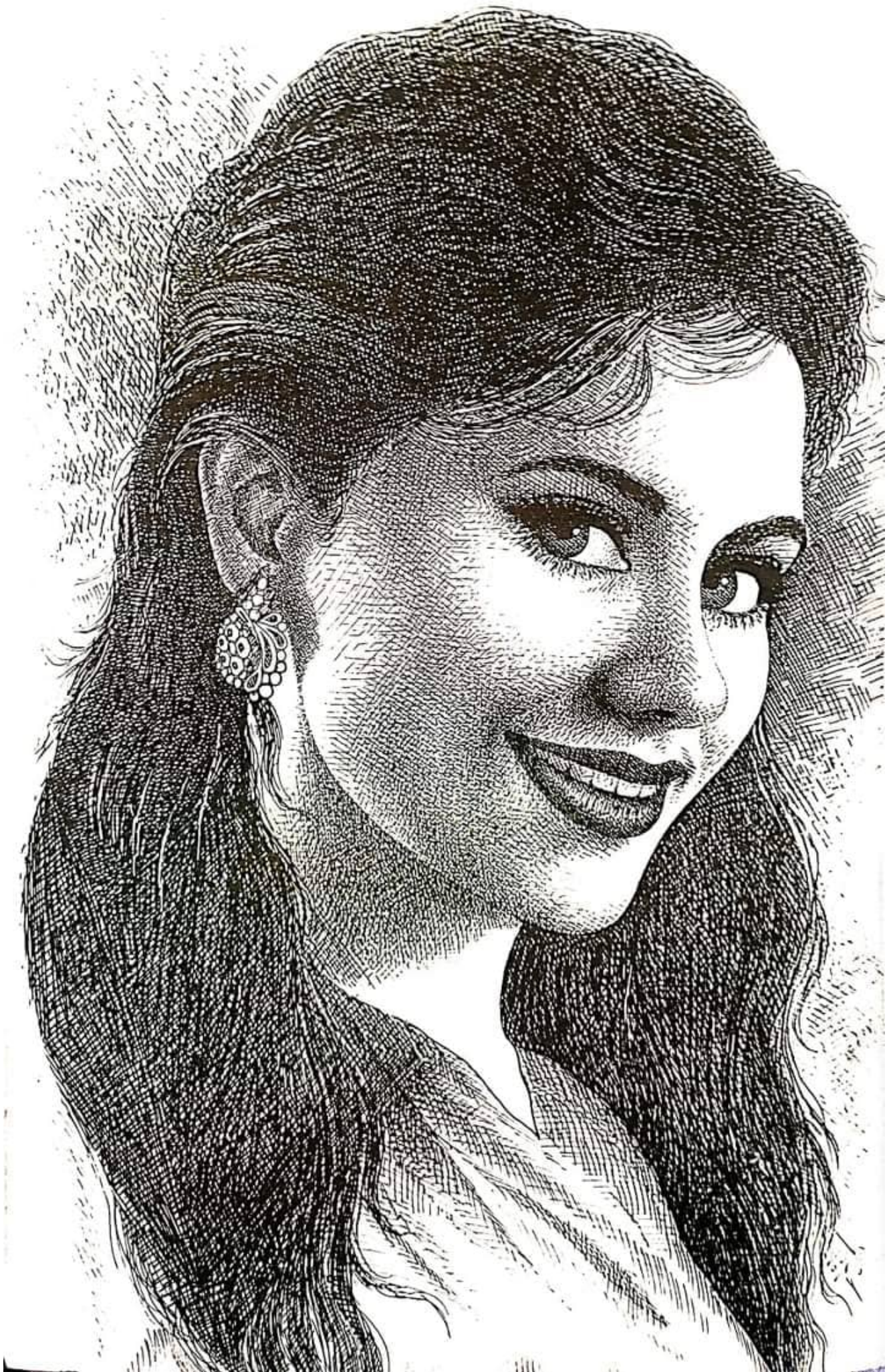
**مختاروں کے گندے اور لٹینے سے بعد شتوں کا پاک مسامحہ کی دل گداڑ داستان**

**منتہا**

ناہید سلطانہ اختر









”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اس کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر بولا ”میں بات صاف کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔ گوا چھان نہیں ہوا مگر یہ بہر حال اچھا ہوا کہ بات کھل گئی اور میری سمجھ میں آ گیا کہ آپ..... نے بات کو اتنے عرصے سے درمیان میں کیوں لٹکا رکھا تھا۔“ اس نے توقف کیا اور ایک گہری سانس کھینچی ”خیر کوئی بات نہیں..... غیبت ہے کہ صرف اتنا ہوا کہ کچھ وقت میرا ضائع ہوا اور کچھ وقت آپ کا اور..... کسی اور کا بھی۔ خدا نخواستہ آپ اپنے گھر والوں کی مردت میں شادی کر بیٹھتیں تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی مگر مگر کا توڑنا مشکل نہیں۔“ وہ اپنا سینہ ساکت کیے سنتی رہی۔

اس کے چپ ہو جانے پر اس نے گھائل نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور لب کھولے ”بس یا ابھی کچھ اور کہنا ہے آپ کو۔“

”کہنے کو تو بہت جی چاہتا ہے۔“ نعیم نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا اور قدرے رنجور لہجے میں بولا ”مگر کہنے سننے کا فائدہ کچھ نہیں۔“

”جو جی میں ہے کہہ ڈالیے۔“ وہ ایک گہرے صدمے کی کیفیت سے دوچار تھی۔  
”ایسا نہیں کیا کرتے۔“ وہ شاکی لہجے میں بولا۔  
”کیسا؟“

وہ چند ثانیے اسے ننگی باندھ دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں گلہ، محبت اور کرب کی ملی جلی کیفیت تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور اس کے سوال کے جواب میں پہلے کی طرح شاکی لہجے اور دھیمی آواز میں گویا ہوا۔

کسی انجان کو خود اپنا بنانا اے دوست  
اور پھر خوگر الطاف و عنایت کر کے  
اس سلوکِ ستم آگئیں سے مٹانا اے دوست  
منہا چند لمحے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ موقع اور محل اسے اس کی باطنی کیفیت کے اظہار کی اجازت نہ دے رہے تھے مگر..... وہ زیادہ دیر اپنے جذبات پر بند نہ باندھ پائی۔ اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اس نے سائیڈ ریک پر دھرے ٹشو پیپر بیگ سے جلدی سے ایک کاغذی رومال کھینچا اور کمرے کے دروازے کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے جلدی سے اپنی آنکھوں کی نمی ٹشو پیپر میں جذب کر لی۔  
”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری باتیں بری لگیں مگر میں شاید آپ سے بھی زیادہ ہرٹ ہوا ہوں۔ آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں میں کس قدر محبت اور کتنے خلوص سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا نا اگر قیامت تک بھی انتظار کرنا پڑا تو کروں گا۔“

”محبت اتنی اندھی اور..... ظالم تو نہیں ہوتی نعیم صاحب۔“ منہا نے انتہائی تلخی سے کہا۔  
”کیا مطلب!“ نعیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”آپ سے..... آپ سے کس نے کہا کہ..... مجھے میرے کسی افسرنے.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا ”یا میں خود.....“ اسے دوسرا جملہ بھی پورا کرنا مشکل اور عجیب محسوس ہوا۔

”ایسی باتیں ہمیشہ تو چھپی نہیں رہتیں۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی ذریعے سے کھل ہی جاتی ہیں اور آپ تو..... ایک پبلک انسٹی ٹیوشن کی سربراہ ہیں، آپ جیسے لوگوں کی تو ہر بات بہت جلد لوگوں کی نگاہوں میں آ جاتی ہے۔“

”آپ غلط کہہ رہے ہیں..... کوئی انسان اگر اپنے آپ کو چھپانا چاہے تو اپنے آپ سے بھی چھپا لیتا ہے۔ خود کو بھی پتا نہیں چلنے دیتا کہ کیا ہو گیا۔“



”بات تو اچھی کی ہے آپ نے!“

”مگر شاید آپ کو بری لگی ہو۔“

”میں بڑے سچے دل کا آدمی ہوں۔ دوسرے لوگوں کی بہت کم باتیں بری لگتی ہیں مجھے.....“ اس نے توقف کیا، ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر کہا ”جب..... مجھے یہ بات پتا چلی تو بہت افسوس ہوا مجھے۔ جی میں آتا ہے لگا دوں آگ کو، طور کو دالی کیفیت بھی لیکن پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی جو آپ نہیں چاہتے اور وہ بھی جس کا آپ تصور تک نہیں کر سکتے۔“

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اب تک۔“

”کون سا سوال؟“

تبھی غزالہ کمرے کے دروازے پر وارد ہوئیں ”ایکسکیوز می میڈم!“

”جی غزالہ۔“

”میڈم آپ نے کہا تھا تھرڈ پیریڈ آپ لیں گی فور تھ بی میں۔“

”آئی ایم سوری غزالہ اس وقت میں پیریڈ نہ لے سکوں گی۔ پی ٹی آئی کو بتادیں کہ مس رابعہ چھٹی پر ہیں۔ فور تھ بی میں ان کا تھرڈ پیریڈ وہ لے لیں۔“

”ٹھیک ہے میڈم۔“ غزالہ نے ایک اچھتی ہوئی نظر نعیم پر ڈالی۔

”تھینک یو۔“

غزالہ کے جانے کے بعد وہ دوبارہ نعیم کی طرف متوجہ ہوئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کسی بچی کی والدہ کا فون تھا جو چاہتی تھیں کہ اس کی بیماری کی اطلاع مگر ان جماعت کو دے دی جائے۔

”بینش الماس ٹوائے۔“ منتہا نے چٹ پر بچی کا نام اور جماعت نوٹ کرتے ہوئے اس کی والدہ سے کہا ”ٹھیک ہے میں ان کی کلاس انچارج کو اطلاع بھیجوا دوں گی مگر آپ بچی کی چھٹی کی درخواست اور میڈیکل سرٹیفکیٹ ضرور بھیجوا دیں۔“ ریسپورر رکھ کر وہ پھر نعیم کی جانب متوجہ ہوئی ”جی..... آپ کو یہ تو بتانا ہوگا کہ ایسا کون دے گا؟“

”آپ کو یہ خبر وہاں پہنچائی۔“

”جو بھی ہو اس کا اتنا پتا آپ کو بتا دینے سے کیا فرق پڑے گا۔“

”مجھے اپنے دشمن کا چہرہ پہچاننے میں آسانی ہوگی۔“

وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا پھر چند ثانیوں بعد بولا ”جنہوں نے مجھے بتایا انہیں یہ بات اپنے گھر سے پتا چلی اور ان کے گھر والوں کو یہ بات کسی اور نے بتائی تھی لیکن میرا خیال ہے اس بحث میں پڑنا بیکار ہے کہ کس نے کسے بتایا۔ جس نے بھی بات کی بلا سبب نہیں کی ہوگی۔ رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بناتے ہیں لوگ۔ ہمیں اس معاملے کو اس طرح انجام پزیر کرنا ہوگا کہ امی جان ڈسٹرب نہ ہوں۔ مجھے بس انہی کی فکر ہے۔“

منتہا نے اپنا ہاتھ میز کی اوٹ میں کیا اور اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی انگلی سے اتارتے ہوئے کہا ”اگر آپ کی خواہش یہی ہے تو یہی کہیں۔“

اس نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے آس پاس کسی تیسرے فرد کے نہ ہونے کا یقین کرتے ہوئے انگلی سے اتاری ہوئی انگلی میز کے شیشے پر نعیم کے سامنے رکھ دی اور گھائل لہجے میں بولی ”باقی چیزیں بھی پہنچادی جائیں گی آپ کو۔“

نعیم نے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہیں باہم ملیں اور منتہا کے شیشہ دل پر ایک شدید ضرب سی لگی۔

”تعلیم یافتہ اور مہجور ہونے کا ایک فائدہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ گمبیر مسائل کو بھی بات چیت کر کے اسی طرح حل

کر لیا کرتے ہیں جیسے آج ہم دونوں نے کیا۔“ نعیم نے میز کے شیشے پر اپنے سامنے دھری انگلی کو بہت آہستگی سے  
منہ کی سمت سرکا دیا اور بولا ”اس انگلی کو میری طرف سے ایک حقیر سا تحفہ سمجھ کر رکھ لیں اور باقی بھی کوئی چیز واپس  
کرنے کی ضرورت نہیں۔ مادی چیزیں قطعاً غیر اہم ہوتی ہیں۔“

”آپ سمجھتے ہیں میں اہمیت دیتی ہوں مادی چیزوں کو۔“ منہا نے تلخ لہجے میں کہا۔  
”نہیں..... نہیں..... خدا خواستہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔“

”آپ کا جو بھی مطلب ہو..... ایک بات آپ سن لیجئے۔ پروپوز کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ میرے کسی افسر  
نے آج تک مجھ سے بے تکلفی سے بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ مجھے دوسروں سے اپنی عزت کر دانی آتی  
ہے اور ہاں ایک بات اور آپ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں میں جانتی ہوں کہ جس شخص نے آپ سے یہ لغو بات کی ہے  
اس کے ڈانڈے میرے اسکول کے کسی فرد سے ضرور ملتے ہیں۔“  
”کیا مطلب!“ نعیم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اپنی ایک ٹل ایجنڈ غیر شادی شدہ خاتون ٹیچر کی نوجوان آفس کلرک سے غیر معمولی پیٹلیں بڑھتے دیکھ کر میں  
نے انہیں ٹوکا تو ان محترمہ نے بھی یہی بہتان طرازی مجھ پر کر کے مجھے دم بخود کر دیا تھا اور انہیں یہ بات ہاتھ لگی تھی  
ایک دوسری ٹیچر سے جن کے سامنے میرے ایک افسر میری کارکردگی کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہہ گئے تھے کہ انہیں جو  
لوگ اچھے لگتے ہیں بس اچھے ہی لگتے ہیں۔“  
وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”بات تو کچھ یہی ہے۔ میرے ایک سیکنڈ کزن باہر ہوتے ہیں، میرے دفتر کے ساتھی بھی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں  
پہلے ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا میں جانتا ہوں تمہاری شادی میں تاخیر کا سبب کیا ہے۔ میں حیران ہوا کہ وہ کیونکر  
جانتے تھے۔ میں نے یہ سوال کیا ان سے تو ان کے جواب نے مجھے دھچکا پہنچایا۔ کہنے لگے تمہاری منگیتر اپنے ایک افسر  
میں انٹرنلڈ ہے اور اس نے بھی انہیں شادی کا پیغام دے رکھا ہے۔ میں نے پوچھا آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ کہنے  
لگے جس اسکول میں تمہاری منگیتر پرنسپل ہے اس اسکول کی ایک ٹیچر سے میری بیگم کی دوستی ہے اور یہ بات اسی نے  
میری بیگم کو بتائی ہے۔“

خدا! کہاں سے کہاں کڑیاں ملتی تھیں جبکہ وہ اپنی دانست میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اسکول بھر میں سوائے  
غزالہ کے کسی اور کو اس کے منگنی شدہ ہونے کا علم نہ تھا۔

اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر کہا ”بہر حال یہ میرے حق میں بہتر ہوا کہ مجھے زیادہ برا وقت آنے سے پہلے  
ہی یہ معلوم ہو گیا کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو سنی سنائی باتوں کو ثبوت کے بغیر سچ مان لیتے ہیں۔ میں شک و ضرور  
ہوئی ہوں نعیم صاحب مگر..... سچ گئی ہوں۔“  
”میں سمجھا نہیں۔“

منہا کو یوں لگا جیسے اس کے حلق میں کوئی گولہ سا آن پھنسا تھا۔ اسے بات کرنا دو بھر معلوم ہونے لگا۔ آنکھوں  
کے کناروں پر سیلن سی محسوس ہونے لگی۔

”مجھے آپ پر بہت مان تھا مگر آپ نے میرا مان توڑ دیا۔“ وہ کھٹی کھٹی آواز میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔  
”نہیں کی کھٹی پھر سچ رہی تھی۔“

کال ہائی اسکول کی پرنسپل کی طرف سے تھی۔ وقفے کے دوران ان کی طرف کوئی پارٹی تھی۔ وہ وقفے کا دورانیہ  
دونوں ہی اسکولوں میں دس منٹ بڑھوا دینا چاہتی تھیں۔

وہ ریسپورڈ کر ڈیل پر واپس رکھ چکی تو نعیم خفت آ میز لہجے میں گویا ہوا ”آئی ایم سوری..... مجھے تو جس دن انہوں



نے یہ بات بتائی تب سے آج تک میں ڈسٹرب رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ وہاں سے یہ سوچ کر چلا تھا کہ پاکستان پہنچتے ہی آپ سے ملوں گا اور بات کروں گا مگر یہاں آنے کے بعد ہفتہ بھر اسی تذبذب میں رہا کہ آپ سے کہاں اور کیونکر بات کروں۔ بالآخر آج آپ کے اسکول چلا ہی آیا۔“

وہ جپ جپ سنتی رہی اور سننے کے بعد بھی جپ رہی۔

”انگوٹھی پہن لیجئے پلیز۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

منتہا نے ایسی کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھا کہ وہ خفیف ہو گیا ”آئی ایم سوری!“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”آئی ایم ریلی سوری!“ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر آہستگی سے پوچھا ”میمہ بھابی کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا پھر اپنے سامنے رکھے سپروائٹ پر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی گھماتے ہوئے بولی ”میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنا وقت مزید ضائع نہ کریں۔“

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر گویا ہوا ”میڈم پرنسپل آپ کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی شاید اور ان کے بارے میں مجھے اس قسم کی بات سننے کو ملتی تو میں اتنا آپ سیٹ نہ ہوتا جتنا آپ کے بارے میں یہ خبر سننے کے بعد ہوا۔ آپ کے اس ان دیکھے اور انجانے افسر سے اب بھی رقابت محسوس ہو رہی ہے مجھے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ کے دل میں اب بھی بدگمانی ہے۔“  
”نہیں یہ بات نہیں۔“  
”تو پھر؟“

”شاید..... شاید میں نے آپ کے بارے میں اتنا سوچا ہے۔ اتنا پوزیو ہو چکا ہوں کہ آپ کا نام بھی کسی اور کے ساتھ سننا گوارا نہیں مجھے۔“

”آپ کے خاندان والے آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن آج آپ کا رویہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ آپ مرد حضرات کو صرف اپنی ٹیٹلنگز کی پروا ہوتی ہے دوسروں کی نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی باتوں سے ہرٹ ہونے کے بعد میرا بھی جی چاہا آپ سے کہہ دوں یہ ہماری آخری ملاقات ہے مگر میں ایسا نہ کہہ سکتی شاید اس لیے کہ.....“

”کہ؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”کہ مجھے والدہ کا خیال آ گیا۔ وہ پریشان ہوں گی۔ مجھے بھائی کی عزت کا خیال دامن گیر ہوا کہ وہ اپنی بیوی‘ سرال والوں اور دوستوں سے کیا کہے گا کیوں ٹوٹا بہن کا رشتہ۔ کیونکر مطمئن کرے گا وہ لوگوں کو۔ مجھے اپنی انا کو پس پشت ڈالنا پڑا۔ مجھے خود کو سمجھانا پڑا کہ میں اگر ہرٹ ہوئی ہوں تو کوئی بات نہیں ان لوگوں کو آزار نہیں پہنچنا چاہیے جن سے میں پیار کرتی ہوں۔“

”میں یونہی تو آپ کا منتظر نہیں ہوں۔ کوئی خوبی ہے جو آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

منتہا کو ایک عجیب سی یاسیت نے آگھیرا۔

کیا تھا اگر فرحان نہ مرا ہوتا۔

اور اگر موت اسی طرح اس کے مقدر میں لکھی تھی تو حادثے کے وقت نعیم گاڑی نہ چلا رہا ہوتا۔

کیا تھا اگر نعیم سے اس کی نسبت نہ ہوئی ہوتی اور اگر ہو ہی گئی تھی تو یہ کہ فرحان کی موت کے بعد اس سے اتنی نفرت نہ ہو گئی ہوتی۔

کیا تھا اگر ظہیر صاحب میہ کے لیے ڈاکٹر پیام کے پروپوزل کو خوش دلی سے قبول کر لیتے۔

اگر ایسا ہو جاتا تو شاید..... شاید اگلی منزلیں کچھ آسان ہو جاتیں۔

حالات کے الجھاد پر اس کا دل چپکے چپکے دکھنے لگا۔

☆☆☆

بیہ کو سسرال میں پیش آمدہ صورتِ حال سے ڈاکٹر پیام کو آگاہ کرتے ہی بنی۔ اس کا خیال تھا ڈاکٹر پیام کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس کی توقع کے برعکس ڈاکٹر پیام نے شانے اچکاتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“

”کیا مطلب!“ بیہ کو ڈاکٹر پیام کے سرد سے ردِ عمل پر تعجب ہوا۔

”آپ کے ان لازٹھیک ہی سوچ رہے ہیں۔“

”یہ..... یہ آپ کہہ رہے ہیں!“

”اصل میں، میں کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”میں بھی نہیں۔“

”بالفرض ہم آپ کے ان لازکی مرضی کے برخلاف شادی کر بھی لیں تو مجھے خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ بچے کی وجہ سے وہ لوگ ہماری زندگی میں مداخلت کرتے رہیں گے اور اس سے ہم باپ بیٹی ڈسٹرب ہوں گے جو مجھے کسی قیمت پر گوارا نہ ہوگا۔“

بیہ ڈاکٹر پیام کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

گویا ڈاکٹر پیام کے لیے ساری اہمیت اپنی ذات اور اپنی بیٹی کی تھی۔

”تو پھر آپ..... آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا مطلب!“ ڈاکٹر پیام کو جیسے اس کا سوال بے ربط لگا۔

”میرا مطلب ہے..... ہم اگر ایک دوسرے کے مسائل شیئر کرنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں تو ایسی شادی کا

فائدہ۔“ بیہ جواب اس صدمے کی کیفیت پر قابو پا چکی تھی بلا تکلف بولی۔

ڈاکٹر پیام دھیرے سے مسکرا دیئے ”ایمانداری کی بات یہ ہے بیہ کہ مجھے دوسری شادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میری زندگی میں ایمین کی جگہ کبھی کوئی دوسری عورت نہ لے سکے گی۔ دوسری شادی میں صرف سمن کی وجہ سے کرنا چاہتا

ہوں۔ اس بچی کو ہر وقت تو میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اس کی دیکھ بھال اس کی تربیت کے لیے مجھے گھر میں بہر حال

ایک عورت کی ضرورت ہے۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے سوچا.....“

”آئی ایم سوری۔“ بیہ نے ڈاکٹر پیام کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے میں نے سمجھنے میں غلطی کی۔“

اس کے لہجے میں پیچھتاوا تھا۔

”کیا مطلب!“ ڈاکٹر پیام نے چونک کر پوچھا۔

وہ چند ٹاپے خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے نگاہ اٹھا کر ڈاکٹر پیام کو دیکھا اور دھیمی آواز میں گویا ہوئی ”میرا خیال

تھا..... ہم..... ہم ایک دوسرے کے درد کا مداوا کر کے اپنے بچوں کے لیے بہتر راستے تلاش کر سکیں گے۔ آئی ایم

سوری ڈاکٹر پیام مجھے اپنے بیٹے کے لیے ایک کیئر ٹلکر کی نہیں باپ کی ضرورت ہے جو اس کے سر پر ہاتھ رکھ سکے، جو

اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے زندگی کے راستوں سے اعتماد سے گزرنا سکھائے جو اس کے اور میرے مسائل شیئر کر سکے۔ آپ

سے ملنے کے بعد میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ شاید آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر..... پتا چلا کہ نہیں..... جب آپ

کو اپنی بچی کے لیے ایک ماں کی ضرورت نہیں صرف ایک کیئر ٹلکر چاہیے تو آپ کسی بچے کو باپ کی شفقت دینے کی

بات کیونکر سوچ سکتے ہیں۔ آپ کو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی بچی کے لیے کوئی آیا تلاش کریں اور ہاں ایک

بات آپ اور سن لیجئے..... مجھے بھی اپنی ذات کے لیے دوسری شادی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں نے بھی یہ فیصلہ صرف



اپنے بیٹے کے لیے کیا تھا۔“  
ڈاکٹر پیام چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر شانے اچکاتے ہوئے بڑی لائق سے بولے ”او کے!“  
بیہ کو دکھ ہوا۔ اس شخص کی خاطر اس نے سرال والوں کی خفگی مول لی تھی۔ سر اس سے کھنچے کھنچے تھے۔ عدنان نے ہمسکام ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ساس بات تو کرتیں مگر انتہائی حزم و احتیاط سے۔ وہ ہاسپٹل سے گھر واپس لوٹی تو ظہیر صاحب منے کو لے کر گھر سے باہر نکل جاتے اور دو دو تین تین گھنٹے منے سمیت غائب رہتے۔ کھانے کی میز پر سب اتنے خاموش ہوتے جیسے کھانا کھانے نہیں کسی کی فاتحہ کے لیے اکٹھے ہوئے ہوں۔

اسے ڈاکٹر پیام کے رویتے پر شدید ملال ہوا۔  
اس روز وہ گھر واپس لوٹی تو بہت دل شکستہ تھی۔ ملال اس کے چہرے سے چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر اس کا دل بار بار بھرتا رہا اور وہ گھر والوں سے نگاہیں چرائے بے دلی سے کھانا کھالی رہی۔ مسز ظہیر کن انکھیوں سے اسے بار بار دیکھتی رہیں۔  
رات کو جب وہ بستر پر لیٹ چکی تھی کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا اور پوچھا ”کون؟“  
”ہم ہیں۔“ مسز ظہیر کی آواز آئی۔

اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اٹھ بیٹھی اور بستر سے اتر کر اس نے دروازے کی سمت پیش قدمی کی اور دروازہ کھول دیا۔  
”کیا سو گئی تھیں؟“ ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح تسکین بخش تھا۔  
”جی نہیں۔“

”آجائیں؟“ وہ اجازت طلب لہجے میں بولیں۔  
”جی..... جی.....“ اس نے ہٹ کر انہیں راہ دی۔  
وہ کمرے میں آ گئیں۔

بیہ نے ٹیوب لائٹ آن کر دی اور کینڈل بلب آف کر دیا۔  
مسز ظہیر نے اس کی کلائی تھام لی اور بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں بولیں ”کچھ بات کرنی تھی تم سے۔“  
”اب کسی بات کی ضرورت نہیں۔“ اس کے دل نے کہا مگر زبان خاموش رہی۔  
مسز ظہیر اس کا ہاتھ پکڑے بیڈ کے کنارے پر آ گئیں۔ چند ٹاپے خاموش بیٹھی کمرے میں چہار اور دیکھتی رہیں۔  
منا دادا کے کمرے میں سو رہا تھا۔

”آج کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو تم ہمیں۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔  
بیہ نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا پھر نظریں چرا کر کہا ”نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“  
”ہم نے ساری زندگی نو عمر بچیوں کو پڑھایا ہے اور تم جیسی کئی لڑکیوں کے ساتھ برسوں اسٹاف روم میں اٹھتے بیٹھے رہے ہیں اور پھر ہم ماں بھی تو ہیں، بچوں کی آنکھوں سے ان کے دل کا بھید جان لیتے ہیں۔ بچوں کے بتائے بغیر ہی سمجھ جاتے ہیں ہم کہ کب ہمارا کون سا بچہ خوش ہے کون اداس۔ تم بھی تو ہماری بیٹی ہی ہو۔ زبان سے بتاؤ یا نہ بتاؤ آج تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم کچھ پریشان ہو۔“  
”نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”اچھا چلو تمہاری مرضی نہ بتاؤ۔“ مسز ظہیر نے توقف کیا پھر تسلی آمیز لہجے میں بولیں ”تم تھوڑی سی مہلت دو ہمیں..... ظہیر صاحب کو ہم سمجھا سمجھا کر منالیں گے۔ طبعاً جذباتی آدمی ہیں اس پر بیٹے کی جدائی نے انہیں اور بھی زود رہنا یاد دیا ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو اور پریشان مت ہو۔ ڈاکٹر پیام سے بھی کہہ دو تھوڑا سا انتظار کر لیں۔“

وہ دم بخود رہ گئی۔

ان کی تحمل مزاجی اور بردباری تو وہ کئی سال سے دیکھ رہی تھی مگر وہ اتنی حوصلہ مند اور صابر ہوں گی یہ اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ ان کے جواں مرگ بیٹے کی بیوہ بھی اور وہ کس محل سے اس سے اس قدر نازک موضوع پر بات کر رہی تھیں۔

وہ چند لمحے گنگ بیٹھی رہی پھر اس نے کہا ”میں..... اس چیئر کو بند کر چکی ہوں۔“  
”کیوں؟“ اب مسز ظہیر نے چونک کر اسے دیکھا۔  
”بس۔“

”نہیں..... اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے لیے مناسب ہیں تو ایسا ہرگز مت کرنا۔“  
اوہ خدا! اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

”ہاں بس ایک بات کا یقین ضرور کر لینا..... کہ منے کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ ضرور نکال سکیں وہ اپنے دل میں۔“ ان کی آواز بھر رہی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے وہ سانس لینا بھول چکی تھی۔  
”یہ تمہارا شرعی قانونی اور اخلاقی حق ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں بھلا تمہیں اس حق سے محروم رکھنے والے۔ ہماری دعائیں تمہارے اور منے کے ساتھ ہیں۔“

اس کا جی بھر آیا۔  
وہ کتنی وسیع قلبی سے اس نازک موضوع پر اس سے ہمکلام تھیں جس پر ان کی باتیں سننا بھی اس کا دل چیرے دے رہا تھا۔

”میں نے..... منع کر دیا ہے۔“ وہ کھٹی کھٹی آواز میں بولی۔  
”وجہ؟“ مسز ظہیر نے چونک کر قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ خاموش رہی۔ وجہ بتانا کا رگراں تھا۔

”ظہیر صاحب کی باتوں سے رنجور ہوئی ہو؟“

”جی نہیں۔“ اس نے جیسی آواز میں کہا۔

”اچھا تو پھر..... کیا ہم یہ سمجھیں کہ تم..... عدنان..... ہمارا مطلب ہے..... تم سمجھ رہی ہونا ہم کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔“

”آئی ایم سوری امی..... عدنان کو میں نے ہمیشہ اس طرح دیکھا ہے جیسے بڑے اپنے چھوٹوں کو دیکھتے ہیں۔“  
مسز ظہیر سوچ میں پڑ گئیں۔

”پھر یہ مسئلہ کیونکر حل ہوگا بیٹا؟“

”کون سا مسئلہ؟“

”دبارہ..... تمہارا گھر بننے کا۔“

مہر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”ایسی بے یقینی سے مت دیکھو۔“ مسز ظہیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”تمہیں دیکھ کر بہت دل کٹا ہے ہمارا۔“ ان کی آواز بھر گئی ”تمہیں دیکھ کر مستقل فرحان کا خیال آتا رہتا ہے ہمیں اور دل چپکے چپکے دکھتا رہتا ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں..... میں مئی کے ہاں چلی جاتی ہوں۔“ وہ دل برداشتہ لہجے میں بولی۔



”تم غلط سمجھی ہو۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں..... شاید تمہیں دوبارہ آبا دیکھ کر ہمارے دل کے درد میں بھی کچھ افاتہ ہو جائے۔“

”کوئی اور بات کیجئے۔“

”چلو یہ تو ہم نے مان لیا کہ عدنان کے لیے تمہاری فیملنگو کچھ اور ہیں اور اسی لیے اب ہم کبھی تم سے اس حوالے سے عدنان کے بارے میں بات نہیں کریں گے مگر یہ تو بتاؤ کہ ڈاکٹر پیام کے لیے انکار کیوں..... یا نہیں بتانا چاہتیں۔“

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

”تم نہیں بتانا چاہتیں تو ہم بھی اصرار نہیں کریں گے۔“ مسز ظہیر اتنی نرمی سے بولیں کہ بیہہ کا جی چاہا اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دے۔

”میرے لیے اس دنیا میں منے سے زیادہ اہم اور کوئی نہیں ہے۔“ اس نے اس ایک جملے میں گویا حدیث دل بیان کرنے کی کوشش کی۔

مسز ظہیر زمانہ شناس تھیں اس کے ایک جملے میں کروٹ لیتی جملہ داستان سمجھ گئیں۔

”کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا ”دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔“ اس نے نظر اٹھا کر ذرا کی ذرا ان کی طرف دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ مسز ظہیر کچھ پشیمان سی ہو کر بولیں ”ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ڈاکٹر پیام خدا نخواستہ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ تمہارا یا تمہارے گھر والوں کا انتخاب غلط کیسے ہو سکتا ہے بھلا مگر شاید ان کی بھی کوئی مجبوری رہی ہوگی، خیر کوئی بات نہیں ہر بات میں اللہ میاں کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“ بیہہ کو یوں لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہو۔ مسز ظہیر انسان تھیں یا فرشتہ!

دوسرے کا دل ہاتھ میں رکھنا تو جیسے ان کا مسلک تھا۔ فرحان کی موت کے بعد نعیم سے بھی وقتی سی رنجش ہوئی تھی انہیں پھر اس کی طرف سے بھی وہ اپنا دل صاف کر بیٹھی تھیں۔ جس پر بیہہ کو دل ہی دل میں ان سے گلہ بھی تھا مگر اب ڈاکٹر پیام کے لیے اس انداز سے بات چیت کرتے دیکھنے کے بعد ان سے کسی شکایت یا گلہ کا کیا جواز رہ جاتا تھا اس کے پاس۔

☆☆☆

وہ بات جس نے نعیم کو اس قدر تشویش سے دوچار کیا کہ وہ بغیر کسی پیشگی پروگرام اجانک پاکستان آ پہنچا اچھی بھابی کے کانوں تک بھی آ پہنچی۔ بات ان تک پہنچانے والی ان کی خالہ زاد بہن تھیں جو نعیم کے اسی سیکنڈ کزن کی والدہ تھیں جس نے نعیم کو یہ بات بتائی تھی۔ نعیم کی آمد کی خبر سن کر وہ بیٹے کا حال چال معلوم کرنے کے لیے نعیم سے ملنے آئیں تو نعیم سے تو نڈل پائیں کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے اس کے انتظار میں اچھی بھابی کے پاس بیٹھیں تو ان کے کانوں میں صور پھونک کر انھیں۔

وہ تو چلی گئیں مگر اچھی بھابی شدید ذہنی دباؤ سے دوچار ہو گئیں۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ملازمہ بے چاری اپنی سی کرتی پھری۔ کبھی ان کے ہاتھ سہلاتی، کبھی پیروں کے تلووں پر اپنا سوتی دوپٹا گر لٹتی، کبھی سرد بانے لگتی تو کبھی پانی میں گلو کو زگھول کر دیتی۔

نعیم گھر واپس لوٹا تو اچھی بھابی کا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

”کیا ہوا امی جان؟“ وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

انہوں نے اشارے سے بتایا کہ بولا نہیں جارہا تھا۔ نعیم نے جوں توں ملازمہ کی مدد سے انہیں گاڑی تک پہنچایا اور بھاگم بھاگ قریبی اسپتال پہنچا۔ بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا جسے کم کرنے کے لیے انہیں فوری انجکشن لگایا گیا۔ جسم پر طاری لرزہ ٹھنسنے میں دیر لگی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد جا کر کہیں ان کی طبیعت سنبھلی تو ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

گھر آنے کے بعد نعیم نے ملازمہ سے پوچھا ”بوا کیا امی نے دوا نہیں لی تھی جو طبیعت خراب ہو گئی۔“  
 ”دوا تو لی تھی۔ باجی ارشاد آئیں تھیں، ان سے بہت دیر باتیں کرتی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی۔“

اچھی بھابی بستر پر چت پڑی تھیں۔ نعیم ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔  
 ”کھانا نکالوں بھیا؟“ ملازمہ نے نعیم سے پوچھا۔

”بھوک نہیں ہے۔“

”تھوڑا سا کھالو۔“ اچھی بھابی دھیمی آواز میں بولیں۔

نعیم نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگایا ”آپ میری فکر نہ کریں۔“

”یہیں لے آؤں؟“ ملازمہ نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اچھی بھابی نے آہستگی سے کہا ”لے آؤ بوا۔“  
 ملازمہ کمرے سے چلی گئی۔

”بلڈ پریشر بڑھا کیوں امی جان؟“ نعیم نے ماں کے سر کو بہت محبت سے دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”کیا دوا نہیں لی تھی؟“  
 ”لی تھی۔“ اچھی بھابی نے آنکھیں موند لیں۔

”کوئی بد پرہیزی ہوئی؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا پھر نقاہت بھری آواز میں بولیں ”بوا کھانا لے آئیں تو تم کھانا کھالو پھر بتاؤں گی وجہ۔“

نعیم چونک کر سیدھا ہو بیٹھا ”پہلے بتائیں گی تو کھانا کھاؤں گا۔“

اچھی بھابی نے آنکھیں کھولیں اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بہت محبت سے اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں ”پہلے تم کھانا کھالو۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں آپ سے آپ کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سننے بغیر کھانے کو ہاتھ بھی لگا جاؤں۔“ نعیم نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اچھی بھابی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ نعیم بے چین سا ہو گیا۔ ایسی کیا بات تھی جو اس کی ماں کو رلا رہی تھی۔  
 ”بات کیا ہے امی جان۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

اچھی بھابی نے اشارے سے کہا کہ وہ اٹھ کر بیٹھنے میں اس کی مدد چاہتی ہیں۔ نعیم نے انہیں بستر سے اٹھا کر تکیوں کے سہارے بیٹھنے میں مدد دی اور اپنی بے تابانہ نگاہیں ان پر نکا دیں۔

”ارشاد آئی تھیں تم سے ملنے کے لیے، تم سے تو ان کی ملاقات نہیں ہوئی مگر وہ ایک بڑی عجیب سی بات بتا گئی ہیں جس نے میرا دل دماغ سب کچھ الٹ کر رکھ دیا۔“

”مہلتا اپنے کسی انسر سے شادی کرنے میں انٹرسٹڈ ہیں؟“ نعیم نے والدہ کے مزید کچھ کہنے سننے سے پیشتر ہی از خود کہا۔



اچھی بھابی نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور رقت آمیز لہجے میں بولیں ”تم سے کس نے کہا؟“  
 نعیم دھیرے سے مسکرایا اور ان کے کمزور شانوں پر بہت آہستگی سے اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا ”کیا اسی وجہ سے آپ نے اپنی طبیعت خراب کر لی؟“

”کیا تمہیں پریشانی نہیں ہوئی یہ سن کر!“ اچھی بھابی کو اچھنچھا ہوا۔  
 ”ہوئی تھی۔“ نعیم نے ایک گہری سانس کھینچی پھر مزید کہا ”اتنی کہ میں تو منہ اٹھا کر سیدھا پاکستان آ پہنچا۔“  
 اچھی بھابی کی نگاہوں میں حیرانی ڈولنے لگی ”میں..... سمجھی نہیں۔“  
 ”آپ کو ارشاد خالہ نے بتایا، مجھے ان کے صاحب زادے کی زبانی پتا چلا تھا۔“

ملازمہ کھانا لے آئی تھی۔ اس کے واپس جانے تک وہ دونوں خاموش رہے۔ اس کے جانے کے بعد اچھی بھابی نے بڑی دل سوزی سے کہا ”خواہ مخواہ تم نے اپنا اتنا وقت برباد کیا۔ اب اس فحشے کو ختم کر دو اور کہیں اور بسم اللہ کر دو۔ لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔“

”کیا آپ نے بھی میری طرح یقین کر لیا،“ نعیم نے کہا۔

”تو کیا نہ کرتی!“

”امی جان! لوگ تو بات کا بٹنکڑ بنا لیتے ہیں۔“

”بات ہوتی ہے تو بٹنکڑ بناتے ہیں“ اچھی بھابی نے توقف کیا اور چونک کر نعیم کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔  
 ”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”امی جان! اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ منہا نے اپنی کسی ٹیچر کو کلرک سے بے تکلف ہونے پر ٹوکا تھا۔ وہ محترمہ ارشاد خالہ کی بہو کی جاننے والی ہیں۔ انہوں نے یہ بے بنیاد بات کی ہے۔“  
 ”بیٹا، کچھ نہ کچھ بات ضرور ہوگی۔“

”کچھ بھی نہیں امی جان! منہا کے کسی افسر نے کسی ٹیچر کے سامنے منہا کی تعریف کر دی تھی، بس اس بات کو لے آؤں وہ۔“

”تمہیں پتا ہے، اب خاندان میں بھی پھیلے گی یہ بات اور کیا پتا پھیل بھی چکی ہو۔ کس کس کو صفائی پیش کرتے پھریں گے۔“

”صفائی پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”لوگوں سے نظریں چرا کر بھی تو نہیں رہا جاسکتا۔“

”نظریں چرانے کی بھی کیا ضرورت۔“

”تم نہیں سمجھو گے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں امی جان!“

”اگر سمجھتے ہو تو پھر اس معاملے کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس لڑکی، جس عورت کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نکل جائے اس کی عزت تو نہیں رہتی۔ لوگ اسے گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔“

”امی جان، منہا بہت سمجھ دار بہت باوقار ہے۔ میں نے اس کے اسکول جا کر دیکھا ہے، بہت عزت ہے اس کی۔“

”کیا!“ اچھی بھابی نے چونک کر اسے دیکھا ”تم..... تم کب گئے اس کے اسکول؟“

”تین چار دن قبل۔“

”اچھا! مگر کیوں؟“

”بات کلیئر کرنے کے لیے..... میں اس مرتبہ پاکستان آیا ہی تھا منتہا سے دو ٹوک بات کرنے کے لیے اور اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بول رہی ہے تو میں ایک منٹ نہ لگاتا یہ قصہ ختم کرنے میں۔“

”ہو سکتا ہے منتہا جھوٹ بول گئی ہوں۔“  
 ”نہیں امی جان! ایسا نہیں ہوا۔ میں بھی کچھ تجربہ رکھتا ہوں زندگی کا..... مجھے بھی لوگوں کے چہرے پڑھنے آتے ہیں۔ سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتا ہوں۔ منتہا نے مجھ سے جو کچھ کہا سچ کہا ہے۔“

”کیا کہا؟“  
 ”بتایا تو آپ کو کہ یہ سارا فساد منتہا کی اپنی ساتھیوں کا پیدا کردہ ہے۔“  
 اچھی بھابی اے! کبھی ابھی نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔  
 ”ایسا ہوتا ہے امی جان! گھر سے باہر نکل کر کام کرنے والی خواتین کو کبھی کبھی ایسے حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔“

”اس نے کہا اور تم نے یقین کر لیا؟“  
 ”کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے امی جان! آپ ہی کو میں نے ایک مرتبہ پھوپھی جان سے کہتے سنا تھا کہ یہ یقین کا رشتہ ہوتا ہے۔“

اچھی بھابی لا جواب سی ہو کر اس کا منہ تکتے لگیں۔ کچھ دیر وہ اسے ٹھنکی باندھے دیکھتی رہیں پھر بولیں ”اچھا خیر یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے مگر ارشاد اور ان کے گھر والوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ بات کہاں سے اور کیوں چلی تاکہ یہ بات خاندان میں زیادہ نہ پھیلے۔“  
 ”امی جان! ہمیں کسی کو کوئی صفائی پیش کرنے یا وضاحت دینے کی ضرورت نہیں۔ سچ اور جھوٹ دونوں ہی بالآخر ظاہر ہو جاتے ہیں۔“

”خیر..... اب تمہاری شادی ہو جانی ضروری ہے۔ بہت تاخیر ہو چکی، اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“  
 ”جی ہاں، یہ تو اب میں بھی چاہتا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ لیلیٰ کو میرے لیے بھی کھانا پکانا، کپڑے دھونا، استری کرنا اور میرے کمرے کی صفائی کرنا پڑے۔“

اچھی بھابی کا چہرہ کھل اٹھا۔  
 ”شکر ہے، کسی بہانے تمہیں یہ احساس تو ہوا کہ تمہاری شادی ہونا کتنا ضروری ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں لیلیٰ کو کب کا وہاں بھیج چکی ہوتی۔ خیر سے وہ بھی اب دو سے تین ہو جائیں گے تو لیلیٰ کے کام اور بڑھ جائیں گے بلکہ اب تو وہاں لیلیٰ کا خیال رکھنے اور اس کا ہاتھ بٹانے کو بھی کوئی ہونا چاہیے۔ میں آج ہی منتہا کی والدہ سے بات کرتی ہوں۔“

”تھوڑا سا صبر اور امی جان!“  
 ”کیا مطلب؟“ اچھی بھابی نے اس کی طرف دیکھا۔  
 ”مجھے پتا چلا ہے، پھوپھی جان کے ہاں ان دنوں بیہ بھابی کی عدنان سے شادی کا مسئلہ زیر غور ہے۔“

”اچھا! تمہیں کیسے پتا چلا، لیلیٰ سے؟“  
 ”جی نہیں، منتہا سے معلوم ہوا مگر..... ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا، منتہا ہی سے کہ بیہ بھابی کسی صورت آمادہ نہیں اور ہیں۔ مسئلہ اٹکا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے جہاں اتنا انتظار کیا ہم لوگوں نے، وہاں تھوڑا سا اور سہی۔ دیکھ لیا جائے کہ انٹ کسی کروٹ بیٹھتا ہے۔“

”دیکھو بیٹا“ اچھی بھابی نے تیور بٹا کر کہا ”بہت ہو چکی..... آخر کب تک تم اس بات کا انتظار کرتے رہو گے کہ بیہ کا کچھ بنے تو پھر تمہاری بات بنے۔ نہیں بھئی، بس اب ایک فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ بیہ اگر عدنان سے نکاح ثانی کے



لیے عمر بھر آمادہ نہ ہوئیں تو کیا تم عمر بھر انتظار کرتے رہو گے۔ ویسے بھی یہ بے جوڑ بات نظر آتی ہے۔ عدنان چھوٹا ہے۔

”وہ ایک علیحدہ بات ہے لیکن بالفرض اگر یہ نیل منڈھے نہ بھی چڑھ سکی تو ایک اور رشتہ بتایا جاسکتا ہے منہا کے گھر والوں کو یہ بھابی کے لیے۔“

”کس کا بھائی؟“

”وہیں دہلی میں ہے ایک لڑکا۔ انڈیا سے آیا ہوا ہے۔ ہمارے بڑوں میں رہتا ہے۔ فہیم سے اچھی دوستی ہے اس کی۔ کبھی کبھی گھر بھی آ جاتا ہے۔ اسے رشتے داروں میں شادی ہوئی تھی اس کی۔ لڑکی کچھ عرصہ دہلی میں بھی اس کے ساتھ رہی پھر بڑوں میں کچھ ایسے جھگڑے ہوئے کہ لڑکی اسے چھوڑ کر واپس انڈیا چلی گئی۔ دو ڈھائی سال علیحدگی رہی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل لڑکے نے اسے طلاق لکھ بھیجی ہے اور اب دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے دبے لفظوں میں یہ بھابی کا تذکرہ کیا تو اس نے کہا، ٹھیک ہے آپ بات چلائیں، یہ ابھی میرے یہاں آنے سے دو چار دن قبل ہی ہوئی تھی بات۔“

”تم منہا سے ملے تو کیا تم نے ذکر کیا اس بات کا؟“

”جی نہیں..... اصل میں میرے ذکر کرنے سے قبل ہی منہا نے از خود عدنان والا قصہ چھیڑ دیا۔ میں نے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مبادا پھولی جان اور ان کے گھر والے یہ سمجھیں کہ میں یہ بھابی اور عدنان کے قصے میں خدا خواستہ کوئی رخ نہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”اچھا کیا۔ وہ لوگ تو پہلے ہی اپنے دلوں میں بدگمانی لیے بیٹھے ہیں۔“ اچھی بھابی ملول دکھائی دیے لگیں۔

”بہر حال اگر عدنان والا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے تو جس رشتے کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ بتا دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ لڑکا ہر لحاظ سے اچھا ہے۔“

”بیٹا بالفرض بات چلے بھی تو تم سامنے مت آنا۔“

”یعنی؟“

”تمہاری پھولی جان اور ان کے گھر والوں کو ہرگز یہ پتا نہ چلے کہ یہ رشتہ تم نے بتایا ہے۔“

”وہ تو خیر معلوم ہو کر رہے گا۔ لیکن جو جانتی ہیں اسے۔“

”بس تو پھر جانے دو..... چپ کر جاؤ۔ بھول کر بھی ذکر نہ کرنا کسی سے۔ خواہ مخواہ دشمنی اور بڑھ جائے گی ان لوگوں سے۔“

نعیم نے ایک گہری سانس کھینچی، پھر بولا ”کیسی عجیب بات ہے۔ ابا کے بعد جس گھر سے ہم لوگوں کو سب سے زیادہ پیار ملا، اب وہیں سب سے زیادہ نفرت ہے ہمارے لیے بالخصوص میرے لیے۔“

اچھی بھابی نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ”میں تو ایک دوست سے محروم ہو گئی۔ تمہاری پھولی سے میں اپنا ہر دکھ سکھ کہہ سن لیا کرتی تھی۔“

ماں کے دل سے رنج و ملال دور کرنے کو نعیم نے اپنا بازو ان کے شانوں پر دراز کر دیا۔

☆☆☆

منہا ایک پالیسی لیٹر کی تلاش میں ایک فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ اقبال نے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دی۔

”بھئی، اس نے نظر فائل کے ادراک پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔“

”حاضر ہو سکتا ہوں میڈم! چند ثانیے بعد دروازے کی سمت سے آواز اس تک پہنچی۔“

”جی..... جی!“ اس نے نگاہ اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ جبار نامی وہ شخص جو ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ بہت سی شکایتیں حکایتیں لے کر اس کے دفتر میں آیا تھا، دروازے پر کھڑا تھا۔

”السلام علیکم میڈم!“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”وعلیکم السلام“ منتہا فائل سے توجہ ہٹا کر ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو چکی تھی اور اسے اس کی بہیمیت کے وہ قصے یاد آ رہے تھے جو اس کی بیوی نے سنائے تھے۔

اس کی میز کے نزدیک پہنچ کر وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”میڈم! بچوں کے اسکول لیونگ سرٹیفیکیشن چاہئیں۔“

منتہا نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ تھام لیا اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ وہ کاغذ اسے تھما کر صوفے کے بجائے اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ منتہا نے کاغذ کے مندرجات پر نظر دوڑائی۔ وہ بچوں کو اپنے ساتھ بیرون ملک لے جانے کے لیے ان کے اسکول لیونگ سرٹیفیکیشن حاصل کرنے کی درخواست گزار رہا تھا۔

”تو اب آپ فیملی کو اپنے ساتھ ہی رکھیں گے“ منتہا نے پوچھا۔

”جی میڈم!“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”گڈ!“ منتہا نے اس کی درخواست پر آفس کلرک کے لیے ضروری ریمارکس لکھے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”کل گیارہ بجے تک آپ بچوں کے واجبات ادا کر کے سرٹیفیکیشن لے سکتے ہیں۔“

”تھینک یو“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”مسز جبار کیسی ہیں؟ کافی دنوں سے آئیں نہیں؟“

”ٹھیک ہے“ وہ بڑے سرد سے لہجے میں بولا۔

”خدا اس عورت کے حال پر رحم کرے“ منتہا نے جی ہی جی میں سوچا ”اب یہ جلا دھفت آدمی اس کمزوری عورت پر غیر دیس میں نہ جانے کیا ظلم ڈھائے گا۔“

اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ اسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

”آپ کی بہو صاحب کے مزاج کچھ راہ راست پر آئے؟“ ظہیر صاحب نے مسز ظہیر کے نزدیک بیٹھتے ہوئے

کہا۔

”جناب ظہیر صاحب، بہو صاحب تو وہ آپ کی ہیں۔ ہماری تو فقط بیہہ ہیں۔“ مسز ظہیر کی کوشش ہوتی کہ گھر کی فضا گھبر نہ ہونے پائے۔

”کیا ارادے ہیں ان کے؟ آمادہ ہوئیں عدنان کے لیے؟“

مسز ظہیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ان کے گھر والوں سے بات کرو پھر۔“

”دیکھیے، وہ خود مختار ہیں۔ گھر والوں سے بات کرنے سے کیا فرق پڑے گا۔“

”ادنیہ!“ ظہیر صاحب نے سر کو جھٹکا دیا۔

”بس اب اس خیال کو جانے دیجئے۔ زبردستی تو نہیں کر سکتے تاہم لوگ بلکہ اس چیئر کو اب بالکل ہی کلوز کر دینا

چاہیے ہمیں کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جب سے یہ قصہ چھڑا ہے، عدنان بھی ڈسٹرب سے ہیں۔ بیہہ سے بات کرتے بھی اچکپانے لگے ہیں وہ اب۔“

”ریجیکٹ جو کیا ہے تمہاری بہو نے نہیں۔“



”بات رنجیکشن یا پروول کی نہیں۔“

”تو پھر کا ہے کی ہے۔“

”بس نہیں ماننا ہوگا دل ان کا۔“

”دل!“ ظہیر صاحب کے لہجے میں تحقیر بھی تھی استہزا بھی۔

مسز ظہیر کی نگاہیں فرحان کی دیوار گیر تصویر پر جا رکیں۔

☆☆☆

علیب کو اللہ میاں نے بیٹی دی تھی۔ مئی، علیب، منہا سبھی خوش تھے۔ رحمت خداوندی کو انتہائی خوش دلی اور گرم جوشی سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ ننھی مئی گڑیا سی بچی کو اپنے ہاتھوں پر لیے علیب اسے ایک حیرت انگیز مسرت کے ساتھ دیکھتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جسے لفظوں میں بیان ہی نہ کیا جاسکتا تھا۔

ثروت کا میکا خاصا وسیع تھا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کے میکے سے مبارک باد دینے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اسپتال کے کمرے میں گلدستے، مٹھائی اور کیک کے ڈبے جمع ہوتے چلے گئے۔ مئی ہر آنے جانے والے کا منہ میٹھا کراتی جا رہی تھیں۔

سوئے اتفاق عدنان کے ہمراہ مسز ظہیر اور نعیم کے ساتھ اچھی بھابی آگے پیچھے اسپتال پہنچیں۔ گوا چھی بھابی کو آنے میں دقت ہوئی مگر وہ جوں توں ہمت کر کے آ ہی گئیں۔ عدنان نے خاصی سرد مہری سے نعیم کو نظر انداز کر دیا پھر مسز ظہیر سے بولا ”یہاں نزدیک ہی میرا ایک دوست رہتا ہے، میں اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ کتنی دیر بیٹھیں گی آپ؟“

مسز ظہیر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا ”پانچ بجے تک آ جانا تم۔“

”ٹھیک ہے۔“

نعیم کمرے کے باہر راہداری میں جا کھڑا ہوا۔ مسز ظہیر اور اچھی بھابی وہیں کمرے ہی میں بیٹھی رہیں۔

”انشاء اللہ ایک آدھ ماہ میں آپ بھی ماشاء اللہ دادی بن جائیں گی“ مئی نے جودادی بن کر بہت مسرور تھیں، اچھی بھابی سے کہا۔

”انشاء اللہ!“

ثروت کے میکے سے چند افراد مبارک بادی کے لیے آئے تو مسز ظہیر اور اچھی بھابی نے اجازت چاہی۔

”بہت شکریہ آپ کے آنے کا“ مئی نے اچھی بھابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”شکریے کی کیا بات۔ اب تو آپ کی اور ہماری خوشیاں مشترک ہیں“ اچھی بھابی نے کہا پھر سرگوشی میں بولیں۔

”میں جلد ہی گھر پر آپ کے پاس آنے والی ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناکس لیے؟“

”جی“ مئی نے کہا پھر مسز ظہیر کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں ”آپ کیوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عدنان کے آنے تک تو آپ کو بیٹھنا ہی ہوگا۔“

”باہر انتظار کرتے ہیں ہم ان کا۔“

”باہر کیوں بیٹھیں بیٹھیں۔“

”کوئی بات نہیں، آپ ہماری بالکل فکر نہ کریں۔ اچھی بھابی کو خدا حافظ کہنے کے لیے تو ہمیں باہر جانا ہی ہوگا۔“

”چلیے تو پھر میں بھی چلتی ہوں۔“

”ارے نہیں نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ یہ اسپتال ہے۔ تکلف کی ضرورت نہیں، ماشاء اللہ آنا جانا لگا ہوا ہے آپ

یہیں ٹھہریں“ اچھی بھابی نے مئی کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اچھی بھابی نے مسز ظہیر کا سہارا لیا۔ انہیں کمرے سے باہر آتے دیکھ کر نعیم جو راہداری میں کھڑا تھا، ان کی طرف بڑھا۔ مسز ظہیر اچھی بھابی کو سہارا دیے آہستہ روئی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ نعیم ان کے نزدیک آ پہنچا تو اچھی بھابی نے اپنا ہاتھ مسز ظہیر کے شانے پر سے ہٹا کر نعیم کے شانے پر دھریا اور تشکر آمیز نگاہوں سے مسز ظہیر کو دیکھتے ہوئے بولیں ”شکریہ!“

”کیسی بات کرتی ہیں؟“ مسز ظہیر نے کہا۔  
اچھی بھابی کی آنکھیں بھر آئیں ”ایسی کیا غلطی ہوئی ہم لوگوں سے جو محبتوں کے رشتے ہی کٹ گئے“ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

انہیں دلاسا دینے کو مسز ظہیر نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر دھردیا اور نعیم کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں ”بس اب تم بھی شادی کر ڈالو اور اچھی بھابی کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھو۔“  
”دل تو بہت چاہتا ہے پھوپھی جان مگر مجبوری ہے۔“

”ساری مجبوریاں ایک طرف اور بھابی کے تمہارے ساتھ ہی رہنے کی ضرورت ایک طرف۔“  
”آپ دعا کیجئے پھوپھی جان!“

”دعا کے ساتھ دعا بھی ضروری ہوتی ہے۔“  
”جی، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ پھوپھی جان کیسے ہیں؟“ نعیم نے موضوع بدلنا چاہا۔  
”شکر ہے خدا کا۔“

”بھابی.....؟ منا.....؟“

”الحمد للہ وہ بھی ٹھیک ہیں۔“

تبھی لفٹ آ کر رکی اور منتہا، علیب کے ہمراہ لفٹ سے نکلی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں تھرماس پکڑ رکھا تھا۔ علیب نے ایک بیگ اٹھا رکھا تھا۔ اچھی بھابی، نعیم اور مسز ظہیر کو دیکھتے ہی وہ دونوں ٹھنک گئے۔ علیک سلیک اور مبارک باد کے بعد منتہا نے تھرماس علیب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”ثروت کو دودھ دینا ہے، تم یہ تھرماس لے جاؤ کمرے میں۔“

علیب کمرے کی طرف چلا گیا۔ منتہا ان لوگوں کے ساتھ راہداری ہی میں ٹھہری رہی۔ چاروں ہی گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل والی کیفیت سے دوچار نظر آتے تھے۔ بالآخر مسز ظہیر نے یہ مشکل آسان کی۔  
”ہم ابھی تمہارے آنے سے پہلے نعیم سے کہہ رہے تھے بس اب شادی کر ڈالیں۔“

منتہا خاموش رہی۔

”یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تم بیہ کی وجہ سے یہ قربانی دے رہی ہو مگر بات یہ ہے کہ وقت کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ جو

ای میل اور فیکس کی سہولیات مختصر پیغامات اور تبصروں کے لئے جملہ قارئین کے لئے حاضر ہیں۔ بعض قارئین طویل خطوط، کوپن والے اشعار و سوالات ڈاک سے بھیجنے کے بجائے ان ہی ذرائع سے بھیج دیتے ہیں۔ ٹرانس مشن اور اسکے ننگ (SCANNING) کی بعض فنی وجوہ کی بنا پر بسا اوقات یہ متن پوری جزئیات کے ساتھ موصول نہیں ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ ازراہ کرم اپنی تخلیقات اور اشعار و سوالات اصل کوپن کے ساتھ صرف ڈاک سے ارسال کروں تاکہ یہ ضائع نہ ہوں۔ ای میل پر تبصروں وغیرہ کے آخر میں اپنے نام کے ساتھ ازراہ کرم اپنے شہر اور ملک کا نام ضرور لکھیں۔



نوٹ:- غیر ملکی قارئین کے خطوط ہم تک بروقت نہیں پہنچ پاتے، لہذا غیر ملکی میں بسنے والے تمام قارئین کے لئے ای میل اور فیکس کی سہولت بدستور برقرار ہے..... (ادارہ)



دقت گزر جائے وہ پھر بڑی سے بڑی دولت کے عوض بھی نہیں خریدا جاسکتا۔ اس لیے ہم تو تمہیں یہی ایڈوائس دیں گے کہ دقت کی قدر کرو۔ بیہ کی خاطر تمہارا یوں اپنا وقت ضائع کرنا عقلمندی ہرگز نہیں۔ ہم تو بیہ کے لیے بھی کسی مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں۔“

منظر ظہیر کے آخری جملے پر ان تینوں نے ایک ساتھ چونک کر انہیں دیکھا۔ ان تینوں ہی کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔

”ہاں“ منظر ظہیر کی آنکھوں میں نمی لہرائی ”ہم چاہتے ہیں، بیہ کے لیے کوئی اچھا رشتہ ملے تو ان کا گھر دوبارہ بس جائے۔“

اچھی بھابی نے انہیں کچھ اس طرح دیکھا جیسے ان کی ذہنی کیفیت یا پھر اپنی سماعت کا اعتبار نہ ہو۔ منظر ظہیر ان کی نگاہوں میں ہلکورے لیتی حیرانی کا سبب بھانپ گئیں۔

”خدا نخواستہ..... خدا نخواستہ بیہ کی جگہ ہماری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا ہم اس کے لیے ایسا نہ سوچتے..... بہو بھی تو آخر کسی کی بیٹی ہی ہوتی ہے۔ بیہ کو دیکھ دیکھ کر ہمارا دل کتنا رہتا ہے۔ فرحان کا خیال آتا رہتا ہے۔ بیہ کا گھر پھر سے بس جائے تو شاید ہمارے دل کی دھن میں بھی کچھ افادہ ہو جائے۔“

”یو آر گریت پھوپھی جان! یو آر ریٹلی گریت! نعیم ان کے بالکل نزدیک آ گیا اور بولا ”خدا کی قسم، آپ کے پاؤں چھونے کو جی چاہتا ہے۔“

اچھی بھابی کی آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے تھے ”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، تم جیسی نیک فطرت، دوسروں کی ہمدرد اور غمگسار اور ہر ایک کے کام آنے والی اپنی بندی کے دل کو اللہ میاں نے یہ دکھ کیوں دیا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا؟“ انہوں نے ہمدردانہ نگاہوں سے منظر ظہیر کو دیکھا۔

”ہم سے ایک غلطی ہو گئی تھی اچھی بھابی!“ منظر ظہیر آزر دگی سے بولیں۔  
”کیسی غلطی؟“

”آپ تو جانتی ہیں نا ہم نے کیسی زندگی گزاری ہے؟ زندگی کی دھوپ ہم نے تنہا کاٹی ہے۔ بچوں کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے اور بچیوں کے گھر آباد کرنے کے بعد جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر گھر بیٹھے تو ہم اکثر اللہ میاں سے چپکے چپکے کہتے، نہ ہم نے پہلے کبھی آپ سے شکوہ کیا کسی بات کا نہ آئندہ کبھی کریں گے۔ شاید ہم اپنی اسی خطا پر پکڑے گئے“ منظر ظہیر کی آواز بھرا رہی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی روچک رہی تھی ”اس نے ایسی آزمائش ڈالی اچھی بھابی کہ ہمارا اس سے آئندہ بھی گلہ نہ کرنے کا دعویٰ رکھا رہ گیا۔ ہم اس سے شکوہ کرنے پر مجبور ہو گئے“ منظر ظہیر کی آواز لمحہ بہ لمحہ رندھتی چلی گئی۔

نعیم نے اپنے ہاتھ ان کے شانوں پر دھر کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی اور آہستگی سے بولا ”سوری پھوپھی جان! میں آپ کا مجرم ہوں۔“

”نہیں بیٹا!“ منظر ظہیر نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک بات کہیں تم سے“ اچھی بھابی نے منظر ظہیر کی جانب دیکھا پھر نعیم کو ماتا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”ہمارے بچے کو معاف کر دو تم سب لوگ۔“

منظر ظہیر نے یکبارگی اچھی بھابی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور نعیم کی جانب دیکھا۔ نعیم نے اپنا سر اُن کے سامنے جھکا دیا۔ منظر ظہیر نے اچھی بھابی کے ہاتھ چھوڑ دیے اور اپنے سامنے جھکے نعیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں ”یہ ہمارا بچہ بھی تو ہے اچھی بھابی! اور اپنے بچوں سے بھلا کون دیر تک ناراض رہ سکتا ہے۔ ہم تو کب کے اس حادثے کو اپنی قسمت کا لکھا اور فرحان کا مقسوم سمجھ کر بھلا چکے۔“

## تاریخ متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں، ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”گھر کے باقی لوگوں سے بھی کہوا پنا دل صاف کر لیں ان کی طرف سے“ اچھی بھابی نے کہا۔  
 ”وقت بہت بڑا مرہم ہے اچھی بھابی! صدمہ شدید تھا اس لیے گھاؤ بھرنے میں وقت لگ رہا ہے مگر ایک دن ہماری طرح سب سمجھ لیں گے کہ تعیم میاں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک حادثہ تھا۔“  
 ”میرا قصور تھا پھوپھی جان! گاڑی بہت تیز چلایا کرتا تھا میں۔“  
 ”تھا کیا مطلب؟“ مسز ظہیر نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔  
 ”اب انتہائی جلدی میں بھی ہوں تو سنبھل کر گاڑی چلاتا ہوں۔“  
 ”اللہ تعالیٰ ہماری بہت سی بے اعتدالیوں کو اسی طرح اعتدال پر لاتے ہیں“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”بھئی منہا، تمہاری بیٹی ماشاء اللہ بڑی خوش بخت ہے۔ اس کے طفیل آج ہم کتنے سال بعد پھر اس طرح ملے ہیں“ اچھی بھابی نے مسز ظہیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ نے ایک مشکل حل کر دی“ منہا نے مسکراتے ہوئے اپنی ہونے والی ساس کی جانب دیکھا۔  
 ”کیسی مشکل؟“  
 ”کل سے اب تک صاحب زادی کا نام ہی نہیں ملے ہو پارہا تھا، اب ہو گیا۔“  
 ”وہ کیسے بھئی؟“ نعیم نے پرجسس لہجے میں کہا۔  
 ”امی جان نے اسے خوش بخت کہا ہے، اب وہ ساری زندگی خوش بخت ہی کہلائے گی۔ می سے کہوں گی بس یہی نام رکھیں اس کا۔“  
 ”جیتی رہو۔ یہ تمہاری سعادت مندی ہے“ اچھی بھابی بولیں۔  
 ”نعیم کو منہا کا انہیں“ امی جان“ کہنا بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے ماں سے سرگوشی میں کچھ کہا اور انہوں نے اس طرح سر ہلایا جیسے اسے کسی بات کی اجازت دے رہی ہوں۔  
 ”پھوپھی جان! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“ نعیم نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔  
 ”مسز ظہیر اور منہا دونوں اس کے لہجے سے جھلکتی غیر معمولی حزم و احتیاط پر کھنکیں۔  
 ”ہاں..... کہو“ مسز ظہیر نے کہا۔  
 ”میری اس جسارت کا برا نہ منائیے گا پلیز!“  
 ”منہا چونکا تو ہر تن اس کی طرف متوجہ ہو گئی کہ ایسی کیا بات کہنے جا رہا تھا وہ جس کے برا منائے جانے کا اندیشہ بھی تھا اسے!  
 ”پھوپھی جان..... بیہ بھابی کے لیے..... ایک..... پروپوزل ہے“ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔  
 ”مسز ظہیر اور منہا دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔“



”وہاں دہلی میں ایک لڑکا ہے۔ ہینڈسم، ویل ایجوکیٹڈ، ویل سیلڈ اور اچھے خاندان کا۔“  
تبھی عدنان آنا دکھائی دیا۔

”بعد میں فون پر بات کریں گے ہم“ مسز ظہیر نے نعیم سے کہا۔ وہ عدنان کے اپنے نزدیک آ پہنچنے سے قبل اس موضوع کو پلیٹ دینا چاہتی تھیں۔

عدنان ان سب کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر پہلے ٹھنک پھر قدرے متردسا آگے بڑھ آیا۔  
”چلیے امی!“ اس نے ان کے نزدیک پہنچ کر دیگر افراد کو انتہائی سرد مہری سے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔  
”ممائی جان کو آداب کرو۔ نعیم میاں سے ملو، تم پہلے بھی ملے بغیر چلے گئے تھے۔“ مسز ظہیر نے اسے ٹوکا۔  
عدنان کچھ جزبہ ساد دکھائی دینے لگا۔

مسز ظہیر نے اس کا بازو پکڑا اور اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی سے کسی بات پر ناراضی ہو جانے پر اس سے اپنی بات چیت تین دن سے زیادہ بند نہ رکھے“ مسز ظہیر نے عدنان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں نعیم کا ہاتھ لیتے ہوئے دونوں کا ہاتھ ملوانے کا قصد کیا۔

عدنان جو اس صورت حال کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، گھبرا کے پیچھے ہٹا اور اس نے اپنا ہاتھ پرے کھینچنے کی کوشش کی مگر مسز ظہیر نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔  
”امی!“ عدنان انتہائی مذہب لہجے میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”بیٹا، ہم تمہاری ماں ہیں، اتنی آسانی سے نہیں چھڑوا سکتے تم ہماری گرفت سے اپنا ہاتھ۔“  
”امی پلیز، چلیے۔“ عدنان کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔

”بیٹا! رنجش اور خلش کبھی کسی کے دل کو پہنچنے نہیں دیتیں۔ اس سرد جنگ کا اب خاتمہ ہو جانا چاہیے۔“

عدنان نے الجھی الجھی نگاہوں سے ماں کو دیکھا ”اور ابو.....؟“ اس کا سوال بہت مختصر مگر بہت جامع تھا۔  
”ابو اور ہم تو اب چراغ سحری ہیں بیٹا۔ آج ہیں کل نہیں ہوں گے۔ تمہارا دکھ سکھ اپنے ان خونی رشتوں کے سہارے ہی گزر رہے گا۔ رنجش اور خلش کو جتنا بڑھاؤ، بڑھ جاتی ہیں جتنا گھٹانا چاہو، گھٹ جاتی ہیں۔ زندگی محبت اور مروت کے سہارے گزرتی ہے بیٹا، نفرت کے سہارے نہیں..... شاباش، بھائی سے ہاتھ ملاؤ۔ یہ تمہارے لیے فرحان کی جگہ ہیں۔ آج کے بعد ہم تمہیں ان کے ساتھ اچھے تعلقات کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔“  
عدنان شدید کشمکش سے دو چار دکھائی دینے لگا۔ اچانک نعیم آگے بڑھا اور اس نے عدنان کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر سینے سے لگا لیا۔

اچھی بھابی کی آنکھیں بھر آئیں۔ خود مسز ظہیر کی آنکھوں میں بھی ایک ہلکی سی آبی رو دکھلنے لگے۔  
منہا دم بخود یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

اسپتال کی رابداری میں تجدید مراسم کا یہ جیتا جاگتا منظر مسز ظہیر کی بردباری اور تحمل کا مرہون منت تھا۔  
مسز ظہیر واقعی منظم تھیں۔

خوش بخت کی پیدائش کے تیسرے دن منہا کو اپنی پردیموشن کی خوشخبری ملی۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

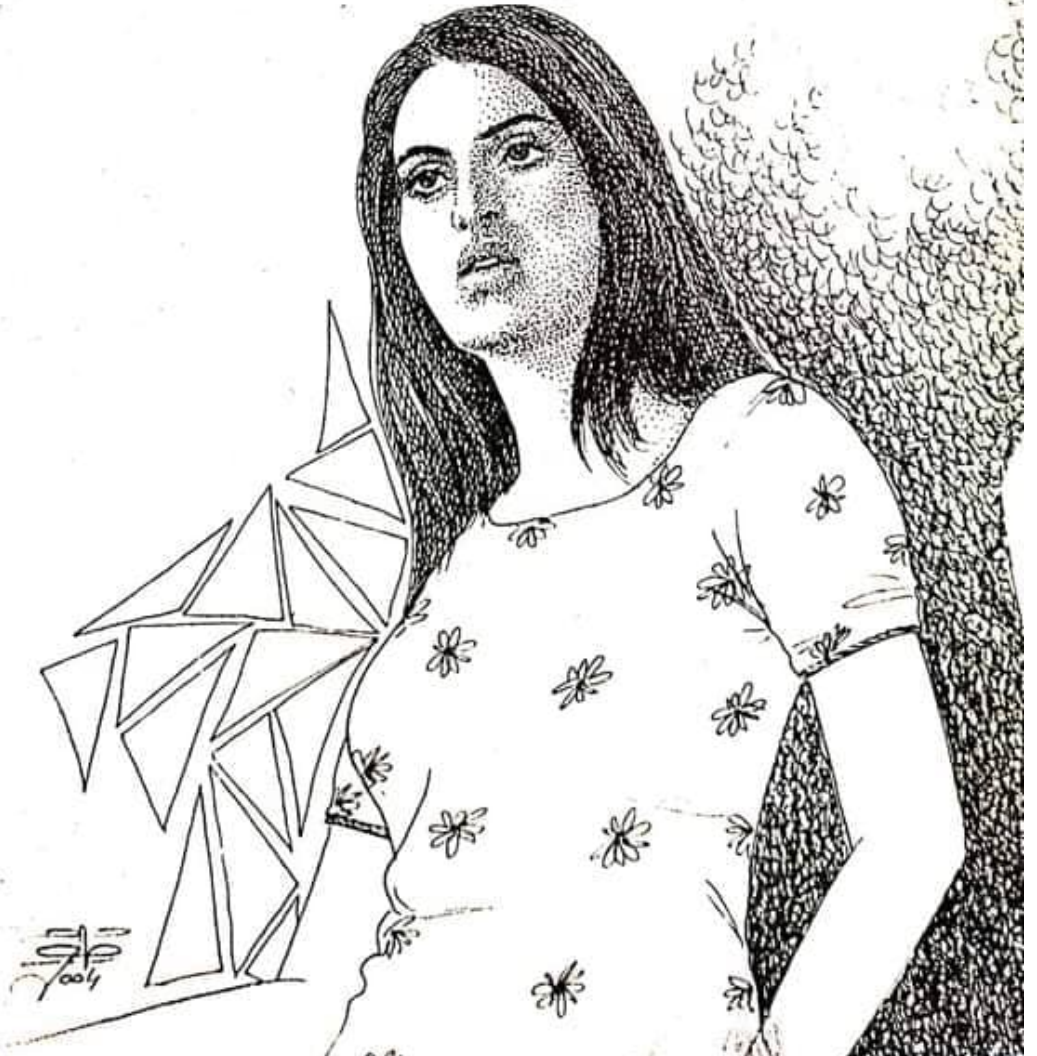
دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی ہنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبنمی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

**محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے رشتوں کے چابک سمار ہونے کی دل گداز داستان**

**منتہا**

**ناہید سلطانہ اختر**









نعیم دو تین دن تک منتظر رہا کہ شاید پھولی مذکورہ رشتے کے بارے میں اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کو اسے فون کریں مگر منظر ظہیر کو اس سے بات کرنے سے قبل بہت سے پہلوؤں پر اچھی طرح غور و خوض کرنا پڑا۔ تین چار دن کے بعد انہوں نے بالآخر اسے فون کر ہی لیا۔ رات کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اچھی بھابی سوچکی تھیں۔ نعیم بھی بس سونے ہی جا رہا تھا۔

”پھولی جان!“ نعیم فون پر ان کی آواز سن کر تھیر آ میز سرت کے ساتھ بولا۔  
 ”ہاں۔“ منظر ظہیر نے دھیمی آواز میں کہا ”ہم نے اسی لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے فون کیا ہے تمہیں جس کا ذکر تم اس روز ہسپتال میں کر رہے تھے۔“  
 ”پھولی جان وہ تو میں آپ کو بتا ہی دوں گا لیکن.....“  
 ”لیکن کیا؟“

”آپ کا..... طرز عمل ناقابل فہم ہے میرے لیے۔“  
 ”ہم سمجھ نہیں۔“

”کون..... کون ماں ہوگی جو..... جو بیٹے کی موت کے بعد..... اس کی بیوہ کا گھر دوبارہ بسانے کے لیے یوں فکر مند ہوگی۔“

”نعیم میاں ہماری بہو کسی کی بیٹی بھی تو ہے نا آخر..... اگر ان کی والدہ ان کے لیے فکر مند ہو سکتی ہیں تو تھوڑی بہت ذمہ داری، کچھ اخلاقی اور معاشرتی فریضہ تو ہمارا بھی ہے کہ ہم اس کا رخیہ میں ہاتھ بٹانے کی کوشش کریں..... رہی بات بیٹے کی موت کی تو.....“ منظر ظہیر نے ایک سرد، کھینچی ”یہ صدمہ تو اب ہماری آخری سانس تک دل میں ترازور ہے گا۔“

”سمجھ میں نہیں آتا آپ کے صبر اور حوصلے کو سلام پیش کرنے کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں۔“  
 ”تم ہمیں اس لڑکے کی تفصیلات بتاؤ۔“ منظر ظہیر بولیں۔

”جی..... گوش گزار کرتا ہوں..... بس اتنا خیال رکھیے گا پھولی جان کہ میرا نام بھولے سے بھی درمیان میں نہ آئے ورنہ میسہ بھابی تو شاید بلکہ یقیناً میرے حوالے سے اس شریف آدمی کا نام سننا بھی گوارا نہ کریں گی۔“  
 ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت ساری ایسی باتیں ہماری سمجھ میں آ جاتی ہیں جنہیں پہلے ہم سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میسہ بھی بالآخر سمجھ جائیں گی۔“  
 ”اور پھوپا جان؟“ نعیم نے انتہائی حزم و احتیاط سے کہا۔

”تمہارے پھوپا جان کی نفسیات کو ہم سے بہتر شاید کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح ہیں جو خلاف مزاج کوئی بات ہو جانے پر بچل جاتا ہے مگر چکار و دو من بھی جاتا ہے۔ ہم انہیں سمجھالیں گے۔“  
 ”تو آپ نے..... میرے لیے کوشش کیوں نہیں کی اب تک پھولی جان؟“  
 ”کی ہے مگر زیادہ نہیں۔“

”زیادہ کیوں نہیں؟“

”سچ کہیں۔“ منظر ظہیر کی آواز یکبارگی تھرا گئی ”فرحان کا ذکر آتے ہی ہم خود اتنے دکھی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں خود کسی غمگسار کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہر حال اتنا ہم جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن ہماری طرح تمہارے پھوپا جان کا دل بھی اس بات پر ٹھہر جائے گا کہ مشیت ایزدی یہی تھی اور تب..... انہیں تم سے..... قسمت سے، کسی سے بھی کوئی گلہ نہیں رہے گا..... اچھا خیر، اب تم ہمیں اس لڑکے کے بارے میں بتاؤ۔“  
 نعیم نے انہیں مطلوبہ کوائف سے آگاہ کیا۔



”نام کیا ہے اس کا؟“ مسز ظہیر نے پوچھا۔  
”ثاقب محمود۔“

”اب سوال یہ ہے کہ سلسلہ کیونکر چلے۔ ہمارا مطلب ہے اس سے ہمارے یا ہم سے اس کے رابطے کی صورت کیا ہو۔ بات ایک مرتبہ چل پڑے بس پھر تو ہم سنبھال لیں گے۔“  
”ایک صورت تو میرے ذہن میں ہے۔“  
”وہ کیا؟“

”ثاقب کو اعتماد میں لے کر اسے تمام صورت حال بتادی جائے اور اس کی طرف سے ضرورت رشتہ کا ایک اشتہار یہاں کہ کسی اخبار میں شائع کرادیا جائے۔ آپ اس اشتہار کے حوالے سے اس سے رابطہ کر لیں۔ یوں میں بھی پکچر سے نکلا رہوں گا۔ جب آپ کی اس سے خط و کتابت یا ٹیلی فون پر بات چیت ہو جائے تو آپ لیلیٰ اور نعیم کو بھی انوالو کر سکتی ہیں۔“  
”گڈ!“ مسز ظہیر خوش ہو کر بولیں ”یہ ٹھیک ہے..... تم تو بہت ہوشیار ہو گئے ہو بھی۔“  
”نوازش!“

”ٹھیک ہے تم اس سے بات کرو۔“  
”واپس جا کر ہی کروں گا پھوپھی جان۔“  
”نون کر لو نا۔“

”اے تفصیل سے سمجھانا پڑے گا۔ خاندانی رنجشوں اور مسائل سے آگاہ کرنا پڑے گا۔ فون پر تفصیل سے بات نہ ہو پائے گی۔“

”تو پھر ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ تمہاری اور اس کی بات چیت کا نتیجہ کیا رہا۔“  
”ہوں۔“ نعیم سوچ میں پڑ گیا ”مشکل یہ ہے کہ میں احتیاطاً امی جان کو بھی پکچر میں نہیں لانا چاہتا ورنہ میں انہیں فون کر دوں اور وہ آپ کو بتادیں اور خود میرے آپ کو فون کرنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں..... گڈ! ایک صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں منجھا کو اور وہ آپ کو بتادیں۔ کسی کوشش بھی نہیں کرے گا۔“  
”یہ ٹھیک ہے اور اچھا بھی ہے کہ اس بہانے بیہ کے میکے والے بھی اس معاملے میں انوالو رہیں گے..... نعیم میاں دیر مت کرنا۔“

”نکرنہ کیجئے پھوپھی جان..... مجھے خود جلدی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو تو.....“ نعیم نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔  
”تو تمہارا اپنا مسئلہ بھی حل ہو۔“ مسز ظہیر نے خوش دلی سے اس کی نامکمل بات کو گرہ لگائی۔  
”آپ سے کس نے کہا؟“ وہ چونکا۔

”ارے میاں اپنوں کی باتیں چھپی رہتیں ہیں بھلا ایک دوسرے سے۔ بھی اچھی بھابی نے بتایا تھا لیلیٰ کو اور لیلیٰ نے بتایا ہمیں کہ بیہ کے دوبارہ سٹل ہونے تک منجھا شادی نہیں کرنا چاہتیں۔“  
”اس کا مطلب ہے ثاقب کے معاملے میں میری انوالومنٹ بھی راز نہیں رہ سکے گی۔“  
”جب تک ضروری ہو اتب تک تو رہے گی۔“

”یہ بھی غنیمت ہے۔“

”بس تم تاخیر مت کرنا۔“

”کچھ تو دیر ہوگی کیونکہ اس بار کچھ زیادہ چھٹی لے کر آیا ہوں۔“

”ہم خدا سے دعا کریں گے کہ وہ ہو جو ہم سب کے بالخصوص بیہ اور ہمارے منے کے حق میں بہتر ہو۔“ شدت

جذبات سے مسز ظہیر کی آواز رندھ سی گئی۔  
زندگی تو انسان کو آزمائشوں سے دوچار کرتی ہی ہے مگر یہ آزمائش مسز ظہیر کا اپنا انتخاب تھی۔

☆☆☆

ڈائریکٹریٹ کی جانب سے ترقیوں کے احکامات جاری ہوئے تو منہا کی ساری خوشی اڑ چھو ہو گئی۔ ترقی کے ساتھ ہی تبادلوں کے احکامات بھی جاری ہو گئے تھے۔ اس کا اپنا تبادلہ بیرون شہر کر دیا گیا تھا۔ مئی نے سنا تو وہ بھی خاصی متفکر ہوئیں۔

”اب کیا ہو گا؟“ مئی نے پوچھا۔  
”کچھ بھی نہیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ سے مئی کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے اسے چنداں پر دانہ تھی حالانکہ قلب و ذہن بوجھل تھے۔  
”چھوڑ دو بس!“

”کیا؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔  
”نو کری اور کیا۔ مجھے تو اب تمہاری ملازمت بری لگنے لگی ہے۔ آدھا دن گھر سے باہر گزر جاتا ہے۔“  
”ایسا تو نہ کہیں والدہ، اس نو کری نے تو بہت ساتھ دیا۔ ایسی بے مروتی سے تو نہیں چھوڑا جاسکتا اسے۔“  
مئی نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا ”تو کیا اب اس کی خاطر اپنا گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر رہو گی؟“  
”دیکھوں گی۔“

”دیکھوں گی کا کیا مطلب۔ نہ علیٰ ہل سکتا ہے یہاں سے اور نہ ہی میں علیٰ کو چھوڑ کر کہیں اور جاسکتی ہوں۔“

”کون کہہ رہا ہے آپ سے یا علیٰ سے کہیں اور جانے کو۔“  
”تو کیا غیر جگہ اکیلی رہو گی؟“  
وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”والدہ! پہلی بات تو یہ کہ اس وطن میں کوئی بھی جگہ ہمارے لیے غیر نہیں۔ یہاں کا چپہ چپہ ہمارا اپنا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ملازمت میں انسان کو ان تمام باتوں کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے یعنی ٹرانسفر تو ملازمت کا ایک حصہ ہے۔ کسی بھی وقت کہیں بھی تبادلہ کیا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی کچھ باتیں ہمارے اپنے اختیار میں بھی ہوتی ہیں۔ میں انفران سے بات کروں گی۔ اپنی مجبوری انہیں بتا دوں گی۔ ظاہر ہے میرے لیے اپنے گھر سے دور اکیلے رہنا ممکن نہ ہو گا۔ میں ریکوئسٹ کروں گی کہ مجھے یہیں کہیں اکا موڈیٹ کیا جائے ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ مئی کو اس کا لمحہ بھر کا توقف بھی گراں لگا۔

”ترقی لینے سے انکار کروں گی۔ کوئی ایک نقصان تو آدمی کو ایسی صورت حال میں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔“  
مئی کے چہرے سے مترشح تشویش قدرے چھٹ گئی۔

”میں تو کہتی ہوں یہ سارے چکر چھوڑو گھر بساؤ اور گھر بیٹھو۔“

”آپ کی یہ خواہش بھی پوری کروں گی والدہ۔“

”کب؟ جب میں مر جاؤں گی۔“

”پلیز ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں! مرنے سے بھلا کیا ڈرنا..... مرنا تو ہے ایک دن۔“

”اپنے مرنے سے نہیں۔“



”تو پھر!“

اس نے اپنی بانہیں می کی گردن میں حائل کر دیں۔ ”آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی محال ہے میرے لیے۔“  
 ”ماں باپ کس کے ہمیشہ رہتے ہیں دیکھ لو ہمارے مر گئے اور تمہارے باپ تو جیتے جی ہی مر گئے ہمارے لیے۔“ می کے لہجے میں دکھ تھا۔  
 اس نے چونک کر ایک لمحے کو می کو دیکھا پھر کسی بچے کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا برسوں گزر گئے تھے مگر می اس صدمے کو اب تک نہیں بھول پائی تھیں!

☆☆☆

اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے بیہ بے ساختہ چونک گئی۔ گواہ انداز مانہ نے چہرے کے نقوش کافی بگاڑ دیئے تھے مگر پھر بھی یہ تصویر اس کے لیے پہلی ہی نظر میں قابلِ شناخت تھی مگر اس تصویر کے ساتھ لگی خبر کی سرخی اس کا دل ہلا دینے کو کافی تھی۔

”ذکیٹی کی واردات میں معمر ڈاکٹر شدید زخمی بیوی اور نو عمر بیٹا ہلاک ملازم محفوظ رہا۔“  
 تفصیلات کے مطابق لاہور کے ایک پوش علاقے میں مقیم ڈاکٹر نجیب احمد کی کوٹھی میں گزشتہ شب چار مسلح ڈاکو اس وقت گھر میں داخل ہوئے جب ڈاکٹر نجیب اور ان کے اہل خانہ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ڈاکٹر نجیب احمد کے گھریلو ملازم نصیر کے مطابق ڈاکوؤں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے ڈاکٹر نجیب ان کی اہلیہ فرزانہ اور نو عمر بیٹے حبیب کو گن پوائنٹ پر لے لیا اور ایک ڈاکو نے گھر کا جائزہ لینے کے بعد ان سے سیف کی چابیاں طلب کیں۔ ڈاکٹر نجیب اور ان کی اہلیہ کی جانب سے مزاحمت کی گئی تو انہوں نے ڈھائی گھنٹے تک انہیں خوف و ہراس میں رکھا اور بار بار مارتے پیٹتے رہے۔ بالآخر ڈاکٹر نجیب نے سیف کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ ڈاکو سیف میں موجود چیزیں جن کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا اپنے ساتھ لے گئے اور جاتے ہوئے ڈاکٹر نجیب ان کی اہلیہ اور بیٹے کو زخمی بھی کر گئے۔ ملازم کے مطابق وہ ڈاکوؤں کے جانے کا یقین ہو جانے کے بعد گھر سے باہر نکلا اور اس نے سب سے پہلے ساتھ والی کوٹھی کے کیمینوں کو اطلاع کی۔ زخموں کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا مگر مسز نجیب اور ان کا بیٹا جانبر نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر نجیب احمد موت و زندگی کی کشمکش میں ہیں۔ ملازم سے پولیس کی پوچھ گچھ جاری ہے۔“  
 خبر پڑھ کر بیہ دم بخود رہ گئی۔  
 یہ کیا تھا۔

حادثہ یا مکافاتِ عمل!

وہی مال و اسباب جس کی لالچ میں ایک عورت نے دوسری عورت کا بسا بسایا گھر اجاڑا تھا نہ صرف غاصبہ بلکہ اس کی اولاد کی بھی جان لینے کا سبب بن گیا تھا۔  
 بیہ کتنی ہی دیر ایک صدمے کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ می کو بتائے سرال والوں سے چھپائے یا سب کو بتادے۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں تھی کہ ملتا کا فون آ گیا۔

”بیہ تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“

”جی..... پڑھ لیا۔“

”اوہ میرے خدا کتنی شاکنگ نیوز ہے۔“

”آپ کہاں ہیں؟ گھر سے بات کر رہی ہیں؟“

”نہیں بھئی میں تو اسکول میں ہوں۔ اسمبلی کے بعد اپنے آفس میں آ کر اخبار پر سرسری نظر ڈال رہی تھی کہ.....“  
 ”غلیب آفس جا کر اخبار پڑھیں گے تو انہیں پتا چلے گا شکر ہے گھر میں اخبار نہیں آتا ورنہ می پڑھتیں یہ خبر اور

ڈیڈی کی تصویر دیکھتیں تو بہت اپ سیٹ ہو جاتیں۔“  
 ”بالآخر معلوم تو انہیں ہو گا ہی یہیہ..... اخبار سے نہ سہی کسی اور ذریعے سے..... ہمارے اپنے کسی رشتے دار یا  
 پھر ڈیڈی کے کسی رشتے دار یا جاننے والے کے ذریعے ایک وہی تو اس شہر سے چلے گئے تھے ناباتی تو سب یہیں رہ  
 رہے ہیں۔“

”مگر ان سے ہمارا رابطہ کہاں ہے۔“  
 ”لوگ ایسے موقع پر رابطہ کر لیتے ہیں، یہیہ۔“  
 ”ہوں۔“

”تم نے اپنے گھر میں کسی کو بتایا؟“  
 ”جی نہیں، سب سے پہلے آپ ہی سے بات کر رہی ہوں۔“  
 ”تمہاری ساس کو تو سب کچھ معلوم ہے انہیں اگر بتا بھی دو گی تو کوئی بات نہیں۔“  
 ”باجی ان کو بتانا یا نہ بتانا بعد کی بات ہے یہ بتائیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“  
 ”بہت مشکل سوال ہے یہیہ۔“  
 ”مگر اس کا کچھ نہ کچھ جواب تو ہو گا۔“

”ہاں ہے تو۔“  
 ”کیا؟“

”ڈیڈی نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اس کے بعد ان کے لیے ہمارے دل میں کیا گنجائش رہ جاتی ہے..... تمہارا  
 کیا خیال ہے؟“

”اب آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔“  
 ”مگر..... میری طرح تمہارے پاس بھی میرے اس سوال کا کوئی نہ کوئی جواب تو ہو گا۔“  
 ”دیکھئے باجی.....“ یہیہ نے انکچکپاتے ہوئے کہا ”ڈیڈی نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا اس کے بعد ان کی طرف  
 پلٹ کر دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا مگر..... میرے پروفیشن کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی جان اگر دشمن کی بھی ہو تو بچانے کی  
 کوشش کی جائے۔“

”تمہارا مطلب ہے.....“ ملتا کے لہجے میں بے یقینی تھی۔  
 ”جی ہاں..... میرا خیال ہے مجھ سے بہتر ان کی دیکھ بھال کوئی اور نہیں کر سکتا۔“  
 ”یعنی؟“

”ہمیں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنے اور اگر ممکن ہو تو انہیں یہاں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسرے شہر میں  
 اس وقت ادوروں کے رحم و کرم پر پڑے ہیں۔“

”حیرت ہے! مجھے تو اس وقت تم والدہ کی زبان میں باتیں کرتی لگ رہی ہو۔“  
 ”میرا خیال ہے ہمیں می کو یہ خبر سنا دینی چاہیے اور علیہ کو بھی۔ آپ بات کریں گی می سے یا میں کروں۔“  
 ”انہیں آہستہ آہستہ بتانا ہو گا یہیہ۔“

”مگر کب؟“ یہیہ کے لہجے میں بے تاب تھی۔  
 ”بس میں ڈاک سائن کر کے اٹھتی ہوں گھر جانے کو..... بڑا مشکل ہوتا ہے یہیہ جب آپ کو دل کا درد چپ  
 چاپ سہنا ہو۔ یہاں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی میں۔“  
 ”میں بھی کس سے کہہ سکتی ہوں۔“



”تم اپنی ساس کو ضرور بتا دو تاکہ اگر ہمیں لاہور جانا پڑے تو ان کے علم میں ہو۔ بلکہ وہ ممی کو دلاسا دینے کے معاملے میں ہماری خاصی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ تم ہاسپٹل جاؤ گی کیا؟“

”جی نہیں، ایسی خبر ملنے کے بعد کہاں ہمت ہوتی ہے۔ علیب کو فون کر دوں۔“

”میں کرتی ہوں۔ تم ممی کے پاس پہنچنے کی کرو۔ اس سے پہلے کہ انہیں ادھر ادھر سے خبر ملے ہم میں سے کسی نہ کسی کو ان کے پاس موجود ہونا چاہیے۔“

”آپ فکر نہ کریں میں پہنچتی ہوں ان کے پاس۔“

☆☆☆

علیب کو خبر ہو چکی تھی۔

”جی..... میں نے ابھی ابھی پڑھی ہے یہ خبر۔“ وہ منجھا کافون آنے پر بولا۔

”بیسہ کا خیال ہے ہمیں ان کے پاس پہنچنا چاہیے اور اگر ہو سکے تو انہیں یہاں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”کیوں! کیا ضرورت ہے؟“

”اس کا خیال ہے کہ وہ ان کی بہتر طور پر دیکھ بھال کر سکتی ہے۔“

”انہوں نے بھی سوچا ہمارے پارے میں۔ کبھی پلٹ کر دیکھا ہماری طرف، کبھی زحمت کی یہ جاننے کی کہ ہم نے زندگی کیونکر گزاری۔“ علیب جذباتی ہو گیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔“

”بیسہ سے ذرا یہ پوچھیں کہ ان لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا باپ مر چکا ہے ہم کیا بتائیں گے کہ وہ ایک معمولی عورت کی خاطر ہماری ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ یہ تھا اس کا کردار..... مجھے تو اس خیال ہی سے شرم محسوس ہوتی ہے۔“

”بہر حال علیب یہ بھی تو ایک تلخ حقیقت ہے کہ اپنے کردار کی اس کمزوری کے باوجود وہ..... وہ ہیں تو ہمارے باپ۔“

”ثروت اور اس کے گھر والے تو یہی جانتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب انتقال کر چکے ہیں۔ انہیں شادی کے وقت یہی تو بتایا تھا تاہم نے۔“

”کوئی بات نہیں۔ وہ اعلیٰ ظرف لوگ ہیں۔ انہیں بتا دیں گے ہم کہ اصل بات یہ تھی۔“

”ایک بار جھوٹ بولنے کے بعد سچ بولنا اتنا آسان نہیں ہوتا باجی! مجھے ثروت اور اپنے سرال والوں سے نظریں جھکا کر سچ بولنا پڑے گا۔“

”مرد ہو علیب ڈرتے کیوں ہو۔ نعیم اور ان کے گھر والوں کو بھی حقیقت کا علم نہیں مگر ضرورت پڑی تو میں بے جھجک بات کروں گی۔ گھبرانے کی بات بھی کیا۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنی عجیب و غریب کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ لاہور جانے کی ضرورت پڑی جو کہ لازماً ہوگی تو تمہیں سب سے آگے ہونا چاہیے علیب۔ سبھی تو ہماری اصل قوت ہو۔ تمہارے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں۔“

وہ چپ رہا۔

”بیسہ اور میں گھر پہنچ رہے ہیں، تم بھی آ جاؤ تو اچھا ہے۔“

”دیکھتا ہوں۔“

ملتان نے اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب بیسہ سے اس کی بات ہوئی تو خود اس نے بھی تو شروع میں ایسی ہی سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بیسہ سے دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد ہی وہ ڈیڈی کے خلاف ہتھیار پھینک دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا جلد یا بدیر علیب کو بھی اسی مجبوری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خونی

رشتوں اور قلبی تعلق کے سامنے آدمی اکثر یونہی بے بس ہو جایا کرتا ہے۔

☆☆☆

واقعتاً ایسا ہی ہوا۔

منجہا می کے پاس ٹھہری بیہ اور علیب ڈیڈی کی خبر گیری کو لاہور روانہ ہو گئے ثروت اور اس کے میکے والوں نے اسی اعلیٰ طرئی کا مظاہرہ کیا جس کی ان سے توقع تھی، می حقیقت حال کھلنے پر شرمندہ ہوئیں تو ثروت کی والدہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”یہ ایسی کون سی بات ہے بہن انسان کو کبھی کبھی مصلحتاً اپنے آپ سے بھی بچ چھپانا پڑ جاتا ہے۔“

ان کا لہجہ اور بات کرنے کے لیے الفاظ کا چناؤ ہی ان کی مثبت سوچ اور عظمت کردار کا ثبوت دینے کو کافی تھے۔  
”اب تو آپ کا اور ہمارا ہر مسئلہ ہر دکھ سکھ مشترک ہے۔“ انہوں نے می کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

منجہا می بھی اس واقعے پر اظہارِ افسوس کے لیے می سے ملنے آئیں۔  
منجہا نے نعیم کو بھی بتا دیا۔ چھپانے کی اب ضرورت بھی نہ تھی۔ آج یا کل، جلد یا بدیر ثروت اور اس کے گھر والوں کی طرح نعیم اور اس کے گھر والوں کو بھی بالآخر پتا چل ہی جاتا تھا۔  
”آپ پہلے بتا دیتیں تو علیب کے ساتھ میں بھی چلا جاتا لاہور۔“ نعیم نے کہا۔

منجہا نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟“

اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی ”سوچ رہی ہوں ہم انسان کتنے بزدل ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”ساری زندگی ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے گزارتے ہیں۔ لوگوں کو پتا چل جائے تو کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں دیسا نہ ہو جائے کا خوف کبھی کبھی ہمیں ساری زندگی ہی ڈرائے رکھتا ہے اور بالکل آخر میں آکر پتا چلتا ہے کہ اس خوف کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ ہم خواہ مخواہ ڈرتے رہے۔“  
”میں علیب کے ساتھ ہوتا تو بہتر تھا۔“

”علیب کے ساتھ بیہ بھی ہے۔“

”کوئی بات نہیں ہو سکتا ہے اسی بہا نے بیہ بھابی سے تعلقات کچھ بہتر ہو جاتے۔“

اس رات عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد منجہا نے دو فل اس بات کے شکرانے کے ادا کئے کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگوں سے ناتے جڑوا دیئے تھے۔ منجہا می ثروت کے گھر والے اور نعیم بھی کتنے بامروت اور دوسروں کی مجبوریوں کو خندہ پیشانی سے گلے لگانے والے لوگ تھے!

دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے سے قبل وہ ڈیڈی کی صحت یابی کے لیے دو فل نماز حاجت پڑھنے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔  
علیب اور بیہ لاہور پہنچنے کے بعد گھر والوں سے مسلسل رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ڈیڈی کی دوسری بیوی اور بیٹے کی تدفین ہو چکی تھی۔ ڈیڈی کی اپنی حالت خطرے سے باہر تھی۔ ان کے معالجین نے انہیں سفر کی اجازت دے دی تھی تاہم پولیس اپنی کارروائی مکمل کرنے تک ان کا لاہور میں ہی زیرِ علاج رہنا ضروری سمجھ رہی تھی۔

☆☆☆

”مجھے حیرانی اس بات پر ہے کہ تمہاری پھوپھی نے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا بلکہ جب منجہا سے تمہارے رشتے کی بات چلی اور میں نے ان سے پوچھا لڑکی کے والد کیا کرتے ہیں تو انہوں نے کہا والد نہیں ہیں اس کے۔“ اچھی



بھابی نے نعیم سے کہا۔

”پھوپھی جان اور منہا کی دوستی رہی ہے امی جان اور اچھے دوست وہی ہوتے ہیں جو دوست کا راز راز رکھتے ہیں۔“

”ارے بھئی اس میں اتنی گہری رازداری کی کیا ضرورت تھی۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے مردوں نے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ رکھا ہوگا۔“

”کچھ لوگ بڑے خوددار ہوتے ہیں امی جان..... نہیں چاہتے کہ ان کے دکھوں اور مسائل کی بھنگ دوسروں کو ملے۔“

”انسان ہی انسان کے درد کی دوا ہے بیٹے۔“

”بعض نہیں بھی ہوتے امی جان۔“

”ہاں، تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ لوگوں کی اکثریت دوسروں کے دکھ رو کر سنتی ہے مگر فس کر اڑاتی ہے۔ خیر، تمہاری پھوپھی جان نے تو منہا سے دوستی کا حق ادا کیا۔ کانوں کان خبر نہ ہونے دی کہ باپ زندہ ہیں اور انہوں نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔“

”حالانکہ اس میں عیب تو کچھ نہیں سیکڑوں ہزاروں مرد دوسری شادیاں کر لیتے ہیں۔“

”مگر بیوی بچوں سے ایسی بے مروتی کم ہی دکھاتے ہیں۔“

”بڑی خوددار ہیں منہا کی والدہ۔“

”اب کر کیا رہے ہیں یہ لوگ؟“

”جب تک پولیس تفتیش مکمل نہیں کر لیتی منہا کے والد کو شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں۔“

”تفتیش خاک مکمل ہوگی، چور ڈاکو گھروں میں گھستے ہیں دن دھاڑے لوگوں کو گولیوں سے بھون کر چلے جاتے ہیں۔ پولیس بس تفتیش ہی کرتی رہ جاتی ہے۔ دار دایہ ہاتھ نہیں آتے۔ اس کیس میں بھی یہی ہوگا۔“

”دیکھئے کیا ہوتا ہے۔“

”ایسی وارداتوں میں گھر کے ملازموں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اکثر۔“

”آپ نے تو بڑے کام کی بات کی ہے امی جان۔ واقعی یہ بات خاصی غور طلب ہے کہ ڈاکوؤں نے گھر والوں کو مارا پیٹا، گولیاں مار دیں اور ملازم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔“

”بھئی میں تو اس لیے انجانے لوگوں کو گھر میں ملازم رکھنے کے حق میں نہیں۔“

☆☆☆

منہا نے اسکول سے چھٹی لے رکھی تھی۔ بیہ بھی لاہور جانے سے قبل اپنے ہاسپٹل اطلاع کر گئی تھی کہ امیر جنسی میں لاہور جانا پڑ رہا ہے۔ وہ اور علیب لاہور گئے تو تھے اس ارادے سے کہ اگر ڈیڈی سفر کے لائق ہوئے تو انہیں اپنے ساتھ لانے کی کوشش کریں گے مگر وہاں ایسی افتاد آن پڑی جس کا انہیں سان گمان بھی نہ تھا۔

ڈیڈی کے سرسالی رشتے داروں نے اس واردات کا شبہ ڈیڈی کے پہلے بیوی بچوں پر ظاہر کر کے علیب اور بیہ کو ایک نئی افتاد میں پھنسا دیا۔ پولیس نے علیب کو زیر حراست لے لیا اور بیہ کو اسپتال میں ڈیڈی کے کمرے تک محدود کر کے کمرے کے باہر ایک پولیس اہلکار تعینات کر دیا۔

بیہ نے اس صورت حال کی اطلاع صرف منہا کو دی۔ ذرا دیر کو تو منہا کو یوں لگا جیسے اس کے جسم سے جان جاتی رہی ہو۔ علیب کے زیر حراست ہونے کا تصور ہی بہت تکلیف دہ تھا۔

”باجی پلینز کچھ کیجئے۔ علیب کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔“ بیہ کی آواز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

منہا کی سمجھ میں نہ آیا اس سے کیا کہے کیونکر تسلی دے۔  
 ”ممی کو پتا نہ چلے بیہ۔“ اس نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔  
 ”آپ اپنی کوئیز یا اسٹوڈنٹس میں کوئی سورس نکالیں۔ باجی مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں علیب پر تشدد نہ کر رہے ہوں۔“  
 منہا کو یوں لگا جیسے وہ گر پڑے گی۔

”اچھا باجی دعا کیجئے گا۔“  
 منہا کا بس نہ تھا بلکہ بلکہ کر رہی تھی۔ کچھ درود دم بخود بیٹھی رہی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کہاں جائے  
 کس سے کہے۔ پھر وہ اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے اٹھی اور لاؤنچ سے ممی کے کمرے میں جا پہنچی۔  
 ”کس کا نوں تھا؟“

”اسکول سے تھا والدہ۔“ اس نے جھوٹ بولا دل چاہ رہا تھا خوب روئے۔  
 ”خیریت؟“

”جی..... وہ..... ڈائریکٹریٹ والوں نے بلایا ہے۔“ گھر سے باہر نکلنے کا بہانہ وہ سوچ چکی تھی۔  
 ”کیوں؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے ممی سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔  
 ”کب بلایا ہے؟“

”ابھی..... فوراً۔“ آنسو پینا مشکل ہو رہا تھا۔  
 ”جلدی آ جانا..... یہ تمہارے اسکول والے تمہیں چھٹی کے دوران بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔“  
 ”بس والدہ نوکری ہے نا..... آپ فکر نہ کریں میں جلدی آ جاؤں گی۔“  
 جلدی جلدی چیخ کر کے وہ گھر سے نکل گئی۔ ممی اور ثروت سے اپنی پریشانی چھپانے اور علیب اور بیہ کو اس ناگہانی افتاد سے بچانے کا کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے وہ مسز ظہیر کے پاس جانا چاہتی تھی۔  
 مسز ظہیر کا خیال نجات دہندہ کی صورت اس لیے سامنے آیا کہ ان کے تو کافی تعلقات تھے۔ کیا عجب کوئی ذریعہ نکل آتا علیب اور بیہ کی گلو خلاصی کرانے کے لیے۔

”خدا یا! پولیس حراست کا تو نام ہی برا۔ خدا جانے کیا سلوک کیا جا رہا ہوگا بے چارے علیب کے ساتھ۔“  
 رکشا میں سوار ہو کر وہ مسز ظہیر کے پاس جا پہنچی۔ انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو ان کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔

”پولیس کا معاملہ ہے منہا ہم عورتوں کے بس کی بات نہیں۔“  
 ”پلیز کچھ کیجئے۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”دیکھو اگر صرف علیب کا معاملہ ہوتا تو ہم ابھی اپنے خاندان اور ملنے جلنے والوں میں فون گھمانا شروع کر دیتے اور..... کوئی نہ کوئی سورس نکال ہی لیتے مگر مسئلہ یہ ہے کہ بیہ بھی اس معاملے میں انوالوکری گئی ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے کہ دیکھوان کی بہو..... تم جانتی ہونا لوگ کیسی کیسی باتیں بنانے لگتے ہیں اور ظہیر صاحب کو تو چیخ پکار کا بہانہ مل جائے گا بلکہ ہم تو اس وقت اس خیال سے ڈر رہے ہیں کہ خدا نخواستہ کہیں بیہ کا نام اس قصبے میں اخبار میں آ گیا تو ہمارے گھر میں تو قیامت آ جائے گی اب تو ہمیں اخبار پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔“

منہا کو سکی سی محسوس ہوئی۔ اسے یہ احساس شرمندہ کرنے لگا کہ اس وقت مسز ظہیر کے پاس آ کر اور انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کر کے اس نے غلطی کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ ان کے ہاں آنے سے پہلے اس نے یہ



کیوں نہیں سوچا تھا کہ مسز ظہیر سے اب اس کا صرف دوستی کا ناتا ہی نہ تھا وہ اس کی بہن کی ساس بھی تھیں۔ بہت نازک رشتہ تھا۔

یہ پہلا موقع تھا جب مسز ظہیر کی جانب سے اسے وہ اپنائیت، گرمجوشی اور تعاون نہ مل پایا تھا۔ جس کی وہ اپنے گھر سے امید باندھ کر چلی تھی۔ انتہائی کڑے دفتوں میں ہاتھ تھام کر سچ کج زندگی کی رہنمائی پر چلانے والی مسز ظہیر کے چہرے کا تناؤ اسے ناامید اور مایوس ہی نہیں شرمسار اور دلہی بھی کئے دے رہا تھا۔

پہلی بار اس نے خود کو بہت بے وقار، کمزور اور تنہا محسوس کیا اور پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ اب تک شادی نہ کر کے اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ نعیم سے اس کی شادی ہوگئی ہوتی تو اس وقت وہ اس کی سب سے بڑی قوت ثابت ہوتا۔ صرف اس کے لیے نہیں بلکہ شاید اس کی پوری فیملی کے لیے ڈھال بن جاتا۔ خاندان کے جن بااثر لوگوں کی مدد حاصل کرنے سے اس وقت مسز ظہیر پہلو تہی کر رہی تھیں وہ اس کے دکھ سکھ کا ساتھی، اس کا رفیق زندگی ہونے کے ناتے ان میں سے ایک ایک کا درکھنا تھا..... اس پر بغیر کوئی احسان جتائے..... بغیر شرمندہ کئے۔ اس کا جی بھر آیا۔

ایسی افتاد اور اتنی بے دست و پائی!

تنہائی کا عالم یہ کہ مسز ظہیر بھی جتنہیں وہ آنکھ بند کر کے اپنی دوست اپنی محسنہ تسلیم کرتی تھی ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ شاید وہ بھی ایسا کرنے پر مجبور تھیں!

”اچھا! میں چلتی ہوں۔“ وہ انتہائی یاسیت کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی ”والدہ کو پتا نہ چلے کہ میں یہاں آئی تھی۔“ اس نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا۔

”کیوں؟“

”میں..... ان سے یہ بہانہ کر کے گھر سے نکلی ہوں کہ ڈائریکٹریٹ والوں نے بلایا ہے۔“

”تم ہماری بات کا برا مت منانا۔ اپنے گھر کی عزت ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ تم ہماری بات کا مطلب سمجھ رہی ہونا!“

”جی!“ اسے یوں لگا جیسے اس کے حلق میں درد کا کوئی گولہ آن پھنسا تھا۔

”میں نے کا ہی خیال کر لیتیں بیسہ۔“ مسز ظہیر کے لہجے میں گلہ تھا۔

”اس بے چاری کو کیا معلوم تھا..... منا کیسا ہے؟“

”ٹھیک ہے، اسکول سے ان کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔“

”میں چلتی ہوں..... دعا کیجئے گا۔“

”دعا ہی کر سکتے ہیں۔“

وہ بوجھل دل اور مرے مرے قدموں سے مسز ظہیر کے گھر سے نکل آئی۔ باہر ہر سو وہی شور وہی رونق تھیں مگر اس کا دل بہت چپ بہت اداس تھا!

نہ جانے کتنی دیر اور کتنی دور تک وہ پیدل چلتی چلی گئی۔ گھر جانے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ مٹی اور ثروت کا سامنا کرنے کا یا رانہ تھا۔ علیب کے بارے میں طرح طرح کے وابستہ ستارے تھے۔ بیسہ کی پریشانی کا خیال دل کو مٹھی میں دبوچے لے رہا تھا۔ ڈیڈی سے اسے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس شخص نے کتنے دکھ کتنا نقصان پہنچایا تھا اسے اس کی ماں اور ماں جاییوں کو! اور اب آخر میں اتنی بڑی ذلت اس کا رواں رواں سکھنے لگا۔

جی چاہ رہا تھا کوئی گوشہ مل جائے تو اس میں منہ دبا کر دل کا سارا درد آنکھوں کے راستے بہا نکالے۔

پریشان خیالی میں گم اور دل گرفتہ وہ ایک پہلک پارک تک آ پہنچی۔ جی چاہا وہیں بیٹھ جائے کبھی نہ اٹھنے کے

لیے۔ مگر پارک کے نزدیک ہی ایک پی سی او بھی دکھائی دیا۔ وہ ٹھنک گئی اور چند ٹاپے مذہب سی کھڑی رہی پھر اس نے اپنی قسمت اور نعیم کو ایک ساتھ آزمانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

اس نے نعیم کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔

”میں..... میں منتہا بات کر رہی ہوں۔“ کال ریسیو کئے جانے پر اس نے کہا۔

”خیریت!“ اس کے لہجے میں چونکنے کے ساتھ تشویش کی کیفیت بھی تھی۔

”جی نہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا مطلب؟“

”خیریت نہیں ہے۔“

”کیا ہوا؟“

”فون پر نہیں بتا سکتی۔“

”تو پھر؟“

”کہیں باہر مل سکتے ہیں آپ مجھ سے؟“

”کہاں؟“

”جہاں آپ کہیں۔“

”آپ گھر پر ہیں؟“

”جی نہیں۔“

”تو پھر؟“

منتہا نے آہستگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”آپ پی سی او کے باہر میرا انتظار کیجئے میں آ رہا ہوں۔“

منتہا کو یہ کونہ سلی ہوئی۔

بمشکل پندرہ منٹ میں وہ وہاں پہنچ گیا۔ منتہا کے نزدیک گاڑی روک کر اس نے اگلا دروازہ داکر دیا۔ وہ فرنٹ

سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”خیریت تو ہے اس قدر رُسرار انداز میں اس ملاقات کی وجہ؟“

”گاڑی ذرا آگے لے چلیں وہ پی سی او لاشیٹے میں سے اسی طرف دیکھ رہا ہے۔“

”کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”پی سی او کے دروازے کی طرف دیکھئے۔“

”کمال کرتی ہیں پر پبل صلاحہ اگر وہ دیکھ بھی رہا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے ہم ٹین ایجرز تو نہیں۔“

”مگر میں عورت تو ہوں نا جو قطع نظر عمر کے کمزور ہوتی ہے اور محتاط بھی۔“

”یہ آپ کہہ رہی ہیں!“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا ”آپ تو بہت مضبوط اور حوصلہ مند ہیں۔“

”آپ سے کس نے کہہ دیا۔“

”پھوپھی جان سے سنا ہے۔“

اس کا جی بھر آیا۔ کیسے بتائی اسے کہ آج اس کی پھوپھی جان کے ہاں جا کر وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

”بعض سنی سنائی باتیں سچ نہیں ہوتیں۔“



”اچھا! یعنی آپ اپنے بہادر ہونے کی نفی کر رہی ہیں۔“  
 ”ہاں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔  
 اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ گاڑی کے اندر باہر مناظر دھندلا سے گئے۔  
 ”ادھر میری طرف دیکھئے۔“

منتہا نے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نعیم نے اپنا ہاتھ اسٹیرنگ ویل پر سے اٹھا کر اس کے شانے پر رکھ دیا، منتہا کے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے چونک کر نعیم کو دیکھا۔  
 ”سوری!“ نعیم کو جیسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے منتہا کے شانے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔  
 پی سی اودالانو جوان اب اپنے کسٹمرز کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ مگر نعیم پھر بھی گاڑی آگے بڑھالے گیا۔ منتہا کو مزید انتظار کا یار نہ تھا۔ اس نے نعیم کے دوبارہ پوچھے بنا از خود ہی اسے میہ اور علیب پر آپڑنے والی افتاد کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ ساری بات سننے کے بعد بولا۔  
 منتہا نے چونک کر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا ”کیسے؟“  
 ”یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔“

”پھر بھی کچھ پتا تو چلے۔ آپ نے خاندان میں کسی سے مدد کے لیے کہا سنا اور میہ کی سرال میں بات پہنچی تو پراہلم ہو جائے گی۔“  
 ”آپ فکر نہ کریں۔ فیملی میں کسی سے کہنا سنا ہو تو ایک نہیں کئی با اثر لوگ ہیں مگر میہ بھابی کی وجہ سے میں خود بھی خاندان میں کسی سے کچھ نہیں کہنا چاہوں گا اور بہت سے لوگ ہیں جن سے مدد لی جاسکتی ہے۔ سب سے پہلے تو مجھے حالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے لاہور جانا پڑے گا۔“  
 منتہا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”آپ کی امی جان اجازت دیں گی؟“  
 ”اصل بات نہیں بتاؤں گا۔“  
 ”تو پھر کیا کہیں گے؟“

”کہوں گا اپنے ہونے والے سر صاحب کی عیادت کو جا رہا ہوں۔“  
 ”خدا نخواستہ آپ بھی کسی مشکل میں نہ گھر جائیں۔“  
 ”اب اتنا بھی اندھیر نہیں ہے۔ البتہ ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ مجھے دیکھ کر میہ بھابی کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔“

”ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ اب اس کی ناراضگی کی نہیں علیب کی فکر کرنی ہے، آپ نہیں جانتے علیب سے ہم سب کو کتنا پیار ہے۔ اس میں ہماری جان ہے۔ علیب ہے تو ہم ہیں خدا نخواستہ علیب نہیں تو ہم بھی نہیں۔“ وہ انتہائی جذباتی ہو کر بولی۔

”بہت خوش قسمت ہے علیب۔“ نعیم نے رشک آمیز لہجے میں کہا۔  
 ”لاہور..... کب..... جائیں گے آپ؟“ منتہا نے قدرے اچکچاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ابھی اکٹھے نہ نکل لیں۔“ نعیم کو مذاق سوچا۔  
 ”آپ کو مذاق سوچ رہا ہے میری جان پر بنی ہوئی ہے۔“  
 ”میں آپ کو ریلویکسڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”جب تک علیب گھر نہیں آجاتے میں ریلیکسڈ نہیں ہو سکتی۔“

”اتنی محبت ہے آپ کو علیب سے۔“

”میں نے کہا نا علیب کے بغیر جینے کا تصور ہی نہیں ہے میرے نزدیک۔“ نعیم نے ایک گہری سانس کھینچی۔

”ہر بھائی کو آپ جیسی ایک بہن ضرور ملنی چاہیے اللہ میاں کے ہاں سے۔“

”دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ کو گھر چھوڑ دوں؟“

”نہیں، مجھے بس آپ مین روڈ تک چھوڑ دیں میں چلی جاؤں گی۔“

”میں انشاء اللہ آج ہی لاہور کے لیے نکلتا ہوں۔ مجھے یہ تو بتائیں ڈیڈی ہیں کس ہاسپٹل میں اور علیب کے

بارے میں بھی یہ تو بتائیں کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔“

”مجھے صرف ہاسپٹل کا پتا ہے علیب کی دیر اباؤلس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ میہ سے معلوم کر کے بتا سکوں گی۔“

”لیجئے۔“ نعیم نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا ”معلوم کریں۔“

”ہاسپٹل کا نمبر اس وقت نہیں ہے میرے پاس گھر پر ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔“

”اوکے..... آپ گھر جا کر فون کریں میہ بھائی کو۔ میں جانے سے پہلے آپ سے معلوم کر لوں گا۔“

”مئی کو بتا کر چائے گا۔“

”جی ضرور۔“

☆☆☆

ملوثاتین دن تک چھٹی پر رہنے کے بعد اسکول آئی تھی۔ حالانکہ دل تو اس کا اب بھی نہ چاہ رہا تھا اسکول آنے کو مگر مجبوری تھی۔ پیشہ ورانہ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا دل اسکول سے اچاٹ رہا تھا۔ اگرچہ اس نے تینوں دن ہر روز خواہ پانچ منٹ ہی کو سہی فون کر کے اسکول کے معاملات کی خبر رکھی تھی۔ غزالہ اور تاج محمد کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ نجی وجوہ کی بنا پر وہ اسکول نہیں آ رہی تھی مگر اس کے باوجود چوتھے دن اسکول پہنچنے پر فردا فردا ہر ایک نے اس سے ایک ہی سوال کیا ”میڈم! خیریت تو تھی۔“

”جی ہاں..... بس کچھ کام تھا۔“ وہ خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے ہر ایک کو یہی جواب دیتی رہی۔

دل بہت مضطرب تھا۔

اگرچہ نعیم لاہور چلا گیا تھا مگر پھر بھی اس کے دل سے بے قراری رفع نہ ہو پائی تھی۔ بار بار سینے میں ہوک سی اٹھتی اور یہ خیال دل کو تڑپا دیتا کہ علیب پر نہ جائے کیا بیت رہی ہوگی۔ یوں تو میہ بھی مبتلائے مصیبت تھی مگر علیب کی طرح زیر عتاب نہ تھی۔

نعیم لاہور پہنچا ہوا تھا اور پولیس سے علیب کے چھٹکارے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ اس نے دو تین بار فون کر کے اطمینان دلایا تھا کہ علیب پر انشاء اللہ آج نہیں آئے گی۔

علیب سے رابطہ منقطع ہونے کے باعث ملوثات کومی اور ثروت کو بھی اس پریشانی سے آگاہ کرنا پڑا تھا مئی کا برا حال تھا ثروت اور اس کے میکے والے الگ پریشان تھے۔ بیٹھے بٹھائے عجیب مصیبت سر آ پڑی تھی۔

گوا اسکول اب تک ملوثات کے لیے ایک مقام خود فراموشی رہا تھا جہاں پہنچ کر وہ اپنی ذات اور ذاتی مسائل کو بھول ہی جاتی تھی مگر اس روز اس کا دھیان بارہا علیب اور میہ کی طرف جاتا رہا۔ وقفے تک اس نے فون پر تین چار مرتبہ مئی اور ثروت سے بات کی۔ ثروت نے بتا دیا دس بجے کی گاڑی سے اس کے والد اور بھائی لاہور روانہ ہو گئے تھے۔

ڈائریکٹر ٹیٹ سے ڈاک آئی تو مرے پر سوڈرے کے مصداق ایک اور پریشان کن خبر موصول ہوئی۔



ڈائریکٹریٹ نے ترقی پا کر بیرون شہر تبادلہ کئے جانے والے بعض پرنسپلز اور وائس پرنسپلز کی اس قسم کی درخواستوں پر کہ وہ نئے مقامات تعیناتی پر ڈیوٹی جوائن کرنے کے لیے کچھ مہلت چاہتے تھے مہلت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں وہ خود بھی شامل تھی۔

اس خبر نے اسے مزید پریشان کر دیا۔  
ذرا سی دیر میں یہ خبر آگ کی طرح اسکول میں پھیل گئی اور اسٹاف ممبرز یکے بعد دیگرے پر سادیے کے سے انداز میں اس کے پاس آنے لگیں۔

”میڈم! کیا یہ خبر سچ ہے؟“

”سنا ہے میڈم.....“

”میڈم یہ تو بہت برا ہوا۔“

”کیا آپ چلی جائیں گی میڈم؟“

وہ سختی رہی اپنی پریشانی کو دبائے بڑے تحمل سے جواب دیتی رہی۔  
”جی ہاں۔“

”آپ نے ٹھیک سنا۔“

”ٹرانسفر پوسٹنگ تو جاب کا حصہ ہوتے ہیں۔“

”جی..... اگر پروموشن لی تو جانا ہی پڑے گا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ نہیں بھی جاسکتیں؟“

”جی ہاں اگر پروموشن فور گو کیا تو رک بھی سکتی ہوں۔“

”مت جائیے میڈم۔“ یہی خواہوں نے کہا۔

”دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

اس روز اسکول سے گھر واپسی پر ذہن بہت گھجک ہو رہا تھا۔ ایک طرف علیب اور بیہ کی فکر دوسری طرف جوائننگ کی فکر! گھر پہنچی تو خاموشی اور یاسیت کا سماں تھا۔ می اور ثروت دونوں بیٹھی تھیں۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ کیا ملا تھا می کو زندگی میں! شوہر کے بے وفائی۔ تین بچوں کو ان کی منزلوں سے ہمکنار کرنے کی صعوبتیں۔ جوان بیٹی کی بیوگی کا صدمہ اور اب.....!

☆☆☆

شام کو نفعہ کا فون آیا۔ پروموشن کی مبارکباد دہ پہلے ہی دے چکی تھی اب تازہ ترین خبر پر اظہارِ افسوس و تشویش کے لیے فون کیا تھا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”ہمارے اپنے وائس پرنسپل بھی تو اسی لسٹ میں شامل ہیں نا۔“

”ہاں ہاں، وہ بھی ہیں۔“

”تم کب جا رہی ہو؟“

”کچھ پتا نہیں فی الحال تو دوسری پریشانی میں ہوں۔“

”کیا ہوا؟“

”نتیجہ نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔  
”کم از کم دوستوں کو تو اس قابل سمجھنا چاہیے کہ انہیں اپنے دکھ سکھ سے آگاہ کر دیا جائے۔“ نفعہ نے سب کچھ

سننے کے بعد شامی لہجے میں کہا ”میں اگر خود فون نہ کرتی تو شاید تم تو مجھے نہ بتاتیں۔“

منجبتا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”خیر اچھا ہوا جو ہمارا رابطہ ہو گیا۔ بھائی آج کل لاہور ہی میں پوسٹڈ ہے اور اس کے وہاں بہت کالمیکس ہیں میں اس سے بات کرتی ہوں۔“ فضلہ نے کہا۔

”ضرور کرو فضلہ بلکہ ہو سکے تو ابھی..... ہم سب بہت پریشان ہیں۔“

”گھبراؤ مت، میں ابھی بھائی سے بات کرتی ہوں۔“

”تھینک یو دیری مچ۔“

اس نے می کو بتایا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ”پریشانی اپنی جگہ مگر یہ کتنا بڑا احسان ہے اللہ کا کہ نعم بھی موجود تھے ان دنوں یہاں جو فوراً میرے بچوں کی خبر لینے وہاں جا پہنچے اور اب اللہ نے یہ نیا وسیلہ نکال دیا۔“

کچھ ہی دیر بعد فضلہ کا دوبارہ فون آ گیا۔ اس نے اپنے بھائی سے بات کر لی تھی۔

”منجبتا بھائی سے میرا رابطہ ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے شہر کی آدھی افسر برادری اس کی واقف ہے علیب کو بغیر کسی نقصان کے نکال لائے گا وہ۔ ہاں اسے یہ بتانا ہے کہ علیب کو رکھا کہاں گیا ہے؟“

”میں تمہیں نعم کا موبائل نمبر دیتی ہوں یا تم مجھے بھائی کا نمبر دے دو تو نعم خود ان سے رابطہ کر لیں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

فضلہ نے اسے اپنے بھائی کے گھر دفتر اور موبائل فون نمبرز نوٹ کروا دیئے۔

☆☆☆

”دادو ماما کب آئیں گی؟“ منے نے دادی سے پوچھا۔

”آج آئیں گی بیٹا۔“

”کب؟“ وہ ٹھنک کر بولا۔

”جب تمہارے نانا ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔“ منظر ظہیر نے کن آنکھوں سے ظہیر صاحب کی طرف دیکھنے کی کوشش کی جو نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

”ادھر آئیے آپ ہمارے پاس۔“ ظہیر صاحب نے منے کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور اسے اپنے زانو پر بٹھا کر پیار کرتے ہوئے بولے ”یار تمہیں اپنے دادا کے ہوتے ماما کو یاد کرنے کی کیا ضرورت بھلا!“

منجبتا رہا۔

”یہ بتاؤ ماما زیادہ اچھی لگتی ہیں یا دادا؟“

”کیوں ایسا سوال کرتے ہیں بچے سے جو اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دے۔“ منظر ظہیر بولیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ظہیر صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”بچے محبت اور نفرت کے معاملے میں ہم بڑوں سے زیادہ سچے ہوتے ہیں۔ اپنی ماں سے زیادہ محبت کسی اور سے کر سکتا ہے بچہ؟“

”کیوں نہیں کر سکتا ہمارا منا ہم سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ کیوں یار بتاؤ نانا دادا زیادہ اچھے ہیں یا ماما.....“

”بتاؤ جلدی بتاؤ در نہ ہم تمہیں گد گدائیں گے۔“

”پاپا!“ منے نے کہا۔

ظہیر صاحب اور منظر ظہیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔



”پاپا کیوں نہیں آتے؟“  
 ظہیر صاحب اور مسز ظہیر نے ایک دوسرے سے نظریں چرا لیں۔  
 ”بتائیں نا دادا پاپا کیوں نہیں آتے؟“ منے نے ظہیر صاحب کا بازو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔  
 ”آئیں گے بیٹا۔“  
 ”کب؟“

”جب ان کا کام ختم ہو جائے گا جب انہیں اپنے آفس سے چھٹی ملے گی۔“  
 ”فون بھی تو نہیں کرتے۔“

”بیٹا چیزیں تو بکھواتے ہیں نا آپ کے لیے۔“  
 ”مجھے چیزیں نہیں چاہیں پاپا آئیں گے تو میں ان کے ساتھ گاڑی میں اسکول جایا کروں گا میرے پاپا گاڑی  
 اے چلائیں گے زن..... ہیں..... ہیں۔“ منا ظہیر صاحب کی گود سے اٹھا اور اپنے ننھے ننھے بازوؤں کو گاڑی کے  
 اسٹیرنگ ویل پر حرکت دینے کے انداز میں دائیں بائیں گھماتا منہ سے آوازیں نکالتا بھاگ گیا۔  
 ”بچہ سمجھدار ہو رہا ہے۔ باپ کی ضرورت محسوس کرنے لگا ہے۔“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”عدنان کی بات میں نے اسی لیے تو کی تھی مگر وہ آپ کی بہو صاحب خدا جانے کیا سمجھتی ہیں خود کو۔“  
 ”عدنان کو وہ چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتی ہیں۔“  
 ”بہانہ ہے۔“

”جی نہیں، حقیقت ہے۔“  
 ”حقیقت یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کہ بہو صاحب اسی ڈاکٹر پیام کے چکر میں ہیں۔“  
 ”جی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر پیام کا خیال تو وہ رد کر چکیں۔“  
 ”غلط فہمی ہے تمہاری۔“

”میری خود بات ہوئی بیہ سے۔“  
 ظہیر صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا ”کب؟“  
 ”انہی دنوں..... غالباً منے کے مسئلے پر دونوں میں کچھ ان بن ہو گئی۔“  
 ”اچھا! یہ تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا۔“  
 ”آپ جذباتی ہی اس قدر ہو جاتے ہیں کہ دوسرا آدمی آپ سے بات کرنے میں احتیاط کرتا ہے۔“  
 ”اچھا تو پھر اگر یہ بات ہے تو عدنان سے بہو صاحب کی شادی ہو جانی چاہیے۔“ ظہیر صاحب خوش دکھائی  
 دینے لگے۔

”بیہ اس کے لیے بھی صاف انکار کر چکی ہیں۔“  
 ”تو گویا ان کے نکاح ثانی کا چیپٹر کلوز ہو چکا۔“ ظہیر صاحب مطمئن سے ہو کر بولے۔  
 ”جی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“  
 ”اخبار میں ایک اشتہار پڑھا تھا ہم نے کوئی لڑکا ہے۔ دہی میں ملازمت کرتا ہے پہلی بیوی سے علیحدگی ہو چکی  
 ہے۔ مطلقہ بیویہ سے بھی رشتہ ہونا ممکن ہے ایک دو بچے بھی قابل قبول ہوں گے۔ ہم نے اسے بیہ کے کوائف لکھ  
 بیجے ہیں۔“ ظہیر صاحب کا رد عمل دیکھنے کو مسز ظہیر نے اخبار میں اشتہار چھپنے سے پہلے ہی قصہ چھیڑ دیا۔  
 ”پاکل ہوئی ہو۔“ ظہیر صاحب نے جھجک کر کہا۔

”وہ تو ہم ہمیشہ سے ہیں ورنہ آپ کے ساتھ گزارا کیسے کر لیتے۔“ مسز ظہیر دھیرے سے مسکرائیں۔  
 ظہیر صاحب انہیں خشونت سے دیکھا کئے۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے پھڑکنے لگے۔  
 ”بیٹے بیٹیوں کے لیے سب رشتے تلاش کرتے ہیں۔ بہودوں کے لیے کوئی صحیح الدماغ آدمی رشتے نہیں تلاش کرتا۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر..... بہو بھی تو کسی کی بیٹی ہوتی ہے جو سانحہ میہ کے ساتھ ہوا خدا نخواستہ وہ اگر ہماری کسی بیٹی کو پیش آتا تو کیا ہم اس کا گھر دوبارہ آباد کرنے کی فکر نہ کرتے۔“ یہ بات مسز ظہیر نعیم سے بھی کہہ چکی تھیں۔  
 ظہیر صاحب نے انہیں گھورا اور ایک ہیجانی سی کیفیت میں ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے ان کی طرف سے رخ پھیر کر بیٹھ گئے اور اپنا دایاں پاؤں اضطرابی کیفیت میں ہلانے لگے۔  
 مسز ظہیر چند ٹائیے چپ چاپ بیٹھی ان کی حرکات و سکنات دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ان کا بازو آہستگی سے پکڑتے ہوئے بولیں ”اس کا رخ میں ہمیں آپ کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔“  
 ظہیر صاحب نے ان کی طرف دیکھے بغیر ان کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔

”پلیز!“ مسز ظہیر گڑ گڑائیں۔

ظہیر صاحب نے گردن موڑ کر انہیں گھورا ”میرا دماغ خراب نہیں ہے سمجھیں!“

”اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات؟“

”لوگ نہیں گے بڑھے بڑھیا۔ کو دیکھو بہو کی شادی کر دار ہے ہیں۔“

”ایک مثال تو سیٹ ہو جائے گی۔“

”مجھے شوق نہیں ہے ایسی احمقانہ مثالیں سیٹ کرنے کا۔“

”ہمیں تو اجازت ہے؟“

ظہیر صاحب نے انہیں پھر گھورا۔

”جو کام جلد یا بدیر ہمارے نہ چاہے بغیر بھی ہوتا ہے اگر وہ کارِ خیر ہے تو کیوں نہ ہم خود ہی آگے بڑھ کر بسم اللہ

کر دیں۔“

”منا کہیں نہیں جائے گا۔“

”اگر یہ سلسلہ طے ہو جاتا ہے تو ہم خود وہاں چلیں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ظہیر صاحب نے تیوری پر تل ڈالتے ہوئے کہا۔

مسز ظہیر دھیرے سے مسکرا دیں ”ایک تو ہم آپ کو مطلب سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے۔ لیکن اور فہم دینی میں ہیں

اگر میہ کا بھی وہیں کچھ سلسلہ بن جاتا ہے تو ہم دونوں بھی عدنان کی شادی کر کے وہیں جا کر رہیں گے۔ سنا ہے دینی اتنا

خوبصورت ہو گیا ہے کہ بالکل یورپ کی طرح لگتا ہے۔ فرحان کی یہی خواہش تھی نا کہ میہ اور منادینی میں ان کے

ساتھ رہیں۔ شاید خدا کو یہی منظور ہو کہ فرحان کے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ۔“

”عجیب عورت ہوا“ ظہیر صاحب بڑبڑائے۔

”ہم نہ میہ کو مقید رکھنا چاہتے ہیں نہ خود بندھے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اس گھر سے جائیں تو عدنان کی شادی

کر کے ہم بھی آزاد ہوں۔ جہاں مرضی آئے جائیں آئیں گھومیں پھریں۔ زندگی کی انجوائے کریں۔“

ظہیر صاحب اچانک منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنس پڑے۔ مسز ظہیر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اس عمر میں زندگی انجوائے کرنا چاہتی ہیں یہ بڑی بی!“ ظہیر صاحب نے بیگم کو مضحکہ اڑانے والی نگاہوں سے

دیکھا۔



”عمر کا طعنہ کیا دیتے ہیں ارے بھئی، اصل میں تو یہی عمر ہوتی ہے زندگی سے لطف اندوز ہونے کی جب آدمی ساری ذلت دار یوں سے فراغت کے بعد اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتا ہے۔“ مسز ظہیر نے دزیدہ نگہی سے ظہیر صاحب کو دیکھا اور بظاہر بڑے اکتائے ہوئے انداز میں بولیں ”نہیں صاحب ہم اپنی باقی زندگی میسہ اور بہو کے ساتھ بندھے رہ کر ضائع نہیں کرنا چاہتے۔“

ظہیر صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ٹانگ پر سے ٹانگ اتارتے ہوئے سیدھے ہو بیٹھے ”کیا! کیا کہا تم نے!“

”ہمیں جو کہنا تھا ہم کہہ چکے۔“ مسز ظہیر نے بڑی بے پروائی سے کہا ”آپ کو شوق ہے تو آپ بندھے بیٹھے رہیں گے اپنی بہو صاحب اور پوتے کے ساتھ ہم تو عدنان کی شادی کر کے سیر سیاحت پر نکل لیں گے۔“

”اس..... اس عمر میں دھوکا دو گی!“ ظہیر صاحب کے لہجے میں گلہ تھا۔

”تو پھر تیاری کر لیجئے آپ بھی۔“ مسز ظہیر زیر لب مسکرائیں۔

☆☆☆

نفسہ کا فون آ جانا ایک غیبی مدد ہی ثابت ہوا۔ کچھ اس کے بھائی کے تعلقات کچھ نعیم کی دوڑ دھوپ نے بالآخر علیب کی اس ناگہانی پریشانی سے جان چھڑادی۔ میسہ کی نقل و حرکت پر عائد پابندی بھی اٹھائی گئی۔ انیلی جنس الہکاروں



**حسن رہا جو چھپائے نہ چھپے!**

**سیرے نسوانی حسن کا راز**

**بلو سیم**

برسٹ ڈیونانی کریم

تقریباً 150/-

تو یہ تو ہے کہ اس نے اس کے گھر سے اس کے گھر کے دروازے کے

یہ تو ہے کہ اس نے اس کے گھر سے اس کے گھر کے دروازے کے

یہ تو ہے کہ اس نے اس کے گھر سے اس کے گھر کے دروازے کے

اسٹاک:		
1. فوہا سٹاک	2. فوہا سٹاک	3. فوہا سٹاک
4. فوہا سٹاک	5. فوہا سٹاک	6. فوہا سٹاک
7. فوہا سٹاک	8. فوہا سٹاک	9. فوہا سٹاک
10. فوہا سٹاک	11. فوہا سٹاک	12. فوہا سٹاک
13. فوہا سٹاک	14. فوہا سٹاک	15. فوہا سٹاک
16. فوہا سٹاک	17. فوہا سٹاک	18. فوہا سٹاک
19. فوہا سٹاک	20. فوہا سٹاک	21. فوہا سٹاک
22. فوہا سٹاک	23. فوہا سٹاک	24. فوہا سٹاک
25. فوہا سٹاک	26. فوہا سٹاک	27. فوہا سٹاک
28. فوہا سٹاک	29. فوہا سٹاک	30. فوہا سٹاک

بادشاہ دی ہٹی ڈھوک کھبہ راولپنڈی۔ مشورہ مفت 5502903

مقیم الدین برادرزہ کی گلی نمبر 150 ہال کراچی۔ فون: 2433682 □ ریاض محمود 69 نیو عالمگیر مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون: 7666264

باب الاشفاء و دواخانہ اندرون بخاری مارکیٹ گھنڈہ گھرمٹان۔ فون: 574058 □ شاہی بلدی روٹ لائن بوہڑ بازار راولپنڈی۔ فون: 5505519

گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی پارسل منگوانے کے لئے

حکیم اینڈ سنز۔ پوسٹ بکس 2159، کراچی۔ 74600 پاکستان۔

سے نفعہ کے بھائی کی واقفیت کی بنا پر ڈیڈی کو بھی لاہور سے جانے کی اجازت مل گئی۔ پولیس خود بھی جانتی تھی کہ یہ سیدھا سادہ ڈکیتی کا کیس تھا جس میں وارداتیں دو انسانی جانوں کی بھیبت بھی لے گئے تھے۔ مگر کیس کو کیش کرنے کے لیے پولیس حسب روایت غیر معمولی ”ایفی شنسی“ دکھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر جب اوپر سے ہاتھ آیا تو ساری ایفی شنسی چھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ڈیڈی کی دوسری بیوی کے جن رشتے داروں نے بے گناہوں بلکہ مظلوموں کو اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی وہ بالآخر محفوظ و مامون ٹھہرے۔ پولیس نے ڈیڈی کے ملازم کو از سر نو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔

پیٹ میں گولی کے زخم کے باعث ڈیڈی بیٹھ کر سفر کرنے کے لائق نہ تھے چنانچہ ان کا سفر بذریعہ ایمبولنس قرار پایا۔ اس ایمبولنس میں ان کے ساتھ سفر کرنے والوں میں میہ اور علیب کے ساتھ نعیم بھی شامل تھا۔

ثروت کے والد کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تھی لہذا وہ بیٹے کے ساتھ بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو گئے تھے۔ نعیم جب پہلی بار ہسپتال آیا تو اسے دیکھ کر میہ نہ صرف چونکی تھی بلکہ اس نے اپنے تاثرات سے ناگواری کا اظہار بھی کیا تھا مگر نعیم کی محمل مزاجی اور اس افتاد سے نجات کے لیے اس کی مسلسل دوا دھوپ نے بالآخر اسے سپر ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گواہ بھی نعیم سے اس کے روادارانہ تعلقات تو استوار نہ ہوئے تھے مگر یہ بھی بہت تھا کہ نعیم کی بابت اس کے جارحانہ رویے نے خاموشی دھار لی تھی۔

ایمبولنس میں سفر کے دوران وہ اور علیب عقبی حصے میں ڈیڈی کے ساتھ بیٹھے جبکہ نعیم ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر محو سفر رہا۔

برسوں بعد ڈیڈی کی اپنے بیوی بچوں میں واپسی گویا مردہ احساسات کی حیات نہ تھی۔ علیب اور میہ انہیں قدرے میکانیکی سے انداز میں ہمراہ لے جا رہے تھے۔ نہ کوئی خاص جوش و خروش تھا نہ انہیں لے کر جلد سے جلد پہنچنے کا اشتیاق۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جانتے تھے کہ منہا کے محسوسات بھی ان سے چنداں مختلف نہ ہوں گے۔ می کا عمل بد عمل کیا ہوگا۔ یہ بھی وہ جانتے تھے۔ ڈیڈی جھینپے جھینپے سے تھے۔ اگرچہ علیب اور میہ سے ان کی بات چیت ہو رہی تھی بالخصوص میہ نے تو ہسپتال میں ان کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی اور اب بھی سفر کے دوران وہ ہی ان کی تیماردار کے فرائض انجام دے رہی تھی مگر فریقین کی نگاہیں جب باہم ملتیں تو چغلی کھاتیں کہ دلوں کے مابین طنائوں میں گرہیں موجود تھیں۔ ان گریہوں کو وقت کے ہاتھوں کھلنا تھا۔

لاہور سے روانگی سے قبل ہی یہ طے پا چکا تھا کہ زخم بھرنے تک ڈیڈی کو اسی ہسپتال میں رکھا جائے جہاں میہ ملازمت کر رہی تھی۔ روانگی سے قبل میہ نے اپنے ایم ایس سے بات کر کے ڈیڈی کے لیے کمرے کا بندوبست کروا دیا تھا۔

ایمبولنس ہسپتال پہنچی تو می ثروت اس کے میکے کے چند افراد اور مسز ظہیر ہسپتال کے احاطے میں موجود تھے حیرت انگیز امر یہ تھا کہ ڈیڈی کو اسٹریچر پر ایمبولنس سے اتارنے والوں میں نعیم کو پیش پیش پا کر بھی میہ کی تیوری پر پل نہ تھے۔

یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔

شاید ہر حادثہ اسی طرح ایک نئے امکان کی بنیاد بنتا ہے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں پوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبہی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بہنور میں پھنس گیا تھا۔

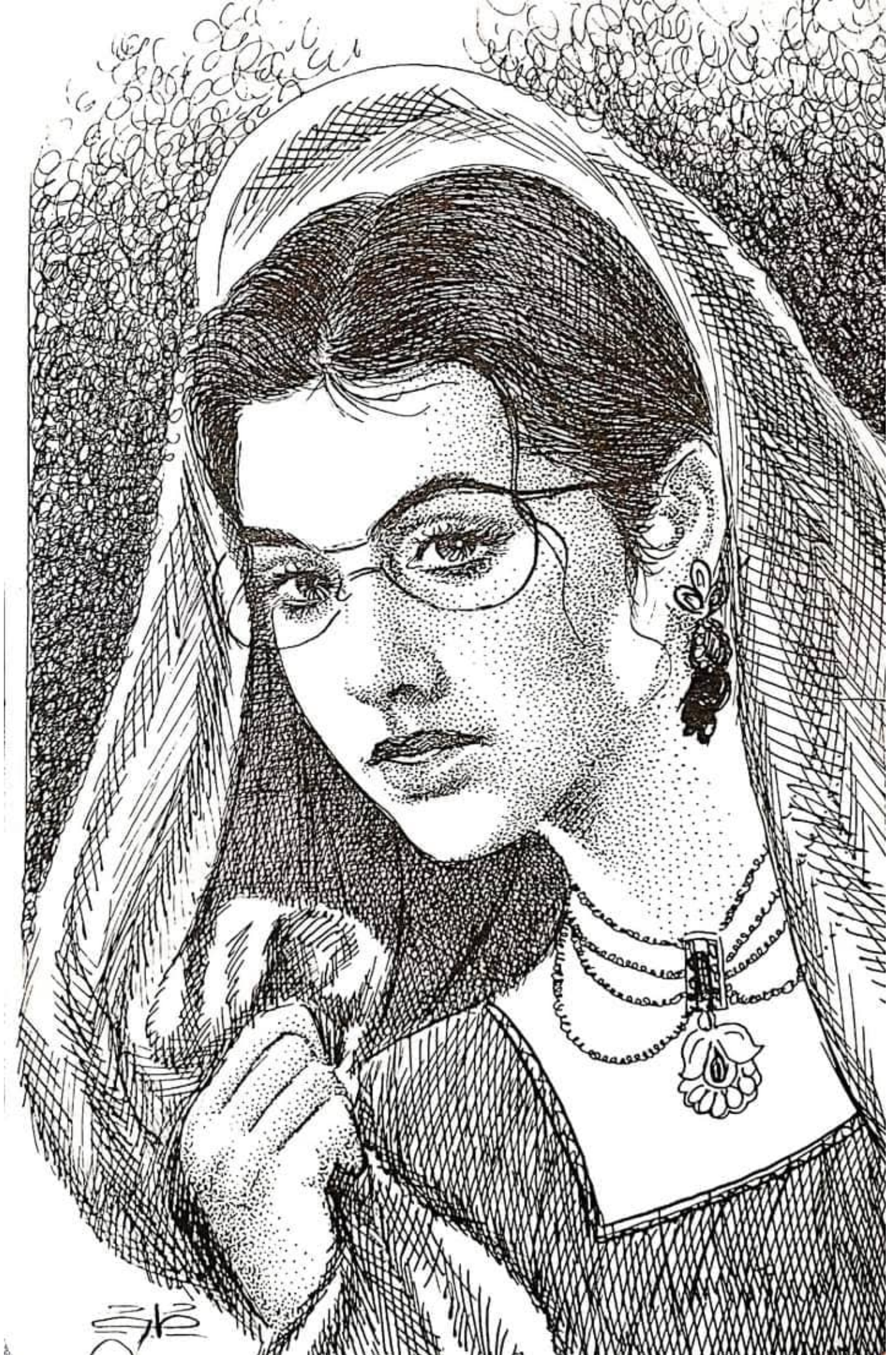
**محببتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے شتوں کے چانک سار ہونے کی دل گداز داستان**

**منتہا**

**ناہید سلطانہ اختر**









پریشانی رفع ہونے اور دوبارہ اپنوں کے درمیان پہنچنے کے بعد حواس ٹھکانے آتے ہی نعیم کی بابت میہ کے تئور پھر بدل گئے۔

”بائی دی دے یہ صاحب وہاں کیسے پہنچ گئے؟“ اس نے منتہا سے پوچھا۔  
”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے انہیں کس نے خبر دی؟“

”ہم نے اور کس نے۔“

”کیوں؟ کیا ضرورت تھی؟“

”فارگا ڈزیک میہ اب تو دل صاف کر لو تم اپنا بے چارے کی طرف سے۔“

”بے چارے! آپ اس شخص کو بے چارہ کہتی ہیں۔“

منتہا نے نعیم کے لیے میہ کے سامنے ڈٹ جانے کا یہ بہترین موقع گنانا مناسب نہ جانا ”ہاں“ اس نے دونوں لہجے میں کہا ”تم اور تمہارے سسرال والے تو نعیم کی طرف سے خواہ مخواہ اپنے دل میں گرہیں ڈال کر بیٹھ گئے ہیں۔“  
میہ نے چونک کر منتہا کو دیکھا، اسے منتہا کی جانب سے اس قسم کے رد عمل کی قطعاً توقع نہ تھی۔

”ہونی کو کون روک سکتا ہے بھلا۔ ڈیڈی کی دوسری بیگم صاحبہ کا یہ انجام ہو گا کس کو پتا تھا مگر ہونی ہو کر رہی نہ صرف اُن کے ساتھ بلکہ ان کے بچے کے ساتھ بھی جو بے چارہ بالکل ہی بے قصور تھا۔ حادثے یونہی ہوتے ہیں۔ فرحان کی قسمت میں بھی موت ایک حادثے کی صورت میں لکھی تھی۔ نعیم کا کیا دوش، انہیں کوئی فرحان سے دشمنی تو نہ تھی۔ اس وقت اچانک آپڑنے والی مشکل میں نعیم جس طرح کام آئے ہیں اس پر تو ہم سب کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ وہ بھاگ دوڑ نہ کرتے، کچھ اپنے کچھ دوسروں کے تعلقات کام میں نہ لاتے تو شاید علی بے چارے کی توجان چھوٹی مشکل ہو جاتی۔“

”نعیم نے کیا کیا..... آپ کی فرینڈ فضا کے بھائی کام آئے۔“

”فضا کے بھائی سے پہلے وہاں کون پہنچا تھا!“

میہ چپ رہی۔

”احسان تل برابر بھی ہو تو انسان کو احسان کرنے والے کا شکر گزار ہونا چاہیے..... علی بے چارے پوچھو، وہ کہتا ہے مجھے لاک اپ میں رکھا ہوا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے اب میں وہاں سے کبھی نہیں نکل پاؤں گا۔ شریف لڑکا! اسے پولیس تھانے سے بھی واسطہ پڑا ہوتا تو جانتا۔ وہ کہتا ہے نعیم بھائی جب مجھ سے ملنے کے لیے پہلی بار پولیس اسٹیشن آئے تو میری جان میں جان آئی۔ فضا کے بھائی نے بھی بے شک بہت مدد کی مگر فضا کے بھائی کو صحیح طرح سے پرسیو کرنا نعیم ہی کا کام تھا۔“

”گویا آپ کے دل میں اب بھی جگہ ہے نعیم صاحب کے لیے۔“ میہ نے چپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب بھی کا کیا مطلب! نعیم پہلے اور آخری آدمی ہیں جن کو میں نے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔“ منتہا نے بے باکی سے کہا۔

”ادہ گاڈ!“ میہ نے بے ساختہ شپٹا کر اسے دیکھا۔

منتہا دھیرے سے مسکرا دی اور اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولی ”میری جان! اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ نے تو کہا تھا..... میری خاطر..... آپ..... آپ نعیم کو اپنے دل سے نکال پھینکیں گی۔“

”میرا خیال ہے الفاظ کچھ اور ہوں گے..... خیر جو بھی سہی معہوم شاید یہی ہوگا..... اور کیا کہتی میں اُس وقت.....“

کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا..... تم آپ سیٹ جو بہت تھیں، تمہارے اطمینان کو مجھے ایسی ہی کوئی بات کہنا پڑی ہوگی مگر..... سچ یہ ہے میہ کہ میں نعیم سے بہتر آدمی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ بہت اچھے انسان ہیں۔“

میہ نے اسے شاکی نظروں سے یوں دیکھا جیسے کہتی ہوا تنازعہ مجھے غلط فہمی میں رکھا۔

”میں تم سے اب بھی یہ سب کچھ نہ کہتی میہ اگر ڈیڈی ہماری زندگی میں دوبارہ نہ پلٹ آئے ہوتے۔“ منتہا نے پل بھر کو توقف کیا، پھر قدرے دل گرفتہ لہجے میں بولی ”میہ! می جب کبھی ڈیڈی کو یاد کرنے کی کوشش کرتی تو میں بہت جذباتی ہو جایا کرتی تھی، میرا جی چاہتا می کبھی ان کا نام بھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔ میں سوچتی جس شخص نے میری ماں کو اور ہم بھائی بہنوں کو بھی اتنا دکھی رکھا ہے وہ اس لائق نہیں ہونا چاہیے کہ اسے ہماری والدہ کبھی بھولے سے بھی یاد کریں۔ میں انہیں اپنی فیملی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کا بلا واسطہ یا بالواسطہ ذمے دار گردانتی تھی لیکن بڑی عجیب بات ہے میہ کہ باوجود اس کے کہ ڈیڈی اس وقت خود دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے ہیں مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہمارے لیے کوئی نجات دھندہ آگیا ہے جیسے سارے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ میں بھی سوچا کرتی تھی خدا نخواستہ ڈیڈی سے زندگی میں دوبارہ کبھی سامنا ہو گیا تو میں شاید اتنی ٹینس ہو جاؤں گی کہ میرا دل دماغ سب ساتھ چھوڑ جائیں گے لیکن..... ہوا یہ ہے میہ کہ جب سے ڈیڈی آئے ہیں میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ اب مجھے نہ تمہاری فکر رہی ہے نہ والدہ کی۔ مجھے یوں لگتا ہے تمہاری فکر کرنے کو اور والدہ کا دکھ سکھ بٹانے کو کوئی آگیا ہے۔“

”یعنی..... اب آپ صرف اپنی فکر کرنا چاہتی ہیں۔“ میہ نے پھر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ منتہا کو اس کے لہجے سے تکلیف پہنچی۔

”کیا مجھے اس کا حق نہیں میہ۔“

وہ چپ رہی۔

”بولو۔“ منتہا نے تقاضا کیا۔

میہ نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو!“ منتہا نے بڑی محبت سے کہا۔

”آپ.....“ میہ کی نگاہوں میں شکوہ ڈولنے لگا ”آپ اس شخص کا ساتھ چاہتی ہیں جو فرحان کی موت کا ذمے دار اور میری اور منے کی خوشیوں کا قاتل ہے۔“

”نہیں میہ..... ایسا نہیں ہے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں اس غلط فہمی کو اپنے دل سے دور کرنا ہوگا..... ورنہ شاید.....“

”آپ چپ کیوں ہو گئیں؟“

”تم نے نعیم کی طرف سے اپنا دل صاف نہ کیا تو شاید ہم سب ہمیشہ اسی طرح ناخوش رہیں گے۔“

”آپ ناخوش کیوں رہیں گی! نعیم صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں!“ میہ کے لہجے میں طنز تھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں میہ۔“

”تو پھر دیر کس بات کی!“ میہ جل کر بولی۔

”اب دیر نہ ہو شاید۔“

میہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر نظریں چرائیں۔

منتہا نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے یہ سب کچھ کہنا شاید ضروری نہ ہونے کے باوجود ضروری تھا۔ کبھی کبھی پھوڑے کو سہلانے کی بجائے اسے چیرا لگا کر مواد نکال دینا زیادہ سکون آور ہوتا ہے سو منتہا نے بھی برسوں سے پکتے پھوڑے کو بالآخر چیرا لگا ہی دیا تھا۔



علیب کی گلو خلاصی کے لیے نفعہ کے بھائی کا اثر و رسوخ ایسا کام آیا کہ اصل مجرم بھی پکڑے گئے۔ واردات کا مرکزی مگر پس پردہ کردار گھر کا ملازم نصیر لگا جس نے اپنے دوستوں کی مدد سے ڈکیتی کی واردات کا ڈراما چاکر مالکوں کے مال پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ نصیر نے اقرار جرم کے ساتھ واردات میں شریک دیگر مجرموں کی بھی نشاندہی کردی اور پولیس بہت تھوڑے وقت میں ان تک جا پہنچی۔

ڈیڈی کی دیکھ بھال میں یوں تو مرکزی کردار بیہ ادا کر رہی تھی مگر میمنٹھا اور علیب بھی پیچھے نہ تھے۔ نعیم بھی کافی وقت دے رہا تھا۔ وہ دن میں دو تین مرتبہ ہاسپٹل کا چکر لگاتا اور بیہ کی ناپسندیدگی کے باوجود ڈیڈی کو اٹھانے بٹھانے میں مدد کرتا، ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں بھی کرتا۔

مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ میمنٹھا ان کے کام تو کرتی مگر ان سے قطعاً ہم کلام نہ ہوتی۔ جس دن سے وہ آئے تھے اب تک انہوں نے ایک بار بھی ان سے بات نہ کی تھی بلکہ ان سے نظر تک نہ ملائی تھی۔ نگاہیں جھکائے لبوں پر خوشی کی مہر لگائے وہ ایک شوہر... پرست عورت کی طرح ان کی دیکھ بھال میں اپنا پورا کردار ادا کر رہی تھیں۔ میمنٹھا بیہ اور علیب ان کی مسلسل چپ کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے اور حیران تھے کہ جس شخص کو ان کی ماں نے اس کی بے وفائی اور سنگدلی کے باوجود برسوں بڑی مستقل مزاجی سے اپنی یادوں کے چوکھٹے میں آراستہ رکھا تھا اس کی واپسی پر وہ اس سے اتنی انجان کیوں بنی ہوئی تھیں!

بچ کہا ہے کسی نے عورت ایک معما ہے۔

نعیم کی ڈیڈی کے پاس گاہے گاہے آمد بیہ کو خاصا ”آن ایزی“ کر دیتی مگر ڈیڈی کی خاطر وہ اس کی موجودگی کو چپ چاپ برداشت کرتی۔ نعیم کن انگلیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیے جاتا۔ ایسے موقع پر اگر میمنٹھا بھی موجود ہوتی تو وہ بھی دزدیدہ نظروں سے بیہ کو دیکھ جاتی۔ بیہ نعیم کی موجودگی کے دوران دل ہی دل میں کھولتے ہوئے سوچتی ”ڈیڈی کی صحت یابی کے بعد جب وہ انہیں بتائے گی کہ فرحان کی موت کا ذمے دار نعیم ہے تو وہ بھی یقیناً فرحان کے گھر والوں کی طرح اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا!

ڈیڈی کی ”ریکوری“ کے بعد جب اس نے انہیں فرحان کی حادثاتی موت کا قصہ سنانے کے بعد نعیم سے اپنی نفرت کا اظہار کیا تو وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ”بیٹا میری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ انسان کا چہرہ اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔ نعیم کا چہرہ بتاتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ہے۔“

”چہرے دھوکا بھی تو دے جاتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو مگر جو آدمی غلط ہو وہ کہیں نہ کہیں ضرور پکڑا جاتا ہے۔ چہرے سے نہ سہی الفاظ سے در نہ اعمال سے یا حرکات سے..... کیا اب تک تم لوگوں میں سے کسی نے کہیں پکڑا اُسے؟“

”شاطر آدمی کو کون پکڑ سکتا ہے۔“

”نہیں بیٹا شاطر آدمی کا انداز ہی اور ہوتا ہے۔“

بیہ انہیں شاکی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ڈیڈی نے سر جھکا لیا اور انتہائی مذہذب سے دکھائی دینے لگے جیسے کوئی مشکل بات کہنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ انتہائی گیسر لہجے میں گویا ہوئے ”تم لوگوں سے..... دور جانے کے بعد میں نے..... اتنے بہت سے شاطر چہرے دیکھے ہیں کہ اب مجھے ان کی پہچان ہو گئی ہے۔“

بیہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں بیٹا۔“ وہ انتہائی وثوق سے بولے ”مجھے انسانوں کو پہچاننا آ گیا ہے۔“ یکا یک ان کا لہجہ بدل گیا۔ اس میں

تیزی آگئی ”اور اسی پہچان کے بل بوتے پر میں کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری ماں سے بہتر عورت نہ مجھے مل سکتی تھی نہ ہی مل پائی۔“

بیہہ انہیں ابھی ابھی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”میں ناعاقبت اندیش تھا بیٹا۔ سراب کے پیچھے لپک لیا۔ میں نے بہت زیادتی کی تم لوگوں کے ساتھ تمہاری ماں کے ساتھ..... بہت پچھتایا میں..... بہت مس کیا تم لوگوں کو میں نے..... مگر جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی..... بہت جی چاہتا تھا کہ تم لوگوں سے ملنے کو مگر میں ڈرتا تھا کہ تم لوگ مجھے دھتکار دو گے..... میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ تم لوگوں سے اس طرح ملنا ہوگا..... میں تم سب کو مجرم ہوں بیٹا۔“ ڈیڈی کی آواز بھر رہی تھی۔

بیہہ نے اپنا ہاتھ ڈیڈی کے شانے پر دھر دیا۔

اچانک ڈیڈی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے اور گڑ گڑا کر بولے ”مجھے معاف کر دو تم لوگ..... اپنی ماں سے کہو وہ بھی معاف کر دیں مجھے۔“

بیہہ نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

وقت قاضی القضاۃ ہے بالآخر فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔

☆☆☆

ترقی پانے والے جن صدر مدرسین کو ڈائریکٹریٹ نے ان کے نئے مقامات تعیناتی پر اپنے فرائض منصبی سنبھالنے کے لیے کچھ وقت دینے کی بجائے فوری طور پر نئے مقامات تعیناتی پر رپورٹ کرنے کا حکم نامہ جاری کیا تھا ماسوا ملنگھا کبھی نے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ ترقی کون چھوڑتا ہے بھلا۔ منہا کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ بھی چل پڑتی۔ پروموشن ”فارگو“ کرتے ہوئے اس کا دل بہت دکھ رہا تھا۔ برسوں بعد جا کر تو اگلے گریڈ میں اور عہدے میں بھی ترقی ملی تھی۔ وائس پرنسپل ہوتے ہوئے پرائمری اسکول کی سربراہی اور پرنسپل کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد ہائی اسکول کی سربراہی دو مختلف باتیں تھیں۔ ہائی اسکول کی پرنسپل مقرر ہونے کے بعد اٹھارہ سے انیس اور پھر انیس سے بیس گریڈ میں بھی ترقی کے امکانات بہت روشن تھے۔ اور کیا عجب کہ بیس کے بعد اکیسویں گریڈ میں بھی مواد اور مل جاتا۔ سنیارٹی کی بنیاد پر ریگ ریگ کر ملازمت کے بالکل اختتامی برسوں میں ڈپارٹ منٹل ترقی پا کر وائس پرنسپل اور پرنسپل بننے والے اساتذہ کی بہ نسبت اس کے پاس تو ابھی کافی وقت تھا۔ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے براہِ راست وائس پرنسپل مقرر ہونے کا یہ بہت بڑا فائدہ تھا۔ جب سے ترقی کے احکامات جاری ہوئے تھے ہر روز ہی کسی اہم منصب یا سینئر ہیڈ کا فون آ جاتا اور ایک ہی سوال ہوتا ”کب جاری ہیں؟“

بہی خواہوں کا مشورہ یہ تھا کہ اسے کسی صورت بھی پروموشن کو ”فارگو“ نہیں کرنا چاہیے۔

ترقی کے موقعے کو نہ گنوانے کی بس ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ وہ نئے مقام تعیناتی پر اپنے فرائض منصبی سنبھال

لتی۔

مگر اکیلی کیسے چلی جاتی وہ!

”بھئی چلی جائیں، جوائن کر لیں چند دن رہیں پھر چھٹی لے کر آجائیں۔“ یہی خواہ مشورہ دیتے۔

انجانے شہر میں اس کے لیے چند دن بھی رہنا مشکل تھا۔

”پروموشن ”فارگو“ کرنے کی غلطی مت کرنا۔“ تمام سینئر ہیڈز کا یہی مشورہ تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ڈپٹی

صاحب سے رابطہ کر لیا ”سر! میں ڈائریکٹر صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ڈپٹی صاحب سے کہا۔

”میڈم ڈائریکٹر صاحب نے اب تک اس سلسلے میں کسی کی نہیں سنی۔ آپ کا کیا خیال ہے جو لوگ گئے ہیں وہ

چپ چاپ چلے گئے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے طور پر سفارشیں پہنچوائیں مگر ڈائریکٹر صاحب کہتے ہیں ٹرانسفر



ملازمت کا جزو لازم سمجھا جانا چاہیے۔“  
 ”درست! لیکن سر ملازمین کو اتنا حق تو ملنا چاہیے کہ وہ محکمے کے سربراہ کو اپنی مشکلات سے آگاہ کر سکیں اور اگر ان کی مجبوری جینوئن ہو تو.....“

”معاف کیجئے گا میڈم! ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس کی مجبوری سب سے زیادہ جینوئن ہے۔“  
 ”سر! آپ یہ تو سوچیں کہ کوئی خاتون کسی انجانے شہر میں تنہا کیونکر رہ سکتی ہے۔“  
 ”مس منہا یہ بات میرے نہیں آپ کے سوچنے کی ہے۔“  
 ”جی سر۔“ وہ خفیف ہو کر بولی ”بات تو میرے ہی سوچنے کی ہے مگر میں ڈائریکٹر صاحب کو اپنی اس مجبوری سے آگاہ کرنے کا حق تو رکھتی ہوں نا۔“  
 ”بالکل رکھتی ہیں۔“

”براہ کرم مجھے اس کا موقع دلوائیے۔“  
 ”میں آپ کو ڈائریکٹر صاحب کا جواب ابھی بتائے دیتا ہوں وہ کہیں گے پروموشن فارگو کر دیں۔“  
 ”ظاہر ہے سر یہی کرنا پڑے گا مگر اس سے پہلے میں ایک چانس لینا چاہتی ہوں۔“  
 ”کیسا چانس میڈم؟“  
 ”ڈائریکٹر صاحب سے مل کر انہیں اپنی مجبوری سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔“  
 ”کوئی فائدہ نہیں۔“  
 ”سر مقدر آ زمانے میں تو کوئی حرج نہیں۔“  
 ”ایزیووش۔“

”سر! ان سے ملاقات کے لیے وقت لینے کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“  
 ”نو پرا بلیم میڈم..... سمجھے مل گیا آپ کو ٹائم..... میں ڈائریکٹر صاحب سے وقت لے کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔“  
 ”تھینک یو دیری میچ سر۔“  
 اسی دن چھٹی سے ذرا قبل ڈائریکٹر صاحب کے پی اے نے اسے مطلع کیا کہ ڈائریکٹر صاحب نے آنے والی کل صبح ساڑھے نو بجے اسے ملاقات کا وقت دیا تھا۔  
 اگلی صبح نماز فجر سے قبل اس نے دو رکعت نماز حاجت ادا کی اور اللہ میاں سے گزر گڑا کر دعا مانگی۔

☆☆☆

وہ مقررہ وقت سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی ڈائریکٹر صاحب جا پہنچی۔  
 ”تشریف رکھیے میڈم۔“ ڈائریکٹر صاحب طے شدہ ملاقاتوں کے معاملے میں وقت کی انتہائی پابندی کرتے ہیں۔ میں ٹھیک ساڑھے نو بجے انہیں آپ کی آمد سے مطلع کروں گا۔“ ان کے پی اے نے کہا۔  
 ”جی بہتر۔“ وہ ڈائریکٹر صاحب کے کمرے سے ملحق ان کے پی اے کے کمرے میں صوفے پر بیٹھ گئی۔  
 ٹھیک ساڑھے نو بجے پی اے نے ڈائریکٹر صاحب کو اطلاع دی کہ وہ ان سے ملاقات کی منتظر ہے۔ انٹرکام کا ریسپونڈر رکھتے ہوئے پی اے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”جائیے میڈم!“  
 وہ اٹھی اور ڈائریکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئی۔  
 ”حاضر ہو سکتی ہوں سر؟“

ڈائریکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ نپے تلے قدموں سے آگے بڑھی۔ کمرے میں ڈپٹی صاحب بھی موجود تھے۔ ڈائریکٹر صاحب کی میز کے نزدیک پہنچ کر وہ ٹھنک گئی۔

”بیٹھے۔“ ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔

اس نے کن آنکھوں سے ڈپٹی صاحب کو دیکھنے کی کوشش کی اور انہیں بھی کن آنکھوں سے اپنی جانب دیکھتے پا کر اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے بھی اشارے سے جواب دیا۔ وہ ڈپٹی صاحب کے اور اپنے درمیان ایک کرسی خالی چھوڑ کر ڈائریکٹر صاحب کے روبرو بیٹھ گئی۔

”جی میڈم فرمائیے۔“ ڈائریکٹر صاحب اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی خاص مہربانی کے موڈ میں نہ تھے۔

منتہا سنبھل کر بیٹھ گئی اور اس نے دھیمی آواز اور نئے تلے الفاظ میں عرض بدعا کی۔

”آئی ایم سوری میڈم! میں نے اس سلسلے میں کسی کو کوئی فیور نہیں دیا۔ آپ کو کیسے دے سکتا ہوں۔ جن کو پروموشن لینا تھا سب گئے ہیں آپ کو بھی جانا ہوگا۔“ ڈائریکٹر صاحب نخوت سے بولے۔

اسے ان کے لہجے پر سخت کوفت محسوس ہوئی۔ کیسی رعونت تھی ان کے انداز میں!

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔

”سوری سر، میں نہیں جاسکوں گی۔“

ڈائریکٹر صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”وہاٹ ڈو یو مین؟“ وہ تیوری چڑھا کر بولے۔

ڈپٹی صاحب دھیرے سے کھنکھارے۔ جیسے اسے متنبہ کرنا چاہتے ہوں کہ اسے احتیاط سے بات کرنی ہوگی۔ وہ ان کی تنبیہ کو خاطر میں نہ لائی۔

”سر!“ اس نے ڈائریکٹر صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”میں پروموشن فارگو کرنا چاہتی ہوں۔“

ڈائریکٹر صاحب نے اسے بے یقین نگاہوں سے دیکھا ”آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”جی سر، میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ بات کہہ رہی ہوں۔“

ڈائریکٹر صاحب کو اس کی جرات رندانہ ایک آنکھ نہ بھائی۔ ان کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔

”سوچ لیجئے میڈم۔“ ڈپٹی صاحب نے ڈائریکٹر صاحب کی ناگواری بھانپتے ہوئے اسے محتاط انداز میں صلاح دینے کی کوشش کی۔

اس نے پہلو بدلتے ہوئے ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھا اور دل گرفتہ مگر دو ٹوک لہجے میں بولی ”سر! میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“

”ٹرانسفر سے بچنے کے لیے پروموشن چھوڑ دینا عقل مندی تو نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!“ اس کے لہجے میں دل گرفتگی بڑھ گئی ”مگر سر زندگی میں ترجیحات مقرر کرنا پڑتی ہیں۔ میرا پرفیشن میری زندگی کی ایک بڑی کٹ منٹ ضرور ہے مگر میری پہلی ترجیح میری فیملی ہے۔ میں ایسا کوئی کام کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی جو میری فیملی کو ڈسٹرب کر دے۔ میری والدہ نہیں چاہئیں کہ میں اپنے گھر سے دور جاؤں۔“

ڈائریکٹر صاحب نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور بولے ”میڈم! ماؤں کو تو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اگر آپ نے شادی کی اور آپ کو اپنی والدہ سے دور جانا پڑا تو؟“

منتہا کوتاہی سے کہی کہ وہ اس قدر ذاتی بات کریں گے۔ ”سر وہ علیحدہ بات ہے۔“ اس نے کہا۔

”علیحدہ کیا ہے میڈم..... زندگی کے جملہ معاملات شہد کے چھتے کے خالوں کی طرح ایک دوسرے سے مربوط

ہوتے ہیں۔“

منتہا نے بحث میں الجھنا مناسب نہ جانا۔

”سر! میرے لیے ایک انجانی جگہ پر تنہا رہنا مشکل ہوگا ورنہ میں ہرگز پروموشن فارگو کرنے کا نہ سوچتی لیکن اگر



آپ مجھے فیور دیں تو میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“ اس نے ڈائریکٹر صاحب سے کہا۔

”مجھ سے کیا فیور چاہتی ہیں آپ؟“

”سراکٹوبر میں ہمارے ہائی اسکول کی پرنسپل صاحبہ ریٹائرمنٹ پر جا رہی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے ہائی اسکول میں اکاؤنٹنٹ کر سکتے ہیں۔“

”ان کی ریٹائرمنٹ تو..... آئندہ سال اکتوبر میں ہوگی۔“

”نوسر..... اسی سال..... اگلے ماہ صرف ستائیس دن بعد۔“

”آپ نے تو ان کے جانے کے دن تک گن رکھے ہیں۔“ ڈائریکٹر صاحب بولے۔

”سراغرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔“

ڈائریکٹر صاحب نے پُرسوج نگاہوں سے ڈپٹی صاحب کی جانب دیکھا ”آپ ذرا چیک کر لیجئے۔ ہائی اسکول کی پرنسپل اگر اسی سال اکتوبر میں جا رہی ہیں تو پھر سوچیں گے۔“

”تھینک یوسر..... تھینک یو دیری میچ۔“ منتہا کا لہجہ احساسِ تشکر سے معمور تھا۔

☆☆☆

ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات کے بعد وہ اپنے دفتر میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ آ پاصغراں نے اپنے مخصوص لہجے میں

بتایا ”میڈم! ایک عورت بڑی دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھی ہے۔“

”بھیجیں۔“ منتہا ملاقاتیوں کو کبھی بھی دیر تک انتظار نہ کرواتی تھی۔

آ پاصغراں پلٹ گئیں۔

کچھ ہی دیر بعد ملاقاتی خاتون اس کے کمرے کے دروازے پر موجود تھی۔ اسے دیکھتے ہی منتہا چونک گئی۔

”آئیے آئیے سز جبار۔“

خاتون آگے بڑھی اور منتہا کی میز کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے منتہا کی طرف بڑھا دیا۔

منتہا نے ہاتھ ملایا اور اسے ہٹانے کا اشارہ دیا۔

”میں تو سمجھ رہی تھی آپ جا چکی ہوں گی۔ گئیں نہیں آپ اب تک؟“ منتہا نے پوچھا۔

”کہاں میڈم؟“

”باہر..... اپنے اسپینڈ کے ساتھ۔“

خاتون کے چہرے پر بڑی کرب آمیزی کیفیت ابھری ”میری ایسی قسمت کہاں میڈم۔“

”کیا مطلب!“

”بچوں کو جانا تھا وہ گئے۔ میرے پاس ایک بچہ بھی نہیں چھوڑا انہوں نے۔“

”مگر میں نے آپ کے اسپینڈ سے پوچھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ میری سز بھی ساتھ جا رہی ہیں۔“

”جی یہ تو انہوں نے آپ سے سچ ہی کہا تھا۔ اپنی نئی نوپلی بیگم کو وہ ساتھ ہی لے گئے ہیں۔“

”کیا.....!“ منتہا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”جی..... دوسری شادی کر لی انہوں نے۔“

”کہاں؟ کس سے؟“

”چترال سے خرید کر لائے تھے..... بڑی خوب صورت..... نوجوان..... جیسے ان کی خواہش تھی۔“

”خرید کر لائے تھے!“ منتہا نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی..... دو لاکھ میں۔“

”ادہ خدا! انسان بھی جکتے ہیں۔“  
 ”انسان نہیں میڈم صرف عورتیں..... لڑکیاں جکتی ہیں ان علاقوں میں۔“  
 ”آپ نے بچوں کو کیوں جانے دیا۔“  
 ”تو پھر کیا کرنی۔ بچے تو انہی کے تھے ناجی۔“  
 ”بچے ماں کے ہوتے ہیں۔“

”نہیں جی..... ہمارے جیسے گھروں میں سب کچھ مرد کا ہوتا ہے..... بچے بھی..... اور عورت تو اس کے پاؤں کی جوتی ہوتی ہے۔“

”آپ نے بچوں کے جانے پر احتجاج نہیں کیا۔“  
 ”کوئی فائدہ نہیں تھا۔“  
 ”خود بھی ساتھ جاتیں۔“  
 ”میں نے کہا تھا۔“  
 ”پھر؟“

”جبار صاحب کہنے لگے دیر ایک ہی بیوی کا ہے۔ میں نے کہا میں بچوں کی، آپ سب کی نوکرانی بن کر ساتھ چلتی ہوں۔ نوکرانی بنا کر ساتھ لے چلیں۔“  
 ”پھر؟“

اس نے منتہا کی طرف دیکھا۔ منتہا کو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی دکھائی دیں۔  
 ”بس..... وہ مجھے چھوڑ گئے۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”بہت افسوس ہوا مسز جبار۔“ منتہا نے محزون لہجے میں کہا۔  
 اس نے اپنی چادر کا کونا منہ میں دبایا اور منہ پر ڈھانپ کر سکنے لگی۔  
 عجیب عورت تھی!

”اب رو کیوں رہی ہیں آپ!“ منتہا نے کہا ”آپ تو خود ان کی دوسری شادی کرانا چاہتی تھیں۔“  
 اس نے اپنی آنکھوں پر سے چادر کا کونا ہٹایا۔ منتہا کو لحظہ بھر کو گھائل نظروں سے دیکھا پھر دوبارہ چادر سے آنکھیں ڈھانپ لیں اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اسے دلاسا دینے کے لیے منتہا کو اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کا شانہ تھپکاتا پڑا۔

اس کے آنسو تھمنے کے بعد منتہا نے پوچھا ”اب آپ کے پاس کون ہے؟“  
 ”کوئی نہیں۔“

”بالکل اکیلی؟“  
 ”جی۔“

”بچوں کا فون وغیرہ آیا؟“  
 ”نہیں۔“

”اب آپ کیا کریں گی؟“  
 ”انتظار۔“

”کس کا۔“

”اپنے بچوں کا..... اور.....“



”اور؟“

”اور..... ان کے باپ کا بھی۔“

منہا کو یوں لگا جیسے ہر دوسری عورت کی کہانی اس کی اپنی ماں کی کہانی تھی!

☆☆☆

ڈیڈی اسپتال سے گھر آ گئے تھے۔ شرمندہ شرمندہ سے۔ کسی مجرم کی طرح خفیہ۔ ان کی بابت می کارویہ ہنوز برقرار تھا۔ ان کے تمام کام کرتیں مگر ان سے اپنی خاموشی برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ علیہ اور بیہ سے تو ڈیڈی کے تعلقات لاہور سے آنے سے قبل ہی بحال ہو چکے تھے۔ منہا سے بھی دھیرے دھیرے بحال ہو رہے تھے۔ تجدید میرا سم کا یہ سلسلہ تکلیف دہ بھی تھا عبرت آموز بھی۔ منہا ڈیڈی سے ہمکلام ہوتی تو جھجکتے ہوئے۔ ڈیڈی بات کرتے تو نظریں نہ ملاتے۔ البتہ ثروت اور نعیم سے ڈیڈی کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ ثروت ان کی خدمت گزاری میں لپک لپک کر می کی معاونت کرتی۔ نعیم بلاناغہ ان سے ملنے آتا اور گھٹنا ڈیڑھ گھٹنا ان کے ساتھ گزارتا۔ دونوں متفرق موضوعات پر دوستوں کی طرح گفتگو کرتے۔ اکثر علیہ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو جاتا۔ علیہ کو ڈیڈی سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر منہا کو حیرت ہوتی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے تو ڈیڈی کی زیادتیوں کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔

ڈیڈی لاہور والا گھر فروخت کر کے دوبارہ اپنے پرانے شہر میں نیا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر می اور ان تینوں بھائی بہنوں کے دلوں میں قناعت نے اس طرح گھر کر لیا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی ڈیڈی کے اثاثوں اور نئے گھر کی خریداری سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ چھوٹے سے اس فلیٹ میں انہیں وہ عافیت اور سکون میسر تھا جو کبھی کبھی محلوں میں بھی نہیں ملتا۔

ڈیڈی کی ظہیر صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور بقول مسز ظہیر یہ بات خاصی حیران کن تھی کہ ظہیر صاحب جو کسی کی تعریف ذرا مشکل ہی سے کرتے تھے دو تین ملاقاتوں ہی میں سدھی کے گردیدہ ہو گئے تھے۔ ڈیڈی کا یہ وصف تو پرانا تھا کہ انہیں لوگوں کو اپنا بنانا آتا تھا۔ یہ بہر حال الیہ ہی تھا کہ ایک غیر عورت کو اپنا بنانے کے چکر میں وہ اپنوں کو چھوڑ گئے تھے۔

نعیم اس بار خدا جانے کیا سوچ کر آیا تھا کہ ڈیڑھ ماہ کی چھٹی ختم ہو جانے کے بعد اس نے چھٹی مزید بڑھوا لی تھی۔ اس کی موجودگی سے مسز ظہیر کو اپنے نئے محاذ پر جس پردہ خاموشی سے سرگرم عمل تھیں خاطر خواہ کم کم مل رہی تھی۔ نعیم نے ثاقب کو فرحان کی حادثاتی موت کے بعد پیدا ہو جانے والی خاندانی رنجش کے سلسلے میں اعتماد میں لے لیا تھا۔ تاہم انہوں نے دلوں کو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ جب تک یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ جاتی کسی قیمت پر یہ بات ظہیر صاحب اور بیہ پر بالخصوص نہ کھلنے دیں کہ یہ رشتہ نعیم نے بنایا تھا بلکہ یہی ظاہر کریں کہ رشتہ اخبار کے ذریعے پتا چلا تھا۔

”امی آپ کو بھی کیا سوچھی ہے۔ کبھی کوئی ساس بھی بہو کے لیے اس طرح سے کیا کرتی ہے۔“ لیلیٰ نے کہا۔

”اس میں برائی تو کوئی نہیں۔“

”برائی تو خیر کچھ نہیں مگر ہمیں یہ بتائیے کہ آپ آخر کس دل سے یہ سب کچھ کر رہی ہیں۔“ لیلیٰ کی آواز جذبات

کی شدت سے بھرا گئی۔

”ہم سمجھ رہے ہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ بیٹا، ہے واقعی بہت مشکل کہ جس لڑکی کو ہم بیاہ کر اپنے گھر لائے ہوں اسی کو اپنے ہاتھوں کسی اور کے سپرد کرنے کی سوچیں لیکن بیٹا زندگی میں کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ دل دکھا دینے والی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انسان کو۔“ مسز ظہیر کی آواز بھی بھرا گئی۔

”آپ رورہی ہیں!“ لیلیٰ نے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں تو.....“ مسز ظہیر نے اپنی رقت کو دبانے کی کوشش کی۔

”ہمیں ایسا لگا جیسے آپ رو رہی ہیں۔“

”اب تو بہت دن ہو گئے بیٹا..... جتنا رونا تھا رو چکے ہم..... بس اب تو ہماری خواہش یہ ہے کہ بیسہ بھی جلد از جلد اپنے گھر کی ہوں تاکہ ہم عدنان کا گھر بھی بسائیں اور اللہ اللہ کریں۔ نعیم نے تولز کے کی طرف سے پوری ذمہ داری لی ہے۔ کہتے ہیں انتہائی معقول نو جوان ہے۔ ہم نے بیسہ کے گھر والوں سے بھی اس رشتے کا ذکر کیا ہے۔ ان کے والد کا قصہ درمیان میں نہ اٹھ کھڑا ہوتا تو بات شاید کسی نتیجے پر بھی پہنچ چکی ہوتی۔“

”بھابی کے والد ہیں کیسے؟“

”نہایت معقول سے آدمی ہیں۔ تمہارے ابو کو تو بہت ہی اچھے لگے۔ ہم حیران ہیں کہ اتنے معقول اور سمجھ دار لوگ بھی بعض اوقات کیسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ سنا ہے کوئی معمولی سی عورت تھی جس کی خاطر یہ صاحب بیوی بچوں کو چھوڑ گئے تھے مگر انجام دیکھو کیا ہوا۔“

☆☆☆

ڈائریکٹر سے ڈپٹی صاحب کا فون تھا۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا ”میڈم آپ کو خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا ہے میں نے۔“

منتہا کا دھیان فوراً اپنے تباد لے کی طرف گیا۔  
”کیسی خوش خبری سر؟“

”ڈائریکٹر صاحب نے آپ کا سابقہ ٹرانسفر آرڈر منسوخ کر کے نئے احکامات جاری کر دیئے ہیں۔ آج ابھی کچھ دیر پہلے ہی ایئر سائن ہوا ہے۔“ آپ چاہیں تو کسی کو بھیج کر آج ہی منگوا لیجئے۔“

”سر! پوچھ سکتی ہوں نیا حکم نامہ کیا کہتا ہے؟“

”ہاں! اسکول کی میڈم کی ریٹائرمنٹ تک آپ اپنے جونیئر اسکول ہی میں رہیں گی، ان کی ریٹائرمنٹ پر آپ ہاں اسکول کا چارج لیں گی۔“

”تھینک یو دیری میچ سر۔“

”شکریہ تو آپ ڈائریکٹر صاحب کا ادا کیجئے گا۔ حقیقتاً انہوں نے آپ کو ایک بڑا فیور دیا ہے۔“

”باد جود مجھ سے اپنی ناراضگی کے!“

”میڈم ناراض تو خیر مجھ سمیت کبھی رہتے ہیں آپ سے کیونکہ آپ لوگوں کے کام نہیں کرتیں۔“

”سریج کام میں نے کبھی کسی کا نہیں روکا۔“

”میڈم سچ کام روک کر تو آدمی خود گرفتار بلا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا سیکھیے۔ اپنے انداز

کار میں لچک پیدا کیجئے ورنہ ہو سکتا ہے آئندہ آپ کو بہر صورت ٹرانسفر آرڈر کی تعمیل کرنے کا حکم دیا جائے۔ آپ کو پتا ہے اس بار بھی کیا ہوا۔“

”کیا سر؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ایڈمن والوں نے جان بوجھ کر ڈائریکٹر صاحب کو ہاں اسکول کی میڈم کی تاریخ ریٹائرمنٹ غلط بتائی۔“

”کیوں سر؟“

”تاکہ آپ کو ان کی جگہ پر ایڈ جسٹ کرنے کا نہ سوچا جائے۔ ڈائریکٹر صاحب کی یادداشت کمال کی ہے۔ انہیں

یاد تھا کہ جب تری پانے والے سربراہان مدارس کے متوقع مدارس تعیناتی کے سلسلے میں متعلقہ شعبے کے افراد کے ساتھ ان کی مینٹگ ہوئی تو انہیں یہی بتایا ہو گا کہ اس اسٹیشن پر سر دست کوئی سیٹ خالی نہیں اور نہ ہی اگلے برس سے پہلے کوئی



امکان تھا۔ ان کے استفسار پر متعلقہ افراد نے انہیں یہی بتایا کہ ہائی اسکول کی پرنسپل کی ریٹائرمنٹ اگلے سال ہونا تھی۔ آپ سے ملاقات کے بعد ڈائریکٹر صاحب نے اس سلسلے میں انکوائری کروائی تو متعلقہ افراد بات کو گول مول کر گئے مگر اسی شعبے کے ایک بھیدی نے مجھے بتایا کہ منہاج کا تبادلہ دوسرے شہر کروانے کے لیے ڈائریکٹر صاحب کو ہائی اسکول کی پرنسپل کی تاریخ ریٹائرمنٹ جان بوجھ کر غلط بتائی گئی تھی۔

”سرا! وہ کون سا شخص تھا جس کو مجھ سے اتنی دشمنی تھی۔“

”یہ آپ کو بتانا تو کیا خود ہمارے لیے بھی جاننا مشکل ہے کیونکہ پوسٹنگ ٹرانسفر کیسز تیار کرنے میں کوئی ایک شخص تو انوالو ہوتا نہیں ہے۔ پورا سیکشن کام کرتا ہے۔ بہر حال گھر کے بھیدی نے بڑے وثوق سے بتایا کہ میڈم منہاج کو باہر پوسٹ آؤٹ کروانے کے لیے ڈائریکٹر صاحب کو ہائی اسکول کی میڈم کی تاریخ ریٹائرمنٹ غلط بتانے کی سازش تیار کی گئی تھی اور وہ اس لیے کہ میڈم منہاج کسی کا کام نہیں کرتیں۔“

”غلط کام نہیں کرتی..... میرا تصور یہ ہے کہ میں ادارے کو لوگوں کی مرضی کے مطابق چلانے کی بجائے اصولوں کی بنیاد پر چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرا تصور یہ ہے سرکہ میں اپنے محکمے کی اداروں کے لیے وضع کردہ ہر پالیسی کا دل و جان سے احترام کرتی ہوں۔ مجھے اپنے ادارے کی نیک نامی اور محکمے کی عزت کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔“

”بہر حال مس منہاج آپ اپنی مداخلت میں کتنے ہی پُر زور دلائل دیں لوگ آپ سے خوش نہیں ہیں۔“

”میری بد قسمتی سر۔“ اس نے بوجھل سی آواز میں کہا۔ ڈپٹی صاحب کی باتیں سن کر اس کا دل بہت بُرا ہوا تھا۔ جس کام کی محبت اس کے لیے عبادت کا درجہ اختیار کر گئی تھی اس کا یہ صلہ مل رہا تھا کہ لوگ اس سے اس حد تک نفرت کرنے لگے تھے کہ اس سے چھٹکارے کے لیے سازش پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس کا جی چاہا کہ کرسی سے اٹھے اور اپنا بیگ میز کی دراز سے نکال کر اپنے دفتر سے نکلے اور سیدھی مین گیٹ کی طرف چلی جائے دوبارہ بھی اسکول واپس نہ آنے کے لیے۔

”بہر حال میڈم آپ کو نئی پوسٹنگ مبارک ہو۔“

”تھینک یوسر۔“ اس کا دل بہت دکھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بے ضرر سے اصولوں کی پاسداری پر لوگ اس حد تک اس کی بدخواہی پر کمر بستہ تھے کہ اس کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ لوگوں کے بڑے مفادات پر ضرب لگانے والے جی داروں کی زندگی کتنی مشکل ہوتی ہوگی۔

ڈپٹی صاحب سے بات کرنے کے بعد وہ اسکول کا راؤنڈ لینے کے لیے ابھی تو مسز جبار سے اپنے کمرے کی طرف آتی دکھائی دیں۔ وہ ٹھٹک گئی۔

”السلام علیکم میڈم۔“

”وعلیکم السلام..... کیسی ہیں مسز جبار؟“

”بس میڈم زندہ ہوں..... ذرا جلدی میں ہوں۔“

”خیریت!“

”آپ سے آخری ملاقات کرنے آئی ہوں۔“

”کیوں بھی آخری ملاقات کیوں؟ کیا بچوں کے پاس جاری ہیں!“

”میری ایسی قسمت کہاں میڈم۔“

”آئیے۔“ منہاج نے راہداری میں کھڑے ہو کر بات کرنے کی بجائے مسز جبار کو اپنے کمرے میں چلنے کی دعوت دی۔

”میڈم باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ اس میں میرا سامان بھی رکھا ہے۔“

”جا کہاں رہی ہیں آپ؟“

”اپنے بہن بھائیوں کے پاس۔“

”اپنا گھر چھوڑ کر!“

”گھر بھی تو اپنا نہیں رہا میڈم۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

”یعنی؟“

”میڈم ٹیکسی والا کہیں میرا سامان لے کر فرار نہ ہو جائے۔ اب تو مجھے کسی کا بھی اعتبار نہیں رہا۔“

”آپ فکر نہ کریں اس کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔“ منتہا نے اپنے کمرے کے باہر مستعد کھڑے اقبال کو آواز دی۔ وہ لپکا ہوا آیا ”دیکھو اقبال گیٹ کے باہر ٹیکسی کھڑی ہے اس میں ان کا سامان رکھا ہے۔ تم گیٹ پر جاؤ اور چوکیدار سے کہہ کر آؤ کہ ان کے آنے تک ان کے سامان کا خیال رکھے۔“

”بہتر ہے میڈم۔“ اقبال نے کہا۔

”اور بھائی اپنے چوکیدار سے یہ کہہ دینا کہ ٹیکسی والے پر بھی نظر رکھے کہ کہیں وہ میرا سامان لے کر بھاگ نہ جائے۔“ مسز جبار نے مزید کہا۔

”اچھا جی۔“ اقبال دھیرے سے مسکرایا۔

”آئیے اب تو آپ کچھ دیر بیٹھیں گی نا۔“ منتہا نے اپنے کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔ مسز جبار اس کے ساتھ ہو لیں۔

”جی، اب بتائیے کیوں جا رہی ہیں، اپنا گھر چھوڑ کر۔“ منتہا نے اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

”مسز جبار نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”کیا ہوا؟“

”کیا بتاؤں میڈم! کیا ہوا..... مرد ذات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

”ایسی بے اعتباری کیوں مسز جبار؟“

”مجھے کہہ گئے تھے فی الحال اسے اور بچوں کو لے جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی بلا لوں گا۔ میں پاگل تھی کہ ان کی اس بات کا بھی اعتبار کر لیا۔ کوئی تین چار دن پہلے آپ ہی آپ میرا دل چاہا کہ ان کی الماری میں چیزیں سنبھال کر رکھ دوں۔ کیا پتا اب کتنے دنوں بعد آئیں۔ الماری کی دراز میں کچھ فالتیں اور کاغذات بھی تھے، میں انہیں سنبھال کر رکھنے لگی تو ایک اسٹامپ پیپر ملا، اتنی بڑھی لکھی تو نہیں ہوں کہ انگریزی پڑھ سکوں۔ اردو تو ٹی پھوٹی پڑھ لیتی ہوں۔ پڑھا تو پتا چلا کہ میرے نام طلاق نامہ لکھ گئے ہیں۔“

”ادہ نو مسز جبار!“ منتہا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”بس میڈم! میرے تو بیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ جس گھر کو اپنا گھر سمجھے بیٹھی تھی، وہ بھی بیگانہ لگنے لگا۔ کیا حق رہ گیا میرا جبار صاحب کے گھر میں رہنے کا۔ میں نے بھائی بہنوں کو فون کیا کہ ایسا ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا تیری قسمت۔ ان سے فریاد کی کہ اب میں تمہارے ٹکڑوں پر آ پڑنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا، آنا چاہتی ہو آ جاؤ..... بس اب جا رہی ہوں“ مسز جبار کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”گھر کس کے حوالے کیا ہے؟“

”مالا لگا کر چابی ان کی بہن کے حوالے کر دی ہے۔“

”بہن یہیں رہتی ہیں؟“



”ہاں جی!“ سز جبار نے ایک سرد آہ کھینچی پھر دفعتاً اٹھ کر منہا کے نزدیک آئیں اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے بڑے احترام سے چومنے کے بعد کہا ”آپ کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی میڈم!“

”کیوں؟“

”کیونکہ آپ نے مجھے اس وقت عزت دی جب وہ شخص مجھے آپ کے سامنے ذلیل اور رسوا کرنے کے لیے لایا تھا..... میرے حق میں دعا کرنا میڈم!“

”اللہ پر بھروسہ رکھیں سز جبار! وہ آپ کے لیے بہتر راستے بنائے گا“ منہا نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔  
 ”میڈم! اب جو بھی راستہ ہوگا، مجھے یقین ہے، پہلے سے بہتر اور آسان ہی ہوگا۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ اس شخص نے مجھے جسمانی ہی نہیں ذہنی بھی کیسی کیسی مار دی ہے۔ خاندان والے بیٹھے ہوتے تھے اور وہ مجھے سب کے سامنے دو منٹ میں ذلیل کر کے رکھ دیتا تھا۔ جب وہ گھر آتا، تو میں اور بچے ہر وقت سہے رہتے تھے۔ میں نے بچوں کو اس کے ساتھ بھیجنا بھی اسی لیے گوارا کیا کہ اس ٹینشن سے تو نکلیں۔“  
 ”یہ نہ سوچا کہ وہ ماں کی محبت سے محروم ہو جائیں گے۔“

”ایسی ماں کس کام کی میڈم! جو بچوں کو ذہنی سکون نہ دے سکے، جس کی وجہ سے زندگی ان کے لیے عذاب بن جائے۔ وہ شخص مجھ سے پہلے دن سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا، میں نے گھر والوں کی خاطر تم سے شادی کر تو لی ہے مگر عذاب میں تم بھی رہو گی میں بھی۔ بے جوڑ شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے میڈم!“  
 مسئلے کا کتنا صحیح ادراک تھا اسے۔

”خدا آپ کے لیے آئندہ زندگی میں آسانیاں پیدا فرمائے سز جبار!“  
 ”معاف کرنا میڈم! آپ مجھے سز جبار کہہ رہی ہیں۔ میں اب سز جبار نہیں ہوں، میرا نام ساجدہ ہے۔“  
 ”سوری ساجدہ!“

”اچھا میڈم..... اجازت؟“  
 ”ادکے!“ منہا نے اسے گلے لگالیا۔  
 وہ رونے لگی۔

”ہو سکے تو بچوں سے اپنا رابطہ برقرار رکھنے کی کوشش کرنا ساجدہ!“  
 ”پتا نہیں میڈم، رابطہ کر سکوں گی کہ نہیں۔ ان کا باپ کہا کرتا تھا، تیرے جیسی ماں کا تو سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے بچوں پر“ اس کی آواز بھر اٹئی۔

”آپ اپنا دل چھوٹا نہ کیجئے۔ وہ ایک کمپلیکس کا مارا ہوا آدمی تھا۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے مرد اور کتنی عورتیں ایسی ہیں جن کی بے جوڑ شادیاں ہوئی ہوں گی مگر وہ ہنسی خوشی گزارا کر رہے ہیں۔ وہ بھی اگر چاہتا تو گزارا کر سکتا تھا۔ بُرا نہ مایے گا ساجدہ! آپ بھی اگر چاہتیں تو خود کو بدل سکتی تھیں مگر شاید..... آپ دونوں میں سے کسی نے بھی خود کو ایک دوسرے کے لیے بدلنے کی کوشش نہیں کی۔“  
 وہ بے ساختہ چونک کر منہا کو دیکھنے لگی۔

”کیا میں نے غلط کہا؟“  
 ”نہیں میڈم! اصل اور سچی بات یہی ہے۔ میں نے بھی خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید بدل لیتی خود کو تو کہانی کچھ اور ہوتی۔“

منہا کو اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔

”اچھا میڈم، خدا حافظ..... دعاؤں میں یاد رکھنا۔“

”خدا حافظ ساجدہ!“  
اسے رخصت کرنے کے لیے ملجا اپنے کمرے سے باہر نکل آئی اور جب پٹی تو کچھ اس طرح جیسے کسی میت کو  
کاندھادے کر آ رہی ہو۔

☆☆☆

”بیہ!“ مسز ظہیر نے اسے مخاطب کیا۔

”جی!“ وہ ٹھنک گئی۔

”کوئی کام تو نہیں کرنے جا رہی؟“

”جی نہیں۔“

”ادھر آؤ، ہمارے پاس بیٹھو۔ ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

وہ مسز ظہیر کے پاس جا بیٹھی۔

”بیٹا، ایک رشتہ ہے۔ ہم نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار پڑھ کر خط لکھا تھا۔ لڑکا دینی میں رہتا ہے۔ خط  
دکتابت ہوئی اور ہم نے لیلیٰ کو فہیم کے ذریعے لڑکے کے بارے میں پوچھ گچھ کرانے کا لکھا تو سوئے اتفاق وہ ان کا  
پڑوسی اور فہیم کا بہت اچھا دوست نکلا۔ انڈین مسلمان ہے۔ شادی ہوئی تھی مگر نہا نہ ہو سکا۔ لڑکی کچھ عرصہ دینی میں بھی  
اس کے ساتھ رہی پھر واپس چلی گئی۔ لڑکے نے اسے طلاق دے دی۔ فہیم اور لیلیٰ نے تو بہت تعریف کی ہے اس کی،  
ملازمت بھی اچھی ہے۔ فہیم اور لیلیٰ نے تو اس کے بارے میں بہت اطمینان دلایا ہے۔ ثاقب محمود نام ہے اس  
کا اور.....“

مسز ظہیر نے اپنے گھٹنے کے نیچے دبا ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر بیہ کی طرف بڑھاتے  
ہوئے بولیں ”یہ اس کی تصویر ہے۔“

بیہ نے نظریں اٹھا کر ایک لمحے کو ان کی جانب دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں۔

”اسے بچے کی موجودگی پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ فہیم کہتے ہیں بے حد نفیس آدمی ہے۔ فہیم کی وجہ سے اسے بھی  
اطمینان ہو گیا ہے۔ اب بس ادھر سے اشارہ ملنے کی دیر ہے۔ وہ آنے کو تیار بیٹھا ہے۔ خود مختار ہے لہذا بات زیادہ لمبی  
کھینچنے کا بھی امکان نہیں۔ شاید ایک ہی دفعہ میں سارے معاملات نمٹا دے گا۔ اسے بلانے کے لیے تمہاری مرضی درکار  
ہے۔“

وہ چپ رہی۔

مسز ظہیر نے کچھ دیر اس کی خاموشی ٹوٹنے کا انتظار کیا پھر کہا ”تمہاری والدہ کے علم میں بھی ہے سارا معاملہ، ہو سکتا  
ہے انہوں نے تم سے ذکر کیا ہو۔“

ہاں می نے اس سے ذکر تو کیا تھا مگر اس طرح اس سے براہ راست جواب کا تقاضا نہ کیا تھا۔

”کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو پوچھو، کچھ کہنا چاہتی ہو تو کہو“ انہوں نے لحظہ بھر کو توقف کیا پھر مزید کہا ”اور ہاں..... تم  
ماشاء اللہ سمجھ دار ہو۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتی ہو۔ جو بات ہم نے تم سے کہی ہے، اس سلسلے میں تم پر کوئی جبر نہیں۔  
تمہاری جو بھی مرضی ہو بلا تکلف کہہ ڈالو۔“

بیہ نے ایک نظر نہیں دیکھا پھر سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی ”اگر آپ مجھ سے پہلے بات کر لیتیں تو اچھا تھا۔“

”کوئی بات نہیں تم اگر چہ سمجھتی ہو کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے تو ہم اس سے معذرت کر لیں گے۔“

بیہ نے چونک کر ان کی جانب دیکھا ”میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتی کہ آپ کو غلط سمجھوں۔“

”تو پھر.....؟“



## یہ بڑی عید جو ہماری ہے

عید الاضحیٰ ہے عید قرباں ہے  
ہاں یہی تو نشاطِ ایماں ہے  
آج تک ان کا فیض جاری ہے  
یہ بڑی عید جو ہماری ہے

راہِ حق میں ہر ایک قربانی  
ہے نشانِ رضائے ربانی  
اب مسلمان جو حج کو جاتے ہیں  
کتنا کیف و سرور پاتے ہیں

یاد آتے ہیں حضرت ابراہیمؑ  
واجب ہم سب پر ان کی ہے تعظیم  
پڑھ کے ہم بھی نمازِ شکرانہ  
پیش کرتے ہیں دل کا نذرانہ

نور چشمِ ان کے حضرت اسماعیلؑ  
کی جنہوں نے اس حکم کی تعمیل  
جب کسی کو گلے لگاتے ہیں  
ہم خدا کو قریب پاتے ہیں

جس پہ کرنا تھا جان کو قرباں  
وہ تو روزِ ازل کا تھا پیاں  
ہر خوشی دی ہوئی اسی کی ہے  
داگی زندگی اسی کی ہے

یہ بھی تھی ان کے خواب کی تعبیر  
خانہ کعبہ کر گئے تعمیر  
پیار سے ہم خدا کو یاد کریں  
مل کے باہم دلوں کو شاد کریں

پروفیسر سیما سراج، عثمانیہ گرلز کالج

اپنے رب کے لیے روا سمجھا  
عیدِ قرباں کا مدعا سمجھا

وہ کشمکش میں پڑ گئی۔  
”ہم سے بالکل کھل کر بات کرو بیٹا! یہ تمہاری زندگی، تمہارے مستقبل کا معاملہ ہے۔ ہمیں یا کسی اور کو جو تمہارا  
ہمدرد اور بھی خواہ ہو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ تمہارے لیے کوئی بات پروپوز کرے مگر اسے قبول یا رد کرنا صرف اور صرف  
تمہارا حق ہونا چاہیے۔ اس وقت تم ہم سے بالکل اطمینان کے ساتھ ایسے بات کرو، جیسے تم اپنی والدہ سے کیا کرتی ہو۔  
یہ مت سوچو کہ ہمیں برا نہ لگ جائے۔ اپنی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے میں تمہیں اپنا پورا اختیار استعمال کرنا چاہیے  
کیونکہ تم ایک پڑھی لکھی باشعور لڑکی ہو۔“  
بیمہ بدستورا ابھی ابھی دکھائی دی۔

”اچھا چلو، ہمیں اپنی والدہ کی جگہ مت سمجھو۔ دوست ہی سمجھ لو اور اطمینان سے بات کرو“ مسز ظہیر نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ دھر دیا۔

”میرے نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور یکساں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔“  
”ہم تمہاری کیفیت سمجھ سکتے ہیں بیٹا، مگر یہی زندگی ہے۔“

”میرے نے پھر ان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔ وہ ہوائے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”میرے جیسے میں ہی کیوں آئی ایسی زندگی؟“

”صرف تمہارے ہی جیسے میں نہیں بیٹا..... بہت سی عورتوں کو ایسی ہی زندگی ملی ہے۔ سہنا پڑتا ہے، اس کے سوا چارہ ہی نہیں ہوتا۔ اچھی بھالی کی مثال ہمارے خاندان میں موجود ہے۔“

”بس..... میں بھی دیے ہی گزار لوں گی“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہم تمہیں اس کا مشورہ نہیں دیں گے۔ اکیلی عورت بہت سے مقامات پر کمزور پڑ جاتی ہے۔ وہ نہیں کر پاتی جو کرنا چاہتی ہے۔ نہ اپنے لیے نہ اپنے بچوں کے لیے۔ سارے خاندان کی سپورٹ کے باوجود بے شمار مقامات تھے جہاں اچھی بھالی کو بھی مرد کی کمی محسوس ہوئی۔ بھیا زندہ رہے ہوتے تو نعیم اور نعیم شاید کہیں آگے ہوتے۔ خدا نخواستہ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اچھی بھالی بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکیں۔ انہوں نے تو اپنی بساط سے بڑھ کر کیا مگر ایک مرد کی سرپرستی میں شاید بلکہ یقیناً اس سے بھی بہتر کرتیں۔ وہ بھی اور بچے بھی۔ انہیں بھی سارے خاندان نے مشورہ دیا تھا مگر وہ مان کر ہی نہ دیں۔ تم بتاؤ، تم تو اچھی بھلی راضی تھیں..... آخر تم ایک اچھا اور نیک ارادہ کیوں ترک کرنا چاہتی ہو؟“  
”کون سا ارادہ؟“

”بھئی تم تو منے کے لیے اچھے حالات پیدا کرنے سے انکاری نہ تھیں۔ اب یہ تبدیلی کیوں؟“  
”منے کے لیے تو یہاں بھی حالات اچھے ہی ہیں امی! بلکہ منے کو یہاں سے بہتر حالات تو شاید کہیں بھی نہ مل پائیں۔ شاید می کے گھر میں بھی نہیں۔“

”حقیقت کا اتنا گہرا ادراک رکھتی ہو پھر غلطی کیوں کرنا چاہتی ہو..... دیکھو بیٹا، ہم اور ظہیر صاحب آخر کتنے دن کے ہیں۔ اپنی اپنی سرسبز سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مٹھی میں گنتی کے چند دن باقی ہیں اور وہ بھی پتا نہیں ہیں کہ نہیں۔ منے کو کسی مضبوط ہاتھ کا سہارا ملنا چاہیے جو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا سکھا سکے اور ایک بات اور..... جو ہم صرف تمہی سے کہہ سکتے ہیں۔ ظہیر صاحب سن لیں تو زمین آسمان ایک کر ڈالیں۔ ارے بھئی منے کو زیادہ دن بڑے میاں کی صحبت میں نہیں رہنا چاہیے، وہ اسے زندگی کی جدتوں سے کہاں آگاہ کر سکیں گے۔ کمپیوٹر تک تو آن کرنا آتا نہیں انہیں۔ وی سی آر لگانا ہو تو ہم سے کہتے ہیں ذرا لگا دو۔“  
”میرے مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔“

”دیے بھی بیٹا، ہمارے مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ بیوہ خاتون کا نکاح کر لینا افضل ہے اس لیے ہم تو تمہیں نیک نیتی سے یہی مشورہ دیں گے۔“

”مگر.....“ وہ فقط ایک لفظ یوں بول کر رک گئی جیسے اس سے آگے بولنا دشوار ہو۔

”مگر.....؟“

”وہاں نہیں۔“

”غالباً تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ دی میں نہیں؟“

”جی! اس نے آہستہ سے کہا۔“

”ہم تم سے وجہ نہیں پوچھیں گے کیونکہ ہم اس کا اختیار نہیں رکھتے۔“



”آپ کو پورا اختیار ہے“ یہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”آپ تو مجھ پر ہمیشہ ماں کی طرح مہربان رہی ہیں بلکہ شاید بعض موقعوں پر آپ نے مجھے مجھ سے بھی زیادہ رعایت دی ہے۔“

”یہ تمہاری محبت ہے، سعادت مندی ہے کہ تم ایسا سمجھتی ہو۔“

”آپ نے مجھے اتنا اعتماد دیا ہے کہ میں آپ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ سکتی ہوں.....“ وہ چند ٹائپے کوڑکی پھر اس نے کہا ”میرے لیے یہ تصور ہی سوہان روح ہے کہ اسی جگہ جہاں مجھے منے کے ساتھ فرحان کے پاس جانا تھا، وہاں میں.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ہم تمہاری فیصلہ کو سمجھ سکتے ہیں بیٹا! خدا کی حکمتیں وہی جانے..... کیا عجب کہ اب اسی جگہ تمہیں اور منے کو بلا کر اللہ میاں تم دونوں کو ایسی خوشیاں اور نعمتیں دینا چاہتے ہوں جو شاید تمہیں فرحان کے ساتھ نہ مل سکتیں۔“

یہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

گنتی پازینو پر دج بھی ان کی!

زندگی کے ہر معاملے کو وہ مثبت انداز میں دیکھتیں۔ منفی انداز فکر گویا ان کے مکتب حیات سے خارج از نصاب تھا بلکہ وہ تو تاریک راستوں میں بھی روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ڈھونڈ نکالتیں۔ کوئی عام سی سوچ رکھنے والی ماں ہوتی تو بے کی ناگہاں موت کا صدمہ ہمیشہ کے لیے بہو اور پوتے کی زندگی پر چسپاں کر دینے کی کوشش کرتی مگر ان کا طرز فکر بالکل جدا تھا۔ اماؤس کی راتوں میں بھی روشنی کی لکیر ڈھونڈ نکالنے والا۔

ان کا یہ مثبت انداز فکر ہی تو تھا جس نے ظہیر صاحب کے نفسیاتی مریض ہونے کے باوجود بھی ان کی زندگی صبر تحمل سے گزر وادی تھی۔

”تم وہاں ہوگی تو لیلیٰ سے ملنے کے بہانے ہم بھی ظہیر صاحب کے ساتھ کبھی کبھی وہاں آ جایا کریں گے۔“

”میں..... میں اتنی بڑی آزمائش میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”کیا مطلب؟“

”ایک وجہ اور بھی ہے جو میں بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

”ہم جانتے ہیں۔“

یہ نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا۔

”مگر ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ نعیم کو فرحان کی موت کا ذمے دار ٹھہرانا تو بہت دور کی بات ہے، اس کا شبہ بھی گناہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فرحان کی موت کے بعد ہم بھی کچھ عرصے کے لیے نعیم کی طرف سے گھٹے سے گھٹے تھے مگر وہ اس صدمے کا ایک فوری اور وقتی رد عمل تھا۔ نعیم کی طرف سے ہمارا دل بالکل صاف ہے بلکہ ہم تم سے بھی یہ کہیں گے کہ تمہارے دل میں نعیم کے خلاف جو رجس ہے، اسے نکال پھینکو۔ گلے، شکوے، ناراضگی، رجس ہم انسانوں کو بھی کچھ نہیں دیتے۔ سوائے اس کے کہ ہمارے دل آلودہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دل تو کعبہ ہے یہ بیٹا! اسے تو اجلا، پاک

### الہامی لکائی

ماہ نامہ پاکیزہ میں شائع ہونے والے تمام اشتہارات اور مضامین نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ قارئین اس بارے میں اطمینان کرنے کے بعد اپنی ذمہ داری پر پیش رفت کریں۔ ادارہ اس حوالے سے کسی بھی قسم کے لین دین اور نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے۔

اور حسن ظن کی خوشبو سے معطر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ایک بات بتائیں، ہمیں زندگی میں کبھی کسی سے نفرت نہیں ہوئی اور اس کا جو سب سے بڑا انعام ہم نے پایا، جانتی ہو کیا ہے؟“

میرہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”ہم ہمیشہ بہت پرسکون رہے۔ ان دنوں بھی جب معاشی مشکلات ہوا کرتی تھیں اور آج بھی جبکہ خدا کی مہربانی سے فراغت میسر ہے۔ تم شاید یہ سن کر حیران ہوگی کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے ہم پر کہ صبح کو ناشتے تک کی امید نہ ہوتی تھی مگر ہمارے دسترخوان پر کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا کہ دو چار مہمان نہ ہوں۔ مگر خدا گواہ ہے کہ ہم ان حالات میں بھی پریشان کبھی نہیں ہوئے۔ اللہ پر بھروسہ رکھا اور کبھی اپنے دل کو کسی معاملے میں آلودہ نہ ہونے دیا۔ نعیم اور نعیم ہمارے بچوں کی جگہ ہیں۔ ان کا بچپن، جوانی سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ان کی فطرت سے ہم واقف ہیں، ہمارے بچوں کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ محبت کا رویہ رکھا۔ فرحان پر تو دونوں بھائی جان چھڑکا کرتے تھے۔ انہیں باہر بلایا بھی انہوں نے ہی تھا۔ ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ نعیم نے فرحان کے معاملے میں کوئی غفلت کی ہوگی۔ بس ایک حادثہ مقدور میں لکھا تھا سو ہو گیا۔ نعیم کی شرافت اور مردت کا اندازہ تم اس بات سے کرو کہ منتہا نے جب یہ دیکھ کر کہ تم نعیم کو انتہائی ناپسند کرتی ہو، ان سے یہ کہا کہ وہ کہیں اور شادی کر لیں تو انہوں نے کہہ دیا کہ وہ ان سے اپنی نسبت کو نہیں توڑیں گے خواہ قیامت تک ہی شادی کے لیے انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔“

میرہ نے چونک کر بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”ہاں“ مسز ظہیر بولیں ”اور تم یہ دیکھو کہ وہ بڑے صبر و سکون سے انتظار کر بھی رہے ہیں۔ یہ ان کے کردار کی مضبوطی ہے ورنہ آج کل کے نوجوان تو ممکن ہی تو درکنار نکاح توڑنے میں بھی دیر نہیں کرتے۔“

میرہ کا چہرہ گہری سوچ میں غلطاں نظر آنے لگا۔

”منتہا کا وقت لگا جا رہا ہے۔ تم ڈاکٹر ہو، عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتی ہو کہ اولاد جیسی نعمت حاصل کرنے کے لیے وقت پر شادی ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ خدا نخواستہ ایسا نہ ہو کہ غیر ضروری تاخیر میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ پھر منتہا ہی نہیں باقی فیملی بھی پہنچتا ہے۔“

میرہ کے چہرے پر سوچ کے بادل اور گہرے پڑ گئے۔

”ہاں بھئی، تو پھر کیا کہتی ہو؟“ مسز ظہیر نے اس کے جواب کے لیے تقاضا کیا۔

میرہ نے انہیں الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھا۔

”بولو بیٹا!“ مسز ظہیر پھر متقاضی ہوئیں۔

میرہ کو کچھ دن قبل منتہا سے ہونے والا اپنا گرم مکالمہ یاد آ رہا تھا، اس نے کہا تھا ”نعیم پہلے اور آخری آدمی ہیں جن کو میں نے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔“

اس وقت اسے بہن کی اس بے باکی پر بہت غصہ آیا تھا مگر آج اسے وہ حق بخائب سمجھ رہی تھی۔ اگر وہ خود فرحان کی موت کے بعد اپنے بہتر مستقبل کے لیے ڈاکٹر پیام سے شادی کرنے کا سوچ سکتی تھی اور اب بھی کسی بہتر آدمی سے نکاح ثانی پر آمادہ تھی تو اس نے منتہا کا جائز حق نعیم سے اپنی رنجش کے باعث کیوں سلب کر رکھا تھا۔

”باقی کے ساتھ زیادتی کی ہے میں نے، ان کی شادی میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی۔

مسز ظہیر بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں ہوتا..... کہ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیمنی قطرے زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

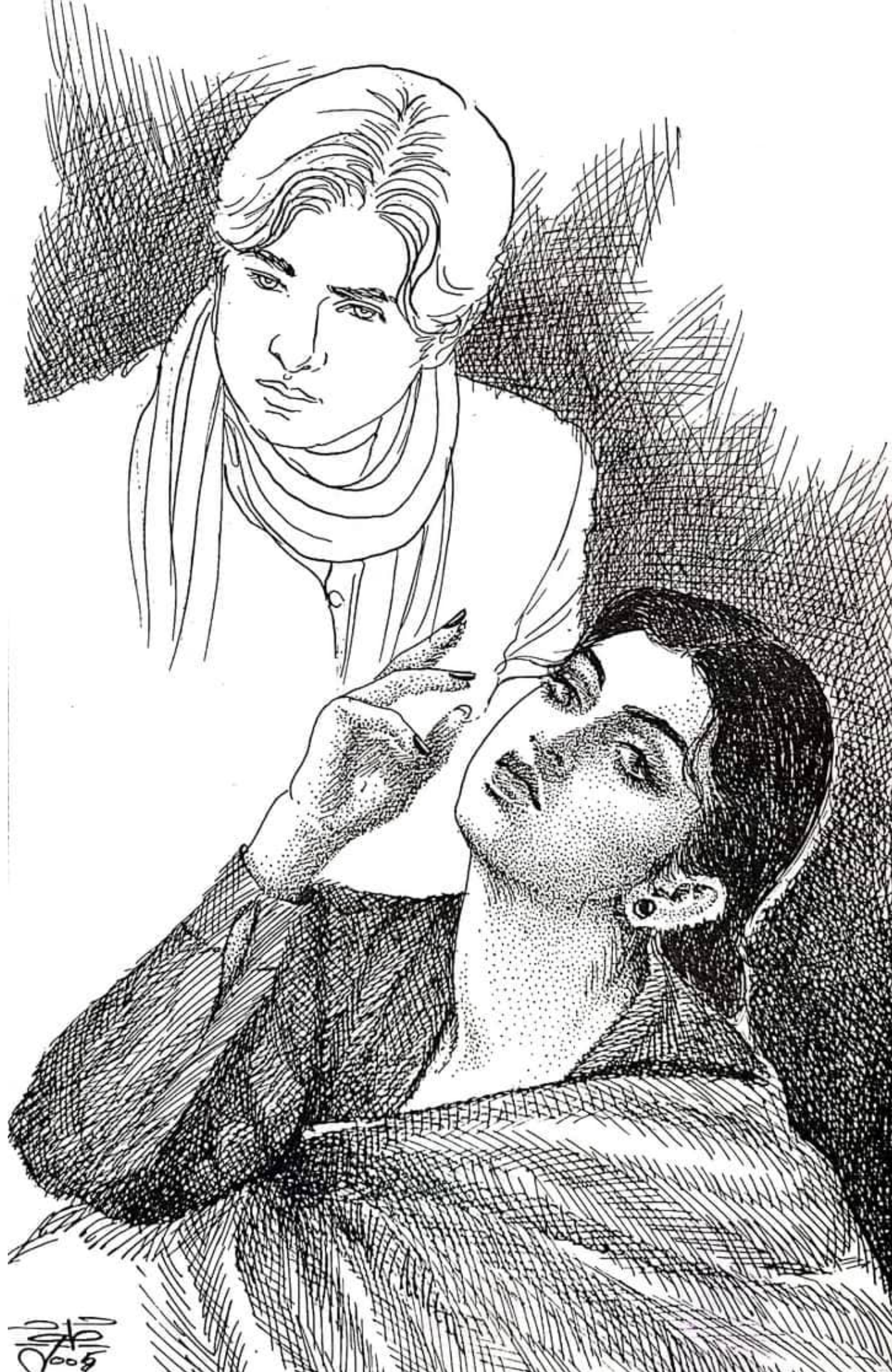
**محبتوں سے گندھے اور یقین سے بندھے شتوں کا چایک مسماں وئے کی دل گلاز داستان**



ناہید سلطانہ اختر









میہ نے می سے بات کرنے میں تاخیر نہیں کی۔  
 ”بس اب باجی کی شادی میں اور دیر نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔  
 می نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”خیریت تو ہے!“  
 ”جی بالکل خیریت ہے۔“ میہ دھیرے سے مسکرائی۔  
 ”مجھے تو کچھ گڑبزدکھائی دیتی ہے۔“  
 ”کوئی گڑبزد نہیں..... باجی کی شادی اب ہو جانی چاہیے۔“  
 ”یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے باجی کی شادی کی فکر کیوں لگ گئی۔“  
 ”کب ان کی شادی ہوگی، کب بچے ہوں گے اور کب انہیں وہ پالیں گی؟“  
 ”ہائیں! ہائیں!“ می نے اسے آنکھیں پھاڑ کر یوں دیکھا جیسے انہیں اپنی سماعت کا بھرم نہ ہو ”کیا کہا تم نے!“  
 ”مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکی۔ چھتیس سال کی ہو گئی ہیں وہ۔“  
 ”ہاں..... ہو تو گئی ہے۔“ می نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔  
 ”تو پھر دیر کیوں کر رہی ہیں آپ!“  
 ”میرا بس چلتا تو کب کی میں اس کے فرض سے سبکدوش ہو گئی ہوتی مگر مجبور میں بھی ہوں اور مجبور وہ بھی۔“  
 ”کوئی مجبوری نہیں۔“  
 ”تمہیں کیا معلوم بھلا!“ می کے لہجے میں دل گر ٹکی تھی۔  
 ”مجھے سب معلوم ہے۔ وہ حضرت آئے ہوئے ہیں چھٹی پر بس آپ بسم اللہ کیجئے۔“  
 می نے اب اسے پہلے سے بھی زیادہ حیرانی سے دیکھا اور بولیں ”عس کی بات کر رہی ہو؟“  
 ”آپ کے ہونے والے داماد اور باجی کے منگیتر نعیم صاحب کی۔“  
 ”چکر کیا ہے!“ می کی نگاہوں اور لہجے میں بدستور حیرانی تھی۔  
 ”کوئی چکر نہیں..... ہمارا دل چاہ رہا ہے باجی کی برات اور ویسے کا کھانا کھانے کو۔“  
 ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“  
 ”بس آپ اتنا سمجھ لیں کہ باجی کی شادی جلد از جلد کرنی ہے۔“  
 ”کیا تم سے تمہارے باپ نے کچھ کہا ہے اس سلسلے میں؟“  
 ”کس نے کہا اور کیا کہا اسے جانے دیجئے..... جو کرنا ہے جلدی کریں۔“  
 ”اوہو! تمہاری باتیں تو میرے ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہی ہیں۔ کچھ بتاؤ تو مجھے۔ کسی نے کچھ کہا سنا ہے یا تم نے کوئی خواب ایسا دیکھ لیا۔“  
 ”میہ انہیں منگلی باندھ کر دیکھنے لگی۔“  
 ”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“  
 ”میہ نے اُن سے نظریں چرائیں اور سر جھکا کر دھیمی آواز میں بولی ”مجھے سب کچھ پتا چل گیا ہے۔“  
 ”کیا!“ می نے چونک کر پوچھا۔  
 ”کہ باجی نے اپنی شادی کو التوا میں کیوں ڈال رکھا ہے۔“  
 ”کیوں ڈال رکھا ہے؟“ می کے لہجے میں عارفانہ تجاال تھا۔  
 ”میہ نے ہل بھر کو نظریں اٹھا کر می کو دیکھا پھر دوبارہ نظریں جھکا کر ایک گہری سانس کھینچنے کے بعد بولی ”میں نے نعیم..... کو معاف کر دیا ہے می۔“ اس کی آواز بھرا سی گئی اور چند ثانیے توقف کرنے کے بعد اس نے مزید کہا ”اس لیے

نہیں کہ میں فرحان کی موت کا صدمہ بھول گئی ہوں بلکہ..... اس لیے کہ..... باجی نے انہیں اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے..... اور میں نے..... آپ کی زبان سے کئی مرتبہ ایک ضرب القتل سنی ہے کہ دشمن کی گلی کیوں چلا کہ وہاں میرا جتن بھی تو رہتا تھا..... باجی کی وجہ سے میں اس شخص کو معاف کر دینے پر مجبور ہو گئی ہوں۔“

مئی انتہائی مطمئن سی نظر آنے لگیں۔

”دیے بیٹا حقیقت یہ ہے کہ نعیم کا قصور تھا بھی نہیں۔“ مئی نے سفارش کرنے والے انداز میں کہا۔

”میں اب اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”چلو بہر حال یہ بھی ایک نیکی ہے کہ تم نے اپنے دل سے نعیم کے خلاف کدورت کو دھو ڈالا۔“ مئی کے چہرے سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

”اب آپ ان حضرات سے کہیے جلد از جلد شادی کا پروگرام بنائیں۔“

”ارے بیٹا وہ تو اشارے کے منتظر ہوں گے۔“ مئی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور اسے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”جہاں تم نے اپنے دل کو اتنا کشادہ کیا وہاں تھوڑا سا دل اور بڑا کر ڈالو۔“

بیہہ انہیں استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”نعیم عمر اور رشتے میں تم سے بڑے ہیں..... نعیم بھائی نہیں کہو گی۔“

بیہہ نے مئی کو گھائل نظروں سے دیکھا۔

”بیٹا..... جب تم نے..... دل کو بڑا کر ہی لیا ہے تو تھوڑا سا اور میرے بچے۔“

بیہہ کا چہرہ اس کے باطنی تناؤ کا آئینہ دار بن گیا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے سر کو یوں اثبات میں ہلایا جیسے مئی کو اطمینان دلانا چاہتی ہو کہ ویسا ہی ہوگا جو وہ چاہتی تھیں۔

☆☆☆

یوں کہنے کو تو گھر کی سربراہ اچھی بھائی تھیں مگر مختار کار نعیم تھا۔ بس اسی کو اشارہ دینا تھا مگر اس سے بات کرنے سے پہلے مئی نے خود اپنے گھر میں صلاح مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ بیہہ کی موجودگی ضروری نہ تھی۔ ملتہا سے بات کرنا بعد کو مؤتلف رکھا۔ ڈیڈی سے ان کی بات چیت تھی نہیں۔ لے دے کر بیٹا اور بہو ہی صلاح کا رتھے۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ علیب نے کہا۔

”اور موقع بھی اچھا ہے کہ نعیم بھائی بھی آئے ہوئے ہیں۔“ ثروت نے کہا۔

”ان کے بار بار چھٹی بڑھوائے کار از سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب سمجھ میں آیا۔“ علیب کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

”خیر چھٹی تو انہوں نے اور دوجہ سے بڑھوائی لیکن شاید اللہ میاں کو یہ بھی منظور ہو کہ اس مرتبہ اور کچھ نہیں تو ان کی موجودگی میں کم از کم تاریخ تو طے ہو ہی جائے۔“ مئی نے کہا پھر بڑے یقین سے بولیں ”اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔“

”مگر پہلے باجی سے ضرور بات کر لیں۔“ علیب نے رائے دی۔

”باجی سے کیا بات کرنی!“ مئی نے ابرو چڑھا کر علیب کو دیکھا۔

”میرا مطلب ہے..... نئے اسکول میں ان کی جوائننگ وغیرہ کا بھی تو مسئلہ ہے۔“

”ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا جو کام ہے بس اسی بارے میں سوچو۔“ مئی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میں اس خیال سے کہہ رہا تھا کہ اگر انہیں چھٹی دلی لینی پڑے تو وہ ابھی سے تیاری کر لیں۔“

”بیٹے! لو کری تو اسے چھوڑنی ہی چھوڑنی ہے۔ ذرا سوچو نعیم کی ملازمت وہاں۔ وہ یہاں بھلا کیسے رہ سکے گی۔“



”بہر حال میں پھر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ باجی سے بات کر لی جائے تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔“

”تمہارے خیال میں کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟“

”وہ اپنی جاب کے ساتھ بہت کمڈ ہیں، ہو سکتا ہے وہ یہ کہیں کہ انہیں کچھ وقت چاہیے۔“

”اب ایک نہیں سنوں گی میں اس کی۔“

”وہ غلط بات ہے مگر پھر بھی میرا خیال ہے ان سے مشورہ کر لینا بھی ضروری ہے۔“

”اچھا بھئی کر لیتے ہیں۔“ مٹی نے نیم دلی سے کہا اور ثروت سے بولیں ”دہن ذرا بلانا تو ملتا ہو۔“

ثروت اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

”مجھے اجازت؟“ علیب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”اپنے..... ڈیڈی کے کان میں بھی ڈال دینا یہ بات۔“ مٹی نے علیب سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

علیب نے کن انگلیوں سے انہیں دیکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا ”کیا ضرورت ہے!“

مٹی نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور غلطی پر ٹوکنے والے انداز میں بولیں ”باپ ہیں تمہارے۔“

”ایک بات بتائیے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں اڑتے ہوئے مٹی کو گہری نگاہوں سے

دیکھتے ہوئے کہا ”جب آپ ان سے بات نہیں کرتیں تو انہیں اتنی اہمیت کیوں دیتی ہیں۔“

اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر مٹی نے نظریں چرائیں اور بولیں ”میں بات کروں یا نہ کروں تمہیں اس سے کیا۔ یہ

میرا اور ان کا معاملہ ہے۔“

علیب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی مگر مٹی سے اپنی مسکراہٹ چھپانے کو اس نے بظاہر معترض لہجے میں کہا ”یہ کیا بات

ہوئی! گویا آپ اور وہ ایک ہیں اور ہم آپ سے الگ۔“

مٹی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی نکلائی تھام لی اور اسے متا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں ”تم تو میری

جان ہو۔“

وہ نیچے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ دھرتے ہوئے بولا ”بس اب صلح کر لیں ڈیڈی

سے۔“

مٹی نے اس کے سر پر پیار سے دھپ لگائی اور آنکھیں دکھاتے ہوئے بولیں ”چلو تو یہاں سے..... بڑا آیا کہیں

سے باپ کی سفارش کرنے والا۔“

تب ہی منتہا آ پہنچی ”جی والدہ آپ نے مجھے بلوایا۔“

”میری سفارش پر غور کیجئے گا۔“ علیب نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور دروازے کا رخ کیا۔

مٹی نے منتہا کو اس کی طلبی کے سبب سے آگاہ کرنے میں کوئی تردد نہ کیا۔ یہ سن کر کہ منتہا نے نعیم کے خلاف بالآخر

سپر ڈال دی تھی اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ مٹی سے اپنی کیفیت پنہاں رکھنے کے لیے اس نے نظریں

جھکائے رکھنا ہی بہتر جانا۔

”منتہا کا مسئلہ تو حل ہو جانے دیجئے والدہ۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”اللہ نے چاہا تو اس کا بھی ہو جائے گا مگر اب پہلے تمہارا۔“

”مجھے ہائی اسکول میں جوائننگ بھی دینی ہے۔“

”خبردار جو اور ایک لفظ بھی نکالا تم نے منہ سے۔“

”لو کری ہے والدہ۔“

”لو کری کے بغیر گزارہ ہو جاتا ہے مرد کے بغیر نہیں ہو پاتا۔“

”کبھی کبھی الٹ بھی ہوتا ہے والدہ۔“

ممی کا لہجہ بدل گیا ”ہاں بیٹا سچ کہتی ہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل گرتلی سے کہا ”تمہاری نوکری نے واقعی بہت ساتھ دیا مگر وقت کے ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اب تمہارا گھر بسا تمہارے نوکری کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔“

”پہلے میہ کا.....“

”بڑی تم ہو کہ میہ..... اور میہ کا تو آخر ہو ہی گیا تھا بس اللہ کی مرضی..... دوبارہ منظور ہوا اللہ کو تو دوبارہ بھی ہو جائے گا..... میں نعیم سے کہتی ہوں بھیجیں اپنے گھر والوں کو تاریخ لینے کے لیے۔“

اس نے کچھ کہنا چاہا۔

ممی نے آنکھیں دکھائیں۔

اور اسے کچھ کہنے کی جانہ رہی۔

☆☆☆

نعیم کو بس اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ اچھی بھابی کا تو دل گویا کھل اٹھا۔ فرط مسرت سے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ انہوں نے نعیم کو متا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ”ایسی خبر سنائی ہے تم نے کہ میرا بس چلے تو اٹھوں اور ابھی تمہارے ساتھ تمہاری سسرال جا پہنچوں۔ بس اب شادی کیے بغیر نہیں جانے دوں گی میں تمہیں دیتی۔“

”امی جان فی الحال تو آپ صرف ڈیٹ فکس کرنے کا پروگرام رکھیں۔ شادی انشاء اللہ اگلی بار۔“

”ہرگز نہیں..... اسی مرتبہ۔“

”اس بار کافی چھٹی لے لی ہے میں نے۔“

”کوئی بات نہیں کچھ دن کی اور سہی۔“

”امی جان..... مشکل ہو گا۔“

”بس میں نے کہہ جو دیا۔“ اچھی بھابی فیصلہ کن لہجے میں بولیں ”اب ایک لفظ بولنے کی ضرورت نہیں تمہیں..... خدا خدا کر کے تو یہ دن آیا ہے..... میں تو سوچتی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری شادی کی حسرت لیے لیے اس دنیا سے سدھار جاؤں..... ہاں یہ بتاؤ ان کے ہاں جانا کب ہے؟“

”یہ آپ کا اور ان لوگوں کا معاملہ ہے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”اچھا خیر میں بات کر لوں گی ان سے بلکہ ابھی کرتی ہوں..... ارے بھئی یہ تو بتاؤ ان کے ہاں جائے گا کون کون تاکہ وہ اگر پوچھیں کہ کتنے لوگ آرہے ہیں تو میں انہیں بتاؤں سکوں۔“

”یہ بھی آپ ہی جانیں۔“

”ادو! میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ ڈھیروں کام کرنے ہوں گے بھی لیلیٰ اور نعیم کو فون کرو، مگر لیلیٰ بے چاری تو دوسرے حال میں ہے۔“

”پہلے آپ ملتا کی می کو فون کر لیں۔“ نعیم دھیرے سے مسکرا دیا۔

”لاؤ نمبر ملا کر دو مجھے۔“

نعیم نے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ بڑھا کر ان کے سر ہانے رکھا ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھینچا۔

”اچھا ٹھہرو۔“

نعیم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”پہلے میں دو رکعت نفل ادا کر لوں..... شکر ہے میرے مالک کا جس نے یہ منزل بھی آسان کی۔“ اچھی بھابی نے



اٹھنے کا قصد کیا۔ نعیم نے انہیں اپنے ہاتھ کا سہارا دیا ”خدا اگلی منزلیں بھی آسان کرے۔“ اچھی بھابی نے صدقِ دل سے دعا کی۔

☆☆☆

منزِ ظہیر کافی دیر سے ثاقب کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ ظہیر صاحب منہ میں کھٹکھٹیاں ڈالے سن رہے تھے۔ ان کی خاموشی سے تنگ آکر منزِ ظہیر زچ ہو گئیں۔

”ارے بھئی ہماری بات کا کوئی جواب تو دیں۔“

”کیا سارے ایڈجیکٹوز ختم ہو گئے؟“ ظہیر صاحب نے انہیں میڑھی نظروں سے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”ایک ان دیکھے انجانے شخص کی اتنے دنوں سے اتنی تعریف سن رہا ہوں کہ مجھے تو اب وہ مشکوک لگنے لگا ہے۔“

”ان دیکھا ضرور ہے انجانا نہیں۔ لیلیٰ اور فہیم اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ فہیم سے تو اس کی دوستی بھی ہے۔“

”دوستی کو دشمنی میں بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔“ ظہیر صاحب کے لہجے میں چہمن تھی۔

منزِ ظہیر انہیں دیکھنے لگیں۔

”فرحان سے بھی تو دوستی ہی تھی تمہارے دونوں بھتیجیوں کی۔“

”پلیز!“ منزِ ظہیر نے انہیں ہلکی نگاہوں سے دیکھا ”آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ فہیم سے ہمارا ایک اور رشتہ بھی ہے۔“

”بد قسمتی سے!“

”کیوں بُری بات نکالتے ہیں منہ سے..... خدا نظرِ بد سے بچائے لیلیٰ ہماری بہت خوش ہیں فہیم کے ساتھ۔“

”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“

”تو بہ کیجئے، کیسے منہ بھر کر آپ نے کہہ دی یہ بات۔ باپ ہیں دعا دیجئے بیٹی کو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے دعا نہیں کرتا ہوں گا میں اپنی بیٹی کے لیے۔“

”بیٹی کو خوش رکھنے والوں کے لیے بھی دعا کیا کریں۔“

”لعت بھیجتا ہوں۔“ ظہیر صاحب ہنسنے لگے۔

”ادھ خدا! آخر کب تک آپ..... ان بے گناہوں کو نا کردہ گناہ کی پاداش میں گنہگار گردانتے رہیں گے۔ رسولِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہیں جنہوں نے بدترین دشمنوں کے معاملے میں بھی عفو و درگزر سے کام لیا۔ نعیم اور فہیم تو ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہیں۔ ہم سب نے ان کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیا ہے، اب آپ کو بھی کر لینا چاہیے۔“

”کیا!“ ظہیر صاحب نے ہڑبڑا کر انہیں دیکھا ”کیا کہا تم نے!“ ان کے لہجے میں بے یقینی کی کیفیت تھی ”کس نے! کس نے کس کی طرف سے دل صاف کر لیا!“

”ہم سب نے..... یہہہ عدنان اور ہم نے..... نعیم کی طرف سے۔“ منزِ ظہیر نے بے خوف و خطر اور بلا جھجک کہا۔

”ہوش میں تو ہوا!“ ظہیر صاحب نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

”الحمد للہ!“ وہ دھیرے سے مسکرائیں۔

”میں..... میں..... عدنان کو تو میں عاق کر دوں گا۔“

”ہمیں اور یہہ کو؟“ مسز ظہیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں..... میں.....“ ظہیر صاحب نے جڑے بھنچے لیے اور مٹھیاں جکڑ لیں۔ ان کی پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی دکھائی دیئے گئیں۔  
 کوئی اور موقع ہوتا تو مسز ظہیر انہیں اعصابی ہيجان میں دیکھ کر گھبرا گئی ہوتیں لیکن اس وقت وہ بالکل اطمینان سے بیٹھی چپ چاپ انہیں دیکھتی رہیں۔  
 ”میرا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔“ ظہیر صاحب غرغراتی آواز میں بولے۔  
 مسز ظہیر اسی طرح ساکن و صامت رہیں۔  
 ”میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔“ ظہیر صاحب نے اپنے جسم کو اکڑاتے ہوئے کہا۔  
 مسز ظہیر ویسے ہی پُرسکون نظر آتی رہیں۔  
 ”مر رہا ہوں میں۔“ ظہیر صاحب ہڈیاں انداز میں چلائے۔  
 ”کچھ نہیں ہو رہا ہے آپ کو۔“ مسز ظہیر نے بڑے اطمینان سے کہا۔  
 ”کیا! کیا کہا!“ ظہیر صاحب یوں آنکھیں پھاڑ کر چلائے جیسے انہیں اپنی سماعت اور بصارت دونوں ہی کا اعتبار نہ ہو۔

”بالکل ٹھیک ہیں آپ..... سمجھے۔“ مسز ظہیر نے انہیں گھورا۔  
 ”کیا! ٹھیک ہوں! مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔“ وہ غرائے۔  
 ”ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔“ مسز ظہیر اپنی جگہ سے اٹھیں اور ان کے نزدیک جا کر ان کے شانے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں بولیں ”آپ کو کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ بالکل ٹھیک ہیں آپ اور اطمینان رکھئے آپ مر بھی نہیں رہے۔ مرنے والا نہ تو دوسروں کو یوں آنکھیں دکھاتا ہے جیسے آپ ہمیں دکھا رہے ہیں اور نہ اس طرح چلاتا ہے جیسے آپ چلا رہے ہیں، اس بے چارے کی تو جان پر بنی ہوئی ہے۔“  
 ظہیر صاحب نے سراٹھا کر انہیں دیکھا اور بے کسی ظاہر کرتے ہوئے بولے ”ارے کیسی بیوی ہو تم!“  
 ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہوتے اگر ہم صحیح قسم کی بیوی تو اپنی ساری زندگی آپ کی ناز برداریوں میں اور قدم قدم پر کسی بچے کی طرح آپ کا خیال رکھنے میں نہ گزارتے۔“ مسز ظہیر بولیں۔  
 ”کیا مطلب!“

”مطلب یہ کہ اب آپ یہ خواہ مخواہ کا غصہ، بد مزاجی اور ہر حال میں اپنی بات منوانے کی عادت چھوڑ دیجئے ورنہ نقصان میں رہیں گے۔ ہم نے ساری زندگی وہی کیا جو آپ نے چاہا مگر اب وہ نہیں ہوگا جو آپ چاہتے ہیں۔“  
 ”کیا! کیا چاہتا ہوں میں!“

”مُنے کو یہ غمال رکھ کر آپ یہہ سے یہ تاوان وصول کرنا چاہتے ہیں ناکہ وہ اپنی بکھری ہوئی زندگی کو سینے کی کوشش نہ کریں مگر ہم..... ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے..... کتنے عرصے سے ہم آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہہ کا گھر دوبارہ بسنا ان کا جائز معاشرتی حق ہے اور اس کا رُخیر میں حصہ لینا نیکی مگر آپ..... آپ سمجھ کر ہی نہیں دیتے..... ہم یہ نیکی ضرور کریں گے..... ہم اپنے مُنے کو بن باپ کا نہیں دیکھنا چاہتے..... ہم یہہ کا گھر اپنے ہاتھوں سے بسائیں گے اور اگر آپ نے اس نیک کام میں ہمارے آڑے آنے کی کوشش کی تو ہم عدنان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لیلیٰ کے پاس چلے جائیں گے..... اکیلے رہ جائیے گا آپ۔“  
 ظہیر صاحب ہکا بکا سنتے رہے۔

”اور ایک بات اور سن لیجئے آپ..... نعیم کی طرف سے ہم سب اپنا دل صاف کر چکے، اب کوئی ہمیں اور ہمارے



بچوں کو اچھی بھابی اور نعیم سے ملنے سے نہیں روک سکتا۔ ہم آج ہی عدنان کے ساتھ اچھی بھابی اور نعیم سے ملنے جائیں گے۔“

ظہیر صاحب کے لبوں کو حرکت ہوئی ”مجھے..... مجھے نچا دکھانے کے لیے۔“  
 ”جی نہیں..... اپنی اس غلطی کے ازالے کی پہلی قسط ادا کرنے کے لیے کہ کیوں ہم نے اتنے سال اتنے پیارے رشتوں کو ایک ایسی رنجش کی خاطر چھوڑے رکھا جسے اللہ کی مرضی سمجھ کر صبر سے بھی تو کام لیا جاسکتا تھا۔“  
 ”اولاد کو بھی میرے خلاف اپنے ساتھ ملا لینا چاہتی ہو۔“ ظہیر صاحب شکستہ لہجے میں بولے ”بغاوت کرنا چاہتی ہو۔“

مسز ظہیر ان کے رُوبرو جا تھمیں اور انہیں احترام و محبت سے دیکھتے ہوئے بولیں ”اب تو ہمارے پاس عمر کی نقدی ختم ہونے کو ہے ظہیر صاحب، اب آپ سے بغاوت کر کے اپنی عاقبت خراب کریں گے کیا ہم۔“  
 ”تو پھر دھمکیاں کیوں دے رہی ہو!“ ظہیر صاحب نے شاکی لہجے میں کہا۔  
 مسز ظہیر کو وہ ایک معصوم سا بچہ لگے۔

”ہماری کیا مجال کہ ہم آپ کو دھمکیاں دیں۔ ہمیں تو ہماری اماں جان نے یہی سمجھایا تھا کہ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ اس کا احترام واجب ہے۔ اس سے محبت کرنا ضروری ہے۔ ہم اماں جان کی اس نصیحت کو اس بڑھاپے میں بھی اپنے پلو میں باندھے ہوئے ہیں۔“ انہوں نے ظہیر صاحب کا بازو تھام لیا اور انہیں بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے انتہائی لجاجت سے بولیں ”ہم نے ساری زندگی آپ سے کچھ نہیں مانگا، کوئی ڈیمانڈ نہیں کی بس پہلی اور آخری مرتبہ آپ سے ایک درخواست کر رہے ہیں اور وہ یہ کہ نعیم کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیں۔“

ظہیر صاحب کی نگاہوں میں پھر خشونت اٹھ آئی ”بیٹے کے قاتل کو معاف کر دوں!“  
 ”بجدا ایسا نہیں ہے۔“ مسز ظہیر بولیں ”ہمیں عدنان کی قسم ہمیں یقین ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔“  
 ظہیر صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ مسز ظہیر کی باندھے انہیں دیکھتی رہیں پھر ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولیں ”کبھی کبھی کوئی گہرا صدمہ اس بُری طرح ہمارے دل کو مجروح کر دیتا ہے کہ ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہم صحیح اور غلط میں تمیز کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ دوست ہمیں دشمن اور دشمن دوست دکھائی دیتا ہے۔ فرحان کی موت بھی ہم سب کے لیے ایسا ہی ایک صدمہ تھی۔ ان کی موت کو ہم نے مشیت ایزدی سمجھنے کے بجائے نعیم کو اس کا ذمے دار قرار دیا حالانکہ یہ شاید ہمارے ایمان کی کمزوری تھی۔ موت اور زندگی کے بارے میں ایک مسلمان کو تو یہ ایمان رکھنے کی ضرورت ہے کہ جس کو خدا بچانا چاہے اسے کوئی مار نہیں سکتا اور جس کی قضا آگئی اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔“ مسز ظہیر نے چند لمحوں کو توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوئیں ”زخم کتنا ہی گہرا ہو بالآخر بھر جاتا ہے۔ فرحان کی موت کو بھی ہم سب نے مشیت ایزدی سمجھ کر نعیم کو بری الذمہ سمجھ لیا ہے۔ آپ کو بھی ایسا ہی کر لینا چاہیے ورنہ..... ہم یہ یقین رکھتے ہیں ظہیر صاحب کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کو کسی اذیت سے دوچار رکھتا ہے وہ خود اس سے بڑھ کر اذیت میں رہتا ہے۔ سچ کہیے کیا ہم غلط کہہ رہے ہیں۔“

ظہیر صاحب انہیں الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگے۔  
 ”پلیز! ہماری خاطر نعیم کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیں۔“

ظہیر صاحب انہیں ویسے ہی دیکھتے رہے۔

”آپ کو ہماری قسم!“

ظہیر صاحب کے تاثرات سر مونہ بدلے۔

”نفرت انسان کو کبھی کچھ نہیں دیتی۔ محبت، اخوت اور غنود درگزر کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔“ مسز ظہیر لمحہ بھر کو

رکس ”ایک لمحے کو یہ سوچنے ذرا کہ اگر نعیم کی جگہ عدنان گاڑی چلا رہے ہوتے اور حادثہ ہوتا تو کیا آپ عدنان کو بھی اسی طرح فرحان کی موت کا ذمے دار سمجھتے۔ اسی طرح ان سے بھی نفرت کرتے.....! بولے.....“

ظہیر صاحب بدستور خاموش رہے۔  
 ”آپ ایسا ہرگز نہ کرتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ نے بلکہ ہم سب نے بھی اس حادثے میں صرف فرحان کے مرنے اور عدنان کے زندہ بچ رہنے پر خدا کا شکر ادا کیا ہوتا۔ نعیم بھی تو ہمارے لیے اولاد ہی کی طرح ہیں۔ ان کی طرف سے آپ نے اپنے دل میں اتنی سخت گرہ کیوں ڈال لی۔ کیا آپ بھول گئے کہ..... اس حادثے سے پہلے آپ نعیم سے کتنی محبت کیا کرتے تھے۔ محبت اتنی ناپائیدار تو نہیں ہوتی ظہیر صاحب اور..... اگر..... ناپائیدار ہوتی ہے تو پھر وہ محبت نہیں ہوتی۔“

ظہیر صاحب نے سر جھکا لیا اور جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے۔  
 ”آپ کی اسی ناراضی کی وجہ سے اتنے عرصے سے نعیم اور منجہا کی شادی کا معاملہ بھی التوا میں ہے۔ نعیم کہتے ہیں جب تک پھوپا جان شریک نہیں ہوں گے میں شادی نہیں کروں گا۔“ آخری بات منظر ظہیر نے مسکراتے اپنے دل سے گھڑی۔

ظہیر صاحب نے چونک کر سر اٹھایا۔  
 ”منجہا کے گھر والے ان کے فرض سے جلد از جلد سبکدوشی چاہتے ہیں مگر صرف آپ کی وجہ سے بات انکی ہوئی ہے۔ آپ کو یاد ہے نا ہم بھی بچیوں کے فرض سے سبکدوشی کے لیے کتنے فکر مند رہا کرتے تھے۔ بس ہم کہہ دیتے ہیں اچھی بھابی سے اور منجہا کے گھر والوں سے کہ بسم اللہ کریں۔“

ظہیر صاحب نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔  
 منظر ظہیر نے لوہا گرم دیکھ کر اگلی ضرب لگائی ”ایک دو دن میں ہم اچھی بھابی اور نعیم کو بلا رہے ہیں اپنے ہاں۔“

ظہیر صاحب تھوڑا سا کسمائے۔  
 ”بس آپ نعیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیجئے گا۔“  
 ظہیر صاحب نے انہیں کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہتے ہوں مجھے مجبور مت کرو۔ چند ثانیے وہ انہیں اسی طرح دیکھتے رہے پھر بولے ”میں گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہوں جو مرضی آئے کرو۔“

”بہت خوب! یہ بدلہ دے رہے ہیں آپ ہمیں ہماری عمر بھر کی ریاضت کا اس عمر میں گھر چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے ہیں۔ ارے ہم نے تو اس عمر میں ایسا کچھ نہیں سوچا جب ہمارے سامنے بہت سے راستے کھلے تھے۔“

”تم..... تم مجھ سے چاہتی کیا ہو!“  
 ”محبت..... منہا مت..... اپنے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی۔“

”پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے تم میرے کان کھا رہی ہو۔“  
 ”انشاء اللہ آئندہ آپ کو اس شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔“ منظر ظہیر مسکرائیں پھر انہوں نے ظہیر صاحب سے بہت محبت سے پوچھا ”یہ بتائیے اچھی بھابی اور نعیم کو ہم شام کی چائے پر بلائیں یا رات کو کھانے پر۔“

”مجھے کیا پتا۔“  
 ”تو پھر کس سے پوچھیں ہم..... ارے بھئی ہمارے شریک زندگی، شریک سفر تو آپ ہیں۔ پلیز بتائیے نا پھر ہمیں بندوبست بھی کرنا ہے۔“

”چائے پر کیا بلاؤ گی، کھانے پر ہی بلا لو۔“ ظہیر صاحب نے قدرے انکپا کرتے ہوئے ہی سہی بالآخر جواب دے ہی دیا۔



اور مسز ظہیر کو یوں لگا جیسے ان کی زندگی میں اس سے پہلے اتنا سخت مگر ایسا خوشگوار مرحلہ کبھی نہیں آیا تھا۔ سوئے اتفاق یہ وہی وقت تھا جب لیلیٰ اور نعیم کو یہ اطلاع دینے کے بعد کہ جمعے کی شام ملتہا کے گھر والوں نے شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے بلایا تھا، اچھی بھابی نعیم سے کہہ رہی تھیں ”لیلیٰ تو اتنی خوش ہو میں، کہنے لگیں آپ میری وجہ سے دیر مت کیجئے گا۔ ابھی سات ہفتے باقی ہیں آپ بس آخری ہفتے سے پہلے کوئی تاریخ رکھ لیجئے گا۔“

”اتنی جلدی کیسے ممکن ہو گا امی جان۔“

”ناممکن ہونے کی بھی کوئی بات نہیں۔ ہم نے اپنے ہی خاندان میں ہفتہ دو ہفتے میں بھی شادیاں ہوتے دیکھی ہیں۔“

”ہونے کو تو ایک دن میں بھی ہو جاتی ہے امی جان۔ وہ کیا مثل ہے چٹ منگنی چٹ بیاہ۔“

”چٹ نہیں پٹ بیاہ۔“ اچھی بھابی مسکرا کر بولیں ”اچھا بھئی اب یہ سوچو کہ تاریخ لینے کے لیے ہمارے ساتھ جائے گا کون کون.....“

”یہ سوال واقعی اہم ہے۔“

”تمہاری پھوپھی جان ہوتیں تو مجھے ذرا فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ سب سنبھال لیتیں۔ بہت کی محسوس ہو رہی ہے مجھے اس وقت ان کی۔“

”پھوپھی جان ہوتیں کا کیا مطلب امی جان، وہ تو ماشاء اللہ اب بھی ہیں۔“

اچھی بھابی نے ایک سرد آہ کھینچی اور دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”مگر حالات تو وہ نہیں ہیں بیٹے۔“

”پہلے سے تو کافی بہتر ہیں امی جان۔“

”ہاں مگر..... تمہارے پھوپھا جان..... اگر وہ راضی نہ ہوئے تب تو ان کے باقی گھر والوں کا شریک ہونا بھی مشکل ہو گا۔“ اچھی بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”کبھی کبھی محبت سے بندھے اور یقین سے گندھے رشتے بھی کس بڑی طرح مجروح ہو جاتے ہیں۔“

نعیم نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بہت محبت اور احترام سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کے درمیان لیتے ہوئے کہا ”مجھے پھوپھا جان کے پاؤں بھی پکڑنے پڑے تو پکڑ لوں گا امی جان۔“

”بہت دعائیں لی ہیں تم نے میری۔“ اچھی بھابی نے اسے ماما بھری نگاہوں سے دیکھا ”خدا کرے تمہارے پھوپھا جان کی ناراضی بھی ختم ہو جائے۔“

یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ ادھر مسز ظہیر اپنے گھر میں ظہیر صاحب سے ایک طویل مکالمے کے دوران مختلف نفسیاتی حربے آزما کر بالآخر انہیں نعیم سے اپنی کئی سالہ ناراضی دور کرنے پر آمادہ کر چکی تھیں اور ادھر اچھی بھابی اپنے گھرانے سے ظہیر صاحب کی ناراضی دور ہو جانے کے لیے دعا گو تھیں۔

قبولیت کی گھڑی کبھی ایسی غیر معمولی مستعدی کا مظاہرہ بھی کر گزرتی ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھنے کا انتظار بھی نہیں کرتی!

☆☆☆

ملتہا ان دنوں ذہنی طور پر خاصی الجھی ہوئی تھی۔ ہائی اسکول میں اس کی جوائننگ اور شادی کے دن آگے پیچھے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ می کو اس نے یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی کہ اسے اتنی مہلت ضرور دیں کہ وہ ہائی اسکول میں اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے کے بعد اپنی ملازمت کے سلسلے میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کر سکے مگر می نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس نے درپردہ نعیم سے اس سلسلے میں تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ بھی طرح دے گیا۔

”آپ کی تو سرکاری نوکری ہے اور قطعاً آپ کی ضرورت یا مجبوری بھی نہیں۔ مجھے دیکھیے پرائیویٹ نوکری ہے

اور سالانہ چھٹی کے ساتھ دوسرے چھٹی میں اضافہ کروا چکا ہوں۔ میں نے امی جان سے کہا تھا فی الحال تاریخ طے کر لیں، میں واپس چلا جاتا ہوں۔ ایک دو ماہ بعد دوبارہ چھٹی لے کر آ جاؤں گا مگر انہوں نے مجھے مہلت دینے سے انکار کر دیا۔ میں تو خود اس وقت بہت ہنگامی حالات میں ہوں۔ دوڑا دوڑا واپس جاؤں گا۔ باس کی منت سماجت کروں گا کہ بہت انتظار کے بعد شادی ہو رہی ہے اور امید ہے کہ ایک ہی بار ہوگی لہذا مجھ پر کرم کرے اور مجھے چھٹی عنایت کرے۔ چھٹی دے دی اس نے تو آ کر شادی کر لوں گا۔“

”اور اگر نہ دی؟“

”تو نوکری یا شادی میں سے کوئی ایک چیز چھوڑنا پڑے گی۔“

”آپ کے چھوڑیں گے؟“

”ظاہر ہے نوکری کو..... کیونکہ شادی بہت مشکل سے ہو رہی ہے۔ نوکری تو دوبارہ کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔“

اس کے لہجے سے خلافِ عادت شوخی جھلک رہی تھی۔

”آ..... آپ امی جان کو یہ سمجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ ان لوگوں کی غلت ہمارے لیے مسائل پیدا کر دے گی۔“

”بہت کوشش کی مگر..... انہوں نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا ہے، ویسے آپ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“

استغنیٰ دیں اور چھٹی کریں۔“

”کٹ منٹس کو اس طرح نہیں چھوڑا جاتا۔“

”چھوڑنی تو ہوگی بہر حال۔“

”نوکری اصولوں کے ساتھ کی جاتی ہے اور قاعدے ضابطے کے تحت چھوڑی جاتی ہے۔“

”بجاء.....! مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تاریخ مقرر ہوتے ہی مجھے واپس کے لیے پہلی

دستیاب پرواز پکڑنی ہے۔“

تاریخ طے ہو گئی تھی۔ ہائی اسکول میں اس کی جوائننگ کے صرف تین دن بعد شادی تھی اور چوتھے دن ولیمہ!

اس نے بہت چاہا کہ جوائننگ کے بعد کم از کم پندرہ بیس دن کا وقفہ تو رکھا جائے تاکہ چارج سنبھالنے کے فوراً بعد

ہی چھٹی لینے کا مسئلہ نہ ہو حالانکہ وہ بھی ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا۔ جمع شدہ چھٹی کے کھاتے سے چھٹی لینے کے بجائے

اتفاقی رخصت کے سالانہ کوٹے سے بھی چھٹی لی جاسکتی تھی۔ درحقیقت وہ ہائی اسکول کے معاملات کو پندرہ بیس دن

دیکھ لینے اور سمجھنے کے بعد چھٹی لینا چاہتی تھی۔

گھر میں کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور بات می کی بھی بہت جائز اور معقول تھی۔ آگے لیلیٰ کے ہاں بچے کی

ولادت کا مرحلہ جو آ رہا تھا، اسے بھی تو مد نظر رکھنا تھا۔ مقرر کی جانے والی تاریخ سے آگے پندرہ بیس دن بعد کی تاریخ

رکھی جاتی تو لیلیٰ کی شرکت مشکل یا پھر ناممکن ہی ہو جاتی اور یہ کیسے ممکن تھا بھلا کہ شوہر کا ایک ہی بھائی اور وہ اس کی

شادی میں شریک نہ ہوتی۔ ویسے بھی اس خبر سے کہ شادی کی تاریخ طے پانے کی تقریب میں اس کے میکے والے بھی

شریک ہوئے تھے وہ اور فہیم دونوں ہی بہت خوش تھے۔ دونوں گھرانوں کے مابین کئی سال بعد تعلقات کی بحالی سے

آنے والی تقریب کی اہمیت دوچند ہو گئی تھی۔

فہیم حسبِ پروگرام دینی واپس چلا گیا تھا۔ شادی کی تیاریاں دونوں گھرانوں میں بڑے زور شور سے جاری

تھیں۔ ابھی بھائی نے اپنی طرف سے تیاریوں کے سلسلے میں مکمل ذمے داری سنبھال کر سونپ دی تھی۔ لیلیٰ اپنی طبیعت

کا استعمال بھول کر بڑے ذوق شوق سے شاپنگ پر شاپنگ کر رہی تھی۔ میکے اور سسرال سے تو اس کا مسلسل رابطہ تھا ہی

منجہا کی پسند ناپسند معلوم کرنے کے لیے وہ جب ضرورت محسوس کرتی بلا تکلف منجہا کو فون کر لیتی۔



سب ہی خوش تھے اور شادی کی تیاریوں میں مگن مگر ملتہا اپنی ملازمت کے سلسلے میں انتہائی فکر مند تھی۔ گھر والوں کی رائے یہ تھی کہ اسے ملازمت سے استعفیٰ دے دینا چاہیے اور اس کا دل کہتا یہ طویل رفاقت ٹوٹنے نہ پائے۔ ملازمت اس کے لیے محض نوکری نہیں رہی تھی شوق، لگن، عیش بن گئی تھی۔ اسے لگتا وہ اپنی زندگی کے سب سے مشکل دورا ہے پر کھڑی تھی۔

مسز ظہیر سے مشورہ لیا تو وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بولیں ”دیکھو بھئی ہمارا خیال تو یہ ہے کہ خواتین کو بالخصوص شادی شدہ خواتین کو تو ملازمت ضرورت کے تحت ہی کرنی چاہیے۔ اگر کسی خاتون کو معاشی کفالت میں شوہر کا ہاتھ بٹانے کی ضرورت نہ ہو تو اسے گھر بیٹھنا چاہیے اور وہ وقت جو وہ شوقیہ ملازمت کو دیتی ہے اپنے گھر اور گھر والوں کو دینا چاہیے۔ ویسے بھی جب تمہیں رہنا دینی میں ہے تو پھر یہاں اپنی ملازمت کیونکر برقرار رکھ سکو گی۔“

”وہ آپ کی مرضی ہے..... مگر ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ جب ملازمت کی ضرورت نہ ہو تو کسی حق دار کے لیے جگہ خالی کر دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔“

مسز ظہیر کی بات اس کے دل کو لگی تو مگر دل ان دنوں اس بیمار کی طرح متلون ہو رہا تھا جو ایک معالج کو نبض دکھا کر مطمئن نہیں ہوتا، سو اس نے فضلہ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔

”میں تمہیں ملازمت چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے سکتی ملتہا..... کیونکہ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ مرد دھوکا دے جاتا ہے۔ شادی ٹوٹ جاتی ہے مگر نوکری ساتھ دیتی ہے۔“

ملتہا نے اسے مذہب نہ بھولے ہوئے دیکھا۔

”نہیں نہیں۔“ فضلہ نے اپنی نرم گرم مسکراہٹ سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی ”خدا خواستہ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں..... اللہ کرے تم سدا سگھی رہو اور تمہارا شوہر ہمیشہ تم سے وفادار رہے۔ میں نے تو اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔ تم اسے اتفاق سمجھو یا میری بدقسمتی کہہ لو کہ میرے لیے تو شادی ایک نہیں دو بار انتہائی تلخ تجربہ ثابت ہوئی۔ ایک جو جس میں ہر دو بار میں اپنی پونجی ہار گئی۔“

”کہاں ہیں وہ حضرت آج کل؟“

”کچھ خبر نہیں..... جب چھوٹی اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریر میں مجھے باپ کے نام خط لکھ کر دیتی اور اسے پوسٹ کرنے کو کہتی ہے تو میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ کہاں، کس پتے پر پوسٹ کروں میں اس کے لکھے ہوئے خط!“

”کیا کرتی ہو اس کے خطوں کا؟“

”بڑی رازداری سے جمع کرتی جاتی ہوں۔“

”کیوں؟“

فضلہ کی آنکھیں یک بارگی ڈبڈبائیں ”کبھی تو.....“ وہ بوجھل سی آواز میں بولی۔ ”ملتہا کبھی نہ کبھی تو وہ شخص واپس لوٹے گا۔ میں چھوٹی کے تمام خط پڑھواؤں گی اسے۔“

ملتہا نے اسے الجھی الجھی نگاہوں سے دیکھا ”کیوں ہے تمہیں اس کا انتظار؟“

فضلہ بڑے کرب سے مسکرا دی ”کیوں ہے اس کا انتظار!“ اس نے کھٹی کھٹی آواز میں ملتہا کے الفاظ دہرائے پھر دھیرے سے بولی ”کیونکہ وہ میری اور میرے بچوں کی پہچان ہے۔“

ملتہا پھر اسے ویسی ہی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو!“ فضلہ کے لبوں پر موم سی مسکراہٹ ابھری۔

”جب تم ایسی باتیں کرتی ہو تو میری والدہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں لگتیں۔“  
 ”اچھا!“ فضہ دھیرے سے مسکرائی ”شاید اس لیے کہ عورت کا خمیر تو ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے نا۔ تمہاری والدہ ڈیڈی کے آنے سے خوش تو بہت ہوں گی؟“

”ہاں..... لگتی تو خوش ہی ہیں مگر..... ابھی سفارتی تعلقات بحال نہیں ہوئے ہیں دونوں کے درمیان۔“  
 ”وہ بھی ہو جائیں گے۔ ہم جیسی عورتیں مردوں کی زیادتیوں کے باوجود ان سے ناراض رہ ہی نہیں سکتیں بظاہر ناراض دکھائی بھی دیں تو دل میں کوئی گلہ نہیں رکھتیں ان سے۔“  
 ”بچوں کی سناؤ کیسے ہیں؟“

”شکر ہے خدا کا۔ راول کا بس آخری سمسٹر باقی ہے۔ رائبل نے بھائی کی تعلیم مکمل کروانے میں بہت ہاتھ بٹایا میرا اور اب تک بنا رہی ہے۔ کالج کے دنوں میں کالج سے واپسی کے بعد اور پھر یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے دوران بھی دوپہر کو گھر واپسی کے بعد رات تک میرے ساتھ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی رہی اور اب بھی تن من دھن سے لگی ہوتی ہے۔ ابھی چند ہفتوں قبل اسے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی ہے۔“  
 ”اچھا.....!“

”ملازمت عارضی ہے مگر ڈو بچے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ جس تندہی اور محبت سے اس نے میرا ساتھ دیا ہے میرے رویوں روئیں سے اس کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔“  
 ”جسے ماں کی دعائیں مل جائیں فضہ اسے کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی اور جو ماں اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے مشکل اٹھاتی ہے اسے بھی بہت آرام ملتا ہے۔ تم اپنے بچوں کے لیے جو محنت کر رہی ہو انشاء اللہ تھوڑے سے دنوں کی دقت اور بے پھر بہت راحت پاؤ گی۔“

فضہ کے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ ابھری ”مجھے اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں چاہیے منتخب۔ میں تو بس ان چاروں کو کامران اور سر بلند دیکھنا چاہتی ہوں۔“  
 ”ہاں بھئی چھوٹو کیسی ہے؟“

”وہ!“ فضہ کی آنکھوں میں ایک بارگی متا کی جوت جاگی ”اس نے تو مجھے از سر نو زندہ کر دیا منتخب بلکہ مجھے کو کیا اس نے تو بہن بھائیوں کو بھی اپنا ایسا دیوانہ بنا لیا ہے کہ سب پروانہ دار اس پر نثار ہوتے ہیں۔ اس کی باتیں ہمیں تازہ دم رکھتی ہیں، اس کی ہلکی ہمارے دلوں میں دلولہ پیدا کرتی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اس دنیا کی ساری رونق پھولوں اور بچوں کی وجہ سے ہے۔ تمہیں سچ بتاؤں منتخب جب یہ دنیا میں آنے والی تھی تو مجھے دل ہی دل میں بہت کوفت ہوا کرتی تھی کہ تین بچے کافی تو تھے اتنے عرصے بعد اس چوتھی روح کو کیا شوق سو جھا مگر اللہ کی مصلحتیں وہی سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چھوٹی نہ ہوتی تو شاید میں اور تینوں بچے حالات کی سختیوں کے باعث قنوطی بن گئے تھے۔ وہ نہ خود کچل بیٹھتی ہے نہ ہمیں بیٹھنے دیتی ہے۔ ہم سب کی جان ہے وہ تو۔“ فضہ کے لبوں پر اب بڑی جاں فزا مسکراہٹ تھی۔

”بھئی اپنے ابا جان کو بھی یاد کرتی ہے؟“ منتخب نے غماط لہجے میں پوچھا۔  
 ”اکثر..... خود تو انہیں وہ گھر میں موجود ان کی تصویروں کی حد تک ہی یاد رکھے ہوئے ہے مگر مجھ سے اور بہن بھائیوں سے اکثر ان کا تذکرہ سننا پسند کرتی ہے۔ خود ان کا ذکر کرے تو بہن بھائیوں کی طرح ان کے لیے بابا کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے میری طرح مختار صاحب کہتی ہے۔“

”اچھا!“  
 ”ہاں..... اور مختار صاحب کو مغرب کی چکا چوندا ایسی بھائی ہے کہ کبھی بھولے سے بھی اس بچی کو یاد نہیں کرتے۔“  
 ”کب تک یاد نہیں کریں گے فضہ..... تم میری بات یاد رکھنا ایک نہ ایک دن وہ ضرور لوئیں گے تمہارے پاس



ایسے ہی جیسے میرے ڈیڑی لوٹ آئے ہیں۔ اور..... اور تم دیکھنا فضا تمہیں اتنی خوشیاں اتنا آرام ملے گا کہ تم اپنے سارے دکھ ساری کلفت بھول جاؤ گی۔“  
 ”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“  
 فضا کی آنکھوں میں ہلکی سی آبی رولرزاں دکھائی دی۔

☆☆☆

دونوں گھروں میں زور شور سے شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ مسز ظہیر کا ایک پیرا اپنے گھر میں تھا تو دوسرا اچھی بھابی کے ہاں۔ اچھی بھابی کی تو دلی مراد برآ کی تھی۔  
 ”بھئی بھئی کی شادی کی تیاری اب تم خود ہی کرو گی۔“ انہوں نے تجدید تعلقات کے بعد مسز ظہیر سے کہا تھا۔  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں اچھی بھابی۔ جو کام ہو ہمیں بتائیے ہم نہ کریں تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔“ مسز ظہیر نے جواب دیا۔

”ارے بھئی میں کیا بتاؤں گی۔ تم ماشاء اللہ تین بچوں کی شادیاں منسا چکی ہو، اس معاملے میں مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔ سچی بات ہے مجھ سے تو اب بھاگ دوڑ ہوتی نہیں۔ سب کچھ سہی کو کرنا ہے۔“  
 ”آپ فکر نہ کیجئے، سب ہو جائے گا۔“  
 ”ہر دکھ سکھ میں تمہیں بڑی طرح یاد کرتی تھی میں اور اٹھتے بیٹھتے دعا مانگتی تھی اپنے اللہ سے کہ دوبارہ ہمارا ملاپ ہو۔ اللہ نے میری سن لی۔“  
 ”ہم بھی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔“

”بس قسمت میں ایک دوسرے سے ہمارا اتنے برس منقطع رہنا لکھا تھا۔“ اچھی بھابی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔  
 ”ہم فیم میاں کی شادی کے سلسلے میں اتنا وقت گزاریں گے آپ کے ہاں کہ ان گزرے برسوں کا حساب برابر ہو جائے گا۔“  
 ”خدا تمہیں خوش رکھے۔“

ظہیر صاحب کو مسز ظہیر کی اچھی بھابی کے ہاں مسلسل آمد و رفت کھل تو رہی تھی مگر چپ تھے۔ عدنان سے کبھی کبھی دبی زبان سے شکوہ کر دیتے۔ ایک روز بولے ”تمہاری امی کا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کس مٹی کی بنی ہیں۔ جنہوں نے دکھ پہنچایا انہی کا دم بھر رہی ہیں۔“  
 ”میں خوش قسمت ہوں ابو جی کہ میرے والد کو میری امی جیسی غیر معمولی خاتون ملی ہیں۔ سارا زمانہ امی کی تعریف کرتا ہے۔“ عدنان نے کہا۔

ظہیر صاحب نے عدنان کو قدرے خشونت سے دیکھا پھر بولے ”بات نامکمل کیوں چھوڑ دی۔“  
 ”جی نہیں، میں نے نامکمل تو نہیں چھوڑی۔“  
 ”کہہ دو۔“ ظہیر صاحب نے اسے گھورا ”کہہ دو سارا زمانہ امی کی تعریف کرتا ہے آپ کو برا کہتا ہے۔“  
 ”نہیں ابو جی۔“ عدنان خفت سے بولا ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“  
 ”صاحب زادے!“ ظہیر صاحب نے اپنے جڑے بھتیجے لے لیے ”میں..... میں سب سمجھتا ہوں۔“  
 ”دی آل لویو ابو جی۔“ عدنان نے کہا۔

”انگریزی کا رعب گانٹھتے ہو ہم پر!“ ظہیر صاحب نے اسے پھر گھورا ”ہماری بلی اور ہی سے میاؤں۔“  
 ”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں ابو جی..... میری یہ مجال کہاں کہ آپ کے سامنے زبان کھول سکوں لیکن.....“

”ہاں..... بولو..... رک کیوں گئے۔“

”ابو جی..... جو ہو چکا اے بھول جائیے..... اے بھلا دینے ہی میں ہم سب کا بھلا ہے۔“

ظہیر صاحب اے دیکھنے لگے۔

”میں جانتا ہوں ابو جی آپ کو ہم چاروں بہن بھائیوں میں فرحان بھائی سے سب سے زیادہ پیار تھا۔“

ظہیر صاحب پر رقت سی طاری ہو گئی۔ عدنان نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر دھر کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

ظہیر صاحب نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ چند ثانیے کی باندھے دیکھتے رہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ عدنان کو ان کی نگاہوں میں شکایت سی محسوس ہوئی۔

”تم نے..... تمہاری ماں نے..... سب نے میرے خلاف محاذ بنا کر مجھے نیچا دکھا دیا نا۔ پسپا کر دیا مجھے۔ میرے

بیٹے کو مارنے والوں کے سامنے گھٹے ٹیکوادیئے میرے..... ہے نا.....!“ شدت جذبات سے ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”نہیں..... نہیں ابو جی.....“ عدنان نے اپنا بازو ان کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے کہا ”آپ کی عزت ہم

سب کی عزت ہے۔“

”تو پھر..... پھر ایسا کیوں کیا تم لوگوں نے!“ ظہیر صاحب کی نگاہوں میں بھی گلہ تھا لہجے میں بھی۔

ان کے اس شکوے کا فوری طور پر عدنان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”بولو!“ ظہیر صاحب نے اس سے جواب کا تقاضا کیا۔

”ابو جی.....“

”ہاں بولو..... چپ کیوں ہو گئے!“

”ابو جی.....“ وہ پھر رک گیا کہ کوئی جواب ہی نہ بن پڑ رہا تھا۔

”کہو۔“ ظہیر صاحب پھر اس سے جواب کے متقاضی ہوئے۔

”میں کو محبت اور یگانگت کی فضا میں رکھنے کے لیے ابو جی۔“

ظہیر صاحب نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا ”کیا مطلب!“

”ہمیں مٹنے کو دشمنی اور نفرت تو نہیں سکھائی ابو جی..... اور..... بچے وہی سیکھتے ہیں جو اپنے بڑوں کو کرتا دیکھتے

ہیں..... ویسے بھی ابو جی ہماری بہن اس گھر میں ہے۔ اس کی خاطر تو خون بھی معاف کیا جاسکتا ہے اور..... فرحان

بھائی کی موت تو خون نہیں حادثہ تھی۔“

”بالکل گھماڑ آ دی ہو تم؟“

”کیوں؟“ عدنان مسکرا نے پر مجبور ہو گیا۔

”کیا..... کیا تھا اگر تم ڈٹ جاتے۔“

”کس بات پر؟“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”بہو صاحب سے شادی کرنے پر۔“

عدنان چونکا۔ ”یہ آپ نے اچانک ٹریک کیوں بدل لیا؟“

”کیا مطلب؟“

”بات کیا اور ہی تھی اور آپ شادی کا ذکر نکال بیٹھے۔“

”وہ..... جب..... اس بد بخت..... ڈاکٹر پیام کا قصہ نکل آیا تھا..... تب تو تم نے بڑی سعادت مندی سے

سر جھکا دیا تھا..... راضی ہو گئے تھے..... پھر بدک کیوں گئے؟“



”بدکا میں تو نہیں۔“

”تو پھر؟“

”آپ لوگوں کی خوشی کے لیے راضی ہو گیا تھا میں تو..... مگر.....“

”مگر.....؟“

”جب بھابی کی طرف سے انکار ہو گیا تو میں کیا کر سکتا تھا؟“

”تمہاری والدہ محترمہ رشتے دیکھ رہی ہیں ان کے لیے اب!“

”رشتے نہیں رشتہ ابو جی!“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”علم میں ہے نا تمہارے؟“

”جی ہاں۔“

”کتنے اطمینان سے کہہ دیا جی ہاں!“

”تو پھر کیا کرتا؟“

”اماں کھڑے ہو جاتے والدہ محترمہ کے سامنے کہ..... گھر کی عزت کو کہیں اور نہیں جانے دوں گا۔“

”سوری ابو جی! یہ تو جہالت ہوئی..... مذہب، قانون، اخلاق سب بھابی کو اپنی زندگی کے فیصلے کا حق دیتے

ہیں۔“

ظہیر صاحب نے اسے قدرے خشونت سے گھورا ”والدہ کے نقش قدم پر چل رہے ہو، صاحب زادے!“

عدنان مسکرا دیا۔ ”ایک بات تو آپ کو بھی ماننا پڑے گی ابو جی!“

”وہ کیا؟“

”امی کے نقش قدم پر چلنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہ سکتا۔ جس جس نے امی کا ہاتھ تھا مایا ان کے نقش قدم پر چلنے

کی کوشش کی آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ مس منہا کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“

”ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“

”باقی سب بھی ٹھیک ہی ہے ابو جی!“

”چلو، پہنچ کہیں ملی تو ملی ہی سہی۔“

”کیا مطلب؟“

”تم نہیں سمجھو گے یار!“

عدنان دھیرے سے مسکرا دیا۔

☆☆☆

نصہ کی بات منہا کے دل کو ایسی لگی کہ خاصی سوچ بچار کے بعد بالآخر اس نے ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بجائے طویل رخصت لینے کا فیصلہ کیا۔ خدا جانے شادی کے بعد حالات کیا ہوتے۔ دبئی میں نعیم کی ملازمت کوئی سرکاری ملازمت تو تھی نہیں پرائیویٹ جاب تھی، جب تک چل رہی تھی، چل رہی تھی۔ کیا عجب کل کوئی گڑبڑ ہو جاتی اور وطن واپس آنا پڑتا۔ ایسے میں ساری کشتیاں جلا دینا عقلمندی نہ ہوتی۔ چھٹی کے سلسلے میں فاروقی صاحب اور ایک دو سینئر ساتھیوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے ہائی اسکول میں چارج سنبھالنے کے بعد چھٹی کی درخواست دینے کا مشورہ دیا۔

جونیر اسکول کے لیے نئی سربراہ ادارہ کے احکامات بھی جاری ہو گئے تھے۔ منہا ان دلوں تن من دھن سے جونیر اسکول کے مختلف معاملات نمٹانے میں مصروف تھی۔ اسے یاد تھا، یہ اسکول اسے کس حالت میں ملا تھا۔ گندگی، بے

ترتیبی اور بد نظم اپنے عروج پر تھی۔ عمارت کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کراہائے جماعت بدرنگ تھے۔ کئی کمروں میں بچے فرش پر پٹھی میلی چیلی اور کئی پٹھی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نہ کوئی ترتیب تھی نہ نظم و ضبط۔ ٹیچرز کلاسوں میں موجود نہ تھیں۔ فرش پر بیٹھنے والے بچے ہلڑ بازی کر رہے تھے۔ دیواروں پر سے جا بجا پلستر اڑھڑا ہوا تھا، جس کے بارے میں بعد میں عقدہ کھلا کہ فرش پر بیٹھنے والے بچے جن کا بیشتر وقت فارغ گزرتا تھا، برکاروں کی لوک اور ناخن تراش کے چاقوؤں سے دیواریں ادھیڑنے میں وقت لگایا کرتے تھے۔ اسبلی کی بد نظمی، فرائض منصبی کی انجام دہی کے سلسلے میں بیشتر استانیوں کے انداز ہائے بے نیازی، غیر مذریعی عملے کی فرائض سے غفلت، اسکول کلرک کا غیر ذتے دارانہ رویہ اور اسکول ریکارڈ کی بے ترتیبی۔ یہ سب کچھ اور بھی بہت کچھ اسے یوں یاد تھا جیسے کسی متحرک فلم کے واقعات اور ان کا تسلسل! اس اسکول کو اس نے اتنی دلسوزی اور محبت سے نکھارا تھا کہ غزالہ ناصر نے ایک روز کہا تھا ”میڈم! بہت سی خواتین تو اپنے گھروں کو بھی اتنی محبت سے نہیں سنوارتیں جتنی محبت سے آپ اس ادارے کو سنوار رہی ہیں۔“

بھدے نقوش اور پھیکے رنگوں والی اس تصویر کو نئی چلا دینے کے لیے اس نے دل و جان سے محنت کی تھی۔ ادارے کو نئی سربراہ ادارہ کے حوالے کرنے سے قبل وہ اس کی لوک پلک درست کر دینا چاہتی تھی، سوان دنوں کے بعد دیگرے بہت سے امور اس کی توجہ کا مرکز بنتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اپنے حصے کا کوئی کام مروجہ رسم کے مطابق اس خیال کے تحت کہ اس کے بعد آنے والی خاتون کر لیں گی، التوا میں نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

غزالہ ناصر جو ادارے میں اس کے عرصہ خدمات کے دوران اس کی دست راست بنی رہی تھیں اور ان دنوں اس کے جلد ہی ہائی اسکول میں چلے جانے کے خیال سے بار بار جذباتی ہوئی جاتی تھیں۔ ایک روز کہنے لگیں ”میڈم جی! جانے والے تو بڑی بڑی باتوں سے بھی نظریں چرا کر گزر جاتے ہیں اور آپ جاتے جاتے بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اہمیت دے رہی ہیں۔ میں نے کئی ہیڈز کے ساتھ کام کیا ہے مگر کبھی بھی ادارے سے ٹرانسفر ہو کر یار یا ٹائر ہو کر جانے والی کسی ہیڈ کو آخری دنوں میں نہ تو آفس ریکارڈ اس طرح اپ ڈیٹ کرتے دیکھا جیسے آپ کر رہی ہیں، نہ کلاسوں پر کسی کی اتنی توجہ دیکھی، نہ ہی مالی کوآرڈینر سندھ موسم کی پیوریوں کے بارے میں ہدایات جاری کرتے دیکھا..... آپ کی ڈیوڈن پر مجھے تو کبھی کبھی رشک آنے لگتا ہے۔“

”ٹینکس فار دی کمپلیمنٹ غزالہ!“

”میں آپ کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گی میڈم!“ غزالہ انتہائی جذباتی دکھائی دیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ استانیوں بھی جن کے بارے میں اس کا دل بھی چنلی کھایا کرتا تھا کہ ان کی عادت اور مزاج کے خلاف ان سے ٹھیک ٹھاک کام لے کر اس نے چونکہ خاصا ”ٹف ٹائم“ دیا تھا انہیں، اس لیے اگر ان کے اس ادارے میں رہتے ہوئے اگر کبھی اس کے جادے کے احکامات آگئے تو وہ تو بغلیں بجائیں گی۔ دل کی اس چنلی کے برعکس اس کی ترقی پر خوش مگر جادے سے ناخوش تھیں۔

عابدہ نامی وہ ٹیچر جس نے پہلے ہی دن اسے خاصی میڑھی نظروں سے دیکھا تھا اور جس کے بارے میں بعد میں غزالہ نے اس سے کہا تھا ”میڈم! عابدہ کی گھریلو زندگی اتنی ناخوشگوار ہے کہ اس کے اثرات اسکول تک پہنچنے سے بھی نہیں رکتے۔ عابدہ کے بارے میں کوئی شکایت ہو آپ کو تو درگزر کر دیجئے گا۔“

وہی عابدہ اپنی آنکھوں میں محبت کی شمعیں روشن کیے اس کے دفتر میں آکھڑی ہوئی اور اس نے لجاجت سے کہا۔

”میڈم پلیز! آپ مت جائیں۔“

”انسان کو ایک دن اپنی جگہ چھوڑنا ہی پڑتی ہے عابدہ!“ اس نے کہا۔

”جی میڈم! یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں، ہر انسان کو اپنی جگہ سے کبھی نہ کبھی تو جانا ہی ہوتا ہے مگر میڈم، آپ جیسے لوگوں کو اپنی جگہ پر دیر تک رہنا چاہیے۔“ اچانک عابدہ کی آنکھیں بھر آئیں ”میڈم! اسے کھن بازی مت کھیجیے گا۔“



جانے والے آدمی کی خوشامد کر کے بندے کے ہاتھ کیا آتا ہے..... یہ منہ دیکھے کی بات نہیں میڈم! حقیقت ہے کہ آپ جیسے فرض شناس کم کم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو بہت مس کروں گی۔“

”تھینک یو دیری میچ عابدہ!..... میں بھی آپ سب کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گی۔“

ادردہ منہ لڑکی فرحینہ جو گزشتہ ڈیڑھ برس سے ایک عارضی اسامی پر کام کر رہی تھی، اس کا تو ان دنوں یہ عالم تھا کہ جہاں منتہا کو دیکھتی، اس کی آنکھیں چھلک اٹھتیں۔

تو محبت اسی نے نہیں کی تھی ادارے سے، ادارے نے بھی اس کے دامن میں محبتیں ڈھیر کر دی تھیں۔

☆☆☆

صحت یابی کے بعد ڈیڈی، علیب کو ساتھ لے کر لاہور ہو آئے تھے۔ لاہور میں موجود کوٹھی کی فروخت کا معاملہ انہوں نے ایک پراپرٹی ڈیلر کے سپرد کر دیا تھا۔ بینک میں موجود جمع پونجی انہوں نے وہیں منتقل کرادی تھی جہاں ان کا مستقبل میں رہنے کا پروگرام تھا۔ پراپرٹی ڈیلر نے جلد ہی کسی اچھی ذیل کی یقین دہانی کروائی تھی۔ بینک میں موجود رقم کی ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی کے بعد انہوں نے خطیر رقم کا ایک اوپن چیک علیب کو دیتے ہوئے کہا ”منتہا کی شادی کے لیے اپنی والدہ کو دے دو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ڈیڈی!“ علیب متردّد ہوا۔

”میں جانتا ہوں“ ڈیڈی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا پھر قدرے دل گرفتگی سے بولے ”مجھے معلوم ہے تم لوگوں کی زندگی میں میری اب کوئی وقعت ہے نہ ضرورت مگر پھر بھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں..... میں زبردستی ہی سہی تمہارے معاملات میں شریک رہوں۔“

”ایسی بات نہ کیجئے“ علیب کچھ شرمسار ہو کر بولا۔

”حقیقت تو یہی ہے نا بیٹے..... بلکہ سچ پوچھو تو میں تو تمہیں بیٹا کہنے کا حق بھی نہیں رکھتا..... دیا کیا ہے میں نے تمہیں جو تم پر کوئی حق جتا سکوں۔“ ڈیڈی نے چیک بدستور اس کی جانب بڑھائے رکھا۔

علیب کو چیک تھا منا پڑا۔ مئی کو دیا تو وہ سخت خفا ہوئیں ”کیا ضرورت تھی تمہیں یہ لینے کی۔ آخر اور بہت سے کام بھی تو ہوئے ان کے بغیر..... واپس کر دو انہیں۔“

”میری ہمت نہیں ہے واپس کرنے کی۔“

”تم نے لیا ہی کیوں“ منتہا بھی معترض ہوئی۔

”غلطی ہوئی“ علیب کو غصہ آ گیا ”اب آپ واپس کر سکتی ہیں تو کر دیں۔“

”کیوں، میں کیوں کروں، لیا تم نے ہے؟“

”کوئی بات نہیں، اب لے لیا ہے تو لے لیا“ بہن بھائی میں بات بڑھتی دیکھ کر مئی نے معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔

علیب نے چونک کر مئی کی طرف دیکھا۔

”باپ ہیں، ان کا بھی کچھ فرض ہے۔ چیک دے کر کوئی احسان نہیں کیا ہے انہوں نے۔“

”عجیب بات ہے، ابھی ذرا دیر پہلے تو آپ خفا ہو رہی تھیں۔“ علیب نے کہا۔

”ارے بیٹا! انسان ہی تو ہوں۔ پرانی باتیں یاد آتی ہیں تو جیسے زخم ہرے ہو جاتے ہیں“ مئی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

”اور میں بھی اس خیال سے منع کر رہی تھی بھائی کہ کہیں ڈیڈی یہ نہ سوچیں کہ ہم بھی ان کے پیسے ہی کے طلب گار

ہیں“ منتہا نے انتہائی نرم لہجہ میں کہا۔

استاد کی بات سمجھ میں آگئی تو آگئی، ورنہ خیر..... ہائی اسکول میں خصوصاً لڑکیوں کے ہائی اسکول میں اساتذہ بالخصوص سربراہ ادارہ کو ہمہ وقت چوک رہنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات انتہائی عجیب و غریب مسائل سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ بچیوں کے کبھی از خود سیدھے راستے سے بھٹک جانے اور کبھی کسی اور کی طرف سے بھٹکا دیے جانے کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ استاد کو عقابانی نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ میں نے تقریباً آٹھ سال ہائی اسکول میں گزارے ہیں اور ان آٹھ برسوں میں ایسے ایسے واقعات نظروں سے گزرے ہیں کہ اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے روئے زمین پر اہم ترین مسئلہ نوعمر بچیوں کی غلط ہاتھوں، غلط نگاہوں سے مناسب حفاظت ہے۔ جو واقعات میری نظروں سے گزرے ہیں یا جو تجربات مجھے ہائی اسکول میں اپنی ملازمت کے دوران ہوئے ہیں ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچیوں کے والدین اور سرپرستوں کو ان کا راہبر اور رہنما ہونے کے ساتھ ہمہ وقت ان کا محافظ بھی رہنے کی ضرورت ہے۔ والدین کو اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ بچیوں کے سلسلے میں کسی پر اندھا اعتماد نہ کریں۔ کبھی کبھی بچیاں خود اپنے ہی گھروں میں بھی محفوظ نہیں ہوتیں۔ اسکولوں میں اساتذہ کو ان کی رہنمائی کرنے اور ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی بچیوں کے بستے اچانک چپک کر لینے سے بھی استاد کو ان کے ذہنی رجحانات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ حیران ہوں گی کہ ایک بچی کے بستے سے نکلنے والی ایک ڈائری کے اندراجات سے ہمیں معلوم ہوا کہ آٹھویں جماعت کی وہ تیرہ سالہ بچی چھ مردوں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی، جن میں ایک اس کا حقیقی رشتے دار بھی تھا۔“

”ادہ مالی گاڈ!“ منتہا نے جھرجھری لی۔

”یہ فسانہ نہیں مس منہا، اسی معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ ایک اور واقعے میں نویں اور دسویں جماعت کی دو لڑکیاں گھروں سے زرق برق ملبوسات اس بہانے سے اپنے بستوں میں رکھ کر اسکول کے لیے نکلیں کہ انہیں اسکول میں ہونے والے ڈرامے میں شرکت کرنی ہے اور اسکول آنے کے بعد یونیفارم کی جگہ وہی کپڑے پہن کر اسکول سے نکل لیں۔ دن بھر بوائے فرینڈز کے ساتھ گھومیں پھریں اور چھٹی کے وقت دوبارہ یونیفارم میں ملبوس گیٹ پر آکھڑی ہوئیں۔ مگر اپنی ہی کسی ساتھی کی رپورٹ پر پکڑی گئیں۔ جبکہ ان کے اسکول سے باہر جانے میں اسکول کا چوکیدار بھی ملوث پایا گیا۔“

”ادہ خدا!“

”یہ سب کچھ میں آپ کو سرسری بتا رہی ہوں ورنہ تفصیلی حقائق زیادہ مہیب ہیں۔ والدین اور اساتذہ کو تو نوعمر بچیوں کو خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں آگاہی دینے کی ضرورت ہے ہی، بچیوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی ایک لمحے کی خطا پوری زندگی کی سزا بن جاتی ہے۔“

منتہا نے تائید میں گردن ہلائی۔

”بچیوں کو ذہنی انتشار سے دوچار کرنے والا ایک اور مسئلہ والدین کے باہمی اختلافات کے نتیجے میں کنہوں کا ٹوٹ جانا بھی ہے۔ آپ ہائی اسکول میں آئیں گی تو چند ٹوٹے ہوئے گھرانوں کی بڑی درد انگیز کہانیاں ملیں گی آپ کو۔“

”اور میڈم!“ منتہا کے لہجے میں تجسس تھا۔

”اور.....؟“ وہ مسکرائیں ”میں آپ کو اسٹاف ممبرز کے بارے میں بتائے دیتی ہوں کہ کس میں کیا خوبی ہے، کیا خامی؟“

وہ بولتی گئیں اور منتہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہائی اسکول میں جوائننگ کے فوراً بعد ہی اسے چھٹی کے لیے درخواست دے دینی تھی، بڑے تجسس اور اشتیاق سے سنتی رہی۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



دکھ کا کوئی رنگ، کوئی مذہب، کوئی نام نہیں پوتا..... دکھ تو دکھ ہے..... جو دل سے نکل کر آنکھوں سے امنڈ پڑتا ہے..... آنسو ہی دکھوں کا ذریعہ اظہار ہیں۔ ان آنسوؤں سے دل کی بنجر و سنگلاخ زمین پر محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ شبیہ قطری زندگی کو تھمنے نہیں دیتے بلکہ آگے بڑھاتے ہیں۔

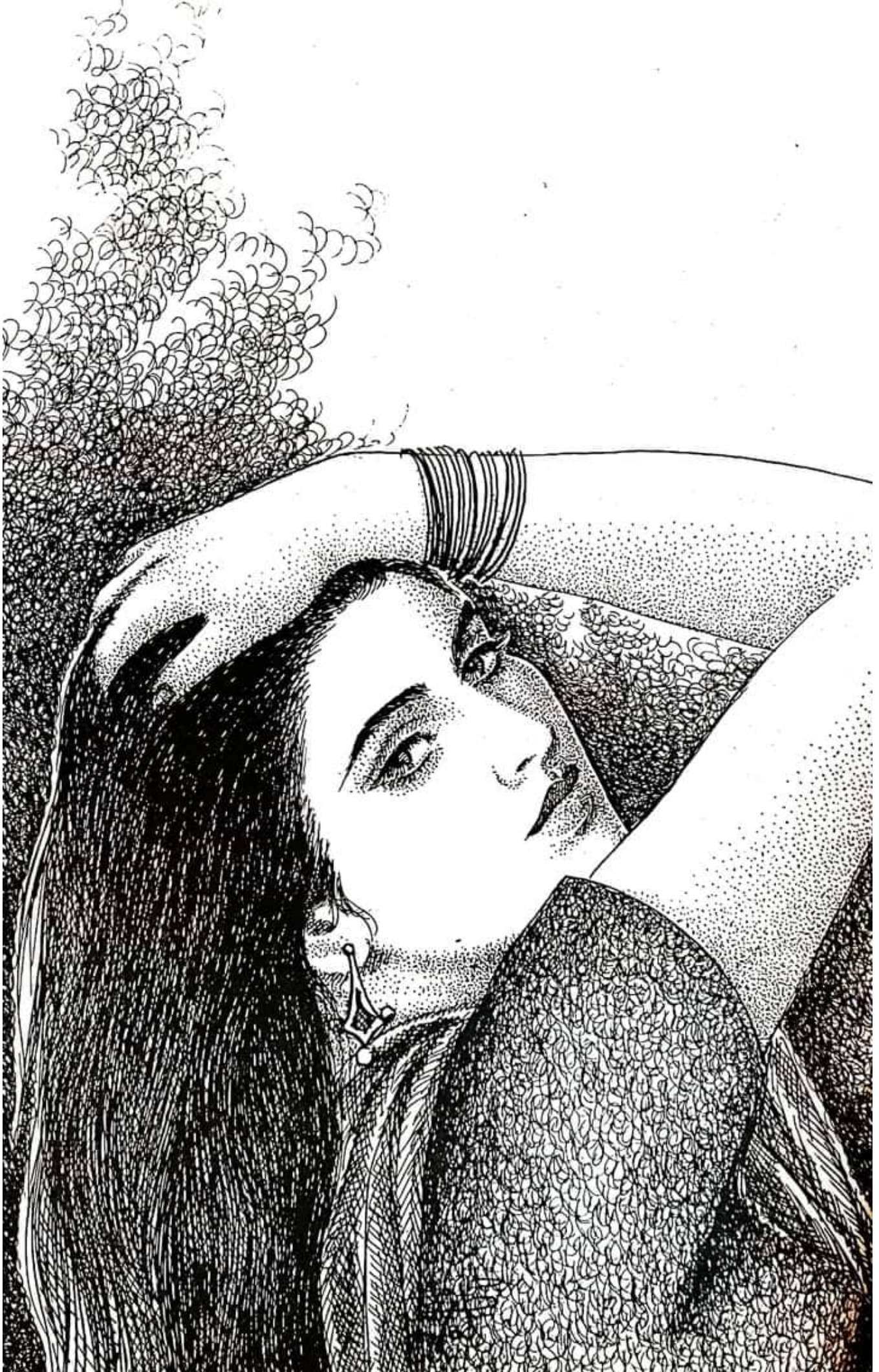
پاکیزہ پڑھنے والے قارئین کے لئے ناہید سلطانہ اختر کا نام نیا نہیں۔ اس سے پہلے ان کے کئی شاہکار ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ منتہا ناہید کی نئی کاوش ہے۔ جو یقیناً اپنے قارئین کو باندھ کر رکھے گی۔ گھر بڑی تگ و دو کے بعد بنتے ہیں مگر ٹوٹنے کے لئے ذرا سی لغزش ہی کافی ہوتی ہے۔ ایسے ہی خاندان کا ماجرا جو اچانک ہی مصائب کے بھنور میں پھنس گیا تھا۔

محبوبوں سے گندھے اور یقین سے بندھے شتوں کا چانک مساموٹنے کی دل گداز داستان

آخری قسط









چونیر اسکول کا چارج نئی پرنسپل کے سپرد کرتے ہوئے منجہا کی عجیب کیفیت تھی۔ اسکول کے چنے چنے سے یادیں وابستہ تھیں۔ اس اسکول کو اس نے بڑی محبت سے سنوارا تھا۔ اسے آج بھی ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کے وہ الفاظ یاد تھے جو گویا ڈائریکٹر کی سوچ کے ترجمان تھے۔ یہ ادارہ اس وقت اپنی تمام تر زبوں حالی کے ساتھ ایک چیلنج کے طور پر اس کے حوالے کیا گیا تھا۔ اسے ادارے کی ظاہری حالت کو بھی بہتر بنانا تھا اور اس کے وجود میں سرایت شدہ بد نظمی کو بھی نظم و ترتیب میں بدلنا تھا۔ کل ادارے کی تاریخ کچھ اور تھی آج وہ اسے ایک نئی تاریخ دے کر جا رہی تھی۔ ادارے کے ظاہری نقوش ہی نہیں روح بھی نکھر گئی تھی۔ بے ترتیبی کی جگہ اب حسن ترتیب تھی۔ بد نظمی کی جگہ نظم و ضبط تھا۔ ادارے سے وابستہ افراد اپنی اپنی ذمہ داریوں کو بادل نا خواستہ نہیں محبت سے سرانجام دیتے تھے۔ طلبہ ریجنل بورڈ اور وظیفہ امتحانات میں امتیازی کامیابیاں حاصل کر کے ادارے کا قد بلند سے بلند تر کئے چلے جا رہے تھے۔ قرب و جوار ہی نہیں دور کے علاقوں میں رہنے والے وہ لوگ جو اپنے بچوں کو کسی سرکاری اسکول میں تعلیم دلوانے کے متنبی ہوتے ان کی پہلی ترجیح ہی اسکول ہوتا۔ سرکاری پرائمری اسکول میں داخلے کے لیے بچوں کے والدین اور سرپرست ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس سے سفارشی رقعے لے کر ڈائریکٹ پہنچ جاتے!

منجہا کا دل بہت مطمئن تھا کہ وہ اس ادارے کے لیے وہ سب کچھ کر چکی تھی جو ایک مختصر عرصے میں اس کے لیے ممکن تھا۔ یہی ادارہ تو تھا جو اسے جا بجا بے تحاشا کوڑے کے ڈھیروں میں لپٹا ملا تھا اور آج! جگمگا رہا تھا۔ ایڈمن بلاک کے برآمدے میں پہلو بہ پہلو ان طلبہ کی تصاویر آراستہ تھیں جن کی تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابیوں نے ادارے کو اپنے ہم عصر اداروں کے مقابلے میں سب سے آگے لے جا کر کھڑا کیا تھا۔ کوئی جادو کی چھڑی نہیں گھمائی تھی اس نے بس اتنا کیا تھا کہ اپنے فرائض منصبی محبت، خلوص اور لگن سے سرانجام دینے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ بہت تسکین بخش تھا۔ اپنی جاں نشین پرنسپل کو وہ بڑی سرخوردگی کے ساتھ چارج دینے جا رہی تھی۔

تاج محمد نے چارج دینے اور لینے کے کاغذات پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔ ضابطے کی کارروائی کی تکمیل ہر دو خواتین کے فقط دستخطوں کی متقاضی تھی مگر چارج لینے والی خاتون پرنسپل متعلقہ کاغذات پر آنکھ بند کر کے دستخط ثبت کرنے کے بجائے اپنے چارج میں آنے والی جملہ املاک کو بنفس نفیس دیکھ کر اپنا اطمینان کرنے کی خواہاں ہوئیں۔ ”میڈم صاحبہ! ہمارے اسکولوں میں ہوتا ہی کیا ہے جو آپ دیکھنا چاہتی ہیں۔“ تاج محمد نے اپنی دانست میں منجہا کو خوش کرنے کے لیے نئی پرنسپل سے کہا۔

”کیوں نہیں تاج محمد صاحب۔“ منجہا نے انہیں ٹوکا ”بہت کچھ ہوتا ہے اسکولوں میں۔“

”میڈم! میں سرکاری اسکولوں کی بات کر رہا ہوں۔“ تاج محمد نے قدرے خفت سے کہا۔

”میں بھی سرکاری اسکولوں ہی کی بات کر رہی ہوں تاج صاحب۔“ منجہا نے کہا ”ہمارے جیسے ترقی پذیر ممالک میں سرکاری سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی اداروں کو اتنا بھی مل جائے جتنا کہ ہماری حکومت اپنے محدود وسائل کے باوجود ہمیں فراہم کرتی ہے تو یہ بھی بہت۔ اسکولوں کی اتنی بڑی بڑی اور کشادہ عمارات، فرنیچر، تربیت یافتہ اساتذہ اور اداروں کے سالانہ بجٹ میں مختلف مددوں میں مختص کی جانے والی رقم۔ بھلا اور کیا چاہیے ہوتا ہے اسکولوں کو!“

تاج محمد صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔

”میڈم صاحبہ! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اسکولوں میں ایسی کون سی بڑی یا قیمتی چیزیں ہوتی ہیں جن کا فزیکل دیکھنا یا گنتا بھی ضروری ہو۔ فرنیچر، الماریاں، ٹائے، کنبیاں، رجسٹر، فائلیں اور بس۔“

”آپ پبلک فنڈ اور اسکول فنڈ کی چیک بکس کا ذکر دہا گئے تاج محمد صاحب۔“ منجہا دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

”اوہ کس میڈم صاحبہ!“ تاج محمد اپنی دائیں انگشت شہادت کھڑکی کر کے بولے ”آئی ایم ریلی سوری۔“

”آئیے میڈم..... آپ جو کچھ دیکھنا چاہتی ہیں دیکھئے میں بھی سائن اسی وقت کروں گی جب آپ اپنا اطمینان کر لیں گی۔“

”مائنڈ نہ کیجئے مس منعہا۔“ ننی پرپل منعہا کے ہم قدم ہو لیں۔

”نونیو میڈم..... میں مائنڈ نہیں کر رہی ہوں بلکہ مجھے اچھا لگا کہ آپ کاغذات پر آنکھ بند کر کے دستخط کرنے والوں میں سے نہیں۔“ اس نے گردن گھما کر تاج محمد کی طرف دیکھا اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”آپ سن رہے ہیں تاج محمد صاحب۔“

”جی میڈم صاحبہ۔“ تاج محمد نے دست بستہ سر جھکا کر کہا۔

منعہا نے اپنا روئے سخن ننی پرپل کی جانب کیا اور بدستور مسکراتے ہوئے بولی ”تاج صاحب کو میری اس عادت سے کہ میں آنکھ بند کر کے کسی بھی کاغذ پر خواہ وہ کتنا ہی غیر اہم کیوں نہ ہو دستخط نہیں کرتی اکثر جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں میڈم۔“ تاج محمد نے نوراً کہا۔

”اب آپ کچھ بھی کہیں تاج صاحب۔ جب میں آنے یا جانے والی ڈاک دیکھ رہی ہوتی تھی اس وقت آپ کے چہرے کے تاثرات کم از کم میرے لیے عبرت آموز ہوا کرتے تھے۔“ ننی پرپل بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”یہ بھی آپ نے خوب بات کہی..... عبرت آموز! مزہ آگیا بھی..... دو لفظوں میں آپ زبان کی خوب چاشنی دکھا گئیں..... پوچھ سکتی ہوں آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“

”میں تو یہیں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی بڑھی ہوں۔“

”زبان تو ہم اپنے والدین اور گھر والوں ہی سے سیکھتے ہیں۔ آپ کے والدین کہاں کے ہیں؟“

”دونوں بچے پاکستانی ہیں۔“

نی پرپل کچھ جھینپ سی گئیں۔

منعہا نے انہیں اسکول کی املاک دکھانا شروع کیں۔ تاج محمد ان تمام چیزوں کی فہرست لیے ہمراہ تھے جو ننی پرپل اپنے چارج میں لینے جا رہی تھیں۔

وقتے میں منعہا نے تمام تذریسی اور غیر تذریسی عملے کو جائے اور بلکے پھلکے لوازمات پر مدعو کر رکھا تھا۔ روایتاً تو اسٹاف اس کے لیے الوداعی پارٹی کا اہتمام کرنے کا خواہاں تھا مگر اس نے شکریہ کے ساتھ ان کی دعوت لوٹا کر خود اپنی جانب سے سب کے لیے جائے کا اہتمام کیا تھا۔

”میڈم یہ تو اچھی بات نہیں۔“ غزالہ نے تمام ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا اچھی بات نہیں۔“ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے غزالہ کو دیکھا۔

”یہی کہ..... آپ الٹا ہم لوگوں کو پارٹی دے رہی ہیں۔“

”کبھی کبھی روایت شکنی بھی اچھی لگتی ہے غزالہ۔“ اس کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔

”کبھی کبھی کیا.....“ غزالہ نے توقف کیا ”اب جب آپ جا رہی ہیں تو میں کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے تو ہمیشہ ہی روایت شکنی کا مظاہرہ کیا۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً۔“ غزالہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں ”ہیڈز اس طرح تن من دھن سے کام کہاں کرتی ہیں جیسے آپ اس اسکول میں آنے کے بعد کرتی رہیں..... نقشہ ہی بدل ڈالا آپ نے تو..... اور ہمیں بھی کام کا نہ صرف عادی کر دیا

بلکہ ڈھنگ بھی سکھا دیا۔“

”میں بھی کہیں سے سیکھ کر ہی آئی تھی غزالہ۔ سٹی اسکول کے پرپل فاروقی صاحب بہت کمال کے منتظم تھے۔“



”تھے! کیا مطلب؟“ غزالہ چونکیں۔

”رہنا ہو گئے۔“

”ادہ! میں کبھی..... خدا خواستہ۔“

”ایک نہ ایک دن تو کبھی کو جانا ہے غزالہ۔“

”جی میڈم..... اچھا مجھے یہ بتائیے کہ آپ پارٹی کیوں دے رہی ہیں؟“

”آپ کو اعتراض کیوں ہے۔“

”نومیڈم اعتراض نہیں۔“ غزالہ جھپٹ کر بولیں ”مگر یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہمیں تو آپ نے اپنے اعزاز میں

فیرویل دینے سے سختی سے منع کر دیا اور خود آپ ہمیں پارٹی دے رہی ہیں۔“

”میری خوشی اسی میں ہے غزالہ۔“

اور یہ بھی کتنی زیادتی کی بات ہے میڈم کہ آپ نے ہم لوگوں کی طرف سے کوئی گفٹ تک لینے سے انکار کر دیا ہے۔“

”میری ایک عادت ہے..... مجھے چھوٹوں سے کچھ لینا اچھا نہیں لگتا۔“

”مگر یہاں تو کئی لوگ عمر میں آپ سے بڑے ہیں۔“

”میں عمر میں بڑے ہونے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“

”تو پھر؟“

”فاروقی صاحب کہا کرتے تھے سربراہ ادارہ کی حیثیت سربراہ خانہ کی سی ہوتی ہے۔ رئیس مدرسہ کو یہ سمجھنا چاہیے

کہ مدرسے کے تمام افراد اس کا کنبہ ہیں۔ اسے ماں باپ کی طرح پر دتار، مشفق اور اپنے کنبے کا ہی خواہ ہونا چاہیے۔

ماں باپ اپنے بچوں پر کوئی ایسا بوجھ ڈالتے اچھے تو نہیں لگتے جس کے بغیر بھی زندگی بڑے آرام سے رواں دواں رہ

سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں ہمارے ساتھیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے لیے کسی پارٹی کی مد میں سو پچاس روپے

خرچ کر دینا انہیں مشکل سے دو چار کر دیتا ہے، سو کسی پر بار کیوں ڈالا جائے غزالہ۔“

”میڈم! کبھی کبھی تو ایسے موقع آتے ہیں۔ آخر ہم اپنے عزیز رشتے داروں کو بھی تو تحائف لیتے دیتے رہتے

ہیں۔“

”درست! مگر ماں کو یہی اچھا لگتا ہے کہ اس کے کنبے کے افراد کسی اضافی اور غیر ضروری بوجھ سے بچے ہی

رہیں۔“

”آف اللہ میڈم پھر ایک روایت سنیں۔“ غزالہ نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”خواتین کو چوزہ بننے کا شوق ہوتا ہے اور آپ ہیں کہ ہر وقت بزرگی طاری کئے رکھتی ہیں اپنے اوپر..... سچ آپ

کی انفرادیت کی وجہ سے بہت مس کریں گے ہم لوگ آپ کو.....“

”چلیے کسی بہانے تو یاد رکھیں گی آپ ہمیں۔“

”میں ہی کیا میڈم ہم سب۔“ غزالہ کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے ”آپ کو پتا ہے ہمارا سو پر بھی جس کے

بارے میں مشہور ہے کنبہ کسی کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتا کل کہہ رہا تھا اس اسکول کو میڈم ملتہا جیسی میڈم نہ

پہلے کبھی ملی تھیں نہ آئندہ کبھی مل پائیں گی۔“

”یہ آپ سب کی محبت ہے غزالہ ورنہ من آنم کہ من دانم۔“

”دیے ایک مزے کی بات بتاؤں آپ کو۔“ غزالہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرائیں۔ ملتہا ہمہ تن گوش ہو گئی۔

”آپ کی ٹرانسفر سے ہائی اسکول والوں کی جان پر بن گئی ہے۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ ملتہا نے چونک کر پوچھا۔

”ان کا خیال ہے جو نیر اسکول کے بعد اب آپ ہائی اسکول کو ٹف ٹائم دینے جا رہی ہیں۔ سنا ہے کئی سینئر لوگ قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا پروگرام بنا بیٹھے ہیں بلکہ بعض نے تو اس اندیشے کے تحت کہ شاید آپ ان کی ریٹائرمنٹ کی درخواست آگے نہ بڑھائیں اپنی درخواستوں پر موجودہ پریسل سے ضروری کارروائی بھی کر دالی ہے۔“

”ریٹیلی!“

”جی میڈم۔“

”کیا میں اپنی خوفناک ہوں۔“ غزالہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

”جو آپ کو نہیں جانتے میڈم وہ تو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری طرح ہائی اسکول والوں کو بھی پتا چل جائے گا کہ آپ کتنی اچھی ہیں۔“

”شاید ایسا نہ ہو سکے۔“

”کیوں؟“ غزالہ چونکیں۔

”ہائی اسکول میں جو اننگ کے بعد میں جلد ہی لمبی رخصت کے لیے درخواست دے رہی ہوں۔“

”کیوں میڈم؟“

”ملتہا نے اپنے بیک سے اپنی شادی کا ایک دعوت نامہ نکالا اور غزالہ کی جناب بڑھادیا۔ غزالہ نے مذہب سی کیفیت میں لفافہ تھاما۔

ملتہا چپ چاپ غزالہ کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی۔

غزالہ نے لفافے سے کارڈ نکالا اور اس پر نظر دوڑائی۔ ایک لخت غزالہ کا چہرہ کھل اٹھا ”اوہ میڈم! بہت مبارک ہو! یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔“

”تمام ساتھیوں میں سے صرف آپ کو مع فیملی انوائسٹ کر رہی ہوں۔“

”عزت افزائی کا شکریہ..... ساتھیوں کو یہ خوشخبری سنانے کی اجازت ہے؟“

”ضروری بھی نہیں۔ میری والدہ کہا کرتی ہیں کہ چاند چڑھتا ہے تو کبھی دیکھ لیتے ہیں۔“

”آپ کی والدہ سے ملنے کی بہت خواہش ہے مجھے۔“

”وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہیں غزالہ..... زندگی سے ایک بھر پور جنگ لڑی ہے انہوں نے۔ میرا اور میرے بھائی بہن کا اسکول کالج کا زمانہ تھا جب میرے والد نے دوسری شادی کر لی اور میری والدہ کو بے آسرا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہمیں پڑھایا لکھایا، اپنے قدموں پر کھڑا کیا، ہمیں ہماری منزلوں سے ہمکنار ہونے میں مدد دی۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اسی ماں کی بدولت ہیں۔“

غزالہ جو ایک تنہی سی کیفیت میں دم بخود سن رہی تھیں اس کے خاموش ہونے پر گویا ہوئیں ”اور آپ کے والد میڈم؟“

”چند ماہ قبل ان کی دوسری بیوی اور بیٹے کو گھر میں ہونے والی ڈکیتی کی ایک واردات میں قتل کر دیا گیا۔ والد صاحب کو ہم لوگ اپنے ساتھ لے آئے۔“

”یہ کب کی بات ہے میڈم؟“

”آپ کو شاید یاد ہو میں نے کچھ عرصہ قبل چند دن کی چھٹی کی تھی بس تب ہی۔“

”اوہ میڈم! آپ کیا ہیں بھلا..... اتنی بڑی بات اور آپ نے ہمیں بے خبر رکھا۔“



”پتا نہیں میں صحیح ہوں یا غلط..... مگر ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ہماری نجی زندگی اور ہمارے فرائض منصبی دو مختلف معاملات ہیں انہیں گڈنڈ نہیں ہونا چاہیے..... پتا نہیں کیوں آج آپ سے شیر کرنے کو جی چاہ گیا۔“

”اس عزت افزائی کا بھی شکریہ..... ویسے ایک بات بتا دوں آپ کو.....“ غزالہ نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر بولیں ”زندگی میں دو افراد ایسے ہیں جن کے سامنے سر جھکائے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک میرے موجودہ شوہر اور وہ اس لیے کہ انہوں نے میرے بن باپ کے بچے کو وہ محبت دی جو شاید اس کا اپنا باپ بھی نہ دے پاتا اور دوسری شخصیت جس کے سامنے سر جھکائے رہنے کو جی چاہتا ہے وہ آپ ہیں میڈم..... وجہ مت پوچھیے گا، وہ شاید میں خود بھی نہیں جانتی۔“ غزالہ کی آواز بھرا گئی۔

منہجہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر غزالہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اور اب اس وقت جب وہ نئی پرنسپل کو چارج دینے کی کارروائی سے گزر رہی تھی غزالہ کسی مستعد میزبان کی طرح اس کی جانب سے اسٹاف کو دی جانے والی پارٹی کے انتظامات کر داتی اسکول کی راہداریوں میں لپک جھپک پھر رہی تھیں۔

شاید اس کی اب تک کی زندگی کا حاصل مسرظہیر جیسی محسنہ غزالہ ناصر جیسی رفیقہ کار اور محبت و احترام سے دیکھنے والی ان گنت نگاہیں تھیں!

☆☆☆

اگلے دن ہائی اسکول میں جوائننگ تھی۔ نہ ہائی اسکول والے اس کے لیے انجانے تھے نہ وہ ان کے لیے اجنبی تھی۔ مگر ہائی اسکول کی سبکدوش ہو کر جانے والی پرنسپل نے اسے اسٹاف سے باضابطہ طور پر تعارف کرانے کے لیے وقفے کے وقت ایک مینٹنگ بلا رکھی تھی۔ جس میں ایک ایک پیالی چائے اور بسکٹوں کا اہتمام بھی تھا۔ منہجہ کو باضابطہ تعارف کی یہ رسم اچھی لگی۔ چارج دینے والی پرنسپل نے اسے تدریسی اور غیر تدریسی عملے کے ایک ایک فرد سے فرد افراد تعارف کرایا۔ تعارفی رسم کے بعد انہوں نے اپنی جانب سے چند الوداعی کلمات ادا کیے۔ منہجہ کو ہائی اسکول میں خوش آمدید کہا۔ اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور بعد ازاں اسے بھی اپنے نئے رفقاء کار سے تعارفی خطاب کی دعوت دی۔ مینٹنگ کے بعد انہوں نے اسے اپنی معیت میں اسکول کا تفصیلی دورہ کرایا۔ ساتھ ہی وہ اسے اسکول کے مسائل اور وسائل کے بارے میں بھی بتاتی رہیں۔

دن بھر مصروفیت میں گزرا۔ چھٹی کے بعد گھر واپس لوٹی تو می نے پوچھا ”جوائننگ دے دی؟“

”جی والدہ۔“

”چھٹی کا کیا بنا؟“

”ایک دو دن میں اپلائی کر دوں گی۔“

”لو ابھی بھی ایک دو دن میں..... اب بھلا کس بات کا انتظار! اور دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ہوا ہو جائیں گے اور کام ڈھیروں ہیں کرنے کو۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“

”فکر میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا۔“

”ایک صاحب ہیں تو مگر آپ انہیں لفٹ ہی نہیں کراتیں۔“

می نے بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اسے زیر لب مسکراتے دیکھ کر آنکھیں دکھاتے ہوئے بولیں۔

”اچھا! ابھی تک تو علیٰ ہی چھیڑ چھاڑ کرتا تھا اب تم بھی شروع ہو گئیں۔“

می کے گھٹنوں پر اپنے ہاتھ دھرتے ہوئے وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی ”آپ کی ناراضگی ہے تو بجا والدہ

لیکن..... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا لیکن؟“

”یہ اچھا نہیں لگے گا کہ آپ دونوں شادی والے دن بھی ایک دوسرے سے دور دور نظر آئیں۔“

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”اب دوستی کر لیں ورنہ مجھے آپ کی فکر رہا کرے گی۔“

”کیا فکر رہا کرے گی۔“

”یہی کہ..... آپ کا وقت کیسے گزرتا ہوگا..... اپنے دل کی بات کس سے کرتی ہوں گی۔“ جذبات کی شدت سے

اس کی آواز یک لخت بھرا گئی۔

”ارے!“ مئی نے اس کا سراپے سینے سے لگالیا اور بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں ”تم

اپنا دل جھوٹا مت کرو۔ میرا خیال رکھنے کو یہ اور علیب ہیں نا..... اور وقت گزارنے کو میری پوتی ہے میرے پاس۔

اللہ رکھے نوا سا بھی ہے۔“

”وہ کون سا ہر وقت آپ کے پاس ہوتا ہے۔ کبھی کبھار ذرا سی دیر کو آتا ہے پھر چلا جاتا ہے۔“

”اللہ خوش رکھے ان سب کو۔“

”ہو سکے تو ڈیڈی جان کو معاف کر دیں۔“

مئی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دے کر بولیں ”تم فکر نہ کرو۔ شادی اور

دوسری رسموں میں کسی کوشش بھی نہیں ہونے دوں گی کہ میری اور تمہارے باپ کی بول چال نہیں ہے۔“

”کیا سچ ایسا نہیں ہو سکتا!“

مئی نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر کہا ”وقت بھی کیا چال چلتا ہے، کبھی میں کوشش کیا کرتی تھی تمہارے باپ کی

طرف سے تم بھائی بہنوں کے دل صاف رکھنے کی اور اب تم بھائی بہن سفارش کرتے ہو۔“

”یہ آپ کی اسی کوشش کا نتیجہ تو ہے والدہ۔“ منجھانے مئی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگالیا۔

☆☆☆

اگلی صبح اس نے اسمبلی میں بچیوں سے خطاب کیا اور انہیں اسکول میں نظم و ضبط، صفائی ستھرائی اور پڑھائی کے سلسلے

میں چند ضروری ہدایات دیں۔ انہیں بتایا کہ مسلمان بچیاں ہونے کے ناتے ان کا کردار عمل کیا ہونا چاہیے۔ بحیثیت

پاکستانی ان کے فرائض کیا ہیں اور طالبات علم ہونے کے ناتے ان کی کیا ذمے داریاں ہیں۔ بچیاں بڑے انہماک

سے سنتی رہیں۔

اسمبلی کے بعد اس نے اسکول کا راولڈ لیا۔ دوسرے پیریڈ میں غیر تدریسی عملے کی میٹنگ رکھی۔ گو سبھی لوگ اس

سے بخوبی متعارف تھے مگر پرائمری اسکول میں رہتے ہوئے اس کی ان سے دور دور کی علیک سلیک تھی، اب تعلق کی

لوہیت بدل گئی تھی۔ محض ”السلام علیکم میڈم“ کا رشتہ نہ تھا تعلق کا تھا۔ ان سے صحیح طور پر کام لینا تھا۔ آفس کلرک شاہد

حسین نے اسے نام بنام ان میں سے ہر ہر فرد کے فرائض کا رے آگاہ کیا۔ منجھا کو دو دن پہلے تک پرائمری اسکول میں

اپنے دور عہد کے دوران انتہائی تپاک سے سلام داغتے ہوئے گزرنے والے لوگ ترساں دلرزاں سے دکھائی دیئے۔

”میں آپ میں سے ہر شخص کو یہ یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اپنے فرائض کو ذمے داری کے ساتھ ادا کرنے والے

افراد کو میرے ساتھ کام کرنے میں انشاء اللہ تعالیٰ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”میڈم! پریشانی تو یہی ہے۔“ مالی غلام فرید نے دبی زبان سے کہا۔

”میں بھی نہیں۔“ منجھانے کہا۔



غلام فرید نے اپنے ساتھیوں پر ایک دزدیدہ نظر ڈالی اور کچھ اس طرح جیسے ان سب کی ترجمانی کرنے چلا ہو، کہا ”میڈم! ہم نے سنا ہے آپ کام بہت سختی سے لیتی ہیں۔“  
”صرف سنا ہے!“ منتہا دھیرے سے مسکرائی۔

غلام فرید نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا ”نہیں جی دیکھا بھی ہے۔ آپا صغراں آپ کے آنے سے پہلے ہر وقت اپنی کمر پکڑے پھرتی تھی کہ کمر میں درد ہے۔ ہم نے اسے کبھی کام ہی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آپ نے تو جی اس کی کمر کا درد نکال دیا۔“

منتہا نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ایک معنی خیز نظر ان سب پر ڈالی اور کہا ”کیا آپ میں سے بھی کوئی کمر درد کا مریض ہے؟“

”ان سب نے درزیدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا“ شاہد حسین دھیرے سے مسکرائے پھر بولے ”میڈم! ہائی اسکول میں آپ کی ٹرانسفر کی خبر سننے کے بعد ان سب نے اپنی کمروں کی دردیں نکالنے کی مشق شروع کر رکھی تھی جی۔ میرا نہیں خیال کہ اب ان میں سے کسی کو کمر درد رہا ہوگا۔ ویسے میڈم ان میں سے دو نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ اور دو نے ٹرانسفر کی درخواست دے رکھی ہے۔“

”ریٹائرمنٹ کی خبر تو میں نے بعض سینئر ٹیچرز کے بارے میں بھی سنی ہے۔“ منتہا نے کہا۔  
”جی میڈم آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ شاہد حسین نے کہا ”ویسے میں تو آپ کے آنے سے خوش ہوا ہوں۔ کوئی تو ہو جو کام نہ کرنے والوں کی دردیں نکالے۔“

مینگ میں موجود غیر تدریسی عملے کے اکثر اراکین نے شاہد حسین کو ناگواری سے دیکھا۔  
وقفہ شروع ہونے کے دس منٹ بعد تدریسی عملے کے ساتھ مینگ رہی۔ منتہا نے اس مینگ کے لیے دوسرے پیریڈ میں ایک نوٹس متعلقہ عملے کو بھجوا دیا تھا۔ وقفہ شروع ہونے کے بعد دس منٹ چائے پینے کے لیے دیئے گئے تھے۔ اساتذات کے ساتھ مینگ میں اس نے چند ضروری امور کے سلسلے میں بات چیت کی۔ گواہی اسکول میں پہلے دن اسے اس منظر کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا جیسا کہ اسے پرائمری اسکول میں تجربہ ہوا تھا۔ جانے والی پر پہل کچھ عرصہ قبل ہی عمارت کو رنگ و روغن کروا کے خاصے صاف ستھرے حالات میں چھوڑ گئی تھیں مگر چہرے کو صرف دھو لینا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔ اسے دوسروں کے لیے دیدہ زیب بنانے اور چہروں کے ازدحام میں نمایاں کرنے کے لیے مصنوعی طریقوں سے سنوارنا بھی پڑتا ہے۔ ادارے کا ”جنرل آؤٹ لک“ یا عمومی منظر دکش بنانے کے لیے کافی کام کرنے کی ضرورت تھی۔ منتہا کا نظریہ یہ تھا کہ تعلیم گاہوں کو اس طرح آراستہ کیا جانا چاہیے کہ ان کے در و بام بھی طالب علموں کی تعمیر کردار کرتے نظر آئیں۔

صبح اسمبلی میں اسے طالبات کی کارکردگی بڑی بے جان سی محسوس ہوئی تھی۔ کھٹنی بجنے کے بعد وہ ست روی سے اسمبلی گراؤنڈ میں پہنچی تھیں۔ قطاریں بننے میں خاصی دیر لگی اور پھر بھی بعض قطاریں میڑھی میڑھی سی نظر آئیں۔ اسمبلی میں ٹیچرز کی حاضری برائے نام تھی۔ اسمبلی کی کھٹنی بجنے تک حاضری رجسٹر میں دستخط نہ کرنے والی ٹیچرز کو تو منتہا سرخ قلم سے ”لیٹ“ مار کر آئی تھی مگر باقی ٹیچرز؟ پوچھنے پر معلوم ہوا اسٹاف روم میں تشریف فرما تھیں۔ انہیں بلوانا پڑا۔ دیر سے اسکول پہنچنے والی ٹیچرز میں سے بعض جھینپی جھینپی مگر ایک دو منہ پھلائے ہوئے پہنچیں۔ منتہا چپ چاپ کھڑی جائزہ لیتی رہی۔ اسمبلی جلدی جلدی بھگتانے والے انداز میں ہوئی۔ قوی ترانہ بے جوش و جذبہ نیم مردہ سی آواز میں پڑھا گیا۔ اسمبلی کے بعد بچیاں بڑی افراتفری میں اپنے کمرہائے جماعت کی طرف گئیں۔ پی ٹی آئی خاتون خاصی ڈھیلی سی دکھائی دیں۔ اسمبلی گراؤنڈ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کوزا کرکٹ سوکھے پتے بد مستیاں کرتے ریپر ز اور پولی تھین کی شکن آلود میلی تھیلیاں۔ احاطے میں کیا ریوں اور پودوں کی تشکیل و ترتیب بڑی بے جتنم تھی۔

اسی ختم ہونے کے بعد اکثر ٹیچرز کمرہائے جماعت میں جانے کے بجائے اسٹاف روم میں گئیں اور وہاں سے کچھ دیر بعد اپنے اپنے کمرہ جماعت میں پہنچیں، اس دوران طالبات کمروں میں شور مچاتی رہیں۔ پہلا پیریڈ ختم ہونے پر کمرہائے جماعت میں لڑکیوں کے شور نے پھر اسکول سر پر اٹھالیا۔ یہاں سے وہاں تک شور ہی شور تھا۔ جوں جوں ٹیچرز کمروں میں پہنچتی گئیں اس شور میں کمی آتی گئی مگر یہ شور بالکل ختم نہ ہوا۔ لائبریری میں غیرتداریسی عملے کی مینٹگ لینے کے لیے جاتے ہوئے ملتہا ان شور مچاتی جماعتوں میں جھانکنے پر مجبور ہو گئی۔ شاہد حسین بھی جو مینٹگ میں شرکت کے لیے ملتہا کے ساتھ ساتھ لائبریری کی طرف جا رہے تھے ٹھنک گئے۔ شور مچاتی جماعتوں سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ ان جماعتوں میں جن ٹیچرز کے پیریڈ تھے وہ اسکول میں حاضر تو تھیں مگر ابھی تک کمروں میں نہ پہنچی تھیں۔ سبب شاہد حسین نے آہستہ سے بتایا۔

”میڈم! دوسرے پیریڈ میں ان ٹیچروں کے لیے جو صبح گھروں سے ناشتا کر کے نہیں آئیں چائے بنتی ہے اور وہ ناشتا کرنے کے بعد اپنی کلاسوں میں جاتی ہیں۔“

”اچھا!“

”جی میڈم بہت بُرا حال ہے۔“

”مگر پرائمری اسکول پر تو ہائی اسکول والوں کی بہت دھاگ ہے۔“

”بس میڈم اوپر اوپر کا دکھاوا ہے، اندر حالات کافی بگڑے ہوئے ہیں۔ آپ اللہ پر یقین کریں میڈم، میں تو آپ کے آنے سے بہت خوش ہوا ہوں۔ پرائمری اسکول کی طرح یہاں بھی کچھ تو حالات سدھریں گے۔“

ملتہا کا دل جکے سے ملال سے دوچار ہو گیا۔

کاش! اسے چھٹی نہ لینا ہوتی۔

ہائی اسکول کے لیے گئے دن تھے اس کے پاس پھر تو لمبی رخصت! بہر حال ان گئے دنوں میں بھی جتنا کام کیا جاسکتا تھا وہ تو کرنا تھا۔ آخری دن آخری لمحہ تک!

جیسے پیریڈ میں جب وہ اسکول کے داؤنڈ پر تھی چراسی نے اسے گھر سے فون آنے کی اطلاع کی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ گھر سے فون آنا اور وہ براہ راست کال ریسپورڈ کر لیتی تو خیر مگر کسی اور ذریعے سے فون آنے کی اطلاع ملتی تو اس کا ماتھا بونٹی ٹھنک جایا کرتا تھا۔ لپک جھپک اپنے دفتر میں پہنچی، کال ریسپونڈ تو می لائن پر تھیں ”میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ آج چھٹی کی درخواست ضرور دیتی آنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ فون آنے کی وجہ خدا نخواستہ پریشان کن نہ تھی۔

”ٹھیک ہے نہیں۔ درخواست کی فونو کال پی ساتھ لانا مجھے دکھانے کو۔“ وہ مسکرائے بنانہ رہی۔

”آپ فکر نہ کریں والدہ میں اصل ہی لے آؤں گی۔“

”اصل لے آؤ گی تو اپنے ڈائریکٹریٹ کو کیا بھجواؤ گی۔“

”ہاں..... یہ مسئلہ تو ہے۔“ می اس کے مذاق کو سمجھ گئیں۔

”اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ..... آج درخواست بھجوا کر آنا۔“

”بہتر والدہ حضور۔“

می سے بات کرنے کے بعد اس نے چھٹی کی درخواست لکھی اور شاہد حسین کے سپرد کرتے ہوئے کہا ”شاہد صاحب! ڈائریکٹریٹ بھجوانے کے لیے یہ کیس تیار کر لیجئے۔ کل کی ڈاک میں ضرور چلا جائے۔“

”جی بہتر۔“ شاہد حسین نے اس کی تحریر کردہ درخواست پر نظر دوڑائی پھر حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے ”میڈم! یہ تو چھٹی کی درخواست ہے۔“



”جی شاہد صاحب۔“  
 ”کوئی گڑبڑ ہوگئی۔“ شاہد حسین نے بہت محتاط سے لہجے میں کہا۔  
 ”کیسی گڑبڑ شاہد صاحب۔“

”میرا مطلب ہے میڈم..... ایسی کیا بات ہوگئی جو کل آپ نے جوائننگ دی اور آج..... ایک سال کی چھٹی کی درخواست!“

”کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی شاہد صاحب..... میں اپنی ذاتی وجوہ کی بنا پر چھٹی لے رہی ہوں۔“  
 ”یہ تو پھر گڑبڑ ہوگئی..... میں تو آپ کے آنے سے خوش ہوا تھا۔“

”اب شاید وہ خوش ہوں گے جو میرے آنے سے ناخوش ہوئے ہیں۔“  
 شاہد حسین نے اثبات میں سر ہلایا اور چہرے پر مایوسی کا تاثر لیے منجھا کی تحریر کردہ درخواست لیے پلٹ گئے۔

☆☆☆

لیلیٰ اور فہیم کراچی پہنچ چکے تھے۔ نعیم کی آمد میں ابھی کچھ دن تھے۔ اسے شادی سے چند دن قبل پہنچنا تھا۔ لیلیٰ اور فہیم کے ہاتھ اس نے بہت سا سامان بھجوا دیا تھا۔ ان سلعے ریشمی جوڑے، طلائی زیورات، کاسمیٹکس، پرفیومز، پرس، ہینڈ بیگز جوتے اور دوسری بہت سی چیزیں۔ میہ اور مٹنے کے لیے اس نے خصوصی تحائف بھجوائے تھے۔  
 دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ لیلیٰ اور فہیم کے آتے ہی یہ تیاریاں گویا دو چند ہو گئیں۔ مزا جا فہیم اور لیلیٰ دونوں ہی محفل پسند تھیں۔ انہوں نے آتے ہی شادی سے قبل اور بعد کی رسموں کے پُرہنگام انعقاد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مایوں، مہندی، چوتھی، چالے لیلیٰ کو تو ہر رسم کا چاؤ سوجھ رہا تھا۔  
 ”بھئی ہمارے کون سے دو چار دیور جیتھ ہیں۔ ہمیں تو اپنے سارے ارمان جی بھر کر ایک ہی کی شادی پر پورے کرنے ہیں۔“

”ضرور کرو۔“ اچھی بھابی نے کہا ”مگر اپنا بھی خیال رکھو۔ تمہارے لیے یہ وقت آرام کا وقت ہے۔“

”یہ موقعے بار بار تھوڑی آتے ہیں ممائی جان۔“

”اور نعیم بھائی کی شادی نے تو بہت ہی انتظار کرایا ہے۔“ فہیم نے کہا۔

”ہاں خدا خدا کر کے یہ دن آیا ہے۔“ اچھی بھابی نے تائید کی۔

”اور اس شادی کی خوشی بھی کو اس لیے زیادہ ہے کہ..... روٹھے ہوئے من گئے ہیں۔“ لیلیٰ نے کہا۔

”ہاں..... یہ اللہ کا بڑا کرم ہے۔“ اچھی بھابی بولیں ”ٹوٹے ہوئے رشتے پھر سے جڑ گئے ہیں۔“

☆☆☆

منجھا کو ہائی اسکول جوائن کئے ہفتہ بھر ہو چکا تھا۔ اس دوران نہ وہ خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی تھی نہ اوروں کو بیٹھنے دیا تھا۔ سچر وقت کی پابندی کر رہی تھیں۔ اسبلی کی کھنٹی بجنے پر لپک کر گراؤنڈ میں پہنچتیں۔ اسبلی پروگرام میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ منجھا نے ایک سینئر ٹیچر کو اسبلی پروگرام کی نگرانی مقرر کر دیا تھا۔ ہر روز اسکول کے کسی ایک فریق کی طالبات اسبلی پروگرام پیش کرنے کے لیے باقاعدہ تیاری کر کے آتیں اور اپنی نگرانی جماعت کی رہنمائی میں موٹر پروگرام پیش کرتیں۔ اپنے رُوبرو کھڑے ہو کر بولنے والوں کی آوازوں کو انتہائی مرتعش کر دینے والے مائیک کی منجھا نے اپنی جوائننگ کے ایک دو روز..... بعد ہی مرمت کروالی تھی۔ غیر متدلیسی اسٹاف میں سے ایک فرد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اسبلی کی کھنٹی بجنے سے دس منٹ قبل ہی اسبلی کے چوٹرے پر مائیک اسٹینڈ لا دھرے۔ اسبلی قارئین آن کر کے مائیک کی کارکردگی جانچے۔ روٹرم چوٹرے پر موجود ہو۔ پرچم کشائی کے لیے پرچم اپنے مخصوص انداز میں ڈوری سے لپٹا ہوا موجود ہو۔ نیز پرچم پر چاند تارے کی سمت درست ہو۔ اگلے رخ پر نہ ہو جیسا کہ پہلے دن دیکھنے میں

آیا تھا جب پرچم کو ڈوری میں اس طرح پرویا گیا تھا کہ چاند تارا اوپر کے رخ پر ہونے کے بجائے نیچے زمین کا رخ کئے دکھائی دیئے تھے۔ طالبات کے لیے سر پر سفید اسکارف لینا لازم کر دیا گیا تھا۔ بچیوں کے سر ڈھک جانے سے ان کے چہروں پر نور اور شخصیت میں وقار آ گیا تھا۔ گو اسکارف کو یونیفارم کا جزو لازم قرار دیئے جانے پر بعض اساتذات نے ایک دو دن بڑی ناک بھوں چڑھائی تھیں اور خاصے تنقیدی جملے کہے تھے۔

”میڈم تو اچھی بھلی اساتذہ بچیوں کو ملانیاں بنانے پر تل گئی ہیں۔“  
 ”یہ اسکول ہے..... انگلش میڈم اسکول کوئی مدرسہ تو نہیں جو لڑکیوں کو اسکارف اوڑھنے کا پابند کیا جا رہا ہے۔“  
 ”آف اللہ! ہم سے تو اس گرمی میں تھوڑی دیر سر پر دوپٹا نہیں اوڑھا جاتا بے چاری بچیاں تو صبح سے دوپہر تک اسکارف اوڑھے اوڑھے پاگل ہو جاتی ہوں گی۔“

”اور ابھی تو موسم اتنا شدید نہیں۔ سخت گرمیوں میں بھلا کیا حال ہوگا۔“  
 ”کیا ہوگا! کچھ بھی نہیں میڈم چلی جائیں گی چھٹی پر..... پھر ہم ہوں گے اور ہماری بچیاں۔“  
 ”میڈم کی اپنی بیٹیاں ہوتیں نا تب انہیں پتا چلتا کہ صبح سے دوپہر تک سر پر اسکارف لیے رکھنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی اولاد کی تکلیف کا انہیں کیا احساس۔“

”ارے بھئی بیٹیاں تو تب ہوتیں نا جب شادی ہوئی ہوتی۔ ہماری میڈم تو خیر سے اب تک کنواری ہیں۔“  
 ”اب کیا کریں گی آدمی عمر کی تو ہو گئیں۔ بالوں کو مہندی لگاتی ہیں۔“  
 ”خیر شادی تو ان سے بھی زیادہ زیادہ عمر کی لڑکیوں کی ہو جاتی ہے۔“

”لڑکیاں! ہا..... ہا..... ہا“ طالبات کے لیے اسکارف کی پابندی ہی نہیں منجھا کے اور بہت سے اقدامات پر بھی جن کا ادارے میں اطلاق وہ کیے بعد دیگرے بڑے تو اتر کے ساتھ کئے جا رہی تھی پھر زاس طرح اپنی تنقید اور تبصرے جاری رکھتیں۔

”خدا یا! پچھلی میڈم نے کتنی چاہت سے رنگ برنگے گلابوں کی کیاریاں بنوائی تھیں۔ ان محترمہ نے تو آتے ہی انہیں اکھڑا پھینکا۔“  
 ”وہ کوئی کیاریاں تھیں۔“ کوئی ایک آدھ حق گو بھی بول ہی اٹھتیں۔  
 ”تو پھر کیا تھیں۔“

”کیا رے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس فٹ جگہ گھیر رکھی تھی۔ کوئی یہاں کوئی وہاں نہ کوئی خوبصورتی نہ تناسب۔ اب کم از کم لان کی صورت تو کچھ نکلتی چلی آرہی ہے۔“

منجھا کا ایک پاؤں لان میں ہوتا تو دوسرا ستور میں۔ ادھر مالی کو ہدایات دے رہی ہے تو ادھر ستور سے آثارِ قدیمہ نکلوا نکلوا کر ایک طرف ڈھیر کر داتی جا رہی ہے۔ لڑکیاں اسے اپنے بیوت اللہ میں جھانکتے دیکھ کر حیران ہوتیں اور وہ خاکروب خاتون کو موتے پر ہی بلا کر ہدایات جاری کرتی ”ایک ایک فلش ٹینک چلاؤ باتھ رومز کو اچھی طرح دھوؤ تیناٹل ڈالو۔ اور ہاں یہ دیواروں پر اپنی گرد دیکوں ہے۔ ادھ خدا یا! یہ چھت تو مکڑی کے جالوں سے الٹی پڑی ہے“

جائے بھی صاف کرو۔  
 ”میڈم جی! جالے مجھ سے نہیں صاف ہوتے۔“ خاکروب خاتون یا سمین منمنائی۔  
 ”کیوں بھی کیوں نہیں ہوتے صاف جالے تم سے ا“  
 ”میڈم! میرا ہاتھ اتنا اونچا نہیں جاتا۔“

”اسٹور میں بالس پڑے ہیں۔ ایک بالس لو اس کے ایک سرے کے ساتھ پھول جھاڑو مضبوطی سے باندھو اور اس سے جالے صاف کرو۔“



”میڈم فیصل بھی نہیں ہے۔“

”فکرمات کرو فیصل ابھی منگوا لیتے ہیں بازار سے تب تک تم جا لے صاف کرو۔ میں بریک کے بعد دوبارہ ہاتھ رو مزکا چکر لگاؤں گی۔ دن میں دو تین بار صفائی ہونی چاہیے ان ہاتھ رو مزکی۔ آٹھ نو سو پچاس استعمال کرتی ہیں انہیں..... اور ہاں میں نے ٹیچرز کا واش روم دیکھا تھا۔ اسے بھی ٹھیک طرح سے دوبارہ صاف کرو۔“

معتبا کے پلٹتے ہی یاسمین اپنا منہ چھپا کر زبان چڑاتی، انگوٹھے دکھائی اور اپنے رخساروں کو سینٹے ہوئے اپنے دل ہی دل میں برا بھلا کہنے لگتی۔ عجیب و غریب تھی یہ نئی پرنسپل! اس سے پہلے تو کبھی کسی نے یوں آ کر بچپوں کے متعفن اور عنکبوت زدہ بیت الخلاؤں کو کبھی نہیں سونگھا تھا! اور نہ ہی دو وقت پوچھا لگوا یا تھا۔ یہ تو زالی تھی! اسے کلاس روم دفتر برآمدے، گراؤنڈ اور ہاتھ رو مز ہی نہیں گیٹ کے باہر اسکول کی دیوار کے آس پاس بھی صفائی چاہیے تھی۔ بد بخت نے یہاں سے وہاں تک اسکول میں جا بجا کوڑے دان رکھوا دیے تھے ہر کمرہ جماعت کے باہر ایک کوڑا دان جنہیں روزانہ خالی کرنا بھی ضروری ہوتا۔ جن دنوں یہ پرنسپل پرائمری اسکول میں ہوتی تھی کام کے بارے میں اس کی سخت مزاجی کی خبریں ہائی اسکول پہنچتی رہتی تھیں مگر ایسی سختی! کج بخت نے ہفتہ بھر ہی میں یاسمین کے نہ صرف سارے کسٹل نکال دیے تھے بلکہ اس کے زیادہ زبان چلانے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ غنیمت تھا کہ اسے کچھ دنوں بعد لمبی چھٹی پر دفع ہو جانا تھا ورنہ بری مشکل پڑ جاتی!

صرف یاسمین ہی کیا باقیوں کی بھی سختی آئی ہوئی تھی۔ چوکیدار جسے پہلے چوکیداری کے سوا سارے کاموں سے دلچسپی تھی اور اسکول لگتے ہی اپنی حاضری لگوا کر رات بھر ڈیوٹی کا بہانہ کر کے سونے کے لیے اپنی کوٹھری میں جا کر گرمیوں میں پیئر شٹل فین اور سردیوں میں ہیٹر آن کر کے لمبی تان کر پڑ جایا کرتا تھا اب دن بھر گیٹ پر ڈیوٹی دیتا نظر آتا۔ نائب قاصد بھی لا بریری تو بھی لیبارٹری، کبھی دفتر تو کبھی اسٹاف روم کی ترتیب نوکی خاطر سامان ادھر سے ادھر کھینچتے اور ڈھوتے دکھائی دیتے۔ اللہ جانے کیوں یہ نئی پرنسپل برسوں سے اپنی جگہ پر جمی چیزوں کو ادھر ادھر کر دانے کے درپے تھی۔ جبکہ خبر یہ تھی کہ اسے زیادہ دن رہنا بھی نہیں تھا جلد ہی لمبی چھٹی پر حلے جانا تھا۔

ٹیچرز کو بھی درس و تدریس کے علاوہ اضافی ذمے داریاں تفویض کر دی گئی تھیں۔ کوئی اسبلی پروگرام کی نگران، کوئی اسکول میں نظم و ضبط کی ذمے دار، کوئی اسکول میں بزم ادب کی تشکیل پر مامور تو کوئی اسکول کینٹین میں اشیائے خورد و نوش کے معیار پر نظر رکھنے کی پابند، کسی کو ہفتہ بھر کے اندر اندر انتخابات کے ذریعے ”اسٹوڈنٹس یونین“ تشکیل دینے کی ذمے داری سونپی گئی تو کوئی پانی کی ٹنکی کے اندر باہر صفائی ستھرائی رکھوانے اور طالبات کو صاف پانی کی فراہمی یقینی بنالینے پر مامور ہوئیں۔ آرٹ ٹیچر ادارے کے بام و در آ راستہ کرنے کی ذمے دار قرار دی گئیں اور نگران ہائے جماعت کو اپنے اپنے کمرہ جماعت کی ایسی تزئین و آرائش کی ہدایات جاری ہوئیں کہ ہر کمرہ جماعت کی آرائش اس جماعت کے نصاب سے مطابقت کی آئینہ دار بن جائے نہ صرف یہ بلکہ طے پایا کہ ہفتہ بھر کے اندر تمام فریق اپنے اپنے کمرہ جماعت کو آ راستہ کر لیں۔ ہفتے کے آخری دن ایک غیر جانب دار کمیٹی تمام کمروں کا جائزہ لے گی اور بہترین فریق کو ایک شیلڈ دی جائے گی جو ونگ شیلڈ ہوگی۔ ہر تیسرے ماہ ایک کمیٹی تمام کمروں کا جائزہ لے گی اور جس جماعت کو ہر اعتبار سے بہتر پائے گی یہ شیلڈ اسے دے دی جائے گی۔ اس مقابلے اور یونین کے انتخابات کے لیے امیدواروں کی نامزدگی نے طالبات میں بڑی سرگرمی پیدا کر دی تھی۔

اگرچہ ہائی اسکول میں معتبا کو حالات پرائمری اسکول میں اپنی جوائننگ کے وقت ملنے والی صورت حال سے نہایت بہتر ملے تھے مگر پھر بھی اصلاحات کے لیے بہت گنجائش نظر آتی تھی۔ بقول کسے ”بہتری کی گنجائش ہمیشہ ہوتی ہے۔“ سو معتبا بھی ہائی اسکول میں اپنے گمنے چنے دنوں میں جو کچھ کر سکتی تھی کر جانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

☆☆☆



منجہا اور ثروت علیہ کے ساتھ بازار مٹی ہوئی تھیں۔ ان دنوں ہر روز ہی بازار جانا پڑ رہا تھا۔ جوں جوں شادی کے دن نزدیک آتے جا رہے تھے مٹی کا دل اداس ہوا جا رہا تھا۔ ہمیشہ کے لیے منجہا کے اس گھر سے دوسرے گھر چلے جانے کا خیال رہ رہ کر انہیں دل گرفتہ کر دیتا۔ بیٹیاں واقعی مہمان ہوتی ہیں جلد یاد دیر انہیں بابل کا گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔

منجہا کے لیے مٹی کے دل میں محبت ہی محبت تھی اور محبت کے ساتھ اک احساس شکر گزاری بھی۔ بہت ساتھ دیا تھا اس نے ان کا۔ کنبے کی کفالت کی خاطر برسوں وہ کولھو کے نبل کی طرح مشقت کرتی رہی تھی۔ ملازمت پر ایویٹ ٹیوشنز۔ یہی نہیں اس نے مٹی کو جذباتی سہارا بھی دیا تھا۔ جب وہ دل شکستہ ہونے لگتیں تو وہ انہیں دلا سادہ جتنی۔ بُرے دن گزر گئے تھے مگر ان کے نقوش یاد دل پر ثبت تھے۔ یادیں باقی تھیں۔ انہیں سہارا دینے والی ہمیشہ کے لیے ان کے گھر سے رخصت ہوا چاہتی تھی۔ دل تو دکھنا ہی تھا۔ مٹی کی آنکھیں بار بار چپکے چپکے بھیگ جاتیں۔

بازار جانے سے پہلے ثروت ہانڈی چڑھا گئی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے مٹی سے تھوڑی دیر بعد ہانڈی دیکھ لینے کو کہا تھا۔ مٹی جو قرآن مجید کے جزدان پر گونے کے پھول ٹانگنے میں مصروف تھیں ان دنوں کے جانے کے کچھ دیر بعد چولھے پر رکھی ہانڈی دیکھنے کو انہیں تو ڈیڈی کے لیے چائے بھی بنا دی۔ چائے کی پیالی ان کے کمرے میں پہنچانے کے بعد حسب معمول خاموشی کی مہربوں پر ثبت کیے واپس ملنے لگیں تو ڈیڈی کی آواز نے ان کے قدم پکڑ لیے۔

”معاف نہیں کرو گی؟“ ڈیڈی نے کہا تھا۔

مٹی جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ دل کی دھڑکن دھیمی پڑ گئی۔ سانس جیسے تھم سی گئی اور وجود سا کبت ہو گیا۔ ڈیڈی اپنی جگہ سے اٹھے اور ان کے روبرو آکھڑے ہوئے ”بہت شرمندہ ہوں میں تم سے۔“ انہوں نے کہا۔ مٹی دم بخود کھڑی تھیں۔

”دیکھو۔“ ڈیڈی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کر دیئے ”میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں..... مجھے معاف کر دو۔“

مٹی پر جیسے سکتے سا طاری تھا۔

”تمہاری خاموشی مجھے مارے ڈالتی ہے۔ مجھے جتنا بُرا بھلا کہنا چاہو کہہ ڈالو مگر..... یوں راندہ درگاہ نہ بنائے رکھو۔“

مٹی نے بے ساختہ چونک کر انہیں دیکھا اور اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئیں۔

”کس نے بنایا ہے آپ کو راندہ درگاہ ڈاکٹر صاحب آپ کو تو بچوں نے آپ کی تمام تر زیادتیوں اور بے مروتی کے باوجود صبر آنکھوں پر جگہ دی ہے اس گھر میں۔“

”جب تک تم..... تم مجھ سے اپنی خفگی دور نہیں کرو گی میں خود کو اس گھر میں اجنبی ہی محسوس کرتا رہوں گا۔“

”بہت وقت گزر گیا۔“ مٹی بو جھل آواز اور دل گرفتہ لہجے میں بولیں ”اب تو تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔“

”خوشی کا ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے۔ مجھے دوبارہ اپنی زندگی میں شامل ہو جانے کی اجازت دے دو۔“

مٹی نے نظریں چار کی تھیں۔

”پلیز!“ وہ گڑ گڑائے ”خدا کے واسطے مجھ پر رحم کھاؤ۔ میں بد قسمت ہاں اپنے دو بچوں کی شادیوں میں تو

شریک نہیں ہو سکا۔ مجھے منجہا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرنے کی اجازت دو۔“

”کس نے منع کیا ہے۔“

”میں مجرم بن کر نہیں ہاں کی طرح اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں اور یہ اعتماد مجھے تم سے مل سکتا ہے، صرف تم

سے۔ مجھ سے تمہاری یہ بیگانگی ختم ہوگی تو مجھے آپ ہی آپ یہ اعتماد مل جائے گا۔ اپنے دل میں بس ذرا سی جگہ دے دو



مجھے۔“

مئی کی آنکھیں بھر آئیں۔

کیسے بتائیں وہ اس جفا جو مرد کو کہ اس کے تمام تر ستم کے باوجود انہوں نے اسے اپنے دل میں ہی بسائے رکھا تھا۔

”ملتہا کی شادی میں، میں صحیح معنوں میں سچی خوشی اور اعتماد کے ساتھ صرف اسی صورت میں شریک ہو سکوں گا جب تم مجھے معاف کر دو گی اور اپنی آنکھوں میں میرے لیے ویسی ہی محبت اپنے لہجے میں میرے لیے ویسی ہی اپنائیت پیدا کر لو گی جیسی کبھی ہوا کرتی تھی۔“

مئی کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بوڑھے ہو چکے ہیں آپ اور..... میں بھی۔“

”تجربہ کہتا ہے کہ بڑھاپے میں مرد کو جوانی کی نسبت عورت کی محبت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔“ وہ مئی کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

مئی جھینپ سی گئیں۔

ڈیڈی آگے بڑھے اور انہوں نے مئی کے شانوں پر اپنے ہاتھ دھر دیے۔

مئی کو اپنے وجود میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔

ایک ایک ڈیڈی نے انہیں اپنے سینے سے لگایا اور مئی کو یوں لگا جیسے بے آب و گیاہ ریگزار میں اچانک نخلستان کا منظر دکھائی دینے لگا ہو۔

☆☆☆

ہائی اسکول کے نقش و نگار خاصی تیزی سے بدلے۔ شاید اس لیے کہ پرائمری اسکول کے برعکس یہاں طالبات کو کسی کام کی ترغیب دینے کے لیے ہلکا سا اشارہ کرنے اور انہیں متحرک کرنے کے لیے بس ذرا سی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔ چند ہی دنوں میں کمرہ ہائے جماعت اور رایداریاں نوع بنوع تعلیمی چارٹس رنگ برنگ تصاویر خوشنما کیلنڈروں اور نظر افروز دستکاریوں سے مزین نظر آنے لگیں۔ ادارے کی رایداریوں اور دفاتر کو آرٹ پیچر نے طالبات کی مدد سے نئی سچ دھج دے ڈالی۔ لائبریری کو نیا نکھار نئی ترتیب مل گئی۔ لیبارٹری کے برسوں پرانے گرد آلود سراپا نے نیا روپ دھار لیا۔ ادارے کی جانب سے سائنس فاؤنڈیشن کی ایک کال پر فاؤنڈیشن نے نہ صرف بیس پچیس دیدہ زیب سائنسی تعلیمی پوسٹرز بلا قیمت ارسال کر دیئے بلکہ ادارے کو ایک معلوماتی سائنسی مجلے کی اعزازی ترسیل کا بھی بندوبست کر دیا۔ نہ جانے لوگ کیوں دوسروں کے عدم تعاون کے شاک میں رہتے ہیں۔ ملتہا کا تجربہ زندگی تو صد فیصد اس شاعر کا ہم نوا تھا جس نے کہا تھا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتر ہے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

پرائمری اسکول کی بد حالی کو دور کرنے کے لیے اس نے جب جہاں اور جس سے بھی تعاون مانگا تھا اس کی توقعات سے بڑھ کر ملا تھا۔ ہائی اسکول میں جہاں صورت احوال بہت بہتر تھی دلوں کے کام گویا گھنٹوں میں ہو رہے تھے۔ یونین کے انتخابات میں صرف دو دن رہ گئے تھے اور اسمبلی میں صرف ایک مرتبہ ہی ”پلانٹس کلیکشن“ کے اعلان نے طالبات کی جانب سے گملوں کی قطاریں لگوا دی تھیں۔ اب وہ اور بات تھی کہ بعض اوقات بڑے دل شکن اعتراضات اور تمبرے اکثر بالواسطہ اور کبھی کبھی بلا واسطہ بھی سننے کو ملتے۔ مثلاً یہ کہ اسکولوں میں اس ظاہری ٹیپ ٹاپ اور دکھاوے کا فائدہ! بچیوں کی توجہ پڑھائی سے ہٹا کر ادھر ادھر بھٹکانے کی وجہ؟ یہ اعتراض پہلے اسٹوڈنٹس یونین کے

انتخابات کے اعلان پر کیا گیا پھر پودے جمع کرنے کی مہم پر..... مگر منجہا کو ان تنقیدوں، تبصروں اور اعتراضات کی پروا نہ تھی۔ کیونکہ جہاں تک اسکول کی ظاہری حالت کو خوش نمائنے اور پرانی ترتیب کو نیا نکھار دینے کا تعلق تھا وہ اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ جس طرح ہماری بصارت سب سے پہلے کسی شخص کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر ہوتی ہے اسی طرح اداروں کے چہرے بھی ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں کے لیے ”پیلے اسکول“ کا عنوان اسے بہت رنجور کرتا تھا۔ اس لیل کو ہٹانے کے لیے سرکاری اسکولوں کے رنگ دروغن اور ظاہری آرائش کو بھرپور توجہ دے کر نجی اداروں کی ٹکر کا نہ سہی اتنا تو بہتر بنایا جاسکتا تھا کہ آنے والوں کو یہ مدقوق یا آسیب زدہ نہ دکھائی دیں۔

یہاں یہ اعتراض کہ بچیوں کی توجہ پڑھائی سے ہٹا کر اسٹوڈنٹس یونین یا پودے بڑھاؤ مہم پر کیوں مبذول کرائی جا رہی تھی تو یہ منجہا کو بڑا ہی بودا محسوس ہوتا تھا۔ تعلیم صرف کتابیں پڑھنے اور رٹ لینے کا عمل تو نہیں۔ شخصیت کی ہمہ گیر اٹھان کا نام ہے۔ بچوں کی متوازن تعمیر شخصیت کے لیے ہم نصابی سرگرمیوں کی اہمیت سے انکار کرنا گویا تعلیم کے مقصد کو پورے طور پر نہ سمجھنا ہے۔ تعلیم کا مقصد محض کتابیں رٹا دینا تو نہیں کردار سازی ہے۔

اعتراض بر اعتراض تو یہ بھی تھا بعض اسٹاف ممبرز کو کہ جب اسے جلد ہی لمبی رخصت پر چلے جانا تھا تو وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی چیزوں کی جگہیں تبدیل کر دینے یا نئے کام چھیڑنے کی۔ آخر پہلے بھی تو اسکول برس ہا برس سے چل رہی رہا تھا۔ اسٹوڈنٹس یونین کی ڈمگڈی بجائے بغیر بھی اسکول کے نتائج تسلی بخش ہی آ رہے تھے اور یہ پودے بڑھاؤ مہم تو عجیب تماشا تھی جس نے والدین کو گیلے اٹھا اٹھا کر اسکول پہنچانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیسی مضحکہ خیز اور اسکول کے کھاتے پر فقیرانہ مہم! اس اعتراض پر منجہا کا رد عمل ہم ہنس دیئے، ہم چپ رہے۔ منظور تھا پردہ تیرا کے مصداق رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو جانے والے ہوں تو پیچھے چھوڑ دینے والی جگہ کو تاخت و تاراج کر کے اٹھتے ہیں۔ اداروں سے جانا ہو تو فرائض منصبی سے صرف نظر کر کے انہیں تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتے ہیں۔

☆☆☆

می اور ڈیڈی کی صلح دھیرے دھیرے جڑیں پکڑ رہی تھی۔ برسوں کی دوری کو قربت میں تبدیل ہونے میں کچھ وقت تو درکار ہی تھا۔ بہر حال یہ بھی بہت تھا کہ ان دونوں کے درمیان اب پہلے کی طرح بیگانگی نہیں تھی۔ کچھ تکلف کے ساتھ ہی سہی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ تکلف میں تکلف کا اظہار بھی می کی طرف سے تھا اور نہ ڈیڈی تو دیدہ و دل فرس راہ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بات بے بات بہانے بہانے وہ می کو مخاطب کرنے کی کوشش کرتے۔

منجہا، ”بہہ اور علیب تینوں ہی می اور ڈیڈی کی صلح پر خوش تھے۔ دونوں کی صلح سے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ ڈیڈی، منجہا کی شادی کی تیاریوں میں بھرپور طریقے سے شامل ہو چکے تھے اور اس حوالے سے بھی می کو بہانے بہانے مخاطب کرتے۔

”ہاں بھئی میرے لیے کیا بنوایا ہے تم نے شادی میں پہننے کو؟“ ایک روز انہوں نے می سے پوچھا۔

”مجھے..... مجھے کیا پتا۔“ می بولیں۔

”جہمیں نہیں تو پھر کسے پتا ہوگا۔“ ڈیڈی نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر علیب کو مخاطب کر کے بولے ”کیوں

علیب بیٹے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”سو فیصد درست۔“ علیب نے کہا۔

”لو بھئی اب تو گواہی بھی مل گئی۔“ ڈیڈی بڑی بے تکلفی سے می کے پاس جا بیٹھے۔ می سمٹ سی گئیں۔ علیب اور

”تہا دونوں ہی موجود تھے۔ بچوں کی موجودگی میں ڈیڈی پہلی مرتبہ ان کے اتنے نزدیک بیٹھے تھے۔

”مکن سے کچھ چلنے کی بو آ رہی ہے۔“ می نے بہانے سے اٹھنے کی کوشش کی۔



”کچھ نہیں جل رہا ہے والدہ۔ دو منٹ پہلے ہی کچن سے آئی ہوں دونوں چولہے بند پڑے ہیں۔“  
 می نے چونک کر قدرے خفت سے اسے دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔  
 ”بیٹھی رہیے“ اس کی نگاہوں میں شرارت آمیز معنی خیزی تھی۔  
 ”آپ دونوں ساتھ بیٹھے زبردست لگ رہے ہیں۔“ علیب نے خوش دلی سے کہا۔  
 ”پھر تو مجھے اور نزدیک ہو جانا چاہیے۔“ ڈیڈی کو شوخی سوچھی اور وہ مسکراتے ہوئے سرک کرمی کے اور نزدیک ہو گئے۔

ملتہا اور علیب کی مسکراہٹ گہری پڑ گئی۔  
 برس ہا برس کی دوری کے بعد ان میں سے کس کے وہم و گمان میں تھا کہ ایک روز سب پھر اس طرح ہلکی خوشی مل بیٹھیں گے۔

کچھ میں نہ آتا تھا کہ اگر ٹوٹے ہوئے گھر کو دوبارہ جڑنا تھا تو وہ ٹوٹا ہی کیوں تھا۔  
 اور اگر ٹوٹ ہی گیا تھا تو اس کی شیرازہ بندی اتنے ڈرامائی طور پر ہونے میں اتنا وقت کیوں لگا۔  
 قدرت کا ہاتھ یہ سب کچھ بہت پہلے بھی کر کے دنیا کو مکافات عمل کا ایک نمونہ دکھا سکتا تھا۔  
 مگر راہ نور دونوں کو دوبارہ اپنے مستقر پر پہنچنے میں برسوں کیوں لگ گئے۔  
 قدرت کے بھید وہی جانے!

☆☆☆

ملتہا ٹیچرز کے ساتھ ایک میننگ میں تھی۔ اس میننگ کی ضرورت اسے روزمرہ معمولات کے سلسلے میں بعض ٹیچرز کی پیشہ ورانہ غفلت اور بے پروائی کے باعث محسوس ہوئی تھی ورنہ جو میننگ والے دن تعارفی رسم اور اگلے ہی دن ایک تفصیلی میننگ کے بعد دوبارہ اتنی جلد میننگ کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے تھی مگر بعض ٹیچرز غالباً اس خیال خام کے تحت کہ اس پرنسپل کو تو جلد ہی چھٹی پر چلے جانا تھا اسے خاطر میں نہ لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسکول گلنے کے بعد اسکول پہنچنا، اسمبلی میں شریک ہونے کے بجائے اسمبلی کے وقت اسٹاف روم ہی میں بیٹھے رہنا، پیریڈ ہونے پر کلاس میں دیر سے پہنچنا یا سرے سے نہ ہی پہنچنا اور اگر پہنچ بھی جاتا تو پڑھانے کے بجائے ٹانگ پر ٹانگ دھر کر کرسی پر بیٹھے رہنا، معمول کے فرائض سے غفلت برتنا یا بغیر کسی اطلاع کے اتفاقی رخصت پر گھر بیٹھ جانا ان ٹیچرز کا گویا شیوہ تھا۔ ملتہا چاہتی تو یہ سوچ کر کہ چند دن بعد تو اسے کبھی چھٹی پر چلے ہی جانا تھا اور اس کے بعد کیا پتا دوبارہ کبھی اس ادارے میں آنا بھی تھا کہ نہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا خبر مستقبل میں ملازمت جاری رکھنی بھی تھی کہ نہیں اس قسم کی پیشہ ورانہ غفلت اور بے پروائی کا مظاہرہ کرنے والی ٹیچرز کے رویوں سے صرف نظر کر کے بھی آئندہ چند دن گزار سکتی تھی مگر ایسا کرنا اسے اپنے فرائض منصبی کے منافی محسوس ہوا سو اس نے میننگ بلا لی۔

میننگ کا آغاز خاصے خوشگوار انداز اور دوستانہ ماحول میں ہوا لیکن جب ملتہا نے ٹیچرز کی ان کے فرائض منصبی سے غفلت کی بات چھیڑی تو ماحول یکسر بدل گیا۔ بعض نے سر جھکا لیا۔ بعض ایک دوسرے کو کن انکھوں سے دیکھنے لگیں۔ ایک دو کو ملتہا نے ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتے بھی دیکھا۔ چند زربل معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”ذرا سوچیے کہ ہم..... ہم ٹیچرز جو اپنے اسٹوڈنٹس کے لیے رول ماڈل ہیں ہم اپنے فرائض سے غفلت برت کر اپنے طلبہ کو کیا سکھارہے ہیں۔ فرائض سے غفلت، کام سے جی چرانا، اپنی ذمے داریوں سے نظر بچا لینا۔ ذرا سوچیے کہ اگر ہم خود دیر سے اسکول پہنچتے ہیں تو کیا ہم اپنی طالبات کو وقت کی پابندی کا درس دیتے اچھے لگیں گے۔“  
 ”میڈم صبح ٹریفک بہت ہوتی ہے اس لیے دیر ہو جاتی ہے پہنچنے میں۔“ ایک ٹیچر نے دلی زبان سے کہا۔

”تھوڑا سا جلدی نکلیں گھر سے۔“

”میڈم بچوں کو بھی دیکھنا ہوتا ہے۔“

”یہ صرف ایک آپ ہی کا مسئلہ نہیں۔ ان گنت ملازمت پیشہ خواتین کو اس مسئلے کا سامنا ہے۔“

”میڈم..... ایسی خواتین کو تھوڑی رعایت ملنی چاہیے۔“

”کس کس کو رعایت دی جائے۔ ہر ایک کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے، کسی کے بچے چھوٹے ہیں، کسی کے والدین بوڑھے ہیں۔ کوئی گھریلو مسائل کا شکار ہے تو کوئی خود بیمار ہے۔“ منجہا نے قدرے ترشی سے کہا ”بات یہ ہے کہ ہم رعایتیں لینے کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ اسے اپنا حق سمجھنے لگے ہیں۔“

”سوری میڈم، میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“ ایک دوسری ٹیچر نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

”جی فرمائیے۔“

”میڈم۔“ مذکورہ ٹیچر نے اپنے آس پاس بیٹھی ٹیچرز کو ایک داد طلب طائرانہ نظر سے دیکھنے کے بعد کہا ”آپ تو ہمیں ہمارا جائز حق بھی دینے کو تیار نہیں۔ کیونکہ لیو ہمارا استحقاق ہے مگر جب سے آپ آئی ہیں آپ نے کیونکہ لیو کے سلسلے میں اتنی سختی کر رکھی ہے کہ خدا کی پناہ!“

منجہا نے بغور ٹیچر مذکور کی بات سنی پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا ”پہلے تو آپ ایک غلط فہمی کا ازالہ فرمائیں۔ دوران ملازمت چھٹی ایک سہولت ہے استحقاق نہیں۔ آپ جس فرد کے ماتحت کام کر رہے ہوں وہ اگر یہ سمجھے کہ آپ کی خدمات چھٹی سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں تو وہ آپ کی چھٹی کی نہ صرف درخواست مسترد کر دینے کا حق رکھتا ہے بلکہ اگر آپ چھٹی پر ہوں تو آپ کی چھٹی منسوخ کر کے آپ کو آپ کی خدمات پر واپس بلا سکتا ہے۔ یہ بات میری اختراع نہیں ہے ایسا کوڈ میں درج ہے۔“

”وہ کیا ہے میڈم؟“ پچھلی صف سے آواز آئی۔

”ملازمت کے قواعد و ضوابط پر مشتمل قانونی دستاویز جس سے ہم سب کو ضروری آگاہی ہونی چاہیے۔“

”میڈم..... چھٹی کی ضرورت تو کسی کو بھی ہو سکتی ہے۔“

منجہا کو پرائمری اور ہائی اسکول اسٹاف میں ایک واضح فرق کا احساس ہوا۔ وہاں فرمانبرداری، معصومیت اور اپنے فرائض سے محبت کا احساس خود فراموشی کی حدود کو چھوٹا تھا یہاں خود آگاہی اور اپنے حقوق کے تحفظ کا احساس فرائض پر حاوی محسوس ہوتا تھا۔

”جی..... مجھے چھٹی کی ضرورت سے انکار نہیں۔ مگر اتنا تو ہو کہ چھٹی لینے والا ایک لمحے کو انصاف کے ساتھ یہ ضرور سوچ لے کہ اس کی چھٹی سے کتنے بچوں کی پڑھائی متاثر ہوگی۔ چھٹی بلا ضرورت نہ لیں۔“

”میڈم آخر آپ بھی تو ایک سال کی چھٹی لے رہی ہیں۔“ ایک سینئر ٹیچر نے کہا۔

منجہا کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔

پیشہ ورانہ زندگی میں اس سے پہلے ایسا مشکل مرحلہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے بولنے کو الفاظ نہ مل پارہے تھے۔

”میڈم!“ ایک ٹیچر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ”اب تو خیر آپ چھٹی پر جا رہی ہیں اگر کچھ عرصہ رہیں تو ہم آپ

سے کہتے ہمارا ایک کام ضرور کر دلائیں کیونکہ سنا ہے ڈائریکٹر آف آپ کی بات کو اہمیت دیتا ہے۔“

”آپ کہیے تو۔“ منجہا کو چند لمحوں پہلے آ پڑنے والی مشکل میں کچھ افاتہ سا محسوس ہوا۔

”میڈم! ہمارے اسکولوں میں کام کرنے والی ٹیچرز کے چھوٹے بچوں کے لیے اگر ہر اسکول میں نہ سہی آس

پاس کے دو تین اسکولوں کے لیے کسی ایک اسکول میں ہی ایک ڈے کیئر سینٹر بنادیا جائے تو شاید چھوٹے بچوں والی مجھ جیسی بہت سی مائیں اسکول بھی وقت پر پہنچیں، اپنے فرائض بھی اطمینان سے انجام دیں اور چھٹیاں بھی کم کریں۔



آپ کو پتا ہے میڈم میں اپنی ایک آٹھ ماہ کی بچی کو اس کی بڑی دو سالہ بہن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر آتی ہوں۔“ مذکورہ ٹیچر کی آواز آخر میں بھرا گئی۔  
”ریٹلی!“ منتہا کو حیرت ہوئی۔

”یس میڈم۔“ خاتون نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ”میں اسکول میں موجود ہوتی ہوں مگر میرا دھیان تمام وقت بچیوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ کبھی یہ خوف کہ دو سالہ بچی چھوٹی بہن کو اس کی دودھ کی بوتل منہ میں دیتے ہوئے کہیں نپل کا رخ ناک کی طرف نہ کر دے۔ کبھی یہ ڈر کہ بڑی بچی خود کو کسی حادثے سے دوچار نہ کر لے۔“  
”کوئی اور نہیں ہے جس کے پاس آپ بچیوں کو چھوڑ سکیں؟“

”نومیڈم۔“  
”کوئی..... کوئی آیا رکھ لیں..... ان کی دیکھ بھال کے لیے۔“  
”اگر میں آیا رکھنا فورڈ کر سکتی میڈم تو خود ملازمت ہرگز نہ کرتی۔“ مذکورہ ٹیچر نے بڑی دل گرنگی سے کہا۔  
ٹیچر کے جواب نے منتہا کو شرمندہ کر دیا۔  
مسئلہ گہیر تھا.....!

☆☆☆

نعیم کراچی پہنچ گیا تھا۔

ثاقب بھی اس کی دعوت پر شادی میں شرکت کے لیے اس کے ہمراہ آیا تھا۔ دراز قامت، وجیہہ اور خوش پوش ثاقب کی غیر متوقع آمد سے مسز ظہیر اور منتہا کے گھرانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔  
”دیکھو بیٹا۔“ مسز ظہیر نے آہستگی سے بیسہ سے کہا ”ہمیں قدرت نے بہت اچھا موقع فراہم کر دیا ہے اس لڑکے کو سمجھنے اور پرکھنے کا۔ تم ماشاء اللہ سمجھ دار ہو، خود مختار ہو، جھجکے، شرمانے کی ضرورت نہیں، اس سے بے تکلفی سے بات کرو۔ دیکھو، سمجھو، رکھو۔ اگر دل ٹھکتا ہے تو بسم اللہ دیے شکل صورت سے تو خاندانی اور انداز و اطوار سے مہذب اور نفیس دکھائی دیتا ہے مگر.....“ مسز ظہیر نے توقف کیا اور بیسہ نے ان کی طرف دیکھا، وہ دھیرے سے مسکرائیں پھر اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولیں۔

”یہ ہماری رائے ہے۔ تم اس کے بارے میں اپنی رائے خود قائم کرو اور ہمیں اس رائے سے بلا تکلف آگاہ کرو۔“

”لیکن امی.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاں بولو..... چپ کیوں ہو لگیں؟“

”ابو؟“ اس کے اس ایک لفظ میں بہت سے سوال لرزاں تھے۔

”ابو کی تم فکر نہ کرو۔“ مسز ظہیر نے اسے تسلی دی ”ہم ان سے بات کیے بیٹھے ہیں۔“

”اور منا؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔

”منا!“ مسز ظہیر نے اس کا شانہ دھیرے سے چمپتاتے ہوئے کہا ”منا تمہاری اولاد ہے، تمہارا ہی رہے گا۔“  
دفعہ ان کی آواز بھرا گئی ”ہمارے لیے تو وہ..... فرحان کی ایک زندہ نشانی ہے۔ تم اجازت دو گی اس سے ملنے، پیار کرنے اور سینے سے لگانے کی تو تمہارے شکر گزار رہیں گے ہم ورنہ..... جینے کو تو فرحان کے بغیر بھی جی ہی رہے ہیں۔“

مسز ظہیر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ان کا عکس بیسہ کی آنکھوں میں بھی جھلملانے لگا۔  
ثاقب کے آنے سے می اور ڈیڈی کی خوشی جیسے دوچند ہو گئی تھی۔ گھر بیٹھے رشتہ جو گہرا گیا تھا۔

☆☆☆

ڈائریکٹریٹ سے ملنے کی چھٹی کی منظوری آگئی تھی۔ چھٹی کی منظوری کے سلسلے میں اس کے نام پر موصول ہونے والے مراسلے کی اختتامی طور میں لکھا تھا ”رخصت ختم ہونے کے بعد آپ اسی اسکول میں دوبارہ اپنے فرائض منصبی سنبھالیں گی۔ اس وقت تک اسکول کا چارج سینئر ٹیچر مسز عائشہ عزیز کے پاس رہے گا۔“

گویا اس وقت تک اسکول عبوری سرپرستی میں رہے گا۔  
کیا خبر اس کے بعد کیا ہونا تھا۔

وہ چھٹی مزید بڑھوائی یا ملازمت سے استعفیٰ دے دیتی۔  
اس کا تجربہ تھا اور خلق خدا بھی یہی کہتی تھی کہ عبوری بنیادوں پر کوئی بھی کام پائیدار نہیں ہوتا۔ عبوری طور پر عنان سنبھالنے والا انفریکٹر عدم دلچسپی اور عدم اعتماد کا شکار رہتا ہے اور ماتحت بھی اسے بہت کم خاطر میں لاتے ہیں نتیجتاً ادارہ متاثر ہوتا ہے۔

اس نے ڈپٹی صاحب کو فون کیا جنہیں وہ اپنی چھٹی کی درخواست جلد ڈائریکٹر صاحب کی میز پر پہنچوانے کے سلسلے میں بھی یاد دہانی کرائی رہی تھی ”سر! چھٹی کی منظوری آگئی ہے، میں شکر گزار ہوں آپ کی۔“

”یہ تو آپ کا حق ہے مس ملکہ۔“  
”نوسر، میں جانتی ہوں کہ چھٹی ہمارا استحقاق نہیں ایک سہولت ہے، آسانی ہے جو اگر انفران بالائیں دینا چاہیں تو مل سکتی ہے نہ دینا چاہیں تو ہمارا کوئی زور نہیں۔“  
”آپ خوش قسمت ہیں کہ مل گئی۔“  
”شکریہ سر! اب ایک درخواست اور ہے آپ سے۔“  
”فرمائیے۔“

”سر! آرڈر تو ہو چکا ہے لیکن اگر ممکن ہو تو اسکول عبوری طور پر مسز عائشہ عزیز کے چارج میں دینے کے بجائے مستقل بنیاد پر کوئی خاتون پرنسپل یہاں پوسٹ کر دی جائیں۔“  
”کیا آپ جانتی ہیں کہ آپ خود اپنے لیے کتنی بڑی مشکل مول لینے کی بات کر رہی ہیں۔ آپ کا اسکول شہر کے ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں ہر سہولت دستیاب ہے اور ایک نہیں کئی خواتین پرنسپل ایسی ہیں جو آپ کے اسکول میں پوسٹ ہونا پسند کریں گی مگر ذرا یہ سوچیے کہ چھٹی ختم ہونے کے بعد آپ کہاں جائیں گی۔ کیا یہ کہیں گی کہ آپ کی جگہ آنے والی خاتون کہیں اور جائیں۔“

”جہیں سر، مجھے خود وہاں جانا چاہیے جہاں اس وقت جگہ ہوگی۔“  
”کیا.....!“ ڈپٹی صاحب چونکے ”مضافات میں بھی پوسٹنگ کی جاسکتی ہے آپ کی۔“  
”سر! اگر لو کری کرنی ہو تو جہاں بھی پوسٹنگ ہو جائے جانا چاہیے مگر اپنی آسانی کی خاطر اگر میں ایک ادارے کو عبوری ہاتھوں میں چھوڑ جاؤں تو یہ خود غرضی ہوگی۔ یہ ایک بڑا ادارہ ہے سر، اسے مستقل اور محفوظ ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔“

”آپ اپنے پاؤں پر آپ کلبھاڑی نہ ماریں۔ جو آرڈر لکھ گئے آپ کے حق میں وہی بہتر ہیں۔ چھٹی کے آرڈر زعمو اسی طرح لکھا کرتے ہیں۔“

”سر، میری درخواست ہے کہ میرے حق میں جاری ہونے والے احکامات کو تبدیل کر دیا جائے۔“  
”آپ ہمیشہ ایسی بات کرتی ہیں مس ملکہ جو عموماً دوسرے لوگ نہیں کرتے۔“ ڈپٹی صاحب بولے۔  
وہ خاموش رہی۔



”ایسا کیجئے جو بات آپ کہہ رہی ہیں مجھ سے وہ آج ہی فوری طور پر درخواست کی صورت بمجھوا دیں مجھے۔ میں ڈائریکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں۔“

”شکر یہ سہرا“

اسے اتنی جلدی تھی کہ اس نے اسی دن چھٹی سے قبل مذکورہ درخواست ڈپٹی صاحب کو بمجھوا دی۔

☆☆☆

منظر ظہیر کے خاندان میں شادی بیاہ کے موقع پر ہر ہر رسم کو بہت اہتمام کے ساتھ ادا کیا جاتا۔ خاندان کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی زیب و زینت اور جوش و ولولہ دیدنی ہوتا۔ کیا مائیوں، کیا مہندی ہر رسم کے لیے لڑکے لڑکیاں خصوصی لمبوسات تیار کرواتے اور رسم کے موقع پر وہ چلیں اور ہنگامہ ہوتا کہ دلوں ان تقریبات کی یادیں شرکا کو گدگدائے جاتیں۔

منجہا کے مائیوں کے لیے لیلیٰ کا پروگرام یہ تھا کہ دولہا والے دلہن کی مائیوں میں شرکت کرنے کے لیے دلہن کے گھر جائیں گے اور ہلا گلا کریں گے۔ منجہا کو اس کی خواہش پر چنداں اعتراض نہ ہوا البتہ شادی سے تین چار دن پہلے مائیوں بیٹھ جانے پر ضرور اعتراض ہوا۔ لیلیٰ کو اس کے انکار سے سخت مایوسی ہوئی۔

”اللہ منجہا بھابی ہم نے تو بڑا زبردست پروگرام بنا رکھا ہے آپ کی مائیوں کے لیے۔“ اس نے منجہا کو باجی کے بجائے بھابی کہنا شروع کر دیا تھا۔

”تم اپنا پورا پروگرام پیش کرنا، مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر چار دن پہلے مشکل ہے میرے لیے۔“ منجہا نے کہا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ میری چھٹی دو دن پہلے شروع ہوگی۔“

”گولی مارے چھٹی کو۔“ نیہہ نے جواب بڑی سرگرمی سے شادی کی خوشیوں میں شریک تھی کہا۔

”مجھے تو ڈر ہے کہ قاضی صاحب نکاح پڑھا رہے ہوں تب بھی یہ اٹھ کر اسکول ہی نہ چل دیں۔“ مئی نے قدرے ناگواری سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔

”دیے باجی آپ کو دوسروں کے جذبات کا بھی کچھ احترام کرنا چاہیے۔ لیلیٰ بے چاری اپنی اس حالت میں بھی کتنی چاہت سے بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔“ نیہہ نے شاکی لہجے میں کہا۔

”مجھے احساس ہے یہ مگر مجبوری ہے۔“

”آخر کیا مجبوری ہے، کہہ دو بس نہیں آسکتی۔“ مئی نے کہا۔

”ایسا نہیں ہوتا والدہ..... چھٹی دو دن پہلے شروع ہوگی۔“

”بھئی آپ کی کچنول لیو بھی تو ہوں گی آخر۔“

”نئی پریسل آرہی ہیں انہیں چارج دینا ہے۔“

”لاحول ولاقوۃ!“ مئی غصے سے بڑبڑائیں۔

”پلیز ناراض نہ ہوں۔ میری مجبوری ہے۔“ اس نے مئی سے کہا پھر لیلیٰ کو معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی ”برامت ماننا لیلیٰ۔“

”چلے، ٹھیک ہے۔“ وہ نیم دلی سے بولی۔

”نیم سے کہوں گی شادی کے بعد کبھی بھولے سے بھی رخ نہ کرنے دینا اسے اسکول کا۔“ مئی کے لہجے سے نیہہ جھلک رہی تھی۔

وہ بظاہر مسکرا دی مگر دل دکھنے لگا۔ اسکول نے ظاہر اُجو کچھ دیا تھا سو دیا تھا بعض ایسی نعمتوں سے بھی نوازا تھا جنہیں صرف محسوس ہی کیا جاسکتا تھا۔ وقت پر اسکول پہنچنے کی خاطر وہ فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ فجر کی نماز وقت پر ادا ہو جاتی۔ صبح سویرے قرآن مجید کی تلاوت کے لیے بھی وقت مل جاتا۔ ترجمہ اور تفسیر بھی اطمینان سے پڑھ لیتی۔ صبح سویرے جب وہ اسکول دین میں بیٹھ کر اسکول جاتی تو صبح کا سہانا سماں دیکھنے کو ملتا۔ سڑکوں پر ٹریفک کم ہوتی۔ وقت میں ٹھہراؤ اور سکون سا محسوس ہوتا۔ وہ کسی دفتر میں ملازمت کر رہی ہوتی تو شاید اس وقت گھر سے نکلا کرتی جب سڑکیں چیخا چٹکھاڑنا شروع کر دیتی ہیں اور سب سے بڑی روحانی نعمت جو اسکول کی ملازمت کی وجہ سے عطا ہوئی تھی وہ... یہ احساس تھا کہ خدا چھوٹے پیانے پر وہ کام لے رہا تھا جو اس نے اپنے پیغمبروں سے لیا ہے۔

☆☆☆

صبح اسکول کتنے کی کھٹی بج چکی تھی۔ طالبات جوق در جوق گراؤنڈ میں پہنچ کر اپنی اپنی قطاروں میں کھڑی ہوتی جا رہی تھیں۔ منہجار و زانہ کی طرح چونکا اور مستعد کھڑی گراؤنڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ لڑکیوں کی حرکات و سکنات اس کی نظر میں تھیں۔ ٹیچرز بعض اسبلی میں پہنچ چکی تھیں۔ باقی آگے پیچھے آ رہی تھیں۔ اسبلی کے چبوترے پر مائیک اسٹینڈ کسی سپاہی کی طرح مستعد کھڑا تھا۔ اسکول بینڈ پی ٹی آئی کی دسل سننے کا منتظر تھا۔ نو منتخب اسٹوڈنٹس یونین میں شامل طالبات جو گزشتہ روز حلف برداری کی تقریب کے بعد اپنی یونیفارم پر مخصوص پٹیاں آراستہ کر چکی تھیں اسکول گراؤنڈ میں مختلف مقامات پر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے چونکا کھڑی تھیں۔

تمام طالبات گراؤنڈ میں آ کر قطاروں میں کھڑی ہو چکی تھیں۔ گیٹ سے گراؤنڈ کو آنے والے راستے پر کھڑی اراکین یونین دیر سے اسکول پہنچنے والی طالبات کو روک کر ایک علیحدہ قطار میں کھڑا کرتی جا رہی تھیں۔ اس منظر سے پرے اسٹاف روم میں تین چار ٹیچرز بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے دروازے سے ان کی ایک سانھی اپنی چادر دھرتی ہوئی خاصی غلٹ میں اندر داخل ہوئیں اور لا کر زکی طرف بڑھیں۔

”اسبلی بیل ہو چکی ہے آج اسبلی میں نہیں چلنا ہے کیا؟“ اسٹاف روم میں اطمینان سے بیٹھی ٹیچرز میں سے ایک نے باقیوں سے کہا۔

”ارے بھی بیٹھی رہو۔“

”میڈم کا آج آخری دن ہے۔“

”تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔ وہ آج صرف چارج دینے کے لیے آئیں گی۔“

”وہ آچکی ہیں۔“ چادر تہ کرنے والی ٹیچر نے چادر اپنے لا کر میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا.....!“ وہ سب چونکیں۔

”جی..... وہ اسبلی گراؤنڈ میں پہنچی ہوئی ہیں۔“

اطمینان سے بیٹھی ٹیچرز نے اپنے اپنے بیک سنبھالے اور اسٹاف روم کے دروازے کی طرف پلکیں۔

پی ٹی آئی نے دسل بجا دی۔ ڈرم پر ضرب پڑی۔

”ائین شن!“ ایک طالبہ نے مائیک پر پاٹ دار آواز میں کہا۔

قطاروں میں کھڑی طالبات کا شن ملتے ہی ”ائین شن“ ہو گئیں۔

منہجائے اسبلی میں پہلو پہ پہلو قطاروں میں آگے پیچھے کھڑی طالبات پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں دبوج لیا۔

”کل میں یہاں نہیں ہوں گی۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

اسٹاف روم سے اٹھ کر آنے والی ٹیچر زجل زجل سی اسبلی میں آ پہنچی تھیں۔



اسبلی پروگرام کا آغاز ہو چکا تھا۔ مائیک پر ایک طالبہ بڑے اعتماد سے اپنی ہم کتبوں سے مخاطب تھی۔  
 ”السلام علیکم ساتھیو! آج بارہ ستمبر ہے اور جمعرات کا دن۔ میرا نام زارا حسن ہے اور میرا تعلق جماعت ہشتم الف سے ہے۔ آج اسبلی پروگرام کے لیے میں اور میری ہم جماعت ساتھیاں آپ کے روبرو ہیں۔ ابتدا ہوتی ہے رب ذوالجلال کے پاک اور پاک نام سے، قرأت کے لیے آئیں گی میری ساتھی نوین اسلم۔“  
 ”بہت مسکروں گی میں یہ سب کچھ۔“ منجھانے دل ہی دل میں کہا اور اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔  
 نعت خوانی کے دوران پرائمری اسکول سے غزالہ ناصر اور دوسری دو ٹیچرز آہنچیں اور منجھا کے نزدیک پہنچنے کے بعد غزالہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

”میڈم! آج آپ کو ہماری اسبلی میں آنا ہے۔“

”خیریت!“ منجھا چونکی۔

”بس میڈم!“ غزالہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائیں ”آپ اگر ہائی اسکول میں آگئی ہیں تو کیا آپ پر ہمارا بھی تو کچھ حق ہے۔ بچے اور آپ کا سابقہ اساف آپ کو خدا حافظ کہنا چاہتا ہے۔“  
 ”مجھے خود ملنے کے لیے آنا تھا آپ سب لوگوں سے۔“  
 ”کوئی بات نہیں ہم خود لینے کے لیے آ گئے۔“

اسبلی میں موجود ہائی اسکول کی ٹیچرز منجھا اور پرائمری اسکول کی ٹیچرز کو تجسس نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔  
 ”اوکے۔“ منجھانے آہستگی سے کہا ”اسبلی ختم ہو جائے میں آتی ہوں۔ آپ لوگ چلیے۔“  
 ”نومیڈم! ہم آپ کو ساتھ لے کر جائیں گے۔“ غزالہ نے کہا۔  
 ”اوکے!“

اسبلی کے بعد منجھانے سینئر ٹیچر عائشہ عزیز کو صورت جال سے آگاہ کیا اور پرائمری اسکول کا قصد کیا۔  
 غزالہ اور باقی دو ٹیچرز کے ساتھ وہ پرائمری اسکول پہنچی تو اسبلی گراؤنڈ کا سماں ہی جدا تھا۔ اس کی آمد کے متوقع راستے سے اسبلی گراؤنڈ تک مانیٹرز ڈپٹی مانیٹرز کلاس گارڈز گرل گائیڈز بوائے اسکاؤٹس ریڈ کریسنٹ اور پریفیکٹس اپنی اپنی مخصوص وردیوں میں ملبوس اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ جونہی وہ اسکول میں داخل ہوئی بینڈ نے مخصوص دھن چھیڑ دی۔ چھوٹے چھوٹے دو بچوں نے جو اپنے قومی لباس میں ملبوس تھے اسے گلہ تے پیش کیے۔ پرائمری اسکول کی پرنسپل نے اسے خوش آمدید کہا اور اسے اپنے ہمراہ لیے اسبلی کے چبوترے پر جا پہنچیں۔  
 اسبلی میں کھڑے بچوں نے اسے دیکھ کر اتنی تالیاں بجائیں کہ شدت جذبات سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔  
 غزالہ نے مائیک سنبھالا۔

”السلام علیکم! ہم سب اپنی ہر دل عزیز سابقہ میڈم منجھا کو اپنے بلکہ ان کے اپنے اسکول میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میڈم منجھا جب اس ادارے میں پہلی مرتبہ آئیں تو ادارے کی صورت کچھ اور تھی مگر جب وہ اس ادارے سے رخصت ہو کر گئیں تو اس کا چہرہ بالکل بدل چکا تھا۔ روایت یہ ہے کہ لوگ جانے والوں کو بھلا دیتے ہیں آنے والوں کی خوشامد کرتے ہیں مگر میڈم منجھا کے بارے میں مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی خفت ہے نہ یہ خوف کہ ان کی تعریف کرنے سے ہماری موجودہ پرنسپل برا بھی مان سکتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میڈم منجھا ہمارے پاس سے جا کر ہمارے اور نزدیک ہو گئیں۔ ہماری خواہش تھی کہ آپ ہائی اسکول میں تو رہیں لیکن اداروں سے ان کی محبت اور بے غرضی کا عالم یہ ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق انہوں نے چھٹی پر جاتے ہوئے ہائی اسکول کو ایک مستقل پرنسپل کے ہاتھوں میں دینے کے لیے ڈائریکٹریٹ سے از خود سفارش کی اور ہر حال میں کرسی سے چپے رہنے کے عفریت کو پاش پاش کر ڈالا۔ میڈم! پرائمری اسکول آج جس مقام پر ہے اس کا سہرا صرف اور صرف آپ کے سر جاتا ہے۔ ہم شکر

گزار ہیں آپ کے کہ آپ نے ہمیں ایک نئی شناخت دی۔ ہمیں کام کا سلیقہ اور کامیابی کی لذت سے آشنا کیا۔ آج ہم ڈائریکٹرٹ کے زیرِ اہتمام وظیفہ امتحانات کے نتائج اور دیگر نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں اپنے ہم عصر اداروں میں سب سے آگے ہیں۔ مجھے اعتراف کرنے دیجئے کہ اس سر بلندی کی بنیاد ہمیں میڈم منجہا نے فراہم کی۔ پیارے بچو اور عزیز ساتھیو! میڈم منجہا سے ہم نے جو سب سے اہم بات سیکھی وہ یہ ہے کہ اداروں کو بنانے، سنوارنے، نکھارنے اور ترقی سے ہمکنار کرنے کے لیے معجزوں کی نہیں شوق، لگن اور جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں میڈم کہ آپ نے ہمارے ادارے کو حیاتِ نو دی، ہمیں کام کرنا اور سر بلند رہنا سکھایا۔ ہم دعا گو ہیں کہ آپ کو آپ کی آئندہ زندگی میں اتنی خوشیاں، اتنا اطمینان میسر آئے کہ آپ سے سنبھالا ہی نہ جائے..... اے بگ بینڈ فار میڈم منجہا.....!“

تالیاں بجیں اور بجتی ہی چلی گئیں۔

پھولوں کے گلہ سستے یکے بعد دیگرے منجہا کو پہنچنا شروع ہوئے۔

اتنے پھول..... اتنے پھول کہ اس کے ارد گرد پھول ہی پھول جمع ہوتے چلے گئے۔

”وی لو یو میڈم..... وی لو یو۔“ بچے ہم آواز ہو کر مسلسل کہے جا رہے تھے اور انتہائی جوش سے تالیاں بجائے

جا رہے تھے۔

گراؤنڈ میں تالیوں کی گونج تھی۔

زمین سے آسمان تک بس ایک ہی صدا تھی ”وی لو یو میڈم۔“

اسی گونج میں مائیک پر غزالہ کی آواز دوبارہ سنائی دی ”میڈم منجہا سے درخواست ہے کہ مائیک پر تشریف

لائیں۔“

منجہا مائیک تک پہنچی۔

اس نے ایک طائرانہ نظرا اپنے سامنے کھڑے بچوں پر ڈالی جو اس امر سے قطعاً بے خبر کم ہائی اسکول کی بالائی منزل سے انہیں دیکھا جا رہا تھا سنا جا رہا تھا ایک بے خودی کیفیت میں تالیاں بج رہے تھے اور مسلسل ”وی لو یو میڈم“ کی گردان کیے جا رہے تھے پھر اس نے دائیں بائیں گردن موڑ کر ان ہنجرز کو دیکھا جن کے ساتھ وہ بہت یادگار وقت گزار گئی تھی۔ ہنجرز سے ذرا پرے ادارے کا غیر تدریسی عملہ بھی کھڑا تھا۔ آج ان میں سے کسی کی آنکھوں میں ناگواری نہیں تھی، احترام تھا، محبت تھی۔

شاید! شاید وہ کچھ عرصہ ہائی اسکول میں گزار پاتی تو شاید انہوں نے بھی اسے خاموشی سے نہیں اسی احترام اور

محبت سے رخصت کیا ہوتا۔

”پھر کبھی..... پھر کبھی سہی۔“ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔

مائیک پر وہ ان سب سے جن سے اس کا محبت اور احترام کا رشتہ بہت دور تک بہت گہرا استوار ہو چکا تھا بہت کچھ

کہنا چاہتی تھی مگر وہ جذبات کی شدت سے رندھ جانے والی آواز میں صرف اتنا کہہ سکی ”آ کی لو یو ٹو“

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

زندگی بڑے کھلے دل سے اس کے لیے اپنی باہنیں داکے کھڑی تھی!

